قرآن مجید

مع ترجمہ و تفسیر ماجدی

تاج کمپنی لمیٹڈ

تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

القرآن الحكيم

مطبوعہ

تاج کمپنی لمیٹڈ قرآن منزل، لاہور

گذارشِ ناشرین

آج سے بیس برس پہلے کی بات ہے کہ چند بے سرو سامان بندوں نے محض فضلِ خداوندی کے بھروسے پر ایک بہت بڑے کام کا عالمِ اسلام میں پہلی بار بیڑا اٹھایا

وہ کام تھا تاج کمپنی لمیٹڈ کا قیام

تاکہ قرآن پاک کی طباعت اس کی عظمت اور شان کے مطابق ہو سکے

ہمارے پاس نہ سرمایہ تھا، نہ دولت، نہ وسائل، نہ ذرائع، نہ بلند پایہ شخصیتیں، نہ شاندار پس منظر۔ ہمارے توشے میں امید اور آرزو کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہی توشہ لے کر ہم میدان میں اُترے۔ دوستوں نے نصیحت کی، دشمنوں نے مذاق اُڑایا، بہت سے ساتھیوں نے ہمت ہار دی۔ سب کو یقین تھا کہ تاج کمپنی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جو کام آزاد اور خود مختار، مالدار اور زردار اسلامی حکومتیں نہ کر سکیں۔ وہ ایک غلام ملک کے غلام قوم کے چند بے سرو سامان لوگ کیونکر انجام دے سکیں گے۔ حالات کے پیشِ نظر یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ لیکن جو ظاہر سے ناتہ توڑ کر یاد یات سے قطع نظر کر کے اور اہلِ دنیا سے بے نیاز ہو کر، صرف فضلِ خداوندی پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ اور اس دعوٰی کا بہترین ثبوت تاج کمپنی لمیٹڈ اور اس کا کام ہے۔

تاج کمپنی لمیٹڈ کے عالمِ وجود میں آنے سے پیشتر متحدہ ہندوستان میں بہت سے مطابع تھے، جو قرآنِ پاک کی طبع واشاعت کا کام کرتے تھے۔ ان اہلِ مطابع کے پاس مال و دولت کی بھی کمی نہ تھی۔ نہ کاغذ کی کمی تھی، نہ مشینوں کی، نہ سامانِ طباعت کی۔ کمی اگر تھی تو صرف حوصلے اور امنگ کی!

اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں پہلی مرتبہ، تاج کمپنی لمیٹڈ نے، اپنی بے مائگی کے باوجود، قرآنِ پاک کی بلاک کے ذریعے بہترین کاغذ پر اعلیٰ درجہ کی طباعت کا انتظام کیا۔ بلاک سازی پر، بلاک سازی کے لئے مخصوص قسم کی کتابت پر، رنگ آمیزی پر، لوح اور ڈیزائن پر، بیل بوٹوں اور پھولوں کی تیاری اور چھپائی پر، بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ صرف کر کے ایسی نادر چیزیں دُنیا کے سامنے پیش کر دیں جو اس سے پہلے اُس کی نظر سے کبھی نہیں گزری تھیں۔

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

جب تک تاج کمپنی لمیٹڈ کے نظر فروز مطبوعات سامنے نہیں آئے تھے کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ اپنے عظیم و جلیل مقاصد میں کامیاب ہو سکے گی۔ لیکن جب تاج کمپنی لمیٹڈ کے چھاپے ہوئے محشّٰی اور مترجم اور معرّیٰ قرآن شریف، پنجسورے، ادعیہ اور وظائف منظرِ عام پر آئے تو ایک دُنیا پکار اٹھی کہ

آمد آں چیزے کہ ما مے خواستیم

یا تو یہ حالت تھی کہ مطبوعاتِ تاج کے لئے بازار میں جگہ نکلنی مشکل نظر آرہی تھی۔ یا اب بفضلِ خدا یہ کیفیت ہے کہ نہ صرف پاکستان اور نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان، ایران، ملایا، سنگاپور، انڈونیشیا، مصر، حجاز، شام، فلسطین، عراق اور دوسرے ممالکِ اسلامیہ و عربیہ میں تاج کمپنی لمیٹڈ کے چھاپے ہوئے قرآن پاک سر آنکھوں پر رکھے جاتے ہیں۔ یا یہ حالت تھی کہ ہمیں بیٹھ کر کام کرنے کے لئے تھوڑی سی اور معمولی جگہ نہ ملتی تھی یا آج اللہ کے فضل و کرم سے یہ کیفیت ہے کہ لاہور میں ایک شاندار اور وسیع عمارت کمپنی خرید چکی ہے۔ کراچی میں منگھو پیر روڈ پر ایک نہایت موزوں اور کشادہ زمین پر اپنی نئی عمارت تعمیر کر چکی ہے۔ لاہور اور کراچی میں بہت شاندار اور اعلیٰ درجہ کے چھاپے خانے قائم کر چکی ہے۔ ان چھاپے خانوں میں باہر کا کام شاذ و نادر ہی چھپنے کی باری آتی ہے۔ ورنہ ان پر صرف کمپنی ہی کی مطبوعات چھپتی رہتی ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات کثرتِ کار کے باعث دوسرے چھاپے خانوں میں اپنا کام چھپوانا پڑتا ہے۔ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں کمپنی کی برانچ قائم ہو چکی ہے۔ حجازِ مقدس (مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ) میں بھی کمپنی کی ایجنسیاں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ ہندوستان (بمبئی) میں بھی کمپنی کا دفتر قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی شاخیں کھولنے کا پروگرام زیرِ غور ہے۔ کمپنی کی اس کامیابی کا ذکر میں فخر اور غرور کے جذبہ کے ماتحت نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کر رہا ہوں۔ کمپنی کو جو کامیابیاں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔ ان کا شکر و سپاس مجھ پر واجب ہے۔ ؎

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا، ترے کرم سے ہوگا

تحدیثِ نعمت کے طور پر مناسب ہے ایک اور عرض بھی کر دوں :۔

تاج کمپنی کے کام نے جہاں قبولِ عام حاصل کیا، وہاں کچھ اپنے مخصوص مہربان بھی پیدا کر لئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تاج کمپنی لمیٹڈ کے کام کی نقل کرنے سے تو اپنے تئیں عاجز و درماندہ پاتے ہیں۔ صرف نام سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی اور دلی کے بعض تجارت پیشہ نقال، بجنسہٖ تاج کمپنی یا تاج کمپنی سے ملتے جلتے نام رکھ کر مسلمانوں کو دھوکہ میں ڈال رہے ہیں تاکہ ناواقف عوام ان لوگوں کے چھاپے ہوئے قرآن پاک بھی تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کا چھپا ہوا سمجھیں۔ لیکن جس طرح ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ان لوگوں کے لفظ "تاج" کو اپنے نام کے ساتھ لگا لینے سے یا قرآنِ پاک کے وہی حوالہ نمبر جو تاج کمپنی نے مقرر کئے ہوئے ہیں مقرر کر لینے سے، کتابت و طباعت میں حسن و پاکیزگی، خوشنمائی و دلکشی کی وہ خوبیاں پیدا نہیں ہو سکتیں جو اللہ تعالےٰ کے خاص فضل و کرم سے تاج کمپنی لمیٹڈ کا سرمایۂ ناز اور طرۂ امتیاز ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ مقدس کلام جس عظمت و شان کا حامل ہے۔ بفضلہٖ تاج کمپنی لمیٹڈ کے مطبوعہ قرآن پاک کی کتابت و طباعت اس شان کے عین شایاں ہوتی ہے۔ اور جو اہتمام کلام اللہ کی طباعت و اشاعت میں تاج کمپنی لمیٹڈ کرتی ہے دنیا کے گوشہ گوشہ میں اس کا اعتراف کرنے والے موجود ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ بقول شخصے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اُردو زبان میں بحمد اللہ تراجم اور تفاسیر کی کمی نہیں ہے۔ بہت ہیں۔ بہتر سے بہتر اور عمدہ سے عمدہ لیکن ایک چیز میرے دل میں عرصہ سے کھٹک رہی تھی۔ اُردو زبان میں نہ کوئی ترجمہ ایسا تھا، نہ کوئی تفسیر جو جدید تعلیم یافتہ اور یورپ زدہ طبقہ کے درد کا درمان بن سکے۔ بنو عباس کے عہد میں جب یونان کے علوم و فنون ترجمہ ہو کر عربی زبان میں پہنچے تو شک و ریب کا ایک طوفان اٹھا۔ اور وقت کے علماء و صلحاء اس کی روک تھام میں لگ گئے۔ علم کلام پر بہت سی

کتابیں لکھی گئیں۔ اور شک و ریب کی تمام فتنہ سامانیوں کا استیصال کر دیا گیا۔ ترجمہ و تفسیر کے سلسلے میں ہم آج تک بغیر کسی ترمیم و تغیر کے، اسی صد ہا برس کے پرانے راستے پر چل رہے ہیں۔ حالانکہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ جس طرح یونان کے علوم و فنون نے ارسطو اور جالینوس نے، افلاطون اور بقراط نے، ان کے فلسفہ اور نظریہ نے زندگی عقاید اور اخلاق کے اقدار پر حملہ کیا تھا۔ بالکل اسی طرح عہد جدید میں فرنگی علوم و فنون نے فلسفہ اور نظریہ نے، کانٹ اور ہیگل نے، نیٹشے اور برکلے نے، آئن اسٹائن، فرائڈ، ایڈلر، یونگ نے زندگی، عقائد اور اخلاق کے اقدار پر بے پناہ حملہ کیا۔ ہم چیخے تو بہت، لیکن اس کی روک تھام کے لئے کچھ نہ کر سکے۔

اس فتنے کی روک تھام میں، ان نظریات کی تغلیط و تکذیب میں، شک و ریب کی اس لہر کو کاٹنے میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو مغرب کا اداشناس ہو۔ مغربی علوم و فنون کا ماہر ہو۔ مغرب کی ذہنیت، فطرت اور مزاج کا رازدان ہو۔ جو خود شک و ریب کی وادیوں میں ٹھوکر کھا چکا ہو۔ جو خود تشکیک کے دریا میں شناوری کر چکا ہو۔ جو لا ادریت کے فلسفہ سے بھی واقف ہو اور عمل سے بھی۔ اور پھر جس نے اسلام کی برتری کے آگے سر جھکا دیا ہو۔

خوش قسمتی سے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تک میری رسائی ہوئی۔ مولانا علوم مغربی کے ماہر ہیں۔ تاریخ قدیم و جدید پر ان کی بڑی وسیع نظر ہے۔ بائیبل کے تمام ادوار ان کی نظر میں ہیں۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ وہ فلسفہ جذبات اور فلسفہ اجتماع جیسی کتابوں کے مصنف ہیں وہ ایک عرصہ دراز تک الحاد و تشکیک کی وادی میں بھی سرگرداں رہ چکے ہیں۔ اور اب وہ ایک مردِ مسلماں ہیں۔ جس دقت نظر سے انہوں نے علومِ مغربی سیکھے تھے اس سے زیادہ ژرف نگاہی کے ساتھ انہوں نے علومِ اسلامیہ میں دستگاہ حاصل کی۔ اب اسلام ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اُن کی زندگی اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے، رچی ہوئی ہے، بسی ہوئی ہے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مولانا نے تنِ تنہا اس کارِ عظیم کا بارِ گراں اپنے دوشِ ناتواں پر اٹھا لیا۔ سالہاسال کی عرق ریزی اور دیدہ کاوی کے بعد انہوں نے اُردو زبان میں قرآنِ پاک کی ایسی تفسیر تحریر فرمائی جو مغرب زدہ طبقہ کے لئے آبِ حیات سے کم نہیں۔ یہ تفسیر ان تمام امراض کا کافی اور شافی علاج ہے۔ جو مغرب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور جو انسان کے عقائد و خیالات کو مسموم اور ذہن و دماغ کو مفلوج کر دیتے ہیں۔

مولانا کے اس ترجمہ و تفسیر کے بارے میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان و پاکستان کے علمائے دین اس کارنامے کی داد دے چکے ہیں نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایتیں اور صلاحیں تو خاص طور پر، قدم قدم پر مولانا کو حاصل ہوتی رہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ اور تفسیر اپنے اندر ایک خاص شانِ امتیاز رکھتا ہے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔

میں اگرچہ دوسرے ضروری اور اہم کاموں میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن میں نے طے کر لیا کہ اس نعمتِ بے بہا کو جلد از جلد شائقانِ کلامِ الٰہی تک پہنچا دوں۔ اس سلسلے کی یہ پہلی قسط ہے۔ بقیہ اقساط یکے بعد دیگرے انشاء اللہ پیشِ خدمت ہوتی رہیں گی۔ قرآنِ پاک کی سات منزلیں ہیں۔ ہر جلد ایک منزل پر حاوی ہوگی کہ قرآنِ پاک کی یہ تقسیم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مبنی ہے۔ یہ پہلی منزل کی جلد آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بقیہ چھ منزلیں بھی انشاء اللہ جلد از جلد منظرِ عام پر آجائیں گی۔ کتابت بہت حد تک ہو چکی ہے۔ بلاک بن رہے ہیں۔ کاغذ خریدا جا چکا ہے۔ طباعت جاری ہے۔ اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰهِ

اس ترجمہ وتفسیر کی کتابت عام انداز سے ہٹی ہوئی ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن مجید کے متن کی پوری ایک سطر ہوتی ہے، پھر اس کے نیچے پوری ایک سطر ترجمہ کی ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد تفسیر ہوتی ہے۔ لیکن ہم نے ممتاز علمائے کرام کے مشورے سے یہ روش نہیں اختیار کی۔ بلکہ متن اور ترجمہ ایک جگہ رکھا اور تفسیر حاشیے پر رکھی۔ اس طرح قارئین کو بہت زیادہ سہولت رہے گی۔ اگر کوئی شخص قرآن پاک کی تلاوت، بغیر ترجمہ وتفسیر پر نظر ڈالے کرنا چاہتا ہے تو بڑی آسانی سے ایسا کر سکتا ہے۔ کوئی شخص تلاوت کے ساتھ صرف ترجمہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے۔ اور اگر کوئی تلاوت، ترجمہ اور تفسیر سے بیک وقت مستفید ہونا چاہتا ہے، تو بھی بغیر کسی زحمتِ نظر کے ایسا کر سکتا ہے۔

اس قرآنِ پاک کی کتابت ہمارے محبِ صادق پیر عبدالحمید صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے بڑے شوق اور دلچسپی سے کی ہے۔ تصحیح کا کام مولوی محمد رفیق صاحب دلاوری، مولٰنا شمس الحسن صاحب، مولوی شاکر محمد صاحب اور خواجہ عبدالوحید صاحب نے کیا ہے۔ بلاک پاکستان کی مشہور ومعروف فرم ایکسپریس بلاک نے تیار کئے ہیں۔ چھپائی کا سارا کام تاج کمپنی کے اپنے چھاپہ خانہ میں مولوی عبدالعزیز صاحب کی نگرانی میں ہوا ہے۔ اور جلد سازی کا انتظام میاں غلام محمد صاحب نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دیں۔

آخر میں قارئینِ کرام سے التماس ہے کہ وہ مجھ گنہگار کے لیئے دعائے خیر اور میرے چھوٹے مرحوم بھائی اور قوتِ بازو نذیر احمد کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔ تاج کمپنی کی کامیابی اور میرے حوصلوں کی بلندی میں اس کے اخلاص محنت اور کارگذاری کو بھی بڑا دخل تھا۔

قرآنِ مجید کے اس ترجمہ وتفسیر کے مترجم ومفسّر حضرت مولٰنا عبدالماجد صاحب تک نذیر مرحوم ہی کی بدولت میری رسائی ہوئی۔ اسی نے اس معاملہ کو چھیڑا، اسی نے اس کارِخیر کے انجام دینے پر مجھے اکسایا۔ اسی کی ذات تھی جس نے مولٰنا صاحب سے ابتدائی مراحل طے کیے۔ وہی تھا جو اس ترجمہ وتفسیر کی کتابت اور دیگر تمام مراحل سے بمبئی میں بیٹھا، اتنی ہی دلچسپی لے رہا تھا، جتنی مجھے تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس کا بیچ نہ ہوتا تو شاید میری پہنچ اس دولت بے بہا تک نہ ہو سکتی۔ اور تاج کمپنی ایسا مایۂ ناز کارنامہ نہ انجام دے سکتی۔

نیز ہر پڑھنے والے سے یہ استدعا ہے کہ کمپنی کے جملہ حصہ داروں اور کارکنوں کے لیے بھی دُعائے خیر فرمائیں کہ انہی کی محنتِ شاقہ کے بعد کمپنی اولوالعزمی کے ساتھ ایسے کاموں کا بیڑہ اٹھاتی اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میری یہ التجا بھی ہے کہ تلاوت کرنے والے بھائی میرے والد اور اس کمپنی کے بانی شیخ غلام رسُول صاحب مرحوم کے لئے بھی دعائے مغفرت فرمائیں، جن کی بے پناہ سعی وکوشش سے کمپنی نے عروج وارتقاء کے مراحل طے کیے۔ اور جو زندگی کی آخری سانس تک کمپنی کے فرائض اور معاملات ومسائل پر توجہ دیتے رہے۔

آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

عنایتُ اللہ
مینجنگ ایجنٹ تاج کمپنی لمیٹڈ

قرآن منزل
لاہور — کراچی — ڈھاکہ

بمقام کراچی، مورخہ ۱۴۔ اگست ۱۹۵۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ تفسیر

الحمد للہ الذی وحدہ۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو پُوری طرح سمجھنا اور پھر اسے دُوسروں کو سمجھانا، اور اس سمجھانے کا حق ادا کر دینا، یہ بڑے عارفوں اور کاملوں کے بھی بس کی چیز نہیں، چہ جائیکہ ایک بے علم اور سراپا بے بضاعت فرد کے۔ غالبؔ نے شعر کہا جس مقصد سے بھی ہو، ہے بہر حال اس موقع کے لیے چسپاں ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کہاں ربّ اور کہاں بندہ۔ نامحدُود اور محدُود کا بھی کوئی مقابلہ ہے۔ سمندر اور قطرہ آفتاب اور ذرّہ کی نسبت بھی تو نہیں۔ لیکن بہر حال بندہ مکلّف بھی تو محض بقدر اپنی طاقت وہمت کے ہے۔ جن جن بزرگوں نے تفسیریں لکھی ہیں، سب نے اپنے اپنے مقام علم و معرفت کے لحاظ سے لکھی ہیں۔ اور سب کے مقامات وصول و یافت الگ الگ ہیں۔ کسی کی توجہ مسائل صرف و نحو کی طرف زیادہ رہی، اور اس نے الفاظ کے اشتقاق اور فقروں کی ترکیب کو خُوب حل کیا۔ کسی کے پیشِ نظر احادیثِ نبوی ہیں، اور اس نے نزولِ آیات کا پس منظر دکھانے میں دادِ تلاش و تحقیق دی۔ کسی نے ادب و بلاغت کے نکتوں کو چُن لیا۔ کسی نے احکامِ قرآنی و مسائل فقہی کے استنباط و استخراج کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔ کسی نے علمِ کلام کے مباحث کو دل کھول کر بیان کیا۔ وقس علیٰ ہذا۔

مَیں کہ ہر علم و فن سے کورا اور حُسنِ عمل سے معرا ہوں، حقیقۃً اس قابل بھی نہیں کہ کلامِ الٰہی کی کسی ایک آیت کی بھی تفسیر و تشریح کی جرأت کر سکوں۔ لیکن ولٰکن یفعل اللہ ما یرید۔ اللہ جس سے جو کام چاہے لے لیتا ہے۔ وہ تنکے سے چاہے تو ستون کا کام لے لے اور ذرّہ میں چاہے تو چٹان کی قوّت بھر دے۔ ع

دادِ او را قابلیت شرط نیست

وہ بے زبان کو چاہے تو فصیح البیان بنا دے، اور جاہل کو چاہے تو علماء و فضلاء کی اُستادی کے مرتبہ پر پہنچا دے۔

اِس احقر کو جب انگریزی کے ترجمہ و تفسیر سے فرصت ہُوئی تو اسی انداز اور نمونہ پر اپنی مادری زبان میں بھی ترجمہ و تفسیر کا خیال آیا۔ جا بجا سے اس کے تقاضے بھی آئے۔ رفتہ رفتہ احباب کے حُسنِ ظن نے ارادہ کے ضعف و تذبذب کو ہمت و عزم سے بدل دیا۔ چند سال کی محنت میں جو کچھ ہو سکا نذرِ ناظرین ہے۔ پڑھنے والوں کو اگر اس میں کوئی خُوبی نظر آ جائے، تو وہ یہ سمجھیں کہ وہ تمامتر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا ثمرہ ہے۔ اور عیب جتنے بھی نظر آئیں، انہیں راقم کی نااہلی پر محمُول کر کے ان سے درگزر فرمائیں، اور ہو سکے تو مصنّف کو اس کی زندگی میں ان سے آگاہ کر دیں۔ اور اس کے حق میں دُعائے خیر بہر صُورت فرماتے رہیں ان شاء اللہ خود بھی ماجُور ہوں گے۔

مطالعہ فرمانے کے وقت اگر معروضاتِ ذیل کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ان شاء اللہ فہمِ مطالب میں بڑی سہُولت رہے گی۔

۱۔ قرآن حکیم ایک نہایت درجہ مرتّب و منظّم کتاب ہے۔ اس لئے اسی نسبت سے دشوار بھی ہے۔ اسے جو آسان فرمایا گیا ہے وہ صرف وعظ اور عبرت پذیری کے اعتبار سے ہے۔ اگر اس کے مطالب کو گرفت میں لانا چاہے تو اس کے لئے سرسری مُطالعہ خصوصاً انڈیکس (اشاریہ) کی مدد سے ہرگز کافی نہ ہوگا۔ مدّتوں کے مُسلسل اور غائر مطالعہ کے بعد کہیں اس سے مناسبت پیدا ہوتی ہے اور دشواریاں مناسبت پیدا ہونے کے بعد ہی حل ہو سکتی ہیں۔ اس لئے قرآن فہمی میں بہت زیادہ عجلت کو دخل دینا ہرگز مناسب نہیں۔

۲۔ قرآن مجید ایک زندہ صحیفہ بھی ہے اور ماضی کی کتاب بھی۔ یعنی ایک طرف تو اس کی مخاطب عرب کی وہ قوم تھی جو اس کے نزول کے وقت موجُود تھی۔ بلکہ ساری قومِ عرب کیوں کہیے زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیے کہ مکّہ اور مضافاتِ مکّہ اور مدینہ و حوالیِ مدینہ کے باشندے تھے۔ اور دُوسری طرف اس کے مخاطب روس و جاپان، چین اور ہندوستان، امریکا، آسٹریلیا کُل رُوئے زمین کے باشندے قیامت تک کے لئے ہیں۔ اس کی یہ دونوں حیثیتیں نہ صرف موجُود ہیں بلکہ برابر ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اور ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے پہلی حیثیت اہم تر اور مقدم ہے۔ جنّت کی نعمتوں، دوزخ کے عذابوں، آسمان کی ساخت، زمین کی حرکت و سکون، ستاروں کی گردش، وغیرہ سے متعلق کوئی ایسی بات اگر وہ بیان کر دیتا جو اس کے مخاطبین اوّل، یعنی چھٹی صدی عیسوی کے اہلِ حجاز کے مسلّمات کے خلاف یا ان کی فہم سے باہر ہوتی تو وہ لوگ خواہ مخواہ ایک نئے الجھاوے میں پڑ جاتے، اور محض اس سے ان کے دماغ وحشت کھا کر قرآن کے بنیادی عقائد توحید، رسالت، حشر و نشر، وغیرہ کی تکذیب پر آمادہ ہو جاتے۔ اس لئے قرآن نے نہایت حکیمانہ اسلوب یہ اختیار کیا، کہ صراحتیں تو تمامتر مذاقِ عرب کے مطابق ہی کیں، لیکن ساتھ ہی اشارے ایسے بھی رکھے کہ بعد کی نسلیں اور ہر دَور کے مخاطبین اپنی اپنی فہم و استعداد کے ماتحت اس سے روشنی حاصل کر سکیں ——— یہ ایک بنیادی نکتہ اگر مستحضر رہے تو بہت سے اشکالات ان شاء اللہ از خود دور ہو جائیں گے۔

۳۔ قرآنِ حکیم اپنے نفسِ مضمون یعنی معانی و مطالب کے لحاظ سے ساری کائناتِ انسانی کو مخاطب کئے ہوئے ہے، سب کی عقلوں اور ذہنوں کو سامنے رکھے ہوئے ہے، لیکن جہاں تک طرزِ ادا اور اسلوبِ خطاب کا تعلق ہے، وہ عربی کلام ہے اور اپنی صنعتوں اور لطافتوں، فقروں کی ترکیب الفاظ کی نشست میں تمامتر عربی ادب و انشا کے لیے خود معیارِ اعلیٰ کا کام دے رہا ہے۔ اس میں روانی، شُستگی، سلاست، اردو یا فارسی یا ہندی یا انگریزی یا ترکی یا جرمنی ادب کے معیار سے تلاش کرنا شدید کوتہ فہمی ہے۔ اس کی انشائی خوبیوں سے لُطف اُٹھانے کے لئے قدیم خطباتِ عرب سے واقفیت ضروری ہے۔ اور اس کی انشا پردازی و بلاغت کو جب کبھی کسی غیر معمولی معیار سے دیکھا جائیگا تو ہمیشہ غلط فہمی ہی ہوگی۔

۴۔ قرآن مجید کی دُنیا، حکمت و اخلاق، رُوحانیت و انسانیت کبریٰ کی دُنیا ہے۔ اس کی فضا تحقیق و طلب کی فضا، اور اس کا ماحول تقوٰی و طہارت کا ماحول ہے۔ اس کی گہرائیوں تک رسائی کے لئے تقوٰی کسی درجہ میں تو بہر حال لازمی ہے۔ طہارتِ قلب و طہارتِ جسم کا مطلق اہتمام کئے بغیر محض زبان دانی کے بھروسہ پر قرآن سمجھ لینے کی کوشش ایک سعی لاحاصل ہے ——— اُبُوجہل اور اُبُولہب سے بڑھ کر زبان داں اور کون تھا؟ کوئی لغوی یا صرفی و نحوی اشکال انہیں کبھی کیوں پیش آنے لگا تھا۔ لیکن اپنی رُوح کو انہوں نے قرآنی رُوح سے یکسر بیگانہ و ناآشنا رکھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ قرآن اُن پر ذرا بھی نہ کُھلا۔ بالکل بند ہی رہا اور وہ فہمِ قرآنی کے درجۂ ادنیٰ کی بھی سعادت سے محروم ہی رہے۔

کلام بڑے غیور اور غنی عن العٰلمین کا ہے۔ اس کا ہے جس سے بڑھ کر کوئی نہ غیرت مند ہے، نہ بے نیاز۔ اور متکلّم کی شانِ غیرت و غنا کا ظہور کلام میں بھی درجۂ اتم میں ہے۔ جو بڑا بننے کی آرزو رکھتے ہیں، انہیں چھوٹا بن کر

اس دروازہ میں داخل ہونا ہوگا۔ قال العارف الرومی ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز کہ اشکستہ نگیرد فضل شاہ

۵۔ اُستاد کی ضرورت تو چھوٹے سے چھوٹے علم اور سہل سے سہل فن میں بھی تقریباً ناگزیر ہی ہے۔ پھر قرآن کا علم تو بڑا مہتم بالشان علم ہے۔ اس میں کوئی طالب علم استاد سے بے نیاز کیسے رہ سکتا ہے؟ کوئی زندہ استاد اگر کامل الفن نہ ملے تو اس کی قائم مقامی اکابر مفسرین اور محقق شارحین کی کتابیں کر سکتی ہیں۔

ان حضرات کی تحقیق و تلاش کی داد دل سے دینا چاہئے۔ ان کے فضل و کمال و تبحر علمی کا احساس پورا پورا رکھنا چاہئے۔ ان کی عظمت و احترام کے اعتراف میں تامل ذرا سا نہ کرنا چاہئے لیکن ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی تازہ رکھنا چاہئے کہ معصوم بجز نبی معصوم کے اور کوئی نہیں۔ اُمت کے بڑے سے بڑے محققین بھی غیر معصوم ہی ہیں۔ کسی ایک کے بھی ہر قول کی تقلید ہر حال میں آنکھ بند کئے کرتے رہنا اور دلیل صریح کے باوجود بھی کئے جانا ہرگز طریق ثواب نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دُوسروں کی عصمت سے انکار کر کے خود اپنی عصمت پر عقیدہ جما لیا جائے، اور اپنی تحقیق پر جزم اور جمود کے ساتھ اعتماد کر لیا جائے۔ حاشا اس کا وہم بھی نہ آنے پائے۔

عربی میں اچھی اچھی تفسیریں ماشاء اللہ کثرت سے موجود ہیں۔ اس نامہ سیاہ نے جن جن سے استفادہ اور خوشہ چینی کی ہے، ان کی کچھ تفصیل عرض ہے:۔

۱۔ تنویر المقیاس یا تفسیر ابن عباسؓ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ (متوفی ۶۸ھ) اصحاب رسولؐ میں مشہور ترجمان القرآن ہوئے ہیں۔ یہ ان کے تفسیری اقوال کا مجموعہ، صاحب قاموس مجد الدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی (متوفی ۸۱۷ھ) کا مرتب کیا ہوا ہے۔ البتہ سلسلہ مرویات ناقدین کے نزدیک کچھ زیادہ معتبر و مستند نہیں۔

۲۔ جامع البیان۔ یا تفسیر ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) ۳۰ جلدوں میں۔ یہ ایک مبسوط مفصل اور محققانہ تفسیر ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہر آیت کی تفسیر میں صحابیوں اور تابعین کے آثار و اقوال کی جامع ہے ساتھ ہی دوسرے پہلوؤں، لغت، ادبیت وغیرہ پر بھی محققانہ کلام ہے۔

۳۔ تفسیر الکشاف۔ ۲ جلدوں میں۔ لغت و ادب کے مشہور امام علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشریؒ (متوفی ۵۳۸ھ) کی مشہور تفسیر ہے۔ زمخشری عقائد میں معتزلی تھے۔ لیکن جہاں تک ادب و بلاغت کے پہلوؤں کا تعلق ہے، اہل سنت بھی ان کی نکتہ سنجیوں کے پوری طرح قائل و معترف ہیں۔

۴۔ مفاتیح الغیب۔ یا تفسیر کبیر۔ ۸ جلدوں میں۔ از امام فخر الدین عمر رازی (متوفی ۶۰۶ھ) رازی معقول و منقول دونوں کے امام تھے۔ ان کی تفسیر حقیقۃً تفسیر کبیر یا تفسیر اعظم ہی کہلانے کی مستحق ہے۔ لسانی، روایتی کلامی، فقہی کہنا چاہئے کہ سارے ہی پہلو اس میں آگئے ہیں۔ اور کلامی مباحث کے تو گویا رازی بادشاہ ہیں۔ مفسر کا کمال یہ ہے کہ اپنے زمانہ کے سارے علوم و فنون کو قرآن کے خادم کی حیثیت سے لا کھڑا کر دیا ہے۔

۵۔ الجامع لاحکام القرآن۔ یا تفسیر قرطبی۔ امام عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے۔ نام سے دھوکا ہوتا ہے کہ شاید صرف احکام فقہی پر محدود ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ مکمل تفسیر ہے۔ محققانہ بھی اور جامع بھی۔ پھر عبارت سلیس۔ افسوس ہے کہ مکمل طبع نہیں ہوئی۔ کوئی نصف قرآن تک مصر میں، متعدد جلدوں میں شائع ہوئی، یہاں وہ نسخہ بھی کمیاب ہے۔ میں نے تمام تر حضرت مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی بھوپالی مہتمم دار العلوم ندوہ سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ موصوف ایک ایک جلد برابر عاریۃً عنایت کرتے رہے۔

۶۔ معالم التنزیل۔ یا مختصراً تفسیر معالم۔ محی السنۃ حسین بن مسعود ابو محمد بغوی شافعی (متوفی ۵۱۶ھ) کی تصنیف ہے۔ مشہور محدث گزرے ہیں۔ کتاب ۸ جلدوں میں تفسیر ابن کثیر کے حاشیہ کے طور پر مصر میں طبع ہوئی ہے۔

۷۔ تفسیر ابن کثیر۔ از حافظ عماد الدین ابو الفدا اسمٰعیل ابن کثیر دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) ۸ جلدوں میں مصر میں چھپی ہے۔ تفسیر بجائے خود اچھی اور مستند ہے لیکن مفسر پر محدثانہ رنگ غالب ہے۔ کتاب عام طلبۂ قرآن کے زیادہ کام کی نہیں۔ گویا صرف ایک مجموعۂ تفسیری احادیث کا ہے۔

۸۔ مدارک التنزیل یا تفسیر مدارک۔ حافظ الدین محمود ابو البرکات النسفی الحنفی (متوفی ۷۱۰ھ) صاحب عقائد نسفی۔ اہل سنت کے مسلم امام ہیں۔ ان کی یہ مختصر تفسیر بہت طویل حاشیہ اکلیل کے ساتھ ہندوستان میں بڑی چوڑی جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ عقاید و احکام کے باب میں اعتماد سب سے زیادہ اسی پر رہا ہے۔

۹۔ انوار التنزیل۔ یا تفسیر بیضاوی۔ از قاضی ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر بیضاوی (متوفی ۶۹۱ھ) ۵ جلدوں میں۔ مشہور و متداول تفسیر ہے، لیکن جامع و مستند۔

۱۰۔ البحر المحیط۔ ۸ جلدوں میں۔ از اثیر الدین ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن حیان اندلسی (متوفی ۷۴۵ھ) ابن حیان محدث بھی ہیں اور ادیب اور متکلم بھی۔ تفسیر میں سب پہلوؤں کی رعایت رکھی ہے۔ جو ضعیف بلکہ موضوع روایات بعض مفسرین محض افراط خوش عقیدگی کی بنا پر ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے آئے تھے، انھوں نے جرأت کر کے ان میں سے اکثر سے انکار کر دیا ہے۔

۱۱۔ تفسیر ابی سعود۔ یہ ابو سعود عمادی کے حواشی تفسیری ہیں۔ زیادہ تر قرآن کی ترکیبات نحوی و مباحث سے متعلق۔ تفسیر کبیر مطبوعہ مصر پر بطور تعلیقات کے شائع ہوئی ہے۔

۱۲۔ رُوح المعانی۔ ۹ جلدوں میں۔ علامہ شہاب الدین سید محمود آلوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ) متاخرین میں ایک بے مثل شخص ہوئے ہیں۔ نظر میں وسعت بھی تھی اور عمق بھی۔ ان کی یہ جامع و مفصل تفسیر ایک بڑی حد تک قدیم تفسیروں سے غنی کر دینے والی ہے۔ لغوی، روایتی، کلامی، فقہی حیثیت سے کہنا چاہئے کہ سب ہی کچھ اس میں موجود ہے۔ اور سلوک و تصوف سے متعلق اشارات اُن پر مستزاد۔

اصل استفادہ عربی میں انھیں تفاسیر سے کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ حسب ذیل بھی وقتاً فوقتاً پیش نظر رہی ہیں۔ اور کہیں کہیں مدد ان سے بھی ملی ہے۔

۱۳۔ تفسیر جلالین۔ مع کمالین

۱۴۔ غرائب القرآن یا تفسیر نیشاپوری

۱۵۔ تفسیر فتح القدیر (شوکانی)

۱۶۔ تفسیر خازن (شرح معالم)

ان عام تفسیروں کے علاوہ فقہی مسائل سے متعلق ذیل کی تفسیروں سے بھی بہت مدد ملی، خصوصاً اول الذکر سے:۔

۱۷۔ احکام القرآن۔ ۲ جلدوں میں۔ از علامہ ابو بکر محمد بن العربی المالکی الاندلسی (المتوفی ۵۴۳ھ) ہر مسئلہ سے متعلق چاروں ائمۂ فقہ کے مذہب نقل کر دیئے ہیں۔ بڑے کام کی کتاب ہے۔

۱۸۔ احکام القرآن۔ ۳ جلدوں میں۔ از امام ابو بکر احمد بن علی جصاص رازی حنفیؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) حنفیہ میں بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی دیئے گئے ہیں۔

۱۹۔ تفسیر احمدی۔ ملا احمد عرف ملا جیون امیٹھوی کی تالیف۔ سن تالیف ۱۰۸۰ھ۔

لغت قرآنی پر کوئی کتاب ابو القاسم حسین بن الفضل راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۲ھ) کی

۲۰۔ المفردات فی غریب القرآن سے بڑھ کر مستند اور مفید میرے علم میں نہیں۔

عام لغات میں

۲۱۔ مجد الدین فیروز آبادی (المتوفی ۸۱۷ھ) کی القاموس (۴ جلدوں میں) ابن المنظور افریقی (المتوفی ۷۱۱ھ) کی ضخیم و مستند

۲۲۔ لسان العرب (۲۰ جلدوں میں) اور سب سے بڑھ کر علامہ مرتضیٰ زبیدی بلگرامی (المتوفی ۱۲۰۵ھ) کی بلند پایہ

۲۳۔ تاج العروس شرح قاموس (۱۰ جلدوں میں) سے مدد قدم قدم پر ملتی رہی

۲۴۔ ان سب کتابوں کے علاوہ سیوطی (المتوفی ۹۱۱ھ) کی اتقان فی علوم القرآن بھی ایک قابل قدر کتاب ہے۔ کہنا چاہئے کہ ایک چھوٹی سی قرآنی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اُس زمانہ تک جتنا کام قرآن سے متعلق ہوا تھا اس کی جامع۔

۲۵۔ کلیات ابی البقا۔ یہ بھی جہاں تک ادب، لغت، نحو و بیان کا تعلق ہے، قرآن مجید سے متعلق بڑے کام کی کتاب ہے۔

فارسی ترجموں میں بجز شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ترجمہ فتح الرحمٰن کے اور کوئی چیز قابلِ ذکر نہیں ملتی۔ ترجمہ کی راہ ہندوستان میں اگر شاہ دہلوی اور ان کے خاندان والوں نے نہ کھول دی ہوتی، تو آج خدا معلوم کتنی دشواریوں کا سامنا ہوتا۔

اس تفسیر کے اُردو ترجمہ کا جہاں تک تعلق ہے یہ ۹۵ فی صدی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نقل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے ترجموں میں شاہ رفیع الدین دہلوی کا ترجمہ اور نئے ترجموں میں حکیم الامت کا ترجمہ بس یہ دو ترجمے باقی تمام ترجموں سے بے نیاز کر دینے والے ہیں۔ پہلا ترجمہ لفظی ہے، اور دوسرا بامحاورہ و مطلب خیز۔

اُردو تفسیروں میں نمبر اول پر

۲۶۔ حکیم الامت کی تفسیر بیان القرآن (۱۲ جلدوں میں) ہے۔ علوم و معارف سے لبریز یہ تفسیر اُردو میں اپنی نظیر آپ ہے۔ سب سے زیادہ اخذ و استفادہ اسی سے کیا گیا ہے۔

۲۷۔ خلاصۃ التفاسیر (۵ جلدوں میں معہ مقدمہ) از مولانا فتح محمد تائب لکھنویؒ۔ کتاب اور مصنف نے زیادہ شہرت نہیں پائی لیکن تفسیر متعدد حیثیتوں سے قابل قدر ہے۔ گو اب ذرا پرانی ہوگئی ہے۔

۲۸۔ ترجمہ اُردو تفسیر مظہری۔ اصل تفسیر قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صاحب مالابدمنہ) کی ہے، اور فارسی میں ہے۔ اس کے اُردو ترجمہ کا صرف قلیل ابتدائی حصہ مطالعہ میں آیا، اور اسے مفید پایا گیا۔

اُردو میں تفسیر پر اور بھی بہت کچھ کام ہو چکا ہے، مثلاً

۱۔ تفسیر مواہب الرحمٰن۔ ۳۰ لمبی چوڑی ضخیم جلدوں میں۔ از مولانا امیر علی ملیح آبادی مرحوم۔ بہت جامع و مفصل کتاب ہے۔ عربی کی مشہور و متداول تفسیروں کا عطر اس میں آگیا ہے۔ زبان پرانی ہوگئی ہے۔

۲۔ تفسیر فتح المنان یا تفسیر حقانی۔ ۷ جلدوں میں۔ از مولانا عبد الحق حقانی دہلوی مرحوم۔ مذاہب غیر سے مناظرہ کرنے والوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔

۳۔ تفسیر ثنائی۔ ۷ جلدوں میں۔ از مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری۔ ذرا مختصر ہے۔ محدثین کے مذہب پر ہے۔ اور غیر مذاہب سے مناظرہ کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔

۴۔ تفسیر بیان القرآن۔ ۳ جلدوں میں۔ از مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے۔ امیر جماعت احمدیہ (قادیانیہ) لاہور۔ مغربیت سے متاثر گروہ کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ گو ظاہر ہے کہ اس کے متعدد بیانات مسلک اہل سنت والجماعت سے ہٹے ہوئے ہیں۔

۵۔ حواشی تفسیری از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ دیوبندی۔ شیخ الہند محمود حسن کے ترجمہ قرآن کے اکثر حصہ پر یہ حاشیے ہیں، اور ضروریات وقت کو ملحوظ رکھ کر ایک فاضلانہ قلم سے لکھے گئے ہیں۔

۶۔ تفہیم القرآن۔ از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی۔ یہ تفسیر جسے تفسیر کہنا مشکل ہی ہے، بہ اقساط نکل رہی ہے۔ ابھی تک آٹھ پاروں کی نکلی ہے۔ بعض نکتے اس میں خوب آگئے ہیں۔

مفسر تھانوی کی اصل تفسیر کے علاوہ ان کے زبانی افادات اور ان کی ایک اور کتاب مسائل السلوک من کلام ملک الملوک سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مسائل سلوک و تصوف سے متعلق ایسے موقعوں پر حوالہ "مرشد تھانوی" کا دیا گیا ہے۔

جن کتابوں کے حوالے بار بار اور کثرت سے آئے ہیں، ان کے لئے ذیل کی صرف علامتیں استعمال ہوئی ہیں:۔

نام کتاب	علامت	نام کتاب	علامت	نام کتاب	علامت
۱۔ تفسیر تنویر المقیاس	(ابن عباسؓ)	۸۔ تفسیر مفاتیح الغیب	(کبیر)	۱۵۔ حواشی ابو سعود العمادی	(ابو سعود)
۲۔ تفسیر ابن جریر طبری	(ابن جریر)	۹۔ البحر المحیط لابن حیان	(بحر)	۱۶۔ مفردات غریب القرآن	(راغب)
۳۔ تفسیر الکشاف	(کشاف)	۱۰۔ النہر اللعیط لابن حیان	(نہر)	۱۷۔ لسان العرب	(لسان)
۴۔ تفسیر انوار التنزیل	(بیضاوی)	۱۱۔ تفسیر الجامع لاحکام القرآن	(قرطبی)	۱۸۔ تاج العروس	(تاج)
۵۔ تفسیر مدارک التنزیل	(مدارک)	۱۲۔ روح المعانی	(روح)	۱۹۔ وجوہ اعراب القرآن المعروف باعراب القرآن	(عکبری)
۶۔ تفسیر معالم التنزیل	(معالم)	۱۳۔ احکام القرآن لابن العربی	(ابن عربی)	۲۰۔ تفسیر بیان القرآن	(تھانوی)
۷۔ تفسیر ابن کثیر	(ابن کثیر)	۱۴۔ احکام القرآن للجصاص رازی	(جصاص)	۲۱۔ القرطین	(ابن قتیبہ)

ان کے علاوہ جن کتابوں کے حوالے آئے ہیں، بجائے علامات اور مرموزات کے، اصل نام کے ساتھ آئے ہیں۔

اس دیباچہ کی تحریر کے وقت (یعنی دسمبر ۱۹۴۳ء ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ میں) صرف پارۂ اول نظر ثانی کے بعد ناشر کے ہاں جانے کے قابل ہوا ہے۔ باقی ۲۹ پاروں پر مفصل اور جزئی نظر ثانی کا کام اب شروع ہو رہا ہے جس نے آغاز کار کی توفیق دی تھی اسی کے ہاتھ میں انجام تک پہنچانا ہے

اسی رب العزت سے دعا ہے کہ اس حقیر و ناچیز کوشش کو حسن قبول عطا فرمائے۔ میری اور میرے والدین اور میرے اعزہ، احباب، متوسلین کی اور ان تمام اشخاص کو جو اس تالیف کی تیاری میں مالی حیثیت سے یا کسی اور حیثیت سے معین ہوئے ہیں مغفرت سے سرفراز فرمائے اور ان پر اور ساری امتِ محمدی پر رحمت کی بارش نازل کرے۔ ناظرین سے صرف اتنی استدعا ہے کہ اس دُعا پر آمین کہہ دیں۔

دریاباد۔ بارہ بنکی
دسمبر ۱۹۴۳ء
ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ

عبد الماجد

ضمیمہ۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء (ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ) آگیا۔ اور اب پانچ پارے تیار شدہ ناشر کے پاس پریس میں پہنچ چکے ہیں۔ دسویں پارہ کی نظر ثانی اس وقت جاری ہے۔

رموزِ اوقافِ قرآن مجید

ہر ایک زبان کے اہلِ زبان جب گفتگو کرتے ہیں تو کہیں ٹھہر جاتے ہیں کہیں نہیں ٹھہرتے۔ کہیں کم ٹھہرتے ہیں۔ کہیں زیادہ۔ اور اس ٹھہرنے اور نہ ٹھہرنے کو بات کے صحیح بیان کرنے اور اس کا صحیح مطلب سمجھنے میں بہت دخل ہے۔ قرآن مجید کی عبارت بھی گفتگو کے انداز میں واقع ہوئی ہے۔ اسی لئے اہلِ علم نے اس کے ٹھہرنے نہ ٹھہرنے کی علامتیں مقرر کر دی ہیں جن کو رموزِ اوقافِ قرآن مجید کہتے ہیں۔ ضرور ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے ان رموز کو ملحوظ رکھیں۔ اور وہ یہ ہیں:۔

○ جہاں بات پوری ہو جاتی ہے، وہاں چھوٹا سا دائرہ لکھ دیتے ہیں۔ یہ حقیقت میں گول ت ہے جو بصورت ۃ لکھی جاتی ہے۔ اور یہ وقفِ تام کی علامت ہے۔ یعنی اس پر ٹھہرنا چاہئے۔ اب ۃ تو نہیں لکھی جاتی۔ چھوٹا سا حلقہ لکھ دیا جاتا ہے۔ اِس علامت کو آیت کہتے ہیں۔

م یہ علامت وقف لازم کی ہے۔ اس پر ضرور ٹھہرنا چاہئے۔ اگر نہ ٹھہرا جائے تو احتمال ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے۔ اس کی مثال اُردو میں یُوں سمجھنی چاہئے کہ مثلاً کسی کو یہ کہنا ہو۔ کہ اُٹھو۔ مت بیٹھو۔ جس میں اُٹھنے کا امر اور بیٹھنے کی نہی ہے۔ تو اُٹھو پر ٹھہرنا لازم ہے۔ اگر ٹھہرا نہ جائے تو اُٹھو مت بیٹھو ہو جائیگا۔ جسمیں اُٹھنے کی نہی اور بیٹھنے کے امر کا احتمال ہے۔ اور یہ قائل کے مطلب کے خلاف ہو جائیگا۔

ط وقف مُطلق کی علامت ہے۔ اِس پر ٹھہرنا چاہئے۔ مگر یہ علامت وہاں ہوتی ہے جہاں مطلب تمام نہیں ہوتا۔ اور بات کہنے والا ابھی کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔

ج وقف جائز کی علامت ہے۔ یہاں ٹھہرنا بہتر اور نہ ٹھہرنا جائز ہے۔

ز علامت وقف مجوز کی ہے۔ یہاں نہ ٹھہرنا بہتر ہے۔

ص علامت وقف مرخص کی ہے۔ یہاں ملا کر پڑھنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی تھک کر ٹھہر جائے تو رخصت ہے۔ معلوم رہے کہ ص پر ملا کر پڑھنا ز کی نسبت زیادہ ترجیح رکھتا ہے۔

صلے الوصل اولیٰ کا اختصار ہے۔ یہاں ملا کر پڑھنا بہتر ہے۔

ق قیل علیہ الوقف کا خلاصہ ہے۔ یہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔

صل قد یوصل کی علامت ہے۔ یعنی یہاں کبھی ٹھہرا بھی جاتا ہے۔ کبھی نہیں۔ لیکن ٹھہرنا بہتر ہے۔

قف یہ لفظ قِف ہے۔ جس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ۔ اور یہ علامت وہاں استعمال کی جاتی ہے۔ جہاں پڑھنے والے کے ملا کر پڑھنے کا احتمال ہو۔

س یا سکتہ سکتے کی علامت ہے۔ یہاں کسی قدر ٹھہر جانا چاہیے مگر سانس نہ ٹوٹنے پائے۔

وقفہ لمبے سکتے کی علامت ہے۔ یہاں سکتے کی نسبت زیادہ ٹھہرنا چاہیے۔ لیکن سانس نہ توڑے۔ سکتے اور وقفے میں یہ فرق ہے کہ سکتے میں کم ٹھہرنا ہوتا ہے۔ وقفے میں زیادہ۔

لا لا کے معنی نہیں کے ہیں۔ یہ علامت کہیں آیت کے اُوپر استعمال کی جاتی ہے۔ اور کہیں عبارت کے اندر۔ عبارت کے اندر ہو تو ہرگز نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ آیت کے اُوپر ہو تو اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ٹھہر جانا چاہیے۔ بعض کے نزدیک نہ ٹھہرنا چاہیے۔ لیکن ٹھہرا جائے یا نہ ٹھہرا جائے اس سے مطلب میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ وقف اسی جگہ نہیں چاہیے۔ جہاں عبارت کے اندر لکھا ہو۔

ک کذلک کی علامت ہے یعنی جو رمز پہلے ہے وہی یہاں سمجھی جائے۔

قرآن مجید کی سُورتوں کی فہرست

شمار سورت	نام سورت	شمار پارہ	شمار سورت	نام سورت	شمار پارہ
۱	سورہ فاتحہ	۱	۲۹	سورہ عنکبوت	۲۰ - ۲۱
۲	سورہ بقرہ	۱ - ۲ - ۳	۳۰	سورہ روم	۲۱
۳	سورہ آلِ عمرٰن	۳ - ۴	۳۱	سورہ لقمان	۲۱
۴	سورہ نساء	۴ - ۵ - ۶	۳۲	سورہ سجدہ	۲۱
۵	سورہ مائدہ	۶ - ۷	۳۳	سورہ احزاب	۲۱ - ۲۲
۶	سورہ انعام	۷ - ۸	۳۴	سورہ سبا	۲۲
۷	سورہ اعراف	۸ - ۹	۳۵	سورہ فاطر	۲۲
۸	سورہ انفال	۹ - ۱۰	۳۶	سورہ یٰسٓ	۲۲ - ۲۳
۹	سورہ توبہ	۱۰ - ۱۱	۳۷	سورہ صافات	۲۳
۱۰	سورہ یونس	۱۱	۳۸	سورہ ص	۲۳
۱۱	سورہ ہود	۱۱ - ۱۲	۳۹	سورہ زمر	۲۳ - ۲۴
۱۲	سورہ یوسف	۱۲ - ۱۳	۴۰	سورہ مؤمن	۲۴
۱۳	سورہ رعد	۱۳	۴۱	سورہ حٰمٓ السجدۃ	۲۴ - ۲۵
۱۴	سورہ ابراھیم	۱۳	۴۲	سورہ شوریٰ	۲۵
۱۵	سورہ حجر	۱۳ - ۱۴	۴۳	سورہ زخرف	۲۵
۱۶	سورہ نحل	۱۴	۴۴	سورہ دخان	۲۵
۱۷	سورہ بنی اسرآءیل	۱۵	۴۵	سورہ جاثیہ	۲۵
۱۸	سورہ کہف	۱۵ - ۱۶	۴۶	سورہ احقاف	۲۶
۱۹	سورہ مریم	۱۶	۴۷	سورہ محمد	۲۶
۲۰	سورہ طٰہٰ	۱۶	۴۸	سورہ فتح	۲۶
۲۱	سورہ انبیاء	۱۷	۴۹	سورہ حجرات	۲۶
۲۲	سورہ حج	۱۷	۵۰	سورہ ق	۲۶
۲۳	سورہ مؤمنون	۱۸	۵۱	سورہ ذاریات	۲۶ - ۲۷
۲۴	سورہ نور	۱۸	۵۲	سورہ طور	۲۷
۲۵	سورہ فرقان	۱۸ - ۱۹	۵۳	سورہ والنجم	۲۷
۲۶	سورہ شعراء	۱۹	۵۴	سورہ قمر	۲۷
۲۷	سورہ نمل	۱۹ - ۲۰	۵۵	سورہ رحمٰن	۲۷
۲۸	سورہ قصص	۲۰	۵۶	سورہ واقعہ	۲۷

شمار سورت	نام سورت	شمار پارہ	شمار سورت	نام سورت	شمار پارہ
۵۷	سورہ حدید	۲۷	۸۷	سورہ اعلیٰ	۳۰
۵۸	سورہ مجادلہ	۲۸	۸۸	سورہ غاشیہ	۳۰
۵۹	سورہ حشر	۲۸	۸۹	سورہ فجر	۳۰
۶۰	سورہ ممتحنہ	۲۸	۹۰	سورہ بلد	۳۰
۶۱	سورہ صف	۲۸	۹۱	سورہ شمس	۳۰
۶۲	سورہ جمعہ	۲۸	۹۲	سورہ لیل	۳۰
۶۳	سورہ منافقون	۲۸	۹۳	سورہ ضحیٰ	۳۰
۶۴	سورہ تغابن	۲۸	۹۴	سورہ انشراح	۳۰
۶۵	سورہ طلاق	۲۸	۹۵	سورہ تین	۳۰
۶۶	سورہ تحریم	۲۸	۹۶	سورہ علق	۳۰
۶۷	سورہ ملک	۲۹	۹۷	سورہ قدر	۳۰
۶۸	سورہ قلم	۲۹	۹۸	سورہ بینہ	۳۰
۶۹	سورہ حاقہ	۲۹	۹۹	سورہ زلزال	۳۰
۷۰	سورہ معارج	۲۹	۱۰۰	سورہ عادیات	۳۰
۷۱	سورہ نوح	۲۹	۱۰۱	سورہ قارعہ	۳۰
۷۲	سورہ جن	۲۹	۱۰۲	سورہ تکاثر	۳۰
۷۳	سورہ مزمل	۲۹	۱۰۳	سورہ عصر	۳۰
۷۴	سورہ مدثر	۲۹	۱۰۴	سورہ ہمزہ	۳۰
۷۵	سورہ قیامہ	۲۹	۱۰۵	سورہ فیل	۳۰
۷۶	سورہ دہر	۲۹	۱۰۶	سورہ قریش	۳۰
۷۷	سورہ مرسلات	۲۹	۱۰۷	سورہ ماعون	۳۰
۷۸	سورہ نبأ	۳۰	۱۰۸	سورہ کوثر	۳۰
۷۹	سورہ نازعات	۳۰	۱۰۹	سورہ کافرون	۳۰
۸۰	سورہ عبس	۳۰	۱۱۰	سورہ نصر	۳۰
۸۱	سورہ کوّرت یا تکویر	۳۰	۱۱۱	سورہ لہب	۳۰
۸۲	سورہ انفطرت یا انفطار	۳۰	۱۱۲	سورہ اخلاص	۳۰
۸۳	سورہ مطففین	۳۰	۱۱۳	سورہ فلق	۳۰
۸۴	سورہ انشقت یا انشقاق	۳۰	۱۱۴	سورہ ناس	۳۰
۸۵	سورہ بروج	۳۰			
۸۶	سورہ طارق	۳۰			

تمت

القرآن الحکیم

مع ترجمہ و تفسیر

از

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، کراچی

سُورَةُ الفَاتِحَةِ

سورۂ فاتحہ

مکّی[۱] - ایک رکوع[۲] - ۷ آیتیں[۳] - ۲۵ لفظ[۴] - ۱۲۳ حرف[۵]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ

ساری تعریف[۱] اللہ کے لئے ہے[۱۰] (وہ) سارے جہان کا مُربّی[۱۱] (وہ) رحمٰن[۱۲]

الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳ اِيَّاكَ نَعْبُدُ

(وہ) رحیم[۱۳] (وہ) مالک روزِ جزا کا[۱۴] ہم بس تیری ہی عبادت

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

کرتے ہیں[۱۵] اور بس تجھی سے مدد چاہتے ہیں[۱۶] چلا ہم کو سیدھا

الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝

راستہ[۱۷] اُن لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام کیا ہے[۱۸]

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

نہ اُن لوگوں کا راستہ جو زیرِ غضب آچکے ہیں[۱۹] اور نہ بھٹکے ہوؤں کا[۲۰]

منزل ۱ ع

سُورَۃُ الفاتحۃ ۱؎ سورۃ کے لفظی معنی بلندی یا بلند منزل کے ہیں۔ السورۃ الرفعۃ (لسان) السورۃ المنزلۃ الرفیعۃ (راغب) جس طرح دُنیا کی دُوسری کتابیں مختلف بابوں میں تقسیم ہوتی ہیں، قرآن کے ہر باب کو سورۃ کہتے ہیں۔ گویا ہر سورۃ ایک بلند منزل کا نام ہے۔ وبھا سمیت السورۃ من القرآن لانہ مرتفعۃ (لسان) بہ سمیت سورۃ القرآن لاجلال ورفعتہ (تاج) سورۃ کے دوسرے معنی شہر پناہ کی دیوار کے بھی ہیں سور المدینۃ حائطہا (راغب) سورۂ قرآنی کو سورہ اس لئے بھی کہا جاتا ہے کہ گویا وہ فصیلِ شہر کی طرح اپنے مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ قرآن مجید کو مختلف سورتوں میں تقسیم وترتیب رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم خود فرما گئے تھے۔ آنحضورؐ ہی کے ارشاد کے مطابق ایک سورۃ شروع کی جاتی تھی اور دوسری ختم۔ کل قرآنی سُورتوں کی تعداد ۱۱۴ ہے۔ ۲؎ فاتحہ کے لفظی معنی ہیں ابتدا کرنے والی کے۔ قرآن مجید کی اس ابتدائی سورۃ کو بھی اسی لئے الفاتحہ کہتے ہیں۔ یہ گویا دیباچۂ قرآن ہے۔ سورتوں کے نام بھی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ اکثر ایک ایک سُورت کے کئی کئی نام روایت ہوتے ہیں۔ اس فاتحۃ الکتاب کے بھی متعدد نام احادیث میں آئے ہیں۔ سورۃ الشفاء سورۃ وافیہ، اُمّ القرآن وغیرہ قرطبی نے ۱۲ نام گنائے ہیں۔ مشہور ترین نام یہی الفاتحہ ہے۔ سورۃ کے فضائل سے احادیث لبریز ہیں۔ اہمیتِ خاص اسی سے ظاہر ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں اس کا پڑھنا واجب ہے۔ بلکہ شافعیہ کی تحقیق میں فرض ہے۔ کوئی نماز بغیر قرآن کے اس جزو کے مکمل نہیں ہوتی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ شیطان چار مرتبہ خاص طور پر رویا چلایا ہے، اور ان چار میں سے ایک موقع نزول سورۂ فاتحہ کا ہے۔ سورۂ فاتحہ گو صورۃً مختصر ہے، لیکن بلحاظ معنویت وجامعیت گویا دریا کوزہ میں بند ہے۔ منکرین ومخالفین تک اس کے ایجاز کے اعجاز کے قائل ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے۔ "حمدِ باری کی یہ زبردست مناجات ..... بلیس اتنی کہ مزید تشریح سے بے نیاز۔ اس پر بھی معنویت سے لبریز" (جلدہ ۱ صفحہ ۹۰۳ طبع یازدہم) ۳؎ قرآنی سورتوں کی ایک اہم تقسیم بہ لحاظ زمانۂ نزول کی گئی ہے۔ جو سُورتیں قبل ہجرت نبوی یعنی رسول اللہ صلعم کے زمانۂ قیام مکہ میں نازل ہوئیں، خواہ ان کا نزول حدودِ شہر مکہ سے باہر ہی ہُوا ہو مکّی کہلاتی ہیں۔ اور جو سُورتیں بعد ہجرت نبوی، یعنی زمانۂ قیام مدینہ میں نازل ہوئیں، وہ مدنی کہلاتی ہیں، خواہ ان کا نزول حدودِ شہر مدینہ سے باہر ہی ہُوا ہو۔ لیکن یہ تقسیم صرف عمومی حیثیت سے ہے۔ ورنہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مدنی سورت کے اندر مکّی آیتیں رکھا دی ہیں یا اس کے برعکس۔ ربطِ مضمون ومناسبتِ مقام کا صحیح تر ولطیف تر احساس رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر اور کس کو ہو سکتا تھا؛ اس لئے کسی متعین آیت کے باب میں اس کے مکّی یا مدنی ہونے کا فیصلہ جزم کے ساتھ کرنا دشوار ہے۔ روایتیں جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں، کوئی درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی نہیں ہیں۔ محض مفیدِ ظن ہیں۔ مفیدِ یقین نہیں۔ اور اس قسم کے عقلی وقیاسی معیار کہ مثلاً یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا سے شروع ہونے والی آیتیں لازمی طور پر مدنی ہونگی اور یٰاَیُّھَا النَّاسُ سے شروع ہونے والی لازمی طور پر مکّی، محض اکثری وتخمینی ہیں۔ کلّی اور قطعی نہیں۔ اور محض ان روایات ونظریات کے ماتحت کسی آیت پر جزم ووثوق کے ساتھ کوئی حکم لگا دینا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ قرآن مجید کی کسی جدید ترتیب پر اُسے ترتیبِ نزولی کا نام دے کر آمادہ ہو جانا بڑی ہی جسارت کا کام ہے۔ اصل میں یہ بلا مسیحیوں کے ہاں سے آئی ہے کہ انھیں نے اپنے ہاں کے قدیم وجدید دونوں صحیفوں کو اس قسم کی سراسر ظنّی بلکہ وہمی "تحقیقات" کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ ۴؎ سورۃ کے اندر کی ایک بڑی تقسیم کا نام رکوع ہے۔ بڑی سورتوں میں اکثر رکوع دس دس آیتوں پر رکھے گئے ہیں اور یہ اتنی مقدار ہے جو ایک رکعت میں بہ آسانی پڑھی جا سکتی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ پارہ ۳۰ کی ۳۴ چھوٹی سورتوں میں بھی کل ایک ہی ایک رکوع ہے۔ ۵؎ اٰیۃ کے لفظی معنی نشان کے ہیں۔ اصطلاح میں سورت کے اندر کی سب سے چھوٹی تقسیم کا نام ہے۔ ہر فقرہ جس میں کوئی حکم ہو، یا وہ ایک مستقل عبارت ہو ایک آیت ہے۔ وقیل لکل جملۃ من القرآن دالۃ علی حکم اٰیۃ (راغب) وقد یقال لکل کلام منہ منفصل بفصلٍ لفظی اٰیۃ (راغب) قرآن مجید کی کل آیتیں شمار کر لی گئی ہیں اور ان کی میزان بقولِ اصح ۶۶۱۶ ہے (اتقان) ۶؎ قرآن مجید کے کل الفاظ بھی شمار کر لئے گئے ہیں۔ اور ان کی میزان بقولِ اصح ۷۷٬۹۳۴ ہے (اتقان) ۷؎ کل حروفِ قرآنی بھی شمار کر لئے گئے ہیں، اور ان کی میزان بقولِ اصح ۳٬۲۳٬۶۷۰ ہے (اتقان) اللہ اللہ کلام الٰہی کے عاشق شیدائی کیسی کیسی دیدہ ریزیاں اس کے واسطے کر گئے ہیں! ۸؎ قرآن مجید کا یہ افتتاحی فقرہ بجز ایک سورت کے، ہر سُورت کی ابتدا میں دُہرایا گیا ہے، یعنی ۱۱۳ بار۔ اور سورۃ النمل کے اندر عبارت میں بطور آیتِ قرآنی بھی آیا ہے۔ اور اس لئے اس کے جزوِ قرآن ہونے نہ ہونے کی بابت تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ آیا ہر سُورت کی ابتدا میں بھی اس کی حیثیت بطور ایک مستقل آیت کے ہے یا امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے کہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ سورتوں کے درمیان محض بطور علامتِ فرق وتمیز کے اور شروع میں بطور افتتاحی فقرہ کے ہے۔ امام مالکؒ بھی اسی مسلک سے متفق ہیں۔ قال مالک وابو حنیفۃ لیست فی اوائل السورۃ باٰیۃ وانما ھی استفتاح لیعلم بھا مبدءھا (ابن العربی) مفصل بحث جصاص رازی حنفی کی احکام القرآن میں موجود ہے۔ ہر جائز کام کی ابتدا بسم اللہ سے کرنے کی بڑی فضیلتیں حدیث میں وارد ہوئی ہیں۔ اور خود رسول اللہ صلعم کی عادتِ مبارک یہی تھی کہ کھانا کھاتے، پانی پیتے، وضو کرتے، جانور ذبح کرتے، غرض اس قسم کے سارے کاموں کی ابتدا بسم اللہ ہی سے کرتے۔ اور یہ بھی یہی کہ جو شخص کسی کام کو خدائے رحمٰن ورحیم کا نام لے کر شروع کرتا ہے، وہ عملاً اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ میرا ضمیر پاک ہے، میری نیت مخلصانہ ہے، میرا مقصد اعلیٰ ہے، اور میں توحید کا پرستار ہوں۔ ایک طرف شرک سے اور دوسری طرف الحاد سے بیزار۔ غرض بسم اللہ سے بڑھ کر قوت بخش اور اس سے زیادہ رُوح واخلاق کو بلند کرنے والا ذکر کوئی اور نہیں۔ بسم اللہ کی ب نحویوں کی اصطلاح میں باء الاستعانت کہلاتی ہے۔ پڑھنے والا گویا یُوں کہتا ہے کہ میں شروع کرتا ہوں اس کلام کو اللہ کے نام سے مدد چاہتے ہُوئے۔ اور یہ کہ بسم اللہ خواں اپنی اور سب کی طرف سے قطع نظر کر کے تکیہ کر لیتا ہے اللہ کی ذات اور اس کی صفاتِ رحمانیت ورحیمیت پر۔ ۹؎ اللہ خدا کے لئے اسمِ ذات ہے۔ کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی کے خدا یا انگریزی کے گاڈ کی طرح اسمِ نکرہ نہیں کہ معبودِ واحد کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی بولا جا سکے۔ اس کی نہ جمع آتی ہے، نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے۔ اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔ علمٌ للذات واجب الوجود المستجمع بجمیع صفات الکمال غیر مشتق (تاج) لم یُسَمَّ بہ غیرہ تبارک وتعالٰی ولھذا لایعرف فی کلام العرب لہ اشتقاق من فعل یفعل (ابن کثیر) رحمٰن کا صحیح ترجمہ دشوار ہے۔ مصدر رحمۃ سے صیغۂ مبالغہ ہے فعلان کے وزن پر۔ زیادتی صفت کے لئے جس کے بعد زیادتی کا کوئی درجہ نہ ہو۔ معناہ عند اھل اللغۃ ذو الرحمۃ التی لاغایۃ بعدھا فی الرحمۃ (تاج) صِبا لغۃ فعلان مثل غضبان وسکران من حیث الامتلاء والغلبۃ (بحر) اسم ذات اللہ کی طرح اسمِ صفت، رحمٰن کا اطلاق بھی صرف ذاتِ باری ہی پر ہوتا ہے۔ ولا یطلق الرحمٰن، الا علی اللہ تعالٰی (راغب) اسم مختص باللہ لایجوز ان یسمی بہ غیرہ (تاج) یہ بات اتفاقی نہیں بہت پُرمعنی ہے کہ قرآن مجید میں اسمِ ذات کے بعد جو سب سے پہلا اسمِ صفاتی ارشاد ہوا ہے وہ صفتِ رحمانیت کا مظہر ہے۔ لین پول (Lane-Poole) انگریز اسی لئے اپنے ہم قوموں کو متنبہ کر

کہتا ہے کہ **سگ** یہ بات برابر بھول جاتے ہیں کہ قرآن کے اندر وصفِ رحمت پر کتنا زور دیا گیا ہے"۔ **رحیم** بھی اسم صفت صیغۂ مبالغہ ہے۔ فعیل کے وزن پر تکرار و تواتر کے اظہار کے لئے۔ مبالغۃ الفعیل من حیث التکرار گویا صفت رحمت و شفقت کی انتہائی قوت کا اظہار رحمٰن سے ہو رہا ہے اور انتہائی کثرت کا رحیم سے۔ اس فرق کے اظہار کے لئے رحمٰن کا ترجمہ "نہایت رحم کرنے والا" اور رحیم کا ترجمہ "بار بار رحم کرنے والے" سے کیا گیا ہے۔ رحمٰن یعنی شانِ کرم کا عموم ہے مومن و کافر سب کے لئے۔ اور اسی لئے اس کا ظہور اسی دنیا میں بھی ہو رہا ہے۔ رحیم میں تجلی رحمت و مغفرت کا خصوص ہے اہلِ ایمان کے ساتھ۔ اس لئے اس کا پورا ظہور آخرت ہی میں ہوگا۔ اور اسی معنی میں یہ حدیث صحیح مسلم میں صحابی ابن مسعودؓ کے واسطہ سے آئی ہے کہ الرحمٰن رحمٰن الدنیا والرحیم رحیم الاٰخرۃ۔ اور اسی معنی میں جعفر صادقؒ کا بھی یہ قول نقل ہوا ہے۔ الرحمٰن اسم خاص لصفۃ عامۃ والرحیم اسم عام لصفۃ الخاصۃ (ج) صوفیانہ مذاق پر ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ رحمانیت وہ تربیت ہے جو ذرائع و وسائط کے ساتھ ہو، اور رحیمیت وہ تربیت ہے جو براہ راست و بلا واسطہ ہو۔ رحمانیت وہ شفقت ہے جو طبیب مریض کے ساتھ رکھتا ہے۔ اور رحیمیت شفقتِ محض ہے (روح)۔ اسلام کے اس خالص توحیدی کلمہ کے مقابلہ میں اب مسیحیت کا فقرۂ افتتاحیہ ملاحظہ ہو۔ "شروع باپ بیٹے اور رُوح القدس کے نام سے" کوئی نسبت اس شرکِ جلی کو اسلام کی توحید خالص سے ہے؟ راقم آثمؔ کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ عجب نہیں جو خالق اکبر کی یہی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت ہی مسخ ہو کر مسیحیت میں بیٹا اور رُوح القدس بن گئی ہوں۔ **ــــه** الحمد میں ال کلمۂ استغراق ہے۔ یعنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ

الف لام میم یہ کتاب اس میں کوئی شبہ نہیں

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

ہدایت ہے (اللہ سے) ڈر رکھنے والوں کے لئے جو غیب پر ایمان رکھتے

بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انکو دیا ہے اس میں سے

يُنْفِقُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

خرچ کرتے رہتے ہیں اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر اُتارا گیا ہے

اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ

اور (اس پر) جو آپ سے قبل اُتارا گیا ہے اور آخرت پر بھی

منزل ۱

جمیع حمد۔ کوئی سی بھی ہو، کسی قسم کی بھی ہو، بظاہر کسی کے لئے بھی ہو۔ حمد کا درجہ لغوی اعتبار سے، مدح اور شکر دونوں سے بلند تر ہے۔ شکر تو کسی متعین ہی نعمت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور مدح میں ممدوح کی خوبیوں کا ارادی و اختیاری ہونا ضروری نہیں۔ صرف حمد ہی ایسی چیز ہے، جو محمود کی عام اختیاری خوبیوں اور فضیلتوں کی بنا پر کی جاتی ہے (راغب) فی کلام العرب معناہ الثناء الکامل (قرطبی) گویا قرآن مجید کی سب سے پہلی تعلیم توحید کے جملہ اصناف کی جامع ہے۔ مدح اور تعریف کسی کی بھی ہو، کسی کے نام سے بھی ہو، درحقیقت صرف اللہ ہی کی ہوتی ہے، اور اسی کو پہنچتی ہے۔ الالف واللام فی الحمد لاستغراق جمیع اجناس الحمد للہ تعالیٰ (ابن کثیر) اور یہی معنی ہیں اس حدیثِ نبوی کے بھی کہ اللّٰھم لک الحمد کلہ ولک الملک کلہ وبیدک الخیر کلہ والیک یرجع الامر کلہ۔ حاکم اگر عادل ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے صفتِ عدل اس کے اندر رکھ دی ہے۔ طبیب اگر حاذق ہے تو اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اللہ نے اسے یہ کمال عطا کر دیا ہے۔ کسی کی شکل جمیل ہے اور کسی کی سیرت پاکیزہ ہے تو، ہر موقع پر مدح و ثنا، تعریف و ستائش کی اصل مستحق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ ع ہر جا کنیم سجدہ بآں آستاں رسد

ــــه رب، جو یہاں بطور اسم استعمال ہوا ہے، مصدر ہے تربیت کے معنی میں۔ اور تربیت کے معنی ہیں کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دیتے رہنا۔ تاآنکہ وہ حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ ھو انشاء الشیء حالاً فحالاً الی حد التمام (راغب) وھی تبلیغ الشیء الی کمالہ شیئاً فشیئاً (بیضاوی) الرب المصلح والمدبر والجابر والقائم یقال لمن قام باصلاح شیء واتمامہ (قرطبی) اُردو میں اس کا ترجمہ پروردگار سے بھی صحیح ہے۔ لیکن قریب ترین لفظ اس مفہوم کے لئے "مربیّ" کا ہے، اور یہی ترجمہ تھانوی مدظلہ نے اختیار کیا ہے۔ عربی میں اس کا اطلاق مطلق اور بلا اضافت صورت میں صرف حق تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ ولا یقال الرب مطلقاً الا للہ تعالیٰ (راغب) ولا یستعمل الرب لغیر اللہ بل بالاضافۃ (ابن کثیر) صفاتِ رحمانیت و رحیمیت کے معاً بعد اب اللہ کی صفت ربوبیت کا اظہار ہے۔ مسیحیوں کے "آسمانی باپ" سے کہیں زیادہ شفقت، کہیں زیادہ قدرت، کہیں زیادہ حکمت لفظ رب سے عیاں ہے۔ عالمین عالم کا لفظ خود اسم جمع ہے کوئی اس کا واحد نہیں آتا۔ اور مرادف ہے خلقت یا موجودات کے۔ العالم الخلق کلہ (لسان) عالمون بصیغۂ جمع کے معنی ہوئے ہر ہر صنفِ موجودات اور سارے سلسلۂ کائنات کے۔ والعالمون اصناف الخلق (لسان) رب العالمین کا لفظ لا کر قرآن مجید نے گویا بتا دیا کہ ہر صنفِ موجودات کا ایک مستقل نظامِ تربیت ہے۔ اور سب کا آخری سرا اسی قادرِ مطلق واحد یکتا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی صنفِ موجودات اس کے ہمہ گیر نظامِ ربوبیت و تربیت سے آزاد و مستثنیٰ نہیں۔ یہ تعلیم بھی اسی ایک لفظ سے مل گئی کہ اسلام کا خدا کسی مخصوص نسل مخصوص قوم مخصوص قبیلہ کا خدا نہیں۔ یہ حقیقت تاریخ مذاہب میں نہایت درجہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام سے قبل مذاہب جس صورت میں موجود تھے وہ اس وسیع تخیل ہی سے آشنا نہیں رہے تھے۔ ہر قوم خدا کو صرف اپنا خدا تسلیم کرتی تھی۔ گویا خدا کی حیثیت محض قومی خدا کی رہ گئی تھی۔ بابل، مصر، ہند، یونان، روما، عرب وغیرہ کی مشرک قوموں کا ذکر نہیں، بنی اسرائیل جیسی موحد قوم بھی خدا کے خدائے کائنات ہونے کی پوری طرح قائل نہیں رہی تھی۔ قرآن نے ایک لفظ رب العالمین لا کر ان سارے مشرکانہ و کافرانہ عقائد کی تردید کر دی۔ مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفتِ ربوبیت ہی کے سمجھنے میں لگی ہے۔ اسی لئے قرآن نے تصحیح میں بھی اسی کو مقدم رکھا۔ علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ کلمۂ الحمد للہ رب العالمین تمام کلموں سے افضل و اشرف ہے۔ یہاں تک کہ لا الٰہ الا اللہ سے بھی۔ اس لئے کہ اس میں صرف توحید ہے، اور اس میں توحید کے ساتھ حمد بھی (قرطبی)

ــــه ۱۲ (جو دنیا میں سب کو رزق دے رہا ہے، سب کو راحت پہنچا رہا ہے۔ نفع رسانی کا دروازہ سب کے لئے کھولے ہوئے ہے) الرحمٰن العاطف علی البر والفاجر بالرزق لھم ودفع الآفات عنھم (ابن عباسؓ) نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۹۔ **ــــه ۱۳** (جو آخرت میں مومنین کو اجر ان کے استحقاق سے بہت زائد دے گا) الرحیم خاصۃ علی المؤمنین بالمغفرۃ وادخالھم بالجنۃ (ابن عباسؓ) نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۹۔ صفات کے بیان میں صفتِ ربوبیت کو سب سے پہلے لانا اور اس کے معاً بعد صفاتِ رحمانیت و رحیمیت پر زور دینا خود اس امر کی ایک واضح شہادت ہے کہ عقائدِ اسلام میں ان صفات کا مرتبہ کتنا بلند اور ان کا درجہ کیسا اہم ہے۔ ان تصریحات کی موجودگی میں اور ان کی تکرار کے باوجود مسیحی پادریوں کا یہ کہے جانا کہ اسلام کا خدا صرف قوت اور قہرمانی کا خدا ہے، حقیقت پر کیسا ظلم کرنا ہے۔ **ــــه ۱۴** مالک۔ حاکم یا قاضی خواہ کیسے ہی وسیع اختیارات رکھتا ہو بہرحال اس کے اختیارات محدود ہی ہوتے ہیں، اور وہ مجرم کو حسبِ ضابطہ سزا دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ گویا خود حاکم پر حکومت ضابطہ یا قانون کی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مالک وہ ہوتا ہے جسے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ مجرم کو چاہے وہ بخش دے، چاہے سزا دے۔ کوئی اس سے بازپرس کرنے والا اور کوئی اس پر حاکم نہیں۔ حدیث مسلم میں آچکا ہے کہ لا مالک الا اللہ عزوجل (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی مالک نہیں) اور محققین کا قول بھی ایسا ہی ہے کہ بجز اللہ کے کسی کو مالک کہنا یا پکارنا جائز نہیں لا یجوز ان تسمی احد بھذا الاسم ولا یدعی بہ الا اللہ تعالیٰ (قرطبی) لفظ کا فارسی ترجمہ بھی اسی لئے سفیان تابعی سے "شہنشاہ" مروی ہے قال سفیان مثل شاھان شاہ (قرطبی) اور مفسرین نے بھی معنی مطلق الاختیار کے لئے ہیں۔ المالک

هو المتصرف فی الاعیان المملوکۃ کیف یشاء من الملک (بیضاوی) ہندوستان کی بعض مشہور مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ[۱۴] قانونِ مکافاتِ عمل (ہندی اصطلاح میں "کرم") کے خلاف خدا بھی نہیں جا سکتا۔ اور کسی خطا کو معاف نہیں کر سکتا۔ مسیحیوں کا بھی عقیدہ ہے کہ خدا انصاف کرنے پر مجبور ہے۔ اور اسی لئے صفتِ عفو و رحم کے اظہار کے لئے اُسے اپنے اکلوتے "بیٹے" کو بطور کفارہ کے سب گنہگار مخلوق کی طرف سے پیش کرنا پڑا۔ قرآن مجید کے ایک لفظ مالک میں ان سب باطل عقاید کی تردید آگئی۔ یوم الدین۔ دین کے لفظی معنی جزا یا بدلہ کے ہیں۔ الدین الجزاء۔ اور قیامت کو بھی روزِ جزا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پورے حساب اور ہر عمل کے بدلہ کا دن ہوگا۔ یہاں بھی یوم الدین سے مراد روزِ حشر ہے۔ یوم حساب الخلائق وهو یوم القیمۃ یدینهم باعمالهم (ابن جریر عن ابن عباس) اے یوم البعث والجزاء (کبیر) اللہ تعالیٰ مالک تو آج بھی ہے۔ روزِ جزا کے ساتھ تخصیص کا مطلب یہ ہے کہ اس روز اس کی صفتِ مالکیت کا مشاہدہ و تحقق بڑے سے بڑے منکر کو بھی ہو کر رہے گا۔ ۱۵ (نہ کسی اور کی)، اے اللہ! ایّاک لفظ ایّا خود ہی حصر اور تخصیص کے لئے آتا ہے۔ اور بہ حیثیت مفعول اس کی تقدیم فعل نعبد پر اس حصر و تخصیص کو اور زیادہ مؤکد کر رہی ہے یعنی ہم تیری عبادت میں شائبہ بھی کسی کی شرکت کا نہیں رکھتے۔ معناہ نعبدک ولا نعبد غیرک (ابن عباس) وقدم المفعول للتعظیم والاهتمام به والدلالۃ علی الحصر (بیضاوی) اب یہاں سے دعا کی تعلیم ہے گویا بندے اپنی زبان سے دعا کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے صرف تمہیدِ دعا تھی۔ صیغۂ غائب سے صیغۂ مخاطب، یا مخاطب سے غائب کی طرف دفعۃً انتقال کا نام صنعتِ التفات ہے۔ اور عربی ادب و انشا میں یہ عیب نہیں۔ اس کا شمار بہترین صنعتوں میں سے ہے۔ صاحب کشاف نے اس موقع پر امرؤ القیس جاہلی کے تین شعر شہادۃً نقل کئے ہیں، تینوں میں یہ صنعت موجود ہے۔ بزرگوں سے منقول ہے کہ قرآن مجید کا لب لباب سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا لب لباب یہ آیت ہے۔ قال بعض السلف الفاتحۃ سر القرآن وسرها هذه الکلمۃ (ابن کثیر) نعبد۔ عبادت نام ہے تذلل، انکسار و افتقار کے آخری مرتبہ کا۔ انها غایۃ التذلل (راغب) العبادۃ اقصی غایۃ الخضوع والتذلل (کشاف) اور اسی لئے اس کا مستحق بجز ذاتِ باری تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ لم تستعمل الا فی الخضوع للہ تعالیٰ (کشاف) ولا یستحقها الا من له غایۃ الافضال وهو اللہ تعالیٰ (راغب) مشرک قومیں خدا معلوم چھوٹے بڑے کتنے دیوی دیوتاؤں کو عبادت میں شریک کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ ان کی عبادتوں میں تو خدا کی شرکت رہنے بھی نہیں پاتی۔ معبود تمام تر اگنی دیوتا اور سورج دیوتا اور کالی مائی اور لچھمی جی وغیرہ بن جاتی ہیں۔ مسیحیوں کے ہاں بھی نماز جیسی اور جب کبھی بھی ہوتی ہے، اس میں برابر خدا کے ساتھ فرزندِ خدا کی شرکت رہتی ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ آیت کے ایک لفظ ایّاک سے تردید ہو گئی سارے مذہبوں کے مشرکانہ طرزِ عبادت کی۔ نعبد کا صیغۂ جمع بھی قابلِ لحاظ ہے۔ دعا تنہا ایک فرد نہیں کر رہا ہے۔ ساری ملتِ اسلامیہ مل کر اجتماعی رنگ میں کر رہی ہے۔ اور یہ اجتماعیت کی اہمیت قرآن و حدیث دونوں کی دعاؤں میں کثرت سے جلوہ گر ہے۔ مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ نسبتِ عبدیت سالک کے مقام کی انتہا ہے۔ کوئی مقام اس سے مافوق نہیں۔ ۱۶ (نہ کسی اور سے)، اے حاجت روا سمجھ کر اے اللہ! آیت کے جزو اول میں بیزاری اور تبری ہے شرک سے۔ اس آخری جزو میں بندہ کی زبان سے اقرار ہے اپنی بے بساطی اور بے قدرتی کا۔ اور اقرار ہے اپنے کو حفاظت اور نصرت کے لئے ہر طرح اللہ کے ہاتھ میں سپرد کر دینے کا۔ فالاول تبرؤ من الشرک والثانی تبرؤ من الحول والقوۃ وتفویض الی اللہ عز وجل (ابن کثیر) نعبد کے معاً بعد نستعین لانا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق، تیری ہی اعانت، تیری ہی دستگیری کے محتاج ہیں۔ ایّاک کی تکرار توحید اور ردِّ شرک کی اہمیت کو اور دوبالا کر رہی ہے۔ کرر للاهتمام والحصر (ابن کثیر) کرر الضمیر للتنصیص علی انه المستعان به لا غیر (بیضاوی) آیت نے جڑ کاٹ دی ہے ہر قسم کی مظہر پرستی اور مخلوق پرستی کی۔ شرک کی خفی سے خفی بھی راہیں بند کر دی ہیں، اور کوئی خفیف سی بھی گنجائش پیر پرستی، پیمبر پرستی، فرشتہ پرستی وغیرہ کی باقی نہیں چھوڑی ہے۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ سالک کا مقام ایّاک نعبد پر تمام ہو جاتا ہے۔ ایّاک نستعین سے وہ طالب تمکین و رسوخ کا ہوتا ہے۔ ۱۷ یعنی وہ راہ جس میں کوئی کجی نہیں، کوئی اونچ نیچ نہیں، کہیں ٹھوکر لگنے کا احتمال نہیں۔ مراد اس سے جادۂ شریعت ہے کہ یہی زندگی کا مکمل نظام ہے۔ زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبہ کے باب میں ایک مکمل دستورِ ہدایت ہے۔ اور اسی پر چلتے رہنا فرد و جماعت دونوں کے حق میں، دنیوی و اخروی اعتبار سے فلاح ہی فلاح ہے۔ صحابہ، تابعین سب سے یہی معنی مروی ہیں۔ هو دین اللہ الذی لا عوج له (ابن جریر عن ابن عباس) قال ابن عباس وجابر هو الاسلام وهو قول مقاتل (معالم) یہ گویا بندوں کی زبان سے درخواست ہے کہ لے ہمارے ہادیِ برحق و رہنمائے حقیقی، اپنا سیدھا راستہ ہم پر کھول دے۔ اس پر چلنے کی ہمیں توفیق عطا فرما، اور اپنے فضل و کرم کو ہمارا دستگیر رکھ۔ طلبِ ہدایت کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ راہرو بھٹکا ہوا ہے اور وہ راستہ دریافت کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ راہ تو مل چکی ہے، درخواست اسی پر قائم رہنے کی ہے۔ یہاں مراد یہی دوسری قسم کی دستگیری ہے۔ اے وفقنا الثبات علیه (ابن جریر عن ابن عباس) اهدنا ثبتنا (کشاف عن علی و ابی) جو پہلے ہی سے ہدایت یاب ہیں، ان کی طرف سے یہ درخواست ہدایت پر ثبات و استقامت اور مزید ہدایت کی ہے۔ اور چونکہ روحانی ترقیوں کی انتہا نہیں اس لئے جو جس مرتبہ پر ہے اس کی دعا اس سے بھی بلند تر مرتبہ کی رہتی ہے۔ اور مومن کی ہوسِ ہدایت طلبی کبھی نہیں بجھتی۔ یہ اعتراض محض طفلانہ ہے کہ ہدایت یاب کو درخواستِ ہدایت کی ضرورت نہیں۔ نعبد، نستعین، اهدنا سب میں ضمیر متکلم کا صیغۂ جمع میں آنا بہت ہی پُر معنی ہے۔ ظاہر ہے کہ اظہارِ عبودیت کرنے والا اپنی اپنی جگہ پر فردِ واحد ہی ہوگا۔ اس پر بھی یہ التزام ہے کہ فرد کا ربط امت سے کسی حال میں بھی نہ چھوٹنے پائے۔ عبادت کرتے ہیں تو ایک "میں" نہیں بلکہ "ہم سب"، طلبِ اعانت کرتے ہیں تو "ہم سب"، درخواستِ ہدایت کرتے ہیں تو "ہم سب"۔ امت و ملت کی یہ زبردست وحدتی شیرازہ بندی اسلام ہی کا حصہ ہے۔ مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ مطلوب و مقصود صراطِ مستقیم تشریعی ہے نہ کہ تکوینی جو ساری مخلوق کے لئے خود بخود عام ہے۔ ۱۸ (یا بہ ہدایت ہیں) یہ مزید شرح و تفسیر ہو اسی سیدھے راستہ یا صراطِ مستقیم کی۔ ساری تعلیمات و ہدایات تو ساری کی ساری قرآن مجید کے لفظ و عبارت میں آگئیں۔ لیکن مشیتِ الٰہی نے مزید شفقت و کرم سے ان تعلیمات و ہدایات کے عملی نمونے بھی انسانی روح و قالب میں بشری صورت و سیرت میں بہ کثرت بھیج دیئے کہ اس صراطِ مستقیم پر چلنا اور زیادہ آسان ہو جائے۔ یہ انعام پائے ہوئے لوگ انبیاء و مرسلین ہیں۔ ان کی زندگی کے واقعات و حالات قرآن مجید میں بہ کثرت نقل ہوئے ہیں۔ اور ان میں بھی علی الخصوص اس پاکیزہ جماعت کے پاکیزہ ترین سردار محمد رسول اللہ صلعم۔ آپ کی سیرتِ مبارکہ کا ایک ایک جزئیہ تک محفوظ ہے۔ پھر اس کے بعد آپ کے جو صحیح نائب و جانشین آپ کے معاً بعد ہوئے ہیں، اور پھر ہر دور میں ہوتے آئے ہیں۔ یعنی اولیائے امت یا صدیقین، یا پھر شہیدانِ راہِ حق اور عام صالحین کہ یہ بھی اپنے اپنے درجہ میں نمونہ کا کام اپنے بعد آنے والوں کے لئے دے سکتے ہیں۔ خود قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ ان انعام پائے ہوؤں کی فہرست کے خاص خاص عنوانات گنا دیئے ہیں۔ ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین (سورۃ النساء) انعمت علیهم کے لفظ سے امام ابن جریر نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جن لوگوں کو یہ مرتبہ نصیب ہوا ہے اس کی تہ میں اصل شے محض انعامِ الٰہی و فضلِ خداوندی ہے۔ وفی هذه الآیۃ دلیل واضح علی ان طاعۃ اللہ جل ثناؤه لا ینالها المطیعون الا بانعام اللہ بها علیهم وتوفیقه ایاهم لها۔ مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ الذین انعمت علیهم سے اشارہ اس طرف ہو گیا کہ صراطِ مستقیم میسر نہیں ہوتا بغیر اس کے کہ پیروی اہلِ صراطِ مستقیم کی کی جائے۔ اور اس کے لئے محض اوراق و کتب کافی نہیں۔

۱۹ (اپنی دانست و ارادی کج روی کی بدولت) غیر المغضوب علیهم کی تقدیرِ کلام غیر صراط المغضوب علیهم ہے۔ صرف مضاف الیہ بیان کیا گیا، اور مضاف محذوف ہے۔ عربی ادب و انشا میں حذفِ موصوف، حذفِ مضاف کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ صرف صفت یا صرف مضاف الیہ بول کر کام چلا لیا جاتا ہے۔ اور ایسا حذف قرینۂ مقام سے بے تکلف سمجھ لیا جاتا ہے۔ اکتفی بالمضاف الیه عن ذکر المضاف وقد دل علیه سیاق الکلام (ابن کثیر) "زیرِ غضب" سے مراد زیرِ غضبِ الٰہی ہے۔ انعامِ الٰہی کا ذکر ابھی اوپر آ چکا ہے۔ وہاں صیغۂ معروف استعمال ہوا تھا اور ضمیرِ فاعل صریح تھی۔ یہاں غضب کے موقع پر صیغۂ مجہول کر دیا گیا ہے۔ اور فاعل کی کوئی صراحت نہیں۔ یہ اثر ہے غلبۂ رحمتِ الٰہی کا۔ غضبِ الٰہی کا ذکر اگلے آسمانی نوشتوں میں صراحت کے ساتھ ہے۔ توریت میں بھی اور انجیل میں بھی۔ توریت میں ہے کہ "اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کر دوں" (خروج ۳۲: ۱۱) نیز خروج ۳۲: ۱۲، ۱۳ و استثنا ۹: ۲۰ و ۲۱ وغیرہ۔ انجیل کو عام طور پر سرتاسر حلم و رأفت و شفقت کا صحیفہ سمجھا گیا ہے، وہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں۔ ملاحظہ ہو متی ۳: ۷، ۱۰ و مکاشفہ ۱۹: ۱۵ وغیرہ۔ حیرت ہے کہ بعض جدید اہل قلم نے مسیحی پادریوں کے دجل و تلبیس سے متاثر بلکہ مرعوب ہو کر اسلام میں غضبِ الٰہی کے وجود ہی سے انکار کر دینا چاہا ہے۔ گویا حق سبحانہ تعالیٰ ان کم فہموں کے خیال میں ایک بڑے پیمانہ پر کوئی سادھو، سنیاسی مہاتما ہیں کہ جو بدبخت چاہے، اُن کے بنائے اور آئے ہوئے قوانین کو جو سرتاسر بندوں ہی کے نفع و مصلحت، فلاح و بہبود کے لئے ہیں، آزادی و بے تکلفی سے توڑتا پھوڑتا، چیرتا پھاڑتا رہے، اور وہ اہنسا اور شانتی کے ساتھ صبر و خاموشی کے ساتھ جمود و تعطل کے ساتھ سارا تماشا دیکھتا رہے۔ اور اصلاحِ حال کے لئے اپنی غیر محدود قوت اور نامتناہی توانائی کو حرکت میں لائے، اور نہ دفعِ فساد کے لئے کوئی عملی اقدام کرے! پادریوں کے اعتراض کی اصل بنیاد ہی غلط ہے۔ انہوں نے غضبِ الٰہی کو بھی قیاس کیا انسانی غصہ اور طیش پر جو ہیجان ہوتا ہے نفس کی ایک انفعالی کیفیت کا۔ حق تعالیٰ پاک ہے ہر قسم کے انفعال و تاثر سے۔ وہ صرف فاعل ہے۔ تمام تر مؤثر ہے۔ اس کے اصلاحی اقدامِ عمل، اس کی تعزیری حرکتِ ارادی کا نام بندوں کی زبان میں غضبِ الٰہی ہے۔ اس کی کمالِ قوت، مرتبۂ شفقت دونوں کا عین مقتضی یہی ہے کہ وہ گنہگاروں، باغیوں، مجرموں کو ان کے جرم و بغاوت کے آخری عملی نتائج تک پہنچائے۔ اس کا غیظ و غضب درحقیقت تتمہ و ضمیمہ ہے اُس کی رحمتِ بے حساب کا، اور لازمی نتیجہ ہے اس کی شفقتِ بے کراں کا۔ اہلِ تفسیر عموماً اس طرف گئے ہیں کہ المغضوب علیهم سے مراد یہود ہیں۔ احادیث و آثار بھی اسی کی تائید میں ہیں۔ اور آیۂ کریمہ مَن لعنه اللہ وغضب علیه کے لفظ سے بھی یہی استنباط کیا گیا ہے۔ لیکن ایک گروہ نے مشرکین مراد لی ہے۔ عجب نہیں کہ آیت ان سب کے حق میں عام ہو جو ازراہِ شرارت و خبثِ نفس حق کی مخالفت دیدہ و دانستہ کرتے رہتے ہیں۔ ۲۰ یعنی ان کی راہ بھی نہیں جو اپنی غفلت، بے التفاتی، نادانی کی بنا پر حق کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے۔ اہلِ تفسیر عموماً اس طرف گئے ہیں کہ الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ حدیث و آثار بھی اسی کی تائید میں ہیں۔ اور آیۂ کریمہ قد ضلوا من قبل واضلوا کثیرا کے لفظ سے بھی یہی استنباط کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغضوب علیهم اور ضالین کے مصداقوں کو حصر انہیں دو مذہب والوں کے ساتھ کر دینا مشکل ہے جو کھلے ہوئے مشرکین و ملحدین ہیں، ظاہر ہے کہ وہ ضلالت میں ان سے بھی بڑھے ہوئے اور غضبِ الٰہی کے ان سے مستحق تر ہیں۔

محقق رازی کی رائے میں نتیجہ یہ ہے کہ کل عملی غلطیوں والوں کو زمرۂ مغضوب علیہم میں رکھا جائے اور کل اعتقادی غلطیوں والوں کا شمار طبقۂ ضالین میں کیا جائے۔ فالاولی ان یحمل المغضوب علیھم علی کل من اخطأ فی الاعمال الظاھرۃ وھم الفساق ویحمل الضآلون علی کل من اخطأ فی الاعتقاد لان اللفظ العام والتقیید خلاف الاصل (کبیر) سُورت کے خاتمہ پر آمین کہنا مستحب ہے۔ آمین خود ایک دعا ہے۔ اس کے معنی ہیں استجب۔ یعنی اے رب قبول فرما! یعنی آمین عند اکثر اھل العلم اللّٰھم استجب لنا (قرطبی)

تذییل

یہ خوش عقیدگی نہیں اظہارِ حقیقت ہے کہ جس حیرت انگیز ایجاز و جامعیت کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی سات مختصر آیتوں میں توحید الٰہی اور صفاتِ کمالیہ کا بیان آگیا ہے، اس کی نظیر سے مذاہبِ عالم کے دفتر خالی ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر تو کیا اس کے برابر کی بھی مثال پیش کرنے سے دنیائے مذاہب عاجز ہے۔ مسیحی دنیا کو بڑا ناز اپنی انجیلی دعا Lord's Prayer پر ہے لیکن اول تو اس کا منتسب و اسناد بھی خود مسیحی فاضلوں کو مسلّم ہے یعنی اسی کی تحقیق نہیں کہ الفاظ خود حضرت مسیح کے ہیں بھی۔ پھر جو کچھ جہاں سے بھی آئی ہو یہاں اس کے الفاظ سورۂ فاتحہ کے بالمقابل درج کئے جاتے ہیں۔ ہر منصف مزاج خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن کی فاتحۃ الکتاب اور اس انجیلی دعا کے درمیان کیا نسبت ہے!

سورۃ الفاتحہ

ا۔ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے (جو) سارے جہانوں کا مربی۔
۲۔ (وہ) نہایت رحم کرنے والا (وہ) بار بار رحم کرنے والا
۳۔ (وہ) مالک روز جزا کا۔
۴۔ ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔
۵۔ چلا ہم کو سیدھا راستہ
۶۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام کیا ہے۔
۷۔ نہ ان کا راستہ جو زیر غضب ہیں اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔

انجیلی دُعا (متی ۶: ۹-۱۳)

ا۔ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے
×
۲۔ تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔
×
۳۔ ہماری روز کی روٹی ہمیں آج دے۔ اور
۴۔ جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے قرض ہم کو معاف کر۔
۵۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ برائی سے بچا۔

(۱) کہاں رب العالمین کی لامحدود وسعت و ہمہ گیری اور کہاں آسمان پر بیٹھے رہنے والی بعید اور محدود، اور پھر باپ جیسی محض مادی تعلق رکھنے والی ہستی! (۲) ایک طرف اعلان ہو رہا ہے ہمہ گیر صفاتِ ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت و مالکیت کا۔ اور دوسری طرف ان کی بجائے ذکر ہے صرف زمین پر آسمانی بادشاہت کے آنے کا! (۳) توحیدِ خالص پر جو زور قرآنی عبارت میں، منع عبادت غیر و منع استعانت بالغیر میں ہے۔ انجیلی دُعا میں کہیں اس کا پتہ تک نہیں (۴) انجیلی دعا کی آیت نمبر ۳ میں روٹی کی اس درجہ اہمیت ادبیت کی تمنا ہے۔ (۵) محض برائی سے بچنے کی دُعا، صراط مستقیم پر قائم رہنے کی نسبت سے کہیں زیادہ ہلکی ہے۔

سورۃ البقرۃ ۱؎ سورت کے اور بھی متعدد نام ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور نام یہی ہے۔ بقرہ کے لفظی معنی گائے کے ہیں اور بیل کے بھی۔ لفظ بقرہ سورۃ کے آٹھویں رکوع میں آیا ہے، اور وہیں ایک قصہ بھی اس سے تعلق درج ہے۔ سورت کا نام بھی اسی مناسبت سے پڑا۔ بزرگ و معظم تو ہر سورت قرآن کی ہے لیکن اس سورت کا شمار بزرگ ترین سورتوں میں ہے۔ عقائد و اعمال دونوں کے باب میں اسلام کی اہم ترین تعلیمات کہنا چاہیئے کہ سب کی سب اس کے اندر آگئی ہیں۔ اور یہ جو بعض روایتوں میں آیا ہے کہ فلاں فلاں صحابی کو اس کے سیکھنے اور حاصل کرنے میں کئی کئی سال لگ گئے، تو یہاں سیکھنے سے مراد محض تلاوت یا اس کے الفاظ کا حفظ نہیں، بلکہ اس کے احکام و مسائل پر عبور ہے۔ احادیث میں اس سورت کی بڑی بڑی فضیلتیں آئی ہیں۔ ایک یہ کہ شیطان اور سورۂ بقرہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ شیطان مصدر ظلمت و ضلالت، ظاہر ہے کہ وہ مرکز نور و ہدایت کے ساتھ کیونکر اکٹھا ہو سکتا ہے۔ ان الشیطن یفر من البیت الذی تقرأ فیہ سورۃ البقرۃ (مسلم، ترمذی عن ابی ہریرۃ) اقرؤا سورۃ البقرۃ فان اخذھا برکۃ وترکھا حسرۃ ولا تستطیعھا البطلۃ وھی فسطاط القرآن (دارمی عن خالد بن معدان) بالفرض یہ روایتیں نہ موجود ہوتیں، جب بھی سورت کے مضامین کی بلندی معنویت و جامعیت سورت کو بجائے خود اس مرتبۂ فضیلت کا مستحق بنانے کو کافی تھیں ۲؎ یعنی اس سُورۃ کی بیشتر بلکہ قریباً تمام تر آیتیں رسول اللہ صلعم کے قیام مدینہ کے زمانہ میں بعد ہجرت نازل ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں کسی کسی آیت کا شامل ہو جانا سورت کے مدنی ہونے کے منافی نہیں ۳؎ اللہ اور رحمٰن اور رحیم سب پر حاشیے گزر چکے ۴؎ الٓمٓ یہ حروف پڑھنے میں پوری پوری آواز کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اردو رسم الخط میں ظاہر بھی کر دیا گیا ہے۔ اور یہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ صحابی اور بعض تابعین کا قول ہے کہ الٓمٓ مخفف اور قائم مقام ہے پورے فقرہ انا اللّٰہ اعلم کا (ابن جریر) زجاج لغوی نے یہی قول اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ حروف مقطعات میں سے ہر حرف کسی متعین معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور عربی شاعری سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں (قرطبی) بعض نے کہا ہے کہ یہ سُورت کا نام ہے۔ اکثر متکلمین اور خلیل نحوی اور سیبویہ نحوی اسی طرف گئے ہیں۔ انھا اسماء السور وھو قول اکثر المتکلمین واختیار الخلیل وسیبویہ (کبیر) بعض کا قول ہے کہ یہ قرآن ہی کا ایک نام ہے۔ اور اور قول بھی نقل ہوئے ہیں۔ بعض صوفیہ نے انہیں عارفانہ اشارات و رموزات قرار دیا ہے، اور ان سے طرح طرح کے نکتے اور لطیفے پیدا کئے ہیں۔ ایک قول یہی نقل ہوا ہے کہ خطبات عرب کے دستور کے مطابق یہ حروف محض افتتاح کلام کے لئے لائے گئے ہیں۔ اور یہ بات اس لئے دل کو زیادہ لگتی ہے کہ عرب اگر اس طرز خطاب و خطابت سے آشنا و مانوس نہ ہوتے تو اس پر اعتراض ضرور ہی کرتے۔ اعتراض کے لئے تو مخالفین بہانے ہی ڈھونڈتے رہتے تھے۔ لیکن اس قسم کا کوئی بھی اعتراض اہل زبان سے منقول نہیں۔ لیکن مشاہیر صحابہ و تابعین میں سے اکثر کا اور جمہور مفسرین کا مسلک یہ ہے کہ یہ حروف اُن متشابہاتِ قرآنی میں سے ہیں جن کا علم کسی مصلحت سے عام بندوں کو نہیں دیا گیا ہے۔ ان ھذا علم مستور و سر محجوب استأثر اللہ تعالٰی وتبارک بہ (کبیر) حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور شعبی، سفیان ثوری، ربیع بن خثیم و ابو حاتم وغیرہ سب کا یہی مذہب ہے (قرطبی و ابن کثیر) یہ اعتراض کہ قرآن کے مخاطب جب ہم ہیں تو ان حروف کو بھی ہمارے لئے قابل فہم ہونا لازمی ہے، کچھ زیادہ باوقعت و باوزن نہیں۔ قرآن مجید کے اندر اور جتنے مضامین و مطالب ہیں، کیا وہ سب ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آگئے ہیں؟ یا کائناتِ خارجی میں جو کچھ موجود ہے، کیا ان موجودات میں سے سب کا معرف بڑے بڑے فاضلوں اور ماہروں کی بھی سمجھ میں آگیا ہے؟ ۵؎ الکتٰب محض زبانی یادداشتوں یا روایتوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ باضابطہ و مستند نوشتہ ایک صحیفۂ مکتوب۔ قرآن مجید اپنا پہلا تعارف اسی حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ ضبط تحریر میں آیا ہوا، ایک کتابی شکل میں مرتب صحیفۂ آسمانی ہے۔ وہ دُوسرے مذہبوں کی کتب الہامی کی طرح نہیں کہ صاحب مذہب کے دماغ میں ان کے صرف معانی و مطالب ہوں، اور کوئی راوی ان سے کوئی ٹکڑا نقل کرے اور کوئی کچھ اور، یہاں تک کہ صدیوں بعد جب نوبت جمع و کتابت کی آئے، تو صحتِ لفظی اور استنادِ حرفی تو خیر بہت دُور کی چیز ہے نفس مفہوم و معنی تک مسخ ہو کر رہے۔ اور نام تو ایک کتاب کا ہو، لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں خدا معلوم کتنے انسانی دماغ اور کتنے بشری قلم شریک ہو جائیں! دلائل و شواہد کو چھوڑیئے محض دعوٰی کی حد تک بھی تو اس باب میں قرآن کی حریف و مقابل دنیا کی کوئی بھی الہامی کتاب نہیں۔ توریت، انجیل، وید کسی کا بھی یہ دعوٰی نہیں کہ وہ لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف نازل شدہ کتاب ہے۔ اور نہ ان کے پیرو انہیں اس حیثیت سے پیش ہی کر رہے ہیں۔ یہ دعوٰی تنزیلِ لفظی کا تو صرف قرآن مجید ہی کا ہے۔ آج دنیا میں اس کا عذاقلم کے ذریعہ "کتابیں" (بصیغہ جمع و عموم) جتنی بھی چاہیں تیار کر ڈالی جائیں الکتٰب (بصیغہ واحد و بتخصیص الف ولام) یا "کتاب واحد" کا مصداق صرف قرآن ہی نکلے گا۔ زمخشری معتزلی کا مرتبہ اللہ بلند کرے، کیا خوب بات کہہ گیا ہے:- معناہ ان ذالک الکتٰب ھو الکتٰب الکامل کان ما عداہ من الکتب فی مقابلتہ ناقص (کشاف) مطلب یہ ہے کہ کتاب تو بس یہی ایک کتاب کامل ہے۔ اور اس کے سامنے کتابیں جتنی بھی لائی جائیں گی سب ناقص ہی ہوں گی۔ زمخشری ۲۷ رجب ۴۶۷ھ تا ذی الحجہ ۵۳۸ھ (۸ مارچ ۱۰۷۵ء تا ۱۴ جون ۱۱۴۴ء) بہرحال مومن تھے، اور آج سے آٹھ ساڑھے آٹھ سو سال قبل کے مومن۔ وہ اگر یہ کہہ گئے تھے تو انہیں کہنا ہی چاہیئے تھا۔ یہ دیکھئے، کہ قرآن کا منکر اور مادیت و عقلیت کا پرستار وہ بھی اس بیسویں صدی کا کیا کہہ رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم کی شہادت ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے The most widely-read book in the world" (جلد ۱۵ صفحہ ۸۹۸) اور پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر ہٹی (Hitti) کا بیان ہے کہ قرآن "گو دورِ آخر کی کتابوں میں سب سے کم سن ہے لیکن دنیا میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی یہی ہے" (تاریخ اہل عرب، صفحہ ۱۲۶ مطبوعہ ۱۹۳۷ء) ذٰلِکَ اسم اشارہ ہے۔ اور اشارۂ بعید کا ترجمہ اردو میں "وہ" سے کیا جاتا ہے۔ لیکن بُعد ہمیشہ بُعدِ مکان یا بُعدِ زمان ہی نہیں ہوتا۔ بُعدِ منزلت و علوئے مرتبت بھی بُعد ہی کی قسمیں ہیں۔ اور ھٰذا کے مقابلہ میں ذٰلِکَ اسی بلندیٔ منزلت کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ یقال بازاء ھٰذا فی المستبعد بالشخص او بالمنزلۃ ذٰلک و ذاک (راغب) انما قال ذٰلک لبعد منزلۃ فی الشرف والتعظیم (تاج) اُردو اور فارسی زبانوں میں بھی اشارۂ بعید "آں" بارہا اظہار تکریم و علوئے منزلت کے موقع پر آتا ہے۔ آنحضرت، آنمخدوم، آنجناب، آنعزیز وغیرہ۔ صحابی ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت کثیر مجاہد، عکرمہ، سعید ابن جبیر، سدی، مقاتل، زید بن اسلم وغیرہ سے ذٰلک، ھٰذا کے معنی میں مروی ہوا ہے۔ (ابن کثیر) لیکن خود ذٰلک اور ھٰذا دونوں اسموں کے درمیان تبادلہ محاورۂ عرب میں بالکل جائز ہے۔ یستعملون کلا منھما مکان الاخر وھذا معروف فی کلامھم (ابن کثیر) اشارہ کا مشار الیہ اس کے مابعد کا اسم یعنی الکتٰب ہے۔ گویا فقرہ کا صحیح اُردو ترجمہ یہ ہوا "یہ مکرم و معظم کتاب" ۶؎ (کہ) کتاب الٰہی ہے۔ اس کا ہر مضمون برحق اور اس کا ہر لفظ صدق ہے۔ لا شک فیہ انہ من عنداللّٰہ وانہ الحق والصدق (معالم) یہی معنی تابعین کو صحابہ کو سب کو مسلّم ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ قال ابن ابی حاتم لا اعلم فی ھٰذا اختلافاً (ابن کثیر) اس حقیقت کو ایک اور پہلو سے دیکھیئے۔ قرآن بجائے خود ایک عالم ہے۔ اس عالم قدس کے اندر گزر کسی شک و تردد کا ہے نہ خلجان و اضطراب کا۔ یہاں تو جو کچھ ہے تسکین و اطمینان ہے، علم و ایقان ہے، یکسوئی و اذعان ہے۔ ہر دعوٰی مدلل ہے، اور ہر حقیقت ثابت شدہ۔ اب اگر کسی بدنصیب کو اس کے خلاف نظر آتا ہے، تو گناہ چشمۂ آفتاب کا نہیں قصور شپرہ چشمی کا ہے۔ اسی لئے ارشاد یہ نہیں ہوا ہے کہ اس کے باب میں کسی کو شک و تردد لاحق ہو ہی گا نہیں، بلکہ ارشاد صرف یہ ہوا ہے کہ خود یہ کتاب، اس کے مضامین شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ ما نفی ان احدا لا یرتاب فیہ وانما المنفی کونہ متعلقاً للریب ومظنۃ لہ (کشاف) المراد انہ بلغ فی الوضوح الی حیث لا ینبغی لمرتاب ان یرتاب فیہ (کبیر) لاریب فیہ، مقصود چونکہ نفی ریب کی تاکید ہے۔ اس لئے ترکیب کلام بجائے لافیہ ریب کے لاریب فیہ رکھی گئی کہ اس میں زور اس سے زیادہ ہے (کبیر) ۷؎ ھُدًی۔ قرآن مجید کے مطالعہ کے وقت اس کا یہ اپنا بتایا ہوا وصف اوّل ہی سے خوب ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ وہ کوئی تاریخ کا دفتر نہیں کہ اس میں سنہ وار ترتیب کے ساتھ پچھلے زمانہ کے واقعات درج ہوں۔ کوئی سائنس کی کتاب

نہیں کہ علوم طبیعی وریاضی کے مسائل کا حل بس کے اوراق میں ڈھونڈھا جائے۔ کوئی فلسفہ کا مقالہ نہیں کہ اس کے پڑھنے والے اشراقیوں اور مشائیوں، یونانیوں اور ہندیوں کے ظنون اور نظریات میں الجھے رہیں۔ افسانہ وحکایات کی کتاب نہیں کہ پڑھنے والے اُسے تفریح اور دل بہلانے کے لئے پڑھیں۔ اس کی اصلی اور بنیادی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ ہدایت نامہ ہے، دستورِ حیات ہے، مکمل ومفصل نقشۂ زندگی ہے۔ للمتقین۔ یہ قید لگا کر صاف بتادیا کہ اس قانونِ علم وتربیتِ تام سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر خوفِ خدا موجود ہو۔ کتابِ ہدایت نازل تو ساری دنیا کے لئے ہوئی ہے۔ خطاب سارے عالم سے کررہی ہے لیکن عملاً اس سے نفع صرف وہی لوگ حاصل کریں گے جن کے اندر حق کی طلب اور تلاش ہے، اور جن کا ضمیر زندہ ہے۔ آفتاب اپنی جگہ عالمتاب سہی، لیکن جن کی بصارت ہی ضائع ہوچکی۔ ان کے لئے تیز سے تیز شعاع بے کار ہے۔ زمین اگر مردہ ہے تو اس کے حق میں بڑی سے بڑی بارش بے اثر ہے۔ غذا بہتر سے بہتر بھی معدہ کے مریض کے لئے لاحاصل بلکہ مضر ہے۔ قرآن مجید سے استفادہ کے لئے اولین شرط دل کے اندر کا تقویٰ ہے۔ ھو فی نفسہ ھدًی ولکن لاینالہ الا الابرار (ابن کثیر) ۵ (رسول کی تعلیمات وتصریحات کے مطابق نہ کہ اپنے ظن وتخمین، وہم وگمان سے) یؤمنون۔ ایمانیات کے دائرہ کے اندر کی جتنی چیزیں بھی ہیں سب کو تصریحاتِ نبوی کے مطابق وماتحت ہونا ضروری ہے کسی اور راہ سے آیا ہوا علم اس دائرہ میں نامقبول ہے۔ ایمان کی کیفیتِ نفسی شک، ریب، تردد وتذبذب کی بالکل ضد ہے۔ ایمان سے اس کے برعکس دماغ کو سکون، دل کو اطمینان، روح کو تسلی نصیب ہوتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی صاحبِ ایمان کو خودکشی کرتے نہیں پایا گیا۔ ایمان کے بغیر دل میں بے کلی اور بے چینی ہی رہا کرتی ہے لیکن ایمان والے کو سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی ڈھارس بندھی رہتی ہے کہ وہ بڑا سہارا اور مضبوط آسرا رکھتا ہے۔ بالغیب یعنی ایمان ایسے عالم پر رکھتے ہیں جو محسوسات اور معقولات سے ماوراء ہے۔ اور اس کی بابت خبریں صرف نبی کے

هُمْ يُوقِنُونَ ۝٤ أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن

(وہ) پورا یقین رکھتے ہیں تھ — یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر

رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝٥ إِنَّ

ہیں ١١ اور یہی (پورے) بامراد ہیں ١٢ بیشک

الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ

جو لوگ کفر (اختیار) کئے ہوئے ہیں ١٣ ان کے حق میں یکساں ہے، خواہ آپ انہیں ڈرائیں

أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝٦ خَتَمَ اللَّهُ

یا آپ انہیں نہ ڈرائیں ١٤ وہ ایمان نہ لائیں گے ١٥ مُہر لگادی ہے اللہ نے

عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰٓ أَبْصَارِهِمْ

اُن کے دلوں پر اور اُن کی شنوائی پر ١٦ اور اُن کی آنکھوں پر

غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝٧ وَمِنَ

پردہ ہے ١٧ اور اُن کے لئے بڑا (ہی) عذاب ہے ١٨ اور کچھ

النَّاسِ مَن يَقُولُ ءَامَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ

لوگ ایسے (بھی) ہیں جو کہتے ہیں ١٩ کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ اور روزِ آخرت پر

الْءَاخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ۝٨ يُخَادِعُونَ اللَّهَ

حالانکہ وہ (بالکل ہی) ایمان والے نہیں ٢٠ دھوکا دینا چاہتے ہیں اللہ کو

وَالَّذِينَ ءَامَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ

اور ایمان والوں کو ٢١ حالانکہ (فی الواقع) دھوکا کسی کو بھی نہیں دیتے بجز اپنی ذات کے ٢٢

ع ١ — وقف لازم

ذریعہ سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ غیب لغت میں شہود کی ضد ہے۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے چھپی ہوئی ہو یا مشاہدہ وتجربہ سے باہر ہو۔ الغيب كل ما غاب عنك (لسان) استعمل في كل غائب عن الحاسة (راغب) یہ لغوی تشریح تھی۔ آیت میں الغیب سے مراد ائمہ تفسیر نے وہ عالم لیا ہے جو حواس وعقل سے ماوراء ہے، اور جس کی بابت جو کچھ بھی علم ہوتا ہے وہ حضرات انبیاء کے توسط سے مثلاً احوالِ حشر ونشر، حور وملائکہ، جنت ودوزخ وغیرہا۔ اور یہ تفسیر خود جماعتِ صحابہ سے مروی ہے۔ اما الغيب فما غاب عن العباد من امر الجنة وامر النار وما ذكر الله تعالى وتبارك في القرآن (ابن جرير عن ابن مسعود وناس من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم) وهو قول جمهور المفسرين ان الغيب هو الذي يكون غائبا عن الحاسة (کبیر) غیب کی تفسیر منقول اسی قدر ہے لیکن ذرا اسی وسعت دینے سے اس کے اندر پھر سارے علوم داخل ہوجاتے ہیں۔ اور پھر جن جن امور سے وحی جلی یا وحی خفی کی روشنی میں لوگوں کو روکا ہے، ان کی باریک باریک برائیوں کا امت کے نقطۂ نظر سے داخلِ غیب ہونا صاف معلوم ہوجاتا ہے۔ وحی الٰہی کی خوردبین سود، شراب، زنا وغیرہ کی خرابیوں اور مفسدوں کو جس طرح اپنی گرفت میں لے آتی ہے، وہ انسان کے لئے غیب ہی کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن جب غیب کی حقیقت یہ معلوم ہوگئی کہ وہ شہود یا علم کے مقابلہ کی چیز ہے تو ظاہر ہے کہ جس طرح ہر شخص کا علم ومشاہدہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اسی نسبت سے ہر ایک کا غیب بھی دوسرے سے جداگانہ ہوتا ہے۔ طبیب کے لئے مرض ومریض سے متعلق بہت سے امور شہود میں ہوتے ہیں جو دوسروں کے لئے غیب کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر فن کا ماہر ایسی چیزیں جانتا ہے جو عامی کے لئے غیب یا خفا میں ہوتی ہیں۔ گویا جس شخص کا دائرۂ علم جس قدر وسیع ہوگا، اسی نسبت سے اس کا دائرۂ غیب چھوٹا ہوگا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ پر چونکہ ہر چیز روشن وعیاں ہے، اس لئے کوئی شے اس کے لئے غیب میں داخل ہی نہیں۔ اور اس لئے جب عالم الغیب کہا جاتا ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو بھی جانتا ہے۔ جو سب بندوں کے لئے غیب میں ہوتی ہیں۔ غیب کی اضافت یہاں صرف بندوں کی جانب ہوتی ہے، ورنہ حق تعالیٰ کے لئے تو جس طرح دور ونزدیک، آسان ودشوار، بڑا اور چھوٹا سب یکساں ہیں، اور ان کے باہمی فرق بے معنی ہیں، اسی طرح غیب وشہود بھی بالکل ایک ہیں۔ ويقال للشيء غيب وغائب باعتباره بالناس لا بالله تعالى فانه لا يغيب عنه شيء (راغب) یہیں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ پیمبر چونکہ تمام دوسرے انسانوں سے داناتر وعالم تر ہوتے ہیں اور ان کا دائرۂ ادراک ومعرفت ساری دوسری مخلوق سے وسیع تر ہوتا ہے، اس لئے قدرۃً انہیں بے شمار ایسی مخفیات کا علم ہوتا ہے جو غیر انبیاء کے لئے تمام تر مجہول ہوتی ہیں۔ لیکن اس ساری وسعت کے باوجود کہیں نہ کہیں کسی منزل پر پہنچ کر ان کے علم کی بھی انتہا ہوجاتی ہے۔ اور دائرۂ غیب ان کا بھی شروع ہوجاتا ہے۔ غیب پر ایمان لانا تو آیت میں متقین کی سب سے پہلی علامت بیان کیا گیا ہے۔ اب اگر خدانخواستہ کسی کا غیب ہے ہی نہیں، تو وہ ایمان کس چیز پہ لائے گا؟ انبیاء کرام تو متقی ہی نہیں، متقیوں کے سردار وپیشوا ہوتے ہیں۔ ان کا ایمان بھی اگر مغیبات ومخفیات پر نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ ہاں البتہ ان کا غیب، انہیں کے ظرف ومرتبہ وبساط کے موافق ہوتا ہے۔ ہم شما کا سا غیب ان کا نہیں۔ دین کا مغز کہئے یا ایمان کی روح یہی عالمِ غیب کا عقیدہ ہے یعنی یہ اعتقاد کہ اس عالمِ مادی محسوس کے ماوراء اس کائناتِ حسی سے اوپر، کچھ اور، ایک عالم ہے ضرور۔ اور جو اس عالم کے وجود کا قائل نہیں وہ سرے سے مذہب ہی کا قائل نہیں۔ اور سب سے بڑا غیب تو خود وجودِ باری ہے ——— سب سے بڑھ کر روشن وعیاں، مگر سب سے زیادہ مخفی ونہاں۔ بڑے سے بڑے عالم وعارف کے لئے بھی اس کے مرتبہ علم ومعرفت کے بعد پھر غیب کے حدود شروع ہوتے ہیں ۹ (اوقات کے، خشوع کے، تعدیلِ ارکان کے، غرض جملہ لوازم باطنی وشرائط ظاہری کے ساتھ) صلوٰۃ کے لفظی معنی دعا کے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں ایک مخصوص ہیئت کی معروف عبادت کا نام ہے۔ اور یہ نام بھی اسی سے پڑا کہ دعا بھی اس عبادت کا جزوِ اعظم ہے۔ الصلوة التي هي العبادة المخصوصة اصلها الدعاء (راغب) محققین نے کہا ہے کہ نماز تو یکسر دعا ہے۔ دعا زبان سے بھی، دل سے بھی، اعضائے ظاہری سے بھی۔ یعنی دعا قولی، دعا قلبی، دعا فعلی کا مجموعہ۔ اقامت صلوٰۃ اور محض ادائے صلوٰۃ میں فرق ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ میں نماز کی تکمیل صوری ومعنوی ہر طرح کی آگئی۔ کسی شے کی اقامت کرنے کے معنی ہی عربی میں یہ ہوتے ہیں کہ اسے اس طرح ادا کیا جائے جو اس کا حق ہے۔ اقامة الشيء توفية حقه (راغب) اور اقامت صلوٰۃ کی تعبیریں مداومت سے، تعدیلِ ارکان سے، اور اور مختلف طریقوں سے کی گئی ہیں (ابن جریر، کبیر وغیرہ) اب سب سے زیادہ جامع تشریح يقيمون الصلوة کی صاحب جلالین نے اپنے دو مختصر لفظوں میں کردی ہے يأتون بها بحقوقها۔ اَن دیکھے خدا کے آگے جھکنے، عبودیت ختم کرنے، اس سے گہرا ربط وتعلق پیدا کرنے، اور خود افرادِ امت میں باہم نظم پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔ اور بدنی عبادتوں میں یہی فریضہ سب سے اعلیٰ اور ایمان، توحید کا سب سے بڑا عملی مظہر ہے۔ فرد کے لئے اسلامی نماز باجماعت کے جو اخلاقی، طبی، مادی فائدے ہیں، اور ملت کے لئے جو معاشی اجتماعی مصلحتیں ہیں ان کی جھلک کہیں دُور سے دیکھ کر یہود، مسیحی اور منکرین تک اس کے دلدادہ ہوگئے ہیں۔ اور ان کے اہلِ علم اپنی تحریروں میں بار بار اس کا ذکر داد ومدح کے لہجہ میں کرچکے ہیں۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ متقین کی پہلی علامت ارشاد ہوئی ہے کہ وہ عقیدۂ غیب کے قائل ہیں۔ دوسری علامت یہ بیان ہورہی ہے کہ عملی زندگی میں وہ نماز کے پابند ہیں ۱۰ (مناسب وضروری موقعوں پر جائز اور مفید کاموں میں) رزق کا لفظ کلامِ عرب میں بڑے وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں آجاتی ہیں، خواہ ظاہری ومادی ہوں، مثلاً مال وصحت، اولاد۔ یا معنوی وروحانی ہوں مثلاً علم وحکمت، فہمِ سلیم وغیرہ۔ يقال للعطاء الجاري تارة دنيويا كان ام اخرويا وللنصيب تارة (راغب) الرزق في كلام العرب هو الحظ (کبیر) اسم لكل ما ينتفع به (راغب) رزقنٰهم میں ہر رزق کو اپنی جانب منسوب کرکے بتادیا کہ جو نعمت جتنی اور جس قسم کی بھی انسان کو ملتی ہے، سب اللہ ہی کے فیض وعطا کا ثمرہ ہوتی ہے۔ انسان کی اپنی کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔ ینفقون۔ متقین کی تیسری صفت یہ ارشاد ہوئی

کہ اللہ کے ہاں سے انہیں جو بھی ظاہری و معنوی نعمتیں عطا ہوئی ہیں، انہیں وہ اللہ ہی کے دین پر حق کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ اللہ کی مخالفت، عدوان و عصیان میں صرف نہیں کرتے۔ مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ اس عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ جو کم نے انہیں جو انوارِ معرفت عطا کئے ہیں ان کا وہ طالبین پر افاضہ کرتے رہتے ہیں ۱۱ (اے ہمارے رسول) یعنی ان متقین کا چوتھا وصف یہ ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں رسول کے لائے ہوئے ہر پیغام پر خواہ قرآن ہو یا اس کے علاوہ۔ آیت کی عبارت سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ تین چیزیں الگ الگ ہیں۔ (۱) ایک کلام کا نازل کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ۔ (۲) دوسرے وہ شخص جس پر کلام نازل ہوا ہے یعنی اللہ کا رسول برحق۔ (۳) تیسرے خود کلام ——— بروز، تمثل، حلول اور وحدت الوجود (اپنے عوامی مفہوم میں) ان سب مشرکانہ و نیم مشرکانہ عقائد کی جڑ اس آیت سے کٹ جاتی ہے۔ نہ کلام متشکل ہوا ہے، اور نہ رسول (نعوذ باللہ) اللہ کے اوتار انسانی قالب میں خدا ہیں۔ بلکہ ایک مستقل انسانی شخصیت رکھتے ہیں ۱۲ (دوسرے پیغمبروں پر خواہ وہ کسی ملک، کسی قوم، کسی زمانہ کے ہوں) قرآن مجید نے اس امر کو صاف کر دیا ہے کہ سلسلۂ ارشاد و ہدایت کوئی نو پیدا چیز نہیں بلکہ اس وقت سے قائم ہے جب سے انسان دنیا میں آئے۔ سلسلۂ وحی کی عمر اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانیت کی۔ مرد مومن کیلئے تصدیق صرف ختم المرسلین کی کافی نہیں، بلکہ سارے انبیاء و رسل کی کرنا ضروری ہے خواہ وہ درجۂ اجمال ہی میں ہو۔ انہیں متقین کا یہ پانچواں وصف ارشاد ہوا کہ وہ بخلاف یہود و نصاریٰ کے دوسرے انبیاء کی تعلیمات پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ طالب کو اعتقاد تو تمام شیوخ اہل حق کے ساتھ ایسا ہی رکھنا چاہئے جیسا اپنے شیخ کے ساتھ۔ لیکن اتباع صرف اپنے شیخ کا کرنا چاہئے۔ جیسا عینہ یہی حکم انبیاء علیہم السلام کے باب میں ہے ۱۳ یہ چھٹا اور آخری وصف ان متقین اہل ضمیر کا بیان ہوا، جو قرآن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ الآخرۃ سے مراد ہے دار الآخرت یا عالم آخرت۔ یعنی وہ عالم جو موجودہ سلسلۂ زندگی کے بعد شروع ہوگا۔ اسے آخرۃ کہا ہی اسی لحاظ سے جاتا ہے کہ وہ اس ناسوتی زندگی کے خاتمہ کے بعد پیش آئے گا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر کہیں دار الآخرۃ سے آیا ہے اور کہیں صرف آخرۃ سے۔ ويعبر بالدار الآخرة عن النشأة الثانية وربما ترك ذكر الدار (راغب) انما وصفت بذلك لمصيرها آخرة لاولى كانت قبلها (ابن جرير) جزا و سزا کے لئے ایک مستقل آئندہ عالم پر یقین رکھنا دین صحیح کے لوازم میں سے ہے۔ یہیں سے تردید ہو گئی ان باطل مذہبوں کی جو تناسخ کو تو مذہب ہیں۔ لیکن یا تو سرے سے جزا اعمال ہی کے قائل نہیں، یا قائل تو ہیں لیکن اس جزا کا محل و مکان اسی عالم ناسوت کو سمجھتے ہیں۔ خواہ ایک ہی قالب میں یا نئے نئے قالبوں میں۔ بعض جدید اہل باطل نے الآخرۃ کا ترجمہ کیا ہے "زمانۂ آخر کی وحی" تاکہ اس سے ان کی خود ساختہ نبوت کا اجرا قرآن سے ثابت ہو۔ لیکن یہ ترجمہ ہے نہ تفسیر، یہ صرف تمسخر و تلعب ہے، قرآن مجید اور لغت عربی دونوں کے ساتھ۔ یوقنون۔ ایقان یا یقین کے معنی یہ نہیں کہ محض عقل کسی عقیدہ کو استدلالاً مان لے۔ یا منطق بادل ناخواستہ سکوت پر مجبور ہو جائے۔ یا دماغ اس کے ان نتیجوں کا محض سرسری، رسمی، سطحی طور پر لفظی اقرار کرے۔ جیسا کہ اکثر فلسفیانہ نظریوں کے ساتھ معاملہ رہتا ہے۔ بلکہ یقین یہ ہے کہ اس مسئلہ پر دل و جان سے اعتقاد جم جائے، اور عقل، جذبات، ارادہ سب پر وہی چھا جائے۔ یقین کی راہ شک، گمان، خیال سب سے الگ ہے۔ اليقين ازاحة الشك (تاج) اليقين من صفة العلم فوق المعرفة والدراية واخواتها (راغب) الايقان اتقان العلم بانتفاء الشك والشبهة عنه (كشاف) اليقين العلم دون الشك (قرطبی) وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ یقین کا مرتبہ یوں بھی محض علم سے قوی تر تھا، پھر فقرہ کی ترکیب یعنی فعل یوقنون کے تاخر اور بالآخرۃ کے تقدم اور ہم کے اضافہ نے قوت کئی درجہ اور بڑھا دی۔ مطلب یہ ہوا کہ مومنین متقین کے نزدیک آخرت اس درجہ اہم ہے کہ گویا وہ بس اسی پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی عقیدہ ان کی زندگی میں رچا بسا رہتا ہے ۱۴ سورۂ فاتحہ میں دعا بندوں کی زبان سے طلب ہدایت کی تھی، اھدنا الصراط المستقیم، دعا مقبول ہوئی، کتاب ہدایت نازل ہو گئی۔ ھدی للمتقین۔ اب ارشاد ہوا کہ فلاں فلاں علامتیں جن میں موجود ہوں، وہی ہدایت یاب لوگ ہیں۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ۔ اولئک۔ ان ہدایت یاب لوگوں کے خصوصیات ذیل قرآن مجید ہی سے معلوم ہو چکے ہیں۔ (۱) ان کا ضمیر زندہ ہوتا ہے، ان کے دلوں میں خوف خدا کی جگہ ہوتی ہے (المتقین) (۲) ان کا اعتقاد اس مادی دنیا سے پرے ایک عالم غیب پر ہوتا ہے (یؤمنون بالغیب) (۳) ان کے تعلق مع اللہ کا عملاً اظہار یوں ہوتا ہے کہ نماز پڑھتے رہتے ہیں، اور نماز کا حق ادا کرتے رہتے ہیں (یقیمون الصلوٰۃ) (۴) اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو یہ اللہ کی مخلوق پر صرف کرتے رہتے ہیں (مما رزقنٰھم ینفقون) (۵) یہ رسولؐ کے رسول برحق اور بہترین معلم و ہادی ہونے اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ (یؤمنون بما انزل الیک) (۶) پورے سلسلۂ وحی و نظام نبوت کی تصدیق کرتے رہتے ہیں (وما انزل من قبلک) (۷) ان کا کامل اعتقاد یوم آخرت یا روز جزا پر رہتا ہے (وبالآخرۃ ھم یوقنون) ۱۵ (دنیا اور آخرت دونوں میں) دنیا کی فلاح تو یہ کہ انہیں راہ ہدایت نصیب ہو گئی، اور انفرادی و اجتماعی، شخصی و قومی ہر حیثیت سے جامع ترین و بہترین دستور حیات منازل زندگی کے طے کرنے کا ہاتھ آ گیا۔ اور آخرت کی فلاح یہ کہ وہاں پورا پورا صلہ مل کر رہے گا۔ ای الذین ادرکوا ما طلبوا ونجوا من شر ما منہ ھربوا (ابن جریر عن ابن عباسؓ) فلاح عربی میں بڑے ہی وسیع معنی میں آتا ہے۔ دنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے۔ اس لئے المفلحون کا پورا ترجمہ "کامیاب" "بامراد" وغیرہ کسی اردو لفظ سے ہونا دشوار ہی ہے۔ امام لغت زبیدی کا قول ہے کہ ائمہ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ کلام عرب میں جامعیت خیر کے لئے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں۔ لیس فی کلام العرب کلمۃ اجمع من لفظۃ الفلاح لخیری الدنیا والآخرۃ کما قال ائمۃ اللسان (تاج) اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کی ترکیب نے معنی میں حصر و تاکید پیدا کر دی۔ اور ھم بطور کلمۂ فصل کے تاکید نسبت و تخصیص کے لئے ہے۔ وھو فصل یفصل الخبر عن الصفۃ ویؤکد النسبۃ ویفید اختصاص المسند بالمسند الیہ (بیضاوی) وادخال ھو فی مثل ھذا الترکیب احسن لانہ محل تاکید ورفع توھم (بحر) مفسر تھانوی مدظلہ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ حصر کا تعلق فلاح کامل سے ہے نہ کہ فلاح مطلق سے۔ اور المفلحون سے مراد الکاملون فی الفلاح ہے۔ اور معتزلہ و خوارج جنہوں نے آیت سے یہ نکالنا چاہا ہے کہ کبائر کا مرتکب فلاح مطلق یعنی نجات سے محروم رہے گا، انہوں نے فلاح مطلق و نجات کاملہ کے اور مطلق فلاح کے درمیان خلط کر دیا ہے۔ المراد بہ الفلاح الکامل المستفاد من الاطلاق فالحصر للفلاح المطلق لا لمطلق الفلاح (تھانوی) ۱۶ (اور قیام دلائل کے باوجود اس پر اڑے ہوئے ہیں) اما انبتوا علی الکفر (ابن عباسؓ) ایسے لوگ ظاہر ہے کہ علم الٰہی میں کفر ہی پر مرنے والے ہیں۔ جو لوگ دلائل حق میں غور نہیں کرتے اور باطل پر جمے رہتے ہیں، ان کی استعداد قبول حق کے باب میں روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بالکل مردہ ہو جاتی ہے۔ آیت میں خصوصی اشارہ یہود مدینہ کی جانب ہے۔ ان کا کفر کفر جحود کی قسم کا تھا یعنی پیغمبر آخر الزمان کی بابت پیشگوئیوں اور ان کی علامتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور پھر دانستہ اغماض و اخفا کرتے رہتے تھے کہ اپنی دینی ریاست اور دنیوی سیادت میں فرق نہ پڑنے پائے۔ واما معنی الکفر فانہ الجحود ذلک ان الاحبار من یہود المدینۃ جحدوا نبوۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وستروہ عن الناس وکتموا امرہ (ابن جریر) ۱۷ (لیکن آپ کی دعوت و تبلیغ برابر جاری ہے۔ آپ کا اجر اس سے ثابت ہو رہے گا) آج معمولی مبلغ بھی اپنی دھن کے کچے ہوتے ہیں، تو رسول اللہ صلعم تو دنیا کے لئے "مبلغ اعظم" تھے۔ دین الٰہی کی اشاعت کے لئے آپ کی تڑپ کا کیا کہنا۔ آپ کو حرص اگر تھی تو اسی کی کہ کافر سب کے سب زمرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ یہاں حقیقت آپ کو بتلا دی گئی ہے کہ آپ کچھ بھی کر ڈالیے ان کے حق میں سب یکساں ہے۔ یہ بدبخت اپنی صلاحیت حق شناسی کو ضائع کر چکے ہیں، لیکن آپ کا اجر تبلیغ بہرحال ثابت ہے۔ فلا تذھب نفسک علیھم حسرت فمن استجاب لک فلہ الحظ الاوفر ومن تولی فلا تحزن علیھم (ابن کثیر) ظاہر ہے کہ یہ صرف ایک خبر ہے جو خبیر مطلق اپنے بندہ کو دے رہا ہے۔ ایک اطلاع ہے جو علیم کل اپنے رسول کو پہنچا رہا ہے۔ مرضی الٰہی سے اسے شائبۂ تعلق بھی نہیں۔ "علم" و "مرضی" کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عوام کے ذہن ان دو بالکل مختلف قانونوں کے درمیان خلط مبحث کر کے اپنے کو عجیب الجھنوں میں ڈال لیتے ہیں ——— طبیب حاذق اپنے علم کی رو سے مدتوں پیشتر خبر دے دیتا ہے کہ فلاں بد پرہیز، خود رائے مریض اچھا نہ ہوگا۔ کیا اس پیش گوئی اس اخبار غیب میں اس شفیق طبیب کی خواہش و مرضی کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے؟ بقول مفسر تھانوی مدظلہ اس کافر کا ناقابل ایمان ہونا اللہ کے اس خبر دینے کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا اس کافر کے ناقابل ایمان ہونے کی وجہ سے واقع ہوا ہے۔ اور ناقابل ایمان ہونے کی صفت خود اس کی شرارت و عناد و مخالفت حق کے سبب سے پیدا ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اس کی پیدائش کے ساتھ استعداد قبول حق کی رکھی ہے۔ جیسا حدیث میں آ گیا ہے۔ مگر شخص خود اپنی ہوائے نفسانی اور خود غرضی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز وہ استعداد فنا ہو جاتی ہے ۱۸ (اس لئے کہ وہ ایمان لانے کا قصد ہی نہیں کرتے، اور نہ خلوئے ذہن کے ساتھ تعلیمات اسلامی پر غور کرتے ہیں) اے لایریدون ان یؤمنوا (ابن عباسؓ) اس سے پہلے فقرہ کی مزید تاکید اور توثیق ہو گئی۔ اور اہل عناد کے حق میں ان کی بے التفاتی اور عدم احساس کی بنا پر انذار و عدم انذار کا یکساں ہونا اور روشن ہو گیا۔ اکثر ائمہ تفسیر نے آیت کی ترکیب نحوی یوں ہی سمجھی ہے اور لایؤمنون کو جملۂ مؤکدہ و مفسرہ فقرۂ ماقبل کا سمجھا ہے۔ جملۃ مؤکدۃ للتی قبلھا (ابن کثیر) جملۃ مفسرۃ لاجمال ما قبلھا او حال مؤکدۃ (بیضاوی) لیکن ایک دوسری ترکیب بھی انہیں بزرگوں سے منقول ہے۔ کہ لایؤمنون خبر ہے ان الذین کفروا کی اور پورا فقرہ سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم درمیان میں بطور جملہ معترضہ کے آ گیا ہے۔ خبرا لان والجملۃ قبلھا اعتراض (کشاف) خبر ان والجملۃ قبلھا اعتراض (بیضاوی) خبر لان والجملۃ قبلھا اعتراض (مدارک) ویحتمل ان یکون لا یؤمنون خبرا (ابن کثیر) اصل مقصود دونوں ترکیبوں کی صورت میں ایک ہی رہتا ہے ۱۹ قلب۔ دل سے مراد سینہ کے اندر کا وہ مضغۂ گوشت نہیں جو طبی اصطلاح میں دل کہلاتا ہے۔ بلکہ وہ دل مراد ہے جو محاورۂ زبان میں احساس، عقل، ارادہ سب کا مرکز ہے۔ انسانی بول چال میں دل اسی کو کہا جاتا ہے اور افعال ارادی کا صدور اسی سے ہوتا ہے۔ توریت، انجیل اور دوسرے صحیفے سب میں یہی محاورہ استعمال کیا گیا ہے۔ ختم اللہ۔ اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا یہ فعل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس کے قبل۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا سبب۔ فطرت سلیم تو ہر انسان کو عطا ہوئی ہے، اور اس میں دلائل حق پر غور و فکر کی استعداد بھی شامل ہے۔ لیکن انسان جب اپنے ارادہ و عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے، اور آسمانی ہدایتوں اور خداوندی نشانیوں سے مسلسل منہ موڑے ہوئے قانون شیطانی پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلۂ غضبی کے تحت میں آ جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے سلسلۂ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور نصرت الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اب ہر روشنی اسے تاریک اور ہر تاریکی اسے روشن نظر آنے لگتی ہے۔ اس نے اپنے لئے جو کچھ اختیار کیا، وہی اللہ تعالیٰ اسے بحیثیت علت العلل و مسبب الاسباب اپنے قانون تکوینی (نہ کہ قانون رضا) کے تحت دینے لگتا ہے۔ اور یہی معنی ہیں انسان کے عقل و حواس پر مہر لگ جانے کے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ مہر خداوندی کوئی مادی چیز نہیں ۲۰ (چنانچہ کھلے ہوئے دلائل حق اور روشن سے روشن آیات الٰہی بھی انہیں نظر نہیں آتے) یہ سب ثمرہ ہے ان کافروں کے ارادی اعراض عن الحق اور دانستہ کج روی کا۔ حق تعالیٰ کی جانب ان افعال کا انتساب جو کچھ ہے وہ محض تکوینی حیثیت سے ہے، یعنی بطور علت العلل و مسبب الاسباب کے ——— ارادۂ حق جس طرح بندہ کے زہر کھا لینے پر موت کا ثمرۂ طبعی مرتب کر دیتا ہے، اسی طرح بندہ کی ارادی کج روی پر موت روحانی کا ثمرہ بھی مرتب کر دیتا ہے۔ مرضی حق کا تعلق

۱۹؎ اول الذکر سے بہ آخر الذکر سے! اس طرز بیان کی اور فہم، سماعت و بصارت کی قوتوں سے سزا کے طور پر محرومی کی مثالیں قدیم صحیفوں میں بھی کثرت سے ملتی ہیں:۔ "خدا نے تم کو وہ دل جو سمجھے اور وہ آنکھیں جو دیکھیں اور وہ کان جو سنیں آج تک نہیں دیئے"
(استثناء ۲۹: ۴) "تم سنا کرو پر سمجھو نہیں۔ تم دیکھا کرو پر بوجھو نہیں۔ تو ان لوگوں کے دلوں کو چربا دے اور ان کے کانوں کو بھاری کر" (اسیاہ ۶: ۹، ۱۰) "وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ ان کی آنکھیں لیپی گئیں سو وہ دیکھتے نہیں اور ان کے دل بھی سو وہ سمجھتے نہیں"
(اسیاہ ۴۴: ۱۸) "تمہاری آنکھیں جو کہ نبی ہیں موندی ہیں اور تمہارے سروں پر جو کہ غیب بیں ہیں حجاب ڈالا ہے" (اسیاہ ۲۹: ۱۰) "میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا" (زبور ۸۱: ۱۲، ۱۱) انجیل میں اس قسم کی مثالوں کے لئے
ملاحظہ ہو رومیوں ۱۱: ۸، ۷ اور ۲ تھسلنیکیوں ۲: ۱۱۔ **۲۱؎** (آخرت میں) اسلام مسلسل حیات کا قائل ہے۔ یہ ناسوتی، مادی زندگی صرف ایک حصہ ہے کل زندگی کا۔ باقی اس کا پورا ظہور بروز حیات اخروی ہی میں ہوگا۔ اخروی
زندگی لازمی تمہ و نتیجہ ہے اس دنیوی زندگی کا۔ اور یہاں کی مسلسل قانون شکنی و نافرمانی وہاں عذاب الیم کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ گویا جو تخم آج ڈالے گئے ہیں کل وہی تناور درختوں کی صورت میں نمودار ہوں گے۔ عذاب کے شدید و عظیم ہونے میں تو کوئی شک
ہی نہیں۔ اور قرآن مجید میں اسے مختلف پیرایوں میں سمجھایا اور بتایا گیا ہے۔ پھر بھی اس کی تفصیلی کیفیت اور نوعیت ادراک بشری سے بالاتر اور ماوراء ہے۔ اور بعض نے عظیم کے کلمۂ نکرہ ہونے سے یہی استنباط کیا ہے کہ وہ کسی خاص و غیر متعارف ہی
نوعیت کا ہوگا۔ من الآلام العظام نوع عظیم لا یعلم کنہہ الا اللہ (مدارک۔ بیضاوی) والتنکیر فیہ للنوعیۃ ای لہم فی الآخرۃ نوع من العذاب غیر متعارف فی عذاب الدنیا (روح) **۲۲؎** (محض زبان سے، شرکت قلب کے بغیر)
مَنْ۔ واحد، تثنیہ، جمع تینوں موقعوں پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ حالت افراد میں لحاظ اس کی لفظی حیثیت کا کیا جاتا ہے اور جمع میں نظر اس کے معنی و مفہوم پر رکھی جاتی ہے۔ اب تک قرآن مجید نے ذکر دو قسم کے انسانوں کا کیا ہے۔ ایک مومن فرمانبردار

وَمَا يَشْعُرُونَ ۝٩ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ
اور اس کا بھی احساس نہیں رکھتے **۱۹**؎ اُن کے دلوں میں بیماری ہے **۲۷**؎ سو
فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اللہ نے بڑھا دی اُن کی بیماری **۲۸**؎ اور اُن کے لئے عذاب دردناک
أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝١٠ وَإِذَا
ہونا ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے **۲۹**؎ اور جب
قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا
اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ **۳۰**؎ تو کہتے ہیں
إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝١١ أَلَا إِنَّهُمْ
کہ ارے! ہم تو اصلاح کر رہے ہیں **۳۱**؎ سُن رکھو، حقیقۃً یہی لوگ
هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝١٢
فسادی ہیں اور یہ اس کا بھی احساس نہیں رکھتے **۳۲**؎
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ
اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے ہیں **۳۳**؎
قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ
تو کہتے ہیں **۳۴**؎ کہ کیا ہم (ایسا) ایمان لے آئیں جیسا کہ بیوقوف ایمان لائے ہیں **۳۵**؎ سُن رکھو کہ
هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ۝١٣ وَإِذَا لَقُوا
بیوقوف تو خود یہی لوگ ہیں اور اس کا بھی علم نہیں رکھتے **۳۶**؎ اور جب اُن

قانونِ الٰہی کے مطیع۔ دوسرے کافر نافرمان، قانونِ الٰہی کے منکر و باغی۔ اب ذکر ایک تیسری صنف کا شروع ہو رہا
ہے۔ ہوتے یہ بھی کافر و منکر ہی ہیں، لیکن اپنے کفر و انکار پر پردہ مکر و فریب کا ڈالے رکھتے ہیں۔ یعنی زبان پر دعویٰ
اسلام رکھتے ہیں لیکن دل میں کفر خالص۔ زبان سے اقرار ایسا کہ جس میں قلب کی تصدیق کسی درجہ میں بھی شامل
نہیں۔ ان ننگِ انسانیت انسانوں کو شریعت کی اصطلاح میں منافق کہتے ہیں۔ نفاق کی حقیقت یہ کہ
انسان اعلان و اظہار بھلائی کا کرتا پھرے، اور شر کو اندر ہی اندر چھپائے رکھے۔ النفاق ہو اظہار الخیر و
اسرار الشر (ابن کثیر) پھر نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک نفاقِ حقیقی یا اعتقادی جس میں ایمان سرے سے
ہوتا ہی نہیں۔ اور اس کی سزا ابدی خلودِ جہنم ہے۔ دوسرا نفاقِ عملی یا مجازی۔ اس میں ایمان کا استحضار نہیں
رہتا، اور انسان گناہ پر بے دریغ جری ہو جاتا ہے۔ ہو انواع اعتقادیؒ وہو الذی یخلد صاحبہ فی النار
وعملیؒ ہو من اکبر الذنوب (ابن کثیر، سورۂ بقرہ مدنی ہے۔ اور مدینہ میں منافقین کثرت سے تھے۔ اسلام سے عداوت
میں اور رسول اسلام سے عناد میں یہ لوگ کھلے ہوئے کافروں سے کچھ کم نہ تھے۔ شاید کچھ بڑھے ہی ہوئے ہوں۔ نفاق
یعنی جھوٹا اظہار اسلام مکہ میں نہ تھا۔ بلکہ مکہ میں تو اس کے برعکس صورتِ حال یہ تھی کہ لوگ مومن ہو کر بھی اپنے ایمان
کو چھپائے رکھتے، اور بظاہر کافروں ہی میں شامل رہتے۔ نفاق کی بنیاد مدینہ میں پڑی، وہ بھی غزوۂ بدر کے بعد،
جب اسلام کو روز بروز دنیوی عظمت و شوکت حاصل ہونی شروع ہو گئی۔ اس وقت بعض لوگوں نے اپنے کو محض
تقیۃً بلا شائبۂ ایمان و صداقت مومن و مسلم کہنا شروع کر دیا۔ اس پارٹی کا سرغنہ یا سرِ خیل بنو خزرج کا سردار عبداللہ
بن اُبَی بن سلول تھا۔ اس کا اثر و اقتدار حریف قبیلہ بنو اوس پر بھی تھا۔ یہ اپنے وقت کا کامیاب ترین لیڈر
تھا۔ یہاں تک کہ ساری آبادی اس کی سرداری پر متفق ہو چکی تھی۔ اور قریب تھا کہ اس کی بادشاہی کا اعلان
ہو جائے، کہ یک بیک اسلام کے قدم مدینہ میں جم گئے۔ اُس نے اپنی دوکان اجڑتے دیکھی تو اپنے پیروؤں کے
کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ زبان سے کلمۂ اسلام کا پڑھتے جاؤ لیکن دل میں اپنے ہی عقائد پر جمے رہو۔ اوس
و خزرج کے علاوہ یہود کی بھی ایک غدار و ضمیر فروش جماعت نے خوشی سے اس تحریک پر لبیک کہا۔ البتہ مکہ کا
کوئی مہاجر اس میں شریک نہیں ہوا۔ ابن کثیر نے تفصیل سے لکھا ہے اور یہاں بھی زیادہ تر اسی کی تلخیص ہے
۲۳؎ یعنی ان کے دل میں ایمان کا گذر ذرہ برابر بھی نہیں، ایمان انہیں چھو بھی نہیں گیا۔ یقولون ذٰلک
قولاً لیس وراءہ شیء آخر (ابن کثیر) انہم لیسوا من الایمان فی شیء (بیضاوی) بمؤمنین۔ حرف باء
تاکید کے لئے ہے۔ اکد النفی بالباء (بیضاوی) ظاہر سیاق کا تقاضہ تھا کہ فعل ماقبل قالوا اٰمنّا کی تردید
تغلیط میں ما اٰمنوا یا اسی قسم کا کوئی اور فعل ماضی ہی لایا جاتا۔ لیکن یہاں تاکید اور زور کے لئے بجائے فعل کے اسم فاعل
لایا گیا، کہ ان لوگوں سے نفی ایمان کی، ماضی، حال، مستقبل ہر زمانہ سے متعلق نکل آئے۔ وفیہ من التوکید والمبالغۃ
ما لیس فی غیرہ (کشاف) تاکیداً ومبالغۃً فی التکذیب لان اخراج ذواتہم من عداد المؤمنین ابلغ
من نفی الایمان عنہم فی ماضی الزمان (بیضاوی) اکان ذٰلک مبالغۃ فی تکذیبہم (کبیر) **۲۴؎** یعنی محض
مسلمانوں سے نفع حاصل کرنے کیلئے اُن کی گرفت سے اپنے کو بچانے کے لئے اپنے تئیں مسلمان کہہ رہے ہیں۔ اور جرم
کفر پر اضافہ جرم خدع کا کر رہے ہیں۔ یخدعون باب مفاعلہ سے ہے اور اس کا خاصہ طرفین سے شارکت ہے۔ لیکن یہاں یخدعون کے معنی میں ہے۔ اور باب مفاعلہ محض زور اور تاکید کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ المفاعلۃ لافادۃ المبالغۃ فی
الکیفیۃ (ابو سعود) اخرج فی زنۃ فاعلت للمبالغۃ (بیضاوی) یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ۔ حق کی مخالفت اور تکذیب کرتے کرتے جسارت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اپنے خیال و پندار میں خدا کو بھی دھوکا دے چلے تھے۔ اجترء واعلی اللہ حتیٰ ظنوا انہم یخدعون
اللہ (ابن جریر عن ابن عباس) یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ کو دھوکا دے رہے ہیں اپنے خیال کے مطابق۔ معناہ یخادعون اللہ فی زعمہم (مدارک) اسی مفہوم کے پیش نظر ترجمہ کیا گیا ہے کہ "اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں"۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول کو اس
دھوکا دینے کی کوشش کو قرآن مجید نے عین اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے تعبیر کیا ہو۔ اس کی اور بھی نظیریں قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ ذکر نفسہ واراد بہ رسولہ علی عادتہ فی تفخیم امرہ (کبیر) اراد برسول اللہ (مدارک) مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا
کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا مثلاً عداوت یا فریب کا ایسا ہی ہے جیسے حق تعالیٰ کے ساتھ کرنا **۲۵؎** یعنی ان کے اس نفاق سے نقصان کسی اور کا نہیں۔ خود انہیں کا ہوتا ہے اور ہوگا۔ آخرت میں عذاب اور دنیا میں رسوائی، فضیحت
اور منافقت کی پردہ دری۔ ضررہا یلحقہم ومکرہا یحیق بہم (کشاف) یفتضحون فی الدنیا ویستوجبون العقاب فی العقبیٰ (معالم) **۲۶؎** (کہ اس منافقت کا وبال خود انہیں پر ہو کر رہے گا) لایعلمون ان وبال خداعہم یعود علیہم (معالم)
یشعرون۔ بجائے یعلمون کے یہاں یشعرون وارد ہوا ہے۔ شعور عربی میں علم حسی کو کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام اُردو میں احساس ہے۔ اور مشاعر انسان کے آلاتِ حواس کو کہتے ہیں۔ المشاعر الحواس (راغب) الشعور علم الشیء علم حس من الشعار
مشاعر الانسان حواسہ (کشاف) اس لفظ کے لانے میں نکتۂ بلاغت یہ ہے کہ منافقوں کو اس مکر و فریب سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا وہ بالکل مادی ہونے کی طرح صاف اور صریح ہے لیکن یہ احمق فرطِ غفلت سے اس کا بھی احساس نہیں
رکھتے۔ والمعنی ان لحوق ضرر ہذا لک بوحہ کالمحسوس وہم لتمادی غفلتہم کالذی لاحس لہ (کشاف) لے لا تدرکونہ بالحواس (راغب) **۲۷؎** (کفر کی اور نفاق کی اور شک کی، جو انہوں نے اپنے ہاتھوں پیدا کر رکھی ہے) شک و نفاق و ظلمۃ (ابن عباس) دوسرا پہلو ان کم اعتقادوں کے مرض کا یہ تھا کہ جوں جوں مسلمانوں کو ترقیاں اور کامیابیاں حاصل ہوتی جاتی تھیں ان کے رشک و حسد میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ ہمارے ائمۂ تفسیر کی نظر سے یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں ہونے پایا۔
والمعنی ان المنافقین مرضت قلوبہم لما رأوا ثبات امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم واستعلاء شانہ یوماً فیوماً (کبیر) والمراد بہ ہنا ما فی قلوبہم ...... من الغل والحسد والبغضاء لان صدورہم کانت تغلی علی رسول اللہ صلعم والمؤمنین
(کشاف) مرض لغوی اعتبار سے نام ہے انسان کے حالتِ طبعی سے خروج کا۔ المرض الخروج عن الاعتدال الخاص بالانسان (راغب) رذائل نفسانی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور مجازاً نفاق و کفر کو بھی مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے، کہ وہ انسان کے لئے

اور اک فضائل اور تحصیل حیاتِ اُخروی کی راہیں حائل ہو جاتے ہیں۔ (راغب) مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ امراض قلب کا معاصی کے معنی میں اثبات خود قرآن مجید سے ہو گیا ۲۸ رسول، اسلام اور جماعت مومنین کو مزید ترقیاں اور تحسینیں بان نے دیکھ یا اپنے کلام کے مسلسل نزول سے، منافقوں کے دل کے روگ کو ترقی دو طریقوں سے ہوتی رہی یا توں کہ جوں جوں اسلام کو مزید غلبہ واقتدار حاصل ہوتا گیا، ان لوگوں کے دل کی کڑھن اور جلن بڑھتی گئی۔ اور یا یوں کہ کلام الٰہی کی ہر ہر آیت کے نزول کے ساتھ ان کے غیظ و بغض میں اور اضافہ ہو تا گیا۔ اہل تفسیر نے یہ دونوں پہلو اختیار کئے ہیں۔ کلما ازداد رسولہ نصرۃ و تبسطا فی البلاد و نقصا من اطراف الارض ازدادوا حسدا و غلا و بغضا (کشاف) کلما انزل علی رسولہ الوحی کفروا بہ فازدادوا کفرا الی کفرھم (کشاف) فزادھم میں حرف ف بہت اہم ہے۔ یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس فعل کا ذکر آ رہا ہے، وہ محض بطور ثمرہ یا نتیجہ کے پیدا ہوا ہے۔ والفاء للدلالۃ علی ترتب مضمونہا علیہ (ابوسعود) حق تعالیٰ کی جانب اس قسم کے افعال کا انتساب صرف مجازی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ اللہ نے خواہ مخواہ ان سے یہ افعال کرا چھوڑے۔ اس نے تو صرف وہ حالات واسباب پیدا کر دیئے، جن سے ان بدنصیبوں نے اپنے مرض کے بڑھانے کا کام لیا، ورنہ اگر وہ اپنی عقل وارادہ کا صحیح استعمال کرتے، تو انہیں اسباب وحالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے۔ وکان اسناد الزیادۃ الی اللہ تعالیٰ من حیث انہ مسبب من فعلہ (بیضاوی) یہ سزا بھی جو کچھ ملی ٹھیک جرم کے مناسب حال ہی ملی۔ وھو الجزاء من جنس العمل (ابن کثیر) اس قسم کے افعال کا حق تعالیٰ کی جانب انتساب قدیم صحیفوں کا بھی ایک محاورۂ عام ہے۔ "اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔" (زبور ۸۱: ۱۱، ۱۲) "پس خدا نے منہ موڑ کر انہیں چھوڑ دیا کہ آسمانی فوج کو پوجیں" (اعمال ۷: ۴۲) "خدا نے ان کے دلوں کی خواہشوں کے مطابق انہیں ناپاکی میں چھوڑ دیا کہ ان کے بدن آپس میں بے حرمت کئے جائیں" (رومیوں ۱: ۲۴)

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى
لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ایمان لا چکے ہیں اور جب اپنے
شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ
شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو محض
مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ
بنا رہے تھے انہیں اللہ بنا رہا ہے اور وہ انہیں ڈھیل
يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ
دے رہا ہے (تو) وہ اپنی سرکشی میں سرگردان ہو رہے ہیں یہ وہ لوگ
الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا
ہیں کہ انہوں نے گمراہی خرید کرلی ہدایت کے بدلے سو نہ
رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾
اُن کی تجارت ہی سود مند ہوئی اور نہ وہ راہ یاب ہوئے
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ
اُن کی (عجیب) مثال تو ان کی سی (عجیب) مثال ہے جنہوں نے آگ جلائی، پھر جب آگ
فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ
نے اپنے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی
بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا
سلب کرلی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ

۲۹ یعنی اپنے مومن ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ عذاب الیم جس کا یہاں ذکر ہے منافقوں پر مطلق کفر پر نہیں، بلکہ ان کی منافقت پر یا جھوٹے دعویٰ ایمان پر ہوگا۔ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کافروں کے لئے جس عذاب کی خبر اوپر دی جا چکی ہے (آیت ۷ میں) اس کی صفت عظیم آئی ہے، اور یہاں منافقوں کے لئے جس عذاب کی وعید ہے، وہ الیم ہوگا۔ اور الیم کے معنی ہیں مؤلم یعنی دکھ پہنچانے والا۔ گویا تکلیف و اذیت کا پہلو اسی میں زیادہ نمایاں ہوگا۔ وصف بہ العذاب للمبالغۃ (بیضاوی) خوب سمجھ لیا جائے کہ جو منافق تھے وہ کافر تو تھے ہی، لیکن کافر کے علاوہ بھی کچھ اور تھے، یعنی خادع و کاذب۔ تو عذاب عظیم کے مستحق تو وہ پہلے کفر کی بنا پر ہو ہی چکے، یہ منافقت کا عذاب الیم اس پر مستزاد۔ گویا منافقوں پر دونوں عذابوں کا مجموعہ ہوگا۔ قد حصل للمنافقین مجموع العذابین فصار المنافقون اشد عذابا من غیرھم من الکفار (بحر) بما میں ب سببیہ ہے اور ما مصدری۔ الباء للسببیۃ وما مصدریۃ (ابوسعود) منافقوں اور ریاکاروں سے انجیل کا طرزِ خطاب حسبِ ذیل ہے۔ "تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کی مانند ہو، جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں" (متی ۲۳: ۲۷) اور شیوخ واکابر یہود کے الفاظ ان کی جیوش انسائیکلو پیڈیا میں یوں منقول ہیں۔ "جو اولیا کی صحبت میں منافقت کے ساتھ رہتے ہیں، خدا انہیں غارت کرکے رہے۔ ...... جو کوئی منافقت برتے خدا کرے چیل کوّے اس کی آنکھیں نکال کر رہیں" (جلد ۶، صفحہ ۵۱۲) اور انہیں کے تالمود میں ہے۔ "جو کوئی منافقت برتتا ہے وہ غضب (خداوندی) دنیا پر لاتا ہے۔ اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اور جو بچے ابھی رحمِ مادر میں ہیں، وہ تک اس پر لعنت کرتے ہیں، اور اس کی جگہ جہنم ہے" (ایوری مینس تالمود ص۱۰۰) ۳۰ اس سے معلوم ہوا کہ قانونِ شریعت کے علاوہ کسی دینِ جاہلی پر قائم رہنا، اس کے طور طریقوں کی اشاعت کرنا فساد فی الارض کے مرادف ہے۔ امن عالم ونظامِ اقوام قائم جب ہی رہ سکتا ہے جب عملدرآمد قانونِ شریعت پر رہے۔ اس راہ سے انحراف، بلکہ سرِ مو تجاوز کرنا بھی دنیا کو بدنظمی ابتری کشت و خون اور قسم کی طبقاتی جنگ و کشمکش کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ دنیا عملاً اس کا تجربہ بار ہا کر چکی ہے، اور اس وقت بھی کر رہی ہے۔ اسلام کے امن ہونے پر کہ وہ نظامِ عالم کا بہترین ضامن ہے، اللہ مراتب میں اضافہ کرے ہمارے زمانہ میں اقبال نے شاعرانہ زبان میں خوب ہی لکھ دیا ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ۔ اس قول کا قائل کون تھا؟ بعض نے اس کا قائل رسول اللہ کو قرار دیا ہے اور بعض نے عام مومنین کو، اور کسی نے اللہ تعالیٰ کو بھی۔ الفاظ میں گنجائش ان سب کی ہے۔ وکل ذلک محتمل (کبیر) ۳۱ (اور الٹا ہم ہی پر الزام فساد و تخریب کا لگ رہا ہے!) جواب بعینہ وہ ہے جو آج بھی خدا معلوم امت کے اندر کے کتنے منافقوں کی زبان پر ہے۔ دین میں رخنے قدم قدم پر ڈالتے جاتے ہیں، اور زبان پر دعوے وہی تجدد کے، تجدید کے، اصلاح کے، تعمیر کے ہیں۔ نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے معروف معنی تو یہی ہیں کہ یہ لوگ زبانی دعویٰ اپنے دینِ حق پر قائم ہونے کا رکھتے تھے۔ قالوا انما نحن علی الھدی مصلحون (ابن جریر عن مجاہد) دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم تو لوگوں کے درمیان صلح کرانے والے ہیں، محمدی اور غیر محمدی کے درمیان جو کشمکش ہے اس کے مٹانے والے ہیں۔ قالوا انما نرید الاصلاح بین الفریقین من المومنین واھل الکتٰب (ابن جریر عن ابن عباسؓ) انما کلمہ حصر ہے۔ اُردو میں زور کا یہ مفہوم لفظ "ہی" سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۳۲ (کہ فساد تو تمامتر انہی کی ذات سے پھیل رہا ہے) کیا ٹھکانا ہے ان کی غباوت کا، مسخ شدہ ذہنیت کا، سیاہ کو سفید کہہ رہے ہیں، تاریکی کا نام کا نور رکھ رہے ہیں، اور احساس اپنے اس جہل کا بھی نہیں رکھتے! اَلَآ کلمہ تنبیہ، عربی میں "خبردار ہو جاؤ" "آگاہ رہو" کے معنی میں۔ لفظ "جی" میں گستاخی کی کمی نہ ہوتی تو اردو میں اس مفہوم کے لئے یہی بہترین لفظ ہوتا ۳۳ (اسلام اور رسولِ اسلام پر صدق واخلاص کے ساتھ) دعویٰ ایمان کا تو اب بھی ان لوگوں کو تھا، سمجھانے والوں کا مطلب یہ تھا کہ ایمان دل سے لاؤ، دیانت اور راستی کے ساتھ رسول کی رسالت کو تسلیم کرو۔ لے ایمانا مقرونا بالاخلاص بعیدا عن النفاق (کبیر) اخلصوا فی ایمانکم (خازن) النّاس، ناس، ال کے داخلہ کے بعد معرفہ ہو گیا۔ اب مراد ساری نوعِ انسان نہ رہی، بلکہ وہ متعین ومخصوص افراد رہ گئے جو مخاطبین کیلئے معلوم ومعروف تھے۔ روایتوں میں عبداللہ بن سلام وغیرہ حق شناس یہود کے نام آئے ہیں، جنہوں نے اسلام کی صداقت کو قبول کر لیا تھا۔ ھم بعض الناس لا جمیعھم (ابن جریر) کما صدق المھاجرون والمحققون من اھل یثرب (قرطبی) ھم ناس معھودون کعبد اللہ بن سلام واشیاعہ (کشاف) یہ بھی جائز ہے کہ الناس کو انسانِ کامل کے معنی میں لیا جائے۔ اور اس صورت میں مراد ہوگی کہ ایمان ان کی طرح جو صفتِ انسانیت میں کامل ہیں۔ اور واقعی انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔ الکاملون فی الانسانیۃ (کشاف) واللام فی الناس للجنس والمراد بہ الکاملون فی الانسانیۃ (بیضاوی) اس سے اشارہ یہ نکلا کہ جو منکرین ہیں وہ صورۃ انسان ہیں لیکن حقیقۃً ایسی ناقص کہ لاشئ ہو گئے ہیں۔ ومن عداھم کالبھائم فی فقد التمییز بین الحق والباطل (کشاف) ۳۴ (اس کے جواب اور اپنی صفائی میں) ۳۵ یعنی ان ترقی کے کچے اور سچے مسلمانوں پر، رسول کے صحابیوں پر۔ یعنون اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ابن جریر عن ابن عباسؓ وابن مسعودؓ) یہی سنت آج تک چلی آ رہی ہے۔ "ترقی پسندوں" "روشن خیالوں" اور "اہل تجدد" کے دربار سے آج بھی جمود پسند، رجعت پسند، تاریک خیال، وغیرہ کیسے کیسے خطابات خاص مخلصین اہل ایمان کو عطا ہوتے رہتے ہیں! ۳۶ کیا ٹھکانا ہے ان کے حمق اور کم فہمی کا! پہلے افساد کو اصلاح کہہ رہے تھے۔ اب حمق بالائے حمق یہ ہے کہ عقل، دور اندیشی وحکمت کو بے عقلی ٹھہرا رہے ہیں! اسفیہ کہتے ہیں اس کم عقل کو جسے اپنے نفع و نقصان کی پوری تمیز نہ ہو۔ السفیہ الجاھل الضعیف الرای القلیل المعرفۃ بمواضع المنافع والمضار (ابن جریر) ۳۷ (اور صاحب وجاہت صاحب اثر بھی ہیں) اے ابابکر واصحابہ (ابن عباسؓ) ۳۸ (اور آپ ہی جیسے مسلمان ہیں) انما کا ایمانکم (معالم) یہ بات یہ لوگ ذی اثر مسلمانوں کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے کہتے۔ غیر مراسمھم للمومنین ومصانعۃ وتقیۃ (ابن کثیر) منافقین کی ایک ذہنیت یہ بھی تھی کہ غریب عوام مسلمانوں کے مقابلہ میں تو اکڑتے رہتے لیکن مسلمانوں میں جو صاحب اثر واقتدار ہوتے ان کے آگے خود جھک جاتے اور ان سے تعلق ...

۳۹ یعنی اپنے شریر رفیقوں یا سرداروں کے پاس۔ شَیٰطِیْنِهِمْ شیطان کا لفظ عربی میں بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ ہر سرکش اور بہکانے والے کو شیطان کہتے ہیں۔ انسان، جنات، حیوانات سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ الشیطان کل عارم متمرد من الجن والانس والدابة (تاج) الشیطان اسم لکل عارم من الجن والانس والحیوانات (راغب) یہاں شیاطین سے مراد رؤسائے یہود و منافقین لئے گئے ہیں جو اپنی سرکشی و طغیان کے لحاظ سے خوب ہی شیطان بنے ہوئے تھے۔ یثرب کے کاہن جن کے یہ لوگ بہت معتقد تھے۔ کهنتهم ورءوساءهم (ابن عباس) رؤسهم فی الکفر (ابن جریر عن ابن عباس وابن مسعود) خَلَوْا اِلٰی۔ خلیٰ کا صلہ جب الی آتا ہے تو معنی ہوتے ہیں تنہا ہونے کے، تنہائی میں ملنے کے۔ خلا الیه اجتمع معه فی خلوة (لسان) خلا الیه انتهی الیه فی خلوة (راغب) ۴۰ (اپنے اصلی عقائد و خیالات میں) یعنی ہم مسلمانوں کے ساتھ تو محض ظاہرداری کے طور پر ہیں، اور مصلحۃً اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتے ہیں، ورنہ حقیقۃً تو ہم تمہارے ہی ہم عقیدہ، ہم مذہب ہیں۔ انا معکم ای انتم علیه من التکذیب بمحمد (ابن جریر) ۴۱ (ان مسلمانوں کو، ان کے پیمبر اور ان کے صحابیوں کو) بمحمد واصحابه (ابن عباس) مطلب یہ ہوا کہ عوام منافقین جب تنہائی میں اپنے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم دل و جان سے تو آپ ہی کے ساتھ ہیں۔ باقی مسلمانوں کے بنانے کے لئے ان کی سی کہہ دیتے ہیں۔ استہزاء کے معنی تمسخر کرنے، ہنسی اڑانے بنانے کے ہیں ۴۲ یعنی ان کے تمسخر کو انہیں پر پلٹے دیتا ہے۔ مجازات، سزا، معاوضہ کے موقع پر لغت عرب میں یہ محاورہ عام ہے کہ جزائے فعل کو اصل فعل ہی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ ای یجازیهم جزاء الهزء (راغب) مثل قول نسوا الله فنسیهم ای جازاهم جزاء النسیان (ابن قتیبه) جزاء الاستهزاء باسمه کما جزاء السیئة سیئة (بیضاوی) ہنسی اور تمسخر کا انتساب ذات باری تعالیٰ کی جانب قدیم صحیفوں میں برابر موجود ہے۔ "تو اے خداوند ان پر ہنسے گا، تو ساری قوموں کو مسخرہ بنائے گا" (زبور ۵۹: ۸) ...... "میں تمہاری پریشانی پر ہنسوں گا، اور جب تم پر دہشت غالب ہوگی تو میں ٹھٹھے ماروں گا" (امثال ۱: ۲۶)

يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا

کچھ دیکھتے بھالتے نہیں ۳۸ (وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں ۵۰ تو اب وہ

يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ

واپس نہ ہوں گے ۵۱ یا پھر جیسے آسمان سے زور کا مینہ برس رہا ہو ۵۲ اس میں

ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ

اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی ۵۳ وہ ٹھونسے ہوئے ہیں اپنے کانوں

فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ

میں انگلیاں، کڑک کے سبب موت کے اندیشہ سے ۵۴

وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ

حالانکہ اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو ۵۵ قریب ہے کہ بجلی ان کی

يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا

بینائی ہی اچک لے جائے ۵۶ وہ جب ان پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں یہ

فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ

چلتے ہیں، اور جہاں ان پر اندھیرا ہوا (تو بس) کھڑے رہ جاتے ہیں ۵۷ اللہ اگر

شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ

چاہتا تو ان کے کان اور ان کی بینائی سلب کر لیتا ۵۸

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ ع ۲/۲

بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۵۹

منزل ۱

۴۳ (اپنے قانون تکوینی کے مطابق) خالق کائنات نے بندوں کو جو آزادی و اختیار دے رکھا ہے، اس میں وہ خواہ مخواہ دست اندازی کبھی نہیں کرتا۔ سانپ کو کاٹنے کی، زہر کو ہلاک کرنے کی، آگ کو جلانے کی یہ ساری اجازتیں اور آزادیاں اسی کے قانون تکوینی کے مطابق ہیں۔ ۴۴ یہ خود ایک تفسیر ہوگئی اللہ کے "استہزاء" کی۔ عمه اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کو راستہ سجھائی نہ دے، اور وہ ادھر ادھر اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور ہاتھ پاؤں مارتا پھرے۔ هو التردد فی الضلال والتحیر فی منازعة (تاج) العمی فی العین والعمه فی القلب (قرطبی) وحی الٰہی کی روشنی سے محرومی کے بعد انسان کی واقعی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ اپنی محدود و ناقص "عقل" کے سہارے وہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ طرح طرح کے "نظریے" قائم کرتا ہے۔ "اصول" و "کلیات" بناتا ہے۔ ہر طرف ظن و تخمین کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ کھلا ہوا راستہ کوئی نہیں سجھائی دیتا ہے۔ شک، ارتیاب، بے اطمینانی کے دلدل میں اور زیادہ پھنستا جاتا ہے۔ ۴۵ ان کی بدبختی کی انتہا ہے کہ انہوں نے ہدایت و ایمان جیسی جنس بے بہا قیمت میں دیکر خریدی بھی تو کیسی نکمی اور بے حقیقت چیز، گمراہی و کفر! اِشْتَرَوُا۔ اشتراء یا خریداری کے معنی کسی چیز کا معاوضہ میں لینا۔ ایمان کا قبول کر لینا ان منافقین کے بالکل اختیار کے اندر تھا لیکن اسکے بجائے انہوں نے روش کفر اختیار کرلی۔ اہل عرب ہر استبدال کے موقع پر اشتراء بولتے ہیں۔ اختاروا الکفر علی الایمان (ابن عباس) ای استبدلوا الکفر بالایمان (معالم) والعرب تستعمل ذلك فی کل من استبدل شیئا بشیء (قرطبی) ویجوز الشراء والاشتراء فی کل ما یحصل به شیء (راغب) بِالْهُدٰی میں ب کے معنی ہیں عوض۔ ای بدله (ابو سعود) عرب کے باشندوں کا تجارتی کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا، اور تجارت کی اصطلاحیں ان کی زبان و ادب کا ایک جزو بن گئی تھیں۔ جیسا کہ آج کل انگریزوں کا کاروبار خوب پھیلا ہوا ہے، اور کاروباری اصطلاحیں انگریزی زبان و ادب کا جزو بن چکی ہیں۔ ۴۶ (اور سمجھتے بھی کیسے، جب کہ اپنی قوت ارادہ و فیصلہ سے صحیح کام نہ لے کر خود گمراہی خرید بیٹھے تھے) تجارت میں مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ رہے اور نفع اس پر بڑھتا رہے۔ یہاں منافق کافروں نے نفع کا کیا ذکر، عقل سلیم کے اصل سرمایہ ہی کو الٹا برباد کر ڈالا (کبیر) ربح بھی تجارتی اصطلاح ہے، اردو کے لفظ منافع کے معنی میں۔ ۴۷ (محرومی و خسران کے لحاظ سے) الَّذِی لفظاً واحد ہے، لیکن یہاں معنیً بطور جمع کے استعمال ہوا ہے۔ یقع للواحد والجمع (قرطبی) وضع الذی موضع الذین (کشاف) عربی میں متعدد نظائر اس طریق استعمال کے کہ لفظ واحد لاکر مراد جمع لی گئی ہے، خود قرآن مجید ہی میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً وخضتم کالذی خاضوا۔ الذی جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون۔ ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدة۔ وغیرہا۔ مَثَل کے مفہوم میں ایک پہلو ندرت و غرابت کا بھی شامل رہتا ہے یعنی ایسا حال جو عجیب و غریب ہو۔ ولم یضربوا مثلاً الا قولا فیه غرابة من بعض الوجوه (کشاف) ۴۸ یعنی مسائل و حقائق خوب واضح و روشن ہو گئے ۴۹ (اور طرح طرح کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں) مطلب صرف اس قدر ہے کہ منافقین کا اندرونی نور بصارت سلب ہو گیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں طلب حق مطلق نہ تھی۔ اور قانون اسلام کے مقابلہ میں وہ راہ تمامتر انکار و بغاوت کی اختیار کئے ہوئے تھے لیکن ادنیٰ و حقیر مصلحت کوشیوں کی بنا پر زبان سے اظہار اسلام کئے جاتے تھے۔ یہاں ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جب حقانیت کی آگ خوب روشن ہوگئی اور ہدایت کا نور ہر طرف پھیل گیا، تو بجائے اس کے کہ اس سے مستفید ہوتے، منافقین نے خود اپنے اندرونی حاسۂ بصارت کو ضائع کر دیا۔ اور اس روشنی سے محروم ہوگئے۔ سلب بصارت اور گمراہی میں چھوڑ دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب محض تکوینی حیثیت سے ہے۔ یعنی جب منافقوں نے گمراہ رہنا چاہا اور دعوت حق کو قبول و توجہ کے کانوں سے سنا ہی نہیں، تو مشیت الٰہی نے بحیثیت علت العلل کے اس پر نتیجہ بھی وہی مرتب کر دیا۔ رضائے الٰہی کو اس میں مطلق دخل نہیں۔ ۵۰ یعنی صدائے حق کو گویا سنتے ہی نہیں، اور کلمہ حق و ایمان کے ادا کرنے سے ان کی زبان گنگ ہے۔ اور دید حق کی طرف سے ان کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اپنی اختیاری گمراہی کے نتیجہ کے طور پر۔ ۵۱ (باطل سے حق کی طرف، کفر سے ایمان کی طرف) عن کفرهم وضلالتهم (ابن عباس) الی الهدی ولا الی خیر (ابن جریر عن ابن عباس) ۵۲ منافقین مدینہ کے بھی دو طبقے تھے۔ ایک تو وہ تھے جن کے دلوں میں سرتاپا کفر تھا۔ ایمان کا گزر ہی نہ تھا۔ اس طبقہ کے منافقین کی مثال ابھی اوپر گزر چکی۔ ذهب الله بنورهم وترکهم فی ظلمات لا یبصرون۔ دوسرا طبقہ ان منافقین کا تھا جو کھلے منکر بھی نہ تھے بلکہ آج کل کے بعض انتہائی روشن خیالوں کی طرح متشککین و مذبذبین میں تھے۔ اسلام کی ظاہری قوت و شوکت اور مادی اقتدار و فتح مندی کو دیکھ کر کبھی چند قدم اس کی طرف بڑھتے۔ اور جب مسلسل یہ کامیابی نہ پاتے، تو پھر پیچھے ہٹ جاتے۔ آیت میں مثال اس طبقہ کے منافقین کی بیان ہو رہی ہے۔ هذا مثل آخر ضربه الله تعالیٰ لضرب آخر من المنافقین وهم قوم یظهر لهم الحق تارة ویشکون تارة اخری (ابن کثیر) هذا هو المثل الثانی للمنافقین (کبیر) صَیِّبٍ اس باران رحمت سے اشارہ ہے طلوع اسلام کی جانب۔ المراد من الصیب هو الایمان والقرآن (کبیر) السَّمَآءِ یہاں کثرت سے اس کے معنی بادل یا سحاب کے نقل ہوئے ہیں۔ ای من السحاب (معالم) قیل المراد بالسماء السحاب (بیضاوی) سماء کے خود لفظی معنی میں بھی اس مفہوم کی پوری گنجائش موجود ہے کہ ہر چیز جو انسان سے اوپر کی طرف ہو لغت میں سماء ہی ہے۔ السماء کل ما علاك فاظلك (قرطبی) اَوْ کو بعض نے یہاں بل کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے و کے معنی میں (کبیر) ۵۳ اشارہ ہے ان شدائد کی طرف جو آغاز اسلام میں امت کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شرعی پابندیاں مراد ہوں جو اظہار اسلام کے بعد بہرحال منافقین پر بھی عائد ہو جاتی تھیں۔ مثلاً ادائے نماز، فریضہ جہاد، ترک امارت قدیم، اطاعت رسول وغیرہا (کبیر) فیه میں ضمیر کا مرجع صیب بھی ہو سکتا ہے اور السماء بھی۔ ظلمت کا تعلق فی صیب سے بھی ہو سکتا ہے اور فی السماء سے بھی۔ ماحصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے ۵۴ یہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے والے وہی اندھیروں میں راہ چلنے والے ہیں یعنی منافقین و مذبذبین۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین اپنی بزدلی، پست ہمتی، دوں فطرتی کی بنا پر اسلام لانے میں ہر وقت خطرے ہی دیکھ رہے ہیں۔ ایک معنی یہ بھی نقل ہوئے ہیں کہ منافقین قرآن مجید کے بیانات اور احکام و وعید کی تصریحات سننے ہی سے بچنا چاہتے

تھے اور کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے اس ڈر سے کہ کہیں یہ کلام اثر کر جائے اور انہیں اسلام لاتے ہی بن پڑے۔ من الصواعق لمعنی بیان القرآن و وعد و وعید (ابن عباسؓ) حذر الموت لمخافة میل القلب الیه (ابن عباسؓ) ۵۵ (اپنے علم سے، قدرت سے، ہر لحاظ سے) سو وہ اس کی گرفت سے بچ کر جا کہاں سکتے ہیں اور اس کے سامنے ان کی ساری تدبیریں اور حیلے بے اثر رہیں گے۔ جیسے محیط سے وہ چیز نہیں بچ سکتی جو اس کے احاطہ میں ہو۔ لے عالم بهم و جامعهم فی النار (ابن عباسؓ) مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر محض علم ہی کے لحاظ سے محیط نہیں بلکہ ذاتاً بھی محیط ہے، بلا کسی کیفیت کے۔ اور عارف رومیؒ نے کہا ہے اتصالے بے تکیف بے قیاس ۔ ہست رب الناس را با جان ناس ۵۶ (اور ان کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں) تشبیہ مرکب کے سلسلہ میں بیان ہو رہا ہے کہ غلبہ اسلام کی قوت و شدت کا، کہ منافقین کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے لئے اور انہیں مرعوب کرنے کے لئے کافی ہے۔ وهذا التمثیل لشدة الامر علی المنافقین (کشاف) ۵۷ یعنی جب اسلام کی مادی نعمتیں اور کامیابیاں دیکھتے ہیں تو ان منافقین و مذبذبین کے قدم گویا اضطراراً اسلام کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ طلب حق تو ان کے دل میں ہوتی ہی نہیں، البتہ مرعوبیت کچھ دیر کے لئے آمادہ کر دیتی ہے لیکن جب اہل ایمان کو ابتلا پیش آنے لگتے ہیں، تو یہ منافقین و مذبذبین انکار اور بے یقینی کے مقام پر پھر ٹھٹک جاتے ہیں۔ اور اسلام کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ کلما اضاء لهم مشوا فیه۔ کلما اصاب المنافقین من عز الاسلام اطمانوا الیه (ابن کثیر۔ عن ابن عباسؓ) واذا اظلم علیهم قاموا۔ ولذا اصاب الاسلام نکبة قاموا لیرجعوا الی الکفر (ابن کثیر۔ عن ابن عباسؓ) مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ ایسا ہی حال اس سالک کا ہے جو حالت بسط میں طاعات میں لگا رہتا ہے اور قبض میں چھوڑ بیٹھتا ہے۔ ۵۸ (جیسا معاملہ کہ بعض اگلی قوموں کے ساتھ پیش بھی آچکا ہے) توریت میں ہے۔ "جب وہ اس کی طرف کو اترے تو الیسع نے خداوند سے دعا مانگی اور کہا کہ مہربانی کر کے ان لوگوں کو اندھا کر دیجئے سو اس نے جیسا کہ الیسع نے کہا تھا ان کو اندھا

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى

اے انسانو!۵۹ عبادت (اختیار) کرو اپنے پروردگار کی ۶۰ جس نے تمہیں

خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

پیدا کیا ۶۱ اور تم سے قبل والوں کو (بھی) ۶۲ عجب نہیں کہ

تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ

تم پرہیزگار بن جاؤ ۶۳ (وہ) وہی (پروردگار) ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ایک

فِرَٰشًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ

فرش اور آسمان کو ایک چھت بنا دیا ہے ۶۴ اور آسمان سے پانی

مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ

اتارا ۶۵ پھر تمہارے لئے غذا کو پھل پیدا کئے ۶۶

فَلَا تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

سو تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ ۶۷ اور تم جانتے (بوجھتے) بھی ہو ۶۸

وَإِن كُنتُمْ فِى رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ

اور اگر تم اس کتاب ہی کے بارہ میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر

عَبْدِنَا فَأْتُوا۟ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِۦ وَٱدْعُوا۟

اتاری ہے ۶۹ تو کوئی ایک سورت اس جیسی تم بھی بنا لاؤ ۷۰ اور اپنے

شُهَدَآءَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمْ

حمایتیوں کو بھی اللہ کے مقابلے میں بلا لو ۷۱ اگر تم

منزل ۱

کر دیا۔" (۲ سلاطین۔ ۲: ۱۸) ولو شاء اللہ۔ یعنی مشیت الٰہی اگر یہی ہوتی، قانون تکوینی اگر اب بھی یہی ہوتا۔ اس سے اشارہ یہ بھی نکل آیا کہ مؤثر حقیقی صرف ارادہ الٰہی ہے۔ اور اسباب ظاہری میں تاثیر جو کچھ بھی پیدا ہوتی ہے مشیت الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ بذات خود موجود نہیں ہے۔ والتنبیه علی ان تاثیر الاسباب فی مسبباتها مشروط بمشیة اللہ تعالیٰ (بیضاوی) ۵۹ (چنانچہ اس پر قادر ہے، اور اب بھی یہی کر سکتا ہے) قدیر صیغہ مبالغہ ہے، زور و قوت میں قادر سے زیادہ۔ اسلام کا خدا قادر مطلق ہے ہمہ توان ہے۔ مصری، ہندی، یونانی خداؤں کی طرح ناقص اور محدود القویٰ نہیں ۶۰ قرآن مجید کا مخاطب سارا عالم انسانیت ہے۔ کوئی مخصوص نسل مثلاً بنی اسرائیل اور کوئی مخصوص قوم مثلاً اہل عرب نہیں۔ خطاب لجمیع من یعقل (بحر) یہ طرز خطاب خود ایک دلیل ہے تخاطب کے عام سمجھنے پر۔ پچھلے دور کوعوں میں موجودات انسانی کی سہ گانہ تقسیم اور مومن، مشرک اور اعتقادیات کی پیچ پیچ یعنی مومن، کافر، منافق۔ اب خطاب سارے عالم انسانی کو مجموعی طور پر شروع ہو رہا ہے ۶۱ قرآن مجید کے اصل پیام کا آغاز گویا اب ہو رہا ہے۔ اور اس کا عنوان اول یہ مسئلہ توحید کو ہی اصل و اساس ہے سارے عقائد و مسائل اسلامی کی ۶۲ (تن تنہا، بلا کسی کی شرکت و اعانت کے) عمل تخلیق خالص خدائی عمل ہے۔ ہمسر و مساوی ہونا تو خیر الگ رہا، ماتحت و معاون کی بھی حیثیت سے کوئی شریک تخلیق نہیں۔ پھر خلقکم سے اس پر بھی زور دینا مقصود ہے کہ کائنات "خلق" ہوئی ہے، نیست سے ہست ہوئی ہے، عدم سے وجود میں آئی ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے سے کوئی غیر مخلوق مادہ موجود تھا۔ اللہ نے اسکی صورت میں کوئی خاص صفت و ترتیب پیدا کر دی۔ بہت سے باطل مذہبوں کا رد اسی سے نکل آیا ۶۳ (پس الوہیت و معبودیت کا سزاوار وہی ایک خالق بے ہمتا ہے) الذین من قبلکم سے پچھلی انسانی نسلوں کا مراد ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ خلقت انسانی سے قبل جو روئے زمین پر کوئی اور مخلوق بھی آباد ہو، جیسا کہ توریت میں تصریح بھی ہے۔ قرآنی لفظ ان سب ممکن مخلوقات پر حاوی ہے۔ "تم کو" (یعنی موجودین بصیغہ حال) اور "تم سے قبل والوں کو" (یعنی موجودین بصیغہ ماضی) یہ دو لفظ لا کر قرآن مجید نے اشارہ ادھر بھی کر دیا کہ توحید کا درس ماضی و حال، تاریخ و مشاہدہ، دونوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے ۶۴ (کہ توحید ہی مرتبہ تقویٰ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے) لکونوا من المتقین الذین رضی اللہ عنهم (ابن جریر) لعل سے ترا طمع رکھنے امید و آرزو کیلئے لیکن قرآن مجید میں جہاں حق تعالیٰ کی طرف سے ادا ہوا ہو تو کسی فعل کی آرزو کی جگہ اسکے وقوع کا اور شک و احتمال کی جگہ یقین کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ لعل وعسیٰ حرفا ترج وطمع وشک وقد جاءت فی القرآن بمعنی کے (لسان) وقد جاءت فی القرآن بمعنی کے (تاج) ۶۵ آیت کے اس ٹکڑے کی جان یا اصل روح جعل لکم ہے۔ مقصود زمین و آسمان کی ہیئت بیان کرنا یا ان کی ارضیاتی یا فلکیاتی ماہیت بیان کرنا کسی درجہ میں بھی نہیں۔ بیان صرف یہ کرنا ہے کہ زمین ہو یا آسمان، کوئی بھی از خود نہیں بن گئے ہیں، بلکہ جو کچھ اور جیسے بھی کچھ ہیں، اللہ کے بنائے ہوئے، اور اسی قادر مطلق کے زیر فرمان ہیں۔ ربکم الذی جعل لکم۔ دوسری تعلیم ساتھ ہی ساتھ یہ ملی کہ زمین و آسمان انسان کیلئے خلق ہوئے ہیں، انسان زمین و آسمان کے لئے خلق نہیں ہوا ہے۔ مقصود و مطلوب انسان ہے۔ زمین و آسمان دونوں باذن الٰہی، اسی خلیفۃ اللہ کے خادم ہیں۔ پھر یہ کیسی شدید حماقت ہے کہ انسان اپنے ان خدائی خادموں کے آگے جھکنے لگے اور انہیں کو معبود قرار دے کر انکی پرستش کرنے لگے۔ الارض ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے قدموں کے نیچے ہو۔ وکل ما سفل فهو ارض (تاج) اسی طرح سماء ہر اس بلند چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے سر کے اوپر ہو۔ السماء کل ما علاک (تاج) کل ما علا واظل قیل له سماء (قرطبی) ارض میں اصل تخیل پستی کا ہے۔ اور انسان کے تعلق میں اس کا اصل وصف فراش یا ماتبسط کا ہے یعنی وہ ایسی چیز جو بچھا دی گئی ہو، یا بچھی ہوئی ہو۔ ہمارے لئے فرش یہ ایسی ٹھوس اور ہموار چیز جس پر ہم قدم رکھ سکتے ہیں، چل سکتے ہیں، بیٹھ سکتے ہیں، لیٹ سکتے ہیں، نہ کوئی ایسی کھردری یا پھسلنی چیز جس پر بیٹھنا، چلنا، قدم رکھنا نا ممکن ہو۔ یہ زمین اپنی ہیئت کے لحاظ سے گول ثابت ہو یا چپٹی، بہرحال و بہرصورت اس کا تعارف انسان و انسانیت کے سلسلہ میں اس سے بہتر ممکن نہیں کہ وہ انسان کیلئے فرش کا کام دے رہی ہے، اور اس کام پر اسے اللہ ہی نے لگایا ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہاں اس کا یہی وصف بیان کر دیا۔ اسی طرح سماء میں اصل تخیل بلندی کا ہے۔ زمین جس طرح بطور فرش ہمیں نیچے سے سنبھالے ہوئے ہے، آسمان اسی طرح ہمیں اوپر سے ڈھانپے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ جو محسوس و مرئی چیز اس قدر بلند ہے کہ بڑے بلند میناروں کی بلندیاں، اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں، پرندوں اور طیاروں کی بڑی سے بڑی بلند پروازیاں سب اس کے اندر سما جائیں اور سب اس سے پست ہی رہیں تو چھت کا اطلاق اس پر بھی نہ ہو گا تو کس پر ہو گا؟ زمین کی طرح آسمان کی ہیئت سے قرآن مجید یعنی دنیا کے اس اخلاقی اور روحانی نظام نامہ کو کوئی تعلق نہیں۔ آسمان کوئی ٹھوس مادی جسم رکھتا ہے، یا محض خلا منتہائے نظر ہے، اس قسم کے مسائل کا تعلق تمام تر دنیوی تجربی علوم سے ہے۔ قرآن کو تو آسمان کا صرف وہی وصف بیان کرنا تھا جو سلسلہ الٰہی و خلافت الٰہی سے تعلق رکھتا ہے، اور یہی اس نے کر دیا۔ زمین و آسمان کی پوجا ہر مشرک، جاہل و "متمدن" قوم نے کی ہے۔ اور آسمان کو تو بہت بڑا دیوتا یونانیوں سے لیکر ہندیوں تک سبھی نے مانا ہے۔ قرآن کی اصلی زد انہیں مشرکانہ تخیلات اور جاہلی اوہام پر کر پڑتی ہے ۶۶ (اسی معبود واحد برحق اور اسی خالق یکتا و مطلق نے، نہ کہ کسی دیوی دیوتا نے) مقصود اس حقیقت کی تعلیم ہے کہ آسمان اور بارش سب خدائے واحد ہی کی مخلوق و مصنوع ہیں۔ نہ کوئی آکاش دیوتا ہیں، نہ کوئی اندر دیوتا اور نہ کوئی Father-Zeus بلکہ یہ کلدانیوں، مصریوں، ایرانیوں، ہندیوں، یونانیوں، رومیوں کے سب گڑھے گڑھائے خرافات ہیں۔ آسمان اور بارش کی پرستش دنیا سے بالکل ختم اب بھی نہیں ہوئی ہے۔ ایشیا، افریقہ، امریکہ تینوں براعظموں کے خدا معلوم کتنے گوشوں میں اب بھی یہ شرک جاری ہے۔ لفظ سماء کے معنی اوپر کے حاشیہ میں ابھی گزر چکا ہے کہ بہت وسیع ہیں۔ اس لئے سماء سے پانی کا اترنا، بادل سے پانی کے اترنے، بخارات کے منجمد ہونے اور پھر گرمی پا کر برس پڑنے، یا اور اسی طرح کے درمیانی واسطوں کے ہرگز منافی نہیں ۶۷ (اسی معبود واحد اور خالق یکتا نے، نہ کہ کسی اور دیوی دیوتا نے) خدا جانے کتنی مشرک قومیں الگ الگ دیوی دیوتا، زراعت کے، نباتات کے، پھل پھلاریوں کے مان چکی ہیں۔ قرآن مجید کا کام مسائل طبیعیات، فلکیات، جغرافیہ طبعی وغیرہ کی تعلیم دینا نہیں، بلکہ ان عالمگیر مشرکانہ عقائد اور جاہلی تخیلات کی تردید ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے یا جو کچھ ہو رہا ہے وہ نہ از خود اور بے سبب ہے، اور نہ کسی اور کی قوت سے ہو رہا ہے۔ تمام تر قادر مطلق ہی کی کارفرمائی کا ثمرہ ہے۔ به یعنی پانی کے واسطہ یا ذریعہ سے للمعنی اجعل

عطاء سبحانی خود جماد و مادہ بعد ازاں خود پانی کو جو خیر عظیم ہر قسم کی زمینی پیداوار اور نباتات میں ہے محتاج بیان نہیں ٦٨ (کسی کو کسی حیثیت سے بھی) خلیفۃ اللہ جب کبھی اپنے مقام و مرتبہ کو بھول کر پستی میں گرا ہے تو اس نے اپنا سر جھکایا اور ماتھا ٹیکا
ہے درختوں کے آگے، ان کے پھلوں کے آگے، بارش کے دیوتا کے آگے، زمین کے آگے، آسمان کے آگے۔ قرآن مجید اسی حماقت و سخافت پر اسے تنبیہ کر رہا ہے۔ فلا تجعلوا میں ف سببیہ ہے یعنی جس نے تمہیں ان نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا، وہ اسی لائق ہے
کہ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ انداد۔ ند عربی میں کہتے ہیں مثل و مشابہ کو بھی، اور مخالف و مدمقابل کو بھی۔ الند المثل والنظیر وقال الاخفش الند الضد والشبہ (تاج) چنانچہ انداد کے معنی اضداد اور اشباہ دونوں لکھے گئے ہیں (تاج) لفظ کی
جامعیت میں نکتہ یہ ہے کہ شرک دنیا میں دونوں قسموں کا مروج رہا ہے۔ بہت سی قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو محض ایک خدائے اصغر یا ماتحت خدا تسلیم کیا ہے، اور مجوس نے اہرمن کو یزدان کے حریف و مدمقابل کی حیثیت سے پیش کیا ہے ٦٩ (اپنے الہام فطری اور علم و فہم بشری کی بنا پر
کہ سب کا حاکم سب کا خالق بس وہی ایک ہے) اتنی بصیرت، جو توحید تک پہنچا دے، ہر طبیعت بشری میں ودیعت رکھ دی گئی ہے۔ بشرطیکہ غلط تعلیم و تربیت اور ناقص ماحول اس فطرت ہی کو مسخ نہ کر ڈالے۔ وانتم تعلمون انی صانع ہذہ الاشیاء (ابن عباس) انکم
لکمال عقولکم تعلمون ان ہذہ الاشیاء لا یصح جعلہا انداداً للہ تعالیٰ (کبیر) ٧٠ (یعنی اس کے کلام الٰہی ہونے کے باب میں اے کافرو اور منکرو) خطاب یہاں یایہا الناس کے تحت میں ساری دنیا سے ہو رہا ہے، صرف اہل عرب یا قریش سے نہیں ارشاد
ہو رہا ہے کہ اگر تمہارے خیال میں یہ کلام الٰہی نہیں، تو یقیناً ایک انسانی تصنیف ہوگی۔ اور جب ایک انسان ایسی تصنیف پر قادر ہے تو دوسرا بھی ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ لائق و فائق انسانوں کا ایک پورا مجمع۔ اکثر اسلام کے اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک توحید باری،
دوسرے رسالت محمدی۔ توحید کا بیان اوپر کی دو آیتوں میں ہو چکا، اب صورت تصدیق رسالت کی دی جا رہی ہے ٧١ (جن کا نام محمد ہے) سیاق و موقع ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم کے خاص قرب اختصاص کے اظہار کا ہے۔ نیز آیت میں ایک نہایت پر زور اور دائمی

صٰدِقِيْنَ ۝٢٣ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا
سچے ہو ٧٤ اور اگر تم (یہ) نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے ٧٥
فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ
تو پھر اس آگ سے ڈرو ٧٦ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں ٧٧
اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝٢٤ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
(اور) وہ کافروں کے لئے تیار کی ہوئی ہے ٧٨ اور ان لوگوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو ایمان لائے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
اور نیک عمل کئے، ٧٩ کہ ان کے لئے (بہشتی) باغ ہیں کہ ان کے نیچے
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ
دریا بہ رہے ہوں گے ٨٠ انہیں جب کوئی پھل کھانے کو دیا
ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ
جائے گا تو وہ بول اٹھیں گے ٨١ کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں (اس کے) قبل
قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ
مل چکا ہے ٨٢ اور انہیں وہ (واقعی) دیا ہی جائیگا ملتا جلتا ہوا ٨٣ اور ان کے لئے
اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٢٥
پاکیزہ بیویاں ہوں گی ٨٤ اور وہ وہاں (بہشتوں) میں ہمیشہ کے لئے ہوں گے ٨٥
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً
اللہ اس سے ذرا نہیں شرماتا ٨٦ کہ کوئی مثال بیان کرے مچھر کی

چیلنج منکرین کو دیا جا رہا ہے لیکن اس انتہائی زور اور اہمیت کے موقع پر بھی جو سردار انبیاء اور سردار رسل تھے اور وہ قرآن کی زبان
میں محض ایک عبدہ بندہ یا چاکر ہیں! —— نہ خدا کے بیٹے اور اکلوتے بیٹے، نہ خدا کے مثل، نہ خدا کے بروز یا اوتار، نہ خدا
کے وزیر یا مشیر، بلکہ محض عبد محض بندے! توریت میں "خداوند کے خادموں" کا لقب ایسے ہی اعزاز و اکرام کے موقع پر آیا
ہے، اور ابراہیم نبی، اسحٰق نبی اور یعقوب نبی کو خداوند کا خادم ہی ٹھہرایا ہے۔ نزلنا یعنی جس کلام کو ہم نے تھوڑا
تھوڑا کر کے بتدریج حسب ضرورت و مصلحت اتارا ہے۔ شک و تردد کا ایک بڑا سبب یہی نزول تدریجی تھا۔ منکرین کہتے
تھے کہ جس طرح اور شاعر سوچ سوچ کر شعر کہتے ہیں، یہ رسول بھی وقفوں کے ساتھ اسے گڑھتے رہتے ہیں۔ خدائی کلام
ہوتا تو ایک بارگی سب کا سب نہ آ جاتا (مظہری) عبدنا سے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ آپ عبدیت میں کامل
اور احکام الٰہی کے پورے پورے مطیع و فرمانبردار تھے (مظہری) ٧٢ (معانی کی بلندی، مطالب کی جامعیت،
مضامین کی ندرت کے لحاظ سے) قرآن مجید اپنی زبان کی فصاحت اور حسن انشاء کے لحاظ سے بھی یقیناً بے نظیر
ہے، جیسا کہ عرب کے بڑے بڑے ماہرین ادب تسلیم کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں جو تحدی کی جا رہی ہے اس کا مخاطب
یایہا الناس کے ماتحت سارا عالم ہے، صرف قریش یا اہل عرب نہیں۔ اس لئے قرآن مجید کو یہاں صرف انشاء و فصاحت
تک محدود رکھنا اس کے عام و عالمگیر چیلنج کو محدود کر دیتا ہے۔ قرآن نے اپنی حقیقت خود یہ بیان کر دی ہے کہ وہ
ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کتاب ہدیٰ ہے۔ یعنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام نامہ، مکمل و ہمہ گیر و جیتی
دستور العمل، اس کے علاوہ اس کی اور جتنی حیثیتیں ہیں، تبعی و ضمنی ہیں۔ وہ یہاں پیش اپنے اسی سب سے بڑے وصف
کو کر رہا ہے، اور پکارے کہہ رہا ہے کہ جو ہدایتیں اور بصیرتیں میرے ایک ایک سورہ کے اندر موجود ہیں، اب اگر تم
اپنی متحدہ کوشش اور جد و جہد سے بھی اس کے مقابلہ کی کوئی چیز پیش کر سکتے ہو تو لاؤ دکھاؤ۔ من مثلہ میں
مثلیت کی تفسیر پر بہترین روشنی خود قرآن مجید ہی سے پڑتی ہے۔ قل فاتوا بکتب من عند اللہ ہو اھدی
منہما اتبعہ ان کنتم صدقین (قصص آیت ٤٩) ھو اھدی کے ایجاز میں سب کچھ آ گیا۔ من مثلہ کی تفسیر
میں مفسرین کے اقوال کثرت سے مثلہ فی البلاغۃ اور حسن نظم کے منقول ہوئے ہیں، لیکن اعجاز من جہۃ
المعنی کا پہلو بھی اہل تحقیق سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ یعنی مثل ہذا القرآن حقاً وصدقاً لا باطل فیہ
ولا کذب (ابن جریر عن قتادہ) اور امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں متعدد پہلو اختیار کئے ہیں۔ من مثلہ میں من
بعض نے کہا ہے تبعیض کے لئے ہے، بعض نے کہا ہے تبیین کے لئے ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ زائد ہے۔ من
للتبعیض او للتبیین و زائدۃ عند الاخفش (بیضاوی) بسورۃ یعنی پورا قرآن نہ سہی، اس کا نصف یا ثلث
بھی نہیں۔ اس کی کسی ایک سورۃ ہی کے برابر تم تصنیف کر دکھاؤ! لفظ سورۃ پر حاشیہ شروع میں گزر چکا ہے۔
٧٣ شہداء کم میں شہداء سے عموماً مراد حامیوں اور ناصروں سے لی گئی ہے۔ یعنی اعوانکم ما انتم
علیہ (ابن جریر عن ابن عباس) معناہ اعوانکم ونصراء کم (قرطبی) المراد من الشہداء اکابرہم او من یوافقہم فی
انکار امر محمد علیہ السلام (کبیر) لیکن اگر شہداء کے وہی لفظی معنی گواہ کے رکھے جائیں جب بھی مراد یہ ہوگی کہ ان لوگوں
کو بھی بلا دیکھو، جو تمہارے اس خوبی کی کہ تم نے کسی قرآنی سورت کا جواب لکھ لیا ہے تصدیق کر دیں۔ اناس
یشہدون لکم (ابن جریر عن مجاہد) ٧٤ (اپنے اس زعم و گمان میں کہ قرآن انسانی دماغ کی پیداوار ہے) قرآن کا سیدھا سادہ دعویٰ یہ ہے کہ وہ انسان کا نہیں، خدا کا کلام ہے۔ اور اپنے اس دعویٰ پر دلیل اس نے کیسی قطعی، اور عوام و خواص دونوں کی سمجھ میں
آ جانے والی یہ پیش کر دی ہے کہ اگر کوئی اسے امکان بشری کے اندر سمجھتا ہے، تو ذرا اس کا ادنیٰ اور ہلکا نمونہ بھی سب کی متحدہ کوشش سے پیش کر دکھائے! قرآن کے چیلنج کو ساڑھے تیرہ سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں، اور دنیا کے کتب خانے اس کتاب سازی کے
عہد میں، قرآن کے برابر کیا معنی تقریباً برابر کتاب سے بھی یکسر خالی ہیں! ٧٥ (قیامت تک) اللہ اکبر! کس زور کی تحدی ہے اور وہ بھی ایک امی کی زبان سے! اپنی عقل و حکمت، اپنے علوم و فنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا کیسا جوش اس وقت بھی آیا ہوگا اور
آج بھی آ رہا ہے۔ ع لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی! کتنے نئے نئے مسلک روز پیدا ہو رہے ہیں، کیسی کیسی "isms" ہر روز اٹھ رہی ہیں، اور دنیا کو راہ نجات دکھانے میں سب کی سب بیکار ہی ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ سب گویا قرآن کے
جوابات ہی ہیں۔ ہر جواب ناکام، اور شرمناک حد تک ناکام! ٧٦ یہ دنیا کی نہیں دوزخ کی آگ ہوگی۔ وہ دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ تیز اور جلانے والی ہے۔ یہاں تک کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ وہ اس سے ستر حصے زیادہ تیز ہوگی۔ آخرت کے
عذاب آتشیں کا ذکر توریت میں بھی ہے۔ ملاحظہ ہو یسعیاہ ٣٣: ١٤ نیز ٦٦: ٢٤۔ انجیل کی تعلیم تمام تر رافت و حلم، عفو و درگزر کی سمجھی جاتی ہے لیکن آگ کے جہنم کا ذکر حضرت مسیح کے ٹھنڈے مواعظ میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو متی ١٨: ٨، ٩۔
فاتقوا جواب شرط ہے۔ اور ف نتیجہ کو بتلا رہا ہے۔ یعنی جب قرآن کی پیش کی ہوئی دلیل کے جواب سے عاجز آ چکے ہو، اور اپنے انکار پر کوئی دلیل خود رکھتے نہیں ہو، تو اب انکار حق کئے چلے جانا بجز عناد و خبث نفس کے اور کس چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟
اور جہنم کا عذاب آتشیں اسی معاندانہ انکار حق کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے ٧٧ جہنم کی اصل غذا تو خود اہل کفر و شرک ہوں گے۔ سزا انہیں کو ملے گی لیکن اس سزا میں اشتداد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کی مورتیوں، ان کے ٹھاکروں کو بھی ان کے پہلو میں
رکھ دیا جائیگا۔ اور گویا ان سے کہا جائیگا کہ لو اب اپنے انہیں معبودوں سے کام لو جنہیں دنیا میں پوجتے رہے تھے۔ شرک اور مورتی پوجا میں تعلق بہت قدیم، بہت وسیع، بہت گہرا ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر مشرک قوم نے بت پرستی بھی ضرور کی ہے۔
کلدانیہ، مصر، عرب، یونان، روم سب بت پرست رہ چکے ہیں، اور ہندوستان کی بت پرستی تو مشہور ہی ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ والمراد بہا حجارۃ الاصنام والانداد التی کانت تعبد من دون اللہ (ابن کثیر) اراد بہا الاصنام (معالم) جدید
جاہلی متمدن و مہذب قوموں کا ذوق سنگ تراشی و مجسمہ سازی بھی بت پرستی سے کچھ بہت زیادہ دور نہیں ٧٨ یہیں سے اہل سنت نے یہ استنباط کیا ہے کہ جہنم کی اصل غایت کافروں کی تعذیب ہے۔ نہ کہ محض اہل فسق و عصیان کی۔ عارضی طور پر یہی تادیب کے
لئے اس میں داخل کر دئے جائیں تو یہ ایک الگ چیز ہے ٧٩ (اے ہمارے پیغمبر!) بشر۔ گویا مومنین صالحین اس کے مستحق ہیں کہ مخاطب انہیں مبارکباد پہنچائے۔ اور اس میں ان لوگوں کی تکریم زائد ہے بمقابلہ اسکے کہ انہیں براہ راست خود ہی بشارت

فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ

یا اس سے بھی بڑھ کر کسی اور چیز کی ۸۸ سو جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ تو یہی سمجھیں گے کہ

اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وہ (مثال) یقیناً حق ہے انکے پروردگار کی جانب سے ۸۹ البتہ جو لوگ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں

فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ

وہ یہی کہتے رہیں گے ۹۰ کہ اللہ کا اس مثال سے مطلب کیا تھا؟ ۹۱

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ

گمراہ بھی کرتا ہے بہتوں کو اسی سے ۹۲ اور راہ بھی دکھاتا ہے بہتوں کو اسی سے ۹۳

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۲۶ الَّذِيْنَ

ہاں وہ گمراہ کسی کو (بھی) اس سے نہیں کرتا بجز بےحکمی کرنے والوں کے ۹۴ جو اللہ سے

يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠

اپنے معاہدہ کو اس کے استحکام کے بعد توڑتے ہیں ۹۵

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ

اور جس چیز کو اللہ نے حکم دیا تھا جوڑے رکھنے کا اُسے کاٹتے ہیں ۹۶ اور

يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ

زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ۹۷ تو بس یہی لوگ ہیں

الْخٰسِرُوْنَ ۲۷ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ

نقصان اُٹھانے والے ۹۸ تم لوگ کس طرح کفر کر سکتے ہو اللہ سے ۹۹

منزل ۱

دیدی جاتی۔ اٰمنوا یعنی توحید و رسالت پر ایمان لے آئے۔ عملوا الصٰلحٰت یعنی عمل مطابق شریعت اسلام کئے۔ نیک عمل کے سمجھنے میں بہتوں کو دھوکا ہوا ہے، اور یہ مغالطہ آج کل بہت عام ہوگیا ہے۔ سمجھا یہ جانے لگا ہے کہ نیکی اور ایمان ایک دوسرے سے بالکل الگ اور بےتعلق چیزیں ہیں۔ اور پھر اس مفروضہ کی ایک فرع یہ قائم کی گئی ہے کہ کوئی شخص ممکن ہے کہ بہت صالح اعمال کا ہو لیکن ایمان سے یکسر محروم ہے ——— حالانکہ یہ تخیل ہی سرتاسر غلط ہے۔ نیکی ایمان سے الگ نہیں، ایمان ہی کی عملی شکل کا نام ہے۔ ایمان جب تک قلبی ہے، ایمان ہے۔ اگر قولی و لسانی ہے تو اسلام ہے۔ اور یہی ایمان جب عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے تو اس کا نام حُسنِ عمل رکھ دیا یا عمل صالح پڑ جاتا ہے۔ اور حُسنِ عمل کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہو۔ کوئی نیکی اگر ایسی پیش کی جاتی ہے جس کی تہہ میں جذبۂ ایمانی خفیف سا بھی موجود نہیں، تو وہ نیکی نہیں، نیکی کی صرف صورت ہے، نیکی کی صرف نقل ہے۔ اور جس طرح نماز کی نقل محض، نماز نہیں۔ اسی طرح کسی نیکی کی نقل پر اطلاق نیکی کا نہیں ہو سکتا۔ عمل نیک کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل ضابطۂ شریعت کے موافق ہو۔ فقہاء نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ ایمان و اعمال دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور اعمال ایمان کے علاوہ ہیں ۸۰ یہ عالم آخرت کے انعام کا بیان ہے۔ جنت کے انعامات اس قسم کے جتنے بھی بیان کئے گئے ہیں سب عمومی اور اکثری کے حکم میں داخل ہیں، صحرا و کلیہ کی صورت میں نہیں، چنانچہ چونکہ انسان کو لطف باغ و راغ میں ملتا ہے اس لئے اُسکے لئے یہ سامان آخرت میں موجود ہوگا۔ لیکن بالفرض کوئی شخص ایسا ہو جسے بجائے سبزہ و گلزار کے دشت و ریگستان پسند ہو، تو جنت میں یہ سامان مہیا ہونے بھی دیر نہ لگے گی۔ آیت سے معلوم ہوا کہ بشارتِ جنت کے استحقاق کے لئے سبب ایمان اور عمل دونوں وصف ہیں۔ ۸۱ (فرحت و مسرت و انبساط سے) ۸۲ (دنیا میں یا جنت میں) یعنی جنتیوں کو جب کوئی پھل پھلاری کھانے میں آئے گا تو انہیں پھل کا مزہ بھی تازہ ہوجایا کرے گا اور اسکی شکل دیکھتے ہی وہ بول اُٹھیں گے کہ ارے یہ تو وہی لذیذ میوہ ہے جس کا مزہ ہمیں خوب یاد ہے۔ من قبل۔ یہ قبل والے پھل دنیا کے باغوں کے بھی ہوسکتے ہیں اور جنت کے باغوں کے بھی۔ اہل تفسیر سے دونوں منقول ہیں۔ حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے، یعنی اہلِ جنت میں شوق آفرینی و رغبت افزائی۔ یعنی فی الدنیا وقیل یعنی فی الجنۃ (قرطبی) فیها وجهان۔ الاول انه من ارزاق الدنیا والثانی ان المشبه به رزق الجنة ایضاً (کبیر) ای من قبل هذا فی الدنیا جعل ثمر الجنة من جنس ثمر الدنیا لتمیل النفس الیه او فی الجنة لان طعامها متشابه فی الصورة کما حکی ابن کثیر عن الحسن (بیضاوی) ۸۳ یعنی یہ تشابہ محض اہلِ جنت کے خیال کے مطابق نہ ہوگا۔ واقعۃً اور نفس الامر بھی یہی ہے۔ یہ تشابہ کس سے ہوگا؟ بعض نے کہا کہ دنیا کے پھل پھلاریوں سے۔ اور بعض کا قول ہے کہ جنت ہی کے میوے ایک دوسرے سے مشابہ ہونگے۔ لیکن اگر دنیا ہی کے پھلوں سے تشابہ مراد لی جائے تو یہ لحاظ رکھنا ضروری ہوگا، کہ یہ شباہت صرف صوری اور ظاہری ہی ہوگی۔ ورنہ اصل لذت، ذائقہ، خوشبو وغیرہ کے لحاظ سے جنت اور دنیا کی نعمتوں میں آسمان و زمین کی نسبت ہے، چنانچہ محققین نے کہہ دیا ہے کہ دونوں میں اشتراک صرف نام کا ہوگا۔ لیس فی الدنیا مما فی الجنة الا الاسماء (ابن جریر عن ابن عباسؓ) بعض اہلِ لطائف و اسرار نے آیت سے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ اسی دنیا کے اعمالِ حسنہ جنت میں طرح طرح کی نعمتوں کی شکل و تمثل اختیار کرلیں گے اور اہلِ جنت کو اپنے حسناتِ دنیوی اور ان کے ثمراتِ اخروی کے درمیان ایک خاص تشابہ و تناسب محسوس ہوگا۔ ۸۴ مطهرة۔ پاک صاف ہر طرح اور ہر اعتبار سے، جسم کی شرح کی ہر ممکن گندگی اور آلودگی سے ستھری، پاکیزہ مطهرة من القذر والاذی (ابن جریر عن ابن عباسؓ) قیل مطهرة من مساوی الاخلاق (معالم) فالمراد طهارة ابدانهن وطهارة ازواجهن من جمیع الخصال الذمیمة (کبیر) بعض "روشن خیالوں" کو پاکیزہ بیویوں کے نام سے خدا معلوم کیوں اتنی شرم آئی کہ انہوں نے اس معنی ہی سے انکار کردیا۔ اور ازواج مطهرة کی تفسیر عجب طرح تو ڑ مروڑ کر کی ہے۔ گویا بہشت میں رضائے الٰہی کے مقام میں، ہر قسم کی انتہائی لذت، مسرت و راحت کے موقع پر بیویاں اور پھر پاکیزہ بیویوں کا ملنا کوئی بڑی ہی شرم و غیرت کی بات ہے! جنت کے نفسِ وجود ہی سے اگر کسی کو انکار ہے، جب تو خیر بات ہی اور ہے۔ ایسے مخاطب کے سامنے پہلے جنت کا اثبات کیا جائیگا۔ لیکن اگر جنت کا اقرار ہے، تو پھر وہاں کی کسی لذت، کسی نعمت، کسی راحت کے انکار کے کوئی معنی نہ نقل کے لحاظ سے صحیح ہیں، نہ عقل کے اعتبار سے۔ جنت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہ مادی اور روحانی ہر قسم کی لذتوں، مسرتوں، راحتوں کا گھر ہوگا ——— یا پھر یہ کہ بیوی کے نعمت و راحت سمجھنے ہی سے انکار ہے؟ اگر ایسا ہے، تو اس عقیدہ کا رشتہ اسلام سے کہیں زیادہ رہبانیت، اور مسیح کی لائی ہوئی نہیں پولوس کی پھیلائی ہوئی "مسیحیت" سے وابستہ ہے۔ زوجیت جب دنیا میں اللہ کا ایک اعلیٰ انعام ہے، تو آخرت میں کس جرم میں اس سے محرومی ہو جائیگی؟ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی، مادی، جنتی خصوصاً ازدواجی نعمتوں کو حقیر سمجھنا، یا اُن سے شرمانا، تمامتر جاہلی مذہبوں خصوصاً پولوسی مسیحیت سے دماغی مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ اسلام تو حسّی اور معنوی، مادی اور روحانی، جسمانی اور عقلی ہر قسم کی نعمت کی قدر کرنے کی تعلیم دیتا ہے، ایسی خشک لذت جس میں کوئی شائبہ نہ لمس کا ہو، نہ باصرہ کا، نہ ذائقہ کا، نہ سامعہ کا، اور صرف اسی پر قانع رہنا کمال نہیں نقص ہی ہے، ہنر نہیں عیب ہے۔ اور معلوم ہے کہ نقص و عیب جنت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتے ۸۵ سب سے بڑی آخری بات جنت کے سلسلہ میں یہ فرما دی گئی کہ اس کی لذتیں اور مسرتیں کبھی ختم ہونے والی نہیں، اور داخلہ جنت کے بعد زوالِ عیش کا امکان ہی نہیں۔ دنیا کی بڑی سے بڑی لیکن کیسی فانی اور عارضی نعمتیں اسکے سامنے تصور میں بھی لائی جاسکتی ہیں؟ خلدون۔ خلود کے معنی ایسی حالت میں رہنے کے ہیں جس میں کبھی تغیر اور خرابی نہ پیدا ہو۔ الخلود هو تبری الشیٔ من اعتراض الفساد وبقاؤه علی الحالة التی هو علیها (راغب) فلا آخر له ولا انقضاء بل فی نعیم سرمدی ابدی علی الدوام (ابن کثیر) ۸۶ جیسا کہ بعض کج فہم اور معاند معترضین کے خیال میں شرمانا چاہیئے۔ قرآن مجید میں اپنے اپنے موقع اور محل پر تذکرہ بڑی سے بڑی مخلوق کا بھی آیا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی کا بھی۔ جانوروں میں ایک طرف ہاتھی، اونٹ، شیر کا، اور دوسری طرف چیونٹی مکھی اور مچھر کا۔ اسی تذکرہ پر بعض نافہموں نے کہنا شروع کیا کہ واہ دعویٰ تو کلامِ الٰہی ہونے کا اور مضامین اسکے اس قدر ایسے حقیر! یہ نافہم اور کم عقل معترضین بعض روایتوں میں آتا ہے کہ یہود تھے، بعض میں کہ مشرکین تھے، بعض میں کہ منافقین۔ عجب نہیں کہ تینوں ہوں۔ نزلت فی الیهود (روح عن ابن عباسؓ) نزلت فی المنافقین (روح عن مجاهد) والقول الثالث ان هذا الطعن کان من المشرکین قال القفال الکل محتمل ههنا (کبیر) ۸۷ کسی دینی حقیقت کی توضیح کے لئے مثال کی غایت ہی یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو ذہن کے سامنے زیادہ کھول کر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ لے آئے۔ اب یہ مقصد جس مثال سے پورا ہوسکے اسکو بہترین کہا جائیگا، خواہ وہ چیز جو مثال میں پیش کی گئی ہو بجائے خود کیسی ہی ہو۔ مچھر بظاہر ایک بہت حقیر اور بےحقیقت سی مخلوق ہے۔ اب جہاں مخلوق کی بےحقیقتی بیان کرنا ہوگی وہاں موزوں مثال ظاہر ہے کہ مچھر ہی کی ہوگی۔ پھر اس پر اعتراض کرنا کیسی حماقت کی دلیل تھی۔ امام رازیؒ نے یہ بات بھی خوب لکھی ہے کہ صانع عالم اور خلاق علیم کی بنائی ہوئی کوئی شے بھی درحقیقت حقیر و بےحقیقت نہیں، بلکہ جو چیز بظاہر جتنی زیادہ چھوٹی اور حقیر ہوگی، اسی قدر اس کا بیان کمال علم، کمال اطلاع اور کمال حکمت پر اور زیادہ دلالت کریگا (کبیر) مثلاً ما۔ مثلاً کا لفظ خود نکرہ تھا، مَا کے اضافہ نے اسکے وصف تنکیر کو اور بڑھا دیا۔ فما فوقها یعنی مچھر سے بھی بڑھ کر، اپنے جثہ کے صغر یا ظاہری بےحقیقتی کے اعتبار سے۔ فما فوقها فی الصغر (راغب) اراد بما فوقها فی الصغر والمحققون مالوا الی هذا القول (کبیر) ما دونها فی الصغر والحقارة وهذا قول الکسائی وابی عبیدة قاله الرازی واکثر المحققین (ابن کثیر) ای فما تجاوزها وزاد علیها فی المعنی الذی ضربت فیه مثلاً وهو القلة والحقارة (کشاف) مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اصل ہے عادت صوفیہ کی کہ مثال لانے میں حیا عرفی کی پروا نہیں کرتے ۸۸ (اور اپنے مقصود و غایت اور توضیح مراد میں بالکل کافی و وافی) اَنَّهٗ میں ضمیر مَثَل کی طرف راجع ہے۔ هذا المثل (ابن کثیر عن ابی العالیة) المثل هو (معالم) دوسرا قول یہ ہے کہ ضمیر خود قرآن کی طرف راجع ہے۔ ای یعلمون انه کلام الرحمٰن وانه من عند الله (ابن کثیر عن قتادة) اَمَّا حرف اَمَّا آغاز کلام میں سے آنے سے فقرہ میں قوت اور زور کی زیادتی ہوگئی ہے۔ توکید ما صدر به (ابو سعود) یؤکد ما به صدر (بیضاوی) ۸۹ (استفساراً نہیں، طنز و تعریض کی راہ سے) ۹۰ یعنی وہ اسی میں اُلجھے رہیں گے کہ ایسی مثالوں سے حاصل کچھ بھی نہیں۔ هٰذا کے لفظ میں ایک پہلو تحقیر و اہانت کا ہے۔ وفی قولهم ماذا اراد الله بهذا استحقار (کبیر) وفی هذا استحقار واسترذال (بیضاوی) اردو روزمرہ کے مطابق هذا مثلاً کا ترجمہ ہوگا: "ایسی ایسی مثال سے" ۹۱ (اور اپنے قانون تکوینی کے مطابق اللہ کو علم)

مفسرین سمجھا کہ مذہبوں کو ہی بڑی بڑی تفتیش پیش آئیں چنانچہ انھیں سمجھنے کیلئے ایک دوسرا خالق شر بھی فرض کر لیا گیا ہے لیکن اس دشواری کی اصل یہ ہے کہ خیر کی طرح شر کا بھی کوئی وجود فرض کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ شر تو اشیائے کائنات کے، موجوداتِ عالم کے، اور اپنے قویٰ کے صرف غلط و ناجائز طریقِ استعمال کا نام ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے مختلف راہوں میں سے ایک کے انتخاب کی، اور اسی کا نام ارادہ ہے چنانچہ انسان جب اپنے اسی ارادہ و اختیار سے غلط کام لیکر غلط راہ کا انتخاب کرتا ہے تو اسی کو شر میں مبتلا ہو جانا کہتے ہیں۔ اللہ علاوہ احکم الحاکمین ہونے، مالک الملک ہونے آخری اور اصلی قانون ساز ہونے کے تکوینی حیثیت سے بھی سب کا آخری مسبب الاسباب بھی تو ہے۔ وہ بدی کا خالق صرف اسی معنی میں ہے جس معنی میں زہر کا، زہریلے جانوروں کا، خونخوار درندوں کا ہے۔ یُضِلُّ بِهٖ کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ بندہ جب اپنی بدنیتی اور ارادہ سے گمراہی اختیار کرنے لگتا ہے تو حق تعالیٰ اس کا بھی سامان بہم پہنچا دیتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ سامان تو اکٹھے ہو جائیں اور نتیجہ برآمد ہونے نہ دے۔ بِهٖ یعنی اس سے اور اسی طرح دوسری قرآنی تمثیلات سے ضمیر کا مرجع مثلاً ہے۔ کَثِیْرًا بہتوں کو یہ بہت وہی ہیں جو اپنی قوتِ فکر و نظر سے صحیح کام نہیں لیتے۔ اور اس لئے اپنے ارادہ سے کفر و ضلالت اختیار کئے رہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی رضا کو ان کے کفر سے ذرا بھی دخل نہیں ۹۲ راللہ اپنے اسی قانونِ تکوینی کے مطابق بِهٖ ضمیر کا مرجع یہاں بھی مثلاً ہے۔ کَثِیْرًا یہ بہت وہی ہیں جو اپنی قوتِ فکر و نظر سے صحیح کام لیتے رہتے ہیں۔ مومنین متدین کا شمار گو کافرین مضلین کے مقابلہ میں کمتر ہو پھر بھی بجائے خود ایک بہت بڑی تعداد میں ہے۔ اور ضمناً کثیر کا لفظ اسکے لئے بھی آیا ہے ۹۳ آیت نے خود اس مضمون کو صاف کر دیا کہ گمراہی تو بس انھیں کے حصہ میں آتی ہے جو خود گمراہ رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ہرگز جبر نہیں دیتا۔ بار بار کی ارادی نافرمانیوں اور عدول حکمیوں سے اندر کا نور بجھ کر رہ جاتا ہے اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش باقی نہیں رہ جاتی، بلکہ اس کے برعکس باطل دوستی و ناحق پرستی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اور اس سلسلہ کا خاتمہ کفر و انکار پر ہوتا ہے۔ فسق کہتے ہیں احکام سے تجاوز کر جانے کو۔ اور فاسق وہ ہے جو دائرۂ اطاعت سے بار بار نکل جائے۔ الفسق العصیان والترک لامر اللّٰہ عزّ وجلّ والخروج عن طریق الحق (لسان) المنافق و الکافر سُمّیا فاسقین لخروجہما عن طاعۃ ربہما (ابن جریر) ائمۂ لغت نے کہا ہے کہ فاسق کے استعمال کی مثال عربی میں اسلام سے قبل عہدِ جاہلی میں نہیں ملتی۔ فیروز آبادی کا قول ہے لیس فی کلامہم ولا شعرہم فاسق علی انہ عربی (قاموس) اور ابن الاعرابی نے کہا ہے لم یسمع فی کلام الجاھلیۃ ولا فی شعرہم فاسق ھذا عجب وھو کلام عربی (لسان) فسق بحیثیت فعل، بے جان چیزوں کے سلسلہ میں ضرور استعمال میں تھا، لیکن بحیثیت اسم فاسق کا استعمال انسان کیلئے کلامِ عرب میں نہیں ملتا۔ لم یسمع الفاسق فی وصف الانسان فی کلام العرب (راغب عن ابن الاعرابی) اس اصطلاحی معنی میں جس میں اس کا استعمال اب عربی بلکہ اردو میں عام ہو یہ تمام تر ایک اسلامی لفظ ہے اور ان چند لفظوں میں سے ہے جو قرآن نے آکر عربی زبان کو دیئے۔ لا یعرف اطلاقہا علی ھذا المعنی قبل الاسلام (تاج) آج انگریزی زبان بھی باوجود اپنی وسعت کے، علت، حرمت، طہارت، تقویٰ کے مفہوم کے بہت سے الفاظ سے محروم ہے۔ ایں حدیث شہد ایماں دیگر است ۹۴ عہد اللّٰہ یعنی معاہدۂ طاعت کو۔ عہدِ ایمان کو توحید کے حاسۂ فطری کو۔ اقرارِ توحید ربوبیت تو ایسا سیدھا سادہ صاف مسئلہ ہے کہ ہر انسان کی فطرتِ سلیم اس عقیدہ پر گواہ ہے۔ نافرمان و فاسق خود اپنی اس فطرتِ سلیم سے اقرارِ فطری سے بغاوت کرتا رہتا ہے۔ اور اس لئے یہاں فاسقین کے تحت میں ہر قسم کے اہلِ کفر آگئے۔ عنی بھذہ الآیۃ جمیع اھل الکفر والشرک والنفاق وعہدہ الی جمیعہم فی توحیدہ ما وضع لہم من الادلۃ الدالۃ علی ربوبیتہ (ابن کثیر) من بعد میثاقہٖ۔ اس عہدِ فطرت کی توثیق ہر فرد اور ہر زمانہ میں پیمبروں کی تعلیمات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے۔ والمراد بہ ما وثق اللّٰہ بہ عہدہ من الآیات والکتب (بیضاوی) ۹۵ آیت کے وسعتِ مفہوم میں سارے حقوق اللہ اور حقوق العباد داخل ہیں یعنی وہ سارے فرائض جو ہر انسان پر خالق و مخلوق دونوں کے تعلق سے عائد رہتے ہیں۔ ان یوصل من الایمان والارحام (ابن جریر عن ابن عباسؓ) صلۃ الارحام والقرابات وقیل المراد اعم من ذلک (ابن کثیر) امام رازیؒ نے ایک معنی یہ بھی کہے ہیں کہ حکمِ الٰہی مومنین کے ساتھ رشتہ جوڑے رکھنے کا ہے۔ یہ اہلِ فسق اسے چھوڑ کر اپنا رشتہ کافروں سے جوڑ لیتے ہیں ۹۶ (اپنے عقائدِ کفریہ باطلہ سے) اس فساد کے اندر روحانی، مادی ہر قسم کے مفسدے شامل ہیں۔ اسلام کی حقیقت ہی چونکہ یہ ہے کہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے اور ایک ہمہ گیر نظامِ حیات۔ اس لئے اس سے اعراض و انحراف کے کھلے ہوئے معنی یہی ہیں کہ کسی ناقص دستورِ زندگی اور چھوٹے نصب العین کو قبول کر لیا گیا ہے اور اس ناقص پروگرام کا لازمی نتیجہ ہے انفرادی انتشار اور اجتماعی اختلال۔ والاظہر ان المراد منہ الصدّ عن طاعۃ الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام لان تمام الصلاح فی الارض بالطاعۃ (کبیر) عقیدہ نہیں مشاہدہ ہے کہ آج دنیا اتنی ترقیوں اور علمی کمالات کے باوجود کیسی کیسی مصیبتوں میں بھٹک رہی ہے، انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اور یہ صلاح و فلاح سے محرومی نتیجہ ہے اسلامی زندگی کو گم کر دینے کا ۹۷ اس نقصان میں خسارۂ عاجل بھی شامل ہے اور خسارۂ آجل بھی۔ عاجل اس لحاظ سے کہ عدمِ ایمان سے دلوں سے سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے اور قوم و افراد قوم طرح طرح کی بداخلاقیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور آجل اس اعتبار سے کہ آخرت میں نجات سے محرومی رہے گی۔ مغبونون بذھاب الدنیا والآخرۃ (ابن عباسؓ) ۹۸ (اے کافرو اور منکرو!) یعنی کفر و انکار کی جرأت و ہمت کس طرح رکھتے ہو؟ سوال سے مقصود ان کی جسارت پر استعجاب ہے۔ علی وجہ التعجب (ابن عباسؓ) فالمراد بہ التبکیت والتعنیف (کبیر) لفظ کیف کا استعمال قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی حق تعالیٰ کے سلسلہ میں آیا ہے، سیاق ہمیشہ تنبیہ یا توبیخ ہی کا رہا ہے۔ وکل ما اخبر اللّٰہ تعالیٰ بلفظۃ کیف عن نفسہ فھو استخبار علی طریق التنبیہ للمخاطب او توبیخ (راغب) ۹۹ (شکمِ مادر میں) یعنی ابھی تمہاری تشکیل ہوئی بھی نہ تھی ۱۰۰ (رحمِ مادر میں) نعمتوں میں سب سے مقدم صفتِ حیات ہے کہ دوسری ساری نعمتوں سے استفادہ اسی کے بعد ممکن ہے۔ اس لئے ذکر میں بھی اسے یہاں سب سے مقدم رکھا ۱۰۱ (اس دنیوی مدتِ زندگی کے خاتمہ پر) بیان توحید کامل کا ہو رہا ہے کہ خلق، احیاء، افنا سب قوتیں باری تعالیٰ ہی کی ہیں۔ یہ نہیں جیسا کہ بعض مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ موجد و خالق برہما جی ہیں اور قائم و باقی رکھنے والے وشنو جی اور موت و ہلاکت لانے والے شیو جی ۱۰۲ (حشر میں) حشر کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں ہے۔ بغیر اسکے اس محدود و مختصر زندگی میں نظامِ عدل کا قیام ممکن ہی نہیں ۱۰۳ (حساب و کتاب کے لئے) انسان کو جزا و سزا اعمال کی جوابدہی کے لئے براہِ راست اللہ ہی کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اس میں رد آگیا مسیحی مشرکوں کے اس عقیدہ کا کہ حشر میں پیشی مسیح کے حضور میں ہوگی ۱۰۴ خطاب عام نوعِ انسانی کو ہے۔ ان سے ارشاد ہو رہا ہے کہ تم تو خود ہی ساری کائناتِ ارضی کے مقصود و مطاع ہو۔ پھر کیسی حماقت ہوگی کہ تم کسی اور مخلوق کو مقصود و مطاع بنالو۔ آیت ہر قسم کے شرک، ہر قسم کی مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ اس فرشِ زمین پر جو کچھ بھی ہے سب انسان ہی کے لئے ہے، نہ یہ کہ انسان کسی اور مخلوق کے لئے ہو۔ اور مشرک انسان اس فطری اور قدرتی ترتیب کو الٹ دیتا ہے۔ حدیثِ نبوی کا یہ ٹکڑا جو مسلمان ہر جمعہ کو خطیب کی زبان سے سنتا ہے، کہ اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ (دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم پیدا کئے گئے ہو آخرت کے لئے) اسی مفہوم کا ترجمان ہے۔ اور خلیفۃ اللہ کی جیسی شان ہونا چاہیئے۔ سب کچھ اسکے لئے ہو اور وہ خود خدا کیلئے ہو۔ وہ جس چیز کو جس طرح بھی چاہے اپنے تصرف میں لائے۔ اور اس کو جواب دہ صرف اپنے مالک و خالق کے سامنے ہو، مرتبۂ انسانی کا یہ شرف و احترام اسلام ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ ڈارون کے ترقی یافتہ بندر، غریب کو اس رتبہ و مقام سے کیا واسطہ! لکم۔ اے لاجلکم ولانتفاعکم بہ فی دنیاکم ودینکم (کشاف) ھو یدل علی ان المذکور بعد قولہ خلق لاجل انتفاعنا فی الدین والدنیا (کبیر) جمیعًا۔ اس سب میں گنگا جی بھی شامل ہیں اور سنگار پربت بھی، گئو ماتا بھی اور ہنومان جی بھی۔ حجر پرستی، شجر پرستی، دریا پرستی، کوہ پرستی، ناگ پوجا وغیرہ مخلوق پرستی اور مظاہر پرستی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب بے معنی اور ننگ انسانیت ہیں ۱۰۵ سماء واحد اور جمع دونوں طرح آتا ہے یُستعمل للواحد والجمع (راغب) یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ یہاں لفظاً واحد ہے لیکن معنیً جمع ہے کہ جنس ہونے کے معنی میں ہے فانہا فی معنی الجنس (ابو سعود) بہر صورت ضمیرِ جمع ھُنَّ سے کوئی خلجان نہ ہونا چاہیئے۔ سماء کی وسعتِ مفہوم پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے (حاشیہ ۵۰) یہاں مراد اجرامِ علوی سے بھی لی گئی ہے اور سمتِ علوی سے بھی۔ المراد بالسماء ھٰذہ الاجرام العلویۃ او جہات العلو (بیضاوی) گویا

وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ

درآنحالیکہ تم بے جان تھے ۹۹ سو اس نے تمہیں جاندار کیا ۱۰۰ پھر وہی تمہیں موت دیگا ۱۰۱ پھر

يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِي

وہی تمہیں زندہ کریگا ۱۰۲ پھر اسی کی طرف تم واپس کیے جاؤگے ۱۰۳ وہ وہی (خدا) ہے

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ

جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب ۱۰۴ پھر اس نے

إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ

آسمان کی طرف توجہ کی ۱۰۵ اور انہیں سات آسمان درست کرکے بنا دیئے ۱۰۶ اور وہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ

ہر چیز کا جاننے والا ہے ۱۰۷ اور (وہ وقت یاد کرو) ۱۰۸ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا

سے کہا ۱۰۹ میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں ۱۱۰ وہ بولے

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ

کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کریگا اور خون

الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ

بہائے گا، درآنحالیکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں ۱۱۱ اور تیری پاکی

لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

پکارتے رہتے ہیں؟ (اللہ نے) فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۱۱۲

منزل ۱

ع ۳

معلوم ہوا کہ وہ بلندی کی طرف متوجہ ہوا۔ والمراد بالسماء جہات العلو کأنہ قیل ثم استوی الی فوق (کشاف) استوی کا صلہ جب الی کے ساتھ آتا ہے تو اسکے معنی بجز اس کے قصد کیا، توجہ کی، التفات کیا۔ چنانچہ یہاں اکثر مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ عمد الی خلق السماء (ابن عباسؓ) وقال بعضهم اقبل علیها وقال بعضهم عمد الیها (ابن جریر) قصد الیها بخلقه واختراعه (قرطبی عن سفیان وابن کیسان) اقبل وعمد الی خلق السموات (مدارک) ۱۰۶ آسمانوں کا تعداد میں سات ہونا توریت و انجیل دونوں کو مسلّم ہے۔ ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے: "عہد عتیق و عہد جدید دونوں میں آسمانوں کا جو تخیل ہے۔۔۔۔۔۔ وہ سات آسمانوں کا ہے" (جلد ۲ ص ۳۲۲) سَوّٰىهُنَّ۔ تسویہ کے معنی ہیں تکمیل تک پہنچا دینے اور ہر طرح درست کر دینے کے۔ ھُنَّ السماء کی طرف راجع ہے۔ خواہ اسکی تفسیر اجرام سے کی جائے یا خود اسی کو معنی جمع قرار دیا جائے (بیضاوی) ومعنی تسویتھن تعدیل خلقھن واخلاؤہ من العوج والفطور واتمام خلقھن (کبیر) اس لئے فَسَوّٰىهُنَّ کا ترجمہ ٹھیک ٹھیک اردو میں یہی ہو سکتا ہے کہ انھیں ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ سبع سموٰت۔ قدیم اہل ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیاروں کے مدار لئے ہیں۔ یعنی کرۂ قمر، کرۂ عطارد، کرۂ زہرہ، کرۂ شمس، کرۂ مریخ، کرۂ مشتری، کرۂ زحل (کبیر) صاحب تفسیر کبیر نے ایک حدیث سے استنباط کر کے لکھا ہے کہ عرش اور اسکے اندر جتنے سماوات ہیں سب کروی ہیں اور عرش زمین کے اطراف کو محیط ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہر کوکب اپنے فلک میں ایک خاص چال سے چلتا ہے اور آسمان کو حرکت نہیں ۱۰۷ (چنانچہ اپنے بندوں کی ساری ضرورتوں کا بھی اسے پورا علم ہے۔ اور اس نے اپنے بندوں کو محض پیدا ہی نہیں کیا، بلکہ از راہ بندہ پروری اُس نے ان کی ہر ضرورت کے پورا کرنے کا بھی سامان کر دیا) صفت خلق کے بعد صفت علم کا اثبات بھی ضروری تھا۔ جاہلی قوموں نے کثرت سے اپنے دیوی دیوتاؤں کو ان کے معبود تسلیم کر لینے کے باوجود ان کے علم کو ناقص مانا ہے ۱۰۸ اِذْ ظرف زمان ہو کسی گزشتہ واقعہ کی یاد دلانے کے موقع پر آتا ہے جس طرح اذا کسی امر مستقبل پر آتا ہے۔ اذ ظرف موضوع لزمان نسبة ماضية وقع فيها نسبة اخرى مثلها (ابو السعود) بعض اکابر اذکر اس کے قبل مقدر مانا ہے۔ هو نصب باضمار اذکر والمعنی اذکر لهم (کبیر) او اذکر واذا فعل بایکم (کبیر) ابو عبیدہ نحوی نے کہیں کہہ دیا تھا کہ اذ یہاں زائد ہے۔ اس کی شدومد سے تردید اہل لغت اور تفسیر دونوں نے کی ہے۔ قال ابن اسحاق هذا اقدام من ابی عبیدة قال الزجاج هذا اجتراء من ابی عبیدة (ابن کثیر) ردہ ابن جریر قال القرطبی وکذا ردہ جمیع المفسرین (ابن کثیر) ۱۰۹ (آفرینش آدم کے وقت) سورہ کے رکوع اول میں بیان فطرت انسانی کا تھا کہ قرآن کے مخاطبین میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک اسکے پیام کو قبول کرنے والے، صالح و سلیم فطرت رکھنے والے۔ دوسرے بد فطرت، پیام الٰہی سے انکار کرنے والے۔ دوسرے رکوع میں مخاطبین کی ایک تیسری نوع کا بیان تھا۔ تیسرے رکوع میں اصل پیام کا لُبّ لباب سنا دیا گیا یعنی توحید و رسالت کی تبلیغ کر دی گئی۔ اب اس چوتھے رکوع میں اس تبلیغ کی تاریخ شروع ہوتی ہے یعنی یہ پیام ابتداءً نسل انسانی کے بانی و مورث حضرت آدم کو دیا گیا، اور ان سے نسل بنسل منتقل ہوتا آیا ہے۔ ملٰئکة جمع مَلَک کی۔ اور وہ الوك سے ہے جس کے معنی پیامبری یا پیام رسانی کے ہیں۔ الالوك الرسالة ومنه الملائكة لانه يبلغه رسالته (راغب) من الالوكة وهي الرسالة (روح) ملائکہ کو ملائکہ کہتے ہی اسی لئے ہیں کہ ان کا اصل کام پیام رسانی ہوتا ہے۔ اور یہ خالق کے پیامات مخلوق تک لایا کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے ایجنٹ یا واسطے ہیں۔ لانهم وسائط بين الله تعالى وبين الناس فهم رسل الله او كالرسل اليهم (بیضاوی) اردو میں انھیں فرشتہ کہتے ہیں۔ فرشتے نوری مخلوق سمجھے جاتے ہیں۔ وجود خارجی رکھتے ہیں محض صفات الٰہی یا قوائے طبیعی کے مرادف نہیں۔ عادۃً انسان کیلئے غیر مرئی ہوتے ہیں جب ضرورت مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ اجسام لطيفة هوائية تقدر على التشكل باشكال مختلفة مسكنها السموات وهذا قول اكثر المسلمين (کبیر) ذهب اكثر المسلمين الى انها اجسام لطيفة قادرة على التشكل باشكال مختلفة مستدلين بان الرسل كانوا يرونهم كذلك (بیضاوی) ان کی لاانتہا تعداد اللہ ہی کے علم میں ہے۔ وجود میں انسان پر تقدم زمانی رکھتے ہیں۔ سرشت معصومانہ ہوتی ہے یعنی بدی کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ خالق کے خاص فرمانبردار خادم ہوتے ہیں مخلوق محکوم بندے ہوتے ہیں بالکل انسان ہی جیسے ہیں۔ خود کوئی معبود یا نیم معبود یا حیثیت دیوی دیوتا کی قسم کی مطلق نہیں رکھتے۔ اور یہیں سے رد ہو جاتا ہے ان باطل مذہبوں کا جنھوں نے ملائکہ کو خواہ اسی نام کے ساتھ، خواہ انھیں دیوی دیوتا قرار دے کر خالق و مخلوق کے درمیان ایک برزخی درجہ دے رکھا ہے۔ للملئکة میں لام تبلیغ کا ہے۔ اللام الجارة للتبليغ (روح) ۱۱۰ (عنقریب اپنی حکومت کی تنفیذ کیلئے) اللہ اللہ! خاک کے پتلے کا یہ شرف مرتبہ! اللہ کی مخلوق تو اُس وقت تک بھی بے شمار تھی۔ اب ان میں انسان نامی محض ایک نئی صنف کا اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ اللہ کا نائب زمین پر پیدا کیا جا رہا ہے (بعض اہل تحقیق نے یہیں سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ تخلیق تو ساری ہی موجودات کی ہوئی ہے۔ جنات کی بھی اور ملائکہ کی بھی، جنت کی بھی اور عرش کی بھی، لیکن اور کسی کے بھی قصۂ تخلیق کے ذکر کا اہتمام قرآن مجید نے نہیں کیا ہے۔ یہ فخر صرف خلقت آدم کے حصہ میں آیا۔ اور یہ دلیل ہے آدم کی افضلیت و اشرفیت کی۔ ولم يقل انى خالق عرشا او جنة او ملكا وانما قال ذلك تشريفا وتخصيصا للآدم (بحر) خلیفہ اسے کہتے ہیں جو کسی کی نیابت کرے، خواہ اس لئے کہ وہ موجود نہیں یا اس لئے کہ فوت ہو چکا یا اس لئے کہ معذور ہے اور خواہ اس لئے کہ اس سے مستخلف کی تعظیم ظاہر ہو۔ الخلافة النيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه واما لتشريف المستخلف (راغب) اور خلیفۃ اللہ وہ ہے جو زمین پر اللہ کی شریعت کی حکومت قائم کرے۔ يخلفنى فى الحكم بين خلقى وذلك الخليفة هو آدم ومن قام مقامه فى طاعة الله والحكم بالعدل بين خلقه (ابن جریر عن ابن عباسؓ وابن مسعودؓ) خليفة الله فى ارضه لاقامة احكامه وتنفيذ قضاياه (سالم) یہیں سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ انسان کو جو قوتیں ملیں گی وہ اس غایت و مقصود یعنی منصب خلافت الٰہی کے متناسب ملیں گی۔ نسل انسانی خود اپنی صلاح و فلاح کے لئے اس کی محتاج تھی اور محتاج ہے کہ اپنے کسی ہم جنس کے واسطہ سے شریعت الٰہی سے استفادہ کرے۔ اور سلسلۂ نبوت اسی غرض سے قائم ہوا ہے۔ والمراد به آدم وكذلك كل نبى استخلفهم الله فى عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ امره فيهم (بیضاوی) واضح رہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے بھی انسان، نوع انسان کو اس بلند مرتبہ یعنی خلافت و نیابت الٰہی پر نہیں رکھا ہے۔ اور غیر جاہلی مذہبوں کا تو ذکر ہی نہیں خود یہودیت اور اسکا مسخ شدہ ضمیمہ مسیحیت دونوں اس باب میں اسلام سے کہیں پیچھے ہیں۔ بائبل میں اس موقع پر ذکر اس قدر ہے:

"خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے اور زمین سے بخار اٹھتا تھا اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا، اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اسکے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا سو آدم جیتی جان ہوا" (پیدائش ۲:۵-۷)

گویا جس طرح اور سب حیوانات پیدا ہو رہے تھے، ایک جانور آدم بھی پیدا ہو گیا، اس کا کام زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے! کہاں یہ اتنا طول لیکن بے مغز، انسان کو کاشتکاری تک محدود رکھنے والا بیان، اور کہاں قرآن مجید کا باوجود شدت اختصار انسان کو مرتبہ خلافت الٰہی پر پہنچا دینے والا بلند و جامع اعلان۔ (بعض صوفیہ نے یہیں سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جوہر خاک کو شرف خلافت اس لئے عطا ہوا کہ کثافت ہی فیضان اتم کے قابل اور تحمل نورانیت کے لائق ہے۔ اور بعض عارفین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ نور آفتاب کا فیض کامل و ذاتی زمین ہی پر ہے بسبب اسکے کمال کثافت کے۔ اور پانی اور ہوا اور آگ پر یہ فیضان صرف صفاتی ہے اس لئے کہ کثافت ان میں کم ہے۔ اور اجرام علویہ تو اس نورانیت کے صرف سایہ بلکہ سایہ ہی سے مستفیض ہو سکتے ہیں بسبب کمال لطافت کے۔ اور آدم کی ترکیب جسمی چونکہ خاکی عنصر سے ہوئی ہے اور ان کے اخلاق کی عالم ملکوت سے اور انکی روح کی عالم امر و نور سے۔ اس لئے ان میں صلاحیت فیضان بھی غایت کمال کی قرار پائی) ۱۱۱ اللہ معاف کرے! یہاں کلام کے سمجھنے میں بعض کا بڑے تسامحات ہو گئے ہیں۔ فرشتوں کا یہ قول بر اعتراض یا گستاخی کے نہ تھا۔ فرشتے تو گستاخی کر ہی نہیں سکتے۔ "باغی فرشتوں" کا تخیل تمام تر مسیحی ہے۔ اور عجب نہیں کہ مسیحیوں ہی کے ساتھ تعلقات قائم ہو جانے سے یہ خیال مسلمان علماء میں سرایت کر گیا ہو۔ فرشتوں کا یہ قول تمام تر خود نیاز مندی، اقرار وفاداری اور جوش جاں نثاری کا نتیجہ تھا جیسا کہ ہمارے محققین نے صراحۃً سمجھا ہے۔ ليس على وجه الاعتراض على الله ولا على وجه الحسد لبنى آدم كما قد يتوهمه بعض المفسرين (ابن کثیر) وليس باعتراض على الله تعالى ولا طعن فى بنى آدم على وجه الغيبة فانهم اعلى من ان تظن بهم ذلك (بیضاوی) ليس المقصود الا الاستفسار عن المرجح لا العجب والتفاخر (روح) على طريقة قول من يجد فى خدمة مولاه وهو يأمر بها غيره استخدم العصاة وانا مجتهد فيها (ابو السعود) بہترین تقریر اس سلسلہ میں وہ ہے جو ہمارے شیخ وقت مفسر تھانوی مد ظلہ نے کی ہے۔ وہ ذیل میں بجنسہ نقل ہے: "مطلب یہ ہے کہ ہم تو سب کے سب آپ کے فرمانبردار ہیں اور ان میں کوئی کوئی مفسد سفاک بھی ہو گا، سو اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لگ لپٹ کر اسکو انجام دینگے۔ اور وہ لوگ سب اس کام کے نہ ہونگے۔ البتہ جو مطیع ہونگے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے مگر جو مفسد و ظالم ہونگے ان سے کیا امید ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں۔ خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کہ جن میں کوئی کام کا ہو گا کوئی نہ ہو گا، اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بطور اعتراض کے نہیں کہا، نہ اپنا استحقاق جتلایا جو ان مقدس خدمتگاروں پر شبہات پیدا ہوں، بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی حاکم نیا کام تجویز کرے کہ اسکے لئے ایک مستقل عملہ رکھنا چاہے اور اپنے قدیمی عملہ سے اس کا اظہار کرے تو وہ لوگ اپنی جاں نثاری کی راہ سے عرض کریں کہ حضور جو لوگ اس کام کیلئے تجویز ہوئے ہیں ہم کو کسی طرح تحقیق ہوا ہے کہ بعض بعض تو اسکو بخوبی انجام دے سکیں گے اور بعض بالکل ہی کام بگاڑ دیں گے جس سے حضور کا مزاج ناخوش ہو گا۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں، ہر وقت حضور پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں۔ اور حضور کی جان و مال کو دعا دیتے رہتے ہیں۔ کیسا ہی کام کیوں نہ ہو حضور کے اقبال سے اس کو انجام دے نکلتے ہیں۔ کبھی کسی خدمت میں ہم غلاموں نے عذر نہیں کیا۔ اگر وہ نئی خدمت بھی ہم کو عنایت ہو گی تو ہم کو کوئی عذر و انکار نہ ہو گا اسی طرح فرشتوں کی عرض و معروض اظہار نیاز مندی کے واسطے تھی۔ اور یہ بات کسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے معلوم کرا دی ہو گی کہ بنی آدم میں بُرے بھلے سب ہی طرح کے ہونگے" تجعل فیھا۔ یفسد فیھا۔ ضمیر ھا دونوں جگہ ارض (روئے زمین) کیلئے ہے۔ فیھا کی تکرار شدت فساد کے اظہار کے لئے ہے۔ وتكرار الظرف للدلالة على الافراط فى الفساد (روح) اتجعل فیھا الخ مطلب یہ ہے کہ یہ جدید مخلوق اور اسکی ذریات آپ کے قوانین کی نافرمانی بھی کریگی۔ اور نافرمانی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ روئے زمین پر مادی و معنوی دونوں حیثیتوں سے فساد برپا ہو کر رہے گا۔ فرشتوں کی یہ ساری عرض و معروض انکی کسی غیب دانی کی بنا پر نہیں، بلکہ نیابت الٰہی و خلافت ربانی کا نام سنکر خود ہی انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا قوائے بشری کی ترکیب کا بھی اور زمینی مخلوق کی ضرورتوں و طبعی تقاضوں کا بھی۔ اور اس سے یہ نتیجہ خود بخود انکے سامنے آگیا تھا کہ زمین پر شر و فساد بھی ہو گا اور انسانوں میں سرکش و باغی و نافرمان بھی پیدا ہونگے۔ بحمدك میں ب تسبیح کے ساتھ حمد کے دوام معیت کے اظہار کیلئے ہے۔ الباء لاستدامة الصحبة والمعية (روح) لك میں ل الحمد تخصیص کیلئے ہے یعنی تقدیس خاص تیری رضا ہی کیلئے ہے۔ اشعار بان ايقاع الفعل لاجل الله تعالى خالصا لوجهه سبحانه (روح) تسبیح اور تقدیس کے درمیان یہ فرق کیا گیا ہے کہ تسبیح کا اطلاق باعتبار طاعات کے ہوتا ہے اور تقدیس کا بلحاظ اعتقادات کے (روح) ونحن میں و حالیہ ہے والواو للحال (کبیر) علموه من الطبيعة البشرية (ابن کثیر) اعلم انهم عرفوا خلقته وعرفوا انه مركب من هذه الاخلاط الاربعة (کبیر) والاحتياج الى الحاكم والقاضى انما يكون عند التنازع والتظالم فكان الاخبار عن وجود الخليفة اخبارا عن وقوع الفساد بطريق الالتزام (کبیر) علموا ذلك من تسمية خليفة لان الخلافة تقتضى الاصلاح وقهر المستخلف عليه وهو يستلزم ان يصدر عنه فساد (روح) بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ انسانی آبادی سے قبل روئے زمین پر جنات آباد تھے، انکی سرشت و فطرت پر قیاس کر کے فرشتے سمجھے۔ کما فعل بنو الجان فقاسوا الشاهد على الغائب (سالم) توریت میں اس مخلوق کا ذکر بصراحت موجود ہے۔ دنیا میں دیوتا پرستی کی بیماری فرشتوں ہی کے فرائض کی غلط تشخیص سے پیدا ہوئی ہے۔ آگ کے فرشتوں کو جاہلی قوموں نے اگنی دیوتا مان لیا۔ بارش کے فرشتہ کو اندر دیوتا۔ و قس علی ہذا۔ قرآن نے نحن نسبح بحمدك ونقدس لك فرشتوں کی زبان سے کہلا کر انکی عبدیت محض پر انھیں کی زبان سے ایک اور مہر لگا دی۔ فرشتے یہاں صاف صاف عرض کر رہے ہیں کہ ہم خدام نوری سرشت کے لحاظ سے بجز حضور والا کی تحمید و تقدیس کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

۱۱۲ (مصالح کائنات ومخلوق حاجات کے سلسلہ میں) مطلب یہ ہوا کہ تمہیں اسکی کیا خبر کہ عبدیت کے علاوہ دنیا کا کام خلافت الٰہی کا جو اس نئی مخلوق سے لیا جانے والا ہے، اور اسکے لئے جن صلاحیتوں اور جس قسم کی استعداد کی ضرورت ہے وہ تمہارے اندر کہاں تک موجود ہیں۔ انی اعلم من المصلحۃ الراجحۃ فی خلق ھذا الصنف علی المفاسد التی ذکرتموھا ما لا تعلمون (ابن کثیر) دیوتا پرستی پر ایک اور ضرب لگی۔ ملائکہ پرستوں کو ان کے جہل پر ایک اور تنبیہ کی گئی کہ صفات خلق، قدرت وغیرہ الگ رہیں محض ان مصالح کے علم کے لحاظ سے بھی فرشتوں کو اللہ تعالیٰ سے کیا نسبت؟ کہاں علم محدود، کہاں علم لامحدود! ۱۱۳ یعنی آدم کو اشیاء کائنات کے اسماء اور آثار و خواص کا علم دے دیا۔ آدم۔ یہی سب سے پہلے بشر تھے، اسی لئے ابوالبشر کہلاتے ہیں۔ اور خلیفۃ اللہ کے اولین مصداق جنت سے جب زمین پر آئے تو غالباً دجلہ و فرات کے دوآبہ میں آباد ہوئے، جو اب ملک عراق کہلاتا ہے۔ توریت میں تین صاحبزادوں کا نام آتا ہے۔ ہابیل، قابیل، شیث۔ توریت ہی کی حسب روایت عمر ۹۳۰ سال کی پائی۔ عربی میں ان کا یہ نام کس مناسبت سے پڑا؟ کسی نے کہا کہ زمین کی جلد (ادیم) سے پیدا ہوئے، اس لئے آدم کہلائے، کسی نے کہا کہ اپنی جلد کی سُرخی کی بنا پر۔ خلق آدم من ادیم الارض فسُمّی آدم (ابن جریر عن سعید بن جبیر) قیل سمّی بذلک لکونہ جسدہ من ادیم الارض وقیل بسمرۃ فی لونہ (راغب) اسماء۔ اسم کا مفہوم عربی میں اردو کے نام سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسم وہ ہے جس کے ذریعہ سے کوئی چیز جانی جائے، پہچانی جائے۔ اسم الشیء علامتہ (قاموس) الاسم ما یعرف بہ ذات الشیء (راغب) اور یہ شناخت ممکن نہیں جب تک اعراض، خواص، آثار کا علم بھی ساتھ ساتھ نہ ہو۔ اسی طرح اہل لغت نے بھی تشریح میں اس کا لحاظ رکھ لیا ہے۔ قال ابن سیدہ الاسم ھو اللفظ الموضوع علی الجوھر او العرض لتمییز لیفصل بہ بعضہ عن بعض (تاج) اسم کے ساتھ اگر مسمّٰی کا علم نہ ہوا، تو اسم محض ایک آواز ہی تک رہے گی۔ اور ذہن کے سامنے کوئی مفہوم نہ پیدا ہوگا۔ علامہ راغب نے اسی لئے اس پر شرح و بسط سے کلام کر کے آخر میں کہا ہے، ان معرفۃ الاسماء لا تحصل الا بمعرفۃ المسمّٰی و

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ
اور اللہ نے آدم کو نام سکھلا دیئے کل کے کل پھر انہیں فرشتوں کے
عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ
سامنے پیش کیا پھر فرمایا بتلاؤ تو ان کے
هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۱) قَالُوْا
نام اگر تم سچے ہو وہ بولے
سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا
تو پاک ذات ہے ہمیں تو کچھ علم نہیں مگر ہاں وہی جو تو نے ہمیں علم دیدیا
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۳۲) قَالَ يٰٓاٰدَمُ
بیشک تو ہی ہے بڑا علم والا، حکمت والا (اللہ نے فرمایا اے آدم،
اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ
بتلا دو انہیں ان کے نام پھر جب انہوں نے انہیں ان کے نام بتلا دیئے
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ
تو فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی
وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ
چیزیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، وہ سب
تَكْتُمُوْنَ (۳۳) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا
جانتا ہوں اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے آگے

حصول صورتہ فی الضمیر (کہ اسم کی معرفت بغیر مسمّٰی کی معرفت اور ذہن میں اسکی تصویر کے ہو نہیں سکتی) اور ایک دوسرے امام لغت نے اسکی دلیل ان الفاظ میں دی ہے۔ ھو کلام نفیسٌ (تاج) اور بعضوں نے کہا ہے کہ اسم مرادف ہے ذات شے اور عین شے کے۔ یقال ذات ونفس وعین واسم بمعنیً (قرطبی) یہ تو لغوی معنی ہوئے۔ آیت کی تفسیر میں محققین نے مراد معلومات اشیاء سے لی ہے۔ اور اسماء کے ساتھ مسمیات اور ذوات و خواص اشیاء کو شامل کیا ہے۔ اور اشیاء کے اسماء سے مراد انکے آثار و خواص کا علم لیا ہے۔ فالمراد الانواع الثلاثۃ من الکلام وصورۃ المسمیات فی ذواتھا (راغب) علّم آدم مسمیات الاسماء (کشاف) الھمہ معرفۃ ذوات الاشیاء و خواصھا و اسمائھا و اصول العلوم و قوانین الصناعات وکیفیۃ آلاتھا (بیضاوی) علّمہ صفات الاشیاء ونعوتھا وخواصھا (کبیر) صاحب تفسیر مظہری نے کہا کہ مراد اسماء سے اسماء الٰہی ہیں۔ انہیں کا علم اجمالی کامل آپ کو مل گیا تھا، اور ہر اسم و صفت کے ساتھ ایسی مناسبت تامہ آپ کو پیدا ہو گئی تھی کہ آپ جس کسی اسم یا صفت کی طرف توجہ کرتے، وہ اسم یا صفت فوراً آپ پر متجلی ہو جاتی مثلاً جب اسم پاک الاول کی تجلی آپ پر ہوتی تو ہر گزری ہوئی چیز آپ پر منکشف ہو گئی۔ اسی طرح جب اسم پاک الاٰخر کی تجلی ہوتی تو ہر آنے والی چیز معلوم ہو گئی۔ اور اسی قیاس سارے اسماء الٰہی کا کیا جا سکتا ہے۔ اللہ اکبر! یہ مقام ہے انسان کی فضیلت کبریٰ کا حیف ہے کہ یہ خلیفۃ اللہ دیوتا پرستی، ملائکہ پرستی میں مبتلا ہو جائے! ۱۱۴ (کہ انسان کی اعلیٰ صلاحیت اور منصب خلافت الٰہی سے اس کی مناسبت فرشتوں پر بھی ظاہر ہو جائے) عَرَضَھُمْ۔ سوال یہ ہے کہ کیا چیز اب فرشتوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے؟ اگر حروف کے محض نام مراد ہوتے تو لفظ قرآنی عرضھا ہوتا۔ ضمیر ھُم ذوی العقول کے لئے ہے اور غیر ذوی العقول ضمناً و تبعاً اس میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ دلیل ہے اس پر کہ پیش صرف نام نہیں ہو رہے تھے بلکہ اصل موجودات۔ گویا پہلے صورت مثالی سے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے نام اور خواص سے اطلاع بخشی گئی، پھر خود ان مخلوقات و موجودات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ عرض الخلق علی الملٰئکۃ (ابن جریر عن ابن عباس وابن مسعود وغیرھما من اصحاب النبی) عرض تلک الاشیاء علی الملٰئکۃ (ابن جریر عن قتادۃ) اعرض المسمیات (کشاف) المراد بہ ذوات الاشیاء او مدلولات الالفاظ (بیضاوی) تقدیر کلام یوں تھی اسماء المسمیات۔ مضاف الیہ حذف کر دیا گیا، کہ مضاف اسکی وضاحت کے لئے کافی ہے (بیضاوی) ۱۱۵ (اپنے اس گمان میں کہ تم ہر منصب کی اہلیت اور ہر خدمت کے ساتھ مناسبت رکھتے ہو) خطاب فرشتوں سے ہو رہا ہے۔ اسماء پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔ یہاں بھی محض نام نہیں، خواص و آثار بھی مراد ہیں۔ صادقین۔ صدق سے مراد یہاں اردو کی سچائی اور راست گفتاری نہیں کہ اسکے خلاف کا تو فرشتوں میں احتمال ہی نہیں۔ بلکہ مراد محض ان کے دعویٰ کا صحیح ہونا یا ان کے خیال کا مطابق واقعہ ہونا ہے۔ صدق کا اطلاق لغت عربی میں اردو کی "سچائی" سے کہیں زیادہ وسیع ہے وہ جس طرح ارادی راست گفتاری کے لئے آتا ہے اسی طرح اصابت رائے وصحت خیال کے لئے بھی۔ وقد یستعمل الصدق والکذب فی کل ما یحق ویحصل فی الاعتقاد (راغب) والصدق ھو الصواب (بحر) صدق و کذب۔ عربی کے ان دو لفظوں کے صحیح مفہوم پر نظر نہ ہونے سے اردو خوان طبقہ قرآن و حدیث سے متعلق کتنی ہی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ مرشد تھانوی مدظلہٗ نے فرمایا کہ مدار خلافت مجاہدہ و اعمال نہیں بلکہ علم و فہم ہے بشرطیکہ بدعملی نہ ہو اور اسی لئے مشائخ طریقت عطائے خلافت کے وقت اسی کی زیادہ رعایت کرتے ہیں ۱۱۶ (اور اس سے برتر و منزہ کہ تیرا کوئی سا بھی فعل حکمت سے خالی اور مصلحت سے عاری ہو) ملائکہ کی زبان سے بار بار توحید پرستی کے کلمات ادا کرا دنیا میں پھیلی ہوئی ملائکہ پرستی (دیوی دیوتا پوجا) پر ضرب شدید لگاتا ہے ۱۱۷ (اور ہم ناچیز بندوں کے علم کی تیرے لامتناہی اور لامحدود علم کے سامنے بساط ہی کیا!) صفت خلق، صفت قدرت وغیرہ دوسری صفات کا ذکر ہی نہیں، خود صفت علم کے بھی معیار سے کہاں فرشتوں کا علم جزئی اور کہاں حق تعالیٰ کا علم کلی! ۱۱۸ (جس کے علم کیلئے حاضر و غائب، قریب و بعید، حال و مستقبل سب یکساں!) اور جو بحیثیت ہمہ دان و ہمہ بین کے ہر مخلوق کے ظرف و استعداد سے، ملکات طبع سے یکساں واقف! ۱۱۹ (اور اسی قانون حکمت کے ماتحت بشر و ملک ہر مخلوق میں اسکی استعداد کے مطابق، اسکے ظرف کے متناسب علم کا تقسیم کرنے والا کام لینے والا) ۱۲۰ (یعنی فرشتوں کو اشیاء کائنات کے آثار و خواص) اسماء پر حاشیہ اوپر گزر چکا۔ جب فرشتے اظہار عجز کر چکے تو اب آدم سے ارشاد ہوا کہ تم اپنے معلومات کا اظہار کرو۔ آدم کی فضیلت اس علم تکوینی ہی کی بنا پر تھی ۱۲۱ یعنی حضرت آدم جب امتحان میں پورے اُترے اپنے معلومات تکوینی کا اظہار سارے خلائق پر کر دیا۔ اور اس طرح ان کا شرف علماً سارے کائنات پر ثابت ہو گیا ۱۲۲ خطاب کا یہاں براہ راست ملائکہ سے ہونا تو ظاہر ہی ہے، لیکن عجب نہیں کہ بالواسطہ ساری مخلوق سے ہو ۱۲۳ گو آیت نمبر ۳۰ میں انی اعلم ما لا تعلمون کی جو اجمالی حقیقت بیان ہوئی تھی، اب اسکی تفصیل ہو گئی۔ اور ضمناً ان مسائل کی تعلیم آگئی کہ علم کلی صرف ذات باری کا خاصہ ہے۔ اور خالق کے لامحدود و لامتناہی علم سے مخلوق، اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق کے بھی علم کو کوئی نسبت نہیں۔ مفسرین نے یہاں ایک روایت نقل کی ہے کہ آدم کا ابھی جسد خاکی ہی تیار ہوا تھا اور روح ابھی اس میں نہیں پڑی تھی کہ ادھر سے ابلیس کا گزر فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ ہوا۔ ہمراہیوں سے پوچھا کہ یہ نئی مخلوق اگر تم سب پر حاکم بنا دی گئی تو کیا کرو گے؟ فرشتے بولے کہ جان و دل سے اطاعت کریں گے اور کیا کریں گے۔ واپسی پر ابلیس نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے تو اطاعت نہ ہوگی بس تو خود ہی اس پر غلبہ حاصل کروں گا۔ اور مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں ما تبدون کا تعلق فرشتوں کے اعلان اطاعت اور اظہار طاعت سے ہے، اور ما کنتم تکتمون کا تعلق ابلیس کے اخفاء بغاوت سے۔ لیکن خطاب کو اگر شروع ہی سے ساری مخلوق کیلئے عام لے لیا جائے (جیسا کہ ابھی اوپر کے حاشیہ میں گزر چکا) تو پھر اس روایت سے استناد کی کوئی ضرورت نہیں ہو جاتی ۱۲۴ یہاں صراحت صرف فرشتوں کی ہے۔ لیکن جب یہ حکم فرشتوں کو ملا، تو جنات وغیرہ جو نسبۃً ادنیٰ مخلوق تھے، وہ اس حکم کے مخاطب بدرجۂ اولیٰ ٹھہرے۔ بادشاہ کا حکم جب وزیر یا نائب السلطنت کو ملتا ہے تو ادنیٰ عہدہ دار بدرجۂ اولیٰ اس کے مخاطب سمجھتے ہیں۔

۱۲۵ (بطور اظہار عجز و نیاز) بحیثیت علامت تسلیم و اطاعت) اُسْجُدُوْا۔ سجدہ سے مراد سجدۂ اصطلاحی و سجدۂ نماز نہیں مطلق سجدہ مراد ہے۔ سجود اور سجدہ کے لفظی معنی محض تواضع و تذلل کے ہیں۔ سجد ای خضع (قاموس) کل من ذل و خضع لما امر به فقد سجد (لسان عن الفراء) السجود اصله التطامن و التذلل (راغب) سجدۂ نماز کو بھی سجدہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ تذلل و تواضع کا بہترین مظہر ہے۔ ویکون السجود علی جھة الخضوع و التواضع (لسان) خود محاورۂ قرآن میں سجود کا استعمال اس عام معنی میں عام ہے۔ مثلاً الم تران الله یسجد له من فی السموٰت والارض (اے مخاطب کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمان و زمین میں جو بھی مخلوق ہے سب اللہ کے آگے جھکی ہوئی ہے) اور یہاں بھی قول اصح یہی ہے کہ یہ سجدہ اپنی ہیئت معروفہ کے ساتھ زمین پر پیشانی رکھنے کے معنی میں تھا ہی نہیں بلکہ صرف جھکنے کے معنی میں تھا۔ کان ذلک انحناء ولم یکن خرورًا علی الذقن (مدارک عن ابن عباسؓ) قیل المعنی اللغوی ولم یکن فیه وضع الجباہ بل کان مجرد تذلل و انقیاد (روح) اقوال قوم لم یکن هذا السجود المعتاد الیوم ولکنه یبقی علی اصل اللغة فهو من التذلل والانقیاد (قرطبی) قیل امروا بالتذلل له والقیام بمصالحه و مصالح اولاده (راغب) لیکن جن لوگوں نے اسے سجدۂ متعارف کے معنی میں لیا ہے انہوں نے بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا جو اگلی شریعتوں میں جائز تھا۔ سجدۂ عبادت ہرگز نہ تھا۔ تکرمة لآدم لا عبادة لآدم (ابن جریر) کان ذلک سجود تعظیم و تحیة لا سجود عبادة (معالم) کان السجود تحیة لآدم (مدارک) اور سب سے بڑی بات تعجب کی یہ واقعہ عالم ارواح کا ہے، عالم ناسوت کا ہے ہی نہیں۔ اور تکلیفات شرعیہ کا تعلق اسی عالم ناسوت سے ہے۔ لِاٰدَمَ۔ یعنی خلیفة اللہ کے آگے۔ نائب سلطان حقیقی کی طرف رخ کرکے۔ نہ کہ اسکو۔ ل یہاں الی کا مرادف ہے یعنی سمت اور طرف کے معنی میں۔ سجدہ صرف سب آدم میں تھا جیسے آج بھی سمت کعبہ میں ہوتا ہے۔ مسجود جس طرح آج بھی کعبہ نہیں، رب کعبہ ہے۔ اسی طرح اس وقت بھی ذات باری ہی تھی۔ قرآن مجید ہی کی ایک اور آیت میں ل عند کے معنی میں آیا ہے۔ اقم الصلوٰة لدلوک الشمس۔ نصبه الله قبلة لسجودهم کالکعبة (بحر عن الشعبی) لے الی ادم فکان ادم قبلة والسجود لله تعالٰی (معالم) لے الیه والی مستقبلین وجه ادم (قرطبی) ۱۲۶ اِبْلِيْسَ۔ لفظی معنی ہیں مایوس زدہ کے۔ قرآن مجید میں مصدر ابلاس مختلف موقعوں پر اسی مفہوم میں آیا ہے۔ یبلس المجرمون۔ فاذا هم مبلسون۔ وغیرہا۔ ابلیس اسی سے مشتق ہے۔ اور یہاں بطور علم کے شیطان کیلئے آیا ہے۔ الابلاس الحزن المعترض من شدة الیاس منه اشتق ابلیس (راغب) ابلیس افعیل من الابلاس وهو الایاس من الخیر والندم والحزن (ابن جریر) ابلیس کوئی فرشتہ نہ تھا، جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے تتبع میں ایک عام خیال پھیل گیا ہے۔ بلکہ جنّی تھا جیسا کہ قرآن مجید میں مصرح ہے۔ کان من الجن (کہف۔ آیت ۵۰) نور کا بنا ہوا فرشتہ نہیں جو نافرمانی پر قادر ہی نہیں۔ بلکہ آگ کا بنا ہوا جن تھا۔ خلقتنی من نار (اعراف۔ آیت ۱۲) ان صریح نصوص کے مقابلہ میں قول کسی کا بھی ہو قابل اعتنا نہیں ۱۲۷ اَبٰی۔ انکار کیا حکم کی تعمیل سے۔ وَاسْتَكْبَرَ۔ اس نے صاف کر دیا کہ تعمیل ارشاد سے انکار کسی اشتباہ یا غلط فہمی کی بنا پر نہیں محض پندار تفوق کی بنا پر تھا۔ انکار اس نے اپنی بڑائی کی راہ سے کیا ۱۲۸ یعنی اس نافرمانی نے اسے کافروں میں داخل کر دیا۔ یہ معنی نہیں کہ وہ پہلے سے کافروں میں تھا ہی۔ لے صار من الکفرین (ابن عباس) صار من الکفرین باباء و استکباره (مدارک) ومن اقسام کان ان تاتی بمعنی صار کقوله تعالٰی کان من الکفرین (کرخ) جن اہل تفسیر نے کان کو ہوگیا کے بجائے تھا کے معنی میں لیا ہے انہوں نے فی علم الله (اللہ کے علم میں) محذوف مانا ہے۔ ابلیس پر کفر کا اطلاق حکم کے تردد و انکار کی بناء پر ہوا۔ محض ترک عمل (سجدہ) کی بناء پر نہیں۔ ترک عمل گو گناہ کیسا ہی ہو ایمان سے خارج کر دینے اور کفر تک پہنچا دینے کیلئے اہل سنت کے مذہب میں کافی نہیں (مدارک) ۱۲۹ جنّة۔ لفظی معنی ہر اس باغ کے ہیں جس کے درخت زمین کو چھپا لیں۔ کل بستان ذی شجر یستر باشجاره الارض (راغب) الجنة سے اصطلاح شرعی میں مراد وہ عظیم الشان باغ ہے جو بے شمار نعمتیں لئے ہوئے عالم آخرت میں نیک کاروں کیلئے مخصوص ہے اور آج نظروں سے مستور ہے۔ اسکا نام جنت یا تو اس لئے پڑا کہ وہ دنیا کے باغوں سے مشابہ ہے گو مشابہت بہت ہی دور کی سہی۔ اور یا اس لئے کہ اسکی نعمتیں ابھی مستور ہیں۔ سمیت الجنة اما تشبیهًا بالجنة فی الارض وان کان بینهما بون واما لستره نعمها عنا (راغب) اَنْتَ۔ اس صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب اصلی حضرت آدمؑ تھے حضرت حوا کی حیثیت تابع کی سی تھی۔ زَوْجُكَ۔ مراد حضرت حوا ہیں۔ اس وقت تک پیدا ہو چکی تھیں۔ حَيْثُ شِئْتُمَا۔ اس سے اشارہ جنت کی بہت عظیم ہی معلوم ہوگئی۔ ۱۳۰ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ ظاہر ہے کہ یہ درخت جنت کے درختوں میں کوئی متعین اور حضرت آدمؑ کیلئے معلوم و معروف درخت تھا لیکن اب اسکی تعیین سے کوئی نتیجہ نہ تھا۔ اس لئے قرآن حکیم جو کبھی بے نتیجہ بات نہیں کہتا، اس سے خاموش ہے۔ اور حدیث صحیح میں بھی اس باب میں کچھ وارد نہیں ہوا ہے۔ لم یضع لعباده دلیلًا علی ذلک فی القرآن ولا فی السنة الصحیحة (ابن جریر) اس لئے محققین کا مسلک بھی اس باب میں خاموشی کا ہے اقوال و آراء بکثرت مروی ہیں۔ توریت میں ایک بڑی طویل عبارت میں اس کا بیان آیا ہے۔ اسکے آخر میں ہے۔ "اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اس سے کھائے گا ضرور مرے گا۔" (پیدائش۔ ۲: ۱۶ و ۱۷) بات یہاں بھی اسی قدر مجمل ہی۔ مادی درختوں

لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ
جھکو ۱۲۵ تو وہ سب جھکے مگر ابلیس (نہ جھکا) ۱۲۶ اس نے انکار کیا ۱۲۷
اسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَ
تکبر میں آگیا ۱۲۸ اور کافروں میں سے ہوگیا ۱۲۸ اور
قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
ہم نے کہا اے آدم، تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو سہو، اور
وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا
اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ ۱۲۹ اور اس
تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
درخت کے پاس نہ جانا ۱۳۰ ورنہ تم گنہگاروں میں سے
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا
ہو جاؤ گے ۱۳۱ پھر شیطان نے دونوں کو پھسلایا اسی درخت کے باعث ۱۳۲
فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا
اور جس میں تھے اس سے انہیں نکلوا دیا ۱۳۳ اور ہم نے کہا (اب) تم سب نیچے اتر جاؤ ۱۳۴
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى
ایک دوسرے کے دشمن ہو کر ۱۳۵ اور تمہارے لئے زمین
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾
ہی پر ٹھکانا اور ایک میعاد تک نفع اٹھانا ہے ۱۳۶

منزل ۱

میں سے گیہوں، خرما، کافور، انجیر، حنظل وغیرہ سے لیکر شجر محبت، شجر علم وغیرہ معنوی درختوں تک کے نام لئے گئے ہیں۔ قیل الحنطة وقیل النخلة وقیل التین، قیل الحنظل وقیل شجرة المحبة وقیل شجرة الطبیعة والهوٰی وقیل وقیل (روح) لیکن اہل تحقیق کا فیصلہ وہی خاموشی کا ہے۔ ولا علم عندنا بایة شجرة کانت علی التعیین فلا حاجة ایضًا الی بیانه اذ لیس و الاولی عدم القطع والتعیین (روح) ۱۳۱ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بڑھ کر کون ظلم اپنے آپ پر ہوگا۔ اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جنت اس وقت تک دار الجزاء یا دار الخلد نہ تھی، جیسا کہ اب ہے۔ بلکہ اس وقت وہاں تکلیفات شرعی تھیں۔ احکام تھے، نواہی تھے، اور جب جنت کی ماہیت اس وقت یہ تھی، تو کوئی اشکال نہیں رہتا وہاں وسوسۂ شیطانی کے پہنچ جانے پر یا کسی نفس کے وہاں سے نکالے جانے پر۔ مرشد تھانوی مدظلہ نے لا تقربا سے یہ نکتہ خوب پیدا کیا کہ اصلاً صرف اکل ممنوع تھا لیکن ممانعت قرب شجر کی بھی کر دی گئی۔ اسی طرح مشائخ محققین بعض دفعہ مباحات سے روک دیتے ہیں کہ کہیں غیر مباح کی طرف منجر نہ ہو جائے۔ ۱۳۲ الشَّيْطٰنُ شیطان وہ ہے جو خیر اور رحمت الٰہی سے دور ہوگیا۔ شطن ای تباعد (راغب) الشیطان فیعال من شطن ای بعد عن الخیر وعن الرحمة (معالم) ابلیس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ وہی اب یہاں اپنے معنی عام شیطان سے یاد کیا جا رہا ہے نافرمانی کی پاداش میں وہ جنت سے نکالا جا چکا ہے اور بنی آدم سے شدید حسد رکھتے ہوئے ہے۔ اب اس کا نام شیطان ہے۔ اسکے پاس اور کوئی قوت نہیں۔ انسان کو مجبور ذرا بھی نہیں کر سکتا۔ البتہ پروپیگنڈے کے فن کا وہ امام ہے۔ ترغیب خوب دے سکتا ہے۔ سیاہ کو سفید کرکے خوب دکھا سکتا ہے۔ اور وسوسہ اندازی کی طاقت غضب کی رکھتا ہے۔ نزدیک اور دور اپنا عمل کہیں بھی کر سکتا ہے۔ یہ فاصلہ اسکے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا اور مادی رکاوٹیں کسی قسم کی بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ جنت کی حیثیت اس وقت تک دار الجزاء کی متعین نہیں ہوئی تھی۔ اسلئے وہاں بھی اس کا عمل بے تکلف اثر کر سکتا تھا۔ اَزَلَّ۔ زلة سے ہے۔ اور اسکے معنی ہیں، جگہ سے ہٹا دیا، ڈگا دیا، پھسلا دیا۔ بغاوت، سرکشی یا ارادی نافرمانی کا کوئی مفہوم اسمیں شامل نہیں۔ الزلة فی الاصل استرسال الرجل من غیر قصد (راغب) الزلة اسم لفعل یقع علی خلاف الامر من غیر قصد الی الخلاف کزلة الماشی فی الطین (مدارک) قرآن مجید نے پیغمبروں کی غلطیوں، لغزشوں، فروگزاشتوں کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن بائبل کے برخلاف، کوئی اخلاقی جرم، کوئی دانستہ نافرمانی، کوئی حقیقی معصیت کبھی بھی ان کی جانب منسوب نہیں کی ہے۔ نہ صراحةً نہ کنایةً۔ عَنْهَا۔ ضمیر ھا شجرة کی جانب ہے۔ اور عن تعلیلیہ ہے۔ یعنی اس کے سبب سے۔ اکثر اہل تفسیر اسی طرف گئے ہیں۔ عنها اے بسببها (ابن کثیر) والضمیر فی عنها للشجرة ای فحملهما الشیطان علی الزلة بسببها (کشاف) ای حملهما علی الزلة بسببها (روح) قرآن مجید میں عن کثرت سے اسی معنی میں آیا ہے۔ مثلاً الا عن موعدة (توبہ) وما نحن بتارکی الهتنا عن قولک (ہود) وما فعلته عن امری (کہف) ضمیر ھا سے اشارہ جنت کی طرف بھی سمجھا گیا ہے۔ اس قول پر مراد یہ ہوگی کہ شیطان انہیں دور لے گیا جنت سے۔ روایات احادیث میں آتا ہے کہ شیطان نے پہلے تو قسم کھا کر آدمؑ و حواؑ کو اپنی دوستی، ہوا خواہی و اخلاص کا یقین دلایا۔ ان بیچاروں کے خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ خدا کی قسم جھوٹی بھی کھائی جا سکتی ہے۔ اسکے بعد کہا کہ "اس درخت کا پھل اگر کھا لوگے تو جنت میں تمہارا قیام مستقل ہو جائے گا۔ اس میں تاثیر یہ

کہ پھر یہاں سے ہٹائے نہیں جا سکو گے۔ اور وہ ممانعت جو ہوئی تھی وہ تو ایک عارضی حکم تھا کہ اس وقت تک تمہاری استعداد پختہ نہیں ہوئی تھی۔ حضرت آدمؑ قربِ الٰہی کے اس محل (جنت) سے بڑھ کر اور کس نعمت کے حریص ہو سکتے تھے۔ مکار کے فریب میں آگئے۔ دانستہ نافرمانی کا سایہ بھی پڑنا الگ رہا، وہ تو درخت کے پھل کو بُعد کے بجائے قرب کا ذریعہ سمجھے۔ یہ فہم، اجتہاد کی غلطی جیسی اور جس درجہ کی بھی ہو، بہرحال فسق و معصیت سے تو اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور روایتوں سے قطع نظر قرآن مجید میں بھی جا بجا جو تصریحات ملتی ہیں، اُن سے بھی تائید اسی صورت واقعہ کی نکلتی ہے۔ بائبل میں ہے کہ بہکانے والا سانپ کی صورت میں گیا۔ اُس نے آکر پہلے حوا کو بہکایا اور پھر انہوں نے حضرت آدمؑ کو ترغیب دی۔ ہمارے مفسرین نے بھی ایک طویل قصہ نقل کیا ہے جس میں شیطان، سانپ، طاؤس سب کا ذکر آتا ہے۔ یہ قصہ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے، اس سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ یہ اسلامی عقائد میں بہرحال داخل نہیں۔ اور اس کا ماخذ قرآن و سنت نہیں، بلکہ اسرائیلی روایات ہیں۔ اسی لئے جو اہل تفسیر زیادہ محتاط و محقق ہوئے ہیں، وہ اس سے الگ ہی رہے ہیں، بلکہ اس سے احتیاط ہی کی تنبیہ کر گئے ہیں۔ اعلم ان هذا وامثاله مما یجب ان لا یلتفت الیه (کبیر) وقد اکثر المفسرون فی نقل قصص کثیرة فی قصة آدم وحوا والجنة والله اعلم بها (مدارک) وقد ذکر المفسرون ههنا اخبارًا اسرائیلیة (ابن کثیر) فقہاء نے یہیں سے استنباط کیا ہے کہ زلّت کے لفظ تک کا، برخلاف معصیت و اثم وغیرہ، اطلاق حضرات انبیاء پر جائز ہے۔ هذا دلیل علی انه یجوز اطلاق اسم الزلة علی الانبیاء علیهم السلام کما قال مشائخ بخارا (مدارک) وقد کانت منهم […] من بعض الانبیاء قبل ظهور مراتب النبوة او بعد ثبوت منازل الرسالة [illegible] (ابن العربی) اور مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ کاملین بھی شیطان کے مکر سے محفوظ نہیں، کہ حضرت آدمؑ کے اس وقت بھی کامل ہونے میں شک نہیں۔ ١٣٣ مِمَّا کَانَا فِیْهِ۔ ترجمہ دو ہو سکتے ہیں: "اُس حالت سے جس میں وہ تھے" یا "اُس مقام سے جس میں وہ تھے"۔ منقول دونوں قول ہیں۔ ای من النعیم والکرامة او من الجنة (کشاف) اور حاصل بھی دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔ ١٣٤ (زمین پر) یہ جنت زمین کے کسی حصہ میں نہیں آسمان ہی

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ

پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ الفاظ سیکھ لئے ١٣٧ پھر اللہ نے

عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٣٧﴾ قُلْنَا

ان کی توبہ قبول کر لی ١٣٨ وہ تو ہے ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ١٣٩ بڑا مہربان ١٤٠ اور ہم نے

اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ

حکم دیا کہ تم سب اس سے نیچے اتر جاؤ ١٤١ پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی

مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا

ہدایت پہنچے ١٤٢ تو جو جو کوئی پیروی میری ہدایت کی کرے گا، سو ان

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٨﴾

کے لئے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے ١٤٣

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۤىِٕكَ

اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے ١٤٤ سو وہی

ع ٤

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾ يٰبَنِىْٓ

دوزخی ہیں ١٤٥ اور وہ اس میں (ہمیشہ) پڑے رہیں گے ١٤٦ اے

اِسْرَاۤءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ

بنی اسرائیل ١٤٧ میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر

عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ

کیا ١٤٨ اور مجھ سے وعدہ پورا کرو تو میں تم سے وعدہ پورا کروں ١٤٩

منزل ١

تھی۔ قول محقق یہی ہے۔ اور خود لفظ اهبطوا کا اقتضا بھی یہی ہے۔ جب تک کوئی اور قرینہ موجود نہ ہو گا ھبوط کے معنی بلندی سے پستی میں اترنے ہی کے لئے جائیں گے۔ ای انزلوا الی الارض (معالم) الهبوط النزول الی الارض (مدارک) اهبطوا۔ خطاب اب بجائے صیغۂ تثنیہ (تم دونوں) کے صیغۂ جمع (تم سب) میں ہو رہا ہے۔ گویا مخاطب اب تنہا آدمؑ و حواؑ ہی نہیں، بلکہ ان کی ساری نسل بھی ہے۔ المراد هما و ذریتهما (مدارک) اجمع الضمیر لانهما اصلا الجنس (بیضاوی) ١٣٥ یہ مختصر لفظوں میں کل زمینی زندگی کا نقشہ آگیا، یعنی یہاں کشمکش، بغض، حسد، نفسانیت، خود غرضی کا دور دورہ رہے گا۔ ١٣٦ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ۔ آیت کا یہ جزو خود اس امر پر دلیل ہے کہ آدمؑ زمین پر اب پہلی بار بھیجے جا رہے ہیں۔ اور اب تک جس جنت میں وہ تھے وہ زمین پر نہیں آسمان پر تھی۔ اس وقت سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ نئی زندگی اور نیا ماحول۔ اور اب یہیں انہیں رہنا سہنا ہے۔ اِلٰی حِیْنٍ۔ یعنی قیام یہاں بھی دائمی نہ ہو گا، صرف ایک مدت معین تک رہنا ہو گا۔ متاع اور الٰی حین دونوں سے زمینی زندگی کا عارضی اور بے ثبات ہونا بالکل ظاہر ہو رہا ہے۔ ١٣٧ (توبہ و انابت کے) خطاوار کو توبہ و انابت کے الفاظ اپنی طرف سے تلقین کر دینا خود ایک بڑی فرد رحمت خداوندی اور رحمت الٰہی کی ہے۔ اور پھر اس سے بڑھ کر بندہ نوازی کا کمال یہ ہے کہ اس تعلیم و تلقین کی نسبت تک اپنی جانب نہیں فرمائی گئی، بلکہ اُسے حضرت آدمؑ کی جانب منسوب کر دیا گیا کہ انہیں نے وہ الفاظ سیکھ لئے۔ کیا ادب ہے شفقت و بندہ پروری کا۔ یہ کلمات و الفاظ کیا تھے؟ روایتیں جو اس باب میں نقل ہوئی ہیں مختلف ہیں۔ لیکن خود قرآن مجید میں توبہ کے الفاظ حضرت آدمؑ و حواؑ کی زبان سے نقل ہوئے ہیں: ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین۔ ١٣٨ (اور ان کی خطا سے درگزر کر دی) تاب علیه۔ تاب کا صلہ جب علی کے ساتھ آتا ہے، تو معنی ہوتے ہیں کہ رحمت کے ساتھ رجوع و توجہ کی، یا توبہ کی توفیق دی۔ یا توبہ کے اسباب آسان کر دیئے۔ رزقه التوبة من خطیئته (ابن جریر) رجع الیه بالرحمة والقبول (کشاف) عبارة عن قبول التوبة والعفو عن الذنب التوفیق لها والتیسیر لاسبابها (روح) ١٣٩ صیغۂ مبالغہ کی اہمیت ملحوظ رہے۔ اسلام کا خدا یہی نہیں کہ توبہ قبول فرماتا ہے بلکہ توبہ کے سامان و اسباب بھی بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ یقال بذلك لکثرة قبوله توبة العباد حالًا بعد حالٍ (راغب) الرجاع علی عباده بالمغفرة او الذی یکثر اعانتهم علی التوبة (بیضاوی) ١٤٠ یعنی وہ صرف خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہی نہیں بلکہ اپنی طرف سے اور بھی فضل و کرم کرنے والا ہے۔ المبالغ فی الرحمة۔ یہی وہ رحیم و غفور اور تواب (تینوں صفات کا بصیغۂ مبالغہ ہونا خیال رہے) خدا ہے جس کے لئے سادہ مسیحیوں اور ان کے پادریوں نے بار بار لکھا ہے کہ اسلام کا خدا ایک غضبناک سخت گیر خدا ہے! ١٤١ (اے اولاد آدم) اهبطوا جمیعًا مراد ذریت آدمؑ ہے۔ والمراد الذریة (ابن کثیر) عنها میں ضمیر جنت کی طرف ہے۔ یعنی جنت سے نیچے اترو۔ یہ حکم بطور سزا و عتاب نہیں مل رہا ہے۔ اس لئے کہ خطا تو اب معاف ہی ہو چکی ہے۔ بلکہ یہ محض نتیجۂ طبعی کا ظہور ہے۔ شجر ممنوع کا پھل کھا لینے سے جو طبعی اثرات مرتب ہو رہے تھے ان کے لحاظ سے اب جنت میں قیام کی گنجائش نہ تھی۔ سوء مزاج کے داغ دُھل جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم و مادہ سے بھی غلط کاری کے نقش مٹ جائیں۔ کوئی شخص خودکشی کے ارادہ سے اگر زہر کھا لے، اور معاً اُسے اپنی عصیان کاری پر تنبہ ہو جائے، اور وہ رو رو کر گڑگڑائے، دل سے توبہ کرے، اس سے گناہ تو عجب نہیں کہ معاف ہو جائے لیکن زہر کے طبعی اثرات جو نظام جسم پر مرتب ہوتے ہیں وہ تو بہرحال ہو کر رہیں گے۔ خشوع خضوع، انابت قلب ان زہر کے اثرات کو مٹانے کے لئے کافی نہیں۔ ١٤٢ (اور وہ یقینًا پہنچے گی پیمبروں یا ان کے نائبوں کے ذریعہ سے) اس ناسوتی دنیا میں رہنے سہنے کا قانون بتایا جا رہا ہے۔ ١٤٣ (روز جزا میں) هدای۔ جو پیام ہدایت رسولوں کے ذریعہ سے آتا ہے، اُسے براہِ راست حق تعالیٰ کی جانب بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ۔ ان کے اوپر کوئی خوفناک واقعہ پیش نہ آئے گا۔ یعنی اُن کے لئے فی نفسہ کوئی بات خطرہ و تشویش کی نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ صالحین طبعی طور پر بھی اپنے انجام کی طرف سے اندیشہ نہ کریں گے۔ بلکہ اندیشہ تو صالحین کو دوسروں سے کہیں زیادہ لگا رہتا ہے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے۔ اور حزن کا تعلق ماضی سے۔ مطلب یہ ہوا کہ حشر میں مومنین صالحین کو نہ کوئی سزا پیش آنے والی ہے اور نہ وہ لوگ اپنی ناسوتی زندگی پر حسرت و تاسف کریں گے۔ مَنْ۔ من موحد کا استعمال الذی جمع دونوں کیلئے آتا ہے۔ ١٤٤ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا۔ اہل جنت کے ذکر میں نسبت حق کے لئے ضمیر متکلم صیغۂ واحد کی ابھی گزر چکی ہے۔ تبع هدای اور اہل جہنم کے سلسلہ میں وہی ضمیر متکلم صیغۂ جمع میں ہو گئی ہے۔ باٰیٰتنا۔ اہل لطائف نے لکھا ہے کہ وہ موقع اظہار خصوصیت و شفقت کا تھا اس لئے "میری" ہی مناسب تھا اب محل حاکمانہ جلالت و اقتدار کا ہے، اس لئے یہاں "ہماری" ہی موزوں ہے۔ اصحب النار۔ یعنی دوزخ والے۔ وہ لوگ جو دوزخ کے ہو چکے۔ گویا وہ دوزخ ہی کی آبادی ہیں۔ الصاحب الملازم (راغب) ومعنی الصحبة اقتران بالشیء وهو الغالب فی العرف ان نطلق علی الملازمة (روح) گویا جو لوگ ضابطۂ شریعت سے انکار اور قانون الٰہی کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں انہوں نے اپنا مستقل تعلق دوزخ اور آتش دوزخ سے پیدا کر لیا ہے۔ آخرت میں یہی تعلق جو ابھی خفی اور غیر مرئی ہے مجسم و متشکل ہو جائے گا۔ عذاب آخرت سے ڈرانا صرف اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، گو جتنا زور اس پر قرآن مجید نے دیا ہے، اس کی نظیر شاید کہیں نہیں ملتی۔ جہنم کے عذاب آتشیں بلکہ اس کے دوام و خلود کے ذکر سے بائبل کے صفحات بھی خالی نہیں۔ "خداوند سلطنت کرتا ہے ...... ایک آگ اُس کے آگے آگے جاتی ہے، اور اُس کے دشمنوں کو ہر طرف جلاتی ہے" (زبور، ۹۷:۳) "فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راستبازوں سے جدا کریں گے، اور اُنہیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے، وہاں رونا اور دانتوں کا پیسنا ہو گا" (متی، ۱۳: ۴۹، ۵۰) "اے ملعونو! میرے سامنے سے اس ہمیشگی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے فرشتوں کے لئے تیار کی گئی ہے ...... اور یہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے" (متی، ۲۵: ۴۱، ۴۶) "...... جہنم میں ڈالا جائے جہاں اس کا کیڑا نہیں مرتا اور آگ نہیں بجھتی" (مرقس، ۹: ۴۸) ١٤٥ خلود کے اصل معنی ہیں کسی چیز کا ایک حال پر قائم و برقرار رہنا اور اس کے اندر کوئی تغیر کر کوئی خرابی نہ پیدا ہونا۔ الخلود هو تبری الشیء من اعتراض الفساد وبقاؤه علی الحالة التی هو علیها (راغب) اس سے ثانوی مفہوم دوام و ہمیشگی کا پیدا ہو گیا۔ ثم استعیر للمبقی دائمًا (راغب) الخلد البقاء والدوام [illegible] ومنها الخلود ودار الخلد للآخرة لبقاء اهلها (تاج) خود قرآن مجید میں اس معنی میں بہت صاف طور پر آیا ہے۔ جہاں خالد کو باقی کے معنی میں لے کر فانی سے اس کا تقابل کیا ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ

الخلد ون (انبیاء۔ ۳۴) اور خلود فی الجنۃ اور خلود فی النار سے مراد ہے جنت کی نعمتوں یا جہنم کے عذاب کا دوام اور اہل جنت اور اہل جہنم کا کبھی اپنے اپنے مقام سے باہر نہ نکلنا۔ اہل جنت کے تنعم اور اہل جہنم کے عذاب کا دائم و غیر منقطع ہونا امت کے اجماعی مسلمات میں سے

ہے۔ لا یموتون فیہا ولا یحیون لہم عنہا ولا محیص (ابن کثیر) فہم اصحاب النار لا العذاب الدائم (کبیر) والخلود ہہنا الدوام علی ما انعقد علیہ الاجماع (روح) ۱۴۶ بنی اسرائیل۔ مشہور نامور پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام عراقی ثم شامی ثم حجازی (۲۱۶۰ تا ۱۹۸۵ ق م) سے مشہور و نامور نسلیں چلیں۔ ایک بی بی ہاجرہ علیہا السلام مصری کے بطن کے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے۔ یہ نسل بنی اسمٰعیل کہلائی۔ اور آگے چل کر قریش بھی اسی کی ایک شاخ پیدا ہوئی۔ ان کا وطن عرب رہا۔ دوسری بی بی سارہ علیہا السلام عراقی کے بطن کے فرزند حضرت اسحٰق علیہ السلام کے فرزند حضرت یعقوب عرف حضرت اسرائیل علیہ السلام سے۔ یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی۔ اس کا وطن شام رہا۔ قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ ملک نہ تھا، شام ہی کا جزو تھا۔ ایک تیسری نسل تیسری بیوی حضرت قطورہ سے چلی اور بنی قطورہ کہلائی۔ لیکن اسے تاریخ میں اس درجہ کی شہرت حاصل نہیں۔ بنی اسرائیل کا عروج صدیوں تک رہا۔ توحید کی علمبرداری دنیا میں یہی قوم رہی۔ نبیوں اور رسولوں کی ایک سلسلہ ان میں جاری رہا۔ بڑے بڑے عابد و زاہد ان میں پیدا ہوئے۔ کیسے کیسے حکمران سلاطین اور فوجی جنرل بھی ان میں بڑے بڑے پیدا ہوتے رہے۔ نزول قرآن کے وقت ان کا دینی اقتدار مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ اپنے وطن سے نکل کر عراق، مصر وغیرہ اطراف و جوانب میں پھیل چکے تھے اور ان کے بعض قبیلے حجاز و اطراف حجاز خصوصاً یثرب (اسی کا نام بعد کو مدینۃ النبی پڑا) اور حوالی یثرب میں آباد ہو چکے تھے۔ بنی اسرائیل تو ایک قومی و نسلی اصطلاح ہے۔ مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے۔ اہل کتاب تھے۔ توریت محرف و مسخ شدہ ہو کر لیکن بہرحال موجود ان کے درمیان تھی۔ سلسلۂ وحی و نبوت اور عقیدۂ جزا و سزا کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے۔ علوم انبیاء و معارف اولیاء کے حامل تھے۔ مالدار تھے، ساہوکار تھے۔ ساتھ ہی علمی عقلیات، سحر و کہانت نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے۔ حجاز کی آبادی میں اس دینی و دنیوی تفوق کی بنا پر اہمیت انہیں اس وقت اچھی خاصی حاصل تھی۔ ملک کی عام آبادی مشرکوں اور بت پرستوں کی تھی۔ وہ لوگ ایک طرف تو یہود کے علم و فضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے۔ اور دوسری طرف کثرت کے قرضدار بھی رہا کرتے تھے۔ گویا

وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿٤٠﴾ وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ

اور تم صرف مجھی سے ڈرتے رہو اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب)

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ

نازل کی ہے تصدیق کرتی ہوئی اُس (کتاب) کی جو تمہارے پاس ہے اور مت بنو اس کے سب سے

بِهِ ۖ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ

اولین کفر کرنے والے اور میری آیتوں کو فروخت مت کرو (اور) تھوڑی سی قیمت پر اور صرف

فَاتَّقُونِ ﴿٤١﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ

مجھی سے ڈرو اور حق کو ناحق کے ساتھ خلط ملط مت کرو اور

تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقِيمُوا

حق کو مت چھپاؤ درآنحالیکہ تم جان بھی رہے ہو اور نماز قائم

الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ

کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (نماز میں) جھکنے والوں کے

الرَّاكِعِينَ ﴿٤٣﴾ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ

ساتھ جھکتے رہو کیا تم دوسرے لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھول

أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾

جاتے ہو درآنحالیکہ تم کتاب (الٰہی) پڑھتے رہتے ہو سو کیا تم عقل سے کام ہی نہیں لیتے

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ

اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور وہ بیشک گراں ہے

دینی و دنیوی ہر طرح کے حاجتوں میں انہیں کو مشکل کشا جانتے تھے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ منظم و قاہر قوموں کے تمدن سے کمزور اور غیر منظم قومیں مرعوب و متاثر ہو جاتی ہیں، مشرکین عرب بھی اسرائیلی اخلاق، اسرائیلی روایات، بلکہ اسرائیلی عقائد سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے۔ اور بہت سے مسائل میں یہود کو اپنا استاد مانتے تھے۔ ان سب چیزوں کے علاوہ یہود کے مذہبی نوشتوں اور اسرائیلی کی مقدس زبانی روایتوں، دونوں میں ایک آنے والے نبی کی بشارت موجود تھی اور یہ لوگ اس نبی موعود کے ظہور کے منتظر رہتے تھے۔ ان اسباب عام و خاص دونوں کی بنا پر بالکل قدرتی تھا کہ قرآن مجید میں تخاطب اس قوم کے ساتھ ہو اور خوب مفصل ہو۔ اس منزل پر پہنچ کر بہتر ہوگا کہ ایک نظر قرآن مجید کی ترتیب بیان پر بھی کر لی جائے۔ قرآن مجید کا اصل تخاطب ساری کائنات انسانی سے ہے۔ اسی مناسبت سے رکوع اول میں بیان اس کا ہوا کہ نوع انسان کی حقیقی تقسیمیں کل دو ہیں۔ ایک اچھے یا مومن، دوسرے بُرے یا کافر۔ مومن یا نیک وہ جو قرآن مجید کے دستور حیات کو تسلیم کرتے ہیں، کافر یا بد وہ جو اس سے انکار کرتے ہیں۔ دوسرے رکوع میں بیان کافروں ہی کی ایک خاص قسم یعنی کافروں کا ہوا۔ اور یہ بتا گیا کہ یہ لوگ بھی ایمان و نجات سے محروم ہی رہیں گے۔ تیسرے رکوع میں مخاطب ساری نسل انسانی کو کیا گیا۔ اور قرآن مجید کا اصل پیام یعنی توحید و رسالت بیان کر دیا گیا۔ چوتھا رکوع تاریخ نسل انسانی پر ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا کہ انسان کی اصل غرض آفرینش دنیا میں قانون الٰہی کی تنفیذ ہے اور حاکمیت الٰہی کی نیابت۔ اور اسی غفلت میں نسل انسانی کا دیرینہ دشمن شیطان اس کو بچھاڑ سکتا، اور حق سے باطل کی طرف نور سے ظلمت کی جانب لے جا سکتا ہے۔ لیکن انسان اگر ذرا بھی ہمت اور توجہ صرف کرتا ہے، اور انبیاء کی بتائی ہوئی اور دکھائی ہوئی صراط مستقیم پر قائم رہے تو وہی غالب و منصور رہے گا۔ اب پانچویں رکوع میں بیان اس کا شروع ہوتا ہے اور اس کی تفصیل متعدد رکوعوں تک چلتی رہے گی کہ مدت دراز ہوئی کہ ایک بڑے مقبول، برگزیدہ بندہ کی اولاد میں ایک خاص نسل کو توحید کی نعمت خاص سے سرفراز کیا گیا تھا مگر قوم اس کی نااہل ثابت ہوئی۔ موقعے اسے بار بار دیئے گئے، رعایت اس کے ساتھ بار بار کی گئی، لیکن ہر بار اس نے اس نعمت کو اپنے ہاتھوں ضائع کیا، یہاں تک کہ اپنی نسل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں تو حد ہی سے گزر گئی۔ طویل و مسلسل مراعات کے بعد اب حکومت الٰہی کا دستور ایک نیا ضابطہ اختیار کرتا ہے۔ اس ناشکر گزار، بغاوت و عصیاں پیشہ قوم کو اس منصب سے معزول کیا جاتا ہے۔ اور یہ نعمت اس سے چھین کر ایک مکمل پیغمبر کے واسطے سے دنیا کی تمام قوموں اور ساری نسلوں کے واسطے عام کی جا رہی ہے ۱۴۷ اس انعام خداوندی کی تصریح کے لئے ملاحظہ ہوں حواشی ... بہرحال کوئی ایک انعام تھا جو نسل اسرائیل پر نسل اسرائیل کی حیثیت سے تھا۔ ۱۴۸ توریت نسل اسرائیل پر احسانات الٰہی اور خداوندی نعمتوں کی یاد دہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ عہدی یعنی تمہارا وہ عہد جو میرے ساتھ ہے۔ طاعت الٰہی و اطاعت انبیاء کا عہد۔ بما عاهدتمونی من الایمان بی والطاعة لی (کشاف) توریت میں بھی اسی عہد کا ذکر جا بجا ہے۔ مثلاً "تم نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے ...... اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا، اور اس کی شرطوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا۔ اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا" (استثناء ۲۶: ۱۷) عهدکم یعنی جو عہد میں نے تم سے تمہارے ایمان و طاعت پر بطور انعام کر رکھا ہے۔ ای ارضی عنکم وادخلکم الجنة (کبیر عن ابن عباس) توریت میں اس کا ذکر بھی جا بجا ہے۔ مثلاً "اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا" (استثناء ۲۶: ۱۸) "اگر تم میری آواز کے فی الحقیقت سننے والے ہو گے اور میرے عہد کو حفظ کرو گے تو تم ساری قوموں سے زیادہ میرے لئے ایک خزانہ خاص ہو گے۔" (خروج ۱۹: ۵) اوفوا۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا، کہ وفائے عہد جس کا یہاں ذکر ہے، اس کے مراتب میں بہت وسعت ہے۔ ادنیٰ مرتبہ بندہ کی طرف سے ادائے کلمۂ شہادت ہے، اور حق تعالیٰ کی طرف سے حفاظت جان و مال ۱۴۹ رکوع اول جیسی مخلوق سے اور جیسے کے لئے خطاب عام جملہ عالم انسانیت سے رکوع ۳ میں ہو چکا ہے۔ اب خطاب خاص اسی مخصوص حامل توحید قوم، بنی اسرائیل سے ہے۔ لیکن یہاں اشارہ شرک جلی اور بت پرستی سے زیادہ شرک خفی اور ضعف ایمان کی جانب ہے۔ یہ اخلاقی بیماری اسرائیلیوں کی ساری قوم میں پھیل چکی تھی اور خالق کی رضا اور عدم رضا کے بجائے انسانوں کو راضی رکھنے کی پرواہ اور ان کی خوشی سے بچنے کی اہمیت اچھے اچھے علماء و مشائخ یہود کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ انجیل میں حضرت مسیحؑ کے مواعظ میں اس قسم کی ہدایتیں اور تنبیہیں کثرت سے ملتی ہیں ۱۵۰ بما انزلت۔ اشارہ ہے قرآن کی طرف۔ لما معکم۔ اشارہ ہے توریت کی طرف۔ کافر، صورۃً واحد ہے، معنیً جمع ہے۔ یعنی یا تو تقدیر کلام یہ ہے۔ ولا تکونوا اول فریق کافر (قرطبی) اور یا بقول اخفش نحوی و فراء نحوی اعتبار معنیٰ فعل کا کیا گیا ہے۔ لان المعنی اول من کفر بہ (قرطبی) بہ۔ ضمیر قرآن کی طرف ہے۔ اول کافر بہ۔ قرآن کا اولین منکر بنی اسرائیل کو اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ مشرکین عرب یہود کے تسلیم و اقرار کے بعد جس طرح اس باب میں ان کی تقلید کرتے، اسی طرح یہود کے انکار و مخالفت کے بعد اسے بھی سند میں پیش کرتے اور خود بھی انہیں کی راہ چلتے۔ یہود بہرحال اہل کتاب تھے، کتاب آسمانی کی قدر انہیں کو ہونا چاہیے تھی، اور بطور مقتدائے عرب انہیں کی ذمہ داری سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۴۶۔ وعندکم فیہ من العلم ما لیس عند غیرکم (ابن جریر عن ابن عباسؓ) (وان) وظیفتکم ان تکونوا اول من آمن بہ لما انکم تعرفون حقیقتہ (الامر) ۱۵۱ ثمنا قلیلا۔ حق کو کسی دنیوی مادی مصلحت کی بنا پر چھوڑ دینا، آخرت کی ابدی دولت کو دنیا کے ثمن قلیل (تھوڑی سی قیمت) پر فروخت کر ڈالنا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ عقبیٰ کو تھوڑے دام پر نہ بیچا جائے، اور زیادہ دام پر بیچ ڈالا جائے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت بھی آخرت کے مقابلہ میں بہرحال قلیل ہی ہے۔ کل کثیر الیہ قلیل وکل کبیر الیہ حقیر (کشاف) یہود کی حق فروشیوں کے کاروبار کا ذکر انجیل میں بھی ہے۔ مثلاً "یہ لوگ ناجائز نفع کی خاطر ناشائستہ باتیں سکھا کر گھر کے گھر تباہ کر دیتے ہیں" (ططس ۱: ۱۱) ۱۵۲ خوف خداوندی کی تاکید سے توریت اور انجیل دونوں بھرے پڑے ہیں ۱۵۳ کلام الٰہی میں لفظی یا معنوی تحریف کر کے۔ لا تلبسوا۔ تلبیس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو ڈھانپ لینا، چھپا لینا۔ واصل اللبس ستر الشیء (راغب) معنوی بات کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے، یا جھوٹ کو لفظی اور ظاہری سچائی کا رنگ دے دینا، بعض اوقات بالکل گڑھے ہوئے جھوٹ سے کہیں بڑھ کر دھوکے اور مغالطہ کا سبب بن جاتا ہے۔ وہی سطحی جھلکی ہوئی شے کا نام آج کی اصطلاح میں پروپیگنڈہ ہے۔ موجودہ فرنگیوں کی طرح یہود بھی اس فن میں اُستاد ہو چکے تھے ۱۵۴ احکام الٰہی کو بدل دینے کی ممکن صورتیں دو ہیں۔ ایک ان میں آمدہ وہی تحریف، تلبیس و تخلیط، دوسرے ان کا سرے سے اخفاء و کتمان۔ یہود نے اپنے دینی صحیفوں میں دونوں طرح کے عمل جاری کر رکھے تھے۔ توریت سخت مختلف ہونے سے اول تو یوں ہی کتنے احکام سرے سے غائب اور گم ہو گئے تھے۔ پھر جو باقی رہ گئے تھے، انہیں علمائے توریت نے اپنے اپنے اغراض و مصالح کے ماتحت خدا معلوم کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا ۱۵۵ اگر تم تلبیس و کتمان کے مرتکب ہوئے ہو تو بھی تحریف تمہارے

علاوہ واقعات سے باہر نہیں۔ دیدہ و دانستہ تمہارے علم کے اندر ہو رہی ہے۔ یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ تم اپنے ان اعمال قبیحہ کتمان کی شناعت سے بھی خوب واقف ہو۔ ۱۵۶ یعنی ایمان کے بعد عملاً بھی ارکانِ اسلام کی پابندی کرو۔ ایمان لانے کے

حکم ابھی ایک آیت قبل وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ میں مل چکا ہے۔ اب تسلیم امر جزئیات احکام کی ہو رہی ہے۔ اقیموا الصلٰوۃ نماز کے پابند ہو جاؤ کہ اس سے مرضِ حبِّ جاہ کا علاج ہو جائیگا (تھانوی) اٰتوا الزکوٰۃ۔ زکوٰۃ دیتے رہو کہ اس سے مرضِ حبِّ مال کی اصلاح ہو جائیگی (تھانوی) واصولهم الخ

کے ساتھ جھک کر تواضع باطنی کے حصول میں بڑا دخل اس تواضع کی ہیئت کو ہوتا ہے (تھانوی) ارکعوا۔ رکوع اسلامی نماز کے ایک مشرف رکن کا نام ہے۔ مقصد ارشاد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ نماز جماعت میں شریک ہو۔ فقہا میں ایک بحث یہ پیدا ہوئی کہ آیا کافروں کو فروع

کا مخاطب بنانا درست ہے؟ ایک گروہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے جواب اثبات میں دیا ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کی طرف سے معقول جواب یہ ہے کہ آیت کے یہ سارے احکام ایک آیت قبل کے حکمِ ایمان وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ کے ماتحت ہیں یعنی پہلے ایمان لاؤ اور پھر ان احکام پر عمل کرو۔

۱۵۷ یعنی کیسے غضب کی بات ہے کہ دوسروں کو تو ایمان لانے کا مشورہ دیتے ہو اور خود ایمان نہیں لاتے۔ خطاب یہود سے چلا آ رہا ہے۔ اوپر کسی حاشیہ میں یہ آچکا ہے کہ یہود اپنے صاحبِ علم و کتاب ہونے کی بنا پر مشرکین عرب کی نظر میں بڑے معزز و قابل وقعت تھے۔ جاہل غریب عرب ان کے پاس کہ

رسول اللہ صلعم اور آپ کی دعوت کے باب میں استفادہ و مشورہ کیا کرتے کہ اس مدعی نبوت کے دعووں میں کہاں تک صداقت ہے؟ ہم اس کی تصدیق کریں یا انکار کریں، وغیرہا۔ احبار یہود ایسے موقعوں پر بارہا یہ مشورہ دے اٹھتے کہ بیشک ان میں علامتیں تو ہمارے ہاں کی پیشگوئیوں کی مطابق پائی جاتی ہیں۔

قالوا هو صادق وامرہ حق فاتبعوہ (کبیر) نزلت فی احبار المدینة کانوا یامرون سرًّا من نصحوہ باتباع محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم (معالم عن ابن عباس) ضمیر و دیانت کے لحاظ سے قرآن کا مشورہ یہ تھا۔ لیکن اپنے عمل کے وقت ہوائے نفس حائل ہو جاتی اور خیال یہ گزرتا

کہ اگر اسلام لانے کے بعد باتحتی اور پابندی کی زندگی بسر کرنا ہوگی، سیادت یہ مالی اور جاہی مزے کہاں حاصل رہیں گے۔ وهم کانوا لا یتبعونه لطمعهم والصلات التی کانت تصل الیهم من اتباعهم (کبیر) ولا یتبعونه (معالم عن ابن عباس) البر۔ بِر کے لفظی معنی نیکی

کے ہیں، اور یہ اپنے اطلاق میں عام ہے یعنی ہر قسم کی نیکی پر شامل۔ البر التوسع فی الخیر الکامل (راغب) هو اسم جامع لاعمال الخیر (کبیر) یتناول جمیع اصناف الخیرات (ابن سعود) یہاں مراد قبولِ اسلام و تصدیقِ رسالتِ محمدی سے ہے۔ اَتَأْمُرُوْنَ۔ ہمزہ یہاں اظہار حیرت اور ملامت کے لئے ہے۔ والهمزة للتقریر مع التقریع والتعجب (کبیر) الهمزة للتقریر مع التوبیخ والتعجب من حالهم (کشاف) ۱۵۸ یعنی کتاب توریت جس میں علامتیں اور شہادتیں ان خاتم النبیین کی درج ہیں۔ یعنی بالکتب التوراة (ابن جریر عن ابن عباس) ۱۵۹ (ایمان کی نعمت قدمی اور شعائر) کفر کے ترک پر ۱۶۰ انها۔ ضمیر نماز کی طرف ہے۔ نماز کا حکم ابھی ابھی مل چکا ہے۔ اب بیان اُن طریقوں کا ہو رہا ہے جن سے نماز آسان ہو جائے اور نماز کی پابندی میں سہولتیں پیدا ہو جائیں۔ خٰشعین۔ خشوع کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ اب یہاں آیت میں خشوعِ قلب کے دو خاص اثرات کا بیان ہو رہا ہے۔ پہلا اثر یہ ہے کہ خاشعین کو اس کا دھیان لگا رہتا ہے کہ عبادتیں ہماری جانے والی نہیں۔ اپنے شفیق و کریم پروردگار کے حضور میں بہرحال حاضر ہونا ہے۔ اُس وقت یہ ساری محنت وصول ہو جائیگی۔ اور استحقاق سے کہیں بڑھ کر اجر ملے گا۔ شوقِ نماز اس مراقبہ سے پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ دوسرا اثر خشوعِ قلب کا یہ ہے کہ خاشعین کے دل میں یہ بات جم جاتی ہے کہ آخر تو اسی مالکِ حقیقی کے روبرو ہونگے، حساب ہر ہر عمل اور ترکِ عمل کا ہوگا۔ ترکِ نماز کی عادت اس سے خود بخود ترک ہو جائیگی۔ عمل میں ساری سہولتیں یقین ہی کی مضبوطی اور قوت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور یقین کے ایجابی و سلبی دونوں پہلو یہاں بیان میں آگئے۔ نفسیاتِ جدید میں محرکِ عمل دو ہی چیزیں مانی گئی ہیں۔ ترغیب و ترہیب۔ ترغیب کا جزو انهم ملٰقوا ربهم میں جزا و اجر کے اقتضاء سے آگیا۔ اور ترہیب کا جزو انهم الیه راجعون میں مراقبہ مواخذہ سے آگیا۔ یظنون۔ ظن لغت میں شک اور یقین دونوں کے معنی میں آیا ہے۔ العرب تسمی الیقین ظنًّا والشک ظنًّا (ابن جریر) الظن من الاضداد یکون شکًّا ویقینًا (معالم) اور کلام عرب میں ظن بہ معنی یقین کے استعمال کی نظائر بے انتہا ہیں۔ والشواهد من اشعار العرب وکلامها علی ان الظن فی معنی الیقین اکثر من ان تحصی (ابن جریر) الظن بمعنی الیقین او الترجیح مشهور عن العرب (مر) یہاں اکثر ائمہ تفسیر نے یقین ہی کے معنی میں لیا ہے۔ ای یعلمون ویستیقنون (ابن جریر عن ابن عباس) الظن هٰهنا الیقین (ابن جریر عن ابی العالیہ) ای یستیقنون (معالم) ورُوی عن مجاهد والسدی والربیع بن انس وقتادة نحو قول ابی العالیة (ابن کثیر) اعتقاوا ویقنون ذٰلک الجمهور (بحر) بعض نے یہاں بھی مراد توقع و امید سے لی ہے، اور اس قدر بھی کافی ہے۔ یظنون ای یتوقعون (کشاف) ۱۶۱ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۲۰ و ۱۲۲۔ ۱۶۲ خوب خیال رہے کہ یہاں ذکر مذہب یہود کا نہیں، ایک مخصوص قوم و نسل کا ہے۔ بنی اسرائیل نام کسی مذہب یا فرقہ یا عقیدہ کا نہیں، ایک خاص نسل کا ہے۔ افضلیت یہاں مذہب یہودیت کی نہیں، نسلِ اسرائیل کی بیان ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نسل کی افضلیت سارے عالم پر کس معنی میں ارشاد ہو رہی ہے؟ اور وہ کونسی ایسی نعمت تھی جو حیثیتِ نسل بنی اسرائیل کے ساتھ بلا شرکت غیرے، مدتوں مخصوص رہی؟ اگر کہیے کہ دولت یا حکومت یا تجارت یا کثرتِ آبادی، تو اول تو یہ انعامات اللہ کے خود اس درجہ کے نہیں کہ انکا ذکر اس شان و اہتمام کے ساتھ کیا جائے، اور انہیں کو معیارِ فضیلت افضلیت بنایا جائے، اور پھر یہ نعمتیں تو بہت سی قوموں کو اپنے اپنے وقت میں نصیب رہ چکی ہیں۔ کلدانیہ، مصر، ہندوستان، ان سب ملکوں کو تمدن اپنے زمانہ میں، اسرائیلیوں سے قبل، عروج پر رہ چکا ہے۔ اور تاریخ کا بیان ہے کہ ان قوموں کا فخر ہی جاہ و حشم اسرائیلیوں سے کچھ بڑھ ہی چڑھ کر رہا ہے۔ پھر آخر قوم اسرائیل کی وہ مخصوص فضیلت کیا تھی؟ تاریخ کی زبان سے جواب ایک ہی ملتا ہے کہ وہ دولت یا اللہ کی اعلیٰ ترین نعمت، مسلکِ توحید کی تھی۔ دنیا کی تاریخ کے جس دور میں ساری قومیں اور ساری نسلیں کم و بیش شرک میں مبتلا تھیں، یا اس کی طرف بہی چلی جا رہی تھیں، یہ نسلِ اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی جو من حیث القوم توحید کی علمبردار رہی۔ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رسالت کی قائل صرف وہی قوم ہوگی جس کا عقیدۂ توحید واضح و پختہ ہوگا۔ اور انبیاء و رسل جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے، نسلِ اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے۔ ہاں متفرق طور پر کسی دوسری نسل میں بھی کبھی کبھی پیدا ہو گئے ہوں، تو وہ اس کے منافی نہیں۔ ذکر یہاں افراد کا نہیں، نسل و قوم کا ہو رہا ہے۔ دنیا کی ساری دوسری قوموں میں جس وقت ظہورِ آفتابِ اسلام کا ہو رہا تھا، اور وہ قومیں عناصر کی مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، بت پرستی، غرض شرک ہی کی کسی نہ کسی شکل میں گرفتار تھیں، انبیاء اور رسل اور ان کی تعلیمات کا چرچا صرف بنی اسرائیل میں تھا۔ ہندوستان کی آریہ نسل میں فلسفہ، ہندسہ، ریاضیات، معقولات کے ماہرین و علماء جیسے بھی پیدا ہوتے رہے ہوں، بہرحال حلولیت کا شرک اُن میں قبول ہی کئے ہوئے تھا۔ اور توحید و رسالت کی دعوت صرف سامی نسل کی شاخ اسرائیل کے حصہ میں آئی تھی۔ موجودہ یہود کو بھی اپنے اسلاف کی یہ امتیازی حیثیت یاد ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔ "بنی اسرائیل پر خاص فرض عائد ہوا تھا کہ توحید باری کی دعوت دیتے رہیں

اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ

مگر خشوع رکھنے والوں پر (نہیں)، جنہیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انہیں اپنے

مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ

پروردگار سے ملنا (بھی) ہے اور اس کا کہ انہیں اس کی طرف واپس ہونا ہے ۱۶۰ اے

اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

بنی اسرائیل، میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا ۱۶۱

وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا

اور تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی ۱۶۲ اور اس دن سے ڈرتے رہو

تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

جب نہ کوئی کسی کے حق میں بدلہ بن سکے گا اور نہ کسی کے حق میں

شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ

سفارش قبول ہوگی اور نہ کسی سے معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ انہیں مدد

يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ

ہی پہنچ سکے گی ۱۶۳ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی تھی

يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ

جو تمہارے اوپر بڑا عذاب توڑ رہے تھے ۱۶۴ تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے

وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ

اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے ۱۶۵ اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے

ع ۵

منزل ۱

آئی گرامتِ موسوی "اور" قوم اسرائیل" کے درمیان خلط ہوگیا، اور دونوں کا عظیم الشان فرق نظر میں نہ رہا۔ امتِ محمدیؐ کی افضلیت بلحاظِ دین و عقیدہ ہے، نہ کسی نسلی یا قومی اعتبار سے، اور آیت میں ذکر ایک خاص نسل کی افضلیت کا ہے۔ یہ کوئی نظریہ یا اجتہادی مسئلہ نہیں، ایک مسلم تاریخی حقیقت ہے کہ جس وقت دنیائے تہذیب طرح طرح کے شرک و وہم پرستیوں میں مبتلا تھی، موحدِ اعظم ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل کی ایک شاخ توحید کا علم بلند کئے ہوئے تھی۔ ہمارے مفسرین میں سے بھی کسی کسی کے ذہن کی رسائی اس حقیقت تک ہوگئی ہے، اور وہ صاف لکھ گئے ہیں کہ نسلِ اسرائیلی کی افضلیت اس میں سلسلۂ نبوت و انبیاء کے لحاظ سے تھی۔ بما جعل فیھم من الانبیاء وھذہ خاصۃ لھم ولیست لغیرھم (قرطبی) ۱۴۳ یوماً "اس دن" سے مراد ظاہر ہے کہ یوم قیامت ہے۔ قیامت کی بار بار یکساں تکرار پر دلائی گئی حشر نشر جزا و سزا کا عقیدہ جو انسان کے دل میں سئولیت اور ذمہ داری کی روح ہے، اسرائیلیوں کے دلوں ہی سے نہیں، کہنا چاہئے کہ ان کی مقدس کتابوں اور نوشتوں تک سے مٹ چکا تھا۔ آگے روزِ قیامت کے جو اوصاف بیان ہو رہے ہیں، سب میں رد ہے کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدہ کا۔ لا تجزی نفس عن نفس۔ اس سے مقصود اس اسرائیلی عقیدہ کی تردید ہے، جو آج تک جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے "بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمالِ حسنہ کی بنا پر بخش دیئے جائیں گے" (جلد ۵، صفحہ ۲) ولا یقبل منھا شفاعۃ۔ (جس صورت میں کہ موت حالتِ کفر پر اور عدمِ ایمان میں ہوئی ہو) یہاں بھی تردید ہے اس اسرائیلی عقیدہ کی کہ عمل اور عقیدے کیسے ہی ہوں، بہرحال اپنے اسلافِ کرام شفاعت کر کے بخشوا ہی لیں گے۔ شفاعت اور ایک شفیعِ مستقل کا یہی وہ مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے مسیحیت میں آگر انسانی شکل اختیار کرلی۔ اور کفارہ ہی کی طرح شفاعت پر مسیحیت کی بنیاد ہے۔ ولا یؤخذ منھا عدل۔ اس میں اصل ضرب یہودی اور مسیحی عقیدۂ کفارہ پر ہے۔ مسیحیوں کے ہاں عقیدۂ کفارہ کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن خود یہود بھی ایک بڑی تعداد میں اسی عقیدۂ کفارہ سے متاثر ہوکر اس کے قائل ہوگئے تھے (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۴، صفحہ ۲۷۸) ولاھم ینصرون۔ ایمان نہ رکھنے والوں کو کسی طرف سے مدد و نصرت بھی نہ پہنچے گی کہ سزا میں کچھ تخفیف ہی ہو سکے چہ جائے کہ نجاتِ کامل ہو سکے ۱۴۴ آل لغت میں اھل کا مرادف ہے۔ اور مراد اس سے اہل و عیال، اتباع، ہم مذہب اور ہم نسب ہوتے ہیں۔ اھل الرجل عیالہ واتباعہ واولیاؤہ مگر فرق یہ ہے کہ اھل کا استعمال عام ہے اور آل صرف خصوصیت اور اہمیت رکھنے والوں کے لئے آتا ہے۔ لا یستعمل الآل الا فیما فیہ شرف غالباً (تاج)۔ فرعون۔ یہ کسی متعین بادشاہ کا ذاتی نام یا علم نہیں۔ قدیم شاہانِ مصر کا عام لقب تھا۔ جیسے ہمارے زمانہ میں ابھی کل تک جرمنی کے بادشاہ کو قیصر، روس کے تاجدار کو زار، اور ٹرکی کے فرمانروا کو سلطان کہتے تھے۔ یا آج بھی والیٔ مصر کو خدیو اور والیٔ دکن کو نظام کہتے ہیں۔ فرنگی مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے عہد کوئی ایک بادشاہ نہیں ہوا ہے، یکے بعد دیگرے دو بادشاہ ہوئے ہیں۔ یہ اگر صحیح ہے تو اسے بھی قرآن کا اعجاز ہی کہنا چاہئے کہ وہ بجائے شخصی نام کے عمومی لفظ لایا جس کے بعد شخصیتوں کے ایک یا دو یا چند ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یسومونکم سوء العذاب یعنی ظالم و جابر حکمرانوں کی طرح تمہیں مبتلا بنائے ہوئے تھے اور طرح طرح کی سختیاں کر رہے تھے۔ توریت میں ہے۔ "مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی تھیں" (خروج ۱: ۱۳، ۱۴) قدیم ترین اسرائیلی مؤرخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود (History of Jewish Antiquities) میں تفصیلات اور زیادہ موجود ہیں۔ قرآن مجید اور توریت کے بیان کا یہ فرق بھی قابلِ لحاظ ہو کہ توریت نے حالاتِ سخت گیریوں کو بجائے "مصریوں" کی جانب منسوب کر دیا۔ اور قرآن نے اپنے حسبِ معمول محتاط اور انتہائی صادق انداز میں نام صرف "فرعونیوں" کا لیا ——— دونوں چیزیں ایک دوسرے سے ایسی ہی الگ ہیں جیسے انگریزی قوم اور انگریزی حکومت۔ نجینا۔ باب تفعیل سے ہے۔ اور اس باب کی ایک خاصیت فعل کی تدریج ظاہر کرنا بھی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سارے اسرائیلی مصر سے دفعۃً نہیں نکلے تھے، بلکہ رفتہ رفتہ اور مختلف ٹولیوں میں نکلتے رہے۔ اور ان کا سب سے بڑا اور آخری دستہ وہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں روانہ ہوا۔ اور راہ میں بھٹک کر بحیرۂ قلزم پار ہوا۔ ہیسٹنگز کی "ڈکشنری آف دی بائبل" میں ہے۔ "ممکن ہے کہ مصری اسرائیلیوں کے گروہ وقتاً فوقتاً مصر سے نکل کر اپنے اجداد کے مقبروں کے گرد آباد ہوتے رہے ہوں" (جلد ۳، صفحہ ۸۱) اگر تاریخ نے کبھی مؤرخین کے اس خیال کی تصدیق کر دی تو قرآن مجید کے لفظ نجینا کے باب تفعیل سے آنے کی اعجازی قدر اس وقت ہوگی ۱۴۵ توریت میں ہے۔ "اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو ...... اور فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا، کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو" (خروج ۱: ۱۶ و ۲۲) ۱۴۶ یہ لڑکیوں کا قتل نہ کرنا اور انہیں عورت بننے کے لئے زندہ رکھنا غالباً اس لئے تھا کہ انہیں آئندہ فرعونی امراء اپنے حرم میں داخل کریں۔ (مطین کی "ہسٹری آف دی جیوز" جلد اول صفحہ ۱) توریت میں ذکر قرآن کی طرح صرف ان کے زندہ رکھنے کا ہے۔ وجہ و مصلحت صریح نہیں۔ "اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو۔ اور اگر بیٹی ہو تو اسے جینے دو ...... ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو اور جو بیٹی ہو اسے جیتی رہنے دو" (خروج ۱: ۱۶ و ۲۲) ۱۴۷ مشہور و قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس کے الفاظ بھی تقریباً بالکل یہی ہیں۔ "یہ ایک بہت سخت ابتلا تھا" (تاریخ آثار یہود، باب ۹، فصل ۹) ۱۴۸ فرعون اور مصری گورنمنٹ کے مظالم سالہا سال تک برداشت کرنے کے بعد بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ساری قوم اسرائیل نے مصر کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کو چلا جانا طے کرلیا۔ سفر مصری حکومت سے چھپ چھپا کر رات کے وقت شروع کیا۔ زمانہ

رَبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٤٩﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ
تمہارے پروردگار کی بڑی آزمائش تھی ۱۴۹ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑ دیا تھا ۱۵۰
فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾
پھر ہم نے تمہیں نجات دے دی اور فرعون والوں کو غرق کر دیا، درآنحالیکہ تم دیکھ رہے تھے ۱۵۱
وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ
اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ کرلیا تھا ۱۵۲ پھر تم نے ان کے
الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ
پیچھے گوسالہ کو اختیار کرلیا ۱۵۳ اور تم (سخت) ظالم تھے ۱۵۴ پھر ہم نے
عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ
تم کو اس کے بعد بھی معاف کر دیا ۱۵۵ کہ شاید تم
تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ
شکر گزار بن جاؤ ۱۵۶ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان دیئے
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ
تاکہ تم راہ یاب ہو جاؤ ۱۵۷ اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا
يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ
کہ اے میری قوم یقیناً تم لوگوں نے اپنے اوپر (بڑا) ظلم کیا اپنی گوسالہ گیری سے ۱۵۸
فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ
سو اب اپنے خدا سے توبہ کرو ۱۵۹ پھر اپنے اشخاص کو قتل کرو ۱۶۰ یہی بہتر ہے

وہ تھا کہ آج کل کی سی باقاعدہ سڑکیں تھیں، نہ راستوں میں لیمپ لالٹین۔ شب کی تاریکی میں اسرائیلی راستہ بھول گئے۔ اور بجائے اس کے کہ شمال کی طرف بڑھتے اور آگے بڑھ کر اپنے دائیں پر مشرق کی طرف مڑتے، پہلے ہی ادھر گھوم پڑے۔ ادھر فرعون کو خبر ہوگئی، اور وہ اپنے لشکر کی کمان خود کرتا ہوا تیزی سے تعاقب میں آپہنچا۔ اب اسرائیلیوں کے سامنے یعنی مشرق کی جانب سمندر تھا، اور دائیں بائیں شمال و جنوب میں پہاڑیاں تھیں، اور پشت پر یعنی مغرب کی جانب مصری لشکر۔ قرآن مجید میں اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ توریت میں اس کو خروج بنی اسرائیل سے موسوم کیا ہے۔ زمانہ کی تعیین جزم کے ساتھ مشکل ہے۔ جدید ترین تحقیقات کے مطابق پندرھویں صدی قبل مسیح کا وسط قرار پایا ہے۔ بلکہ بعض نے جرأت کر کے سن بھی متعین کر دیا ہے۔ ۱۴۴۷ ق م۔ بکم۔ تمہارے لئے یعنی تمہیں بچانے کے لئے، تمہیں راستہ دینے کے لئے۔ ای فرقناہ لکم (معالم) ای فرقنا بسببکم وبسبب انجائکم (کشاف)۔ فرقنا البحر۔ بشر کے محدود نقطۂ نظر اور انسان کے ناقص علم کے اعتبار سے جو مستبعد، خلافِ معمول اور حیرت انگیز واقعہ کسی نبی کی تائید میں، ظاہری مادی اسباب سے بے تعلق، ظہور میں آئے، اسے اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔ ایسے کسی واقعہ کو جس کا ثبوت روایت یا روایت، مشاہدہ یا نقلِ صحیح سے مل جائے، "خلافِ عقل" کہہ کر اس کے امکان سے انکار کر بیٹھنا خود ایک انتہائی نادانی اور بے عقلی ہے۔ تاریخی عجائب سے آخر تاریخ لبریز ہی ہے، اور خوارق، نوادر، حوادثِ عجیبہ سے دنیا کا کون سا گوشۂ زمانہ کا کون سا دور خالی رہا ہے؟ یا آج کس دن، کس تاریخ کے اخبارات خالی رہتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ ایسے واقعات کو خلافِ معمول، خلافِ عادت مانا کہا جا سکتا ہے، اور ان کے روایتی ثبوت کا مطالبہ یقیناً کرنا چاہئے، راویوں پر جرح بھی خوب کرلینا چاہئے، لیکن اس سے تجاوز کر کے اُن کے نفسِ امکان میں شک کرنا یا انہیں خلافِ عقل و محال قرار دینا خود اپنی کم عقلی کا اظہار کرنا ہے۔ استبعاد جو کچھ بھی ہے، وہ توصرف انسانی معیار سے ہے، انسان کے بہت ہی محدود و مختصر علم و تجربہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ جو قادرِ مطلق ہے، اس کے لئے تو "عجیب" اور "خلافِ معمول" سب ایک ہے۔ "غریب" اور "مانوس" کا فرق اس کے لئے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ "وقوع" اور "امکان" دو بالکل الگ چیزیں ہیں، اور انہیں کے خلط مبحث نے معجزہ کے مسئلہ میں اتنی الجھن پیدا کر دی ہے۔ امکان تو ہر چیز کا ہے۔ اللہ کے دائرۂ قدرت کے اندر ہر چیز ہے۔ ناممکن تو اس کے لئے کوئی سی بھی چیز نہیں۔ لیکن وقوع پر یقین کرنے کے لئے ضرورت شاہدوں کی ہوتی ہے۔ اور جو واقعہ جس قدر عجیب اور معمولِ عام سے ہٹا ہوگا، اسی نسبت سے اس پر یقین لانے کے لئے شہادت بھی زبردست ہونی چاہئے۔ یہ تو معجزات پر اصولی گفتگو تھی، باقی یہاں جس فرق البحر کا ذکر ہے، تو یہ سمندر کا پھٹ جانا اور درمیان میں خشکی کی راہ بن جانا کچھ ایسا زیادہ خارقِ عادت ہے بھی نہیں کہ اس کی نظیر کہیں ملتی ہی نہ ہو۔ بحری زلزلہ کے وقت ایسی صورتیں پیش آتی ہی رہتی ہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۴ء، رمضان ۱۳۵۲ھ میں جو عظیم الشان زلزلہ بہار اور اطراف بہار میں آیا، اس موقع پر صوبہ کے صدر مقام، شہر پٹنہ میں دن دہاڑے کوئی ڈھائی بجے کے وقت، ایک مجمعِ کثیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گنگا جیسے وسیع و عریض دریا کا پانی چشم زدن میں غائب ہوگیا، اور اتنے چوڑے پاٹ میں بجائے دریا کے خشکی ہی خشکی نکل آئی اور یہ حیرت انگیز اور دہشت ناک منظر چند سکنڈ نہیں، چار پانچ منٹ تک قائم رہا، یہاں تک کہ دریا اسی برق رفتاری کے ساتھ یک بیک زمین سے ابل کر پھر جاری ہوگیا۔ ——— واقعہ کی مفصل روداد ایک وقائع نگار کے قلم سے، انگریزی روزنامہ

بطور انکشتی کی۔ جنوری ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں درج ہے۔ البحر۔ بحر سے مراد یہاں دریائے نیل نہیں، جیسا کہ بعض ثقات کو دھوکا ہو گیا ہے۔ بلکہ بحر قلزم یا بحر احمر مراد ہے۔ دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن اور مصر سے مغرب کی طرف واقع تھا۔ اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لئے مشرق کی طرف تھا۔ نیل سے اس راستہ کو کوئی بھی واسطہ نہ تھا۔ مصر سے شام کی راہ کے قریب بحر قلزم تھا۔ اسی کے تنگ شمالی سرے کی جانب یہاں اشارہ ہے۔ مصر کے مشرق میں جہاں اب نہر سویز کھد گئی ہے۔ اس سے متصل جنوب میں نقشہ میں سمندر دو شاخوں کی شکل میں تیر نظر آئے گا۔ یہاں ان ہی سے مغربی شاخ مراد ہے۔ اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تھا۔ ۱۶۹ اسرائیل اپنے کو ہر طرف سے محصور پا کر قدرۃً سخت پریشان ہوئے۔ لیکن رہنمائی اللہ کے ایک پیمبر کر رہے تھے۔ آپ نے وحی الٰہی کے اشارہ سے فرمایا کہ بلا توقف سمندر میں چل پڑو۔ سمندر کا پانی ہٹ کر دونوں طرف پہاڑ جیسی دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ درمیان میں خشک راستہ پیدا ہو گیا۔ اسرائیلیوں کا قافلہ عبور کر گیا۔ اتنے میں فرعونی بھی لب ساحل پہنچ گئے۔ اور یہ منظر دیکھ کر وہ بھی پیدل اور سوار خشک سمندر میں در آئے۔ لیکن ابھی درمیان ہی میں تھے کہ پانی کی دو کھڑی ہوئی دیواریں تاگاہ آپس میں مل گئیں۔ اور سمندر کا پانی حسب سابق رواں ہو گیا۔ اور دیکھتے دیکھتے فرعون مع اپنے لاؤ لشکر کے غرق ہو کر رہ گیا۔ توریت میں تعبیر کلمات ذیل ملتی ہے۔ "پھر موسیٰ نے دریا پر اپنا ہاتھ بڑھایا اور خداوند نے بسبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا۔ اور دریا کو سکھایا۔ اور پانی کو دو حصہ کیا۔ اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کر گزر گئے۔ اور پانی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔" (خروج ۱۴: ۲۱-۲۲) "بنی اسرائیل خشک زمین پر دریا کے بیچ میں چلے گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔ سو خداوند نے اس دن اسرائیل کو مصریوں کے ہاتھ سے یوں بچایا۔" (خروج ۱۴: ۲۹-۳۰) "اور مصریوں نے پیچھا کیا اور ان کا پیچھا کئے ہوئے وہ اور فرعون کے سب گھوڑے اور اس کی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بیچوں بیچ تک آئے ۔۔۔۔۔۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ دریا پر بڑھایا۔ اور دریا صبح ہوتے ہی اپنی اصلی قوت پر لوٹا۔ اور مصری اس کے آگے بھاگے اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا۔ اور پانی پھرا۔ اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر کو جو ان کے پیچھے دریا میں آئے تھے چھپالیا۔ اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوڑا۔" (خروج ۱۴: ۲۳-۲۸) واقعہ کا زمانہ جدید ترین اثری تحقیق

تَكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۗ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۗ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ

تمہارے حق میں تمہارے خدا کے نزدیک ۔ پھر اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی ۔ بیشک وہ بڑا توبہ قبول

الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ

کرنے والا، بڑا مہربان ہے ۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز نہ باور کریں گے تمہارے

نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ

کہنے سے جب تک کہ ہم خدا کو دیکھ نہ لیں علانیہ ۔ سو (اس پر) تم کو آ لیا کڑک نے ۔ اور تم (اس کا تماشا)

تَنْظُرُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ

دیکھ رہے تھے ۔ پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا تمہارے مرے پیچھے ۔ کہ شاید تم

تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا

شکر گزار بنو ۔ اور ہم نے تمہارے اوپر ابر کا سایہ کر دیا ۔ اور ہم نے

عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ

تمہارے اوپر مَنّ و سلویٰ اتارا ۔ کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے

مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا

جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں ۔ اور انہوں نے زیادتی ہم پر نہیں کی بلکہ زیادتی اپنی

أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ

ہی جانوں پر کرتے رہے ۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا کہ اس

الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَ

بستی میں داخل ہو جاؤ ۔ اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ پیو ۔ اور

منزل ۱

کے مطابق ۱۴۴۷ ق م یا اس کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔ وانتم تنظرون۔ مجموعہ غیر ضروری یا بے بیت نہیں۔ بنی اسرائیل پر اس حقیقت کا پُرزور طریقہ پر اعلان مقصود ہے کہ اپنے ایسے پُر قوت دشمن کی ہلاکت و بربادی کا نظارہ محض تائید خداوندی سے تم نے اپنی آنکھوں سے کر لیا۔ توریت میں ہے "اسرائیلیوں نے مصریوں کی لاشیں دریا کے کنارے پر دیکھیں" (خروج ۱۴: ۳۱) ۱۷۰ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کو مصری حکومت کے پنجہ سے نکال لائے۔ تو اب مشیت خداوندی یہ ہوئی کہ اس قوم کو ایک پورا نظام شریعت اور دستور زندگی عطا ہو چنانچہ حضرت موسیٰ جزیرہ نمائے سینا کے ایک پہاڑ کی چوٹی کوہِ طور پر نوشتۂ غیبی لینے کیلئے ایک چلّہ کیلئے طلب کئے گئے۔ موسیٰ۔ موسیٰ بن عمران سلسلۂ اسرائیل کے سب سے زیادہ مشہور و جلیل القدر پیمبر کا نام ہے۔ توریت میں ہے کہ کل ایک سو بیس سال کی پائی (استثناء ۳۴: ۷) آپ کا زمانہ مؤرخین اور اثریین کی تحقیق ہے کہ پندرھویں اور سولہویں صدی قبل مسیح کا تھا۔ سال ولادت غالباً ۱۵۲۰ ق م۔ سال وفات غالباً ۱۴۰۰ ق م۔ اربعین لیلۃ۔ چالیس رات مراد ہیں۔ توریت میں ہے۔ "اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن رات خداوند کے پاس رہا۔" (خروج ۲۴: ۱۸) اسلامی روایتوں میں آتا ہے کہ یہ زمانہ ذی قعدہ کے پورے مہینہ اور ذی الحجہ کے پہلے عشرہ کا تھا۔ قیل انها ذو القعدة بكماله وعشر من ذي الحجة (ابن کثیر) مرشد تھانوی مد ظلہ نے فرمایا کہ اہل سلوک کے یہاں جو چلّہ کی میعاد متعارف ہے۔ اس کی اصل یہی ہے۔ ۱۷۱ عجل۔ بطور اپنے معبود کے۔ من بعدہ۔ یعنی حضرت موسیٰ کی عارضی غیر حاضری کے زمانہ میں۔ اِدھر حضرت موسیٰ پہاڑ پر تشریف لے گئے ادھر آپ کی قوم نے گرد و پیش کی مشرک قوموں کی دیکھا دیکھی ایک گوسالہ کی مورت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ توریت میں خروج کا باب ۳۲ پورا اسی گوسالہ پرستی کی تفصیلات کی نذر ہے۔ ۱۷۲ (اپنے حق میں) قرآن مجید نے اس جرم کو فسق شدید بلکہ شرک کو اکثر ظلم ہی سے تعبیر کیا ہے اور واقعی اس سے بڑھ کر ظلم انسان کا اپنے حق میں اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ اسرائیلیوں میں یہ گمراہی آئی کہاں سے؟ اس سوال کے جوابات مختلف دیئے گئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ مصریوں کی گاؤ پرستی کا عکس تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مشرک کنعانیوں اور فلسطینیوں کے جوار ہونے کا اثر تھا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ گوسالہ مورت تھی چند دیوتاؤں کی۔ اور گوسالہ پرستی مرادف تھی آفتاب پرستی کی۔ بہرحال یہ شرک تھا اور اسی کو قرآن نے سیدھے شرک قرار دیا۔ خواہ وہ مورتی نعوذ باللہ خدائے واحد ہی کی کیوں نہ بنائی گئی ہو۔ مرشد تھانوی مد ظلہ نے فرمایا کہ حلول یا اتحاد کی جانب میلان ہو ورنہ اگر محض غلطی ہوتی تو اسرائیل اس میں معذور سمجھے جاتے۔ ۱۷۳ تمہارے توبہ و استغفار اور تم میں سے ایک خاص گروہ کی سزا یابی کے بعد۔ گوسالہ پرستی اور شرک جیسے انتہائی جرم کی سزا چاہیئے تو یہ تھا کہ ساری قوم کو ملتی، شرک کرنے والوں کو شرک کی، اور باقی تماشا دیکھنے والوں کو سکوت عن الحق اور اعانتِ جرم کی۔ لیکن واقعۃً سزا صرف ایک مخصوص گروہ کو ملی۔ جیسا کہ ابھی آتا ہے۔ اور باقی ساری قوم توبہ و استغفار کے بعد بچ گئی ۱۷۴ کہ شکر گزاری اور دستہ پذیری تمہارے جوہر شرافت اور معیار انسانیت ہے۔ اس موقع پر عملی شکر گزاری توحید و طاعت پر ثابت قدمی تھی ۱۷۵ اور جزئیات تک کیلئے زندگی کا ایک دستور العمل ہاتھ آ جائے۔ اجمالاً راہ ہدایت یعنی توحید کی تعلیم تو اسرائیلیوں کو پہلے سے ملی ہوئی تھی اور پیمبر ان کے درمیان موجود ہی تھے۔ اب کتاب اس لئے نازل فرمادی گئی کہ ایک مستقل و مرتب دستور العمل جزئیات زندگی کا ان کے ہاتھوں میں آ جائے اور آئندہ یہ راہ سے بھٹکنے نہ پائیں۔ الکتٰب۔ یعنی توریت۔ قرآن مجید میں مطلق الکتٰب کا لفظ علاوہ قرآن کے توریت کیلئے بھی آیا ہے۔ الفرقان۔ فرقان اپنے لغوی معنی میں ہر وہ چیز ہے جس سے حق و باطل کے درمیان فرق کیا جا سکے۔ کل ما فرق به بين الحق والباطل فهو فرقان (راغب)۔ الفرقان۔ قرآن کا بھی ایک نام ہے۔ اس مناسبت سے کہ قرآن حق و باطل، حرام و حلال کے درمیان فارق ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس کا اطلاق علاوہ قرآن کے توریت و انجیل پر بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ کتابیں بھی فارق ہیں، بلحاظ عقائد حق و باطل کے درمیان۔ بلحاظ اقوال صدق و کذب کے درمیان۔ اور بلحاظ اعمال نیک و بد کے درمیان (راغب) اس مقام پر الفرقان کی متعدد تفسیریں نقل ہوئی ہیں۔ ۱۔ الکتٰب و الفرقان کے درمیان عطف تفسیری ہے۔ اور مراد دونوں سے ایک ہی یعنی توریت ہی کی دو صفتیں ہیں۔ ایک صفت کتابیت۔ دوسری صفت فرقانیت۔ اول کے لحاظ سے وہ الکتٰب ہے۔ اور دوسری کے لحاظ سے الفرقان۔ يعني الجامع بين كونه كتابا منزلا وفرقانا يفرق بين الحق والباطل يعني التوراة (کشاف) الفرقان نعت والواو زائدة يعني الكتب الفرقان (معالم عن الکسائی) ۲۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد یہاں توریت اپنے احکام و شرائع کے لحاظ سے ہے۔ ابن عباس اور بہت سے تابعین کا یہی مذہب ہے۔ یہ قول قول اول سے معنی بالکل ملتا ہوا ہے۔ ۳۔ مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ کو عطا کئے گئے تھے۔ مثلاً معجزۂ عصا، معجزۂ ید بیضا وغیرہما۔ یہ مذہب مجاہد ابن کا ہے۔ انه معجزات الفارقة بين الحق والباطل (روح) ۴۔ مراد وہ فتح و غلبہ ہے جو بنی اسرائیل کو حکومت فرعونی کے مقابلہ میں عطا ہوا تھا۔ النصر والفرج الذي اتاه الله بني اسرائيل على قوم فرعون (کبیر) الفرقان الفرج من الكرب لانهم كانوا مستعبدين مع القبط (قرطبی) ۔ یہود کا عقیدہ ہے کہ لکھی ہوئی کتاب توریت کے علاوہ زبانی بھی بہت سے اسرار و مسائل کی تعلیم حضرت موسیٰ کو ہوئی تھی۔ اور وہ ان کے بعد سے سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل ان کی قوم میں منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ لفظ فرقان سے مراد اسی علم سفینہ کے علاوہ یہ علم سینہ ہے ۱۷۶ (بعد اس کے کہ بنی اسرائیل شرک اور گوسالہ پرستی کے مرتکب ہو چکے تھے) ۱۷۷ کہ توحید جیسی دولت بے بہا پا کر پھر شرک اور مخلوق پرستی کی سفلیت پر اتر آئے ۱۷۸ خطوط اس خاصیت ہے کہ انہوں نے ظلم کیا ہو تو آج تو بہ کی نوبت آئی۔ والفاء للتسبيب (بیضاوی) لان الظلم سبب للتوبة (روح)۔ توریت میں ہے۔ "اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لئے اپنے تئیں مخصوص کرو، ہر ایک مرد اپنے بیٹے اور بھائی پر حملہ کرے کہ وہ تمہیں برکت دیوے" (خروج ۳۲: ۲۹) ۱۷۹ اپنے ہاتھ سے اپنے مجرموں کو قتل کرو۔ فليقتل الذي لم يعبد العجل الذي عبده (ابن عباس)۔ شرک شریعت موسوی اور آئین اسرائیل میں علاوہ معصیت مذہبی کے فوجداری کا بھی ایک سنگین جرم تھا، مستوجب قتل۔ توریت کی قانونی آیتوں میں مشرک و مشرکہ کے لئے یہ تصریح ہے کہ "اس مرد یا اس عورت کو پتھراؤ کیجیو" (استثناء ۱۷: ۵) اور ظاہر ہے کہ شریعت کا لفظ صاحب شریعت کے سامنے عملی نمونہ آ کر ہو تو ...... گواہوں کے ہاتھ اس پر پہلے اٹھیں کہ اس کو قتل کریں اور ان کے بعد باقی سب لوگوں کے ساتھ۔ تم یوں ہی اپنے بیچ سے شرارت کو دفع کیجیو۔" (استثناء ۱۷: ۷) ...... یہاں تک پتھراؤ کیجیو کہ وہ مر جائیں۔ توریت میں ہے۔ "تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ایک دروازہ سے دوسرے دروازہ تک تمام لشکرگاہ میں گزرتا پھرے۔ اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تقریباً تین ہزار آدمی اسے پڑے۔" (خروج ۳۲: ۲۷-۲۸) فاقتلوا انفسكم۔ میں قتل سے مراد یہی ہلاک ہے جیسے سب جانتے ہیں۔ اور محققین کا گروہ اسی معروف اور کے ہوا۔ شرک کے مجرمین پکڑ پکڑ کر سامنے لائے گئے اور اپنے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ معنی میں قتل کا قائل ہے۔ والمتبادر من القتل المعروف من ازهاق الروح (روح) ظاهر هذا انه هو القتل على الحقيقة هنا (قرطبی)۔ اس کھلے ہوئے معنی کو چھوڑ کر، بلا وجہ و بلا ضرورت قتل کے مجازی معنی

مجاہدہ یا ریاضت یا نفس کشی کے کرنا کسی نقلی سند کے مطابق ہے نہ کسی عقلی دلیل کے ماتحت۔ یہ واقعہ قتل تاریخ اسرائیل کا ایک مشہور و مسلم واقعہ ہے۔ توریت کی سند ابھی گزر چکی، تاریخ کی سب کتابیں اس کو دہرا رہی ہیں۔ سارے دفتر نقل و روایت میں کوئی لفظ اس کے خلاف موجود نہیں۔ رہی عقل۔ سو ہذا اسلوم دنیا کے پردہ پر وہ کونسی پاگل گورنمنٹ ہے، جو اپنے قانون فوجداری کے شدید مجرموں، لٹیروں، ڈاکوؤں، نقب زنوں کو محض معافی طلب کرنے پر چھوڑ دیتی ہے! ——— آج کے روشن خیال تفسیر نویسوں کی تاویلات بھی عجیب عجیب ہوتی ہیں ١٨٠ اور اس خیر ست بستری کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ خیر سے نشاۃ یہاں نجات مغفرت اور گناہ کی گندگی سے پاک صاف ہونے سے ہے۔ یہاں ذکر تو ایک اسرائیلی ضابطہ شریعت کا ہے۔ لیکن خود اسلامی شریعت کا ضابطہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ رہزنی، سرقہ، زناکاری وغیرہ جن جن جرائم کے لئے حدود مقرر ہیں، وہ دنیا میں معاف نہیں ہو سکتے خواہ مجرم صدق دل سے تائب ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اجر آخرت کے بعد امید ضرور قائم ہو جاتی ہے کہ وہ اوم تائب حشر میں دُھلا دُھلایا، پاک صاف حاضر ہوگا ١٨١ تاب علیکم۔ یعنی تمہاری توبہ جب تم لوگ توبہ قبول کرلی۔ سزا صرف انہیں افراد کو ملی جو شریک جرم واقعۃً اور عملاً تھے۔ آبادی کا بڑا حصہ جو صرف اپنی خاموشی سے شریک جرم رہا اس کی خطا معاف ہوگئی ١٨٢ دنیا کی بہت سی گمراہ قوموں کا یہ عقیدہ رہا ہے اور اب بھی ہے (مثلاً بدھ مذہب والوں کا) کہ خدا کو معاف کر دینے کا کوئی اختیار ہی نہیں کیونکہ وہ خود قانون مکافات عمل کا پابند ہے۔ مسیحیت بھی اسی اساسی گمراہی میں مبتلا ہے۔ خدا جو کہ از خود کسی کو معاف نہیں کر سکتا، اور معاف کرنا چاہتا ہے، اس لئے اس نے اپنے بیٹے کو سب کی طرف سے بطور کفارہ سزا دے کر دوسروں کو معاف کر دیا۔ یہود نے بھی خدا کی قہاریت پر اتنا زور دیا کہ اس کی رحمت و رحمانیت کی تصویر بالکل ہی دھندلی کر دی۔ قرآن مجید نے توبہ و قبول توبہ اور رحمت الٰہی کی وسعت پر بار بار زور دے کر ان ساری گمراہیوں کی تردید کر دی ١٨٣ اگر جو مخاطبہ تم سے ہوا وہ مخاطبہ الٰہی ہی تھا، اور جو کلام تم نے سنا ہے وہ کلام الٰہی ہی ہے۔ قلتم "تم نے کہا تھا" یعنی تمہاری قوم کے ستر بڑے بڑے نمائندوں نے۔ والقائلون هم السبعون الذين اختارهم موسىٰ للميقات (بیضاوی) لن نؤمن لك. لے لاجل قولك (بیضاوی) تاریخ اسرائیل کے اہم ترین واقعات دہرائے جا رہے ہیں، اور اسرائیلیوں پر ان کی قومی تاریخ سے حجت قائم کی جا رہی ہے۔ اب ذکر اس وقت کا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر بزرگان قوم کو ہمراہ لیکر لشکر گاہ سے کوہ طور پر گئے ہیں۔ دامن کوہ میں انہیں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے ہیں اور مکالمہ و مخاطبہ الٰہی سے مشرف ہونے کے بعد اس کی اطلاع اور خوشخبری ان بزرگان قوم کو پہنچائی ہے ١٨٤ (یعنی انہیں مادی اور ظاہری آنکھوں سے۔ گویا اللہ تعالیٰ بھی کوئی مادی جسم رکھتا ہے اور گویا اہل کے حواس عام بشری حواس سے کچھ مختلف ہی نہیں ہوتے ١٨٥ (اس گستاخانہ مطالبہ کی پاداش میں) لفرط العناد والتعنت وطلب المستحيل (بیضاوی) اخذتكم "پکڑلیا تم کو" یعنی انہیں ستر بزرگان قوم کی جماعت کو۔ معتزلہ نے آیت سے استدلال کیا ہے کہ رؤیت باری جائز ہی نہیں ورنہ اگر جائز ہوتی تو اس سوال پر سرداران اسرائیل کو اتنی سخت سزا کیوں ملتی۔ لیکن اہل سنت کا مذہب ہے کہ رؤیت باری جنت میں تو مومنین کو ہو ہی کر رہے گی، باقی دنیا میں بھی مخصوص افراد کو بطور فضل خاص ممکن ہے۔ البتہ بے جہت، جسم، اور مادی کم و کیف سے پاک۔ وقد اختلف فی جواز رؤیة الله تعالیٰ فاکثر المبتدعة علی انکارها فی الدنيا والآخرة واهل السنة والسلف علی جوازها فیهما و وقوعها فی الآخرة (قرطبی) الممکن ان یری رؤیة منزهة عن الکیفیة وذلك للمومنین فی الآخرة ولافراد من الانبیاء فی بعض الاحوال فی الدنیا (بیضاوی) رہی ان کی یہ سزا تو اس کے اسباب بالکل دوسرے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ پیمبر کی بات کو جھٹلا رہے تھے، حالانکہ ظہور معجزات و دلائل کے بعد پیمبر پر ایمان لانا فرض ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ وہ سوال اپنے رفع جہل کے لئے نہیں، بلکہ بطور انکار ازراہ عناد کر رہے تھے۔ انما عوقبوا بکفرهم لانهم امتنعوا عن الایمان بموسیٰ بعد ظهور معجزاته والایمان بالانبیاء واجب بعد ظهور معجزاتهم ولانهم لم یسئلوا سوال استرشاد بل سوال تعنت وعناد (مدارک) ١٨٦ توریت میں ہے۔ "اور یوں ہوا کہ تیسرے دن صبح کو بادل گرجے اور بجلیاں چمکیں اور پہاڑ پر کالی گھٹا امڈی اور قرنائی کی آواز بہت بلند ہوئی، چنانچہ سب لوگ ڈیروں میں کانپ کانپ گئے" (خروج ١٩: ١٦) وانتم تنظرون۔ مفسر ابن حیان نے کہا ہے کہ ینظرون عربی میں ینتظرون کے معنی میں بھی آتا ہے اس لئے کوئی یہ مراد لے کہ تم سوال و عریضہ کے قبول ہونے کا انتظار کر رہے تھے، تو اس معنی کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے، گو کہ یہ کسی کا مفہوم منقول نہیں۔ ولکن هذا الوجه لیس بمنقول فلا اجسر علی القول به وان کان اللفظ یحتمله (بحر) ١٨٧ یا حیات حضرت موسیٰ کی سفارش پر ہوئی تھی اسرائیلی روایات اس باب میں خاموش ہیں بعثناکم "جلایا تم کو" یعنی انہیں ستر بزرگان قوم کو۔ بعثناکم من بعد موتکم۔ موت اور بعث دونوں کے کھلے ہوئے معنی مرنے اور جی اٹھانے کے ہیں۔ اور ایسا ہی مفسرین نے عموماً سمجھا ہے، بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ بعد موت کی قید لگائی ہی اس لئے گئی ہے کہ بعث کو کوئی غشی یا نیند کے بعد نہ سمجھے۔ ای احییناکم (قرطبی) ماتوا وذهبت ارواحهم ثم ردوا لاستیفاء آجالهم (قرطبی) وقید البعث لانه قد یکون عن اغماء او نوم (بیضاوی) والموت هنا ظاهره مفارقة الروح الجسد وهذا هو الحقیقة (بحر) بحر، روح وغیرہ میں ایک دوسرا قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ موت حقیقی نہ تھی، بلکہ بیہوشی کی قسم سے مجازی موت تھی ١٨٨ اور آئندہ توحید اور ایمان پر پوری طرح قائم رہو۔ بعض تفسیروں میں یہاں یہ قصہ نقل ہوا ہے کہ یہ ستر اشخاص بعد کو حضرت موسیٰ کی دعا سے نبی ہو گئے۔ لیکن یہ قصہ بے اصل ہے۔ هذا غریب جدّاً (ابن کثیر) وهو بعید (روح) ١٨٩ تمہیں آفتاب کی تپش سے بچانے کیلئے جب کہ تم صحرائے سینا میں بھٹک رہے تھے۔ جزیرہ نمائے سینا جیسے ریگستانی ملک اور چٹیل میدان کی دھوپ میں سایہ میسر آجانا واقعی سایہ رحمت سے کم نہیں۔ توریت میں ستون ابر اور ستون نار دونوں کا ذکر بطور معجزہ کے ہے۔ سیاق قرآنی سے معجزہ کا پہلو لازم نہیں آتا۔ ذکر عام نعمتوں کا ہو رہا ہے جو بنی اسرائیل پر ان کی تاریخ کے اہم ترین دور میں برابر نازل ہوتی رہیں۔ اور قرآن مجید نے عام مستقل اور بظاہر طبعی اسباب سے پیدا شدہ نعمتوں کو کہیں بھی معجزانہ و خارقانہ نعمتوں سے کم اہمیت نہیں دی ہے۔ توریت میں ہے۔ "اور خداوند دن کو بدلی کے ستون میں ہو کے تاکہ انہیں راہ بتائے اور رات کو آگ کے ستون میں ہو کے تاکہ انہیں روشنی بخشے ان کے آگے آگے چلا جاتا تھا کہ دن رات چلے جائیں اور بدلی کا ستون دن کو اور آگ کا ستون رات کو ان کے آگے سے ہرگز نہ اٹھایا جاتا تھا" (خروج ١٣: ٢١-٢٢) روایات یہود میں حسب بیان جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ہفتم۔ یہ تصریح بھی موجود ہے کہ بنی اسرائیل جب کثرت معاصی میں مبتلا ہو جاتے تھے تو یہ ابر ان پر سایہ کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ الغمام۔ قرآن مجید نے لفظ ابر ہی لایا ہے۔ یہود اسے تخت خداوندی سمجھتے تھے ١٩٠ اسی دشت سینا میں انزلنا۔ "اتارا" سے مراد لازمی طور پر نہیں ہوتی کہ وہ چیز کسی غیر طبعی معجزانہ طریق پر اتری ہو۔ پانی، لوہا، کھانے کے سامان وغیرہ جو اپنے معمولی اور طبعی طریقوں پر انسان کے کام کے لئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان سب کے لئے قرآن مجید کی زبان میں اتارنے ہی کا لفظ آیا ہے۔ منّ اہل لغت کی تحقیق میں ایک میٹھی میٹھی رطوبت تھی جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔ المن شیء کالطل فیه حلاوة یسقط علی الشجر (راغب) عربی میں اسم جنس ہے، خیر و شر کی طرح، جس کا واحد نہیں آتا۔ اسم جنس لا واحد له من لفظه مثل الخیر والشر قاله الاخفش (قرطبی) معنی اس کے متعدد بیان کئے گئے ہیں، میٹھا گوند، شہد، شربت وغیرہ۔ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ ترنجبین کے مرادف ہے۔ الترنجبین وعلی هذا اکثر المفسرین (قرطبی) الاکثرون علی ان المن هو الترنجبین (معالم) اور ترنجبین سے متعلق قدیم طب کی کتابوں میں یہ درج ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی اور لذیذ، آسمان سے گرنے والی شبنم کی قسم کی چیز ہے۔ الترنجبین طل یقع من السماء وهو ندی شبیه بالعسل جامد متحبب (مفردات ابن البیطار) بہرحال اتنا یقینی ہے کہ کوئی لذیذ قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو مسلسل مسافرت کے زمانہ میں بلا مشقت و تعب مل جاتی تھی۔ توریت کی تصریحات اس بارہ میں حسب ذیل ہیں۔ "صبح کو لشکر کے پاس اوس پڑی۔ اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے۔ اور بنی اسرائیل نے دیکھ کر آپس میں کہا کہ منّ ہے۔ کیونکہ انہوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے انہیں کہا کہ یہ روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تمہیں دی ہے" (خروج ١٦: ١٣-١٥) "اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام منّ رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید تھی، اور مزا اس کا شہد میں تلی ہوئی پھلوری کا تھا" (خروج ١٦: ٣١) "اور منّ سوکھے دھنیے کی مانند تھا۔ اور اس کا رنگ موتی کے دانہ کا سا تھا۔ لوگ ادھر ادھر جاکر اسے جمع کرتے تھے۔ اور چکی میں پیستے تھے۔ یا اوکھلی میں کوٹتے تھے۔ اور تنوروں پر پکاتے تھے اور ٹکیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تھی تو منّ بھی ان پر پڑتا تھا" (گنتی ١١: ٧-٩) سلویٰ۔ ایک قسم کا بٹیر ہے۔ بٹیر جزیرہ نمائے سینا کا خاص جانور ہے۔ بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے۔ جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آجاتا ہے۔ اڑتا بہت اونچی نہیں، بہت نیچے رہتا ہے۔ تھک بہت جلد جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ (جیوئش انسائیکلوپیڈیا، جلد ١٠، ص ٢٠٠) اس کا شمالی سفر مصر سے فلسطین کی جانب عموماً مارچ میں ہوتا ہے، اور جنوبی فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں۔ یہ اسرائیلی بٹیرے تھے جو مارچ اپریل میں اپنے وقت اپنی شمالی پرواز میں ہوتے ہیں۔ بحر قلزم شمال میں جہاں دو حصوں میں تقسیم ہوا ہے، وہاں تک یہ اپنے سالانہ اڑان میں آتے ہیں۔ اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ سمندری ہوا ان کی بے شمار تعداد بآسانی اسرائیلیوں کے ڈیروں تک لے آتی تھی (ڈکشنری آف دی بائبل، از ڈاکٹر ہیسٹنگز، جلد چہارم) ان کا گوشت چربی دار ہوتا ہے۔ رکھنے سے بہت جلد خراب ہو جاتا ہے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، کالم ٤٠٠٩) واضح رہے کہ رکوع میں اور اس کے بعد بھی ذکر بنی اسرائیل کے ساتھ حق تعالیٰ کے معاملات کا ہے۔ اور ان معاملات کو حق تعالیٰ نے بطور اپنے احسانات و انعامات کے گنایا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سارے واقعات اپنے عام طبعی اسباب سے ہٹ کر بصورت معجزات ہی پیش آئے ہوں۔ اصل مقصود یہاں احسانات والطاف خداوندی کی یاد دہی ہے، خواہ وہ حسب عادت ہوں، خواہ بطور خارق عادت۔ یعنی قانون تکوینی کی عام دفعات کے ماتحت، یا کسی خصوصی دفعہ کے مطابق۔ اہل تفسیر نے عموماً ابر کی سایہ افگنی، منّ و سلویٰ کے نزول، اور چٹان سے چشمہ کی روانی، سب کو معجزات میں شمار کیا ہے۔ لیکن کسی کی تحقیق میں اگر یہ سب امور تمام واقعات طبیعیہ میں داخل ہوں اور ان کی توجیہ عام اور معمولی قوانین تکوینی کے ماتحت ہو جائے، یا آج کل کی اصطلاح میں ان کے سائنٹفک اسباب دریافت ہو جائیں، تو اس کا اثر ارشادات قرآنی پر مطلق نہیں پڑے گا۔ ان کی احسانی اور انعامی حیثیت ہر صورت قائم رہتی ہے۔ اور اسی کی تذکیر قرآن کا مقصود ہے۔ توریت میں البتہ اس کے برعکس، سارا زور ان واقعات کی معجزانہ حیثیت پر ہے ١٩١ (اور ان چیزوں کا ذخیرہ نہ کرو۔ روز کی روز خرچ کرتے رہو۔ حکم اسرائیلیوں کو یہ ملا تھا کہ بلا ضرورت ان غذاؤں کا ذخیرہ نہ کرتے جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ "ذخیرہ اندوزی" Hoarding کی عادت یہودیوں کی آج کی نہیں، بہت قدیم ہے ١٩٢ (اس حکم کی خلاف ورزی کرکے) مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ باوجود معاصی کے نعمتوں کا جاری رہنا استدراج اور سخت خطرناک ہے۔ اور اس میں جاہل صوفیوں کو سخت دھوکا ہوا ہے، چنانچہ وہ کثرت جاہ و مال کو علامت مقبولیت کی سمجھتے ہیں، حرص میں مبتلا، توکل سے نا آشنا۔ اور نافرمانی کے عادی بنی اسرائیل سے تعمیل اتنے معمولی حکم کی بھی نہ ہونے پائی۔ لگے ان غذاؤں کا ذخیرہ فراہم کرنے، اور لطیف غذائیں باسی ہو ہو کر سڑنے لگیں۔ توریت میں ہے۔ "اور باوجودیکہ موسیٰ نے کہا کہ کوئی اس میں سے صبح تک باقی نہ چھوڑے۔ وہ اس کے سننے والے نہ ہوئے۔ اور بعضوں نے صبح تک کچھ رہنے دیا۔ سو اس میں کیڑے پڑ گئے اور سڑ گیا" (خروج ١٦: ٢٠) یہود جو مشرک قوموں کے اثر سے عقیدہ تجسیم کے قائل تھے، یعنی خدا تعالیٰ کو بھی بشری اوصاف سے متصف جانتے تھے، اور اس کے تاثر و انفعال کے معتقد تھے، انہیں یہ بار بار بتانے اور یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ خدا تعالیٰ کسی نفع ونقصان سے متاثر نہیں ہوا کرتا۔ یہ انسان ہی ہے جو احکام الٰہی کی نافرمانی کرکے نقصان اٹھاتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ١٩٣ (بنی اسرائیل سے ان کے پیمبر کی وساطت سے) یہ واقعہ اگر حضرت موسیٰ کے زمانہ کا ہے تو وہی مراد ہیں اور اگر ان کے بعد کا ہے تو ان کے جانشین حضرت یوشع۔ قرآن مجید، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، توریت کے بعض حصوں کی طرح تاریخ کی کوئی کتاب نہیں۔ اس لئے اس کے بیانات میں تسلسل زمانی اور ترتیب تاریخی ہرگز ضروری نہیں۔ اس کا مقصود صرف نتائج و عبر ہیں، اخلاقی و روحانی سبق، نہ کہ واقعات کی روداد۔ اس ایک حقیقت کو پیش نظر نہ رکھنے سے یہود و نصاریٰ آج قرآن فہمی میں طرح طرح کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ یہ واقعہ جس کا ذکر اب شروع ہو رہا ہے، تاریخ اسرائیل ہی کا ایک مسلم واقعہ ہے۔ زمانہ تاریخی اس کا جو کچھ بھی ہو۔

۱۹۴ یعنی کون سی بستی؟ ممکن ہے کہ فلسطین کا مشہور شہر اریحا ہو۔ جو موجودہ نقشوں میں Jericho کے نام سے ملے گا۔ بحر مُردہ کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسے اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع کے زمانہ میں فتح کیا تھا۔ قدیم اُمّ تفسیر کا رُخ بیت المقدس کے بعد پھر اسی شہر کی جانب ہے۔ قرية اریحا (ابن عباسؓ) ھی اریحا قرية من بیت المقدس (ابن جریر عن ابن زید) اس کے علاوہ بھی متعدد شہروں اور مقامات کے نام لئے گئے ہیں۔ بعض شہروں کے نام تک اب بدل گئے ہیں۔ مثلاً ایلہ کہ اب اُسے عقبہ کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مراد شہر شطیم ہو۔ یہ علاقہ موآب میں واقع ہے۔ جو بحر مُردہ کے مشرق میں ہے۔ شہر دریائے یردن کے مشرق (بائیں) کنارہ پر ہے۔ بحر مُردہ کے شمال مشرق میں۔ بنی اسرائیل کی دشت پیمائی کے زمانہ میں شہر گویا اُن کا سرحدی ناکہ تھا۔ عربی میں اُسے وادی السنط بھی کہتے ہیں اور وادی بستی مریم بھی۔ بعض مفسرین نے جو ردون کا نام لیا ہے۔ اُس سے بھی یہی مراد معلوم ہوتا ہے ۱۹۵ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر خوب وسیع اور خوب آباد و پُر رونق تھا۔ ۱۹۶ یہ بطور اظہار عجز و نیاز و عبودیت کے گویا یہی شان مومنین مخلصین کی ہے۔ الباب۔ دروازہ سے مراد شہر کا پھاٹک ہے۔ قدیم شہروں کے گرد گرد ایک بلند چہار دیواری شہر پناہ کے نام سے مشہور ہوتی تھی شہر میں داخل ہوتے وقت اسی شہر پناہ کے پھاٹک سے گزرنا ہوتا تھا۔ سُجّدًا یہاں اپنے لغوی معنی میں ہے یعنی عاجزی سے فروتنی کے ساتھ۔ سجدۂ نماز کی ہیئت مخصوص مراد نہیں۔ سجدًا ای منحنین متواضعین (راغب) خاشعة خاضعة (ابن جریر عن ابن عباسؓ) اراد به الخضوع وھو الاقرب (کبیر) قیل متواضعین خضوعًا لا علی ھیئة متعینة (قرطبی) توریت اس اہم جزو کے تذکرہ سے خالی ہے۔ ۱۹۷ گویا زبان بھی قلب و اعضا کی طرح اظہار تذلل کرتی رہے۔ یہ فرق ہے اللہ والوں کے لشکر اور دنیادار بادشاہوں کے لشکروں کے۔ حملہ میں ایک کا قومی بینڈ اور ترانے بجتے ہوتے ہیں، وطنی نعرے لگتے ہوتے ہیں یعنی قدم قدم پر قومی شیخی اور وطنی برائی کا اظہار، دوسرے کے ہاں قلب خشوع سے لبریز اور زبان پر تسبیح قُولُوا حِطَّةٌ سے مراد نہیں کہ بعینہٖ لفظ حطّة کا تلفظ ادا کرتے جاؤ۔ یہ لفظ تو عربی ہے، اور اسرائیلیوں کی زبان عربی نہیں، عبری یا عبرانی تھی، مراد یہ ہے کہ انہیں زبان سے یہی کلمات توبہ و استغفار ادا کرتے رہنے کا حکم ملا تھا۔

ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ

دروازہ (شہر) میں عاجزی سے جھکے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا توبہ ہے ۱۹۷ ہم تمہاری خطائیں

لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۵۸ فَبَدَّلَ

بخش دیں گے اور ہم نیک کاروں کو زیادہ ہی دیتے ہیں ۱۹۸ مگر ان

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ

زیادتی کرنے والوں نے جو انہیں بتایا گیا تھا اس کے خلاف ایک اور کلمہ بدل ڈالا ۱۹۹

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ

سو ہم نے اُن زیادتی کرنے والوں پر ایک بلا آسمان سے نازل کی ۲۰۰

بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۵۹ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى

اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے رہے تھے ۲۰۱ اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے

ع ۱۳ ۶

لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ

پانی کی دعا مانگی ۲۰۲ سو ہم نے کہا (اے موسیٰ) اپنا عصا (فلاں) پتھر پر مارو ۲۰۳ تو اس میں سے

مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ

بارہ چشمے پھوٹ نکلے ۲۰۴ (اور) ہر گروہ نے اپنا (اپنا)

اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ

گھاٹ معلوم کر لیا ۲۰۵ کھاؤ پیو اللہ کے (دیئے ہوئے)

اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۶۰

رزق میں سے، اور زمین پر فسادی بن کر مت پھرو ۲۰۶

منزل ۱

وقد روی عن ابن عباسؓ انہم اُمروا بھذہ اللفظة بعینھا وھذا محتمل ولکن اقرب خلافه بوجھین احدھما ان ھذہ اللفظة عربیة وھم ما کانوا یتکلمون بالعربیة وثانیھما وھو الاقرب انھم اُمروا بان یقولوا قولا دالا علی التوبة والندم والخضوع (کبیر) ولا تتوقف التوبة علی ذکر لفظة بعینھا (روح) اور ایسا ہی صاحب کبیر نے بھی کہا ہے۔ تفسیر قرطبی اور ابن العربی مالکی کی احکام القرآن میں یہاں طویل بحث اس کی موجود ہے کہ آیا شریعت کے الفاظ میں تبدیلی جائز ہے؟ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ جہاں الفاظ ہی تعبد کے ہوں یعنی حکم انہیں الفاظ ہی کا ہو، وہاں تبدیلی جائز نہیں لیکن جہاں اصل مقصود معانی ہوں وہاں لفظی تبدیلی جائز ہے بشرطیکہ معنوی تحریف نہ پہنچ جائے ۱۹۸ یعنی ان لوگوں کو جو نیکی میں اخلاص کامل سے لگے ہوئے ہیں۔ عفو و مغفرت کا وعدہ تو سب ہی توبہ کرنے والوں سے ہو چکا۔ اس کے بعد یہ ذکر مزید فضل و کرم کا ہے۔ ۱۹۹ یعنی جو الفاظ انہیں تلقین کئے گئے تھے، انہیں چھوڑ چھاڑ کر اور کلمے ہزل اور تمسخر کے زبان پر لانے لگے یہ کلمے کیا تھے، اس میں روایتیں مختلف ہیں مگر حاصل سب کا ایک ہی ہے کہ بجائے توبہ و انابت کے اب وہ تمسخر و استہزا اسے لے رہے تھے و معنی الاٰیة انھم وضعوا مکان ما اُمروا به من التوبة والاستغفار قولا مغایرا له مُشعرا باستھزائھم بما اُمروا به کل ذلک عدم مبالاة باوامر اللّٰه (بحر) ۲۰۰ رجزًا۔ رجز عام ہے ہر عذاب کے لئے خواہ وہ کسی صورت میں ہو الرجز ھو العذاب (لسان) لفظ کی تنوین عذاب کی شدت و ہیبت کے اظہار کے لئے ہے والتنوین للتھویل والتفخیم (ابو سعود) من السماء سے مراد یہ نہیں کہ وہ عذاب۔ برف۔ بارش وغیرہ کی طرح آسمان سے نازل ہوتا ہوا دکھائی دیا، بلکہ یہ فقرہ اس حقیقت کے نمایاں کرنے کیلئے ہے کہ وہ عذاب آسمانی حاکم کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ ارضی اسباب سے خود بخود پیدا نہیں ہو گیا تھا۔ ای مقدرٌ من السماء (بیضاوی) الذین ظلموا کی تکرار آیت میں ان ظالموں کے ظلم نمایاں کرنے کیلئے ہے فی تکریر الذین ظلموا زیادة فی تقبیح امرھم وایذان بان انزال الرجز علیھم لظلمھم (کبیر) ولھم بصورة تعظیم الامر (قرطبی) یہ عذاب تھا کس صورت میں؟ ہمارے ہاں روایتیں طاعون کی نقل ہوئی ہیں بعث اللّٰه علیھم الطاعون (کبیر عن ابن زید) الطاعون (کبیر عن وھب) والمراد به الطاعون (بیضاوی) تاریخ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ طاعون اس قوم پر بار بار آیا اور بائبل میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر ہے۔ آیت قبل میں اگر قریہ سے مراد شہر شطیم ہی لیا جائے جو موآب کے علاقہ میں ہے تو اس کے طاعون کا تو مفصل ذکر بائبل میں موجود ہے۔ "سو اسرائیل شطیم میں مقیم ہوئے اور اُن لوگوں نے موآبیوں کی بیٹیوں سے حرامکاری شروع کی۔ انہوں نے اپنے معبودوں کی قربانیوں پر لوگوں کو دعوت کی۔ لوگوں نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا۔ اور اسرائیل بعل فغور سے ملے تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا (گنتی ۲۵: ۱-۳) "وہ جو اس وبا میں مرے چوبیس ہزار تھے" (گنتی ۲۵: ۹) ۲۰۱ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔ اے بسبب فسقھم المستمر (ابو سعود) كانوا يفسقون کا صیغہ دوام، عادت و تکرار پر دلالت کر رہا ہے یہاں یہ صاف کر دیا کہ طاعون کا اصل سبب طبی یا طبعی نہ تھا، روحانی یا اخلاقی بد پرہیزیاں یا نافرمانیاں تھیں قوانین تکوینی کی خلاف ورزی نہیں، اصل باعث شریعت موسوی کی خلاف ورزی تھی۔ شریعت کی خوردبین نگاہ امراض اور معاصی کے اُن خفی و مخفی تعلقات تک بہ آسانی پہنچ جاتی ہے جو دنیا کے بڑے بڑے حاذق طبیبوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔ عارف رومیؒ نے سچ کہا ہے ؎

ابر ناید از پئے منع زکات   وز زنا خیزد وبا اندر جہات

فقہا نے آیت سے اہل بدعت کا ظالم اور سزاوار غضب ہونا نکالا ہے۔ بدعت کہتے ہیں دین میں ایسے نئے امر کے پیدا کرنے کو جس کا نشان اصل شریعت میں نہ موجود ہو۔ اور قرطبی نے کہا ہے کہ جب لفظی تبدیلی یہ نوبت پہنچا دیتی ہے تو عملی تحریف کی شناعت کا کیا ٹھکانا! والقول انقص من العمل فکیف بالتبدیل والتغییر فی الفعل (قرطبی) ۲۰۲ اب قوم اسرائیل فلسطین سے دور اور مصر سے الگ، دونوں کے درمیان معلق جزیرہ نمائے سینا کے لق و دق بیابان و ریگستان میں اپنے خیمہ و خرگاہ کے ساتھ کوچ در کوچ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک منزل سے دوسری منزل کو منتقل ہو رہی ہے۔ قدیم گلہ بان قوموں میں یہ دستور عام تھا اور آج بھی بہت سی خانہ بدوش قوموں میں عام ہے۔ خشک ملک اور پھر مقامی جغرافیہ سے ناواقفیت، چلتے چلتے یہ لوگ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی نایاب تھا اور ساتھ کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ صورت حال کا ذرا تصور کیجئے، پیاس سے بے حال اور بیدم تو ہو ہی رہے تھے مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے اور لگے اپنی جھنجھلاہٹ اور غصہ اپنے رہبر اور سردار حضرت موسیٰؑ پر اتارنے۔ توریت میں ہے:۔ "تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا۔ اور رفیدیم میں ڈیرا کیا، وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے۔ اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پیویں.... موسیٰ نے خداوند سے فریاد کرکے کہا کہ میں ان لوگوں سے کیا کروں۔ وہ سب تو مجھے ابھی سنگسار کرنے کو تیار ہیں" (خروج ۱۷: ۱-۴) اور قدیم ترین یہودی مورخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود میں ہے:۔ "وہ مقام رفیدیم میں پہنچے جہاں پیاس کی شدت سے بیتاب ہو رہے تھے.... یہاں کی سرزمین میں پانی کا ایک قطرہ نہ پایا۔ اس پر یہ لوگ غصہ میں بھر کر پھر موسیٰ پر ٹوٹ پڑے.... لیکن وہ خدا کے آگے دعا میں زاری کے ساتھ مشغول ہو گیا" (باب ۳ فصل ۲) پیغمبر بھی غیب دان ہمیشہ نہیں ہوتے جب تلاش کے بعد مایوسی ہو چکی تھی تو بجز دعا اور مناجات کے اور کیا کرتے؟ البتہ خود توریت ہی میں ایک دوسری جگہ مقام کا نام بجائے رفیدیم کے قادس (اقدیش) درج ہے اور تفصیلات تقریباً یہی:۔ "بعد اس کے بنی اسرائیل کی ساری جماعت پہلے دشت صین کو آئی اور قادس میں بسنے لگی.... وہاں جماعت کے لئے پانی نہ تھا سو وہ جمع ہو کے موسیٰ و ہارون کے برخلاف ہوئے اور اُن لوگوں نے موسیٰ سے جھگڑا کیا اور کہا.... یہاں تو پینے کو پانی ہی نہیں تب موسیٰ و ہارون جماعت کے سامنے سے جماعت کے خیمہ کے دروازہ پر گئے اور وہ منہ کے بل گرے (گنتی ۲۰: ۱-۶) اس بنا پر علمائے اہل کتاب میں باہم سخت اختلاف پڑ گیا ہے کہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا وہ مقام کون سا تھا لیکن بہر حال وہ مقام کوئی سا بھی ہو اور ایک ہو یا دو ہوں نفس اس واقعہ کا وقوع کوئی اختلافی و نزاعی مسئلہ نہیں، اور یہ تاریخ بنی اسرائیل کے مسلمات میں سے ہے استسقیٰ لغوی معنی ہیں کہ پانی طلب کیا، پانی کی تلاش کی۔ اور مراد یہ ہے کہ پانی کیلئے دعا کی اے دعا لھم موسیٰ بالسقیا (کشاف) مشہور ماہر اثریات سر فلنڈرز پیٹری (Petrie) ۳۰ آدمیوں کے قافلہ کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں اسی جزیرہ نمائے سینا کی تحقیقی مہم پر روانہ ہوئے اُن کے مشاہدات کا خلاصہ ایک دوسرے ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن کی زبان سے سنیئے:۔ "یہ وسیع بیابانی علاقہ سیاہ اور سرخ رنگ کی پہاڑیوں سے لبریز ہے جس میں کہیں کہیں سبزہ زار بھی ہیں اور گہری گہری وادیاں اور غار جابجا نخلستانوں کے بیچ فاصلے

جو نقشہ پر قریب قریب معلوم ہوتے ہیں ، ان ناہمواریوں کے باعث عملاً بڑے لمبے لمبے ہیں۔ پینے والے پانی کے کافی ذخیرہ کی فراہمی کی مشکلات جو اسرائیلیوں کو اپنی صحرانوردی کے زمانہ میں پیش آئی تھیں آج بھی ان کا تجربہ ہوتا ہے **۲۰۳** انکا کسی چٹان میں پانی کا چشمہ نکل آنا
ہو جانے ، پہاڑی چشمہ پہاڑوں کے اندر سے پانی کے اُبلتے ہوئے دھارے ہر ایک کے مشاہدہ میں آچکے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے جب پانی کیلئے بارگاہ الٰہی میں عرض کی تو انہیں ہدایت ہوئی کہ فلاں پہاڑی تک چلے جاؤ ، وہاں چٹان پر اپنا عصا مارو ، پانی نکلنے لگے گا۔ توریت کے بیان سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی چشمہ ابلا حورب یا حرب میں واقع تھی۔ "خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تُو نے دریا پر مارا تھا اپنے ہاتھ میں لے اور جا۔ دیکھ کہ میں وہاں تیرے چٹان
پر تیرے آگے کھڑا ہونگا۔ تو اس چٹان کو مار یو اس سے پانی نکلیگا تاکہ لوگ پیویں۔ چنانچہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کے بزرگوں کے سامنے یہی کیا۔" (خروج ۱۷ : ۵ ، ۶) عصا معروف و متعارف معنی لاٹھی یا ڈنڈے کے ہیں۔ موسیٰ کے اس عصا کا ذکر قرآن مجید میں کثرت
سے آیا ہے۔ اس کے کھلے ہوئے معنی چھوڑ کر ایک مجازی معنی جو صرف عصا المسلمین وغیرہ کی ترکیب میں جائز ہے ، جماعت یا گروہ کے کرنا لغت پر ظلم کرنا ہے۔ **الحجر** سے مراد کوئی خاص چٹان ہے جو حضرت موسیٰ کے علم میں تھی۔ الاشارة الی حجر
معلوم (کبیر) اللام فیہ للعهد (بیضاوی) یعنی حجراً معیناً بدلیل انه عرفه بالالف واللام (معالم) فاضرب۔ ضرب۔ کے عام و معروف معنی مارنے کے ہیں ، چلنے کے معنی اسی صورت میں ہوتے ہیں جب فعل ضرب کا صلہ فی کے ساتھ آئے جیسے
ضرب فی الارض۔ "روشن خیالی" کے مرض میں مبتلا معاصرین نے جو آیت کا ترجمہ "اے موسیٰ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ" کیا ہے ، یہ جس طرح لغت و قواعد زبان کے خلاف ہے ، اسی طرح تاریخ کے بھی بالکل مخالف ، اور اپنی تائید میں کوئی دلیل کسی قسم کی نہیں
رکھتا ، نہ عقلی نہ نقلی۔ **۲۰۴** یعنی اس پہاڑی چشمہ سے بارہ دھارے یا بارہ ٹوٹیاں الگ الگ جاری ہو گئیں ، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تعداد کے عین مطابق۔ بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو بائبل میں موجود نہیں ، قرآن نے کہاں سے گڑھ

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ
اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ایک کھانے پر بس نہیں
وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا
کر سکتے ۲۰۷ سو اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کر دیجئے اُن چیزوں کی جنہیں
تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَ
زمین اُگاتی ہے ۲۰۸ ساگ ہُوا ، ککڑی ہوئی ،
فُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ
گیہوں ہُوا ، مسور ہوئی ، پیاز ہُوا ۔ (موسیٰ نے) کہا تو کیا جو چیز ادنیٰ ہے تم
الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا
اُسے لینا چاہتے ہو اُس چیز کے مقابلہ میں جو بہتر ہے (تو خیر) کسی شہر میں
مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ
اُتر پڑو (وہیں) مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو ۲۰۹ اور اُن پر
عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ
جما دی گئی ذلّت اور محتاجی ۲۱۰ اور وہ اللہ کے غضب کے
مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ
مستحق ہو گئے ۲۱۱ یہ (سب) اس لئے ہُوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں سے
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ
انکار کرتے رہتے تھے ۲۱۲ اور انبیاء کو ناحق قتل (تک) کر ڈالتے تھے ۲۱۳

کہدیا ؟ قدرت نے سوال کا جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلوا دیا۔ جارج سیل ، انگریزی میں قرآن کریم کا قدیم ترین مترجم ہے۔ آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے :۔ "ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے تصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلتا تھا۔" اور ایک دُوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے :۔ "چٹان میں اسوقت ۲۴ سوراخ موجود ہیں ، جو بآسانی شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ۱۲ ایک طرف ہیں اور ۱۲ انکے مقابل جانب " پادری ڈین اسٹینلی (Dean Stanley) نے جو انیسویں صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوئے ہیں ، صدی کے وسط میں بائبل کے مقاماتِ مقدسہ کی جغرافی تحقیق کیلئے بہ نفسِ نفیس فلسطین اور اسکے ملحقات کا سفر کیا ، اور اپنے مشاہدات تحقیقات پر ایک مستقل تصنیف Sinai and Palestine کے نام سے شائع کی ، اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :۔ "یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے ، آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور راس سفسفہ کے قریب ایک وسیع وادی میں واقع ہے۔ شگاف دروزنما پڑے ہوئے ہیں ، کچھ مٹے ہوئے ہیں کچھ بڑے ہیں ، کچھ چھوٹے ، گنتی میں اگر سب لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں ، اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس۔ سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ انہیں شگافوں کی طرف ہے۔" (ص ۴۷-۳۰) عرب کے اُمی کی لائی ہوئی کتاب کے اعجاز کے قربان جائیے ، صدیاں گزر جانے پر اُسکے بیان کی جزئیات تک کی تصدیق ہو رہی ہے منکرین و معاندین کی زبان سے **۲۰۵** اُناس۔ یعنی اسرائیل کے بارہ گروہوں میں سے ہر گروہ نے۔ اے من کل سبط (بیضاوی) اے من قومه الذین استقی لهم (بحر) صیغہ جمع ہے لفظاً اس کا کوئی واحد نظر نہیں آتا۔ جمع لا واحد له من لفظه (روح) مشربهم۔ یعنی اپنے اپنے لئے پانی لینے کی جگہ۔ اے عینهم التی یشربون منها (کشاف) **۲۰۶** جب قوم کی قوم قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے ہوائے نفس کے مطابق کوئی روش اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نتیجہ دنیا میں لازمی طور پر فتنہ و فساد ، حرب و ضرب اور کثرت جرائم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور امن انفرادی و اجتماعی دونوں طرح پر اٹھ کر رہتا ہے۔ فضل و انعام سے سیراب کر کے بنی اسرائیل کو ہدایت یہ ہوئی کہ جو فارغ البالی نصیب ہے اس کو غنیمت سمجھو ، قانونِ الٰہی کی پابندی کرو ، اس قانون کو توڑ کر امن نظم عالم میں اختلال کے باعث نہ بنو۔ رزق اللہ میں رزق کی نسبت اپنی جانب کر کے گویا ایک بار پھر انہیں جتا دیا کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ سب خدا ہی کے فضل و عطا سے ہے ، تمہارے زور بازو کا نتیجہ نہیں۔ ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔ عثی کے معنی خود ہی فساد میں حد سے گزر جانے کے ہیں۔ العیث شدة الفساد (قرطبی) العثی اشد الفساد (معالم) مفسدین۔ جو ترکیب میں حال واقع ہوا ہے ، ہر پہلو سے فساد کی تاکید کیلئے ہے۔ تکرر المعنی تاکیدا لاختلاف اللفظ (قرطبی) عیث و عثی کے معنی ایک ہی ہیں عثی لغت قرآنی ہے (قرطبی) ایک باریک فرق دونوں میں یہ ہے کہ عیث کا تعلق فسادِ حسی سے ہے اور عثی کا فسادِ معنوی سے (راغب) **۲۰۷** (اور لے کھاتے کھاتے اُکتا گئے ہیں) ذکر بھی اسی دشتِ سینا کے زمانۂ خانہ بدوشی کے کسی اور موقع کا ہے ، قرآن مجید بیان واقعات میں ان کی تاریخی ترتیب کے تسلسل کا ہرگز پابند نہیں۔ بنی اسرائیل عرصۂ دراز تک ایک ہی قسم کی غذا کھاتے کھاتے اکتا گئے تھے اور اب اپنے پیمبر سے فرمائش کر رہے تھے کہ اس بیابان سے نکال کر کہیں دُوسری جگہ لے چلئے ، جہاں قسم قسم کے شہری اور دیہاتی کھانے موجود ہوں۔ طعام واحد۔ یعنی ایک ہی قسم کا کھانا۔ بٹیر اور ترنجبین جو انہیں ہر روز ملے چلا جاتا ہے **۲۰۸** (اور جن کے خوگر ہم مصر میں رہ چکے ہیں) مصریوں کی مرغوب غذا اکثر زراعت پیشہ قوموں کی طرح یہی زمینی پیداوار تھی۔ "مصر میں آج کی طرح اسوقت بھی بڑی مانگ سبزی ، پیاز ، ہلدی وغیرہ کی تھی۔" (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا ، کالم ۲۰۹-۱۲۰) اور یہی چیزیں اسرائیلیوں کی بھی اصل غذا بن چکی تھیں :۔ "اسرائیلیوں کی اصل غذا سبزی تھی خصوصاً غلہ کی اقسام۔" (جیوش انسائیکلوپیڈیا ، جلد ۵ صفحہ ۴۳) "قدیم اسرائیلی سبزترکاریوں اور پھلوں پر بسر کرتے تھے۔" (جلد ۵ صفحہ ۵۹) **۲۰۹** توریت کی روایت اس سے ملتی جلتی مگر کسی قدر مختلف حسب ذیل ہے :۔ "اور بنی اسرائیل بھی پھر سے اور رونے لگے اور بولے۔ کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا۔ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے۔ اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن۔ پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی ، یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ من۔" (گنتی ۱۱ : ۴-۶) فوم کے معنی گیہوں کے علاوہ لہسن کے بھی آتے ہیں۔ **۲۱۰** (کہ بڑے شہروں میں سبزیاں اور پھل علاوہ فصل اور موسم کے ، بے فصل اور خلاف موسم بھی مل جایا کرتے ہیں) مصراً۔ کوئی شہر۔ یہاں مراد جزیرہ نمائے سینا یا اس کے مضافات کا کوئی آباد شہر ہے۔ مصر کے لفظی معنی شہر کے ہیں جس کی حد بندی ہو چکی ہو۔ اسم لکل بلد محصور ای محدود۔ اور یہاں تو تنوین کے ساتھ کھلا ہوا اسم نکرہ ہے لیکن بڑے بڑے فاضل انگریز مترجمین نے بے کھٹکے اس کا ترجمہ ملک مصر کر ڈالا ہے! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو انہیں سمجھایا کہ تمہاری فرمائش بیجا ہے ، نامعقول ہے جب دیکھا کہ اصرار جاری ہے تو پھر یہ کہا کہ اچھا ، اگر یہ منظور ہے تو شہری تمدن اختیار کر لو۔ ساری گفتگو سمجھنے کیلئے قوم اسرائیل کے اس وقت کے طرز معاشرت کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ صورت حال یہ ہے کہ مصر جیسے متمدن و مہذب ملک سے لاکھوں کی تعداد میں نکل تو آئے ہیں لیکن ابھی دُوسرے مہذب و متمدن ملک اور اپنے قدیم وطن یعنی فلسطین یا کنعان تک نہیں پہنچ پائے ہیں بلکہ دونوں کے درمیان اور فلسطین کے جنوب میں جزیرہ نمائے سینا کے بیابان میں معلق ہیں۔ یہ علاقہ اس وقت تک غیر متمدن ، یعنی مکان ، باغ ، عمارتیں ، کھیت وغیرہ جو لوازم تمدن ہیں ، اس لق و دق بیابان میں کہیں موجود نہیں۔ اسرائیلی اسوقت مکانوں میں سکونت پذیر نہیں ، بلکہ اپنے خیموں ڈیروں کے ساتھ کہ آج یہاں سے کوچ ، کل وہاں مقام ، خانہ بدوش قبیلوں کی طرح ایک مستقل سفر اور مستقل حرکت اس بیابان میں کر رہے ہیں۔ البتہ بیابان کے خاتمہ کے بعد ملک سرسبز ، ویران اور بے آب گیاہ نہیں ، غیر بیابانی علاقے اچھے خاصے آباد تھے اور شہری اور حضری تمدن کے نمونے جابجا موجود تھے۔ یہ علاقہ مصر کے زیر حکومت تھا گو بالکل مصر کا جزو نہ تھا۔ مصراً میں اشارہ بھی قسم کے کسی شہر کی طرف ہے۔ **۲۱۱** ضُرِبَت کے معنی ہیں لیس دی گئی ، چپکا دی گئی ، مسلط کر دی گئی۔ ذلّة کے معنی ہیں خواری و رسوائی ، و مسکنة سے مراد فقر و محتاجی۔ الذلة الذل والصغار (قرطبی) المسكنة الفقر والفاقة وتشديد المحنة (کبیر) علیهم میں ضمیر هم کے مرجع کو خوب سمجھ لینا چاہئے۔ یہ ہیں کون لوگ جنکے اوپر ذلت و ننگ حالی مسلط کر دی گئی ، ضمیر کا مرجع الیهود یا الذین هادوا نہیں بلکہ بنی اسرائیل ہے یعنی اس وعید کے مورد فلاں فلاں عقیدے رکھنے والے یا فلاں مسلک کے ماننے والے نہیں بلکہ اسرائیل نامی ایک متعین قوم نسل ہو بحیثیت نسل!

عالم گیر نہ اسا لفظ جامع بلاغت ہے۔ اس نے اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیا کہ جو ذلت، نکبت، افلاس، مقہوریت تقریباً ۴۰۰۰ سال گزر جانے پر بھی آج تک چلی آ رہی ہے اس کی مورد و حامل ایک مخصوص قوم ہے، نہ کہ کسی مخصوص مذہب و ملت کے پیرو۔ —— خود لفظ Anti-Semitism بتا رہا ہے کہ یہود سے جو مستقل عداوت نازی جرمنی کو خصوصاً اور اٹلی، ہنگری، رومانیہ وغیرہ یورپ اور امریکہ کی کثیر ولایتوں کو عموماً ہے، اس کی بنا نسلی یا قومی ہے، نہ کہ دینی یا اعتقادی۔ لیکن سیاسی محکومی اور ذلت تک تو خیر، مالی مفلسی، محتاجی، تنگدستی کے انتساب پر عجب نہیں کہ ناظرین کو حیرت ہو اور سوال ان میں پیدا ہو کہ تمول تو یہود کا ضرب المثل ہے، پھر اس قوم کو محتاج و تنگدست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ محض دھوکا اور عام طور سے پھیلا ہوا مغالطہ ہے۔ دولت و ثروت جتنی بھی ہے وہ قوم یہود کے صرف کابر و مشاہیر تک محدود ہے ورنہ عوام یہود کا شمار دنیا کی مفلس ترین قوموں میں ہے۔ یہ بیان خود محققین یہود کا ہے، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے :- "گو یہود کا تمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا ہے لیکن اہل تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں، وہاں کی آبادی میں انہیں کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے" (جلد ۱۰، ص۱۵) "عوام یہود دوسری قوموں سے کہیں زیادہ غریب ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کے چند افراد بہت زائد دولتمند ہیں" (جلد ۱۰، ص۹۱) ۲۱۲ (اسی دنیا میں اپنی ہی جیسی مخلوق کے ہاتھوں) باؤ و کے معنی لوٹ کر چلے گئے بھی کئے گئے ہیں، لیکن اکثر محققین اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد استحقاق ہے۔ لے استوجبوا اللعنة (ابن عباسؓ) لے استحقوا (کبیر) لے استحقوا غضبا (بحر) نسل اسرائیلی پر اس تحقق غضب کا ظہور برابر انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس آخر زمانہ میں ہٹلر جیسے چنگیزی فرمانروا کی یہود دشمنی و یہود بیزاری اخبار بین و تاریخ خواں طبقہ سے پوشیدہ نہیں۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ عارف کیلئے اس قصہ میں بڑا سبق ہے۔ ان لوگوں کے حال سے عبرت پکڑنا چاہئے جنہوں نے نہ بلا پر صبر کیا نہ نعمت پر شکر ادا کیا، اور نہ قضاء الٰہی پر راضی رہے۔ ایسوں پر ذلت طغیان لگا دی گئی، حب دنیا ان کے قلب میں جما دی گئی، اور انہیں درجات عالیہ سے گرا دیا گیا۔ ۲۱۳ لفظ یہاں کفروا نہیں کانوا یکفرون استعمال ہوا ہے۔ ذکر کسی خلص موقع کا نہیں کہ اس وقت وہ منکر ہو بیٹھے تھے بلکہ ذکر ان کی مستقل قومی خصلت کا ہو رہا ہے کہ انکار کرتے ہی رہتے تھے انکار کو شعار ہی بنا لیا تھا۔ اٰیٰتِ اللّٰہ کا لفظ عام ہے، معجزات و خوارق بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور کتب آسمانی بھی۔ لے المعجزات مطلقاً ...... اوالکتب المتلوة مطلقاً (روح) المعجزات التسع وغیرھا ...... اوالقرآن او جمیع اٰیات اللّٰہ المنزلة علی الرسل (بحر) بانھم میں با سببیہ ہے یعنی یہ سزا انہیں کفر عادی اور مسلسل قتل انبیاء کی پاداش میں ملی۔ ۲۱۴ قتل تک! یعنی دوسری بیہودگیاں، شرارتیں، سفلہ پن بازیاں تو تھیں ہی، حد یہ ہے کہ قتل تک سے بھی نہ چوکے۔ یسعیاہ نبی کا قتل، یرمیاہ نبی کا قتل، زکریا نبی کا قتل، یحیٰی نبی کا قتل، اور عیسیٰ مسیح کا اقدام قتل بلکہ اپنے خیال میں قتل ہی، اسرائیل کی تاریخ جرائم کے چند جلی عنوانات ہیں —— یہ قوم اس قابل رہ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ بھی رعایتیں روا رکھی جائیں یا اسے زندہ رہنے کی بھی کچھ مہلت دی جاتی؟ بغیر الحق۔ لیکن نبی کا قتل تو ہمیشہ ناحق ہی ہوگا، نبی کے قتل جائز کی کوئی صورت ہی نہیں۔ یہ قرآن جس میں ایک لفظ بھی بیکار یا بطور حشو نہیں لے کیوں لایا؟ قرآن کا مقصود اس اضافہ سے یہ ہے کہ خود ان قاتلوں کے معیار سے بھی یہ قتل ناحق و ناجائز تھے یعنی خلاف عدل تو خیر ہوتے ہی، قانون وقت کے لحاظ سے خلاف قانون اور بے ضابطہ بھی تھے! لے عندھم ایضاً (مدارک) فلوھم من عیوان کان ذلک القتل حقاً فی اعتقادھم وخیالھم (کبیر) لے لو بیّن عوانی قتلھم وجھاً یستحقون به القتل عندھم (بحر) بعض نے کہا ہے کہ اس تصریح سے مقصود قتل کے ناحق ہونے پر زور اور تاکید ہے۔ کان ھذا تعظیماً للشنعة علیھم (قرطبی) تعظیم للشنعة والذنب الذی اتوہ (قرطبی) سلسلۂ اسرائیلی کے خاتم نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ زمانہ بھی آپ کا نسبتاً بہت قریب کا ہے یعنی عہد تاریخی کے اندر کا۔ اُس وقت کی تاریخ ایک اچھی خاصی حد تک محفوظ ہے۔ حال میں اٹلی کے ایک ایڈوکیٹ روزیڈی (Rosedi) اور انگلستان کے ایک بیرسٹر اینس Innes نے قدیم کاغذات کی چھان بین کر کے آپ کے مقدمہ کی رُوداد الگ الگ شائع کی ہیں۔ یہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کے مقدمہ میں یہ نہیں ہوا کہ رُومی حاکم عدالت سے سزائے صلیب کا فیصلہ سنانے میں کوئی اجتہادی غلطی ہو گئی۔ بلکہ ہوا یہ کہ یہود نے ایک بالکل جھوٹا استغاثہ گڑھا، اور پہلے اپنی مذہبی عدالت میں، اور پھر ملک کی عام فوجداری عدالت میں بالکل ہی بے ضابطہ کارروائیاں کر کے حکم سزا دلا دینے میں کامیاب ہو گئے —— رُومی اور جیسے بھی کچھ ہوں، آئین دوستی اور قانون پرستی تو ان کی مشہور ہے۔ جب اُن تک کے عہد میں یہ اندھیر ہوا، تو پھر قدیم ترین انبیاء کی مظلومیت کا کیا ٹھکانا۔ جن کے قتل میں غالباً ضابطہ کی ظاہری اور رسمی صورت بھی نہیں برتی گئی! ۲۱۵ اسرائیلیوں کے مسلسل تمرد، سرکشی، نافرمانی کے تذکروں سے توریت و انجیل دونوں کے صفحات لبریز ہیں، سب کی نقل کرنے کی نہ گنجائش نہ ضرورت۔ بطور نمونہ از خروارے دو چار نمونے دیکھتے چلئے :- "انہوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اُڑا دیا، اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا، اور اس کے نبیوں سے بدسلوکی کی یہاں تک کہ خدا کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا" (۲-تواریخ ۳۶: ۱۶) "تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمہارے نبیوں کو کھا گئی ہے۔" (یرمیاہ ۲: ۳۰) "اے اہل یعقوب اور اہل اسرائیل کے سب خاندانو! خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یوں فرماتا ہے

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ اِنَّ
یہ (سب) اس لئے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ بڑھ جاتے تھے ۲۱۵ بیشک

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ
جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ۲۱۶ اور جو لوگ یہودی ہوئے ۲۱۷ اور نصاریٰ ۲۱۸ اور

الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ
صابی ۲۱۹ (غرض) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے ۲۲۰

وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ
اور نیک عمل کرے، ۲۲۱ سو ان (سب) کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے

وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ وَ اِذْ
اور نہ کوئی اندیشہ ان کے لئے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے ۲۲۲ اور (وہ وقت

اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ
یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا ۲۲۳ اور ہم نے تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا ۲۲۴

خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا
مضبوطی کے ساتھ اس (کتاب) کو پکڑے رکھو جو ہم نے تم کو دی ہے ۲۲۵ اور جو کچھ

فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ
اس میں ہے اُسے یاد رکھو تاکہ تم متقی بن جاؤ ۲۲۶ پھر تم اس (عہد) سے اس کے بعد بھی

بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ
پھر گئے ۲۲۷ سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی

کہ تمہارے باپ دادوں نے مجھ میں کونسی ناانصافی پائی جو وہ مجھ سے دُور بھاگے اور بطلان کے پیرو ہوئے اور آپ باطل ہو گئے" (یرمیاہ ۲: ۴، ۵) "وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے اور انہوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو نصیحت دیتے تھے کہ انہیں تیری طرف پھرا لائیں، قتل کیا، اور انہوں نے کاموں سے تجھے غصہ دلایا" (نحمیاہ ۹: ۲۶) یہ مختصر، بہت ہی مختصر، اقتباسات عہد قدیم کے نوشتوں سے تھے، اب عہد جدید کے نوشتوں کے ایسے ہی مختصر نمونے ملاحظہ ہوں :- "اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو ...... نبیوں میں سے کس کو تمہارے باپ دادوں نے نہیں ستایا" (اعمال ۷: ۵۱، ۵۲) "تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو ...... دیکھو میں نبیوں، داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے، اور بعض کو اپنے عبادتخانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بشہر ستاتے پھرو گے۔ تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا ہے، تم پر آئے ...... اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ہیں، انہیں سنگسار کرتی ہے" (متی ۲۳: ۲۹–۳۷، لوقا ۱۱: ۴۷–۵۱، ۱۳: ۳۴) غرض توہین انبیاء اور تعمیر کشی کا الزام یہود پر قرآن مجید نے دُنیا میں پہلی بار نہیں لگایا۔ اُن کی فرد جرم کا یہ عنوان تو قدیم نوشتوں میں موجود چلا ہی آ رہا تھا۔ قرآن مجید نے محض اس کی تصدیق و توثیق کر دی۔ بما عصوا میں با سببیہ ہے۔ ذٰلك۔ اس میں اشارہ کا مشار الیہ کفر اور قتل انبیاء ہے۔ الاشارة الی الکفر والقتل (بیضاوی) مرشد تھانوی نے فرمایا کہ کسی گناہ کو بھی خفیف نہ سمجھنا چاہئے، ایک گناہ برابر دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے، یہاں تک کہ کفر کا، چنانچہ یہاں بھی جیسا اور تجربہ و مشاہدہ تھا جو ان لوگوں کو کفر آیات الٰہی اور قتل انبیاء تک لے آیا۔ مفسر بیضاوی نے بھی یہاں یہی کہا ہے کہ جس طرح چھوٹی طاعت بڑی طاعت کی طرف لے جاتی ہے، چھوٹی معصیت بھی بڑی معصیت تک نوبت پہنچا دیتی ہے، چنانچہ یہاں بھی خوئے عصیان نے رفتہ رفتہ کفر و قتل انبیاء تک پہنچا دیا۔ جرّھم العصیان والتمادی والاعتداء فیه الی الکفر بالاٰیات وقتل النبیین وان صغار الذنوب سبب یؤدی الی ارتکاب کبارھا ۲۱۶ آخری رسولؐ اور آخری کتاب پر یعنی مسلمان ہو چکے ہیں۔ ایمان لانے کے معنی کل ضروری کے تسلیم کر لینے کے ہیں، توحید پر ایمان، رسالت پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، آسمانی کتابوں پر ایمان سب کچھ اس میں شامل ہے۔ اور الذین اٰمنوا مطلق صورت میں قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی آیا ہے، مراد اس سے مسلمان ہی ہیں۔ یہاں بھی مراد مومنین ہی ہیں۔ لے من امتی محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کبیر) عن ابن عباسؓ ھم المصدقون رسول اللہ صلعم وما اتاھم من الحق من عند اللہ (ابن جریر) اور رازی نے بھی محققین سے یہی معنی نقل کئے ہیں کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر دین پر ثابت و قائم رہے۔ الذین اٰمنوا فی الماضی وثبتوا علی ذلک واستمروا علیه فی المستقبل وھو قول المتکلمین (کبیر) ۲۱۷ یعنی جو لوگ دین یہودیت کے پیرو ہیں۔ یقال ھادو تھود اذا دخل فی الیھودیة (بیضاوی) خواہ پہلے سے موسوی چلے آتے ہوں، نسلاً یہودی ہوں، یا پہلے مشرک وغیرہ کچھ اور ہوں اور اب یہود کے عقیدے اور شعار اختیار کر لئے ہوں۔ ایک کہ بنی اسرائیل نام ایک خاص نسل و خاندان کا چلا آ رہا تھا اور ان کی تاریخ کے اہم ترین منظر سامنے آئے جاتے تھے! پر ذکر ان کے مسلک و عقیدہ کا شروع ہوتا ہے تو اب یہاں بلفظ الذین ھادوا آیا ہے۔ بنی اسرائیل ایک نسلی نام تھا، ایک قبیلہ یا قوم کا نام تھا جسے اپنی عالی نسبی پر فخر تھا، اپنے آباء و اجداد کی مقبولیت پر ناز تھا۔ تاریخ کے دور آتے وقت ضروری تھا کہ اس نسلی نام کو لیا جائے۔ مطالب بیان

ایک ہی مسلک کو، ایک اعتقادی نظام کا شروع ہو رہا ہے۔ ضروری ہو کر اب نام ایسا لیا جائے، کوئی وصف ایسا بیان کیا جائے، جو بجائے نسل نسب خاندان کے مسلک عقیدہ کی جانب بنمائی کرے۔ الذین ھادوا اسی ضرورت کو پورا کر رہا ہے ۔۔۔ قرآن مجید کے بلاغت کے وجوہ اعجاز بے شمار ہیں۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ متقارب لیکن ممتاز معانی کیلئے لفظ بھی وہ مختلف لاتا ہے اور ان کے دقیق باہمی فرق کا لحاظ رکھ لیتا ہے۔ مذہب یہود ایک نسلی مذہب ہے تبلیغی مذہب نہیں کسی غیر اسرائیلی کو باضابطہ یہودی بنانے کا طریقہ ان کے ہاں نہیں لیکن عرب میں متعدد قبیلے ایسے آباد تھے جو نہ پیدائشی یہودی تھے اور نہ نسلاً اسرائیلی بلکہ عرب یا بنی اسمٰعیل تھے لیکن یہود کی صحبت سے متاثر اور ان کے علوم سے مرعوب ہو کر انہوں نے پہلے یہود کے طور طریقے اور پھر ان کے عقیدے اختیار کر لئے اور رفتہ رفتہ ان کا شمار بھی یہودی آبادی میں ہونے لگا۔ بجائے الیہود کے الذین ھادوا لانے میں ایک نکتہ یہ بھی ہو کہ ان لوگوں کے عقاید اختیاری کی جانب دلالت خوب واضح ہو جائے۔ بنی اسرائیل کی قومی حکومت و وجاہت کا خاتمہ تو ظہور اسلام سے مدتوں پہلے بلکہ کہنا چاہیئے کہ سنہ ۷۰ء میں مشرک رومیوں کے ہاتھوں بیت المقدس کی بربادی کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ اور رسول اللہ صلعم کے معاصرین یہود کی حیثیت صرف ایک مذہبی اور دینی فرقہ کی رہ گئی تھی، اسی لئے خوب خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کا لفظ جہاں جہاں استعمال کیا ہو سیاق عبارت ہر جگہ تاریخی ہے۔

٢١٨ النصاریٰ۔ نصاریٰ جمع ہے نصرانی کی۔ ملک شام (حال فلسطین) میں ایک قصبہ ناصرہ ہے (Nazareth) علاقہ گلیل میں بیت المقدس سے ستر میل شمال میں، اور بحر روم سے مشرق میں، ۲۰ میل کے فاصلہ پر موجودہ آبادی آٹھ اور نو ہزار کے درمیان ہے۔ حضرت عیسیٰ کا آبائی وطن یہی قصبہ ہے اور آپ یسوع ناصری اسی مناسبت سے کہلاتے ہیں۔ ناصرہ ہی کو عربی تلفظ میں نصران بھی کہتے ہیں نصرانی کا انتساب اسی قصبہ کی جانب ہے۔ سمّوا بذلک انتسابًا الی قریۃ یقال لھا نصران (راغب) نصران قریۃ بالشام ینسب الیہ النصاریٰ (جوہری) یہی اشتقاق ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ صحابی سے آیا ہے۔ سمیت النصاریٰ نصاریٰ لان قریۃ عیسیٰ ابن مریم کانت تسمّی ناصرۃ وکان اصحابہ یسمون الناصریین (ابن جریر عن ابن عباسؓ) اور یہی قول قتادہ و ابن جریج تابعین کا ہے۔ نیز بعد کے محقق مفسرین کا وھو قول ابن عباسؓ و قتادۃ و ابن جریج (کبیر) سمّوا بذلک لقریۃ تسمی ناصرۃ کان ینزلھا عیسیٰ فلما نسب اصحابہ الیہ قیل النصاریٰ (قرطبی) بعض نے اسے عربی کا لفظ فرض کر کے نصرت سے مشتق سمجھا ہے لیکن قول صحیح وہی ہے جو ابھی گزر چکا۔ خوب خیال کر لیا جائے قرآن یہاں ذکر مسیحیوں کا نہیں، نصاریٰ کا کر رہا ہے۔ اور قرآن حکیم کا ہر لفظ پر حکمت ہوتا ہے۔ مسیحی وہ ہیں جو اناجیل اربعہ پر ایمان رکھتے ہیں، مسیح کو خدا کا نبی نہیں، خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اُن کے قالب میں حلول کر آیا تھا، آخرت میں نجات دینے والا (Saviour) خدا کو نہیں مسیح ابن اللہ کو یقین کرتے ہیں، اور خدا کو تین اقنوموں میں تقسیم کر کے ایک ناقابل فہم فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ ہر اقنوم بجائے خود بھی خدا ہے، اور تینوں اقنوم مل کر بھی ایک ہی خدا بنتے ہیں ۔۔۔ اس کھلے ہوئے شرک کے قائلوں کا ذکر اس مقام پر مقصود نہیں اسی لئے نام بھی جو مشہور اور چلا ہوا تھا، اسے ترک کر کے نصاریٰ لایا گیا۔ نصرانی معرب ہے Nazarene کا حضرت مسیح کے سچے پیرو ابتدائی زمانہ میں جو انہیں نبی مانتے والے Nazarenes کہلاتے تھے۔ یہ توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیل اربعہ کے صرف انجیل متی کو مانتے تھے آگے چل کر یہی لوگ ایبونیہ (Ebonites) بھی کہلائے لیکن جب مشرکانہ عقائد کا زور بندھا اور اصل مسیحیت حلولیت اور تثلیث ہی قرار پا گئی، تو قدرۃً نصرانیت کا ستارہ بھی گردش میں آیا۔ اور نصرانی و نصرانیت کے الفاظ بجائے عزت و تکریم کے تحقیر کے موقع اور ذم کے محل میں استعمال ہونے لگے موجودہ مسیحیت سر تا سر پولسیت ہے۔ اور تمام تر پولوس (Paul) طرسوسی کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یہ حضرت مسیح کے کچھ ہی روز بعد شروع ہو گئی تھی۔ اور نصرانی اسکے بالکل منکر تھے۔ قرآن مجید نے محل مدح میں ایک موقع پر بھی تثلیثی مسیحیت کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ذکر جب کبھی آیا ہے تو ہمیشہ ملامت اور بیزاری کے ساتھ۔ ان آیتوں میں لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم۔ وقس علیٰ ہذا۔ لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ۔

٢١٩ الصابئون۔ صابی کے لفظی معنی ہیں جو کوئی بھی اپنے دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں آ جائے یا اس کی طرف مائل ہو جائے۔ من خرج او مال عن دین الیٰ دین (قرطبی) قیل لکل خارج من الدین الی دین آخر صابی (راغب) اصطلاح میں صابیون (Sabians) کے نام کا ایک مذہبی فرقہ تھا جو عرب کے شمال مشرق میں شام و عراق کی سرحد پر آباد تھا۔ یہ لوگ دین توحید اور عقیدہ رسالت کے قائل تھے اور اسی لئے اہل کتاب تھے، اپنے کو نصاریٰ یحییٰ کہتے تھے، گویا حضرت یحییٰ کی اُمت تھے۔ حضرت عمرؓ جیسے مبصر و نکتہ رس خلیفہ راشد اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جیسے محقق صحابی نے صابیوں کا شمار اہل کتاب میں کیا ہے اور حضرت عمرؓ نے ان کا ذبیحہ بھی حلال مانا ہے۔ قال عمر ابن الخطاب و ابن عباس ھم قوم من اھل الکتاب وقال عمر تحل ذبائحھم مثل ذبائح اھل الکتاب (سالم) تابعین میں سے متعدد اکابر ان کے اہل کتاب یا موحد ہونے کے قائل ہوئے ہیں۔ ھم طائفۃ من اھل الکتاب (ابن جریر عن السدی) فرقۃ من اھل الکتاب (ابن کثیر عن ابی العالیۃ) و ربیع بن انس والضحاک والسدی واسحق بن راہویہ۔ ابن زیدان کے موحد ہونے کے قائل تھے، اور قتادہ اور حسن بصریؒ سے تو یہاں تک منقول ہے کہ اہل قبلہ تھے اور نماز پانچ وقت کی پڑھتے تھے (ابن جریر) اور ہمارے امام ابو حنیفہؒ جو خود بھی عراق تھے اور اسلئے صابیوں سے براہ راست واقفیت کا موقع رکھتے تھے، ان کا فتویٰ ہے کہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ بھی حلال ہے اور ان کے ہاں کی عورتوں سے نکاح بھی جائز۔ قال ابو حنیفۃ لا باس بذبائحھم و نکاح نسائھم (قرطبی) تاریخ ایران پر ایک مستند مستشرق کی کتاب کے اردو ترجمہ ابھی حال ہی میں نکلا ہے (انجمن ترقی اردو دہلی) اس کے محشی فاضل مرحوم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور لفظ مینڈین Mandean پر حاشیہ دیتے ہیں:۔ "مینڈین بزبان آرامی یعنی اولوالعلم۔ اس فرقہ کے لوگ عراق میں اب بھی موجود ہیں اور صابیوں کہلاتے ہیں، وہ لوگ اگرچہ عیسائی نہیں ہیں، تاہم جان دی بیپٹسٹ کو مانتے ہیں۔ عراق میں عوام الناس ان کو حضرت یحییٰ کی امت کہتے ہیں" (ایران بعہد ساسانیاں)

٢٢٠ من اٰمن باللّٰہ۔ یعنی اللہ کی ذات و صفت پر ایمان لائے جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے اور وہ ایمان ہر قسم کی شرکت کے شائبہ سے پاک ہو۔ اس ایمان باللہ کے تحت میں اسکے سارے لوازم و تضمنات بھی داخل ہیں، ورنہ خدا پر مطلق ایمان تو کسی نہ کسی صورت میں تقریباً ہر انسان کو ہے۔ اور ان لوازم توحید میں سب سے اونچے نمبر پر ایمان بالرسل ہے کہ بندوں کا صحیح تعلق اللہ کے ساتھ قائم کر دینے والی اس کا سیدھا راستہ بتانے والی ذات رسول ہی کی ہوتی ہے۔ قد دخل فی الایمان باللّٰہ الایمان بما اوجبہ اعنی الایمان بالرسل (کبیر) والیوم الاٰخر۔ یوم آخرت پر ایمان لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ سارے احکام آخرت پر ایمان لایا جائے۔ دخل فی الایمان بالیوم الاٰخر جمیع احکام الاٰخرۃ (کبیر) تناسخ حلول وغیرہ کے گمراہ عقائد کی بنیاد صرف یہی ہے کہ دوسرے مذہبوں میں یوم حشر کا ایمان صحیح باقی نہیں رہا اور انہوں نے بجائے اس کے جزا و سزا کی اور اور صورتیں تجویز کر لیں۔

٢٢١ اور عمل صالح کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل وحی الٰہی یعنی شریعت اسلامی کے ماتحت ہو، دور حاضر کی چلتی ہوئی گمراہیوں میں سے ایک سوال جو بار بار پیش ہوتا رہتا ہے یہ ہے کہ ایک شخص صاحب ایمان ہے مگر بدعمل، اور دوسرا خوش عمل ہے مگر ایمان سے خالی، تو ان دو میں نجات کس کی ہو گی؟ علماء اس کے جوابات مختلف دیتے رہتے ہیں لیکن سب سے سیدھا اور بے تکلف جواب یہ ہے کہ حُسن عمل کا ایک لازمی عنصر تو خود ایمان ہی ہے، بغیر تصحیح ایمان کے بغیر حق تعالیٰ کی رضاجوئی کے خیال کے کوئی عمل، عمل صالح کی تعریف میں آ ہی کب سکتا ہے؟ ایمان سے خالی شخص کا حسن عمل تو صرف صورۃً عمل ہو گا، ورنہ اسکی حقیقت یعنی خالق کونین کی رضا طلبی تو اس سے خارج ہی ہو گی۔

٢٢٢ اعتقاد صحیح اور عمل صحیح بس یہی دو شرائط نجات ہیں۔ گویا مذہبی دنیا کو یہ بشارت پہلی بار کھلے لفظوں میں پہنچی کہ اصل شے عقیدہ اور عمل ہیں، اور ان دو کی تصحیح کے بعد قوم نسل وغیرہ کی ساری نسبتیں ہیچ ہیں۔ عند ربھم میں عند سے مراد عندیت مکانی نہیں کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حق میں جو مکان و جہت سے پاک و منزہ ہے محال ہے، بلکہ مراد اجر کا یقینی اور قطعی ہونا ہے۔ لیس المراد العندیۃ المکانیۃ فان ذلک محال فی حق اللّٰہ تعالیٰ بل المراد ان اجرھم متیقن جار مجری (کبیر) قرآن مجید کا ایک بلیغ و حکیمانہ اسلوب یہ بھی ہے کہ جزئیات کے ضمن میں بڑے بڑے اہم کلیات بیان کر جاتا ہے۔ ذکر بنی اسرائیل کی مسلسل نافرمانی اور پشتہا پشت کی سرکشی کا چلا آ رہا تھا مخاطبین پر یہ اثر پڑنا بالکل طبعی تھا کہ ایسے مجرموں کیلئے اب نجات کی کوئی گنجائش ہو ہی کیا سکتی ہے؟ معاً درمیان میں یہ آیت لا کر اس بدگمانی کو رفع کر دیا گیا کہ جو کوئی بھی اپنا عقیدہ اور عمل درست رکھے گا خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی یا نصرانی یا صابی، غرض کوئی بھی ہو، رحمت و مغفرت کی راہیں سب کے لئے کھلی ہوئی ہیں، کام کی چیزیں صرف ایمان صحیح اور عمل صحیح ہیں۔ لیعرف ان جمیع ارباب الضلال اذا رجعوا عن ضلالھم و اٰمنوا بالدین الحق فان اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ یقبل ایمانھم و طاعتھم ولا یردھم عن حضرتہ البتۃ (کبیر) لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ بیان آخرت کا ہو رہا ہے یعنی قیامت کے دن جو کشف حقائق کا دن ہو گا اہل ایمان کو نہ اپنے ماضی پر حسرت ہو گی نہ اپنے مستقبل کی طرف سے تشویش۔ خوف و اندیشہ کا تعلق مستقبل سے ہے، اور غم و حزن کا ماضی سے۔

٢٢٣ (اے بنی اسرائیل تمہارے پیغمبر کے واسطہ سے اس مضمون کا کہ تم توریت پر عمل کرو گے)

٢٢٤ الطور۔ طور مطلق پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور جزیرہ نمائے سینا کے ایک مخصوص و متعین پہاڑ کا بھی نام ہے۔ الطور اسم جبل مخصوص وقیل اسم لکل جبل (راغب) جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کے متعدد پہاڑوں پر ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے سلسلہ میں جبل طور سے مراد جبل سینا ہوتا ہے لیکن خود جبل سینا کی کوئی ایک چوٹی نہیں، متعدد چوٹیاں ہیں۔ انھیں میں سے کسی کا نام طور ہو گا۔ قوم کے اوپر پہاڑ بلند کرنے سے کیا مراد ہے؟ توریت میں اس کی کچھ مجمل سی کیفیت درج ہے:۔ "وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا پر ہر تا بالا دھواں تھا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور دھواں اس کا بھٹی کے دھوئیں کی طرح اٹھتا تھا اور سارا پہاڑ نہایت لرز گیا" (خروج ۱۹: ۱۷، ۱۸) اور تالمود جو توریت کی مشہور و مستند اور نہایت ضخیم شرح یہود کے ہاں موجود ہے، اس میں اس اجمال کی تفصیل بہ الفاظ ذیل درج ہیں:۔ "حق تبارک و تعالیٰ نے ان کے اوپر کوہ سینا کو الٹ دیا جس طرح کوئی برتن الٹ دیا جاتا ہے اور کہا کہ اگر تم توریت کو قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ سب یہیں دفن ہو کر رہ جاؤ گے" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۲، ص ۳۱) "خدا نے پہاڑ کو ان لوگوں پر الٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ توریت کو اگر قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ یہیں تمہارا مدفن بن کر رہیگا" (ایضاً) ہمارے مفسرین نے جو آثار صحابہ و تابعین کی زبانی نقل کئے ہیں، ان میں بھی روایتیں اسی سے ملتی جلتی ہیں۔ واللّٰہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

٢٢٥ یہ پورا قول اسی وقت کا ہے جب کتاب نازل ہوئی تھی۔ کتاب ہدایت کے نزول اور رفع طور کے ساتھ ساتھ ہدایت اس کی بھی ہوئی تھی کہ اس کتاب کی محافظت کرنا اور اس کے احکام پر مداومت۔ اعملوا بما اعطیتکم من الکتب (ابن عباس) مَآ اٰتَیْنٰکُمْ سے مراد کتاب توریت ہے۔ احکام توریت کے اس اخذ و تمسک کی تاکید اور اس کے ترک پر وعید خود توریت میں بھی جابجا مذکور ہے:۔ "جو کوئی اس شریعت کی سب باتوں پر قائم نہ رہے کہ ان پر عمل کرے اس پر لعنت، سب جماعت کہے آمین" (استثناء ۲۷: ۲۶) "اگر تو کوشش کر کے خداوند اپنے خدا کی آواز سنے تاکہ ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ سے فرماتا ہوں، دھیان رکھ کے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا زمین کی قوموں کی نسبت تجھے سرفراز کریگا" (استثناء ۲۸: ۱) "لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوا نہ ہو گا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو بتاتا ہوں، دھیان رکھ کے عمل کرے تو ایسا ہو گا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر آ پڑیں گی، اور تجھ تک پہنچیں گی" (استثناء ۲۸: ۱۵)

٢٢٦ اور تقویٰ کی راہ یہی ہے کہ کتاب الٰہی پر عمل کیا جائے۔ وَاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ۔ یاد رکھو اس کے مضامین کو تاکہ ان پر عمل کر سکو۔ احکام الٰہی کا یاد رکھنا اصلاً اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان پر عمل کیا جا سکے۔ حکم کے تحت میں حفظ و قرأت وغیرہ بھی داخل ہیں لیکن مقصود اصلی وہی عمل ہے۔ اقرؤا ما فی التوراۃ واعملوا بہ (ابن کثیر عن ابی العالیۃ) ای تدبروہ واحفظوا اوامرہ ووعیدہ ولا تنسوہ ولا تضیعوہ ھذا ھو المقصود من الکتب العمل بمقتضاھا لا تلاوتھا باللسان و ترتیلھا (قرطبی) لَعَلَّ کے لئے پوری تصریح اوپر گزر چکی ہے کہ یہ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے استعمال ہوتا ہے تو مفہوم شک و احتمال کا نہیں رہتا، بلکہ معنی یقین کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

٢٢٧ (اور حسب سابق پھر نافرمانی کرنے لگے) مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ۔ یعنی اس قول و اقرار کے بعد، کتاب ہدایت و احکام مل جانے کے بعد۔ ای من بعد البرھان (قرطبی)

٢٢٨ یعنی فی الفور ہلاک کر دئے گئے ہوتے، اور ساری قوم کی قوم دنیا سے اسی طرح بے نشان ہو گئی ہوتی جیسے اور پرانی متعدد قومیں ہو چکی ہیں۔ فضل و رحمت خداوندی بنی اسرائیل کے حق میں یہی تھی کہ ان کی خطاؤں اور جرائم سے مزید چشم پوشی کی گئی اور انہیں اور مہلت سنبھلنے اور اپنے کو درست کرنے کی دی گئی۔

۲۲۹ لَقَدْ عَلِمْتُمُ۔ عِلْم کا لفظ خود ہی تحقیق کے معنی میں قرآن مجید میں بارہا استعمال ہوا ہے۔ پھر ل حرف تاکید۔ قد حرف تاکید۔ لقد جب فعل پر داخل ہوتا ہے، اس میں معنی شدتِ تاکید کے پیدا کرتا ہے۔ گویا قرآن بنی اسرائیل کو انکی تاریخ کا کوئی واقعہ انکے لئے خوب اچھی طرح سے جانا بوجھا ہوا یاد دلا رہا ہے۔ اور ان سے کہہ رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل جس واقعہ کا ذکر آگے آ رہا ہے، وہ تمہاری تاریخ کا ایک مسلّم و متعارف واقعہ ہے اور تم اس سے بلاشک و اشتباہ خوب واقفیت رکھتے ہو۔ مِنْكُمْ۔ یعنی تمہارے اسلاف و اجداد میں سے۔ فِي السَّبْتِ۔ یعنی احکام سبت کے بارہ میں۔ سبت کے لفظی معنی ہیں ہفتہ کا ساتواں دن یعنی شنبہ یا سنیچر۔ السبت شریعتِ یہود کی اصطلاح میں ایک مقدس دن مسیحیوں کے اتوار کی طرح ہے۔ یہ دن صرف یادِ خدا اور عبادت کے لئے مخصوص ہو، اور اس روز تجارت، زراعت، شکار وغیرہ ہر قسم کے دنیوی کام سب ممنوع تھے۔ اور ممانعت بھی اس شدومد کے ساتھ کہ جو اس حکم کو توڑے اسکی سزا قتل۔ توریت کے الفاظ ہیں:۔ "پس سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے مقدس ہے۔ جو کوئی اسکو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے ...... پس جو کوئی روز سبت کو کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے" (خروج ۳۱: ۱۴، ۱۵) اعْتَدَوْا۔ تجاوز کر جاتے تھے شریعتِ موسوی کے حدود سے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں یہود کی ایک بڑی آبادی مقام ایلہ میں تھی۔ یہ ذکر انہیں کا ہے۔ حضرت داؤدؑ کا زمانہ حکومت مستشرقین کی تحقیق میں ۔۔۔ ہے۔ مقام ایلہ اگر وہی ہے جس کا ذکر توریت میں ایلات (Elath) کے نام سے آتا ہے۔ (استثناء ۲: ۸) تو یہ فلسطین کے جنوب میں، عرب کی عین شمالی سرحد پر، قدیم علاقہ ادوم میں، بحر قلزم کی مشرقی خلیج میں لبِ ساحل واقع ہے۔ موجودہ جغرافیہ اسکو عقبہ کے نام سے پہچانتا ہے۔ اور عقبہ خلیج عقبہ کا مشہور بندرگاہ ہے۔ ایلہ کے یہودی اپنی شریعت کے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کرتے مچھلی کا شکار ایک خاص چالاکی کے ساتھ اور اسے ظاہری صورت جواز دے کر سبت کے دن کیا کرتے ۲۳۰ اس مسلسل نافرمانی پر سزا ان مجرموں کو یقیناً ملی۔ باقی کیا ملی، اسکی تفصیلات اس درجہ قطعی نہیں۔ جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ یہ سزا اسی طرح واقع ہوئی جیسی قرآن کے ظاہر الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی وہ انسان بندر بنے اور چند روز کے بعد ہلاک ہو گئے۔ اس تفسیر پر عقلاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا جو لوگ اللہ کے قانونِ تشریعی کے توڑنے میں اتنے جری و بیباک ہوں، انکے حق میں خالقِ کائنات اپنے قانونِ تکوینی کو کسی حد تک اگر بدل دے، اور بجائے "ارتقاء" کے کبھی اگر "ارتقاءِ معکوس" ہو جائے تو اس میں عدمِ امکان تو خیر کیا ہو گا، استبعاد بھی کچھ ایسا زائد تو نہیں لیکن روایتیں خود اس نتیجہ پر تمام تر متفق نہیں۔ بلکہ یہ قول تابعین ہی کے زمانہ سے تفسیروں میں لکھا چلا آ رہا ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا، صوری نہیں، یعنی ان کے عادات و اخلاق بندروں کے سے کر دیئے گئے تھے۔ اور بندر کا اطلاق ان پر مجازاً ہونے لگا تھا۔ ورنہ حقیقۃً وہ بندروں کے جسم و قالب میں تبدیل نہیں کئے گئے تھے۔ لم یمسخوا قردۃ انما ھو مثل ضربہ اللہ لھم (ابن جریر عن مجاہد) مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ (ابن جریر عن مجاہد) روی عن مجاھد فی تفسیر ھذہ الاٰیۃ انہ انما مسخت قلوبھم وردت افھامھم کافھام القردۃ (قرطبی) مفردات میں بھی ایک قول اسی معنی میں نقل ہوا ہے۔ قیل بل جعل اخلاقھم کاخلاقھا وان لم تکن صورھم کصورتھا (راغب) لیکن جمہور مفسرین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ قول غریب اور ظاہر سیاقِ قرآنی کے خلاف ہے۔ قول غریب خلاف الظاھر من السیاق فی ھذا المقام و فی غیرہ (ابن کثیر) وظاھر القراٰن انھم مسخوا قردۃ علی الحقیقۃ وعلی ذلک جمہور المفسرین وھو الصحیح (روح) ۲۳۱ سزا کی تفصیلی نوعیت کچھ بھی ہو، بہرحال تھی وہ کوئی بہت سخت اور عبرتناک سزا۔ قرآن مجید کا مقصود اس سزا کی تفصیل بیان کرنا نہیں، بلکہ اسکی عبرت انگیزی اور موعظت آموزی کے پہلو کو واضح کرنا ہے۔ ــــ واقعہ جو کچھ بھی ہو یہود کا جانا بوجھا ہوا تھا، قرآن اُسے صرف یاد دلا رہا ہے۔ جعلنٰھا میں ھا کی ضمیر عقوبت کی طرف بھی ہو سکتی ہے، اور اُس مسخ شدہ اُمّت کی طرف بھی۔ ماحصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔ اے جعلنا تلک العقوبۃ (ابن جریر عن ابن عباسؓ) یعنی بہ فجعلنا الامۃ التی اعتدت فی السبت (ابن جریر) نَكَالًا۔ نکال وہ سخت سزا ہے جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔ اے عبرۃ تنکل المعتبر بھا (بیضاوی) عبرۃ تنکل من اعتبر بھا (کشاف) مَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا۔ ما دونوں جگہ مَن کے معنی میں آیا ہے یعنی ما کا استعمال جاندار صاحبِ عقل مخلوق کیلئے ہوا ہے۔ مَا بَيْنَ يَدَيْهَا معاصرین کے معنی میں ہے اور مَا خَلْفَهَا بعد کے آنے والوں کے معنی میں۔ ما بین یدیھا اے معاصریھم (ابن عباسؓ) ما خلفھا اے من خلفھم (ابن عباسؓ) بما قبلھا وبما بعدھا من الامم والقرون (کشاف) يَدَيْهَا اور خَلْفَهَا دونوں میں ضمیر ھا عقوبت کی طرف ہے۔ والضمیران للعقوبۃ (قرطبی) گویا سزا ایسی تھی کہ مدتوں تک نسلاً بعد نسل اس کا چرچا رہے، اور لوگ اس کا تذکرہ محسوس کرتے اور لرزتے رہیں ۲۳۲ یعنی تاکہ متقین کو اس واقعہ کی حکایت سے راہِ تقویٰ کی طرف ترغیب اور زیادہ ہو یا یہ مراد لی جائے کہ نصیحت کو قبول کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے متقین ہی ہوں گے۔ صاحبِ روح المعانی نے یہاں یہ نکتہ اہلِ عرفان کیلئے لکھا ہے کہ اللہ نے عبادتوں کو خاص خاص ہیئت کے ساتھ خاص اوقات میں متعین کیا ہے۔ تاکہ طبعی ظلمتیں دور ہوں سو جو شخص ان ہیئتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نورِ استعداد ضائع ہو جاتا ہے اور وہ اصحابِ سبت کی طرح مسخ کر دیا جاتا ہے یعنی جس جانور کے وصاف اسمیں راسخ ہیں، اُنھیں کی طبیعت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اگرچہ اس اُمت کیلئے مسخ صورت نہیں پس انسان کو چاہیئے کہ اوامرِ شرعیہ کے ذریعہ سے اپنی انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں لگا رہے۔ چنانچہ بعض اہلِ کشف اس زمانہ میں ایسے بھی پائے گئے ہیں، جو انسان کو اسی حیوان کی شکل میں دیکھتے ہیں، جس کی صفتِ حیوانی اس پر غالب ہوتی ہے۔ مثلاً جس میں ظلم و شقاوت غالب ہوتی ہے اُسے آتا ہوا دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں کہ بھیڑیا آ رہا ہے۔ یا جس پر حرام خوری کی گندگی غالب ہوتی ہو اُسے دیکھ کر یوں بول اٹھتے ہیں کہ سؤر چلا آ رہا ہے۔ اور اس قسم کا کشف تکوینی صرف اہلِ حق و مقبولین کے ساتھ مخصوص نہیں ۲۳۳ اسرائیلیوں میں ایک واقعہ قتل کا ہو گیا تھا اور قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ذبحِ گاؤ کا حکم اسی سلسلہ میں ملا۔ اسکی کچھ تصریح اگلے رکوع میں آ رہی ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ صدیوں تک مصر اور مصر والوں کے درمیان رہتے رہتے بہت سے مشرکانہ رسوم توحید کے علمبردار اسرائیلیوں میں پھیل چکے تھے۔ اور گائے کی عظمت بلکہ تقدیس ان کے دلوں میں رچ چکی ہے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی گائے کی تقدیس مشرکانہ مذہب کا ایک جزو تھی۔ توریت میں اسرائیلیوں کو ذبح گاؤ کا حکم خاص خاص قیدوں اور شرطوں کے ساتھ بارہا ملا ہے۔ مثلاً "بنی اسرائیل کو کہو کہ ایک لال گائے جو بے داغ اور بے عیب ہو اور جس پر کبھی جوا نہ رکھا گیا ہو، تجھ پاس لائیں۔ تم اسے العیزر کاہن کو دو کہ اسے خیمہ گاہ سے باہر لے جائے اور وہ اسکے حضور ذبح کی جائے" (گنتی ۱۹: ۲) "جو شہر مقتول سے زیادہ نزدیک ہے اسی شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو اور اس شہر کے بزرگ اس بچھیا کو ایک بہتی وادی میں جو نہ جوتی گئی ہو نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں" (استثناء ۲۱: ۳، ۴) بقرۃ۔ اصلاً صرف گائے کیلئے ہے اور ثور کا مؤنث ہے۔ قیل المذکر ثور (راغب) البقرۃ اسم للانثی والثور اسم للمذکر (قرطبی) لیکن بعض مفسرین نے اسے گائے اور بیل دونوں کیلئے عام رکھا ہے اور یہاں اس سے بیل مراد لی ہے ۲۳۴ بنی اسرائیل سکتہ میں آ گئے، کہ احترام و تقدیس کے جذبہ سے سرشار تھے، یقین ہی نہ آیا کہ ایسے مقدس و محترم جانور کے ذبح کر ڈالنے کا حکم ملا ہو گا۔ بس یہی سمجھے کہ حضرت موسیٰ ہنسی اور تفنن طبع کی راہ سے کہہ رہے ہیں ۲۳۵ اور احکامِ خداوندی کی پیامرسانی میں ہنسی دل لگی سے کام لینے لگوں۔ الجھل فعل الشئ بخلاف ما حقہ ان یفعل (راغب) اللہ کی طرف سے پیام گڑھ لینے کی جسارت وہی کر سکتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ سے غافل و جاہل ہو۔ انما یکون ذلک من الجھل باللہ تعالیٰ (بحر) یا وہ کر سکتا ہے جو امورِ دینی میں استہزاء کے نتائج و عواقب سے بے خبر ہو۔ ان اکون من الجاھلین بما فی الاستھزاء فی امور الدین من العقاب الشدید (کبیر) فقہاء و مفسرین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ دین و معظماتِ دین کے ساتھ استہزاء حکم جہل اور گناہ عظیم میں داخل ہے اور اس کا مرتکب مستحق وعید ہے۔ وفی الاٰیۃ دلیل علی منع الاستھزاء بدین اللہ ودین المسلمین ومن یجب تعظیمہ وان ذلک جھل وصاحبہ مستحق للوعید (قرطبی) یدل علی ان الاستھزاء من الکبائر العظام (کبیر) لیکن ساتھ ہی یہ ضروری تصریح بھی کر دی ہے کہ مزاح یا خوش طبعی کو استہزاء یا تمسخر سے کوئی مناسبت نہیں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ خوش طبعی تو خود رسول اللہ صلعم اور ۔۔۔

رَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ

رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور تباہ ہونے والوں میں ہوتے ۲۲۹ اور تم خوب جان چکے ہو

الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے سبت کے بارہ میں تجاوز کیا تھا ۲۳۰ تو ہم نے ان سے کہا

كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ

کہ ذلیل بندر ہو جاؤ ۲۳۱ پھر ہم نے اسے (موجبِ) عبرت بنا دیا اُس

يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَاِذْ

زمانہ کے اور اس کے بعد کے لوگوں کے لئے اور ایک (موجبِ) نصیحت (بنا دیا) خوف خدا رکھنے والوں کے لئے ۲۳۲ اور

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ

(وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ ایک

تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ

گائے ذبح کرو ۲۳۳ وہ بولے آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں کیا؟ ۲۳۴ موسیٰ نے کہا

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا

کہ خدا مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں ۲۳۵ وہ بولے

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ

ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجیئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیسی ہو؟ کہا کہ وہ

اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ

فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بن بیاہی (بلکہ) دونوں عمروں کے درمیان

دین میں برابر رائج رہی ہے۔ ولیس المراد من الاستہزاء بسبیل الاثری ان النبی صلعم کان یمزح والائمۃ بعدہ (قرطبی) والفرق بین الھزء والمزاح ظاھر فلاینافی وقوعہ من الانبیاء (روح)
اور مفسر قرطبی نے اس سلسلہ میں ابن خویز منداد کے حوالہ سے شہر کوفہ کے قاضی (رح) کی ایک دلچسپ حکایت بھی نقل کی ہے ۲۳۶ (بلحاظ عمر) ما ھی سے مراد بیان حقیقت نہیں، مقصود توضیح مزید
ہے ۲۳۷ یعنی نہ ایسی بڑھی ہو نہ بالکل بچہ۔ فارض وہ ہے جس کے بچہ جننے کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہو۔ بکر وہ ہے جس نے ابھی بچہ جنا ہی نہ ہو۔ الفارض المسنۃ التی لاتلد والبکر
الفتیۃ التی لوتلد قط (معالم) یہیں سے خیال ہوتا ہے کہ بقرۃ سے مراد بیل نہیں گائے ہی ہے۔ عوان کے معنی درمیانی سن رکھنے والی۔ العوان المتوسط بین السنین (راغب) ۲۳۸

ذٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا
ہو ۲۳۸ سو اب کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار
رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے۔ کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ گائے خوب گہرے زرد رنگ
صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ
کی ہو ۲۳۹ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو ۲۴۰ وہ بولے اپنے
لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۗ
پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمیں بتلا دے کہ وہ اور کیسی ہو ۲۴۱ گائیں ہمیں اشتباہ میں ڈال رہی ہیں
وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے ۲۴۲ کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت
بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ
کرنے والی نہ ہو جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو ۲۴۳
مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۚ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ
اس میں کوئی داغ (دھبہ) نہ ہو ۲۴۴ وہ بولے اب آپ ٹھیک پتہ لائے ۲۴۵
فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧١﴾ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا ع ۸
پھر انہوں نے اسے ذبح کیا، اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے ۲۴۶ اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے ایک
فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۚ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿٧٢﴾
شخص کو قتل کر ڈالا تھا ۲۴۷ پھر تم آپس میں اس باب میں جھگڑنے لگے ۲۴۸ اور اللہ کو وہ ظاہر کر دینا تھا جسے تم چھپا رہے تھے ۲۴۹

اہلِ مصر بیل کی تقدیس کے باوجود اسے قربانی میں بھی چڑھایا کرتے تھے۔ مگر قربانی کے بیل میں بڑی بال کی کھال نکالا کرتے تھے۔ اس کا رنگ یکسر سفید ہو، اسکے جسم بھر پر بال ایک بھی سیاہ نہ ہو، دُم بالکل صحیح اور طبعی حالت میں ہو، کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ غرض طرح طرح کی قیدیں اور شرطیں تھیں۔ یہ سب پوری ہولیتیں جب کہیں جا کر قربانی کی نوبت آتی۔ اسرائیلیوں نے جو اتنی موشگافیاں کیں، عجب نہیں کہ مصریوں ہی کی صحبت کا اثر ہو ۲۳۹ یعنی رنگ خوب شوخ کھلتا ہوا ہو۔ فلسطین وسینا کی بعض گائیں یقیناً اس رنگ کی ہوتی ہونگی۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اہل کشف خود نفس کو بھی زرد ہی رنگ کا بتاتے ہیں۔ اور صوفیہ نے جو نفس کو اس گائے سے تشبیہ دی ہو تو اس سے وہ شباہت اور بڑھ جاتی ہے ۲۴۰ یعنی وہ گائے خوش نما خوش منظر خوش رنگ ہو۔ بدرنگ، بدنما، بدمنظر نہ ہو ۲۴۱ یعنی ذرا اور متعین ومحدود کیجیے، اور اسکی اور خصوصیات بیان کیجیے۔ اس حلیہ اور اس رنگ کی گائیں تو بہت سی ہیں ۲۴۲ (گائے تک) اور اسے ضرور ذبح کر کے رہیں گے۔ ای الی عین البقرۃ المامور بذبحھا (بحر) ۲۴۳ ہندوستان میں عام رواج صرف بیل سے کاشتکاری کا کام لینے کا ہے، گائے سے نہیں لیکن دوسرے ملکوں میں یہ کام گائے سے بھی لیا جاتا ہے ۲۴۴ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۲۳۰۔ ۲۴۵ یعنی مفصل و پورا پتہ تو اب بتایا ہے ۲۴۶ یعنی ان کی مسلسل موشگافیوں سے تعمیل حکم بعید ہی معلوم ہوتی تھی ۲۴۷ (اپنے ہی میں سے) "تم نے" یعنی تم میں سے کچھ لوگوں نے۔ ذکر بنی اسرائیل ہی کا بدستور چل رہا ہے۔ یہاں بھی اشارہ ان کی قومی تاریخ ہی کے کسی واقعہ کی طرف ہے لیکن اس خاص واقعہ کی تعیین کیلئے یہود کے ذخیرۂ تاریخ و روایات میں بہت زیادہ گھسنے اور کرید کرنے کی ضرورت ہے۔ ان شاء اللہ کوئی آئندہ مفسر ہمت کر کے اس فرض کو ادا کرے گا۔
۲۴۸ (اور ایک دوسرے پر الزام رکھنے لگے) یعنی اصل قاتل کا پتہ نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ قاتل فلاں ہے اور کوئی کہتا کہ فلاں۔ ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے۔ فادّٰرءتم۔ درء کے معنی جھگڑنے کے بھی ہیں اور دفع کرنے کے بھی۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دفع کرنے ہی کے معنی میں آیا ہے مثلاً فادرءوا عن انفسکم الموت۔ ویدرءا عنھا العذاب۔ یدرءون بالحسنۃ السیئۃ۔ یہاں ادّٰرءتم (بروزن افاعلتم) سے مراد آپس میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر الزام ڈالنے سے ہے۔ ای ینفی کل واحد منکم القتل عن نفسہ ویضیفہ الی غیرہ (کبیر) اختلفتم واختصمتم فی شانہا (کبیر) ۲۴۹ یعنی اصل قاتل کا پتہ۔ رکوع سابق میں جو حکم ذبح گاؤ کا ملا ہے، وہ جیسا کہ مفسرین کا خیال ہے، شاید اسی موقع کے لئے تھا۔

۲۵۰ تفصیلات کا علم تو عالم الغیب کو ہے۔ البتہ اتنا پتہ تو یہود کے قانون شریعت (توریت) کے مطالعہ سے بہرحال چلتا ہے کہ قتل کے موقع پر جب قاتل کی تحقیق ہو رہی ہو چند خاص شرائط کی پابندی کے ساتھ ایک جوان گائے کو جس سے کوئی خدمت نہ لی گئی ہو ذبح کیا جاتا تھا۔ اور اسکے لاشہ پر بزرگان قوم ایک خاص طریق پر دعا کرکے خون کے گناہ سے اپنی بخشائش چاہتے تھے۔ کتاب استثناء کے باب ۲۱ میں آیات ۱۔۹ میں یہ تفصیلات درج ہیں۔ یہاں صرف چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ "اگر اس سرزمین میں جس کا خداوند تیرا خدا تجھے ارشاد کرتا ہے، کسی مقتول کی لاش کھیت میں پڑی ہوئی ملے اور معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے، تب تیرے بزرگ اور تیرے قاضی باہر نکلیں اور ان بستیوں تک جو مقتول کے گرداگرد ہیں، درمیان کو ناپیں۔ اور یوں ہوگا کہ جو شہر مقتول سے زیادہ نزدیک ہے اسی شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جو سے تلے نہ آئی ہو...... اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں...... پھر اس شہر کے سارے بزرگ جو مقتول سے نزدیک ہیں اس بچھیا کے اوپر جو اس وادی میں گردن ماری گئی ہے اپنے ہاتھ دھوئیں اور جواب دے کے کہیں کہ ہمارے ہاتھوں نے یہ خون نہیں کیا، نہ ہماری آنکھوں نے دیکھا" تفسیری روایات میں آتا ہے کہ مقتول زندہ ہوگیا تھا اور قاتل کا نام اور پتہ بتاکر پھر مرگیا۔ واللہ اعلم ۲۵۱ (قیامت کے دن) جعل تبارک وتعالٰی ذالک الصنیع حجۃ لہم علی المعاد (ابن کثیر)

قرآن مجید نے اپنی عام خصوصیت یعنی خاص سے عام کی تعلیم کی یہاں بھی نہ چھوڑی۔ اور ایک جزئی واقعہ سے اپنی قدرت اور امکانِ بعث ہی کا پہلو نمایاں کیا ۲۵۲ (اور نمونے اپنی قدرت کاملہ اور اختیار مطلق کے) ۲۵۳ (اور کم از کم، اس نظیر کے مشاہدہ کے بعد امکان بعث اور وقوع قیامت کے انکار سے تو باز آجاؤ) ۲۵۴ یعنی قبول کی طرف ذرا نہ مائل ہوئے۔ ثم۔ یہاں استبعاد کیلئے ہے، یعنی جو نتیجہ نکلنا چاہیئے تھا وہ نہ نکلا۔ ثم لاستبعاد القسوۃ بعد مشاھدۃ ما یزیلھا (ابو سعود) مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ۔ اس تصریح نے اس استبعاد کو اور زیادہ قوی وشدید کردیا۔ مؤکد للاستبعاد اشد تاکید (روح) ۲۵۵ (عدم قبولِ حق کے باب میں) اسرائیلی صحیفوں میں بھی یہ مضمون بار بار آیا ہے۔ مثلاً "وہ تربیت پذیر نہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے چہرہ کو چٹان سے سخت تر بنایا۔ انہوں نے پھرنے سے انکار کیا ہے" (یرمیاہ۔ ۳:۵) "سارے اہل اسرائیل بے حیائی کی پیشانی رکھتے اور سنگدل ہیں" (حزقیل ۳:۷)

او۔ یہاں "یا" کے معنی میں نہیں، بلکہ "بلکہ" کے معنی میں ہے۔ کلمۃ او بمعنی بل (کبیر) او بمعنی بل (جمل) یہ بھی کہا گیا ہے کہ او یہاں بطور کلمہ اباحت آیا ہے یعنی خواہ انہیں پتھر سمجھو یا پتھر سے بھی بڑھ کر سخت، دونوں باتیں صحیح ہیں۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ او کو کلمۂ تنویع قرار دیا جائے اور آیت کے معنی یہ کئے جائیں کہ انکے قلوب دو قسم کے ہیں کچھ تو پتھر جیسے سخت، اور کچھ اس سے بھی زیادہ سخت۔ فالمعنی ھم فرقتان فیھم من قلبہ کالحجر وفیھم من قلبہ اشد من الحجر (قرطبی) کان قلوبہم علی قسمین قلوب کالحجارۃ قسوۃ وقلوب اشد قسوۃ من الحجارۃ (بحر) او للتنویع ای بعض کالحجارۃ وبعض اشد (روح) ۲۵۶ (اور ان سے ایک عالم سیراب ہوتا ہے) اس قسم کے پتھروں کی مثال انسانی آبادی میں حضرات انبیاء و رسل ہیں۔ انکے چشمۂ فیض سے ایک عالم اپنی روحانی پیاس بجھاتا اور سیراب ہوتا رہتا ہے ۲۵۷ (اور ان سے بھی کسی درجہ میں اللہ کی مخلوق سیراب ہوتی رہتی ہے) اس نوعیت کے پتھروں کی مثالیں اولیاء امت اور ابرار و متقین ہیں کہ ان سے بھی انسانوں کا ایک بڑا طبقہ فیضیاب ہوتا رہتا ہے ۲۵۸ (اور اس طرح خود اپنے تاثر کا ثبوت بہم پہنچاتا رہتا ہے) اس طرح کے پتھروں کی مثال عام مومنین صالحین ہیں کہ دوسروں کی اصلاح و ہدایت اگر نہ کرسکیں جب بھی اپنا ایمان تو سلامت لیے ہی جاتے ہیں اور اپنے قبولِ حق کا ثبوت تو دیے ہی جاتے ہیں مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ۔ اوپر سے ذکر پتھروں ہی کا چلا آرہا ہے پتھروں کا جمود تو مسلّم اور ان کی قساوت تو مشاہد پھر ان میں خشیت اللہ کا گزر کیسے اور ہیبتِ الٰہی کا اثر کیونکر؟ اہل سنت کا ایک گروہ کہتا ہے کہ خشیت الٰہی کا یہ اثر پتھروں میں اپنے حقیقی و لفظی معنوں میں ہے یعنی بعض پتھروں میں گداز کا جزو ہوتا ہے۔ گو انکے مرتبہ جمادی کے مطابق۔ اور ان میں فہم و ادراک کی قوتیں ہوتی ہیں گو انکی سطح حجری کے متناسب۔ جیسے طور کا آخر پہاڑ ہی تھا لیکن تجلی الٰہی کے وقت جلالت باری سے چور چور ہوگیا۔ ذلک بان اللہ جل ذکرہ اعطی بعض الحجارۃ المعرفۃ والفہم (ابن جریر) قیل المراد بہ حقیقۃ الخشیۃ تدارکہ مذھب قوم وھو المروی عن مجاھد وغیرہ انہا اھنا حقیقۃ (روح) مذھب اھل السنۃ والجماعۃ ان للہ تعالٰی علما فی الجمادات وسائر الحیوانات سوی العقلاء لا یقف علیہ غیر اللہ فلہا صلوۃ وتسبیح وخشیۃ (معالم) لیکن ایک دوسرا گروہ کہ وہ بھی اہل سنت ہی کا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ خشیت سے یہاں مراد محض خشیتِ مجازی یا انقیادِ تکوینی ہے عقل و فہم و شعور و ارادہ سے اس کا تعلق نہیں لیکن بہرحال طبعی و غیر ارادی طور پر تو موجودات کا ایک ایک ذرہ قوانین الٰہی کے تابع ہی ہے۔ اسی کو یہاں مجازاً خشیتِ الٰہی سے تعبیر کردیا گیا ہے۔ جیسے خود محاورۂ قرآنی ہی میں ایک دوسری جگہ ارادہ کو بے جان و بے روح دیوار کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔ جدارًا یرید ان ینقض (کہف) حالانکہ سب جانتے ہیں کہ دیوار میں کوئی قوت ارادہ کی ہوتی ہے نہ خواہش کی۔ انما اُرید بذلک انہ من عظم امر اللہ یری کانہ ھابط خاشع من ذل خشیۃ اللہ (ابن جریر) قیل ھو مجاز عن انقیادھا لامر اللہ (مدارک) والخشیۃ مجاز عن الانقیاد (بیضاوی) قال قوم ان الخشیۃ مجاز عن انقیادہ لامر اللہ (روح) دونوں گروہ اہل حق ہی کے ہیں اور دونوں تفسیریں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ۲۵۹ خدائے تعالٰی نہ بے علم و بے خبر ہے، نہ بے طاقت و بے اختیار ہے۔ اور اسکے علم و طاقت دونوں کا حال عنقریب منکشف اور مشاہد ہوکر رہے گا ۲۶۰ (اے مسلمانو! اسرائیلیوں کی ان ساری بدکرداریوں کی روداد سننے کے بعد بھی) خطاب اس آیت میں اسرائیلیوں سے نہیں مسلمانوں سے ہے۔ حسن بصری تابعی کا قول ہے کہ اسکے مخاطب رسول اور مومنین ہیں (کبیر) قال القاضی ھذا الذی بالظاہر کبیر یرید محمدًا واصحابہ (معالم) افتطمعون میں جو ہمزہ استفہامی ہے، اس سے مقصود استبعاد ہے یعنی بھلا ایسا بھی کہیں ہوسکتا ہے؟ الھمزۃ للانکار الواقع استبعادہ (ابو سعود) الاستفہام للاستبعاد او للانکار التوبیخی (روح) تطمعون۔ طمع کے عام معنی لالچ کرنے، حرص رکھنے کے ہیں۔ لیکن دوسرے معنی امید و توقع کے بھی ہیں۔ اور وہی یہاں مراد ہیں۔ طمع فیہ وبہ احرص علیہ ورجاہ (لسان) اتکرجو یا محمد (ابن عباس) شاہ عبد القادر دہلوی نے ترجمہ فارسی میں امید سے اور مترجم تھانوی نے اردو میں توقع سے کیا ہے ۲۶۱ "وہ لوگ" یعنی عہد رسول کے معاصر یہود، جن کی قساوت قلب کی اتنی مفصل و مسلسل سرگزشت ابھی بیان ہوچکی۔ ھم الیھود الذین کانوا فی زمن الرسول علیہ السلام (کبیر)

فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى

تو ہم نے کہا کہ اس (میت) پر اس (گائے) کا کوئی ٹکڑا مارو ۲۵۰ یوں ہی اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا ۲۵۱

وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝۷۳ ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ

اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے ۲۵۲ تاکہ تم عقل سے کام لو ۲۵۳ اس پر بھی تمہارے دل

مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً ؕ وَ

اس کے بعد بھی سخت ہی رہے ۲۵۴ چنانچہ وہ مثل پتھر کے ہیں، بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر ۲۵۵

اِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ ؕ وَاِنَّ

اور پتھر تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے دریا پھوٹ نکلتے ہیں ۲۵۶ اور کوئی

مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا

ان میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے پانی نکلتا ہے ۲۵۷ اور کوئی ان میں سے ایسا

لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

بھی ہوتا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے آگرتا ہے ۲۵۸ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو، اللہ اس سے

عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝۷۴ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا لَـكُمۡ

بے خبر نہیں ۲۵۹ تو کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو ۲۶۰ کہ وہ لوگ ۲۶۱ تمہارے کہنے سے

وَقَدۡ كَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ كَلٰمَ

ایمان لے آئیں گے ۲۶۲ درآنحالیکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ کا کلام سنتے ہیں،

اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ

پھر اسے کچھ کا کچھ کردیتے ہیں، بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے ہیں،

لکمؕ ۔ یعنی تمہاری خاطر سے، تمہارے کہنے سے، تمہاری دعوت پر۔ لے لاجل دعوتکم ویستجیبوا لکم (کشاف) ای لاجل دعوتکم لھم (بحر) ۲۶۲ دو گروہ سخت جسارت کر رہے ہیں۔ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ ۔ کان کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، اور لغت و نحو دونوں اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک ایسا فریق تھا اسرائیلیوں کے درمیان، گویا ذکر ماضی کا اور یہود معاصرین کے اسلاف کا ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک ایسا فریق رہا ہے اُن کے درمیان۔ یعنی ذکر حال کا اور معاصر یہود کا ہو رہا ہے۔ ائمہ تفسیر سے دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں۔ لیکن سیاق و دوسرے معنی کے زیادہ موافق ہے۔ کہ بحث معاصرین ہی پر قائم کی جا رہی ہے، اور کرم انہیں کو قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ المراد بالفریق من کان فی زمان محمد علیہ الصلوٰۃ وھذا القرب (کبیر) كَلَٰمَ ٱللَّهِ یعنی یہود کے آسمانی صحیفے۔ اپنے ہاں کے صحیفوں کی تحریف یہود کو خود مسلّم رہی ہے۔ یرمیاہ نبی اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ "تم نے زندہ خدا، رب الافواج، ہمارے خدا کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے" (یرمیاہ ۲۳: ۳۶) قرآن مجید کی اعجازی کامیابیوں میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اب خود یہود بھی اپنے آسمانی صحیفوں کی تنزیل لفظی کے قائل نہیں رہے ہیں۔ اور ان کے علماء و اکابر اب صاف صاف اقرار کر رہے ہیں کہ صرف مضامین و مطالب کا القاء ہمارے انبیاء و اصفیاء کے قلب صافی پر ہوتا تھا، اور وہ حضرات انہیں الہامات معنوی کی روشنی میں اپنے لفظ و عبارت میں نوشتے تیار کر لیتے تھے۔ مِنۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ ۔ یعنی نادانستگی میں نہیں، دیدہ و دانستہ، سب کچھ جان لینے، سمجھ لینے کے بعد ۲۶۳ اب ذکر منافقین یہود کا شروع ہو رہا ہے۔ یہود کی ایک تعداد تو مدینہ میں علانیہ دشمن اسلام تھی ہی۔ لیکن کچھ ان کے علاوہ اس قماش کے بھی تھے کہ مسلمانوں کے سامنے اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتے تھے۔ یہ ذکر انہیں منافقین کا ہے۔ یعنی المنافقین من الیہود (ابن جریر۔ عن ابن عباسؓ) ۲۶۴ یعنی دیکھ

وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝٧٥ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا

اور وہ اسے (خوب) جانتے بھی ہیں ۲۶۲ اور جب وہ اُن سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں

قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ

تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں ۲۶۳ اور جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں ۲۶۴

قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ

تو کہتے ہیں کہ ارے کیا تم انہیں وہ بتا دیتے ہو جو خدا نے تم پر منکشف کیا ہے ۲۶۵

لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝٧٦

جس سے وہ تمہیں تمہارے پروردگار کے حضور میں قائل کر دیں گے ۲۶۶ سو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ۲۶۷

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ

کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو اس کی بھی خبر ہے جسے یہ چھپاتے ہیں،

وَمَا يُعْلِنُونَ ۝٧٧ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا

اور اس کی بھی جسے یہ جتلاتے ہیں ۲۶۸ اور ان میں اَن پڑھ (بھی) ہیں جو

يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا

کتاب (الٰہی) کا کوئی علم نہیں رکھتے بجز جھوٹی آرزوؤں کے، اور یہ محض تخیلات

يَظُنُّونَ ۝٧٨ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ

میں پڑے رہتے ہیں ۲۶۹ سو بڑی خرابی ہے اُن لوگوں کے لئے جو کتاب (الٰہی) کو اپنے

بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ

ہاتھوں سے لکھتے ہیں، پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے

منزل ۱

لیتے ہیں کہ آس پاس کوئی مسلمان تو نہیں سن رہا ہے۔ ۲۶۵ یعنی وہ اسرار و تعلیمات جو تمہاری مقدس کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں محفوظ ہیں۔ مثلاً آخری نبی کی بشارتیں اور علامتیں۔ یہود جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو قائل کرتے کہ تم اپنے ہاں کی پیشگوئیاں اور خاص تعلیمات مسلمانوں پر کیوں ظاہر کرتے، خواہ مخواہ ان کے ہاتھ میں ہتھیار اپنے خلاف دے دیتے ہو۔ انہیں معلومات سے وہ ہمیں قائل کرتے ہیں، یہی دلائل وہ ہمارے تمہارے خلاف استعمال کرتے ہیں ——— گویا یہ احمق یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ رسولِ اسلام اور پیروانِ اسلام کو جو کچھ بھی علم ہوگا محض انہیں کے بتانے ہی سے ہو سکتا ہے، اور بس ان کے سوا ان پر علم و معلومات کے کل دروازے بند ہیں۔ یہ جہل مرکب بالکل اسی طرح کا تھا جس میں آج سارا فرنگستان مبتلا ہے۔ یہ لوگ قرآن مجید پر جب تبصرہ کرنے بیٹھتے ہیں تو اس مفروضہ کو بنیاد کار بنا لیتے ہیں کہ اس میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ یہود کی توریت مروجہ، مسیحیوں کی انجیل مروجہ، اور اسی طرح کے دوسرے انسانی ہی ذرائع سے ماخوذ و منقول ہے۔ اور اس کا تو کوئی امکان وجود کا بھی نہیں کہ اس میں کوئی غیبی امداد و حی والہام کے قسم کی شامل ہو۔ لفظ اللہ اب تو ایک اسلامی اصطلاح ہے۔ لیکن پہلے بھی اس کا استعمال عرف اہل عرب کی زبان پر تھا، یہاں ایسے لوگوں کی زبان سے نقل ہوا ہے جو مسلم تھے نہ عرب۔ اس لئے بجائے اسی کو بجنسہ رکھ دینے کے اس کا ترجمہ "خدا" درج کیا گیا۔ ۲۶۶ عند ربکم کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ روز قیامت کے دن اور آخرت میں تمہیں قائل کریں گے چنانچہ ایک گروہ نے یہی معنی لئے ہیں۔ المراد یحاجوکم یوم القیٰمۃ (کبیر عن الامام) لے عند ربکم یوم القیٰمۃ (جلالین) لیکن زیادہ لگتے ہوئے معنی یہ ہیں کہ اسی دنیا میں تم پر حجت قوی قائم کر دیں گے۔ اور عند ربکم یہاں عند اللہ کی طرح حجت قوی و معروف کے معنی میں ہے، اس لئے کہ اول تو یہود عالم آخرت کے پوری طرح قائل نہ تھے۔ دوسرے وہاں حجت قائم کرنے کے لئے کسی ایسے ظاہری سہارے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہاں تو کشف حقائق از خود ہو کر رہے گا۔ اس لئے یہاں گویا احتجاج بکتاب اللہ کو عند اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ امر قدیم ائمہ تفسیر کی عظمت پر بس کرتا ہے کہ انہوں نے یہود کے عقائد متعلق بہ آخرت کا پورا علم رکھ کر بغیر بھی یہی پہلو اختیار کر لیا ہے۔ ھو فی کتاب اللّٰہ ھٰکذا وھو عند اللّٰہ ھٰکذا بمعنی واحد (کشاف) لے فی حکم اللّٰہ (کبیر عن القفال) قیل ھٰذا علی اضمار المضاف. لے عند کتاب ربکم (مدارک) لیحتجوا علیکم بما انزل ربکم فی کتابہ (بیضاوی) لے فی کتابہ وحکمہ (روح) ۲۶۷ جو مسلمانوں کو اپنے رازوں سے اپنی زبان سے واقف کئے دیتے، اور ان کے ہاتھوں میں اپنے خلاف ہتھیار دیئے دیتے ہو۔ اب جا کر اکابر یہود کی تقریر اپنے ہم قوموں سے ختم ہوئی ۲۶۸ (اور یہی اللہ جب چاہے رسولؐ اور مومنین کو اطلاع دے سکتا ہے، اور قوی سی بات ہے کہ اللہ کے لئے ایسے امور کی اطلاع اپنے پیمبر کو دے دینا مشکل ہی کیا تھا۔ لیکن بے مغز یہود اس امکان ہی کی طرف سے ذہن نہیں لے جاتے تھے کہ شاید اس مدعی نبوت کا تعلق خدائے تعالیٰ کے ساتھ واقعی کچھ ہو! ٹھیک اسی طرح جیسے آج بے مغز فرنگی اس امکان ہی کی طرف ذہن نہیں لے جاتے کہ کہیں قرآن انسانی تصنیف کے بجائے واقعی خدا ہی کی کتاب ہو ۲۶۹ (کہ "ہمارے بزرگ ہمیں بخشوا لیں گے"، "ہم خدا کے خاص محبوبوں کی اولاد ہیں، ہمیں کیا غم" وغیرہ) اشارہ اسی قسم کے خرافات عقائد کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ یہ ذکر عوام یہود کا ہے۔ یہ عوام کالانعام پڑھے نہ لکھے، باپ دادا کی لکیر کے فقیر، اپنی دل کی گڑھی ہوئی آرزوؤں اور دل خوش کن روایتوں میں پڑے مست رہتے تھے۔ انجیل میں کہیں تو مسیحؑ کی زبان سے اور اس سے بڑھ کر پولس کی زبان سے یہود کی انہیں باطل پرستیوں اور حماقت نوازیوں کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اماني ۔ اُمْنِيَّة کی جمع ہے۔ ایک معنی تو یہ ہیں کہ محض اپنی آرزوؤں کو پالتے رہتے ہیں، جنہیں واقعیت و حقیقت سے اصلاً تعلق نہیں۔ اُمنیۃ ما تخیلہ الانسان کبرا التمنی فی ھٰذا الموقع ھو تخلق الکذب وتخرصہ (ابن جریر) دوسرے معنی یہ کئے گئے ہیں کہ یہ جھوٹی روایتوں، بے ثبوت و بے سند خرافات میں پڑے رہتے ہیں۔ اور یہ معنی اکثر اکابر سے منقول ہیں۔ الاکاذیب المختلفۃ سمعوھا من علمائھم فنقلوھا علی التقلید (بحر عن ابن عباسؓ ومجاہد والفراء) ۲۷۰ پچھلی آیت میں ذکر عوام یہود کا تھا، اب ذکر خواص، اکابر یہود کا ہے۔ توریت کی تحریف اب کوئی اختلافی یا نزاعی مسئلہ نہیں، دوست و دشمن سب ہی کو اب تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ کلام الٰہی نہیں اس کے دوست زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ انسانوں کی تصنیف ہے۔ کسی جامد سے جامد یہودی میں بھی اب یہ ہمت باقی نہیں کہ توریت کو قرآن مجید کی طرح تنزیل لفظی قرار دے۔ اب زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خاصانِ خدا نے الہام خداوندی سے مشرف ہو کر اسے اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب و تالیف دیا، اور خدائے تعالیٰ کی جانب اس کا انتساب صرف مجازاً یا بالواسطہ ہے، حقیقی اور براہِ راست کے مفہوم میں نہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً جو تصحیفات ہوتی رہی ہیں، وہ بالغرض کسی مصلحت یا ضرورت ہی سے ہوئی ہوں، بہرحال نفس ان کے وقوع کا اعتراف کھلے خزانے سب کو ہے۔ اور بائبل کی تنقید Higher Criticism ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جرمن، فرنچ، انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر تیار ہو چکی ہیں۔ اور مقالات و مضامین کا تو شمار ہی نہیں، پھر فن بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ انتقاد متن Textual Criticism انتقاد تاریخی Historical Criticism وغیرہ اور ہر شاخ کے الگ الگ ماہرین پیدا ہو رہے ہیں ——— کاش سید احمد خاں مرحوم (اللہ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے) آج زندہ ہوتے، اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ یہود و نصاریٰ کی طرف سے جس الزام کی صفائی خواہ مخواہ انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھی، اس جرم کا اقبال اب کھلے لفظوں میں وہی لوگ کس کثرت سے کر رہے ہیں۔ یورپ اب جا کر جہاں پہنچا ہے سو برس ابھی پچھلی صدی، انیسویں صدی سے پیدا ہوا ہے۔ عرب کے اُمّی کے لائے ہوئے کلام کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے تیرہ صدی پیشتر ہی اہل کتاب کی "کتاب" جو لفظی ترجمہ ہے بائبل کا، کو تمامتر محرف و ناقابل اعتبار قرار دے دیا تھا۔ اللہ کا لفظ یہاں بھی یہود کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ اس لئے ترجمہ یہاں بھی "خدا" سے کیا گیا ۲۷۱ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت کے اندر دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہود کی انتہائی شقاوتِ قلب کی جانب کہ کلام ربانی تک میں تحریف کر چکے۔ دوسرے اس امر کی طرف کہ اس تحریف سے بھی مقصود کوئی

خدمتِ دین نہ تھی، تمامتر تحصیل جاہ و مال ہی تھی۔ ثمناً۔ ثمن کے معنی صرف نقد یا زرِ قیمت کے نہیں، بلکہ جو چیز بھی کسی چیز کے معاوضہ میں حاصل ہو وہ اس کی ثمن ہے۔ کل ما یحصل عوضاً عن شیٔ فھو ثمنہ (راغب) مفسرین نے بھی اسے یہاں اسی وسیع مفہوم یعنی مطلق دنیوی معاوضہ کے معنی میں لیا ہے۔ الثمن ھنا ھو عرض الدنیا (بحر) قلیلاً۔ کلامِ ربانی کی تصحیف و تحریف جیسے شدید و عظیم جرم سے جو بھی مادی نفع، کسی قسم کا بھی حاصل ہوگا، ظاہر ہے کہ وہ حقیر و بے وقعت ہی ہوگا۔ بعض خشک اہلِ ظاہر نے آیت کے ظاہر الفاظ پر جا کر یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ قرآن مجید کی خرید و فروخت دونوں ناجائز ہیں، لیکن مذہب صحیح یہ ہے کہ دونوں بالکل جائز ہیں۔ بیع و شرا یہاں جو کچھ بھی ہوتی ہے، وہ کاغذ، کتابت وغیرہ کی ہوتی ہے، نہ کہ "آیات اللہ" کی۔ آیت اگرچہ گو وعید لازم آتی ہے تو وہ جھوٹے مسئلے بتانے والوں اور موضوع حدیثیں بیان کرنے والوں کے حق میں ہے ۲۷۲ قرآنی اور اسلامی معیار صداقت و دیانت کا ہر تحریف اور ہر تصحیف موجبِ لعنت ہے اور عمداً بڑھی ہوئی جسارت۔ اور اسی لئے یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آتی نہیں کہ کوئی شخص کسی کلام کو کلامِ الٰہی مان کر اس میں دخل و تصرف کی نیت کرہی کیسے سکتا ہے۔ لیکن دوسری قومیں اس معیار ہی سے ناآشنا ہیں، بلکہ بعض اہلِ کتاب کے ہاں تو بھلائی کے لئے ہر برائی درست، اور خدا کی سچائی اور خداوند کے جلال کے اظہار کے لئے ہر جھوٹ جائز! آج دنیا میں مسیحیت کے ہم سے جو مکمل شرک پھیلا ہوا ہے، اس مذہب کے بانی پولس صاحب Paul اسرائیلی ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ مقولہ آج تک انجیل مرزج میں لکھا چلا آرہا ہے۔ "اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے؟ اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو؟" (رومیوں ۳:۷، ۸) ۲۷۳ (اپنی تحریفی جسارتوں سے)۔ مما یکسبون سے مراد کیا ہے، یعنی وہ کیا چیز ہے جو وہ اپنی ان حرکتوں سے حاصل کرتے رہتے ہیں؟ اس کے دو جوابات دیئے گئے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ ایک یہ کہ

لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا

تاکہ اس سے قدرِ قلیل معاوضہ حاصل کریں سو خرابی ہے ان کے لئے اس کی

كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

بدولت جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں ۲۷۲ اور خرابی ہے ان کے لئے اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے ہیں ۲۷۳

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں بجز چند گنے چنے دنوں کے ۲۷۴ آپ کہئے

اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ

کیا تم اللہ کے ہاں سے کوئی وعدہ پا چکے ہو، جو اللہ اب اپنے وعدہ کے خلاف

عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

نہ کرے گا، (یا یوں ہی) اللہ پر وہ جوڑ رہے ہو جس کا علم تم نہیں رکھتے ۲۷۵

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــــَٔــتُهٗ

(نہیں) بلکہ اصل یہ ہے کہ جو کوئی بھی بدی اختیار کریگا اور اس کا گناہ اس کو گھیر لے گا

فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

سو یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں ۲۷۶ اس میں ہمیشہ پڑے رہنے والے ۲۷۷

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ

اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو یہی لوگ اہلِ جنت

الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ

ہیں اس میں ہمیشہ رہنے والے ۲۷۸ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے

ع ۹/۱۱

منزل ۱

ان کے گناہوں کا ذخیرہ مراد ہے، یعنی وہ لوگ اپنی ان حرکتوں سے اپنے معاصی ہی کا انبار بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی من المعاصی (سالم) والمراد بذٰلک سائر معاصیھم (کبیر) دوسرے یہ کہ جو مالی نفع وہ اپنی غرضمندانہ تحریفات اور بے قول خود اور دروغ مصلحت آمیز سے حاصل کرتے ہیں، وہ یہاں مراد ہے۔ یصیبون من الحرام والرشوۃ (ابن عباسؓ) ای مما اکلوا بہ من السحت (ابن کثیر) المال المأخوذ علی ھذا الوجہ (کبیر) یرید بہ الرشی (بیضاوی) ۲۷۴ اور یہ چند دن بھی ہیں، جیسا کہ پادری راڈول نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے حاشیہ میں اکابر یہود کے حوالہ سے لکھا ہے، جن میں قوم اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا رہی تھی، یعنی کوئی ۴۰ دن۔ اور یہی بات ہمارے بعض اکابر تفسیر نے بھی نقل کی ہے۔ قدر الاربعین یوماً التی عبد فیھا اٰباؤنا العجل (ابن عباسؓ) اور ایک دوسرے مسیحی مترجم قرآن سیل نے یہ مدت گیارہ مہینہ یا ایک سال نقل کی ہے۔ اسی طرح ایک میعاد سات دن کی بھی نقل ہوئی ہے۔ بہرحال وہ بھی کوئی محدود و متعین مختصر ہی سی مدت۔ بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسرائیل اپنے کو آتشِ دوزخ کی زد سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھے بیٹھے تھے۔ چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل ہوا ہے۔ "آتشِ دوزخ گنہگاران قوم یہود کو چھوئے گی بھی نہیں۔ اس لئے کہ وہ درِ جہنم پر پہنچتے ہی اپنے گناہوں کا اقرار کرلیں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے۔" (جلد ۵ صفحہ ۵۸۲) اور یہود کے بڑے مقدس نوشتہ تالمود کے انتخابات کا جو مجموعہ انگریزی میں ڈاکٹر کوہن Kohen کا مرتب کیا ہوا Everyman's Library Series میں شائع ہوا ہے، اس میں یوں آیا ہے۔ "قیامت کے دن ابراہیم درِ دوزخ پر تشریف رکھتے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہ ہونے دیں گے۔" (ص ۴۰۴) "جہنم کی آگ اسرائیلی گنہگاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی۔" (ص ۴۰۴) حاصل یہ کہ بنی اسرائیل اپنی قوم کو خدا کی لاڈلی اور دُلاری سمجھے بیٹھے تھے، اور اس پر حد سے زیادہ نازاں تھے۔ یہود کی زبان سے اس سلسلہ میں ہم صیغۂ جمع متکلم جہاں جہاں بھی آیا ہے، اجتماعی معنی رکھتا ہے یعنی مراد قوم اسرائیل ہے ۲۷۵ یہود سے بطور حجت الزامی سوال ہو رہا ہے کہ یہ جو اپنی قوم کی محبوبیت خاصہ کا، عذابِ آخرت سے محفوظیت کا، عدم مسئولیت کا عقیدہ تم نے اپنے دل میں جما رکھا ہے، تو آخر یوں ہی اپنے دل سے گڑھ لیا ہے، یا اس کی کوئی سند بھی اپنے مقدس نوشتوں میں دکھا سکتے ہو؟ آخر اعتبار کس سے قائم کرلیا ہے؟ اتقولون علی اللہ قال کا صلہ جب علی کے ساتھ آتا ہے، تو معنی ہوتے ہیں کسی پر کوئی بات جوڑ لی، کسی پر بہتان باندھ دیا۔ قال علیہ افتری (تاج) ۲۷۶ نجات و عدم نجات کا اصل قانون اب بیان ہو رہا ہے کہ اس کے لئے نسل و قوم کو کوئی واسطہ ہی نہیں۔ احاطت بہ خطیئتہ۔ قصداً بدی کی راہ اختیار کرے اور معصیت پوری طرح گھیر جائے کہ خود ایمان کے لئے گنجائش ہی باقی نہ رہ جائے، صرف نہیں کیئے ممکن ہے جو سرے سے اہلِ باطل ہوں، اور ان کی موت کفر اور بے دینی ہی پر آئے۔ جو مومن کیسا ہی بدعمل ہو بہرحال اس آیت کا مصداق تو نہ ہوگا، کم از کم زبان سے اقرار اور قلب سے تصدیق کا درجہ تو اسے حاصل ہی ہوگا۔ تمام اکابر اہلِ سنت کے ہاں مراد کفر ہی سے لی ہے۔ ای اشرک باللہ ومات علیہ (ابن عباسؓ) السیئۃ الکفر و الشرک قال ابن عباسؓ ومجاھد (کبیر) المؤمنون لا یدخلون فی حکم ھذہ الآیۃ (معالم عن الواحدی) فاما اذا مات مؤمنا فاعظم الطاعات ھو الایمان معہ فلا یکون الذنب محیطا بہ فلا یتناولہ النص (مدارک) بعض اہلِ باطل، معتزلہ و خوارج وغیرہ نے آیت سے جو مومن عاصی کی عدم مغفرت پر استدلال کرنا چاہا ہے، وہ صریحاً باطل ہے ۲۷۷ خلود کے معنی اگرچہ مدت طویل کے بھی ہیں، لیکن اہلِ دوزخ اور اہلِ جنت کے سلسلہ میں جہاں جہاں اس لفظ کا استعمال قرآن مجید میں ہوا ہے، اہلِ سنت کا اجماع ہے کہ اس سے مراد دوام یا ہمیشگی ہے، اور اس کی تاکید و تائید میں قرآن مجید میں خالدین فیھا کے ساتھ ساتھ جا بجا ابداً بھی آیا ہے۔ والمراد بالخلود الدوام (روح) ومن الناس من حمل الخلود علی اصل الوضع وھو اللبث الطویل لیس بشیٔ لان فیہ تھوین الخطب فی مقام التھویل مع عدم ملائمتہ حمل الخلود فی الجنۃ علی الدوام (روح)

۲۷۸ دونوں آیتوں میں نجات کا پورا قانون ایجاز و اختصار کے ساتھ آگیا کہ نجات کو نسل و قوم سے کوئی تعلق نہیں۔ جو کوئی اپنے قصد و اختیار سے بدعقیدگی و بدکرداری کی راہ پر چلے گا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جو کوئی اپنے قصد و اختیار سے ایمان و عمل صالح کی روش کا انتخاب کرے گا، اس کی منزل جنت ہے۔ اُولٰۗىِٕكَ ۔ فَاُولٰۗىِٕكَ ۔ اوپر کی آیت کے الفاظ تھے فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۔ اور اس آیت میں ہیں اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ گویا ایک ہی قسم کا حکم لگانے میں ایک جگہ اولٰئک ف کے ساتھ ہے۔ اور ایک جگہ بغیر ف کے۔ یہ فرق گو خفیف سا ہے اور لفظی بھی نہیں محض حرفی ہے، لیکن اتنا فرق بھی آخر کیوں؟ اہلِ تحقیق نے جواب میں کہا ہے کہ پہلا موقع وعید کا تھا اہلِ جہنم کے لئے اور وعید میں امکان تخلف وعید کا ہے، اس لئے ف پر زور دیا گیا ہے۔ اور دوسرے موقع پر صرف وعدہ تھا اہلِ جنت سے جس کے تخلف کا کوئی امکان ہی نہیں، اس لئے محض اُولٰۗىِٕكَ بغیر ف کے بالکل کافی تھا۔ اور دوسرا جواب اس کے برعکس یہ بھی دیا گیا ہے کہ اہلِ تحقیق کہتے ہیں کہ اس فقرہ من دخل داری فاکرمہ میں اس کا امکان رہ جاتا ہے کہ گھر میں داخل ہونے والے کا اکرام نہ بھی کیا جائے، لیکن دوسرے فقرہ من دخل داری اکرمہ میں اکرام کرنا یقینی ہو جاتا ہے۔ عدم اکرام کا احتمال نہیں باقی رہتا۔ اسی نمونہ پر قرآنی فقرہ میں نیک کاروں کو جنت ملنا بالکل یقینی ہے۔ (روح) الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت کی جو ترتیب یہاں ہے، یہ قرآن نے ہر جگہ اور بڑی کثرت سے ملحوظ رکھی ہے، اور اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گو عمل صالح اپنی جگہ پر نہایت اہم اور ضروری ہے، لیکن ایمان اس سے بھی اہم تر ہے، اور بغیر ایمان کے مجرد عمل صالح کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ایمان کی حقیقت نیتِ عمل اور فکر کی تصحیح ہے۔ اور قرآن مجید نے بالکل فطری ترتیب کے مطابق تصحیحِ فکر کو تصحیحِ عمل پر مقدم رکھا ہے۔ محض عمل، اگر نیت سے قطع نظر کرلی جائے، تو صرف صورتِ عمل رہ جاتا ہے، حقیقتِ عمل نہیں۔

بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ قف وَ بِالْوَالِدَیْنِ

بنی اسرائیل سے عہد لیا ۲۷۹ کہ عبادت نہ کرنا کسی کی بجز اللہ کے ۲۸۰ اور حسن سلوک سے

اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ

پیش آنا (اپنے) ماں باپ سے اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے بھی ۲۸۱

وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا

اور لوگوں سے (بالعموم) بھلی بات کہنا ۲۸۲ اور نماز قائم رکھنا اور زکوٰۃ

الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَ اَنْتُمْ

دیتے رہنا ۲۸۳ پھر تم (سب ان احکام سے) پھر گئے بجز تم میں سے (معدودے) چند کے، اور تم ہی ہو

مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ

گردن کش ۲۸۴ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا

دِمَآءَکُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ

خون نہ بہانا ۲۸۵ اور اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے مت نکالنا

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ

پھر تم نے اس کا اقرار کرلیا اور تم (اس کے) گواہ ہو ۲۸۶ پھر تم ہی وہ ہو کہ

تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْکُمْ مِّنْ

اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو، اور اپنے ہی ایک گروہ کو اُن کے وطن سے نکال بھی

دِیَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ط

دیتے ہو (اور) اُن کے مقابلہ میں گناہ و ظلم کے ساتھ (انکے مخالفین کی) مدد بھی کرتے ہو ۲۸۷

۲۷۹ (انکے پیغمبروں کے واسطہ سے) عہد جب اس کا تعلق خدائے تعالیٰ سے ہوتا ہے، محاورۂ توریت میں حکم کے معنی میں آتا ہے، مثلاً "اور اُس نے اپنا عہد تمہارے آگے بیان کیا جس پر عمل کرنے کا حکم بھی اُس نے تمہیں دیا، یعنی دس احکام" (استثناء ۴:۱۳) بعض شارحین قرآن نے بھی یہاں "عہد لینے" کو "حکم دینے" کے معنی میں لیا ہے۔ اے امرناہم بذلک (ابن قتیبہ) ۲۸۰ توریت اثباتِ توحید و ممانعتِ شرک سے بھری پڑی ہے۔ صرف دو ایک مقام بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:۔ "میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لئے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر" (خروج ۲۰:۳-۵) "میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لئے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے مت بنا۔ تو انہیں سجدہ نہ کر نہ ان کی بندگی کر" (استثناء ۵:۷ و ۸) "سُن لے اے اسرائیل خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے" (استثناء ۶:۴) "تم اور معبودوں کی قوموں کے معبودوں میں سے جو تمہارے آس پاس ہیں پیروی نہ کرو کیونکہ خداوند تیرا خدا جو تمہارے درمیان ہے غیور خدا ہے۔ نہ ہو کہ خداوند تیرے خدا کے قہر کی آگ تجھ پر بھڑکے اور تمہیں روئے زمین سے فنا کردے" (استثناء ۶:۱۴ و ۱۵) تعبدون۔ صورۃً صیغۂ مضارع ہے لیکن معنیً امر ہے۔ هو اخبار فی معنی النهی (کشاف) بلکہ امر صریح سے بلیغ تر ہے یعنی اس سے یہ نکلتا ہے کہ گویا اس حکم کی تعمیل ہوچکی وهو ابلغ من صریح الامر والنهی لانه کانه سورع الی الامتثال (کشاف) هو ابلغ من صریح النهی لما فیه من ایهام ان المنهی سارع الی الانتهاء فهو یخبر عنه (بیضاوی) ۲۸۱ اس سے ملتے جلتے احکام توریت موجودہ میں اب بھی موجود ہیں:۔ "تو اپنے ماں باپ کو عزت دے" (خروج ۲۰:۱۲) "اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے۔ جیسا خداوند تیرے خدا نے فرمایا ہے" (استثناء ۵:۱۶) "اور اپنے مفلس بھائی کی طرف سے اپنے ہاتھ مت بند کیجیو بلکہ تو اس پر اپنا ہاتھ کشادہ رکھیو۔ اور کسی کام میں جو وہ چاہے بقدر اسکی احتیاج کے ضرور اس کو قرض دیجیو" (استثناء ۱۵:۸ و ۹) "اور مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہیں۔ آویں اور کھاویں اور سیر ہوویں" (استثناء ۱۴:۲۹) "اور مسکین زمین پر سے کبھی جاتے نہ رہیں گے۔ اس لئے میں یہ کہہ کے تجھے حکم کرتا ہوں کہ تو اپنے بھائی کے واسطے اور اپنے مسکین کے لئے اور اپنے محتاج کے لئے جو تیری زمین پر ہے اپنا ہاتھ کشادہ رکھیو" (استثناء ۱۵:۱۱) ۲۸۲ یعنی عام طور پر لوگوں سے حسنِ گفتار کو قائم رکھو۔ اے قولوا للناس مقالۃ حسنۃ (بحر) قولوا لهم القول الطیب (بحر عن ابی العالیہ) بات چیت میں اچھی طرح پیش آتے رہنا سہل ترین اور ادنیٰ فریضۂ انسانیت ہے۔ اس لئے یہ حکم عام ہے۔ یعنی خوش خلقی سب ہی کے ساتھ پیش آتے رہنا چاہیئے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس حکم کی تعمیم آیاتِ قتال سے منسوخ ہوگئی لیکن حضرت ابوجعفر باقرؒ سے مروی ہے کہ یہ حکم اب بھی عام ہے، تحدید و تخصیص پر کوئی دلیل نہیں، اور یہی مذہب قوی ہے۔ زعم ابوجعفر محمد بن علی الباقر ان هذا العموم باقٍ علی ظاهره وانه لا حاجة الی التخصیص وهذا هو الاقوی (کبیر) توریت موجودہ میں اب حسنِ سلوک کے جتنے بھی احکام ملتے ہیں ان کا دائرہ محدود ہے بنی اسرائیل کے ساتھ۔ اس لئے یا تو اس حکم کو اہلِ توریت نے بدل ڈالا۔ اور یا یہ حکم ہے ہی خاص شریعتِ محمدیؐ کا حکم، جیسا کہ متعدد اہلِ تفسیر کا گمان ہے ۲۸۳ صلوٰۃ، اقامتِ صلوٰۃ، زکوٰۃ۔ اب یہ سب مخصوص اسلامی اصطلاحیں ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اسرائیلیوں کو یہ سب احکام انھیں مخصوص ہیئتوں اور انھیں متعین قیود کے ساتھ ملے تھے۔ انھیں جو احکام ملے تھے، وہ تھے انھیں عبادتوں سے متعلق، لیکن اُن کی مخصوص بولی میں اور ان کے حالات و ماحول کے مطابق۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور دعا اور عبادت کی تاکید اب بھی توریت میں مختلف عنوانات سے موجود ہے۔ ۲۸۴ چند شہادتیں اسی مضمون کی خود توریت سے ملاحظہ ہوں:۔ "وہ اس راہ سے جو میں نے انہیں فرمائی جلد پھر گئے" (خروج ۳۲:۸) "میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے" (خروج ۳۲:۹) "اس لئے کہ تم گردن کش لوگ ہو" (خروج ۳۳:۳) "بنی اسرائیل کو کہہ دو کہ تم گردن کش لوگ ہو" (خروج ۳۳:۵) یہ چند حوالے صرف نمونہ کے طور پر دیئے گئے۔ ورنہ توریت کا تو یہ ایک خاص موضوع ہے۔ ۲۸۵ "عہد لیا" یہاں بھی "حکم دیا" کے معنی میں ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۲۷۹۔ خونریزی کی ممانعت توریت مروجہ میں بھی متعدد مقامات پر ملتی ہے، مثلاً۔ "تو خون مت کر" (خروج ۲۰:۱۳) "بے گناہ کا لہو تیری زمین پر جسے خداوند تیرا خدا تیری میراث کردیتا ہے، بہایا نہ جائے کہ خون تجھ پر ہو" (استثناء ۱۹:۱۰) ۲۸۶ یعنی ان احکام کی اطاعت کا اقرار تم نے صاف صاف کیا، جو آج تک تمہارے نوشتوں میں لکھا چلا آتا ہے، اور تمہیں اس سے مجال انکار نہیں۔ توریت میں ہے:۔ "وہ بولے کہ سب کچھ جو خداوند نے فرمایا ہے ہم کریں گے اور تابع رہیں گے" (خروج ۲۴:۷) ۲۸۷ یہود کے جو قبیلے عہدِ نبوی میں، مدینہ اور جوارِ مدینہ میں آباد تھے، ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ باہم خانہ جنگیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ مشرکینِ مدینہ دو بڑی ٹکڑیوں میں آج کل کی "مہذب" فرنگی قوموں کی طرح بٹے ہوئے تھے۔ ایک اتحاد اوس کا تھا دوسرا خزرج کا۔ اسرائیلیوں کے بھی بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ یہی کیا کرتے کہ ان میں سے ایک مشرکوں کے ایک جتھے کے ساتھ ہوجاتا اور دوسرا مشرکوں کی دوسری پارٹی کے ساتھ۔ اور پھر جنگ جب شروع ہوجاتی تو ظاہر ہے کہ وہ سب ہی کچھ ہوتا جو جنگ میں ہوا کرتا ہے۔ جلاوطنی اسرائیلی کا قتل اسرائیلی کے ہاتھ سے، وغیرہا ——— یہاں عہد نبوی کے معاصر اسرائیلیوں کے یہی خصوصیات بے نقاب کئے جارہے ہیں۔ بالاثم والعدوان۔ یہ کہہ کر قرآن نے تبلادیا کہ پھر یہ نہیں کہ اس خانہ جنگی اور مشرک نوازی کی بنیاد کسی جذبۂ صادق وصحیح اور حسنِ نیت و اخلاص پر ہو۔ بلکہ تمام تر حسن اخلاقی کے برعکس دنیوی اہل سیاست عموماً مبتلا رہتے ہیں، اور مشرکین خاص طور پر مبتلا تھے، وہی ان محاربات کا باعث تھیں۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں آج بھی یہ درج ہے کہ جنگ بعاث مشرکین کی باہمی جنگ تھی۔ یہود اس میں فریقین کی جانب سے شریک ہوگئے اور نمایاں حصہ لیا۔ بنی نضیر اور بنی قریظہ نے اوس کا ساتھ دیا، اور بنی قینقاع خزرج کی حمایت میں نکل پڑے۔ جنگ نے طول کھینچا اور بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ بالآخر شکست خزرج کے فریق کو ہوئی (جلد ۲ ص ۴۱۶) اسی انسائیکلوپیڈیا میں یہ تصریح بھی موجود ہے، کہ یہودی قبیلے مشرکینِ مدینہ کے ساتھ شادی بیاہ کرتے تھے۔ اور جنگ میں دونوں فریقوں کے شریک ہوجاتے تھے۔

۲۸۸ اور اس کو اپنے نزدیک دینداری کا بڑا کارنامہ سمجھ کر اس پر فخر کرتے اور احسان جتاتے ہو ۔ ۲۸۹ توریت محرّف میں بھی آج تک اسی قسم کے احکام لکھے چلے آتے ہیں ۔ ” تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ نہ کر “ (خروج ۔ ۲۰ : ۱۷) لیکن بالفرض کوئی صراحت اس قسم کی نہ ملے جب بھی کسی کو بلا عذر شرعی وطن سے بے وطن کر دینا سنگدلی و شقاوت کی انتہائی صورت ہے ۔ ۲۹۰ الکتٰب سے اس سیاق میں مراد ظاہر ہے کہ اسرائیلیوں ہی کی آسمانی کتاب توریت ہے ۔ بحث الزامی پہلو پر قائم ہو رہی ہے کہ قرآن پر ایمان لاتا تو الگ رہا تم خود توریت ہی کے کب پابند ہو ؟ بلکہ جس جیا کی سو تمہارے کار اس کے بعض احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں ۔ اس سے تو صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے اوپر حجت اور اپنے لئے واجب العمل توریت کے صرف بعض ہی اجزاء کو سمجھتے ہو ، اور بعض اجزاء پر تمہارا ایمان ہی نہیں ۔ ۲۹۱ پیشگوئی چند ہی روز میں لفظ بلفظ پوری ہو کر رہی ۔ حجاز میں یہود کے تین زبردست قبیلے رہتے تھے ۔ بنی نضیر ، بنی قریظہ ، بنی قینقاع ۔ تینوں دولت ، وجاہت ، قوت ، علم و ہنر میں ممتاز تھے ۔ تینوں چند سال کی قلیل مدت میں رسول اللہ صلعم کی حیات مبارک ہی میں تہس نہس ہو کر رہے ۔ ۲۹۲ اسرائیلیوں کیلئے جہنم کی وعید خود ایک اسرائیلی نبی اور سلسلہ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم حضرت مسیح کی زبان سے بھی منقول ہے ۔ انجیل موجود میں ہے ۔ ” تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو ۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو ۔ اے سانپو ، اے افعی کے بچو ! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے “ ۔ (متی ۲۳ : ۲۳) ۲۹۳ ۔ (اور وہ سب کو سزا مناسب وقت پر دیتا ہے ۔ اور آخرت میں ضرور دیگا) آیت میں اشارہ ہے یہود کے خفیہ طریق کار اور سازشی کارروائیوں اور ریشہ دوانیوں سے متعلق

وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ

اور اگر وہ تم تک اسیر ہو کر پہنچ جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو ۲۸۸ حالانکہ ان کا

إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ

وطن سے نکالنا ہی تم پر حرام تھا ۲۸۹ تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو ۲۹۰ اور ایک حصہ سے

بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ

انکار کرتے ہو ؟ سو پس تم میں سے جو ایسا کرے اس کی سزا کیا ہے بجز دنیوی زندگی

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ

میں رسوائی کے ؟ ۲۹۱ اور قیامت کے دن یہ سخت ترین عذاب میں ڈالے بھی

الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ

جائیں گے ۲۹۲ اور جو کچھ تم کرتے ہو ، اللہ اس سے بے خبر نہیں ۲۹۳ یہی لوگ ہیں

الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا

جنہوں نے دنیوی زندگی خرید لی ہے آخرت کے معاوضہ میں ۲۹۴ سو ان پر

يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝ وَلَقَدْ

سے نہ عذاب ہلکا کیا جائے گا ۲۹۵ اور نہ انہیں مدد ہی پہنچے گی ۲۹۶ اور ہم نے

آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ

موسیٰ کو کتاب عطا کی ۲۹۷ اور ان کے پیچھے ہم نے پے در پے پیمبر بھیجے ۲۹۸

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ

اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے روشن نشانات عطا کئے ۲۹۹ اور ہم نے

ع ۱۰

ہے ۔ ۲۹۴ حالانکہ آخرت کا سودا بھی بہت ارزاں تھا ۔ ایمان و طاعت سے لئے بہ آسانی خرید سکتے تھے ۔ یہود کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فکر اخروی باقی ہی نہیں رہ گئی تھی ۔ ان کے مقدس مذہبی نوشتوں تک کی تعلیمات کا خلاصہ بس یہ رہ گیا تھا کہ مذہب کی راہ پر چلو تاکہ دنیوی فلاح حاصل ہو ، قوم کو آزادی ملے اور تم ایک اقبال مند قوم بن جاؤ ۔ آخرت کی جزا و سزا جس سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے ، اس سے عہد عتیق بلکہ توریت تک تقریباً خالی ہے ۔ ۲۹۵ (آخرت میں) شدید ترین عذاب الٰہی ابھی اوپر والی آیت میں آ چکا ہے ۔ اب تاکیداً ارشاد ہو رہا ہے کہ اس بے پناہ عذاب سے رہائی پانے کا کیا ذکر ہے ، تخفیف تک کی صورت اس میں ممکن نہ ہو گی ۔ فلاح کی ٹ کا تجربہ سونے کیا گیا جو مقصود ہے کہ یہ عذاب تکذیب انبیاء کے جرم میں اس کے نتیجہ کے طور پر اور ایمان نہ لانے کی پاداش میں ہوگا ۔ ۲۹۶ (کہ ان کے اکابر و اجداد ہی آ کر سفارش کر دیں) یہود کو بڑا غرہ اسی کا تھا کہ ہم انبیاء مقبولین کی اولاد ہیں ۔ ہمیں کیا غم ہے ۔ ہماری نصرت و شفاعت کیلئے ہمارے اسلاف کافی ہیں ۔ قرآن کو اسی لئے اس عقیدہ کی تردید بار بار کرنی پڑی اور مختلف پیرایوں میں انہیں تنبیہ کی گئی کہ قانون الٰہی کے باغیوں کی مدد و سفارش کوئی بھی نبی یا ولی نہیں ہو سکتا ۔ اور جو ایمان سے خالی ہیں ان کی امداد و نصرت کسی سمت و جہت سے بھی نہ ہو گی ۔ ۲۹۷ اور ایک مستقل دستور شریعت سے قوم اسرائیل کو بطور انعام خاص مشرف و ممتاز کیا ۔ الکتٰب سے مراد وہی توریت ہے ۔ حضرت موسیٰ کون تھے کس زمانہ میں تھے یہ سب ذکر پہلے حاشیوں میں آ چکا ہے ۔ ۲۹۸ (تمہاری ہی نسل اسرائیل میں) اسرائیلیوں میں حضرت موسیٰ کے بعد بھی انبیاء کا متواتر اور بکثرت آتے رہنا تاریخ کا ایک مشہور و مسلم واقعہ ہے ۔ حضرت یوشع نبی ، حضرت داؤد نبی ، حضرت زکریا نبی ، حضرت یحییٰ نبی کے نام سے اردو خواں طبقہ بھی واقف ہے ۔ متعدد انبیاء کے صحیفے کیسے ہی محرف سہی ، ” عہد نامہ عتیق “ کے موجودہ مجموعہ میں شامل ہیں ۔ ۲۹۹ (اپنی

پیمبری و صداقت کے) البیّنٰت ۔ اس میں دلائل ، خوارق ، معجزات سب آ گئے ۔ عیسیٰ ۔ آپ سلسلہ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں ۔ سنہ عیسوی آپ ہی کے نام سے جاری ہے ۔ آپ کے بعد صرف نبوت محمدی ہوئی ۔ ملک شام کے علاقہ ارض گلیل میں ایک قصبہ ناصرہ نامی ہے وہی آبائی وطن تھا ۔ ولادت بیت المقدس کے ایک گوشہ میں ہوئی ۔ خاندان یوسف بن یعقوب بن ماثان نامی ایک حکیم کا تھا جناب یوسف لکڑی کی صنعت سے خوب واقف تھے اسی لئے یوسف نجار کے نام سے مشہور تھے ۔ شام اس وقت رومی مملکت کا ایک نیم خود مختار صوبہ تھا ۔ اور اس وقت والی شام ہیرود تھا ۔ مسیحی تقویم میں ۴ سال کی غلطی شروع سے چلی آ رہی ہے ۔ اسلئے آپ کا سال ولادت وہ نہیں جس سے مسیحی تقویم شروع ہوئی ہے بلکہ اس سے تین سال بعد کا ہے ۔ اس لحاظ سے کہنا چاہیئے کہ آپ کی ولادت ۳ ق م میں ہوئی ۔ ۳۳ سال کی عمر میں آپ زندہ جو اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق اور مسیحی عقیدہ کے مطابق تین دن کیلئے وفات پا کر آسمان پر اٹھا لئے گئے ۔ مریم ۔ مریم بنت عمران بن ماثان ۔ قوم اسرائیل کے ایک بڑے معزز خاندان سے تھیں اور خود بھی بڑی با عصمت اور خوبصورت تھیں ۔ سال وفات مسیحی روایتوں کے مطابق ۴۸ ء ہے ۔ عیسیٰ بن مریم ۔ ابن مریم کے لفظ میں اشارہ ہے کہ عیسیٰ مسیح اپنی پیمبرانہ عظمت کے باوجود محض بشر ہی تھے ایک عورت کے بطن سے پیدا ۔ خدا یا مثیل خدا یا فرزند خدا وغیرہ کچھ بھی نہ تھے ۔

۳۰۰ روح القدس۔ اسلامی اصطلاح میں مشہور ممتاز و مقرب فرشتہ حضرت جبرئیل کو کہتے ہیں۔ لے جبریل علیہ السلام واطلاق روح القدس علیہ شائع (روح) الروح الامین سمّی بہ جبریل وسمّاہ بروح القدس (راغب) مسیحی اصطلاح میں روح القدس، تثلیث مقدس کے تیسرے اقنوم ثالث کو کہتے ہیں، اسی سے یہاں کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ اصطلاح کے مشترک ہونے سے بعض دفعہ بڑے بڑے مغالطے اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش چونکہ خداوندی مصالح کے مطابق، عام بشری طریق سے الگ، ایک نئے قانون کے ماتحت محض عنصر ملکوتی سے ہوئی تھی، اس لئے عجب کیا جو بعد میں بھی آپ کو مناسبت عالم ملائکہ سے زیادہ رہی ہو۔ اور اسی مناسبت سے استفادہ بھی ملائکہ سے زیادہ ہوتا رہتا ہو۔ ایّدنٰہ میں اشارہ ادھر بھی نکلتا ہے کہ آپ اپنی بشریت کی بنا پر اعانت خداوندی کے محتاج تھے اور وہ اعانت ایک فرشتہ کے ذریعہ سے کرائی جاتی تھی۔ ۳۰۱ (اور اسی طرح کے احکام تو کم وبیش سب ہی پیمبر لائے) مخاطبت انھیں بنی اسرائیل سے ہے۔ بڑے سخن دفعۃً صیغۂ غائب سے صیغۂ مخاطب کی طرف (یا کسی ایک صیغہ سے دوسرے کی طرف) پلٹ دینا صنعت التفات کہلاتا ہے اور عربی ادب وانشاء میں یہ عیب نہیں حسن ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ۳۰۲ (اور اس پیمبر کی اطاعت واتباع سے عار محسوس کرنے لگے) انسان کی یہ شامت شروع سے رہی ہے کہ وحی الٰہی کے مقابلہ میں حاکم وقاضی وہ اپنے ہوائے نفس ہی کو رکھنا چاہتا ہے۔ اور جو احکام اُسے اپنی خواہشوں یا اپنی محدود و ناقص اور جذبات زدہ عقل کے منافی نظر آتے ہیں جھٹ ان کا انکار اور ان کے مقابلہ میں علم بغاوت بلند کر دیتا ہے ——— آج جس چیز کا نام "روشن خیالی" ہے تحلیل کر کے اور خوب غور کر کے دیکھا جائے تو اس کی تہ میں بھی اصلاً صرف یہی ملے گا۔ استکبار نفس اور پیمبر کے اقتدا و اتباع سے عار۔ ۳۰۳ (اور طرح طرح کی ایذا کے درپے ہو گئے) ۳۰۴ جیسے زکریا نبی، یحییٰ نبی وغیرہما تفصیل حاشیہ رکوع ۷ کے ذیل میں گزر چکا۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ کبر ہی اکثر معاصی کی بنیاد ہے چنانچہ یہاں قرآن نے تکذیب انبیاء وقتل انبیاء کو کبر ہی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ۳۰۵ (اور دعوت اسلام ہمارے اوپر کچھ اثر نہیں کر سکتی) یہود فخریہ اور علانیہ کہتے تھے کہ "نئے پیغمبر" کچھ بھی کر ڈالیں ہم اُن کے کہے میں نہیں آنے کے۔ غلف ممکن ہے کہ جمع غلاف کی ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے قلوب گنجینۂ علوم ہیں، معارف موسوی سے لبریز ہیں، ہمیں ضرورت کسی نئی تعلیم کے قبول کرنے کی نہیں۔ ھی جمع غلاف (راغب) لے ھی اوعیۃ للعلم تنبیھا انّا لا نحتاج ان نتعلم منک فلنا غنیۃ بما عندنا (راغب) یہ بھی ممکن ہو کہ یہ اغلف کی جمع ہو۔ اور اغلف کہتے ہیں غیر مختون کو، اس کو جس کا ختنہ نہ ہوا ہو۔ قیل ھو جمع اغلف (راغب) مستعاراً عن الاغلف الذی لم یختن (کشاف) قیل واصلہ ذو القلفۃ الذی لم یختن ہ (روح) "مختون" و "نامختون" کہنے کا محاورہ یہود کی زبان پر عام طور پر چڑھا ہوا تھا کبھی اپنے کو "نامختون" کہتے کبھی اپنے دل و جسم یا کبھی اپنے اعضاء وجوارح کو۔ توریت میں بار بار اس کا استعمال ہوا ہے مثلاً "میں جو نامختون ہونٹ رکھتا ہوں، فرعون میری کیوں کر سنے گا" (خروج ۶ : ۱۲) "تب دل کے نامختون اور جسم کے نامختون اجنبی اولاد کو میرے مقدس میں لائے" (حزقی ایل ۴۴ : ۷) بلکہ کہیں کہیں انجیل میں بھی آیا ہے مثلاً "اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو! تم ہر وقت روح القدس کی مخالفت کرتے ہو" (اعمال ۷ : ۵۱) قرآن کا یہ انداز بیان بھی ایک اعجازی پہلو رکھتا ہے کہ جب یہود کا قول نقل کیا، تو زبان بھی انہیں کی اختیار کی۔ ۳۰۶ قرآن مجید یہود کے فخریہ جواب میں کہتا ہے کہ جس "محفوظیت" پر انہیں اس قدر غرہ ہے یہ کوئی فخر وناز کی چیز نہیں یہ تو ایک نشان ہے صداقت سے ان کے دور ہو جانے اور حق سے ان کے بُعد پیدا ہو جانے کا۔ اور یہی حقیقت ہے لعنت کی۔ لعنت پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ نام ہے رحمت الٰہی سے بُعد و ہجران کا۔ بکفرھم۔ اس میں یہ بتا دیا کہ یہ ملعونیت اور مغضوبیت جو ان پر طاری ہو گی ان کے کفر اختیاری کے باعث ہو گی۔ عناد کے پیمبر سے مخالفت وعناد پر اصرار رکھنے کے باعث ہو گی۔ ب سببیہ ہے۔ لے بسبب کفرھم (ابو سعود) لعنت کا محاورہ توریت میں بہت عام ہے۔ صرف ایک مقام کا اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہو۔ "یہ ساری لعنتیں تجھ پر آتریں گی اور تجھ تک پہنچیں گی۔ تو شہر میں لعنتی ہو گا اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہو گا، تیرا ٹوکرا اور تیرا کٹھرا لعنتی ہو گا، تیرے بدن کا پھل اور تیری زمین کا پھل تیری گائے بیل کی بڑھتی اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہو جائیں گے تو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہو گا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہو گا۔ خداوند ان سارے کاموں میں جن میں تو کرنے کیلئے ہاتھ لگائے تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کریگا۔" (استثناء ۲۸ : ۱۵-۲۰) لعنت انجیل میں بھی منقول ہے حضرت مسیح کی زبان سے، نہ صرف کاہنوں اور فریسیوں کیلئے بلکہ انجیر کے خشک درخت کے لئے بھی ۳۰۷ (اور یہ تھوڑا یا برائے نام ایمان نجات کیلئے کافی نہیں) قلیلاً۔ قلیل یہاں ایمان کی صفت ہے جو ایمان نجات کیلئے ضروری ہے اور جس کا حکم مکلف کو ہے۔ اس کے متعدد اجزاء ہیں۔ یہود کا ایمان جو کچھ بھی تھا صرف ان میں سے بعض پر تھا۔ لے لا یؤمنون الا بقلیل مما کلفوا بہ (کبیر) قلیلاً صفۃ مصدر محذوف لے فایمانا قلیلا یؤمنون (مدارک) ما یؤمنون میں ما مزیدہ ایمان کی قلت پر زور دینے کیلئے لایا گیا ہے یعنی بہت ہی تھوڑا ایمان۔ ما مزیدۃ للمبالغۃ فی التقلیل (بیضاوی) ما مزیدۃ للمبالغۃ (ابو سعود) قلیلاً۔ صفت مومن کی بھی ہو سکتی ہے مفہوم اس صورت میں یہ ہو گا کہ ان میں سے بہت ہی تھوڑے ایمان لاتے ہیں۔ چنانچہ بعض کبار ادھر بھی گئے ہیں۔ لے لا یؤمن منھم الا القلیل (ابن جریر عن قتادۃ) اقال بعضھم فقلیل من یؤمن منھم (ابن کثیر) اور امام رازیؒ نے ترجیح اسی آخری ترکیب کو دی ہے لیکن محاورہ میں قلیل کا استعمال نفی مطلق کے موقع پر بھی ہوتا ہے یجوز ان تکون القلۃ بمعنی العدم (کشاف) معنی اس صورت میں یہ ہوں گے کہ یہ ایمان سے کل خالی ہیں۔ والمعنی فیہ نفی جمیعہ (ابن جریر) معناہ لا یؤمنون اصلاً لا قلیلاً ولا کثیراً (کبیر) ۳۰۸ کتٰب من عند اللہ یعنی قرآن۔ لما معھم۔ یعنی توریت۔ قرآن مجید نے اپنی یہ صفت جا بجا بیان کی ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ بجائے خود صادق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کا مصدق بھی ہے اور ان پچھلی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور توریت ہے۔ ۳۰۹ (کہ عنقریب آخری نبی نجات دہندہ کا ظہور ہونے والا ہے) الذین کفروا سے مراد اس سیاق میں مشرکین عرب ہیں۔ ایک تو مسلم انصاری صحابی سے روایت ہے کہ زمانۂ قبل اسلام میں جب ہم یہود کو شکست دیتے تھے تو وہ کہا کرتے کہ اچھا اخیر جلد عنقریب ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے ہم اس کے ساتھ ہو کر تمہیں قتل کر کے رکھ دینگے (سیرۃ ابن ہشام باب خبر انذار یہود برسول اللہ صلعم) یہود نے حضرت عیسیٰ کے مسیح ماننے سے تو انکار کر دیا تھا لیکن اس کے بعد سے برابر ایک مسیح (نجات دہندہ) کے ظہور کے منتظر رہا کرتے تھے اور اس کا ذکر مشرکین عرب سے کثرت کرتے رہتے یستفتحون یہاں یفتحون کے مرادف قرار دیا گیا ہے اور فتح کے معنی عربی میں خبر دینے اور بیان کرنے کے ہیں۔ لے یعرفون المشرکین ان نبیاً یبعث منھم (روح) لے یفتحون علیھم ویعرفونھم (کشاف) لیکن یستفتحون اپنے عام اور مشہور معنی کے لحاظ سے مفہوم طلب فتح ونصرت کا رکھتا ہے۔ اس صورت میں مراد یہ ہو گی کہ اس کے قبل یہود اس پیمبر نبی کا واسطہ دلا دلا کر خدا سے مدد چاہا کرتے تھے اور اکثر مفسرین کی تشریح یہی ہے اور منقول ہے لے یستنصرون اللہ بمبعث محمد علیہ السلام (راغب) یستنصرون بمحمد علی العرب (ابن عباسؓ) ومعنی الاستفتاح الاستنصار (ابن جریر) یسألون الفتح والنصرۃ (کبیر) ۳۱۰ (اور اسی کا انکار کرنے لگے کہ یہ کلام کلام الٰہی ہے یا یہ شخص اللہ کا پیمبر ہے) ما عرفوا سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور ذات رسالت بھی۔ حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے کہ جس کتاب کا تحمل لانے والا تھا (ان یراد بہ النبی صلعم (روح) مقصد یہ ہے کہ یہود اس آخری نبی اور اسکی نبوت کی علامتوں سے اپنے ہی دینی نوشتوں کے ذریعہ سے خوب واقف ہو چکے تھے۔ نبی کا علم اور اسکے حال اور ان کے علاوہ واقفیت سابق کے بغیر نہیں ہوا۔ انجیل یوحنا میں حضرت یحییٰ نبی کی زبانی بیان ہے۔ نام بھی یوحنا ہی ہے کہ ظہور کا حال یوں درج ہے:۔ "جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لیوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے اس سے کہا کہ پھر تو ہے کون؟" (یوحنا ۱ : ۱۹-۲۲) اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہود یوں تین کو ایک جانے بوجھے ہوئے نبی "وہ نبی" کے منتظر بیٹھے تھے۔ ۳۱۱ یعنی ان پر جان بوجھ کر عناد و تعصب کی راہ سے کفر و انکار کر بیٹھیں لعنت پر ایک حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔ ۳۱۲ یعنی کیسی بری وہ حالت ہے جسے اختیار کر کے وہ بزعم خود اپنی جانوں کو عقوبت آخرت سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ شرعاً باعوا حظ انفسھم لے اختاروا الکفر وبذلوا انفسھم للنار (معالم) اشتراء لغات اضداد میں سے ہے خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں بیچنے کے معنی میں ہے۔ الاشتراء ھھنا بمعنی البیع (معالم) معناہ باعوا (بیضاوی)

بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا

روح القدس کے ذریعہ سے (تائید کی) سو کیا جب کبھی کوئی پیمبر تمہارے پاس ان (احکام) کے ساتھ آیا جو

تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَ

تمہارے نفس کو نہ بھائے تو تم اکڑنے لگے پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور

فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۸۷ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ

بعض کو تم قتل ہی کرنے لگے اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں (نہیں) بلکہ

لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۸۸ وَ

اللہ نے ان پر لعنت کر رکھی ہے ان کے کفر کے باعث سو وہ ایمان بہت ہی تھوڑا رکھتے ہیں اور

لَمَّا جَاۗءَھُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

جب ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے پہنچ گئی تصدیق کرنیوالی اسکی جو ان کے پاس

مَعَھُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَي

(پہلے ہی موجود) ہے اور اس کے قبل یہ (خود ہی) کافروں سے بیان کیا کرتے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ښ فَلَمَّا جَاۗءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا

تھے پھر جب ان کے پاس وہ آگیا جس کو (خوب) پہچانتے تھے تو اسی کا کفر

بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۸۹ بِئْسَمَا

کر بیٹھے سو اللہ کی لعنت ہو کافروں پر بری ہے وہ چیز

اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ

جس کے عوض میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا یہ کہ انکار کرتے ہیں اس (کلام) کا جو اللہ نے

۳۱۳ قرآن نے اس حقیقت کو بار بار صاف کیا ہے کہ یہود کا یہ کفر و انکار کسی اجتہادی غلطی کی بنا پر، فکر و نظر کے کسی دھوکے یا مغالطہ کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس غصہ و عناد کا نتیجہ تھا کہ نبوت خاندان اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کو کیوں مل رہی ہے؟ —— وہی نسلیت یا قومیت کی ملعون عصبیت جو آج تک دنیا پر مسلط ہے۔ امام رازیؒ کی خداداد نظر قرآن حکیم کے عجب عجب نکتوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس مقام پر لکھا ہے کہ یہود تو نبوت کو اپنا موروثی حق سمجھنے لگے تھے۔ ایک عرب کو اس کا مدعی پا کر اُلٹے اس کے رشک و حسد پر اُسے محمول کرنے لگے۔ ظنوا ان هذا الفضل العظيم بالنبوة المنتظرة يحصل فی قومهم فلما وجدوه فی العرب حملهم ذٰلك على البغي والحسد (کبیر) کیا حد ہے اس عناد و نفسانیت کی کہ نسلی و خاندانی عصبیت کی بنا پر تصدیق نبوت تک سے انکار کر دیا! من فضله میں فضل سے مراد فضل وحی ہے یعنی الوحي (بیضاوی)۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ احوال موہوب و فضل و بخشش کے پیچ ہوتے ہیں کسب و اکتساب کو دخل نہیں۔ ۳۱۴ بغضب على غضب کی تفسیر میں بہت سے اقوال نقل ہوئے ہیں ان میں سے ایک قول تابعی حضرات سے منقول یہ ہے کہ یہود کی پہلی مغضوبیت کی بنیاد رسالت عیسوی کا انکار ہے اور دوسری مغضوبیت کی بنیاد رسالت محمدی کا انکار۔ وهو قول الحسن والشعبي وعكرمة وابي العالية وقتادة (کبیر) یہ تفسیر بھی اپنی جگہ پر بہت خوب ہے لیکن اس سے بھی زیادہ دلنشین اور بے تکلف قول یہ ہے کہ پہلا عتاب ان کے بالکل بلا وجہ اور بلا دلیل واضح و صریح کی موجودگی میں انکار و تکذیب رسالت پر ہے اور دوسرا عتاب ان کے جذبات حسد و عناد پر۔ لانهم كفروا بنبي الحق وبغوا عليه (کشاف) للكفر والحسد (بیضاوی) بما اقترفوا من الكفر والحسد (روح) یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ مقصود کلام غضب کی تکرار نہیں بلکہ اس کی تاکید اور اشدیت ہے۔ المراد به تأكيد الغضب وتكثيره (کبیر) ويحتمل ان يراد الترادف والتكاثر لاغضبان (روح) ۳۱۵ عذاب الٰہی نہایت شدید و الیم ہونا تو ظاہر ہی ہے پھر اس عذاب کی بنا چونکہ یہود کی قومی منافرت و نسلی عصبیت ہے اس مناسبت سے یہ سزا اُن کے غرور کو توڑنے والی، ان کی توہین، ذلت و رسوائی کو بڑھانے والی بھی ہوگی۔ ۳۱۶ (اپنے بندہ اور آخری رسول محمدؐ پر)۔ ذکر وہی بنی اسرائیل کا چل رہا ہے۔ انہیں سے کہا جاتا تھا کہ آخری آسمانی قرآن پر ایمان لاؤ۔ ۳۱۷ (اور وہ ہمارے لئے بالکل کافی ہے) انزل علينا۔ ہمارے اُوپر یعنی ہماری قوم و نسل کے اُوپر نازل ہوا ہے۔ یہود کا کہنا یہ تھا کہ ہم کوئی سلسلۂ وحی یا سلسلۂ رسالت کے منکر تھوڑے ہی ہیں، ہم بھی تو مومن ہی ہیں اور اپنی نسل اسرائیل کے انبیاء کے قائل ہیں۔ ۳۱۸ یہ یہود کے قول کا تتمہ ہے۔ قرآن مجید نے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ لوگ اپنے اسرائیلی سلسلہ کے باہر کسی اور نبوت کے قائل نہیں، ایک عرصہ تک الطاف الٰہی و عنایات خداوندی کے مورد خاص بنے رہنے، اور اسی نسل کے اندر انبیاء کے سلسل پیدا ہوتے رہنے سے بنی اسرائیل کے دل میں یہ جم گیا تھا کہ نبوت خاندان اسرائیل کے باہر جا ہی نہیں سکتی۔ ۳۱۹ هو الحق ضمیر هو قرآن کی جانب ہے۔ اس کی حقانیت دلائل سے ثابت اور شواہد سے روشن ہے۔ مصدقا لما معهم یعنی وہ تصدیق کرتا ہے توریت اور انبیاء بنی اسرائیل کے دوسرے صحیفوں کی۔ قرآن یہاں یہود کے مقابلہ میں اپنے دو وصف بیان کر رہا ہے۔ (۱) ایک یہ کہ وہ فی نفسہٖ حق ہے۔ اس کی حقانیت دلائل سے ثابت ہے۔ اسلئے اس پر ایمان لانا بجائے خود واجب ہے۔ (۲) توریت اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں کے ساتھ اس کا تعلق منافات کا نہیں۔ اس کا رشتہ اتحاد و تصدیق کا ہے۔ ۳۲۰ تیسرا جواب قرآن مجید نے یہود کو یہ دیا کہ خود یہی دعویٰ تمہارا کب صحیح ہے کہ تم اپنی قوم کے انبیاء پر ایمان رکھتے ہو؟ ایمان و تصدیق الگ رہی، تم نے خود اس زور و شور سے ان کی تکذیب کی اور ان کی مخالفت و عداوت پر اس حد تک اُتر آئے کہ انہیں قتل تک کر ڈالا۔ اور تمہاری قومی تاریخ کے تو صفحات رنگین ہیں انبیاء کے خون سے۔ اسرائیل اور قتل انبیاء پر مفصل حاشیے (رکوع ۷) کے ذیل میں گزر چکے۔ بائبل کے اُن حوالوں کے علاوہ ایک حوالہ اور ملاحظہ ہو۔ نحمیاہ نبی کے زمانہ میں خود اکابر بنی اسرائیل اپنے باپ دادوں سے متعلق مناجات میں کہتے ہیں:—

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ

اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ

نازل کیا ہے محض اس ضد پر کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا

مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ

اپنا فضل (خاص) نازل کیا ہے ۳۱۳ سو وہ مستحق ہو گئے غضب بالائے غضب کے ۳۱۴ اور

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا

کافروں کے لئے عذاب ذلت والا ہے ۳۱۵ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ

بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ

اس کلام پر جو اللہ نے نازل کیا ہے ۳۱۶ تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر تو ایمان رکھتے ہیں جو ہمارے اُوپر نازل ہوا ہے ۳۱۷

يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا

اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اس سے کفر کرتے ہیں ۳۱۸ حالانکہ وہ خود بھی حق ہے اور اس کی بھی تصدیق کرنے والا ہے

مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ

جو ان کے پاس ہے ۳۱۹ آپ کہئے کہ اچھا تو تم اس کے قبل انبیاء کو کیوں قتل کرتے رہے ہو، اگر

قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۱ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ

تم واقعی ایمان والے تھے؟ ۳۲۰ اور موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے

مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

نشان لے کر آئے ۳۲۱ اس پر بھی تو تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا ۳۲۲

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۹۲ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ

اور تم تو ہی ہو ظالم ۳۲۳ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا تھا

منزل ۱

"وہ نافرمانبردار نکلے اور تجھ سے پھر گئے۔ اور انہوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو اُن کو نصیحت دیتے تھے کہ انہیں تیری طرف پھرا لائیں قتل کیا اور انہوں نے اپنے کاموں سے تجھے غصہ دلایا۔" (نحمیاہ۔ ۹: ۲۶) ۳۲۱ (اور اُن کھلے ہوئے نشانوں کا اثر طبعی طور پر یہ ہونا چاہئے تھا کہ تم خدا کی طاعت اور نبی کی اطاعت میں دل سے لگ جاتے) حضرت موسیٰؑ کے کھلے ہوئے نشانات اور معجزات جو فرعون کے مقابلہ میں تھے، عصا، ید بیضا وغیرہ، وہ تو مشہور ہی ہیں لیکن جا بکہ سے اشارہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ معجزات موسوی خود بنی اسرائیل کیلئے بھی تھے۔ ۳۲۲ (پرستش کیلئے) یہ ہے تمہارے دعویٰ توحید کی حقیقت! گوسالہ پرستی پر حاشیے (رکوع ۶) کے ذیل میں گزر چکے۔ ثم یہاں محض تاخر زمانی کیلئے نہیں، بلکہ یہ بھی ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ تم کیسی پستی میں اُتر گئے۔ اور یہ کہ تم نے یہ اس وقت کیا جب تمہارے پاس دلائل و شواہد اس کے خلاف پہنچ چکے تھے۔ ثم للتراخي في الرتبة والدلالة على نهاية قبح ما صنعوا (ابو سعود) كلمة ثم للاستبعاد (روح) من بعده۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے زمانہ میں۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت اپنی قوم کو میدان میں چھوڑ کر ستر منتخب افراد کے ہمراہ کوہ طور پر گئے ہوئے تھے تفصیلات رکوع (۶) کے ذیل میں گزر چکیں۔ ۳۲۳ (اپنے حق میں) یعنی تمہاری تاریخ گواہ ہے کہ تم اپنی جانوں پر اپنی رُوحوں پر ظلم کرنے کے کیسے عادی ہو! یہ گویا جوابات سابق کا تتمہ ہے۔ اسرائیلیوں سے ارشاد ہو رہا ہے کہ اور زمانوں میں تو خیر تم نے جو کچھ کیا، خیر وہ تو کیا ہی، شرک تو تم نے خود حضرت موسیٰؑ ہی کے زمانہ میں شروع کر دیا۔ اور شرک بھی کیسا جلی۔ گوسالہ پرستی! اور وہ بھی پیمبرؑ کی صرف چند روزہ غیر حاضری کے زمانہ میں! تمہارے لئے مانع نہ اُن کے لائے ہوئے نشانات اور دلائل ہو سکے۔ اور نہ یہ امر کہ وہ تو ابھی زندہ و سلامت موجود ہیں۔ غرض کہ نافرمانیوں میں دلیر تم آج سے نہیں، مدت دراز سے ہو۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

اور تمہارے اوپر کوہِ طور کو بلند کیا تھا ۳۲۴ کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے ۳۲۵ اسے مضبوطی

وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۤ وَاُشْرِبُوْا فِيْ

کے ساتھ پکڑو اور سنو ۳۲۶ یہ لوگ بولے تھے کہ ہاں ہم نے سن تو لیا مگر ہم نے مانا نہیں ۳۲۷ اور ان کے

قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۭ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ

دلوں میں گوسالہ ان کے کفرِ سابق کے سبب پیوست ہو گیا تھا ۳۲۸ آپ کہہ دیجئے کیسی بری ہے وہ بات جس کا

اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۳ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ

حکم تمہارا ایمان تمہیں دے رہا ہے، اگر تم (واقعی) ایمان والے ہو ۳۲۹ آپ کہہ دیجئے کہ اگر

الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ

عالمِ آخرت خاص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کو

النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۹۴

چھوڑ کر ۳۳۰ تو موت کی آرزو کر دیکھو اگر تم سچے ہو ۳۳۱

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ

لیکن وہ اس کی آرزو ہرگز کبھی بھی نہ کریں گے بسبب ان اعمالِ بد کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں ۳۳۲ اور

عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۹۵ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ

اللہ ظالموں سے (خوب) واقف ہے ۳۳۳ اور آپ انہیں زندگی پر حریص سب لوگوں سے

عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ

بڑھ کر پائیں گے ۳۳۴ (یہاں تک کہ) مشرکوں سے بھی بڑھ کر ۳۳۵ ان میں سے ایک ایک یہ

۳۲۴ (تمہارے اوپر) نزولِ شریعت کے وقت (اس پر حاشیہ رکوع ۸ میں گزر چکا)۔ ۳۲۵ یعنی یہ احکام و شرائع جو ابھی تم پر نازل کئے ہیں۔ ۳۲۶ (ان احکام و شرائع کو گوشِ دل سے سنو، اور ان پر عمل کرو) لے اقبلوا ما سمعتم (بحر) قال الماتریدی معنی اسمعوا اقبلوا (بحر) وقیل اعملوا (بحر) ۳۲۷ آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ عَصَيْنَا (ہم نے نہیں مانا) ان لوگوں نے زبان سے بھی کہا ہو۔ قال ابو مسلم وجائز ان یکون المعنی سمعوه وتلقوه بالعصیان فیعبر عن ذلک بالقول وان لم یقولوه (کبیر) یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول یہاں بطور مجاز، زبانِ حال کے معنی میں استعمال ہوا ہے، نطقِ لسانی مراد نہیں۔ قیل یعبر بالقول للشیء عما یفهم به من حاله وان لم یکن نطق (بحر) وقیل للمعنی قالوا بلسان الحال عصنا وبلسان المقال سمعنا (روح) چونکہ واقع میں یہ بات دل سے تھی، اس لئے گویا زبانِ حال سے یہی کہہ رہے تھے (تھانوی) قول کا لفظ یوں بھی عربی زبان میں نہایت وسیع معنی رکھتا ہے۔ زبان سے ادا کرنا ہرگز اس کیلئے لازمی نہیں۔ راغب نے اپنے مفردات میں خود قرآن ہی سے اس کے متعدد معنی نقل کئے ہیں، اور چوتھے نمبر پر اس کے ضمن دلالتِ حالی لکھے ہیں اور ایک شاعر کا مصرع بھی سند میں پیش کیا ہے۔ یقال للدلالۃ علی الشیء نحو قول الشاعر۔ امتلأ الحوض وقال قطنی اور تاج العروس میں سیبویہ وغیرہ ائمہ لغت کے حوالہ سے اس سے بھی زیادہ وسیع معنی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن گراں سرکشوں اور گستاخوں نے یہ لفظ زبان سے بھی نکالا ہو تو اُن کی عادی اور مسلسل نافرمانیوں کو دیکھتے ہوئے تعجب ذرا سا بھی نہیں۔ یرمیاہ نبی کے صحیفہ میں ایک تصریح بالکل اس سے ملتی جلتی گو ایک دوسرے موقع کیلئے موجود ہی ہے:۔ "خداوند یوں کہتا ہے کہ راہوں پر کھڑے ہو اور دیکھو اور پرانے رستوں کی بابت پوچھو کہ بھلی راہ کہاں ہے؟ اسی میں چلو کہ تم اپنے جیوں میں آرام پاؤ گے۔ پر انہوں نے کہا کہ ہم اس میں نہ چلیں گے، اور میں نے تمہارے اوپر نگہبان بھی ٹھہرائے، اور کہا کہ نرسنگے کی آواز سنو۔ پر انہوں نے کہا کہ ہم نہ سنیں گے۔" (یرمیاہ۔ ۶: ۱۶، ۱۷) ۳۲۸ بچھڑے بیل کے تقدس کا اعتقاد اسرائیلی قوم میں مدت دراز تک قائم رہا (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۴)۔ اشربوا فی قلوبهم۔ مراد یہ ہے کہ گوسالہ کی محبت ان کی رگ رگ میں رچ گئی تھی، جیسے پانی رگ رگ میں پہنچ کر جزوِ بدن بن جاتا ہے۔ مشروب یہ استعارہ شدید محبت اور شدید نفرت دونوں موقعوں پر اہلِ عرب کی زبان میں عام ہے۔ وان من عادتهم اذا ارادوا العبارة عن مخامرة حب او بغض استعاروا الی اسم الشراب لانه ابلغ انجاع فی البدن (راغب) یا یہ استعارہ رنگ سے ہو کہ وہ بھی کپڑے کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ کما یداخل الثوب الصبغ (کشاف) کما یتداخل الصبغ الثوب والشراب اعماق البدن (بیضاوی) بکفرهم۔ ب سببیہ ہے یعنی ان کے کفر کے باعث، نتیجۂ کفر کے طور پر۔ الباء للسبب ای الحامل لهم علی عبادة العجل هو کفرهم السابق (بحر) ۳۲۹ حجتِ الزامی ہے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں، گویا قرآن کا کہنا یہ ہے کہ دعویٰ تو یہ کہ ہم صاحبِ ایمان و توحید ہیں، اور عمل یہ کہ گوسالہ کی تنزیہ و تقدیس میں لگے ہوئے ہو، کیا اچھا تمہارا ایمان ہے! ۳۳۰ (جیسا کہ تم اپنے زعم و پندار میں سمجھے ہوئے ہو) اسرائیل کے اس بنیادی عقیدہ کا ابتدائی خاکہ تو خود موجودہ توریت میں موجود ہے، مثلاً "تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو" (استثناء۔ ۱۴: ۱) "تو خداوند اپنے خدا کے لئے مقدس قوم ہے، اور خداوند نے تجھ کو چن لیا، تاکہ سب قوموں کی نسبت جو زمین پر ہیں، تو اس کیلئے خاص قوم ہو" (استثناء۔ ۱۴: ۲) رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ترقی کر کے اس درجہ تک پہنچ گیا کہ یہود اپنے سوا کسی اور کو جنت کا مستحق ہی نہیں سمجھتے تھے اور نجاتِ اُخروی کو اپنا مخصوص حق سمجھنے لگے تھے۔ اپنے کو خدا کا محبوب اور خدا کا لاڈلا اور چہیتا فرزند قرار دینے لگے تھے اور خیال یہ جما لیا تھا کہ خداوند خدا کا جو معاملہ ہماری قوم و نسل کے ساتھ ایک ناقابلِ تبدیل طور پر ہے وہ دنیا جہان میں کسی اور کے ساتھ نہیں ــــ نسلی تقدیس کی یہی وبا ہے جو ہندوستان میں برہمنیت کے نام سے جلوہ گر ہے۔ الدار الاٰخرة عند الله۔ مراد ہے جنت اور نجات کا حاصل ہونا۔ دون الناس۔ ناس سے مراد نوعِ انسانی ہے اور دون الناس سے مراد اپنی قوم و نسل کی خصوصیت کا اظہار اور اس میں دوسروں کی شرکت سے انکار ہے۔ دون هنا لفظ یستعمل للاختصاص وقطع الشرکة (بحر) ۳۳۱ (اپنے اس دعویٰ میں کہ ہماری نجات یقینی اور قطعی ہے) قدیم مفسرین نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ یہی مطالبہ یہود بھی تو اُلٹ کر مسلمانوں اور رسول اللہ صلعم سے کر سکتے تھے اور پھر اپنے اپنے مذاق پر اس کے جوابات دیئے ہیں لیکن حقیقۃً یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کوئی مسلمان کب اپنی نجات کو محض مسلمان گھرانے میں پیدا ہو جانے سے یقینی سمجھتا ہے؟ مسلمان تو خود ہی ایمان اور عملِ صالح کے ذمہ دار ٹھہرے۔ اختیاری معیار سے ڈرتا، لرزتا رہتا ہے کہ دیکھا چاہیئے حشر میں اس امتحان میں پورا اُترتا بھی ہے یا نہیں، یہ اطمینان اور یہ زعم کہ چونکہ ہم فلاں گھرانے، فلاں خاندان میں پیدا ہو گئے ہیں اسلئے بغیر کسی جہد و اکتساب کے ہماری نجات تو یقینی ہو چکی، یہ عقیدہ اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص تھا، مسلمان اس کے قریب ہی کب گیا جو یہ سوال اس پر عائد ہو سکے؟ اسلام تو اس نسلی تقدیس اور اس اضطراری نجات کے مٹانے کیلئے ہی ہے۔ مسلمان تو خود ہی کہتا ہے کہ مجھے اپنا انجام نہیں معلوم، میں ایمان اور طاعت کی راہ اپنی طرف سے اختیار کر کے آگے فضلِ خداوندی کا منتظر ہوں۔ مسلمان کے سامنے اس سوال کو پیش کرنے کا کوئی محل ہی نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ مطالبہ ہر اسرائیلی سے ہر زمانہ کیلئے ہے بھی نہیں۔ اس کا دائرہ صرف انہیں معاند یہود کے ساتھ مخصوص ہے جو رسول اللہ صلعم کے معاصر تھے اور سارے شواہد کے بعد بھی آپ کے منکر تھے۔ وهذا خاص بالمعاصرین له صلی الله علیه وسلم (روح) یہ تفسیر خود صحابی حضرت سے مروی ہے بلکہ حضرت ابن عمرؓ نے تو اپنے زمانہ کے ایک گستاخ یہودی کے جواب میں یہ مضمون بڑی حدت و شدت کے ساتھ ادا کیا ہے۔ توهم هذا الکلب اللعین الجاهل ان هذا لکل یهودی او للیهود فی کل وقت لا انما هو لاولئک الذین کانوا یعاندون ویجحدون نبوة النبی صلی الله علیه وسلم بعد ان عرفوا (روح) مرشد تھانوی نے فرمایا کہ موت کی محبت، خواہ طبعی ہو یا عقلی، ولایت کی علامتوں میں سے ہے۔ ۳۳۲ یعنی ان کا دل خود چور ہے۔ ان کا ضمیر ان پر ملامت کر رہا ہے۔ تقاضۂ ایمان کا کوئی ولولہ کوئی جذبہ ان میں باقی ہی کہاں ہے، جو یہ عالمِ آخرت کی تمنا کر سکیں۔ ابدًا۔ احتجاج بالاجب صرف یہود معاصرینِ رسول کے ساتھ مخصوص ہو گیا، تو ابدًا کے معنی بھی لازمی طور پر یہ ہوں گے کہ یہ اپنی زندگی بھر ایسا نہ کریں گے۔ ومعنی بالابد هنا ما یستقبل من زمان اعمارهم (بحر) ای لن یتمنوه ما عاشوا (روح) ۳۳۳ یعنی ان لوگوں سے جو اپنے ہتھکنڈوں سے خود اپنے حق میں ظلم کرتے رہتے ہیں۔ الظلم هو تجاوز ما حد الله (بحر) ۳۳۴ یعنی ان کی زندگی پر حریص جو پلیدی اور گندگی سے لبریز ہے۔ زندگی سے محبت اور موت سے وحشت تو ایک حد تک طبعی ہے اور ان طبعی حدود کے اندر ہرگز اسلام میں کوئی ملامت نہیں لیکن یہود کا جذبۂ حُبِّ دنیا طبعی حدود سے تجاوز کر گیا تھا۔ دنیا پرستی مقصود بالذات بن گئی تھی۔ اور روحانیت کا ذوق بالکل مُردہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں بھی جن قوموں نے جنتر منتر وغیرہ ظاہری رسوم میں غلو اور اُن پر تکیہ کر رکھا ہے۔ اُن کے دل بھی ذوقِ آخرت سے یکسر محروم ہو چکے ہیں۔ اور یہود کی حُبِّ دنیا تو ضرب المثل آج بھی ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں تالمود وغیرہ کے حوالہ سے اس مضمون کے متعدد قول نقل ہوئے ہیں کہ دنیوی زندگی بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے، مصیبت گوارا کر لینا چاہیئے لیکن موت نہ گوارا کرنا چاہیئے، وقس علی ہذا۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ ۳۳۵ (جو بیچارے کتابِ آسمانی اور پیامِ انبیاء کی دولتوں سے محروم ہیں) مطلب یہ ہے کہ مشرکین تو سرے سے اُخروی نعمتوں کے لذت شناس ہی نہیں، وہ اگر اُدھر سے غیر ملتفت ہو کر اپنا مرکزِ توجہ و محورِ زندگی اسی مادی زندگی کو بنائے رکھیں، تو کچھ ایسا حیرت انگیز نہیں، غضب تو یہ یہود کر رہے ہیں جو اپنے آسمانی صحیفوں اور پیغمبرانہ ہدایتوں کے باوجود بھی مشرکوں سے بڑھ کر دنیا سے لپٹے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب بات اسی سلسلہ میں یہ ہے کہ طولِ عمر کے جو عجب عجب نظریئے آج یورپ میں قائم ہو رہے ہیں اور طرح طرح کی تدبیریں اور نسخے اس کیلئے ایجاد ہو رہے ہیں، ان میں سب سے زیادہ پیش پیش یہودی ہی ڈاکٹر اور اہلِ سائنس ہیں۔

۳۳۶ احدھم ضمیر ھم کا مرجع یہود ہیں اے یود احد الیھود (ابن کثیر عن السدی) البعض نے مرجع الذین اشرکوا کو ٹھہرایا ہے لیکن سیاق قولِ اوّل کو صاف ترجیح دے رہا ہے۔ کما یدل علیہ نظم السیاق (ابن کثیر) **۳۳۷** بالفرض اس قدر طویل زندگی حاصل بھی ہوگئی تو آخر کیا نتیجہ؟ بہرحال خاتمہ تو ایک روز اس طویل سے طویل زندگی کا بھی ہوتا ہے۔ اور پھر اُسی مواخذۂ اخروی کا سامنا۔ سو ایسی لایعنی اور لغو تمناؤں کے پھیر میں پڑے رہنا کسی دیندار شخص کیلئے ممکن ہی کیونکر ہے **۳۳۸** اور ہر طرح کی جزا و سزا پر قادر ہے) خدا تعالیٰ کی ہمہ بینی، ہمہ دانی، ہمہ توانی کا استحضار انسان کو راہِ راست پر قائم رکھنے کے باب میں اکسیر ہے۔ انسان غفلت و معصیت کی طرف قدم اسی وقت رکھتا ہے جب ذہن سے ایک حاضر و ناظر حاکم کا تصور غائب ہوتا ہے۔ یہی راز ہے اس کا کہ قرآن مجید میں اللہ کی صفات ہمہ بینی و ہمہ دانی کی یاددہانی اس کثرت و تکرار کے ساتھ ہوئی ہے۔ **۳۳۹** جبریل۔ اسلامی اصطلاح میں ایک فرشتۂ اعظم کا نام ہے۔ ان کے سپرد ایک اہم خدمت انبیاء کرام تک وحیِ الٰہی کے پہنچانے کی ہے۔ انسان بڑے سے بڑا مقبول انسان بھی بہرحال بشری ہوتا ہے، اور جسم خاکی ہی رکھتا ہے۔ اس کے محدود اور کثیف خاکی قویٰ علی العموم اتنا تحمل نہیں رکھتے کہ براہِ راست تجلیاتِ لاہوتی کی شعاعوں کو قبول کر سکیں۔ اس غرض کیلئے عموماً لطیف الجسم نور کے بنے ہوئے فرشتوں سے سفارت و توسط کا کام لیا جاتا ہے۔ یہود بھی وجودِ ملائکہ کے قائل تھے، بلکہ خود حضرت جبریلؑ کو بھی ایک فرشتۂ اعظم مانتے تھے اور ان کا ذکر توریت میں آج تک موجود ہے لیکن اپنی نادانی سے خیال یہ جما لیا تھا کہ وہ ایک فرشتۂ عذاب ہیں۔ ان کا کام وحی لانا نہیں عذاب لانا ہے، اور وحی لانے کا کام ایک دوسرے فرشتہ حضرت میکائیلؑ کا ہے۔ اپنی اس خود ساختہ عقیدے کا تعلق کے بعد وہ رسول اللہ صلعم پر معترض ہوتے تھے کہ یہ نئے مدعی نبوت اپنی وحی کے سلسلہ میں نام حضرت جبریل کا کیوں لیتے ہیں ——— یہاں تعرض یہود کی اسی غلط اندیشی کو کیا جا رہا ہے۔ موجودہ توریت میں بار بار ذکر ایک ایسے فرشتہ کا آتا ہے جو لوگوں کو مارتا تھا۔ (۲۔ سموئیل ۲۴: ۱۶، ۱۷) اور علمائے یہود نے اس سے مراد فرشتہ جبریل ہی سے رکھی تھی۔ آج بھی یہود حضرت جبریلؑ کو حضرت میکائیل کا ہمسر و ہم پایہ نہیں، ان سے کمتر ہی سمجھتے ہیں۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۵ صفحہ ۵۳۱)

۳۴۰ (پھر اُن سے مخالفت و عداوت و بدگمانی کے کیا معنی؟) یہاں یہود کے جہل کو رفع کیا گیا، اور بتایا گیا کہ حضرت جبریلؑ کے نام سے چڑھنا کیا معنی، وہ تو خدا کے ایک معتمد سفیر ہیں، اور خدمتِ سفارت پر مامور۔ باذن اللہ۔ اذن کے معنی لغت میں علاوہ اجازت کے حکم یا ارشاد کے بھی ہیں ویکون باذنہ اے بامرہ (راغب) ویکون الاذن امراً (تاج) چنانچہ یہاں بھی اذن اللہ سے مراد اللہ کا حکم یا ارشاد ہی ہے۔ اے باذن اللہ (معالم) فالاظہر بامر اللہ (کبیر) اے بامرہ (بیضاوی) **۳۴۱** یہاں کلام مجید نے اپنے تین وصف متعین طور پر بیان کئے۔ ایک یہ کہ وہ گزشتہ انبیاء اور سابق صحیفوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کا پیام کوئی نرالا اور انوکھا نہیں، وہی توحید کا پرانا سبق ہے جو سارے سلسلۂ وحی میں مشترک رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ فی نفسہٖ ایک ہدایت نامہ ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ اہلِ ایمان کے حق میں مایۂ بشارت ہے **۳۴۲** یعنی جو شخص بھی اللہ یا اس کے پیمبروں یا اس کے فرشتوں، خصوصاً جبریلؑ و میکائیلؑ جیسے مقرب فرشتوں سے وہ رشتہ و تعلق قائم رکھتا ہو جو ان کے مرتبہ و احترام کے منافی ہے۔ عدوّ عربی میں بطور مصدر بھی آتا ہے اور اس معنی میں یہ ضد ہے دوستی و محبت کا۔ منافاۃ الالتیام (راغب) دوسرا استعمال اس کا بحیثیت اسم کے ہے جیسا کہ یہاں ہے، اور اس معنی میں یہ مقابل ہے دوست کے۔ العدو المتخصص ضد الصدیق (تاج) اور اس کے مفہوم میں محض عداوت نہیں بلکہ انکار، نافرمانی، حق ناشناسی، غرض دوستی و محبت کے منافی جو کچھ ہے سب داخل ہے۔ میکال یا میکائیل بھی جبریلؑ کی طرح ایک فرشتۂ مقرب کا نام ہے۔ مشہور روایت میں آیا ہے کہ ان کے ذمہ مخلوق کی رزق رسانی اور بارش ہے گویا جس طرح احکام تشریعی کیلئے واسطۂ خاص حضرت جبریلؑ ہیں، احکام تکوینی کیلئے واسطۂ خاص میکائیل ہیں۔ پہلے کا تعلق خاص بارگاہِ الوہیت سے ہے، دوسرے کا کارگاہِ ربوبیت سے۔ توریت میں ان کا ذکر بڑے تعظیمی لہجہ میں موجود ہے۔ یہود نے اپنے سارے تعلقات انہیں سے جوڑ رکھے تھے اور انہیں اپنا قومی محافظ سمجھتے تھے۔ یہود نے جب حضرت جبریلؑ کے حاملِ وحی ہونے سے انکار کیا تھا (ملاحظہ ہو حاشیہ ۳۳۹) تو اپنی عداوت و رغبت کا محل انہیں دو فرشتوں کا نام لیکر کیا تھا۔ اسی مناسبت سے قرآنی جواب میں بھی تصریح انہیں دونوں کے نام کی ہے۔ اور ساتھ ہی جیسا کہ قرآن مجید کا عمومی دستور کسی واقعۂ خاص سے ایک ہدایتِ عام بیان کر دینے کا ہے، ایک عام قاعدہ تمام معصوموں (یعنی انبیاء و ملائکہ) سے متعلق بیان کر دیا گیا۔ و۔ اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ حرفِ واؤ ہمیشہ عطف و جمع ہی کیلئے نہیں آتا، بلکہ یا کے معنی بھی کبھی دیتا ہے۔ تکون بمعنی أو (قاموس) چنانچہ یہاں چاروں جگہ اسی معنی میں ہے یعنی ان اسماء کا مجموعہ مراد نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ جو کوئی ان میں سے کسی ایک کا بھی مخالف ہے۔ یعنی من کان عدواً لاحد ھؤلاء انہ عدو للکل (معالم) یعنی من کان عدواً لاحد من ھؤلاء (کبیر) **۳۴۳** یعنی ایسا ہر شخص کافر سمجھا جائیگا اور اس کے ساتھ معاملہ وہ کیا جائیگا جو دشمن کے ساتھ دشمن کرتا ہے۔ فقہاء نے آیت سے نکالا ہے کہ معصوموں کی اطاعت عین اطاعتِ الٰہی، اور معصوموں کی مخالفت عین مخالفتِ حق ہے۔ فرشتہ کی اطاعت توریت میں بھی عین اطاعتِ رب بتائی گئی ہے۔ ”دیکھ میں ایک فرشتہ تیرے آگے بھیجتا ہوں کہ راہ میں تیرا نگہبان ہو، اور تجھے اس جگہ جو میں نے تیار کی ہے لے آئے۔ اس کے آگے ہوشیار رہ اور اس کا کہا مان۔ اُسے مت چڑھا، کیونکہ وہ تیری خطا نہ بخشے گا کہ میرا نام اُس میں ہے۔ پر اگر تو سچ مچ اس کا کہا مانے اور سب جو میں کہتا ہوں کرے تو میں تیرے دشمنوں کا دشمن اور تیرے بیریوں کا بیری ہونگا“ (خروج ۲۳: ۲۰–۲۱) یہ بھی کہا گیا ہے کہ خلفائے راشدین و صحابۂ رسول جن کے فضائل گویا تواتر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں، ان کی مخالفت و عداوت بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ مُرشد تھانوی نے فرمایا کہ اہل اللہ سے عداوت رکھنا خود اللہ تعالیٰ کی عداوت کا سبب بن جاتا ہے۔ **۳۴۴** (آپ کی صداقت اور نبوت کے) یعنی ایک تو قرآن خود ایک معجزہ ہے، پھر دوسرے تائیدی شواہد و دلائل، بشارات و معجزات۔ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ سے مراد آیاتِ قرآنی بھی ہو سکتی ہیں، یہ جن جن عظیم تعلیمات کی حامل ہیں، ان پر نظر کرکے بعض محققین نے یہی پہلو اختیار کیا ہے۔ الاظہر ان المراد اٰیات القرآن الذی لا یاتی بمثلہ الجن والانس (کبیر) لیکن لفظ اٰیات ہے عام و وسیع، اسلئے دوسرے بزرگوں نے سارے اقوال کو جمع کرکے لکھا ہے کہ اس سے مراد بھی کچھ ہے، قرآن بھی، معجزات بھی، کتب سابقہ پر اطلاع بھی، معجزات سابقہ پر اطلاع بھی، قرآن کا قانونی نظام بھی۔ وقس علی ہذا۔ اے القراٰن والمعجزات المقرونۃ بالتحدی علی الحق فی الکتب السابقۃ او النرائع او الفرائض (مجموعہ کل ما تقدم (بحر)) یہود جو اپنے پیمبروں کے معجزات کی روایتوں کے خوب عادی ہو چکے تھے بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ یہ کیسے نبی ہیں، نبی ہیں تو کوئی نشانی تو دکھلائیں۔ جواب ملا کہ تم ایک نشانی کو کہتے ہو، ہم تو انہیں متعدد نشانات (صیغۂ جمع) لئے چکے ہیں اور وہ بھی دقیق و مخفی نہیں، نمایاں و روشن، سب کو نظر آ جانے والے۔ **۳۴۵** یعنی ان شواہد صریح اور دلائل روشن سے انکار کوئی فطرتِ سلیم والا تو کرتا نہیں، بس وہی لوگ کرتے ہیں جو قانونِ الٰہی کے توڑتے رہنے اور شرائعِ ربانی سے بغاوت کرنے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ انجیل میں یہود کی قساوتِ قلب کے سلسلہ میں ہے کہ مسیح نے ”اگرچہ اُن کے سامنے اتنے معجزے دکھائے تو بھی وہ اُس پر ایمان نہ لائے“ (یوحنا ۱۲: ۳۷) **۳۴۶** خدا یا اس کے کسی نبی کی اطاعت کا، ذکر انہیں عصیان پیشہ یہود کا چل رہا ہے **۳۴۷** بنی اسرائیل کی تاریخ، غداری، عہد شکنی، نافرمانی، سرکشی کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ توریت کے صفحے، انجیل کے ورق، قدیم مؤرخین یہود جوزیفس وغیرہ کے دفتر سب اسی سرگزشت سے لبریز ہیں اور یہاں اشارہ ان کی اسی قومی خصوصیت کی جانب ہے **۳۴۸** (اپنے کسی عہد و پیمانِ اطاعت کا، یعنی ایفائے عہد تو الگ رہا) ان میں بہت سے اسی کے قائل نہیں ملتے کہ کبھی اطاعت کا عہد و پیمان کیا بھی تھا۔ گویا ایمان، لایؤمنون میں اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں لغوی معنی میں ہے۔ لایؤمنون کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ایمان کو ایمان اصطلاحی کے مفہوم میں لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ لوگ خود اپنی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان کب رکھتے ہیں۔ لایصدقون بکتابھم (کبیر) لایؤمنون بالتوراۃ (مدارک) ماحصل دونوں صورتوں کا یہی ہے کہ وہ پاسِ عہد خصوصاً آخری نبی کی تصدیق کرنے کے عہد کا اپنے کو پابند ہی کب سمجھتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ

اور جب اُن کے پاس پیمبر اللہ کی طرف سے آئے تصدیق کرتے ہوئے اس (کتاب) کی جو

لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

انکے پاس موجود تھی ۳۴۹ تو ان اہل کتاب میں سے ایک جماعت نے کتاب اللہ کو

كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا

اپنی پشت کے پیچھے پھینک مارا ۳۵۰ گویا وہ جانتے ہی (نہ) تھے

يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى

نہیں ۳۵۱ اور یہ لوگ پیچھے لگ لئے ۳۵۲ اُس (علم) کے جو سلیمان کی بادشاہت میں شیطان

مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ

پڑھا کرتے تھے ۳۵۳ اور سلیمان نے تو کبھی کفر نہیں کیا ۳۵۴ البتہ شیطان (ہی) کفر کیا کرتے

الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ

تھے ۳۵۵ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے ۳۵۶ اور وہ

اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ

پیچھے لگ لئے ۳۵۷ اُس (علم) کے بھی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتارا گیا تھا ۳۵۸

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ

اور وہ دونوں کسی کو بھی (اس فن کی باتیں) نہیں بتلاتے تھے ۳۵۹ جب تک یہ کہہ دیتے ۳۶۰ کہ ہم تو بس ایک

فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا

ذریعہ امتحان ہیں ۳۶۱ سو تم کہیں (کفر نہ) اختیار کر لینا ۳۶۲ مگر لوگ ان دونوں سے وہ (سحر) سیکھ ہی لیتے

۳۴۹ یعنی کتاب توریت کی۔ یہود کو بتایا یہی جا رہا ہے کہ نئے نبی جو آئے ہیں یہ تمہاری کتاب اور اسکے دین کو مٹانے کیلئے نہیں۔ یہ تو بلکہ اسے تازگی بخشنے، اسے حیاتِ تازہ دینے کے لئے آئے ہیں۔ رسول۔ یہ کس پیمبر کے آنے کا ذکر ہے؟ جائز ہے کہ رسول کو مطلق رسول کے معنی میں لیا جائے، اور مراد اس سے کوئی بھی پیمبر سمجھ لیا جائے۔ یعنی ابھی یہود کی عام عادت تکذیبِ انبیاء، رسل کے لحاظ سے صحیح ہیں۔ لیکن ترجیح اس پہلو کو ہے کہ یہاں مراد رسول موعود، نبی آخر الزماں ہیں۔ اور رسول کا صیغہ نکرہ میں ہونا اس کے منافی نہیں۔ صیغہ نکرہ جس طرح تنقیص کے لئے آتا ہے عظمت و تکریم کے لئے بھی آتا ہے، اور وہی یہاں مقصود ہے۔ والتنکیر للتعظیم (ابوسعود) ۳۵۰ نبذوہ وراء ظهورهم کتاب کے پس پشت پھینک دینے سے محاورہ میں مراد اسکی طرف سے بے التفاتی برتنے اور اسکی عملی مخالفت کرنے سے ہے۔ لمطرحوه بقلة اعتدادهم به (راغب) مثل يضرب به دراء الظهر استغناءً عنه وقلة التفات اليه (کشاف) کتاب اللہ سے یہاں کیا مراد ہے؟ یہود کی بے التفاتی اور بے تعلقی قرآن سے تو ظاہر ہی تھی، اور یہ کوئی بات ایسی ذکر کرنے اور توجہ دلانے کی بھی نہ تھی۔ غضب یہ تھا کہ قرآن و صاحبِ قرآن سے مخالفت کی دھن میں خود اپنی کتاب آسمانی کی طرف سے بھی وہ بے پروا اور بے تعلق ہو گئے تھے۔ کہ آخر توریت میں بھی تو نبی آخر الزمان کی بابت پیشگوئیاں، ان کی علامتیں اور ان پر ایمان لانے کی تاکید درج تھی۔ اس لئے محققین نے ترجیح اس کو دی ہے کہ کتاب اللہ سے یہاں مراد توریت ہے۔ یعنی التوراة (کشاف) قیل انه القرآن وقیل انه التوراة وهذا هو الاقرب (کبیر) و یعنی بقوله کتاب اللہ التوراة (ابن جریر عن السدی) ۳۵۱ گو اس کتاب کے اندر بھی کوئی مضمون اس قسم کا موجود ہے) لایعلمون ما فی التوراة من الامر باتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم وتصدیقه (ابن جریر) ۳۵۲ ذکر اسرائیلیوں کا چل رہا ہے۔ اور وہی یہاں مراد ہیں۔ خصوصاً یہود عرب ۳۵۳ یعنی بجائے اسکے کہ وحی الٰہی کا اتباع کرتے اور رسولِ برحق کی تصدیق کرتے، یہ یہود تو ایک اور ہی علم کے پیچھے لگ گئے، اور وہ علم بھی کس کا؟ شیطان کا۔ قرآن مجید وقت کی اہم ترین قوم یہود کے پتر سے کھول ہی رہا ہے۔ اب اس نے انکی فردِ جرم میں ایک اس عنوان کا بھی اضافہ کیا کہ یہ لوگ وحی الٰہی کی اتباع کے بجائے ایک دوسرے ہی سفلی علم میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس ضمن میں قرآن مجید بعض اور اہم تاریخی اور دینی حقیقتوں کو زبردست روشنی میں لے آیا ہے۔ اس علم سے مراد فنِ سحر ہے۔ فنونِ سحر و کہانت میں یہود کی مہارت تاریخ میں مسلّم چلی آرہی ہے۔ انکے اکابر و مشاہیر اس کا برابر اعتراف کرتے آئے ہیں بلکہ اکثر فخر کے ساتھ۔ قرآن مجید نے اکثر تاریخی حقائق کی طرح ان کی تفصیلات میں گئے بغیر یہاں بھی صرف اشارہ کر دینا کافی سمجھا ہے۔ یہود کا یہ شوق ان کی قدیم تاریخ سے قطع نظر رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں بھی تمام تھا۔ آکسفرڈ یونیورسٹی کا یہودی النسل و یہود خصلت پروفیسر مارگولیس آنجہانی جس کی اسلام دشمنی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اپنی انگریزی سیرتِ رسول میں عام یہود عرب کے سلسلہ میں لکھتا ہے۔ "یہ لوگ فنِ سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدانِ جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے" ص ۱۸۹ اصل عبارت اور مزید حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ اور ہمارے مفسرین نے بھی اس سحر پرستی میں یہود عہدِ سلیمانی اور یہود عہد محمدی کو شریک سمجھا ہے۔ قیل یہود زمان سلیمان وقیل یہود زمانہ او اللفظ فہم عام ولجمیعهم فعل وقن کان الکل منهم متبعاً لهذا الباطل (ابن جریر) شیاطین۔ جب صیغہ جمع میں ہے، تو ظاہر ہے کہ ابلیس تو یہاں مراد ہو نہیں سکتی۔ اہلِ لغت اور اکابرِ اہلِ تفسیر دونوں کی جانب یہ ہے کہ شیطانوں سے مراد یہاں خبیث و سرکش قسم کے جنات ہیں جو حضرت سلیمان کے تابع تھے۔ لے مردة الجن (راغب) المراد شیاطین الجن وهو قول الاکثرین (کبیر) والمتبادر من الشیاطین مردة الجن وهو قول الاکثرین (روح) وهم المتمردون من الجن (ابوسعود) لیکن خود جنات کیا ہیں؟ جنات سے مراد وہ صاحبِ شعور و ادراک ہستیاں ہیں جن کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے اور جو انسانی آنکھ کو عموماً اور عادۃً نظر نہیں آتے۔ انسان کی طرح وہ بھی مکلف ہیں گو یہ ضرور نہیں کہ ان کی شریعت بھی جزئیات و تفصیلات کے لحاظ سے شریعتِ انسانی ہو ——— اس آتشیں مخلوق کا وجود دلائلِ نقلی و شواہد سے پوری طرح ثابت ہے۔ اور اس وجود سے انکار پر کوئی ایک دلیل بھی قائم نہیں، نہ عقلی نہ نقلی۔ بعض کا قول ہے کہ مراد شیاطینِ انس ہیں، یعنی وہ سرکش و خبیث انسان جو حضرت سلیمان کے خلاف بغاوت میں پیش پیش تھے، اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے، اور سحر و کہانت کے بھی ماہر تھے۔ فرقۂ معتزلہ کے متکلمین کا رجحان اسی معنی کی طرف ہے۔ قیل شیاطین الانس وهو قول المتکلمین من المعتزلة (کبیر) راغب لغوی نے بھی معنی جس طرح سرکش جنات کے جائز رکھے ہیں اسی طرح سرکش انسانوں کے بھی۔ فهم مردة الجن ویصح ان یکونوا هو مردة الانس ایضاً (راغب) اور مفسرین اہلِ سنت نے بھی گنجائش دونوں کیلئے رکھی ہے۔ الشیاطین من الجن او الانس او منهما (بیضاوی) وهو یرید شیاطین الجن والانس (جصاص) اگر انسان ہی مراد لئے جائیں یعنی دربارِ سلیمانی کے باغی سردار و سرغنہ، تو ان کا مفصل ذکر عہد عتیق کے بعض صحیفوں میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو (سلاطین باب ۱۱) علی ملک سلیمٰن۔ یعنی آپکے عہدِ حکومت میں۔ علیٰ۔ صرف استعلاء کیلئے نہیں، بلکہ مصاحبت تعلیل وغیرہ کی طرح ظرفیت کیلئے بھی آتا ہے۔ اور فی کے معنی میں اسکا استعمال عام ہے۔ ابن جریر جو عربیت کے بھی امام ہیں لکھتے ہیں:۔ والعرب تضع فی فی موضع علی وعلی فی موضع فی اور عرب فی کا استعمال علی کی جگہ پر کرتے ہیں اور علی کا استعمال فی کے موقع پر۔ اور اتقان (سیوطی) میں اس معنی کی تصریح ہے اور اہلِ لغت لکھتے ہیں:۔ کان ذٰلک علی عهد فلان لے فی عهد فلان (تاج) فلاں واقعہ علی عہد فلاں ہوا، اسکے معنی ہوتے ہیں "فی عہد فلاں ہوا"۔ خود قرآن مجید میں بھی علیٰ ایک دوسری جگہ صاف فی کے معنی میں آیا ہے۔ ودخل المدینة علی حین غفلة (قصص ع ۲) لے فی حین غفلة۔ چنانچہ یہاں بھی اہلِ تحقیق نے یہی معنی لئے ہیں کہ سلیمان کے عہدِ حکومت میں۔ لے علی عهد سلیمٰن (ابن کثیر) لے فی عهد ملکه (ابوسعود) لے فی عهد سلیمان (ابن جریر) لے فی ملکه وعهده (معالم) سلیمٰن۔ سلیمان بن داؤد (۱۰۳۳ ق م تا ۹۷۵ ق م تقریباً) اسرائیلی سلسلہ کے ایک نامور پیمبر گزرے ہیں اور اپنے والد ماجد ہی کی طرح، لیکن ان سے بڑے تاجدار بھی شام و فلسطین کے علاوہ آپکے حدودِ حکومت مشرق کی سمت میں عراق کے دریائے فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحدِ مصر تک وسیع تھے۔ آپکی سلطنت کی عظمت و شوکت پر دوست دشمن سب کو اتفاق ہے ——— اسلام میں اعلیٰ ہو اعلیٰ روحانی و اخلاقی مرتبہ یعنی نبوت و رسالت کے ساتھ جس طرح فقر و مسکنت جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح دولت و امارت، حکومت و ریاست بھی۔ اسلام کا خدا غریبوں اور امیروں، ناداروں اور زرداروں سب کا یکساں خدا ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح ان یہود کے آباؤ اجداد عہدِ سلیمانی میں شیطانی مشغلوں (سحر و کہانت) میں لگے رہے اسی طرح آج خود بھی بجائے نبی کی ہدایتوں پر چلنے کے انھیں سفلی مشغلوں میں پڑے ہوئے ہیں ۳۵۴ جیسا کہ ناسپاسوں، کافروں، افترا پردازوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ آیت کے اس مقام پر پہنچ کر مومن کے قلب میں ذرا کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ یہ کہنے والی کون سی بات تھی جو قرآن نے فرما دی؟ جب حضرت سلیمان پیمبر برحق تھے، تو یہ تو کھلی ہوئی اور موٹی سی بات ہے کہ آپ شائبۂ کفر و شبہۂ کفر سے بمراحل دور تھے پیمبر کے حق میں یہ نازل ہونا کہ وہ کفر سے بری تھے، یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی، جیسے کسی ملک کا بادشاہ یہ فرمان جاری کر کے رعایا کو بتائے کہ ہمارا نائب السلطنت باغی و غدار نہیں ہے۔ کھٹک بجا ہے۔ قرآن مجید کبھی کوئی چھوٹا سا بیان بھی بے ضرورت نہیں دیتا۔ اگر یہاں قرآن کو اس اعلان و اعلام کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کا علم سادہ دل مسلمان کو کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا علم تو اسکے مبین و مہمدان پروردگار ہی کو ہو سکتا تھا۔ سلیمان کو پیغمبر ماننے والی دو قومیں مسلمانوں سے پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ یہ دونوں وہی ہیں جو اہلِ کتاب کہلاتی ہیں، یعنی یہود و نصاریٰ۔ ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو آپکی عظمت و پیمبری کے قائل ہیں، اور دوسری طرف اسکے نامۂ اعمال میں گندے سے گندے جرائم بھی ڈال دیئے ہیں! ایمان تک کہ کفر و شرک بھی! اگر اللہ کی عدالت میں کوئی جرم اس سے بڑھ کر ہو، اس کے برابر بھی سنگین تصور میں نہیں آ سکتا۔ یہودی قصص و حکایات اور مسیحی آثار و روایات کی کتابوں کو چھوڑیئے۔ خاص الخاص بائبل یعنی عہدِ عتیق کے صحائف، جن پر یہود و نصاریٰ دونوں کا ایمان ہے، انہیں ملاحظہ فرما لیجیے کہ اس مجموعہ میں آج تک کیا تصریحات لکھی چلی آ رہی ہیں:۔ "جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اسکی جوروؤں نے اسکے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا، اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا" (۱ سلاطین۔ ۱۱:۴)

یعنی محض غفلت یا عدم اعتنا کی بنا پر عملی کوتاہی یا معصیت نہیں، صریح بدعقیدگی۔ توحید ہی کی طرف سے بے یقینی! ——— آگے اور ملاحظہ ہو۔ "سو ایسا ہوا کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے
حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے۔ پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔" (۱۔ سلاطین۔ ۱۱: ۹، ۱۰) معاذ اللہ۔ خدا کا پیمبر اور کفر و شرک میں مبتلا! چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی! دنیا سینکڑوں سال تک، ہزار ڈیڑھ ہزار سال
تک، انہیں یہودیانہ تحریفات و اختراعات کا شکار ہو کر اس برگزیدۂ اعظم کو نعوذ باللہ کافر و مشرک سمجھتی رہی۔ یہاں تک کہ قرآن آیا جو ہر قوم ہر زمانہ کے سچے پیمبروں کی عزت و ناموس کا محافظ ہے۔ اور اس نے آکر یقین نہ کرنے والی دنیا کے سامنے آکر اعلان کیا
کہ سلیمان کو معاذ اللہ کافر کہتے ہو! وہ تو کفر کے قریب تک نہیں گئے تھے! قرآن کی صدائے حق فضا میں بلند ہو کر خاموش ہو گئی۔ جن کے کان تھے انہوں نے سُنا۔ دنیا اپنے کاروبار میں لگی رہی، پھنسی رہی۔ بابل والوں نے بابل کی پرستاری نہ چھوڑی۔
یہاں تک کہ ۱۳، ۱۳½ صدیاں اور گزر گئیں، اور اب قدرتِ حق کا اعجاز دیکھئے کہ اب جو محققانہ و فاضلانہ کتب جوامع و حوالہ جات بابل ہی کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی اور شائع ہو رہی ہیں وہ تائید اور تصدیق کلامِ بابل کی الزام دہی کی نہیں، قرآن کے
جواب صفائی کی کر رہی ہیں! انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، برطانوی کاوش و تحقیق کا لب لباب ہوتا ہے۔ اسکے سب سے آخری ایڈیشن میں مقالہ زیر عنوان سلیمان نکال کر دیکھئے، صاف یہ مضمون ملے گا۔ "سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے۔"
(جلد ۲۰، صفحہ ۹۵۰ طبع چہاردہم) انسائیکلوپیڈیا بائبلیکا، خاص مسیحی ہی فضلاء اور پرستارانِ بائبل کی تحقیق و تدقیق کا ثمرہ ہے۔ اس میں تو یہاں تک ہے کہ بائبل کی جو آیتیں ابھی اوپر نقل ہو چکی ہیں، ان کا حوالہ دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کو
بڑھائی گئی ہیں، اور الحاقی ہیں! اور پھر لکھا ہے۔ "یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں، اسرائیلی بھی غیر اسرائیلی بھی۔ لیکن انہوں نے نہ تو سب کے لئے قربان گاہیں ہی تیار کرائیں، اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں
کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا۔" (کالم ۴۶۸۹) خیر یہ اعجاز تو کلام الٰہی کا تھا۔ اس سے بڑھ کر

يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ
جس کو وہ جدائی ڈالدیتے درمیان مرد اور اس کی زوجہ کے ۳۶۱ حالانکہ وہ (فی الواقع) کسی کو
بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ
بھی اس کے ذریعہ سے نقصان نہ پہنچا سکتے مگر ہاں ارادۂ الٰہی سے ۳۶۲ اور یہ وہ چیز سیکھتے
مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ
ہیں جو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہے اور انہیں نفع نہیں پہنچا سکتی ۳۶۳ اور (یہ بھی) یہ خوب جانتے ہیں کہ
اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۟ؕ وَلَبِئْسَ
جس نے اسے اختیار کر لیا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۳۶۴ اور بہت ہی بری
مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾
وہ چیز ہے جس کے عوض میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے ۳۶۵ کاش وہ اتنا ہی جانتے ہوتے ۳۶۶
وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ
اور اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے، تو اُس کا ثواب اللہ کے ہاں
اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يٰٓاَيُّهَا
کہیں بہتر ہوتا کاش وہ (اتنا) جانتے ہوتے اے
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا
ایمان والو "راعنا" مت کہا کرو ۳۶۷ اور "انظرنا"
انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾
کہا کرو اور سنتے رہا کرو ۳۶۸ اور کافروں کے لئے عذاب دردناک ہے ۳۶۹

ع ۱۲/۱۲

منزل ۱

بھی ہوتا تو ہو سکتا تھا۔ لیکن محدود و ناقص عقل اور زمان و مکان سے مقید علم رکھنے والے بندوں نے
اپنی ایمانی فراست و اشراقیت سے جو کام کر دکھایا ہے، وہ بھی اعجاز سے کچھ کم نہیں۔ رئیس المفسرین امام ابن جریر
آج کے نہیں، آج سے ایک ہزار سال قبل کے شخص ہیں، اور یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے شاید زیادہ واقف بھی نہ
ہوں گے، اس وقت اپنی تفسیر میں یہ روایت بصراحت درج کر گئے ہیں کہ آیت بالا یہود ہی کے گندے
عقائد اور افتراء کے رد میں نازل ہوئی ہے جو آپس میں کہتے تھے کہ ان نئے مدعی نبوت کی نادانی تو دیکھو، کہ ابن داؤد کو
قال بعض احبار الیہود الا تعجبون من محمد یزعم نبی اللہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ بخدا
ان ابن داؤد کان نبیًا واللہ ما کان الا ساحرًا فانزل وہ تو بس ایک ساحر تھا۔ اللہ نے انہیں کے قول
اللہ فی ذلک من قولہم وما کفر سلیمن الخ کے رد میں یہ آیت نازل کی ہے۔ وما کفر سلیمٰن الخ
۳۵۵ اور اسے منسوب حضرتؑ کی جانب کر دیتے تھے) ان شیطانوں کی (خواہ وہ جن ہوں یا انس) ایک
شیطنت یہ بھی تھی کہ اپنی کافرانہ ساحرانہ حرکتوں کی نسبت حضرت سلیمانؑ کی جانب کر دیتے تھے، اور شہرت
یہ دے دیتے تھے کہ ہم تو جو کچھ کر رہے ہیں، ان کی رضامندی بلکہ انکے اشارہ ہی سے کر رہے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ
اللہ کے نبی برحق کو ان گندگیوں سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ قرآن کریم نے کس کس طرح دوسری امتوں کے انبیاء کی طرف
سے صفائی پیش کی ہے، انھیں کے امتیوں کے لگائے ہوئے داغ دھبے ان کی پاک سیرتوں سے دور کئے ہیں۔
اور یہ ناشکر گزار قومیں ہیں کہ الٹی قرآن ہی کی دشمنی پر تلی ہوئی ہیں! ۳۵۶ سحر نام ہے اسبابِ خفی (مثلاً
تاثیر کواکب، استعانت شیاطین الجن وغیرہ) سے کام لیکر تصرفاتِ عجیب کرنے کا۔ خاص خاص شقتوں اور ریاضتوں
سے یہ فن حاصل ہو جاتا ہے۔ مشرک جاہل قوموں میں اس کا رواج پہلے بھی زور شور سے رہ چکا ہے۔ اب بھی ہے۔
شریعتِ اسلام نے اسے حرام قرار دیا۔ یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ۔ یعلمون کا فاعل شیاطین ہونا ظاہری ہے۔
اکثر مفسرین نے اسی ترکیب کو اختیار کیا ہے اور یہاں بھی ترجمہ اسی لحاظ سے کیا گیا۔ لیکن اسکی بھی گنجائش ہے
کہ فاعل بجائے شیاطین کے یہود ہی کو قرار دیا جائے، یعنی فریق من الذین اوتوا الکتٰب کو۔ معنی اس صورت
میں بجائے ماضی کے حال کے ہو جائیں گے۔ یعنی یہ یہود لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے ہیں سحر کی۔ سحر و کہانت
تاریخ بنی اسرائیل کا ایک مسلم و ناقابلِ انکار جزو ہے۔ خود عہد عتیق کے صحیفوں میں اس کی شہادت موجود
ہے۔ "انہوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا اور فال گیری اور جادوگری کی.....
ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر نپٹ غصہ ہوا، اور اپنی نظر سے انہیں گرا کر دور کر دیا۔" (۲۔ سلاطین ۱۷: ۱۷، ۱۸)
۳۵۷ بیان انہیں یہود عرب کا چل رہا ہے۔ واؤ عاطفہ کبھی فقرہ کو فقرہ سے
جوڑتا ہے، کبھی لفظ کو لفظ سے، اور کبھی فقرہ کو لفظ سے۔ یہاں فقرہ وما انزل علی الملکین کا عطف
ہے فقرہ ماقبل ماتتلوا الشیٰطین پر، اور دونوں فقرے تابع ہیں فعل اتبعوا کے۔ گویا تقدیر کلام یوں ہے
واتبعوا ماتتلوا الشیٰطین الخ واتبعوا ما انزل علی الملکین۔ بعض نے ما انزل الخ کا عطف السحر پر مانا

ہے۔ عطف علی السحر وقیل ہو عطف علی ماتتلوا ای واتبعوا ما انزل (کشاف) معنی میں کوئی بڑا فرق اس سے بھی نہیں پڑتا۔ اور حاصل دونوں صورتوں میں ایک ہی رہتا ہے۔ قرآن جو کچھ بھی کہتا ہے حق مطلق کی شان بے نیازی کے ساتھ بالکل بے خوف اور
بے دھڑک کہتا ہے۔ اُسے کسی خارجی سہارے کی تلاش نہیں ہوتی۔ خارجی سہارے از خود اسکی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اُسے اپنی جگہ پر اطمینان کامل ہے کہ اسکے کسی بیان میں تردید کی گنجائش نہ ہوگی، شک و تردد کا احتمال بھی کسی طالب حق کو نہیں ملے گا۔ یہود عرب
کی طول طویل فرد جرم اوپر سے مسلسل چلی آرہی ہے۔ ابھی ابھی ذکر انکے فلسطینی سحر کا آچکا ہے، (سلیمان نبی بادشاہ فلسطین کے تھے، انکے عہد کا سحر فلسطینی ہی سحر کہا جائیگا) اب یہ بھی کہے ڈالتا ہے کہ یہ توحید کے پرانے امانت دار اور کتاب و سنت کے قدیم تدریس میں
یہی نہیں کہ عہد سلیمانی کے شیاطین جن و انس کی روایات سحر و کہانت کا حق ادا کر رہے ہیں، بلکہ اس فلسطینی سحر کے علاوہ بابل یا عراق کے بھی سحر کے وارث بنے ہوئے ہیں! مدعی ہیں علم و فضل، دین و روحانیت کے لیکن عملاً غرق ہیں فنونِ سحر کے انواع
و اقسام میں! تاریخ قدیم کے جاننے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ عہد رسالت و طلوع اسلام سے صدیوں قبل قوم بنی اسرائیل دو مستقل حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک ٹکڑا وہ جو بخت نصر کے ہاتھوں جلاوطنی یا جبری ہجرت کے بعد کلدانیہ یا بابل (موجودہ عراق)
میں رہ پڑا تھا اور وہیں بس گیا تھا۔ دوسری شاخ وہ جو ایک مدتِ دراز کے بعد وہاں سے واپس آکر پھر فلسطین میں آباد ہو گئی ——— آیت اس تاریخی حقیقت کو فاش کر رہی ہے کہ عہد رسالت کے معاصر یہود عرب جامع ہیں فلسطینی اور بابلی دونوں
قسم کے رذائل و خباثت کے۔ تاریخ قدیم کے یہ نازک دقائق اور اپنی جگہ پر بالکل مسلّم و مستند حقائق، جو عام طور پر اچھے اچھے اہل علم کے علم میں بھی نہیں، ادا کرائے جا رہے ہیں، کسی مؤرخ اعظم کی زبان سے نہیں، عرب کے ایک اُمّی کی زبان سے! اللہ اللہ!
۳۵۸ (کسی خاص حکمت و مصلحت کے ماتحت) دو باتوں کا اس سلسلہ میں استحضار رہے تو انشاء اللہ آیت کی تفسیر میں کوئی الجھن ذہن میں پیدا نہیں ہونے پائے گی:۔ ایک یہ کہ نزول و انزال کا اطلاق صرف احکام تشریعی میں نہیں ہوتا، امور تکوینی میں بھی برابر ہوتا رہتا
ہے۔ دوسرے یہ کہ تکوینیات کے سلسلہ میں جو کام جیسا بھی لیا جاتا ہے، اسکے لئے واسطہ اور وسیلہ بہرحال فرشتے ہی ہوتے ہیں۔ اور یہ امر ان کی نزاہت و معصومیت کے ذرا بھی منافی نہیں۔ ما انزل میں ما موصولہ ہے الذی کے معنی میں۔ بعض نے ما کو نافیہ قرار
دے کر ما انزل کا عطف ما کفر سلیمان پر کیا ہے۔ لیکن محققین نے اسکے قبول کرنے سے انکار کیا ہے اور ابن جریر میں اس پر مفصل گفتگو موجود ہے۔ ثم شرع ابن جریر فی رد ہذا القول وان ما بمعنی الذی واطال القول فی ذلک (ابن کثیر) ظاہر ان
موصولۃ (بحر) عطف علی السحر ای یعلمونہم ما انزل علیہما (ابو سعود) الجمہور علی ان ما بمعنی الذی (مدارک) انزل۔ اللہ کی طرف سے "مادی" صرف کتاب و حکمت، وحی و الہام ہی نہیں ہوتا، قحط، بیماری، موت سب کا نزول و انزال بحیثیت مسبب
الاسباب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔ محاورۂ قرآنی میں انزال کا لفظ رزق (روزی) ماء (پانی) لباس (پوشاک) حدید (لوہے) انعام (چوپائے) کے سلسلہ میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ یہاں تک کہ رجز (عذاب یا بلا) کیلئے بھی یہی لفظ

مراد مستعمل ہوا ہے۔ انا منزلون على اهل هذه القرية رجزا من السماء (عنکبوت۔ آیت ۳۴) سو جن لوگوں نے نزولِ سحر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب کرنا اسکی تقدیسیت کے منافی سمجھا وہ خود ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک سحر ہی پر کیا موقوف ہے کائنات میں تمام اچھا برا، حق و باطل، ایمان و کفر، طاعت و معصیت جو کچھ بھی موجود ہے سب کا وجود تکوینی حیثیت سے مسبب الاسباب ہی کے نازل کرنے سے تو ہوا ہے۔ انزال یہاں اپنے اسی وسیع معنی میں ہے یعنی انہیں یہ بات بتادی گئی، ان کے دل میں یہ ڈال دیا گیا۔ کوئی اظہار شرف و تکریم مقصود نہیں۔ الانزال بمعنى التعليم والالهام (سلام) الانزال اما على ظاهره او بمعنى القذف في قلوبهما (روح) قلنا كل خير او شر او طاعة او معصية او ايمان او كفر منزل من عند الله تعالى (ابن عربی) انزل لے قدرت في قلوبهما مع النهي عن العمل (مدارک) الانزال بمعنى الخلق لا بمعنى الايصال (ابن کثیر) الملكين۔ لفظ کی قراءت مشہور مَلَکین (بہ فتح لام) ہے۔ القراءة المشهورة بفتح اللام (کبیر) لیکن دوسری قراءت مَلِکین (بہ کسر لام) کی بھی صحابہ و تابعین ہی کے زمانہ سے چلی آرہی ہے، ابن عباسؓ، ضحاک، حسن بصریؒ کی روایت ہے۔ قرأ الحسن بكسر اللام وهو مروي ايضا عن الضحاك وابن عباس (کبیر) چنانچہ اسی دوسری قراءت کی بنا پر مفسرین اسی طرف چلے گئے ہیں کہ یہ دونوں اصلاً فرشتے نہ تھے، بشر تھے اور بادشاہ، اور انہیں جو دوسری روایتوں میں فرشتہ کہا گیا ہے، تو وہ محض مجازاً ہے یعنی ان کے صفات ملکوتی کی بنا پر۔ قيل رجلان سميا ملكين باعتبار صلاحهما (بیضاوی) لیکن جمہور کا قول وہی قراءت مشہور کی بنا پر ان کے فرشتہ ہونے کا ہے۔ ذهب كثير من السلف الى انهما كانا ملكين من السماء وانهما انزلا الى الارض (ابن کثیر) اور نظام تکوینی میں فرشتوں کے اوپر حقیقتِ سحر کا نزول ان کی نزاہت کے ذرا بھی منافی نہیں، خصوصاً جب کہ ان پر اس فن کے الہام کے جانے سے مقصود ہی تمامتر اصلاح خلق تھا یعنی لوگوں کو سحر و کہانت سے بچانا، نہ کہ اس پر آمادہ کرنا ——— مجسٹریٹوں کو، پولیس کے افسروں کو جرائم سے علمی واقفیت حاصل کرتے کس نے نہیں دیکھا ہے؛ ظاہر ہے یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ خود کوئی جرم کریں، بلکہ اس لئے کہ اپنی علمی واقفیت کو مجرموں کے ارتکاب جرم سے باز رکھنے میں کام میں لائیں۔ بابل۔ بابل جس قدیم ملک کا نام ہے، وہ موجودہ نقشہ اور جغرافیہ میں عراق عرب کہلاتا ہے۔ ملک کے پایۂ تخت کا بھی یہی نام تھا۔ شہر بابل دریائے فرات کے کنارے واقع تھا، موجودہ بغداد سے کوئی ۵۰ میل سمت جنوب میں۔ تقریباً وہیں جہاں آج ہلّہ کی آبادی ہے۔ شہر بہت بڑا تھا، رقبہ میلوں کا تھا۔ ملک اپنے عروج کے زمانہ میں بڑا سرسبز شاداب، خوشحال، مہذب و متمدن رہ چکا ہے۔ نہروں، پانی کے نلوں، شاہی قصر و ایوان، زبردست قلعوں کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ ان سے اتنا تو بہرحال ثابت ہو جاتا ہے کہ ملک میں ماہرین انجینیوں کی کمی نہ تھی۔ دجلہ و فرات دو دو مشہور دریا اسکے علاقہ کو سیراب کرتے تھے۔ سلطنت کے عروج کا زمانہ تخمینی طور پر ۲۲۵۰ ق م سمجھا گیا ہے۔ ملک کی ایک خاص شہرت علوم سحر، عملیات سفلی اور جنتر منتر کے لحاظ سے تھی جنہیں آج انگریزی میں Occult Sciences (علم پر اسرار) کہتے ہیں۔ اسی ملک کا ایک دوسرا قدیم نام کالدیا (کلدانیہ) ہے۔ اور انگریزی میں آج تک لفظ کالڈین (کلدانی) ساحر کا مرادف چلا آرہا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں اس ملک کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ ذکر اس ملک کی عظمت کا بھی اور اسکی بدعملیوں تباہ کاریوں کا بھی۔ ملاحظہ ہو صحیفہ دانی ایل ۴: ۳۰، مکاشفہ ۱۱: ۵، ۱۸: ۳۰ وغیرہا۔ لیکن اس فہرست جرائم کا عنوان اول سحر کاری تھا۔ بائبل کی شہادت ملاحظہ ہو:- "تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے۔ تیری جادوگری سے زمین کی ساری قومیں گمراہ ہو گئیں۔ اور نبیوں اور مقدسوں اور زمین کے ان سب مقتولوں کا خون اس میں بہایا گیا" (مکاشفہ ۱۸: ۲۳ و ۲۴) "پرانے کتبے اور نوشتے آج جو کچھ دریافت ہوئے ہیں ان کی متفقہ شہادت ہے کہ دین بابلی کا جزو اعظم سحر و کہانت، جنتر منتر، ٹونے ٹوٹکے تھے۔ بابلی مذہب کا جزو اعظم سحر و کہانت کے انواع و اقسام ہیں ... بابلی مذہب کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو ہر طرف کہانت کے منتری نظر آئینگے" (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، جلد ۲، ص ۳۱۸) ایک اور فاضل کی تحقیق ہے:- "مذہب بابل و نینوا کا جزو اعظم بھوت پریت کا ماننا جھاڑنا تھا" (جاسٹرو کی ریلیجن آف بابیلونیا اینڈ اسیریا ص ۲۳۸) یہ جرائم پیشہ کہانت دوست قوم جب ۵۳۸ ق م میں شہنشاہ ایران کے ہاتھوں برباد و منتشر ہوئی تو جہاں جہاں گئی اپنے ساتھ اپنے فنون سحر و کہانت کو بھی لیتی گئی۔ تاریخ کا بیان ہے:- "یہ لوگ جہاں جہاں گئے اپنے ان علوم کو اپنے ساتھ لیتے گئے، ان کی تعلیم دیتے رہے۔ اور ضعیف العقیدہ خلقت انہیں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیتی رہی" (ریگوزین کی کالڈیا ص ۲۵۳) "بابل کے میل جول نے اسرائیلیوں کے عقائد متعلق ملائکہ و شیاطین کو متاثر کرنا شروع کیا" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۳، ص ۱۰، طبع یازدہم) خود یہود کے اکابر کا اعتراف ہے کہ "بابل کا مذہبی احترام ہر خطہ کے یہود میں قائم رہا" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۲، ص ۴۳۳) ہمارے قدیم مفسرین کی تصریحیں اتنی تفصیلی رکھے بغیر اسکے کہ انکے کان میں بھنک بھی آوازوں کی پڑے، انیسویں صدی کے آخر میں سر ہنری راولنسن کو اور بیسویں صدی میں سر لیونارڈ وولی اور دوسرے ماہرین اثریات کو بابل کے کھنڈروں میں کیسے کیسے کتبے عملیات اور نقوش سے لبریز مل گئے۔ محض اپنی قوت ایمانی کی بخشی ہوئی جلاء و اشراقیت سے کام لے کر ما انزل على الملكين کا عطف ما تتلوا الشيطين پر کرکے اس تاریخی حقیقت کو صاف اور بے نقاب کر گئے کہ یہود کی فرد جرم دونوں جرموں سے سیاہ ہے۔ اتباع سحر فلسطین سے بھی، اور اتباع سحر بابل سے بھی! ——— خود قرآن کا اعجاز تو خیر بہت بڑی چیز ہے، حق یہ ہے کہ قرآن والوں کا اعجاز بھی اپنی جگہ دلوں کو ہلا دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔ بابل کی اسی سحر پرور و کہانت خیز سرزمین میں جب عملیات سفلیہ اور علوم سحریہ کا زور حد سے بڑھ گیا، اور عوام کے ذہن میں دیانِ حق انبیاء کرام اور اولیائے صالحین کی حیثیت خلط ملط اور مشتبہ ہو کر کاہنوں، ساحروں، عاملوں، شعبدہ بازوں کی ہو کر رہ گئی، تو مشیتِ الٰہی اور حکمت ربانی نے حق و باطل کے ان دو علیحدہ گروہوں کے درمیان نمایاں فصل و امتیاز کرنے اور لوگوں کی اصلاح خیال کیلئے دو فرشتوں کو انسانی صورت و قالب میں بھیجا۔ هاروت وماروت۔ یہ نام ہیں ان دونوں فرشتوں کے۔ دونوں اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے فرشتے تھے، لیکن جب ایک غرض خاص کے ساتھ انسانوں کے درمیان رہنے بسنے کے لئے بھیجے گئے تھے، تو ظاہر ہے کہ ان کی شکل و شباہت، رنگ و روپ، جسم و قالب انسانوں ہی کا ہوگا۔ اور انکی عادتیں اور انکے جذبات بھی بالکل بشری ہو گئے۔ بعض اہل تفسیر نے یہاں ایک قصہ یہود کا بیان کیا ہوا ملک عراق کی مشہور رقاصہ اور حسینہ زہرہ کا نقل کیا ہے۔ لیکن اول تو آیت کی تفسیر اس قصہ پر موقوف کسی درجہ میں بھی نہیں۔ دوسرے خود محدثین اور محققین تفسیر نے اسکی صحت سے بالکل انکار کر دیا ہے۔ اور صاف لکھ دیا ہے کہ قصہ بالکل گڑھا ہوا اور لغو و مردود ہے۔ اور اس گروہ میں قاضی عیاض، امام رازیؒ، شہاب الدین عراقی وغیرہم شامل ہیں۔ اعلم ان هذه الرواية فاسدة مردودة غير مقبولة (کبیر) وهذا كله لا يصح منه شئ (بحر) ونص الشهاب العراقي على ان من اعتقد في هاروت وماروت انهما ملكان يعذبان على خطيئتهما مع الزهرة فهو كافر بالله تعالى (روح) لیکن بالفرض صحیح ہو بھی، تو جب کسی خاص حکمت و مصلحت سے کسی فرشتہ کو پیکر انسانی اور جذبات بشری دے دیئے گئے، تو اگر کسی وقت وہ ملکوتی الاصل انسان بشری جذبات سے مغلوب بھی ہو جائے، تو اس میں کوئی استحالۂ شرعی ہے نہ عقلی۔

۳۵۹ يعلمٰن۔ تعلیم کے متعارف مفہوم کی بنا پر اس لفظ سے یہ شبہ نہ ہو کہ ملائکہ سحر کا درس یا سبق دیا کرتے تھے۔ نستغفر اللہ۔ تعلیم کے معنی علاوہ سکھانے اور سبق دینے کے، اعلام یعنی جتلانے، بتلانے، آگاہ کرنے کے بھی آتے ہیں۔ والتعليم ربما استعمل في معنى الاعلام (راغب) چنانچہ ماہرین قرآن کی ایک جماعت نے یہاں بھی یہی معنی لئے ہیں۔ والتعليم بمعنى الاعلام (معالم) فكان المعنى في يعلمٰن يعلمان (بحر) التعليم انما هو تعريف يسير بعد مبادئه (بحر) اور خود ایک قراءت بھی بجائے تعلیم کے اعلام کے ساتھ منقول ہے۔ وقرأ طلحة من مصرف يعلمان بالتخفيف من الاعلام (روح) من احد میں من زائد ہے، تاکید استغراق کیلئے معنی ہونگے "کسی کو بھی" یا "کسی ایک کو بھی"۔ من زائدة لتاكيد استغراق الجنس (بحر)

۳۶۰ یہ بنظر احتیاط مزید، ملائکہ اس باب میں اتنی احتیاط رکھتے کہ خیر خود سے تو کسی کو کیا بتلاتے، سکھلاتے، جو لوگ پوچھنے آتے، انہیں بھی پہلے متنبہ کر دیتے حتى ينصحاه اولا (معالم) حتى ينبهاه وينصحاه (مدارک) لا يصلاه حتى يبالغا في نهيه (جصاص)

۳۶۱ امتحان یعنی وہ چیز جس سے کھل جائے کہ سحر و کہانت سے بچا کون کون رہا اور مبتلا ان میں کون کون ہو گیا۔ فتنة کے معنی امتحان، آزمائش، جانچ پڑتال کے ہیں۔ تارة يستعمل في الاختبار (راغب) اور یہاں بھی آزمائش ہی مراد ہے۔ ومعناه في هذا الموضع الاختبار والابتلاء (ابن جریر) عن ابن جريج اي ابتلاء واختبار من الله (کشاف) مطلب یہ ہوا کہ یہ انسان نما ملائکہ کسی پر بھی حقیقت سحر کو نہ کھولتے، کسی کو بھی کلمات سحر پر مطلع نہ کرتے جب تک کہ اُسے متنبہ نہ کر لیتے۔ ہوتا یہ تھا کہ فسق پیشہ لوگ آکر ہاروت و ماروت کو گھیرتے اور ان سے اصرار کرکے دریافت کرتے کہ آپ ہمیں سحر سے روک تو رہے ہیں، لیکن یہ تو بتایئے کہ سحر کہتے کسے ہیں۔ وہ ہیں کون سے اعمال و اقوال جن پر سحر کا اطلاق ہوتا ہے؟ فرشتے انہیں اس تنبیہ و یاد دہانی کے بعد کہ اس فن سے کام لینا کفر ہے، جب انہیں آگاہ و خبردار کرنے کیلئے ان اعمال و اقوال کی نقل و حکایت انکے سامنے کرتے تو وہ فسق پیشہ لوگ اس سے فائدہ یہ اٹھاتے کہ خود اس فن ہی کے سیکھ جانے کا کام لینے لگتے ——— بالکل ایسی ہی بات جیسے آج کوئی کسی فقیہ عالم سے یہ دریافت کرے کہ رشوت اور سود کا اطلاق کن کن آمدنیوں پر ہوتا ہے، اور پھر ان سے بچنے کے بجائے انہیں طریقوں پر عمل شروع کر دے! یہ مفہوم طبعزاد نہیں، حضرت علیؓ سے ایک اثر ٹھیک اسی معنی میں مروی ہے۔ قال علي كانا يعلمان تعليم انذار لا تعليم دعاء اليه كانهما يقولان لا تفعل كذا كما لو سأل سائل عن صفة الزنا او القتل فأخبر بصفته ليجتنبه (بحر)

۳۶۲ (ان اعمال و اقوال سحر کو اختیار کرکے) اى لا تجعل ما تتعلم منا سبباً للكفر (ابن عربی) فقہاء نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اعمال و اقوال سحریہ کا اعتقاداً اختیار کر لینا کفر کے مرادف ہے۔ لا تكفر بعمل هذا السحر واعتقاده فثبت ان ذلك كفر اذا عمل به واعتقده (جصاص) اس میں فقہائے امت کا اختلاف شروع سے چلا آرہا ہے کہ آیا مطلق سحر یعنی اس کا سیکھنا بھی حرام ہے یا محض اس پر عمل۔ شروع سے قول دونوں قسم کے ملتے ہیں۔ بعض نے تعلم کو بالکل جائز رکھا ہے اور صرف عمل کو حرام قرار دیا ہے اور بعض نے نفس تعلم کو بھی۔ قيل فلا تكفر بتعلمه والعمل به وهذا على قول من قال تعلمه مباح والعمل به كفر وقيل لا تكفر بتعليم السحر وهذا على قول من قال ان تعلمه كفر (بحر) بعض نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ سحر کا سیکھنا بہرصورت حرام ہے یہاں تک کہ ساحروں کے رد کیلئے سیکھا جائے جب بھی حرام ہے، اسلئے کہ کلام الٰہی فلا تكفر ... لیکن تحقیق خود حنفیہ کے ہاں بھی متفق علیہ نہیں اور شافعیہ کو تو اس سے بالکل اختلاف ہے۔ فلا تكفر بتعلمه جوازه والعمل به۔ وفيه دليل على ان تعلم السحر وما لا يجوز اتباعه غير محظور وانما المنع من اتباعه والعمل به (بیضاوی) اى لا تتعلم السحر فتعمل به فتكفر (معالم) فلا تكفر بتعلمه والعمل به على وجه يكون كفرا (مدارک) مفسر تھانوی کی تحقیق اس موقع پر بھی قابل قدر ہے:- "سحر کے فسق یا کفر وغیرہ ہونے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس میں کلمات کفریہ ہوں مثل استعانت شیاطین و کواکب وغیرہ، تب تو کفر ہے خواہ اس سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے، یا نفع پہنچایا جائے، اور اگر کلمات مباح ہوں تو اگر کسی خلاف شرع قسم کا ضرر پہنچایا جائے، یا کسی اور غرض ناجائز میں استعمال کیا جائے تو وہ فسق و معصیت ہے۔ اور اگر ضرر نہ پہنچایا جائے، نہ کسی اور غرض ناجائز میں استعمال کیا جائے تو اُسے عرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا عزیمت یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور وہ مباح ہے۔ اور اگر کلمات معلوم نہ ہوں تو بوجہ احتمال کفر ہونے کے واجب الاحتراز ہے۔ اور کفر عملی کا اطلاق ہر ناجائز پر صحیح ہے۔"

۳۶۳ یعنی وہ فسق پیشہ اور معصیت دوست لوگ سحر سیکھ ہی جاتے۔ ملائکہ کی نیت کا نتیجہ ہونا بالکل ظاہر ہے۔ وہ تو نفس مسئلہ سمجھاتے، سحر کی حقیقت بیان کرتے، اسکی حرمت کا حکم صادر کرتے، لیکن فاسد الطبع لوگ اس سے فن سیکھ جاتے۔ اور اسے کام میں لانے لگتے

۳۶۴ ذکر ایک بار پھر حافظہ کو تازہ کر لیجئے، یہود کا چل رہا ہے۔ یہود عہد سلیمانی کا ہو کہ کسی اولاد در اولاد کا۔ قرآن، ایک اُمی کا لایا ہوا قرآن، ان کی فرد جرم سناتے سناتے یک بیک یہ بھی کہہ ڈالتا ہے کہ یہود سحر اور عملیات سفلی میں تو مشغول رہتے ہی تھے، لیکن ان میں بھی خصوصاً ان عملیات میں جن کا تعلق میاں بیوی کے افتراق سے تھا، قرآن نے

توضیح اللہ کو یا بالکل لپیٹ میں ایک بات کہدی۔ اب دیکھئے میسوں صدی کے علمائے یہود اور محققین اسرائیل اپنے اسلاف کے مشغلۂ سحر و ساحری کی نوعیت سے متعلق کیا شہادت دیتے ہیں:۔ "سحر کی سب سے زیادہ عام متداول صورت اُس نقش کی تھی جو عشق و محبت کیلئے دیا جاتا تھا، خاص کر وہ نقش جو ناجائز آشنائیوں کیلئے لکھا جاتا تھا۔ اس قسم کے سحر کی ماہر عورتیں ہی زیادہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ ذکر بھی سحر اور حرامکاری کا عموماً ساتھ ہی ساتھ آیا ہے" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۸ صفحہ ۲۵۵) ۳۶۵ یعنی بجز مشیتِ تکوینی کے۔ اسلام نے شرک کی جڑ جس جس طرح کاٹی ہے، اسکے لحاظ سے یہ صراحت ضروری بھی تھی۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ کہیں تم حقیقی ان عملیات سحریہ کو، اس منتر جنتر کو، ان ٹونے ٹوٹکوں کو ہرگز نہ سمجھ لینا۔ ان میں قوت ذراسی بھی نہیں۔ مؤثر و فاعلِ حقیقی جس طرح ہر حال میں ہماری مشیت، صرف ہماری تجلی ارادی تکوینی رہتی ہے۔ اس موقع پر بھی صرف وہی رہی۔ اذن اللہ کے معنی یہاں تقدیر الٰہی، مشیتِ تکوینی، قضا و قدر کے ہیں۔ معناہ الا بقضائہ وقدرتہ ومشیتہ (معالم عن سفیان ثوری) اے بعلمہ تکوینیۃ فان سحر السحر وإلا الله یکون (سالم) اے بعلمہ ومشیتہ (مدارک) یعنی بحکمہ وقضائہ لا بامرہ (ابن عربی) بس اتنا یاد رہے کہ اللہ کی قدرت، مشیت، حکمتِ تکوینی ہرگز ہرگز اللہ تعالی کے حکم یا رضا کے مرادف نہیں ــــــ زہر کے اثر سے گناہوں کی ہلاکت، کافروں کے ہاتھوں اولیاء و انبیاء کی اہانت و اذیت، مشرکوں کا مسلمانوں پر غلبہ و تسلط جس قانون حکمت تکوینی کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے، اسی کے ماتحت سحر بھی اپنا اثر دکھاتا ہے اور رضائے الٰہی سے بُعد جس قدر غلبۂ کفر وغیرہ کو ہے، اسی قدر تاثیر سحر کو۔ ہو ہر ارادۂ الٰہی کے اندر کتنی کتنی تکوینی حکمتیں اور کائناتی مصلحتیں ہوتی ہیں، اس کا علم بھی بجز اسی دانا و بینا علیم و خبیر کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ ۳۶۶ ایسا کہ ہر معصیت کا قاعدہ ہے کہ اسکی تحصیل مضر اور غیر مفید ہی ہوا کرتی ہے۔ یہی بدبخت یہود اپنا وقت اور اپنی قوتیں کیسی ضائع کر رہے ہیں، ان علوم و فنون کی تحصیل میں جو ان کے حق میں نافع تو ذرا سے بھی نہیں اور مضر ہیں۔ ضمناً اس سے علوم سحریہ کے سیکھنے کی ممانعت بھی نکل آئی، جیسے ان علوم عقلیہ و فلسفیہ سے جو گمراہی کی طرف لے جائیں۔ فیہ دلیل علی انہ واجب الاجتناب کتعلم الفلسفۃ التی تجر الی الغوایۃ (مدارک) ۳۶۷ خود اپنے مذہبی نوشتوں کی تصریحات سے۔ اشارہ عہدِ رسالت کے یہود کی جانب ہے۔ یہ کلام متعلق ہے آیۂ ماقبل لما جاءھم رسول الخ سے۔ یہود عہدِ سلیمانی اور انکی ساحری کا قصہ درمیان میں آگیا تھا۔ اب رجوع پھر اسی پہلے تذکرہ کی جانب ہے یعنی یہود معاصرین عہدِ رسول سے تعلق۔ متعلق بقولہ تعالیٰ ولما جاءھم وقصۃ السحر متطرفۃ فی البین فالضمیر لاولٰئک الیہود (روح) قرآن نے کس دعوے سے کہہ دیا کہ (لقد علموا) یہود ہی خوب جانتے ہیں کہ سحر سفلی کیسی گندی چیز ہے۔ یہود کہہ سکتے تھے کہ ہم کہاں جانتے ہیں؟ کس نے ہمیں یہ خبر دی ہے؟ ہمارے مقدس نوشتوں میں کہاں یہ موجود ہے؟ مگر نہ کہہ سکے۔ اس لئے کہ آج کی تحریف شدہ، مسخ شدہ توریت تک میں یہ تصریحات باقی ہیں: "تو جادوگرنی کو جینے مت دے" (خروج ۲۲:۱۸) "اور جادو نہ کرو، اور ساعتوں پر لحاظ مت کرو" (احبار ۱۹:۲۶) "اور نہ رمّال اور ساحر ہو کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خداوند کی نفرت کے باعث ہیں" (استثناء ۱۸:۱۲) ۳۶۸ اشترٰہ ضمیر سحر کی طرف ہے۔ اے اختار السحر (سالم) اے استبدل ما تتلوا الشیاطین بکتاب اللہ واستبدل السحر بدین اللہ (جصاص) یہود کو دعوتِ حق دی جا رہی تھی۔ پیام انکے پاس مذہب توحید کا پہنچ رہا تھا، اور وہ تھے کہ ادھر سے غافل و بے پروا، فارغ و غیر متوجہ، اپنے انھیں علوم سحر و کہانت میں لگے ہوئے اور انہیں خرافات کو کمال کے درجہ میں رکھے ہوئے تھے۔ اشارہ ان کی اسی محرومی و بدنصیبی کی جانب ہے۔ ۳۶۹ "اپنے آپ کو بیچ ڈالا" یعنی اپنی جان کو عذاب و ہلاکت میں ڈالا۔ بئسما شروا بہ۔ وہ بُری چیز کفر و اعمال سحریہ ہیں جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ بندوں کے حال پر کمال شفقت سے تاسف و حسرت کے لہجہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ دین برحق جیسی نعمت سے منہ موڑے ہوئے یہ کفر و سحر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ گویا دوزخ کی خریداری کر چکے ہیں۔ حیث اختاروا السحر والکفر علی الدین الحق (سالم) ۳۷۰ یعنی افسوس کہ اس حد تک بھی انہوں نے اللہ کی دی ہوئی عقل سلیم سے کام نہ لیا۔ ۳۷۱ اور اپنی موجودہ روش کفر و فسق سے تائب ہو جاتے۔ گنہگار بلکہ سرکش و نافرمان و غدار بندوں کے حق میں اس قدر تاسف اسی مالکِ حقیقی ہی کا حصہ ہے! کیا حد ہے اس شفقت و کرم بے حساب کی! ۳۷۲ (مجمع میں رسول اللہ کو مخاطب و متوجہ کرتے وقت) رسول اللہ صلعم جب مجمع میں قرآن مجید سناتے یا تبلیغ کرتے ہوتے اور لوگ کوئی بات سُن نہ پاتے تو قدرۃً دوبارہ آپ کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتے۔ یہود نے ایسے موقع کے لئے ازراہِ شرارت لفظ راعنا استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ اسکے اصل معنی تو صرف اس قدر ہیں کہ "ہماری رعایت کیجیے" لیکن راعنا کے "ع" کو ذرا کھینچ کر پڑھنے سے اسکے معنی میں ایک گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مسلمان اس شرارت سے غافل، بے خبر، خالی الذہن، خود بھی بعض اوقات یہ لفظ بولنے لگتے۔ یہاں انہیں کو ممانعت ہو رہی ہے۔ انظرنا کے معنی ہیں "ہمارے اُوپر نظر کیجیے"۔ اور یہ پہلوئے ذم سے خالی ہے۔ آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مرتبۂ رسالت کا ادب صرف معنوی ہی حیثیت سے نہیں بلفظی حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے احتمال بھی اہانت کا نکلتا ہے، ان سے احتیاط لازم ہے۔ وھذا دلیل علی تجنب الالفاظ المحتملۃ التی فیہا التعرض للتنقیص (ابن عربی) بلکہ امام مالکؒ کے ہاں تو ایسے الفاظ پر حد واجب ہو جاتی ہے۔ فقہاء حنفیہ نے جو اپنی

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا
جو لوگ کافر ہیں (خواہ) اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین
الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ
میں سے وہ اسے ذرا بھی پسند نہیں کرتے کہ تمہارے اوپر کوئی بھی بھلائی تمہارے
رَبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ
پروردگار کی طرف سے اُترے حالانکہ اللہ اپنی رحمت سے جسے چاہے مخصوص کرلے اور وہ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۱۰۵) مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ أَوْ
بڑے ہی فضل والا ہے ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا
نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ
بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں۔ کیا تجھے خبر نہیں
أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۰۶) أَلَمْ
کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے کیا تجھے
تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ
خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے سلطنت آسمانوں اور زمین کی ہے
وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۱۰۷)
اور اللہ کے سوا کوئی تمہارا یار و مددگار نہیں
أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا
تم تو شاید یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو جیسا کہ

عنزل

بارِیک بینی کیلئے سب سے ممتاز ہیں، یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کہ فلاں مقام پر مراد امر خیر ہے یا شر، واضع کی نیت کے لحاظ سے ہوگا، تابع کی رائے سے نہیں۔ صحابۂ کرامؓ ظاہر ہے کہ سوء ادب کے قصد سے بالکل بری تھے، ممانعت جو کی گئی، وہ یہود کی نیت پر حکم کرکے۔ ۳۷۳ (رسولؐ کے ارشادات ادب و تعظیم کے ساتھ) حال کے بعض گروہوں نے ایمان و اسلام کیلئے رسولؐ کی شخصیت سے بالکل قطع نظر کرکے محض قرآن کی اتباع کو کافی سمجھ لیا ہے، ان کی گمراہی آیت سے ظاہر ہے۔ ۳۷۴ (پیمبر برحق کی توہین اور اپنی دنائتِ اخلاق کی پاداش میں) خصوصاً ان کافروں کیلئے جو رسولؐ کے ساتھ شدتِ بغض و عداوت میں اس حد تک پہنچ جائیں، اور عام انسانیت و تہذیب کے بھی حدود کا لحاظ نہ رکھیں ــــــ ایسے بدترین معاندین کی اصلاح کی توقع بھی کیا ہو سکتی تھی۔ ۳۷۵ الذین کفروا۔ کافروں یعنی طریقِ اسلام کے منکروں کی بڑی قسمیں دو ہیں۔ ایک مشرک جو سرے سے توحید، رسالت، ملائکہ، وحی، جنات ہی کے قائل نہیں، بلکہ ان کے بجائے عجیب عجیب تخیلات اور اوہام گڑھ رکھے ہیں۔ دوسرے اہل کتاب جو ان بنیادی حقائق پر لفظاً ایمان رکھتے ہیں، لیکن عملاً و معناً ان میں سے ہر حقیقت کو مسخ کر چکے ہیں۔ یہاں جملہ میں آگے جو خبر نکلے گی، اس کا مبتدا یہی الذین کفروا ہے۔ مزید صراحت کیلئے اسکی دونوں قسموں کو بھی کھول کر بیان کر دیا جائے۔ اھل الکتب یہ لفظ قرآن مجید میں پہلی بار آیا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں یہ لفظ مومنین اور مشرکین کا درمیانی درجہ رکھتا ہے۔ اور اس کا اطلاق یہود و نصاریٰ پر ہوتا ہے۔ جو اصلاً توحید و نبوت و معاد کے قائل تھے، اور آسمانی صحیفے بھی اپنے پاس رکھتے تھے، گو معنوی اور لفظی تحریفات کے لحاظ سے بالکل مسخ شدہ، اور قرآن اور صاحبِ قرآن کے منکر تھے۔ المشرکین۔ مشرک وہ تھے، جو سرے سے توحید و نبوت ہی کے قائل نہ تھے، بجائے ایک خدائے واحد کے مختلف فرشتوں کو مختلف قوتوں کا مستقل مالک و متصرف سمجھتے تھے۔ ان کو دیویوں، دیوتاؤں کے نام سے پکارتے اور انہیں کی پرستش کرتے۔ اور مختلف عناصر اور مظاہرِ فطرت کی بھی الوہیت کے قائل رہتے۔ حیرت اور افسوس ہے کہ انگریزی کے تقریباً کل مترجمین قرآن اور اردو کے بھی متعدد شارحین نے شاید از راہ "روشن خیالی" کے اثر سے ترکیبِ عبارت کو بالکل نظرانداز کرکے ترجمہ یوں کر دیا ہے، "ہم اہلِ کتاب میں سے جو کافر ہیں وہ اور مشرکین دونوں ہی پسند نہیں کرتے"۔ حالانکہ یہ ترجمہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اول تو اھل الکتب کا مفہوم ہی کافر اہلِ کتاب کا ہے۔ گروہ اسلام قبول کرکے تو اہلِ کتاب کے ہی کیوں جائیں؟ مومن ہی نہ کہلانے لگیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ ان میں سے جو کافر ہیں، خود ہی بے معنی ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر صریح اور قاطع المشرکین کا اعراب ہے۔ المشرکین حالتِ جری میں ہے۔ اور من حرفِ جار کا مجرور۔ اس کا عطف اھل الکتب پر ہے۔ اگر الذین کفروا پر ہوتا تو حالتِ رفعی میں ہوتا۔ اور بجائے المشرکین کے المشرکون ہوتا۔ ایک حدیث میں کافروں کی یہ دوگونہ تقسیم اہلِ کتاب و مشرکین میں صراحت کرکے دونوں کے حق میں عذاب کی دعا آئی ہے۔ اللّٰھم عذب الکفرۃ اھل الکتب والمشرکین الذین یجحدون اٰیاتک ویکذبون رسلک ویصدون عن سبیلک ویتعدون حدودک ویدعون معک الٰھا اٰخر لا الٰہ الا انت تبارکت وتعالیت عما یقول الظلمون علوا کبیرا۔ ۳۷۶ (اے مسلمانو!)

سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ

(ان سے) قبل موسیٰ سے سوال کئے جاچکے ۳۷۷ اور جو کوئی ایمان کے بدلہ میں

بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ

کفر اختیار کرلیگا ۳۸۰ سو وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا بہت سے

كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

اہل کتاب تو دل ہی سے چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان لے آنے کے بعد پھر سے

اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًاۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ

کافر بنالیں ۳۸۱ حسد کی راہ سے جو ان کے نفسوں میں ہے ۳۸۲ (اور یہ بھی)

بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا

بعد اس کے کہ ان پر حق واضح ہوچکا ۳۸۳ سو معاف کرتے رہو ۳۸۴ تاآنکہ

حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ

اللہ اپنا حکم بھیج دے ۳۸۵ یقیناً اللہ ہر چیز پر

شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَؕ

قادر ہے ۳۸۶ اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو ۳۸۷

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ

اور جو کچھ بھلائی تم اپنے واسطے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے پاس

اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

پالوگے ۳۸۸ یقیناً تم جو کچھ کررہے ہو اللہ اُس کا خوب دیکھنے والا ہے ۳۸۹

منزل ۱

مطلب یہ ہے کہ کافروں کو تو چاہے وہ اہل کتاب ہوں یا مشرک، یہ کسی طرح گوارا ہی نہیں، بلکہ دل سے شاق گزر رہا ہے کہ خیر و رحمت کا نزول مسلمانوں پر ہو۔ الخیر۔ خیر سے مراد عموماً وحی و نبوت لی گئی ہے۔ الخیر الوحی (کبیر) فسّر الخیر بالوحی (بیضاوی) لیکن بہتر یہ ہے کہ اسے ہر قسم کی فلاح دنیوی و اُخروی کا جامع سمجھا جائے اور اسکے تحت میں علم، نصرتِ غیبی، فتوحاتِ ملکی وغیرہ سب کو شامل کرلیا جائے۔ لے بالعلم وبالنصرة ولعل المراد به ما یعم ذلک (بیضاوی) ھٰھنا عام فی جمیع انواع الخیر (بحر) عام فی انواع الخیر بکلھا (روح) ۳۷۷ (اپنے قانونِ حکمت و مصالحِ تکوینی کے ماتحت) یہود کو اصل حسد اس کا تھا کہ نعمتِ نبوت کے حقدار تو ہم ہیں یعنی اولادِ اسرائیل۔ یہ اہلِ عرب کو کہ بنی اسماعیل ہیں، یہ دولتِ نبوت کہاں سے مل جاتی ہے اور کیسے مل سکتی ہے؟ اور اھل الکتٰب سے اشارہ زیادہ تر انھیں کی طرف ہے، اور الحمد للہ کہ ہمارے قدیم مفسرین نے بھی آیت کو اسی مفہوم میں لیا ہے۔ معنی الآیة ان اللہ تعالیٰ بعث الانبیاء من ولد اسحاق فلما بعث النبی صلعم من ولد اسمٰعیل لم یقع ذلک بودّ الیہود (معالم) ۳۷۸ (وہ جس فرد، جس نسل، جس جماعت کو چاہے اپنے فضل و کرم سے نوازدے) اور اب اگر کسی قوم یا نسل کو محروم کیا جارہا ہے تو اسکی بنا یہ نہیں کہ ادھر سے فضل و کرم میں کچھ کمی ہو گئی ہے بلکہ یہ اس لئے ہے کہ خود اس قوم نے اپنی مسلسل نالائق روش سے پہلے کو اس فضل و کرم کا نااہل ثابت کردیا۔ اور اب اسے اس نعمت سے نوازے جانا آئینِ حکمت کے منافی ہے ۳۷۹ (لوگوں کے دماغ یا حافظہ سے) انساءھا محو حفظ ذکرھا عن القلوب (راغب) انساء لہ لے اذھابھا عن القلوب (بیضاوی) اٰیة کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کا اطلاق آیتِ مکتوبی پر بھی ہوتا ہے اور نشان، دلیل، معجزہ پر بھی۔ یہاں مراد اگر دلائل و معجزات سے لی جائے جب تو آگے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کے بجائے دوسرا نشان حقانیتِ قرآن کا وجود میں اب بھی آتا ہی رہتا ہے۔ اور زمانہ نزولِ قرآن میں تو خارقِ عادت نشانوں کی بھی کمی نہ تھی۔ البتہ اگر آیت مکتوبی ہی مراد لی جائے جب بھی دو شقیں ممکن ہیں۔ آیتیں یا قرآن مجید کی ہوں گی یا کتب سابق کی۔ اگر کتبِ سابق کی آیتیں مراد ہیں جیسا کہ ابو مسلم اصفہانی کا مذہب ہے جب بھی بحث آگے نہیں بڑھتی۔ پرانی کتابوں کی آیتوں کا قرآنی آیتوں سے منسوخ ہونا تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس میں نہ کوئی اختلاف ہے نہ نزاع، اب اگر آیاتِ قرآنی ہی مراد ہوں جیسا کہ جمہور مفسرین کا خیال ہے تو سوال یہ رہ جاتا ہے کہ نسخ سے مفہوم کیا ہے؟ نسخ سے مراد کسی نے آج تک یہ تو لی نہیں کہ فلاں عقیدہ کسی زمانہ میں واجب تھا اب وہ منافیِ ایمان قرار پایا۔ یا جھوٹ، چوری، زنا، قتل پہلے حرام تھے پھر حلال قرار پاگئے یا فلاں حکایت پہلے جس طرح قرآن میں بیان ہوئی تھی بعد کو اسکی تردید ہوگئی۔ غرض نسخ کی گنجائش کا عقائد میں، کلیاتِ اخلاق میں اور حسی میں، قصص گزشتہ اور حکایاتِ ماضی میں، اخبارِ غیب میں یعنی قرآن مجید کے بیشتر حصہ میں تو کوئی بھی قائل نہیں۔ نسخ کی گنجائش تو کچھ بھی ہے لے دے کے بابِ احکام میں ہے اور احکام کی مثال طبیب کے نسخے کی ہے۔ طبیب کی تشخیص اپنی جگہ پر بدستور رہتی ہے لیکن مریض کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ اور پھر موسم اور آب و ہوا میں بھی فرق ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں کوئی حاذق سے حاذق طبیب بھی اپنے نسخہ کے اجزا میں ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کرنے میں تامل نہ کرے گا۔ قرآن کے بعض احکام قانون کے نسخ کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ خود قانون ساز و قانون آفریں کے قلم سے عین وضعِ قانون کے دوران میں بعض قانون جو عارضی و ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں بدل دیئے گئے اور ان کی جگہ مستقل و دوامی قوانین نے لے لی۔ انسان کے دانت اور جبڑے مستقل طور پر غذاؤں کے چبانے، پیسنے، چیرنے، کاٹنے اور پھاڑنے ہی کے کام کے لئے ہیں لیکن ابتدائی شیرخوارگی میں دانت نکلنے سے قبل دوسری قسم کی شربتی یا نیم شربتی غذائیں اسکے لئے موزوں ہیں، اس موٹی اور سیدھی سی بات میں خدا معلوم اتنا گھبرانے کا کونسا پہلو ہے جو آج بعض مفسرین جدید خود مسئلہ نسخ ہی سے انکار پر تُل گئے ہیں۔ یہ بھی خوب واضح رہے کہ یہ نسخ جو کچھ بھی ہوگا محض علمِ بشری ناقص و محدود کے اعتبار سے ہوگا۔ ورنہ علمِ الٰہی میں تو ہر حکم ازل سے وقتِ معین کیلئے مقرر و ثابت ہی ہے۔ جمہور کا مذہب اسی قوعِ نسخ کا ہے۔ گو ایک گروہ عدمِ نسخ کا بھی قائل رہا ہے۔ و یروی عن بعض المسلمین انکار النسخ واحتج الجمھور من المسلمین علی جواز النسخ ووقوعہ (کبیر) اور فقیہ جصاص نے ایک غیر فقیہ کا قول بھی اسی معنی میں نقل کیا ہے کہ شریعتِ محمدی کے اندر کوئی نسخ نہیں، ناسخ خود یہ شریعت ساری سابق شریعتوں کی ہے۔ زعم بعض المتأخرین من غیر اھل الفقہ انہ لا نسخ فی شریعة نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وان جمیع ما ذکر فیھا من النسخ فانما المراد بہ نسخ شرائع الانبیاء المتقدمین (احکام القرآن) اور نسخ کے معنی شریعت میں ازالہ یا تبدیلی کے ہیں بھی نہیں۔ اصلی مغالطہ یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ نسخ کو اردو کی منسوخی کے مرادف سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اصطلاحِ شریعت میں نسخ کے معنی کسی مطلق و غیر مقید حکم کو وقت محدود و مقید کر دینے کے ہیں۔ وتفسیر النسخ لغة التبدیل وشریعة بیان انتہاء الحکم الشرعی المطلق الذی تقرر فی اوھامنا استمرارہ بطریق التراخی فکان تبدیلاً فی حقنا بیاناً محضاً فی حق صاحب الشرع (مدارک) ۳۸۰ (یعنی وقت و موسم، بدلے ہوئے حالات کے زیادہ مطابق) لے بما ھو انفع لکم واسھل علیکم (معالم) مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ جو حال یا وارد، بلا اختیار عبد زائل یا مغلوب ہو جائے حق تعالیٰ اس سے بہتر یا اس کے مثل ہی دوسرا عطا کردیتا ہے۔ سو اس پر افسوس و حسرت نہ کرنا چاہیئے۔ ۳۸۱ (سو ایسے قادرِ مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ احوال و مصالح کی رعایت برابر کرتا رہے) خطاب یہاں معترض، معاند منکرِ نسخ سے ہے۔ قیل منکر النسخ (روح) اور بعض نے مطلق سامع کو مخاطب قرار دیا ہے۔ والاولی ان یکون المخاطب السامع (بحر) ۳۸۲ (اور اسی کو ہر طرح کا اختیار کامل و تصرفِ مطلق حاصل ہے) خطاب یہاں عام ہے ہر سامع اور مخاطب کے لئے۔ اور ام کہ مفہوم ایجابی ہے یعنی اے مخاطب تجھے خوب معلوم ہے معناہ الایجاب لے قد علمت ایھا المخاطب (بحر) یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب رسولؐ کو اور پھر آپ کے واسطہ سے امت سے ہے۔ الخطاب للنبی والمراد ھو وامتہ (بیضاوی) ۳۸۳ (اے بنی آدم) آیت بجائے خود ایک درسِ توحید کامل کا ہے۔ ملک، ولایت، نصرت سب اللہ ہی کیلئے مخصوص ہے۔ ۳۸۴ (از راہِ عناد و اعتراض) مخاطب یہاں غالباً یہود ہیں۔ نزلت فی الیہود (معالم) اور اور قول بھی نقل ہوئے ہیں لیکن ترجیح اسی قول کو ہے۔ اختلفوا فی المخاطب بہ علی وجوہ احدھا انھم المسلمون والقول الثانی انہ خطاب لاھل مکة والقول الثالث المراد الیہود وھذا القول اصح (کبیر) ورجح انھم الیہود (بحر) رسولکم سے مراد اس صورت میں رسولِ وقت سے ہوگی۔ تمہارے زمانہ کے رسولؐ سے۔ لیکن مسلمان ہی اگر مخاطب سمجھے جائیں تو یہ بھی تہدیداً جائز ہوگا۔ ام یہاں ہمزہ کا مرادف اور سوالیہ نہیں منقطعہ ہے۔ بل کا مرادف ام لے بل (جلالین) ام منقطعة التقدیر بل تریدون (مدارک) ام ھھنا منقطعة والتقدیر بل تریدون (عکبری) فیہا الاضراب والانتقال عن حملھم علی العمل بوجب علمھم (ابوسعود) ۳۸۵ سوال اگر کسی مسئلہ کی سنجیدہ تحقیق و دریافت کیلئے ہوں تو باعثِ رحمت ہیں لیکن جب ضد اور نفسانیت اور شرارت سے ہوں اور اعتراض محض اعتراض کی غرض سے ہوں تو وہی الٹا ایک لعنت بن جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ سے جیسے جیسے گستاخانہ سوالات اور بیہودہ فرمائشوں کی بھرمار بنی اسرائیل کرتے رہے، ان کے تذکرہ سے تاریخ اسرائیل اور خود بائبل کے صفحات لبریز ہیں۔ قرآن کا اسکو اتنی کھلی ہوئی تلمیح کے طور پر لے آنا بجائے خود اسکی دلیل ہے کہ قرآن بھیجنے والا اس سے خوب واقف تھا۔ اور یہ کلام عرب کے ایک اَن پڑھ انسان کی تصنیف ہو نہیں سکتا۔ ۳۸۶ (جس کی ایک شکل یہی رسول سے معاندانہ اور گستاخانہ سوال و جواب ہے) ایبدل الکفر بالایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایمان کے بدلہ اور مقابلہ میں راہِ کفر کو اختیار کیا۔ من یتبدل الکفر لے یختارہ ویأخذہ لنفسہ (ابوسعود) بالایمان لے بمقابلتہ بدلا منہ (ابوسعود) سیاق میں ذکر یہود کا ہے اس لئے انہیں کے ملک بنی کے صحیفہ کا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔ "سنو اے آسمانو! اور کان لگاؤ اے زمین، کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میں نے لڑکوں کو پالا پوسا پھر انہوں نے مجھ سے سرکشی کی۔ بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے صاحب کی چرنی کو، بنی اسرائیل نہیں جانتے، میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے۔ آہ خطاکار گروہ، ایک قوم جو گناہ سے لدی ہوئی ہے۔ بدکاروں کی نسل خراب اولاد کہ انہوں نے خداوند کو ترک کیا۔ اسرائیل کے خدا ہی کو حقیر جانا۔ اس سے بالکل پھر گئے" (یسعیاہ ۱: ۲-۴) ۳۸۷ (اے ایمان والو) شانِ نزول کے ایک مخصوص

واقعہ کی بنا پر عموماً مفسرین نے یہاں اہل کتاب سے مراد یہود یا احبار یہود لی ہے۔ لیکن لفظ قرآنی عام ہے اور یہود و نصاریٰ دونوں اسکے عموم میں یکساں داخل ہیں۔ مسیحیوں کی طرف سے جو کھلا ہوا زبردست اور منظم اور علماء یہود کی طرف سے نسبتۃً ہلکا اور مخفی پروپگنڈا عقائد اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی، جغرافی تحریروں کے ذریعہ سے اسلامی آبادیوں کے درمیان جاری رہتا ہے، وہ سب اسی کے مظاہر ہیں۔ غایت ان ساری سرگرمیوں اور کوششوں کی یہی رہتی ہے کہ مسلمان اگر یہودیت و مسیحیت کو بھی قبول کریں جب بھی کم از کم اپنے دین کی طرف سے تو ضرور بدگمان و برگشتہ ہو کر رہیں۔ ۳۸۸ یعنی یہ کوششیں اور سرگرمیاں بھی اخلاص و ہوا خواہی کی راہ سے نہیں۔ رشک و حسد سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہود کا حسد تو خود اپنے پیغمبر و ہادی تک سے رہا ہے اور اس پر خود عہد عتیق ناطق ہے۔ "انھوں نے خیمہ گاہ میں موسیٰ کے برادر و خداوند کے مقدس مرد ہارون پر حسد کیا" (زبور ۱۰۶ : ۱۶) اور عہد جدید کی شہادتیں بھی حسد کے باب میں کچھ کم واضح و صریح نہیں۔ "یہودیوں نے حسد میں آکر بازاری آدمیوں میں سے کئی بدمعاشوں کو اپنے ساتھ لیا اور بھیڑ لگا کر شہر میں فساد کرنے لگے" (اعمال ۱۷ : ۵) "یہودی اتنی بھیڑ دیکھ کر حسد سے بھر گئے" (اعمال ۱۳ : ۴۵) ۳۸۹ یعنی اہل کتاب کے اس انکار و مخالفت کی بنیاد کوئی اشتباہ یا مغالطۂ عقلی نہیں، محض ضد اور عناد اور استکبار ہے۔ وضوح حق ان پر پوری طرح ہو چکا ہے۔ ۳۹۰ (سردست اے مسلمانو! ان سے کسی طرح کا انتقام نہ لو) یہود کی مفسدانہ کوششوں پر مسلمانوں کا اشتعال ایک امر طبعی تھا، ان کو ہدایت ہو رہی ہے کہ سردست عفو و درگزر ہی سے کام لیتے رہو اور انتقامی تعزیری کارروائیاں فوراً ہی نہ شروع کر بیٹھو۔ ۳۹۱ (جہاد و قتال کے لئے) اکثر صحابہ و تابعین سے حکم کی تفسیر حکم جہاد و قتال کے ساتھ منقول ہے۔ انه الامر بالقتال وهو قول

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ ھُوْدًا اَوْ
اور یہ کہتے ہیں کہ جنت میں کوئی ہرگز داخل نہ ہوگا مگر ہاں وہی جو یہودی یا
نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّھُمْ ۭ قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَكُمْ اِنْ
نصرانی ہوں ۳۹۶ یہ اُن کی (نری) آرزوئیں ہیں ۳۹۷ آپ کہہ دیجیے کہ اپنی سند لاؤ ۳۹۸ اگر
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۤ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَھُوَ
تم سچے ہو ۳۹۹ ہاں البتہ جو کوئی بھی اپنی ذات کو اللہ کے آگے جھکائے
مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
اور وہ مخلص بھی ہو ۴۰۰ تو ایسے کے لئے اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسوں
وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى
پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے ۴۰۱ اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد
عَلٰي شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰي
پر نہیں ۴۰۲ اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر
شَيْءٍ ۙ وَّھُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ
نہیں ۴۰۳ درانحالیکہ وہ سب (ایک ہی) کتاب آسمانی پڑھتے ہیں ۴۰۴ اسی طرح وہ لوگ بھی کہنے
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ
لگے انھیں کا سا قول جو علم نہیں رکھتے تھے ۴۰۵ (کچھ بھی) سو اللہ اُن کے درمیان
بَيْنَھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
قیامت کے دن اس باب میں فیصلہ کردے گا جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں ۴۰۶

ع ۱۳

اکثر الصحابة (کبیر) الذی هو الاذن فی قتالهم (بیضاوی) المراد به الامر بالقتال (روح) حکم قتال اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا۔ آیت سے صاف اشارہ اس طرف نکل آیا کہ عنقریب بھیجنے والا ہے۔ ۳۹۲ (پس بیچے نادر مطلق کیلئے کیا مشکل ہے کہ سرکش اور زور آور کافروں سے پورا بدلہ لے لے اور ان کا زور توڑ دے۔ اور مظلوم مغلوب مسلمانوں کو دیکھتے دیکھتے مظفر و منصور و حاکم و غالب بنادے) ۳۹۳ (اس درمیان میں اے مسلمانو) مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جہاد کے احکام دوسرے ہیں جب تک وہ نافذ نہ ہوں انکے انتظار میں عام احکام اسلامی کی پابندی میں غفلت و تساہل کو راہ نہ دو۔ یہ مالی اور بدنی عبادتیں تو ہر حال و صورت میں واجب العمل ہیں۔ ۳۹۴ نیکی کچھ جہاد و قتال ہی پر موقوف نہیں۔ اعمال صالحہ جو کچھ بھی میسر آجائیں سب یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔ برابر انہیں میں لگے رہو۔ لانفسکم حذف مضاف ہے یعنی اپنے نفع اپنی نجات و مغفرت کے واسطے وهو علی حذف مضاف ای لنجاة انفسکم (بحر) تجدوه۔ اسے پاؤ گے، یعنی اسکے اجر و ثواب کو پاؤ گے یہ مراد نہیں کہ بعینہٖ وہ عمل موجود ملے گا۔ تجدوه ای ثوابه (بیضاوی) المراد وجدان ثوابه وجزائه (کبیر) ۳۹۵ (سو اس کا احتمال ہی نہیں کہ کوئی نیکی ضائع جائیگی، اجر ہر نیکی کا پورا پورا ملے گا) ۳۹۶ یہ کہنے والے یہود و نصاریٰ تھے۔ قرآن مجید نے انہیں کی ترجمانی کی ہے۔ یہود کا یہ عقیدہ شروع سے چلا آرہا ہے کہ نجات انہیں کی قوم اور وابستگانِ قوم کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ انجیل میں بھی ان کا یہ مقولہ نقل ہوا ہے کہ "نجات یہودیوں میں سے ہے" (یوحنا ۴ : ۲۲) یہود و نصاریٰ دونوں کے ہاں کے مزید حوالوں کے لئے ملاحظہ ہوں حواشی تفسیر انگریزی۔ ظہور اسلام کے وقت یہود و نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ اس نئے دین کے قبول کرنے کی ضرورت کیا، نجات تو ہمارے دینوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ۳۹۷ (جو کبھی پوری ہونے والی نہیں اور جن کی تائید میں نہ کوئی دلیل معقول ہے اور نہ سند منقول) محض بزرگ زادگی اور نسلی و نسبی شرافت پیغمبروں کی اولاد کے کام نہ آسکی تو ہمارے زمانہ کے پیرزادوں اور مشائخ زادوں کا اپنے شرف نسلی پر نازاں رہنا کس درجہ بے عقلی ہے۔ امنیة واحد ہے امانی کا منی سے مشتق۔ افعولة اور اعجوبه کے وزن پر۔ ۳۹۸ (اپنے اس دعویٰ میں کہ نجات یہودیت یا نصرانیت کے ساتھ وابستہ ہے) پیغمبر علیہ السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ اہل کتاب سے کہیے کہ خالی زبانی دعووں اور خالی آرزوؤں سے کیا ہوتا ہے، اگر حقانیت کے مدعی ہو تو اپنی تائید میں کوئی دلیل عقلی یا نقلی لاؤ۔ ۳۹۹ یعنی نجات کا صحیح قانون یہ ہے جو اب بیان ہو رہا ہے۔ بلیٰ اپنے ماسبق کی نفی و تردید کے لئے ہے۔ یعنی تمہارا دعویٰ غلط محض ہے۔ صحیح قاعدہ یہ ہے جو آگے آرہا ہے۔ ۴۰۰ (اپنے اس ایمان و اعتقاد میں) یعنی اس کا عمل بھی اسکے عقیدۂ توحید کے مطابق ہو۔ گویا ایمان و حسن عمل دونوں جمع ہوں۔ وجه کے لفظی معنی چہرہ کے ہیں، لیکن محاورہ میں اکثر مراد ذات سے لی جاتی ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔ ربما عبّر عن الذات بالوجه (راغب) فالوجه اما مستعار للذات وانا مجاز عن القصد (روح) اسلم وجهه لله یعنی توحید کا پوری طرح قائل ہو جائے بلا آمیزش شرک۔ ای اخلص نفسه له لا یشرك به غیره (کشاف) او یقصد سواه (روح) ۴۰۱ خوف و اندیشہ کا تعلق مستقبل سے ہے اور حزن و غم ماضی کے واقعات پر ہوتا ہے۔ ذکر قیامت کا ہے کہ اس روز اہل ایمان نہ اپنے ماضی پر حسرت و تأسف کریں گے نہ آیندہ کیلئے دہشت زدہ ہوں گے۔ ۴۰۲ یعنی ان کا دین تمام تر باطل ہے۔ یہودی قوم عقیدۂ بہر حال موحد تھی۔ نصرانیت کا شرک اور الوہیت کی تثلیث وہ برداشت ہی نہ کرسکتی تھی اور نہ اسکی قائل ہوسکتی تھی کہ ایسے گرے ہوئے دین میں کچھ بھی صداقت ہوسکتی ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ ۴۰۳ یعنی ان کا دین تمام تر باطل ہے۔ شریعت موسوی سے متعلق موجودہ انجیلوں میں تذکرہ الفاظ ذیل میں ملتا ہے۔ "آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے راستباز ٹھہرتا ہے" (گلتیون ۲ : ۱۶) "شریعت کے اعمال سے کوئی بشر راستباز نہ ٹھہرے گا" (ایضاً ۲ : ۱۷) "راستبازی اگر شریعت کے وسیلے سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا" (ایضاً ۲ : ۲۰) ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ (اصطلاح انجیل میں مطلق شریعت سے مراد شریعت موسوی ہی ہوتی ہے) ۴۰۴ الکتٰب۔ یعنی مجموعۂ صحائف انبیاء بنی اسرائیل جسے آج عہد نامۂ عتیق کہتے ہیں۔ یہود و مسیحی دونوں ان صحیفوں کے الہامی اور مقدس ہونے کے قائل ہیں۔ وھم میں واو حالیہ ہے، عطف کیلئے نہیں۔ الواو للحال (کشاف) افسوس ہے کہ انہیں گمراہ قوموں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی باوجود اپنی مشترک کتاب قرآن کے گروہ در گروہ ہو کر ایک دوسرے کی تحقیر بلکہ تفسیق و تضلیل شروع کر دی۔ اور نوبت تکفیر کی آجاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ شافعیہ حنفیہ کو ذلیل سمجھنے لگے اور اشعریہ اور ماتریدیہ کے نزدیک ہدایت انہیں کے اپنے اپنے حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ۴۰۵ (وحی اور نبوت کا) وہ کہنے لگے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی حق پر نہیں۔ علم سے آیت میں مراد کتاب آسمانی کا علم ہے۔ یہ کہنے والے کون تھے عموماً ان سے مراد مشرکین عرب لئے گئے ہیں اور ہر ایسے مذہب کے پیرو جس کی بنیاد کسی کتاب آسمانی پر نہ ہو یعنی ہر دین جاہلی کے پیرو اسکے تحت میں آجاتے ہیں۔ یعنی بذالك مشرکی العرب لانهم لم یكونوا اهل الکتب ونفی عنهم من اجل ذالك العلم (ابن جریر) ای الذین لا علم عندهم ولا كتاب كعبدة الاصنام والمعطلة ونحوهم (کشاف) وهم مشركو العرب في قول الجمهور (روح) قرآن مجید نے علم اور اسکے مختلف صیغوں یعلمون وغیرہ کو جہاں جہاں استعمال کیا ہے عموماً علم حقیقی یعنی علم وحی و نبوت ہی کے معنی میں کیا ہے۔ ان آیتوں سے آج کل کے رواجی "علوم و فنون" اور اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کی تعلیم پر استدلال کرنا کس قدر شدید ظلم قرآن مجید اور فہم سلیم دونوں پر ہے۔ ۴۰۶ فیصلہ سے عملی حتمی فیصلہ مراد ہے۔ ورنہ جہاں تک دلائل و شواہد کا تعلق ہے حق و باطل، کفر و ایمان کے درمیان یقینی فیصلہ تو اس دنیا میں بھی موجود ہے۔ بینهم سے مراد ہے ایک فریق اہل حق و ایمان کا اور دوسرا گروہ اہل باطل و کفر کا۔ یقضی بین المحق والمبطل (معالم) یحکم بین المحق والمبطل (کبیر)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا
اور اُس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روک دے کہ ان میں اُس کا

اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
نام لیا جائے ۴۰۷ اور اُن کی بربادی کی کوشش کرے ۴۰۸ یہ لوگ اس لائق ہی نہیں

اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا
کہ ان میں داخل ہوں مگر ہاں یوں ڈرتے ہوئے ۴۰۹ اُن کے لئے دُنیا میں (بھی بڑی)

خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ
رسوائی ہے اور آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے ۴۱۰ اور اللہ

الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ
ہی کا ہے مشرق (بھی) اور مغرب (بھی) ۴۱۱ سو تم جدھر کو بھی منہ پھیرو ۴۱۲ اللہ ہی کی

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ
ذات ہے ۴۱۳ اللہ بڑا وسعت والا ہے ۴۱۴ بڑا علم والا ہے ۴۱۵ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے

اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ
ایک بیٹا بنا لیا ہے ۴۱۶ پاک ہے وہ ۴۱۷ اصل یہ ہے کہ اُسی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور

الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ
زمین میں ہے ۴۱۸ سب اسی کے حکم بردار ہیں ۴۱۹ (وہ) موجد ہے آسمانوں اور

وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ
زمین کا ۴۲۰ اور جب کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے ۴۲۱ تو بس اتنا ہی اس سے

منزل ۱

۴۰۷ جیسا کہ مشرکین مکہ نے عین حرم کعبہ میں ذکر و عبادت الٰہی سے مسلمانوں کو روک دیا تھا خصوصاً واقعۂ حدیبیہ میں۔ ھؤلاء المشرکون حین حالوا بین رسول اللّٰہ صلعم یوم الحدیبیۃ و بین ان یدخل مکۃ (ابن جریر عن ابن زید) بعض نے مراد بیت المقدس کو لی ہے کہ وہاں ٹائیٹس Titus رُومی کے عہد میں رُومی مشرکین نے یہود اہلِ توحید کو ذکر الٰہی سے روک دیا تھا۔ بہرحال حکم عام ہے قریبی سبب نزول جو کچھ بھی رہا ہو۔ اور حکم کو کسی خاص مسجد یا خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں۔ انہ کل مسجد وھو الصحیح لان اللفظ عام ورد بصیغۃ الجمع فتخصیصہ ببعض المساجد او فی بعض الازمنۃ محال (ابن عربی)۔ مسجد کے لفظی معنی جائے سجدہ کے ہیں۔ مراد اس سے مسلمانوں کی عبادتگاہ ہوتی ہے۔ مسجد کے حسن تاثر و کشش و دلآویزی صفائی وسادگی کی شہادت غیر مسلموں کی زبان سے بھی منقول ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیۂ تفسیر انگریزی۔ اظلم۔ یعنی ظالم تر، خبیث تر، مجرم تر۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ منع ذکر و داخلۂ مسجد اگر کسی ضرورت دینی اور مصلحت شرعی سے ہو تو بالکل درست ہے کہ ایسے موقع پر یا امور مسجد کی بربادی و ویرانی میں نہیں اعین اصلاح و آبادی میں داخل ہیں۔ مسائل ذیل بھی فقہاء نے آیت کے تحت میں ذکر کئے ہیں۔ (۱) مسجد میں اذن عام ہونا شرط ہے (۲) مسجد کا دروازہ کسی مملوک زمین پر نہ ہو۔ بعض عارفوں نے لکھا ہے کہ جب اینٹ اور چونے کی بنی ہوئی عمارت میں ذکر حق روک دینے والوں کے حق میں قرآن نے یہ وعید اور پھٹکار رکھی ہے تو اُس قوم یا شخص کے جرم کی اہمیت یا عظمت کا کیا ٹھکانا ہے جو قلوب انسانی کو کہ وہ معنوی سجدہ گاہ حق ہیں، ذکر حق سے روکے۔ اسلامی تعلیم کی روک تھام میں سعی کرنا، اشاعتِ مذہب حق میں روڑے اٹکانا، سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔ ۴۰۸ فقہاء نے کہا ہے کہ جس طرح اللہ کے ذکر سے مسجد آباد ہوتی ہے ممنوعات و بدعات کے ارتکاب سے مسجد کی بربادی بھی سمجھی جائیگی۔ نیز وہ تمام امور جو نمازیوں کی کمی اور مسجد کی ویرانی کے باعث ہوں، آیت کے تحت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ۴۰۹ (مسلمانوں کے رعب و دبدبہ سے) یعنی داخلہ کی اجازت غیر مسلم کو صرف اس حال میں دی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا محکوم ہو اور اس کا داخلہ سرکشانہ نہیں مطیعانہ ہو۔ قرآن مجید میں لفظ مسٰجد بصیغۂ جمع ہے لیکن ایک قول ہے کہ مساجد سے یہاں مراد مسجد حرام یا حرم کعبہ ہی ہے۔ المراد بالمساجد المسجد الحرام (معالم عن ابن زید) اور اس شبہ کا کہ لفظ جمع سے مراد واحد کیونکر ہوگی، جواب یہ دیا گیا ہے کہ محاورۂ زبان میں یہ جائز ہے مثلاً اگر کوئی شخص ایک ہی مرد نیک کو ایذا پہنچائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ نیکوں کو ستانے والا بڑا ظالم ہے۔ کما تقول لمن اذی صالحا واحدا ومن اظلم ممن اذی الصالحین (کشاف) ایک قول یہ بھی ہے کہ آیت سارے کافروں کے حق میں ہے کہ عبادت سے روکنے والے تو سارے ہی کافر ہیں۔ اور مساجد سے مراد کل روئے زمین ہے۔ چنانچہ کافروں کو دارالاسلام میں داخلہ کا کوئی حق نہیں بجز اس کے مسلمانوں ہی کے شرائط پر ہو۔ اور یہ قول امام ماتریدی کی جانب منسوب ہے (احمدی) مراد اگر مسجد حرام لی جائے تو قانونی و تشریعی حیثیت سے قطع نظر واقعاتی رنگ میں بات بالکل صحیح نظر آئیگی۔ چنانچہ مسجد حرام اس وقت سے آج تک بحمد اللہ! مسلمانوں ہی کے قبضہ میں چلی آرہی ہے۔ مساجد اللہ کی ترکیب سے فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ جو جگہ عبادت کے لئے مخصوص کر دی جائے اور اس کیلئے اذن عام دیدیا جائے وہ شخصی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر کسی نے اپنے گھر کا کوئی حصہ عبادت کیلئے مخصوص کر لیا، اور اس کیلئے اذن عام نہیں رکھا تو اس پر مسجد کا اطلاق ہی نہ ہوگا اور وہ اس شخص کی ذاتی ملک باقی رہیگی (ابن عربی)۔ ۴۱۰ عذاب آخرت کا تجربہ تو آخرت ہی میں ہوگا۔ باقی دنیا میں ان لوگوں کی ذلت و رسوائی کا مشاہدہ تو چند روز میں سب کو ہو گیا۔ یہود، مشرکین، منافقین، سارے اعدائے اسلام جزیرۂ عرب میں اور اس کی سرحدوں میں دیکھتے دیکھتے نیست و نابود ہو کر رہے اور قرآن مجید کی پیشگوئی لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ ۴۱۱ (بحیثیت مخلوق و بحیثیت مملوک بھی) یعنی انھما لہ ملکا وخلقا (ابن جریر) للّٰہ میں لام اختصاص کا ہے۔ نحو میں لام جارہ کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک لام اختصاص بھی ہے یعنی مشرق و مغرب سب اُسی کے ہیں۔ اللام لام الاختصاص ای ھو خالقھما ومالکھما (کبیر) اُمت محمدی جو اب ساری دنیا کیلئے اُمت عادل بنا کر بھیجی جا رہی تھی، لازمی تھا کہ اس کی مرکزیت و یکجہتی کیلئے ایک قبلہ بھی ہو، اور وہ قبلہ اب خانۂ کعبہ مقرر ہو رہا تھا۔ اہل کتاب نے اس پر اعتراضات شروع کئے۔ یہ نقل اعتراض و جواب اعتراض کی تمہید ہے۔ المشرق والمغرب۔ دونوں سمتیں اور نہیں دو پر کیا موقوف ہے ہر سمت اور ہر جہت اللہ تعالیٰ کیلئے یکساں ہے۔ وہ سب کا یکساں خالق ہے، حاکم ہے، مالک ہے۔ کسی خاص سمت میں کوئی بھی خاص تقدیس کوئی شائبۂ الوہیت کوئی شان حق تعالیٰ موجود نہیں۔ مذاہب جاہلی کی تاریخ انسانی حماقتوں، جہالتوں، وہم پرستیوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ایک مشترک گمراہی شرک قوموں میں یہ رہی ہے کہ خدا جو کہ متمکن ہو اور مجسم ہو اسلئے لازمی ہے کہ اس کی ہستی کسی نہ کسی متعین سمت یا جہت میں ہو اور اس تخیل کی بنا پر خود وہ سمت یا جہت مقدس ہے۔ مصری، ہندی، رُومی تمام مشرک قوموں نے خدا کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کر کے خود اسی جہت کو مقدس بنا لیا اور چونکہ سورج دیوتا کا مرتبہ مذاہب شرک میں عموماً اہم و مقدم رہا، اس لئے شاہ خاور کے طفیل میں سمت مشرق ہی عموماً مقدس سمجھی گئی اور دُنیا کے اکثر علاقوں میں پُجتی رہی۔ ——— مسلمان جس کی آنکھیں ہی توحید کے آغوش میں کھلی ہیں، ان کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ سمت و جہت جیسی خیالی چیز بھی قوموں کی معبود ہو سکتی ہے۔ مشرکوں ہی کے اثر سے سمت پرستی کا شرک اہل کتاب میں بھی سرایت کر گیا۔ اور مسیحی مذہب چونکہ عقائد و عبادات دونوں میں اپنے وقت کے رائج و شائع رُومی مذہب ہی کا مثنیٰ یا پرتو ہے، اسلئے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ یہود جنہیں اپنی توحید پر ناز تھا وہ بھی تمام تر محفوظ نہ رہ سکے بلکہ اُن کے بعض فرقے ——— تو پوری طرح اس صف میں آگئے بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدس کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مشرق اگر خصوصیات مجمعے کی بنا پر مقدس ہے تو مغرب بھی خط موت و دیار ہلاکت ہے شاہ خاور طلوع اگر ادھر سے ہوتا ہے تو روز غروب اور فنا تو ادھر ہی ہوتا ہے پھر اس کے تقدس کا بھی کیوں نہ قائل ہو لیا جائے چنانچہ یہ دونوں سمتیں خوب پجتی رہیں۔ مشرق زیادہ اور مغرب اس سے کچھ کم۔ اصل انگریزی حوالوں کیلئے ملاحظہ ہوں حواشی تفسیر انگریزی۔ دُنیا کی دُنیا اس سمت پرستی کے شرک، مشرق پرستی اور مغرب پرستی کی ضلالت میں مبتلا تھی کہ توحید قرآنی نے ساری دنیا کے عقائد کو چیلنج کر کے اس مشرکانہ عقیدہ پر ضرب لگا کے ایک عالم کو چونکا دیا۔ قدیم مذاہب یہ آواز سن کر بھونچکے سے رہ گئے۔ ۴۱۲ (دعا کیلئے نماز کیلئے یا کسی عبادت کی بھی غرض سے اے مسلمانو) خطاب اس اُمت سے ہو رہا ہے جس کا کام ہی دنیا میں خدائے واحد کی پرستاری تھی اور شرک اور ہر شائبۂ شرک سے بیزاری۔ ۴۱۳ یعنی وہ خدائے واحد جو ہر مکان، ہر ظرف کی قید سے پاک، ہر سمت و جہت سے منزہ ہے، اسکی ذات پاک کی تجلیات ہر طرف ہیں، سب کہیں ہیں۔ جدھر بھی رُخ کرو گے جلوہ اسی کا پاؤ گے۔ اسکی تجلیات کو کسی خاص جہت کے ساتھ محدود و مخصوص کر لینا عین جہل ہے۔ وجہ۔ لفظی معنی چہرہ کے ہیں، ثانوی معنی ذات کے ہیں۔ وجہ اللّٰہ کی ترکیب جب آئیگی مراد ذات ہی سے ہوگی، اور وہی یہاں بھی مراد ہے۔ ربما عبر عن الذات بالوجہ (راغب) فثم ذاتہ (بیضاوی) قیل الوجہ بمعنی الذات جعل ھناکنایۃ عن علمہ واطلاعہ بما یفعل ھناک (روح) آیت میں پوری تردید آگئی عقیدۂ تجسیم کی جس کیلئے انگریزی میں ایک لمبا سا نام Anthropomorphism ہے ہمارے اکابر نے بھی آیت کو اسی معنی میں لیا ہے۔ الاٰیۃ من اقوی الدلائل علی نفی التجسیم واثبات التنزیہ (کبیر) ھذا یدل علی نفی الجھۃ والمکان عنہ تعالیٰ لاستحالۃ ذالک علیہ (ابن عربی) مسیحیوں کے ہاں آج تک ایک یہی اصطلاح Orientation شرق روی کی چلی آرہی ہے اور گرجے وغیرہ شرق رویہ ہی بنائے جاتے ہیں۔ فثم وجہ اللّٰہ۔ بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ ہم بھی اسیطرح کائنات میں جس چیز پر بھی نظر ڈالتے ہیں انوار حق ہی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ ۴۱۴ وہ تو خود ہی بے پایاں وسعتوں والا ہے، بڑی ہی بڑی وسعت تو اس کے اندر شامل۔ اسے بھلا کون اپنے اندر لے سکتا ہے؟ اسکی سمائی کس بڑے سے بڑے ظرف و مکان میں ہو سکتی ہے؟ ہر سمت اور ہر جہت تو خود ہی اس کی مخلوق ہے، مملوک ہے۔ وہ لامحدود بھلا کسی محدود سمت و جہت میں گھر سکتا ہے۔ واسع باحاطتہ بالاشیاء (بیضاوی) ۴۱۵ وہ اپنے اس علم کامل اور حکمت بالغہ کے لحاظ سے جو قبلہ چاہے مقرر کرے۔ اس کے مصالح و حکم کا احاطہ کون کر سکتا ہے؟ وہ وحدت اُمت کیلئے تعین قبلہ جب کریگا مناسب ہی کرے گا۔ اس میں کسی جہت کی قدوسیت کو اصلاً دخل نہیں۔ ۴۱۶ یہ کہنے والے کون تھے؟ مراد سب سے اہل باطل لئے جا سکتے ہیں لیکن خاص طور پر اشارہ اس گروہ کی جانب ہے جس کا نام ایک پیغمبر برحق کی جانب منسوب کر کے مسیحیت رکھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ اسکے عقائد باطلہ سے نعوذ باللہ حضرت مسیح کو کوئی نسبت نہیں۔ اتخذ ولدا کا صحیح ترجمہ پیش نظر رکھا ہے ایک بیٹا بنا رکھا ہے ایک بیٹا ہے یہاں مسیحیوں کا یہ قول نہیں نقل ہو رہا ہے کہ خدا کے ایک بیٹا ہے، بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ اتخذ ولدا

صفت معلوم یہ ہو کہ خدا نے گویا کسی کو متبنیٰ کر لیا ہے۔ ــــــ قرآن مجید کی تلمیحات کو پوری طرح سمجھنے کیلئے قرآن کے صدہا مقامات کی طرح یہاں بھی اسکی ضرورت ہے کہ فرق اہل باطل کے عقائد و خیالات پر نظر رکھی جائے۔ مسیحیوں کے ہاں ایک زبردست فرقہ Adoptionists کے نام سے گذرا ہے، ان کے مرکزی عقیدہ کیلئے اصطلاحی لفظ تبنیت Adoptionism کا ہے۔ عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خلقۃً خدا نہیں۔ وہ خدا پیدا نہیں ہوئے، وہ خدا شروع سے بنے بنائے اور خود بخود نہیں ہیں۔ بلکہ اصلاً و خلقۃً وہ انسان ہی تھے البتہ اقنوم ثالث یعنی روح القدس کا فیضان ان پر شروع ہی سے ہونے لگا تھا، اسلئے وہ قدوسیت کے ایسے اوج کمال پر پہنچ گئے اور روح الٰہی انکے اندر ایسی حلول کر گئی کہ اقنوم اول یعنی خدائے برتر و اعلم نے انہیں اپنا بیٹا قرار دے کر اپنا متبنیٰ بنا کر شریک الوہیت کر لیا، اور اب وہ ربوبیت و حکمت وغیرہ جملہ صفات الٰہی میں شریک و سہیم ہیں۔ اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں آٹھویں صدی عیسوی میں ملتی ہے، آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق قرار پائے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ آیت میں صاف اشارہ مسیحیت کی اس شاخ کی جانب ہے۔ بڑے سے بڑا محقق مفسر بھی بہرحال بندہ اور بشری ہوتا ہے کسی کی نظر سے کوئی پہلو رہ جاتا ہے کسی کی نظر کوئی مسیحیت کے سلسلہ میں یہ خوب یاد رہے کہ مسیحی مذہب میں عقیدۂ ابنیت کوئی ثانوی درجہ یا فروعی حیثیت نہیں رکھتا، مسیحیت کی روح اور جان ہی عقیدہ ہے۔ ۴۱۷ (اس قسم کی بشری رشتہ داریوں کو جو اس کیلئے ہر حال میں پست اور باعث توہین ہیں)۔ تنبیہ ہے مسیحیوں کو کہ معاذ اللہ خدا کو خدا بھی کہے جاتے ہو اور پھر اس کیلئے بشری سطح والی رشتہ داریاں بھی ملائے جاتے ہو الوہیت کے باب میں کتنا گھٹیا تخیل اور کیسا کریہہ نظریہ رکھتے ہو! ۴۱۸ مخلوق کا رشتہ اپنے خالق کے ساتھ صرف مالکیت و مملوکیت مطلقہ کا ہے۔ نہ کہ فرزندی و دلبندی وغیرہ خرافات کا۔ توحید کی صاف سادہ تعلیم یہی ہے کہ حق تعالیٰ ان سارے امتیازات و تعینات سے پاک ہے جو اہل شرک نے اس کیلئے گھڑ رکھے ہیں۔ ضمناً آیت شرک کی دوسری قسموں پر بھی ضرب لگاتی جاتی ہے ہر ہستی اللہ کی مملوک ہے کوئی ہستی اسکی مملوکیت سے خارج نہیں اور ہر ہستی صرف اللہ ہی کی مملوک ہے، یہ نہیں کہ کچھ ہستیاں اسکی مملوک ہوں اور کچھ کسی اور کی۔ ۴۱۹ (اگر ارادۃً نہیں تو جبلۃً و اضطراراً) اللہ کی تکوینی محکومی اور فرمانبرداری سے چارہ کسی کو بھی نہیں۔ ــــ کل یعنی جمیع مخلوق، مومن و کافر، بلند و پست، کبیر و صغیر، زندہ و بیجان، ذی عقل و غیر ذی عقل سب اس کے آگے جھکے ہوئے، سب کی تقدیر اسکی مشیت سے وابستہ ہے۔ منقادون لا یمتنع شیء منہم علی تکوینہ و تقدیرہ و مشیتہ (کشاف) منقادون لا یمتنعون عن مشیتہ و تکوینہ (بیضاوی) قنوت کے بہترین معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اپنے جسم کی شہادت کے ذریعہ سے اللہ کی عبودیت و طاعت کا اقرار کیا جائے۔ والی معانی القنوت الطاعۃ والاقرار للہ عزوجل بالعبودیۃ بشہادۃ اجسامہم بما فیہا من آثار الصنعۃ (ابن جریر) بڑی یا چھوٹی، وحشی یا متمدن کس مخلوق کی مجال ہے جو اللہ کے بنائے ہوئے دن اور اللہ کی بنائی ہوئی رات کے چوبیس گھنٹوں کے علاوہ کوئی گھنٹہ کوئی منٹ کوئی لمحہ اپنے لئے پیدا کر سکے۔ بڑے سے بڑے ماہرین سائنس میں ہے کس کے امکان میں کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضائے کائنات سے باہر ایک گز، ایک فٹ، ایک انچ جگہ اپنے لئے تلاش کر سکے؟ کون ایسا ہے کہ اللہ نے زمان اور مکان کی جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان سے قدم باہر نکال سکے؟ کون ایسا ہے جو اس کے خلق کئے قانون حرارت، برودت، رطوبت سے بے نیاز رہ سکے؟ کون ایسا ہے جو اسکے باندھے ہوئے قانون کشش اجسام سے بغاوت کر سکے؟ اعداد، وزن، مقدار کے جو ضابطے خدا نے مقرر کر رکھے ہیں، کس میں اتنی ہمت ہے کہ گنجائش ان سے عدول و انحراف کی پا سکے؟ ــــ بڑے سے بڑے موجد، بڑے سے بڑے صناع کا کمال بجز اسکے کیا ہے کہ اس نے نظام تکوینی کے ضابطوں اور قاعدوں کی مزاج شناسی میں کمال پیدا کر لیا ہے، اور سب کے سب اسکے حضور میں وہ دوسروں سے بڑھ کر بندۂ قانت ہیں۔ کل لہ قانتون۔ اس میں رد آ گیا ہر شرک قوم کا، جن جن کو تم ابن اللہ یا دیوی یا دیوتا مانتے ہو، وہ اللہ کے شریک و سہیم و ہمسر تو کسی حیثیت سے بھی کیا ہوتے سب کے سب اسکے محکوم، اسکی مخلوق، اسکے قوانین تکوینی کے تابع و مسخر ہیں۔ ــــ ۴۲۰ (اور اسی طرح ساری مخلوق کا نیز ان سب سے سابق و متقدم بھی ہے) بصیر یہاں مبصر کے معنی میں اور بدیع یہاں مبدع کے معنی میں ہے۔ جیسے الیم مولم کے معنی میں اور سمیع مسمع کے معنی میں آتا ہے۔ البدیع یقال للمبدع (راغب) لانہ مبدعہا وانما ہو مفعول صرف الی فعیل کما صرف المؤلم الی الیم (ابن جریر) اور مصدر ابداع کے معنی ہیں نیست سے ہست کرنا، عدم محض سے وجود میں لانا بغیر کسی مثال یا نمونہ کے اور بغیر کسی سابق مادہ یا ہیولیٰ کے۔ الابداع انشاء صنعۃ بلا احتذاء واقتداء (راغب) واذا استعمل فی اللہ تعالیٰ فہو ایجاد الشیء بغیر آلۃ ولا مادۃ ولا زمان ولا مکان (راغب) بدیع وہ ہے جو خود کسی آلہ کا محتاج ہو نہ کسی خام مسالہ کا، نہ مقام و مکان کا پابند، نہ زمان و وقت کا مقید، محتاج کسی نمونہ کا، نہ استاد کا، وہ صناع ہے کاریگر نہیں۔ اصل اور حقیقی معنی میں خالق اور موجد ہے بغیر کسی کی اعانت و شرکت کے وجود میں لانیوالا۔ معنی المبدع المنشیء والمحدث مالم یسبقہ الی انشاء مثلہ واحداثہ احد (ابن جریر) ہو بارئہا وخالقہا وموجدہا من غیر اصل ولا مثال احتذاہا علیہ (ابن کثیر) یہ لفظ ان شرک قوموں کے رد میں ہے جو خدا کو محض صانع کی حیثیت دیتے ہیں اور روح یا مادہ یا دونوں کو کسی کسی درجہ میں اس کا شریک و سہیم رکھتے ہیں گویا مادہ پہلے سے موجود ہی تھا وہ قدیم و غیر حادث ہے یا روح بھی اسکے ساتھ ساتھ قدیم و غیر حادث ہے۔ اب خدا نے صرف اتنا کیا کہ ایک اعلیٰ درجہ کے کیمسٹ کی طرح ان میں باہم ترکیب و ترتیب سے نئی نئی صورتیں نمودار کر دیں۔ بدیع کا لفظ سارے مشرکانہ تخیلات کی تردید کیلئے کافی ہے۔ تقدم ذاتی کے علاوہ تقدم زمانی بھی تمام صفات کمال کی طرح اسکی ذات کیلئے ثابت ہے، وہ سب پر زمانہ بھی مقدم ہے ایک زمانہ تھا کہ عرش، فضا، اور کچھ بھی نہ تھا، نہ جمادات نہ حیوان۔ انہ تعالیٰ خالق الجہات کلہا وانہ تعالیٰ متقدم علی المخلوق کلہا لانہ کبیر تقدم کل الحادث والی قبل خلق العالم منزہا عن الجہات والحیز (کبیر) ۴۲۱ محض اپنے ارادہ و مشیت سے اور محض اپنی حکمت مطلقہ کے مقتضیٰ کی حیثیت سے (معنی قضی ہنا اراد و احکم بانہ یفعل شیئاً (کبیر) اے حکم (مدارک) قرآن کا خدا صاحب ارادہ، ذی حیات، صاحب اقتدار خدا ہے یونان کے فلسفیوں اور بعض دوسرے مشرکوں کے خدا کی طرح صرف ایک بیجان، مسلوب الارادہ علت العلل یا آخری سبب نہیں۔ ۴۲۲ یعنی عدم محض سے وجود میں آ جاتا ہے۔ بس یہ سمجھانا۔ یہ قول گویا کہنا اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری آپ کی طرح یہ دو حرفی لفظ کن بولتا ہے، لفظ و حرف تو خود ہی حادث ہیں اور حق تعالیٰ کا تلفظ زبان، ہونٹ یا اعصاب کا محتاج ہے۔ بندوں کی سمجھ کے لائق تو اسکے سوا اقرب سے اقرب پیرایہ بیان اور اسلوب تعبیر کیا اختیار کیا جائے۔ یہ بر زعم لزوم وقال قبیل من خاک برفرق من و تمثیل من مقصود صرف یہ ہے کہ ادھر حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا ادھر وہ شے معاً بلا توسط و توقف اس کا ظہور عملاً ہو گیا۔ وہذا مجاز عن سرعۃ التکوین والتمثیل ولا قول ثم (مدارک) قلنا ان کن لیس بامر حقیقۃ اذ لا فرق بین ان یقال واذا قضی امراً فانما یکون فیکون وبین ان یقال فانما یقول لہ کن فیکون (مدارک) لیس المراد بہ حقیقۃ امر وامتثال بل تمثیل حصول ما تعلقت بہ ارادتہ بلا مہلۃ بطاعۃ المامور المطیع بلا توقف (بیضاوی) لہ میں ضمیر اس چیز کی جانب ہے جس کا وجود ابھی خارج میں نہیں ہوا لیکن علم الٰہی میں تو بہرحال موجود ہی ہے اور امر الٰہی کے لحاظ سے مامور و موجود میں کوئی فرق ہی باقی حیثیت سے نہیں ہر امر کے معنی موجود ہونے کے ہیں، اور ہر موجود کے معنی مامور ہونے کے ہیں۔ الامر والشیء ہنا کلا یتقدم الوجود ولا یتاخر عنہ فلا یکون الشیء مأموراً بالوجود الا وہو موجود بالامر ولا موجوداً الا وہو مأمور بالوجود (ابن جریر) اطلق علی تعلق الارادۃ الالہیۃ بوجود الشیء من حیث انہ یوجبہ (بیضاوی) ہو بمنزلۃ الموجود اذ ہو عندہ معلوم بمنزلۃ المخاطب ہو ذلک الشیء الموجود فی علم اللہ تعالیٰ لا الامر والدخول فی الوجود الخارجی (کبیر) کن فیکون۔ یکن یہاں تامہ ہے ناقصہ نہیں یعنی ہو جا موجود میں آ جانے کے مرادف ہے۔ فلاں چیز ہو جا یا بن جا کے مرادف نہیں ہیں۔ کن الشامۃ بمعنی احدث فیحدث (بیضاوی) ۴۲۳ یعنی بس وہ شے معاً وجود میں آ جاتی ہے۔ اسکے ہونے میں کچھ دیر نہیں لگتی ہے۔ اس کیلئے کسی اعانت و وساطت شرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ المراد من ہذہ الکلام ہو بیان قدرۃ اللہ تعالیٰ فی تکوین الاشیاء (کبیر) یہی گویا شرکین ہی کو خطاب ہے کہ تم عمل تخلیق خداوندی کو کچھ یا ہوا سمجھو اس میں تو بجز ارادۂ الٰہی کے اور کسی چیز کی شرکت کا گزر ہی نہیں اور اس سے تمہارے شرک کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ ۴۲۴ یعنی علم حقیقی سے علوم آسمانی سے مراد مشرکین ہیں۔ وہم کفار العرب (ابن جریر عن قتادۃ والربیع) والمراد جہلۃ المشرکین وقد روی ذلک عن قتادۃ والسدی والحسن وجماعۃ (کبیر) ۴۲۵ (براہ راست اور بلا واسطہ انبیاء و رسل) آگے اکثر یہ مسئلہ انبیاء ابن مردویہ کے یہاں ہلا کے معنی میں ہے اور ہلا کا اردو ترجمہ کیوں نہیں ہی ہو سکتا ہے اور محاورۂ قرآنی میں لولا عموماً اسی معنی میں آتا ہے یعنی ہلا ہیکلمنا اللہ ابن جریر کل ما فی القرآن لولا فہو بمعنی ہلا الا واحداً (اسیاطی) سیوطی نے بھی اتقان انوع ۴۲ میں یہ قول خلیل نحوی اور ہاکٹ سے نقل کیا ہے۔ مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ خدا اگر اپنے فلاں فلاں بندہ سے یہ قول انہیں کے کلام کر سکتا ہے اور کرتا ہے تو آخر ہم ہی کو کیوں نہیں کرتا، ہم بھی تو انسان ہی ہیں احمقوں کے نزدیک مکالمۂ الٰہی کیلئے گویا وصف بشریت کافی تھی۔

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ

کہتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتا ہے اور جنہیں علم سے بہرہ نہیں وہ کہتے

لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ

ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشان (عظیم) کیوں نہیں آجاتا اسی طرح

مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ

وہ لوگ کہہ چکے ہیں جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہیں کا سا کہنا ان کے قلوب تشابہ ہو گئے

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ

ہم نے اپنے نشان تو کھول کھول دیئے ہیں ان لوگوں کیلئے جو یقین رکھتے ہیں ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے

بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ

خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور آپ سے اہل دوزخ کی بابت کچھ بھی پوچھ

الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى

نہ ہوگی اور آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز خوش نہ ہوں گے

حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ

جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصلی ہدایت ہے

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ

اور اگر آپ بعد اس علم کے جو آپ کو پہنچ چکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی

الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ

کرنے لگے تو آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) کے مقابلہ میں نہ کوئی یار ہوگا نہ مددگار جن لوگوں کو

وقف منزل

اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىٕكَ

ہم نے کتاب دی ہے اور وہ لوگ اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اسکے پڑھنے کا حق ہے ۴۲۷ وہ لوگ

یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اس پر ایمان لے آئیں گے ۴۲۸ اور جو کوئی اس سے کفر اختیار کریگا تو یہی لوگ پورا نقصان اٹھانے والے ہیں ۴۲۹

۱۴ ع ۹ ۱۴

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ

اے بنی اسرائیل میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم کو بخشیں ۴۳۰

وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ

اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی ۴۳۱ اور اس روز سے ڈرو جب نہ کوئی

نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا

کسی کے بھی کام آئے گا اور نہ اس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائیگا اور نہ اسے

تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ

سفارش نفع پہنچا سکے گی اور نہ انہیں مدد ہی پہنچ سکے گی ۴۳۲ اور اور وہ وقت بھی یاد کرو جب

رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ

ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند امور میں آزمایا ۴۳۳ اور انہوں نے وہ انجام دے دیئے، ارشاد ہوا کہ میں

اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی

یقیناً تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں ۴۳۴ بولے اور میری نسل سے بھی؟ ۴۳۵ ارشاد ہوا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو

الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ

نہیں پہنچتا ۴۳۶ اور اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کیلئے ایک مقام رجوع اور

۴۲۶ (جس سے ہم چاروناچار ان پیمبر کے دعوی کی تصدیق کرہی دیں)۔ ایۃ کے لفظی معنی نشان کے ہیں، قرآن مجید میں بکثرت معجزہ کے معنی میں آیا ہے اور یہاں بھی یہی مراد ہے۔ اور معجزہ سے مراد وہ واقعہ ہے جو معمول عام سے ہٹا ہوا ہو اور بلا اسباب ظاہری اس کا ظہور تائید رسول کے لئے ہو۔ رسول اللہ صلعم کی صداقت پر معنوی دلائل وشواہد تو کثرت سے موجود تھے لیکن مشرکین کی طرف سے یہیم فرمائشیں یہ جاری رہیں کہ کوئی عظیم الشان، حیرت انگیز حسی معجزہ دکھایا جائے جس کے بعد گنجائش ہی چون وچرا کی نہ رہے۔ جن لوگوں کی عقلی، روحانی، اخلاقی سطح پست ہے، ان کی طرف سے اولیاء ربانی سے فرمائشیں آج بھی اس قسم کی خارق عادت کرامات ہی کے ظہور کی ہوتی رہتی ہیں۔ ایۃ کی تنوین اظہار عظمت کے لئے ہے یعنی کوئی عظیم الشان لرزہ انگیز معجزہ ۴۲۷ (اپنے اپنے زمانہ کے پیغمبروں اور داعیان حق سے یہی ان کی فرمائشیں کوئی نئی نہیں) اور ان کا یہ مطالبہ کوئی نرالا نہیں۔ جاہلوں نے ہر دور اور ہر ملک میں اس قسم کی فرمائشیں پیش کی ہیں۔ رسالت محمدی سے حضرات انبیاء میں قریب ترین زمانہ حضرت عیسیٰ کا گزرا ہے۔ آپ عرب میں نہیں شام میں تھے، آپ بھی تعلیمات اور اصل پیام کو چھوڑ کر تقاضے ہمیشہ آسمانی نشانوں کے ہوتے رہتے تھے۔ "فریسیوں اور صدوقیوں نے پاس آکر آزمانے کے لئے اس سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی آسمانی نشان دکھا" (متی ۱:۱۶) یہاں تک کہ خود حق تعالیٰ کو لاکر دکھانے کی فرمائش شروع ہوگئی تھی۔ "فلپس نے اس سے کہا کہ اے خداوند ہمیں باپ کو دکھا بس ہمیں کافی ہے" (یوحنا ۸:۱۴) ۴۲۸ یعنی اگلوں اور پچھلوں کے قلب بالکل ایک سے ہیں بے بصیرتی اور ناحق شناسی میں۔ انجیل میں غضبناکی کے لہجہ میں ہے۔ "اس زمانہ کے برے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یونس کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائیگا" (متی ۴:۱۶) "اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو، تم ہروقت روح القدس کی مخالفت کرتے ہو جیسے تمہارے باپ دادا کرتے تھے، ویسے ہی تم بھی کرتے ہو۔ نبیوں میں کس کو تم نے نہیں ستایا" (اعمال ۷:۵۱-۵۲)

۴۲۹ مطالبہ ایک نشان (آیۃ بصیغہ واحد) کا تھا جواب یہ ملا کہ یہاں تو نشان پر نشان (الآیات بصیغہ جمع) پیش کئے جاچکے ہیں۔ تاریخ اور سیرت میں جن معجزوں کا ذکر آتا ہے ان سے قطع نظر، معجزے تو بالکل بین، ونمایاں تھے۔ ۱۔ رسول اللہ صلعم کا سچائی، امانت، پاکبازی، عقل وفہم کے لحاظ سے بے نظیر ہونا۔ آپ کی سیرت مبارک کے ایک ایک جزو کا بجائے خود معجزہ ہونا۔ ۲۔ قرآن مجید کا لفظی، معنوی، ظاہری، باطنی، تعلیمی، ادبی اعتبار سے بے مثل ہونا۔ بینا۔ یعنی یہ نشانات کچھ ان سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم نے انہیں بالکل واضح وآشکار کر رکھا ہے۔ ان میں کسی طرح کا خفا نہیں۔ قد بینا۔ قد کی تاکید نے بینا کی صراحت کو اور زیادہ زوردار بنا دیا۔ اور اسی کے اظہار کے لئے اردو ترجمہ میں "کھول کھول" لایا گیا ہے۔ لقوم یوقنون یعنی یہ کھلے ہوئے نشان بھی نظر انہیں لوگوں کو آتے ہیں جن کے قلب جہل وعناد کی گندگی اور شک وارتیاب کی آلودگیوں سے پاک ہیں۔ شواہد ودلائل خواہ کسی قسم کے ہوں، حسی یا معنوی، بہرحال ان سے نفع حاصل کرنے کے لئے دیدۂ بصیرت وچشم بینا ضروری ہے۔ آنکھ رکھنے والے کے لئے پیمبر کی کتاب زندگی کی ایک ایک سطر معجزہ ہے۔ عارف رومی نے اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے ؎ دردل ہر کس کہ از دانش مزاست — روئے وآواز پیمبر معجزاست

اما من كان فى ارتياب اوشك اوتغافل اوجهل فلا ينفع فيه الآيات ولوكانت فى غاية الوضوح (بحر)۔ یقین شک کی ضد ہے اور علم وتحقیق کے مرادف ہے۔ اليقين ازاحة الشك والعلم وتحقيق الامر ونقيضه الشك (تاج) لقوم يوقنون کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جو یقین کی طلب اور پیاس اپنے اندر رکھتے ہیں اے طالبون معرفة حقايق الاشياء على يقين وصحة (ابن جرير) اے يطلبون اليقين (بیضاوی) ۴۳۰ (سارے عالم کے لئے ہمارے پیغمبر) بالحق۔ حق کے ساتھ۔ یعنی دین حق کے ساتھ یا اوحی کا بادی بنا کر، یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ حقانیت وصداقت کے ساتھ مع اس کی ساری ترتیب اور دلائل کے۔ بشیرا۔ مومنین مطیعین کے حق میں کہ جو آپ کے پیام کو مان لیں گے ان سے دنیا وآخرت دونوں کی فلاح کا وعدہ ہے۔ نذیرا۔ منکروں اور سرکشوں کے حق میں کہ جو آپ کے پیام سے بغاوت کریں گے ان کی آخرت تو یقیناً اور دنیا اکثر تباہ ہوکر رہے گی۔ اقبال نے لطف قرار داد سرا پا رحمتے — آں بہ یاراں نیز بر اعدا رحمتے ۴۳۱ (اور اہل دوزخ وہی ہو گئے جو آپکے پیام کے منکر ہیں) تو مطلب یہ ہوا کہ منکرین کے انجام کی ذمہ داری آپ پر کیا ہے؟ آپ کیوں ان کے لئے اس قدر فکر وتشویش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ کا فرض تو پیام پہنچا دینے پر ختم ہو جاتا ہے۔ آگے کی ذمہ داری آپ پر ذرا بھی نہیں۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ جو کوئی خود اپنی اصلاح نہ چاہے مرشد کو اس کے زیادہ درپے نہ رہنا چاہئے ۴۳۲ (خواہ آپ ان کی کتنی ہی رعایت ملحوظ رکھیں اور ان کے ساتھ برتاؤ کتنی ہی غمخواری اور دلسوزی کا رکھیں) یہ حکم ——— نصرانیوں سے متعلق ہے جو بہرحال اہل کتاب تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مشترک ایمان سلسلہ وحی ونبوت پر رکھتے تھے۔ تو جو کھلے ہوئے اہل شرک ہیں، اور اسلامی عقائد سے اشتراک کسی درجہ کا بھی نہیں رکھتے، ان کی رضاجوئی اور ان سے توقع صلح رکھنے کا جو حکم ہوگا ظاہر ہی ہے ۴۳۳ (یعنی اس مذہب کے جو انہوں نے گڑھ رکھا ہے۔ اور اپنے دین حق سے دستبردار نہ ہو جائیں) ملۃ کے معنی مذہب اور طریقہ کے ہیں۔ الملة الشريعة اوالدين (قاموس) قال ابو اسحق الملة السنة والطريقة (تاج) دین اور ملت میں فرق یہ ہے کہ دین کا استعمال اللہ اور افراد امت کے سلسلہ میں ہوتا ہے، مثلاً دین اللہ یا دین زید اور ملۃ کا استعمال نبی اور جماعت کے سیاق میں ہوتا ہے، جیسے ملت ابراہیم یا ملت یہود (راغب الفظ ملة کے صیغہ واحد سے فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کفر جس قسم کا بھی ہو بہرحال ایک ہی ملت کے حکم میں ہے۔ وقد استدل كثير من الفقهاء على ان الكفر كله ملة واحدة (ابن کثیر) اور اسی اصل کی بنا پر وراثت کافروں اور مسلموں کے درمیان جائز نہیں رکھی ہے، لیکن کافروں کافروں کے درمیان جائز رکھی ہے، خواہ ان کا کفر آپس میں مختلف ہی ہو۔ وهذا مذهب الشافعى وابى حنيفة واحمد فى رواية عنه (ابن کثیر) ۴۳۴ (حق وصواب کی اسی پر عقل ونقل کے دلائل کا اتفاق ہے اور یہی اللہ کی بتلائی ہوئی راہ کا نام طریق اسلام ہے) ۴۳۵ (سائل دین میں۔ اور یہ پیروی ان کے لئے محال ہے) لئن میں لام قسم کا ہے تاکید وقطعیت کے لئے ہے۔ لام قسم (جلالین) قرآن ہے خدا کا کلام لیکن ہے بہرحال محاورۂ انسانی میں، انسانی کلام میں جہاں جہاں قسم کا موقع آتا ہے قرآن میں بھی اس کی رعایت کی جائیگی۔ اھواء سے مراد وہ رائیں اور خیالات ہیں جو علم وحقیقت کے بجائے نفسانی خواہشوں پر مبنی ہوں۔ اے آراءهم الزائغة (بیضاوی) والهوى رأى يتبع الشهوة (بیضاوی) العلم سے مراد علم وحی ہے، ہر طرح قطعی ویقینی اور ہر اشتباہ سے بالاتر۔ العلم الوحى (بیضاوی) اے من بعد الذى اقتصصت عليك من نبئهم (ابن جرير) گویا ایک سرے پر العلم ہے، حقیقت سے تمام تر لبریز، اور دوسرے سرے پر اھواء، حقیقت سے تمام تر خالی۔ استدلال قرآنی کی منطقی شکل گویا اب یہ ہوئی۔ ۱۔ یہود ونصاریٰ کی رضاطلبی کے لئے لازمی ہے کہ آپ ان کا دین اختیار کریں، لیکن ان کا دین سر تا سر محرف وباطل ہے۔ اس لئے ان کی رضاطلبی کے لئے لازم ہوا کہ آپ دین محرف وباطل اختیار کریں۔ ۲۔ جو رحمت خاص اور دین سے مالامال اور توفیق الٰہی سے سرفراز ہو اس کے لئے باطل کی پیروی محال ہے۔ آپ رحمت خداوندی سے مالامال اور توفیق الٰہی سے سرفراز ہیں۔ اس لئے آپکے لئے پیروی باطل محال ہے۔ ۳۔ اور جب آپکے لئے پیروی باطل محال ہے، تو وقت یہود ونصاریٰ کی پیروی جو خود ایک شکل زیغ وباطل ہی کی ہے اس کی پیروی بھی محال ہے۔ اور اس لئے ان باطل پرستوں کی حصول رضا کی بھی کوئی شکل آپکے لئے نہیں۔ آگے جو وعید اتباع باطل پر آئی ہے وہ اس کے ساتھ قید بعد الذى جاءك من العلم کی لگی ہوئی ہے، اس قید سے امام رازیؒ نے استنباط کیا ہے کہ وعید ہمیشہ دلائل صریح کے بعد ہی ہوگی۔ يدل على انه لا يجوز الوعيد الا بعد نصب الادلة (کبیر) ۴۳۶ ولی یار، اس دنیا میں اور نصیر، مددگار، عالم آخرت میں۔ خوب خیال رہے کہ رسول اللہ صلعم کو خطاب کرکے یہ بات محض بطور فرض کے کہی گئی ہے۔ اور فرض جب کہ بات عقل تک کے جاسکتے ہیں تو محالات عادی یا ممتنعات شرعی کے فرض کرلینے میں تو ادنی بھی کوئی اشکال نہیں۔ اور اس طرز مخاطبت سے مقصود بھی غالباً مسلک کی اہمیت پر زور دینا ہے۔ منکروں کی طرف میلان پر اتنا تشدد جب خود رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے۔ فيه تهديد ووعيد شديد للامة عن اتباع طرائق اليهود والنصارى (ابن کثیر) اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں خطاب رسول اللہ صلعم سے صرف لفظاً ہے ورنہ مراد امت ہی ہے اور اصل حکم اسی کو ہے۔ الخطاب مع الرسول والامر للامة (ابن کثیر) وقيل خطاب مع النبى والمراد به الامة (معالم) وقيل المقصود منه امته (روح) ۴۳۷ یعنی دل سے اس کی تعظیم واحترام کرتے ہیں۔ اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ اس میں تحریف وتغیر کو راہ نہیں دیتے حق تلاوت ادا کرنے میں یہ سب کچھ آگیا۔ يتبعونه حق اتباعه (ابن عباس) يحرفون الكلم عن مواضعه ولايتأولونه على غير الحق (کبیر) الکتب سے مراد توریت ہے۔ یعنی التوراة (ابن عباس) الذين اٰتينٰهم سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں۔ هم اليهود والنصرى وهو قول عبد الرحمن بن زيد واختاره الطبرى (کبیر)

۴۳۸ اور اسلام قبول کریں گے، مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب ضد نفسانیت، ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیتے وہ خود اپنی کتاب کے مطالعہ سے قرآن کی حقانیت وصداقت کے قائل ہو جائیں گے، اور رسول اللہ صلعم پر ایمان لے آئیں گے۔ یؤمنون بہ میں ضمیر رسول اللہ صلعم کی جانب بھی پھیری جاسکتی ہے۔ اس تاویل سے کہ اوپر آپ کا ذکر انا ارسلناک بالحق میں مضمر ہے۔ قیل یعود علی النبی صلعم وقد تقدم ذکرہ فی قولہ انا ارسلناک بالحق (بحر) اکثر نے الکتب کی طرف پھیری ہے۔ ظاہرہ ان الضمیر فی بہ یعود الی ما یعود الضمیر فی یتلونہ لہ الکتب (بحر) لیکن سب سے انسب یہ ہے کہ ضمیر میں مرجع الحق (آیت ۱۱۹) اور العلم (آیت ۱۲۰) کو مانا جائے اور معنی یہ کئے جائیں کہ یہ لوگ اس دین حق اور علم وحی پر ایمان لے آئیں گے۔ مفسر تھانوی اور مفسر دہلوی (شاہ عبدالعزیز) دونوں نے یہی ترکیب اختیار کی ہے۔ یہ اختلافات صرف ترکیب نحوی کے لحاظ سے ہیں، مآل و مقصود کلام ہر صورت میں تقریباً ایک ہی ہے ۴۳۹ (دنیا و آخرت میں) منکرین اسلام یہود کی ہلاکت آخرت میں تو یقینی ہے۔ دنیا میں بھی ان کی بربادی سب کے مشاہدہ میں آچکی ہے۔ یکفر بہ میں بھی ضمیر کے مرجع کے بارہ میں اختلافات ہیں اور انسب یہاں بھی یہی ہے کہ الحق والعلم کو مانا جائے ۴۴۰ قوم بنی اسرائیل اور ان پر جو احسانات خداوندی تھے ان کا تعارف رکوع ۵ میں مفصل کرایا جاچکا ہے۔ وہیں کے حاشیے ملاحظہ فرمالئے جائیں شروع میں تاریخ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے زمانہ سے بیان ہوئی، یعنی اس کے اس عہد کی جب وہ مستقل صاحب کتاب وشریعت ہو کر آزاد و خود مختار رہے اور ہر طرح کی نافرمانی و سرکشی میں بھی مبتلا ہے اب اس کے قدیم ترین دور یعنی عہد ابراہیمی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے حضرت ابراہیم ہی کے بعد سے تو آپ کی نسل کی دو شاخیں ہوئیں اور ایک کا نام دو پشتوں کے بعد ہی اسرائیل پڑا ۴۴۱ توحید کی علمبردار اور مبلغ کی حیثیت سے۔ قرآن مجید جو دعویٰ کرتا ہے کسی کی پروا کئے بغیر بے تکان اور بے دھڑک کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کو اس نے مطلق صورت میں بلا کسی قید و شرط کے، اس وقت تک کی تمام قوموں کے مقابلہ میں افضل قرار دیا ہے۔ یہ افضلیت اسی نعمت توحید کی بنا پر تھی۔ دنیا کی دنیا شرک کی لعنت میں مبتلا تھی۔ توحید پر قائم صرف یہی قوم تھی۔ اور سلسلہ نبوت کی قائل صرف یہی نسل تھی تفصیل کے لئے رکوع ۵ کے حاشیے ملاحظہ فرمالئے جائیں۔ بنی اسرائیل کو ان کے عروج اور ان کی گمراہیوں کی سرگزشت سنا کر یاد دلایا جارہا ہے کہ ان کی افضلیت و اشرفیت کا راز تھا کیا؟ یہی تھا کہ وہ موحد اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں تھے۔ اور توحید و نبوت کی امانت انہیں کی نسل کے سپرد کی گئی تھی۔ انہیں اگر پھر استفادہ انہیں انعامات سے منظور ہے تو چاہئے کہ اسی دین ابراہیمی کی طرف رجوع کریں ۴۴۲ کسی طرف سے بھی۔ اور نہ ان کی فریاد رسی کسی سے بھی ہوسکے گی ایک آیت ہی رکوع ۶ میں گزر چکی۔ اور وہیں اس پر متعدد حاشیے دیئے جاچکے ہیں۔ بنی اسرائیل نے اس وقت ایک تو عقیدۂ قیامت کو بالکل بھلا دیا تھا اور جزا و سزا کی ساری صورتیں اسی دنیا میں محدود سمجھ لی تھیں۔ چنانچہ موجودہ توریت میں بھی جہاں جہاں سعادت و شقاوت کے ثمرات مذکور ہیں، اسی دنیا کی خوشحالی و بدحالی کا بیان ہے۔ اس لئے تو انہیں یوم آخرت کی یاد دلائی گئی۔ اور پھر ان کی گمراہی کے ایک ایک مرکزی عقیدہ، شفاعت، کفارہ وغیرہ پر ضرب لگائی گئی۔ آیت کے الفاظ اتنے جامع ہیں کہ یہود کے ساتھ نصرانیت کی بھی جڑ کٹی جاتی ہے۔ نصرانیت کی بنیاد ہی شفاعت، کفارہ وغیرہ ہی کے عقائد باطلہ پر ہے ۴۴۳ یہ نام پہلی بار قرآن میں آیا ہے۔ قرآن کے مخاطب اول اہل عرب تھے، جو شخصیتیں ان کے لئے معلوم و معروف تھیں، قرآن ان کے نام ان کے سامنے بے تکلف بغیر کسی مزید تعارف کے لے آتا ہے۔ اور پھر ابراہیم تو وہ بزرگ تھے جن سے علاوہ مشرکین عرب کے یہود و نصاریٰ بھی خوب ہی واقف تھے۔ ان کا تعارف اور بھی غیر ضروری تھا۔ ابراہیم علیہ السلام وہی ہیں جو اسلامی عقیدہ کے علاوہ یہودی و نصرانی عقیدہ میں بھی ایک بڑے جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں۔ توریت میں آپ کا نام ابرام اور ابراہم دونوں طرح سے آیا ہے۔ توریت کی روایت ہے کہ آپ کے اور حضرت نوح کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہوا ہے۔ یعنی آپ ان کی گیارھویں پشت میں تھے۔ لیکن خود توریت ہی کے شارحین کا خیال بعض قوی قرائن کی بنا پر یہ ہے کہ توریت ...... میں نسب نامہ کی کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں۔ سال ولادت سرچارلس مارسٹن محقق اثریات کی جدید ترین تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ ق م ہے اور عمر شریف توریت میں ۱۷۵ سال درج ہے، سال وفات اس حساب سے ۱۹۸۵ ق م ٹھہرتا ہے۔ والد کا نام تارح تھا، عربی تلفظ میں آزر نام کا تلفظ قدیم زبانوں میں کئی کئی طرح آیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے قرآنی لفظ آزر کافی ہے۔ وطن آبائی ملک بابل کے کلدانیہ (انگریزی تلفظ میں کالڈیا) اقلیم جدید جغرافیہ میں اسی کو ملک عراق کہتے ہیں، جس شہر میں آپ کی ولادت ہوئی اس کا نام توریت میں اُور (UR) آیا ہے۔ مدتوں یہ شہر نقشہ سے غائب رہا۔ اب از سر نو نمودار ہوگیا ہے۔ کھدائی کے کام کی داغ بیل ۱۹۲۲ء ہی میں پڑ گئی تھی ۱۹۲۲ء میں برطانیہ اور امریکہ کے ماہرین اثریات کی ایک مشترک تحقیقی مہم برٹش میوزیم اور پنسلوینیا یونیورسٹی کے زیر اہتمام عراق کو روانہ ہوئی۔ اور کھدائی کا کام پورے سات سال تک جاری رہا۔ رفتہ رفتہ پورا شہر نمودار ہوگیا اور عراق گورنمنٹ کے محکمہ آثار قدیمہ نے عجائب خانہ کے حکم میں اکثر کھنڈروں کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شہر خلیج فارس کے دہانہ فرات اور عراق کے پایہ تخت بغداد کے تقریباً درمیانی مسافت پر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور نبوت چونکہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصرانیوں کو بھی مسلم ہے۔ اسی لئے ان قوموں کے علماء نے بھی آپ کے حالات کی تحقیق و جستجو میں کوئی درجہ کاوش کا اٹھا نہیں رکھا ہے۔ موجودہ محرف بائبل میں تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اکتا کر بعض ”روشن خیال“ محققین نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم نامی کوئی تاریخی شخصیت گزری ہی نہیں۔ بلکہ یہ محض ایک زعمی نام تھا یا ہر شیخ قبیلہ کا لقب۔ لیکن اب پھر تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے پھر آپ کی تاریخی شخصیت کا پوری طرح قائل ہو جانا پڑا ہے۔ نسل اسرائیلی اور نسل اسمٰعیلی دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک مدتوں سے چلی آرہی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں سلسلوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اللہ کی نعمت خاص الخاص یعنی توحید کی علمبرداری اب نسل اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھن کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر کے واسطہ سے اب ساری دنیا کے لئے عام ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ابراہیمی شخصیت اور ان کے ضمن میں اسمٰعیلی شخصیت کی مرکزیت اور اہمیت سے دنیا کو روشناس کر دیا جائے۔ چنانچہ یہاں یہی ہو رہا ہے ۴۴۴ اور وہ چند امور احکام تھے اوامر و نواہی کی قسم کے۔ ابتلا۔ آزمایا اپنی واقفیت کے لئے نہیں کہ وہ تو خود علیم کل ہے۔ بلکہ علی الاعلان اکثر دوسروں کو ان کے ایمان کامل کا مشاہدہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سلسلہ میں آزمانے کا لفظ جب بھی استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے۔ وابتلاء اللّٰہ العباد لیس لیعلم احوالہم بالابتلاء لانہ عالم بہم ولکن لیعلم العباد احوالہم (معالم) کلمٰت۔ یہ کلمات کیا تھے ان کی تعیین میں بڑا اختلاف ہے۔ قد اختلف العلماء فیہا اختلافا کثیرا (بحر) لیکن تفصیل ان کی جو کچھ بھی ہو، بہرحال تھے وہ احکام شرائع ہی۔ ای شرائع الاسلام (معالم عن ابن عباس) ای اختبارہ لہ بما کلفہ من الاوامر والنواہی (ابن کثیر) ۴۴۵ یعنی آپ ان امتحانوں میں پورے اترے اور ان احکام کی تعمیل کر دی۔ ای فاداھن (ابن جریر عن ابن عباس) ای عمل بھن (ابن جریر عن قتادۃ) روایات یہود میں بھی یہ ذکر آیا ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی ۴۴۶ (کہ لوگ دین و شریعت میں تمہاری اقتدا کریں۔ ای یاتمون بک فی دینک (کبیر) ای یاتمون بک فی دینہم (مدارک) اماماً۔ امام کہتے ہی ایسے ہیں جس کی پیروی کی جائے، لغت میں بھی اور اصطلاح شریعت میں بھی۔ ھو اسم من یؤتم بہ (مدارک) اسم الامامۃ مستحق لمن یلزم اتباعہ والاقتداء بہ فی امور الدین او فی شئی منہا (جصاص) توریت میں بھی یہ وعدہ امامت ان الفاظ میں ملتا ہے۔ ”اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بزرگ کروں گا، اور تو ایک برکت ہوگا۔ اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا، اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کروں گا۔ اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے۔“ (پیدائش ۱۲: ۲-۳) یہ دینی سرداری اور امامت پورے ایک عالم کی آج تک آپ کے حصہ میں چلی آرہی ہے۔ اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذاہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں یعنی یہودیت و نصرانیت وہ آپ کی امامت پر متفق و متحد ہیں۔ ایک مورخ فرنگی فاضل، بیسویں صدی کے ثلث اول کے خاتمہ پر آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے۔ ”ابراہیم کی ہستی کسی بدوی سردار کی نہ تھی کہ وہ لوٹ مار کرتے اور ملک گیری کرتے پھرتے۔ ان کی اصل اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے۔ وہ حقیقۃً مورث اعلیٰ کسی نسل کے نہیں، بانی و امام وہ مذہبی تحریک کے تھے محمد کی طرح جو ان کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے، وہ سامی قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور توریت کے حسب روایت وہ اسرائیلی مذہب کے بانی تھے۔“ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول طبع چہاردہم) جن لفظوں کو یہاں ترجمہ میں جلی کر دیا گیا ہے انہیں ایک بار پھر پڑھ لیا جائے۔۔۔ یورپ کی زبان سے اللہ کے حبیب اور اللہ کے خلیل کے درمیان مماثلت کا یہ اعتراف! بس اللہ ہی کی شان ہے۔ آیت سے ایک نتیجہ فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ احکام کی تعمیل و امتحان الٰہی میں کامیابی انسان کو دینی پیشوائی و سرداری کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اور انبیائے کرام کے بعد اولیاء امت اور علماء امت کی امامت، اپنے اپنے ظرف وحیثیت کے مطابق، اسی قانون کی مظہر ہے۔ فقیہ جصاص رازی نے کہا ہے کہ فالانبیاء علیہم السلام فی اعلیٰ مرتبۃ الامامۃ ثم الخلفاء الراشدون بعد ذلک ثم العلماء و القضاۃ العدول ومن الزم اللّٰہ تعالیٰ بالاقتداء بہم ثم الامامۃ فی الصلوٰۃ ونحوہا (احکام القرآن) امامت کے جو معنی بیان ہوئے اس کے لحاظ سے امامت کے اعلیٰ مرتبہ پر تو حضرات انبیاء فائز ہوتے ہیں۔ ان کے بعد خلفائے راشدین ہیں، پھر عادل علماء اور عادل ججوں کا آتا ہے اور ان کا جن کی پیروی خدا نے لازم کر دی ہے۔ پھر امامت نماز ہے وغیرہا ۴۴۷ (امام ہوتے رہیں گے، عالم کی پیشوائی، سرداری وامامت کی بشارت پا کر ابراہیم علیہ السلام کا دل قدرتی طور پر باغ باغ ہوگیا اور اس جوش مسرت میں سوال کر بیٹھے کہ اس انعام میں میری نسل اور میری اولاد بھی شریک ہے نا؟ ذریۃ کے معنی ہیں اولاد اور اولاد در اولاد۔ اس میں سارا سلسلہ نسل آگیا۔ اور یہ سلسلہ ابراہیمی شاخ اسرائیلی اور شاخ اسمٰعیلی دونوں کو شامل ہے۔ اسرائیلیوں کو جو دعویٰ تخصیص تھا اس کی جڑ یہیں سے کٹ گئی۔ من ذریتی میں من تبعیضیہ ہے اور فقرہ کی ترکیب نے صاف کر دیا کہ ابراہیم کی یہ دعا و سوال کے رنگ میں اپنی ساری نسل سے متعلق نہیں اس کے ایک جزو سے متعلق تھی۔ من تبعیضیۃ ای وجاعل بعض ذریتی (ابو السعود) ومن ذریتی۔ یدل انہ علیہ السلام طلب ان یکون بعض ذریتہ ائمۃ للناس (کبیر) من ذریتی کا عطف جاعلک کے ک پر ہے۔ گویا تقدیر کلام یوں ہے۔ وجاعل بعض ذریتی۔ محاورۂ عرب میں جب سائل کچھ بولا جاتا ہے تو جواب استفہامی میں بجائے پورے فقرہ اکرم زیداً کے صرف وزیداً کافی ہے (کشاف) گو صاحب بحر کے نزدیک یہ عطف یہاں صحیح نہیں۔ آیت سے معلوم ہوا کہ مسرت و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کرنا نہ صرف امر طبعی ہے بلکہ سنت انبیاء بھی ہے ۴۴۸ یعنی برکت و فضل کا سلسلہ تمہاری نسل میں بھی ضرور رہے گا۔ لیکن اس کے تحقق کے لئے محض ارث، نسب، نسل کافی نہیں۔ بلکہ ایمان و عمل صالح بھی حاصل کرنا ہوگا۔ گویا دعائے ابراہیمی اولاد صالح کے حق میں قبول ہوگئی۔ دل علی انہ ینالہ غیر الظالم (جلالین) اور حضرت کو خبر دے دی گئی کہ آپ کی نسل میں دونوں طرح کے لوگ ہوں گے، کچھ صالح مطیع اور کچھ ظالم و نافرمان، صالحین کو امامت کی بشارت مل گئی اور ظالم اس سے محروم کر دیئے گئے۔ تنبیہ علی انہ قد یکون من ذریتہ ظلمۃ وانہم لاینالون الامامۃ وانما ینالہا البررۃ الاتقیاء منہم (بیضاوی) عہدی سے مراد یہی یعنی دینی منصب امامت پیشوائی کا وعدہ۔ معنی العہد عہد الامامۃ (ابن جریر عن مجاہد) ھذا العہد ھو الامامۃ المذکورۃ فی ما قبل (کبیر) الظلمین۔ ظلم سے یہاں مراد کفر بھی لی گئی ہے اور فسق بھی، کافر کو امامت دینی نہ ملنا بالکل ظاہر اور متفق علیہ ہے۔ بعض نے اس منصب سے محرومی کے لئے فسق بھی کافی سمجھا ہے۔ وقد فسر الظلم ھہنا بالکفر وھو قول ابن جبیر وبظلم العاصی غیر الکفر وھو قول عطاء والسدی (بحر) ای اہل الکفر (مدارک) اخبر ان امامۃ المسلمین لا تثبت لاہل الکفر (مدارک) المراد بالظالم الکافر ھہنا اذ ھو الظالم المطلق (مدارک) المتبادر من الظلم الکفر لانہ الفرد الکامل من افرادہ (روح) فقہاء امت نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ فاسق کی امامت کا انعقاد جائز نہیں۔ واحتج الجمہور علی ان الفاسق لا یصلح ان تنعقد لہ الامامۃ بہذہ الآیۃ (کبیر) مرشد تھانوی نے آیت سے استنباط کیا کہ اختیار عمل کے ساتھ فضل الٰہی وانعام خداوندی جمع نہیں ہوتے ۴۴۹ بیت کے لفظی معنی گھر کے ہیں جہاں رات بسر کی جائے۔ البیت سے متفقہ طور پر مراد بیت الحرام یا خانہ کعبہ ہے۔ شہر مکہ معظمہ کے اندر کی یہ عمارت روئے زمین پر صرف ایک خدائے واحد کی عبادت کا قدیم ترین مکان ہے۔ اور قرآن نے اس حقیقت کا اعلان ان کھلے لفظوں میں کر دیا ہے۔ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً۔ مسیحیت کو کعبہ کی تقدیس و برکت کے ساتھ ساتھ کعبہ کی یہ قدامت بھی نہایت شاق ہے لیکن انکار قدامت پر کوئی دلیل باوجود کوشش کے بعد آج تک قائم نہیں ہوئی، بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف باسورتھ اسمتھ کو لکھنا پڑا۔ ”یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہد تاریخ سے پرے ہے۔“ (محمد اینڈ محمڈنزم ص ۱۶۲) پھر آگے مشہور قدیم رومی مورخ ڈیوڈورس سکولس (Diodorus Seculus) جس کا زمانہ خود حضرت مسیح سے ایک صدی قبل کا ہے کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہ معبد قدیم ترین تھا اور ساری نسل عرب کا نہایت مقدس مرجع تھا ص ۱۶۲۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔

۴۵۰ مثابۃ مصدر ثوب کے معنی ہیں کسی شے کا اپنی حالت اصلی یا حالت مقصودہ کی طرف لوٹنا۔ رجوع الشیء الی حالتہ الاولی التی کان علیھا او الی الحالۃ المقدرۃ المقصودۃ۔ (راغب) اور جب کچھ لوگ کسی مقام کی طرف لوٹتے ہیں تو کہا جاتا ہے ثاب القوم اور اسی کو مثابۃ اسم ظرف
للمکان معنا من ثاب القوم الی الموضع اذا رجعوا الیہ فھم یثوبون الیہ مثابا و مثابۃ (ابن جریر) مثابۃ میں ۃ مبالغہ کی ہے۔ اس میں زور و تاکید مثاب سے زائد ہے۔ والتاء فی مثابۃ للمبالغۃ قالہ الاخفش (بحر) گویا مثابۃ کے معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف انسان بار بار رجوع
کرے اور پھر جی نہ بھرے۔ مرجعا للناس یعودون الیہ فلا یقضون منہ وطرا۔ یہی معنی امام ابن جریر نے خود بھی لئے ہیں۔ اور یہی ابن عباسؓ صحابی اور مجاہد، سدی، عطاء وغیرہ تابعین سے بھی نقل کئے ہیں۔ اور بیت الحرام کیہ وصف تو مشاہد ہی ہے
لوگ حج پر حج اور عمرہ پر عمرہ کرتے چلے جاتے ہیں، اور اس سے اکتاتے نہیں۔ پھر چونکہ البیت مرجع ارباب حج و عمرہ کا ہے اسلئے اجتماع و رجوع کے ساتھ عبادت کا مفہوم بھی لازماً اس لفظ میں شامل ہو گیا ہے۔ مباءۃ و مرجعا للحاج و العمار یتفرقون عنہ ثم یثوبون
الیہ کذا فی المدارک۔ عام زائرین کا جو تانتا کعبۃ اللہ کی زیارت اور عمرہ کا سال کے ہر موسم، ہر فصل، ہر زمانہ میں لگا رہتا ہے۔ اس سے قطع نظر تصور میں نقشہ ان لاکھوں انسانوں کا جمایئے جو صرف حج کے موقع پر کھنچے چلے آتے ہیں، صرف حجاز یا ملک عرب ہی کے ہر حصہ سے
نہیں بلکہ روئے زمین کے ہر خطہ، ہر علاقہ، ہر ملک سے۔ اور پھر یہ بھی ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ سلسلہ دس بیس سال سے نہیں، حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ یعنی تقریباً چار ہزار سال سے قائم ہے! جب جا کر لفظ کی جامعیت کی تفسیر ذہن میں آسکے گی۔ امنا۔ مامونیت اسی کا ظاہر ہے
کہ صرف عمارت کعبہ یا مسجد الحرام ہی نہیں بلکہ اردگرد کی سرزمین میلوں تک داخلِ حرم ہے، اور حرم وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان لینا الگ رہا، جانور تک کا شکار جائز نہیں! اور یہ حکم تو خیر شریعتِ اسلامی کا ہے، ارضِ حرم کا مامن ہونا جاہلیتوں کو بھی مسلم رہا ہے۔ بڑے بڑے مجرم
مشرکوں کے دورِ حکومت میں بھی جرم کر کر کے خانۂ کعبہ کی دیوار وں کے درمیان آکر پناہ پا جاتے تھے۔ فرنگی قاموس علم و دانش میں ہے:۔ اتنا تو ہر حال ہے کہ محمدؐ کے ظہور سے بہت قبل مکہ کی دو حیثیتیں ہم مسلم پاتے ہیں، یہ تجارتی مرکز تھی، ایک مقدس معبد کی جس کے گرد کی زمین بھی

وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَ

مقام امن مقرر کیا ۴۵۰ اور مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو ۴۵۱ اور

عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ

ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کی طرف حکم بھیجا ۴۵۲ کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک

لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۱۲۵ وَاِذْ قَالَ

صاف رکھو ۴۵۳ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کیلئے ۴۵۴

اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ

اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیم نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن

اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

والا بنادے اور اس کے بسنے والوں کو روزی دے پھلوں سے ۴۵۵ (یعنی) ان بسنے والوں کو جو اللہ اور روزِ آخرت پر

الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ

ایمان لائیں ۴۵۶ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جو کفر کریگا میں اُسے بھی کچھ دن مزہ اُٹھانے دونگا پھر اُسے

اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۲۶

کشاں کشاں عذابِ جہنم تک پہنچادوں گا اور وہ کیسا بُرا ٹھکانا ہے ۴۵۷

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ

اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیم اور اسمٰعیل خانۂ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے ۴۵۸

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷

اے ہمارے پروردگار ہم سے (یہ) قبول کرلے ۴۵۹ بیشک تو ہی سب کچھ سننے والا ہے سب کچھ جاننے والا ہے ۴۶۰

حرم ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۵ صفحہ ۱۵۱ طبع چہاردہم) غرض کہ قرآن نے البیت کے جو دو وصف یہاں ذکر کئے ہیں وہ اعتقاد سے زیادہ تو مشاہدۂ ماضی و حال کی چیزیں ہیں۔ ۴۵۱ اے مسلمانو! اتخذوا صیغۂ امر ہے اور یہ خطاب رسول اللہ صلعم کے معتقدوں اور امّتِ اسلامیہ سے ہے۔ الخطاب لامۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (بیضاوی) الامر فیہ للناس کما هو الظاهر (روح) والخطاب علی هذین الوجهین لامۃ محمد صلعم وهو صلی اللہ علیہ وسلم رأس المخاطبین (روح) مقام ابراہیم کے معنی اس پتھر ہی کے لئے گئے ہیں جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کی تعمیر کرتے تھے، اور یہ پتھر خانۂ کعبہ سے چند ہی فٹ کے فاصلہ پر اب بھی ایک حجرہ میں محفوظ ہے۔ یہ اصطلاح اگرچہ نزولِ قرآن کے بعد کی ہے لیکن ایک بہت بڑے گروہ نے یہی معنی لئے ہیں۔ حج کے موقع پر اس حجرہ کے سامنے طواف کے سات چکروں کے بعد دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ حنفیہ و مالکیہ کے ہاں یہ نماز واجب ہے، اور شافعیہ کے ہاں محض سنت۔ محققین کے دوسرے گروہ نے جن میں ابن عباسؓ صحابی، مجاہد، عطاء تابعین اور امام نخعی وغیرہ شامل ہیں، اس کے معنی سارے حرم یا کل مشاہدِ حج کے لئے ہیں۔ قال ابن عباس الحج کلہ (ابن کثیر) اور روی عن مجاهد و عطاء مثل ذلک (ابن کثیر) و ذهب النخعی و مجاهد الی ان المراد من مقام ابراهیم الحرم کلہ (روح) و حکی عن عطاء انہ مواقف الحج کلہا (روح) من مقام میں من تبعیضیہ ہے یعنی ایک حصہ ظاہر کرنے کیلئے، بعض نے فی کے معنی میں لیا ہے۔ و من للتبعیض او بمعنی فی و الاظهر الاول (روح) مصلی۔ نماز کی جگہ یا دعا کی جگہ۔ صلوٰۃ دعوت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اصلی مقصد کے اعتبار سے جائے نماز اور جائے دعا میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں۔ یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے۔ اور اب اسے اور زیادہ صاف ہو جانا چاہیئے کہ قرآن مجید اپنے مخاطبات میں تاریخِ انسانی کی ترتیب کا پابند نہیں۔ بارہا پاس پاس کی آیتوں میں بلکہ کبھی خود ایک ہی آیت کے اندر معنوی مناسبت کی بنا پر دو ایسے واقعات جمع کر دیئے جاتے ہیں جن کے درمیان زمانی حیثیت سے صدیوں کا فاصلہ ہوتا ہے، اور اسی میں یہ بھی شامل ہے کہ واقعاتِ ماضی کے بیان سے متصل ہی اور گویا انھیں کے ضمن میں کوئی مستقل حکم حال و مستقبل کیلئے دیدیا جائے اور صیغۂ امر لا کر اس کا عطف صیغۂ ماضی پر کر دیا جائے ـــــــ قرآن اصلاً صرف کتابِ ہدایت ہے اور وہ اپنے اس مقصدِ اصل کے آگے پروا کسی انسانی حد بندی اور کسی مصنوعی و اختراعی تکلف کی نہیں کرتا۔ ۴۵۲ عهدنا یہاں امرنا کے معنی میں ہے۔ ای امرنا (ابن جریر۔ ابن زید) امرناهما (ابن کثیر) عہد یعنی امر پر حاشیہ عہدِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اوپر گزر چکا ہے۔ ابراهیم پر حاشیہ اوپر گزر چکا۔ اسمٰعیل ابراہیمؑ کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ کی مصری بیوی حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تھے۔ سالِ ولادت غالباً ۲۰۷۴ ق۔م سالِ وفات غالباً ۱۹۳۷ ق۔م۔ توریت میں ہے کہ عمر ۱۳۷ سال کی پائی۔ آپ کے بارہ فرزند ہوئے اور ان سے بارہ نسلیں چلیں۔ توریت میں ان بارہ فرزندوں کے نام درج ہیں اور یہ تصریح ہے کہ وہ اپنی اُمّتوں کے بارہ رئیس تھے۔ (پیدائش ۲۵: ۱۶) عرب کا مشہور و عالی نسب قبیلہ قریش آپ ہی کی نسل سے ہے۔ اسلئے آپ رسول اللہ صلعم کے بھی مُورثِ اعلیٰ ہوئے۔ اہلِ کتاب کہلانے والوں نے آپ کے خلاف زہر اگلنے اور اپنے خبث و عناد کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔ تاہم اپنی کتاب کی تصریحات کو کیا کرینگے جو تحریف و تلبیس کی ہر ممکن کوشش کے بعد بھی نہ مٹ سکیں، ان میں ابراہیم خلیلؑ کی دعا بھی شامل ہے۔ اور خداوند کریم کے وعدے بھی اور تاریخ کا بیان بھی:۔ ”اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔“ (پیدائش ۱۷: ۱۸) ”اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی۔ دیکھ میں نے اسے برکت دُونگا۔ اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤنگا۔“ (پیدائش ۱۷: ۲۰) ”اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤنگا۔“ (پیدائش ۲۱: ۱۸) ”اور خدا اُس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہوگیا۔“ (پیدائش ۲۱: ۲۰) یہاں حکم جو کچھ مل رہا ہے وہ آپ کو اور آپ کے والد ماجد کو مشترک مل رہا ہے۔ گویا خدمتِ کعبہ میں آپ اپنے والد ماجد کے برابر کے شریک تھے۔ ۴۵۳ (ہر طرح کے شرک و بت پرستی کی گندگی سے) طهرا۔ طہارت سے اصلاً یہاں مُراد یہ ہے کہ نجاستِ معنوی و اعتقادی سے دُور اور ذکرِ توحید و عبادتِ الٰہی سے معمور رکھو ضمناً ظاہری صفائی کا حکم بھی آجاتا ہے۔ هو تطهیرہ من الاصنام و عبادۃ الاوثان فیہ و من الشرک باللہ (ابن جریر عن مجاهد و قتادہ و ابن زید) من الاوثان و الفواحش و الانجاس کلها (مدارک) و التطهیر المامور بہ هو التنظیف من کل ما لا یلیق۔ طهرا تثنیہ کا صیغہ ہے حکم حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت اسمٰعیلؑ کو بھی مل رہا ہے اور اقامتِ توحید میں برابر کے شریک بنائے جا رہے ہیں۔ فقہاء نے خطاب کے اس صیغہ سے مفہوم عموم کا لیا ہے یعنی تطہیر کی ذمہ داری ہر فرد پر ہے۔ خواہ وہ ابراہیمؑ کی طرح متبوع و مقتدا ہو یا اسمٰعیلؑ کی طرح تابع و مقتدی ہو۔ طهرا بالتشدید مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی خوب اچھی طرح پاک صاف رکھو۔ فقہاء نے یہیں سے یہ نکالا ہے کہ مسجد کی صفائی فرض ہے۔ بیتی اضافت تشریفی ہے۔ میرے گھر کی ترکیب کو خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ اسلام کا خدا (نعوذ باللہ) کوئی مرئی و مجسم دیوی دیوتا تو ہے نہیں جو اسے رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے کیلئے کسی گھر یا مکان کی ضرورت ہو۔ اسلئے ”میرے گھر“ سے مراد ”میرے رہنے کا گھر“ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ مراد صرف یہ ہے کہ وہ گھر جو میری یاد و عبادت کیلئے مخصوص و نامزد ہو چکا ہے۔ اضافت سے مقصود محض اظہارِ شرف و عظمت ہے۔ هذہ اضافۃ تشریف لا ان مکانا محل للہ (بحر) الاضافۃ للتشریف کناقۃ اللہ (روح) اضافۃ البیت الیٰ ضمیر الجلالۃ للتشریف (روح) اس آیت میں کوئی اشارہ مخصوص کعبہ کیلئے نہیں۔ ذکر صرف وصفِ عمومی بیت کے ساتھ فرمایا ہے۔ اس سے فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہی حکم ہر عبادت خانۂ الٰہی یعنی ہر مسجد کیلئے ہے۔ ۴۵۴ الطائفین یعنی لاجل تخصیص کیلئے ہے یعنی کعبہ اور اسی طرح ہر مسجد پر حق انہیں لوگوں کا ہے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ عمارت بن کر تیار ہو چکی تو اب غایت تعمیر بیان ہو رہی ہے کہ مقصود اس عمارت سے قیامِ توحید و استیصالِ شرک ہے۔ الطائفین۔ خانۂ کعبہ کا طواف کرنے والے۔ طواف کے معنی پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا۔ حج وغیرہ کے سلسلہ میں تو طوافِ کعبہ فرض ہی ہے، لیکن یوں بھی بجائے خود بڑے اجر کی چیز ہے اور ساتھ ہی بڑے لطف کی بھی، جیسا کہ صاحبِ ذوق کا تجربہ شاہد ہے۔ اس ناچیز سیاہ نامہ نے اس کا بیان اپنے سفرِ حجاز میں کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ خانۂ کعبہ کو تمام دنیائے اسلام کی مسجدوں بلکہ نمازوں سے جو مرکزی نسبت حاصل ہے، اسی مناسبت سے اہمیتِ طوافِ کعبہ کو بھی حاصل ہے۔ کعبہ مظہرِ اعظم ہے دینِ توحید کا۔ اس کے گرد چکر لگانا گویا زبانِ حال سے اقرار کرنا ہے کہ ہماری ساری عبادتوں کا سارے اعمال کا ساری زندگی کا مرکز و محور توحیدِ الٰہی ہے۔ العاکفین عکوف کے لفظی معنی ہیں کسی جگہ کے رہنے کو تعظیماً لازم کرلینا۔ العکوف الاقبال علی الشیء و ملازمتہ علی سبیل التعظیم لہ (راغب) اور اعتکاف اصطلاحِ شریعت میں نام ہے مسجد کے اندر بہ نیتِ عبادت قیام کو کسی مدت کیلئے لازم کرلینے کا کہ جز بشری ضرورتوں کے اور کسی حال میں باہر نہ نکلا جائے۔ هو الاحتباس فی المسجد علی سبیل القربۃ (راغب) رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنتِ کفایہ مؤکدہ ہے۔ اس میں روزہ بھی شرط ہے۔ نفسِ اعتکاف ہر حال میں موجبِ اجر و قربت ہے۔

ہے کم السجود۔ رکوع اور سجدہ نماز کی دو مشہور و متعارف ہیئتیں ہیں۔ طائفین اور عاکفین اور رکوع اور سجود چار لفظوں کے لانے کے بجائے یہ بھی ممکن تھا کہ صرف عابدین یا ذاکرین کہہ دیا جاتا لیکن تفصیل و تصریح سے ایک ایک عبادت کی تخصیص اور بزرگی کا الگ الگ اظہار ہوگیا۔

۴۵۵ ابراہیم خلیل اللہ کی یہ دعائیں جس حیرت انگیز طریقہ پر پوری ہوئیں وہ خود ایک معجزہ ہے۔ پہلی دعا یہ تھی کہ شہر مکہ کو امن و امان والا بنا دیا جائے۔ آس پاس کے بسنے والے لٹیرے اور خونخوار لوٹ مار قتل و خون کا بازار گرم، وسائل معاش محدود و خطرناک، راستہ غیر محفوظ۔ اس پر بھی حج و زیارت کے لئے حاجیوں اور زائروں کا آنا صدیوں سے جاری ہے اور اب امن و امان کے لحاظ سے مکہ اور حوالی مکہ آپ اپنی نظیر ہیں۔ ڈاکے پڑتے ہیں، نہ قافلے لٹتے ہیں۔ نہ لاشیں تڑپتی نظر آتی ہیں۔ اور شریعت اسلامی نے تو شہر و مضافات شہر کو حرم ہی قرار دے دیا یعنی ان حدود کے اندر جانور تک کا شکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور خونی بھی اگر آ کر خانہ کعبہ کے اندر پناہ گزین ہو جائے تو اسے وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ شہر اور خانہ کعبہ کا اتنا احترام جاہلیتوں نے بھی اپنے زمانہ میں ملحوظ رکھا۔ دوسری دعا یہ تھی کہ مکہ والوں کو پھل پھلاری کھلنے کو ملتے رہیں۔ مکہ واقع ایسی جگہ ہے کہ ساری زمین یا سخت ریتلی ہے یا سخت پتھریلی، بارش بھی بہت ہی قلیل مقدار میں ہوتی ہے، غرض یہ کہ تازے پھلوں اور میوے دار درختوں کا ذکر ہی نہیں معمولی سے پھل پھول کے درخت بلکہ تازہ و سبز گھاس تک نہیں پیدا ہوتی۔ اور کاشتکاری و باغبانی کو کوئی جانتا بھی نہیں، ایک بے آب و گیاہ سرزمین، کہیں ریگستان، کہیں گرم و خشک پہاڑیوں کے چٹان، لیکن ان سب کے باوجود بہتے تازہ تازہ پھل میوے، ترکاریاں، غلے جا ہیئے شہر مکہ میں خرید لیجئے۔ اس باب میں کچھ تفصیلات اس عاجز کے سفر نامۂ حجاز میں بھی ملیں گی۔ ۴۵۶ ابھی

ابھی حضرت ابراہیم کو بتایا جا چکا تھا کہ فضل و برکت کے خاص وعدے ایمان و عمل صالح کے ساتھ مشروط ہیں۔ ان کے بغیر نہیں لا ینال عہدی الظلمین (آیت ۱۲۴) اللہ کے پیغمبر نے اللہ کے اس ارشاد کو گرہ باندھ لیا۔ اور اب جو دعا کی اس میں خود ہی یہ قید لگا دی کہ ان سب ثمرات کی برکتیں صرف اہل ایمان و طاعت کے لئے مقصود و مطلوب ہیں۔ سعۃ المومنین خاصۃ (بیضاوی) الرزق علی الادامۃ خص المومنین (مدارک) خص بہ دعاءہ المومنین دون الکافرین (کبیر) حضرات انبیاء کی ادب شناسی کا کیا کہنا۔ حق تعالیٰ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ امامت یا دینی سرداری مخصوص ہے اہل ایمان و طاعت کے ساتھ۔ خلیل جلیل نے اشارہ پا کر دنیوی منفعت و تمتع کو بھی اہل ایمان و طاعت کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ حالانکہ اس کا تعلق نبوت سے ہے جو مومن و کافر سب کے لئے اس عالم میں عام ہے۔ فنبہ سبحانہ علی ان الرزق رحمۃ دنیویۃ تعم المومن والکافر بخلاف الامامۃ والتقدم فی الدین (بیضاوی) مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ایمان کے اجزاء یہاں دو ہی بیان کئے گئے ہیں اللہ پر ایمان اور روز آخرت پر ایمان۔ انہیں کے ضمن میں ایمان کے دوسرے ضروری اجزاء بھی آ گئے۔ اس کی ضرورت مطلق نہیں کہ ایمان کا ذکر جہاں کہیں بھی آئے ہر جگہ اس کے سب ہی اجزاء کی تصریح ہو۔ لما کان الایمان باللّٰہ والیوم الاٰخر یتضمن الایمان بجمیع ما یجب ان یؤمن بہ اقتصر علیٰ ذٰلک (بحر) ۴۵۷ قَلِيْلًا یعنی چند روز۔ یہاں مراد ہے زندگی بھر کو۔ دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہی ہوتی ہے۔ متاعًا یتمتع بہ الی وقت مماتہ (ابن جریر) الی منتہی اجلہ (معالم) مطلب یہ ہوا کہ وہ جو فضل خداوندی اہل ایمان، اہل ہدایت کے ساتھ مخصوص ہو اور جس سے اہل ضلالت و کفر محروم رہیں گے اس کا تعلق نفع آخرت سے ہے۔ رہے یہ دنیوی زندگی کے انعامات و منافع غذا اور مسکن وغیرہ تو ان سے محروم کافروں اور منکروں تک کو نہ کیا جائے گا کہ قانون ربوبیت کا عین تقاضا ہے۔ دوزخ جیسی جگہ میں کوئی شخص خوشی سے تو جائے گا نہیں، ہر ایک کشاں کشاں ہی لے جایا جائے گا۔ قرآن نے یہاں جو اس کی تصریح کر دی ہے وہ جہنم کی ہولناکی کا نقش واضح کرنے کے لئے ہے۔ ۴۵۸ البیت سے مراد خانہ کعبہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں۔ الکتاب جس طرح قرآن کریم ہے، النبی جس طرح محمد رسول اللہ صلعم ہیں، البیت اسی طرح کعبۃ اللہ ہر جگہ کا لفظ قابل غور ہے۔ بنیادیں اول بار کھی نہیں جا رہی تھیں وہ تو حضرت آدم کے عہد ہی میں رکھی گئی تھیں عمارت کے منہدم ہو جانے کے بعد اب انہیں از سر نو اٹھایا جا رہا تھا بلکہ کیا جا رہا تھا۔ مسیحیوں نے خانہ کعبہ جیسی اور اس کی قدامت سے جو کد ہے وہ اہل ظاہر ہے۔ ہر امکانی کوشش اپنے علم و اس کی مخالفت میں کر چکے ہیں، لیکن حقیقت اس کے باوجود حقیقت ہی ہے۔ آفتاب کے وجود سے روز روشن میں انکار کہاں تک کیا جا سکتا ہے؟ مترجم قرآن جارج سیل (Sale) اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں لکھتا ہے:۔ "مکہ جسے بکہ بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں اور ان کے معنی مقام اجتماع عظیم کے ہیں، یقیناً دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اور بعض کی رائے میں توریت کے شہر میسا سے یہی مراد ہے۔" اور پھر وہی آگے کہتا ہے:۔ "مکہ کا معبد اہل عرب کے درمیان مقدس اور ایک عبادت گاہ کی حیثیت سے بہت ہی قدیم زمانہ سے اور محمد سے بہت سی صدیوں قبل سے چلا آتا تھا۔" باسورتھ اسمتھ جو لیکچرز آن محمد اینڈ محمدن ازم کے مصنف ہیں وہ لکھتے ہیں:۔ "بناء کعبہ کا سلسلہ حسب روایات، اسمٰعیل اور ابراہیم تک پہنچتا ہے، بلکہ شیث و آدم تک۔ اور اس کا نام بیت ایل خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسے ابتدائی شکل میں کسی ایسے ہی بزرگ قبیلہ نے تعمیر کیا ہے۔" (ص ۱۶۰) سب سے بڑھ کر قابل لحاظ شہادت سر ولیم میور کے قلم سے ہے:۔ "مکہ کے مذہب کی تاریخ بہت ہی قدیم ماننی پڑتی ہے۔ ہیروڈوٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ایک نامعلوم زمانہ سے ملک عرب کا مرکز چلا آتا ہے جس مقام کا تقدس اتنے وسیع رقبہ میں مسلّم ہو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی بنیاد قدیم ترین زمانہ سے چلی آتی ہے۔" (لائف آف محمد۔ مقدمہ ص ۱۰۲ و ص ۱۰۳)۔ یہ شہادتیں مخالفوں کی تھیں۔ باقی ہمارے ہاں کی روایتوں میں خانہ کعبہ کی قدامت کی جو روایتیں ہیں ان سے تو تفسیر، حدیث، سیر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اسمٰعیل۔ اسمٰعیل کی عمر اور زمانہ وغیرہ پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے۔ ایک پیغمبر برحق کی حیثیت سے اسلام میں آپ کا جو مرتبہ ہے، ظاہر ہے۔ لیکن آپ کا ایک مستقل معجزہ یہ ہے کہ جن قوموں نے آپ کی

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً

اے پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری نسل سے ایک فرمانبردار

مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ

امت پیدا کر اور ہم کو ہمارے دینی قاعدے بتا دے اور ہمارے حال پر توجہ رکھ بے شک یقیناً تو

أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ

تو بڑا توجہ فرمانے والا ہے، بڑا مہربان ہے اے ہمارے پروردگار ان میں ایک پیغمبر انہیں

رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

میں سے بھیج دے (جو) انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب (الٰہی)

الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ

اور دانائی کی تعلیم دے اور انہیں پاک (صاف) کر دے بے شک یقیناً تو تو بڑا زبردست ہے، بڑا حکمت (والا)

الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ ع ۱۵/۸

ہے اور ابراہیم کے مذہب سے کون پھرے گا مگر

إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي

وہی جس نے اپنے کو احمق بنا لیا ہو اور ہم نے تو انہیں دنیا میں بھی برگزیدہ کر لیا

الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۳۰﴾ إِذْ قَالَ

تھا اور آخرت میں بھی وہ زمرۂ صالحین میں ہوں گے اور وہ وقت بھی

لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۙ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۱﴾

یاد کرنے کے قابل ہے جب ان کے پروردگار نے فرمایا کہ حکم بردار ہو جاؤ تو وہ بولے میں حکم بردار ہوں سارے جہان کے پروردگار کا

اور آپ کی والدہ ماجدہ کی ہجو اور بدگوئی کو اپنا شعار بنا لیا ہے ان تک کے نوشتوں میں آپ کی تعظیم منقول چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ بعض احبار یہود کا یہ قول آج تک یہود کی دائرۃ المعارف میں لکھا چلا آتا ہے کہ "جو کوئی خواب میں اسمٰعیل کو دیکھ لے حق تعالیٰ کے ہاں اس کی دعا قبول ہو جائے گی۔" (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۷ ص ۲۳۰) آپ کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ شاہ مصر کی صاحبزادی تھیں۔ اور مصر کا شاہی خاندان حضرت ابراہیم کے خاندان کی ایک شاخ تھا۔ عراق سے منتقل ہو کر مصر میں آباد ہو گیا تھا جب حضرت ابراہیم اپنے سفر میں ادھر سے گزرے تو بحیثیت ایک شیخ قبیلہ کے آپ کو شاہ مصر نے اپنا مہمان بنایا اور رخصت کے وقت آپ کے اعزاز و اکرام میں اپنی صاحبزادی کو بطور تحفہ کے پیش کیا۔ اور تواضع و انکسار کی راہ سے کہ مشرقی میزبانی کا خاصہ ہے، کہا کہ یہ کنیزی کے لئے ہدیہ ہے۔ اردو زبان میں یہ محاورہ آج تک چلا ہوا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر بڑے سے بڑا معزز شخص بھی اپنی لڑکی کو کنیز ہی کہہ کر داماد اور سمدھی کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مشرقی تواضع کے اس عام پیرایۂ بیان سے معاندین کو گویا ایک بڑی معتمد اور مستند دستاویز ہاتھ آ گئی۔ اور ام اسمٰعیل ان کے ہاں آج تک کنیز ہی چلی آ رہی ہیں۔ واقعات بہرحال واقعات ہیں۔ انہیں کوئی کہاں تک جھٹلا سکتا ہے؟ اسی جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اکابر احبار یہود کے حوالہ سے ہے:۔ "ہاجرہ فرشتہ ہی کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہوئیں۔ ان کی عصمت مآبی اس سے ظاہر ہے کہ ابراہیم نے انہیں اپنے پاس سے الگ کر دیا جب بھی ان کی وفاداری میں فرق نہ آیا۔ . . . ان کے نام کے ایک معنی "آراستہ" بھی بیان ہوئے ہیں۔ اور یہ اس بنا پر کہ وہ زیور اخلاق و حسن عمل سے آراستہ تھیں۔" (جلد ۶ ص ۱۳۰)۔ اور اسی میں ایک دوسری جگہ یہ روایت بھی درج ہے کہ "بادشاہ نے خود اپنی صاحبزادی بطور کنیز ہدیہ کر دی۔" (جلد ۱ ص ۵۵) اور قصص یہود کا جو مجموعہ گنز برگ (Ginzberg) نے چار جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں ہے:۔ "بادشاہ مصر نے عہد کر لیا کہ وہ ابراہیم کو ہر طرح پرقوت و شوکت بنا کر رہے گا . . . . . چنانچہ اپنی بیٹی تک ہدیہ دے دی۔ سارہ کی تعلیم و تربیت میں رہ کر وہ بھی ویسی ہی باخدا بن گئیں اور ہر طرح ابراہیم کی رفاقت کے قابل" (جلد ۱ ص ۲۲۲ و ص ۲۲۳)۔ ۴۵۹ (محض اپنے فضل و رحمت سے) کیا ٹھکانا ہے اس خشیت قلب کا! اخلاق کے مجسمے ہیں۔ صداقت کے پتلے ہیں۔ اس پر بھی ڈرتے جاتے ہیں کہ دیکھئے نذر قبول بھی ہوتی ہے یا نہیں! باب تفعل کا ایک خاصہ تکلف ہے۔ اس لئے بعض نکتہ سنجوں نے لفظ تقبل سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ عمل بذات خود ہرگز قابل قبول نہیں۔ تمام تر ناقص ہے۔ اور مقبولیت محض لطف و کرم سے ہو رہی ہے نہ کہ کسی استحقاق کی بنا پر۔ ان التقبل عبارۃ عن ان یتکلف الانسان فی قبولہ (کبیر) فی اختیار صیغۃ التفعل اعتراف بالقصور لما فیہ من الاشعار بالتکلف فی القبول (روح) مزدور اور معمار جب کام کرتے ہیں تو عموماً عادۃً کچھ گنگناتے بھی جاتے ہیں۔ اللہ کے گھر کے معمار اللہ کے گھر کی دیواریں اٹھاتے وقت خاموش نہ تھے۔ یہاں ان کی مناجات بیان ہو رہی ہے۔ فقہاء کا استنباط ہے کہ عمل صالح کے بعد دعا کرنا مستحب ہے۔ چنانچہ ختم نماز پر دعا اور افطار صوم کے وقت دعا، اسی قبیل سے ہیں۔

۳۶۰ سمیع ۔ سننے والا زبان سے نکلے ہوئے لفظ و قول کا ۔ علیم ۔ جاننے والا دل کے اندر کے اخلاص کا ۔ مشرک قوموں کے حکما اور فلاسفہ نے سب سے زیادہ ٹھوکر حق تعالیٰ کی صفتِ علم ہی کے باب میں کھائی ہے ۔ اور باری تعالیٰ کا علم (نعوذ باللہ) ناقص و محدود فرض کیا ہے ۔ قرآن جو علم باری کے کامل و محیط ہونے کا شد و مد سے اثبات کرتا ہے ، اور اللہ کے علیم و سمیع و بصیر ہونے کو بار بار پیش کرتا ہے ، اس کا ایک مقصد فلاسفہ کے اس وہم باطل کی تردید کرنا ہے ۔ ۳۶۱ اور زیادہ مسلمین کے معنی یہاں دو طرح کئے گئے ہیں ۔ ایک اللہ کی توحید کے ماننے والے بلا شائبۂ شرک و شرکت ۔ اے موحدین مخلصین لانعبد الا ایاک (کبیر) دوسرے اسلام کے عام احکام کے پابند ۔ اے قائمین بجمیع شرائع الاسلام (کبیر) لیکن دونوں معنی ایک دوسرے کے منافی بالکل نہیں ۔ مسلم کے ترجمہ فرمانبردار میں دونوں سموئے ہوئے ہیں ۔ وہ لطف جو خود لفظ مسلم میں ہے ۔ مسلمون اے منقادون لحکمک مخلصون لہ (راغب) فرمانبردار بندے یا مسلم تو وہ اُس وقت ہی تھے جب دُعا کر رہے تھے ۔ دعا کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہماری فرمانبرداری میں مزید ترقی ہو ۔ والمعنی زدنا اخلاصا و اذعانا لک (کشاف) والمراد طلب الزیادۃ فی الاخلاص و الاذعان او الثبات علیہ (بیضاوی) ۳۶۲ امۃ مسلمۃ کے ترجمہ فرمانبردار امت میں وہ بلاغت و معنویت کہاں جو قرآنی لفظ امتِ مسلمہ میں ہے ۔ دعا کی مقبولیت اسی سے ظاہر ہے کہ وہ امت آج تک اسی نام سے مشہور چلی آتی ہے ، اور دوست دشمن سب کی زبان پر ۔ ایک امریکی یہودی توری ییل یونیورسٹی کا استاد اپنی اسلام دشمنی میں آکسفورڈ والے مارگولیس کا بھائی کا پورا جانشین ہے ۔ لیکن ایک بات بڑے پتے کی اس کی زبان سے بھی نکل گئی ہے ۔ کہتا ہے ۔ "اسلام کی بنیاد تو حقیقۃً اسمٰعیل کے ہاتھوں پڑی جو اہل عرب کے مورث اعلیٰ ہیں" (جیوئش فاؤنڈیشن آف اسلام ص ۔ دیباچہ) من ذریتنا یعنی ابراہیم و اسمٰعیل کی مشترک نسل سے ۔ دعا دونوں بزرگوار مل کر رہے تھے ، اس لئے ذریت سے مراد نسل اسمٰعیل ہی ہو سکتے تھے ۔ برنابا نامی حضرت مسیح کے ایک بلند پایہ حواری (صحابی) ہوئے ہیں ، ان کی انجیل کو مسیحیوں نے اپنے مذاق و مسلک کے بالکل ناموافق پا کر اس کی اصلیت ہی سے انکار کر دیا ہے ۔ اس انجیل کے نسخے انگریزی ، عربی ، اردو تینوں زبانوں میں موجود ہیں ۔ اس میں صراحت کے ساتھ ہے کہ عہد الٰہی اسمٰعیل کے ساتھ ہوا تھا نہ کہ اسحٰق کے ساتھ ۔ وقولی لانی اقول لکم الحق ان العہد صم باسمٰعیل لا باسحق (۴۳: ۳) میری بات کا یقین کرو کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وعدہ اسمٰعیل سے کیا گیا تھا نہ کہ اسحٰق سے ۔ اور پھر ہے ۔ وان الموعد صنع باسمٰعیل لا باسحق (۴۳: ۱۸) وعدہ اسمٰعیل سے کیا گیا تھا نہ کہ اسحٰق سے ۔ ۳۶۳ مناسکنا ۔ یعنی عام دینی قاعدے خصوصاً بیت اللہ کے حج و زیارت کے آداب و شعائر ۔ اے شرائع دیننا و اعلام حجنا (معالم) ارنا ۔ اراءۃ کے معنی یہاں آنکھ سے دکھلا دینے کے نہیں بلکہ سکھلا دینے بتلا دینے کے ہیں ۔ اے علمنا و عرفنا ۔ اسلام فعل رأی کا تعدیہ جب دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی رویت کے نہیں علم کے ہو جاتے ہیں ۔ ارانی اذا عدی الی مفعولین اقتضی معنی العلم (راغب) اری ھھنا بمعنی العلم (ابن قتیبہ) ابن حاجب نحوی اور ابوحیان مفسر نے اس معنی کے قبول کرنے سے انکار بھی کیا ہے لیکن جب تائید میں راغب اور زمخشری جیسے مستند امامانِ ادب و لغت کی شہادتیں موجود ہیں تو کسی کا انکار چل نہیں سکتا ۔ ولکن ابن الحاجب واتبعہ ابوحیان ثبوت رأی بمعنی عرف وذکرہ الزمخشری فی المفصل والراغب فی مفرداتہ وھما من الثقات فلا عبرۃ بانکارھما (روح) ۳۶۴ رحمت و شفقت و مغفرت کے ساتھ ۔ وتوبۃ الرب علی عبدہ عودہ علیہ بالعفو لہ عن جرمہ والصفح لہ عن عقوبۃ ذنبہ مغفرۃ لہ منہ وتفضلا علیہ (ابن جریر) ۳۶۵ تو تیرے لئے ہماری اس دعا کو شرفِ قبول بخش دینا کچھ بھی دشوار نہیں ۔ ۳۶۶ منھم ۔ یہ قید خوب خیال میں رہے ۔ دعائے ابراہیمی ابھی چل رہی ہے ۔ ابھی ابھی آپ اور حضرت اسمٰعیل دونوں مل کر عرض کر چکے ہیں کہ اے پروردگار ہم دونوں کی نسل میں سے ایک امتِ مسلمہ ایک اپنی فرمانبردار امت پیدا کر ، اور اس کے مابعد منھم کا لفظ لاتے ہیں ۔ کھلی ہوئی مراد نسل اسمٰعیل سے ہے ۔ لفظ ھم کا مرجع ذریۃ کو بھی سمجھا گیا ہے اور امتِ مسلمہ کو بھی ۔ والضمیر فی منھم یحتمل ان یعود علی الذریۃ ویحتمل ان یعود علی امۃ مسلمۃ (بحر) ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے یعنی نسل اسمٰعیل ۔ اور یہ جزو تاریخ سے اپنی جگہ ثابت ہے کہ صحیح النسب نسل اسمٰعیل قوم عرب ہی رہ گئی تھی ۔ اس لئے لازمی تھا کہ پیغمبر بھی عرب ہی میں پیدا ہو ۔ رسولا ۔ رسول کا ایک توصیف اور اعداد بھی اعراب کی تنوین ۔ گویا یہ اشارہ قریب بصراحت ہے کہ وہ رسول ایک ہی ہوگا متعدد نہ ہوں گے ۔ یہود کا دعویٰ ہے ۔ اور نصاریٰ بھی انہیں کا ساتھ دیتے رہے ہیں ، کہ نبوت و رسالت تو بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص تھی ۔ یہ نیا پیغمبر بنی اسمٰعیل میں کیسے پیدا ہو گیا ؟ لیکن انہی کی توریت باوجود ان کی ساری تحریفات کے اب تک شہادت کچھ اور ہی دے رہی ہے ۔ ایک جگہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ۔ "خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا ۔ تم اس کی طرف کان دھرو ۔" (استثنا ۱۸: ۱۵) قطع نظر اس سے کہ بنی اسرائیل میں تو ایک نبی نہیں خدا معلوم کتنے انبیاء حضرت موسیٰ کے بعد پیدا ہوتے رہے ، خود "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کی تصریح بتا رہی ہے کہ مراد بنی اسرائیل نہیں ، بلکہ ان کے ہم جد بھائی بنی اسمٰعیل ہیں ۔ اگر خبر اسرائیلی ہی نبی کی دینا ہوتی تو بجائے "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کے عبارت "تجھ ہی میں سے" ہوتی ۔ یہ الفاظ تو صرف مخاطبین کی وحشت دور کرنے اور ان میں جذبۂ انس و موانست پیدا کرنے کے لئے ہیں کہ جب وہ نبی آئے تو اس کی اطاعت کرنا ، وہ بھی تمہارا کوئی غیر نہیں تمہارے ہی بھائیوں میں سے ہوگا ۔ اور پھر دو ہی آیتوں کے بعد توریت میں بعینہ یہی مضمون براہ راست حق تعالیٰ کی جانب سے ادا کیا گیا ہے ۔ "خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا ۔ میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا ۔" (استثنا ۱۸: ۱۸) اس سے قطع نظر اگر ممکن ہو تو کر لیجئے کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" یعنی لفظی کلام الٰہی ہونے کا مصداق بجز قرآن کے ساری آسمانی کتابوں میں اور ہے ہی کون ؟ لفظی کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ کس دوسری کتاب کا ہے ؟ اور اس سے بھی قطع نظر اگر ممکن ہو تو کر لیجئے کہ "تجھ سا" یعنی "موسیٰ کا سا" مثیل موسیٰ ہونے کا مصداق تاریخ کی دنیا میں بجز ذات محمدی کے اور ہوا کون ہے ؟ اور کیا اس سے بھی قطع نظر ممکن ہوگی کہ یہاں بھی بجائے "ان میں سے" کے یا "اسرائیلیوں میں سے" کے "ان کے بھائیوں میں سے" ہونے کی صراحت یہاں بھی موجود ہے ۔ اور پھر یہی پیشگوئی انہیں لفظوں میں موسیٰ نبی کی زبان سے نکلی ہوئی نصاریٰ کی انجیل میں بھی دہرائی ہوئی موجود ہے ۔ "موسیٰ نے کہا کہ خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے مجھ سا ایک نبی پیدا کرے گا ۔ جو کچھ وہ تم سے کہے تم اس کی سننا ۔" (اعمال ۳: ۲۲) ۳۶۷ ذرا غور کرنے سے نظر آ جائے گا کہ رسول اعظم کے جملہ فرائض کمال ایجاز کے ساتھ ان چند فقروں میں آ گئے ہیں ۔ یتلوا علیھم آیٰتک ۔ رسول کا پہلا کام اپنی امت کے سامنے تلاوتِ آیات ہوا ہے ۔ یعنی اللہ کا کلام پہنچا دینا ۔ گویا رسول کی پہلی حیثیت مبلغ اعظم کی ہوتی ہے ۔ یعلمھم الکتٰب ۔ رسول کا کام محض تبلیغ و پیام رسانی پر ختم نہیں ہو جاتا ، اس کا کام کتاب الٰہی کی تبلیغ کے بعد اس کی تعلیم کا بھی ہے ۔ اس تعلیم کے اندر کتاب کی شرح ، ترجمانی ، تعمیم میں تخصیص ، تخصیص میں تعمیم سب کچھ آ گئی ۔ اور یہیں سے ان کج فہموں کی بھی تردید ہو گئی جو رسول کا منصب (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ یا قاصد کا سمجھے ہوئے ہیں ۔ گویا رسول کی دوسری حیثیت معلم اعظم کی ہوئی ۔ والحکمۃ ۔ پھر رسول تعلیم محض کتاب ہی کی نہ دیں گے بلکہ حکمت و دانائی کی تلقین بھی امت کو کریں گے ۔ احکام و مسائل ، دین کے قاعدے اور آداب ، عوام و خواص سب کو سکھائیں گے اور خواص کی رہنمائی اسرار و رموز میں بھی کریں گے ۔ گویا رسول کی تیسری حیثیت مرشد اعظم کی ہوئی ۔ یزکیھم ۔ تزکیہ سے مراد دلوں کی صفائی ہے ۔ رسول کا کام محض الفاظ اور احکام ظاہری کی تشریح تک محدود نہیں رہے گا بلکہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اور نیتوں کے اخلاص کے بھی فرائض انجام دیں گے ۔ رسول کی یہ چوتھی حیثیت مصلح اعظم کی ہوئی ۔ ۳۶۸ انک انت ۔ عربی کے اس دوہرے فقرۂ مخاطبت کا مفہوم اردو میں یقیناً تو تو (پہلا "تو" واؤ مجہول اور دوسرا "تو" واؤ معروف کے ساتھ) سے ادا ہوتا ہے ۔ العزیز ۔ ہر دعا کے قبول کرنے پر ، ہر آرزو کے پورا کرنے پر قادر ، اس کی مشیت پر مانع اور غالب کوئی چیز نہیں آ سکتی ۔ الحکیم ۔ قادر مطلق ہونے کے ساتھ حکیم مطلق بھی ۔ قبول وہی دعائیں کرتا ہے بندوں کی آرزوئیں وہی پوری کرتا ہے ، جو قانونِ حکمت کے مطابق و ماتحت ہوتی ہیں ۔ اللہ اکبر ! خلیل و ذبیح کی ادب شناسیوں کا کیا کہنا ! دعا میں بھی کیسے کیسے نکتے ملحوظ رکھے ہیں ـــــ حضرات انبیاء سے بڑھ کر ادب شناس اور ہو بھی کون سکتا ہے ۔ ۳۶۹ یعنی ملتِ ابراہیمی تو عین دینِ فطرت ہے ۔ اس کی تعلیمات عین طبع سلیم کی ترجمان ہیں ۔ اس سے کنارہ کشی تو صرف وہی اختیار کر سکتا ہے جس کی فطرت ہی سلیم نہ باقی رہی ہو ، بلکہ مسخ ہو چکی ہو ۔ اس مقدمہ کی تصدیق انسان جب چاہے اعتقاد سے نہیں آزمائش سے کر لے ۔ اسلام نے جماعت (سوسائٹی) کا جو نظام قائم کیا ہے ، وہی بہترین نظام اجتماعی ہے ۔ ہر فرد کے لئے جو ضابطۂ عمل بنا دیا وہی بہترین ضابطۂ شخصی ہے ۔ عقل و جذبات ، فرد و جماعت ، دل و دماغ ، جسم و روح ، حریت و اطاعت حیاتِ بشری کے متضاد و متناقض عنصروں کی جتنی باہمی رعایت شریعتِ اسلام نے ملحوظ رکھی ہے ، دنیا کے کسی قانون میں کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی ۔ دعائے ابراہیمی ختم ہوئی اب بیان ملتِ ابراہیمی کا شروع ہو رہا ہے ۔ کہ یہ تو وہی دینِ توحید ہے جس کی دعوت آج اسلام ہی دے رہا ہے اور جسے تم سب باوجود اپنے مشترک بزرگ ابراہیم کی پیروی کے دعویٰ کے چھوڑے بیٹھے ہو ۔ ملۃ ابراھم ۔ قرآن مجید نے عجب بلاغت و نکتہ سنجی سے کام لے کر یہاں اپنے دین اسلام کی نسبت نہ حق تعالیٰ کی جانب کی نہ رسولِ وقت حضرت محمد صلعم کی جانب ، بلکہ ابراہیم خلیل کی جانب کی ۔ یہاں مخاطب اصلاً یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب ہیں اور یہ تینوں قومیں مسلمانوں ہی کی طرح حضرت ابراہیم کو اپنا مقدس پیشوا مانتی تھیں ۔ اس اسلوب بیان کو اختیار کر کے گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآن تمہیں کسی نئے دین کی دعوت نہیں دیتا ، عین تمہارے ہی بزرگ و محترم پیشوا ابراہیم ہی کے دین کی جانب تمہیں بلا رہا ہے ! ـــــ تلطف اور حسن تبلیغ کا پیرایہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا ! مشرکین عرب کے پاس آسمانی کتاب کی قسم سے کوئی کتاب تو تھی ہی نہیں ، البتہ یہود و نصاریٰ کے نوشتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے فضائل اس وقت بھی درج تھے اور آج تک لکھے چلے آتے ہیں ۔ توریت مروجہ میں ہے ۔ "اپنے باپ ابراہام پر اور سرہ پر جو تمہیں جنی نگاہ کرو کہ جب میں نے اُسے بلایا وہ اکیلا تھا پھر اس کو برکت دی اور اس کو بہت بنایا ۔" (یسعیاہ ۵۱: ۲) "اے ابراہام تو مت ڈر میں تیری سپر اور تیرا بہت بڑا اجر ہوں ۔" (پیدائش ۱۵: ۱) "اور وہ خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لئے صداقت محسوب ہوا ۔" (پیدائش ۱۵: ۶) اور مسیحیوں کی انجیل مروجہ میں ہے ۔ "ابراہیم خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لئے راستبازی گنا گیا ۔ پس جان لو کہ جو ایمان والے ہیں وہی ابراہیم کے فرزند ہیں ۔" (گلتیوں ۳: ۶ ، ۷ نیز رومیوں ۴: ۳) ۳۷۰ دنیا کی اسی توحید پرستی اور ایمان باللہ کے صلے میں ہر قسم کی نعمتوں اور سرفرازیوں کے لئے ۔ یہاں تک کہ منصب نبوت و رسالت کے لئے ۔ ایک مسیحی مورخ ریورنڈ ردیم رنز ایم اے نے ایک مستقل سیرت ابراہیم انگریزی میں لکھی ہے ۔ اس سے آپ کے دنیوی عروج و اقبال پر بھی خوب روشنی پڑتی ہے ۔ ان روشن خیال ملاحدوں کی تردید کے لئے یہی کافی ہے جنہوں نے ابھی انیسویں صدی کے آخر میں آپ کے وجود کو فرضی قرار دیا تھا ۔ ۳۷۱ (ایک پیغمبر جلیل القدر کے شایانِ شان) یہود و نصاریٰ نے اہل کتاب ہونے اور نبوت و سلسلۂ وحی پر ایمان رکھنے کے باوجود اپنے نوشتوں میں کوئی کسر عظمتِ انبیاء کے داغدار بنانے میں اٹھا نہیں رکھی ۔ اس لئے قرآن مجید جہاں جہاں انبیاء سابق کا ذکر کرتا ہے اکثر ان حضرات کی اخلاقی و روحانی عظمت پر بھی زور دیتا جاتا ہے اور اس طرح انبیاء برحق کی نصرت و حمایت کا فرض توریت و انجیل کی عائد کی ہوئی فرد جرم کے مقابلہ میں ادا کرتا جاتا ہے ۔ یہ عجیب و غریب اہل کتاب ، نبی اور نبوت کے قائل گو ہیں ان کے صرف لفظی معنی میں تھے ۔ یعنی نبی وہ ہر جو کاہنوں جوتشیوں کی طرح غیب کی خبریں دے سکے ۔ اور اس سے انہیں کوئی بحث ہی نہ تھی کہ اس کے اخلاق کا کیا عالم تھا ، اس کے روحانی کمالات کس درجہ کے تھے ، اس کی تعلیمات کیا تھیں ، وقس علی ہذا ۔ ابراہیم خلیل تو اکثر انبیاء کے ابو الآباء ہیں ۔ آپ کی عصمت کے تحفظ کا تو قرآن نے اور زیادہ اہتمام رکھا ہے ۔ ۳۷۲ اسلموا کا دوسرا ترجمہ "اسلام لے آؤ" یا "مسلم ہو جاؤ" بھی ہو سکتا ہے ۔ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے اور یہاں اسے پھر یاد کر لیا جائے کہ قرآن مجید میں واقعات کا بیان ہمیشہ ترتیب تاریخی کے اعتبار سے نہیں ہوتا ۔ اسلام لانے کے معنی ہیں اپنے آپ کو تمام تر خدائے واحد کے سپرد کر دینا ، اس کا پرستار بن جانا ، عقیدہ ، معاشرت ، معاملت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کے قانون کو قبول کرنا اور اسی کے احکام کی اطاعت کرنا ۔ اصطلاح میں اسلام و ایمان گویا مترادف ہیں ۔ اور یہی دین اسلام ہمیشہ انبیاء کا رہا ہے ۔ ۳۷۳ یعنی میں خدائے پروردگار عالم پر اسلام لے آیا ۔ یہاں گویا حضرت ابراہیم نے اشارۃً اپنے ایمان لانے کی وجہ بھی بیان کر دی ۔ یعنی اسلام میں کیوں نہ لاؤں ؟ ایک ہی پروردگار ، ایک ہی حاکم مطلق ، ایک ہی مالک ، ایک ہی ربوبیت کے سارے شعبوں کا ناظم وہی ہے ۔ میں اس پر ایمان کیسے نہ لاتا ؟ [illegible]

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ

اور ابراہیم اس کی ہدایت کر گئے اپنے بیٹوں کو ۴۷۳ اور اسی طرح یعقوب بھی ۴۷۴ ۴۷۵ اپنے بیٹوں کو ۴۷۶ کہ

اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ

اے میرے بیٹو بیشک اللہ نے تمہارے لئے دین کا انتخاب فرمایا ہے ۴۷۷ سو ایسا ہرگز نہ ہونے پائے کہ تم مرتے

اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ

وقت بجز مسلم کے کچھ اور ہو ۴۷۸ بھلا اُس وقت تم کیا موجود تھے جب یعقوب کو

يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ

موت آپہنچی ۴۷۹ اور اُس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم میرے بعد

مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ

کس کی عبادت کرو گے ؟ ۴۸۰ وہ بولے ہم عبادت کریں گے آپ کے اور آپ کے باپ دادوں

اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحْنُ

ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود کی (یعنی) معبود واحد کی اور ہم تو اسی کے

لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

حکم بردار ہیں ۴۸۱ یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ۴۸۲ اُن کے آگے ان کا کیا ہوا آئیگا

وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا

اور تمہارے آگے تمہارا کیا ہوا اور وہ جو کچھ کرتے رہے اس کی پوچھ گچھ تم سے

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى

نہ ہوگی ۴۸۳ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تو

منزل ۱

۴۷۳ بہا یعنی اس دینِ توحید کی، ملّتِ اسلام کی۔ ضمیر خواہ ملّت کی جانب ہو خواہ اسلمتُ لرب العٰلمین کی طرف، ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ والضمیر فی بہا للقولہ اسلمت لرب العٰلمین ذکرتہ والضمیر للملّۃ او لقولہ اسلمت (بیضاوی) وصّٰی۔ عربی کا لفظ وصیۃ، اردو کے وصیت سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ بسترِ مرگ کی خواہشوں اور مرنے والوں کی آخری ہدایتوں تک محدود نہیں۔ ہر حکم، ہر ہدایت پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ وصّیتہ بکذا کے معنی ہیں میں نے اس کو حکم دیا۔ ”میں نے اسی سے یہ کرنے کو کہا“۔ بنیہ۔ حضرت ابراہیم کے صاحبزادے آٹھ تھے۔ (۱) حضرت اسمٰعیل م، حضرت ہاجرہؓ مصری کے بطن سے (۲) حضرت اسحٰق، حضرت سارہؓ عراقی کے بطن سے۔ (۳) زمران (۴) یقسان (۵) مدان (۶) مدیان (۷) اسباق (۸) سوخ یہ سب حضرت قتورہؓ کے بطن سے تھے (پیدائش ۲۵: ۱ و ۲) ۴۷۵ یعقوبؑ حضرت ابراہیم خلیل کے پوتے اور حضرت اسحٰق نبی کے صاحبزادہ تھے۔ اور نبی زادہ ہونے کے علاوہ خود بھی نبی تھے۔ اسرائیل آپ ہی کا دوسرا نام ہے۔ توریت میں ہے:- ”اور خدا نے اسے کہا کہ تیرا نام یعقوب ہے۔ تیرا نام آگے کو یعقوب نہ کہلائے گا بلکہ تیرا نام اسرائیل ہوگا۔ سو اس نے اس کا نام اسرائیل رکھا“ (پیدائش ۳۵: ۱۰ و ۱۱) عمر حسب روایت توریت ۱۴۷ سال کی پائی۔ زمانہ غالباً ۱۸۰۰ ق م تا ۱۶۵۵ ق م۔ ولادت کنعان (فلسطین) میں ہوئی ۱۸۰۰ق م میں اپنے نامور فرزند یوسف نبی کے پاس مصر میں منتقل ہو گئے۔ وفات یہیں ہوئی۔ ۴۷۶ چار ازواج طاہرات سے آپ کے بارہ فرزند تھے ان کے نام حسب تصریح توریت حسب ذیل ہیں:- روبن۔ شمعون۔ لاوی۔ یہوداہ۔ اشکار۔ زبلون۔ یوسف۔ بن یامین۔ دان۔ نفتالی۔ جد۔ آشر۔ (پیدائش ۳۵: ۲۳-۲۶) (انہیں صاحبزادوں میں سے جہاں تک خاندانی شجرہ اور نسب نامہ سے پتہ چلا ہے، حضرت لاوی کی نسل سے ان سطور کا راقم بھی ہے) ۴۷۷ الدین۔ یعنی اس دینِ توحید کا، ملّتِ اسلام کا۔ اصطفٰی۔ اصطفا کے معنی ہیں چن لینا اور ملاوٹ یا آمیزش سے پاک کر دینا۔ لکم میں ل تخصیص کا ہے۔ یعنی یہ دین تمہارے لئے ہے اور تم اس دین کے لئے ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم نے جو قوم عرب اور نسلِ یہود دونوں کے مورثِ اعلیٰ ہوئے ہیں۔ اور نصارٰی کے بھی مقتدا۔ اور حضرت یعقوبؑ جو نسلِ اسرائیلی کے جدِ امجد ہوتے ہیں۔ یہ دونوں تو اپنی اولاد کو خود اپنے اختیار کئے ہوئے اور خدا کے پسند کئے ہوئے دین کو منتقل ہی کر گئے اور فرما گئے کہ تمہیں کسی مزید تلاش میں حیران و سرگرداں ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ تمہارے لئے تو یہ اللہ کا بنایا ہوا اور بتایا ہوا دینِ توحید موجود ہی ہے —— قرآن کے مخاطبینِ اول سب کے سب اسلاف پرستی کے مرض میں گرفتار تھے۔ ان سے خطاب کا یہ بہترین اسلوب ہے کہ اچھا اگر دین کے بارے میں اپنے اسلاف ہی کو حکم بنا رہے ہو تو دیکھو وہی کیا کہہ گئے ہیں؟ ۴۷۸ (اور چونکہ موت کا وقت انسان کے علم میں نہیں۔ اس لئے تیار اس کے لئے ہر وقت اور ہمیشہ رہو) مطلب یہ ہوا کہ مسلم ہمہ وقت بنے رہو۔ ایمان کو ہر لحظہ دل میں جگہ دیئے رہو۔ دین کے مطالبات میں بس ایمان کا مطالبہ ایسا ہے جو ہمہ وقتی اور ہمہ حالی ہے ورنہ اعمال جتنے بھی ہیں سب حالات کے تابع ہیں اور حالات خود تغیر پذیر ہیں۔ ضمناً اہلِ کتاب کو بھی فہمائش ہو رہی ہے کہ تم جس دین کو نیا اجنبی اور انوکھا سمجھ کر اس سے بدک رہے اور بھڑکتے ہو وہ تو نو پیدا نہیں۔ وہ تو عین تمہارے ہی بزرگوں کا تعلیم کیا ہوا دین و آئین ہے [راقم سطور نامہ سیاہ کو اگر فرمائش کی جائے کہ سارے قرآن مجید میں سے کسی ایک آیت کو اپنے لئے انتخاب کرے تو اسکی نظرِ انتخاب اسی آیت بلکہ جزِ آیت پر پڑے گی اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ جی میں ہے کہ زندگی کی ہر ساعت میں یہی آیت وردِ زبان رہے۔ اور دل میں اسی کے معنی کا استحضار رہے۔ موت کے وقت یہی دل و زبان پر بھی ہو۔ اور بعدِ موت یہی کفن پر بھی لکھ دی جائے۔ اور قبر کے کتبہ پر بھی کندہ کر دی جائے۔ بارہا اس آیت پر وجد کر چکا ہوں۔ بارہا اس آیت پر آنسوؤں سے رو چکا ہوں۔ اور دل یہ کہتا ہے کہ سارے قرآن مجید کا لُبِّ لُباب یہی آیت ہے] ۴۷۹ حضر الموت یعنی وقتِ موعود قریب آگیا۔ اور آپ کو علامات و آثار اسکے محسوس ہونے لگے۔ یہ مراد نہیں کہ خود موت ہی آپ پر طاری ہو گئی۔ کنی بالموت عن مقدماتہ لانہ اذا حضر الموت نفسہ لا یقول المحتضر شیئاً (بحر) قرآن مجید ہی میں ایک اور دوسری جگہ ہے ویاتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت۔ یہاں بھی موت سے مراد موت کے دواعی و اسباب ہی لئے گئے ہیں۔ ام کنتم شھدآء۔ خطاب اہلِ کتاب سے ہے اور استفہام میں لہجہ زجر شامل ہے۔ معنی الاستفہام ھٰھنا الزجر والتوبیخ وھو فی معنی النفی (بحر) یعنی تم جو واہیات خرافات حضرت یعقوبؑ کی جانب منسوب کر رہے ہو تو تمہارا اس وقت وجود ہی کہاں تھا؟ صحیح واقعات وہی ہیں جو قرآن بیان کر رہا ہے۔ ۴۸۰ من بعدی۔ یعنی میری وفات کے بعد۔ مضاف محذوف ہے: من بعدی ای من بعد موتی (ابو سعود) حضرات انبیاء کو زندگی کی طرح اپنے آخر وقت میں بھی سب سے مقدم فکر دین ہی کی ہوتی ہے ۴۸۱ یعنی ہم سب اس پر اسلام لا چکے ہیں۔ توریت موجودہ کے اوراق تو اس اہم اور ضروری تذکرہ سے کسی مصلحت سے خاموش ہیں۔ البتہ احبارِ یہود کا یہ قول نقل ہو کر پہنچا ہے کہ ”یعقوب نے اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹوں کو تین احکام دیئے (۱) بُت پرستی نہ کرنا (۲) خدا کی بے حرمتی نہ کرنا (۳) میرے جنازے کو کوئی کافر ہاتھ نہ لگانے پائے۔“ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۷ صفحہ ۲۲) روایات و حکایات کی جو دوسری کتابیں ہیں ان میں صراحت اس سے بڑھ کر ملتی ہے:- ”یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا...... مجھے اندیشہ ہے کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بارہ بیٹوں نے کہا: سن لے اسرائیل، اے ہمارے باپ، ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے جس طرح تیرا دلی ایمان ایک خدا پر ہے اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان اسی ایک خدا پر ہے۔“ (گنزبرگ کی قصص یہود جلد ۲ صفحہ ۱۴۳) اٰبآئك۔ اسمٰعیلؑ یعقوبؑ کے بڑے چچا (یا تایا) تھے۔ فرزندانِ یعقوبؑ کے کمال سعادت مندی سے ان کا شمار بھی آبائے یعقوبؑ میں کیا، جیسا کہ اردو محاورہ میں بھی باپ چچا کو ایک ہی حکم میں رکھا جاتا ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلعم کی زبانِ مبارک سے آپ کے چچا حضرت عباسؓ کیلئے یہی لفظ اب آیا ہے۔ ھٰذا بقیۃ اٰبائی یعنی میرے بڑوں یا بزرگوں میں اب یہی باقی ہیں۔ اسحٰق۔ یہ نام پہلی بار آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے صاحبزادہ تھے، حرمِ اول حضرت سارہ کے بطن سے۔ سالِ ولادت غالباً ۲۰۶۰ ق م۔ سالِ وفات غالباً ۱۸۸۰ ق م۔ عمر شریف توریت میں ۱۸۰ سال درج ہے۔ یہ بھی درج ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۱۰۰ سال تھی۔ آپ کے بسترِ مرگ کا منظر قصص الیہود میں یوں دکھایا گیا ہے:- ”جب اسحٰق نے دیکھا کہ ان کا وقتِ موعود آپہنچا، تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا، اور کہا کہ میں تمہیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں، جسکی صفات علی، عظیم، قیوم، عزیز ہیں۔ اور جو آسمان و زمین اور انکے درمیان کی ہر شے کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا۔“ (جلد اول صفحہ ۳۱۶) ۴۸۲ اور انکے فضائل و کمالات بھی انکے ساتھ گزر چکے تمہیں تو انکے نام گنانے سے کیا حاصل؟ تلك امّۃ سے مراد یہی اجدادِ یہود ہیں جن کا شمار جماعتِ انبیاء میں ہے۔ خطاب یہاں یہود سے ہے جو آبائی مفاخرت، نسلی عظمت، پیرزادگی کے نشہ میں چور تھے۔ اس میں بڑا سبق آج کل کے پیرزادوں، رسمی مشائخ زادوں، اور بہت سے بدعتی فرقوں کے لئے موجود ہے۔ بلاسعی و عمل محض بزرگوں کی نسبت سے فائدہ اٹھانے کی جڑ ہی اسلام نے کاٹ دی ہے۔ ۴۸۳ اسلام کے طفیل اب یہ بات معمولی سی معلوم ہوتی ہے لیکن قرآن نے جب اس حقیقت کا اعلان کیا ہے اس وقت بہت ہی اہم اور گویا ایک نادر سی بات تھی۔ شخصی و ذاتی ذمہ داری اور انفرادی مسئولیت کی تعلیم اسلام کے خصوصیات امتیازی میں سے ہے۔ ورنہ مشرک تو مشرک، یہود اہلِ توحید تک اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ذاتی عمل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بعنوانِ الٰہی کی جانب انتساب نسلی اور بزرگوں کی طرف نسبتِ نسبی بالکل کافی ہے۔ مسیحیوں کا گھڑا ہوا مسئلہ ”معصیتِ متوارث“ سب کو معلوم ہے۔ یعنی جو معصیت ابو البشر سے سرزد ہو گئی تھی، وہ ہر نسلِ آدم میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ یہود نے اسکے مقابل ایک عقیدہ ”نجاتِ متوارث“ کا وضع کر لیا تھا۔ اور یہ سمجھ لیا تھا کہ ”خدائے تعالیٰ اپنے اسم پاک کے طفیل میں اور بطور اپنے افضال کے، باپ کے حسنات اولاد کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے“ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۲۲۳) توریت مروجہ میں ایک آیت اس مضمون کی ملتی ہے:- ”میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں، جو باپ دادوں کی بدکاری کا بدلہ انکی اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک جو میرا کینہ رکھنے والے ہیں لیتا ہوں“ (استثناء ۵: ۹) بس اس تنکے کی اوٹ پہاڑ یہ کھڑا کر لیا گیا کہ ہر نسل کو انتقالِ ثواب اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی یعنی

اسلاف اخلاف دونوں کی طرف منسوب ہوتا ہے گا۔ اور بعض کو ثواب اپنے اسلاف کے اعمال کا ملے گا، اور بعض کو ثواب اپنے اخلاف کے اعمال کا۔" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۶ صفحہ ۸) "افراد یہود کی امید یہ سب اسلاف کے تقدس پر قائم ہو گئی تھیں (یعنی اس پر کہ ہم ابراہیم کی اولاد ہیں)" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۳ صفحہ ۱۶۸ طبع یازدہم) ۴۸۴ قرآن مجید کی صاف اور سیدھی تعلیمات اور اسکے واضح دلائل کو سن کر چاہیئے تو یہ تھا کہ اہل کتاب ان سے متاثر ہوتے، اور قبول حق پر آمادہ ہو جاتے۔ لیکن بجائے اسکے ضد اور ہٹ سے کام لیکر الٹے مسلمانوں کو یہودیت اور نصرانیت کی دعوت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا دین قبول کر لو، تو تمہیں دنیا کی فلاح اور آخرت میں نجات حاصل ہو جائیگی۔ ۴۸۵ (ساری امت مسلمہ کی طرف سے ان لوگوں کے جواب میں، اے ہمارے پیغمبر!) ۴۸۶ (اسکی اصلی اور غیر محرف شکل میں) ملۃ ابراھیم۔ یہود اور نصاریٰ دونوں، تو مسلمانوں اور نیم مسلموں کو اپنی اپنی طرف کھینچتے تھے کہ، فلاح ونجات منظور ہو تو ہمارے مذہب میں آؤ۔ اس نئے مذہب میں کیا رکھا ہے؟ مسلمانوں کو تعلیم اس جواب کی مل رہی ہے کہ "تمہارے ہاں کیا رکھا ہے بجز تحریفات کے؟ ہمارا دین تو وہ تو پیدا ذرا بھی نہیں۔ وہ تو بس قدیم دین توحید ابراہیم علیہ السلام ہے، اور ہم اسی کی اصلی اور غیر محرف شکل پر قائم ہیں۔" حنیفًا۔ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے مضاف الیہ ابراہیم کا۔ اکثر اکابر تفسیر اسی طرف گئے ہیں۔ حال من المضاف الیہ (کشاف) ھو حال من المضاف الیہ (ابو سعود)۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حنیفًا صفت ابراھیم کی نہیں بلکہ ملۃ کی ہے۔ اور حال مضاف الیہ کا نہیں، بلکہ مضاف کا واقع ہوا ہے۔ وھو حال من المضاف بتاویل الدین او تشبیھًا لہٗ بفعیل بمعنی مفعول (روح) اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا ہم نے پایا ہے مذہب ابراہیم کا جو سیدھی راہ ہے۔ "حنیفًا کے معنی بہرصورت مستقیمًا و مائلًا الی الحق کے ہیں۔ اس جملہ کی تقدیر یوں ہے۔ بل نکون علی ملتہ علیہ السلام یا بل نتبع ملتہ علیہ السلام ۴۸۷ یہ تعریض ہے اہل کتاب پر کہ تم کس منہ سے اپنے کو دین ابراہیم کی جانب منسوب کرتے ہو، وہ تو شرک کے قریب ہو کر بھی نہیں گزرے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کی توحید خالص پر یہود و نصاریٰ سب ہی متفق تھے گو عملاً ان کی روش چھوڑے ہوئے تھے۔ بلکہ مسیحی تو صریح شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ۴۸۸ (اللہ کے ہاں سے ہمارے پیمبر کے واسطہ سے) خطاب عام مسلمانوں سے ہے یعنی ہمیں تو نسلی یا قومی تعصب کسی سے بھی نہیں۔ ہمارا رشتہ اسمٰعیلی، اسرائیلی ہر شریعت الٰہی سے بس اعتقاد و انقیاد ہی کا ہے۔ الاسباط جمع ہے سبط کی۔ اور معنی ہیں اولاد کی اولاد یا پوتے اور نواسے۔ الاسباط اولاد اولاد وقیل اولاد البنات (تاج) عوام میں صرف نواسوں کے معنی میں مشہور ہے۔ لیکن ائمہ لغت کی تصریح ہے کہ پوتوں اور نواسوں دونوں کے لئے عام ہے۔ کلام الائمۃ صریح فی انہ یشتمل ولد الابن او الابنۃ کما صرح بہ ابن سیدہ (تاج) بنی اسمٰعیل کی شاخیں جس طرح قبائل میں تقسیم ہو گئیں۔ بنی اسرائیل کی شاخیں اسی طرح اسباط کہلائیں۔ قال الازھری الاسباط فی بنی اسحٰق بمنزلۃ القبائل فی بنی اسمٰعیل (تاج) نسل اسرائیل میں رسالت بہت وسیع پیمانہ پر پھیلی رہی۔ فقرہ کا مطلب یہ ہوا کہ ہم مسلمان کسی پیمبر کے بھی منکر نہیں۔ ۴۸۹ (اللہ کے ہاں سے) اسمٰعیل و اسحٰق۔ یہ دو نام اس سیاق اور اس سلسلہ میں خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ اسمٰعیل علیہ السلام کا نام لانا تو اس لئے بہت ضروری تھا کہ اہل کتاب انہیں سے تو بغض رکھتے تھے۔ بغیر ان کا نام لائے اسلام کے دعویٰ کا اثبات ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اسحٰق علیہ السلام کا نام لانا خود ایک دلیل روشن ہے اسلام کے طریق عدل اور بے تعصبی کی۔ قرآن اگر بشری کلام ہوتا تو بشر کی فطرت تو یہ تھی کہ اہل کتاب کے شدید اور مسلسل اشتعال انگیز تعصب کے جواب میں اسمٰعیل کی نصرت وحمیت میں اسحاق کا نام نظر انداز ہی کر دیا جاتا۔ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق تینوں کی تاریخی شخصیتیں پر حاشیے اوپر گزر چکے۔ ۴۹۰ (کلام الٰہی یا کتاب آسمانی میں سے) موسیٰ۔ آپ کی تاریخی شخصیت پر حاشیہ گزر چکا۔ عیسیٰ۔ ابن مریم۔ بجائے والد کے اپنی والدہ کی جانب منسوب ہیں۔ بنی اسرائیل کے آخری اور مشہور نبی ہوئے ہیں۔ آپ پر سلسلہ اسرائیلی رسالت کا بلکہ قومی ونسلی رسالت کا ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا۔ ولادت صوبہ یہودیہ (ملک شام) کے قصبہ بیت اللحم میں، یا بیت المقدس میں، حاکم شام ہیرود کے زمانہ میں ہوئی۔ شام اس وقت روم کی شہنشاہی کا ایک نیم آزاد علاقہ تھا۔ سال ولادت اغلبًا ۴ ق م ہے۔ یہ بات سننے میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ لیکن اس پر اتنی حیرت نہ کیجئے۔ سنہ عیسوی جو اس وقت رائج ہے، خود اسی تقویم کے قائم کرنے میں شروع ہی سے غلطی رہ گئی، اور اسکا پتہ بعد کو چلا۔ چنانچہ سن عیسوی کا پہلا سال آپ کا سال ولادت نہیں۔ آپ کی ولادت کے چوتھے سال سے یہ سنہ جاری ہوا ہے۔ آپ کی عمر غالبًا ۳۳ سال کی تھی، اور سنہ ۲۹ء تھا کہ اسرائیلیوں نے آپ کی تعلیم و تبلیغ سے نہایت درجہ آزردہ ہو کر آپ پر مقدمہ پہلے تو اپنی آزاد و خود مختار مذہبی عدالت میں چلایا۔ اور پھر سرکاری قانون کا بھی مجرم بنا کر رومیوں کی ملکی عدالت میں پیش کیا۔ وہاں سے سزائے موت (بذریعہ صلیب) کا حکم صادر ہوا۔ اسکے بعد کیا گزری، اس کا ذکر سورۂ مائدہ کی آیت وما قتلوہ وما صلبوہ کے تحت میں ان شاء اللہ آئے گا۔ ۴۹۱ (خواہ وہ کسی ملک، کسی نسل، کسی زمانہ کے ہوں، کہ ان میں کسی کو نبی مرسل مانیں، کسی کو نہ مانیں) اسلام کے ایک جدید یا نو پیدا مذہب ہونے کی یہ تردید ایک بار پھر کی جا رہی ہے۔ عالمگیر مذہب، آج ہر شخص بجائے خود فیصلہ کر سکتا ہے، کہ وہ ہو سکتا ہے جو ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل، ہر زمانہ کے پیغمبروں اور سچے ہادیوں کی علانیہ اور پر زور تصدیق کر رہا ہے۔ یا وہ مذہب ہو سکتے ہیں، جو آسمانی ہدایت کو فلاں ملک، فلاں قوم، فلاں نسل کے ساتھ مخصوص و مقید کئے ہوئے ہیں۔ ۴۹۲ (وہ ہم کو جس کسی کی بھی اطاعت کا حکم دے دیگا، ہم اسی کے پیرو ہو جائیں گے ہمیں کسی سے نہ تعصب نہ عناد، ہم تو بس امر الٰہی کے فرمانبردار ہیں) اسلامی تعلیمات کا عطر و لب لباب بس یہی مسئلہ توحید ہے۔ ۴۹۳ (اور اپنے ایمان کی بنا پر نجات کے مستحق ہو گئے) خطاب مسلمانوں سے ہے، اور "یہ لوگ" سے مراد وہی منکرو کافر اہل کتاب ہیں جن کا سلسلہ اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ انہیں بشارت دی جا رہی ہے کہ اتنی ضد و عناد کے باوجود اگر اب بھی وہ ایمان لے آئیں تو ان کا پچھلا کفر و عناد انکی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ فان کی ف سے اشارہ اس طرف ہو کہ اب جب کہ تعلیمات اسلامی کا معقول ان پر پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ ۴۹۴ (حق و راہ راست سے) یعنی اتنی واضح ہدایت پہنچ جانے کے بعد اگر اب بھی ایمان نہ لائیں، تو اب جو انہیں مخالفت ہے وہ مخالفت ہی کی غرض سے، ضد اور عداوت ہی کی بنا پر ہے۔ اس لئے نہیں کہ وضوح حق میں کوئی خفا یا ابہام باقی رہ گیا ہے۔ اب جو وہ دین کو نہیں سمجھتے، تو محض اس لئے کہ سمجھنا چاہتے نہیں۔ اے علمنا انہ لیس غرضھم طلب الدین والانقیاد للحق وانما غرضھم المنازعۃ واظہار العداوۃ (کبیر) ۴۹۵ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسکین و تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ہجوم اعداء اور قوت و کثرت مخالفین سے ذرا بھی تشویش و فکر نہ کریں۔ حق کے معاندین آپ کو اور آپکے دین کو گزند پہنچانے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اب اللہ آپ کا نگہبان ہے۔ ۴۹۶ سمیع۔ سننے والا ان کے الفاظ و اقوال، ان کے حرف حرف عبارت کا۔ یعنی جو کچھ ان کی زبانوں پر ہے ان کی گفتگوئیں اور تقریریں سب اللہ پر روشن ہیں۔ علیمٌ۔ جاننے والا انکے دلوں کے احوال و اسرار کا۔ یعنی ان کے ظاہر کی طرح ان کا باطن بھی اس عالم کل پر روشن ہے، اور ان کی اندرونی کارروائیاں اور سازشیں سب اس کے سامنے بے نقاب موجود ہیں۔ ۴۹۷ تقدیر کلام یوں سمجھی گئی ہے۔ صبغنا اللہ صبغۃ (ابو سعود) یعنی ہمیں اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اور اللہ کے رنگ سے مراد اسکے دین فطری یعنی اسلام سے ہے۔

تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ

راہ یاب ہو جاؤ گے ۴۸۴ آپ کہہ دیجیئے ۴۸۵ کہ نہیں بلکہ ہم نے تو ابراہیمؑ سیدھی راہ والے کا مذہب پا لیا ہے ۴۸۶ اور وہ

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ

مشرکین میں سے نہ تھے ۴۸۷ کہہ دو کہ ہم تو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اُس پر جو ہم پر

اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ

اُتارا گیا ہے ۴۸۸ اور جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ

وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى

اور اولاد (یعقوبؑ) پر اُتارا گیا ہے ۴۸۹ اور جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو دیا گیا

وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ

اور اس پر جو دوسرے انبیاء کو انکے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ۴۹۰ اور ہم ان میں سے کسی کے درمیان

اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا

بھی فرق نہیں کرتے ۴۹۱ اور ہم اللہ ہی کے حکم بردار ہیں ۴۹۲ تو اگر یہ لوگ ایمان

بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا

لے آئیں جس طرح تم ایمان رکھتے ہو تو بیشک وہ بھی راہ پا گئے ۴۹۳ اور اگر منہ موڑے رہیں

فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ

تو بس (یہی) مخالفت میں پڑے ہیں ۴۹۴ سو اب اللہ آپ کی طرف سے انکے مقابلہ میں بس ہے ۴۹۵ اور وہ

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ

بڑا سننے والا (اور بڑا) جاننے والا ہے ۴۹۶ (کہہ دو کہ ہم پر) اللہ کا رنگ ہے ۴۹۷ اور اللہ سے بہتر کون

لے دین اللہ (مدارک) والمراد بہ دینہ الذی فطر الناس علیہ (جلالین) یہی دین اللہ کے معنی ابن عباس صحابی اور مجاہد، ابو العالیہ، قتادہ وغیرہ متعدد تابعین سے مروی ہیں (ابن کثیر) صدیوں سے یہود و نصاریٰ کی
عرف چلا آرہا ہے۔ ان دونوں کے ہاں بڑی اہمیت ایک خاص قسم کے رسمی تطہیری غسل کی تھی، جسے بپتسمہ یا اصطباغ کہا جاتا تھا۔ انہیں کی اصطلاح میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے
لازم پکڑنے کی چیز دینِ توحید ہے۔ یعنی التزموا دین اللہ (معالم) ۴۹۸ (جس کا دین ایمان کے رنگ کو نکھار دیتا ہے، اور کفر و ضلالت کی نجاستوں کو دور کر دیتا ہے) والمراد انہ یصبغ عبادہ بالایمان و یطہرہم
بہ من اوساخ الکفر فلا صبغۃ احسن من صبغتہ (کشاف، کبیر) ۴۹۹ اور سارے عقاید باطل، شعائر باطل، معبودانِ باطل کے منکر ہیں (نحن، ہم یعنی مسلمان یا اُمّتِ مُسلمہ) ۵۰۰ خطاب اگرچہ سارے

مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ
رنگ (دینے والا) ہے ۴۹۸ ہم تو اُس کی بندگی کرنے والے ہیں ۴۹۹ آپ کہیے کہ
اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا
کیا تم ہم سے اللہ کے باب میں حجت کیے جاتے ہو ۵۰۰ درآنحالیکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی
وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ
پروردگار ہے ۵۰۱ اور ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے اور ہم تو اُسی کیلئے خالص ہیں ۵۰۲ کیا تم یہ کہتے
اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ
ہو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ
وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ
اور اولادِ (یعقوبؑ) یہودی یا نصرانی تھے ۵۰۳ آپ کہیے تم
اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ
واقف تر ہو یا اللہ ۵۰۴ اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اُس شہادت کو چھپائے جو اُس کے
مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾
پاس اللہ کے ہاں سے پہنچ چکی ہے ۵۰۵ ورنہ اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر تو ہے نہیں ۵۰۶
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا
یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ۵۰۷ اُن کا کیا ہوا اُن کے آگے آئیگا اور تمہارا کیا ہوا تمہارے
كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶
آگے آئیگا ۵۰۸ اور جو کچھ وہ کرتے رہے اُس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی ۵۰۹

اہلِ باطل کیلئے عام ہے، لیکن سیاق میں خاص طور پر مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ ذکروا فیہ وجوھا احدھا انہ خطاب للیہود والنصاریٰ وھو الیق بنظم الآیۃ (کبیر) ۵۰۱ (تو کم از کم اس کی ذات و صفات کے باب میں تو تمہیں کوئی مغالطہ یا غلط فہمی نہ رہنا چاہیے) یعنی اے اہلِ کتاب جب ہمارے تمہارے درمیان کوئی اختلاف پروردگار کے تعین میں نہیں۔ تو اول تو اسکی توحید پر قائم رہنا چاہیے۔ اور تثلیث فی التوحید یا توحید فی التثلیث اور خدا کے فرزند بعد ازو مظہر وغیرہ قسم کے خرافات سے بالکل بچنا چاہیے۔ دوسرے جب اسکی صفاتِ کمالیہ پر ایمان ہے، تو وہ اپنی حکمت و ربوبیت کے تقاضا سے جس نسل کے جس فرد کو بھی چاہے نبوت و رسالت سے سرفراز کرے۔ وہ ہر طرح مالک و مختار ہے۔ اسرائیلی غیر اسرائیلی کسی خاص نسل کا اجارہ نہیں۔ ۵۰۲ (اپنے عقائد و اپنی عبادات میں ہر شرک، ہر ضلالت سے پاک صاف ہو کر) بس اعمال تو ہمارے اور اپنے اعمال کے فرق کا اثر آخرت میں تو تمہیں بھی نظر آجائیگا۔ آج جتنا چاہو اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرلو۔ ۵۰۳ یعنی کیا تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ان پیمبروں، بزرگوں اور تمہارے مورثوں کے عقائد ذات و صفاتِ باری کے باب میں بجائے دینِ توحید و اسلام کے، یہودیت و نصرانیت کے تھے؟ ام تقولون۔ خطاب اہلِ کتاب خصوصاً یہود سے ہے۔ اور لہجۂ خطاب میں زجر کا پہلو شامل ہے۔ صیغۃ استفہام و معناہ التوبیخ (معالم) جتنے اسماء و اعلام یہاں آئے ہیں، ان سب پر حاشیے آیت ۱۳۶ کے ذیل میں اور اسکے قبل گزر چکے۔ ۵۰۴ (ان حضرات کے دین و عقائد کے باب میں) اور اللہ کی شہادت یہ ہے کہ یہ سب توحیدِ خالص کے پیرو تھے۔ نزولِ قرآن کے وقت یہود میں بڑے بڑے عالم و فاضل موجود تھے۔ ان سب کو چیلنج دیکر ایک اُمّی کی زبان سے کہلایا جا رہا ہے کہ تم واقعات کو توڑ مروڑ کر، صداقتوں کا گلا گھونٹ کر جو کچھ بھی کہے جاؤ، واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سب حضرات خالص موحد اور توحید کے مبلغ ہوئے ہیں ـــــ آج یورپ کے بڑے بڑے ماہرینِ تاریخ اور محققینِ اثریات جو کچھ ان حضرات کے دین کی بابت کہہ رہے ہیں، وہ اسی قرآنی متن کی شرح اور اسی اُمّی کے لائے ہوئے کلام کے اجمال کی تفصیل ہے! ۵۰۵ (اور وہ شہادت ہے دینِ اسلام کے برحق ہونے کی، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کے مومنِ کامل و مبلغِ توحید ہونے کی۔ اور آخر زمانہ میں ایک رسولِ برحق کے ظہور کی) اس شہادت کو چھپانے والے ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب خصوصاً یہود کے علماء تھے۔ اور یہ شہادت محفوظ تھی ان کی مسلّم آسمانی کتابوں اور الہامی نوشتوں میں۔ شہادۃ فی کتمانہم امر محمد صلی اللہ علیہ وسلم و نبوتہ (ابن جریر) وھی شہادۃ اللہ لابراہیم بالحنیفیۃ (مدارک) و فیہ تعریض بکتمانہم شہادۃ اللہ لمحمد علیہ السلام بالنبوۃ فی کتبہم و سائر شہاداتہ (مدارک) ۵۰۶ (وہ وقت آنے پر انہیں کے مطابق تم سے معاملہ کرے گا) مطمئن اور بے فکر نہ ہو جاؤ۔ وہاں رتّی رتّی کی خبر ہے۔ اور ویسا ہی معاملہ پیش آئے گا۔ وہاں بزرگوں کے ساتھ نسبی و نسلی انتساب ہرگز کام نہ دے گا۔ منکروں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے اس سے بہتر اور موثر کوئی ذریعہ نہیں کہ اللہ کے عالم الغیب ہونے کا استحضار ذہن کے سامنے بار بار ہوتا رہے۔ اور قرآن مجید یہی کراتا رہتا ہے۔ ۵۰۷ (اور محض انکے نام کا انتساب بغیر انکے سے اعمال و عقائد کے ہرگز کافی نہیں) تلک امۃ سے مراد ہیں قوم اسرائیل کے اکابر سلف خصوصاً اجداد ثلثہ ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ، جن کی اولاد ہونے پر اسرائیلیوں کو حد سے زیادہ ناز تھا۔ نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۵۰۔ ۵۰۸ (آخرت میں) یعنی نہ انکے ایمان و اعمالِ صالحہ سے تمہیں کچھ نفع پہنچے گا، اور نہ تمہارے کفر و اعمالِ سیّئہ سے انہیں کوئی ضرر ہوگا ۵۰۹ یہود کی کتابوں میں آج تک یہ تعلیمات موجود ہیں کہ ”جس طرح انگور کی زندہ و شاداب بیل ایک بے جان ستون کے سہارے بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے اسی طرح زندہ یہودی اپنے آنجہانی و مرحوم مورثوں اور بزرگوں کے بل بوتے پر پروان چڑھتا رہتا ہے۔ اور تینوں اجداد اسرائیل نیز دوسرے صالحین و اخیار نے اعمالِ صالحہ کا جو انبارِ عظیم لگا دیا ہے، اسی سے ان کی اولاد کو مجموعاً و منفرداً برابر حصہ ملتا رہتا ہے، اور اس طرح کسی فرد میں خواہ کتنی ہی کمزوریاں ہوں اسکی نجات یقینی ہے“ قرآن حکیم اس نجاتِ متوارث کے عقیدہ پر برابر ضرب شدید لگاتا جاتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۵۰۔

۵۱۰ یہ بطور استفہام واستفسار کے نہیں، بلکہ بطور طنز و تعریض (سیقول میں س ہو سکتا ہے کہ استقبال کے لئے ہو اور اس کے معنی عنقریب، کے ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مطلق تاکید کے لئے ہو، اور معنی صیغہ ماضی کے دے۔ اور چونکہ آیت کا نزول ایک قول کے مطابق حکم تحویل قبلہ سے قبل نہیں، اس کے بعد ہوا ہے، اس لئے مفسرین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے، کہ یہاں ماضی مراد ہے۔ اور اردو محاورہ میں اس کی مثال ایسی ہوگی، جیسے کسی گزرے ہوئے واقعہ سے متعلق کہا جائے، کہ ہاں ہم تو جانتے ہی تھے کہ یہ لوگ ضرور اس پر اعتراض کریں گے۔ قال القفال ان الآیۃ نزلت بعد تحویل القبلۃ وان لفظ سیقول مراد منہ الماضی (معالم) قیل ان سیقول بمعنی قال (رح) اور اسی سے ملتا ہوا قول یہ بھی ہے، کہ صیغہ ماضی یہاں اس اعتراض کے استمرار کو ظاہر کرنے کو لایا گیا ہے، یعنی یہ لوگ برابر اسی طرح کہتے رہیں گے۔ انما عبر عن الماضی بلفظ المستقبل للدلالۃ علی استدامتہ والاستمرار علیہ (رح) لیکن جمہور کا فیصلہ ہے کہ یہاں مستقبل ہی مراد ہے۔ اور آیت کا نزول حکم تحویل قبلہ سے قبل ہی ہوا ہے۔ و سیقول ظاہر من الاستقبال (بحر) اس صورت میں بالکل درست ہوگا اگر آیت کو ایک سچی پیشگوئی یا اخبار بالغیب کی مثال میں بھی پیش کیا جائے۔ ان اللہ تعالی اخبر عنہم قبل ان ذکروا ہذا الکلام انہم سیذکرونہ (کبیر) ان اخبار من اللہ تعالی لنبیہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ بعد دھم ہذا القول فی المستقبل (بحر) انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قیام مکہ کے زمانہ میں اسی رخ پر نماز جاری رکھی، بلکہ جب مدینہ ہجرت فرمائی جب بھی اسی قبلہ کو

الربع

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ

اب بیوقوف لوگ (ضرور) کہیں گے ۵۱۰ کہ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلہ سے جس پر

الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ

وہ اب تک تھے ۵۱۱ ہٹا دیا آپ کہہ دیجیے ۵۱۲ کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ملک ہیں ۵۱۳

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

وہ جسے چاہے ۵۱۴ سیدھی راہ چلا دیتا ہے ۵۱۵

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ۵۱۶ ایک امت عادل بنا دیا ہے ۵۱۷ تاکہ تم گواہ رہو

عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

لوگوں پر ۵۱۸ اور رسول گواہ رہیں تم پر ۵۱۹

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ

اور جس قبلہ پر آپ (اب تک) تھے ۵۲۰ اسے تو ہم نے اسی لئے رکھا تھا کہ ہم پہچان لیں رسول

مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ

کا اتباع کرنے والوں کو الٹے پاؤں واپس چلے جانے والوں سے ۵۲۱ اور

اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ

یہ حکم، بہت گراں ہے، مگر ان لوگوں کو نہیں جنہیں اللہ نے راہ دکھا دی ہے ۵۲۲ اور

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ

اللہ ایسا نہیں کہ ضائع ہو جانے دے تمہارے ایمان کو ۵۲۳ اور اللہ تو لوگوں پر بڑا شفیق ہے ۵۲۴

برقرار رکھا۔ بیت المقدس مدینہ سے سمت شمال میں واقع ہے۔ آپ کا دل بار بار یہ چاہتا تھا کہ اپنے جد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے خانہ کعبہ کو قبلہ بنائیں لیکن حکم الہی سے مجبوری تھی۔ آخر ورود مدینہ کے ۱۶ مہینے بعد تحویل قبلہ کا حکم ملا کہ اب نماز بجائے بیت المقدس کے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی جائے اور اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ خانہ کعبہ کہ مدینہ سے ٹھیک جنوب میں واقع ہے۔ اور اس طرح مدینہ کے نمازیوں کے رخ دفعۃً شمال سے جنوب کی جانب پھر گئے۔ بیت المقدس یہود کا قبلہ تھا۔ اس کی منسوخی کا اعلان رسول اللہ صلعم کی زبان سے یہود کو بہت ہی ناگوار گزرا۔ وہ یوں بھی رسول اللہ صلعم کو اپنا دشمن اور اپنے دین کا بیخ کن سمجھے ہوئے تھے۔ تحویل قبلہ کے اس بیّن اعلان کو وہ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی سمجھے، اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کرنے لگے، ان کے ہمنوا کچھ اور لوگ بھی منافقوں اور بد دینوں میں سے ہو گئے۔ السفہاء من الناس سے یہی لوگ مراد ہیں۔ سفہاء جمع ہے سفیہ کی، اور سفیہ کے معنی کم عقل یا بدعقل کے ہیں۔ السفیہ الخفیف العقل (تاج) واستعمل فی خفۃ النفس لنقصان العقل (راغب) یہاں سفاہت کا صاف اطلاق احکام الہی پر قیل و قال کرنے والوں کے حق میں ہے۔ السفہاء سے مراد یہود کا ہونا خود صحیح بخاری میں آچکا ہے۔ السفہاء ہم الیہود (بخاری عن البراء) صحابہ و تابعین کثرت سے اسی طرف گئے ہیں، بعض روایتیں منافقین سے متعلق بھی ملتی ہیں۔ نزلت فی المنافقین (ابن جریر عن السدی) راجح یہ ہے کہ آیت عام رکھی جائے تمام معترضین کے لئے۔ والآیۃ عامۃ فی ہؤلاء کلہم (ابن کثیر) یدخل فیہ الکل لان لفظ السفہاء لفظ عموم (کبیر) الاقرب ان یکون الکل (کبیر) ۵۱۱ یعنی بیت المقدس سے۔ قبلہ۔ وہ مکان ہے جس کے مقابل رخ کر کے نماز پڑھی جائے۔ صار اسما للمکان المقابل المتوجہ الیہ للصلوۃ (راغب) یہ حکم سب سے زیادہ ناگوار یہودیوں کو گزرا۔ اب تک وہ یہ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ مسلمان کم از کم ان کے ہم قبلہ تو ہیں۔ اب یہ مسرت بھی ان سے چھن گئی ۵۱۲ ان کے جواب میں اے ہمارے پیغمبر ۵۱۳ اور کسی خاص سمت و جہت میں کوئی تقدس رکھا ہوا نہیں ہے۔ اس کے لئے سب برابر ہیں۔ وہ جدھر اور جس چیز کو بھی چاہے، نماز کے لئے رخ مقرر کر دے۔ سوال اصلاً یہ ہو ہی نہیں سکتا، للہ میں لام ملکیت کا ہے۔ مشرق و مغرب سب اللہ کی ملک ہیں، مخلوق ہیں، ہر دوسری مخلوق کی طرح تابع و محکوم ہیں۔ یہ ضرب ہے مشرق پرستی، مغرب پرستی، اور ہر قسم کی سمت پرستی پر، جو مختلف مشرک، جاہلی قوموں کا مذہب رہی ہے۔ شرک کی اس خاص قسم سمت پرستی یا جہت پرستی پر حاشیہ اوپر گزر چکا۔ پارۂ اول، رکوع ۱۴، آیت ۱۱۵ للہ المشرق والمغرب کے تحت میں ۵۱۴ اور اس کا چاہنا ہمیشہ قانون حکمت کے مطابق ہی ہوتا ہے ۵۱۵ اور یہ چون و چرا، سوال یا ردت کے سب سے بڑے حکیم و عالم کے اتباع کی توفیق دے دیتا ہے ۵۱۶ اے مسلمانو اسی طرح ایک اسی مسئلہ پر موقوف نہیں، ہر معاملہ میں ۵۱۷ یعنی ایسی امت جو ہر اعتبار اور ہر معیار سے نقطۂ اعتدال پر ہو، ہر کجی اور ہر افراط و تفریط سے پاک۔ وسطاً عربی زبان میں یہ لفظ خاص مدح کے موقع پر آتا ہے۔ ولما الوسط ذلک فی کلام العرب الخیار (ابن جریر) استعیر للخصال المحمودۃ بوقوعہا بین طرفی افراط و تفریط (بیضاوی) حدیث نبوی میں وسط کی تفسیر عدل سے آئی ہے۔ عن ابی سعید الخدری عن النبی صلعم امۃ وسطا قال عدلا (ابن کثیر عن احمد) اور ائمہ لغت سے بھی یہی معنی منقول ہیں۔ قال الجوہری فی الصحاح امۃ وسطا ای عدلا وھو الذی قالہ الاخفش والخلیل و قطرب (کبیر) آیت سے یہ استنباط بھی کیا گیا ہے کہ اجماع امت حجت ہے۔ احتج جمہور الاصحاب وجمہور المعتزلۃ علی ان اجماع الامۃ حجۃ (کبیر) ۵۱۸ ملت اسلامی انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے، ساری دنیا کے لئے بطور نمونہ کے تیار کی گئی ہے، کائنات کی ہر امت کو اسی سانچہ میں ڈھلنا اور اسی معیار پر پورا اترنا چاہیے۔ آیت سے کمال درجہ کی فضیلت امت اسلامی کی ثابت ہو رہی ہے۔ شہداء سے یہ تنبیہ بھی نکل رہی ہے کہ مسلمانوں کو اخلاقی پستی اور فسق و فجور کی ہر صورت سے بچے رہنا چاہیے۔ ورنہ پھر وہ اس شہادت کے قابل نہ رہیں گے ۵۱۹ جس طرح دنیا کی ہر امت کے لئے نمونہ اور معیار کا کام دینے کے لئے امت اسلامیہ ہے خود اس امت کے لئے معیار کا کام دینے کے لئے رسول اللہ صلعم کی ذات ہے ۵۲۰ اور اس پر بھی حکم الہی ہی سے تھے یعنی بیت المقدس۔ اس سلسلہ میں یہ خوب ملحوظ رہے کہ اسلام میں قبلہ خواہ بیت المقدس یا خانہ کعبہ، بہرحال ایک متعین و مخصوص مکان کا نام ہے، خواہ وہ کسی مقام سے کسی طرف پڑے، نہ کسی متعین سمت و جہت کا، جیسا کہ مشرکوں کے ہاں اور مسیحیوں کے ہاں ہے ۵۲۱ اور فرمانبرداروں کا امتیاز نافرمانوں سے کر لیں۔ لنعلم۔ علم کے معنی یہاں تمیز و شناخت کے ہیں۔ ای لیتمیز بہ الثابت علی دینہ من المرتد (بحر) علی اطلاق العلم علی معنی التمییز لان بالعلم یقع التمییز (بحر) الا لنمیز ھؤلاء من ھؤلاء ...... فسمی التمییز علما (کبیر) علم الہی کلی میں تو ہر واقعہ شروع ہی سے موجود ہے، لیکن کائنات میں جب تک کوئی واقعہ واقع نہ ہولے، اس پر واقعہ کا اطلاق ہی نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی یہ مضمون آیا ہے، مراد اس کے وقوع ظاہری عملی سے ہوتی ہے

۵۲۲ اور وہ اطاعت رسول کے ذوق سلیم سے بہرہ ور ہیں۔ بعض علماء نے یہیں سے یہ استنباط کیا ہے، کہ اہل قبلہ جتنے بھی ہیں، وہ جز ضروری تک راہ ہدایت پر ہیں۔ قبلہ پر قائم رہنا ایک بڑے سنگین امتحان سے گزرنا ہوا، اور اہل قبلہ کی عدم تکفیر کی ایک بنا یہ بن گیا ۵۲۳ اور اعمال ایمانی کو، بعض مسلمانوں کو یہود کے ورغلانے سے یا از خود یہ وہم ہو گیا تھا کہ جب اصل قبلہ خانہ کعبہ ہے اور بیت المقدس محض ایک عارضی قبلہ تھا، تو اس رخ پر جتنی نمازیں پڑھی گئیں وہ بیکار گئیں۔ اور جو مسلمان اس حکم جدید سے قبل وفات پاچکے، وہ تو سرتاسر گھاٹے میں رہے۔ جواب انہی کو مل رہا ہے، کہ یہ وہم کیسا۔ قبلہ کوئی سا بھی ہو، اجر تو تعمیل احکام کرنے والوں کا ہے۔ جنہوں نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، انہوں نے بھی بہرحال حکم ہی کی تعمیل کی تھی۔ اجر ان کا تمام و کمال ہے ۵۲۴ چنانچہ دوسرے احکام کی طرح یہ حکم تحویل قبلہ بھی تمام تر اس کی شفقت و مہربانی، رافت و رحمت ہی کا نتیجہ ہے۔

۵۲۵ (انتظارِ وحی میں اے پیغمبر!) رسول اللہ صلعم کو صحیح جذبۂ دینی کے ماتحت اس کا یقین تھا کہ اب جب کہ امامت بنی اسرائیل سے چھن چکی ہے، تو ان کا قبلہ بھی قبلۂ امت نہیں رہ سکتا۔ تحویلِ قبلہ کا حکم اب آکر رہے گا، اور فرشتۂ وحی کے انتظار میں آپ کی نظر بار بار آسمان کی طرف بھی اُٹھ جاتی تھی۔ یہاں اسی کیفیت کا بیان ہے۔ حق تعالیٰ اگرچہ ہرگز کسی جہت کا پابند، کسی مکان سے محدود نہیں، تاہم تجلیاتِ خاصّہ کو قرآن میں آسمان کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ اسی لئے محققین نے لکھا ہے کہ بوقتِ اضطرار دُعا آسمان کی طرف مُنہ کرنا موجباتِ قبول میں سے ہے۔ بلکہ اس نسبت علوی سے کمالِ یقین اور تصفیۂ قلب میں امداد ملتی ہے۔ قد نری گو صیغہ مضارع ہے، لیکن مراد ماضی ہے۔ لفظہ مستقبل والمراد بہ الماضی (کلیات) نری سے اشارہ یہ بھی ہوگیا کہ آپ حیران و مضطر کیوں ہوتے ہیں، ہم نے خوب دیکھ لیا ہے آپ کے تعلقِ خاطر کو، اور اس میں کمالِ تسکین ہے رسول اللہ صلعم کی۔ فی السماء میں فی الی کے معنی میں ہے۔ فی جھۃ السماء (کشاف) نحو السماء و قبلہا (ابن جریر) ۵۲۶ یعنی خانۂ خدا و قبلۂ ابراہیمی کی جانب۔ یہ وعدہ ہے تحویلِ قبلہ کا۔ یہاں بجائے براہِ راست یہ ارشاد فرمانے کے کہ ہم کعبہ کی طرف آپ کو پھیر دیں گے، ارشاد ہوا ہے کہ ہم اسے آپ کا قبلہ قرار دے دیں گے جسے آپ خود قبلہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے رسول اللہ صلعم کی کمالِ رفعتِ مراتب اور کمالِ درجۂ قبولیت ظاہر ہے۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اہلِ طریقت کی ہاں جو اصطلاح مقامِ مرادیت و محبوبیت کی آئی ہے، اس کی اصل یہی آیت ہے۔ کیا ٹھکانا ہے اس بلندیِ مرتبہ کا کہ مولیٰ خود طالبِ رضائے عبد ہو جائے! اس کے آگے کوئی مرتبہ تصور میں بھی نہیں آسکتا ہے۔ اقبال نے اسی مقام کی تشریح کی ہے ؎ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔ خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے! فلنولینک کے دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ہم آپ کو اس کا والی و حاکم اور اس پر متصرف بنا دیں گے۔ اے لنمکننک من استقبالھا (مدارک، روح) ابھی وعدہ ہوا تھا تحویلِ قبلہ کا، اب حکم صادر ہوگیا تحویلِ قبلہ کا۔

رَحِيمٌ ﴿١٤٣﴾ قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ

بڑا مہربان ہے ۵۲۴ بیشک ہم نے دیکھ لیا آپ کے مُنہ کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا ۵۲۵ سو ہم ضرور آپ کو متوجہ

قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَ

کر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں ۵۲۶ اچھا اب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف ۵۲۷ اور تم

حَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا

لوگ جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے کر لیا کرو اُسی کی طرف ۵۲۸ اور جن لوگوں کو کتاب مل چکی

الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ

ہے وہ یقیناً جانتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک ہے ان کے پروردگار کی طرف سے ۵۲۹ اور اللہ بےخبر نہیں ان کی

عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٤﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا

کارروائیوں سے ۵۳۰ اور اگر آپ ان لوگوں کے سامنے جنہیں کتاب مل چکی ہے، ساری ہی نشانیاں لے آئیں ۵۳۱

تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ

جب بھی یہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے ۵۳۲ اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں ۵۳۳ اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے

قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ

قبلہ کو ماننے والے ہیں ۵۳۴ اور اگر کہیں آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں ۵۳۵ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم

مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٥﴾ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ

آچکا ہے ۵۳۶ تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہو جائیں ۵۳۷ جن لوگوں کو ہم کتاب دے

الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ

چکے ہیں ۵۳۸ وہ آپ کو پہچانتے ہیں اس طرح جیسے کہ اپنی نسل والوں کو پہچانتے ہیں ۵۳۹ اور بیشک

وقف لازم

الوجہ لفظی معنی چہرہ کے ہیں۔ لیکن حکم میں کل جسم کے ہے۔ المراد من الوجہ ھھنا جملۃ بدن الانسان (کبیر) وقد یعبر عن کل الذات بالوجہ (کبیر) ۵۲۷ المسجد الحرام عزت و حرمت والی مسجد سے مراد مکہ معظمہ کی وہ مسجدِ اعظم ہے جس کے اندر خانۂ کعبہ واقع ہے۔ خانۂ کعبہ بہت ہی مختصر عمارت کا نام ہے۔ مدینہ والوں اور کہیں کے بھی لوگوں کو اس کی جہت کی تعیین بہت دشوار تھی۔ اس لئے امت کی سہولت کے لئے نام بنسبتاً ایک بہت بڑی عمارت کا لے دیا گیا (مدارک، بیضاوی) محققین کے نزدیک یہاں مسجد حرام سے مراد کعبہ ہی ہے۔ والمراد البیت نفسہ (جصاص) والمراد بہ البیت لانہ تعالیٰ خاطبنا بلغۃ العرب وھی تعبر عن الشیء بما یجاورہ او بما یشتمل علیہ (ابن عربی) وذکر المسجد الحرام دون الکعبۃ دلیل علیٰ ان الواجب مراعاۃ الجھۃ دون العین (مدارک) اور امام مالکؒ سے یہ قول منقول ہے کہ مسجد حرام قبلہ ساری دنیا کی ہے اور خانۂ کعبہ قبلہ ہے اس مسجد کا۔ مسجد حرام یا حرم شریف کی موجودہ عمارت کا نقشِ اول خلیفہ مہدی عباسی کے زمانہ کا ہے۔ بعد کے خلفاء و سلاطین برابر اس میں اضافہ کرتے رہے، خصوصاً ترک سلاطین۔ موجودہ ہیئت سلطان سلیم ثانی ترکی ۹۸۴ھ کے عہد سے تقریباً قائم ہے۔ صحن کی وسعت ... فٹ بیان کی گئی ہے۔ متعدد بڑے بڑے عالی شان اور فراخ دالان چاروں طرف اس کے علاوہ ہیں۔ داخلہ کے ۱۹ دروازے ہیں۔ منارے چھ ہیں۔ اور گنبد گمزیوں کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہے۔ ایک دوسرے بیان کے مطابق شمالی غربی وسعت ۵۴۰ فٹ ہے، جنوبی و شرقی ۵۳۵ فٹ، شمالی شرقی ۳۶۰ فٹ، اور جنوبی و غربی ۳۶۴ فٹ۔ شطر سے مراد ہے مسجد حرام کی سمت میں یا اس کے رُخ پر۔ نہ کہ عین اس کے مقابل کہ اس کی تعمیل دور دراز کے علاقوں میں ممکن ہی نہیں۔ شطرہ ای نحوہ وتلقاءہ قالہ ابن عباس وابو العالیۃ ومجاھد والربیع بن انس وجماعۃ۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ نماز میں جو استقبالِ قبلہ فرض ہے وہ سینہ کا ہے، چہرہ کا استقبال صرف مسنون ہے۔ نماز سے باہر ہونا صرف اُس وقت ممکن ہے جب چہرہ کے ساتھ سینہ بھی کعبہ کی طرف سے پھر جائے۔ صرف گردن پھر جانے سے نماز باطل نہیں ہو جاتی ۵۲۸ (حالتِ نماز میں) خطاب جائے مسلمانوں یا امتِ محمدی سے ہے۔ ابھی ابھی رسول اللہ صلعم کو حکم دیا تھا کہ اپنے پسندیدہ قبلہ کی طرف نماز پڑھا کیجئے، اب عام حکم صراحت کے ساتھ ساری امت کو مل رہا ہے۔ حیث ما کنتم سے فقہاء نے یہ نکالا ہے کہ نماز، انسان کہیں بھی ہو، درست ہے، کچھ مسجد ہی کی قید نہیں ۵۲۹ علماء اہلِ یہود کو اپنے ہاں کی روایتوں اور نوشتوں کی بنا پر یہ خوب علم تھا کہ پیغمبر آخر الزمان کا قبلہ وہی ہوگا جو ابراہیم خلیل اللہ کا تھا کہ وہی قبلۂ اصلی اور حقیقی ہے۔ بیت المقدس کا قبلہ ہونا عارضی تھا۔ انّہ میں ضمیر سے مراد یہی حکم تحویلِ قبلہ ہے۔ ای التحویل الی الکعبۃ (کشاف) والضمیر للتحویل او للتوجہ (بیضاوی) من ربھم کی قید نے اس حقیقت کو اور واضح کر دیا کہ استقبالِ کعبہ رسول اللہ کا امرِ اجتہادی نہیں، تمامتر حکمِ ربانی ہے ۵۳۰ (جو وہ اخفاءِ حق و صداقت کی کرتے رہتے ہیں) ۵۳۱ یعنی اپنی پیغمبری کے سارے ممکن دلائل و معجزات بھی۔ الذین اوتوا الکتب سے مراد یہود ہیں ۵۳۲ یہ حد سے ان کے ضد، عناد و تعصب کی۔ اس لئے آپ کا ان کے اعتراضات کی طرف اعتنا کرنا ہی بے کار ہے ۵۳۳ (اس لئے کہ اسرائیل کی امت کے خاتمہ پر آپ کو ایک مستقل، امتیازی، عالمگیر قبلہ عطا ہو چکا ہے، اور یہود و نصاریٰ کو آپ کی طرف سے اب ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا چاہیے) ۵۳۴ چنانچہ یہود کا قبلہ آج تک ہیکل بیت المقدس ہے، اور نصاریٰ کسی عمارت یا مکان کو نہیں، بلکہ سمتِ مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں اور عجب نہیں کہ اندرونی اختلافات اس سے بھی زائد ہوں۔ بحمد اللہ کہ ہمارے قدیم مفسرین بھی یہود و نصاریٰ کے قبلوں کے فرق سے صحیح طور پر واقف تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ فالیھود مستقبل بیت المقدس والنصاریٰ مطلع الشمس (مدارک) اور خیر نسفی تو بعد کے شخص ہیں، ابن جریر تو متقدمین میں ہیں، وہ تک اس سے باخبر تھے۔ وذلک ان الیھود تستقبل بیت المقدس بصلاتھا وان النصاریٰ تستقبل المشرق (ابن جریر) ۵۳۵ (تحویلِ قبلہ کے باب میں) حالانکہ عصمتِ نبوت خود ہی اس مفروضہ کے منافی ہے۔ اہلِ کتاب کی اتباع واسترضاء تو مطلقاً ممنوع ہے، لیکن قبلہ جیسے بنیادی دینی مسئلہ میں ان کی اتباع معصیت ہی نہیں، کفر ہے ۵۳۶ یعنی علم ثابت بالوحی قرآنی اصطلاح میں العلم سے مراد یہی علمِ حقیقی ہوتا ہے۔ دنیوی "علوم" کی کوئی صنف نہیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ آیت میں تہدید ہے اُن لوگوں کے لئے جو علمِ صحیح کے باوجود بجائے اس کے اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔ وفی ذلک تحذیر لمن یترک الدلیل بعد انارۃ ویتبع الھوی (مدارک) ۵۳۷ اللہ کے قانون میں رو رعایت کی گنجائش کسی کے لئے نہیں، یہاں تک کہ انبیاء کے لئے بھی نہیں۔ اور نفسِ فطرتِ بشری کے لحاظ سے گناہ ہو سکنے کی صلاحیت اُن میں بھی ویسی ہی ہوتی ہے، جیسی دوسرے انسانوں میں، یہ اور بات ہے کہ توفیقِ الٰہی ان کا تعلق ہر وقت اور ہر حال میں اپنے سے قائم رکھتی ہے، اور انہیں خطاء سے محفوظ اور معصیت سے معصوم بنائے رکھتی ہے۔ امام رازی نے آیت سے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ عالم کے حق میں وعید شدیدتر ہے غیر عالم کے مقابلہ میں۔ ودلت الآیۃ علیٰ انہ توجہ الوعید علی العلماء اشد من توجہ علیٰ غیرھم (کبیر) ۵۳۸ عموم لفظ کے تحت میں مسیحی بھی داخل ہیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ مراد یہود ہیں۔ توریت و صحفِ قدیم کو یہی بھی مانتے ہیں۔ علماء بلاغت نے اشارہ کیا ہے کہ اس موقع پر صیغہ معروف اٰتینٰھم الکتٰب ضمیر متکلم کی تصریح کے ساتھ صیغہ مجہول اوتوا الکتب سے کہیں زیادہ وسیع و بلیغ ہے ۵۳۹ یعنی خوب اچھی طرح بغیر کسی اشتباہ والتباس کے۔ مطلب یوں ہوا کہ پچھلے نوشتوں میں ایک نبی آخر الزمان کی آمد کی بابت پیش گوئیاں اس صراحت سے مذکور ہیں کہ یہود کو آپ کی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی۔ وہ جس طرح اسرائیلی انبیاء کو پہچان لیتے تھے، ٹھیک اُسی طرح آپ کو بھی پہچان سکتے ہیں۔ ابناءھم کے لفظی معنی اپنے لڑکوں کے ہیں، لیکن ضمیر ھم سے مراد افراد و اشخاص نہیں، بلکہ قوم یہود و نسلِ اسرائیل مجموعاً ہے۔ یعنی ابناءِ اسرائیل۔ ابناء کا لفظ عربی میں اولاد سے زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے۔ اور ہمیشہ صلبی بیٹوں ہی کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ جن جن پر فرزندی کا اطلاق مجازاً ہو سکتا ہے اُن سب پر حاوی ہے۔ یعرفونہ میں ضمیر ہ سے کیا مراد ہے؟ قدماء مفسرین اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد بیت الحرام کو بحیثیت قبلۃ الانبیاء کے پہچاننا ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن جریر میں ابن عباسؓ صحابی سے لیکر قتادہ، ابن زید، سدی، ابن جریج تابعین کے اقوال اسی معنی میں

منقول ہیں۔ لیکن متوسطین اور متاخرین میں تقریباً سب کا اس پر اتفاق ہوگیا ہے کہ مراد ذاتِ رسالت ہے ہے۔ اور دلائل اسی کے زیادہ موئد ہیں۔ اور سند اس کی بھی تابعین سے مل جاتی ہے۔ یعنی یعرفون محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم (معالم) لعیرفون رسول اللہ صلعم (کشاف) ذکر وافیہ وجوھا احدھا انہ عائد الی رسول اللہ صلعم ...... والقول الثانی ...... واعلم ان القول الاول اظھر (کبیر) والضمیر لرسول اللہ صلعم وان لم یسبق ذکرہ یدل علیہ الکلام علیہ (بیضاوی) والضمیر عائد علی النبی صلعم قال مجاھد وقتادۃ وغیرھما (بحر) ہٗ ظاہر ہے کہ ضمیر غائب ہے۔ لیکن اُردو میں نہایت تعظیم کے موقع پر غائب "وہ" کے بجائے حاضر "آپ" لاتے ہیں۔ ٥٤٠ یہود اور دوسرے منکرین کا یہ اخفائے حق دانستہ اور بارادہ ہے۔ کسی معذوری، دانستہ غلط فہمی یا دلائل میں خفا کا نتیجہ نہیں۔ اَلْحَقَّ۔ حق سے مراد یہاں رسول اللہ صلعم کا وہ مفصل و مکمل تعارف ہے۔ جو توریت اور دوسرے الہامی نوشتوں میں موجود ہے۔ مانی کتبھم من صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ابن کثیر) لے یکتمون محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم (ابن جریر۔ عن مجاہد) والحق المکتوم ھنا ھو رسول اللہ صلعم قال قتادۃ ومجاھد (بحر) دوسرے معنی اَمرِ تحویلِ قبلہ کے بھی لئے گئے ہیں۔ قیل امر القبلۃ (کبیر) وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ اس ٹکڑے سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ یہ انکار کرنے والے عوام وجہلاء یہود نہیں، اُن کے علماء واکابر تھے۔ ٥٤١ (اے مخاطب) آیت کا یہ جزو تاکیدِ کلام کے لئے ہے۔ یعنی یہاں جو کچھ بھی بیان ہو رہا ہے، خواہ رسول اللہ صلعم کی رسالت سے متعلق ہو یا امر تحویلِ قبلہ سے متعلق۔ بہرحال وہ بہر صورت یہ اللہ ہی کا کلام ہے، اور ہرگز بے اتفاقی یا کم اتفاقی کے قابل نہیں۔ ٥٤٢ ع ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے! یعنی ہر قوم

فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤٦﴾

ان میں کے کچھ لوگ خوب چھپاتے ہیں حق کو، حالانکہ جانتے ہوتے ہیں ٥٤١ یہ امر

الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١٤٧﴾

حق ہے تیرے پروردگار کی طرف سے پس تو کہیں شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہو جانا ٥٤٢

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ

اور ہر ایک کے لئے کوئی رخ ہوتا ہے جدھر وہ متوجہ رہتا ہے ٥٤٣ سو تم نیکیوں کی طرف بڑھو ٥٤٤

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ

تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تم سب کو پالے گا ٥٤٥ بے شک اللہ

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٤٨﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

ہر چیز پر قادر ہے ٥٤٦ اور آپ جس جگہ سے بھی (باہر) نکلیں اپنا

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ

منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں ٥٤٧ اور یہ آپ کے

لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾

پروردگار کی طرف سے امرِ حق ہے ٥٤٨ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو ٥٤٩

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ

اور آپ جس جگہ سے بھی (باہر) نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا

الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ

کریں ٥٤٩ اور تم لوگ (بھی) جہاں کہیں ہو، اپنا منہ اس کی طرف موڑ لیا کرو ٥٥٠

منزل ۱

ہر اُمّت نماز و عبادت کیلئے ایک مرکزی رُخ مقرر رکھتی ہے، سو اُمّتِ اسلامیہ کے لئے بھی ایک متعین قبلہ ناگزیر ہے۔ لِكُلٍّ "ہر ایک" سے مراد ہر قوم یا ہر اُمّت ہے اور حذفِ مضاف کی طرح حذفِ مضاف الیہ کی مثالیں عربی میں عام ہیں۔ ولم یقل لکل قوم او امۃ لانہ معروف المعنی عندھم (کبیر) یعنی بذلک اھل الادیان (ابن کثیر) لکل طائفۃ من اھل الادیان (بحر) مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ بعض صوفیہ عارفین نے آیت کو حدیث نبوی کل میسر لما خلق لہ (ہر ایک کے لئے وہی آسان ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے) سے مؤید کر کے اس کی شرح میں کہا ہے کہ تکوینی و تشریعی دونوں حیثیتوں سے اللہ نے افراد کے حالات مختلف رکھے ہیں اور متعدد طبقے ان کے پیدا کر دیئے ہیں۔ کوئی کاشتکاری میں لگا ہے، کوئی تجارت میں لا کوئی صنعت وحرفت میں۔ اسی طرح دینی حیثیت سے بھی کوئی احادیثِ نبوی جمع کر رہا ہے، کوئی حفظِ قرآن کر رہا ہے، کوئی مسائلِ فقہ کا استنباط کر رہا ہے، کوئی قرآن کی تفسیر و ترجمانی میں لگا ہوا ہے۔ یہ سب مختلف طریقے راستے ہیں اللہ کی طرف کے۔ اللہ ان سارے طریقوں کو اپنے بندوں کے ذریعہ سے آباد رکھنا چاہتا ہے تو جو شخص جس طریق پر بھی اللہ کی رضا کے قصد سے چلے گا، اللہ اُس کے لئے قبول و وصول آسان کر دے گا۔ هُوَ اخفش نحوی اور زجاج لغوی کا قول نقل ہوا ہے کہ یہ ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی رُخوں کا پھیرنے والا ہے۔ قیل ھو عائد علی اللہ تعالیٰ قال الاخفش والزجاج (بحر) ٥٤٣ (اے مسلمانو!) خطاب اُمّتِ اسلامیہ کو ہے کہ حُسنِ عمل کی طرف بڑھو اور جملہ مذاہب و ادیان کے اتحادِ قبلہ کے خیالِ خام میں نہ پڑے رہو۔ خیرات۔ خیر کی جمع وسیع و عام مفہوم میں ہے۔ رضاء الٰہی کیلئے موافقِ شرع جملہ امور کو شامل۔ وصول الی اللہ کے بے شمار راستوں پر حاوی۔ فَاسْتَبِقُوا۔ عارفین نے کہا ہے کہ ہر وقت جو چیز اُس وقت کے لحاظ سے خیر و مصلحت ہو، اُس کی طرف بڑھنا ہی استباقِ خیر ہے ٥٤٤ (اور تمہاری نمازوں میں وحدت پیدا کر دے گا) ساری اُمّت کا قبلہ ایک خاص مکان کو مقرر کر دینے سے ایک خیال یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ تو ایک صورت انتشار کی سی پیدا ہو گئی، کوئی شمال کی طرف رُخ کرے گا، کوئی جنوب کی طرف۔ وقس علی ہذا۔ شبہ کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہے۔ شبہ محض سطحی ہے۔ مقصود تو نماز اور نمازوں میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ تم شمال، جنوب، مشرق، مغرب، دنیا کے کسی خطہ کسی علاقہ میں بھی متفرق و منتشر ہو۔ عالم الغیب والشہادۃ کو تو بہرحال علم ہے کہ تم رُخ ایک ہی طرف کئے ہوئے ہو۔ وہ کعبہ کی طرف بڑھی ہوئی ساری نمازوں کو ایک حکم میں رکھے گا۔ یجعل اللہ تعالیٰ صلاتکم مع اختلاف جھاتھا فی حکم صلاۃ متحدۃ الجھت (روح) اے یجمعکم ویجعل صلاتکم کلھا الی جھۃ واحدۃ قالہ الزمخشری (بحر) دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ اشارہ یہاں موت و قیامت کی طرف ہے یعنی تم دفن جہاں کہیں بھی ہو گے۔ اللہ تعالیٰ سب کو حشر میں یکجا کر دے گا۔ ٥٤٥ (اور اُس کے احاطۂ قدرت سے کوئی چیز بھی خارج نہیں) یہ ایک اصولی جواب بہت سے شبہات کا ہے۔ اللہ کے بتائے ہوئے مسائل میں انسان کو جہاں کہیں بھی استبعادِ عقلی معلوم ہوتا ہے اُس کی بنیاد ہمیشہ اسی مغالطہ پر ہوتی ہے کہ اپنے اوپر قیاس کر کے اللہ کے قویٰ کو بھی محدود، اور اُس کی قدرت کو بھی زمان، مکان وغیرہ کی قیود کا پابند سمجھ لیا جائے۔ قرآن مجید نے اس بشری ذہنیت (سائیکالوجی) کو پوری طرح سمجھ کر بار بار اسی حقیقت کی طرف تنبیہ کی ہے کہ خدائی فعلیت پر حکم لگاتے وقت خدائی قدرت کی بھی وسعتِ بے پایاں کو تو یاد رکھا کرو۔ ٥٤٦ مطلب یہ کہ یہ حکمِ استقبالِ کعبہ، سفر و حضر سب کے لئے ہے۔ محض قیام مدینہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یعنی ھذا استوی العالمین اقامۃ وسفرًا فی انہ مأمور باستقبال البیت الحرام (بحر) ٥٤٧ یعنی امرِ ثابت شدہ جس میں اب کسی نسخ و تبدیلی کا امکان نہیں۔ لَلْحَقُّ لے ثابت الذی لا یعرض لہ نسخ ولا تبدیل (بحر) إِنَّهُ میں ضمیر حکمِ استقبالِ کعبہ کی طرف ہے۔ ٥٤٨ ایک جزئی حکم کے بعد کلی تنبیہ اسلوبِ قرآنی کے خصائص میں سے ہے۔ اور صیغۂ واحد سے صیغۂ جمع کی طرف منتقل ہو جانا عربی اسلوبِ بلاغت میں عام ہے۔ ٥٤٩ الفاظ کی تکرار غالباً تاکیدِ معنی کے لئے ہے۔ اور یہ اہلِ عرب کا عام دستور ہے۔ کرر ذلک تاکیدًا (کبیر) ھو الاکثر المعھود فی لسان العرب وھوان تعاد الجملۃ مرۃ واحدۃ (بحر) بعض نے لکھا ہے کہ پہلا حکم تعمیمِ حال کیلئے ہے۔ یعنی سفر و حضر میں جس حال میں بھی ہوں، توجہ کعبہ کی طرف کر لی جائے۔ اور دوسرا حکم تعمیمِ مکان کیلئے ہے۔ یعنی دور و نزدیک، حاضر و غائب، جہاں کہیں بھی ہوں، توجہ کعبہ کی طرف کر لی جائے۔ مفسرین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق دوسری حکمتیں بھی اس تکرارِ حکم کی لکھی ہیں۔ ٥٥٠ (اے مسلمانو!) یعنی یہ حکم رسولؐ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ساری اُمّت پر اس کی تعمیل فرض ہے۔ یہاں تک یہ حکمِ استقبالِ کعبہ کل ملا کر چھ بار آچکا ہے۔ اہلِ لطائف و اسرار نے لکھا ہے کہ ہر بار کے حکم سے ایک ایک خاص اشارہ مقصود ہے۔ مثلاً (۱) پہلی بار سے مطلق حکم وجوب (۲) دوسری بار سے تعمیمِ احوال۔ یعنی سفر ہو یا حضر (۳) تیسری بار سے تعمیمِ مکان۔ یعنی نزدیک ہو یا دور، حاضر ہو یا غائب (۴) چوتھی بار سے تعلیم ادب یعنی قبلہ رُو رہنے کا استحباب (۵) پانچویں بار سے توجہِ قلبی۔ یعنی دل اُسی طرف لگا رہے جدھر پروردگار کی خاص توجہ ہے (۶) چھٹی بار سے تاکید۔ یعنی دفعِ احتمالِ نسخ۔

۵۵۱ مثلاً اہل کتاب کو اس اعتراض کی گنجائش کہ ہمارے نوشتوں کے بموجب تو آخری نبی کا قبلہ، قبلہ ابراہیمی ہونا تھا۔ یا مشرکین عرب کو اس اعتراض کا موقع کہ یہ نبی دین ابراہیمی کے مدعی ہو کر قبلہ ابراہیمی کیوں ترک کئے ہوئے ہیں۔ للناس میں الناس سے مراد جملہ مخالفین و معترضین ہیں۔ ۵۵۲ یعنی رہ گئے وہ کج فطرت معاندین جو اس کے بعد بھی اعتراضات پر اڑے رہیں گے سو ان کی کچھ پروا ہی نہ کرو۔ الا للمعاندین منھم (کشاف) لاحجۃ لاحد علیکم الا الحجۃ الداحضۃ للذین من الیھود وغیرھم (بحر) الا کو یہاں ابوعبیدہ و لغوی نے واؤ کے مرادف قرار دیا ہے۔ لیکن فراء اور دوسرے اہل لغت نے اس سے انکار کیا ہے (جصاص) ۵۵۳ (اور نہ ان کی کو اس کی کچھ پروا کرو) فلا تخافوا مطاعنھم فی قبلتکم (بحر) ۵۵۴ کہ میری ہی نافرمانی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ۵۵۵ اتمام نعمت کے مفہوم اور بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس سیاق میں کھلی ہوئی مراد تعیین قبلہ سے ہے۔ بعد ایتی ایاکم الی قبلۃ ابراھیم (معالم) واتمام النعمۃ بما ھدیتم الیہ من القبلۃ (بحر) لاتمّ کا عطف لئلا یکون پر ہے (جلالین)۔ خانہ کعبہ کا محل نزول رحمت، مرکز تجلیات ہونا مسلّم۔ ساتھ ہی نماز کا افضل عبادات ہونا مسلّم ہے۔ ان دونوں حقیقتوں کے استحضار کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے کہ خانہ کعبہ کی تعیین قبلہ سے بڑھ کر عنایت اور تکمیل نعمت اور کیا ہوگی ۵۵۶ اور اپنے درجات ہدایت میں مزید ترقی کرتے رہو۔ شریعت اسلامی دنیا کا اکمل ترین ممکن نظام ہے۔ اور اس مکمل ترین ممکن نظام کا ایک اہم جزو تعیین قبلہ و استقبال کعبہ بھی ہے۔ لعلکم میں لعل کے کا مرادف ہے۔ شک کے معنی نہیں تاکہ کے معنی میں ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جو لوگ پہلے ہی سے ہدایت پر ہیں، ان کو ہدایت یابی سے سرفراز کرنا دلیل اس امر کی ہے کہ مدارج قرب میں ترقی کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے ۵۵۷ کما کا تعلق آیت ماقبل سے ہے۔ یعنی یہ اتمام نعمت اب استقبال کعبہ کے واسطے سے اسی طرح ہوگا، جیسے بعثت رسول کے ذریعہ سے اس کے قبل ہو چکا ہے۔ کما ارسلنا متعلق بالتمامۃ اتماماً کاتمامھا بارسال الرسول (جلالین) ۵۵۸ (ہر طرح کے فسق و عصیان اور اخلاقی آلودگیوں سے) رسول کی حیثیت محض پیام رساں اور مبلغ کی نہیں ہوتی، مزکی (پاک کرنے والے) کی بھی ہوتی ہے۔ رسول کی گوناگوں حیثیتوں پر حاشیے آیت ۱۲۹ کے ذیل میں گزر چکے ہیں ۵۵۹ رسول کی حیثیت معلم اور شارح کی بھی ہوتی ہے۔ یُعَلِّمُكُمْ۔ لفظ تعلیم سے اشارہ ادھر بھی ہو گیا کہ پیمبر کے ارشادات محض لفظ و عبارت تک محدود نہیں رہتے۔ وہ حکمت و دانائی کے سبق، روحانیت کے اصول و مسائل کی تعلیم بھی دیتا رہتا ہے۔ یعنی انہیں اپنے سامعین کے رگ و ریشہ میں اتارتا رہتا ہے ۵۶۰ وحی الٰہی کو عقل بشری سے وہی نسبت ہے جو خدا کو بندہ سے ہے اور رسول چونکہ وحی سے مؤید رہتا ہے اس لئے قدرۃً اس کی باریک بین و دوررس اور دقیقہ سنج نگاہ ان دقیق حقائق تک پہنچ جاتی ہے، جو بڑے بڑے عقلاء و مفکرین سے بھی مخفی رہتے ہیں۔ اور رسول کی رسائی عالم حقیقت کی ان گہرائیوں تک ہو جاتی ہے، جو علم و عقل، کشف و اشراق سب کے ماوراء ہیں۔ یکون ارسالہ صلی اللہ علیہ وسلم نعمۃ عظیمۃ ولولاہ لبقی الخلق متحیرین فی امر دینھم لاھین عن ما ذا یصنعون (روح) مالا سبیل الی معرفتہ الا بالوحی (مدارک) ۵۶۱ (طاعت و عبادت کے ذریعہ سے) بندہ کا اپنے مالک کو یاد کرنا یہی ہے کہ اس کی بتلائی ہوئی راہ پر رغبت اور شوق سے چلتا رہے۔ اور یہ یاد الٰہی کسی خاص وقت کے ساتھ محدود و مقید نہیں۔ لکھتے پڑھتے، بولتے چالتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، سب میں رضاء الٰہی کو مقدم رکھنا یہی بندہ کی طرف سے یاد الٰہی ہے۔ فاذکرونی۔ ابوبکر جصاص رازیؒ نے ذکر سے مراد لی ہے آیات الٰہی اور ان کی عظمت و قدرت کا تفکر۔ وذکرنا بالفکر فی دلائلہ وآیاتہ وقدرتہ وعظمتہ (احکام القرآن) اور اسی کو سارے اذکار سے افضل اور ان کی اصل قرار دیا ہے۔ وھو افضل الذکر وسائر وجوہ الذکر مبنیۃ علیہ وتابعۃ لہ (احکام القرآن) ۵۶۲ اپنے لطف و عنایت خاص سے اللہ کا اپنے بندوں کو یاد کرنا یہی ہے، کہ ان پر دنیا و آخرت دونوں میں اپنے خصوصی فضل و کرم کی بارش کرتا رہے۔ فاذکرونی اور اذکرکم میں ضمیر متکلم کو صیغۂ واحد میں لا کر علامت تخصیص کی ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ بندہ ادھر سے یاد میں لگا ہے تو ادھر سے بھی سرافرازی ہوتی رہے گی اور یہی اصل ثمرہ اور انعام ہے بندہ کے ذکر الٰہی کا۔ سو اگر ذہن کے سامنے ان کا استحضار رہے تو بندۂ ذاکر و شاغل کو کبھی تشویش ہو اور نہ بے حاصلی کی شکایت پیدا ہو ۵۶۳ واشکروا لی۔ توحید، ایمان و اسلام کے حقوق ادا کرتے رہنا یہی اللہ کی شکرگزاری کرتے رہنا ہے۔ اور شکر کی بہترین تعریف یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ ہی کے کاموں میں لگایا جائے۔ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ کفر و شرک، الحاد و ارتیاب، فسق و بدعت میں لگے رہنا یہی اللہ کی ناشکری اور اس کی نعمتوں سے کفران کرنا ہے۔ اور ناشکری کا اصل مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے قویٰ کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کیا جائے ۵۶۴ یعنی ہجوم مشکلات کے وقت بھی مشکل کشائے حقیقی سے تعلق برابر جوڑے رہو۔ اس پر بھروسہ رکھو، اس کے آگے جھکتے رہو، گرتے رہو —— روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی بڑی اور پرقوت ہستی سے تعلق قائم ہو جانے سے دل کو کتنی تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ خطرہ کے وقت پولیس کے پہنچ جانے سے، کسی بڑے حاکم کے آ جانے سے دل کو کیسی ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ شدید بیماری کے وقت کسی نامور طبیب کے آ جانے سے ٹوٹی ہوئی آس کیسی جڑ جاتی ہے۔ پھر جب دل کا ربط ہمہ بیں و ہمہ داں ناصر حقیقی و محافظ حقیقی سے قائم ہو جائے، تو انسان بے بنیاں کی تسکین خاطر و تقویت قلب کا کیا پوچھنا! دنیا میں رہ کر، زندگی کی کشمکش میں پڑ کر، مشکلات و مصائب کا پیش آتے رہنا ناگزیر ہے۔ افراد کو بھی، اور امت و جماعت کو بھی۔ اور وہ دستور العمل ناقص ہے جو مشکلات کے دفاع اور مصائب کے مقابلہ کا طریقہ نہ بتائے۔ قرآن مجید نے بجائے غیر ضروری اور لامتناہی تفصیلات میں جانے کے یہاں اشارہ اصل اصول کی طرف کر دیا۔ بالصبر۔ صبر کے لغوی معنی تنگی و ناخوشگواری کی حالت میں اپنے کو روکے رہنے کے ہیں۔ الصبر الامساک فی ضیق (راغب) اور اصطلاح شریعت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے، اور قدم دائرۂ شریعت سے باہر نہ نکالا جائے۔ الصبر حبس النفس علی ما یقتضیہ العقل والشرع (راغب) صبر کے یہ معنی نہیں کہ جو امور طبعی اور بشری ہیں، ان کے آثار کو بھی اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا جائے۔ بھوک کے وقت مضمحل اور نڈھال ہو جانا، درد کی تکلیف سے کراہنا، رنج کے وقت آہ سرد بھرنا، عزیزوں قریبوں کی موت پر آنسوؤں سے رونا، ان میں سے کوئی شے بھی صبر کے منافی اور بے صبری میں داخل نہیں۔ قرآنی فرمان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہجوم مشکلات کے وقت گھبرا نہ جاؤ، ثابت قدم رہو۔ دل قابو میں رکھو، خود دل کے بس میں نہ آ جاؤ۔ الصبر والصلوٰۃ۔ صبر ایک سلبی کیفیت اور صلوٰۃ ایک ایجابی عمل ہے۔ ان دو کلیدی لفظوں سے اشارہ ادھر ہو گیا کہ انفرادی اصلاح اور اجتماعی فلاح دونوں کا راز صرف ان دو چیزوں میں ہے۔ ایک معاصی سے حفظ و احتیاط، دوسرے اوامر کا اتباع ۵۶۵ اللہ کی معیت عام تو کافر و مومن، فاسق و صالح، اپنے ہر بندہ کے ساتھ ہے۔ وھو معکم این ما کنتم۔ یہاں معیت علم مراد نہیں، بلکہ معیت خصوصی مراد ہے جس کے آثار حفاظت، اعانت و توجہ خاص ہیں۔ یہ اسی معیت الٰہی کا احساس و استحضار تھا، جس نے رسول کریم کے صحابہ کو بے پناہ قوت، جرأت، بے خوفی کا مالک بنا دیا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اس کے مراقبہ سے بڑھ کر روح کے لئے کوئی لذیذ غذا ہے اور نہ جراحت قلب کے لئے کوئی مرہم تسکین۔ یہی ایک نعمت ہے اہل ایمان کے لئے جو ہر ناگوار کو خوشگوار، ہر تلخ کو شیریں، ہر زہر کو قند بنا دینے کو کافی ہے۔ دور حاضر کے مغربی مفکرین اور محققین نے بھی اس تعلق باللہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور تسلیم کیا ہے کہ قلب کی اداسی، غمگینی، افسردگی کے وقت تعلق باللہ سے بڑھ کر مونس، رفیق و دمساز کوئی نہیں ملاحظہ ہو Psychology of Religions مصنفہ James کی Varieties of Religious Experiences کے مختلف مقامات۔ صبر، اپنے وسیع مفہوم میں ایک جامع لفظ ہے۔ صلوٰۃ اسی کی ایک ممتاز صورت ہے۔ معیت الٰہی کی یہ نعمت جب صابرین کو ملے گی، تو نمازیوں کو بدرجۂ اولیٰ ملے گی۔ اور اسی لئے اس کی صراحت کی ضرورت نہ رہی۔ ولم یقل مع المصلین لانہ اذا کان مع الصابرین کان مع المصلین من باب اولی لاشتمال الصلوٰۃ علی الصبر (روح) ۵۶۶ (عالم برزخ میں ایک خاص حیات کے ساتھ، اور عام انسانوں کی طرح مُردہ نہیں) فی سبیل اللہ۔ یعنی دین حق کی راہ میں، مذہب صحیح کی خاطر۔ فی طاعتہ واعلاء کلمتہ (روح) غزوۂ بدر میں جب کچھ صحابی شہید ہو گئے تو

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں حجت نہ رہ جائے ۵۵۱ سوا ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم

مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِىْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِىْ

ہیں ۵۵۲ سو تم ان سے نہ ڈرو ۵۵۳ بلکہ صرف مجھ سے ڈرو ۵۵۴ تاکہ میں اپنا انعام تم پر

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵۰ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا

پورا کروں ۵۵۵ اور تاکہ تم راہ پر قائم رہو ۵۵۶ (اسی طرح) جیسے ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول

مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ

تم ہی میں سے بھیجا ۵۵۷ جو تمہارے رو برو ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے ۵۵۸ اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم

وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۵۱

دیتا ہے ۵۵۹ اور تمہیں اس کی تعلیم دیتا ہے ۵۶۰ جو تم نہیں جانتے تھے ۵۶۱ سو تم

فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝۱۵۲

مجھے یاد کرتے رہو ۵۶۱ میں بھی تمہیں یاد کرتا رہوں گا ۵۶۲ اور میری شکرگزاری کرتے رہو اور میری ناشکری نہ کرو ۵۶۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۗ

اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو ۵۶۴

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ

بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۵۶۵ اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں،

يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ

انہیں مُردہ نہ کہو (نہیں) بلکہ وہ زندہ ہیں ۵۶۶

معانقہ ۲ ع ۵ ۱۸

منزل ۱

نا فہم کا فروں نے کہنا شروع کیا کہ انھوں نے خواہ مخواہ اپنی زندگی گنوادی، اور زندگی کے لطف سے محروم ہوگئے۔ انھیں جواب مل رہا ہے کہ تم جس معنی میں انھیں مُردہ سمجھ رہے ہو، اُس میں وہ سرے سے مُردہ ہی نہیں، بلکہ زندوں سے کہیں بڑھ کر بہرہ لذت یاب ہو رہے ہیں۔ اصطلاح میں ایسے مقتول کو شہید کہتے ہیں۔ برزخی زندگی اپنی عام صورت میں تو سب ہی کے لئے ہے، لیکن شہیدوں کو اُس عالم میں ایک خصوصی اور امتیازی زندگی نصیب ہوگی، آثار حیات میں دوسروں سے کہیں زیادہ قوی۔ بقول مفسر تھانویؒ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر اُس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچتا ہے کہ اس کا جسد باوجود گوشت پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور مثل جسد زندہ کے صحیح و سالم رہتا ہے۔ جیسا کہ احادیث و مشاہدات شاہد ہیں۔ اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء شہیدوں سے بھی زیادہ قوت و امتیاز رکھتے ہیں۔ تخصیص الشہداء لاختصاصھم بالقرب من اللہ تعالیٰ ومزید البھجۃ والکرامۃ (بیضاوی) ایک گروہ نے کہا ہے کہ حیات صرف روحانی ہوتی ہے۔ لیکن ترجیح اسی قول کو ہے کہ جسمانی و روحانی دونوں ہوتی ہے۔ ذھب کثیر من اھل السلف الی انھا حقیقیۃ بالروح والجسد وذھب البعض الی انھا روحانیۃ والمشھور ترجیح القول الاول (روح) آیت سے یہ قاعدہ دلالۃ النص یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جان و مال کو صرف کرنے والے اور انہیں ہوائے نفس میں لٹانے والے یکساں نہیں ہوتے۔ حیات شہداء کے معتقد یہود کے بھی بعض فرقے ہوئے ہیں۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۴ ص ۵۶۶) ابن العربی المالکیؒ نے کہا ہے کہ اسی آیت سے تمسک کر کے بعض ائمہ نے شہید کے لئے غسل و نماز جنازہ دونوں غیر ضروری بتائے ہیں، کہ اُن کی تطہیر تو شہادت سے ہو چکی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ نے نماز جنازہ کو ضروری برقرار رکھا ہے (احکام القرآن) **۵۶۷** اس لئے کہ برزخ حواس ناسوتی سے مدرک نہیں ہوتا اور انسان اُسی حیات عالی و لطیف کا ادراک اپنے حواس ظاہری کے ذریعہ سے نہیں کر سکتے۔ اماھی امر لا یدرک بالعقل بل بالوحی (بیضاوی) لانھا من احوال البرزخ التی لا یطلع علیھا ولا طریق للعلم بھا الا بالوحی (روح) لان حیاتھا الشھید لا نعلم حسًّا و درکًا۔ ابن کثیرؒ نے ایک حدیث نبوی نقل کر کے اور اس سے استنباط کر کے لکھ دیا ہے کہ ایسی حیات عام مومنین کو بھی حاصل رہی ہے، البتہ شہداء کا ذکر خاص طور پر اُن کی عظمت و اکرام کے لئے قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے۔ ففیہ دلالۃ لعموم المومنین ایضًا وان کان الشھداء قد خصصوا بالذکر فی القرآن تشریفًا لھم وتکریمًا وتعظیمًا

۵۶۸ (بہ تقاضائے حکمت) خطاب مومنین صادقین سے چلا آرہا ہے۔ انھیں بتایا ہے کہ مصیبتیں اور بلائیں اُن پر بھی یقینًا آئیں گی، لیکن بطور سزا و عذاب نہیں، بلکہ ابتلاء و امتحان کے رنگ میں۔ اور اس ارشاد سے ان کی تسلی و تسکین کا بہترین سامان بہم پہنچا دیا۔ آزمائش خداوندی سے مقصود نتائج کو دنیا پر ظاہر کر دینا ہوتا ہے۔ ورنہ حق تعالیٰ کو تو یہ علم ظاہر ہے کہ ہمیشہ سے حاصل ہے۔ بشیء سے یہ بتا دیا کہ امتحان بہت سخت نہیں ہوگا۔ ہر بلا کے جزو قلیل ہی سے متعلق ہوگا۔ کُل سے متعلق نہیں۔ الخوف۔ خوف کا لفظ جامع ہے۔ جان، مال، عزت ہر چیز سے متعلق اندیشہ ہر اس اس کے اندر آگیا۔ الجوع۔ بھوک کا امتحان یہ ہے کہ کسی حاجت کے باوجود ہر مال حرام سے بچے، اور نہ روزہ سے ہچکچائے۔ نہ فقر و فاقہ سے ڈرے۔ اموال۔ رشوت، سود، خیانت، بیع فاسد، ہر غیر شرعی معاملت سے دستبردار ہو جائے، اور جو مالی نقصانات تکوینی طور پر واقع ہوں۔ چوری ہو جائے، آگ لگ جائے۔ ان سب پر صبر سے کام لے۔ الانفس۔ موت، بیماری، جہاد کے حادثوں میں صبر سے کام لے۔ الثمرٰت۔ اولاد سے بھی مراد ہو سکتی ہے اور تجارت، زراعت، وغیرہ کے منافع بھی۔ ہر قسم کی نیک نامی، ناموری کے موقع بھی اس میں شامل ہیں۔ محققین نے کہا ہے کہ بندہ کا ہر امتحان شرک و توحید کے درمیان فارق ہوتا ہے۔ عوام کا امتحان شرک جلی سے متعلق ہوتا ہے اور خواص کا شرک خفی سے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت نص ہے اس باب میں کہ مجاہدہ اضطراری بھی نافع ہوتا ہے۔ **۵۶۹** صبر کرنے والوں کو یعنی اُن بندوں کو جو حالت غم میں بھی حدود شریعت سے قدم باہر نہیں نکالتے۔ صبر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہو جائے، اور غم کو غم محسوس ہی نہ کرے۔ اس کا نام صبر نہیں، بے حسی ہے۔ صبر یہ ہے کہ انتہائی غمناک و درد انگیز واقعہ پر بندہ عقل کو نفس پر غالب رکھے، زبان کو شکوہ و ناشکری سے نا آلودہ ہونے دے اور نظر مسبب الاسباب پر، اُس کی مصلحت و حکمت پر، اُس کی شفقت و رحمت پر رکھے ؎

غم بھی ہے قانون فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں!
یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے، دشمن نہیں!
(اکبرؔ)

۵۷۰ (حضور قلب کے ساتھ) تحصیل صبر میں عقیدۂ قلب، تلفظ زبانی پر مقدم ہے۔ مصیبۃ کے لغوی معنی اتنے کے ہیں۔ اور حدیث میں اس کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کل شیء ساء المومن فھو مصیبۃ (جو شے بھی مسلمان کو ناگوار گزرے، بس وہی اس کے حق میں مصیبت ہے) گویا اس کا اطلاق نہایت وسیع اور عام ہے۔ اور اس کے تحت میں چھوٹا بڑا ہر ناخوشگوار واقعہ تکوینی آگیا۔ بیماری ہو، مالی نقصان ہو، دوستوں عزیزوں کی مفارقت کا صدمہ ہو، موت کا غم ہو، لاولدی ہو، توہین اور بے عزتی ہو۔ وقس علیٰ ہذا۔ المصیبۃ کل ما اذی المومن فی نفس او مال او اھل صغرت او کبرت (بحر)۔ زبان سے اس آیت کی تلاوت کا دستور بحمد اللہ اب بھی اکثر مسلمان گھروں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن تحصیل صبر کے لئے محض زبانی اعادہ ہرگز کافی نہیں۔ قلب کے سامنے بھی استحضار پوری طرح ہونا چاہئے۔ الاسترجاع تسلیم واذعان (مدارک) ولیس الصبر بالاسترجاع باللسان بل بہ وبالقلب (بیضاوی) قَالُوْٓا۔ صورۃً صیغہ ماضی کا ہے۔ لیکن مقصود مومنین صابرین کی عادت کا بیان ہے۔ اِذَا۔ بیان کسی ایک اور اتفاقی واقعہ کیلئے نہیں۔ عام عادت کے اظہار کے لئے آیا ہے یعنی جب جب، یا جب کبھی بھی کوئی ناخوشگواری پیش آتی ہے۔ والمعنی فی اذا ھنا علی التکرار والعموم (بحر) **۵۷۱** (خواہ آج خواہ چند روز بعد) آیت کے اندر تعلیم تین چیزوں کی ہے۔ ایک یہ کہ ہم سب عبد محض ہیں، اور تمامتر اُسی کی ملک۔ ہم خود بھی اور ہماری ہر چیز بھی اپنی کوئی شے ہی نہیں، نہ بیوی نہ بچے، نہ مال نہ جائداد، نہ وطن نہ خاندان، نہ جسم نہ جان! ؎ جو کچھ ہے سب خدا کا، وہم و گماں ہمارا! (اکبرؔ) انسان کے سارے رنج و غم، درد و حسرت کی بنیاد صرف اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبوب چیزوں کو اپنی سمجھتا ہے۔ لیکن جب ذہن اس عام مغالطہ سے خالی ہوگیا، اور کوئی شے بھی تھے ہو سرے سے اپنی رہی ہی نہیں تو اب گلہ و شکوہ، رنج و ملال کا موقع ہی کیا؟ دوسری بات یہ کہ بڑے بڑے رنج اور صدمے اور دل کے داغ بھی عارضی اور فانی ہیں، رہ جانے والے کوئی بھی نہیں۔ عنقریب انہیں چھوڑ چھاڑ مالک کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہاں پہنچتے ہی سارے قرضے بیباق ہو جائیں گے۔ ہر کھوئی ہوئی چیز وصول ہو کر رہے گی۔ یہ تینوں عقیدے جس کے جتنے زیادہ مضبوط ہوں گے اُسی قدر اس کے دل کو دنیا میں امن و سکون حاصل رہے گا۔ غم و حزن کے بار کو ہلکا کرنے کا جو عارفانہ اور تیر بہدف نسخہ یہاں بتا دیا گیا ہے، یہ صحائف کائنات میں بے نظیر ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر صرف یہی ایک آیت ہوتی، تو یہی اُسے حکیم مطلق کا کلام ثابت کرنے کے لئے واللہ کافی تھی۔ صبر ایک کیفیت نفسی کا نام ہے۔ اور اصلًا اُس کا تعلق قلب سے ہے۔ زبان سے کلمۂ صبر دہرانے کا حکم اسی کیفیت کو قوی اور مؤکد بنانے کے لئے ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ آیت میں جو حکم ہے اُس کی تعمیل کے تین مرتبے ہیں (۱) درجۂ اعلیٰ دل میں آیت کے معنی منقش ہوں، اور زبان پر بھی اس کے الفاظ جاری ہوں (۲) درجۂ اوسط۔ دل میں معنی کا خیال کرے، اور زبان سے ادا نہ کرے (۳) درجۂ ادنیٰ۔ دل میں استحضار نہ ہو مگر زبان سے دُہرائے۔ چوتھی ممکن صورت یہ ہے کہ دل میں اعتقاد کسی درجہ میں بھی موجود نہ ہو محض زبان سے دُہرائے۔ اس مقام کا نام منافقت ہے، اور یہ ایمان والوں کی دنیا سے خارج ہے۔ رسول اللہ صلعم کی بابت تاریخ کا بیان ہے کہ آپ ادنیٰ ادنیٰ تکلیف یا ناگواری کے موقع پر بھی یہ کلمہ زبان پر لاتے رہتے تھے۔ اور یہی معمول آپ کے صحابیوں کا رہا ہے۔ راجعون سے یہ مراد نہیں کہ انسان ابھی کہیں اور ہے، اور پھر کسی ایسے مقام یا جہت میں چلے گا جہاں خدا ہے۔ خدا کے پاس تو وہ اب بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ عالم آخرت میں جس طرح اللہ کی ملکیت و ربوبیت اور سارے ظاہری اسباب کے ٹوٹ جانے سے بالکل واضح و نمایاں ہو جائے گی اُسی طرح یہ خدا ہی کی طرف رجوع بالکل آشکار ہو کر رہے گا۔ درمیانی واسطے سب غائب ہو کر رہیں گے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ کلمۂ استرجاع تمام مصیبتوں کا علاج ہے اور انہی میں قبض بھی داخل ہے، جو سالکوں کو اکثر پیش آتا رہتا ہے۔ **۵۷۲** دنیا اور آخرت دونوں میں اوپر کی آیت میں صابرین کے حق میں جس خوشخبری کا ذکر تھا، یہ سب اسی کا بیان ہو رہا ہے۔ علیھم صلوٰت من ربھم۔ یعنی یہ لوگ عنایت خاصہ کے مورد ہوں گے۔ ہر شخص اپنے

وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ
البتہ تم ادراک نہیں کر سکتے ۵۶۷ اور ہم تمہاری آزمائش کرتے رہیں گے ۵۶۸ کچھ خوف اور
وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ
بھوک سے اور مال اور جان اور پھلوں کے کچھ نقصان سے ۵۶۹ اور آپ
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ
صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے ۵۶۹ کہ جب ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں ۵۷۰ کہ
قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ
بیشک ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور بیشک ہم اُسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں ۵۷۱ یہ لوگ وہ ہیں کہ اُن پر
صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
نوازشیں ہوں گی اُن کے پروردگار کی طرف سے اور رحمت (بھی) اور یہی لوگ
الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ
راہ یاب ہیں ۵۷۳ صفا و مروہ بیشک اللہ کی یادگاروں میں سے
اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ
ہیں ۵۷۴ سو جو کوئی بیت (اللہ) کا حج کرے یا عمرہ کرے ۵۷۵ اس پر ذرا (بھی) گناہ
عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ
نہیں کہ ان دونوں کے درمیان آمد و رفت کرے ۵۷۶ اور جو کوئی خوشی سے کوئی امر خیر کرے،
فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ
سو اللہ تو بڑا قدر دان ہے، بڑا علم رکھنے والا ہے ۵۷۷ بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جو

مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا
ہم کھول ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں سے نازل کر چکے ہیں، بعد اس کے کہ ہم اُسے
بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ
لوگوں کے لئے کتاب (الٰہی) میں کھول چکے ہیں ۵۷۷ یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ اُن پر لعنت کرتا ہے
وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَۙ ۝١٥٩ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا
اور اُن پر لعنت کرنیوالے لعنت کرتے ہیں ۵۷۸ البتہ جو لوگ توبہ کر لیں ۵۷۹ اور درست ہو جائیں ۵۸۰
وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْۚ وَاَنَا التَّوَّابُ
اور ظاہر کر دیں ۵۸۱ سو یہ وہ لوگ ہیں کہ میں اُن پر متوجہ ہو جاؤنگا رحمت سے ۵۸۲ اور میں بڑا توبہ قبول کرنیوالا
الرَّحِيْمُ ۝١٦٠ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ
ہوں بڑا رحمت والا ہوں ۵۸۳ بیشک جو لوگ کفر کرتے ہیں اور مر جائیں اسی حال میں کہ وہ کافر
كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ
ہیں، سو یہ وہی لوگ ہیں کہ اُن پر لعنت ہے اللہ کی، اور فرشتوں کی اور
النَّاسِ اَجْمَعِيْنَۙ ۝١٦١ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ
آدمیوں کی سب کی ۵۸۴ وہ اُس میں پڑے رہنے والے ہیں ۵۸۵ کہ نہ اُن پر سے عذاب ہلکا ہونے
الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝١٦٢ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ
پائیگا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ۵۸۶ اور تمہارا خدا ایک خدا ہے۔ بجز
وَّاحِدٌۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝١٦٣ ع ١٩ ١١ ٢
اُس کے کوئی خدا نہیں ۵۸۷ بے انتہا رحم و کرم کرنیوالا، بار بار رحم کرنے والا ۵۸۸

اپنے درجے کے مناسب۔ ورحمتہ۔ یعنی یہ لوگ رحمت عالم کے سرور میں گے۔ ھم المھتدون۔ دنیا میں ان کی رسائی اس حقیقت تک ہو چکی تھی کہ کوئی چیز بھی اپنی نہیں۔ یہاں تک کہ خود ان کے جسم و جان نفس و روح کا مالک حق تعالیٰ ہی ہے۔ چنانچہ جب یہ اسکے پاس پہنچیں گے تو سب ہی کچھ پالیں گے جس نے اللہ کی رحمت مغفرت، رضامندی کو پالیا اُس نے دنیا اور آخرت کی بھی ہی کونسی نعمت! اولٰئک ھم المفلحون عطالہم الدینیۃ والدنیویۃ فازوا من خالقہم بالزکوۃ والرحمۃ (روح) ۵۷۳ ؎ وہ کرو یعنی دو پہاڑوں کی یادگاروں میں سے۔ صفا و مروہ کسی زمانہ میں مسجد الحرام کے پاس دو پہاڑیاں تھیں۔ اب صرف بلندیاں محض چٹان کی سی رہ گئی ہیں۔ صفا حرم شریف کی داہنی جانب ہے اور مروہ بائیں جانب۔ دونوں کے درمیان فاصلہ ۴۹۳ قدم کا ہے، یا تقریباً ۲ فرلانگ۔ صفا کے لغوی معنی صاف پتھر یا خالص چٹان کے ہیں۔ اور مروہ کے بھی لغوی معنی سفید نرم پتھر کے ہیں۔ الصفا الحجارۃ الصافیۃ (راغب) اصل المروۃ الحجر الابیض (روح) حدیث صحیح میں یہ مضمون آیا ہے کہ حضرت ہاجرہؓ حضرت اسمٰعیل کو شیر خوارگی کے زمانہ میں خانہ کعبہ کے پاس پیاسا اور تنہا چھوڑ کر اس تلاش میں نکلی تھیں کہ کہیں کوئی قافلہ آتا ہوا نظر آجائے، تو اس سے پانی مانگ لے۔ اور اس وقت اضطراب میں دوڑ کر اس پہاڑی سے اُس پہاڑی پر جاتی تھیں کہ شاید بلندی پر کسی قافلہ پر نظر پڑ جائے۔ شعائر اللہ۔ یعنی اللہ کے دین کی نشانیاں یا علامتیں۔ دین الٰہی کے وہ شعار جو طاعتوں میں بطور علم کام دیں۔ شعائر جمع ہے شعیرہ کی اور اسکے معنی ہیں علامت کے۔ جمع شعیرۃ وھی العلامۃ (مدارک) اعلام طاعتہ وکل شیء جعل علمًا من اعلام طاعۃ اللہ فھو من شعائر اللہ (کبیر) ھی العلامات التی ندب اللہ الیھا وامر بالقیام بھا (ابن عربی) اصطلاح میں مراد مناسک حج کی علامتیں ہیں۔ ای من اعلام مناسکہ ومتعبداتہ (مدارک) من معالم اللہ فی الحج (ابن عربی) ۵۷۴ ؎ حج۔ عبادات اسلامی کا چوتھا رکن یا نماز، روزہ، زکوٰۃ کے بعد چوتھا فریضہ۔ اہل ہر فرد پر خواہ وہ دنیا کے کسی علاقہ کا باشندہ ہو بہ شرط استطاعت و صحت و امن راہ، عمر میں ایک بار فرض ہے۔ گویا دنیائے اسلام کی بین الاقوامی سالانہ کانگرس۔ ارکان حج۔ یعنی جو چیزیں فرض ہیں، وہ تین ہیں:۔ (۱) پوشش احرام یعنی حدود حرم میں داخلہ سے پہلے عام لباس اتار کر احرام یا بے سلا ہوا لباس پہن لینا (۲) میدان عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو حاضری۔ اصطلاح میں اسے وقوف کہتے ہیں (۳) طوافِ زیارت۔ یعنی وقوف کے بعد خانہ کعبہ کا طواف۔ اور واجبات حج چار ہیں:۔ (۱) ۹ و ۱۰ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں مزدلفہ میں قیام (۲) صفا و مروہ کے درمیان آمد و رفت۔ اصطلاحی نام سعی ہے (۳) مزدلفہ میں قیام کے بعد منیٰ میں کنکریاں پھینکنا۔ اصطلاحی نام رمی جمرات ہے (۴) طوافِ کعبہ۔ (یہ طواف فرض کے علاوہ ہے اور طوافِ صدر کہلاتا ہے)۔ قربانی کرنا، سر کے بال منڈوانا، وغیرہا سنن و مستحبات ان کے علاوہ ہیں۔ عمرہ۔ اس کا دوسرا نام حج اصغر ہے۔ اس میں حج کی طرح مہینہ اور تاریخ کی قید نہیں۔ اور نہ اس میں وقوف عرفات ہے، اور نہ قیام مزدلفہ و منیٰ۔ سال کے ہر موسم میں اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ عمرہ کی نیت سے احرام حدود حرم سے باہر باندھے۔ طوافِ کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرکے بال منڈوا لے، بس عمرہ ہو گیا۔ احرام کھول دے۔ ۵۷۵ ؎ لا جناح علیہ۔ صفا و مروہ کو نسبت تو توحید کے خاص امام گھرانے سے حاصل تھی، یعنی ہاجرہ اور اسمٰعیل اور ابراہیم علیہم السلام سے۔ لیکن زمانہ جاہلیت میں بعض ان پر بھی مشرک کا ہو گیا تھا۔ اور ایک ایک پہاڑی پر ایک ایک دیوی کی مورتی نصب ہو گئی تھی۔ مشرک تیرتھ کرنے جاتے تو انہیں بھی دوڑ دوڑ کر چھوتے اور چومتے۔ قرن اول کے مسلمانوں، صحابیوں کی توحید پرستی اور شرک بیزاری کا کیا پوچھنا۔ قدرۃً خیال گزرا کہ کہیں ان پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت شعائر شرک میں نہ قرار پائے۔ آیت میں اسی کا شبہ دور کیا گیا ہے، اور ارشاد ہوا ہے کہ یہ جاہلیت کی نہیں عین توحید کی یادگاریں ہیں۔ اس لئے اگر ان کے درمیان آمد و رفت اسلامی توحید ہی حج کا جزو رکھی جائیں، تو اس میں مطلق مضائقہ نہیں۔ یطوف بھما۔ طواف کے اصلی معنی کسی چیز کے گرد گھومنے یا چکر کاٹنے کے ہیں۔ لیکن وسعت دے کر اسکے معنی مطلق آس پاس جانے کے بھی کئے گئے ہیں۔ اور یہاں مراد دو مقاموں کے درمیان آمد و رفت سے ہے۔ الطوف المشی حول الشیء (راغب) والمراد ھنا السعی بینھما (مدارک) یہ سعی صفا و مروہ کے درمیان، حنفیہ کے ہاں واجب ہے، امام احمد کے ہاں سنت ہے۔ اور مالکیہ و شافعیہ کے ہاں فرض ہے۔ یہ آمد و رفت سات بار ہوتی ہے۔ درمیان کا کچھ فاصلہ تقریباً ۵ فرلانگ دوڑ کر چلنا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام سعی (دوڑ) ہے۔ اس فاصلہ کی علامت کے طور پر سڑک کے کنارے دو پتھر سبز رنگ کے نصب کر دیئے گئے ہیں۔ کسی زمانہ میں یہاں بالکل ویرانہ تھا۔ لیکن اب تو عین بازار ہے، اور صفا و مروہ کے درمیان خوب آبادی اور چہل پہل رہتی ہے ۵۷۶ ؎ (اس لئے اسکے ہاں نہ اعزاز و اکرام کی کمی کسی نیک کار کے لئے ہوگی، اور نہ وہ کسی کے اخلاص عمل کا ناواقف ہے) تطوع۔ تطوع ہر وہ چیز ہے فرض کے علاوہ جو انسان اپنی خوشی سے انجام دے۔ خیرا۔ خیر عام معنی میں ہے، ہر عمل خیر کو شامل۔ المراد منہ جمیع الطاعات (کبیر عن الحسن) وھذا اولی لانہ اوفق لعموم اللفظ (کبیر) مطلب یہ ہے کہ کوئی سا بھی نیک عمل ہو کسی نوعیت اور کسی درجہ کا، جو بھی انسان خوشی سے انجام دیگا، اُس کا اجر اسے مل کر رہے گا۔ شاکر۔ شکر کا لفظ جب اللہ کے لئے آتا ہے تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بندہ کی تھوڑی سی طاعت پر معاوضہ بہت زیادہ دیتا ہے۔ الشکر من اللہ تعالیٰ ان یعطی لعبدہ فوق ما یستحقہ یشکر الیسیر ویعطی الکثیر (…) علیم۔ یعنی نیتوں تک سے واقف۔ علیم بنیتہ (…) ابھی ایک ہی آیت اوپر ذکر فضائل صبر کا ہو رہا تھا۔ اسکے معاً بعد ذکر حج کا شروع ہو جانا، علاوہ اور بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کے ایک خاص مناسبت بھی صبر سے رکھتا ہے۔ ان سطور کے راقم روسیاہ کا ذاتی تجربہ ہے کہ موسم حج کے ہجوم، چپقلش اور مسلسل کوچ و مقام میں فرائض تک کی پابندی مشکل پڑ جاتی ہے۔ سنن و مستحبات کا کیا ذکر ہے۔ اشتعال کے باوجود زبان پر قابو رکھئے، ہاتھ پیر پر قابو رکھئے، کان اور آنکھ پر قابو رکھئے۔ غرض صبر کا پورا امتحان ہر طرح ہو جاتا ہے۔

۵۷۷ ؎ یعنی کتب سابق کے مضامین اور پیشین گوئیوں کو دانستہ چھپاتے ہیں۔ مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور اس پر ابن عباسؓ صحابی اور مشاہیر تابعین سب کا اتفاق ہے۔ نزلت فی اھل الکتب من الیھود والنصاری (کبیر عن ابن عباس ومجاہد والحسن وقتادۃ والربیع والسدی والاصم) الاقرب انہا نزلت فی الیھود والحکم عام (روح) یکتمون۔ اور حق پوشی بھی اس غضب کی کہ محض سکوت پر کفایت نہیں کرتے۔ بلکہ امر حق کی مخالف شہادت دے گزرتے ہیں۔ کتمان کا اطلاق اُس اخفا پر ہوتا ہے جو قصداً کیا جائے، اور اس موقع پر جہاں اظہار ضروری ہو۔ الکتمان ترک اظہار الشیء قصداً مع مساس الحاجۃ الیہ (روح) البینت و الھدی۔ بینات وہ نشانیاں ہیں جو بجائے خود واضح و صریح ہیں۔ الھدی وہ ہے جو دوسروں کے لئے ذریعہ ہدایت بن سکے۔ یہاں بینات سے مراد رسالت محمدی کے دلائل و شواہد ہیں۔ اور ھدی سے مراد احکام شریعت ہیں۔ بینٰہ میں ہٗ کی ضمیر ما انزلنا کی طرف ہے۔ یعنی اُس مضمون کو اُس مفہوم کو۔ الکتب سے مراد ہے جنس کتاب یعنی قدیم کتب آسمانی۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت میں ایسے شخص کی مذمت ہے جو اپنے مُریدوں کے سوا دوسروں سے علوم شریعت کو چھپاتا ہے، کہ علوم ما انزل اللہ کے عموم میں داخل ہیں۔ البتہ علوم مکاشفہ کا حکم دوسرا ہے وہ منزل نہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان کے اظہار میں خوف فتنہ بھی ہے ۵۷۸ ؎ خواہ وہ لعنت کرنے والے جنس آدم سے ہوں یا جنات ہوں یا ملائکہ ہوں یا اور کوئی مخلوق ہوں۔ لعنۃ پر حاشیہ پارہ اول میں گزر چکے۔ اللہ کی لعنت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنے سے دور اور اپنے فضل و کرم سے محروم کر دیتا ہے۔ لعن یبعدھم عن رحمتہ (روح) وذلک من اللہ تعالیٰ فی الاخرۃ عقوبۃ وفی الدنیا انقطاع من قبول رحمتہ وتوفیقہ (راغب) مخلوق کی لعنت یہ کہ ان بدکاروں کے لئے بددعا کی جائے، ان کے لئے حق تعالیٰ کی رحمت سے دوری اور اسکے فضل و کرم سے محرومی طلب کی جائے۔ ومن الانسان دعاء علی غیرہ (راغب) بمعنی الدعاء علیھم بالابعاد (…) قدیم صحیفوں کا بھی چلا ہوا محاورہ ہے۔ ملاحظہ ہوں توریت میں استثنا ۲۷: ۱۱ … وغیرہ اور انجیل میں مرقس … یوحنا … وغیرہ۔ فقہاء نے آیت ماقبل سے استدلال کیا ہے کہ عالم پر تبلیغ حق اور اپنے علم کا بیان واجب ہے۔ استدل بھا علماءنا علی وجوب تبلیغ الحق وبیان العلم علی الجملۃ (ابن عربی) ۵۷۹ ؎ (اپنے پچھلے جرائم سے) توبہ کرنے سے مراد ہے باز آنا، نادم ہونا، اور عزم ترک کے ساتھ عذر خواہی کرنا ۵۸۰ ؎ یعنی آئندہ کے لئے اپنی اصلاح حال کر لیں ۵۸۱ ؎ (اپنی آسمانی کتابوں کے اُن مضامین کو جنہیں وہ اب تک چھپاتے رہے ہیں، یہاں مراد ہیں اسلام و پیمبر اسلام سے متعلق پچھلے صحیفوں کی پیشین خبریں۔ خلاصہ یہ کہ یہ مجرم گزشتہ پر نادم ہو کر اب بھی ایمان لے آئیں، اور تلافی مافات پر آمادہ ہو جائیں ۵۸۲ ؎ یعنی یہ تائبین نہ صرف لعنت کی زد سے باہر ہو جاتے ہیں، بلکہ رحمت و مغفرت الٰہی کے ماتحت بھی آ جاتے ہیں۔ البتہ جو لوگ اپنی اسی بدکرداری پر اصرار رکھتے ہیں، اُن پر سزا بھی قائم رہتی ہے۔ والذین … ۔ توبہ اور قبول توبہ کا مضمون قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔ یہاں توبہ کے ساتھ قید اصلاح اور تبیین کی لگی ہوئی ہے۔ یعنی جو فساد پھیلایا تھا اس کی اصلاح اور جو چھپایا تھا اس کا اظہار۔ محققین نے لکھا ہے کہ جن گناہوں سے صرف حقوق اللہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے، مثلاً نماز یا روزہ کا ترک، اُن کے لئے محض توبہ و استغفار کافی ہے، کہ اس کا تعلق صفات رحمانیت و رحیمیت سے ہے۔ لیکن جن گناہوں سے بندوں کی حق تلفی لازم آتی ہے، مثلاً قتل، چوری، رشوت، غصب، فساد، بدامنی، سود خوری، عقائد باطلہ کا اعلان، ان کے لئے ضروری ہے کہ مرتکبین معصیت ضرر کا عملی تدارک بھی بقدر امکان کرے، جب جا کر توبہ قبول ہوگی، کیونکہ یہاں واسطہ حق تعالیٰ کی صفت عدل سے ہے۔

۵۸۳ قرآن مجید کا بار بار صفتِ رحیمی اور قبولِ توبہ پر زور دینا ایک طرف اُن گمراہ قوموں، مثلاً بودھ مت والوں کے مقابلہ میں ہے جو سمجھتے ہیں کہ قانونِ مکافاتِ عمل (ہندی اصطلاح میں "کرم") ہر حال اور ہر صورت میں اپنا عمل کر کے رہتا ہے، اور کوئی خدائی قوت اس پر غالب نہیں آ سکتی۔ اور دوسری طرف اُن گمراہ قوموں، مثلاً مسیحیوں کے مقابلہ میں ہے جو سمجھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ صفتِ رحیمی کا اظہار پوری طرح کر ہی نہیں سکتا، اور اس کی صفتِ عدل کے تقاضہ کو پورا کرنے اور گنہگاروں کو معافی دلوانے کے لئے کسی کفارہ کا وجود لازمی ہے ۵۸۴ اجمعین کا لفظ تاکید کے لئے آیا ہے، اور اس کا تعلق اللہ اور ملائکہ اور الناس تینوں سے ہے۔ محض الناس سے نہیں۔ واجمعین تاکید بالنسبة الی الکل لا للناس فقط (روح) لعنة اللہ۔ اہلِ سنت کے ہاں کسی متعین گنہگار پر لعنت کرنا ہرگز جائز نہیں البتہ بغیر کسی کو متعین کئے ہوئے مبہم و مطلق صورت میں جائز ہے، مثلاً یہ کہ چور پر لعنت ہو۔ فاما العاصی المعین فلا یجوز لعنه اتفاقا، فاما لعن العاصی مطلقا فیجوز اجماعا (ابن العربی) بلکہ حدیث صحیح میں تو مومن پر لعنت اُس کے قتل کے مثل بتائی گئی ہے۔ وفی صحیحہ مسلم لعن المومن کقتله (ابن العربی) وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ۔ بلکہ زندگی میں تو کافر متعین پر بھی لعنت کی اجازت نہیں۔ وماتوا کی قید نے صاف کر دیا کہ یہاں جن پر لعنت آئی ہے اُن کی موت ہی کفر پر ہو چکی تھی۔ اور اصل مدار ختمِ اعمال یا وفات پر ہے۔ قال لی کثیر من اشیاخی ان الکافر المعین لا یجوز لعنه لان حاله عند الموافاة لا تعلم (ابن العربی) وقد شرط اللہ تعالیٰ فی هذه الآیة فی اطلاق اللعنة الموافاة علی الکفر (ابن العربی) عبرت حاصل کرنا چاہیے اُن مسلمانوں کو جو اپنے کسی بھائی کو لغزش میں مبتلا دیکھ کر جھٹ اس پر لعنت بھیجنے لگتے ہیں ۵۸۵ (ہمیشہ ہمیش کے لئے) خلدین۔ خلود کے معنی یہاں لازم پکڑ لینے کے۔ یعنی اسی لعنت و عذاب میں جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔ الخلود اللزوم الطویل ومنه یقال اخلد الی کذا ای لزمه ورکن الیه (کبیر) فیھا۔ ضمیر دوزخ کی طرف ہے۔ اور بعض نے لعنت کی طرف رجع کی ہے۔ ای فی اللعنة او النار (بیضاوی) اور بجائے اسم کے ضمیر لانے سے مقصود اظہارِ عظمت و اہمیت ہے۔ انها اضمرت تفخیما لشأنها وتهویلا (کبیر) ۵۸۶ تخفیف کا تعلق بعدِ عذاب سے ہے اور مہلت کا تعلق قبلِ عذاب سے۔ یعنی دوزخ میں پڑنے کے بعد نہ کسی قسم کی تخفیف اُن کے عذاب میں ہو گی اور نہ عذاب میں پڑنے سے قبل ہی کوئی مہلت انہیں ملے گی

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ
یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اُدل بدل
وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
میں اور جہازوں کے چلنے میں جو سمندر میں اُن چیزوں کے ساتھ چلتے ہیں جو لوگوں کو نفع
النَّاسَ وَمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ
پہنچاتی ہیں، اور (اس) پانی میں جسے اللہ نے اُتارا پھر اُس سے زمین کو اُس کے
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيفِ
مُردہ ہونے کے بعد جِلا اُٹھایا اور اس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دیئے، اور ہواؤں
الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ
کے بدلنے میں، اور بادل میں (جو) آسمان اور زمین کے درمیان مقید ہے (ان سب) میں
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ
ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں نشانیاں (موجود) ہیں ۵۸۹ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے علاوہ دوسروں
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ
کو بھی شریک بنائے ہوئے ہیں ۵۹۰ اُن سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ سے (رکھنا چاہیے) ۵۹۱
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ
اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی محبت سب سے قوی رکھتے ہیں ۵۹۲ اور کاش ظالم جب عذاب کو
ظَلَمُوْٓا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ
دیکھ لیتے ۵۹۳ تو سمجھ لیتے کہ قوت اللہ ہی کی ہے

۵۸۷ (نہ بڑا نہ چھوٹا۔ نہ عقلی نہ غیر عقلی) یہاں خطاب ساری نوعِ انسانی سے ہے۔ نفسِ وجودِ باری تو مشرکینِ عرب کو بھی تسلیم تھا جس طرح آج بھی ساری مشرک قوموں کو تسلیم ہے۔ لیکن مشرکین علاوہ اس خدائے اعظم یا خدائے برتر کے اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا یا دیوتا تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ مشرکینِ قدیم تو اپنی قوم کے علاوہ دوسری قوموں کے، یہاں تک کہ اپنی دشمن قوموں کے بھی دیوتاؤں کے وجود کے قائل تھے۔ اُن کی قوت کے قائل تھے، اُن کی خدائی کے قائل تھے۔ بس صرف اُن کی عبادت کے منکر تھے۔ اور اس کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ دشمن کا دیوتا بھی دشمن ہی ہوگا! ——— گویا خدا بھی جذبات و احساسات کے لحاظ سے انسان کا مثنیٰ ہوتا تھا۔ قرآن نے اگر اس عقیدہ پر بھی ضربِ کاری لگائی۔ اور دعوے سے بار بار اعلان کیا کہ قابلِ پرستش و ناقابلِ پرستش ہونا کیسا، کسی دوسرے خدا یا دیوتا کا وجود ہی سرے سے نہیں، نہ بڑے کا نہ چھوٹے کا، نہ عقلی کا نہ غیر عقلی کا! اور اللہ کے ساتھ شریک کا وجود محض وہمِ انسانی کی ایک اختراع ہے! ہمارے قدیم مفسرین بھی بغیر جدید علم الاقوام (انتھالوجی) کی کسی تحقیق کے اس نکتہ تک پہنچ گئے تھے۔ ان الهة لا یتوهم ان فی الوجود الٰها لکن لا یستحق منهم العبادة (بیضاوی) ۵۸۸ یہ مظہرِ کامل رحمانیت کا بھی اور رحیمیت کا بھی۔ دونوں صفتیں اسی پر ختم ہیں۔ کوئی اُس کا شریک نہ اِس صفت میں، نہ اُس صفت میں ۵۸۹ (اللہ کی حکمت و ربوبیت، قدرت، صناعی، اور اس کی فردیت کی) زمین و آسمان کے یہ سارے کارخانے، جو دنیا کے ہر طلسم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور انسانی سائنس کے ہر شعبہ سے عجیب تر ہیں، بجائے خود اس کی دلیل ہیں کہ نہ یہ اپنے آپ وجود میں آ سکتے ہیں، نہ باقی رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی صاحبِ شعور، صاحبِ ارادہ، قادرِ مطلق ہستی اُن کی صانع و خالق نہ ہو۔ ان سارے مظاہرِ فطرت کا تسلسل و استمرار، اُن کی یکرنگی و باقاعدگی، ان کا نظم و انضباط، ہر عقلِ سلیم کو مجبور کر رہے ہیں کہ اُن کے عقب میں ایک غیبی حکیم فعال کا ہاتھ تسلیم کیا جائے ——— اسی عقلِ سلیم کو جو ایک معمولی سی گھڑی کو بھی بغیر کسی ماہرِ فن اور صناع گھڑی ساز کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے! اور یہ خلاق ہستیاں اگر بہ صیغۂ جمع، یعنی ایک سے زائد فرض کی جائیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک خالق ان سارے امور کے لئے کافی نہ تھا۔ اس سے اُس کا عجز ثابت ہوا۔ اور جو عاجز یا کسی بات میں ناقص ہے، وہ خالق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر کسی کی ربوبیت و خالقیت پر اعتقاد ہے تو اُسے لامحالہ واحد و یکتا بھی ماننا پڑے گا۔ خلق السموٰت والارض۔ آسمان ہوں یا زمین، سب مخلوق ہی ہیں، غیر مخلوق یا خود آفریدہ کوئی نہیں۔ مشرک قوموں نے انہیں معبود مانا ہے، اور صاحبِ تصرف و صاحبِ سوا دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے ان کی پرستش کی ہے۔ قرآن مجید نے لفظ "خلق" سے ادھر اشارہ کر دیا کہ یہ عظیم الشان موجودات بھی دنیا کے ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ کی طرح مخلوق ہی ہیں۔ اور آکاش دیوتا، دھرتی ماتا، وغیرہ قسم کے الفاظ نرے بے معنی اور مہمل ہیں۔ اللیل والنھار۔ دنیا ایسی مشرک قوموں سے بھی خالی نہیں رہی ہے، جنھوں نے رات اور دن کو ذی حیات و صاحبِ ارادہ و تصرف مان کر انہیں دیوی دیوتا کا درجہ دیا ہے، اور اُن کی پوجا کی ہے۔ یہاں اُن کے اختلاف (ادل بدل) کا ذکر کر کے یہ بتا دیا ہے کہ ان کا غیر مخلوق یا خود آفریدہ ہونا الگ رہا، یہ وقت و زمان کے بے حس، بے جان اجزاء تو خود اپنی حرکت تک پر قادر نہیں۔ قادرِ مطلق ہی ان میں الٹ پھیر کرتا رہتا ہے۔ الفلک۔ ہندوستان میں جب شروع شروع ریل چلی ہے، تو دیہات میں خود اس کی پوجا شروع ہو گئی تھی، اور بہت سے "خوش عقیدہ" مشرکوں نے اپنے معبودوں کی فہرست میں ایک "انجن دیوتا" کا بھی اضافہ کر لیا تھا۔ ایسی ہی وہم پرست قوموں نے اگر کبھی بادبانی جہاز اور دخانی کشتیوں کی بھی پوجا کی ہو، تو کچھ عجب نہیں۔ فلک کے عموم کے تحت میں اسٹیمر، لائنر، ڈریڈناٹ، ہر قسم کے چھوٹے بڑے جہاز اور آبدوز، تباہ کن، ہر قسم کی چھوٹی بڑی کشتیاں، غرض ہر کل بحری سواریاں آ گئیں، جو اس وقت موجود ہیں، یا قیامت تک ایجاد ہو سکیں، سامانِ جنگ کے لئے یا سامانِ تجارت کے لئے یا بغرضِ تفریح۔ ما ینفع الناس۔ انسان کو فائدہ پہنچانے والی چیز کا وصف سب میں عام و مشترک ہے۔ ما ینفع الناس کے عموم کی وسعت لحاظ رکھنے کے قابل ہے۔ انسانی نفع و منفعت کی ہر ممکن شے اس میں آ گئی۔ ای بالذی ینفعهم من التجارات وسائر المآرب التی تصلح بها احوالهم (قرطبی) امام قرطبی نے لکھا ہے کہ ایک معترض نے سوال کیا کہ قرآن کی جامعیت کا دعویٰ ہے تو اس میں نمک، مرچ، وغیرہ کھانے کے مسالوں کا ذکر کہاں ہے؟ جواب یہ ہے کہ ما ینفع الناس کا عموم ان سب کو شامل ہے۔ السماء کا لفظ جیسا کہ اوپر تشریح ہو چکی ہے، بادل، آسمان، وغیرہ ہر اوپر والی چیز کے لئے عام ہے۔ ما انزل اللہ الخ یہ یاد دلا دیا کہ بارش میں حیات بخشی کی جو قوت ہے، یہ اُسی خدائے واحد و حیات آفریں کی ودیعت کی ہوئی ہے۔ دابة عام ہے ہر حیوان کے لئے۔ حیوان پرستی شرک کا ایک جزوِ اعظم تاریخ کے ہر دور میں رہی ہے۔ بابل، مصر، ہندوستان وغیرہ میں گائے، بیل، بندر، لنگور، بلی، سانپ، بچھو وغیرہ کی پوجا برابر ہوا کی ہے۔ زمین اگر ۲۵ ہزار میل کے محیط کا کوئی گولا ہے تو، یا اگر غیر پیمائش شدہ وسعت کی کوئی چپٹی چیز ہے تو بھی، اگر تیزی اور پھرتی کے ساتھ گردش کر رہی ہو یا اگر اپنی جگہ پر ساکن ہے تو بھی، بہر حال ہر دو صورت فرض کرنے کے بعد بھی کیسی عظیم الشان کاریگری، کیسی بے مثال صناعی کا نمونہ ہے! فضا کی خلا میں کس کی قوت اسے تھامے ہوئے، سنبھالے ہوئے ہے؟ اس کے اور چاند سورج اور ستاروں، سیاروں کے درمیان فاصلہ کا ایک خاص تناسب کس نے قائم کر رکھا ہے؟ اس کی رفتار کی ایک خاص شرح کس نے متعین کر دی ہے؟ آفتاب سے ایک خاص مقدار میں روشنی اور گرمی کون پہنچا رہا ہے؟ چاند سے روشنی اور خنکی ایک متعین حساب کے ساتھ کس کا دستِ قدرت اس تک لا رہا ہے؟ آسمان اگر ٹھوس، مادی اجسام ہیں تو، یا اگر خلا میں محض حدِ نظر ہیں تو بھی ہر صورت میں اُن کی وضع، ساخت، ترکیب، ہیئت، انسانی دسترس سے کتنی بالاتر ہے؟ اَن گنتی شمار سے باہر ثوابت و سیارے کے سکون و حرکت کا انتظام کون قائم کئے ہوئے ہے؟ ستاروں کی یہ روشنی، اور ان کے طلوع و غروب میں یہ باقاعدگی کس کے حکم سے قائم ہے؟ نظامِ فلکی کے بیشمار اجزاء و عناصر میں یہ ترتیب ذرا بھی تناسب کس کی حکمت و صنعت کے دم سے زندہ ہے؟ رات اور دن کس طرح ایک برتر قانون کے اندر جکڑے نظر آ رہے ہیں! گرمی اور سردی اور برسات ہر موسم میں اُن کے اندر مناسب وقت تبدیلیاں کون کرتا رہتا ہے؟ مختلف ملکوں میں اُن کے طلوع و ظہور کے وقت کیسے بندھے ہوئے ہیں! یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جس وقت کلکتہ میں دن نکلتا ہے، دمشق میں بھی دن نکل آئے، یہ ہو جاتا ہے کہ امریکہ کی شام کبھی ایران کی شام بن جائے، جنوری میں جو اوقات اندھیرا چھا جانے کے ہوتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ جون میں وہی باقی رہ جائیں۔ آخر یہ رات دن کے بندھے ہوئے اوقات، قانون کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تغیرات کس کی حکومتِ قاہرہ اور حکمتِ کاملہ کی شہادت دے رہے ہیں؟ بحرِ ذخار، سارے پر عظمتوں کو اپنی گرفت میں لئے رہنے والا، رقبہ میں خشکی سے چار چند، اپنی اس ساری عظمت و ہیبت کے باوجود کس طرح مشتِ خاک انسان کے قبضہ میں آ گیا ہے! کس طرح لکڑی کے تختوں کو جوڑ جاڑ کر، ان میں لوہے کی کیلیں ٹھونک ٹھانک کر، ان پر لوہے کی چادریں چڑھا کر انسان سمندر کے بڑے سے بڑے مہیب فاصلوں اور مسافتوں کو طے کر کے رکھ دیتا ہے! اس میں مدوجزر جب ہوگا، قمری مہینہ کی خاص خاص ہی تاریخوں پر ہوگا، اپنی ساری غضبناک تندی کے باوجود ایک خاص رقبہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ

سکے گا، ایک مخصوص و متعین ہی وزن کی چیزوں کو وہ اپنے اُوپر تیرنے دے گا، اور اسکے علاوہ وزن والیوں کو ڈبوتے گا۔ اسکے پانی کا ایک مخصوص مزاج، خاص رنگ، خاص مزہ ہوگا، کنوؤں کے پانی سے مختلف، دریاؤں کے پانی سے مختلف، اس طرح کے سیکڑوں دوسرے قانون کا پابند ہے، کس کی مشیت، کس کی قدرت، کس کی حکومت نے کر رکھا ہے؟ بارش کا خاص خاص فصلوں میں، خاص خاص موسموں میں یا خاص خاص فضائی تغیر کے ماتحت ہونا، بخارات کا ایک خاص گرمی پاکر سمندری ذخیرہ آب سے اُٹھنا، ایک خاص فاصلہ تک اُوپر جانا، ایک خاص درجہ کی سردی پاکر اُن دُخانی و ہوائی اجزاء کا منجمد ہو جانا، اُن کا بادل کی شکل اختیار کر لینا، ایک خاص درجہ ثقل تک بڑے بڑے بھاری اور بوجھل بادلوں کا فضا میں سنبھلے رہنا، پھر فلاں فلاں فضائی تغیر کے ماتحت فلاں فلاں علاقہ تک پہنچ جانا، پھر ایک بندھی ہوئی مقدار میں، ایک متعین مدت کے اندر برس پڑنا، اس سے از سرِ نو خشک زمین میں جان پڑ جانا، یہ سارے رد و بدل کسی حکیم کی حکمت، کسی آمر کی حکومت، کسی قادر کی قدرت کی کیسی کھلی ہوئی شہادت دے رہے ہیں! پھر حیاتِ نباتی کے علاوہ خود حیاتِ حیوانی جن عجائب کا مجموعہ ہے۔ ہر زندہ جسم بے شمار ذروں اور خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان کی جو ایک مخصوص ترتیب، اور متعین ترکیب ہوتی ہے۔ ایک خاص درجہ کی حرارت جو حیات کو قائم رکھتی ہے، ایک خاص مقدار سے بڑھی ہوئی سردی جو اس لحظ میں منتشر اس اجتماع میں انتشار پیدا کر دیتی ہے، نظام تنفس، نظام تغذیہ، نظام تناسل، نظام عصبی وغیرہ جسم کے اندر کے متعدد نظامات، پھر ہر نظام کے ماتحت بے شمار قاعدے اور ضابطے، اس سارے نظام اعظم کی تکوین و قیام پر کس کی قدرت، کس کی مشیت، کس کی حکومت کار فرما ہے؟ اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں سوالات پر انسان جتنا زیادہ غور اور نکتہ سنجی سے کام لے گا، توحید اور توحیدی حکمتوں کا نقش دل پر اور زیادہ ہوتا جائے گا۔ جاہلی اور غیر مومن قوموں کے فلسفہ اور سائنس کا صرف نقطۂ نظر غلط ہوتا ہے، اس کی اگر تصحیح ہو جائے اور ان علوم مادی کا مطالعہ اگر ایمانی نقطۂ نظر سے شروع کر دیا جائے، تو بجائے الحاد، ارتیاب و تشکک کے عرفان و ایقان ہی کی راہیں روز بروز روشن تر ہوتی جائیں۔ مُرشد تھانویؒ نے فرمایا ہے، کہ آیت میں مصنوعات سے صانع پر استدلال ہے اور یہی اصل ہے مراقبۂ صوفیہ کی۔

جَمِيعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ اِذْ تَبَرَّاَ

ساری کی ساری ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب بہت ہی سخت ہے ۵۹۰ (اس وقت کا خیال کرو) جب

الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ

مقتدا (یا متبوع) اپنے مقتدیوں (یا پیروؤں) سے الگ ہو جائیں گے ۵۹۱ اور اُن کے باہمی تعلقات

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا

ٹوٹ کر رہ جائیں گے ۵۹۷ اور پیرو کہنے لگیں گے، ۵۹۸

لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ

کاش ہم کو پھر ایک دفعہ (دنیا میں) مل جاتا ۵۹۹ تو ہم بھی ان سے الگ ہو جائیں جیسے یہ ہم سے الگ

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ

ہو گئے، بس اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو انہیں (خالی) ارمان (کرکے) دکھائے گا، ۶۰۰

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ

اور وہ دوزخ سے کبھی بھی نہ نکل پائیں گے ۶۰۱ اے انسانو! زمین

كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا

پر جو کچھ حلال اور پاکیزہ موجود ہے اُس میں سے کھاؤ (پیو) ۶۰۲ اور شیطان کے

خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾

نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو ۶۰۳ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ۶۰۴

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا

وہ تو تمہیں بس برائی اور گندگی ہی کا حکم دیتا ہے ۶۰۵ اور اس کا کہ تم اللہ پر ایسی باتیں گڑھ لو

ع ۲۰ / ۴

منزل ۱

۵۹۰ اَنۡدَادًا۔ نِدّ کے لفظی معنی کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ ۲۳ پ ۱۔ انداد سے مراد عموماً مورتیوں، بتوں، دیوتاؤں سے لی گئی ہے۔ المراد الاوثان والاصنام التی کانوا یعبدونھا (قرطبی) المراد بھا الاصنام کما ھو الشائع فی القرآن والمروی عن قتادۃ ومجاھد واکثر المفسرین (روح) رؤسا، سردار، اور مقتدایانِ قوم بھی مراد لیے گئے ہیں۔ قیل الرؤساء الذین یطیعونھم طاعۃ الارباب من الرجال (روح) انھا السادۃ الذین کانوا یطیعونھم (کبیر عن السدی) تیسرا قول یہ ہے کہ مفہوم ان سب سے وسیع تر ہے اور لفظ کا عموم ہر ایسی چیز کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا قلب پر مسلط ہو جائے۔ امام رازیؒ نے اس قول کو صوفیہ اور عارفین کی جانب منسوب کیا ہے۔ القول الثالث قول الصوفیۃ والعارفین ان کل شیء شغلت قلبک سوی اللہ تعالیٰ فقد جعلتہ فی قلبک ندا للہ تعالیٰ (کبیر) قیل المراد اعم منھا وھو ما یشغل عن اللہ تعالیٰ (روح)

۵۹۱ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج بھی مسیحیوں کو محبت اور تعلق خاطر خدا سے کہیں زیادہ "خدا کے بیٹے" اور پھر "روح القدس" اور "مقدس کنواری" سے ہے۔ اور ہندوؤں کی محبت اور تعلق خاطر اپنے ایشور اور پرماتما سے کہیں زیادہ درگا مائی، لکشمی مائی، اگنی دیوتا وغیرہ دیویوں دیوتاؤں کے ساتھ، اور رشیوں، منیوں، سادھوؤں کے ساتھ ہے۔ کَحُبِّ اللّٰہِ۔ اس فقرہ نے اسے بالکل صاف کر دیا کہ غیر اللہ سے نفس محبت ممنوع نہیں۔ بلکہ ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹے، بیٹی، عزیزوں، دوستوں، رفیقوں سے تو محبت درجۂ طبعی میں رکھ ہی دی گئی ہے۔ ائمۂ شریعت و طریقت سے بھی محبت رکھنا مستحب بلکہ کسی حد تک تو واجب بھی ہے۔ البتہ جو محبت حرام ہے، وہ محبوب کو درجۂ ربوبیت پر جا پہنچانے والی محبت ہے۔ "یا علی" "یا حسین" "یا خواجہ" "یا غوث" "یا وارث" کے نعرے لگانے والے ذرا اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں کہ محبت کا کتنا حصہ اللہ کے لیے باقی رہ گیا، اور کتنا دوسروں کی نذر ہو چکا ہے

۵۹۲ یعنی مومن کی محبت عقلی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی تمام دوسری محبتوں پر غالب و حاکم رہتی ہے۔ آیت نے ضمناً اس مسئلہ کو بھی واضح کر دیا کہ مومن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اصلاً اُنس و محبت ہی کا ہوتا ہے۔ کاش اس آیت کو وہ مسیحی مشنری آنکھ کھول کر پڑھیں جن کے نزدیک اسلام کا خدا ایک دہشت ناک قسم کا معبود ہے!

۵۹۳ (دیکھ لیتے) یری یہاں یعلم کے معنی میں ہے۔ و یری بمعنی یعلم (قرطبی) لَوۡ کا جواب محذوف ہے۔ وجواب لو محذوف والمعنی لو علموا فی الدنیا شدۃ عذاب اللہ (جلالین) اَلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا۔ اپنے حق میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والے، یعنی مشرکین

۵۹۴ (اور کوئی شخص اس عذاب کے دور کرنے پر قادر نہیں) "اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم مشرکین جب دنیا میں کسی مصیبت کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے، اور دوسرے سب اُس کے سامنے عاجز ہیں۔ اور اسی مصیبت کی شدت میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آخرت میں کہ دار الجزاء ہے اور بھی سخت ہوگا تو اس طرح غور کرنے سے تراشے ہوئے معبودین کا عجز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت منکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار کر لیتے۔" (تھانویؒ)

۵۹۵ (آخرت میں) اس شدتِ عذاب کا پورا ظہور عالمِ آخرت ہی میں ہوگا

۵۹۶ قیامت میں۔ یہاں اُس منظر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جب قیامت میں مشرکین کے خواص، علماء و امراء اپنے عوام اور اپنے مقلدین اور رعایا سے علیحدگی کا اعلان کر دیں گے، اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے

۵۹۷ اہلِ باطل کے جتنے بھی باہمی تعلقات و روابط ہیں، اُستادی شاگردی کے، ہم نسبی و قرابت کے، ہم وطنی اور دوستی کے، یہ سب اسی دنیا تک محدود ہیں۔ آخرت میں جو حقائق کے مشاہدہ و معائنہ کا وقت ہوگا، سب ایک دوسرے سے بے تعلق بلکہ آپس میں مخالف نظر آئیں گے۔ یہ قرآن ہی کی نص ہے۔ الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین۔ ہم میں ب بھی کے معنی میں بھی لی گئی ہے۔ بعض نے عنہم سے مراد لیا ہے، قیل بھم بمعنی عنھم (عکبری) اور سببیہ بھی مانی گئی ہے۔ یعنی یہ قطع تعلق بسبب کفر کے ہوگا۔ الباء ھنا للسببیۃ والتقدیر وتقطعت بسبب کفرھم (عکبری) الباء للسببیۃ ای تقطعت بسبب کفرھم الاسباب التی کانوا یرجون منھا النجاۃ (روح)

۵۹۸ (غم و غصہ اور جذباتِ انتقام کے ساتھ)

۵۹۹ (دنیا میں)

۶۰۰ یعنی یہ حسرت بھی پوری نہ ہوگی، اور یہ خلش کا ناسور ہمیشہ کھٹکتی ہی رہے گی

۶۰۱ سزائے دوزخ کے دوام و خلود پر یہ ایک نص صریح ہے۔ کافروں کی زبان سے آخرت میں دنیا میں ایک بار پھر جانے کی تمنا و حسرت کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ دلیل علی خلود الکفار فیھا وانھم لا یخرجون منھا (قرطبی) ابلغ من ھم بخارجین (روح)

۶۰۲ یعنی کھا سکتے ہو۔ امر یہاں وجوب کے لیے نہیں، اباحت کے لیے ہے۔ اور دوسری جگہ یہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اُردو ترجمہ میں بے خبری کی تاکید اور تائید کا کام دے رہی ہے۔ مراد یہ نہیں کہ لازمی طور پر کھاؤ۔ خطاب عام نسلِ انسانی سے ہے۔ دینِ حنیف ابراہیمی کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ، مشرکین، سب ہی کھانے پینے کے باب میں طرح طرح کی غلط روی اور کج راہی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اور خلط کر کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کے حکم میں رکھ رہے تھے۔ مما فی الارض میں من تبعیضیہ ہے من للتبعیض اذ لا یوکل کل ما فی الارض (بیضاوی) حلٰلا جو غذائیں بجائے خود جائز ہیں اور حرام نہیں کی گئی ہیں۔ طیبا وہ جو حلال ذرائع سے حاصل ہوں۔ اور جن میں غیر کا حق نہ ہو۔ مثلاً بیع فاسدہ، اجرت فاسدہ وغیرہا۔ المراد منہ الا یکون متعلقا بہ حق الغیر (کبیر) الطیب الطاھر (سلام) ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ سعد بن ابی وقاصؓ صحابی نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ آپؐ دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ لقمۂ حلال کا التزام کر لو، خود بخود مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے

۶۰۳ یہ ہے اسلام میں اکل حلال کی اہمیت۔ حلالا طیبا یعنی جو غذائیں حاصل بھی جائز ذرائع سے ہوئی ہوں۔ والصحیح ان اللفظ عام فی کل ما عدا السنۃ والتزام من البدع (قرطبی) لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ تعلق، حرام و حلال غذاؤں سے ہے۔ حکم تو عام ہے ہر شیطانی روش کے لیے۔ اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام، اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال ٹھیرا کر

۶۰۴ یعنی اس سے کسی نفع کی، خیر خواہی کی تو قع ہی نہ رکھو

۶۰۵ انما کا حصر کا ہے۔ اسکے صاف معنی یہ ہوئے کہ شیطان سے ہمیشہ شیطنت ہی کا ظہور ہو گا، کسی نیکی کے صدور کا اس سے امکان ہی نہیں۔ دلت الآیۃ علی ان الشیطان لا یامر الا بالقبائح لان کلمۃ انما تفید الحصر (کبیر) سوء و فحشاء دو لفظ متقارب المعنی ہیں، لیکن متحد المعنی نہیں۔ سوء تو وہ چیز ہے جو عقلاً بھی ناپسندیدہ ہو، اور فحشاء وہ ہے جسے شریعت نے بُرا ٹھیرایا ہے۔ السوء ما انکرہ العقل واستقبحہ الشرع والعطف لاختلاف الوصفین (بیضاوی) یہ فرق بھی کیا گیا ہے کہ سوء میں کوئی حد شرعی مقرر نہیں، اور فحشاء میں حد شرعی معین ہوتی ہے۔ اور یہ معنی ابن عباسؓ سے منسوب ہیں۔ السوء ما لا حد فیہ والفحشاء ما فیہ حد حکی عن ابن عباس وغیرہ (قرطبی)

۶۰۶ اور اسی دشمنی کے تقاضہ سے انسان کو الٹی صلاحیں اور قانون الٰہی توڑنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے

۲۰۶ یعنی اپنی طرف سے نکالی ہوئی چیزوں کو احکام خداوندی کی طرح سمجھنے لگو۔ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ ۔ قول کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کے خلاف گڑھ لینا، کسی پر بہتان لگانا۔ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ علم سے یہاں مراد علم یقینی یا علم بحجت بالوحی ہے۔ پس اس وعید کے تحت میں صرف کفری ہی کے نہیں بلکہ بدعت کے اقوال بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ فیدخل فی ھذا کل کافر وکل مبتدع ایضاً (ابن کثیر) ویدخل فیہ کل ما اضاف الی اللّٰہ تعالیٰ مما لا یجوز علیہ (مدارک) ۲۰۷ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ ۔ یعنی اللہ نے جو کچھ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے اتارا ہے۔ مراد یہ کہ جب ان سے عالمگیر شریعت الٰہی کی ماتحتی میں آنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ ۲۰۸ گویا طریق آبائی میں خطا و غلطی کا امکان ہی ان کے نزدیک نہیں۔ اور یہی جمود عین جہالت و ضلالت ہے۔ آج مشرک قوموں اور مبتدع فرقوں کا بھی یہی حال ہے۔ جب انہیں اتباع حق کی دعوت دی جاتی ہے، تو وہ جواب میں اپنے آباء اجداد کے رسوم کو پیش کر دیتے ہیں۔ ۲۰۹ یعنی نہ فہم دین اور اس کے حقائق و معارف کی رکھتے ہوں، اور نہ ہدایت کسی کتاب آسمانی کے ماتحت رکھتے ہوں۔ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا ۔ المراد انھم لا یعلمون شیئاً من الدین (کبیر) لَا یَھْتَدُوْنَ ۔ ای لا یھتدون الی الحق (روح) بعض کج رائے فرقوں نے آیت سے تقلید فقہی کا عدم جواز ثابت کرنا چاہا ہے۔ حالانکہ قاعدہ اقتضاء النص جس کا مقتضی ہے کہ آیت سے تقلید کے عدم جواز نہیں بلکہ جواز پر استدلال کیا جائے۔ آیت میں جس امر کی مذمت وارد ہوئی ہے وہ نفس تقلید نہیں، بلکہ گمراہ و نادان اسلاف کی تقلید ہے۔ اور یہ قید خود اس امر کی دلیل ہے کہ محققین اہل علم کی تقلید جائز ہی نہیں بلکہ عین مطلوب ہے! کسی مریض سے اگر یہ کہا جائے، کہ تم نے بھی کیا حماقت کی کہ ایک اناڑی اور ان پڑھ کا علاج شروع کر دیا، تو ظاہر ہے کہ اس فقرہ سے مذمت نفس علاج کی ہرگز نہیں نکلی، بلکہ اناڑی اور ان پڑھ سے علاج کی بجائے اور نفس علاج کی مقصودیت یا مطلوبیت ہی ظاہر ہوئی۔ ۲۱۰ (بے حسی اور نافہمی میں) ذکر داعی حق کی دعوت حق کا ہو رہا ہے۔ ایک تشبیہ رسولؐ اور اس کی امت دعوت کے رویہ سے متعلق پیش کی جا رہی ہے۔ مضاف ’داعی‘ محذوف ہے۔ علیٰ حذف مضاف تقدیرہ مثل

عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا

جس کا تم علم نہیں رکھتے ہو ۲۰۶ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

اتارا ہے اس کی پیروی کرو ۲۰۷ تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ (دادا)

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

کو پایا ہے ۲۰۸ خواہ ان کے باپ (دادا) نہ ذرا عقل بھی رکھتے ہوں اور نہ ہدایت رکھتے ہوں، ۲۰۹

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا

اور جو لوگ کافر ہیں ان کا حال تو اس شخص جیسا ہے ۲۱۰ جو ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے جو کچھ

يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ

سنتا ہی نہیں بجز بلانے اور پکارنے کے (یہ) لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو (کچھ بھی)

لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ

نہیں سمجھتے ۲۱۱ اے ایمان والو، پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں

مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

کھاؤ پیو ۲۱۲ اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہو ۲۱۳ اگر تم خاص اسی کی بندگی کرنے والے ہو ۲۱۴

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ

اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سور کا گوشت، اور جو (جانور) غیر اللہ کے لئے

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ

نامزد کیا گیا ہو، حرام کیا ہے، ۲۱۵ لیکن (اس میں بھی) جو شخص مضطر ہو جائے ۲۱۶ اور نہ بے حکمی

داعی الذین کفروا (بیضاوی) لے مثل داعیھم الی الایمان (کشاف) فیھا مضاف محذوف اما من جانب المشبہ او المشبہ بہ (روح) ۲۱۱ یعنی اس جانور کی طرح جس کے کان میں پکارنے والے کی آواز اور الفاظ تو آ رہے ہیں باقی وہ معنی و مفہوم کچھ نہیں سمجھتا، بس وہی معاملہ منکرین دعوت حق کے ساتھ کر رہے ہیں۔ داعی کے الفاظ تو سن لیتے ہیں لیکن اس کے معنی و مفہوم پر غور ہی نہیں کرتے۔ مثل الدابۃ تنادی فتسمع ولا تعقل ما یقال لھا کذٰلک الکافر یسمع الصوت ولا یعقل (ابن جریر عن ابن عباسؓ) صُمٌّ ۔ یعنی بہرے ہیں، آواز حق کی طرف سے۔ صُمٌّ عن الحق فلا یسمعونہ ولا ینتفعون بہ (ابن جریر عن قتادۃ) بُكْمٌ ۔ یعنی اقرار حق کے لئے ان کی زبان گونگی ہے۔ بُکْمٌ عن الحق فلا ینطقون بہ (ابن جریر عن قتادۃ) عُمْیٌ ۔ یعنی اندھے ہیں خود اپنے نفع و نقصان کے باب میں۔ عمی عن الھدیٰ فلا یبصرونہ (ابن جریر عن قتادۃ) اس سے ملتا جلتا ایک فقرہ توریت میں بھی موجود ہے۔ ”وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ ان کی آنکھیں لیپی گئیں سو وہ دیکھتے نہیں، اور ان کے دل بھی سو وہ سمجھتے نہیں“۔ (یسعیاہ۔ ۴۴: ۱۸) ۲۱۲ یعنی کھا پی سکتے ہو، کھانے پینے کی اجازت ہے۔ صیغہ امر یہاں بمعنی اجازت ہے، بمعنی حکم نہیں۔ کلوا فی ھذا الموضع لا یفید الایجاب ولا الندب بل الاباحۃ (کبیر) كُلُوْا ۔ یہاں لفظی معنی میں صرف کھانے تک محدود نہیں، بلکہ ہر قسم کا جائز انتفاع اس میں آ گیا۔ المراد بالاکل الانتفاع من جمیع الوجوہ (قرطبی) وکلوا العموم بجمیع وجوہ الانتفاع دلالۃ و عبارۃ (روح) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔ خطاب ابتک عامۃ الناس سے تھا۔ حلال و حرام کے باب میں مشرکین کی غلطی کے اظہار کیلئے اب خطاب صرف مومنین سے ہے۔ ان سے ارشاد ہو رہا ہے کہ حلال و حرام کے باب میں منکرین کی پیروی نہ کریں۔ طَيِّبٰتِ ۔ یعنی وہ چیزیں جنہیں شریعت خداوندی نے پاکیزہ قرار دیا ہے۔ ۲۱۳ (زبان سے بھی اور عمل سے بھی) اُشْکُرُوْا ۔ شکر اس امر کا کہ اس نے یہ رزق عطا کیا، اور رزق بھی حلال و طیب۔ یہاں صیغہ امر وجوب کے لئے ہے نہ کہ صرف اجازت کے لئے۔ اشکروا للّٰہ امر ولیس باباحۃ (کبیر) ۲۱۴ یعنی اگر اپنے دعویٰ ایمان و اخلاص میں سچے ہو تو اللہ کے حکم پر عمل کرو اور اس کے مقرر کئے ہوئے حق ادا کرتے رہو۔ ۲۱۵ یعنی حیوانات کے سلسلہ میں تو شریعت الٰہی کی حرام کی ہوئی بس یہ چیزیں ہیں، نہ وہ چیزیں جو تم نے اپنی تجویز سے گڑھ رکھی ہیں۔ یہاں تردید تمامتر مشرکوں کے خود تراشیدہ محرمات کی ہو رہی ہے۔ باقی جو چیزیں حدیث صحیح کی بنا پر یا کسی اور دلیل شرعی سے حرام ہیں، ان سے آیت کو کوئی بحث نہیں۔ لیس المراد من الآیۃ قصر الحرمۃ علی ما ذکر مطلقاً بل مقید بما اعتقدوہ حلالاً (روح) الْمَيْتَةَ ۔ میتہ یا مردار وہ جانور ہے جو بغیر کسی کے ہلاک کئے از خود مر جائے، یا ہلاک تو کیا جائے لیکن ذبح شرعی کے مطابق نہ ہو۔ ھو غیر المذکی اما لانہ لم یذبح او انہ ذبح ولکن لم یکن ذبحہ ذکاۃ (کبیر) وھی کل ما فارقہ الروح من غیر ذکاۃ مما یذبح (مدارک) زندہ جانور کے اگر گوشت کا کچھ حصہ کاٹ لیا جائے، تو وہ بھی مردار ہی کے حکم میں داخل ہوگا۔ حنفیہ کے ہاں مردار سے کسی قسم کا بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔ یہاں تک کہ مردار گوشت کتوں اور شکاری پرندوں کو کھلانا بھی درست نہیں کہ یہ بھی تو اس سے نفع اٹھانا ہی ہوا۔ درآنحالیکہ قرآن میں مردار کی حرمت مطلق صورت میں ہے۔ قال اصحابنا لا یجوز الانتفاع بالمیتۃ علی وجہ ولا یطعمھا الکلاب والجوارح لان ذٰلک ضرب من الانتفاع بھا وقد حرم اللّٰہ المیتۃ تحریماً مطلقاً معلقاً بعینھا (جصاص) لیکن عمل دباغت کے بعد مردار کی ہڈی، کھال وغیرہ پاک ہو جاتی ہے اور مردار کے حکم میں رہتی ہی نہیں، بمثلہ احادیث و آثار سے ثابت ہے اور حنفیہ اور بعض دوسرے ائمہ فقہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ قال ابوحنیفۃ واصحابہ والحسن بن صالح وسفیان الثوری وعبید اللّٰہ بن الحسن العنبری والاوزاعی وذٰلک انہ یجوز بیعہ بعد الدباغ والانتفاع بہ (جصاص) والحجۃ لمن طھرھا وجعلھا زکاۃ ما ورد عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من الآثار المتواترۃ من الوجوہ المختلفۃ بالفاظ مختلفۃ کلھا توجب طھارتھا والحکم بذکاتھا (جصاص) اور احادیث اس قسم کی وارد ہوئی ہیں۔ ایما اھاب دبغ فقد طھر (عن ابن عباسؓ) دباغ جلود المیتۃ طھورھا (عن ثوبانؓ) زکاۃ الادیم دباغہ (عن سلمۃ بن المحبق) دو جانور ایسے ہیں جو حدیث صحیح کی رو سے بغیر ذبح بھی جائز ہیں، ایک مچھلی دوسرے ٹڈی۔ وقد احلت السنۃ بالحدیث السمک والجراد (مدارک) ھذہ الآیۃ فلھا التخصیص بقولہ علیہ السلام احلت لنا میتتان الحوت والجراد اخرجہ الدار قطنی (قرطبی) فقہ مفسرین نے اسی سلسلہ میں اس مسئلہ کو بھی بیان کر دیا ہے کہ جن غذاؤں میں ذبیحہ کا سوال نہ پیدا ہو، وہ مجوس اور مشرکوں اور سب غیر کتابیوں کے ہاں کی بھی جائز ہیں۔ وقال ابو عمرو ولا باس باکل طعام عبدۃ الاوثان والمجوس وسائر من لا کتاب لہ من الکفار ما لم یکن من ذبائحھم (قرطبی) وَالدَّمَ ۔ یعنی خون جاری یا سیال۔ المراد الدم الجاری (معالم) یعنی السائل (مدارک) اور سورۂ انعام میں دم مسفوح کی قید خود موجود ہے اور فقہا کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دم جو یہاں مطلق صورت میں ہے وہ اسی قید مسفوحیت کے ساتھ حرام ہے۔ وحمل العلماء ھٰھنا المطلق علی المقید اجماعاً (ابن العربی) اس پر فقہا امت کا اجماع ہے کہ خون جاری حرام بھی ہے اور نجس بھی۔ نہ اس کا کھانا جائز ہے نہ اس سے اور کوئی نفع اٹھانا جائز ہے۔ اتفق العلماء علی ان الدم حرام نجس لا یوکل ولا ینتفع بہ (ابن العربی) حدیث صحیح کی رو سے دو منجمد خون حلال ہیں، ایک جگر دوسرے تلی، اور ان کی حلت پر فقہائے امت کا اجماع ہے۔ احلت لنا دمان الکبد والطحال اخرجہ الدار قطنی (قرطبی) گو علمائے یہ بھی کہا ہے کہ جگر و طحال خون کی تعریف میں آتے ہی کب ہیں، وہ تو گوشت کی قسم کی چیزیں ہیں، نہ کہ خون کی قسم کی، اور اس تخصیص و استثناء کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ والصحیح انہ لم یخصص وان الکبد والطحال لحم یشھد بذٰلک العیان الذی لا یعارضہ بیان ولا یفتقر الی برھان (ابن العربی) وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ ۔ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ حرمت لحم خنزیر کی آئی ہے لیکن فقہاء امت کا اجماع ہے کہ سور کا صرف گوشت ہی نہیں بلکہ اس کی چربی، ہڈی، کھال، بال سب ہی حرام ہیں۔ اور لحم کی تصریح تو اس لئے ہے کہ گوشت ہی ہر جانور کے جسم کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے اور جب گوشت کہہ دیا تو اس کے تحت و تابعیت میں جانور کے دوسرے اجزا بھی آ گئے۔ یعنی الخنزیر بجمیع اجزائہ وخص اللحم لانہ المقصود بالاکل (مدارک) اتفقت الامۃ علی ان الخنزیر حرام بجمیع اجزائہ (ابن العربی) بعض مبتدع فرقوں کے اس قول کے جواب میں کہ گوشت کی حرمت سے چربی کی

حُرمت لازم آتی ہے۔ فقیہ ابن العربی بھی کہتے ہیں، کہ یہ اعتراض اہلِ علم کی طرف سے ہوا ہے، جو یہی نہیں جانتے کہ لفظ لحم میں شحم شامل ہے۔ البتہ شحم میں لحم شامل نہیں جس طرح ہر حمد شکر ہے، لیکن ہر شکر حمد نہیں۔ وهم اعاجم لا یعلمون ان من قال لحمًا فقد قال شحمًا ومن قال شحمًا فلم یقل لحمًا ان کل شحم لحم ولیس کل لحم شحم (ابن العربی) رہی اس کے جسم کی نجاست، تو جمہور فقہاء اس کے بھی قائل ہیں۔ قال الجمہور العلماء انه نجس (ابن العربی) البتہ امام مالکؒ کا اصول چونکہ یہ ہے کہ زندگی خود دلیل طہارت ہے، اور ہر زندہ جانور پاک ہے، اس لئے وہ سؤر کی نجاست کے بھی قائل نہیں۔ قال مالك انه طاهر وكذلك كل حيوان عنده لان علة الطهارة عنده هي الحياة (ابن العربی) سؤر کا اور سارا جسم تو ناپاک ہوتا ہی ہے، البتہ اس کے بالوں سے نفع اُٹھانے کی گنجائش ہے، چنانچہ ایک حدیث میں اس کا جواز مذکور ہے۔ لا خلاف ان جملة الخنزير محرمة الا الشعر فانه يجوز الخرازة به وقد روى ان رجلا سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الخرازة بشعر الخنزير فقال لا بأس بذلك (قرطبی) امام ابوحنیفہؒ و محمدؒ و اوزاعیؒ سؤر کے بالوں سے انتفاع کے جواز کے قائل ہیں، اور امام شافعیؒ عدم جواز کے، اور امام ابو یوسفؒ سے جواز و کراہت دونوں کی روایتیں منقول ہیں۔ وقد اختلف الفقهاء في جواز الانتفاع بشعر الخنزير فقال ابو حنيفة ومحمد يجوز الانتفاع به للخرز وقال الشافعي لا يجوز الانتفاع بشعر الخنزير (جصاص) فقہی احکام اور شرعی حُرمت سے قطع نظر، خنزیر ہے ہی ایسی نجس چیز کہ خود فطرت سلیم اسے گندہ سمجھتی ہے اور لطافت طبع کو اس کی جانب رغبت کرنے سے کراہت آتی ہے۔ یہاں تک کہ لفظ خنزیر بھی عربی فیلولوجی (لسانیات) کے بعض ماہروں کا خیال ہے کہ خنز الشیء (وہ چیز گندی ہوگئی) سے بنا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی جتنے نام اس جانور کے مثلاً Hog, Swine, Pig یا اس جانور کے گوشت کے لئے ہیں مثلاً Ham, Pork, Bacon ہیں وہ بھی سب کے سب دلالت ثانوی گندگی و غلاظت پر کرتے ہیں۔ اور اس کے گوشت کے جو طبی نقصانات ہیں، خصوصاً امراض غدودی میں، جس طرح متعین ہوتا ہے، اُس پر تو آج کل کے ڈاکٹر بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ سؤر کی گندگی اور ناپاکی اتنی روشن و عیاں ہے کہ بعض پُرانی قومیں مثلاً اہل مصر بھی اسے نجس سمجھتی رہی ہیں، بلکہ خود یہود کے ہاں بھی یہ حرام تھا۔ آج

وَلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ١٧٣

کرنیوالا ہو، اور نہ حد سے نکل جانیوالا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ بڑا بخشنے والا ہے، بڑا رحمت والا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ

بیشک جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اُس کے

وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَـمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰۗىِٕكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ

معاوضہ میں قلیل قیمت حاصل کرتے ہیں سو ایسے لوگ تو اپنے سینوں میں

بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

بس آگ ہی آگ بھرتے ہیں اور اللہ قیامت کے دن اُن سے نہ کلام کرے گا

وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ښ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ١٧٤ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ

اور نہ انہیں پاک کریگا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے یہ وہ لوگ ہیں

اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ

جنہوں نے گمراہی کو خرید لیا ہے ہدایت کے بدلہ میں، اور عذاب کو نجات کے بدلہ میں،

فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَي النَّارِ ١٧٥ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ

اور یہ لوگ کیسے جیوٹ رکھتے ہیں دوزخ کے لئے اور یہ (سزا) اس لئے ہوگی کہ اللہ نے تو کتاب

الْكِتٰبَ بِالْحَـقِّ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ

کو (بالکل) ٹھیک ٹھیک اُتارا تھا اور بیشک جو لوگ کتاب کے بارے میں اختلاف ڈالا کرتے ہیں وہ (بڑی)

شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ١٧٦ ۧ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ قِبَلَ

دُور دراز کے خلاف میں پڑے ہوئے ہیں طاعت یہی نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف

ع ٢١ / ٩ / ٥

منزل ١

بھی قومیں جس ذوق و شوق سے یہ گندہ گوشت، تازہ اور خشک دونوں صورتوں میں کھایا کرتی ہیں، اور اُس کی چربی سے جو طرح طرح کے کام لیتی رہتی ہیں، بلکہ اس کی نسل کی پرورش کا انتظام جس بڑے پیمانہ پر جابجا کئے ہوئے ہیں، اُسے دیکھ کر تو قیاس یہی ہوتا ہے کہ کراہت کیسی، عجب نہیں کہ کچھ فضائل اس جانور کے مسیحیت میں وارد ہوئے ہوں! حالانکہ اس کی حُرمت اور نجاست دونوں، صراحت کے ساتھ بائبل میں موجود ہیں۔ "اور سؤر کہ کُھر اس کا دو حصہ ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرا ہے، پر وہ جگالی نہیں کرتا وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے" (احبار ١١: ٧) "اور سؤر بھی کہ اس کے کُھر چرے ہوئے ہیں، یہ جگالی نہیں کرتا، اور یہی تمہارے لئے ناپاک ہے۔ تم اس کا گوشت نہ کھائیو، نہ اُس کی لاش کو ہاتھ لگائیو" (استثناء ١٤: ٨) وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ اہلال کے اصلی معنی آواز بلند کرنے، پکار کر دینے، شہرت دے دینے کے ہیں۔ هو رفع الصوت يقال اهلّ بكذا اي رفع صوته (راغب) الاهلال رفع الصوت (قرطبی) مراد یہ ہے کہ جس جانور کو بطریق تعظیم و عبادت یا بقصد تقرب کسی مخلوق کے لئے نامزد کر دیا جائے، اور نیت کسی مخلوق کی نذر و نیاز یا بھینٹ کی کر لی جائے، وہ حرام ہو جاتا ہے، خواہ اس کے ذبح کے وقت بسم اللہ بھی کیوں نہ پڑھ لی جائے۔ شیخ سدو کے نام کے بکرے اور اس قبیل کی تمام چیزیں اسی حکم کے تحت میں آجاتی ہیں۔ ولا خلاف بين المسلمين ان المراد به الذبيحة اذا اهل بها لغير الله عند الذبح (جصاص) "در حدیث صحیح وارد است کہ ملعون من ذبح لغير الله یعنی ہر کہ بہ ذبح جانور تقرب غیر خدا نماید ملعون است خواہ در وقت ذبح نام خدا گیرد و زیرا کہ چوں شہرت داد کہ ایں جانور برائے فلانے ست ذکر نام خدا وقت ذبح فائدہ نکرد" (تفسیر فتح العزیز) جس جانور کو غیر اللہ کے نامزد اس نیت سے کیا ہو کہ وہ ہم سے خوش ہوں گے اور ہماری کارروائی کرائیں گے، جیسا کہ اکثر عام جاہلوں کی عادت ہوتی ہے کہ اس نیت سے بکرا، مرغا وغیرہ مقرر کر دیتے ہیں، وہ حرام ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ذبح کے وقت اُس پر اللہ کا نام لیا ہو۔ البتہ اگر اس طرح نامزد کرنے کے بعد اس سے توبہ کرے پھر حلال ہو جاتا ہے" (تھانوی) بعض فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی حاکم یا سردار کے آنے پر بطور بھینٹ کے ذبح کرے گا، تو بھی وہ حرام ہو جائے گا۔ اگرچہ اُس پر اللہ کا نام لے لیا ہو۔ ذبح لقدوم الامير ونحوه كواحد من العظماء يحرم لانه اهل به لغير الله ولو ذكر اسم الله تعالى (درمختار) بلکہ فقہاء نے تو یہ بھی کہا ہے کہ کوئی مسلمان اگر جانور کو تقرب غیر اللہ کے قصد سے ذبح کرے گا، تو مرتد ہو جائے گا، اور اُس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ سمجھا جائے گا۔ قال العلماء لو ان مسلما ذبح ذبيحة وقصد بذبحها التقرب الى غير الله صار مرتدا وذبيحته ذبيحة مرتد (کبیر) ٦١٦ یعنی مجبور ہو کر حرام غذا کے استعمال پر۔ اي فمن اضطر الى شيء من هذه المحرمات اي الجئ اليه (قرطبی) اِضطرار اضطراً ضرورت سے مشتق ہے، اور اس کے باب افتعال سے۔ مطلب یہ ہے کہ شدید ضرورت کے وقت ان حرام غذاؤں کو بھی بہ قدر کفایت کھایا جا سکتا ہے۔ شدید ضرورت کی صورتیں دو ہو سکتی ہیں۔ (١) یہ کہ بھوک کی شدت سے معلوم ہوتا ہو کہ دم نکلا جا رہا ہے۔ اور حلال غذا سرے سے دستیاب ہی نہیں ہو رہی ہے، یا افلاس کی بنا پر اس تک دسترس نہ ہو، اور یا پھر کسی مرض کی بنا پر وہ حلال غذا نا قابل استعمال ہو۔ (٢) یہ کہ کوئی حاکم اُس حرام غذا کے استعمال پر مجبور کر رہا ہو۔ وهذه الضرورة لها سببان احدهما الجوع الشديد الثاني اذا اكرهه على تناول ذلك مكره كبير كالاضطرار لا يخلوان يكون باكراه من ظالم او بجوع في مخمصة والذي عليه الجمهور من الفقهاء والعلماء في معنى الآية هو من صيره العدم والغرث وهو الجوع الى ذلك (قرطبی) ٦١٧ ان حرام چیزوں کے کھا لینے میں، بلکہ اکثر تو ایسے موقع پر نہ کھانا گناہ ہے۔ بل ربما اثم بتركه التناول (روح) اس لئے کہ حفظ نفس تو اولین فرائض میں سے ہے، اور ایسے موقع پر غذا نہ کھانا خود کشی کے مترادف ہے، جو حرام خوری سے شدید تر ہے۔ ولا خلاف انه لا يجوز له قتل نفسه بالامساك عن الاكل الذي امره به على وجه الوجوب (قرطبی) او ترك الاكل تلف نفسه بذلك اكبر المعاصي (قرطبی) وقال الطبري ليس الاكل عند الضرورة رخصة بل ذلك عزيمة واجبة ولو امتنع من الاكل كان عاصيا ... الميتة فلم يأكل حتى مات دخل النار الا ان يعفو الله عنه وترك الاكل ... ما ابيح الله له (جصاص) ٦١٨ یعنی اس کی نیت اور ارادہ نافرمانی اور قانون شکنی کا نہ ہو، اور وہ محض طالب لذت نہ ہو۔ ضرورت واقعی ہو، یہ ہرگز نہ ہو کہ کسی شخص کے دل میں قانون الٰہی کا احترام ہی ہلکا ہو یا وہ حرام چیزوں سے لذت ہی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ باغ کے معنی دو ہو سکتے ہیں۔ ایک، دوسرے پر ظلم کرنے والا، دوسرے طالب لذت۔ وَّلَا عَادٍ ۔ اور نہ حدود شرعی سے تجاوز کرنے والا۔ یعنی مقدار میں بھی بس محض بقدر ضرورت کھائے، یہ نہ ہو کہ خوب سیر ہو کر کھانے لگے۔ قال الشافعي وابو حنيفة واصحابه لا يأكل المضطر من الميتة الا قدر ما يمسك رمقه (کبیر) ٦١٩ غَفُوْرٌ ۔ ایسا مغفرت والا کہ بعض حالات میں جرائم پر بھی مواخذہ نہیں کرتا بلکہ انہیں جرائم باقی بھی نہیں رہنے دیتا۔ رَّحِيْمٌ ۔ ایسا شفقت والا کہ تنگی کے موقعوں پر آسانی بہم پہنچا دیتا ہے ٦٢٠ یہود کی جانب اشارہ ہے جو اپنے ہاں کی اصل آسمانی تعلیمات کو چھپاتے تھے، اور اس اخفاء و کتمان سے ان کا مقصود کچھ نفع دنیوی حاصل کرنا ہوتا تھا۔ ثَـمَنًا قَلِيْلًا سے یہ مراد نہیں کہ زیادہ قیمت اور بڑے معاوضہ پر دین فروشی جائز ہے۔ مراد اس سے محض دنیوی معاوضہ ہے۔ اور دنیوی معاوضہ نفع آخرت کے مقابلہ میں ہمیشہ قلیل ہی ہوگا ٦٢١ یہود کا جرم اخفائے حق اور کتمان وحی آسمانی اُن کی معصیت اکل حرام سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے اس جرم کی سزا بھی اس سے سخت تر مذکور ہوئی ٦٢٢ (بطریق لطف و ملاطفت) جو خطاب بطریق عتاب ہوگا، وہ ظاہر ہے کہ اس سے مستثنٰی ہے۔ قیامت کے دن اللہ کی اپنے بندوں سے گفتگو ان کی انتہائی خوش قسمتی ہوگی۔ اور اس سے محرومی ان کی انتہائی بدنصیبی ٦٢٣ گناہوں سے۔ برزخ کے بعد حشر میں بھی جو لوگ اپنے ایمان اور دوسری نیکیوں کی بنا پر اپنے گناہوں سے دُھلا دھلایا اور اپنے کو گرفت سے پاک پائیں گے، وہ بھی گویا بڑے سستے چھوٹ جائیں گے۔ بڑی اور اصلی مصیبت اُن کی ہے، جن میں قیامت کے دن بھی کوئی شائبہ ایمان نہ پایا جائے گا ٦٢٤ (کہ اس کے لئے تیار ہو گئے، اور یہاں دُنیا میں ایمان و طاعت پر آمادہ نہ ہوئے) اما کلام تعجب ہے کہ اپنی ان حرکتوں کے ہولناک ثمرے اور دہشتناک نتیجے معلوم ہیں، اس پر بھی یہ شوخ چشمی! مذهب الجمهور منهم الحسن ومجاهد ان معناه التعجب (قرطبی) اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۔ اس کا تعلق اسی دُنیا سے ہے۔ یعنی ہدایت کے بدلے گمراہی کو لے لیا اسی دُنیا میں۔ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۔ اس کا تعلق عالم آخرت سے ہے۔ یعنی لازمی نتیجہ عدم ایمان کا یہ ہوگا کہ آخرت میں مغفرت کے

بجائے عذاب کے دوچار ہونا پڑے گا۔ ۶۲۴ (اور نا ہنجار بندوں نے اُس میں خواہ مخواہ خبط و تلبیس کر دیا) الْكِتٰبَ۔ یہاں بطور اسم جنس استعمال ہوا ہے۔ مراد ہیں تمام کتب آسمانی۔ بِالْحَقِّ۔ یعنی بالکل صحیح یا دلائل و شواہد کے ساتھ۔ اے بالصدق وقیل بالحجۃ (قرطبی) ذٰلِكَ یہ اشارہ عذاب کی طرف ہے۔ اے ذلك العذاب (بیضاوی) ۶۲۵ (اور اس کے نتائج بھگت کر رہیں گے) اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ۔ یعنی خواہ مخواہ، اور اپنے اغراض کے لئے اپنی کتاب آسمانی میں جھگڑے نکال کھڑے کئے۔ ورنہ تعلیمات الٰہی میں کمال وضوح کی بنا پر اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ۔ یعنی بھٹک کر حق و صداقت سے بہت ہی دور جا پڑے ہیں۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ غفلت اُن میں اس سے پیدا ہو گئی ہے کہ اللہ کے سچے کلام میں اُنھوں نے از راہ نفسانیت خواہ مخواہ اختلاف کیا اور اس لئے اور زیادہ بھٹک گئے۔ ۶۲۶ (جیسا کہ گمراہ و مشرک قومیں سمجھ رہی ہیں) قرآن مجید کے متعدد مقامات کی طرح یہ آیت بھی اصلاً گمراہ و مشرک قوموں کے رد میں ہے اور اس کا مفہوم پوری طرح جبھی روشن ہوگا، جب اُن کے عقائدِ باطل کو پیش نظر رکھا جائے۔ الْبِرَّ۔ بر کے معنی لغت عربی میں بہت وسیع ہیں، نیکی کے جملہ اقسام پر شامل ہے۔ اردو میں اس کا صحیح مفہوم لفظ طاعت ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ البر التوسع فی فعل الخیر فی اللہ تعالٰی الثواب فی العبد الطاعۃ (راغب) البر الطاعۃ (زجاج) قال بعضھم البر الخیر قال لا اعلم تفسیرا اجمع منہ لانہ یحیط بجمیع ما قالوہ (البحر) اہل لغت ہی کو نہیں اہل تفسیر کو بھی بر کے مفہوم کی بھی وسعت مسلم ہے۔ البر اسم جامع للطاعات واعمال الخیر المقربۃ الی اللہ تعالٰی (کبیر) اسم عام لجمیع ما یوجر علیہ الانسان (کبیر) اسم جامع لانواع الخیر والطاعات المقربۃ الی اللہ تعالٰی (روح) البر کل فعل مرضی (بیضاوی) ۶۲۷ (حالت نماز میں یا عبادت کے وقت) ظہور اسلام سے قبل دنیا کی بے شمار گمراہیوں میں سے ایک اہم گمراہی سمت پرستی تھی۔ یعنی بے جان دیوتاؤں، دیویوں، مورتیوں، پتھروں، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں کے علاوہ خود سمتوں یا جہتوں کی بھی پرستش جاری ہو گئی تھی اور مختلف جاہلی قوموں نے یہ اعتقاد جما لیا تھا کہ فلاں مخصوص سمت، مثلاً مشرق، مقدس ہے، اور فلاں متعین جہت مثلاً مغرب قابل پرستش ہے۔ قرآن مجید یہاں شرک کی اسی صورت خاص کی تردید کر رہا ہے،

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

پھیر لیا کرو ۶۲۷ بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن اور

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى

فرشتوں اور کتاب اور پیمبروں پر ایمان لائے ۶۲۸ اور اس کی محبت میں مال

حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ

صرف کرے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور

وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى

سائلوں پر ۶۲۹ اور گردنوں کے آزاد کر دینے میں ۶۳۰ اور نماز کی پابندی کرتے اور زکوٰۃ

الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ

ادا کرتے ۶۳۱ اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وعدہ کر چکے ہوں،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ

اور تنگی میں اور بیماری میں، اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ۶۳۲

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۱۷۷

یہی لوگ ہیں جو سچے اُترے، اور یہی لوگ تو متقی ہیں ۶۳۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ

اے ایمان والو، تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے ۶۳۴

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ

آزاد کے بدلہ میں آزاد، اور غلام کے بدلہ میں غلام، اور عورت کے بدلہ میں عورت ۶۳۵ ہاں جس کسی کو

منزل ۱

اور ارشاد کر رہا ہے کہ کسی جہت میں کیا تقدس رکھا ہوا ہے، اور کوئی سمت، بہ حیثیت سمت ہرگز قابل تقدیس نہیں۔ طاعت (البر) سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ ہمارے حضرات مفسرین کو اس آیت میں جو اشکال نظر آیا، وہ محض اسلئے کہ اُن کی نظر مذاہب غیر کی اس گمراہی پر نہ تھی۔ اسلام نے ظاہر ہے کہ نماز کے لئے کوئی سمت، بہ حیثیت سمت ہرگز متعین نہیں کی ہے، اُس نے نہ صرف ایک متعین مکان یعنی خانۂ کعبہ کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے اور اُسے قبلۂ توجہ ٹھیرا لیا ہے خواہ وہ کسی سمت میں پڑ جائے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ کعبہ مصر و طرابلس و حبشہ سے مشرق میں پڑتا ہے، ہندوستان، افغانستان اور چین سے مغرب میں، شام و فلسطین و مدینے سے جنوب میں، اور یمن اور بحر قلزم کے جنوبی ساحلوں سے شمال میں، اور بہت سے مقامات سے ان مختلف سمتوں کے مختلف گوشوں میں۔ الْمَشْرِقِ۔ سورج دیوتا دنیائے شرک کا معبود اعظم رہا ہے۔ مشرک قوموں نے اس کی پرستش بڑی کثرت سے کی ہے۔ اور یہ چونکہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے، اس لئے عموماً جاہلی قوموں نے مشرق کو بھی مقدس سمجھ لیا، اور عبادت کے لئے مشرق رُخی اختیار کر لی۔ حضرت مسیحؑ کے چند ہی سال بعد جب مسیحیوں میں ایک شخص پولس نامی آگھسا (جسے ایک دنیا آج سینٹ پال کے نام سے یاد کرتی ہے) اور اُس نے مسیحیت کا رُخ بجائے تجدید موسویت کے ایک مستقل تثلیثی شرک کی طرف پھیر دیا۔ رومی اُس وقت حاکم قوم تھی۔ اور جیسے آج ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں "انگریزیت" اور "صاحبیت" کا بول بالا ہے، اُس وقت بھی محکوموں کے دلوں میں رومی مشرکوں ہی کے علوم و فنون، تہذیب و معاشرت، دین و عقائد کا تسلط چھایا ہوا تھا۔ اور رومی مذہب کا ایک جزو آفتاب پرستی بھی تھا۔ پولوسی مسیحیوں نے جہاں اور بہت سے مشرکانہ مراسم رومیوں سے دھڑا دھڑ اخذ کر لئے، وہیں مشرق پرستی کو بھی ان سے لے لیا، اور عبادت مشرق کی طرف رُخ کر کے کرنے لگے چنانچہ مسیحیوں کے گرجے آج تک مشرق رویہ چلے آتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس مشرق رُخی پر زبردست ضرب لگائی۔ اور بتا دیا کہ یہ سمت دار تقدس تو کسی درجہ میں بھی طاعت یا عبادت نہیں، بلکہ طاعتیں وہ ہیں جن کی تفصیل یہی آیت آگے کر رہی ہے۔ وَالْمَغْرِبِ۔ مشرق پرستی سے تو بہرحال کم اور بہت کم، لیکن پھر بھی بہت کچھ عام اور وسیع وبا مغرب پرستی کی بھی شرک کی دنیا میں رہ چکی ہے۔ آفتاب کے طلوع و غروب پر قیاس کر کے مشرک ذہنیت نے یہ نتیجہ نکالا کہ مصدر حیات جس طرح سمت مشرق ہے، اسی طرح مستقر موت و اجل سمت مغرب ہے، اور یہ بھی مستحق تعظیم و تقدیس ہے۔ نیز ملاحظہ ہوں حواشی نمبر ۵۱۴ و ۵۰۳ پ ۱۔ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ یہ دو نام صراحت کے ساتھ صرف مثال کے طور پر لے لئے گئے۔ مقصود تمام سمتوں کی تعمیم ہے، انہی دو سمتوں کی تحدید یا تخصیص نہیں۔ والمراد من ذکر المشرق والمغرب التعمیم لا تعیین الجہتین (روح) ۶۲۸ مشرکانہ ذہنیت کی تردید کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اصلی طاعت یہ ہے جس کا بیان اب ہو رہا ہے، آیت کے اس جزو میں عقائد کی تصحیح آگئی۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ۔ تقدیر کلام یوں ہے۔ ولکن البر بر من۔ طاعت تو اُس کی ہے، جو اللہ پر ایمان لایا الخ والتقدیر لکن البر بر من (قرطبی) فحذف المضاف وھو کثیر فی الکلام وھذا اختیار الفراء والزجاج (قرطبی، کبیر) اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ اس میں دہریت و الحاد کی جلی و خفی ہر صورت کی تردید آگئی۔ ایمان و طاعت میں داخلہ کا یہی دروازہ ہے، کوئی ایسا نظام یا مسلک (خواہ اس کی بنیادیں نقلی ہوں یا اخلاقی یا معاشی یا سیاسی) جس میں اللہ کی ذات و صفات پر ایمان کامل داخل نہ ہو طاعت سے کوئی علاقہ بھی نہیں رکھتا۔ مادیت و عقلیت (ریشنلزم)، لا ادریت (ایگناسٹی سزم)، بالشویت وغیرہ سب اسی حکم کے تحت میں آجاتی ہیں۔ اور بودھ مذہب اور جین مت بھی، اگر ان کی بابت یہ بیان صحیح ہے کہ اُن میں توحید باری موجود نہیں۔ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اس میں تردید اُن تمام گمراہ قوموں کی آگئی جو وجود باری کی تو قائل تھیں، لیکن اس عقیدہ سے خالی ہیں کہ ایک عالم آخرت بھی ہے، جہاں ایک روز جزائے اعمال کا سامنا کرنا اور زندگی کے ایک ایک معاملہ کا حساب دینا ہے۔ اور قوم یہود نے اپنی زبردست توحید کے باوجود، عالم آخرت سے اپنا تعلق نہایت درجہ ضعیف کر رکھا تھا۔ جزا و سزا اسی دنیا میں سمجھ، خواہ قومی و اجتماعی عروج و زوال سے، خواہ بہ قاعدہ تناسخ مختلف قالبوں میں روح کے الٹ پھیر سے، یہ سب انکار آخرت ہی کی شکلیں ہیں۔ وَالْمَلٰٓئِكَةِ۔ فرشتوں پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اُن نورانی اور مجرد مخلوقات کا وجود اللہ کے بندوں اور کارساز مطلق کے قاصدوں، خادموں اور کارندوں کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے، نہ یہ کہ خود انھی کو مستقل قوتوں کی طرح فاعل، عامل، متصرف مان کر ان سے دعائیں مانگی جائیں، اور انھی کو ایک چھوٹے پیمانہ پر حاجت روا قرار دے لیا جائے۔ اس ایمان بالملائکہ سے یونان و روم، ہندوستان، ایران کی ان تمام مشرک قوموں کی تردید ہو گئی، جنھوں نے فرشتوں ہی کے تخیل کو مسخ کر کے کائنات کے مختلف شعبوں کے لئے دیویاں اور دیوتے تجویز کر لئے ہیں۔ وَالْكِتٰبِ۔ کتاب یہاں بطور اسم جنس آیا ہے اس کا اطلاق صحیفۂ آسمانی کے نفس تخیل پر ہوگا۔ کتاب آسمانی کا عقیدہ بھی ایک تمام تر اسلامی عقیدہ ہے۔ مشرک قومیں تو خیر اس تخیل ہی سے نا آشنا ہیں کہ اللہ کے ہاں سے کوئی کتاب کسی بندہ پر نازل ہوتی ہے۔ اہل کتاب تک اب اسلامی اصطلاح کے مطابق کسی "کتاب الٰہی" کے قائل نہیں۔ اُن کے ہاں "کتاب" کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ خدا نے ہدایت کے لئے بعض اشخاص کو چن لیا، اور اُن کے قلوب میں کچھ مضامین بطور الہام القا کر دیئے۔ اور ایسا الہام ہر عارف کو ہو سکتا ہے، نبوت اس کی کوئی لازمی شرط نہیں۔ پھر بعد کو ان بزرگوں اور عارفوں نے انھی مضامین و معانی کو اپنے لفظ و عبارت میں مرتب کر کے اپنے شاگردوں اور مریدوں کو سنا دیا، پھر اُن سامعین نے انھیں اپنے طور پر لکھ لکھا لیا۔ (بجز توریت کی ابتدائی پانچ سورتوں کے کہ وہ یہودی عقیدہ کے مطابق خود حضرت موسیٰؑ کی نوشتہ ہیں) ——— گویا ان الہامی کتابوں کی حیثیت کل وہ ہے جو ہمارے ہاں بزرگوں کے جمع کئے ہوئے ملفوظات کی ہوتی ہے! کہاں یہ تخیل، اور کہاں مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف تک وحی شدہ ہے، جس میں غلط اور خطا کا امکان ہی نہیں! اور مسیحی تو جب حضرت مسیحؑ کی رسالت و نبوت ہی کے سرے سے قائل نہیں بلکہ ان کی الوہیت کے مدعی ہیں تو حضرتؑ کا صاحب کتاب رسول ہونا اُن کے ہاں کوئی معنی ہی نہیں رکھتا ——— کوئی آپ اپنے اوپر بھی بھلا کتاب نازل کیا کرتا ہے؟ وَالنَّبِيّٖنَ۔ یعنی عقیدہ یہ ہو کہ اللہ انسانوں کو پیمبر بنا کر بھیجتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ خود حق تعالیٰ مجسم ہو کر اس دنیا میں آ جاتا ہے، یا کسی قالب میں حلول کر آتا ہے۔ اسی عقیدہ میں صاف تردید ہو گئی اوتار پرستی کی مظہر پرستی کی، حلول کی، تجسم باری تعالیٰ کی۔ "اوتار" ٹھیک ضد اور مقابل ہے "پیمبر" کے۔ اوتار کا مفہوم یہ ہے کہ خالق کائنات خود کوئی مادی پیکر اختیار کر کے دنیا میں آ جاتا ہے اور یہ بھی ضرور نہیں کہ وہ قالب انسان ہی کا ہو۔ شیو جی یا بشن جی جس طرح رام چندر جی بن کر یا سری کرشن بن کر آ سکتے ہیں، اسی طرح سانپ بن کر، شیر بن کر، مچھلی یا کچھوے کا

قالب اختیار کر کے بھی آسکتے ہیں۔ غرض یہ کہ اوتار، معنی وحقیقت کے اعتبار سے خدا ہوتا ہے، اور صورت اور ظاہر کے اعتبار سے انسان یا جانور۔ پیمبر اسکے برعکس صرف بشر ہوتا ہے اور ہمیشہ بشر ہی۔ نہ کبھی فوق البشر، نہ کبھی تحت البشر، اور بجز اسکے کہ صاحبِ وحی ہوتا ہے، اور
اس لئے اخلاق کی پاکیزگی میں بے نظیر، اور جرم وعصیان سے پاک، اور کسی حیثیت سے، شکل وصورت میں، چلنے پھرنے میں، بولنے چالنے میں، بھوک پیاس میں، غم وغصہ میں صفاتِ بشری سے ممتاز نہیں ہوتا۔ آیت کے اس جزء میں قرآن مجید نے اپنی معجزانہ
بلاغت وایجاز سے تمام اعتقادی گمراہیوں کی جڑ کاٹ دی، اور سارے مذاہب باطلہ کی تردید کر دی۔ اعتقادی گمراہی جب کبھی بھی انسانوں کو گھیرے گی، ہمیشہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب اور ایمان بالانبیاء ہی کی کسی نہ کسی
غلطی یا غلط فہمی کی راہ سے آئے گی ۶۲۹ عقائد کی تصحیح ہو چکی، تو اب اعمال کی تصحیح شروع ہوئی اور اعمال میں بھی ابتداء شعبۂ معاملات سے ہوئی۔ آیت کے اسی جزء میں اس کا بیان ہے۔ علیٰ حبّہٖ۔ اسکی بحث ہے، ضمیر اللہ کی طرف ہے۔ اس کی محبت سے مراد اللہ تعالیٰ
کی محبت ہے۔ یعنی یعطون المال علی حب اللہ اے علیٰ طلب مرضاۃ اللہ (کبیر) قیل علیٰ حبّ اللہ (کشاف) وقیل الضمیر للہ تعالیٰ (بیضاوی) گویا یہ بتا دیا کہ صرف مال فی نفسہٖ ہرگز محمود ومطلوب نہیں، مطلوب ومقصود صرف وہ صرفِ مال ہے، جو اللہ کی راہ میں، اللہ کی رضا جوئی کے لئے
اللہ کے دین کے فروغ کے لئے ہو۔ دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ صرفِ مال، مال کی محبت کے باوجود ہو۔ یعنی ضمیر غائب کا مرجع بجائے اللہ کے، لفظ قریب مال کو قرار دیا گیا ہے۔ وھو قول الاکثرین انہ راجع الی المال (کبیر) اے مع حب المال والشح بہ کما قال ابن مسعود (کشاف) اس میں
بھی ایک پختہ مومن کی تصویر آگئی ہے۔ مال وزر کی محبت ہر قدر اسکے دل میں ہے، خواہشیں اس کی زندہ ہیں، اپنی ذات پر، اپنے محبوبات ومرغوبات پر وہ خرچ کرنا چاہتا ہے، لیکن امرالٰہی کے آگے اپنی گردن جھکا دیتا ہے، اپنی خواہشوں کو دبا دیتا ہے۔ اپنے شوق کو حکم خداوندی
پر قربان کر دیتا ہے۔ وہ عمل اسی پر کرے گا، جو حکم ربانی ہے۔ اور خرچ وہیں کرے گا، جہاں شریعت حکم دیتی ہے۔ ذَوِی الْقُرْبٰی ۶۳۰ مصارفِ خیر کی اسلام نے کتنی مناسب اور حکیمانہ ترتیب قرار دے دی ہے۔ آیت کے اس جزء میں امت کا پورا نظام معاشی ایک خلاصہ کی شکل میں
آگیا ہے۔ مالی اعانت سب سے پہلے اپنے عزیزوں قریبوں کی کرنا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ بھائی کی کوٹھیاں تیار ہو رہی ہیں اور بہن جھونپڑے کو ترس رہی ہو۔ چچا کے پاس موٹریں ہوں، اور بھتیجے کو لڑکے کے پیسے بھی میسر نہ ہوں۔ ہر زردار کو سب سے پہلے خبرگیری اپنے اور عزیزوں، کنبہ والوں
بھائیوں، بہنوں، بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے قریبیوں کی کرنا چاہئے۔ اسکے بعد نمبر محلہ کے، بستی کے، شہر کے یتیم بچوں، بچیوں کا آتا ہے، جن کا کوئی والی، وارث، سرپرست باقی نہیں رہا ہے۔ اسکے بعد درجہ بدرجہ نمبر امت کے عام مفلسوں محتاجوں، اور پھر اُن مسافروں وغیرہ
کا آتا ہے جو زادِ راہ سے محروم ہیں۔ اور اس لئے اپنے ضروری سفروں سے محروم رہے جاتے ہیں۔ یا بستی میں کہیں باہر سے وارد ہو گئے ہیں، اور کوئی اُن کے ٹھیرانے، کھلانے پلانے کا روادار نہیں ہو رہا ہے۔ اور پھر آخر میں اہل حاجت سوالی رہ جاتے ہیں۔ اس پورے معاشی پروگرام
پر اگر قاعدہ سے عمل ہونے لگے، تو امت میں کہیں مفلسی، تنگدستی، بے معاشی، بے روزگاری کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟ ۶۳۱ (قیدیوں اور غلاموں کی) فِی الرِّقَابِ۔ رقاب، رقبۃ کی جمع ہے۔ لفظی معنی گردن کے ہیں۔ محاورہ میں اس سے مراد وہ ہوتے ہیں جن کی گردنیں آزاد نہیں،
یا جو بندھے ہوئے ہیں۔ یعنی غلام جو دوسروں کی رعایا ہیں۔ یا قیدی، جو کسی جرم فوجداری یا دیوانی کی علت میں گرفتار ہو کر محبوس ہیں۔ الرقبۃ جعل فی التعارف اسمًا للمملوک کما عبر بالرأس والظھر عن المرکوب (راغب) الرقبۃ مجاز عن الشخص (روح) تقدیر کلام یوں ہے۔ فی تخلیص الرقاب۔ ای فی
فک الرقاب۔ گویا مضاف محذوف ہے۔ اور یہ ترکیب قرآن مجید میں عام ہے۔ مراد وہی زرِ معاوضہ دے کر قیدیوں کو قید سے اور غلاموں کو غلامی سے آزادی دلانا ہے۔ یعنی المکاتبین قالہ اکثر المفسرین (معالم) وقیل فداء الاساری (معالم) وھم المکاتبون یعطون لیؤدوا فی تخلیص ابدانھم
المکاتبین او فک الاساری (بیضاوی) اے فی تخلیص الرقاب بمعاونۃ المکاتبین (روح) مصارف خیر واعانت کی ایک ضروری مد رہ جاتی تھی۔ قرآن مجید نے آخر میں اُس کا بھی اضافہ کر دیا۔ اور اب یہ فہرست امت کے اجتماعی نقطۂ نظر سے ہر طرح مکمل ہو گئی ۶۳۲ تصحیح عقائد کی ہو چکی، تصحیح
معاملات کی ہو چکی، اب نمبر عبادات کا آتا ہے۔ عبادات بے شمار ہیں، بنیادی اور بڑی تقسیم عبادت بدنی اور عبادت مالی کی ہے۔ یہاں الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ لا کر دونوں کی جنس کی طرف اشارہ کر دیا۔ نماز ساری بدنی عبادتوں کی قائم مقام ہو گئی، زکوٰۃ ساری مالی عبادتوں کی۔ اقام
الصلوٰۃ۔ یعنی نمازیں وقت مقرر پر، شرائط وقواعد معلوم کے ساتھ ادا کرتے رہتے ہیں۔ اٰتی الزکوٰۃ۔ یعنی زکوٰۃ حسب آداب وشرائط شریعت باقاعدہ ادا کرتے رہتے ہیں ۶۳۳ عقائد ہو چکے، معاملات ہو چکے، عبادتیں ہو چکیں، اب ذکر اخلاق کا شروع ہوا۔ الموفون بعھدھم۔ فقرہ
ہر قسم کے معاہدات کا جامع ہے۔ خواہ وہ معاہدہ بندہ کا اپنے خالق کے ساتھ ہو، یا معاہدہ بندوں کا بندوں کے درمیان ہو۔ مومن جھوٹا وعدہ کرنا یا جھوٹا عہد لینا جانتا ہی نہیں۔ اے فی ما بینھم وبین اللہ تعالیٰ وفی ما بینھم وبین الناس (قرطبی) البأسآء۔ مصیبت اور تنگدستی
ہیں۔ بأسآء کا اصل تعلق مالی پریشانیوں سے ہے۔ اے الشدۃ والفقر (قرطبی) البأسآء فی الاموال کالفقر (بیضاوی عن الازہری) الضرآء۔ بیماری کی تکلیفیں ہیں۔ ضرآء کا اصل تعلق جسمانی آزار سے ہے۔ اے المرض والزمانۃ (قرطبی) الضرآء فی الانفس کالمرض (بیضاوی عن الازہری)
حِیْنَ الْبَاْسِ۔ یعنی جنگ کے وقت دشمنانِ دین کے مقابلہ میں۔ اے وقت مجاھدۃ العدو (بیضاوی) اے وقت الحروب (قرطبی) ثبات وصبر کے ظاہر کرنے اور جوہر سیرت ومردانگی کی چمک دکھانے کے یہی تین خاص موقع ایک مومن کے لئے ہوتے ہیں ۶۳۴
یعنی کمالاتِ حقیقی کے ساتھ موصوف۔ اور طاعت و پرہیزگاری (بر وتقویٰ) میں پورے اترنے والوں کی علامتیں یہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکیں۔ اس معیار سے جس کو چاہو، جانچ لو، پرکھ لو۔ اے صدقوا فی الدین واتباع الحق وطلب البر (بیضاوی) قرآن مجید کی
ہر آیت بجائے خود معظم، محترم، واجب العمل ہے۔ لیکن اس آیت کے باب میں تو حدیث نبوی میں یہاں تک صراحت موجود ہے، کہ من عمل بھذہ الاٰیۃ فقد استکمل الایمان (جس نے اس آیت پر عمل کر لیا، اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا) اور محققین کا قول نقل ہوا
ہے، کہ یہ آیت اہم ترین آیتوں میں سے ہے اور اسکے اندر دین وشریعت کے سوا احکام آگئے ہیں۔ قال علماءنا ھذہ اٰیۃ عظیمۃ من امھات الاحکام لانھا تضمنت ست عشرۃ قاعدۃ الایمان باللہ وباسمائہ وصفاتہ والنشر والحشر والمیزان والصراط والحوض والشفاعۃ
والجنۃ والنار والملٰئکۃ والکتب المنزلۃ وانھا حق من عند اللہ والنبیین وانفاق المال فی ما یعن من الواجب والمندوب وایصال القرابۃ وترک قطعھم وتفقد الیتیم وعدم اھمالہ والمساکین کذلک ومراعاۃ ابن السبیل والسوال وفک الرقاب (قرطبی)
اور بعض صوفیوں نے آیت کے اجزاء کی جامعیت پر نظر کر کے کہا ہے کہ آیت اصل مدار ہے شریعت وطریقت کی۔ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن کے لئے کافی نہ صرف باطنی اعتقاد ہے اور نہ صرف ظاہری، بلکہ دل میں ایمان ہونا بھی لازمی ہے اور ظاہر میں
احکام کی اطاعت بھی۔ اور خیر یہ باتیں تو سب اپنوں کی تھیں۔ فرنگیوں میں سے ایک ذات شریف پادری وہیری (Wherry) نامی ہوئے ہیں۔ مسلمانوں اور اسلام کے بڑے عنایت فرما۔ سن سفید داڑھی کے بال اسلام کی عداوت ہی میں سفید کئے۔ سیل Sale
کے انگریزی ترجمۂ قرآن پر تفسیر کا اضافہ انہی کے قلم سے ہے۔ اس آیت پر پہونچ کر قدرت اُن کے قلم سے یوں لکھواتی ہے۔ "یہ آیت، قرآن کی بلند ترین آیتوں میں ہے ..... ذات باری پر ایمان، اور نوع انسانی کے ساتھ حسن سلوک۔ اس کو اس میں فصیح طریقہ
مذہب کا جوہر اصلی بتا دیا گیا ہے۔ اس میں لب لباب عقائد اور اعمال کا آگیا"۔ خیر یہی بہت غنیمت ہے کہ پادری صاحب کو کچھ تو آیتیں قرآن مجید میں "بلند" نظر آگئیں ۶۳۵ اس حال میں کہ جب تم اپنی حکومت رکھتے ہو، اور سزاؤں کے نفاذ پر باقاعدہ قدرت
رکھتے ہو۔ اسلام اپنے پیروؤں سے توقع دنیوی سربلندی ہی کی رکھتا ہے، اور اسے بطور ایک مسلّمہ کے فرض کئے رہتا ہے کہ امت دنیوی اقتدار کی بھی مالک ہو گی۔ مسلمانوں کا صدیوں تک مسلسل کافروں کے تسلط واقتدار میں رہنا اسلام کے مفروضات اولین میں گویا داخل
ہی نہیں۔ قانون فوجداری اور قانون دیوانی دونوں کی کثیر دفعات کا نفاذ نظامِ حکومت کے اسلامی ہونے پر معلق ہے یعنی امت کو ان قوانین الٰہی کی تنفیذ کی باقاعدہ قدرت بھی تو ہو۔ لاخلاف ان القصاص فی القتل لا یقیمہ الا اولوا الامر فرض علیھم النھوض بالقصاص واقامۃ
الحدود وغیر ذلک (قرطبی) اتفق ائمۃ الفتویٰ علی انہ لا یجوز لاحد ان یقتص من احد حقہ دون السلطان ولیس للناس ان یقتص بعضھم من بعض (قرطبی) قصاص۔ یا انتقام محض کا مرادف نہیں کہ ہر فرد دوسرے فرد سے از خود لینا شروع کر دے۔ بلکہ قانون فوجداری کے ماتحت سزا کی منظم،
مہذب ومنضبط ترین شکل کا نام ہے۔ امت کا ایک قانونی واجتماعی حق ہے۔ اس کے اجراء کی ذمہ داری حکومت یا اہل حل وعقد پر عائد ہوتی ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں مومنین سے خطاب اجتماعی حیثیت سے ہے، انفرادی حیثیت سے نہیں۔ قَتْلٰی۔ قتل عمد کی سزا یا
کے ہر قانون میں عموماً قتل ہی ہے۔ البتہ خود قتل عمد کی تعریف میں بہت کچھ اختلافات ہیں۔ شریعت اسلامی کی اصطلاح میں قتل عمد وہ ہے کہ کوئی کسی کو ارادہ کر کے کسی آہنی سلاح سے یا کسی اور حربہ سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے، قتل کرے۔ ھو العمد
ما تعمد ضربہ بسلاح او ما اجری مجری السلاح فی تفریق الاجزاء کالمحدد من الخشب والحجر (ہدایہ) اور فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ قصاص یعنی سزائے قتل اسی قتل کے ساتھ خاص ہے ۶۳۶ مراد یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ملحوظ رہے
گی، اور خون خون سب کا برابر سمجھا جائے گا۔ یہ نہیں کہ اونچے شخص کی جان کی قیمت معمولی شخص کی جان سے زیادہ سمجھی جائے۔ عرب جاہلی میں ایک دستور یہ بڑ گیا تھا کہ آزادوں میں سے کوئی اگر کسی غلام کو مار ڈالتا، تو قصاص میں جان اُس آزاد کی لینے کے بجائے کسی
غلام کی لی جاتی۔ دنیا کی تاریخ دوسرے ملکوں میں بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ اور امریکہ میں تو آج تک ایک گورے (White) کا خون ایک کالے (Negro) کے خون سے کہیں زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ اور فرنگی حکومتیں اپنے ایک ایک مقتول کے عوض
قاتل قوم کے کئی کئی شخصوں کی جانیں بے تکلف لیتی رہتی ہیں۔ یہاں پہونچ کر داد اُن فقہاء ومفسرین کی نکتہ سنجی کی دینا پڑتی ہے جنہوں نے آیت کی تفسیر میں صاف لکھ دیا ہے۔ اے المساواۃ ویمنعھم الزیادۃ۔ اسلام نے ان ظالمانہ دستوروں کو مٹایا،
اور اعلان کر دیا کہ زندگی ہر مومن کی، امت کے ہر فرد کی، یکساں قابل احترام ہے۔ اور مرد ہو، عورت ہو، آزاد ہو، غلام ہو، کوئی ہو، جس کا جو قاتل ہو گا، وہی سزا پائے گا۔ القصاص مجازۃ علی المساواۃ۔ والمعنی فرض علیکم اعتبار المماثلۃ والمساواۃ
بین القتلیٰ (مدارک) فقہ حنفی کے دو مسئلے اس سلسلہ میں قابل خیال رکھنے کے ہیں۔ (۱) مقتول اگر کافر ہے لیکن ذمی، تو اس کا بھی قصاص قاتل ہی سے لیا جائے گا، اگرچہ وہ مسلم ہو۔ ہاں کافر حربی چونکہ کھلا ہوا باغی اور دشمن ہوتا ہے، اسلامی "اسٹیٹ" کا
بھی، اور اسی لئے تو اُسے حربی کہا ہی جاتا ہے، سو اُس کے قتل میں ظاہر ہے کہ قصاص نہیں۔ (۲) دوسرے یہ کہ قتل عمد میں آزاد کے عوض میں تو آزاد قتل کیا ہی جائے گا۔ غلام کے عوض میں بھی آزاد قتل کیا جائے گا اگر وہ قاتل ہے اور عورت کے عوض میں عورت تو
ماری ہی جائے گی، لیکن مرد بھی قتل کیا جائے گا، اگر وہ قاتل ہے۔ آیت میں ایک پہلو ایسا بھی ہے جس سے معتزلہ کا رد نکل آیا۔ معتزلہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو خارج از ایمان سمجھتے ہیں حالانکہ آیت میں اکبر الکبائر یعنی قتل مسلم کا بیان ہے، اور قاتل کو دائرۂ اسلام
سے خارج نہیں کیا ہے، مسلمان ہی شمار کیا ہے۔ شریعت موسوی کی جو تصریحات اس باب میں درج ہیں وہ قابل ملاحظہ ہیں۔ "اور وہ جو انسان کو مار ڈالے گا وہ مار ڈالا جائے گا"۔ (احبار ۲۴: ۱۷) "اور جو انسان کو مار ڈالے، جان سے مارا
جائے"۔ (احبار ۲۴: ۲۱) "توڑنے کے بدلے توڑنا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت۔ جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے، اس سے ویسا ہی کیا جائے"۔ (احبار ۲۴: ۲۰)

عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ

اُس کے فریق مقابل کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے ۶۳۶ سو مطالبہ معقول (اور نرم) طریق پر کرنا

وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ

چاہئیے ۶۳۷ اور مطالبہ کو اُس (فریق) کے پاس خوبی سے پہنچا دینا چاہئیے ۶۳۸ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت

رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ

اور مہربانی ہے ۶۳۹ سو جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا اُس کے لئے

فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَ لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ

(آخرت میں) عذاب دردناک ہے ۶۴۰ اور تمہارے لئے اے اہلِ فہم (قانون) قصاص میں زندگی ہے

یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ

تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۶۴۱ تم پر فرض

عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ

کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی معلوم ہو، بشرطیکہ کچھ مال بھی چھوڑ

خَیْرَا ۖۚ الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ

رہا ہو، تو وہ والدین اور عزیزوں کے حق میں معقول طریقہ سے وصیت

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ

کر جائے یہ لازم ہے پرہیزگاروں پر ۶۴۲ پھر جو کوئی اُسے اُس کے

بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَی الَّذِیْنَ

سننے کے بعد بدل ڈالے، سو اُس کا گناہ بس اُنہی پر ہوگا جو

۶۳۶ فمن عفی لہٗ۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد قاتل یا قاتلین ہی ہو سکتے ہیں۔ یراد بھا القاتل ھذا قول ابن عباس و قتادۃ و مجاھد و جماعۃ من العلماء (قرطبی) من ھو قاتل معفو لہ (مدارک)۔ من اخیہ یعنی مقتول کے فریق کی طرف سے مُدعی یا مُستغیث کی طرف سے۔ لفظ اخیہ کی بلاغت و معنویت اس سیاق میں سر دُھننے کے قابل ہے، شدید ہیجانی جذبات انتقام و اشتعال پیری کا موقع قتل سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ اس انتہائی موقع پر بھی یہ لفظ لا کر بتا دیا کہ قاتل باوجود اتنے سنگین جرم کے کافر نہیں ہو جاتا، اخوتِ اسلامی کے دائرہ سے خارج نہیں ہو جاتا، مقتول کا ولی و وارث، قاتل کا دینی بھائی اس وقت بھی رہتا ہے۔ والمراد بالاخ ولی الدم (روح) سماہ اخا استعطافا بتذکیر اخوۃ البشریۃ والدین (روح) یعنی ولی الدم و ذکرہ بلفظ الاخوۃ الثابتۃ بینھما من الجنسیۃ والاسلام لیرق لہ و یعطف علیہ (بیضاوی) والاخ ولی المقتول و ذکر بلفظ الاخوۃ بعثا لہ علی العطف لما بینھما من الجنسیۃ والاسلام (مدارک)۔ شیء۔ لفظ اہم ہے یعنی سزائے واجب کا کچھ حصہ چھوڑ دیا جائے۔ نہ ہو کہ تمام تر معاف کر دیا جائے بلکہ یہ ہو کہ مقتول کے عزیز اور وارث اگر قاتل کو سزائے قتل نہ دینا چاہیں، بلکہ اُسے ہلکی کوئی سزا دے کر یا خونبہا کی پوری رقم میں سے کچھ حصہ اُسے معاف کر کے اُسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہوں۔ رُومیوں کی مشرک قوم میں قتل تمام تر ایک جرم قانون فوجداری کا تھا۔ قانون دیوانی سے اُسے کوئی علاقہ ہی نہ تھا۔ موجودہ فرنگی قانون چونکہ تمام تر رُومیوں ہی کے قانون (رومن لا) پر مبنی ہے۔ اسلئے اس میں بھی قتل محض ایک فوجداری کا جرم ہے۔ شریعتِ اسلامی کی نظر فطرتِ بشری کی گہرائیوں اور مصالحِ اجتماعی کی باریکیوں پر اس سے کہیں زائد ہے۔ اُس نے اپنے اصول قانون میں یہ بات رکھی کہ قتل جس طرح فوجداری کا جرم ہے، دیوانی کا بھی ہے، اس جرم سے محض (اسٹیٹ) حکومت اور سوسائٹی ہیئتِ اجتماعیہ ہی کے ایک قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، بلکہ یہ فرد پر بھی اُس کی شخصی حیثیت میں ایک حملہ ہے گویا یہ جرم ایک پبلک حیثیت رکھتا ہے اور ایک پرائیویٹ۔ اور جب اس کی یہ دوگونہ حیثیت ہے تو مقتول کے وارثوں یا خون کے مدعیوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو مجرم کو پوری سزا اسٹیٹ (حکومت) سے دلائیں، اور چاہیں تو خود مالی معاوضہ لے کر انتہائی سزا سے دستبردار ہو جائیں۔ اسی مالی معاوضہ کو اصطلاحِ شریعت میں دیۃ یا خونبہا کہتے ہیں۔ اور اس میں گھٹ بڑھ برابر ہو سکتی ہے (دیت کا ذکر خود قرآن مجید میں آگے آ رہا ہے) آج بھی انٹرنیشنل (بین الاقوامی) قانون میں یہ بالکل جائز ہے کہ جب ایک (اسٹیٹ) مُلک کی رعایا کا خون دُوسرے ملک (اسٹیٹ) کے باشندوں کے ہاتھوں ہو جائے، اور غیر مُلک میں فوجداری کا مقدمہ چلانے میں دقتیں اور دُشواریاں محسوس ہوں، تو بجائے فوجداری استغاثہ اور اُس کی پیروی کے صرف "ہرجانہ" (Damages) کی رقم پر کفایت کر لی جائے۔ یہ "ہرجانہ" اُسی خونبہا کے لئے ایک خوشنما اور جدید اصطلاح ہے۔ ۶۳۷ (اور خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ، شر و فساد کا موقع نہ نکالنا چاہئیے) یعنی مقتول کا فریق کہ وہی اب مُدعی یا مُستغیث ہوگا۔ خونبہا کی مطلوبہ رقم کا مطالبہ معقولیت، آدمیت سے کرے، خواہ مخواہ ضد اور اشتعال سے فریق مقابل کو تنگ نہ کرے، اور اس کے جوش کو نہ بڑھائے کہ اس سے فساد کو مزید تحریک ہوگی عین حدت و اشتعال طبع کے نازک موقعوں پر یہ رکھ رکھاؤ، اتنی احتیاط اور حسنِ معاشرت کو سنبھالے رکھنے کا اہتمام شریعتِ اسلامی کا مخصوص حصہ ہے۔ ۶۳۸ اب یہ تاکید قاتل یا اُسکے فریق کو ہو رہی ہے ان ملزموں یا مدعا علیہم کو بھی اپنی طرف سے یہی چاہیئے کہ جتنی رقم کی قرارداد ہو چکی ہو، اُسے بغیر مزید طوالت یا پیچیدگی و بدمزگی کے فریقِ مقتول یعنے مدعیوں یا مستغیثوں تک خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے پہنچا دیں۔ الیہ میں ضمیر فریق مقتول کی جانب ہے۔ والضمیر فی الیہ للاخ (مدارک) فطرتِ بشری کی ان نزاکتوں کا لحاظ اور قاتل و مقتول ہر دو مختلف فریق کے مصالح و جذبات کی رعایت کون انسانی قانون رکھ سکتا ہے؟ قانون ساز انسان تو ایک محض خشک انسان ہوتا ہے۔ اتنے متعدد اور باریک پہلوؤں کی رعایت تو صرف خدائی ہی قانون کی شان ہو سکتی ہے۔ ۶۳۹ ذٰلك۔ یعنے یہی حکم جو اُوپر فمن عفی لہ کے اندر مذکور ہو چکا۔ یعنی الحکم المذکور من العفو واخذ الدیۃ (مدارک) ایک طرف قصاص کی انتہائی سختی، دُوسری طرف دیت اور عفو کی نرمی جیسی حسنِ امتزاج اور اعتدال و توازن کا یہ مکمل قوام اُسی قانون کا حصہ ہو سکتا ہے جو بشری دماغ سے نہیں، حکمتِ مطلق سے نکلا ہو۔ ۶۴۰ (آخرت میں) اعتدی یعنی زیادتی کی صورتیں مُتعدد ہو سکتی ہیں، مثلاً ایک یہی کہ کسی بیگناہ پر قتل کا جھوٹا دعویٰ کر دیا۔ یا یہ کہ قاتل کو پہلے تو معاف کر دیا، اور پھر معافی کے بعد لوٹ کر قصاص کے درپے ہو گئے۔ وقس علی ہذا۔ ایسے بیدردوں اور خدا ناترسوں کو صرف خوفِ آخرت ہی بیجا جسارتوں سے روک سکتا ہے۔ ۶۴۱ قانونِ قصاص عین عدل و مساوات کا قانون ہے اور ہیئتِ اجتماعی کے نظم و قیام امن کا بہترین ضامن و کفیل کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرنے پائے اور قوی و ضعیف سب کے حقوق کا تحفظ ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ جو زبردست ہوں وہ زیردستوں پر ستم ڈھایا کریں۔ اُمت کے مختلف طبقوں میں ایک دُوسرے کی طرف سے اطمینان و دلجمعی پیدا کرنے والا درحقیقت یہی قانون ہے۔ اور جب اس قانون پر عملدرآمد ایک عرصہ تک رہیگا، اس قانون کی رُوح اُمت میں سرایت کر جائیگی تو ساری قوم کا مزاج صالح ہو جائیگا، اور آئین پسندی، باہم صلح و سازگاری، خدمت و معاونت جزوِ زندگی بن جائیگی اور اُمت دیکھتے ہی دیکھتے اُمتِ صالحین و ابرار، اُمتِ عادل کہلانے کی مصداق بن جائیگی۔ ۶۴۲ یہ حکمِ وصیت، آیتِ میراث کے نزول سے (جس میں حقداروں کے حصے معین کر کے بتا دیے گئے ہیں) بہت قبل کا ہے۔ نزلت قبل نزول الفرائض والمواریث (قرطبی) اس لئے قدرةً اب اس پر عملدرآمد اُس آیت متاخر و مابعد ہی کے ماتحت ہوگا۔ اور اسی کو مفسرین اپنی اصطلاح میں ایک آیت کا دوسری آیت سے منسوخ ہو جانا کہتے ہیں۔ جائداد کی تقسیم اب آیتِ میراث کے موجب ہوگی۔ اور وصیت کا اب کوئی محل ہی نہ رہا بجز جائداد کے ایک ثلث کے کہ اتنے میں وصیت چل سکتی ہے۔ اور اس کی تصریح بھی اسی سورۃ النساء کی آیتِ میراث میں موجود ہے۔ وصیۃ کے لفظی معنی نصیحت کے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں اس سے مُراد وہ ہدایتیں ہوتی ہیں جو وصیت کر جانیوالے کی موت کے بعد قابلِ عملدرآمد ہوتی ہیں۔ فقہائے لکھا ہے کہ وصیت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) بعض وصیتوں کی تعمیل درجۂ واجب میں ہے مثلاً ادائے زکوٰۃ و کفارہ کی وصیت، یا ادائے امانت یا ادائے قرض کی وصیت۔ (۲) بعض مستحب کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً کسی کارِ خیر کیلئے وصیت کر جانا، یا کسی ایسے عزیز کو میراث دے جانا جسے حصہ نہ پہنچ رہا ہو۔ (۳) بعض صرف مُباح ہوتی ہیں۔ جیسے کسی امرِ جائز کیلئے وصیت کر جانا۔ (۴) اُن کے علاوہ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کی تعمیل ممنوع ہے۔ وہ وصیتیں کالعدم سمجھی جائینگی۔ مثلاً کسی کافرِ حربی کے حق میں یا کسی فعلِ حرام کے لئے وصیت کر جانا۔ (۵) اور بعض وصیتیں موقوف کہلاتی ہیں۔ ان کی تعمیل شرطا کے ساتھ معلق ہوتی ہے۔ مثلاً ترکہ کے ایک ثلث سے زائد میں وصیت کر جانا۔ اس کی تعمیل دُوسرے ورثا کی رضامندی پر موقوف رہے گی۔ الوصیۃ یہاں الایصاء کے معنی میں ہے اور اسی معنی کا لحاظ کر کے اس کیلئے فعل مذکر (کُتِبَ) لایا گیا ہے۔ ورنہ اصل قاعدہ کے لحاظ سے فعل مؤنث (کُتِبَتْ) آنا چاہیئے تھا۔ اور تائے تانیث کے حذف کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اسم وصیت اپنے فعل سے بہت فاصلہ پر ہے اور اتنا فاصلہ حائل ہو جانے پر محاورۂ زبان میں فعل کی تائے تانیث حذف ہو جاتی ہے (قرطبی)۔ خیرا۔ خیر کے ایک معنی علاوہ مشہور معنی کے، مالِ طیب کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس استعمال کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔ مثلاً قل ما انفقتم من خیر (سورۂ بقرہ) یا وما تنفقوا من خیر (سورۂ بقرہ) وقس علی ہذا۔ بہرحال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہاں خیر مال ہی کے معنی میں ہے۔ الخیر ھھنا المال من غیر خلاف (قرطبی) قال بعض العلماء انما سمی المال ھھنا خیرا تنبیھا علی معنی لطیف وھو ان الذی یحسن الوصیۃ بہ ما کان مجموعا من المال من وجہ المحمود (راغب) لیے مالا کما قالہ ابن عباس و مجاھد (روح) ایک گروہ نے لفظ وجوب سے استناد کر کے کہا ہے کہ کچھ نہ کچھ وصیت بہرحال کر جانا چاہیئے۔ دُوسرے گروہ نے آیتِ میراث کی موجودگی میں اسے بالکل غیر ضروری ٹھیرایا ہے۔ امام نخعی کا قول اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے سامنے دونوں قسم کے اُسوۂ حسنہ موجود ہیں۔ ابوبکر صدیق وصیت کر گئے تھے لیکن خود رسول اللہ صلعم نے کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ وقال النخعی مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یوص وقد اوصی ابوبکر فان اوصی فحسن وان

لم یوص فلا علیہ شئ ء (قرطبی) بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی پسندیدہ طریقہ پر عقل کی رعایت سے، حاجت کا لحاظ کرکے حسنِ معاشرت وحسنِ معاملت دونوں قسم کے احکام کے موقع پر قرآن مجید میں یہ لفظ کثرت سے آیا ہے۔ عَلَى الْمُتَّقِيْنَ یہ متقین سے یہاں مُراد مومنین ہیں۔ اُن کے وصفِ تقویٰ کا ذکر کرکے مُراد خود انہی سے لی گئی ہے۔ مراد بالمتقین المومنین وھم الذین اتقوا الکفر (کبیر) والمراد بالمتقین المؤمنون (روح) ٦٢٣ (کہ حاکموں پر جو عالم الغیب نہیں ہوتے، بلکہ گواہوں کے بیانات ہی پر فیصلہ کی بنیاد رکھتے ہیں) بَدَّلَهٗ اور سَمِعَهٗ دونوں میں ضمیر وصیت کی طرف ہے۔ والضمیر فی بدلہ یرجع الی الایصاء وکذٰلک الضمیر فی سمعہ (قرطبی) یعنی جن گواہوں کے سامنے وصیت کی گئی کہ فلاں فلاں عزیز کو اتنا اتنا حصہ ملے، اور وہ گواہ اُس میں اپنی طرف سے کچھ قطع وبرید کردیں، جس سے بعض کی حق تلفی لازم آتی ہے۔ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ۔ یہ حاکموں، قاضیوں کو اطمینان دلایا ہے کہ تمہارا اس غلط اجراء میں کیا قصور، قصور تو بس اُنہی جھوٹے گواہوں کا ہے۔ ٦٢٤ سَمِيْعٌ۔ اُس پر خوب روشن ہے کہ گواہ نے کس کس طرح جھوٹ سے کام لیا، اور اصل وصیت میں کیا کیا کتر بیونت کی۔ عَلِيْمٌ۔ اُس پر خوب روشن ہے کہ قاضی یا ثالث ایسے موقع پر کیسا معذور و بے بس ہوتا ہے۔ ٦٢٥ (اور وہ اس بنا پر اسے باخلاص و خیر خواہی وصیت میں تبدیل کردے جس سے اُس بے ضابطگی یا معصیت کی اصلاح ہوجائے) خَافَ۔ خوف عربی میں ہمیشہ اندیشہ اور ڈر ہی کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ کبھی علم کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں یہی معنی مُراد ہیں۔ لے فمن توقع وعلم وھذا فی کلامھم مشائع (کشاف) والخوف والخشیۃ العلم (کبیر) ومعنی خاف توقع وعلم (روح) لے فمن ظھر لہ من احوال الموصی مایغلب معہ علی ظنہ انہ یرید الجور وصرف المیراث عن الوارث (جصاص) جَنَفًا۔ جنف کہتے ہیں نادانستہ غلطی یا بے ضابطگی کو۔ مُراد ہے سہو یا خطاء فہم سے کوئی زیادتی۔ الجنف الخطاء (ابن جریر عن ابن عباس) الجنف الخطاء من حیث لایعلم بہ (کبیر) میلاً عن الحق بالخطاء (کشاف) اِثْمًا۔ یعنی دانستہ غلطی کھلی ہوئی حق تلفی جس پر گناہ کا اطلاق ہو سکے۔ الاثم العمد (ابن جریر عن ابن عباس) الاثم ھو العمد (کبیر) ٦٢٦ (مضمون وصیت میں ترمیم کرکے اور وارثوں کی حق تلفیوں کو دور کرکے)

يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ فَمَنْ

اُسے بدل ڈالیں ٦٢٣ بیشک اللہ بڑا سننے والا ہے، بڑا جاننے والا ہے ٦٢٤ البتہ جس کسی

خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ

کو وصیت کرنے والے سے متعلق کسی بےعنوانی یا گناہ کا علم ہوجائے، پھر وہ ان لوگوں کے آپس میں

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

صلح کرادے ٦٢٥، تو اُس پر کوئی گناہ نہیں ٦٢٦ بیشک اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت کرنیوالا ہے، بڑا رحم کرنیوالا ہے ٦٢٧

۲۲ ع ۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ

اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے ٦٢٨

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

جیسا کہ اُن لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں ٦٢٩ عجب نہیں

تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ

کہ تم متقی بن جاؤ ٦٣٠ (یہ روزے) گنتی کے چند روز کے (ہیں) ٦٣١ پھر تم میں سے جو شخص

مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ

بیمار ہو ٦٣٢ یا سفر میں ہو ٦٣٣ اُس پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا

اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ

(لازم ہے) ٦٣٤ اور جو لوگ اُسے مشکل سے برداشت کرسکیں ٦٣٥ اُنکے ذمہ

طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ

فدیہ ہے (کہ وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے ٦٣٦ اور جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے ٦٣٧ اُس کے حق میں

منزل ۱

يَنْھُمْ میں ضمیر جمع غائب وارثوں کی جانب ہے۔ لے بین الموصی لھم (روح) الکنایۃ عن الورثۃ (قرطبی)
یعنی وصیت اگر بے ضابطہ ہے یا خلاف قاعدۂ شرعی ہے اور کوئی شخص وارثوں کے درمیان وقوعِ نزاع یا احتمالِ نزاع ہی دیکھ کر مضمونِ وصیت میں ایسی ترمیم کردے جس سے حق تلفیوں کی اصلاح ہوجائے اور وارثوں میں باہم مصالحت ہوجائے۔ بعض فقہاء نے اس حکم کے ماتحت وسعت دے کر کہا ہے کہ حکم صرف وصی اور گواہانِ وصیت اور حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں، اُمت کا ہر فرد اس پر عمل کرسکتا ہے۔ فمن خاف من سائر الناس من موص میلا عن الحق وعدولا الی الجور فالواجب علیہ ارشادہ الی العدل والصلاح (جصاص) الخطاب لجمیع المسلمین (ابن العربی) اس لئے کہ اس حکم کا تعلق بابِ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے ہے اور وہ ساری اُمت پر فرض ہے۔ ولا یختص بذٰلک الشاھد والوصی والحاکم دون سائر الناس لان ذٰلک من باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر (جصاص) لان اصلاح الفساد فرض علی الکفایۃ (ابن العربی) فقہاء نے اس آیت سے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ غلبۂ ظن کے بعد رائے وعمل کا اجتہاد جائز ہوجاتا ہے اسلئے کہ وصیت کرنے والے کی طرف سے ظلم وزیادتی کا اندیشہ تو ظنِ غالب ہی کے حکم میں رہیگا۔ وفیھا الدلالۃ علی جواز اجتھاد الرای والعمل علی غالب الظن لان الخوف من المیل یکون فی غالب ظن الخائف (جصاص) وفی ھذا دلیل علی الحکم بالظن (ابن العربی) ٦٢٧ (اس تبدیل وترمیمِ مضمونِ وصیت کے باب میں) بلکہ وہ تو اور مستحق اجر و ثواب کا ہوگا۔ لانہ تبدیل باطل الی حق (مدارک) ٦٢٨ اللہ تو گنہگاروں تک کے حق میں غفور ورحیم ہے۔ چہ جائیکہ یہ شخص جو گنہگار رہے بھی نہیں بلکہ اپنی سعی اصلاح میں تو مطیع حکم اور مستحق اجر ہے۔ غَفُوْرٌ۔ یعنی گناہوں کا بخشنے والا۔ رَحِيْمٌ۔ یعنی خطاکاروں کے حال پر رحم کرنے والا۔ ٦٢٩ صیام جمع ہے صوم کی۔ صوم یا روزہ اصطلاحِ شریعت میں اسے کہتے ہیں کہ انسان طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک اپنے کو کھانے پینے اور عملِ زوجیت سے روکے رہے۔ جو روزے فرض ہیں وہ ماہِ رمضان کے ہیں۔ غیبت، فحش، بدزبانی وغیرہ زبان کے تمام گناہوں سے روزہ میں بچے رہنے کی سخت تاکیدیں حدیث میں آئی ہیں۔ جدید وقدیم سب طبیب اس پر متفق ہیں کہ روزہ جسمانی بیماریوں کے دور کرنے کا بہترین علاج اور جسمِ انسانی کیلئے ایک بہترین مصلح ہے پھر اس سے سپاہیانہ ہمت اور ضبطِ نفس کی روح جو ساری اُمت میں تازہ ہوجاتی ہے، اسکے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین نسخہ ہے۔ ٦٣٠ روزہ کسی نہ کسی صورت میں تو دنیا کے تقریباً ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع چہاردہم کی جلد ۹ صفحہ ۱۰۶ اور جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳ سے ظاہر ہے لیکن قرآن کو مشرکانہ مذہبوں سے بحث نہیں۔ الذین من قبلکم سے اسکی اصل مُراد اہلِ کتاب ہی سے ہوسکتی ہے چنانچہ روزہ شریعتِ موسوی کا ایک اہم اور مشہور جزو ہے۔ مذاہبِ عالم سے اتنی گہری واقفیت کہ صاف صاف اُن میں روزہ کے جزوِ مذہب ہونے کی خبر دے دی، تو آک اور یل کے زمانہ سے صدیوں قبل اور اخبارات اور کتبخانوں کے دور سے ہزار بارہ سو سال پیشتر عرب جیسے دور اُفتادہ اور دنیا کے ہر ملک سے بے تعلق جو یرہ نما میں ایک اُمی کیلئے کسی طرح ممکن نہیں ——— بجز وحیِ الٰہی کے توسط کے۔ ٦٣١ روزہ تعمیلِ ارشادِ خداوندی میں تزکیۂ نفس، تربیتِ جسم دونوں کا ایک بہترین دستورالعمل ہے، اشخاص کے انفرادی اور اُمت کے اجتماعی ہر دو نقطۂ نظر سے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے ارشاد سے اسلامی روزہ کی اصل غرض وغایت کی تصریح ہوگئی کہ اس سے مقصود تقویٰ کی عادت ڈالنا اور اُمت وافراد کو متقی بنانا ہے۔ تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے احتیاط رکھنے سے جسمانی صحت درست ہوجاتی ہے اور مادی لذتوں سے لطف وانبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہوجاتی ہے۔ بھوک خوب کھل کر لگنے لگتی ہے خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح اس عالم میں تقویٰ اختیار کرلینے سے (یعنی متقی عادتیں صحت روحانی وحیاتِ اخلاقی کے حق میں مُضر ہیں، اُن سے بچے رہنے سے) عالمِ آخرت کی لذتوں اور نعمتوں سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت واستعداد انسان میں پوری طرح پیدا ہوکر رہتی ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی روزہ کی افضلیت تمام دوسری قوموں کے گرے پڑے روزوں پر علانیہ ثابت ہوتی ہے اور خیر مشرک قوموں کے ناقص، ادھورے اور برائے نام روزوں کا تو ذکر ہی نہیں، خود مسیحی اور یہودی روزوں کی حقیقت بس اتنی ہے کہ وہ یا تو کسی بلا کو دفع کرنے کے لئے رکھے جاتے ہیں یا کسی فوری ومخصوص روحانی کیفیت کے حاصل کرنے کو۔ یہود کی قاموسِ اعظم جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:- "قدیم زمانہ میں روزہ یا تو بطور علامتِ ماتم کے رکھا جاتا تھا، اور یا جب کوئی خطرہ درپیش ہوتا تھا اور یا پھر جب سالک اپنے میں قبولِ الہام کی استعداد پیدا کرنا چاہتا تھا۔" (جلد ۵۔ صفحہ ۳۴۷) اسلام میں روزہ نام ہے اپنے قصد وارادہ سے ایک مدتِ معین تک کیلئے اپنی جائز اور طبعی خواہشوں کی تکمیل سے دستبرداری کا۔ اور اس سے ایک طرف طبی اور جسمانی، دوسری طرف روحانی اور اخلاقی جو فائدے حاصل ہوتے ہیں، فرد اور اُمت دونوں کو، انکی تفصیل کی گنجائش تو یہاں بہرحال نہیں۔ البتہ سورۃ کے آخر میں بطور ضمیمہ اس نامسیاہ کی بعض اور تحریریں پرچہ صدق اور سچ سے نقل کرکے درج کی جاتی ہیں۔ ٦٣٢ یعنی ان فرض روزوں کی ایک متعین تعداد ہے جیسا کہ ڈسپلن (تنظیم یا باقاعدگی) کا اقتضاء ہے۔ یہ نہیں کہ جب جس کا جی چاہے جتنے دنوں کے لئے رکھ ڈالے۔ وحدتِ اُمت کے لحاظ سے لازمی تھا کہ ایک متعین زمانہ متعین حدود کے ساتھ ساری اُمت کیلئے مقرر ہو۔ مسنا یہ پہلو بھی حل آیا کہ ان فرض روزوں کی تعداد کچھ بہت بڑی نہیں۔ یہ نہیں کہ سال سال بھر روزے رکھتے ہی جاؤ، چھ مہینے بلکہ تین مہینے بھی نہیں۔ سال بھر میں کل ۲۹ یا ۳۰ دن۔ ٦٣٣ (اور بیماری کے باعث روزہ اُس پر شاق ہو) بیماری کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بیماری بہت شدید بھی ہوسکتی ہے اور بہت خفیف برائے نام بھی ہوسکتی ہے اور پھر موسم، عمر، جثہ وغیرہ کے اختلافات بھی اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ یہاں مُراد ایسی بیماری ہے جو روزہ رکھنے میں خلل انداز ہو، محض مریض کسی درجہ میں ہونا اجازتِ ترکِ صوم کے لئے کافی نہیں۔ لے مریضاً یعسر علیہ الصوم معہ (روح) قال جمہور من العلماء اذا کان بہ مرض یؤلمہ ویؤذیہ او یخاف تمادیہ او یخاف تزیدہ صح لہ الفطر (قرطبی)

يخاف من الصوم زيادة مرض (مدارک) قال ابو حنيفة وابو يوسف ومحمد اذا خاف ان تزداد عينه وجعًا او حمّه شدة افطر (جصاص) فثبت اتفاق الفقهاء ان الرخصة في الافطار للمريض موقوفة على زيادة المرض بالصوم.
وانه ماله يخش الضرر فعليه ان يصوم (جصاص) بیماری کی کوئی معین حد شریعت نے نہیں بتائی۔ ہر شخص اپنے حالات کے لحاظ سے اپنے ضمیر کی روشنی میں اس کا فیصلہ کرسکتا ہے ۶۵۴ سفر کے اندازے شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں۔ یعنی
سفر کی اتنی مقدار کہ جس میں ترکِ صوم جائز ہو۔ وقد اتفقوا على ان للسفر المبيح للافطار مقدارًا معلومًا في الشرع (جصاص) - لیکن خود ان اندازوں میں اختلاف صحابہؓ کے زمانہ سے ابتک چلا آرہا ہے۔ ابن عمرؓ، ابن عباسؓ صحابیوں اور فقیہ ثوریؒ
کا مذہب ہے کہ سفر شرعی کا اطلاق تین دن کے مسافت والے سفر پر ہوتا ہے۔ قال ابن عمر وابن عباس والثوری الفطر فی سفر ثلثة ایام (قرطبی) حنفیہ کے ہاں بھی فتوے تین ہی دن کی مقدارِ سفر پر ہے۔ گو دوسرے ائمہ کے یہاں دو روز بلکہ ایک دن
کے سفر پر بھی افطار جائز ہے۔ فقال اصحابنا مسيرة ثلثة ايام ولياليها وقال آخرون يومين وقال آخرون مسيرة يوم (جصاص) فقال مالك والشافعی اقل السفر يوم وليلة وقال ابو حنيفة اقله ثلاثة ايام (ابن العربی)
۶۵۵ (اگر اس بیماری یا سفر کے دوران میں روزے چھوٹ گئے ہوں) یہ حکم نہیں، اجازت ہے۔ اور مقصود معذوروں کے لئے گنجائش ہے۔ البتہ اگر کوئی ایسی بیماری یا ایسا سفر ہو جس میں روزہ رکھنے سے ہلاکت کی نوبت آ جاتی ہو، تو اس حالت
میں ترکِ صوم جائز ہی نہیں، واجب ہوجاتا ہے اور زیادہ تکلیف کی حالت میں ترکِ صوم ہی بہتر سمجھا گیا ہے ۶۵۶ یطیقونہ میں ضمیر صوم کی طرف ہے یعنی روزہ رکھنے کو رکھ تو ڈالیں لیکن روزہ کا تحمل انہیں مشکل ہی سے ہو سکے مشقت بہت زیادہ
اٹھانی پڑے۔ مثلاً زیادہ بوڑھے اشخاص یا حاملہ اور مرضعہ عورتیں۔ طاقة اور وسعة ان دو لفظوں میں اہلِ لغت نے فرق کیا ہے۔ وسعت تو گویا امکان کے مرادف ہے، اور طاقت میں یہ مفہوم شامل ہے کہ وہ کام کرنے والے کی قدرت میں تو
ہو لیکن اسکے کرنے میں مشقت بہت زیادہ پڑے۔ کام تو ہو جائے لیکن بمشکل ہو۔ هو اسم لمقدار ما
يمكن ان يفعله بمشقة منه (راغب) الطاقة اسم لمقدار ما يمكن للانسان ان يفعله بمشقة (راغب)
الوسع فوق الطاقة والوسع اسم لمن كان قادرًا على الشیء على وجه السهولة واما الطاقة فهو اسم
لمن كان قادرًا على الشیء مع الشدة والمشقة (کبیر) اور یہاں طاقة کا مادہ استعمال ہوا ہے جس کے کھلے ہوئے
معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ جو تکلیف کے ساتھ روزہ رکھ سکیں، مثلاً بوڑھے اور بوڑھیاں، حاملہ اور مرضعہ۔ ایسے
یصومونہ بجهدهم وطاقتهم ومبلغ وسعهم (کشاف) ای الذين يقدرون على الصوم مع الشدة والمشقة (کبیر)
فيصير المعنى وعلى الذين يصومونه مع الشدة والمشقة فيشمل نحو الحبلى والمرضع (روح) يكلفونه او يتكلفونه على
جهد منهم وعسر وهم الشيوخ والعجائز (کشاف) اور ابن عباسؓ کی قراءت میں تو یطوقونہ ہے، جو ٹھیک
مرادف یکلفونہ کا ہے۔ ومشهور قراءة ابن عباس يطوقونه بفتح الطاء وتشديد الواو بمعنى يكلفونه
(قرطبی) تابعین بلکہ صحابیوں کی متعدد روایتوں میں اس سے مراد بوڑھے اور بوڑھیاں ہی لی گئی ہیں، اور متعدد مفسرین
نے بھی یہی سمجھا ہے اور آیت کے منسوخ قرار دینے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ هو الشيخ والشيخة (ابن جریر)
نزلت هذه الآية في حق الشيخ الهرم (کبیر) قال ابن عباس ليست منسوخة هو الشيخ الكبير والمرأة
الكبيرة لا يستطيعان ان يصوما (ابن کثیر عن عطاء) ففسر ابن عباس ان كان الاسناد عنه صحيحًا يطيقونه
بيطيقونه ويتكلفونه (قرطبی) روى ابو داؤد عن ابن عباس وعلى الذين يطيقونه قال اثبتت للحبلى
والمرضع (قرطبی) وخرج الدارقطنی عنه ايضًا قال رخص للشيخ الكبير ان يفطر ويطعم عن كل يوم مسكينًا
ولا قضاء عليه۔ هذا اسناد صحيح (قرطبی) وروى عنه ايضًا انه قال وعلى الذين يطيقونه فدية
طعام ليست بمنسوخة هو الشيخ الكبير والمرأة الكبيرة لا يستطيعان ان يصوما فيطعمان مكان كل
يوم مسكينًا وهذا صحيح (قرطبی) وحكم هؤلاء الافطار والفدية وهو على هذا الوجه ثابت غير منسوخة
(کشاف) مفسر قرطبی کا فیصلہ اس باب میں قول فیصل ہے۔ فقد ثبت بالاسانيد الصحاح عن ابن
عباس ان الآية ليست بمنسوخة وانها محكمة في حق من ذكر۔ ۶۵۷ یعنی جن بوڑھوں بوڑھیوں کو اول
کے لئے روزہ رکھنا بہت تعب کا باعث ہو، انہیں اختیار ہے کہ بجائے روزہ رکھنے کے ایک غریب کو روزانہ کھانا
کھلا دیا کریں۔ اور کھانے کا معیار وہ ہو جو خود اُن کا اوسطاً رہتا ہے۔ مختلف فقہاء سے مختلف مقداریں منقول
ہیں۔ ۶۵۸ (اسی ادائے فدیہ کے باب میں) یعنی اسقدر مقدار تو بہرحال واجب ہے اب اگر اس میں کوئی
زیادتی کرنا چاہے، یعنی ایک شخص کے بجائے دو شخصوں کو کھلا دے، کھانے کی تعداد بڑھا دے، کھانے کی قسم بہتر
کر دے، فدیہ کے ساتھ روزہ کو بھی جمع کرلے تو اور بہتر ہے۔ خیر خیرات، فیاضی، ہمدردی، حسنِ سلوک وغیرہ
کی تاکید تو اسلام میں ہمیشہ اور ہر حال کیلئے موجود ہے لیکن رمضان کے ماہ مبارک میں اس کی اہمیت اور
زیادہ ہے۔ چنانچہ ماہ مبارک کے ختم پر یا ختم سے ذرا قبل جو صدقۂ فطر واجب بتایا گیا ہے کہ آس پاس کا کوئی
کلمہ گو بھوکا نہ رہنے پائے وہ اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ رسول اللہ صلعم فیاضی، سخاوت، جود و کرم میں اپنی

لَهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۴

بہتر ہے، اور اگر تم علم رکھتے ہو تو بہتر تمہارے حق میں یہی ہے کہ تم روزے رکھو ۶۵۸

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى

ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے، ۶۵۹ لوگوں کے لئے ہدایت

لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ

ہے ۶۶۰ اور (اس میں) کھلے ہوئے (دلائل ہیں) ہدایت اور (حق و باطل میں) امتیاز کے ۶۶۱ سو

شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ

تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے، لازم ہے کہ وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے ۶۶۲ اور جو کوئی بیمار

مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ

ہو یا سفر میں ہو، تو (اس پر) دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) ۶۶۳

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ

اللہ تمہارے حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا ۶۶۴

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا ھَدٰىكُمْ

اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم شمار کی تکمیل کر لیا کرو ۶۶۵ اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو اس پر کہ تمہیں راہ بتادی ۶۶۶

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ

عجب نہیں کہ تم شکرگزار بن جاؤ ۶۶۷ اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب

عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا

میں دریافت کریں، تو میں تو قریب ہی ہوں ۶۶۸ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے

نظیر آپ تھے تاہم متعدد حدیثوں میں آتا ہے کہ اس ماہ مبارک میں آپ کا جوش کرم اور بڑھ جاتا تھا، اور آپ فیاض سے فیاض تر ہو جاتے تھے۔ ۶۵۹ (کہ صوم رمضان کی کیا کیا برکتیں اور فضیلتیں ہیں اور اس کے کیا کیا منافع و مصالح ہیں) ۶۶۰ (اگرچہ
معقول عذر روزہ کو قضا کر دینے اور اسکے بجائے فدیہ دینے کے موجود ہوں) اس میں ترغیب اور تشویق ہے کہ روزہ رکھنے کے جو منافع و مصالح ہیں، وہ تو روزہ رکھنے ہی سے حاصل ہوں گے، ان معذوروں کیلئے گنجائش فدیہ کی بھی رکھ دی گئی ہے ۶۶۱
یعنی اترنا شروع ہوا۔ اے ابتدی فیہ انزالہ (مدارک۔ بیضاوی۔ روح) ابدی بانزالہ فیہ علی رسول اللہ (بحر) کل قرآن مجید کا نزول تو بڑی تدریج کے ساتھ کوئی ۲۱-۲۲ سال کی مدت میں ہوا ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم پر نزول قرآن کی ابتدا ماہِ رمضان میں ہوئی۔ وحی قرآنی کی سب سے پہلی آیتیں سورۃ العلق کا ابتدائی حصہ ہے، اور وہ غار حرا میں رسول اللہ صلعم پر اسی مہینہ میں نازل ہوئی تھیں۔ (سنہ نبوی ا) بعض مفسر اس جانب بھی گئے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول آسمانِ
دنیا پر اسی مہینہ میں ہوا اور پھر وہاں سے فرشتۂ وحی حضرت جبرئیل کے توسط سے تدریج رسول اللہ صلعم پر ہوتا رہا۔ القرآن۔ جس طرح ارض کا اطلاق سارے روئے زمین پر بھی ہوتا ہے اور زمین کے ہر ہر ٹکڑے پر بھی۔ اسی طرح قرآن کا اطلاق، موہاروں والی کل
کتاب پر بھی ہوتا ہے اور اسکے ہر ہر جزو پر بھی۔ رمضان۔ سنہ قمری اسلامی کے نویں مہینہ کا نام ہے۔ شریعت نے اعتبار قمری مہینوں کا کیا ہے اور اپنے حسابات میں اسی تقویم سے کام لیا ہے۔ قمری مہینے چونکہ مختلف موسموں میں ادل بدل کرتے رہتے
ہیں مسلمان روزہ دار بھی رمضان کی اس گردش سے ہلکی گرمی اور ہلکی سردی، شدید گرمی اور شدید سردی خشک و تر ہر ہر موسم میں بھوک اور پیاس کے ضبط و تحمل کا خوگر ہوجاتا ہے۔ روزوں کی تعداد تو شریعت نے مقرر کر ہی دی ہے، زمانہ بھی ایک متعین و مقرر
ہے۔ یہ نہیں کہ محض تعداد جس کا جب جی چاہے پوری کرلے۔ انفرادی اصلاح تو شاید ان حسب مرضی روزوں سے ہو بھی جاتی لیکن اجتماعی منافع و مصالح کے لئے تعداد کی طرح تعیین بھی ناگزیر تھی۔ وحدتِ امت کیلئے لازمی تھا کہ عرب و چین، مصر و ہندوستان
طرابلس و جاپان، حبش و آسٹریلیا، افغانستان اور کناڈا، امریکہ اور میکسیکو، برطانیہ اور آسٹریا غرض سارے روئے زمین پر اسلامی آبادی جہاں کہیں بھی ہو سب ایک ہی وقت میں روحانیت کی اس سالانہ پریڈ میں شریک ہو ــــ علم الاجتماع
کے ماہرین جانتے ہیں کہ وحدتِ امت و تنظیم ملت میں کتنا زیادہ دخل اس ہم وقتی یا وقت کی ہم آہنگی کو ہوتا ہے۔ قرآن کی مناسبت رمضان کے ساتھ ہر صاحب نظر پر بالکل روشن ہے۔ اہل سنت اسی لئے قرآن مجید کے اس نزول کی سالانہ یادگار اس مہینہ
راتوں کو اپنی مسجدوں میں مناتے ہیں اور تراویح کی رکعتوں میں سارے قرآن کو اپنے حافظہ میں تازہ کر لیتے ہیں۔ ۶۶۲ یعنی اس میں خفا و التباس کسی قسم کا نہیں، اور اسکے سارے ہدایات و احکام لوگوں ہی کے نفع کے لئے ہیں۔ للناس سے اس پر
بھی روشنی پڑگئی کہ قرآن کی مخاطب ساری دنیا ہے محض قریش یا عرب نہیں۔ ۶۶۳ قرآن مجید ایک کتاب محکم ہے نہ صرف دلالت احکام میں وضاحت کامل کی بنا پر، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اسکے دلائل حق کو باطل سے واضح اور نمایاں طور پر ممتاز کر دینے والے ہیں

۶۶۴ فَلْيَصُمْهُ یعنی کچھ لوگوں نے خدا اسلام کس قاعدہ زبان سے اس لفظ کے یہ معنی نکال کر کہ رمضان میں یا رمضان کے اندر روزے رکھے جائیں۔ یہ حکم لگا دیا ہے کہ صرف تین دن کے روزے بھی کافی ہیں یہ ایجاد بندہ تمام تر گندہ ہے۔ آیت کے صاف و صریح معنی اس مہینہ کو روزہ میں گزارنے کے ہیں اور اردو میں اس مفہوم کو مہینہ بھر تک ہی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ فیصومہ تقدیرہ فمن شہد منکم جزءًا من اجزاء الشہر فلیصم کل الشہر اکبرا اے الشہر کلہ اصلہ۔ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ قمری مہینہ کا آغاز ہر ۲۹ یا ۳۰ دن کے بعد چاند دیکھنے سے ہوتا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اور یہ رنگ اس کی اخلاقی، معاشرتی، تعبدی، جزئی، کلی ہر تعلیم میں نمایاں ہے۔ طاعتوں اور عبادتوں کے باب میں جہاں اس نے ایک طرف یہ تاکید رکھی ہے کہ وقت مقرر پر ادا ہوں، وہاں یہ نہیں کیا کہ خود اوقات کو ریاضی کی مقداروں کو ماہرین ہیئت و حساب کا محتاج و پابند بنا دیا ہو شمسی تقویم رکھنے والے یہاں اپنی گھڑی گھنٹہ کے لئے تمام تر دست نگر رہتے ہیں ہیئت دانوں اور فلکیات کا حساب کتاب رکھنے والوں کے۔ اور اگر کسی ملک یا قوم کا تمدن ابھی اس درجہ تک نہ پہنچا ہو کر رصد خانے بن سکے ہوں، دوربینیں ایجاد ہو چکی ہوں، طرح طرح کے آلات سے کام لیا جانے لگا ہو۔ ریاضیات کا طویل و عریض نظام وجود میں آ چکا ہو۔ تو وہاں کے لوگ بیچارے منہ دیکھتے رہ جائیں۔ اسلام تو اس بعید سے بعید مسافر ہے۔ فطری حساب کا قائل ہے کہ بغیر کسی آلہ کی مدد کے بغیر ریاضیات اعلیٰ کے توسط کے بس آنکھ سے جب چاند دیکھ لو روزہ رکھنا شروع کر دو۔ شَهِدَ۔ وسیع معنی میں ہے یعنی جس وقت ماہ رمضان کے شروع ہونے کا علم ہو جائے۔ خواہ چاند کو براہ راست دیکھ کر، خواہ دوسروں کو رویت کی خبر سن کر، تو بیماروں، مسافروں، معذوروں کو چھوڑ کر اور سب لوگ روزہ رکھنا شروع کر دیں۔ وشہد من الشہود والترکیب یدل علی الحضور اما ذاتًا او علمًا وقد اطلق علی الرؤیۃ وایقاع السماع (کبیر) رویت ہلال معتبر کہاں کی ہو گی؟ فقہا نے اس کے جواب میں بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں لیکن صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ اسی شہر یا بستی کی یا قرب و جوار کی بستیوں کی سیکڑوں ہزاروں میل دور سے رویت ہلال کی خبریں منگانے کا تار، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ سے انتظام کرنا، یا کلکتہ کی رویت کو ۱۹۰۰ میل دور بمبئی پر حجت گرداننا شریعت اسلامی کی اصل روح پر ظلم کرنا ہے۔ اختلاف مطالع ایک صریح مشاہدہ کی چیز ہے۔ اسے کیونکر جھٹلایا جا سکتا ہے۔ وحدت یقینًا ایک بڑی اہم چیز ہے لیکن اسکے لئے یہ زبردستی کی کوششیں کرنا طبعی کو غیر طبعی کی حد تک پہنچا دینا ہے۔ واختلفوا اذا اخبر مخبر عن رؤیۃ بلد فلا یخلو انہ یقرب او یبعد فان قرب فالحکم واحد وان بعد فلاهل کل بلد رؤیتہم روی هذا عن عکرمۃ والقاسم وسالم وروی عن ابن عباس وبہ قال اسحٰق والیہ اشار البخاری حیث بوب لاهل کل بلد رؤیتہم (قرطبی) اسی تفسیر قرطبی میں ایک روایت صحیح مسلم کے حوالہ سے اس مضمون کی درج ہے کہ ایک بار رمضان کے سلسلہ میں شام کی رویت کی خبر مدینہ میں پہنچی۔ دونوں جگہ کی تاریخوں میں فرق نکلا۔ حضرت عبداللہ بن عباس صحابی نے حدیث نبوی کا حوالہ دیکر فتویٰ دیا کہ ہم تو میں کی رویت کا اعتبار کرینگے۔ اس کے بعد امام قرطبی لکھتے ہیں:۔ قال علماؤنا قول ابن عباس هکذا امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلمۃ تصریح برفع ذلک الی النبی صلعم وبامرہ فهو حجۃ علی ان البلاد اذا تباعدت کتباعد الشام من الحجاز فالواجب علی اهل کل بلد ان تعمل علی رؤیتہ دون رؤیۃ غیرہ امام مسلم کا شمار اختیار محدثین میں ہے۔ انہوں نے اپنی صحیح کی کتاب الصیام کے ایک باب کا عنوان ہی قرار دیا ہے۔ باب بیان ان لکل بلد رؤیتہم وانهم اذا رأوا الهلال ببلد لا یثبت حکمہ لما بعد عنهم، یعنی باب اس بیان میں کہ ہر شہر کے لئے رویت وہیں کی معتبر ہے۔ اور اس میں کہ جس بستی میں چاند دکھائی دے وہاں سے دور کی بستیوں پر وہاں کا حکم عائد نہ ہو گا۔ اور باب کے تحت میں وہی حدیث لائے ہیں جو قرطبی کے حوالہ سے اوپر گزر چکی۔ اور اس حدیث کو محدث ابن منذر اور امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے۔ وحکاہ ابن المنذر عن عکرمۃ والقاسم وسالم واسحٰق وحکاہ الترمذی (فتح الباری) اور نووی شارح مسلم نے لکھا کہ

والصحیح عند اصحابنا ان الرؤیۃ لا تعم الناس بل تختص بمن قرب علی مسافۃ لا تقصر فیها الصلوٰۃ وقیل ان اتفق المطلع لزمهم وقیل ان اتفق الاقلیم والا فلا۔	صحیح مسلک ہمارے علماء کے یہاں یہ ہے کہ رویت سارے انسانوں پر حجت نہیں بلکہ صرف اتنی مسافت والوں پر ہے جہاں تک نماز قصر نہ کی جائے۔ اور ایک قول ہے کہ جہاں تک مطلع متحد ہو اور ایک قول ہے کہ ایک اقلیم کے حدود کے اندر اور اس کے آگے نہیں۔

اور پھر اس کے آگے یہ لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے غیر رویت پر بے اعتباری نہیں کی، بلکہ

انما ردہ لان الرؤیۃ لا یثبت حکمها فی حق البعید۔	انہوں نے اس پر عمل کرنے سے اسلئے انکار کیا کہ رویت کا حکم دور دراز مقامات پر صادق نہیں آتا۔

اور فقیہ قاضی ابن رشد مالکی نے اس حدیث سے نتیجہ نکالا ہے کہ ہر بستی کیلئے وہیں کی رویت معتبر ہے، چاہے بستیاں آس پاس کی ہوں یا دور کی۔ فظاهر هذا الاثر یقتضی ان لکل بلد رؤیتہ قرب او بعد (بدایۃ المجتہد) مالکیہ کا مذہب مشہور تو یہ ہے کہ ایک جگہ کی رویت سب جگہ کیلئے کافی ہو گی لیکن ابن عبدالبر نے اجماع اس کے برخلاف نقل کیا ہے یعنی ایسے دور دراز ممالک جیسے خراسان اور اسپین ہیں، ان میں سے ایک کے ہاں کا اعتبار دوسری جگہ نہیں کیا جائیگا۔ لکن حکا ابن عبد البر الاجماع علی خلافہ وقال اجمعوا علی انہ لا تراعی الرؤیۃ فی ما بعد من البلاد کخراسان والاندلس (فتح الباری) وحکی ابو عمر الاجماع علی انہ لا تراعی الرؤیۃ فی ما بعد من البلدان کالاندلس و خراسان، قال ولکل بلد رؤیتہم الا ما کان کالمصر الکبیر وما تقاربت اقطارہ من بلاد المسلمین (قرطبی) وروی المدنیون عن مالک ان الرؤیۃ لا تلزم بالخبر عند غیر اهل البلد الذی وقعت فیہ الرؤیۃ الا ان یکون الامام یحمل الناس علی ذلک وبہ قال ابن الماجشون والمغیرۃ من اصحاب مالک واجمعوا انہ لا یراعی ذلک فی البلدان النائیۃ کالاندلس والحجاز (بدایۃ المجتہد) واختلف فی تاویل قول ابن عباس هذا فقیل ردہ لانہ خبر واحد وقیل ردہ لان الاقطار مختلفۃ فی المطالع وهو الصحیح (ابن عربی) اَلشَّهْرَ کوئی ملک اس دنیا کے پردہ پر اگر ایسا آباد ہے کہ وہاں انسانی آبادی عاقلوں، بالغوں، شریعت کے مکلفوں کی ہے، اور وہاں کئی کئی مہینے آفتاب طلوع نہیں ہوتا، یا جب طلوع ہوتا ہو تو کئی کئی مہینے غروب نہیں ہوتا، تو ظاہر ہے کہ وہاں رویت ہلال کے انتیسویں دن یا تیسویں دن کے واقع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں، اور جب یہ نہیں تو وہاں شہود الشہر یعنی طلوع ماہ رمضان کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ——— قرآن مجید کے اس اعجاز بلاغت کے قربان جائیے کہ صرف ایک لفظ شہد الشہر کے لے آنے سے کتنے سوالات اور شبہات کی جڑ کاٹ دی! بطور تطوع یا بر خیال تقویٰ کوئی وہاں بھی روزہ رکھنا چاہے تو سونے جاگنے، کھانے پینے، غرض دنیا کے اور سارے کاروبار کے لئے وہاں اوقات کا جو معیار ہو، اسی اندازہ اور حساب سے روزہ بھی رکھ سکتا ہے۔ ۶۶۵ ابتداء میں حکم صرف اسی قدر تھا کہ تندرست و مقیم بھی جو ماہ رمضان میں روزہ نہ رکھنا چاہیں فدیہ دے کر سکتے ہیں جب آیت فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی، اس وقت سے تندرستوں اور مقیموں سے یہ اختیار چھن گیا۔ اور رمضان کے روزے ان کے لئے اختیاری نہیں رہے لازمی ہو گئے لیکن مریضوں، ناتوانوں، مسافروں کے لئے قضا کا اختیار بدستور باقی رہا۔ آیت کے اسی جزو وَمَن كَانَ مَرِيضًا الخ کو ایک بار پھر اسی لئے دوہرا دیا گیا کہ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کی تعلیم سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ معذوروں سے بھی رعایت ختم کر دی گئی۔ اسلئے حکم کی تکرار صرف صوری اور ظاہری ہے حقیقی اور معنوی نہیں۔ کرر لئلا یتوهم نسخہ بتعمیم من شهد، ولهذا رجس تخصیصًا للمسافر والمریض من شهد الشهر ولعل تکریرہ لذلک لئلا یتوهم نسخہ (بیضاوی) ۶۶۶ چنانچہ شریعت اسلامی کے سارے احکام و قوانین اسی ایک اصل پر مبنی ہیں اور خود اسی روزہ رمضان کے معاملہ میں معذور کے لئے کیسی گنجائش کتنی سہولتیں رکھ دی گئیں۔ حدیث نبوی میں جو آیا ہے۔ دین اللہ یسر وہ اسی آیت قرآنی کی شرح یا تتمہ ہو اور واقعی گر غور کر کے دیکھا جائے، تو شریعت کا ایک حکم بھی ایسا نہ ملیگا جس میں عامل کے حالات، عمر، صحت، جنس، موسم اور دوسری مشکلات کا لحاظ کر لیا گیا ہو۔ اور جو احکام بظاہر سخت معلوم ہوتے ہیں، انکی تہ میں بھی جو حقیقت پائی جائیگی کہ زیادہ امت کی راہ میں کچھ آسانیاں ہی پیدا ہوں۔ لفت ہمارے لئے فرد سرکش کو کافی ہو کر جو احکام غیروں کو سخت معلوم ہوتے ہیں، انکی تعمیل میں بھی اور آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر جانے کے بعد ساری مخالف فضا و ماحول کے باوجود اس خوشدلی اور بے تکلفی کے ساتھ تعمیل ہوتی ہے کہ اغیار دیکھ دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ ——— سرد ملکوں میں بھی رکھتے ہیں۔ روزہ کی سختیاں بدستور قائم ہیں، خواہ وہ کسی موسم میں پڑیں، اور آج تک مشرق کے ریگستانوں میں جھلساتی ہوئی دھوپ اور جھلساتی ہوئی سموم میں گرمیوں کے لمبے لمبے دنوں میں محمد کے پیرو صبح سے شام تک پانی کا ایک قطرہ حلق کے نیچے نہیں اتارتے۔ ... اتنی سخت ریاضت قوت ایمانی اور ضبط نفس کا پورا امتحان ہے۔ (لائف آف محمد، ص) ۶۶۷ (یعنی ایام قضا کی)

دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ
دعا کرتا ہے تو چاہئے کہ لوگ میرا حکم قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں عجب نہیں
يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ
کہ ہدایت پا جائیں ۞ جائز کر دیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی
إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ
بیویوں سے مشغول ہونا ۞ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس
لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ
ہو ۞ اللہ کو خبر ہو گئی کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا کرتے رہتے تھے ۞
فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ
پس اس نے تم پر رحمت سے توجہ فرمائی، اور تم سے درگزر کر دی ۞ سو اب تم ان سے ملو ملاؤ ۞
وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا
اور اسے تلاش کرو، جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے ۞ اور کھاؤ اور پیو
حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
جب تک کہ تم پر صبح کا سفید خط سیاہ خط سے
الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى
نمایاں ہو جائے ۞ پھر روزہ کو رات (ہونے) تک پورا
اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي
کرو ۞ اور بیویوں سے اس حال میں صحبت نہ کرو جب تم اعتکاف کئے ہو مسجدوں

یعنی جتنے روزے قضا ہو جائیں اُن کی تکمیل کرو تو پُورا پُورا اجر روزوں کی ادائی ہی کا مل جائیگا۔ وَلِتُكَبِّرُوا۔ یہ نحوی حیثیت سے ماتحت میں یُرِیدُ اللہُ کے ہے اور عطف الیسر پر ہے۔ یجوز ان یعطف علی الیسر لہ ویرید بکم لتکملوا (بیضاوی) ۶۶۸ العمارۃ
ہی نفع اور فلاح کی) اور اب بھی ایسی جس میں نہ زیادہ مشقت و تعب، بلکہ ہر ایک کے حالات کی پُوری پوری رعایت۔ ۶۶۹ شکر گزار بن جانے کا کتنا آسان نسخہ اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ ہے۔ بندہ بس اسی پر غور کرتا رہے کہ اللہ نے شریعتِ اسلامی کے
ذریعہ سے کیسے کیسے پُر سہولت طریقے اُسکے نفع اور اجر کے بتادیے ہیں۔ ۶۷۰ (اے پیغمبر!) عَنِّی۔ یعنی میرے قرب و بُعد سے متعلق۔ اقریب ربنا فنناجیہ ام بعید فننادیہ (بیضاوی) گمراہ قوموں نے باری تعالیٰ کے
وجود کا اقرار تو بارہا کیا ہے لیکن ذاتِ باری کو انسان سے اسقدر پرے، مادی و معنوی دونوں حیثیتوں سے فرض کیا ہے کہ وہاں تک بندوں کی رسائی گویا ممکن ہی نہیں! اِذَا سَاَلَكَ۔ اہلِ لطائف نے اس سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ قربِ قبول
طلب پر موقوف ہے۔ عِبَادِیْ۔ خطاب اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ بتوسط آنحضرت صلعم کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے کسی اور کی طرف گمان نہ جائے۔ ۶۷۱ (اور یہ آپ بندوں سے میری طرف سے کہدیجیے) قَرِیْبٌ۔ قریب باعتبار کمال
علم یا قریب باعتبار قبول دُعا۔ ای قریب بالاجابة (ابن عباس)، قریب بالعلم لا یخفی علی شئ (معالم) ای بالاجابة وقیل بالعلم (قرطبی) علماً و اجابةً لتعالیہ عن القرب مکاناً (مدارک) انہ تعالی یسمع دعاءھم و یری تضرعھم او المراد من ھذا القرب
العلم والحفظ (کبیر) قریب سے ظاہر ہے کہ قرب حِسّی یا مکانی تو مراد ہو ہی نہیں سکتا، قربِ معنوی مراد ہوگا۔ تمثیل لکمال علمه بافعال العباد واقوالھم واطلاعه علی احوالھم (بیضاوی) حق تعالیٰ کا قرب اپنے بندوں سے رہتا تو ہمیشہ ہی ہے۔ دعا
میں اس عموم میں خصوص پیدا ہوجاتا ہے اور یہ قرب یا تعلق خاص اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ بندوں کی تسکین و تسلی کا کس قدر سامان اس آیت کے اندر موجود ہے! ہمیں اپنے خدا کو ڈھونڈھنے کہیں اور نہیں جانا ہے۔ وہ تو ہم سے قریب ہی، ہم سے متصل
ہی ہے۔ ۶۷۲ (اور جن دعاؤں کا قبول کرنا میری حکمت کاملہ اور مشیت مطلقہ کے منافی نہیں ہوتا) عَنِّیْ، اِنِّیْ، اُجِیْبُ، دَعَانِ۔ متکلم کی ساری ضمیریں آیت میں بجائے جمع کے واحد کی ہیں۔ دونوں صیغوں کا عمومی فرق ملحوظ رہے صیغۂ جمع عموماً قدرت
عظمت، قوت کا مظہر ہے، اور واحد اس کے برعکس التفات، اختصاص، توجہ کی جانب مشیر ہوتا ہے۔ اور یہاں توجہ و التفات کا مشیر ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ آیت کے الفاظ سے دُعا کی ترغیب و تشویق بھی نکل آئی۔ اور اشارہ اس جانب بھی ہو
گیا کہ دُعا بندہ کا کوئی سرتاسر خود غرضانہ اور دنیوی عمل نہیں، بلکہ عین عبادت اور مُوجب تقرب ہے۔ ایک حدیث صحیح میں یہ مضمون آیا ہے کہ جس کے لئے دُعا کا دروازہ کھل جاتا ہے یعنی دُعا کی توفیق ہوجاتی ہے، اُسکے لئے رحمت کا بھی دروازہ کھل جاتا ہے۔
۶۷۳ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي۔ یعنی میری دعوتِ ایمان و طاعت قبول کریں، جس طرح میں اُن کی دُعائے حاجات قبول کرتا ہوں۔ اذا دعوتھم للایمان والطاعة کما انی اجیبھم اذا دعونی لحوائجھم (مدارک) المعنی فلیجیبوا الی فیما ادعوھم الیه
من الایمان ای الطاعة والعمل (قرطبی عن مجاہد وغیرہ) حکیم مطلق کے کسی حکم کے نامناسب ہونے کا احتمال ہی نہیں بخلاف بندوں کی درخواستوں کے کہ اُن میں بہت سی نامناسب بھی ہوتی ہیں، اور اسی لئے مرتبۂ قبول سے محروم رہتی ہیں (تھانوی)
وَلْيُؤْمِنُوا بِي۔ یعنی یقین رکھیں نہ صرف میرے وجود پر بلکہ میرے حاکم ہونے پر، میرے حکیم ہونے پر، اور میری رعایتِ مصالح پر۔ ۶۷۴ (اور اُن پر فلاح دارین کا دروازہ کھل جائے) لَعَلَّ اُوپر بیان ہوچکا ہے کہ کلامِ الٰہی میں جب حق تعالیٰ کی طرف منسوب
ہوکر یہ لفظ آتا ہے تو اس کے معنی محض اُمید یا احتمال کے نہیں رہتے، بلکہ اس میں یقین پایا جانے لگتا ہے۔ مُراد یہ ہوئی کہ احکامِ الٰہی پر عمل کرنے، اور اُس کے حکیم و حاکم ہونے پر یقین رکھنے سے دروازہ فلاح دارین کا کُھلا کرے گا۔ ۶۷۵ یہ اجازت شروع میں نہ
تھی، ابتداءً روزہ کی حالت میں، رات میں بھی دن ہی کی طرح بیویوں سے علیحدگی کا حکم تھا۔ شریعتِ اسلامی رسول اللہ صلعم کی حیاتِ رسالت میں بتدریج نازل ہوئی۔ کہیں تو ایسا ہوا کہ احکام شروع میں نرم تھے، رفتہ رفتہ سخت کئے گئے جیسا
شراب نوشی کہ پہلے صرف ناپسند کی گئی، اور پھر ہوتے ہوتے اُس کی حُرمت کا حکم آگیا۔ اور کہیں اسکے برعکس ہوا ہے، یعنی ابتداءً قانون سخت تھا، رفتہ رفتہ اس میں سہولتیں اور رعایتیں زیادہ ہوتی گئیں۔ چنانچہ یہی روزہ کا معاملہ ہے کہ پہلے صحبت
رات میں بھی حرام تھی، بعد کو جائز کردی گئی۔ رَفَثُ کے لفظی معنی شہوت انگیز کلام کے ہیں، لیکن جب صیغۂ متعدی میں اسے لایا جاتا ہے تو اس سے مُراد صحبت یا مباشرت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں الرفث الی نسآئکم ہے۔ عدّاہ بالی
لانه فی معنی الافضاء (لسان) جعل کنایة عن الجماع وعدی بالی لتضمنه معنی الافضاء (راغب) کنی به عن الجماع (کشاف) والمراد به ھھنا المباشرة (ابن عربی) یہیں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ بیوی کی طرف میل و رغبت ذرا بھی کمالِ رُوحانیت و تزکیۂ نفس کے
منافی نہیں، جیسا کہ بہت سے مشرکانہ اور جاہلی مذہبوں نے سمجھ لیا ہے، اور ماہ صیام کی طاعت و عبادات اور بیوی سے خلوت و صحبت کے درمیان منافات ذرا بھی نہیں، جیسا کہ مذہب کے جوگیانہ اور راہبانہ تخیل نے دلوں میں بٹھادیا ہے۔ شریعتِ اسلامی
نے جس چیز پر سخت پہرہ بٹھا رکھا ہے، وہ شہوتِ حرام اور اس کے مبادی و مقدمات ہیں، نہ کہ نفسِ شہوت ——— بھوک پیاس نیند کی طرح جنسی بھوک بھی اگر اپنے حدود کے اندر ہے تو ایک طبعی اور بےضرر خواہش ہے۔ قصداً اور بلا ضرورت
شرعی روزۂ رمضان توڑ دینے کی سزا شریعت نے دو مہینے یعنی ساٹھ دن کے مسلسل روزے رکھی ہے اور شوہر و بیوی اگر اپنے مشترک عمل سے روزہ توڑ دیں تو دونوں کی یہی سزا ہے لیکن اگر بیوی رضامند نہ ہو، اور شوہر نے اسے ہمبستری پر مجبور کرلیا، تو بیوی
پر گناہ نہیں۔ البتہ خود جبر کا تحقق ہونا چاہیئے۔ اُسکے لئے صرف ایک روزہ کی قضا کافی ہے۔ کفارہ کی بنیاد قصد و تعمّد پر ہے۔ ۶۷۶ (قرب و اتصال کے لحاظ سے۔ یا ایک دُوسرے کے پردہ دار اور موجب تسکین ہونے کے لحاظ سے گویا اُردو محاورہ
میں دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ ان کے حق میں اوڑھنا بچھونا ہیں، اور یہ اُن کے حق میں۔ یہ لباس کی تشبیہ کس اعتبار سے ہے؟ مختلف زبانوں سے اسکے مختلف جوابات ملتے ہیں بعض نے کہا کہ ایک دُوسرے کے محتاج ہونے کی بنا پر
کسی نے کہا کہ اجسام کی ملابست و ملاصقت کی بنا پر۔ وقس علی ہذا۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کے حق میں لباس کا ایک وصفِ امتیازی اُس کی پردہ پوشی ہے۔ لباس جسم کے عیبوں کو چھپاتا ہے، اُسکے حُسن و خوبی کو اُبھارتا ہے تشبیہ لطیف میں
اشارہ اسی وصف کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہر اسلامی خاندان میں میاں بیوی کو ایک دُوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیئے، اور ایک دُوسرے کی زینت کو بڑھانے والا۔ جو انتہائی گہرا رشتہ اور تعلق میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے اس کی بنا پر ظاہر ہے کہ جتنا
موقع ایک کو دُوسرے کے جسمانی، اخلاقی، رُوحانی عیبوں اور کمزوریوں پر مطلع ہونے کا ملتا ہے اُتنا کسی دوست کو مل سکتا ہے نہ کسی عزیز کو۔ اور نہ ایک کا کوئی راز دوسرے سے مخفی رہ سکتا ہے۔ اس صُورت حال میں عورت کے اخلاق کا کمال یہی ہے
کہ شوہر کی ہر کمزوری کو چھپائے، اس پر صبر کرے، اسے بہتر سے بہتر صُورت میں ظاہر کرے اور ع ناخوش تو خوش بود بر جانِ من کا ثبوت قدم قدم پر پیش کرے۔ علیٰ ہذا مرد کے بھی کمال اخلاق کی یہی معراج ہے! ——— دونوں کی اخلاقی
تکمیل کا یہ مؤثر ترین نسخہ اسلام نے باتوں باتوں میں بغیر کسی شدید اور پُرتعب مجاہدہ میں ڈالے ہوئے روزمرہ کے لطیف و سہل مجاہدات کے ذریعہ بتادیا۔ یہ اس مذہب کی تعلیم ہے جو فرنگی "محققین" کی نظر میں پست اس لئے ہے کہ اُس میں عورت کی تحقیر
کی گئی ہے! ع کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا! کون جھوٹ اس سے بڑھ کر سخت، کونسا اتہام اس سے بڑھ کر صریح ہوگا؟ منوسمرتی والے ہندو مذہب کا ذکر نہیں، عہدِ عتیق و جدید والے یہودی و نصرانی مذہبوں سے سوال ہے کہ اُن کے سارے
دفتر کتب و اسفار میں کونسی تعلیم زن و شو کے باہمی تعلق، محبت و اعتماد کے باب میں اس درجہ کی ہے؟ ۶۷۷ یعنی رات کو چھپ چھپ کر بیویوں سے صحبت کرتے تھے، اور جو حکم ممانعت اب تک تھا اُسے بار بار توڑتے رہتے تھے۔ ۶۷۸ یعنی
پچھلے گناہوں کو معاف کردیا، اور آئندہ کے لئے رمضان میں رات کو بیویوں کے ساتھ خلوت اور صحبت کی اجازت دے دی۔ ۶۷۹ (اپنے معمولی طریقہ پر، جیسے رمضان کے علاوہ دُوسرے زمانوں میں کرتے رہتے تھے) بَاشِرُوھُنَّ صیغۂ امر سے
مُراد اجازت ہے نہ کہ حکم۔ مباشرت سے مُراد عورت سے صحبت کرنا ہے۔ کنایة عن الجماع (قرطبی) کنی به عن الجماع (بیضاوی) ۶۸۰ (بصُورت اولاد اور بطور میاں بیوی کی یکجائی کے قدرتی نتیجہ کے) ما کتب اللہ لکم۔ سے مُراد اولاد اور اولاد
صالح ہے۔ عمل مباشرت اگر صحیح سن میں اور مناسب وقت پر ہو، بڑی گہری طبعی لذت بھی رکھتا ہے، لیکن اسلام نے اس عمل سے اصلی اور بڑا مقصد افزائش نسل و حصول اولاد رکھا ہے کہ اُمّت کی قوت اور کثرت میں برابر اضافہ ہوتا رہے
اور ذاتی لذت اجتماعی منفعت کا زینہ بنی رہے ——— ٹھیک اسی طرح جیسے کھانے پینے کی لذت طبعی ذریعہ بنی رہتی ہے۔ فرد کی حیات و بقا کا، اور اس کی تقویت جسم کا۔ ما قضی اللہ لکم من ولد صالح (ابن عباس) یعنی الولد قاله اکثر
المفسرین (معالم) اور ابن کثیر نے اسی معنی کی تائید میں حضرت ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، انسؓ جیسے صحابیوں سے لے کر قاضی شریح مجاہد، حسن بصری، ضحاک، قتادہ، عکرمہ، عطاء، سعید بن جبیر وغیرہ اکابر تابعین تک سب کا اجماع نقل کر دیا ہے۔
کتب۔ لکھ رکھا ہے۔ یعنی لوحِ محفوظ میں۔ اپنی مشیتِ تکوینی میں۔ ای فی اللوح المحفوظ (معالم) ای اثبت فی اللوح من الولد (کشاف) وابتغوا بعض نے وابتغوا سے مُراد شب قدر کی تلاش اور کتب اللہ لکم کے معنی اسکے اجر و ثواب کے لئے ہیں لیکن
اہل تحقیق نے رد کردیا ہے۔ ھو قریب من بدع التفاسیر (کشاف) وابتغوا سے صاف اشارہ نکل رہا ہے کہ مطلوب افزائش نسل ہو، نہ کہ ارادی لاولدی یا عزل۔ قیل ھو نھی عن العزل (کشاف) قیل النھی عن العزل (بیضاوی) منع حمل اور قطع نسل کی جس جدید تحریک کا اسوقت
زور ہے اور جو ضبط تولید وغیرہ مختلف خوشنما ناموں سے پیش ہو رہی ہے، قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں سب کی تردید کردی اور بتادیا کہ مباشرت کا جو نتیجہ قدرۃً اور طبعاً نکلتا ہے، اسی کی توقع رکھنا چاہیئے اور اسی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ عام قاعدہ اور اصل عمومی یہی ہے
باقی اجتماع زوجی کے قدرتی نتیجوں کو بلا وجہ خاص و ضرورت شدید مصنوعی ذریعوں اور تدبیروں سے روکنا، اور ربڑ وغیرہ کے آلات کو کام میں لانا، مصیبتوں کو دُور کرنا نہیں جسمانی آلام اور اخلاقی امراض کو بڑھانا اور خود زوجین دونوں کو نئے نئے فتنوں کی دعوت دینا ہے
انتہائی سرگرم کوششوں کے باوجود اوّل تو ابھی تک کوئی پوری طرح حمل روک آلہ دریافت ہی نہیں ہوسکا ہے۔ "ابتک کوئی مانع حمل ایسا نہیں دریافت ہوسکا ہے جو ہر طرح قابل اطمینان ہو یعنی قطعی ہو، بےضرر ہو، اور سادہ ہو"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۳، صفحہ ۵۰، طبع چہاردہم)
اور پھر اگر کوئی بےخطا اور پکی تدبیر دریافت ہو بھی گئی، تو منع حمل کی جسمانی مضرتوں کے تدارک کی کیا صُورت ہوگی؟ "یہ باور کرنا دشوار ہے کہ عمل امتناع بار بار کیا جائے اور اس کے مُضر اثرات مرد و عورت کے اعلیٰ صفات پر مرتب نہ ہوں" (ایضاً صفحہ ۲۵) پھر
ماں بھی لیا جائے کہ جلد جلد استقرار حمل اور وضع حمل سے عورت کی صحت خراب ہوجاتی ہے، تو بھی خود طب جدید کا فتویٰ یہ ہے کہ عورت کو زمانۂ حمل میں صنفی اعمال سے جو مہلت مل جاتی ہے نیز وضع حمل کے بعد رضاعت وغیرہ کی مشغولی وہ تو یہ سب عورت کی صحت کے لئے مفید ہی
ہے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اولاد کی پیدائش ہمیشہ والدین کے ارادہ کی تابع نہیں رہتی، چنانچہ ایسے والدین کی مثالیں بار بار مشاہدہ میں آچکی ہیں کہ پہلے تو انہوں نے امتناع کی مصنوعی تدبیریں اختیار کرکے اپنے اعضاءِ تولید کی صلاحیتوں کو ضائع کردیا اور پھر آگے چل کر جب اولاد
کی خواہش یا ضرورت محسوس کی تو اپنی سابقہ حرکتوں پر پچھتائے ہیں۔ یہ سب تصریحات انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ہی سے ماخوذ تھیں، باقی متعدد دوسرے ڈاکٹروں اور انہی میں لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں اور سائنس کے ماہرین نے اس جدید فیشن کی لغویت اور بیہودگی پر اس سے بھی
زیادہ کھلے لفظوں میں کہا ہے اور اسکی طبی مضرتیں کھول کر دکھائی ہیں خصوصاً عورت کے حق میں، بلکہ یورپ کے متعدد ملک تو اس تحریک کے نتائج سے تنگ آکر اور طویل تجربوں کے بعد بالآخر اس پر مجبور ہوئے کہ ماؤں کیلئے انعام قرار دیں اور ہر بچے پر ایک نیا انعام دیں۔ جرمنی، اٹلی وغیرہ
سے تو خبریں کئی سال ہوئے آنا شروع ہوگئی تھیں، اور اب روس، فرانس وغیرہ سے عین دوران جنگ میں آنے لگی ہیں۔ اور بالآخر بات اُسی کی سچی نکلی اور اُسی کی بلند رہی جس نے کہا تھا کہ تزوجوا الولود الودود۔ شادیاں کرو زیادہ بچے پیدا کرنے والی بیویوں سے ۶۸۱ یعنی طلوعِ
صبحِ صادق تک کھانے پینے اور ہمبستری کی اجازت ہے۔ خَیْطُ الْاَبْیَضِ، خَیْطُ الْاَسْوَدِ۔ فجر کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہوجانا کنایہ ہے تاریکی شب کے دُور ہونے اور سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے یعنی طلوعِ فجر سے۔ ای یتضح الیکم بیاض الفجر من سواد اللیل (راغب) یعنی
بیاض النھار من سواد اللیل (معالم) خود شارع اسلام علیہ السلام سے یہی تفسیر مروی ہے۔ ھو سواد اللیل وبیاض النھار (بخاری) خط سے یوں بھی کنایہ تنگ سے ہوتا ہے اور یہاں انہیں خط سے یوں تعبیر کیا گیا ہے کہ شروع میں یہ واقعۃً دھاریاں ہی سی نظر آتی ہیں۔

ے یہ سطور ۱۹۴۲ء میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں لکھی جارہی ہیں۔

الخیط فی کلامھم عبارۃ عن اللون (قرطبی) الخیط الابیض ھو اول ما یبدو من الفجر (کشاف) سمیا خیطین لان کل واحد منھما یبدو فی الابتداء ممتدا کالخیط (اطام) احادیث میں بڑی تاکید کے ساتھ ترغیب دی گئی ہے کہ روزہ دار کی رات بھی حتی الامکان ذکر و عبادت میں بسر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اہل سنت نے اپنا ل جو نماز تراویح پر اتنا زور دیا ہے، وہ صاف اسی منشاء نبوی کی تعمیل ہے۔ مشقت و راحت، تعب و لذت کی جو خوشگوار اور حکیمانہ آمیزش شریعت اسلامی کی ساری عبادتوں میں ہے، اس کا ایک نمایاں نمونہ رمضان کے روزے ہیں۔ دن بھر صبر و ضبط کی مشق، کھانے پینے کا انتظار جس سے کھانے پینے کا لطف دوبرہ کر رہتا ہے۔ شام کے وقت فرحت و تفریح۔ پھر شام سے لے کر صبح صادق تک عبادتوں اور مادی لذتوں کا ملا جلا ہوا تسلسل یہ اسلام ہی کے خصوصیات میں سے ہے۔ من الفجر۔ فجر شرعی سے مراد صبح کاذب نہیں، جب کچھ دیر کے لئے اُجالا شمال و جنوب میں معلوم ہونے لگتا ہے، بلکہ وہ نور کا تڑکا مراد ہے، جو صبح کاذب کے کچھ دیر بعد ہوتا ہے۔ اور روشنی شرقاً غرباً پھیلنے لگتی ہے۔ ھو الفجر المعترض فی الافق یمنۃ و یسرۃ و بھذا جاءت الاخبار و مضت علیہ الامصار (قرطبی) حدیث میں سحری میں تاخیر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ صحیح مسلم میں سمرۃ بن جندب صحابی کی روایت درج ہے، رسول اللہ صلعم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ بلال تو لوگوں کو ہوشیار کرنے کے لئے بہت سویرے اذان دیدیتے ہیں، ان کی اذان سے یا محض شمال جنوب میں روشنی دیکھ کر سحری نہ ختم کر دو، بلکہ روشنی کے پھیل جانے کو یعنی وہی شرقی غربی سپیدہ کو معتبر جانو۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یغرنکم اذان بلال ولا ھذا البیاض لعمود الصبح الافق حتی یستطیر (کتاب الصیام باب فضل السحور) روی الائمۃ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یمنعکم اذان بلال من سحورکم فانہ یوذن بلیل لیرجع قائمکم و یوقظ نائمکم (ابن العربی) بلکہ نسائی کی ایک حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم اور حضرات صحابہ، بالکل صبح ہوجانے تک سحری سے شغل فرماتے رہتے۔ بس اس کا لحاظ رہتا کہیں آفتاب ہی نہ نکل آئے۔ عن زید قال قلنا لحذیفۃ ای ساعۃ تسحرت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو النھار الا ان الشمس لم تطلع (کتاب الصیام، باب السحور) (زید کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے حذیفہ صحابی سے دریافت کیا کہ آپ نے رسول اللہ صلعم کے ہمراہ کس وقت تک سحری کھائی ہے؟ وہ بولے کہ صبح تک۔ بس اتنی کسر رہ گئی تھی کہ آفتاب طلوع نہیں ہو گیا تھا) دوسری روایتیں بھی ایسی ہی تاخیر سحور کی تائید میں ہیں۔ ایک گروہ ادھر گیا ہے کہ سحر اس وقت تک درست ہے، جب تک راستے اور مکانوں میں صبح کی روشنی نہ پھیل جائے۔ قالت طائفۃ ذلک بعد طلوع الفجر و تبینہ فی الطرق والبیوت (قرطبی) اور حضرت عمرؓ اور حضرت حذیفہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جیسے صحابیوں اور متعدد تابعین سے یہ منقول ہے کہ کھانے پینے سے احتیاط اس وقت واجب ہے جب صبح راستوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ظاہر ہو جائے۔ ان الامساک یجب بتبیین الفجر فی الطرق و علی رؤس الجبال (قرطبی) حالت جنابت میں اگر صبح ہو گئی، اور ہنوز غسل کی نوبت نہیں آئی، تو روزہ بلا اختلاف جائز ہوگا۔ وفی تجویز المباشرۃ الی الصبح دلالۃ علی جواز تاخیر الغسل الیہ و صحۃ صوم من اصبح جنبا (ابو السعود) والجمھور من العلماء علی صحۃ صوم من طلع علیہ الفجر وھو جنب (قرطبی) اذا جوز الله الوطء قبل الفجر ففی ذلک دلیل علی جواز طلوع الفجر علیہ وھو جنب و ذلک جائز اجماعا (ابن العربی) ۶۸۲ اِلَى الَّيْلِ۔ یعنی جب رات داخل ہونے لگے۔ یہ مطلب نہیں کہ رات کی تاریکی چھا جانے کے وقت تک روزہ رکھے رہو۔ روزہ رات آتے ہی ختم ہو جانا چاہیئے، یہ نہ ہو کہ رات کا کوئی جزو روزہ میں شامل و داخل ہو جائے۔ الی اللیل ای الی دخول اللیل (ابن عباس) فجعل اللیل غایۃ الصیام ولم تدخل فیہ (جصاص) فانہ تعالی ذکر حد الصوم بان آخر وقتہ اقبال اللیل (ابن جریر) الکلمۃ الی لانتھاء الغایۃ فظاھر الآیۃ ان الصوم ینتھی عند دخول اللیل و ذلک ان اللیل لیس من جنس النھار فیکون اللیل خارجا عن جنس النھار (کبیر) اللیل۔ اور خود لیل کا اطلاق عربی میں دن کے خاتمہ یعنی غروب آفتاب پر معاً ہو جاتا ہے۔ اور اعتبار صرف زوال آثار شمس کا کیا گیا ہے۔ اللیل من مغرب الشمس الی طلوع الفجر الصادق (قاموس۔ تاج) اللیل عقب النھار و مبدءہ من مغرب الشمس (لسان) اس لئے آیت کے معنی صاف یہ ہوئے کہ افطار عین غروب آفتاب کے ساتھ ہو جانا چاہیئے۔ یقتضی الافطار عند غروب الشمس حکما شرعیا (ابن کثیر) اَتِمُّوا۔ صیغہ امر کا ہے، اور وجوب کے معنی دیتا ہے۔ امر یقتضی الوجوب من غیر خلاف (قرطبی) والامر بالاتمام ھنا للوجوب (بحر) صوم وصال یعنی بلا افطار کئے دن اور رات کے مسلسل روزہ کی ممانعت بھی اسی آیت سے بہت سے فقہاء نے نکالی ہے اور حدیث میں اس کی ممانعت صراحۃً موجود ہی ہے۔ فیہ ما یقتضی النھی عن الوصال اذ اللیل غایۃ الصیام و قالتہ عائشۃ (قرطبی) فدل الآیۃ علی نفی کون اللیل محل الصوم و ان یکون صوم الیومین صومۃ واحدۃ وقد استنبط النبی صلی اللہ علیہ وسلم منھا حرمۃ الوصال (روح) معصیت کسی قسم اور کسی درجہ کی بھی ہو مسلمان کے لئے ہر زمانہ اور ہر موسم میں حرام ہے۔ لیکن رمضان کے ماہ مبارک میں یہ ممانعت اشد و اکد ہو جاتی ہے۔ روزہ دار کی رات بھی گویا عبادت میں بسر ہوتی ہے۔ اور دن تو خیر اتنی بڑی عبادت، یعنی حکم الٰہی کے احترام میں لذائذ نفس و طبیعت سے اجتناب میں بسر ہوتا ہی ہے۔ بدگوئی، بدنظری، بدزبانی حرام ہمیشہ ہی ہیں۔ رمضان میں کہنا چاہیئے کہ حرام تر ہو جاتی ہیں۔ پورے مہینہ بھر کے رات اور دن کا ایک ایک لمحہ سپاہ اسلام کی روحانی پریڈ کا زمانہ ہے۔ غفلت کسی لمحہ نہ ہونا چاہیئے۔

الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ
میں ؎ یہ اللہ کے ضابطے ہیں سو ان (سے نکلنے) کے قریب بھی نہ جانا ؎
كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
اللہ اسی طرح اپنے احکام لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے ؎ عجب نہیں کہ
یَتَّقُوْنَ ۝۱۸۷ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ
وہ پرہیزگار بن جائیں ؎ اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اُڑاؤ ؎
بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا
اور نہ اسے حکام تک پہنچاؤ کہ جس سے لوگوں کے
فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ
مال کا ایک حصہ تم گناہ سے کھا جاؤ، درآنحالیکہ تم
تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۸ یَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ
جان رہے ہو ؎ آپ سے لوگ (نئے) چاندوں کے باب میں دریافت کرتے ہیں ؎ آپ کہہ دیجئے کہ
مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ
وہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے (شناخت) اوقات ہیں ؎ اور یہ تو (کوئی بھی) نیکی نہیں کہ تم
تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ
گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ، ؎ البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص
مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا
تقویٰ اختیار کرے ؎ اور گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آؤ ؎ اور اللہ سے تقویٰ

ع ٢٣

سر ڈبلیو۔ ٹی۔ آرنلڈ مسلمان نہیں، مسیحی ہیں۔ تاہم جذبۂ انصاف پسندی و حق گوئی سے مجبور ہو کر بیدردی معاندین کے جواب میں لکھتے ہیں:۔ ماہ رمضان کے روزوں کے سلسلہ میں صرف اس قدر کہنا ہے کہ دین کا یہ رکن بجائے خود اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہے کہ اسلام کی ترویج عیش پرستیوں کے جائز کر دینے سے ہوئی ہے۔ کارلائل کے بقول، محمدؐ کا مذہب تن آسانی کا مذہب نہیں۔ سخت سخت روزے، طہارت کے ضابطے، عبادت کے سخت اور پیچیدہ طریقے، دن میں پانچ پانچ مرتبہ نماز، شراب کی حرمت، یہ احکام جس مذہب میں ہوں، اس کی مقبولیت تن آسانیوں کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ (پریچنگ آف اسلام، ص۴۱۷ طبع ثالث) ملاحظہ ہو ضمیمہ، سورۂ بقرہ کے خاتمہ پر ۶۸۳ (بلکہ کسی قسم کا بھی شہوانی میل جول ان سے نہ رکھو) وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ۔ لفظ مباشرت یہاں وسیع معنی میں ہے، یعنی عمل مجامعت کے علاوہ اس کے مقدمات و دواعی، بوس و کنار وغیرہ بھی شامل ہیں۔ انہ اللمس والقبلۃ (ابن العربی) لا یمس المعتکف امرأتہ ولا یباشرھا ولا یتلذذ منھا بشیء قبلۃ ولا غیرھا (ابن جریر۔ عن مالک بن انس) المراد بالمباشرۃ انما ھو الجماع ودواعیہ من تقبیل ومعانقۃ ونحو ذلک (ابن کثیر) یہ تفسیر حنفیہ و مالکیہ کے مسلک کے مطابق تھی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ چیزیں اعتکاف میں کراہت پیدا کر دیتی ہیں، اسے باطل نہیں کرتیں۔ اما ما دون الجماع من المباشرۃ کالقبلۃ واللمس بالشھوۃ فمکروہ ولا یفسد بہ الاعتکاف عند اکثر اھل العلم وھو اظھر قول الشافعی (معالم) عٰكِفُوْنَ اعتکاف کے لغوی معنی ہیں، اپنے کو کسی شے پر روک رکھنے یا لازم کر لینے کے۔ اصطلاح شریعت میں اس سے مراد ہے مسجد میں بیٹھ کر اپنے کو عبادت کے لئے مقید کر لینا۔ ھو الاحتباس فی المسجد علی سبیل القربۃ (راغب) اعتکف فی المسجد ای اقام بہ ولازمہ وحبس نفسہ فیہ (تاج) الاعتکاف فی اللغۃ الملازمۃ وھو فی عرف الشرع ملازمۃ طاعۃ مخصوصۃ فی وقت مخصوص علی شرط مخصوص فی موضع مخصوص (قرطبی) العکوف ھو الاقامۃ علی الشیء والاعتکاف فی الشرع ھو الاقامۃ فی المسجد علی عبادۃ اللہ (معالم) معتکف کے لئے لازم ہے کہ ہر وقت مسجد ہی میں رہے سہے، کھائے پیئے، سوئے جاگے اور بغیر حاجت یا فرض ضرورت شدید کے مسجد سے باہر قدم نہ نکالے۔ یجب ان لا یخرج الا لما لا بد منہ من حاجۃ الانسان وقضاء فرض الجمعۃ (جصاص) لیس للمعتکف ان یخرج من معتکفہ الا لما لا بد لہ منہ (قرطبی) مدت اعتکاف کے زیادہ سے زیادہ ہونے کی کوئی حد نہیں۔ البتہ اقل مدت امام شافعیؒ کے نزدیک ایک لحظہ بھی ہو سکتی ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے مسلک میں کم از کم ایک شب و روز ہونا چاہیئے۔ واقل الاعتکاف عند مالک وابی حنیفۃ یوم ولیلۃ وقال الشافعی اقلہ لحظۃ ولا حد لاکثرہ (قرطبی) ھو غیر مقدر عند الشافعی واقلہ لحظۃ وقال مالک وابو حنیفۃ ھو مقدر بیوم ولیلۃ (ابن العربی) فِی الْمَسٰجِدِ۔ اس سے استنباط کیا گیا ہے کہ اعتکاف ہمیشہ مسجد ہی میں ہونا چاہیئے۔ اجمع العلماء علی ان الاعتکاف لا یکون الا فی مسجد (قرطبی) البتہ عورتوں کا اعتکاف بجائے مسجد کے

گھر کے کسی گوشہ میں بھی ہو سکتا ہے، جسے نماز وعبادت کے لیے مخصوص کر لیا جائے۔ بلکہ مسجد میں عورت کے اعتکاف کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ اما المرأة فتعتکف فی مسجد بیتها ولو لم یکن لها فی البیت مسجد تجعل موضعًا فیه فتعتکف فیه (بدایہ) والمرأة تعتکف فی بیتها (شرح وقایہ) ویکره فی المسجد ولا یصح فی غیر موضع صلاتها من بیتها (در مختار) دوسرے دُنیوی معاملات مثلاً لوگوں سے بات چیت کرنا حالتِ اعتکاف میں جائز ہیں، بشرطیکہ ان میں کوئی بات احترام مسجد و آدابِ اعتکاف کے منافی نہ پیدا ہو جائے۔ رسُول اللہ صلعم کی عادت مبارک تھی کہ ماہِ مبارک کے آخری عشرہ میں پُورے دس دن کے لیے مسجد میں اعتکاف فرماتے، اور علائقِ دنیوی سے انقطاع جو یُوں بھی کامل رہتا، اس عرصہ کے لیے کامل تر ہو جاتا۔ اعتکاف مسنون یہی ہے اور اسی کو فقہاء نے سنت کفایہ قرار دیا ہے۔ یعنی بستی بھر میں اگر کوئی بھی کرے تو پُوری بستی کی طرف سے وہ سُنت ادا ہو جائے گی۔ باقی نفس اعتکاف، ہر مدت کے لیے، ہر زمانہ میں بہرحال استحباب و فضیلت کی چیز ہے۔ رُوحانی قوت و توانائی کا ذخیرہ اپنے اندر بھرنے کے لیے، اپنے کو رُوحانی و ایمانی اعتبار سے تازہ دم کرنے کے لیے اس سے بہتر اور مؤثر نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ عین اُس زمانہ میں جبکہ میں دن کی مسلسل طاعت و عبادت، اور شب و روز کے ذکر الٰہی و فکر ایمانی سے، روح پر عقل جیکی ہو، ملکوتیت بیدار ہو چکی ہو، انسان اپنے کو چند روز کے لیے کامل یکسُوئی اور انقطاع کے عالم میں لے آئے اور اخلاص و للّٰہیت کی مشقوں کو دعاؤں سے، عبادتوں سے، ذکر و فکر سے منتہائے کمال پر پہونچا دے۔ لیکن ہر کس و ناکس کا ظرف اس مرتبہ کا متحمل نہیں ہو سکتا، عجب عجب غیر متوقع صُورتیں معصیت کی پیش آجاتی ہیں (جیسا کہ ان سطور کے راقم نا سیاہ کو اپنی ذات سے متعلق تلخ و قابل نفریں تجربات ہو چکے ہیں، مثلاً یہی کہ کھانا لانے والا آدمی گھر سے کھانا بہت دیر میں لایا، اور معتکف بے اختیار اُس پر غصہ سے برس پڑا) تو فقہاء نے کہا ہے، کہ ایسی صُورت میں اعتکاف نہ کرنا ہی بہتر ہے کہ معصیت شدید عبادت، اعتکاف کے اُسی طرح منافی اور ناقض ہے جس طرح نماز و طہارت کی ناقض جسمی ناپاکیاں (بول و براز) ہیں۔ المعتکف اذا اتی کبیرة فسد اعتکافه لان الکبیرة ضد العبادة کما ان الحدث ضد الطهارة والصلوة قاله ابن خویزمنداد عن مالک (قرطبی) ویکره الدخول فیه لمن یخاف علیه العجز عن الوفاء بحقوقه (قرطبی) ۶۸۴ بہت ہی برمحل یاد دلا دیا گیا ہے کہ یہ سب ضابطے اور قاعدے خدائے دانا و بینا کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ یہ احکام و ہدایات حکیم مطلق و عالم برحق ہی کی طرف سے ہیں۔ انہیں خاطی انسانوں کے قانون قاعدہ پر قیاس کر کے معمولی باتیں نہ سمجھنا۔ تِلْكَ سے اشارہ اُن سب چھ یا سات احکام کی جانب ہے، جو آیت میں مذکور ہو چکے۔ ای هذه الاوامر والنواهی (قرطبی) ای الاحکام الستة المذکورة (روح) ۶۸۵ یعنی جس طرح اُس نے یہاں روزہ، اُس کے حدود و اوقات، اعتکاف، اور اُس کے متعلقات کے احکام تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں اسی طرح وہ اپنے سارے ہی احکام و شرائع انسان کے سُود و بہبود کے لیے تفصیل سے بیان فرماتا رہتا ہے۔ المراد انه کما تبین ما امرکم به ونهاکم عنه فی هذا الموضع کذلک یبین سائر ادلته علی دینه وشرعه (کبیر) اٰیٰتِهٖ آیات سے مراد احکام یا دلائلِ شرعی ہیں۔ ای امره ونهیه (ابن عباس) ای آیاته الدالة علی بقیة مشروعاته (بحر) ای العلامات الهادیة الی الحق (قرطبی) ۶۸۶ (ان احکام الٰہی پر مطلع ہو کر) احکام الٰہی کی عین تعمیل ہی پرہیزگاری ہے۔ لَعَلَّ سے متعلق اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جب اس کا استعمال ہوتا ہے، تو معنی میں شک تردد نہیں بلکہ یقین کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے یعنی احکام کی تعمیل تمہیں پرہیزگار بناہی دیگی، عمل کر کے تجربہ کر لو۔ ۶۸۷ (اے اہلِ ایمان!) لَا تَاْكُلُوْٓا اکل یہاں لفظی معنی میں نہیں۔ یعنی صرف کھانا مراد نہیں، بلکہ کسی طرح بھی اپنے تصرف میں لے آنا ہے۔ عبّر بالاکل عن انفاق المال (راغب) عبّر به عن الاخذ والاستیلاء (بحر) اردو محاورہ میں بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں، فلاں صاحب یہ کھا گئے، یا رقم ہضم کر گئے۔ بِالْبَاطِلِ۔ باطل سے مُراد ہے ہر ناجائز طریق۔ فاکل المال بالباطل صرفه الی ما ینافیه حق (راغب) ای بالوجه الذی لا یبیحه الله تعالیٰ (بیضاوی) والمراد من الباطل الحرام وکل ما لم یاذن باخذه الشرع (روح) گویا دو مختصر لفظوں میں تقویٰ مالی کی ساری تعلیم آگئی۔ ہر خیانت سے احتیاط کی تاکید، اور ہر قسم کی امانت و دیانت کا حکم۔ اور فقہاء نے اکل باطل کی جو تفصیل لکھی ہے، اُسی میں قمار، غصب، حق تلفی وغیرہ کے ساتھ ایک مد یہ بھی بڑھا دی ہے کہ وہ مال بھی باطل ہی کے حکم میں آجاتا ہے، جو مالا تطیب به نفس مالکه او حرمته الشریعة وان طابت به نفس مالکه (قرطبی) (اُس مال کے مالک سے بغیر اس کی خوشدلی کے حاصل کیا جائے۔ یا مالک گو اسے خوشدلی سے دے رہا ہو لیکن خود شریعت نے اس کو نا جائز قرار دیا ہو) اَمْوَالَكُمْ۔ خطاب تمام مومنین کو ہے، اور حکم کے مخاطب افرادِ اُمت ہیں۔ اُردو میں اموالکم کا صحیح مفہوم "اپنا مال" نہیں بلکہ "ایک دُوسرے کا مال" سے ظاہر ہوگا۔ جیسے اقتلوا انفسکم سے مُراد ایک دُوسرے کا قتل کرنا ہے۔ والمعنی لا یاکل بعضکم مال بعض (بحر) والمعنی لا یاکل بعضکم مال بعض بغیر حق (قرطبی) ڈاکٹر رابرٹ رابرٹس نے ایک کتاب "قرآن مجید کے قوانین معاشرت" پر لکھی ہے۔ اُس میں اس آیت کو نقل کر کے لکھا ہے۔ "یہ آیت اس امر کی شہادت مزید ہے کہ محمدؐ نے اپنے پیرودں میں کتنی تاکید باہمی حسن معاملت کے باب میں رکھی ہے" (سوشل لاز آف دی قرآن، ص۷۱) بَيْنَكُمْ کے دائرہ کی وسعت میں فقہاء نے ساری نسل آدم کو داخل کیا ہے، اور صرف مسلمانوں کے مال تک حکم کو محدود نہیں رکھا ہے، مسلم ہو یا کافر کسی کا بھی مال دغا، فریب، ظلم وغیرہ سے لینا جائز نہیں۔ صرف کافر حربی کے مال پر تصرف و تسلط جائز ہے، کہ اس سے تو اعلان جنگ ہو ہی چکا ہے، لیکن اُس سے بھی علی الاطلاق نہیں، بلکہ خاص خاص قیود و شرائط کے ساتھ۔ رشوت، جعلسازی، خیانت، کافر حربی کے معاملات میں بھی درست نہیں ۶۸۸ (کہ تم ناحق اور زیادتی پر ہو) دُنیا کی کوئی عدالت بہتر سے بہتر ہو، اور کوئی حاکم عادل سے عادل سہی، بہرحال دُنیوی فیصلے علم غیب کی بنا پر نہیں، روداد مقدمہ ہی کی بنا پر صادر ہوں گے۔ اور اُن میں غلطی، لغزش، ناانصافی، دھوکے کا احتمال ہر وقت ہے۔ آیت اسی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہی ہے، کہ جو حق ہے وہ عند اللہ حق ہی رہے گا، اور جو ناحق ہے وہ اللہ کے ہاں ناحق ہی شمار ہوگا۔ اگرچہ حکام کا فیصلہ اُس کے برعکس ہی ہو، قاضی کے فیصلے حق کو ناحق اور ناحق کو حق نہیں بنا سکتے۔ اصل شے انسان کی توجہ و لحاظ کے قابل خود اُس کا ضمیر اور تقویٰ ہے۔ حدیث میں اس مضمون کی صراحت بہت زور کے ساتھ آچکی ہے اور مفسرین بھی اسے خوب صاف کر چکے ہیں۔ اعلم ان قضاء القاضی لا یحل الحرام ولا یحق باطلا انما یقضی القاضی بنحو ما یری ویشهد به الشهود والقاضی بشر یخطی ویصیب (ابن جریر) ومن الاکل بالباطل ان یقضی القاضی لک وانت تعلم انک مبطل فالحرام لا یصیر حلالا بقضاء القاضی لانه انما یقضی بالظاهر وهذا اجماع فی الاموال (قرطبی) علی القول بهذا الحدیث جمهور العلماء وائمة الفقهاء وهو نص فی ان حکم الحاکم علی الظاهر لا یغیر حکم الباطن (قرطبی) وهذا رسول الله صلعم المصطفیٰ للاطلاع علی الغیب بتبرأ من الباطل فکیف بغیره من الخلق (ابن العربی) بلکہ جو لوگ اپنی چرب زبانی سے، سخن سازی سے، اپنے "اثر" و "پیروی" سے جھوٹے مقدمے جیت جائیں، اُنہیں اور زیادہ ڈرنا چاہیئے کہ ان پر علاوہ دُوسرے جرائم اور فریق ثانی کی حق تلفی کے، ایک مزید جرم حاکم عدالت کو فریب میں مبتلا کرنے کا بھی عائد ہوگا۔ تُدْلُوْا بِهَآ۔ هَا کی ضمیر اموال کی طرف ہے۔ ب فعل۔ ادلاء کا حرف صلہ ہے۔ تُدْلُوْا۔ ادلاء کے معنی کنوئیں میں ڈول ڈالنے، اور پھر مجازاً کسی چیز کو کہیں پہونچانے یا اسے ذریعہ و وسیلہ بنانے کے ہیں۔ ادلیته ای اخرجته وقیل یکون بمعنی ارسلتها واستعیر للتوصل الی الشیء (راغب) واصل الادلاء ارسال الرجل الدلو فی سبب متعلق به (ابن جریر) مطلب یہ ہوا کہ مال کو حکام تک پہونچا کر، اپنی رسائی اور رسُوخ پیدا کرنے کا ذریعہ بناؤ۔ اور رشوت وغیرہ، مالی تحفہ و تحائف سے حکام پر اثر نہ ڈالو۔ ای لا ترشوها الیهم (کبیر) ای تلقوا بعضها الی حکام التوصل علی وجه الرشوة (مدارک) اسلامی حکومت قائم ہونا اور اسلام کے سائے قانون دیوانی و فوجداری کا نافذ ہونا تو خیر بڑی چیز ہے، قرآن مجید کی صرف اسی آیت پر اگر آج عملدرآمد ہو جائے، تو جھوٹے دعووں جعلی کاغذات، جھوٹی گواہیوں، جھوٹے حلف ناموں، اہلکاروں، اور عہدہ داروں کی رشوتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکام کی خدمت میں نذر، نذرانوں، قیمتی ڈالیوں، شاندار دعوتوں کا وجود کہیں باقی رہ جائے؟ بِالْاِثْمِ۔ گناہ کا لفظ عام ہے۔ ہر قسم کی معصیتیں جو عدالتی کارروائیوں اور انتظامی معاملات کے سلسلہ میں کام میں لائی جاتی ہیں، اس کے تحت میں آجاتی ہیں۔ ای بالظلم والتعدی (قرطبی) بشهادة الزور او بالایمان الکاذبة او بالصلح مع العلم بان المقضی له ظالم (مدارک) فَرِيْقًا۔ فریق کے معنی یہاں پارٹی یا گروہ کے نہیں، بلکہ حصہ یا جزو کے ہیں۔ ای قطعة وجزءًا (قرطبی) قطعة وجملة (روح) ۶۸۹ (اے پیغمبر! کہ ان کے گھٹنے بڑھنے کی غایت کیا ہے؟) الْاَهِلَّةِ۔ نیا چاند یا ہلال تو ایک وقت میں ایک ہی ہوتا ہے، لیکن یہاں سوال ہلال بصیغہ جمع سے متعلق ہے۔ سوال عن الاهلة کے معنی ہی ہوئے چاند کے مہینوں کی بابت دریافت کرنا، یعنی پہلے چاند کا طلوع ہونا، پھر تاریخ وار اس کا بڑھنا اور پھر تاریخ وار اس کا گھٹنا، یہاں تک کہ اس کا غائب ہو جانا۔ یرید بالاهلة شهورها وقد یعبر بالهلال عن الشهر لحلوله فیه (قرطبی) ای عن زیادة الاهلة ونقصانها (ابن عباس) سئل رسول الله عن زیادة الاهلة ونقصانها واختلاف احوالها (ابن جریر) چاند کے روزانہ (بلکہ شبانہ) تغیرات مشاہدہ کی چیزیں ہیں، اس لیے سوال بھی ان کی بابت آسانی سے پیدا ہوتا ہے۔ آفتاب کے تغیرات علم نظروں کے لیے غیر مشاہد رہتے ہیں ۶۹۰ (اور اس سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت نہیں) قرآن کا ایک ایک فقرہ توحید کے اعلان اور شرک کی تردید میں ہے۔ دُنیا میں مشرک قومیں کثرت سے قمر پرستی میں مبتلا رہی ہیں۔ اور بعض ہلال پرستی میں بھی۔ نئے چاند کو دیوتا مان کر اس کی پُوجا کثرت سے کی گئی ہے۔ اور بڑھتے چاند کو مبارک، اور اُترتے چاند کو منحوس سمجھنے کا رواج تو آج خدا معلوم کتنے مسلمان گھرانوں میں بھی موجود ہے۔ اور ہندوستان میں چھپی ہوئی جس جنتری کو چاہیئے آج اُٹھا کر دیکھ لیجئے، اُس کے کتنے خانے اس سے بھرے ملیں گے کہ فلاں تاریخ فلاں کام کے لیے سعد ہے اور فلاں تاریخ نحس۔ قرآن مجید نے عروج و زوالِ قمر کی یہ غایت بتا کر وہ انسان کے کام آنے والی چیزیں ہیں هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ، ہلال پرستی اور اس کے ماتحت سارے خرافات کی جڑ ہی کاٹ دی! ـــــ احمق انسان، تو چاند کی کیا پُوجا کر رہا ہے، چاند تو خود تیری خدمت کے لیے ہے! مَوَاقِيْتُ جمع ہے میقات کی۔ اور اس کے معنی وقت کے بھی ہیں اور منتہائے وقت کے بھی، اور وقت موعود و متعین کے بھی۔ جمع المیقات وهو الوقت وقیل المیقات منتهی الوقت (قرطبی) الوقت المضروب للشیء (راغب) مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ۔ یعنی اُن کے معاملات دُنیوی میں بھی اور حسابات شرعی میں بھی۔ سنہ قمری میں، دونوں، تاریخوں، مہینوں کا حساب چاند کے عروج و زوال سے ہوتے رہنا ظاہر ہی ہے۔ مفسر تھانوی نے یہاں سے یہ نکتہ خوب نکالا ہے، کہ جب اعمال شرعی کا مدار حساب قمری پر ٹھہرا، تو اس حساب قمری کا اہتمام و انضباط بھی فرض کفایہ ہوا۔ جنہیں انگریزی سنہ سے کاروبار رکھنا ضرورت کے درجہ میں آپڑا ہے، اُن کے لیے تو خیر عذر بھی ہے، لیکن بلا ضرورت سنہ ہجری قمری اسلامی کو چھوڑ کر سنہ شمسی مسیحی انگریزی اختیار کر لینا واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔ وَالْحَجِّ قمری مہینے عام مواقیت انسانی کا تو کام دیتے ہی ہیں، اور ان کے علاوہ حج اور دُوسری طاعتوں اور عبادتوں کے لیے بھی معیار و مدار وہی ہیں۔ حج کا ذکر تخصیص کے ساتھ شاید اس لیے فرمایا گیا ہو کہ اس کی اہمیت عرب کے ہر شعبہ زندگی میں بہت نمایاں تھی ۶۹۱ (جیسا کہ مشرکین عرب اپنی سفاہت سے سمجھ رہے ہیں) جاہلی عرب جب احرام حج کی حالت میں ہوتے تو گھر میں جانے کے لیے دروازہ سے داخل ہونے کو نحوست اور بدشگونی سمجھتے، بلکہ پُشت کی دیوار میں ایک بڑا سا روزن پیدا کر دیتے، اور اُسکے اندر سے مکان میں داخل ہوتے، یا پیچھے کی طرف سے چھت پر چڑھ جاتے، اور اس سے اندر پھاندتے، اور اسے اپنے نزدیک کوئی بڑی عبادت اور خانہ کعبہ کی تعظیم سمجھتے۔ کانوا اذا احرموا فی الجاهلیة اتوا البیت من ظهره (بخاری) کانوا اذا حجوا الوصید خلوا بیوتهم من ابوابها بل کانوا ینقبون فی ادبارها (ابن جریر) اذا احرم الرجل منهم نقب کوة فی ظهر بیته فجعل سلّمًا فجعل یدخل منها (ابن جریر) بعض قبیلوں کے نو مسلم صحابی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا

ہو گئے۔ اُنہی کی اصلاحِ خیال کے لیے آیت نازل ہوئی، اور عقیدۂ جاہلی کی تصحیح کی گئی۔ نزلت فی نفر من اصحاب النبی صلعم کنانۃ وخزاعۃ کانوا یدخلون بیوتھم فی الاحرام من خلفھا او من سطحھا کما فعلوا فی الجاھلیۃ (ابن عباس) مفسر قرطبی نے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ انصارِ مدینہ جب حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتے تھے، تو اپنے اور آسمان کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا تقویٰ اور آدابِ احرام کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور واپسی میں اپنے مکان میں دروازوں سے نہیں داخل ہوتے تھے۔ وکان الانصار اذا حجوا وعادوا لایدخلون من ابواب بیوتھم ...... فکانوا یرون ھذا من النسک والبر (قرطبی) یہ رسم چونکہ حج ہی کے سلسلہ میں تھی، اس لیے اس کا ذکر بھی حج ہی کے متصل فرمایا گیا ۶۹۲ (اور تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی منع کی ہوئی اور حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے ڈرا جائے، بچا جائے) ای فخافہ وتجنب محارمہ واطاعہ باداء فرائضہ التی اوجبھا (ابن جریر) ضمناً یہیں سے یہ بات بھی صاف ہو گئی، کہ اصل نیکی تقوائے الٰہی ہے۔ یعنی احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کا خوف، نہ کہ بنے کسی گڑھے ہوئے دستور و رواج کا اتباع ۶۹۳ (جب آ جایا ہو اور گویا رسومِ شرکِ جاہلیت کو پامال کرتے ہوئے) آیت سے فقہائے امت کو ایک بڑی اصل ہاتھ آ گئی ہے، جس سے صدہا ہزارہا اعمال کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ اصل یا قاعدہ یہ ہے کہ جو شے شریعت میں صرف مباح ہو، یعنی کتاب و سنت میں اس کی کوئی نظیر یا مثال طاعت و عبادت کے حکم میں نہ ملے، اُسے اپنے دل سے طاعت و عبادت ٹھہرا لینا، یا اسی طرح اسے بلا دلیلِ شرعی، معصیت و محلِ ملامت یقین کر لینا، یہ دونوں اعتقاداً گناہ ہیں، اور ہر بدعت اسی حکم میں داخل ہے۔ ھذا دلیل علی مسئلۃ من الفقہ وھی ان الفعل بنیۃ العبادۃ لا یکون الا فی المندوب وبات خاصۃ دون المباح ودون المنھی عنہ وھذا اصل حسن (ابن العربی) فی ھذہ الآیۃ بیان ان ما لم یشرعہ اللہ قربۃ ولا ندب الیہ لا یصیر قربۃ بان یتقرب بہ متقرب (قرطبی) قال ابن خویز منداد اذا اشکل ما ھو بر وقربۃ بما لیس ھو بر وقربۃ ان ینظر فی ذلک العمل فان کان لہ نظیر فی الفرائض والسنن فیجوز ان یکون وان لم یکن فلیس ببر ولا قربۃ (قرطبی)

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٨٩﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اختیار کیے رہو، تاکہ تم فلاح پا جاؤ ۶۹۴ اور اللہ کی راہ میں لڑو ان لوگوں سے جو

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

تم سے لڑتے ہیں ۶۹۵ اور حد سے باہر مت نکلو، کہ اللہ حد سے باہر نکل جانے

لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿١٩٠﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ

والوں کو پسند نہیں کرتا ۶۹۶ اور انہیں جہاں کہیں پاؤ قتل کرو،

ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ

اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے تم انہیں نکالو ۶۹۷

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ

فتنہ تو قتل سے (بھی) سخت تر ہے، ۶۹۸ اور ان سے مسجد حرام کے

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ

قریب قتال نہ کرو، جب تک وہ (خود) تم سے قتال نہ کریں ۶۹۹

فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ

ہاں اگر وہ (خود) تم سے قتال کریں تو (تم بھی) انہیں قتل کرو۔ یہی سزا ہے

الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩١﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

کافروں کی ۷۰۰ پھر اگر وہ باز آ جائیں ۷۰۱ تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا ہے،

رَّحِيْمٌ ﴿١٩٢﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ

بڑا مہربان ہے ۷۰۲ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فساد (عقیدہ) باقی نہ رہ جائے ۷۰۳

قرطبی نے ابن عباسؓ کی سند سے حدیثِ نبوی بھی نقل کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلعم تقریر فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑا ہوا ہے۔ دریافت فرمایا، معلوم ہوا کہ وہ ابو اسرائیل انصاری ہیں، اور اس کی نذر مانے ہوئے ہیں کہ روزہ رکھ کر بیٹھیں گے نہیں کھڑے ہی رہیں گے، اور سایہ میں نہ کھڑے ہوں گے اور کسی سے بات چیت نہ کریں گے، خاموش رہیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ انہیں وہاں سے ہٹا لاؤ۔ مروہ فلیتکلم ولیستظل ولیقعد ولیتم صومہ (وہ بات چیت بھی کریں، اور سایہ میں رہیں، اور بیٹھ بھی جائیں اور اسی حال میں روزہ تمام کریں۔ اسلام نام صرف امتثالِ امر کا ہے اور ایمان کی حقیقت فقط تعمیلِ احکام کی ہے۔ خودرائی اس راہ میں سرتاسر کج رائی ہے ۶۹۴ (دنیا اور آخرت دونوں میں) تقویٰ (خوفِ خدا) اور فلاح (انتہائی کامیابی) کے قریب ترین تعلق کو آیت ایک بار پھر واضح کرتی ہے، اور اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کرتی ہے کہ فلاحِ دارین کا اصل اصول تقویٰ ہی ہے۔ خشیتِ الٰہی اور محبتِ الٰہی کے درمیان نسبت تضاد، تخالف، بلکہ تباین کی بھی بالکل نہیں، بلکہ علاقہ توافق و مناسبت کا ہے۔ مخلوقات میں جس کسی چیز سے خوف کیا جاتا ہے اُس میں خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سے بھگاتی ہے، ہٹاتی ہے، دور کرتی ہے۔ لیکن خشیتِ الٰہی میں تو اس کے برعکس ایک کشش ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف لاتی ہے، کھینچتی ہے، بلاتی ہے، اللہ سے قریب تر کرتی ہے، اور اس طرح عملاً محبتِ الٰہی کے مرادف ہے۔ اہلِ تقویٰ اور صالحین سے جس خوف کی نفی کی گئی ہے، وہ "دہشت" کے مرادف ہے، اور وہ "وحشت" سے پیدا ہوتا ہے۔ خشیتِ الٰہی، اس کے ٹھیک برعکس، احساسِ **عظمت** سے پیدا ہوتی ہے، اور وہ ربِ عظیم و معظم سے قریب تر لانے والی ہوتی ہے۔ خوفِ خدا کی ترغیب اور خشیتِ الٰہی کی تاکید سے قدیم صحیفے بھی لبریز ہیں، مثلاً۔ "خداوند کا خوف، دانش کی ابتدا ہے" (امثال سلیمانی۔ ۱:۷) "خداوند کا خوف، دانائی کا شروع ہے" (امثال سلیمانی ۹:۱۰) "خدا سے ڈر اور اُس کے حکموں کو مان، کہ انسان کا فرضِ کلی یہی ہے" (واعظ کی کتاب۔ ۱۲:۱۳) ۶۹۵ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ قتال کا یہ حکم اُن مظلوم مسلمانوں کو مل رہا ہے، جو دو چار مہینے نہیں، پورے تیرہ برس مکہ میں ہر طرح کے شدائد پر، اور شدائد کیسے، یہ کیسے شقاوت، سفاکی، بہیمیت پر، صبر کے امتحان میں پورے اتر چکے تھے، اور اب وطن سے بے وطن ہو کر، گھر بار چھوڑنے پر بھی، مدینہ میں چین سے نہیں بیٹھنے پاتے تھے۔ اللہ تربت ٹھنڈی رکھے لارڈ ہیڈلے انگریز کی۔ نو مسلم ہو کر بات پتہ کی کہہ گیا ہے کہ اسلامی غزوات کے تین ابتدائی جغرافی محلِ وقوع کو دیکھ کر خود فیصلہ کر لو، کہ لڑائی کی ابتدا کس نے کی، اور چڑھائی کون کس پر کر کے گیا تھا، حملہ و جارحانہ اقدام کون کر رہا تھا، اور حفاظتِ خود اختیاری و مدافعت میں کون لڑ رہا تھا؛ مکہ کے جنگجو اہلِ فساد، یا مدینہ کے صابر و شاکر مومنین؟ (۱) **جنگِ بدر**۔ بدر میں ہوئی، مدینہ سے کل تیس میل کے فاصلہ پر۔ (۲) **جنگِ احد**۔ احد تو مدینہ سے کل بارہ ہی میل ہے (۳) **جنگِ احزاب**۔ اس میں تو محاصرہ خود مدینہ ہی کا ہوا، غرض ہر دفعہ قریشِ مکہ یا اُن کے حلیف و مددگار ہی چڑھ چڑھ کر آئے۔ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ۔ خود یہ لفظ کیا بتا رہے ہیں؟ دو باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں، (۱) ایک یہ کہ جنگ کی ابتدا کرنے والے مسلمان نہ تھے۔ ابتدا دوسرا ہی فریق کرتا تھا۔ ای الذین یبدؤنکم بالقتال (ابن عباسؓ) ای ینلجزونکم القتال دون المحاجزین (مدارک) ای یحل لکم القتال ان قاتلکم الکفار (قرطبی) (۲) دوسرے یہ کہ قتال کا حکم صرف انہی افراد کے مقابلہ میں ہے جو واقعی لڑ رہے ہوں، یا آج کل کی اصطلاح میں صرف مصافیوں **Combatants** کے مقابلہ میں۔ غیر مصافی **Non-combatants** آبادی کے سروں پر بم برسا دینے، پُرامن شہریوں پر ہوائی تاخت کرنے، اور ان پر زہریلی گیسیں چھوڑنے کے "مہذب ترین" آئینِ حرب سے اسلام کا قانونِ جنگ ناآشنا ہے۔ بوڑھوں، بچوں، عورتوں، اپاہجوں، بیماروں، گوشہ نشینوں، غرض ایسے کل لوگ جو جنگ سے معذور ہوں، انہیں رسولؐ کے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تو صراحت کے ساتھ مستثنیٰ قرار دیا ہی ہے، لیکن خود آیت بھی اس استثنا کی جانب صاف مشیر ہے۔ لاتقتلوا النساء ولا الصبیان ولا الشیخ الکبیر ولا من القی الیکم السلم وکف یدہ (ابن عباسؓ) ای لا تقاتلوا من لا یقاتل یعنی النساء والصبیان والرھبان (ابن جریر عن عمر بن عبد العزیز) عن ابن عمرؓ قال وجدت امرأۃ فی بعض مغازی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقتولۃ فانکر رسول اللہ صلعم قتل النساء والصبیان (بخاری، مسلم) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا بعث جیشا قال اغزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ ...... ولا تقتلوا امرأۃ ولا ولیدا ولا شیخا کبیرا (مسلم عن بریدہ) امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اصل حکم میں تو پھل دار درخت کو کاٹنے تک کی ممانعت ہے۔ آپ نے یہ حکم خلافتِ اسلامیہ کے پہلے سپہ سالارِ فوج (کمانڈر انچیف) یزید بن ابی سفیانؓ کو دیا تھا۔ اور اُن کی مشایعت آپ نے پا پیادہ چل کر کی تھی۔ اس حکمنامہ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ وانی اوصیک بعشر لا تقتلن امرأۃ ولا صبیا ولا کبیرا ھرما ولا تقطعن شجرا مثمرا ولا تخربن عامرا ولا تعقرن شاۃ ولا بعیرا الا لماکلۃ ولا تحرقن نخلا ولا تغرقنہ (طبقات ابن سعد) البتہ الذین یقاتلونکم سے یہ بھی مراد نہیں کہ جب دشمن واقعۃً سر پر آ جائے، اور لڑائی شروع کر دے، جبھی تم قتال کرو۔ اتنے انتظار و توقف کے معنی یہ ہوں گے کہ آدھی جیت اُن کی ہو گئی، جیسا کہ اس زمانہ کی لڑائیوں میں برابر مشاہدہ بھی ہو رہا ہے۔ بلکہ غنیم کا ارادہ اور آمادگی ہی اُسے اس حکم کے تحت میں لے آنے کے لیے کافی ہے۔ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ قید کتنی اہم اور دنیا کی تاریخِ محاربات میں کیسی انقلاب انگیز ہے! دنیا میں لڑائیاں ہمیشہ لڑی گئیں، اب بھی لڑی جا رہی ہیں، آئندہ بھی لڑی جائیں گی۔ لیکن کاہے کے لیے؟ زر کے لیے یا زن کے لیے، یا زمین کے لیے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ "قوم" اور "وطن" کے لیے، یعنی زر و زمین کی طلب فرد کے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے رہ جائے۔ یہ خصوصیت صرف اسلامی جہاد "بنام و رسوا" اسلامی جہاد کی ہے، کہ جب کبھی اور جن حالات میں شروع ہو، اللہ کی راہ میں ہو۔ شرک کو مٹانے اور توحید کو بلند کرنے کے لیے ہو، دینِ حق کی حمایت و نصرت میں ہو۔ انسانی حکومت مٹا کر، خدائی حکومت قائم کرنے کے لیے ہو۔ خودی کے لیے نہیں خدا کے لیے ہو، نفس کے لیے نہیں، قبیلہ کے لیے نہیں "حلقۂ اثر" کی توسیع کے لیے نہیں، "آزادیٔ تجارت" کے لیے نہیں، "آزادیٔ سمندر" کے لیے نہیں، "نو آبادیوں" کے تحفظ کے لیے "برآمد کی منڈیاں" پیدا کرنے کے لیے نہیں، نام و نمود اور بڑائی کی کسی قسم کی بھی عصبیتِ جاہلی کے جھنڈے کے نیچے نہ ہو، صاف صاف فی سبیل اللہ ہو۔ اور فی سبیل اللہ کے معنی ہیں لاعزاز دین اللہ۔ الجھاد لاعلاء کلمۃ اللہ واعزاز الدین (مدارک) ای جاھد والاعلاء کلمتہ واعزاز دینہ (بیضاوی) ای فی طاعتہ وطلب رضوانہ (کبیر) المحکمۃ (قرطبی) قتال کا طریقہ دوسری امتوں سے نرالا کچھ امتِ محمدی کے ساتھ مخصوص نہیں، بائبل میں اس کا ذکر ایک دو جگہ نہیں، بیسیوں جگہ موجود ہے۔ اور محاربات یہود سے تو تاریخ کے دفتر کے دفتر رنگین ہیں۔ ربانی مسیحی قومیں

اور ان کی خونریزیاں اور خونچکانیاں، تو ان کی نظیر تو دنیا کے پردہ پر کہیں نہ ملے گی۔ عیاں راچہ بیاں! اور جو عظیم نمایاں فرق اسلامی فاتحین کی رحم دلی اور مسیحی فاتحین کی سنگدلی کے درمیان رہا ہے، اس کا اعتراف تو خود مسیحی اہل قلم کو ہے۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو
Finlays' Greece under the Romans.* صـ۳۵۳۔ نیز Bosworth Smith's Mohammad & Mohammadanism صـ۲۱۸ و صـ۲۱۹۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ آیت ماقبل میں ابھی ابھی
تقوی کی تاکید آ چکی ہے اب اسی مناسبت سے ذکر تقوی کی شدید ترین اور نفس کے لیے دشوار ترین قسم یعنی قتال و جہاد کا شروع ہوا ہے۔ لما امرھا بالتقوی امر فی ھذہ الآیۃ باشد اقسام التقوی واشقھا علی النفس (کبیر) ۶۹۶ وَلَا تَعْتَدُوْا۔
اِعتداء کے لغوی معنی حق سے تجاوز کر جانے کے ہیں۔ مجاوزۃ الحق۔ اور اس تجاوز کی متعدد صورتیں ممکن ہیں۔ حد سے مراد حد شریعت بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ انتقام کے جوش یا فتحمندی کے زور میں بے تحاشا غنیم کے مصافی و غیر مصافی سب کو قتل کرنا شروع کر دیا
جائے۔ ان کے کھیتوں، باغوں، چراگاہوں میں آگ لگا دی جائے، ان کے بے زبان جانور تلوار کے گھاٹ اتار دیئے جانے لگیں، وقس علی ہذا۔ قرآن نے دنیا کو سبق یہ دیا کہ قوت کا استعمال صرف اسی حد تک جائز ہے جس حد تک ناگزیر ہے۔ حد سے مراد حد معاہدہ
بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ بدعہد و پیمان شکن قوموں کی دیکھا دیکھی خود بھی معاہدوں کی پروا نہ کی جائے، اور عہد شکنی کی ابتداء اپنی طرف سے کر کے بزدل دیا جائے۔ اسی طرح اور بھی پہلو تجاوز حدود کے نکل سکتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اعتداء کا لفظ زیادتی کے ہر پہلو کو جامع
ہے، اور ہر قسم کی زیادتیوں کی ممانعت اس سے نکل آئی۔ ای لاتعتدوا بابتداء القتال او بقتال المعاھد او للمفاجاۃ بہ من غیر دعوۃ او المثلۃ او قتل من نھیتم عن قتلہ (بیضاوی) ای لاتعتدوا بوجہ من الوجوہ (روح) اور اعتداء اور تجاوز
کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ قتال علاوہ فی سبیل اللہ کے کسی اور غرض کے لیے شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ بعض دقیق النظر مفسرین نے یہ پہلو بھی لیا ہے۔ ای لاتقاتلوا علی غیر الدین (ابن العربی) المعنی لاتعتدوا فی القتال لغیر وجہ اللہ کالحمیۃ وکسب الذکر (قرطبی)
غلبہ و اقتدار کے وقت انتقام کے حدود کے اندر رہنا اخلاق کے مرتبہ اعلیٰ کا مقام ہے۔ اچھے اچھوں کی عقل، متانت اور قوت عدل و توازن اس وقت جواب دے دیتی ہے اور کل کے مظلوم بیساختہ اور شاید بے شعوری کے عالم میں آج کے ظالم بن جاتے ہیں،
قرآن مجید کا اس موقع پر اپنے پیرووں کو ضبط و احتیاط کی تلقین کرنا، افراد امت کو حکمت و اخلاق فاضلہ کے بلند سے بلند مقام پر پہونچا دینا ہے۔ اور پھر جب یاد کر لیا جائے، کہ آیت کا موقع نزول ذیقعدہ سنہ ہجری ہے، جب معاہدہ حدیبیہ کے دوسرے
سال مسلمان عمرہ کی نیت سے مکہ روانہ ہو رہے تھے، اور اندیشہ تھا کہ مشرکین معاہدہ کو توڑ کر جنگ شروع کر دیں گے، اور اسکے جواب میں قدرۃً مسلمان بھی اشتعال سے لبریز ہو جائیں گے۔ تو آیت کے اس تاکیدی اور امتناعی حکم کی قدر و منزلت کس درجہ اور بڑھ جاتی
ہے! پھر فتحمندی کی گھڑیوں میں ایسی ہدایت پر عمل دنیا کی کسی قوم نے آج تک کیا ہے، بجز رسولؐ کے صحابیوں، اور خلافت اسلامیہ کے سپاہیوں کے؟ سوال عقیدت کا نہیں محض تاریخ کا ہے۔ ۶۹۷ وَاقْتُلُوْھُمْ میں ھم کی ضمیر انہی لوگوں کی طرف ہے جو
مسلمانوں سے لڑنے نکلے ہیں۔ والضمیر عائد الی الذین امر بقتالھم فی الآیۃ الاولی (کبیر) حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ۔ یعنی ان مقاتلین محاربین کو جہاں کہیں بھی پکڑ پاؤ، اور جب کبھی ان پر غلبہ حاصل کر پاؤ، قتل کر دو۔ ھم الکفار من اھل مکۃ فامر اللہ تعالیٰ
بقتلھم حیث کانوا فی الحل والحرم وفی الشھر الحرام (کبیر) ای حیث وجدتموھم من حل او حرم (ابو سعود) وَاقْتُلُوْا کے صیغۂ جمع سے فقہاء حنفیہ نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ قتال و جہاد فریضۂ انفرادی نہیں ہے، امام کی معیت میں ہے۔ لشکر کا وجود بوجوب
بطور عبارۃ النص کے نکلا اور امام کا بطور اقتضاء النص کے، کہ لشکر کا انتظام و اجتماع بغیر ایک امام کے ممکن نہیں۔ مِنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ یعنے سرزمین مکہ سے۔ مِنْ حَیْثُ کے معنی جہاں سے کے علاوہ جس طرح سے کے بھی ہیں۔ وَاَخْرِجُوْھُمْ۔ مراد
ہے کہ سرزمین مکہ سے انہیں چاہے مار دو، چاہے نکالو، جو بھی تمہیں اپنی قدرت و مصلحت کے مطابق نظر آئے۔ والمراد افعلوا کل ما تیسر لکم من ھذین الامرین فی حق المشرکین (کبیر) ۶۹۸ (اپنی مضرتوں اور مفسدوں کے لحاظ سے) مفسر تھانویؒ نے
خوب لکھا ہے کہ مشرکوں کی شرارت جسے یہاں فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے، وہی تو اصل جڑ تھی اور اخراج و قتل، وغیرہ اس کی سزائیں تو محض فرع ہوئیں۔ الفتنۃ، فتنہ سے مراد شرک یا اس کی ترغیب تحریص و اہل توحید کی تخویف ہے۔ الفتنۃ الشرک باللہ وعبادۃ الاوثان
(ابن عباسؓ) اقدام الکفار علی الکفر وعلی تخویف المؤمنین (کبیر) روی عن جماعۃ من السلف ان المراد بالفتنۃ ھھنا الکفر۔ قیل انھم کانوا یفتنون المؤمنین التعذیب بکر ھونھم علی الکفر (جصاص) کفر و ترغیب کفر کو فتنہ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ نظام کفر
آخر دنیا کو فتنہ و فساد، کشت و خون، غدر و بد امنی ہی کی طرف لیجاتا ہے۔ انما سمی الکفر بالفتنۃ لانہ فساد فی الارض یؤدی الی الظلم والھرج وفیہ الفتنۃ (کبیر) اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ یعنی حرم میں قتل و خوں سے بھی شناعت میں کہیں بڑھا ہوا، اور جو اس مرکز توحید و ایمان میں
شرک اشاعت شرک و تبلیغ شرک کا ہو۔ اشد من القتل فی الحرم (ابن عباسؓ) ای شرکھم باللہ اعظم من القتل الذی یحل بھم منکم (مدارک) یجوز ان یراد فتنتھم ایاکم بصدکم عن المسجد الحرام اشد من قتلکم ایاھم فی الحرم (کشاف) یعنی کفرھم وتعذیبھم المؤمنین
فی البلد الحرام وفی الشھر الحرام اشد واعظم اثما من القتل فی الشھر الحرام (جصاص) دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کمزوروں کی یہ مسلسل و غیر منقطع ایذائیں اور مظالم قتل سے بھی کہیں زیادہ سخت و ناقابل برداشت ہیں۔ بعض قدیم اکابر کی نظر بھی اسی پہلو کی طرف گئی ہے۔
ای المحنۃ التی یفتتن بھا الانسان کالاخراج من الوطن اصعب من القتل لدوام تعبھا وتالم النفس بھا (بیضاوی) ای المحنۃ والبلاء الذی ینزل بالانسان یتعذب بہ اشد علیہ من القتل (کشاف) الاخراج من الوطن لما فیہ من مفارقۃ المالوف والاحباب و
تنغیص العیش دائما (بحر) ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ یہاں فتنہ سے مراد وہ ابدی عذاب اخروی ہے جو انہیں کفر کی سزا میں ملے گا۔ گویا ارشاد یہ ہے کہ وہ دائمی عذاب دنیا کی سزائے قتل سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور عذاب پر اس معنی میں فتنہ کا اطلاق جائز ہے
المراد من الفتنۃ العذاب الدائم الذی یلزمھم بسبب کفرھم (کبیر) واطلاق اسم الفتنۃ علی العذاب جائز وذالک من باب اطلاق اسم السبب علی المسبب (کبیر) والکفر باللہ یقتضی العذاب الدائم والقتل لیس کذلک (بحر) ۶۹۹ کہ یہاں قتال کی
ابتدا بلا وجہ اور بلا ضرورت کر دینے سے حدود حرم کی ہتک لازم آتی ہے، عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یعنی حرم شریف یا مسجد کعبہ کے گرد و نواح میں کئی میل کا پورا علاقہ جو اصطلاح میں حرم کہلاتا ہے۔ اور اسکے احترام کے خاص آداب و قواعد ہیں۔ عند المسجد الحرام
یقع علی الحرم کلہ (مدارک) نزول آیت کے وقت مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان عارضی صلح کا معاہدہ تھا۔ یہاں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اس پاس معاہدہ کے علاوہ مسلمانوں کے لیے یہ دوسرا مانع احترام حدود حرم کا بھی تو ہے۔ بعض تابعین اور فقہاء حنفیہ نے
آیت سے یہ مستقل حکم نکالا ہے کہ مسجد حرام میں قتل و قتال ناجائز ہے، تاوقتیکہ وہ جواب مدافعت میں نہ ہو۔ قال مجاھد لا یجوز قتال احد فی المسجد الحرام الا بعد ان یقاتل وبہ قال طاؤس وھو الذی یقتضیہ نص الآیۃ (قرطبی) والیہ ذھب ابو حنیفۃ واصحابہ (قرطبی)
فیہ قولان احدھما انہ محکم قالہ مجاھد وابو حنیفۃ (ابن العربی) ۷۰۰ حفاظت خود اختیاری حدود حرم کے اندر بھی قتال کو جائز کر دے گی۔ کَذٰلِکَ۔ یعنی یہی سزائیں جو اوپر گزر چکیں، وطن سے اخراج اور حدود حرم کے اندر قتل۔ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ۔ یعنی ایسے معاہد
پیمان شکن، بے ادب کافروں کی سزا۔ ”کفار کے ساتھ جبکہ شرائط جواز کے پائے جائیں، ابتداء قتال شروع کرنا درست ہے۔ اور اس مقام پر جو ابتداء بالقتال سے ممانعت فرمائی ہے تو وہ صرف وجہ معاہدہ کے ہے۔ تو معاہدہ میں ابتداء ناجائز ہے۔ البتہ اگر معاہدہ کا
باقی رکھنا مصلحت نہ ہو تو صاف اطلاع کر دی جائے کہ ہم وہ معاہدہ باقی نہیں رکھتے۔ پھر قتال جائز ہے۔ اسی طرح اگر وہ لوگ معاہدہ توڑ دیں تب بھی قتال جائز ہے“۔ (تھانویؒ) ۷۰۱ (محض جنگ سے نہیں جسے انہوں نے شروع کیا تھا، بلکہ عقائد کفر و شرک سے جو
محرک اور باعث بنے ہوئے تھے جنگ و قتال کے)۔ ای عن الکفر والشرک وقاتلوا (ابن عباسؓ) ای فان تابوا (ابن جریر عن مجاھد) من قتالکم وکفرھم باللہ (ابن جریر) عن الشرک والقتال (مدارک) یعنی انتھوا بالایمان (ابن العربی) عن الکفر بالتوبۃ منہ کما
روی عن مجاھد وغیرہ او عن القتال (روح) فَاِنِ انْتَھَوْا۔ ضمیر غائب کفار محاربین کی طرف ہے۔ حرف تعقیب فَ سے مراد ہے، جنگ شروع کرنے کے بعد۔ جن مفسرین جدید نے انتھوا سے صرف جنگ سے باز آ جانا مراد لیا ہے، انہوں نے سخت
غلطی کی ہے ۷۰۲ (اس لیے ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی، انہیں دائرہ اسلام میں داخل سمجھا جائے گا، اور ان کے اسلام کو لا حاصل یا بے قدر نہیں سمجھا جائے گا) آیت کے اس جزو نے ان انتھوا کے اس مفہوم کو خود قرآن ہی سے واضح کر دیا، کہ مراد کفر و شرک کو
باز آنا ہے، نہ کہ محض جنگ و قتال سے۔ صفات مغفرت و رحمت کا ترتب کفر ہی سے تائب ہونے پر ہو سکتا ہے نہ کہ محض ترک جنگ پر۔ جو کفر سے تائب ہو گیا اسکے پچھلے گناہ بھی معاف ہو جائیں گے، اور آیندہ بھی اس کے ساتھ معاملہ رحمت کا ہو گا، جیسا کہ خود
قرآن ہی میں دوسری جگہ ہے۔ قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف۔ غفور لمن تاب ورحیم لمن مات علی التوبۃ (ابن عباسؓ) فان اللہ یغفر لھم جمیع ما تقدم ویرحم کلا منھم بالعفو عما اجترم (ابن العربی)
وذلک حق علیہ الغفران والرحمۃ وھما لا یکونان مع الکفر (بحر) فقہاء و مفسرین نے آیت سے قاتل کی قبول توبہ کا مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کفر کی توبہ قبول ہو سکتی ہے، تو قتل عمد تو کفر سے خفیف تر ہے، اس سے توبہ کیوں نہ قبول ہو گی
وفیہ دلالۃ علی قبول توبۃ قاتل العمد اذ کان الکفر اعظم ماثما من القتل وقد اخبر تعالیٰ انہ یقبل التوبۃ من الکفر (بحر) ھذا یدل علی ان قاتل العمد لہ توبۃ اذ کان الکفر اعظم ماثما من القتل وقد اخبر اللہ انہ یقبل التوبۃ
منہ ویغفر لہ (جصاص) ۷۰۳ (ان لوگوں سے، یا سرزمین عرب پر) وَقٰتِلُوْھُمْ میں ھم کی ضمیر کس کی طرف ہے؟ جنگ جاری رکھنے کا حکم کس کے مقابلہ میں دیا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ روئے زمین کے عام کفار بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور مشرکین عرب بھی
سمجھے جا سکتے ہیں، لیکن فقہاء حنفیہ اور بکثرت تابعین نے مراد مشرکین مکہ ہی سے لی ہے۔ ومن ذھا غیرنا صحۃ قال المعنی قاتلوا ھؤلاء الذین قال اللہ فیھم فان قاتلوکم (قرطبی) وھم کفار مکۃ والفتنۃ ھھنا الشرک ولا یسن بھم سنۃ
اھل الکتب فی قبول الجزیۃ قالہ ابن عباس وقتادۃ والربیع والسدی (بحر) عطف علی قاتلوا الذین یقاتلونکم ویؤیدہ ان مشرکین العرب لیس فی حقھم الا الاسلام او السیف (روح) وھذہ الآیۃ خاصۃ فی المشرکین دون
اھل الکتب لان ابتداء الخطاب جری بذکرھم فی قولہ عز وجل واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم وذلک صفۃ المشرکین اھل مکۃ الذین اخرجوا النبی صلعم واصحابہ فلم یدخل
اھل الکتب فی ھذا الحکم (جصاص) حَتّٰی یہاں اظہار غایت کے لیے ہے اور کے یا اِلٰی اَنْ کے مرادف ہے۔ وھذا البیان غایۃ القتال (روح) حتی بمعنی کے او الی ان (مدارک) لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ۔ یعنی حدود حرم اور حدود عرب کے اندر
شرک و کفر باقی نہ رہنے پائے۔ فتنہ سے یہاں کفر و شرک کے مراد لیے جانے پر کہنا چاہیے کہ محققین امت کا اجماع ہے۔ ای شرک قالہ ابن عباس وابو العالیۃ ومجاھد والحسن وقتادۃ والربیع ومقاتل بن حیان والسدی (ابن کثیر) ای الشرک
باللہ فی الحرم (ابن عباسؓ) ای حتی لا تکون شرک باللہ وحتی لا یعبد دونہ احد (ابن جریر) قال ابن عباس وقتادۃ ومجاھد والربیع ابن انس الفتنۃ ھھنا الشرک وقیل انما سمی الکفر فتنۃ لانہ یؤدی الی الھلاک
کما یؤدی الیہ الفتنۃ (جصاص) اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو گو اور کفار سے جزیہ دینے کے اقرار پر قتال سے دستکش ہونے کا حکم ہے، لیکن یہ خاص کفار چونکہ اہل عرب ہیں، ان کے لیے قانون جزیہ نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے اسلام ہے یا قتل (تھانویؒ)
اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اسکے لیے ضروری تھا کہ اس کا ایک جغرافی مرکز ہو، مستقر ہو۔ اور روئے زمین پر کم از کم ایک خطہ تو ایسا ہو جو شرک و کفر سے قطعاً پاک، اور اہل توحید کے لیے صحیح معنی میں ”پاکستان“ ہو۔ اور اس غرض کے لیے مولد رسولؐ و مہبط قرآن کی
ارض مقدس سے بڑھ کر موزوں اور کون ہو سکتی تھی؟ قدرۃً انتخاب اسکے لیے سرزمین عرب کا ہوا۔ کفار عرب اگر اسلام نہ لائیں تو ان کے لیے صرف قتل کا قانون ہے۔ اگر وہ جزیہ دینا چاہیں تو نہ لیا جائے گا۔ (تھانویؒ)

۴۰۴ ضلالت۔ اور کفر و شرک ہر دین باطل کا زور ٹوٹ کر رہے۔ (ذکر وہی خطۂ عرب کی خاص اسلامی حکومت کا چل رہا ہے کہ کم از کم اس "پاکستان" میں کفر و ترغیباتِ کفر کے لئے موقع ہی باقی نہ رہیں۔ یکون الاسلام والعبادۃ للہ فی الحرم (ابن عباسؓ)
لے یکون دین اللہ ھو الظاھر العالی علی سائر الادیان (ابن کثیر) خالصًا لیس للشیطان فیہ نصیب (مدارک) الدِّیْنُ۔ دین سے مراد اللہ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اما الدین الذی ذکرہ اللہ فی ھذا الموضع فھو العبادۃ والطاعۃ للہ فی امرہ
ونھیہ (ابن جریر) الدین ھنا الطاعۃ لے لایکون الانقیاد خالصًا للہ (بحر) والدین الشرعی ھو الانقیاد للہ عز وجل والاستسلام لہ علی جھۃ المداومۃ والعادۃ (جصاص) ۴۰۵ (اپنے کفر و انکار سے، اور ملتِ اسلامیہ میں داخل ہو جائیں) عن قتالکم ودخلوا لملتکم
واخضعوا لما الزمکم اللہ من فرائضہ (ابن جریر) عن الکفر واسلموا (مدارک) ۴۰۶ (جو اسی بے انصافی کی راہ سے ابتک دین توحید تک سے منکر ہیں) اور جب یہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے، تو ظاہر ہے کہ اب اپنے حق میں ظالم باقی نہیں ہے، اور اب ان کے حق میں
سزائے قتل وغیرہ کا حکم باقی نہ رہا۔ فلا سبیل لکم بالقتل (ابن عباسؓ) عُدْوَانَ۔ اس کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں۔ یہاں سزا اور سزائے قتل کے معنی میں ہے۔ والمراد من العدوان ھھنا المعاقبۃ والمقاتلۃ (ابن کثیر) لے العقوبۃ بالقتل (روح)
عربی اسلوب بیان میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ جزائے عمل کے موقع پر بعینہٖ وہی لفظ بول دیا جاتا ہے جو خود اس عمل کیلئے ہوتا ہے، مثلاً مکر کے مقابلہ میں مکر ہی کا لفظ کید کی سزا کے موقع پر لفظ کید کا استعمال اسی طرح استہزاء کے مقابلہ میں لفظ استہزاء وقس علی ہذا۔
اس صنعت کا نام مشاکلت ہے، اور قرآن مجید نے عربی بلاغت کی دوسری صنعتوں کی طرح اس کا بھی بار بار استعمال کیا ہے، چنانچہ یہاں سزائے عُدوان کے موقع پر خود لفظ عُدوان کا لانا اسی طرز پر ہے۔ وھی العدوان الذی ھو علی سبیل المجازاۃ
قولہ فلا عدوان الا علی الظلمین (راغب) انما ذلک علی وجہ المجازاۃ لما کان من المشرکین من الاعتداء (ابن جریر) سمی جزاء الظلمین ظلمًا للمشاکلۃ (کشاف) اراد ھنا بالعدوان الجزاء یقول لا اجزاء ظلم الا علی ظالم (ابن قتیبہ) ۴۰۷ یعنی کسی

وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ
اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے ۴۰۴ سو اگر وہ باز آ جائیں ۴۰۵ تو سختی (کسی پر بھی) نہیں،
إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٩٣﴾ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ
بجز (اپنے حق میں) ظلم کرنیوالوں کے ۴۰۶ حرمت والا مہینہ تو حرمت والے مہینہ کے عوض
الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ
میں ہوتا ہے ۴۰۷ اور حرمتیں معاوضہ کی چیزیں ہیں ۴۰۸ تو جو کوئی تم پر زیادتی
عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ
کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی
عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ
کی ہے ۴۰۹ اور اللہ سے ڈرتے رہو ۴۱۰ اور جانتے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں
الْمُتَّقِينَ ﴿١٩٤﴾ وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا
کے ساتھ ہے ۴۱۱ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو ۴۱۲ اور
تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَأَحْسِنُوا ۛ
اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو ۴۱۳ اور اچھے کام کرتے رہو
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٩٥﴾ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ
یقیناً اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۴۱۴ اور حج اور عمرہ کو
وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ
اللہ کے لئے پورا کرو ۴۱۵ پھر اگر گھر جاؤ، تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو،

مہینہ کی حرمت کی بنیاد تو بس اسی پر ہے کہ دوسرا فریق بھی اس کی حرمت ملحوظ رکھے گا، اور اگر نہیں تو پھر کسی مہینہ
کی حرمت کی بنیاد ہی نہیں۔ یہ چیز تو محض عوضِ معاوضہ کی، اور طرفین کے تعامل پر مبنی ہے۔ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ۔
کے لفظی معنی ہیں "حرمت والا مہینہ"۔ عرب کے قبائل آپس میں سخت جنگجو چلے آتے تھے لیکن آپس میں یہ بھی ٹھہر گئی تھی کہ
سال میں چار مہینے جنگ بند رہے، اور یہ زمانہ امن و صلح کے ساتھ گزارا جائے، اور یہ چار مہینے یہ تھے:۔
محرم۔ سنہ قمری کا پہلا مہینہ۔ رجب۔ سنہ قمری کا ساتواں مہینہ۔ ذی قعدہ۔ سنہ قمری کا گیارہواں مہینہ۔
ذی الحجہ۔ سنہ قمری کا بارہواں مہینہ۔ یہاں اشارہ ذی قعدہ ۶ھ کی جانب ہے۔ رسول اللہ صلعم قصد
عمرہ اس وقت صحابیوں کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے تھے لیکن مشرکین آمادۂ قتال ہو گئے تھے، بلکہ
تیر اندازی اور سنگ اندازی شروع کر دی تھی۔ عرب جاہلیت اپنی جہالت، شقاوت، جنگجوئی کیلئے بدنام اور بالکل
بجا طور پر بدنام ہے، لیکن اس کے باوجود سال کی صرف دو تہائی لڑتے تھے، اور باقی ۱/۳ حصہ امن و آشتی ہی کے شغل
میں گزار دیتے تھے،۔۔۔۔ یہ کمال تو جاہلیت جدید یا جاہلیت فرنگ ہی کیلئے اٹھا رکھا تھا کہ فرنگی قوموں کے بڑے بڑے سورما نہ
اتوار دیکھیں، نہ بڑا دن، نہ ایسٹر، نہ گڈ فرائیڈے، نہ کوئی موسم نہ کوئی مہینہ، ہر روز اور ہر ہفتہ، ہر مہینہ اور ہر موسم میں،
توپیں اور ٹینک اور ہوائی بم ہیں کہ ایک دوسرے کی جانیں لینے پر تلے ہوئے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے
پر اڑے ہوئے رہتے ہیں! ۴۰۸ (پس جو تم سے ان حرمتوں کی رعایت کرے، تم بھی ان سے حرمتوں کی رعایت
ملحوظ رکھو) قصاص کے لفظی معنی بدلہ کے ہیں، خواہ وہ معاوضہ قولی ہو، یا عملی یا جسمانی۔ اور یہاں عملی بدلہ مراد ہے یعنی
جیسا تمہارے فریق مقابل نے تمہارے ساتھ کیا، تم اُنکے ساتھ کرو۔ قصاصٌ لے بدلٌ (ابن عباسؓ) القصاص ھو المجازاۃ
من جھۃ الفعل او القول او البدن وھو فی ھذا الموضع من جھۃ الفعل (ابن جریر) القصاص المساواۃ والمماثلۃ وھو ان
یفعل بالفاعل مثل ما فعل (جصاص) یہاں کافروں پر تعریض ہے کہ خود تو ان مقدس مہینوں کا ذرا پاس لحاظ نہیں کرتے اپنی
کسی حرکت سے بھی باز نہیں رہتے، اور مسلمانوں سے توقع یہ رکھتے ہیں کہ وہ ان کے سارے ظلم اور زیادتیوں پر اس لئے
خاموش رہیں گے کہ یہ مقدس مہینے ہیں! والحاصل ان حرمۃ الشھر الحرام لما لم تمنعھم عن الکفر والافعال القبیحۃ فکیف
جعلوہ سببًا فی ان یمنع القتال من شرھم وفسادھم (کبیر) ۴۰۹ یعنی اگر فریق مقابل قتال شروع کر دے، تو تم بھی برابر
جواب دو۔ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ مثلاً ایک زیادتی یہی کہ دشمن ان مہینوں کا احترام نہ کرے، بلکہ تم سے جنگ شروع کر دے
فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ۔ یہاں مسلمانوں کے اس جوابی اور دفاعی کارروائی کو محض مجازاً اور محاورۂ زبان کے اعتبار سے اعتداء
فرما دیا گیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ زیادتی کے جواب میں جو کارروائی بطور سزا کی جائے، اس پر حقیقۃً زیادتی کا اطلاق ہو کیونکر
سکتا ہے؟ عربی زبان کے قاعدۂ مشاکلت الفاظ پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے، بس وہی صورت یہاں بھی ہے اور محض لفظی
تطابق کی بنا پر یہاں سزائے اعتداء کو خود اعتداء سے تعبیر کر دیا گیا ہے اہل لغت اور اہل تفسیر دونوں کے ہاں تصریح منقول ہے
لے قابلوہ بحسب اعتدائہ وتجاوزوا الیہ بحسب تجاوزہ (راغب) انہ بمعنی المجازاۃ واتباع لفظ لفظًا وان
اختلف معناھما (ابن جریر) انما سمی الفعل الثانی اعتداءً وھو مفعول بحق حملاً للثانی علی الاول علی مجاوزۃ العرب
(ابن العربی) ۴۱۰ (ان سارے احکام و معاملات میں، اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں) یہ اسلام ہی کا معجزانہ کمال ہے
کہ ایک طرف تو قتال اور انتقام کی اجازت پوری پوری دی اور دوسری طرف آخر میں پھر یہ بھی یاد دلا دیا کہ دیکھنا، حدود سے تجاوز کسی حال میں بھی نہ ہو۔ جوش پر قابو، صبر صورت رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ الٹی زیادتی تم اپنی طرف سے حالتِ انتقام میں کرنے لگو۔ خوفِ خدا
بازپرس کا خیال، ہر وقت مستحضر رہے، جو کچھ بھی ہو شدید اشتعال کے موقع پر بھی، ہیجانِ نفس کے ماتحت نہیں خشیتِ الٰہی ہی کے ماتحت ہو! ولتتق ایھا المؤمنون فی حرماتہ وحدودہ ان تعتدوا فیھا (ابن جریر) اللہ اکبر! اس حکیمانہ امتزاج کی نظیر دنیا کے کسی
قانون کسی آئین کسی نظام کے اندر ملے گی؟ ۴۱۱ اللہ اللہ کتنی بلند و پُر حکمت تعلیم ہے۔ ابھی ابھی انتقام میں بھی اہل ایمان پر تقویٰ کی زبردست قید عاید کی جا چکی ہے۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ان احکام سے کہیں پست ہمت نہ ہو جانا، اور یوں نہ خیال کرنے
لگنا کہ "حدود و قیود" عائد کر کے پُر زور مقابلہ سے روکا جا رہا ہے، اور ان کے بعد ان کے حوصلے پوری طرح کیونکر نکل سکیں گے؟ تو یہ بات نہیں ہے، بلکہ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ کی فتح و نصرت، رحمت و عنایت شامل حال انہی لوگوں کے رہتی ہے جو اس کی
خشیت و عظمت اپنے دل میں رکھتے ہیں اور متقی ہوتے ہیں!۔۔۔۔۔ تقویٰ کی تاکید عین نصرت و ہمت افزائی کے لئے ہے، ضعف پیدا کرنے کیلئے نہیں۔ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ متقین کے ساتھ اللہ کی معیت کی آخر نوعیت کیا ہوتی ہے، محققین کا فیصلہ ہے
کہ اللہ کی معیت بلحاظ اس کی نصرت، اعانت، حفظ، علم وغیرہ کے ہوتی ہے، نہ کسی جسمانی یا مادی اعتبار سے۔ لے بالمعونۃ والنصرۃ والحفظ والعلم (کبیر) النصر والعون (روح) بالنصرۃ والتمکین والتائید (بحر) اور یہیں سے امام رازیؒ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ حق تعالیٰ
مجسم ہو اور نہ وہ کسی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے جیسا کہ مجسم کسی متعین جگہ کو اپنے سے لبریز کر دیتا ہے۔ وھذا من اقوی الدلائل علی انہ لیس بجسم ولا فی مکان (کبیر) ۴۱۲ (اپنا مال، اپنی جان قربان کر ڈالنے کا حکم تو قتال کے ذیل وضمن میں آ چکا، اب حکم صرف مال کا ہے) ف
سبیل اللہ۔ اس قید کا خوب خیال رہے، اسلام میں جس طرح محض جان دے دینا مطلوب و مقصود نہیں، بلکہ وہ جان دینا مطلوب و مقصود ہے جو خدا کی راہ میں ہو، اللہ کے دین کی برائی کیلئے ہو، اسی طرح مطلق صرفِ مال کی ہرگز کوئی وقعت و قدر نہیں۔ قدر صرف اُس صرفِ مال کی ہے جو باطل کی راہ میں نہیں
حق کی راہ میں ہو، ہوائے نفس کی تکمیل کے لئے نہیں رضائے الٰہی کے حصول کیلئے ہو۔ یہاں اشارہ خاص جہاد و قتال کی جانب ہے لیکن فی سبیل اللہ کے الفاظ عام ہیں، ہر دینی خدمت میں مالی امداد اس کے تحت میں آ جاتی ہے یعنی فی طاعۃ اللہ (قرطبی)
۴۱۳ جان یا مال میں بخل کر کر کے، قرآن مجید میں جب صیغہ جمع حاضر آتا ہے تو کبھی تو افراد مخاطب ہوتے ہیں اور کبھی جماعت۔ یہاں اصل مخاطب اُمت بحیثیت مجموعی ہے۔ اور بیان یہ حقیقت ہو رہی ہے کہ افرادِ امت نے اگر جہاد و قتال سے جان چرائی
اور مجاہدین کو مالی امداد دینے میں بخل کیا، تو نتیجہ لازمی طور پر ساری امت کی تباہی، بربادی، ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ۔ اصل تقدیر کلام یوں ہے:۔ ولا تلقوا انفسکم بایدیکم یا انفسکم یا نفسک کو محذوف ہے
قیل تقدیرہ ولا تلقوا انفسکم بایدیکم کما تقول لا تقعوا انفسکم فی الہلاکۃ (بیضاوی)

الْهَدْيُ ۚ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ

(اُسے پیش کردو) ۷۱۵؎ اور جب تک قربانی اپنے مقام پر پہنچ جائے اپنے سر نہ

مَحِلَّهٗ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى

منڈاؤ ۷۱۶؎ لیکن اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اُس کے سر میں

مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ

کچھ تکلیف ہو تو وہ روزوں سے یا خیرات سے یا ذبح سے

اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۟ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ

فدیہ دیدے لیکن جب تم حالت اطمینان میں ہو تو جو کوئی شخص عمرہ سے مستفید ہوا لے

اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ

حج سے ملاکر تو جو قربانی بھی اُسے میسّر ہو، وہ کر ڈالے اور جس کسی کو

لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ

میسر ہی نہ آئے تو تین دن کے روزے زمانہ حج میں رکھ ڈالے، اور

سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ

سات روزے جب تم واپس ہو یہ پُورے دس (روزے) ہوئے

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ

یہ اُس کے لئے (درست) ہے جس کے اہل مسجد حرام کے قریب

الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جانے رہو، کہ اللہ سخت گرفت کرنے والا

منزل ۱

التہلکۃ۔ لفظی معنی ہلاکت کے ہیں۔ یہاں مُراد یہ ہے کہ اُمّت کی ضرورت کے موقع پر بخل کر کے اُمّت کو برباد ہی نہ ڈالو، اور یہی معنی ابن عباسؓ، ابوایوب انصاریؓ، اور حذیفہؓ صحابیوں سے، اور حسن اور قتادہ اور عکرمہ اور عطا تابعین سے مروی ہیں۔ اور محدث جلیل امام بخاری نے بھی یہی معنی اختیار کئے ہیں۔ بترک الانفاق فی سبیل اللہ وھو قول حذیفۃ والحسن وقتادۃ وعکرمۃ وعطاء واسلم وقال حذیفۃ بن سلیمان وابن عباس عکرمۃ وعطاء ومجاھد وجمھور الناس المعنی لا تلقوا بایدیکم ان تترکوا النفقۃ فی سبیل اللہ ولا تخافوا العیلۃ والی ھذا المعنی ذھب البخاری اذ لم یذکر غیرہ (قرطبی) التھلکۃ الاقامۃ فی الاھل والمال وترک الجھاد (کشاف عن ابی ایوب الانصاری) بعض نے یہ معنی بھی لئے ہیں کہ بہت زیادہ خرچ کر کے اپنے کو تباہ حال نہ کرو۔ وقال الجبائی التھلکۃ الاسراف فی الانفاق (روح) لا بالاسراف وتضییع وجہ المعاش (بیضاوی) قیل ھو الاسراف فی الانفاق حتی لا یجد ما یاکل ویشرب فیتلف (جصاص) ۷۱۴؎ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جانب رغبت والتفات، پسندیدگی و بیزاری کے افعال وصفات بار بار منسوب کئے ہیں، چنانچہ یہاں بھی اللہ کے لئے ہے کہ یحب المحسنین۔ ان سارے افعال وصفات کے لانے سے ایک بڑا مقصود اُن گمراہ قوموں کی تردید ہے جو وجود باری کے تو قائل ہیں، لیکن خدا تعالیٰ کو صفات کمال وجمال سے معرّیٰ ایک طرح کا محض جامد، بے جان، بےحس، علت العلل سمجھے ہوئے ہیں!۔۔۔ اسلام کا خدا، قرآن کا خدا، ہر معنی میں ایک زندہ خدا، بیدار، متحرک، فعّال خدا ہے۔ خوش بھی ہوتا ہے ناخوش بھی۔ مخلوق کو محبوب بھی رکھتا ہے، مبغوض بھی، صلہ بھی دیتا ہے اور سزا بھی۔ اَحْسِنُوْا۔ یعنی جو کچھ بھی کرو حسن نیت واخلاص کے ساتھ کرو، محض بیگار سمجھ کر بوجھ سا نہ اُتارو۔ صحابیوں سے اسی قسم کے معنی مروی ہیں۔ لے احسنوا اعمالکم بامتثال الطاعات روی ذلک عن بعض الصحابۃ (قرطبی) احسنوا اعمالکم واخلاقکم (بیضاوی) ۷۱۵؎ یعنی جب یہ عبادتیں بجا لاؤ، تو اللہ کی رضا جوئی ہی کے لئے بجا لاؤ۔ اخلاص نیت کے ساتھ، اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ، تمام ممنوعات سے محترز رہ کر۔ یہ نہ ہو کہ کسی طرح اُلٹے سیدھے ادا کر کے ان عبادتوں کو بھی ناقص وفاسد بنادو۔ لے افعلوا الحج والعمرۃ علی نعت الکمال والتمام (کبیر) وظاھر السیاق بالکمال انما ھو فی افعالھما بعد الشروع فیھما (ابن کثیر) اے ادوھما تامین بشرائطھما وفرائضھما لوجہ اللہ تعالیٰ بلا توان ولا نقصان (مدارک) حضرات صحابہ وتابعینؓ سے متعدد تفسیریں نقل ہوئی ہیں لیکن سب سے جامع تفسیر مقاتل تابعی کی ہے کہ اس درمیان میں کوئی ایسی چیز نہ کرو کہ جو ان عبادتوں کے غیر شایاں ہو۔ الا تفعلوا فیھما مالا ینبغی لکم (قرطبی) لِلّٰہِ کی تفسیر میں ایک فقیہ مفسر ابن العربی مالکیؒ نے یہ نکتہ بہت خوب پیدا کیا ہے کہ عمال تو سارے کے سارے اللہ کی جانب منسوب ہوتے ہی ہیں، خلق، علم، ارادہ وغیرہ ہر لحاظ سے یہاں اس تائید و تخصیص سے مقصود اس امر کی تنبیہ ہے کہ حج وعمرہ کا قصد میلہ ٹھیلہ سمجھ کر نہ ہو، تفاخر کی راہ سے نہ ہو، تجارتی ضروریات سے نہ ہو، اخلاص محض کے ساتھ، قرب ورضائے الٰہی کی نیت سے ہو۔ وفائدۃ ھذا التخصیص ان العرب کانت تقصد الحج للاجتماع والتناصر والتظاھر والتناوز والتفاخر وقضاء الحوائج وحضور الاسواق ولیس للہ تعالیٰ فیہ حظ یقصد ولا قربۃ تعتقد فامر اللہ سبحانہ بالقصد الیہ لاداء فرضہ وقضاء حقہ (احکام القرآن) ۷۱۶؎ یعنی اگر کسی دشمن کی روک تھام کے باعث، یا کسی بیماری وغیرہ سے معذور ہو کر راستہ ہی میں رُک جانا پڑے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکو، تو قربانی کا جانور جو ساتھ میں ہو، اُسے وہیں ذبح کر دو، اور احرام کھول ڈالو۔ عازم حج جب کسی معذوری کی بنا پر راہ ہی میں رُک گیا، اور اب قصد حج پورا نہیں کر سکتا، تو اب احرام سے باہر آنے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ اِنْ اُحْصِرْتُمْ۔ احصار کے لفظی معنی گھر جانے کے ہیں۔ خواہ کسی سبب سے بھی ہو۔ اہل لغت سے یہی عام مفہوم منقول ہے۔ الاحصار المنع من طریق البیت یقال فی المنع الظاھر کالعدو والمنع الباطن کالمرض (راغب) وقال الفراء ان لفظ الاحصار یفید الحبس والمنع سواء کان بسبب العدو او بسبب المرض (کبیر) وقال الکسائی وابو عبیدۃ واکثر اھل اللغۃ الاحصار المنع بالمرض او ذھاب النفقۃ (جصاص) چنانچہ فقہا حنفیہ نے بھی اسی عام معنی میں لیا ہے۔ اور یہی معنی بعض فقہاء صحابہ وتابعین سے منقول ہیں۔ ذھب الامام ابوحنیفۃ الی انہ المراد بہ ما یعم کل منع من عدو ومرض وغیرھما (روح) روی عن ابن مسعود وابن عباس العدو والمرض سواء وھو قول ابی حنیفۃ وابی یوسف ومحمد وزفر والثوری (جصاص) ولا یکون الحصر الحبس قالت الحنفیۃ المحصر من یصیر ممنوعا من مکۃ بعد الاحرام بمرض او عدو او غیر ذلک واحتجوا بمقتضی الاحصار مطلقا (قرطبی) لے منعتم بای عذر کان قالہ مجاھد وقتادۃ وابوحنیفۃ (ابن العربی) البتہ امام شافعیؒ وامام مالکؒ کے نزدیک احصار صرف دشمن کے باعث ہو سکتا ہے۔ المراد من الاحصار ھنا حصر العدو عند مالک والشافعی (روح) وعند الشافعی الاحصار بالعدو وحدہ (مدارک) لے بالعدو خاصۃ قالہ ابن عمر وابن عباس وانس والشافعی ھو اختیار علمائنا (ابن العربی) ۷۱۷؎ (جو علامت ہے مناسک حج کے تمام ہو جانے اور حالت احرام سے باہر آ جانے کی) مَحِلَّہٗ یعنی موضع حرم۔ قربانی کی اصل جگہ وہی ہے۔ لے مکانہ الذی یجب نحرہ فیہ وھو الحرم (مدارک) جب عازم حج خود وہاں پہنچنے سے معذور ہو جائے تو قربانی کا جانور وہاں بھیجدے۔ وہیں اُس کی قربانی کر دی جائے گی۔ ھَدْی کے لفظی معنی محض اُس پیشکش کے ہیں، جو خانہ کعبہ کے لئے بھیجا جائے۔ الھدی مختص بما یھدی الی البیت (راغب) وھو ما یھدی الی بیت اللہ من بدنۃ او غیرھا (قرطبی) حنفیہ نے بھی اسی عام معنی میں رکھا ہے، اور قربانی کا ہر جانور اس سے مُراد لیا ہے۔ اور امام مالکؒ وامام شافعیؒ سے بھی یہی مذہب منقول ہے۔ فقال ابوحنیفۃ وابو یوسف ومحمد وزفر ومالک والشافعی الھدی من اصناف الثلثۃ الابل والبقر والغنم وھو قول ابن شبرمۃ (جصاص) بعض ائمہ کے نزدیک اس کا اطلاق قربانی کے صرف اُونٹ پر ہوتا ہے۔ ۷۱۸؎ (ایسے مرض میں کہ اس کی وجہ سے سر کے بال اُتروانے کی ضرورت پڑ جائے) مرضا یحوجہ الی الحلق (بیضاوی) ۷۱۹؎ مثلاً درد، زخم، وغیرہ سے، اور اس لئے سر منڈانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔ ۷۲۰؎ معذوروں کو اجازت ہے کہ قبل از وقت ہی سر منڈا لیں، اور اس کا شرعی فدیہ دے دیں۔ فَفِدْیَۃٌ۔ من راسہ کے بعد عبارت مقدر یوں ہے۔ فحلق فعلیہ فدیۃ۔ فیہ اضمار اے فحلق فعلیہ فدیۃ (معالم) اور اس فدیہ کی تین صورتیں ہیں۔ یا روزے رکھ لئے جائیں، یا مسکینوں کو صدقہ دے دیا جائے، یا قربانی کر دی جائے۔ مِنْ صِیَامٍ۔ جمہور فقہا کا مسلک حدیث صحیح کی بنا پر تین روزے رکھنے کا ہے۔ جمھور فقھاء المسلمین علی ان الصوم ثلثۃ ایام وھو محفوظ صحیح فی حدیث کعب بن عجرۃ (قرطبی) اَوْ صَدَقَۃٍ۔ کھانا اگر دیا جائے تو چھ مسکینوں کو صدقۂ فطر کی مقدار کے مساوی دیا جائے علی ستۃ مساکین لکل مسکین نصف صاع من بر (مدارک)۔۔۔۔ فیحصل من ذلک ان یکونوا من القربۃ اصم ومن الحنطۃ ثلاثۃ اصم وعدد المساکین الذین یتصدق علیھم ستۃ بلا اختلاف (جصاص) اَوْ نُسُکٍ۔ نُسُک سے مراد باتفاق ذبح ہے۔ یقال نسکت للہ اے ذبحت للہ (ابن قتیبہ) النسیکۃ مختصۃ بالذبیحۃ (راغب) یہ قربانی کم از کم ایک بکری کی ہونی چاہیئے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ ایک گائے یا اُونٹ کی ہو۔ ولا اختلاف بین الفقھاء ان ادناہ شاۃ وان شاء جعلہ بعیرا او بقرۃ (جصاص) اعلاہ بدنۃ واوسطہ بقرۃ وادناہ شاۃ (معالم عن الحسن وقتادۃ) روزہ، صدقہ، قربانی، یہ تینوں صورتیں فدیہ وکفارہ کی یکساں ہیں، جو شق بھی پسند آئے، اختیار کی جا سکتی ہے۔ لا اختلاف انہ مخیر بین ھذہ الاشیاء الثلثۃ یبتدی بایھا شاء وذلک مقتضی الاٰیۃ واو للتخییر (جصاص) وعلیہ الاثار عن کعب بن عجرۃ وردت بلفظ التخییر وھو نص القراٰن وعلیہ مضی عمل العلماء فی کل امصار وفتواھم (قرطبی) ۷۲۱؎ یہ مقابلہ اس حالت خطر ومرض کے حبس کا ذکر شروع آیت میں فان احصرتم میں آ چکا ہے۔ اور جس طرح وہاں ایک عام وجامع لفظ احصار آیا تھا، یہاں بھی ایک عام وجامع لفظ امن آیا ہے، جو مرض کے دُور ہو جانے پر بھی اسی طرح حاوی ہے، جس طرح خوف دشمن کے دفع ہو جانے پر۔ اصل الامن طمانیۃ النفس وزوال الخوف (راغب) معناہ برأتم من المرض وقیل خوفکم من العدو قالہ ابن عباسؓ وقتادۃ وھو اشبہ باللفظ الا ان یحمل الخوف من المرض فیکون الامن منہ (قرطبی)

جاء بلفظ الامن وهو آمر فی المعنی والمعرض لیکون اخر الکلام علی نظم اوله (ابن العربی) اِذَآ شرطیہ ہے۔ اس سے فقہا نے یہ نکالا ہے کہ بعد حصر اگر وقت حج میں مانع دُور نہ ہو تو عاصی نہ ہوگا۔ اَمِنْتُمْ۔ فقہا کہتے ہیں کہ صحت کو بھی امن ہی کے اسلئے تعبیر کیا کہ صحت
اچھی ہوجانے پر بظاہر فوت حج کی طرف سے اطمینان ہوجاتا ہے ۲۲۲ (اور اگر کسی نے صرف حج یا صرف عمرہ کیا ہو تو اس پر یہ قربانی واجب العمل نہیں) فَمَنْ تَمَتَّعَ۔ تمتع کے لفظی معنی فائدہ اُٹھانے کے ہیں۔ اصطلاح فقہ میں مُراد حج اور عمرہ کے ملا لینے سے ہوتی
ہے یعنی زمانۂ حج میں ایک احرام باندھ کر عمرہ ادا کیا جائے اور پھر دوسرے احرام سے حج بھی کر لیا جائے۔ دونوں احراموں کی درمیانی مدت میں حالتِ احرام کے ممنوعات سے پُوری طرح تمتع کیا جاسکتا ہے۔ دین ابراہیمی کو چھوڑ کر عرب جاہلی جہاں اور بہت سے
اوہام میں گرفتار تھے۔ وہاں ایک عقیدہ یہ بھی گڑھ لیا تھا کہ موسم حج میں عمرہ کرنا سخت گناہ ہے۔ لان العرب فی الجاهلیة کانت لاتعرف العمرة فی اشهر الحج وتنکرها اشد الانکار (جصاص) یروی عن ابن عباس وعن طاؤس ان ذلك عندهم
کان من افجر الفجور (جصاص) ۲۲۳ (ان ایام حج میں بسبب ناداری یا کسی اور معذوری کے) ۲۲۴ تین زمانۂ حج میں اور سات زمانۂ حج کے بعد۔ یہ پُورے دس کی تصریح تاکید در تاکید کی غرض سے ہے۔ کاملة توکید الکلام کما یقول القائل سمعته
باذنی ورایته بعینی (ابن جریر) قیل هو توکید کما تقول کتبت بیدی وقوله کاملة تاکید آخر (قرطبی) اِذَا رَجَعْتُمْ۔ فقہا حنفیہ اور بعض اکابر تابعین کے ہاں اس رجوع سے مُراد اعمال حج سے فراغت ہے۔ خواہ واقعۃً کوئی وطن واپس ہوجائے یا ابھی وہیں مقیم رہے
لمعه بعد الفراغ من اعمال الحج وهو المراد من الرجوع المذکور فی الآیة (معالم) قال ابوحنیفة المراد من الرجوع الفراغ من اعمال الحج کیرا لی فرغتم ونفرتم من اعمال (روح) قال المجاهد عطاء وابراهیم للمعنی اذا رجعتم نفرتم وفرغتم من اعمال الحج
وهو مذهب ابی حنیفة (بحر) بعض دُوسرے اکابر کے نزدیک مکہ سے وطن کی واپسی مُراد ہے۔ یعنی الی بلادکم قاله ابن عمر وقتادة والربیع ومجاهد وعطاء وقاله مالك فی کتب محمد وبه قال الشافعی (قرطبی) اذا رجع الی اهله و
مصره (ابن جریر) ۲۲۵ یعنی موسم حج میں عمرہ کے ساتھ حج کا ملا لینا۔ ذٰلِكَ۔ یہ اشارہ تمتع کی جانب ہے
جس کا ذکر ذرا اُوپر ضمن تمتع کے ضمن میں آچکا ہے۔ اے التمتع بالعمرة الی الحج (ابن جریر) اشارة الی التمتع
(مدارک) یہ تفسیر امام ابوحنیفہ اور بعض تابعین کے مسلک کے مطابق تھی۔ جن کے ہاں حج میں تمتع اور قران یعنی
موسم حج میں عمرہ کے ساتھ حج کر لینے کی دو صورتیں صرف آفاقیوں کے لئے درست ہیں، مکہ اور جوارِ مکہ والوں
کے لئے نہیں۔ اذلا تمتع ولا قران لحاضری المسجد الحرام عندنا (مدارک) وقال ابوحنیفة ان قوله
ذلك اشارة الی الابعد وهو ذکر التمتع المفهوم من قوله فمن تمتع عن ابی حنیفة (روح) امام شافعیؒ
کے نزدیک ذٰلِكَ کا اشارہ اصل حکم یعنی وجوب قربانی کی جانب ہے ۲۲۶ یعنی جو مکہ کے باشندے یا شہرِ مکہ
سے بالکل متصل کے باشندے نہ ہوں، بلکہ حدود میقات سے باہر کے رہنے والے ہوں۔ میقات اُس مقام کو کہتے
ہیں جہاں سے حرم کے حدود شروع ہوجاتے ہیں۔ اور وہاں پہنچ کر ہر آفاقی پر حج یا عمرہ کی نیت کرلینا اور احرام باندھ
لینا واجب ہوجاتا ہے۔ ہر ہر سمت سے آنے والوں کی میقات الگ الگ ہے۔ لمن لم یکن یہیں ل بمعنی علی ہے۔
لے وجوب الدم علی من لم یکن من اهل مکة (قرطبی) حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے خاص اہل مکہ کا مراد ہونا
اور ان کے لئے تمتع کا ناجائز ہونا سب کو مسلم ہے۔ اجمع جمیعهم علی ان اهل الحرم معنیون به وانه
لامتعة لهم (ابن جریر) لیکن فقہا حنفیہ اور بعض تابعین کا مذہب یہ ہے کہ اس میں مکہ کے علاوہ جوارِ مکہ کے باشندے
بھی شامل ہیں۔ اور حدودِ میقات کے اِدھر تک کُل رہنے والے حاضری المسجد الحرام کے حکم میں داخل ہیں۔
عن مکحول قال من کان دون المواقیت (ابن جریر) عن عطاء قال من کان اهله من دون المواقیت فهو
کاهل مکة لا یتمتع (ابن جریر) هم اهل مواقیت فمن دونها الی مکة (مدارک) قال عطاء ومکحول من
دون المواقیت هو قول اصحابنا (جصاص) امام شافعیؒ کے نزدیک مکہ سے قصر نماز کی مسافت تک رہنے والے اہل مکہ
ہی کے حکم میں رہتے ہیں۔ المراد بالموصول من کان من الحرم علی مسافة القصر عند الشافعی ومن کان
مسکنه وراء المیقات عند ابی حنیفة (روح) اور مفسر طبری نے بقاعدۂ عربیت لفظ حاضر کے اسی عموم کو ترجیح
دی ہے، جو امام شافعی کا اختیار کیا ہوا ہے۔ واولی الاقوال بالصحة عندنا قول من قال ان حاضری المسجد
الحرام من هو حوله فمن بینه وبین المسافة ما لا تقصر الیه الصلوٰة لان حاضر الشیء فی کلام العرب هو
الشاهد له بنفسه (ابن جریر) لیکن محقق جصاص رازی نے قرآن مجید ہی کی متعدد آیتوں کے سیاق سے یہ دکھایا
ہے کہ محاورۂ قرآنی میں البیت سے خانۂ کعبہ نہیں، بلکہ مکہ اور صرف مکہ ہی نہیں بلکہ جوارِ مکہ مُراد لیا گیا ہے
یکون مراد الله تعالیٰ بذکر البیت الحرم من مکة وان کان خارجا عنها (احکام القرآن) اور المسجد الحرام سے بھی
مُراد مکہ اور مضافات مکہ ہی لی گئی ہے۔ وهی مکة وما قرب منها (احکام القرآن) ۲۲۷ اُن کی جو احکام
الٰہی کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ اور تقویٰ الٰہی اختیار نہیں کرتے۔ لمن لم یتقه (بیضاوی) وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ یعنی
اللہ سے ڈرتے رہو ان تمام احکام کی بجا آوری میں۔ اصل شے اور مدار کار تمام احکام و مسائل میں یہی تقویٰ الٰہی یا خوفِ خدا ہی باقی
تعبیر و تفسیر میں جو کچھ اختلافات تو اپنی اپنی فہم و بصیرت فکر و نظر کے مطابق علما و فقہا شارحین و مفسرین میں ہوتے ہی رہیں گے۔

ع ۲۴ / ۸

الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ
ہے ۔ (حج کے (چند) مہینے معلوم ہیں ۔ جو کوئی ان میں اپنے اُوپر
فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا
حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ
جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ
کوئی جھگڑا ۔ اور جو کوئی بھی نیک کام کرو گے ، اللہ کو اس کا علم ہو کر
اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ
رہے گا اور زاد راہ لے لیا کرو اور بہترین زاد راہ تو تقویٰ ہے
وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
سو اے اہل فہم میرا ہی تقویٰ اختیار کئے رہو ۔ تمہیں اس باب میں کوئی مضائقہ
جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ
نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو ۔ پھر جب تم جوق در جوق
مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠
عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعرِ حرام کے پاس کر لیا کرو
وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ
اور ان کا ذکر اس طرح کرو جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے اور اس سے قبل تم
مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ
یقیناً محض ناواقفوں میں تھے ۔ ہاں تو تم وہاں جا کر واپس آؤ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

شَدِيْدُ الْعِقَابِ یہاں جس سیاق میں آیا ہے اس سے بعض علما نے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ مقدس و متبرک مقامات میں جس طرح قبولیت سعادت کے موقع بہت زیادہ ہیں، اسی طرح گناہ و عقوبت کا خطرہ بھی زیادہ لگا ہوا ہے۔ ۲۲۸ اور چونکہ وہ مشہور و معلوم ہیں اس
لئے قرآن کو ان کی تصریح کی بھی ضرورت نہیں، اور وہ تین مہینے شوال، ذیقعدہ و ذی الحجہ ہیں۔ اصل ارکان حج تو ذی الحجہ کے دُوسرے ہفتہ میں ادا ہوتے ہیں، لیکن احرام حج شوال ہی سے بندھنا شروع ہوجاتا ہے۔ احرام اُس خاص پوشش کا نام ہے جو حدودِ
حرم یا میقات میں داخل ہوتے ہی ہر حاجی و زائر پر واجب ہوجاتی ہے۔ یہ پوشش اور کچھ نہیں، صرف بے سلی ہوئی چادریں ہونی چاہئیں۔ حنفیہ کے ہاں احرام جب چاہے باندھا جاسکتا ہے۔ گو قبل شوال ناپسندیدہ ہے۔ جائز ہونے کی دلیل یہ
ہے کہ حنفیہ کے ہاں احرام رکن حج نہیں صرف شرط حج ہے، جیسے وضو کہ رکن نماز نہیں، صرف شرط نماز ہے۔ امام شافعیؒ کے ہاں شوال سے قبل حج کا احرام باندھنا ناجائز ہے۔ یہ اسلئے کہ شافعیؒ کے نزدیک احرام رکن حج ہے، اور کسی رکن حج کی ادائی قبل
موسم حج درست نہیں۔ الْحَجُّ۔ روزانہ پنج وقتہ نماز با جماعت، مہینہ بھر کے روزوں، اور مال کے بے حصہ کی زکوٰۃ کی طرح حج بیت اللہ بھی اسلام کی اُن عبادتوں میں سے ہے، جس نے اپنوں ہی کو نہیں بیگانوں کو بھی خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ اور مستشرقین
کے رُعب انگن نام سے فرنگی اہل علم و اہل قلم کا جو طبقہ ہے، اُس نے تو اس کے ظاہری منافع اور اجتماعی مصالح پر بار بار رشک کیا ہے اور اسے اکثر عالم اسلامی کی سالانہ کانگرس سے تعبیر کیا ہے۔ ۲۲۹ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ۔ یعنی موسم حج میں ادائے حج کی نیت
کرلے، اور اسے اپنے اُوپر واجب کرلے۔ لے اوجبه علی نفسه (ابن قتیبه) فمن الزمه نفسه (کشاف) الفرض اصله وجوب الشیء (ابن قتیبه) لیکن اپنے اُوپر لازم کرلینے کی عملی اور معتبر علامت کیا ہے بعض ائمہ کے نزدیک صرف نیت کرلینا کافی ہے۔ لیکن
حنفیہ نے بعض صحابیوں اور تابعین کی طرح اس کی علامت پوشش احرام کو قرار دیا ہے۔ الفرض الاحرام (ابن جریر عن ابن عباس) فرض الحج الاحرام (ابن جریر عن عطاء والحسن) ولزم علی نفسه بالاحرام (مدارک) قال ابن عباس والحسن وقتادة فی احرم بهم
۲۳۰ بلکہ اس سارے زمانہ میں اپنے آپ کو عبادت و ذکر الٰہی میں مشغول رکھو) ایام صوم کی طرح یوم حج کو بھی اعمال خیر کے ساتھ مناسبت خاص حاصل ہے۔ اور جو چیزیں حرام ہیں، وہ تو خیر ہمیشہ ہی حرام ہیں۔ باقی جو امور جائز و مباح ہیں ان میں بھی بہت
سی چیزوں سے زمانۂ صیام کی طرح حالتِ احرام میں دستبردار ہونا چاہیئے۔ جملہ صورۃً خبریہ ہے، لیکن معنیً نہی ہے، اور وہ بھی تاکید کے ساتھ یعنی ان سب اُمور سے ممانعت کا قطعاً حکم ہو رہا ہے۔ وان کان ظاهره الخبر فهو نهی عن هذه الافعال
وعبر بلفظ النفی عنها لان المنهی عنه سبیله ان یکون منفیا غیر مفعول (جصاص) نفی الثلاثة علی قصد النهی للمبالغة (بیضاوی) فِي الْحَجِّ۔ یعنی اس زمانۂ حج میں، حالتِ احرام میں۔ فی وقته وکانی موضعه (قرطبی) لے فی ایامه (روح) فَلَا رَفَثَ۔
رفث کا مفہوم عام ہے، ہر قسم کی شہوانیت یعنی مباشرت کے دواعی و مبادی اس میں شامل ہیں۔ الرفث کلام متضمن لما یستقبح ذکره من ذکر الجماع ودواعیه (راغب) الرفث کلمة جامعة لما یریده الرجل من اهله (قرطبی) وقال قوم الرفث
الافحاش بذکر النساء وکان ذلك بحضرتهن ام لا (قرطبی) یہاں مُراد شہوانی تذکرے ہیں۔ تابعین اور بعض صحابیوں سے بھی مروی ہیں۔ فقہا حنفیہ نے صراحت کے ساتھ دواعی و مبادی مباشرت کو اس کے تحت میں شامل رکھا ہے۔ قال ابن عمر

وطاؤس وغیرہم — الرفث الافحاش للمرأۃ بالکلام (قرطبی) قال ابن عباس ھو التعریض بالجماع (ابن جریر) الرفث التعریض للنساء بالجماع (ابن جریر عن ابن طاؤس) قال عطاء الرفث الجماع وما دونہ من قول الفحش (ابن جریر) الجماع ودواعیہ محظورۃ علی المحرم اجماعی ہو وقال الحسن المراد منہ کل ما یتعلق بالجماع (کبیر) اللہ اکبر! ایک معیار یہ ہے۔ عبادت میں طہارت و پاکبازی کا اسلام کا قائم کیا ہوا کہ اشارۃً و کنایۃً بھی اُس زمانہ میں جائز شہوانی خیالات زبان پر نہ لائے جائیں۔ اور دوسری طرف مشرک قوموں کے میلے ٹھیلے، تیرتھ، یاترا، تیرتھ جاترا، اور نمائشیں اور جلسے ہیں، جن کی گرم بازاری ہی فحش کاریوں اور شہوت انگیزیوں سے ہے اور پھر عرب جاہلیت کے تو ارکانِ حج تک میں فحش داخل تھا۔ وَلَا فُسُوْقَ۔ اس کے تحت میں بڑے چھوٹے ہر قسم کے گناہ کی ممانعت آگئی۔ قال بعضہم الفسوق ھی المعاصی کلہا (ابن جریر عن محمد بن کعب القرظی) قال الفسوق معاصی اللہ کلہا (ابن جریر یعنی جمیع المعاصی کلہا) قالہ ابن عباس و عطاء و حسن و کذلک قال ابن عمر و جابر (قرطبی) ای الخروج عن حدود الشرع بارتکاب المحظورات (روح) حالتِ احرام میں جب متعدد جائز مشغلے مثلاً شکار، ناجائز ہو جاتے ہیں، تو بڑی چھوٹی کسی قسم کی معصیت کی گنجائش ظاہر ہے کہاں نکل سکتی ہے۔ یہاں حکم محض تاکید کے لئے ہے۔ وَلَا جِدَالَ۔ جدال اپنے عام و وسیع معنی میں ہے۔ مار پیٹ، ہاتھا پائی الگ رہی، زبانی بحث و تکرار جو اکثر سابقت و مفاخرت کے موقعوں پر ہو جاتی ہے، سب احرام کی حالت میں ممنوع ہے۔ قال محمد بن کعب القرظی الجدال ان تقول طائفۃ حجنا ابرّ من حجکم و یقول الآخر مثل ذلک (قرطبی) وقیل الجدال کان فی الفخر بالآباء (قرطبی) لا اختصام مع الخدام والرفقۃ (روح) لا مراء مع الرفقاء والخدم (مدارک) لا الجدال فی تقریر الباطل وطلب المال والجاہ (کبیر) حج کے موقع پر دنیا کے گوشہ گوشہ کی آبادیاں کھنچ کر آجاتی ہیں۔ ہر قسم، ہر عمر، ہر قماش، ہر مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، بوڑھے بھی، جوان بھی، بچے بھی، بڑے تیز مزاج اور غصہ ور بھی، آوارہ مزاج بھی، حریص و طامع بھی، حسین و نوجوان عورتیں بھی، پھر تکلیفیں اور صعوبتیں بھی راہ اور سواری کے سلسلہ میں طرح طرح کی پیش آتی ہیں ——— بڑے بڑے حلیم بھی دامنِ صبر چھوڑ بیٹھتے ہیں، رشک و منافقت، بدنظری و بدکاری، نزاع و جدال کے موقع قدم قدم رکھے ہوئے ہوتے ہیں ——— حکیم مطلق کی حکیمانہ نگاہ نے رفث اور فسوق اور جدال سب کی تصریحًا اور تاکیدًا ممانعت کر کے کمزور بندوں کے حق میں کیا خوب انتظام کر دیا ہے۔ محققین نے یہ بھی کہدیا ہے کہ فقرہ کے آخر میں، یعنی فی الحج میں جو بجائے ضمیر کے اصل اسم لایا گیا ہے، یہ تاکید و تعظیم کے لئے ہے۔ الاظہار فی مقام الاضمار لاظہار کمال الاعتناء بشانہ (روح)

۴۳۱ (اور اسی کے مطابق صلہ بھی دیگا) حاجیوں کے اعمالِ خیر کی تشویق و رغبت افزائی کے لئے بہترین و موثر ترین یاد دہانی ہے۔ اللہ کے عالم کل و عالم جزئیات ہونے کا پورا استحضار کھو اہل جاہلیت کی طرح کہیں اس تذبذب میں نہ پڑ جاؤ کہ جہاں نے خلاں خلاں عمل خیر کا صلہ ملے یا نہ ملے، علمِ الٰہی میں وہ آئے بھی یا آنے سے رہ جائے۔ مومن کے لئے تو بڑی سی بڑی ہمت بھی اسی عقیدہ کا استحضار پیدا کر سکتا ہے کہ خفی سے خفی، باریک سے باریک نیکی بھی عالم الغیب کی نظر سے مخفی نہیں۔ اطباء یونانی موسم بہار میں مصفیات پلاتے ہیں اور جاڑے کے زمانہ میں مقویات استعمال کراتے ہیں کہ ان موسموں کو ان دواؤں کے ساتھ خاص مناسبت ہے ——— رمضان کا مہینہ اور حج کا موسم بھی روحانیات کے عالم میں اپنی صحت بخش آب و ہوا کے لئے ممتاز ہیں، تو طبیب حقیقی ان موسموں میں اعمالِ خیر کی طرف خصوصی توجہ کیسے نہ دلاتا!

۴۳۲ جب ارادہ حج سے نکلا کرو۔ اس ہدایت کی قدر اس وقت ہوگی جب جاہلی قوموں کے زائرین کی ذہنیت پر نظر ہو، خصوصًا جاہلیتِ عرب کی تاریخ پر۔ آج بھی ہندوستان میں کتنی ہی قومیں ایسی ہیں، جو تیرتھ جاترا کے وقت گھر سے مفلس و تہیدست نکلنا ہی اپنی روحانیت کا کمال سمجھتے ہیں، راستہ میں مانگتے ہوئے جائیں گے، کوئی دوسرا انہیں کھلا پلا دیا کریگا یہ اپنے فقیر ہونے پر فخر کرینگے۔ اس قسم کے سارے تخیلات واوہام اسلام نے مٹا دئے اور حکم دیا کہ جب گھر سے حج و زیارت کے لئے نکلو تو ضرورت بھر کا روپیہ پیسہ لے کر نکلو۔ راستہ میں دوسروں پر بار بننے کی کوشش نہ کرو۔ عرب جاہلیت میں یہ مرض اور زیادہ پھیلا ہوا تھا، بلکہ بعض گروہوں کو تو یہ غلو تھا کہ احرام پہننے کے بعد جو کچھ سرمایہ ہوتا بھی، اُسے بھی پھینک دیتے! کانوا یحجون بغیر زاد و کان بعضہم اذا احرم رمی بما معہ من الزاد (ابن جریر) کان اہل الیمن یحجون ولا یتزودون و یقولون نحن المتوکلون فاذا قدموا مکۃ سألوا الناس (بخاری عن ابن عباسؓ) طائفۃ من العرب کانت تجیء الی الحج بلا زاد و یقول بعضہم کیف نحج بیت اللہ ولا یطعمنا فکانوا یبقون عالۃ علی الناس (قرطبی) اسلام ایسے دستور کا جو جھوٹی اور نمائشی روحانیت پر مبنی تھا، اور ایک طرف شخصی غیرت و خودداری کے بھی منافی تھا، اور دوسری طرف معاشیاتِ اجتماعی پر ایک خواہ مخواہ کا بار تھا، کیسے روادار ہو سکتا تھا، اور اسے کیونکر باقی رہنے دیتا۔ تَزَوَّدُوْا کے صیغۂ امر سے فقہاء نے نکالا ہے کہ زادِ راہ لینے کا وجوب آیت سے بقاعدۂ عبارۃ النص ثابت ہے۔ فقہاء نے یہ بھی صاف لکھ دیا ہے، کہ آیت اُن "توکل پیشہ" صوفیہ کے مذہب کی بھی تردید کر رہی ہے، جو کسبِ معاش کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور اسے کوئی بڑا روحانی کمال سمجھ رہے ہیں۔ ھذا یدل علی بطلان مذہب المتصوفۃ الذین یتسمون بالمتوکلۃ فی ترکہم التزود والسعی فی المعائش (جصاص) ہم المقصرون عن درجۃ التوکل الغافلون عن حقائقہ (ابن العربی)

۴۳۳ (خصوصًا گداگری اور دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے احتیاط) ای اتقوا الاستطعام و ابرام الناس والتثقیل علیہم (کشاف) فان خیر الزاد اتقاء الکفون بہ وجوہکم عن السوال (کبیر) ای الاتقاء عن الابرام والتثقیل علیہم (مدارک) زائروں اور جاتریوں کی گداگرانہ عادت اور جھوٹے توکل کو خاص طور پر روکنا تھا۔ اس لئے حکم تزودوا کے بعد مزید تاکید کے لئے یہ تصریح اور بڑھادی، ابھی ارشاد ہوا تھا کہ مصارفِ سفر کا انتظام کر کے چلو۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ بڑا انتظام یہی ہے کہ راہ میں دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا اور دوسروں کے لئے باعثِ گرانی نہ بننا پڑے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ زاد سے جب زادِ راہ اور زادِ عمل دونوں مُراد ہو سکتے ہیں، تو واجب یہی ہے کہ دونوں کا اہتمام والتزام رکھا جائے۔ لما احتملت الآیۃ الامرین من زاد الطعام و زاد التقوی وجب ان یکون علیہما اذ لم تقم دلالۃ علی تخصیص زاد من زاد (جصاص)

۴۳۴ (ان احکام کی تعمیل کے باب میں) اہم حکم کے بعد تقویٰ الٰہی کی تاکید اس کی دلیل ہے کہ اسلام صرف احکام کی ظاہری تعمیل کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ چاہتا ہے کہ بندوں کی اصلاح باطن سے ہو جو بھی نیک عمل انسان کرے وہ صرف اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ ضمیر اور دل کی پاکیزگی کے ساتھ ہو۔

۴۳۵ بسلسلۂ سفرِ حج۔ اسلام جس طرح فلاحِ اُخروی کا ضامن ہے، فلاحِ دنیوی کا بھی داعی ہے، اور اس کی یہ جامعیت اس کی ہر عبادت سے بالکل صاف ظاہر ہو رہی ہے، وضو، نماز، نماز با جماعت، روزہ، زکوٰۃ سب کے سب روح کو جلا دینے اور اپنے باطن کو صیقل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیوی، مادی، جسمانی، معاشی فائدوں اور مصلحتوں سے بھی کتنے لبریز ہیں۔ یہی اصول حج کے بارے میں بھی کام کر رہے ہیں حج کا منزل در منزل سفر، بری و بحری طویل سفر اور امت کے مختلف طبقوں کا دنیا کے مختلف گوشوں سے عظیم الشان اجتماع، ایک خشک عبادت اور محض ذکرِ الٰہی کے لئے نہیں۔ فرد و ملت دونوں کے لئے یعنی انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے فائدے اس سے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور کئے جانے چاہئیں ——— حج کے روحانی اسرار و حقائق کا ادراک تو فرنگی دماغوں کے لئے آسان نہیں لیکن اس "بین الاقوامی سالانہ کانگریس" سے جو سیاسی، ملی، اجتماعی فائدے وابستہ ہیں، اور اس "بین الاقوامی سالانہ بازار" سے جو مالی، تجارتی، معاشی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ اور اُن کا اعتراف تو فرنگیوں کی زبان سے بھی بارہا ہو چکا ہے۔ یہاں خاص طور پر توجہ اس سفر و اجتماع کے معاشی و تجارتی پہلو پر دلائی ہے۔ اور جو رکاوٹ ایک خالص دیندار شخص کو ان فوائد کو حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے، اُسے دور کر دیا ہے۔ فَضْلًا۔ سب کا اتفاق ہے کہ فضل سے یہاں مراد مال اور نفعِ تجارت ہے۔ یعنی المال و ما یکتسب (راغب) ھو النفع والربح بالتجارۃ (کشاف) لوگوں کا غلو اس باب میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جو تاجر مالِ تجارت لے کر منیٰ اور مکہ کے بازاروں کے لئے جاتے، یا جو اونٹ والے اپنے اونٹ مزدلفہ، عرفات و منیٰ کے لئے لے جاتے، سمجھا جاتا تھا کہ ان کا حج ہی نہیں ہوتا، کہ جہاں تجارت آگئی، وہاں عبادت کا وجود کہاں باقی رہا۔ قرآن مجید نے اس مغالطۂ عامۃ الورود کی تردید کردی۔ نزلت ردًا علی من یقول لا حج للتجار والاجراء والجمالین (کبیر) فی ھذا دلیل جواز التجارۃ فی الحج للحاج مع اداء العبادۃ ولا یخرج بہ المکلف عن رسم الاخلاص المفترض علیہ (ابن العربی) یدل علی ان الحج لا یمنع التجارۃ وعلی ھذا امر الناس من عصر النبی علیہ السلام الی یومنا ھذا فی مواسم منیٰ ومکۃ فی ایام الحج (جصاص) ابن عباسؓ صحابی سے لے کر حسن، عطاء، مجاہد، قتادہ وغیرہ تابعین تک بلا اختلاف سب سے یہی تفسیر مروی ہے۔ (روی نحو ذلک من جماعۃ من التابعین منہم الحسن و عطاء و مجاہد و قتادۃ ولا نعلم احدًا روی عنہ خلاف ذلک (جصاص) صرف ایک روایت کسی حد تک اس سے مخالف ملتی ہے لیکن محققین نے تصریح کردی ہے کہ وہ ظاہر قرآن و اجماعِ عام دونوں کے منافی ہے۔ ھذا قول شاذ خلاف ما علیہ الجمہور و خلاف ظاہر الکتاب (جصاص) مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ یعنی حسب تقدیرِ الٰہی۔ بات بات میں بات پیدا کرنا قرآن مجید کا ایک مستقل اعجاز ہے۔ یہ ذرا سا لفظ لا کر یاد دلادیا کہ اس نفع و تجارت کو بھی اپنے قوتِ بازو کا ثمرہ نہ سمجھ لینا، جو کچھ بھی حاصل ہوگا سب کو کارسازِ حقیقی ہی کے لطف و کرم کا ثمرہ سمجھنا، نظر تجارت و کاروبار میں بھی ہر وقت اسی پر رہے۔ اس ہدایت پر عمل کے بعد تجارت کی کوئی بڑی سی بڑی مشغولیت بھی تجارت باقی رہ سکتی ہے؟ تجارت اس حال میں اگر عبادت نہ بن جائے، تو آخر کیا ہو۔

۴۳۶ (۹ ذی الحجہ کی شام کو عرفات میں وقوف اور ادائے آدابِ وقوف کے بعد) حج کے اعمال اواجبات سنن و مستحبات تو بہت سے ہیں لیکن فرض تین ہی ہیں۔ احرام پوشی ۹ کو عرفات میں حاضری یا وقوف اور طوافِ فرض۔ ان تینوں ارکان میں بھی اہم ترین رکن یہی وقوفِ عرفات ہے۔ اَفَضْتُمْ۔ افاضہ کے لفظی معنی انبوہ در انبوہ چلنے یا واپس ہونے کے ہیں۔ لے دفعتم منہا بکثرۃ (راغب) الافاضۃ الاندفاع فی السیر بکثرۃ (کبیر) اصطلاح فقہ میں افاضہ عرفات سے مزدلفہ کو کہتے ہیں۔ عرفات مکہ معظمہ سے جو سڑک مشرق کی جانب طائف کو جاتی ہے اس پر مکہ سے کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر کئی میل کے رقبہ کا ایک لمبا چوڑا میدان پڑتا ہے۔ اور اس کا نام عرفات اسی نام کی ایک پہاڑی بھی اسی میدان میں واقع ہے، سطح زمین سے کوئی ۲۰۰ گز بلند۔ سال بھر یہ میدان بالکل سنسان پڑا رہتا ہے، صرف ایک دن یعنی ۹ ذی الحجہ کو اس کی پوری کسر نکل آتی ہے۔ اس روز یہ میدان انسانوں اور ان کی سواریوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔ حاجیوں کو ۸ ذی الحجہ کی دوپہر تک منیٰ میں آجانا چاہیے، اور ۹ کی صبح کو بعد اشراق قافلہ عرفات کے لئے روانہ ہو جائیں تاکہ ۸ - ۹ میل کا درمیانی فاصلہ دوپہر تک طے ہو جائے، دوپہر سے لے کر آخر وقت عصر تک اسی میدان میں رہنا چاہیے اور اسی کا اصطلاحی نام وقوف ہے یہی حاضری اعمالِ حج کی جان ہے اور یہ سارا وقت توبہ و استغفار، عبادت، انابت ہی میں صرف ہونا چاہیے۔ قریب غروب مزدلفہ یا مشعر الحرام کے لئے کوچ ہونا چاہیے۔ اور جس طرح آج ظہر کے ساتھ عصر کی نماز بقاعدۂ تقدیم عرفات کی مسجد نمرہ میں ملالی گئی تھی اسی طرح آج مغرب کی نماز بقاعدۂ تاخیر، عشاء سے ملا کر اُس وقت پڑھی جائیگی، جب قافلے مزدلفہ پہنچ جائیں۔

۴۳۷ المشعر الحرام۔ مشعر کے لفظی معنی نشانی یا علامت کے ہیں۔ اور حرام یعنی محترم یا مقدس اس کی تعظیمی صفت ہے۔ نام اُس خاص مقام کا بھی ہے جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے اور خود سارے مزدلفہ کو بھی مشعر الحرام ہی کہتے ہیں۔ لم یختلف اھل العلم ان المشعر الحرام ھو المزدلفۃ (جصاص) والمشہور ان المشعر مزدلفۃ کلہا۔ مزدلفہ کوئی ۳ میل کے فاصلہ پر ہے منیٰ سے عرفات جانے کا ایک تو سیدھا راستہ ہے۔ حاجی ۹ کو عرفات جاتے اسی راستے سے ہیں۔ واپسی میں حکم ہے کہ دوسرے راستے سے لوٹیں یہ دہ بڑا چکر کا ہے اور مزدلفہ اسی راستہ میں پڑتا ہے۔ حاجیوں کے قافلے شب ۱۰ کے اول حصہ میں یہاں پہنچ جاتے ہیں اور رات یہاں تسبیح و تہلیل، نماز و استغفار میں گزارتے ہیں۔ مسجد پہاڑی کے اوپر ہے۔ جبل یقف علیہ الامام و انما سمی مشعرًا لانہ معلم العبادۃ و وصف بالحرام لحرمتہ (بیضاوی) عِنْدَ الْمَشْعَرِ۔ یعنی اس مسجد کے گرد و پیش خصوصیت کے ساتھ ادریوں تو سارا مزدلفہ (جزء اول) حرم ہی متبرک و محترم ہے۔ خص اللہ تعالیٰ الذکر عندہ مع انہ مأمور بہ فی جمیع المزدلفۃ لانہا کلہا موقف الا بطن محسر لزیادۃ فضلہ (روح) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ نے یاد دلادیا کہ یہ رات رنگ رلیاں منانے کی نہیں، جاہلی قوموں کے میلوں ٹھیلوں کی طرح رتجگی و قصہ خوانی کی بھی نہیں خوابِ غفلت میں پڑے رہنے کے لئے نہیں، فخریہ قصیدوں اور شعر و شاعری میں صرف کرنے کے لئے نہیں، ذکر و عبادتِ الٰہی کے لئے ہے۔

حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بڑا

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۹۹ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ

بخشنے والا مہربان ہے پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کی

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ

یاد کرو اپنے باپ دادوں کی یاد کی طرح، بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے ہمیں دنیا ہی میں دیدے

وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰ وَمِنْهُمْ

اور ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور کوئی ان میں ایسے ہوتے

مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي

ہیں جو کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے ہم کو دنیا میں (بھی) بہتری دے اور آخرت میں

الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۰۱ اُولٰۗىِٕكَ

(بھی) بہتری۔ اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا یہ وہ لوگ ہیں

لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ

جنہیں حصہ ملے گا بعوض اسکے جو انہوں نے عمل کر رکھا ہے اور اللہ حساب بہت جلد

الْحِسَابِ ۝۲۰۲ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ

لے لے گا اور اللہ کو (ان) چند گنے ہوئے دنوں میں (برابر) یاد کرتے رہو

النصف

منزل

---

۴۳۸ اپنے رسول کے ذریعہ سے ورنہ اپنے اختراعی طریقوں سے بچو) الحاد و انکار سے بچ کر دین و مذہب کے دائرہ میں آجانے کے بعد پھر جو خطرہ اہل مذہب کو شیطان کے ہاتھوں سب سے بڑھ کر درپیش رہتا ہے وہ بدعات و محدثات کا ہے۔ انسان اپنے دل سے طرح طرح کے طریقۂ عبادت و ذکر الٰہی کے ایجاد کرتا رہتا، اور انہیں مذہب میں داخل کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ دین صرف وہ ہے جو شارع اللہ کی طرف سے پہنچائے یا اپنے اجتہاد سے بتلائے۔ یہاں اگر ایک طرف اس کی تاکید ہے کہ برابر یاد الٰہی میں لگے رہو، تو دوسری طرف اس کی بھی صراحت ہے کہ اس یاد کے طریقے اپنے ایجاد کردہ نہ ہوں، اللہ اور اللہ کے رسول ہی کے بتائے ہوئے ہوں۔ حکم ذکر کی تکرار تاکید کے لئے ہے۔ کرر الامر تاکیدا (قرطبی) اکد علی سبیل التوکید و المبالغۃ فی الامر بالذکر (بحر) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلا حکم مشعر الحرام میں ذکر کرتے رہنے کے لئے ہو اور دوسرا حکم اہتمام اخلاص کے لئے ہو۔ قیل الاول امر بالذکر عند المشعر الحرام و الثانی امر بالذکر علی حکم الاخلاص (قرطبی) ۴۳۹ (عبادات و ذکر الٰہی کے صحیح طریقوں سے) ضالٓ ہمیشہ گمراہ ہی کے معنی میں نہیں آتا، ناواقف کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور ضلال سے مراد احکام الٰہی سے ناواقفیت ہو سکتی ہے۔ الضلال ضربان ضلال فی العلوم النظریۃ ... وضلال فی العلوم العملیۃ کمعرفۃ الاحکام الشرعیۃ التی ھی العبادات (راغب) اور یہاں یہی مراد ہے۔ والمراد من الضلال الجھل بالایمان و مراسم الطاعات (روح) اِنْ یہاں اِنَّ کے معنی میں تحقیق و توثیق کے لئے ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ قَدْ کے مرادف ہے۔ اے وانکم کنتم (روح) ان ھذہ عند البصریین التی للتوکید المخففۃ من الثقیلۃ (بحر) مِنْ قَبْلِہٖ میں ضمیرہ ہدیٰ کی طرف راجع ہے جو ھدٰکم سے مفہوم ہوتا ہے۔ والھاء فی قبلہ عائدۃ علی الھدی المفھوم من قولہ ھدٰکم (بحر) ۴۴۰ یعنی عرفات سے۔ قریش کے گڑھے ہوئے عقیدوں میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ ہمیں حج میں عرفات کی حاضری کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں تک سب کے ساتھ جانا ہماری علو شان کے منافی ہے، ہمارے لئے مزدلفہ تک جانا کافی ہے۔ کانت قریش ومن دان دینھا یقفون بالمزدلفۃ وکانوا یسمون الحمس وکانت سائر العرب یقفون بعرفات (صحیح بخاری عن عائشۃؓ) کانت قریش ومن کان علی دینھا وھم الحمس یقفون بالمزدلفۃ یقولون نحن قطین اللہ (ابن جریر۔ عن عائشۃؓ) کانوا یقولون لا نخرج من الحرم فکانوا لا یشہدون موقف الناس بعرفۃ معھم (ابن جریر) کانوا یقولون نحن قطین اللہ فینبغی لنا ان نعظم الحرم ولا نعظم شیئا من الحل (قرطبی) آیت انہی کی اصلاح کے لئے ہے۔ الناس سے مراد جنس انسان ہے۔ المراد من الناس الجنس کما ھو ظاھر (روح) ثُمَّ یہاں تاخر زمانی کے لئے نہیں فصل کلام کے لئے ہے۔ یعنی ایک بات ختم ہوئی، اب دوسری ہدایت سنو، جیسے اردو میں ایسے موقع پر "اچھا" یا "ہاں تو" کہتے ہیں۔ ثم لیست فی ھذہ الآیۃ للترتیب وانما ھی لعطف جملۃ کلام ھی منھا منقطعۃ (قرطبی) ثم للترتیب فی الذکر لا للترتیب فی الزمان الواقع فیہ الافعال (نہر)

۴۴۱ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ۔ حدیث صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں یوم عرفہ سے زیادہ بندے آگ سے آزاد کئے جاتے ہوں۔ حج کا بیان جہاں سے شروع ہوا ہے، دیکھتے آیئے تزکیۂ قلب کا قدم قدم پر کس درجہ اہتمام ہے۔ حرم شریف نہیں، حدود حرم بھی ابھی منزلوں فاصلہ پر ہیں کہ ساری عمر کا مالوف مانوس لباس جسم سے اتر گیا، اور اب نہ سر پر ٹوپی ہے، نہ کسی قسم کی پگڑی یا صافہ، اور جسم پر نہ شیروانی ہے نہ کوٹ، نہ جبا نہ قمیص شاہ و گدا، امیر و رعایا، حکام و عوام سب کے سب دو دو چادروں میں ملبوس، پھر احرام پہنتے ہی جو چیزیں حرام تھیں ان کا ذکر ہی نہیں، جو ہمیشہ حلال تھیں اور نفس جائز ہیں ایک خاص طول مدت کے لئے بالکل ممنوع! کتنی ہی مرغوبات و مالوفات سے اس درمیان میں دستبرداری کرنی ہوتی ہے۔ یہ سب بھی کافی نہیں، گھڑی گھڑی لبیک کہتے رہو۔ اللہ کے دربار میں حاضری برابر ہو، مسلسل ذکر الٰہی کرتے رہو، اور اب یہ حکم مل رہا ہے کہ خطاؤں کو، گناہوں کو، سیہ کاریوں کو یاد کر کے ان پر معافی چاہتے رہو! ـــــــ تنہا کیزہ، ایسے ستھرے اس قدر اصلاحی اجتماع سے دنیا جہان کے میلوں ٹھیلوں، بت پرستانہ، وہم پرستانہ، ہوس پرستانہ، میلوں تہواروں کو کوئی بھی مناسبت ہے! ع کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانہ کو! کیسا صریح ظلم وہ اہل قلم خود اپنی بصارت و بصیرت پر کرتے ہیں، جو اسلام کو دوسرے ادیان و مذاہب کی سطح پر سمجھے ہوئے ہیں! غَفُوْرٌ۔ آیت کے آخر میں یاد دلا دیا کہ تمہارے رب کی صفت مغفرت بڑی ہے۔ اس سے مغفرت طلب کر کے دیکھو تو۔ طالبین مغفرت کی مغفرت، وہ کیوں نہ کرے گا؟ رَحِيْمٌ۔ اور ساتھ ہی اس کی صفت رحمت بھی تو بے پایاں ہے، طالبان مغفرت کے ساتھ وہ رحمت کا معاملہ کیوں نہ کرے گا؟ ۴۴۲ (اور ابھی منیٰ سے منتشر نہیں ہوئے ہو) عرفات و مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام تین دن ۱۰، ۱۱، ۱۲ کو لازمی ہے، اور بعض ائمہ کے نزدیک ۱۳ کو بھی۔ اِذَا کے لفظ سے دھوکا نہ ہو کہ یہاں حکم ادائے مناسک کے بعد کے لئے مل رہا ہے۔ اِذَا ہمیشہ بعد کے لئے نہیں آتا ہے۔ ہم زمانی کے موقع پر بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ مثلاً فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ قیاما وقعودا جس کے معنی ہیں کہ جب تم نماز پڑھتے ہو، نہ یہ کہ جب تم نماز ختم کر چکو، یا اذا طلقتم النساء جس کے معنی ہیں کہ جب تم طلاق دینے لگو، نہ یہ کہ جب تم طلاق دے چکو، اسی طرح یہاں بھی معنی یہ ہیں کہ جب تم ادائے مناسک کر رہے ہو۔ مَنَاسِكَكُمْ۔ مناسک شعائر حج کو کہتے ہیں۔ ھی شعائر الحج (قرطبی) قَضَيْتُمْ۔ قضا کے معنی کسی عبادت کے ادا کر چکنے یا بجالانے کے ہیں۔ قضیتم ھنا بمعنی ادیتم و فرغتم (قرطبی) قضاء المناسک ھو فعلھا علی تمام (جصاص) ۴۴۳ قومی عظمت و قومی خودداری، نسلی مفاخرت جس طرح جدید جاہلی تہذیب کا عنصر اعظم ہیں، عرب کے دین جاہلی کے بھی رکن اعظم تھے۔ عرب جب منیٰ میں جمع ہوتے تو ہر ہر قبیلہ اپنے قبائل کی جے پکارتا اور اپنے بزرگوں کے مفاخر و مناقب کے پرزور بیان سے دلوں کو گرماتا۔ کان اھل الجاھلیۃ یجلسون بعد الحج فیذکرون ایام آباءھم (ابن عباس) کان القوم فی جاھلیتھم بعد فراغھم من حجھم ومناسکھم یجتمعون فیتفاخرون بمآثر آبائھم (ابن جریر) كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ۔ مسلمانوں کو حکم ملتا ہے کہ یہی جوش و خروش تم اللہ کے ذکر میں دکھاؤ۔ تمہاری نہ کوئی قوم ہے، نہ کوئی نسل، نہ تمہارا کوئی وطن۔ تم ان سب کے بدلے اللہ کی عظمت دلوں میں بٹھاؤ، بساؤ، اور اللہ کا نام بانوں پر لاؤ۔ او یہاں تخییر کے لئے نہیں، بلکہ ترقی کا مفہوم دے رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ربط و تعلق کم از کم اس درجہ کا تو رکھو جتنا اپنے خاندان، اپنے قبیلہ، اپنی قوم کے ساتھ رکھتے ہو، بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہو۔ قیل بمعنی بل (بحر) اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ مولانا روی نے اسی کو اپنی شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں یوں ادا کیا ہے ؎

گر گزشتن ہمراہ وانے بود ۔۔۔ عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود

۴۴۴ دنیا میں ایسی بھی قومیں ہیں جو خدا کی قائل ہوتی ہیں، اسے معبود اعظم سمجھتی ہیں، لیکن حشر و نشر، جزا و سزا کی قائل نہیں، ایسے لوگوں کی دعائیں، التجائیں، تمنائیں قدرۃً اسی مادی دنیا کی ترقیوں تک محدود رہتی ہیں۔ مشرکین عرب کے عقیدے بھی اسی قسم کے تھے، اور یہ لوگ جب دعا بھی مانگتے تھے، تو تمام تر سامان دنیوی اور دشمن پر فتح و نصرت وغیرہ کی۔ ابن زید، سدی وغیرہ تابعین سے یہی معنی مروی ہیں۔ المراد المشرکون، قال ابو وائل و السدی و ابن زید کانت العرب فی الجاھلیۃ تدعو فی مصالح الدنیا فقط فکانوا یسألون الابل و الغنم و الظفر بالعدو ولا یطلبون الآخرۃ (قرطبی) مَنْ يَّقُوْلُ سے یہ لازم نہیں آتا کہ دعائیں بالکل انہی الفاظ کے ساتھ کی گئی ہوں۔ قول کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ تمنا کرنا، زبان حال سے کہنا، دل میں خیال لانا، سب اس میں شامل ہیں۔ ۴۴۵ (یعنی آخرت جس کے تسلیم کرنے سے عمر بھر انکار کرتا رہا۔ اذ کانوا لا یعرفون ولا یؤمنون بھا (قرطبی) ۴۴۶ یہ اشارہ انسانیت کے پسندیدہ طبقہ یعنی اہل ایمان کی جانب ہے۔ مومنین کی دعائیں، مناجاتیں، آرزوئیں، دنیا و آخرت دونوں کی فلاح و بہبود کی جامع ہوتی ہیں۔ حَسَنَةً وہ طاعت ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ و بہتر ہے، اور اس کے اندر ہر قسم کی خیر و خوبی آگئی۔ ان حسنۃ نکرۃ فی سیاق الدعاء فھو محتمل لکل حسنۃ من الحسنات علی البدل (قرطبی) والحسنۃ المطلقۃ فی الدنیا ما یشمل جمیع حسناتھا (روح) دنیا میں حسنۃ توفیق خیر ہوئی، اور آخرت میں حسنۃ ثمرۂ خیر۔ والذی علیہ اکثر اھل العلم ان المراد بالحسنتین نعم الدنیا و الآخرۃ وھذا ھو الصحیح فان اللفظ یقتضی ھذا کلہ (قرطبی) ایسی جامع و ہمہ گیر دعا کی نظیر سے دیان و ملل کے صحیفے خالی ہیں۔ رسول مقبول صلعم خود اس دعا کی کثرت رکھتے تھے۔ کان اکثر دعوۃ یدعو بھا النبی صلعم یقول اللھم آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار (بخاری و مسلم) مال، اولاد، صحت، اطمینان وغیرہ جو چیزیں بھی تحصیل خیر میں معین ہو سکتی ہیں، خواہ بظاہر کیسی ہی دنیوی اور مادی ہوں، سب مومن کا مقصود و مطلوب بن سکتی ہیں۔ البتہ خود دنیا ہرگز کسی مومن کا مدعا اور مقصود نہیں بن سکتی۔ آیت کی ترکیب خوب نظر میں رہے۔

أَتَا کا مفعول صرف حسنۃ ہے۔ یعنی جس چیز کی طلب و تمنا کی جا رہی ہے وہ حسنۃ یا بہتری ہے۔ فِی الدُّنْیَا اور فِی الْاٰخِرَۃِ صرف ظرف یا محل ہیں۔ ترکیب میں یہ مفعول یا معنی کے لحاظ سے مقصود کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے۔ مراد محض یہ ہے کہ ہمیں تو آپ کے دربار سے صرف بھلائی یا بہتری درکار ہے، دنیا میں ہو تو بھی اور آخرت میں ہو تو بھی۔ مزید تفسیر یہ کہ دنیا میں ہمیں اعمالِ خیر عنایت ہوں، اور آخرت میں ثمراتِ خیر۔ بعض نادان اور سطحی دماغ والے اہل قلم نے آیت سے عجیب و غریب نتیجہ نکالا ہے کہ آخرت کی طرح دنیا بھی مومن کا مقصود بن سکتی ہے، بلکہ قرآن خود طلبِ دنیا کی تعلیم و ترغیب دیتا ہے! ——— تعالیٰ اللہ علوًّا کبیرًا۔ مغالطہ کی قلعی اوپر کھولی جا چکی ہے۔ مادہ پرست قوموں کی دنیا طلبی اور دنیا پسندی سے مرعوب ہو کر خود مسلمانوں کو طلبِ دنیا کی تعلیم دینا بلکہ اُسے قرآنی تعلیم قرار دینا خدمتِ اسلام کی عجیب و غریب صورت ہے! ٧٤٧ (دونوں جہانوں میں۔ اور جو گمراہ قوموں کی طرح بے بہرہ رہیں گے، ٧٤٨ (اور یوم حساب خود ہر لمحہ قریب آ رہا ہے، بس اس سے غفلت ہرگز مقتضائے عقل و دانش نہیں) مِمَّا كَسَبُوْا میں مِن سببیہ ہے۔ اے من اجل ما کسبوا (بحر) من اجلہ (بیضاوی) سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ اُس جیسے قدرت کاملہ کے مالک کو حساب کرتے یا بندوں کو ان کے اعمال کی جزا دیتے دیر ہی کیا لگ سکتی ہے۔ لے سریع المجازاۃ للعباد باعمالھم (قرطبی) جاہلی قوموں نے اس وصفِ خاص میں بھی اپنے دیوی دیوتاؤں کے باب میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں ٧٤٩ یعنی ایامِ تشریق میں، نا قیامِ منیٰ میں۔ منیٰ مکہ معظمہ سے شمال و مغرب میں ۳ میل کے فاصلہ پر ہے۔ پہلے کبھی محض میدان تھا۔ اب بہت سی پختہ اور عالی شان عمارتیں بن گئی ہیں۔ سال بھر تو خالی پڑی رہتی ہیں۔ موسم حج میں خوب آباد ہو جاتی ہیں۔ صاحب حیثیت حاجی انہیں

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ

جو شخص (ان) دو دنوں میں جلدی کرے، اس پر (بھی) کوئی گناہ نہیں۔ اور جو تاخیر کرے

فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں ٧٥٠ (یہ) اس کے لئے جو ڈرتا رہتا ہے ٧٥١ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانے

اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ

رہو کہ تم (سب) اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے ٧٥٢ اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے ٧٥٣ کہ اس کی

قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ

گفتگو جو دنیوی غرض سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو

قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی

گواہ لاتا ہے، درآنحالیکہ وہ شدید ترین دشمن ہے ٧٥٤ اور جب پیٹھ پھیر جاتا ہے تو اس

الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ

دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر فساد کرے، اور کھیتی اور جانوروں کو تلف کرے ٧٥٥

وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ

درآنحالیکہ اللہ فساد کو (بالکل) پسند نہیں کرتا ٧٥٦ اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ خوفِ خدا

اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ

کرو، تو اُسے نخوت گناہ پر (اور زیادہ) آمادہ کر دیتی ہے ٧٥٧ سو اس کے لئے جہنم بس ہے، اور بڑی

الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ

بری آرامگاہ ہے! اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اپنی جان (تک) اللہ کی

بڑے بڑے کرایوں پر لے لیتے ہیں۔ بعض سرکاری عمارتیں ہیں۔ بازار بھی اس زمانہ میں یہاں بہت بڑا اور بہت پُررونق لگتا ہے۔ دنیا جہان کی چیزیں بکنے آ جاتی ہیں۔ تشریق کے معنی قربانی سکھانے کے ہیں۔ ایامِ تشریق ۱۰-۱۱-۱۲ ذی الحجہ ہیں۔ حاجیوں کے قافلے عرفات و مزدلفہ سے واپسی میں آ کر صبح یہاں پہنچ جاتے ہیں، اور ۱۲ کی شام تک تو بہرحال یہاں قیام رہتا ہے۔ حج کے سلسلہ میں متعدد واجبات و سنن و مستحبات یہیں انجام پاتے ہیں۔ مثلاً قربانی کرنا، سر کے بال منڈوانا، شیطانوں کو کنکریاں مارنا، جامۂ احرام اتارنا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ۔ ادھر حج کا بیان آیا، اُدھر ذکرِ الٰہی کی تاکید پھر شروع ہو گئی۔ تکبیر کی کثرت قیامِ زمانۂ منیٰ کا ایک خاص جزو ہے۔ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ۔ اس پر صحابہ و تابعین سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد زمانۂ تشریق ہے۔ لا اختلاف بین اھل العلم ان المعدودات ایام التشریق وقد روی ذلک عن علی وعمر وابن عباس وابن عمر وغیرھم (جصاص) ٧٥٠ یعنی منیٰ سے مکہ معظمہ کی طرف واپسی کے لئے دونوں صورتیں بالکل جائز ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ۱۰ کے بعد صرف دو دن قیام کر کے ۱۲ کی شام کو مکہ چلا آئے تو بھی درست ہے اور جس کا جی چاہے ۱۳ تک وہیں ٹھہرا رہے، جب بھی درست ہے۔ امام شافعیؒ کے ہاں اگر ۱۳ کو واپس ہوتا ہے تو قبل غروب رمی جمرات (کنکریاں پھینکنے) سے فراغت کر لے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے ہاں اگر ۱۳ تک ٹھہرتا ہے، تو قبل طلوعِ آفتاب ہی رمی جمرات کر ڈالے۔ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ۔ نفی دونوں صورتوں سے گناہ کی کی گئی ہے۔ گویا بلحاظِ جواز دونوں شقیں یکساں ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ دونوں میں کوئی افضل و مفضول نہیں۔ اور بلحاظ درجہ بھی دونوں مساوی ہیں۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں ۱۳ کا قیام افضل ہے ٧٥١ یعنی یہ سب احکام نافع اسی کے حق میں ہو سکتے ہیں جو دل میں خوفِ خدا و خشیتِ الٰہی رکھتا ہو۔ تقوائے الٰہی کی اس شد و مد سے تاکیدیں یوں ہی اور بے کار نہیں۔ مومن کے دل پر تقویٰ کی اہمیت نقش کرنے کے لئے ہے۔ وہ مومن ہی کیا جو متقی نہ ہو ٧٥٢ اور اسی کے سامنے سارے اعمال کا جواب دہ ہونا ہوگا (یہ یاد دہانی حفظِ اعمال میں کس درجہ موثر ہے! سارا کھیل اسی استحضار ہی کا تو ہے۔ ٧٥٣ (اُس کی چرب زبانی کی بنا پر، اُس کے دعوائے اسلام وحبِ اسلام کے باعث) اوپر دو قسم کے انسانوں کا ذکر تھا۔ آخرت کے قائلین و معتقدین کا اور آخرت کے منکرین کا۔ اب ذکر منکرین اور منافقین کا ہوتا ہے۔ اور ابتدا منافقین کے بیان سے ہوتی ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ۔ لازمی نہیں کہ ایک ہی شخص مراد ہو۔ ایک بھی ہو سکتا ہے، بہت سے بھی ہو سکتے ہیں۔ اشارۃ الی بعضھم فیحتمل الواحد ویحتمل الجمع (کبیر) فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ فی اظہارِ مقصودیت کے لئے ہے۔ یعنی گفتگو سے مقصود اس سے محض حصولِ دنیا ہوتی ہے، طلبِ آخرت نہیں۔ یطلب بہ حظًّا من حظوظ الدنیا (کشاف) لطلب مصالح الدنیا (کبیر) فی۔ "باب میں" یا "دربارہ" کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ اِس صورت میں معنی ہوں گے کہ "دنیوی امور سے متعلق"۔ اے مایقولہ فی امور الدنیا واسباب المعاش (بیضاوی) در بابِ زندگانی دنیا (شاہ ولی اللہ دہلوی) شانِ نزول کی روایتوں میں آتا ہے کہ قبیلۂ ثقیف کا ایک شخص خوش منظر و خوش تقریر اخنس بن شریق نامی تھا۔ مجلسِ رسولؐ میں جب آتا تو خوب لمبے چوڑے دعوے اپنے ایمان و اسلام کے کرتا، بات بات پر خدا کو گواہ ٹھہراتا۔ لیکن جب مجلس سے اٹھ کر چلا جاتا تو طرح طرح کی عملی شرارتوں میں لگ جاتا۔ نزلت فی اخنس بن شریق الثقفی (ابن جریر) کان رجلاً حلو الکلام، حلو المنظر (معالم) کل منافقا احسن العلانیۃ خبیث الباطن (کبیر) مگر شانِ نزول کی روایتوں سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آیت کا انطباق صرف اسی خاص شخص تک محدود ہے، بلکہ جہاں کہیں بھی وہ صفات پائے جائیں گے، وہاں وہ آیت بھی چسپاں ہو گی۔ القول الثانی فی الایۃ وھو اختیار اکثر المحققین من المفسرین ان ھذہ الایۃ عامۃ فی حق کل من کان موصوفًا بھذہ الصفات المذکورۃ (کبیر) ٧٥٤ (اللہ کے دین کا، اللہ کے رسول کا) یُشْهِدُ اللّٰهَ۔ یعنی آپ کو اللہ کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے۔ قسم کا مفہوم بھی شہادت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ یقول انی لاحبک ویحلف باللہ علی ذلک (معالم) رسولؐ کے علمِ غیب کی نفی پر دلائل بہت سے قائم ہیں۔ ایک مزید دلیل اس آیت سے نکلتی ہے۔ منافق کے نفاق کا علم آپ کے ذریعہ سے حق تعالیٰ آپ کو کرا رہا ہے۔ ورنہ آپ تو اس کی باتوں سے خوش ہو رہے تھے۔ اگر آپ اُسے منافق پہچان گئے ہوتے، تو ظاہر ہے کہ اس سے گفتگو میں لطف ہی کیوں لیتے ٧٥٥ (جیسا کہ اخنس نے کیا بھی، کہ قبیلۂ ثقیف کے کھیت جلوا دیئے، اور ان کے مویشیوں کو ہلاک کر ڈالا) کما فعلہ الاخنس بثقیف اذ بیتھم واحرق زروعھم واھلک مواشیھم (بیضاوی) وَاِذَا تَوَلّٰی۔ یعنی جب مجلسِ رسولؐ سے اٹھ کر چلا گیا۔ اے اذا خرج من عندک (ابن عباسؓ) اے ادبر واعرض (روح عن الحسن) تَوَلّٰی کے دوسرے معنی "حاکم بن گیا"، "حکومت پا گیا" کے بھی ہو سکتے ہیں، اور کئے گئے ہیں۔ یعنی جب وہ ملک میں حاکم و مسلط ہو جاتا ہے۔ قال مجاھد من الولایۃ اے صار والیا (بحر) اے ملک الامر وصار والیا (معالم۔ عن الضحاک) چوں ریاست پیدا کند (شاہ ولی اللہ دہلوی) اور جب حاکم ہوتا ہے (شاہ رفیع الدین دہلوی) لیکن نظمِ کلام و سیاقِ عبارت کے لحاظ سے ترجیح معنی اول کو ہے، کہ نفاق پر روشنی یہی معنی زیادہ ڈالتے ہیں۔ ——— القول الاول اقرب الی نظم الایۃ لان المقصود بیان نفاقہ (کبیر) سَعٰی کے معنی ہیں سرگرم عمل ہونا، دوڑ دھوپ کرنا۔ السعی فی کلام العرب العمل (ابن جریر) فِی الْاَرْضِ۔ عام طور پر اس سے مراد منافقین کی کثرتِ سعی اور وسعتِ عمل تخریب لی گئی ہے۔ یدل علی کثرۃ سعیہ وتقلبہ فی نواحی الارض (بحر) لیکن الارض کے ال سے مراد کوئی زمین معہود یعنی شہر مدینہ بھی ہو سکتا ہے۔ واذا کان المراد الاخنس فالارض ارض المدینۃ فالالف واللام للعہد (بحر) اَلْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔ کھیتوں میں اس نے آگ لگا دی، اور مویشیوں کو ہلاک کر دیا۔ النسل سے ہر قسم کے جانور مراد لئے گئے ہیں۔ النسل نسل کل دابۃ (ابن عباسؓ) النسل من کل شیء من الحیوان (ابن جریر عن مجاہد) ازہری لغوی کا قول نقل ہوا ہے کہ حرث سے یہاں عورتیں مراد ہیں اور نسل سے اولادِ انسانی۔ ذکر الازھری ان الحرث ھنا النساء والنسل الاولاد (روح) اور جعفر صادقؒ سے منقول ہے کہ

حوت سے مراد دین ہے اور سلم سے انسان۔ عن محمد صدق ان الحوت فی ھذا الموضع الدین والشلم الناس (رح) ۷۵۶ شریعت اسلام کا توصیح شن یہ ہے کہ دنیا کو عدل و امن سے بھر دے۔ بد معنی فساد یعنی غضب الٰہی کی چیزیں یہی اسد اسباب اسلامی کے برعکس عمل کرنے ہی کو کہتی ہیں
۷۵۷ یعنی جب اسے کوئی مخلص ہر خواہ سمجھاتا ہے اور اسے تقویٰ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو بجائے سنبھلنے کے، اور بگڑ جاتا ہے اور اپنی کجروی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتا ہے۔ یہ بیان ہو رہا ہے اس کا کہ ایسے کا زمانہ میں مخالفت حق اور ایذاء مخلوق کے ساتھ ساتھ کبر و پندار بھی کس درجہ
کا ہوتا ہے ۷۵۸ اب بیان مومنین کاملین کا ہو رہا ہے ۷۵۹ عباد کا لفظ ہے تو عام لیکن سیاق چاہتا ہے کہ یہاں مراد بندگان مقبولین ہوں۔ حیث ارشدھم الی مثل ھذا الشراء (بیضاوی) لفظ العبادلہ فی القرآن تشریف واختصاص (بحر) ۷۶۰ حکم خاص طور پر قابل غور ہے۔ اسلام
صرف چند عقائد یا صرف چند عبادات یا صرف چند قوانین کا نام نہیں، وہ تو ایک جامع و مانع نظام حیات ہے، ایک مکمل و منظم دستور زندگی ہے۔ انسانیت کے ایک ایک شعبہ، ہر گوشہ پر حاوی۔ اور اس کا ہر جزو اس کے کل سے، اسکے دوسرے اجزاء سے نہایت درجہ مرتبط ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص
توحید تو اسلام سے لے، لیکن عبادت کے لیے مسجد مندر کلیسا سب کو یکساں سمجھے، یا رسالت پر تو ایمان لے آئے، لیکن معاشیات کے قاعدے کارل مارکس سے اور اخلاق کے ضابطے گوتم بدھ سے لینے جائے۔ معاملات، معاشیات، اخلاقیات، اجتماعیات، اسلام کے سب اپنے ہیں، کسی فلسفہ
کسی اور دین کسی اور نظریہ کی پیوندکاری اسکے ساتھ ہو ہی نہیں سکتی۔ آیت کا حکم عام ہے لیکن شان نزول کی روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ خطاب خاص نومسلم یہود کی طرف تھا، یہ اسلام لانے کے بعد بھی چاہتے تھے کہ کچھ رعایت اپنے عقائد قدیم کی کئے جائیں۔ اور اسلام کی ایک مستقل شاخ
یہودیانہ اسلام قائم کریں، جس طرح بعد کو گمراہ فرقوں کے اثر سے معتزلی اسلام، شیعی اسلام، نیچری اسلام وغیرہ بہت سے "اسلام" قائم ہو کر رہے! اُدْخُلُوْا خود ہی صیغہ امر وجوب کے معنی دے رہا ہے۔ پھر اسکے حال کآفۃ نے اسے کس درجہ مؤکد کر دیا، اور یہ قاعدہ اشارۃ النص اجب بجگہ ظاہری یعنی
انفرادی، اجتماعی، اعتقادی، عبادتی سارے اعمال و امور میں اسلام ہی کا رنگ چڑھا رہے۔ السلم سلم کے لغوی معنی صلح و امن کے ہیں اور لفظ حرب کے مقابل آتا ہے۔ السِلم والسَّلم الصلح وقیل السلم اسم بانزالمحرب (راغب) لیکن السلم سے مراد دین اسلام لی گئی ہے

مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
رضا جوئی میں بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں کے حق میں بڑا شفیق ہے۔ اے ایمان والو
اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر
الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ
نہ چلو وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے پھر اگر تم بعد اس کے کہ
بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
تمہارے پاس کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی ہیں ڈگمگا گئے تو جانے رہو کہ اللہ بڑا زبردست ہے بڑا حکیم
حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ
ہے (یہ لوگ) تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے
ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ
سائبانوں میں آجائے اور فرشتے (بھی) اور قصہ ہی ختم ہو جائے، اور
اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ع ۲۵
اللہ ہی کی طرف (سارے) معاملات رجوع کیے جانے ہیں آپ بنی اسرائیل سے پوچھ دیکھئے
كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ
ہم نے انہیں کھلی نشانیاں کتنی دے رکھی تھیں اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو
اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
بدل ڈالے بعد اس کے کہ وہ اس کو پہنچ چکی ہو تو اللہ بھی سزا دینے میں بڑا سخت

اہل لغت نے بھی اسے قبول کیا ہے، اور صحابیوں اور تابعین کرام سے بھی مروی ہے۔ ای فی الاسلام (رح) ای ادخلوا فی الاسلام (ابن جریر عن
ابن عباس ومجاہد وقتادۃ) وفسر السلم بالاسلام (بحر) ۷۶۱ یہ اس طرح مثلاً کہ اپنے کو کہلاتے تو رہو مسلمان لیکن رسمیں اختیار کر لو
مجوس وہنود کی، معاشرت لے لو مشرکین ہند کی، قانون فوجداری اختیار کر لو ملحدین فرنگ کا، معاملات کرنے لگو دستور یہود کے مطابق شیطان
کے نقش قدم پر چلنا یہی ہے کہ اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش کی جانے لگے اور اسے کوئی اصلاحی یا تجدیدی کارنامہ سمجھا جانے لگے۔
اسلام کامل فرض ہو، اور اس کامل ہو جانے کے بعد جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے
اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے۔ اور بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کے اشد ہونے کے سبب یہ عذاب کا زیادہ
مظنہ ہے (تھانوی) ۷۶۲ وہ تو تمہیں طرح طرح کی آمیزشوں اور بدعتوں کا مشورہ دیتا ہی رہے گا، خوشنما سے خوشنما عنوانات
کے ساتھ آیت میں وعید و تنبیہ شدید ہے۔ ایک طرف جاہل و مبتدع اہل تصوف و طریقت کے لیے، اور دوسری طرف روشن خیال
اہل تجدد کے لیے ۷۶۳ (ہر سزا پر قادر) اور سزا کو وقت مناسب ہی پر دینے والا۔ البینات سے مراد اس سے کھلے ہوئے احکام بھی
ہو سکتے ہیں جن میں کسی قسم کا خفا یا ابہام نہیں، مثلاً عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، حکم نماز، حکم جہاد اور ہر وہ چیز بھی اس میں داخل
ہے جو دین اسلام کی حقانیت یا قانون اسلام کی صداقت پر روشن دلیل کا کام دے سکے۔ یہ بینات خواہ جس معنی میں بھی لے
جائیں، بہرحال ان نومسلم یہود کے پاس پہنچ چکے تھے، اور انہیں کوئی وجہ اب قدم پیچھے ہٹانے یا ڈگمگانے کی نہیں رہ گئی تھی۔ زللتم
زلت کے لفظی معنی پھسل جانے کے ہیں، جو بے اختیاری میں بھی ہوتا ہے۔ یہ لفظ لا کر ڈرا دیا ہے کہ قصداً و دانستہ مخالفت تو بہر
بڑی چیز ہے، غلطی یا بے خیالی سے بہک جانے میں بھی گرفت کا احتمال ہے۔ عزیز، سیاق آیت میں جو جو جب اور جو کچھ چاہے
سزا دے سکتا ہے۔ حکیم وہ ہے جو ہمیشہ وقت مناسب ہی پر سزا دیتا ہے ۷۶۴ (جن کا کام ہی تعمیل ارشاد کرنا ہوتا
ہے) اب پھر اشارہ انہی نومسلم یہود کی طرف ہے جن کا ذکر دو آیت قبل آچکا ہے۔ یہ اسلام میں ابھی داخل ہوئے ہیں لیکن
کفر و یہودیت سے پوری طرح نہیں نکل پائے ہیں۔ یاتیھم اللہ ...... والملئکۃ۔ عقائد کا یہ اصولی اور مسلم مسئلہ ہے کہ
ذات باری کے لیے نہ محل ہے نہ ظرف۔ اس لیے اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے "آنے" یا "جانے" کے کوئی معنی ہی
نہیں۔ امام رازی کہتے ہیں۔ اجمع المعتبرون من العقلاء علی انہ سبحانہ وتعالیٰ منزہ عن المجیء والذھاب (کبیر)
اور آگے اس پر متعدد دلائل قائم کرنے کے بعد پھر لکھتے ہیں۔ ثبت ان اللہ تعالیٰ لیس بجسم ولا متحیز وانہ لا یصح المجیء
والذھاب علیہ (کبیر) اس لیے اکثر مفسرین نے آیت کو متشابہات میں سے مانا ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ اس پر اجمالی ایمان
کافی ہے، تفصیل عقل بشری سے ماوراء ہے۔ چنانچہ مفسر تھانوی کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے آنا وغیرہ جہاں مذکور
ہے اس کی حقیقت کے درپے ہونا جائز نہیں۔ کیونکہ جس طرح اس کی ذات کی حقیقت کسی کو مدرک نہیں ہوئی ہے، اسی طرح
اس کی صفات افعال کی کنہ معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ وجود اور وقوع پر اجمالاً بلا تعیین کیفیت ایمان لے آنا چاہیے کہ اس سے
زیادہ فکر میں پڑنا مالا یطاق کا قصد کرنا ہے۔ اور صاحب روح المعانی نے یہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ یاتیھم اللہ بالمعنی اللائق بہ
جل شانہ منزھا عن مشابھۃ المحدثات والتقید بصفات الممکنات اور "مذھب السلف الصالح" یہ نقل ہوتا
چلا آیا ہے کہ فالاولی السکوت عن التاویل وتفویض معنی الآیۃ علی سبیل التفصیل الی اللہ تعالیٰ (کبیر) اور مفسر و محدث
بغوی کو یہ لکھنا پڑا۔ الاولی فی ھذہ الآیۃ وفی ما شاکلھا ان یؤمن الانسان بظاھرھا ویکل علمھا الی اللہ تعالیٰ ویعتقد
ان اللہ عز اسمہ منزہ عن سمات الحدث علی ذلک مضت ائمۃ السلف وعلماء السنۃ (معالم) اور بہتوں نے آیت میں یاتیھم اللہ کے درمیان کوئی اور لفظ مثلاً امر یا بأس یا آیات وغیرہ محذوف مان کر معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ کا حکم آپہنچے یا عذاب آجائے۔ ای
یاتیھم ثوابہ وحسابہ وعذابہ (ابن جریر) ای امرہ وبأسہ (مدارک) ای آیات اللہ (کبیر) ای امر اللہ (کبیر) یاتیھم اللہ بما وعدھم من الثواب والعقاب ذالہ الزجاج (بحر) یعنی بیاید عذاب او (شاہ ولی اللہ) اور ایک جماعت نے ملائکہ کی آمد اور قضی الامر کے پہلو کو
مد نظر رکھ کر ان دونوں کو روز قیامت سے متعلق کیا ہے کہ یہ منکرین و معاندین قبول حق کے لئے اب شاید آمد قیامت ہی کے منتظر ہیں۔ قولہ یاتیھم اللہ اخبار عن حال القیامۃ (کبیر) یہ سب مذہب اپنی اپنی جگہ صحیح اور حق ہیں۔ لیکن ان سب میں مانا مشترک ہے کہ آیت کا روئے سخن عام منکرین یا
منافقین و اہل کتاب کی جانب سمجھا گیا ہے۔ ای یکذبون بمحمد صلعم (ابن جریر) ارید بہ المنافقون او اھل الکتاب (رح) لیکن سیاق کلام پر نظر کر کے اگر روئے سخن صرف یہود تک محدود کر دیا جائے تو بات بالکل صاف ہوئی جاتی ہے اور بجائے ادبی تفسیر کے صرف استناد کا ہوگا۔
صحت اعتقاد یہود۔ اسلئے کہ یہود کا مذہب تشبیہ و تجسیم کا تھا۔ یہ لوگ خدا کی جسمانیت کے پوری طرح قائل تھے اور جلوۂ حق کو بادلوں کے خاص طور پر متعلق سمجھتے تھے۔ بلکہ بادلوں کو گویا حق تعالیٰ کی سواری سمجھے ہوئے تھے۔ ان کے مقدس صحیفوں اور نوشتوں میں اب تک اس قسم کی تعلیمات محفوظ چلی آتی ہیں
"خداوند ایک تند رو ابر پر سوار ہو کر مصر آئے گا۔ اور مصر کے بت اسکے
"وہ نور کو پوشاک کی مانند پہنتا ہے اور آسمانوں کو پردہ کے مانند پھیلاتا ہے۔ وہ اپنے بالاخانوں کو پانیوں میں بناتا ہے اور بدلیوں کو اپنی رتھ ٹھہراتا ہے اور ہوا کے بازوؤں پر وہ سیر کرتا ہے۔" (زبور ۱۰۴: ۲، ۳) غرض
حضور میں لرزاں ہوں گے۔" (یسعیاہ ۱۹: ۱) "کہ دبی گھر کی داہنی طرف کھڑے ہوئے اور اندر کے صحن بادل سے بھر گیا، تب خداوند کا جلال کروبیوں سے اٹھ گیا، اور گھر کے آستانہ پر آیا، اور گھر بادل سے بھر گیا، اور صحن خداوند کے جلال کی چمک سے معمور ہوا۔" (حزقی ایل ۱۰: ۳، ۴) اس میں معاذ اللہ حق
خدائے تعالیٰ کا بادلوں سے بطور مرکب یا سواری کے قریب ترین تعلق یہود کے تخیل میں رچ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے جدید ترین ایڈیشن (طبع چہاردہم) میں حق تعالیٰ کی جو تصویر قدیم یہودی قوم کے تخیل کے مطابق دی ہے (جلد ۱۳) اس میں ملائکہ کی
تعالیٰ کو صاف صاف بدلیوں پر سوار دکھایا ہے! تو قرآن مجید نے آیت میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے، بلکہ صرف یہود کے خیال کی ترجمانی، اس کی صحت و غلطی سے بحث کئے بغیر کر دی ہے کہ یہ بنی اسرائیل اسی خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ خدا مع فرشتوں کے بدلیوں پر سوار ہو کر ان کے سامنے
آجائے، اور پھر قطعی فیصلہ کر کے رکھ دے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے مرتبے کرے امام التفسیر امام رازی کے، ان کی نظر یہ نکتہ بھی نہ بچا۔ صاف اپنی تفسیر میں لکھ گئے ہیں اور صرف لکھ ہی نہیں گئے ہیں، اسی کو پہلے وجوہ تفسیر پر ترجیح بھی دی ہے۔ والوجہ الظاھر عندی
من کل ما سبق کو کر بہترین توجیہ بھی قرار دے گئے ہیں کہ یہود حق تعالیٰ کی تشبیہ و تجسیم کے قائل تھے اور قرآن نے یہاں بجنسہٖ ان کے اعتقاد کو اس پر تنقید کئے بغیر دہرا دیا ہے۔ اس لئے اس کے بعد مجاز وغیرہ کسی تاویل کی حاجت ہی نہیں رہتی ہے کہ کوئی اشکال ہی رہ جاتا ہے۔ اذا کان ھذا
حکایۃ عن حال الیھود لم یمتنع اجراء الآیۃ علی ظاھرھا وذلک لان الیھود کانوا علی مذھب التشبیہ وکانوا یجوزون علی اللہ المجیء والذھاب وعلی ھذا التقدیر یکون ھذا الکلام حکایۃ عن معتقد الیھود القائلین بالتشبیہ
فلا یحتاج حینئذ الی التاویل ولا الی حمل اللفظ علی المجاز ...... ولیس فی الآیۃ دلالۃ علی انھم محقون فی ذلک الانتظار او مبطلون وعلی ھذا التقدیر یسقط الاشکال (کبیر)

هَلْ ... اِلَّا۔ ھل یہاں استفہامیہ نہیں، بلکہ جب اِلَّا کے ساتھ آتا ہے تو نفی کے معنی دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے اس استعمال کی اور بھی مثالیں ہیں، مثلاً ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ کونھا بمعنی النفی ھوجاد بعدھا الا کثیر الاستعمال فی القرآن وفی کلام العرب (بحر) معناہ النفی ولھذا جاءَ بعدہ اِلَّا (عکبری) ۷۶۵ آخری فیصلہ اور تصفیہ کے لئے۔ کلام بطور تہدید کے ہے۔ ۷۶۶ (اور پھر وہ ہر آیت کا انکار و کفران بھی کس شد و مد سے کرتے رہے) اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ۔ یہ کھلی ہوئی نشانیاں کس چیز کی تھیں؟ خدائے تعالیٰ کے مخصوص فضل و کرم کی، اور بنی اسرائیل کی مخصوص سرفرازیوں کی، مثلاً کتاب توریت اور دوسرے آسمانی صحیفوں کا نزول یا اس نسل میں انبیائے کرام کا مسلسل ظہور، وقس علیٰ ہذا۔ سَلْ بلفظ سل سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں کہ اسرائیلی ان سے انکار کر ہی نہیں سکتے۔ ۷۶۷ (عام اس سے کہ اس سزا کا ظہور فوری اور اسی دنیا میں ہو، یا بہ تاخیر عالم آخرت میں) نِعْمَةَ اللّٰهِ۔ نعمت ادنیٰ بھی ہو، جب بھی نعمت ہی ہے۔ اور بہرصورت قابل قدر، چہ جائیکہ ایسی اعلیٰ نعمتیں جن سے بنی اسرائیل کی مدتوں سرفرازی رہی۔ یُبَدِّلْ۔ تبدیل کے معنی ہیں کسی شے کی اصل حقیقت کو کچھ کا کچھ کر دینا، اس شے کے اندر تحریف کر دینا، اسے مسخ کر دینا، اور اللہ کی نعمتوں کے اندر تبدیل ایک تو یہ ہوئی کہ جو چیزیں ہدایت و استفادہ کے لئے تھیں، الٹا انہی کو فسق و کفر کے کاروبار میں لگا دیا جائے، اور یا پھر یہ کہ جو کلام باعث ہدایت ہوتا تھا، اسی میں تصحیف و تحریف کا عمل شروع کر دیا جائے۔ اہل تفسیر نے دونوں شقیں اختیار کی ہیں
وتبدیلھم ایّاھا ان اللّٰہ اظھرھا لتکون اسباب ھداھم فجعلوھا اسباب ضلالتھم او حرّفوا اٰیات الکتاب الدالّة علیٰ دین محمد صلعم (کشاف۔ مدارک) بجعلھا اسباب الضلالة وازدیاد الرجس او بالتحریف والتاویل الزائغ (بیضاوی)

الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
ہے ۷۶۸۔ خوشنما کر دی گئی ہے دنیوی زندگی اُن لوگوں کی نظر میں جو کافر ہیں ۷۶۹
وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ
اور وہ اُن لوگوں سے تمسخر کرتے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں، درآنحالیکہ جو لوگ ڈرتے رہتے ہیں
يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾
وہ اُن سے کہیں بالاتر ہوں گے قیامت کے دن ۷۷۰، اور اللہ جسے چاہتا ہے بےشمار رزق دیتا رہتا ہے ۷۷۱
كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ
لوگ ایک ہی اُمت تھے، ۷۷۲ پھر اللہ نے انبیاء بھیجے، خوشخبری
مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ
دینے والے، اور ڈرانے والے ۷۷۳ اور اُن کے ساتھ کتاب حق نازل
بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ
کیں، ۷۷۴ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے ۷۷۵
وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا
اور کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی نے جنہیں وہ ملی تھی انہی کی ضد کے باعث
جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللَّهُ
بعد اس کے کہ انہیں کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی تھیں ۷۷۶ پھر اللہ نے اپنے فضل سے انہیں
الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ
جو ایمان والے تھے، وہ امر حق بتا دیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے تھے

منزل ۱

شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ نِعْمَةَ اللّٰهِ کی وسعت اطلاق دینی و دنیوی ہر قسم کی نعمتوں کو شامل ہے اور یہاں ہر نعمت کے مسخ کر ڈالنے پر عذاب شدید کی وعید ہے۔ اب نعمت اگر دینی ہے، مثلاً کتاب الٰہی یا خود انبیاء تو اس میں تحریف یا انکار پر عذاب اُخروی کا وقوع ظاہر ہی ہے، لیکن نعمت اگر محض دنیوی ہے، مثلاً دولت، صحت، سلطنت، تو اس کے سوء استعمال کا خمیازہ بیماری، ناکامی، افلاس، ذلت وغیرہ کی شکل میں اٹھانا بھی مشاہدہ کی چیزیں ہیں۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ کا فقرہ زور دینے اور تاکید کے لئے ہے یعنی بعد اس کے کہ اس نعمت کا پوری طرح تحقق ہو سکے۔ اس کے پوری طرح فہم و معرفت میں آ جانے کے بعد پھر جو کوئی اس کے ساتھ کفران کرے۔ آیت آج اُمت کے کس قدر حسب حال اور کس درجہ قابل غور ہے۔ اللہ کی عطا کی ہوئی ہر دینی و دنیوی نعمت کے ساتھ آج ہمارا کیا معاملہ ہے؟ کس نعمت کا حق ہم ادا کر رہے ہیں؟ کونسی نعمت ایسی ہے جس کی صورت ہم نے نہیں بدل ڈالی؟ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری ساری عبادتیں مغز و روح سے خالی ان عبادتوں کے خالی ڈھانچے رہ گئے ہیں۔ اخلاق و اتحاد کی دولت ہم نے الگ برباد کر ڈالی۔ نتیجہ جو نکلا سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہاں ایک بات اور مسیحیوں کے ہاں ایک عربی داں انگریز پادری ڈاکٹر وہیری Wherry ابھی حال میں گزرے ہیں، مسلمانوں سے مناظرہ کیا کرتے تھے، انگریزی میں مختصر سی تفسیر بھی لکھی تو اس آیت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:۔ "مسلمانوں نے متن قرآن کی جو اتنی سخت حفاظت رکھی ہے، اس کا ایک سبب اسی قسم کی تہدیدی آیتیں ہیں"۔ خیر اس سے کم از کم محفوظیت قرآن پر شہادت تو ایک دشمن اسلام کی زبان سے ادا ہو گئی۔
۷۶۸ (اور اس کا ساز و سامان، جاہ و حشم، باغ و مکان، موٹر اور ریڈیو، کوٹھی اور فرنیچر، سب باوجود فانی و بےحقیقت ہونے کے انہیں نہایت اہم و قابل وقعت نظر آتا ہے، اور اُن کے دلوں کے لئے خاص کشش رکھتا ہے) جو کافر ہے وہ اسی دنیوی زندگی کی مادی لذت و دولت، عیش و عشرت پر نثار رہتا ہے۔ اسی کو مستم بالشان سمجھے ہوئے، اسی پیمانہ سے سب کو ناپتا رہتا ہے۔ وہ بیچارہ تنگ نظر ہوتا ہے، وہ اس بے نام عیش پر بیش بہا سرمدی و عشرت اور زوال کو قربان کئے رہتا ہے۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کافر اس باب میں معذور ہے۔ حب دنیا طبعاً اس پر اتنی غالب کر دی گئی ہے کہ وہ اس کے ترک ہی پر قادر نہیں ۔۔۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں۔ کافر تو کہتے ہی اس کو ہیں، جو بلا کسی معذوری کے، اپنے قصد و اختیار سے حق کے بجائے باطل کی راہ اختیار کرے اور دنیا کی خوشنمائی کا آنکھوں میں بس جانا یہ تو کفر کا نتیجہ اور معلول ہے، نہ کہ اس کا باعث و سبب۔ اپنے ارادہ کا سوء استعمال تو وہ پہلے ہی کر چکا، محض نتیجہ کے طور پر مشیت تکوینی نے اس کی کوشش کو کامیاب کر دیا۔ ۷۶۹ (اور سامان دنیوی سے محروم ہیں) کافر اسی غلط معیار کی بنا پر انہی کج نگاہی سے کام لیکر اپنے کو بڑا سمجھتا، اور ایمان و طاعت کی بے وقعتی و تحقیر کرتا رہتا ہے: نگاہ کی یہ کجی، یہ غلط بینی ہی دنیا کا شدید ترین ابتلا ہے۔ حدیث نبوی کی یہ دعا اسی فتنہ سے بچنے کیلئے ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا۔ اور عارف رومی کی یہ مناجات بھی اسی موقع کیلئے ہے ؎

انچه در کون ست اشیا بر چه ہست ۔۔۔ وا نما جاں را بہر صورت کہ ہست
آب خوش را صورت آتش مدہ ۔۔۔ اندر آتش صورت آبے منہ

۷۷۰ (کہ وہ دن ہوگا کشف حقائق کا) اَلَّذِيْنَ اتَّقَوْا۔ یعنی اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ یا کفر و شرک سے بچتے رہتے ہیں۔ فَوْقَهُمْ۔ یعنی درجہ و مرتبہ میں ان سے ہزار چند بڑھے ہوئے ہونگے۔ لانھم فی علیین وھم فی اسفل السافلین (بیضاوی)
۷۷۱ مطلب یہ ہوا کہ دنیوی مال و دولت کا تعلق مصالح تکوینی سے ہے، سو مال و دولت کی افراط، یہ روپیہ کی ریل پیل، یہ بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں اور بڑے بڑے ساہوکارے، ہرگز کوئی معیار مقبولیت یا حق و صداقت کا نہیں۔ چاہے وہ جاہ و تمول ذاتی و شخصی ہو یا قومی و اجتماعی۔ کوئی اس پر بھول نہ پڑے۔ اور قومی اقبال مندی پر نہ مغرور ہو، نہ اُس سے مرعوب ہو۔ ۷۷۲ (آغاز فطرت میں) آیت نے ایک بڑی گرہ کھول دی۔ فرنگی محققین حسب معمول مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے، اور ان میں سے اکثر یہی کہے گئے، کہ انسان کا ابتدائی مذہب شرک یا تعدد آلہہ تھا، شروع شروع وہ ایک ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا، اور عقیدۂ توحید تک تو نسل انسانی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد، اور عقلی و دماغی ارتقاء کے بڑے طویل سفر کے بعد پہنچی ہے۔ قرآن مجید نے اس خرافی نظریہ کو ٹھکرا کر صاف اعلان کر دیا کہ نسل انسانی آغاز فطرت میں دینی حیثیت سے ایک، اور واحد تھی۔ اس میں "مذہب" و "ادیان" کے یہ تفرقے کچھ بھی نہ تھے۔ اُمَّةً وَّاحِدَةً میں جس وحدت کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ اس سے دینی و اعتقادی ہی وحدت مراد ہے۔ کانوا علیٰ شریعة من الحق (ابن جریر عن ابن عباسؓ) کانوا علی الھدیٰ جمیعًا (ابن جریر عن قتادہ) انھم کانوا علیٰ دین واحد وھو الایمان والحق ھٰذا قول اکثر المحققین (کبیر) صدیوں کی الٹ پھیر تبدیل و تحال کے بعد اب آخری فیصلہ بڑے بڑے ماہرین اثریات، انسانیات و اجتماعیات کا سرچارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن، پروفیسر شمٹ کا یہی ہے کہ انسان کا دین اولین، دین توحید تھا ۷۷۳ (بھٹکے ہوؤں کو راہ حق پر واپس لانے اور جمع کرنے کی خاطر) فبعث میں ف سے مراد ہے کہ ایک مدت کے بعد جب کہ اہل باطل اپنے اختراعی عقائد و اعمال سے بہتیرے فرقے اور مذاہب پیدا کر چکے تھے۔ مُبَشِّرِيْنَ۔ یعنی خوشخبری سنانے والے اہل ایمان کو، اُن لوگوں کو جو خدائی دستوریات کو قبول اختیار کریں۔ مُنْذِرِيْنَ۔ یعنی ڈرانے والے اہل کفر کو، ان لوگوں کو جو خدائی دستوریات کے مقابلہ میں انکار و طغیان کو قائم کریں۔ ۷۷۴ الْكِتٰبَ سے کوئی مخصوص و متعین کتاب الٰہی مراد نہیں، بلکہ ال جنس کا ہے کہ کتاب سے مراد وہ تمام کتابیں ہیں جو مختلف پیغمبروں پر مختلف زمانوں میں اترتی رہیں۔ گویا لفظ کتاب صورۃً واحد ہے، اور معنیً جمع۔ یرید بہ الجنس (بیضاوی) بِالْحَقِّ۔ حق کو لئے کر یا اظہار حق کے لئے۔ ترکیب میں بالحق حال واقع ہوا ہے کتاب کا۔ بتبیان الحق (مدارک) حال من الکتٰب ای ملتبسًا بالحق شاھدًا بہ (بیضاوی) ۷۷۵ یعنی عقائد و اعمال کے باب میں۔ لِيَحْكُمَ۔ تاکہ وہ فیصلہ کرے، یعنی انبیاء یا کتاب کے واسطہ سے فیصلہ کون کرے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہی اصلی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس لئے یحکم کی ضمیر غائب کا مرجع اللہ ہے، لیکن بعض نے نبی اور بعض نے کتاب بھی مراد لی ہے۔ اور یہ دونوں بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔ ای لیحکم اللّٰہ او النبی المنزل علیہ او الکتٰب (کبیر) والضمیر عائد علی اللّٰہ ھذا ھو

الظاھرة قیل علیٰ علی الکتاب (بحر) ۷۷۶ تصدیق حق کی۔ اور اصولِ دین کے باب میں کسی قسم کا التباس اور خفا باقی نہیں رہا۔ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ۔ یہاں یہ صاف کردیا کہ اختلاف اور نزاع کا باعث آپس کی ضد اور نفسانیت ہوئی، نہ یہ امر کہ اصل احکام الٰہی یا پیامِ حق میں کسی طرح کا ایچ پیچ تھا، اور نہ یہ کہ مسائلِ اجتہادی میں کوئی رائے یا اجتہاد کا اختلاف ہوا۔ اَلَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ یعنی وہی لوگ جنہیں کتاب بواسطۂ انبیاء ملی تھی، مراد ہیں علماء و مشائخ و پیشوایانِ قوم۔ گمرہی اور کجروی کی طرح یہی لوگ ڈالتے ہیں، عوام محض ان کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ ۷۷۷ چنانچہ اہلِ حق کو نزاع و اختلاف کبھی مضر نہیں پڑا۔ لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ میں ذکر اہلِ حق کے اختلاف کا ہے اہلِ باطل سے۔ بِاِذْنِهٖ میں اذن کے معنی فضل، توفیق و لطف کے ہیں۔ الاذن التوفیق (تاج) بارادته ولطفه (بیضاوی) بتوفیقه وتیسیره (روح) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا پر سوال ہوا ہے کہ جو اس کے مصداق ہو چکے تھے وہ تو خود ہی ہدایت یافتہ تھے، پھر اب انہیں ہدایت کیسی؟ جواب یہ ہے کہ ایمان سے یہاں مراد قصدِ ایمان و صلاحیتِ ایمان ہے یعنی جو ایمان کے طالب تھے، انہیں ہدایت حاصل ہوگئی۔ ۷۷۸ اور اس کی مشیت ہدایت ہمیشہ اُن لوگوں سے متعلق ہو جاتی ہے جو اس کی طرف بڑھنا چاہتے، اور ضد و تعصب کو چھوڑ کر طلبِ حق اختیار کرتے ہیں۔ اس میں مومنین کی تشفی و تسلی کا پہلو بھی نکل رہا ہے کہ مخالفین و معاندین کی سرگرم کوششوں اور زبردست پروپیگنڈے سے خوف و ہراس نہ کریں۔ اپنی طلب اگر صادق ہے تو کوئی مکر و تدبیر، کوئی قوت یا شوکت ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ ۷۷۹ ربط مشقت اور بغیر امتحان، اے گروہِ مومنین!) خطاب براہِ راست عہدِ رسالت کے مومنین سے ہے۔ ایھا المؤمنون باللّٰہ ورسلہ (ابن جریر) ۷۸۰ یعنی اُن مومنینِ سابقین، اُن انبیاءِ قدیم کی اُمتوں کی سی آزمائش اور مصیبتیں۔ مَثَل کے معنی غیر معمولی حالات و تجربات کے ہوتے ہیں۔ المثل الشبه الا انه مستعار لحال غریبة او قصیة عجیبة لهاشان (بحر) یہاں مراد اُن پچھلی امتوں کے تحمّلِ شدائد سے ہے۔ ما ینال من اذی الکفار والفقر والمجاهدة فی

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست بتا دیتا ہے ۷۷۸

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ

کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے ۷۷۹ درآنحالیکہ ابھی تم پر

مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ

اُن لوگوں کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں ۷۸۰ انہیں تنگی اور سختی پیش آئی

وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ

اور انہیں ہلا ڈالا گیا ۷۸۱ یہاں تک کہ پیمبر اور جو لوگ اُن کے ہمراہ ایمان

اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ

لائے تھے بول اُٹھے ۷۸۲ کہ اللہ کی امداد آخر کب آئے گی ۷۸۳ سن رکھو اللہ کی امداد یقیناً قریب

قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْــَٔـلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلْ مَآ

ہی ہے ۷۸۴ آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں ۷۸۵ آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ بھی

اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

مال سے خرچ کرنا ہے ۷۸۶ سو وہ حق ہے والدین کا اور عزیزوں کا اور

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا

یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا، ۷۸۷ اور جو بھی

تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

نیکی کرو گے، اللہ کو اس کا پورا علم رہتا ہے ۷۸۸

منزل ۱

سبیل اللّٰہ (بحر) احوالھم التی ھی مثل فی الشدة (کشاف) آیت سے یہ مراد نہیں کہ کوئی مومن محض ایمان کی برکت اور فضلِ خدا سے جنت میں داخل ہی نہ ہو سکے گا جب تک کہ مجاہداتِ شدیدہ کی منزل سے نہ گزر لے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ مقاماتِ جن درجاتِ عالیہ کے طالب تھے اور بقول مرشد تھانویؒ ہر مومن کو طلب ایسی ہی رکھنی چاہئے۔ اُن درجاتِ عالیہ تک پہنچنے کے لئے عام شرط ان منزلوں سے گزرنے کی ہے۔ باقی نفسِ مجاہدہ تو ہر مومن کو اپنے درجہ و بساط کے لحاظ سے کرنا ہی ہوتا ہے۔ ۷۸۱ (شدتِ تکلیف سے) ای ازعجوا بانواع البلایا و الرزایا (کبیر) اَلْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ۔ یعنی مخالفین کے ہاتھوں انہیں جو مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ دونوں لفظ قریب المعنی ہیں۔ فرق یہ کیا گیا ہے کہ باسآء میں راحت و آسائش کے فقدان کا پہلو نمایاں ہے اور ضرّآء میں واقعی درد و اذیت کا۔ الباسآء عبارة عن تضییق جهات الخیر والضرآء عبارة عن انفتاح جهات الشر (کبیر) ان آزمائشوں کے تذکرے قدیم صحیفوں میں بھی بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً ”صادق پر بہت سی مصیبتیں ہوتی ہیں“ (زبور۔ ۳۴: ۱۹) ”چاندی کے لئے کٹھالی ہے اور سونے کے لئے بھٹی پر خداوند دلوں کو تپاتا ہے“ (امثال ۱۷: ۳) ”ضرور ہے کہ ہم بہت سی مصیبتیں سہہ کر خدا کی بادشاہت میں داخل ہوں“ (اعمال ۱۴: ۲۲) ۷۸۲ (شدتِ غم و حزن سے بیقرار ہو کر) الرسول سے مراد اس زمانہ کے پیمبر۔ المراد من الرسول الجنس لا واحد بعینه (روح) الرسول هنا اسم جنس (بحر) ۷۸۳ نصر اللّٰہ۔ یعنی نصرتِ موعود۔ انبیاء و مومنین کا یہ قول حالتِ اضطرار میں دعا و مناجات کے طور پر تھا، نہ بطور اعتراض و شکوہ۔ وعدہ نصرتِ الٰہی کا تھا، مگر تعیین تو نہ تھا کہ کس وقت ہوگی۔ جب ہجوم شدائد ہوتا، تو نصرتِ غیبی کی ضرورت محسوس کرتے، اور اپنے اجتہاد سے بالحاح و زاری پکارتے کہ حضرت، یہی تو وقت دستگیری و نصرتِ غیبی کے نزول کا ہے۔ (تھانوی) آیت میں اشارہ ہے کہ اُمتِ محمدی کو بھی ہر قسم کی بلائیں پیش آئیں گی جیسی کہ اگلی اُمتوں کو پیش آچکی ہیں۔ ۷۸۴ یہ جواب ان اُمتوں کو ان کی درخواست کا ملا کرتا۔ اس میں مومنین کو ہمیشہ کے لئے بشارت اور تسلی مل گئی۔ اور اس حقیقت کا بیان آ گیا کہ نصرتِ الٰہی اپنے وقت پر ضرور آ کر رہے گی۔ مجاہدات سے گھبرانا اور بددل نہ ہونا چاہئے۔ صوفیہ نے آیت سے یہ تعلیم بھی اخذ کی ہے کہ حالات مخالف کے ہجوم سے بتقاضائے بشریت اضطراب تو کاملین تک کو ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ثابت قدمی اور اتباعِ احکام کی برکت سے نصرتِ الٰہی حاصل ہو کر رہتی ہے۔ ۷۸۵ (اور کن موقعوں پر) سال المؤمنون رسول اللّٰہ صلعم این یضعون اموالهم (روح۔ عن ابن جریج) المطلوب بالسوال ان مصرفه ای شیء هو (کبیر۔ عن القفال) مرادهم من قولهم لیس هو طلب الماهیة بل طلب المصرف (کبیر) سوال مسلمانوں کی طرف سے تھا، اور اس باب میں تھا کہ اپنی حسبِ ہمت و حیثیت اور خوشدلی سے کب خرچ کریں۔ باقی جو خرچ کہ فرض ہو چکا تھا یعنی زکوٰۃ، اس کا حساب کھلا ہوا تھا۔ سوال اس کی بابت نہ تھا۔ الاکثرون علی ان الاٰیة فی التطوع (روح) عن الحسن ھی فی التطوع (مدارک) قرآن جو مکمل دستورِ حیات ہے، اس میں معاشیات کے مسائل کو نظرانداز نہیں کیا گیا ہے، اپنی جگہ پر وہ پوری اہمیت اس کے اندر رکھتے ہیں۔

۷۸۶ خیر کا مفہوم علاوہ نیکی اور بھلائی کے معروف و متعارف معنی کے عمدہ اور نیک کمائی والے مال کے بھی ہیں۔ لِلمال ھی دجه محمود (راغب) اور یہاں یہی مراد ہے ۷۸۷ مصارفِ خیر کی یہ فہرست کیسی جامع اور اس کی ترتیب کس قدر حکیمانہ ہے۔ سب سے بڑھا ہوا اور اہم ترین حق انسان کے ماں باپ کا ہے۔ جتنی بھی مالی خدمت ہو سکے، اُن کی کی جائے۔ پھر دوسرے عزیزوں کا نمبر ہے، اور اس میں بھائی بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ سب آ گئے ——— شریعت نے اپنے نظام میں خاندان کو جو مرکزی اہمیت دی ہے، اس پر یہ ایک اور دلیل ہے ——— پھر اُمت کے وہ فرزند ہیں، جو معاش کے سب سے بڑے ظاہری سہارے یعنی شفیق باپ کے سایہ سے محروم ہو چکے ہیں۔ پھر وہ اللہ کے بندے ہیں، جن پر کسی طبعی معذوری کی وجہ سے یا اور کسی خارجی سبب سے معاش کے عام ذریعے بند یا قریباً بند ہو چکے ہیں۔ اور اپنی ضرورتوں کے پورے ہونے کے لئے بیرونی امداد کے محتاج ہیں۔ اور آخر میں وہ عام انسان آتے ہیں، جو اپنے وطن سے علیحدہ ہونے کے باعث عارضی طور پر احتیاج یا تنگدستی میں مبتلا ہیں۔ قریب اور دور کے حقدار اور بے رشتہ رکھنے والے سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر کس خوب صورتی سے ایک نظم کے اندر آ گئے ہو گئے۔ مقصودِ شریعت یہ ہرگز نہیں کہ پڑوس میں ہمارا بھائی بھوک سے تڑپ رہا ہو اور ہم اس سے بے خبر چندہ لکھوا رہے ہوں چینی ریلیف فنڈ میں! ۷۸۸ اور اس لئے اس کا اجر بھی پورا مل کر رہے گا۔ خیر۔ عام ہے۔ بدنی، مالی، بڑی، چھوٹی ہر قسم اور درجہ کی نیکی کو شامل ہے۔ آیت میں تنبیہ ہے کہ گمراہ قوموں نے اپنے دیوں، دیوتاؤں سے متعلق جو عقیدے گڑھ لئے ہیں اُن پر قیاس کر کے یہ نہ سمجھ لینا کہ اسلام کے خدا کا بھی علم ناقص یا محدود ہے یا جزئیات یا مخفیات پر محیط نہیں۔

۷۸۹ رجب اس کے شرائط کا تحقق ہو جائے۔ اے مسلمانو! قتال کے آداب، شرائط و قواعد میں سے کچھ پہلے اسی پارہ میں بیان ہو چکے ہیں، کچھ آئندہ حسب موقع بیان ہوتے رہیں گے۔ غیر مصافی کو قتل نہ کرنے پر اسلام نے جو زور دیا ہے، اس کو یاد رکھ کے ذرا ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو، ایسی کتاب سے جو یہود و نصاریٰ دونوں کے نزدیک مقدس ہے۔ " سو اب تو جا، اور عمالیق کو مار، اور جو کچھ اس کا ہے بالکل ختم کر، اور ان پر رحم مت کر، بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچے، شیر خوار اور بیل بھیڑ، اور اونٹ اور گدھے تک کو سب کو قتل کر" (۱۔سموئیل۔۱۵: ۳) ۷۹۰ جیسا کہ بالکل قدرتی اور طبعی ہے۔ اپنی جان کس کو عزیز نہیں ہوتی، اور اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہوئے ہر جاندار قدرۃً ہچکچاتا ہے۔ پھر مکہ کے غریب مہاجرین جو ابھی ترک وطن کر کے مدینہ میں آ کر پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے، دونوں رو پیہ پیسہ، ساز و سامان میں، تعداد میں، غرض مادی اعتبار سے کسی معنی میں بھی اپنے حریفوں کے مدمقابل نہ تھے۔ ان شکستہ دلوں، شکستہ بازوؤں کو حکم جنگ و قتال پا کر اگر طبعی گرانی محسوس ہوئی ہو تو یہ ان کے مرتبۂ اخلاص اور قوت ایمانی کے ذرا بھی منافی نہیں۔ شاق علیکم مکروہ طبعاً (بیضاوی) مکروہ بالطبیعة (بحر) هذه الكره من حيث نفور الطبع عنه لما فيه من مؤنة المال ومشقة النفس وخطر الروح لا انهم كرهوا امر الله تعالى (معالم) ھُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ آیت پوری تردید کر رہی ہے ان بے غیرت "مستشرقین" کی جنہوں نے یہ لکھ ڈالا کہ مسلمان مال غنیمت کی حرص میں خود ہی مشاق جنگ وقت کے تھے! كُرْهٌ لفظاً مصدر ہے، معنی مفعول کے دے رہا ہے۔ جیسے خبز سے مخبوز مراد ہو جاتی ہے، اور نقض سے مراد منقوض۔ ۷۹۱ تعداد میں قلیل اور قوت و شوکت میں ضعیف و مضمحل جن مسلمانوں کو جہاد و قتال پر آمادہ کرنے کیلئے قرآن مجید کو اس تفصیل و اہتمام سے کام لینے کی ضرورت پیش آ رہی ہے ان کی بابت اسلام کے مشہور و معروف "کرمفرما" اور مسیحی دنیا کے نامور مؤرخ و سیرت نویس، پروفیسر مارگولیس کا یہ قول کس قدر "سچائی" اور "دیانت" سے لبریز ہے (نعوذ باللہ) "محمدؐ نے اپنے شورش پسند پیروؤں کو مشغول کار رکھنے کے لئے انہیں جہاد میں لگا دیا!" گویا کمزوروں کا زور آوروں کے سامنے اپنی جانیں دینے کے لئے آنا، شکار کی قسم کا کوئی شغل سیر و تفریح تھا! ——— دین کے دشمنوں پر یہ بھی الٰہی کیسی پھٹکار ہے، کہ عقلیں بھی مسخ ہو جاتی ہیں!

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن

تمہارے اوپر قتال فرض کر دیا گیا ہے ۷۸۹ درآنحالیکہ وہ تم پر گراں ہے ۷۹۰ لیکن کیا عجب کہ تم

تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا

کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور کیا عجب کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے

وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

ع ۲۶ ۱۰

ہو اور وہ تمہارے حق میں باعث خرابی ہو ۷۹۱ اور علم تو اللہ ہی رکھتا ہے، اور تم علم نہیں رکھتے ۷۹۲

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ

اور آپ سے حرمت والے مہینے کی بابت (یعنی) اس میں قتال کی بابت دریافت کرتے ہیں ۷۹۳ آپ کہہ دیجئے

فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ

کہ اس میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے ۷۹۴ اور اس سے کہیں بڑھ کر جرم اللہ کے نزدیک اللہ کی راہ سے روکنا

الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ

اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روک دینا اور اس سے اسکے رہنے والوں کو نکال دینا ہیں ۷۹۵ اور

أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ

فتنہ قتل سے کہیں بڑھ کر ہے ۷۹۶ اور یہ لوگ تو تم سے جنگ جاری ہی رکھیں گے تاآنکہ اگر ان کا

يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَن يَرْتَدِدْ

بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر ہی کر رہیں ۷۹۷ اور جو کوئی بھی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے

مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ

اور اسی حال میں کہ وہ کافر ہے مر جائے تو یہی وہ لوگ ہیں

منزل ۱

شَيْئًا صیغۂ نکرہ ہے، اور اس سے یہ اشارہ نکل آیا کہ یہاں کوئی کلی قاعدہ نہیں بیان ہو رہا ہے یعنی ہر طبعی و مرغوب و محبوب کا شر ہونا اور ہر طبعی مکروہ و مبغوض کا خیر ہونا لازمی نہیں۔ ۷۹۲ یعنی اللہ ہی کا علم کامل اور ظاہر و باطن ہر پہلو کو محیط ہے۔ اس لئے اس کے احکام ہمیشہ بیشمار حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ انسانی علم اس کے برخلاف کسی چیز کا بھی کامل و جامع نہیں ہوتا۔ اسلئے خود انسان کی واقفیت و مصلحت اسی میں ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل بے چون و چرا کیا کرے۔ ۷۹۳ الشهر الحرام بالشهر الحرام کی ذیل میں اوپر گزر چکا ہے کہ قمری سال کے چار مہینے، محرم، رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، عرب جاہلیت میں بھی محترم تھے۔ قتل و غارت تو ان لوگوں کا پیشہ تھا، لیکن اس زمانہ میں ہر قسم کی جنگ بند رہتی تھی۔ الشَّهْرِ الْحَرَامِ سے یہاں مراد ماہ رجب ہے۔ ہوا یہ کہ ۲ ہجری میں یعنی ہجرت مدینہ سے کوئی ۱۷ مہینے بعد ایک بار غزوہ بعض صحابیوں کا مقابلہ مشرکین سے ہو گیا، اور ایک مشرک مقابلہ میں جان سے مارا گیا۔ واقعہ کی تاریخ صحابیوں کے خیال میں ۳۰ جمادی الثانی کی تھی۔ بعد کو علم ہوا (جیسا کہ آج بھی قمری مہینوں میں بارہا ہوتا رہتا ہے) کہ چاند ۲۹ کا ہو گیا تھا، اور وہ تاریخ یکم رجب کی تھی۔ مشرکین نے سہو و غلطی کی اس رائی کو لے کر پہاڑ بنا دیا، اور طعن و اعتراض شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو اب محرم مہینوں کی حرمت کا بھی لحاظ نہیں۔ ان محمدؐ ابعث سرية فلقوا عمرو بن الحضرمي آخر ليلة من جمادي الاولى ليلة من رجب وان اصحاب محمد صلعم كانوا يظنون تلك الليلة من جمادي وكانت اول رجب ولم يشعروا فقتله رجل منهم واحد (ابن جرير عن ابن عباس) لقي واقد بن عبد الله عمرو ابن الحضرمي اول ليلة من رجب وهو يرى انه من جمادى فقتله (ابن جرير عن مقسم) قِتَالٍ فِيهِ ترکیب میں بدل ہے الشهر الحرام سے۔ بدل اشتمال من الشهر الحرام (بیضاوی) وهذا يسمى بدل الاشتمال كقولك اعجبني زيد علمه ونفعني زيد كلامه (کبیر) ۷۹۴ رجب کو دانستہ یعنی ماہ حرام کا علم رکھنے کے باوجود ہو۔ اور یہ جرم مسلمانوں سے سرے سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ وما وقع من اصحابه عليه السلام كان من باب الخطاء في الاجتهاد وهو معفو عنه (روح) فقہاء مفسرین میں ایک بڑی بحث اس کی ہوئی ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتال اب بھی جائز ہے یا نہیں۔ محققین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جب کافر اس زمانہ میں قتال شروع کر دیں، تو مسلمان کی حیات کی حفاظت کے لئے دفاعی و جوابی قتال تو بہر حال جائز ہے لا خلاف في جواز القتال في الشهر الحرام اذا بدءوا (زاد المعاد فصل احکام غزوہ خیبر) گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے بھی اس میں ابتدا جائز ہے؟ انما الخلاف ان يقاتل فيه ابتداء (زاد المعاد) سو امام ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ و امام شافعیؒ امام احمدؒ اور جمہور فقہاء اس کے قائل ہیں کہ قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے یہ حکم حرمت کالعدم ہو گیا ہے، اور اب جہاد ان مہینوں میں بھی شروع ہو سکتا ہے۔ فالجمهور جوزوه وقالوا تحريم القتال فيه منسوخ وهو مذهب الائمة الاربعة (زاد المعاد) قال سائر العلماء هي منسوخة (ابن العربی) روي سليمان بن يسار وسعيد بن المسيب ان القتال جائز في الشهر الحرام وهو قول فقهاء الامصار (جصاص) لیکن عطاؒ تابعی اور بعض اور اکابر اس کے قائل ہیں کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت کا حکم دائمی و قطعی ہے، بلکہ عطاؒ تو اپنے فتوے کی صحت پر حلف اٹھا لینے کو تیار تھے۔ مذهب عطاء وغيره الى انه ثابت غير منسوخ وكان عطاء يحلف بالله ما يحل القتال في الشهر الحرام (زاد المعاد) كان عطاء يحلف انها ثابتة لان الآيات التي بعدها عامة في الازمنة وهذا خاص والعام لا ينسخ الخاص باتفاق (ابن العربی) قالت طائفة حكمه باق لم ينسخ وفيهم قال ذلك عطاء بن ابي رباح (جصاص) ۷۹۵ سو بالفرض وہ جرم مسلمانوں سے سرزد ہوا بھی ہوتا، جب بھی ایسے شدید بلکہ اشد جرائم کے مجرموں کو کیا حق ہے ایک اتفاقی واقعہ قتل پر اعتراض و احتجاج کا؟ صَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ۔ اللہ کی راہ سے مراد اسلام ہے، اس سے روکنا یعنی اسلام قبول کرنے والوں کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالنا، ان پر ظلم و ستم توڑنا۔ سبيل الله اي الاسلام او ما يوصل العبد الى الله (بیضاوی) كُفْرٌ بِهِ یعنی اللہ سے کفر اختیار کرنا۔ اللہ کے دین و شریعت کو نہ قبول کرنے، اور اللہ کا شریک دوسروں کو ٹھہرانے کا عین کفر ہونا ظاہر ہے۔ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مسجد کعبہ خاص اہل توحید ہی کا معبد و مرکز ہے۔ اس کا ہر وقت اللہ کے پرستاروں کے لئے کھلا رہنا اسلامی حکومت کے فرائض اولین میں سے ہے۔ المسجد الحرام کا عطف ترکیب میں سبیل اللہ پر نہیں، بلکہ تقدیر کلام یوں ہے ويصدون عن المسجد الحرام ولا يحسن عطفه على سبيل الله (بیضاوی) تقديره ويصدون عن المسجد (عکبری) واختار ابو البقاء كونه متعلقا بفعل محذوف اي عليه الصلوٰة ويصدون عن المسجد الحرام (روح) إِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ۔ دونوں ضمیریں المسجد الحرام کی طرف ہیں یعنی رسولؐ اور مومنین کو ہر طرح تنگ و پریشان کر کے مسجد الحرام سے نکال دینا، وہاں ان کا داخلہ بند کر دینا۔ انہیں اهل اسلئے کہا گیا کہ یہی لوگ تو اس حرمت والی مسجد کے حقوق ادا کرنے والے تھے۔ انما كانوا اهله لانهم القائمون بحقوقه (روح) گویا کافروں کے اعتراض کے جواب میں دو باتیں ارشاد ہوئیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں سے وہ گناہ عمداً زمانۂ حرمت میں قتل کرنے کا عمل صادر ہی نہیں ہوا۔ دوسری بات یہ کہ بالفرض صادر ہوتا بھی تو تمہارے ایسے سنگین و شدید جرائم سے اس کا کیا مقابلہ؟ ۷۹۶ (اپنے مفاسد اور اپنی مضرتوں کے لحاظ سے) الْفِتْنَةُ سے مراد وہ شدید مزاحمتیں اور رکاوٹیں ہیں جو معاندین نے دین حق کی راہ میں پیدا کر رکھی تھیں ——— اس دین کی راہ میں جس کا مقصد ہی دنیا کو راہ امن دکھانا اور تمام زحمتوں اور کلفتوں سے نجات دلانا ہے۔ اي ما يفتن به المسلمون ويعذبون به ليكفروا (روح) والمعنى عند جمهور المفسرين الفتنة التي كانت تفتن المسلمين عن دينهم حتى يهلكوا (بحر) الفتنة هي ما كانوا يفتنون المسلمين عن دينهم تارة بالقاء الشبهات في قلوبهم وتارة بالتعذيب (کبیر) فِتْنَةٌ کے معنی یہاں مطلق کفر کے بھی کئے گئے ہیں، لیکن زیادہ چسپاں نہیں ہوتے۔ بقول امام رازیؒ کے وهو عندي ضعيف (کبیر)

قول محقق وہی ہے جو اوپر درج ہوا۔ اَکۡبَرُ کی تفسیر ابن عباسؓ صحابی اور تابعین کے قول میں اشتق سے آئی ہے۔ مِنَ الۡقَتۡلِ۔ یعنی اُس خاص واقعۂ قتل سے۔ مقصود ارشادیہ ہے کہ دینِ حق کی راہ میں جو لوگ رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، اور لوگوں کو
اس طرف آنے سے طرح طرح کی سازشوں، تدبیروں، ترکیبوں سے روکتے ہیں، وہ حقیقۃً دُنیا کو امن، عدل وعافیت سے محروم کردینا چاہتے ہیں۔ اور اس لئے وہ نوع وسل انسانی کے مجرم ہیں۔ اسلامی جہاد کی تو غایت ہی دُنیا سے ہر قسم کی خود غرضیوں اور فریب کاریوں،
ظلم وجور، شورش وبدامنی کو دور کرنا ہے۔ جو احمق اس کو اور عام دنیوی حکومتوں کے قتل وقتال کو یکساں سمجھ بیٹھے ہیں، وہ جراح کے نشتر اور ڈاکو کے خنجر کو ایک سطح پر رکھ رہے ہیں۔ ۷۹۷ یہ بیان ہے اس کا کہ مشرکین عرب اسلام سے کس درجہ بیزار و حق
کے کس درجہ دشمن تھے۔ لَا یَزَالُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ میں اشارہ انہی دشمنانِ حق کی جانب ہے۔ ایک انگریز مترجم قرآن کیمبرج یونیورسٹی کے اُستادِ عربی پروفیسر پامر ہوئے ہیں، اس موقع پر طنز و تعریض کا نشتر یوں چلاتے ہیں:۔ "اور اب
اسلام نے کافروں پر ہر چہار طرف سے دھاوا بول دیا" دھاوا چاروں طرف سے یقیناً بول دیا گیا تھا، لیکن اس جھوٹ میں سچ صرف اتنا ہے کہ یہ دھاوا اسلام کا نہ تھا، خود اسلام پر تھا۔ حَتّٰی کے معنی یہاں تاکہ کے ہیں اور غرض و مقصود کے
اظہار کے لئے ہے۔ حتی للتعلیل (بیضاوی) یجوز ان یکون بمعنی الی (عکبری) ای الی ان یردوکم وقیل المعنی لیردوکم (کبیر) اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا میں اشارہ یہ پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا اپنے دین سے ہٹنا اور کافروں کا انہیں اپنی کوششوں سے
ہٹا لینا کچھ آسان نہ تھا۔ استبعاد لاستطاعتھم (کبیر) اشارۃ الی تصلبھم فی الدین وثبات قدمھم فیہ کانہ قیل وانی لھم ذلک (روح) ۷۹۸ حَبِطَتۡ .... الۡاٰخِرَةِ۔ حبطِ اعمال کا اثر آخرت میں تو یوں ظاہر ہوگا
کہ یہ بدنصیب مرتد اپنے کو ہر طاعت کے اجر اور ہر عبادت کے ثواب سے محروم پائیگا۔ اور دُنیا میں اُس کا ظہور یوں ہوگا کہ مسلمان بیوی سے اس کا نکاح قائم رہ سکتا ہے، نہ مسلمان کی میراث میں اُسے حصہ مل سکتا ہے۔ بلکہ حکومت اگر اسلامی ہو تو ایسے
بدعہد، باغی وغدار کو زندہ رہنے کا بھی حق باقی نہیں رہتا۔ شریعتِ یہود میں ارتداد ہی نہیں، سعیٔ ارتداد
اور ترغیبِ ارتداد کی بھی سزا قتل و سنگساری ہے۔ توریت میں ہے:۔ "اگر تیرا بھائی جو
تیری ماں کا بیٹا ہے یا تیرا ہی بیٹا ہے یا تیری بیٹی یا تیری ہمکنار جورو یا تیرا دوست جو تجھے جان کے برابر عزیز
ہے تجھے پوشیدہ میں پھسلاوے اور کہے کہ آج غیر معبودوں کی بندگی کریں جن سے تو اور تیرے باپ دادے
واقف نہیں تھے .... تو تو اُس سے موافق نہ ہونا، اور اُس کی بات نہ سننا۔ تو اُس پر رحم کی نگاہ نہ
رکھنا تو اُسکی رعایت نہ کرنا تو اُسے پوشیدہ نہ رکھنا، بلکہ اُسے ضرور قتل کرنا۔ اس کے قتل پر پہلے تیرا ہاتھ بڑھے اور بعد اُس کے
قوم کے ہاتھ۔ اور تو اُسے سنگسار کرنا، تاکہ وہ مرجائے" (استثناء ۱۳:۶-۱۰) اور نصرانیوں کے ہاں بھی۔
"دانستہ ارتداد ناقابلِ تلافی گناہ ہے قتل اور زناکاری کے درجہ کا" (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۱
صفحہ ۶۲۳) چنانچہ انگلستان میں ایک چھوٹے پادری نے جب تیرھویں صدی عیسوی میں ایک یہودن سے شادی کے
بھیر میں دینِ نصرانیت کو ترک کر دیا تھا تو اُسے آکسفورڈ میں ۱۷۔ اپریل ۱۲۲۲ء کو جلا دیا گیا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۶۲۳)
فَیَمُتۡ وَهُوَ کَافِرٌ "۔ اسی حالتِ کفر ہی میں اُس کی موت آجائے" یہ فقرہ بڑھا کر گویا یہ ترغیب دے دی کہ اگر
خدانخواستہ کوئی مرتد ہو ہی گیا، تو اب بھی موقع ارتداد سے پھر اپنے دین کی طرف واپس آجانے کا باقی ہے۔
امام شافعیؒ نے اس فقرہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ محض ارتداد سے اعمال کا حبط نہیں ہوجاتا جب تک کہ مرتد کی موت
بھی ارتداد پر نہ ہو۔ وبھا احتج الشافعیؒ علی ان الردۃ لا تحبط العمل حتی یموت علیھا (مدارک) قید الردۃ
بالموت علیھا فی احباط الاعمال کما ھو مذھب الشافعی (بیضاوی) لیکن حنفیہ کے پاس جواب ہے کہ یہ
مسئلہ تو خود قرآن ہی نے صاف کردیا ہے، اور ایک دُوسری آیت میں صاف حبطِ عمل کو نفسِ ارتداد پر معلق کر
دیا ہے۔ ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ، اور یہی قول امام مالکؒ کا بھی ہے۔ قال مالک یحبط
بنفس الردۃ (ابن العربی) یَرۡتَدِدۡ باب افتعال سے ہے۔ اور افتعال میں ایک مفہوم تکلف کا بھی نکلتا ہے۔
بعض اہلِ معانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ فعل کے اس باب میں لانے سے اسی عملِ ارتداد کے استبعاد پر توجہ دلانا ہے۔
وجاء افتعل ھنا بمعنی التحول والتکسب لانہ تکلف اذ من باشر دین الحق یبعد ان یرجع عنہ (بحر)
عن دینہ۔ دین سے یہاں کھلی ہوئی مراد دینِ اسلام ہے کہ خطاب یہاں مومنین ہی سے ہے۔ ۷۹۹
خٰلِدُوۡنَ۔ خلود کے معنی ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر بغیر کسی قسم کا خلل پڑے ہوئے قائم و باقی رہنا۔ الخلود
بقاء الاشیاء علی الحالة التی علیھا من غیر اعتراض الفساد (راغب) اس تصریح نے اور صاف
کردیا۔ ورنہ یوں بھی عالمِ آخرت ہمیشگی کا عالم ہے۔ وہاں کی ہر سزا اور جزا (تاوقتیکہ موقت و محدود نہ کردی جائے)
یوں بھی دائمی وجاودانی ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قدیم محقق مترجمین نے اپنے ترجموں میں اس پہلو کو
واضح کردیا ہے۔ ایشاں دراں جاویدند۔ (شاہ ولی اللہ دہلوی) وہ بیچ اُس کے ہمیشہ رہیں گے (شاہ رفیع الدین
دہلوی) ۸۰۰ اَلَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا۔ دین کے تحفظ و بقا کی خاطر وطن جیسی عزیز و محبوب چیز کو مع دیگر
تمام مرغوبات و مالوفات کے چھوڑنا اور کفر کی بستی کو ترک کرکے ایمان کی بستی میں آجانے کا نام ہجرت ہے
الخروج من الکفر الی دار الایمان (راغب) جٰهَدُوۡا۔ جہاد کے معنی شدید کوشش اور جدوجہد کے ہیں۔ اس میں سب طرح کی بلائیں اور تکلیفیں آگئیں، اور اس کی بڑی فرد قتال ہے۔ فاطرِ کائنات کے قانون میں ہجرت و جہاد دونوں کے
بڑے فضائل اور بڑے مرتبے ہیں۔ ایمان خود ہی کیا کم دولت ہے اور پھر جب اُس کے ساتھ یہ دونوں مرتبے بھی حاصل ہوجائیں، تو اُس کے درجہ کا کیا ٹھکانا ہے! نفسِ ایمان تو سب صحابیوں میں مشترک تھا ہی کثیر صحابہ ان دونوں دولتوں
سے بھی مشرف ہوچکے تھے۔ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ۔ یہ قید لگا کر پھر اس حقیقت کو صاف کردیا، کہ ہجرت وجہاد بجائے خود کیسے ہی مجاہدے سہی، اللہ کے ہاں مقبول جبھی ہیں، جب خدا کی راہ میں ہوں، دینِ خدا کے واسطے ہوں۔ ورنہ محض محنت ہی
محنت ہاتھ رہیگی۔ ـــــــ وطن، قوم، نسل، رنگ کے نام پر جانیں دے دینے والے، بڑی سی بڑی مصیبتیں جھیل جانے والے آج ہندوؤں، پارسیوں، جرمنوں، انگریزوں، رُوسیوں، امریکیوں، جاپانیوں سب ہی میں لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں
مل جائیں گے، سب کے سب فی سبیل اللہ اور الذین آمنوا کے وصف سے خالی! اکبرؔ نے خوب کہا ہے ؎ ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم * دلوں کو طاعتِ حق سے یہ دُور کرتے ہیں * نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز
ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں * ۸۰۱ اس میں بشارت و تسلی ان مومنین کے لئے ہے جن کے ہاتھ سے ایک مشرک کا قتل یکم رجب کو بغیر صحیح تاریخ سے واقفیت کے ہوگیا تھا۔ اوپر حاشیوں میں مفصل تفصیل گزر چکی۔ ۸۰۲ ان صفات کے
اثبات سے مقصود مومنین کی مزید تشفی وبشارت ہے۔ غَفُوۡرٌ۔ سو وہ اپنی صفتِ غفوریت کے تقاضہ سے اس سہو وخطا کو معاف کریگا۔ رَحِیۡمٌ۔ سو وہ اپنی صفتِ رحیمیت کے تقاضہ سے اجر بھی مرحمت فرمائیگا۔ ۸۰۳ یعنی اُن کے حکم شرعی
کی بابت، ان کے جواز وعدمِ جواز کی بابت۔ والمعنی یسئلونک عما فی تعاطیھما بدلیل (کشاف) دل تخصیص الجواب علی ان ذلک السوال کان واقعا عن الحل والحرمۃ (کبیر) اَلۡخَمۡرِ۔ خمر ومیسر یہاں دونوں اپنے عام و وسیع
معنی میں ہیں۔ خمر کے تحت میں ہر وہ نشیلا مشروب داخل ہے جو عقل کو مختل کرنے۔ اسم لکل مسکر خامر العقل (تاج) الخمر ما اسکر من عصیر کل شیٔ (تاج) سمیت لکونھا خامرۃ لمقر العقل (راغب) شریعت نے بھی اسی
معنوی مفہوم کو قبول کرلیا ہے۔ صحابیوں اور تابعین سب سے یہی معنی منقول ہیں۔ الخمر ما خامر العقل (بخاری عن ابن عمرؓ) الخمر کل شراب خمر العقل فسترہ وغطی علیہ (ابن جریر) اَلۡمَیۡسِرِ بھی ایسے ہی وسیع معنی میں ہے، اور جُوئے کے تمام اقسام پر
شامل ہے۔ کل شیٔ فیہ قمار فھو من المیسر (تاج) علمائے شریعت نے بھی اسی لغوی مفہوم پر مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے۔ المیسر ھو القمار (ابن کثیر بعنی القمار (معالم) وفی حکم المیسر انواع القمار والنرد والشطرنج و
غیرھا (مدارک) شراب اور جُوا جس طرح آج فرنگی تہذیب میں جائز ہی نہیں، بلکہ عین اس تہذیب کا جزو بنے ہوئے ہیں، اور دلیلِ عزت و شرافت ہیں، اسی طرح قدیم عربی تہذیب کا بھی جزو تھے، اور لوازمِ شائستگی میں سے سمجھے جاتے تھے، اور دیکھے

سیقول ۲ ۸۶ البقرة ۲

حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ
کہ ان کے اعمال دُنیا اور آخرت میں اکارت گئے ۷۹۸ اور یہ
اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ
اہلِ دوزخ ہیں اسی میں ہمیشہ پڑے رہنے والے ۷۹۹ بیشک جو لوگ
اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ
ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد
اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ
کیا ۸۰۰ تو یہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھیں گے ۸۰۱ اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے،
رَّحِیۡمٌ ﴿۲۱۸﴾ یَسۡئَلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ
بڑا مہربان ہے ۸۰۲ لوگ آپ سے شراب اور قمار کی بابت دریافت کرتے ہیں ۸۰۳ آپ
فِیۡهِمَاۤ اِثۡمٌ كَبِیۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ
کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے ۸۰۴ اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں ۸۰۵ اور ان کا گناہ
مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ؕ وَیَسۡئَلُوۡنَكَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ ؕ قُلِ
ان کے فائدوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے ۸۰۶ اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں، آپ
الۡعَفۡوَ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّكُمۡ
کہہ دیجئے کہ جتنا آسان ہو ۸۰۷ اللہ اسی طرح تمہارے لئے کھول کر احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم
تَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱۹﴾ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ ؕ وَیَسۡئَلُوۡنَكَ
سوچ لیا کرو دُنیا اور آخرت کے معاملات میں ۸۰۸ اور (لوگ) آپ سے

منزل ۱

عرب ہی پر موقوف نہیں، یہ مشغلے سارے بڑے زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور ہندی تہذیب، مصری تہذیب، یونانی تہذیب، رُومی تہذیب تو خیر خود ہی جاہلی تہذیبیں تھیں، اسرائیلی اور مسیحی تہذیبیں تک، جو شرفِ رسالت کے تعلق سے مشرف تھیں،
ان کی روک تھام نہ کرسکی تھیں۔ شریعتِ اسلامی ہی دُنیا کا وہ قانون ہے جس نے آکر ان کی قطعی حُرمت کا اعلان کیا۔ یہ آیت سلسلۂ حُرمت کی سب سے پہلی آیت ہے۔ قطعی حکم بعد کو نازل ہوا۔ علامہ آلوسی بغدادی، صاحب تفسیر رُوح المعانی نے اس
مقام پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، کہ ہمارے زمانہ کے فاسقوں نے نشیلے مشروبات کے لئے طرح طرح کے خوشنما نام اور لقب رکھ لئے ہیں۔ عرق عنبری، ماء الاکسیر وغیرہا لیکن نام کے بدل دینے سے حقیقت اور حکمِ شرعی نہیں بدل جایا کرتا۔ نشہ آور
چیزیں بہرحال حرام ہیں۔ علامہ کا سالِ وفات ۱۲۷۰ھ ہے۔ گویا آج (۱۹۴۵ء) سے ایک سو سال قبل کے عراق میں آپ کو یہ حسرتناک تجربے ہو چکے تھے۔ اُن مرحوم کو کیا اندازہ کہ آج فرنگیوں کے اثر سے اُن کے وطن عراق ہی میں نہیں،
بلکہ مصر، ایران، ترکی، شام وغیرہ میں شراب کتنی اور کن کن شکلوں کے ساتھ پھیل چکی ہے! اور خبر ہی نہیں میسر بھی کیسے کیسے نئے اور خوشنما ناموں کے ساتھ "تہذیب و تمدن" کا جزو بن چکا ہے۔ اور کتنے گوشوں میں داخل ہو چکا ہے!
۸۰۴ (جیسا کہ مشاہدہ ہے) الاثم کا لفظ ہر ایسے فعل کے لئے آتا ہے جو نیکی کی راہ سے رکاوٹ پیدا کرنے والا ہو۔ اسم للافعال المبطئۃ عن الثواب (راغب) اثم کا اطلاق کسی عمل پر خود اسے حرام قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ الاثم
کلہ محرم (جصاص) چہ جائیکہ جب اس پر تاکید بھی کبیر کے ساتھ موجود ہو! اثم کبیر ہی سے فقہا نے نکالا ہے کہ شراب کی مقدار قلیل بھی حرام ہے۔ ولاحد علی تحریم القلیل منہ (جصاص) اور اس لحاظ سے قرآن مجید ان دونوں کے
حق میں لفظ اثم بہت خوب لایا۔ معاشرہ میں آجتک جتنے فسادات شراب نوشی سے پیدا ہو چکے ہیں، اظہر من الشمس ہیں۔ گالیاں یہ بکوائے، بے حیائی یہ پھیلائے، حرامکاری کی طرف یہ لائے، بلوے، دنگے یہ کرائے، چوری، ٹھگی پر آمادہ
کروے، قتل کی نوبت یہ لے آئے، ہر عبادت سے، طہارت سے، پاکیزہ منشی سے یہ روک دے، اور اسراف
تو اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ اور قماربازی کی لائی ہوئی مصیبتیں کچھ کم ہیں؟ فرنگستان کے سب سے
بڑے قمارخانہ مونٹے کارلو Monte Carlu میں ہر سال کتنی بیشمار دولت تلف ہوتی رہتی ہے!
دیوالی اور جنگھٹ کی راتوں کو ہندوستان کے اندر کیا کچھ نہیں ہوتا؟ اور پھر جوئے کی جدید ترین شکلوں، بیمہ
کمپنیوں کے جوئے، گھڑدوڑ کے جوئے، چٹھیوں (لاٹریوں) کے جوئے، سٹے وغیرہ کو کوئی کہاں تک شمار کرے؟
سچ کہا اُن مفسرین نے جنہوں نے کہا کہ ان دونوں شغلوں کے اندر نیکیوں سے بڑی رکاوٹ ہے۔ فی
تناولھما ابطاء عن الخیرات (راغب) من حیث ان تناولھما مؤدّ الی ما یوجب الاثم وھو
ترک المامور وفعل المحظور (روح) بعض صحابیوں، مثلاً حضرت عمرؓ اور حضرت معاذؓ کی بابت منقول ہے
کہ انہوں نے شراب کی بابت رسول اللہ صلعم سے از خود دریافت کرنا شروع کردیا تھا کہ ایسی چیز جو عقل اور مال دو
کو غارت و برباد کر دینے والی ہو، اُس کے باب میں کیا حکم ہے؟ کان المسلمون یشربونھا وھی حلال
لھم ثم ان عمر ومعاذًا ونفرًا من الصحابۃ قالوا یا رسول اللہ افتنا فی الخمر فانھا مذھبۃ للعقل
مسلبۃ للمال (کبیر)۔ صحبتِ رسولؐ کی برکت سے اگر قلوب میں از خود اتنی جِلا پیدا ہو گئی ہو تو اس میں حیرت
ہی کیا ہے؟ **۸۰۵** (کچھ تھوڑے بہت) حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کائنات میں سب سے مضر ہی مضر اور
ہر طرح نفع و مصلحت سے خالی کوئی شے موجود ہی نہیں۔ یہاں تک کہ شراب نوشی اور قماربازی جیسے گندے مشغلے بھی اس
کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ مثلاً شراب سے بعض بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے، بعض شرابیں خوشبو رکھتی ہیں، شراب سے وقتی
لذت و سرور حاصل ہوتا ہے، بعض قوتوں میں عارضی طور پر تحریک پیدا ہو جاتی ہے، وقس علیٰ ہذا۔ یا اسی طرح جوئے
میں جو جیتتا ہے، اُسے بلا مشقت و تعب تھوڑی ہی سی دیر میں آمدنی ہو جاتی ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ لے باللذۃ
والفرح فی الخمر واصابۃ المال بلا کد فی المیسر (جلالین) مفسرین نے تیرجے اس جزو کے تحت میں شراب کے
بہت سے منافع و مصالح اپنی اپنی بصیرت و دائرۂ علم کے لائق گنائے ہیں۔ اور یہیں سے ایک اور مسئلہ نکل آیا ——
کسی حرام اور ناجائز شے کے جزوی منافع و مصالح بیان کرنا اُس کی حُرمت کے منافی اور اس کی حُرمت سے
انکار کے مرادف ہرگز نہیں۔ آج جو اسپرٹ ملی ہوئی انگریزی دوائیں کثرت سے چل پڑی ہیں، یہ عموماً شراب
کے قسم کی ہوتی ہیں۔ اور فقہا نے انہیں زہر کے حکم میں رکھا ہے۔ **۸۰۶** (اس لئے عقلِ سلیم کے لحاظ کو
یہ دونوں چیزیں قابلِ ترک اور واجب الاحتراز ہیں) فقہا نے کہا اور بالکل صحیح کہا ہے کہ حُرمتِ خمر پر دوسری
آیتیں اس سے صریح تر موجود ہوتیں، جب بھی خود یہ آیت حُرمت کے لئے کافی تھی۔ ھٰذہ الاٰیۃ قد
اقتضت تحریم الخمر لو لم یرد غیرھا فی تحریمھا لکانت کافیۃ مغنیۃ (جصاص) یہ فخر تاریخ میں اسلام
ہی کو حاصل ہے کہ اُس نے اپنے ایک اشارہ ہی سے اپنے حدودِ مملکت سے گویا جیسے کہ ان خباثت کا خاتمہ ہی کر دیا۔ اور
اشخاص و افراد کی کارستانیوں سے قطع نظر، اُمت کی نظر میں بحیثیت مجموعی لفظ "شرابی" اور لفظ "جواری" دونوں
کو انتہائی تحقیر و ذلت کا لقب ٹھہرا دیا۔ یہ اسلام ہی کا اعجاز ہے کہ اُس نے اپنے پیروؤں کو جہاں تک ان اخلاقی

عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ
یتیموں کے باب میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اُنکی مصلحت کی رعایت رکھنا بہتر ہے، اور اگر تم
تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ
انکے ساتھ (خرچ) شامل رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں اور اللہ کو علم ہے کہ مفسد (کون) ہے اور
مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
مصلح (کون) اور اللہ اگر چاہتا تو تم کو پریشانی میں ڈال دیتا بیشک اللہ یقیناً زبردست
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ
ہے حکمت والا ہے اور نکاح مشرک عورتوں کے ساتھ نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے
وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ
آئیں اور مومنہ کنیز یقیناً بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو
وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ
اور اپنی عورتوں کو بھی مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جبتک وہ ایمان نہ لے آئیں اور مومن غلام یقیناً بہتر
خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ
ہے مشرک (آزاد) سے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو وہ لوگ دوزخ کی طرف
اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
بلاتے ہیں اور اللہ جنت و مغفرت کی طرف بلا رہا
بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾
ہے اور لوگوں سے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں

ع ۲۷ ۵ ۱۱

نجاستوں کا تعلق ہے، پاکیزگی اور ستھرائی کے اُس بلند مقام پر پہنچا دیا، جہاں تک باوجود علم و فضل فہم و دانش کے بلند بانگ دعووں کے، آجتک دکوئی "ٹیمپرنس ایسوسی ایشن" (اعتدال و احتیاط کی تبلیغ کرنیوالی انجمن) پہنچا سکی ہے۔ نہ کوئی پروہیبیشنسٹ
Prohibitionist گورنمنٹ" (قانونِ امتناع جاری کرنے والی حکومت)! سر ولیم میور، اپنے نہیں بیگانے ہیں، معتقد نہیں منتقد ہیں۔ باوجود اس کے لکھتے ہیں:۔ "اسلام فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ترکِ میکشی کرانے میں جیسا
وہ کامیاب ہوا ہے، کوئی اور مذہب نہیں ہوا ہے۔" (لائف آف محمد صفحہ ۵۲۱) انیسویں صدی کے ربع آخر میں لندن میں چرچ کانگرس کے ایک اجلاس کے موقع پر ایک ممتاز پادری اسحٰق ٹیلر نے کہا تھا:۔ "دنیا میں انسدادِ مے نوشی کی سب سے
بڑی انجمن خود اسلام ہے۔ برخلاف اس کے ہماری یورپین تجارت کے قدم جہاں جہاں پہنچتے جاتے ہیں، مے نوشی و بدکاری اور لوگوں کی اخلاقی پستی بڑھتی ہی جاتی ہے۔" ٹیمپرنس کے نام سے مے نوشی میں اعتدال و احتیاط پیدا کرنے کیلئے یورپ
اور امریکہ اور ہندوستان میں آج بھی خدا معلوم کتنی انجمنیں بہترین نظم و نظام اور شہرت کارکردگی کے ساتھ قائم ہیں، اور امریکہ کے مشہور کارکن "گریہ یا جانسن" Pussy Foot Johnson نے تو اپنی سرگرمیوں کی دھوم ساری دنیا کے متمدن ملکوں میں
مچادی۔ اور بڑے بڑے ڈاکٹر اور ماہرین سائنس شراب کے نقصانات پر بیانات اور اعداد برابر شائع ہی کرتے رہتے ہیں، لیکن ان ساری سرگرم کوششوں کے باوجود خود انہی لوگوں کو یہ اقرار ہے کہ شراب کو قطعی حرام کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔" (انسائیکلو
پیڈیا برٹانیکا جلد ۲۲ صفحہ ۵۸، طبع یازدہم) ہندوستان میں ابھی دو ہی چار سال ہوئے (غالباً ۱۹۳۸ء میں) متعدد صوبہ دار حکومتوں نے اپنے علاقوں میں قانون امتناع نافذ کیا تھا، لیکن آخر میں وہ قانون واپس لیتے ہی بنی! —— محکمہ
آبکاری کی لکھوکھا روپیہ کی آمدنی سے دستبردار ہو جانا کوئی آسان بات ہے؟ رہی قماربازی، سو اس باب میں قانونِ اسلام سے باغی و منحرف ہو کر یورپ اپنے ہاتھوں اپنا جو حال کر رہا ہے، وہ عالم آشکار ہے۔ خودکشی اور اقدامِ خودکشی کے کتنے
واقعات مے نوشی اور قماربازی ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں! پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یورپ کی پہلی جنگِ عظیم سے قبل، اکیلے ملک انگلستان سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم از کم دس کروڑ پونڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں
کے ہاتھوں میں پہنچتی رہتی ہے! (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، جلد ۶ صفحہ ۱۶۳) یہ تخمینہ یورپ کے صرف ایک ملک، اور ایک چھوٹے سے رقبہ سے متعلق تھا، اور وہ بھی پہلی جنگ عظیم سے قبل کا! یورپ کے کل ملکوں (اور اس فہرست میں دنیا کے معلوم
کا مشہور ترین قمارخانہ مانٹی کارلو بھی شامل ہے) اور امریکہ کی ساری ولایتوں کی مجموعی تباہ کاریوں کے جدید ترین تخمینہ کے لئے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حساب کے کن ہندسوں تک میزان پہنچے! رہیں قانونِ وقت کی ناکام کوششیں، تو
اسی انسائیکلوپیڈیا کے اسی مقالہ میں ہے کہ "قانون اس میں کمی پیدا کرنے کی اپنی والی سب ہی کوششیں کر رہا ہے بجز اُسے قطعی ممنوع کرنے کی ناممکن کوشش کے۔" (صفحہ ۱۶۹) یہ حوصلہ اسلام ہی کا تھا کہ اس نے عقلائے فرنگ کی اس
"ناممکن کوشش" کو اپنے حدود میں ممکن ہی نہیں واقع کر کے دکھا دیا۔

٨٠٧ (خیر خیرات میں) فرض زکوٰۃ کی توشرح متعین تھی۔ یہ سوال اس کے علاوہ دوسرے نیک کاموں میں صرف سے متعلق تھا۔ ٨٠٨ اور اس آسانی کا معیار بقول مفسر تھانویؒ یہ ہے کہ اس سے کسی حقدار کا حق ضائع نہ ہو اور اپنے ضروری مصارف میں تنگی نہ اٹھانا پڑے۔ العفو۔ عفو سے مراد بس اتنا خرچ کرنا ہے جو اپنے اوپر بار نہ ہو۔ العفو نقیض الجهد وهو ان ینفق مالا یبلغ انفاقه منه الجهد (کشاف)۔ لے مالا یجهد (موح عن الحسن) لے انفقوا ما فضل عن قدر الحاجة (مدارک)۔ ٨٠٩ (ان احکام پر عمل کے وقت) امورِ آخرت میں غور و فکر کرتے رہنے کی اہمیت تو ظاہر ہے۔ یہاں حکم اس کا مل رہا ہے کہ امورِ دنیا میں بھی سوچ بچار سے کام لیا کرو ——— تو گویا دنیا بھی اس قابل ہے کہ اس کے معاملات میں غور و تدبر سے کام لیا جائے؛ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ راز اس کا یہ ہے کہ انسان خلوِ ذہن کے ساتھ جس قدر دنیا اور اس کے کاروبار کو سوچے گا، اسی قدر اس کی بے ثباتی اور بے قدری اس کے دل پر نقش جائے گی۔ ٨١٠ ذکر ان کے خرچ کا نظام رکھا جائے، آیا اپنے حساب میں شامل رکھا جائے یا ان کا حساب بالکل الگ کر دیا جائے، یہ سوال کرنے والے یتیموں کے اولیا، تھے جن کی ولایت و سرپرستی میں یتیم بچے پل رہے تھے۔ اللہ رے صحابہؓ کی احتیاط اور مرتبہ تقویٰ! انصاف کے ساتھ اگر سوال کیا گیا تو یتیم کی جائدادوں سے استفاع کی آیا کوئی شکل بھی اولیا، اور سرپرستوں تک کیلئے جائز ہے؟ جائداد کی طمع بھی بُری ہوتی ہے۔ عرب جاہلی میں بہت سے لوگ اس لئے یتیموں کو اپنی ولایت و سرپرستی میں لیتے تھے کہ ان کی جائداد میں خورد بُرد کا موقع مل جائے گا۔ بلکہ کوئی یتیم لڑکی اگر مالدار نظر آئی، تو اس سے اپنے لڑکے کی شادی بھی اسی طمع میں کر دیا کرتے تھے۔ الیتامیٰ۔ یتیم کی جمع ہے۔ اور یتیم سے مراد وہ لڑکا یا لڑکی ہے، جس کے سر سے باپ یا ماں کا سایہ اُٹھ گیا ہو۔ احکامِ شریعت میں یتیمی باپ کی طرف سے معتبر مانی گئی ہے۔ الیتیم المنفرد عن احد ابویه (جصاص)۔ انما المراد بالایتام الفاقدون لآبائهم وهم صغار (جصاص)۔ ٨١١ سو وہ جس طریق پر حاصل ہو وہی صورت اختیار کی جائے۔ یہاں اصل اصول بیان کر دیا کہ مقدم شرط جائداد یتیم کے مصالح کی رعایت ہے۔ اگر اس کا تقاضہ یہ ہو کہ اپنا اور یتیم کا حساب ایک میں رکھا جائے، تو یہی کیا جائے، ورنہ اس کے برعکس۔ اصلاح کا لفظ عام ہے۔ اگرچہ اس کا قریبی تعلق مالی مصالح سے ہے۔ لفظ کے عموم میں جسمانی، مالی، اخلاقی، ہر قسم کی اصلاح آگئی۔ فقہاء نے بقاعدۂ اقتضاء النص اس عموم سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یتیم پر جو تہدید یا تنبیہ تعلیم و تربیت کی ضرورت سے ہو وہ بالکل درست ہے۔ اسلام کی یتیم نوازی، یتیم پروری کا اعتراف اپنوں ہی کی طرح بیگانوں اور منکروں کو بھی ہے۔ برطانوی مصنف باسورتھ اسمتھ نے لکھا ہے:۔ "پیمبر کی توجہ خصوصی کے مرکز غلاموں کی طرح یتیم بھی رہے ہیں۔ وہ خود بھی یتیم رہ چکے تھے اس لئے دل سے چاہتے تھے کہ جو حسنِ سلوک خدا نے ان کے ساتھ کیا وہی وہ دوسروں کے ساتھ رکھیں۔" (محمد اینڈ محمڈنزم، ص۲۵۰) امریکی ماہرِ اجتماعیات، ڈاکٹر سارٹس لکھتے ہیں:۔ "قرآن کے مطالعہ سے ایک خوشگوار ترین چیز یہ معلوم ہوتی ہے کہ محمد کو بچوں کا کس قدر خیال تھا خصوصاً اُن بچوں کا جو والدین کی سرپرستی سے محروم ہو گئے ہوں۔ بار بار تاکید بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ملتی ہے" (سوشل لاز آف دی قرآن ص۵۳، ص۵۴) اور پھر کہا ہے:۔ محمد نے یتیموں کے باب میں اپنی خاص توجہ مبذول رکھی۔ یتیموں کے حقوق کا بکثرت ذکر اور اُن سے بدسلوکی کرنیوالوں اور اُن کے حقوق غصب کرنیوالوں کے خلاف سخت سے سخت وعیدیں سیرتِ محمدی کے اس پہلو کو ظاہر کرتی ہیں جس پر مسلمان مصنفین کو بجا طور پر ناز ہے۔" (ص۵۸) ٨١٢ بھائی ہیں (اور اسلئے مشترک خرچ میں کوئی مضائقہ نہیں) اِخْوَانُكُمْ لفظ اخ یا بھائی انتہائی اخلاص، یگانگت و مودت کا مظہر ہے۔ اس ذرا سے لفظ میں بہت کچھ آ گیا۔ جب تم اور وہ بھائی ہی بھائی ٹھیرے، تو بھائی بھائی میں تکلف کیسا؟ ——— اور عرب میں تو یہ رشتہ اور زیادہ قوی تھا۔ فهم اخوانكم والاخوان يعين بعضهم بعضا ويصيب بعضهم من اموال بعض على وجه الاصلاح والرضا (معالم)۔ چونکہ اس وقت اکثر مسلمانوں کے پاس مسلمان ہی یتیم تھے، اس لئے اِخْوَانُكُمْ فرمایا۔ ورنہ اگر دوسرے مذہب کا بچہ بھی اپنی تربیت میں ہو، اس کا بھی بجنسہٖ یہی حکم ہے۔ اور اس کی دلیل دوسری آیات و احادیث ہیں جو الفاظ عامہ سے وارد ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ مذہبی رعایت اتنی اور زائد ہے کہ اس بچہ پر بعد بلوغ قبولِ اسلام کے لئے جبر نہیں کیا جاتا، مذہبی آزادی دی جاتی ہے۔" (تھانوی) ٨١٣ یعنی اس پر سب کی نیک نیتی اور بدنیتی دونوں خوب روشن ہیں۔ المفسد۔ یعنی یتیموں کی مصلحت کو ضائع کرنے والا۔ الذی یقصد بالمخالطة الخیانة وافساد مال الیتیم (معالم)۔ المصلح یعنی یتیموں کی مصلحت کا لحاظ رکھنے والا۔ الذی یقصد الاصلاح (معالم)۔ مفسر ابو سعود نے کہا ہے کہ لفظ المفسد کو المصلح پر مقدم رکھنے میں وعید میں تاکید اور تہدید اور زیادہ پیدا ہو گئی۔ ٨١٤ یعنی بجائے ان آسانیوں کے اس باب میں کوئی سخت قانون بنا دیتا۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ۔ یعنی اگر اس کی حکمت و مشیتِ تکوینی کا اقتضاء یہی ہوتا۔ ٨١٥ یہاں اپنی دونوں صفات یاد دلا دیں۔ پہلی صفت عزیز کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ جو حکم چاہتا دے سکتا تھا، کوئی قوت اُس سے بالاتر، کوئی حاکم اُس کے اوپر ممکن نہیں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ
اور لوگ آپ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ وہ ایک طرح کی گندگی ہے
فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ
پس تم عورتوں کو حیض کے دوران میں چھوڑے رہو اور جب تک وہ پاک نہ
حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ
ہو جائیں اُن سے قربت نہ کرو پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو اُن کے پاس آؤ جس جگہ
حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ
سے اللہ نے تمہیں اجازت دے رکھی ہے بیشک اللہ محبت رکھتا ہے توبہ کرنے والوں سے
وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠
اور محبت رکھتا ہے پاک صاف رہنے والوں سے تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں،
فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ
سو تم اپنے کھیت میں آؤ جس طرح چاہو اور اپنے حق میں آیندہ کے لئے کچھ کرتے رہو
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ
اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے اور آپ ایمان والوں
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ
کو خوشخبری سنا دیجئے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے اپنی نیکی کے اور اپنے
اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ
تقویٰ کے اور اپنی اصلاحِ خلق کے کاموں کے حق میں حجاب نہ بناؤ اور اللہ

منزل ۱

سب پر بالادست خود ہی ہے۔ لیکن دوسری صفت حکیم کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ احکام وہی دیتا ہے جو بندوں کے لئے نرم و آسان و قرینِ مصلحت ہوں۔ ٨١٦ (اے مسلمان مردو!) میاں بیوی کا رشتہ انتہائی اُلفت و رفق کا، اور باہمی مناسبت اور موانست کا ہوتا ہے۔ بیوی کو اگر شوہر سے اس درجہ نامناسبت ہے کہ وہ اس کی ساری شعوری اور اختیاری زندگی کے اصل اصول یعنی توحید و رسالت ہی کی منکر ہے، تو معلوم ہوا کہ دونوں میں باہمی مناسبت کی بنیاد درجۂ ضعیف میں بھی موجود نہیں، مرد کو ایسی عورت کے ساتھ عمر نباہ کرنے کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہئے، موافقت کامل کے دوسرے اجزاء و عناصر موجود نہ ہوں، نہ سہی، لیکن کم از کم وہ بنیادی عقیدہ تو مشترک ہو جس کے تابع و ماتحت چھوٹا بڑا، زندگی کا ہر معاملہ ہے۔ پھر نکاح اسلام میں ایک دینی اور مذہبی عمل ہے محض معاہدۂ دیوانی Civil Contract نہیں۔ جب ایک فریق دین و مذہب کی بنیادوں ہی سے منحرف ہے، تو اس کے ساتھ معاہدہ ممکن کیونکر ہے؟ فطرتِ بشری خود ایسے بے جوڑ ازدواج سے اباء کرتی ہے، دینِ فطرت اسے کیونکر جائز رکھ سکتا تھا۔ المشرکات۔ لفظ مشرک یہاں اپنے عام و وسیع معنی میں ہے ہر قسم کی کافرہ یا غیر مسلم عورت اس حکم ممانعت میں داخل ہو گئی۔ بس کا بُت پرست ہونا لازمی نہیں۔ قول محقق یہی ہے۔ عن ابن عمر انها عامة فی الکتابیات وغیرهن (جصاص)۔ المشرکات هنا الکفار (نہر)۔ والاکثرون من العلماء علی ان اللفظ المشرك یندرج فیه الکفار من اهل الکتاب وهو المختار (کبیر)۔ امام مالکؒ و امام شافعیؒ بس اسی آیت پر رک گئے ہیں۔ اور اُن کی فقہ میں ہر قسم کی غیر مسلم عورت سے نکاح ناجائز ہے۔ لا یجوز العقد بنکاح علی مشرکة کانت کتابیة او غیر کتابیة قال عمر فی احدی روایته وهو اختیار مالك والشافعی (ابن العربی)۔ لیکن فقہاء حنفیہ کی نگاہ مزید نکتہ بینی کے ساتھ قرآن مجید ہی کی ایک دوسری آیت کی طرف بھی گئی، اور وہ آیت سورۂ مائدہ کی ہے۔ والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم۔" اور انہوں نے پہلی آیت کے عموم کو اس کی جگہ پر رکھ کر اس کا خصوص اس دوسری آیت سے پیدا کیا یعنی عام قاعدہ کے لحاظ سے تو ہر غیر مسلمہ کے ساتھ نکاح ناجائز ہے لیکن کتابیہ یعنی یہودی یا نصرانی عورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ اور یہی مذہب ابن عباسؓ اور بعض تابعین سے مروی ہوا ہے۔ وهو عموم خص بجواز نکاح الکتابیات (نہر)۔ عن ابن عباس قال فی ولا تنکحوا المشرکات نسخ من ذلك نکاح نساء اهل الکتاب احلهن للمسلمین وحرم المسلمات علی رجالهم وعن الحسن و مجاهد مثل ذلك (روح)۔ مفسر تھانویؒ کے چند افادات اس موقع پر نقل کرنے کے قابل ہیں:۔ ۱۔ ہندو عورت یا آتش پرست عورت سے نکاح نادرست ہے۔ ۲۔ کتابی عورت سے نکاح جائز ہے لیکن بہتر نہیں، حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرمایا ہے اور خود حدیث میں نکاح کا حکم دیندار ہی عورت سے کرنے کا ہے۔ ۳۔ ایسی عورت جو وضع و طرز سے کتابیہ معلوم ہوتی ہو لیکن بعد تحقیق اُس کے عقائد کتابیوں کے سے نہ نکلیں، اُس کو بھی نکاح نادرست ہے۔ یہودیت چونکہ ایک نسلی مذہب ہے، اسلئے اسرائیلیوں کو غیر اسرائیلیوں سے نکاح کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ خروج ۳۴: ۱۶،

استثناء ۷: ۱-۴۔ عزرا ۱۰: ۹۔

مسیحی مذہب میں بھی بے ایمانوں (یعنی غیر مسیحیوں) سے ازدواج کی ممانعت ہے۔ ۲ کرنتھیوں ۶: ۱۴، ۱۵۔ ۱ ولیم مارک کی کتاب مختصر تاریخ نکاح (شارٹ ہسٹری آف میریج) میں ہے "سینٹ پال کی تعلیم ہے کہ کوئی عیسائی کسی کافر سے ہرگز نکاح نہ کرے۔" اور ترتولین کے نزدیک تو ایسے ازدواج کا نام حرامکاری ہے" (صفحہ ۴۳) اور ہندوؤں کے ہاں تو نکاح مذہب سے باہر ہونا کیا معنی، ذات سے باہر بلکہ برادری کے باہر بھی درست نہیں۔ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۔ یہ قید لگا کر بتادیا کہ ممانعت کی بنیاد تمامتر دینی و اعتقادی ہے نسلی، قومی، جغرافی وغیرہ ہرگز نہیں۔ جو بھی ایمان لے آئے، اسی وقت جائز ہو جاتی ہے۔ ۸۱۷ (اور پسندیدگی کی بنا خواہ یہ ہو کہ وہ مالدار ہے، یا یہ کہ وہ حسین و جمیل ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور بنا ہو) آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفر قرآن کی نظر میں کس قدر مبغوض ہے۔ کافر عورت میں جو بھی خوبیاں ہوں، کل ایک طرف اور اس کے کفر کی گندگی دوسری طرف۔ لَاَمَةٌ میں ل زور اور تاکید کے لئے ہے۔ اردو میں ایسے موقع پر "ہی" لاتے ہیں۔ لام الابتداء او الشبیھة بلام القسم فی افادة التاکید (ابو سعود) واللام فی افادة التوکید (کبیر عن ابی مسلم) مطلب یہ ہوا کہ ہر مسلم عورت، یہاں تک کہ نعمت آزادی سے محروم اور عرفاً حقیر و ذلیل سمجھی جانے والی باندی تک آزاد، خوش حال، خوش جمال کافر عورت سے بہتر ہے۔ ۸۱۸ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۔ یہ گویا یہاں بھی اسی حقیقت کے زوردار اظہار کے لئے ہے کہ اصل مانع وحائل ان مردوں کا کفر ہے۔ جب یہ مانع دور ہو جائے، تو پھر کوئی امر مانع نہیں۔ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مشرک یہاں بھی اسی عام و وسیع معنی میں ہے جیسے "مشرکۃ" ابھی اوپر آچکا ہے یعنی ہر قسم کے کافر کے مرادف۔ قانون اسلام کا منکر جو کوئی جس قسم کا بھی ہو مومن خاتون اس کے نکاح میں نہ دی جا سکتی ہے، نہ رہ سکتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ شوہر اگر پہلے سے مسلمان ہے، اور بعد کو خدانخواستہ مرتد ہو گیا تو مسلمان عورت اسی وقت اس کے نکاح سے باہر ہو جائیگی۔ اور جو نکاح ابھی تک صحیح تھا ٹوٹ جائیگا۔ اور یہ عورت عدت پوری کر کے کسی مسلمان شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میاں بیوی پہلے سے کافر ہیں، اور عورت مسلمان ہو گئی تو اب بقاء نکاح کی کوئی صورت نہیں، بجز اس کے کہ شوہر بھی اسلام قبول کرلے۔ مزید تفصیل اس قسم کے مسائل کی کتب فقہ میں ملے گی۔ لَا تُنْكِحُوْا ۔ خطاب مردوں سے ہے کہ تم اپنی عورتوں کو کافروں کے نکاح میں نہ دو۔ حکم خود عورتوں کو براہ راست نہیں مل رہا ہے کہ تم کافروں کے نکاح میں نہ جاؤ۔ یہ طرز خطاب بہت پُر معنی ہے۔ صاف اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح مردوں کے واسطہ سے ہونا چاہیئے۔ ۸۱۹ (علمی قابلیت کی بنا پر، اونچی ڈگریوں کی بنا پر، بڑے عہدوں کی بنا پر کسی بھی دنیوی بنیاد پر) لَعَبْدٌ کا ل یہاں بھی تاکید اور زور کے لئے ہے۔ اردو کے "تک" کے معنی میں یعنی نعمت آزادی سے محروم اور عرفاً حقیر و ذلیل سمجھے جانے والے غلام تک کو اختیار کر سکتے ہو لیکن نہ اختیار کرو تو کسی کافر کو، خواہ وہ دنیاوی اعتبار سے کیسا ہی بڑا آدمی ہو۔ ۸۲۰ اِلَى النَّارِ ۔ دوزخ کی طرف یعنی ان اعمال اور ان عقائد کی طرف، اس طریق زندگی کی طرف جس کا انجام دوزخ ہے۔ اور وہ طریق کفر و شرک ہے۔ اے الی الاعمال الموجبة للنار (معالم) اے الکفر المؤدی الی النار (بیضاوی) اُولٰٓئِكَ ۔ اشارہ انہی کافر مردوں اور کافر عورتوں کی جانب ہے۔ آگے کی طرف سے مزید نفرت دلانے کے لئے یہ فقرہ بھی بڑھادیا گیا ہے۔ گویا جتادیا ہے کہ ایسے گئے گزرے ہوئے اور خطرناک لوگ تو معمولی تعلقات رکھنے کے بھی قابل نہیں، چہ جائیکہ ان سے ازدواج کا سا گہرا رشتہ پیدا کیا جائے! ۸۲۱ (چنانچہ اس رحمت و مغفرت ہی کے تقاضے سے اس نے یہ حکم بھی دے رکھا ہے کہ کافروں سے ازدواجی تعلق نہ رکھو، تاکہ ان کے گہرے تعلق کا کوئی اثر تم پر نہ پڑنے پائے اور نہ تم جنت و مغفرت سے دور ہوتے جاؤ) اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ ۔ یعنی اللہ ترغیب دیتا ہے ایمان و اسلام کی اور اس طریق زندگی کی جس کا انجام جنت و مغفرت ہی ہے۔ بِاِذْنِهٖ ۔ اذن کے معنی یہاں توفیق یا ارادہ یا اعلام احکام کے ہیں۔ باعلامه ایاکم سبیله وطریقه (ابن جریر) اے قضائه وقدره وارادته (معالم) بتیسیر الله و توفیقه للعمل (کشاف) ۸۲۲ (اور نصیحت پر عمل کر کے جنت و مغفرت کے حقدار بن جائیں) ۸۲۳ یعنی عورت کے زمانہ خاص میں اس سے ہمبستری کا حکم۔ قرآن زندگی کا مکمل دستور العمل ہے۔ وہی زندگی جس میں کھانا، پینا، سونا، جنسی خواہش کا پیدا ہونا، بچہ کا باپ یا ماں بننا سب کچھ داخل ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ جو کچھ بھی تعلق تعمیر سیرت سے رکھتا ہے اس کی بابت ہدایات و احکام وہ لازمی طور پر دیگا۔ وہ محض "بزرگانہ ملفوظات" کا مجموعہ نہیں۔ معاشیات، معاشرت، اخلاقیات، قانون، غرض انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کے ضروری ابواب کا ذکر ناگزیر ہے۔ خدانخواستہ ایسا نہ ہوتا، تو اس ہدایت نامہ کی جامعیت و کاملیت پر حرف آجاتا۔ مَحِيْض ۔ مصدر میمی ہے حیض کے مرادف ۸۲۴ (جیسا کہ دنیا میں عموماً دوسری قوموں نے بھی سمجھا ہے اور سامی نسل والوں نے علی الخصوص) طب قدیم و جدید دونوں کو مسلم ہے کہ یہ ایک خاص قسم کا ناقص خون ہے، رنگ و بو و ترکیب میں عام خون سے الگ۔ ۸۲۵ اِعْتَزِلُوْا ۔ یہ اعتزال یا عورتوں کو چھوڑے رہنے کا حکم صرف ہمبستری کے عمل خاص تک محدود ہے۔ مجالست و مواکلت وغیرہ عام معاشرت سے اس کا تعلق نہیں۔ بعض قوموں میں عورتیں اپنے اس زمانہ میں نہ دوسروں کے ساتھ کھا پی سکتی ہیں، نہ لیٹ بیٹھ سکتی ہیں۔ بعض قوموں میں اس زمانہ میں عورت کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ بعض مشرک قوموں میں یہ دستور ہے کہ اس زمانہ میں عورت کو میلے کچیلے کپڑے پہنا کر گھر کے ایک الگ گوشہ میں اچھوت بنا کر بٹھادیا جاتا ہے۔ غرض دوسری قوموں نے عام طور پر اس طبعی ناپاکی سے متعلق بہت مبالغہ آمیز تخیل قائم کرلیا ہے۔ شریعت اسلامی میں اس قسم کے کوئی امتناعی احکام موجود نہیں۔ ۸۲۶ مشرک قوموں نے اس باب میں جو سختیاں روا رکھی ہیں، ان سے قطع نظر خود توریت کے قانون کا تشدد بھی اس باب میں اپنی مثال آپ ہے۔ عورت اپنے ایام ماہوار کے زمانہ میں خود ہی ناپاک نہیں ہوتی بلکہ جو شخص یا جو چیز بھی اس سے چھو جاتی ہے، وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے اور سلسلہ در سلسلہ یہ ناپاکی متعدی ہوتی جاتی ہے۔ "جو کوئی اسے چھوئے گا شام تک نجس رہے گا ...... اور جو کوئی اس کے بستر کو چھوئے، اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک ناپاک رہے ...... اور جو کوئی اس چیز کو جس پر وہ بیٹھی ہے چھوئے، اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے نہائے اور شام تک ناپاک رہے ...... اگر مرد اس کے ساتھ سوتا ہو اور اس کی نجاست اس پر ہو تو وہ سات دن تک ناپاک رہیگا، اور ہر ایک بستر جس پر وہ مرد سوئے گا، ناپاک ہو جائے گا" (احبار ۱۵: ۱۹-۲۴) یہ احکام تو خود توریت کے ہوئے۔ باقی فقہاء یہود تو اپنے تشددات میں ان حدود سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور ایسی ایسی قیدیں بیچاری عورت پر عائد کر دی ہیں کہ گویا وہ عورت نہیں ہے کوئی بلا ہے۔ ملاحظہ ہو جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۱ نیز ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل، جلد ۴ صفحہ ۸۲۵۔ ۸۲۷ یعنی خون نجس کا آنا بالکل بند ہو جائے، اور عورت غسل کرلے شریعت میں یہ غسل واجب ہے۔ ۸۲۸ یعنی جائز و فطری طریق کے مطابق۔ اس عام و فطری طریق قربت کے علاوہ حصول لذت کے اور سارے طریقے ناجائز ہیں۔ ۸۲۹ التَّوَّابِيْنَ ۔ تواب ہیں اس سیاق میں وہ لوگ ہیں جن سے قوانین بالا کے باب میں کوئی اتفاقی خلاف ورزی ہو جائے، اور وہ بعد کو توبہ کریں، اور اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۔ متطہرین اس سیاق میں وہ لوگ ہیں جو عورت کی مواصلت سے اس کی طبعی ناپاکی کے زمانہ میں محترز رہتے ہیں۔ اسی لفظ سے فقہاء نے اشارة النص سے یہ استنباط کیا ہے کہ جو اعمال صریحاً نجس ہیں (مثلاً اغلام) وہ سب حرام ہیں۔ صفائی و طہارت کی یہ روح قرآنی عام ہے۔ اور اس کے تحت میں جسمانی اور ظاہری صفائی پوری طرح آجاتی ہے۔ اسلام کی اس لطافت پسندی، نظافت پسندی، طہارت پسندی کے مقابلہ میں دوسرے سرے پر وہ مذاہب ہیں جن میں قرب حق کا ذریعہ صفائی کو نہیں، عین جسمانی گندگی، کثافت و غلاظت کو قرار دیا گیا ہے۔ مشرک قوموں میں جو فرقے "اگھور پنتھی" کے نام سے ہیں، ان کے تفصیلی ذکر سے تو ان صفحات کو نجس کرنے کی جرأت نہیں، خود مسیحیت کی تاریخ میں صدیوں تک راہبوں کے لئے غسل یا جسم کی شست و شو ایک مستقل معصیت رہی ہے۔ ۸۳۰ (کھیت کہتے ہیں اس موضع زمین کو جس میں تخم ریزی ہوتی ہے اور اس میں سبزی، غلہ، نباتات کا نشوونما ہوتا ہے۔ کھیت والے اسے اپنی بہت بڑی دولت سمجھ کر نہایت درجہ عزیز رکھتے اور اس سے خوب نفع حاصل کرتے ہیں۔ اسلام نے ہمبستری کا اصل مقصد طلب اولاد ہی کو رکھا ہے، گو اس کے دوسرے پہلو یعنی طلب لذت کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔ ۸۳۱ (اس تشبیہ اور اس کے مضمرات کو خوب سوچ سمجھ کر) فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ ۔ کنایہ ہے عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے۔ اور قرآن حکیم ایسے موقعوں پر اکثر کنایہ ہی سے کام لیتا ہے۔ فقہاء مفسرین نے یہیں سے استنباط کیا ہے کہ ہر ایسے موقع پر مسلمان کو بھی چاہیئے کہ حتی الامکان بات اشارہ کنایہ ہی میں کہے۔ فأتوا حرثکم من الکنایات اللطیفة والتعریضات المستحسنة فعلی کل مسلم ان یتأدب بها ویتکلف مثلها فی المحاورات والمکاتبات (مدارک) حَرْثَكُمْ ۔ کھیت کا یہ جواب خوب ملحوظ رہے۔ اتیان یا داخلہ کھیت ہی میں ہونا چاہیئے۔ قبول تخم کے موضع یا عضو میں ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اس کے علاوہ یا اس سے خارج کسی اور موقع و محل میں۔ اے نساءکم مزرع اولادکم فأتوا مزرعکم کیف شئتم واین شئتم (ابن جریر) اَنّٰى ۔ انی کے مشہور و معروف معنی کیف اور این کے ہیں یعنی جس طرح کے جس کیفیت کے ساتھ کے، اور جدھر سے جس جہت سے۔ للبحث عن الحال والمکان (راغب) هو بمعنی این وکیف (راغب) قرآن مجید میں انی کیف کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً اَنّٰى يُحْيِيْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ یہاں انی یحیی صاف کیف یحیی کے معنی میں ہے۔ یا پھر اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ ۔ اس آیت میں بھی قرآنیات کے بہترین ماہرین، ابن عباس صحابی نے اور مجاہد، قتادہ، عکرمہ وغیرہ تابعین نے انی کو اسی معنی میں لیا ہے۔ یاتیھا کیف شاء (ابن جریر عن ابن عباس وعکرمہ ومجاہد) اے کیف شئتم (ابن جریر عن السدی) انی حرف استفهام یکون سوالاً عن الحال والمحل معناه کیف شئتم وحیث شئتم بعد ان یکون فی صمام واحد (معالم) گویا یہاں صاف رد ہورہا ہے یہود کا جو مباشرت کی صرف ایک ہی وضع و ہیئت کو جائز سمجھتے تھے اور باقی سب کو ناجائز۔ متعدد آثار و روایات اسی مضمون کے تفسیروں میں منقول ملیں گے۔ اور آیت میں بتایا جارہا ہے کہ کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، چت لیٹے، پٹ لیٹے، کروٹ کے بل لیٹے کی ساری ہیئتیں جائز ہیں۔ اے کیف شئتم من قیام و قعود واضطجاع واقبال وادبار (جلالین) دوسرے معنی انی کے این کے یعنی جدھر کے جس رخ کے ہیں۔ اور اس معنی کو لے کر بعض گندہ مذاق لوگوں نے اس کی تشریح میں اپنی گندہ ذہنی کے عجیب عجیب مظاہرے کئے ہیں حالانکہ ظاہر ہے کہ موضع و محل میں کسی تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ابن کثیر نے تو اس معنی پر ابو حنیفہ و شافعی و احمد بن حنبل جیسے ائمہ فقہ اور ان کے شاگردوں اور بہت سے تابعین کا اجماع نقل کر کے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس معنی سے تجاوز کر کے جواز ڈھونڈھنے والوں کا ان تمام علماء و فقہاء نے شدت سے انکار کیا ہے بلکہ بعض نے تو اس تجاوز کو کفر کے حکم میں داخل کر دیا ہے۔ انھم انکروا ذلک اشد الانکار ومنھم من یطلق علی فعله الکفر وھو مذھب جمہور العلماء۔ موضع و مکان تو بہر حال متعین ہے۔ آزادی صرف اسی موضع و مکان میں دخلہ کیلئے ہر رخ، ہر جہت کی دی جارہی ہے۔ اے علی ای شق من الاحوال وذلک فی مکان الحرث (کبیر) سئل ابن عباس عن الذی یأتی امرأته فی دبرها فقال هذا یسألنی عن الکفر (احمد عن ابن عباس) حیث شئتم وای وجه احببتم (ابن جریر) لیکن ان دو معروف و متداول معنوں کے علاوہ انی کے ایک تیسرے معنی متی یعنی جب اور جس وقت کے بھی نقل ہوئے ہیں۔ گویا انی یہاں ظرف زمان کے طور پر استعمال ہوا ہے ضحاک تابعی اور بعض محققین قرآن اس طرف گئے ہیں۔ انی بمعنی متی قال الضحاک (مدارک) اے متی شئتم (ابن جریر عن ضحاک) اے فی ای زمان اردتم (روح) متی شئتم من لیل ونھار (کبیر) ای وقت شئتم من اوقات الحل (کبیر) انی شئتم من اللیل والنھار (ابن جریر عن ابن عباس) جس خدا کی بنائی ہوئی دنیا کی عملی زندگی میں اس قسم کے سوالات و مسائل روزمرہ پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں، اسی خدا کے اتارے ہوئے ہدایت نامہ میں اگر ان سے متعلق ہدایات و احکام نہ ہوتے تو بہت عجیب سی بات ہوتی۔ ۸۳۲ آیندہ کیلئے کچھ بھیجنے کی چیز عمل صالح ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ گویا اسکی تاکید ہے کہ عین لذت و التذاذ کے شغلوں کے وقت بھی اپنی عبدیت کو، اپنی ذمہ داری کو بھول نہ جاؤ۔ تمامتر لذت پرستی ہی میں غرق نہ ہو جاؤ، بلکہ ہو سکے تو اپنی لذتوں کو بھی عین طاعت و عبادت بنالو۔ ۸۳۳ اگر اسی کا استحضار ہر تقوی و خشیت کو آسان بنادیگا۔ آیت میں تعلیم اسکی ہے کہ مومن کے ہاتھ سے تقوی الہی کا سر رشتہ کسی حال میں نہ چھوٹنے پائے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔ یعنی ہر حال میں، ایام حیات کے ہر ہر لمحہ میں تقوی الہی پر قائم رہو۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۔ قرآن مجید صرف احکام ہی نہیں دیتا، بلکہ وہ طریقہ اور تدبیر بھی بتاتا جاتا ہے جن سے ان احکام پر عمل آسان ہو جائے۔ حکم ابھی تقوی الہی کا ملا ہے اور اب اسکی آسان تدبیر ارشاد ہو رہی ہے کہ وہ لقاء آخرت کا استحضار ہے۔ واعلموا سے محض جان لینا مراد نہیں، بلکہ اس علم کو ہر وقت تازہ رکھنا مراد ہے۔ ۸۳۴ (اے پیغمبر!) یہاں جو اہل ایمان مراد ہیں، انکے صفات ابھی اوپر بیان ہو چکے ہیں کہ وہ اعمال صالحہ کا اہتمام رکھتے ہیں (وقدموا لانفسکم) اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں (واتقوا اللہ) اور جزا و سزا کا عقیدہ تر و تازہ رکھتے ہیں (واعلموا انکم ملقوه) ۸۳۵ عرب جاہلیت کے جاہلانہ دستوروں میں سے ایک دستور یہ تھا کہ خدا کی قسم کھا کر یہ بیٹھتے تھے کہ ہم فلاں فلاں کام نیکی کا، تقوی کا، اصلاح خلق کا نہ کریں گے۔ اور جب کوئی کہتا تو یہی عذر پیش کر دیتے کہ ہم تو اسکی قسم کھا چکے ہیں۔ ان اعمال خیر کا ترک یوں بھی ہر صورت میں مذموم تھا، چہ جائیکہ حضرت حق کے اسم بزرگ اور اسکی قسم کو بجائے قرب حق کے اس سے دوری کا ذریعہ بنایا جائے! —— آیت اسی شعار جاہلی کی تردید میں ہے۔ عُرْضَةً کے عام و متداول معنی ہدف یا نشانہ کے ہیں اور بعض نے یہاں بھی یہی معنی لکھے ہیں۔ عرضة لایمانکم اے نصبا لها (جریر) جعلته

عرضۃ لکثا نصیبۃ لاذا قاریء) لیکن ایک دوسرے معنی حجاب یا مانع کے بھی ہیں اور یہاں یہی زیادہ چسپاں ہیں۔ اے حاجزًا لما حلفتم علیہ (کشاف) قالوا العرضۃ عبارۃ عن المانع (کبیر) فقہاء نے جا ضرورت اور کثرت سے قسمیں کھاتے رہنے کو یوں بھی ناپسند کیا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے نام کی بے توقیری ہو جاتی ہے چہ جائیکہ قصدًا جھوٹی قسمیں کھانا! ۸۳۶ سَمِيعٌ۔ خوب سننے والا ہے تمہارے اقوال کا۔ اسلئے ہر بات سوچ سمجھ کر زبان سے نکالو۔ عَلِيمٌ۔ خوب جاننے والا ہے تمہارے احوال کا۔ اسلئے نیت میں ہر وقت اخلاص رکھو۔ ۸۳۷ یعنی گرفت اُن قسموں پر ہوگی جن میں جھوٹ کی آمیزش بالقصد کی گئی ہے۔ آخرت میں بھی انہی پر دارو گیر ہے، اور دنیا میں بھی ان کے لئے کفارہ ہے۔ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ۔ مراد ان قسموں سے ہے، جو ناواقفیت کی بنا پر یا بے خیالی میں محض عادۃً زبان سے نکل جاتی ہیں، اور جھوٹ کی آمیزش ان میں بلا قصد ہو جاتی ہے۔ فقہاء نے اسی نوعیت کی ساقط الاعتبار قسموں کی کئی قسمیں کی ہیں۔ ان کا تعلق ماضی کے اتفاقات سے بھی ہو سکتا ہے اور آیندہ کے ارادوں سے بھی۔ اُن کی تفصیلات اور ان کے احکام کتب فقہ میں ملیں گے۔ ۸۳۸ غَفُورٌ۔ وہ بڑا بخشنے والا ہے، چنانچہ اسی شان غفر کا تقاضہ ہے کہ اُس نے لایعنی قسموں پر مواخذہ کو معاف کر دیا۔ حَلِيمٌ۔ وہ بڑا بردبار ہے۔ چنانچہ اسی شان حلم کا تقاضہ ہے کہ اس نے ارادی جھوٹی قسموں پر بھی سزا فوراً نہ دی بلکہ قیامت تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ ۸۳۹ ایلاء۔ عرب جاہلی کا ایک شعار یہ بھی تھا کہ شوہر غصہ میں آکر قسم کھا بیٹھتے تھے کہ اپنی بیویوں سے ہمبستری نہ کریں گے۔ اصطلاح میں اس کو ایلاء کہتے ہیں۔ لاخلاف انہ قد انضرب فیہ الیمین علی ترک الجماع (جصاص) شریعتِ اسلامی نے اس میں جو اصلاحیں کیں، اور اس باب میں جو احکام دیئے یہاں ان کا ذکر ہے۔ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ۔ عرب جاہلی ایلاء کر لینے کے بعد جو ایک طرح کی طلاق ہی تھی، بیوی کے نان نفقہ اور ہر قسم کے دوسرے حقوق سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔ اسلام نے اس کی ایک اصلاح یہ کی کہ اس کو خلع نکاح یا فسخ نکاح کا مرادف نہیں، بلکہ اس کی صرف تمہید قرار دے کر غور و فکر کے لئے ایک مدت مقرر کر دی۔ اور پھر اس مدت کی میعاد چار مہینے کی رکھی جو اس کے لئے بالکل کافی ہے کہ سارے پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیا جائے۔ ۸۴۰ فَإِن فَاءُوا۔ یعنی اگر رجوع کر لیں اپنے قصد ترک تعلق سے، اور رشتۂ نکاح کو برقرار رکھیں۔ الفئ الرجوع الی الشئ (جصاص) غَفُورٌ بڑا مغفرت والا ہے، چنانچہ ایسی قسم توڑنے کا گناہ ایک خفیف سے کفارہ کے بعد معاف کر دے گا۔ رَّحِيمٌ بڑا مہربان ہے، چنانچہ شوہر جب از سرِنو اپنے حقوق پر متوجہ ہو گیا ہے، اس پر وہ رحمت سے نظر کرے گا۔ ۸۴۱ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ۔ یعنی دل کے غور و فکر کے بعد بھی، طلاق نام ہے زن و شو کے باہمی تعلق کے باضابطہ و کامل انقطاع کا۔ اسلام سے قبل دنیا میں طلاق سے متعلق عجب افراط و تفریط قائم تھی۔ افراط یہود کے ہاں تھی اور تفریط مسیحیوں کے ہاں۔ یہود کے ہاں نہ کوئی قید طلاق پر عائد تھی، نہ شوہر پر اس باب میں کوئی ذمہ داری تھی۔ اُس کا جب جی چاہتا، وجہ بلاوجہ، بس ایک طلاق نامہ لکھ کر بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا۔ بیوی اسی وقت دوسرا مرد کر سکتی تھی۔ توریت کے قانون کے الفاظ یہ ہیں۔ ”اگر کوئی مرد کوئی عورت لے کے اس سے بیاہ کرے، اور بعد اس کے ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو، اس سبب سے کہ اس نے اس میں کوئی پلید بات پائی، تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کے اُس کے ہاتھ دے، اور اسے اپنے گھر سے باہر کرے۔ اور جب وہ اس کے گھر سے نکل گئی، تو جا کے دوسرے مرد کی ہو رہے“ (استثناء ۲۴: ۱، ۲) اُس آزادی اور بے قیدی کے مقابلہ میں مسیحیوں نے یہ سختی اور تنگی اختیار کی کہ زن و شو میں علیحدگی کی کوئی گنجائش ہی نہ رکھی۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں۔ ”جسے خدا نے جوڑا ہے اُسے آدمی جدا نہ کرے۔ ..... جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے، وہ اُس پہلی کے خلاف زنا کرتا ہے۔ اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے، اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے“ (مرقس ۱۰: ۹۔ ۱۲) ”میں نہیں بلکہ خداوند حکم دیتا ہے کہ بیوی شوہر سے علیحدہ نہ ہو“ (۱۔ کرنتھیوں ۷: ۱۰) چنانچہ مسیحی آبادی کے سوادِ اعظم یعنی فرقۂ کیتھولک کے ہاں تو طلاق مطلقاً ناجائز ہے۔ اور بجز موت کے کوئی صورت میاں بیوی میں افتراق کی ممکن نہیں۔ اور یہی فرقہ اسلام سے قبل موجود تھا۔ پروٹسٹنٹ فرقہ ظہورِ اسلام سے صدیوں بعد پیدا ہوا۔ اس کے ہاں البتہ اجازت ہوئی ہے۔ لیکن صرف اس صورت میں کہ پہلے عدالت میں کسی ایک فریق کا ارتکابِ زنا یا ظلم و جبر ثابت ہو لے! یہ حال اُن قوموں کا تھا جو اہلِ کتاب تھیں۔ یعنی بہرحال اُن کے قانون کی بنیاد آسمانی کتابوں ہی پر تھی۔ رہیں قدیم جاہلی اور مشرک ”مہذب“ ”ترقی یافتہ“ قومیں۔ سو ایک طرف یونانیوں، ہندوؤں میں، اور ایک عرصہ تک رومیوں میں طلاق کا کوئی وقوف ہی نہ تھا۔ بلکہ ہندو مذہب میں تو آج تک طلاق ناجائز چلی آرہی ہے۔ گو حالات سے مجبور ہو کر اُس کے جائز کرانے کے آج چرچے زور و اگر یزی ہندوستان میں بھی اور ریاستوں میں بھی کاونسلوں اور اسمبلیوں میں لگائے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف رومیوں میں عہدِ جمہوریت کے خاتمہ پر طلاق کے جائز ہونے کے ساتھ ہی اس کا جو زور بندھا تو گویا شرافت اور طلاق لازم و ملزوم ہو گئے! دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذہبوں اور بڑی بڑی ”مہذب“ قوموں کی یہ بے اعتدالیاں اور افراط و تفریط پیشِ نظر رہیں، جب جا کر شریعتِ اسلام کی حکمتوں اور اس کے پیدا کئے ہوئے توازن و اعتدال کی قدر ہوگی۔ اسلام نے فطرتِ بشری کا بالکل صحیح اندازہ کرکے یہ حکم دیا کہ جب زوجین میں ناموافقت لاعلاج حد تک پہنچ جائے، اور اس ناموافقت کے اسباب کا احاطہ و استقصاء ممکن ہی نہیں، ہر شخص کے لئے کہنا چاہئے کہ الگ الگ ایک سبب و محرک ہوتا ہے، اور دوسری صورتیں موافقت پیدا کرنے کی ناکام ہو لیں، تو آخری علاج یہ ہے کہ فریقین جنسی خوشی اور باضابطہ معاہدۂ نکاح کو فسخ کرکے ایک دوسرے سے مستقل علیحدگی اختیار کر لیں۔ اور اسی کا اصطلاحی نام طلاق ہے۔ اور اس انقطاعی عمل کو بھی مطلق نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس پر متعدد پابندیاں بھی عائد کر دی ہیں۔ آگے ذکر انہیں قیود و شرائط کا آئے گا۔ ۸۴۲ اس لئے خوب اپنی ذمہ داری محسوس کرکے عمل کا کوئی قدم اٹھاؤ۔ سَمِيعٌ۔ وہ تو بڑا سننے والا ہے۔ اس لئے زن و شو کے ظاہر قول کو اور شوہروں کی قسموں کو، سب کو سنتا رہتا ہے۔ عَلِيمٌ۔ وہ بڑا جاننے والا ہے۔ اس لئے زن و شو کے دلوں کے اندر کی مخفی باتوں کو جانتا ہے، اُن کے ارادوں سے واقف ہے، اور ان کے مناسبِ حال ہی حکم دیتا ہے۔ آیات کے آخر میں صفاتِ باری کا اثبات محض یوں ہی اٹکل سے نہیں ہوتا۔ ہمیشہ پُر معنی اور سیاقِ کلام کے لحاظ سے بلیغ ہی ہوتا ہے۔ یہاں مقصود زن و شو کو، خصوصاً شوہروں کو، ان کی ذمہ داریوں پر متنبہ کرنا ہے، اس لئے انہی صفاتِ باری کا لانا نہایت موزوں و مناسب ہوا۔ ۸۴۳ دوسرے نکاح سے، الْمُطَلَّقَاتُ۔ لفظی معنی کے اعتبار سے ہر طلاق یافتہ عورت کے لئے وسیع ہے۔ لیکن یہاں مراد صرف اُن بیویوں سے لی گئی ہے جو آزاد ہوں، کنیز شرعی نہ ہوں، بالغ ہوں (نابالغ نہ ہوں) اور جن سے خلوتِ صحیحہ ہو چکی ہو (غیر ممسوس نہ ہوں)۔ یہاں احکام صرف انہی آزاد و شوہر دیدہ بیویوں سے متعلق بیان ہوں گے، دوسری قسم کی عورتوں کے طلاق کے احکام دوسرے مقامات پر ملیں گے۔ المراد المدخول بھن من ذوات الاقراء (مدارک) لان ذوات الاقراء من الحرائر المدخول بھن (روح) يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ۔ اپنے کو روکے رہیں۔ یہ نہ ہو کہ ادھر شوہر نے طلاق دی، اور اُدھر بیوی نے فوراً دوسرا شوہر کر لیا۔ یہ پہلی پابندی طلاق پر عائد ہوئی۔ اس سے پہلے نکاح سے آزادی کے بعد تعطل کا زمانہ ہے، اسے اصطلاحِ شریعت میں عدت کہتے ہیں۔ عورت کے لئے انتظار کی اس مدتِ معین میں متعدد حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ ایک طرف تو شوہر کو ٹھنڈے دل سے غور و فکر کا پورا موقع مل جاتا ہے، دوسری طرف عورت کے حمل کی بابت پوری تحقیق ہو جاتی ہے۔ دوسرے مذہب اور دوسری قومیں سب شریعتِ اسلامی کے قائم کئے ہوئے زمانۂ تعطل و وقفہ کے مصالح و فوائد سے محروم ہیں! ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ۔ قرء کے لفظی معنی محض ایک زمانۂ معلوم یا مدتِ معین کے ہیں۔ اصل القرء فی کلام العرب الوقت (ابن قتیبہ) اھل اللغۃ اتفقوا علی ان القرء الوقت (ابن العربی) لیکن اس سے میعاد کا آغاز بھی مراد ہو سکتا ہے اور میعاد کا اختتام بھی۔ دونوں مفہوم ایک دوسرے کے متضاد ہیں، لیکن لغتِ عرب میں دونوں ہی مستعمل ہیں۔ قال ابو عبیدۃ الاقراء من الاضداد فی کلام العرب (کبیر) واصل القرء فی کلام العرب الوقت لمجیء الشئ المعتاد مجیئہ لوقت معلوم ولادبار الشئ المعتاد ادبارہ لوقت معلوم (ابن جریر) کلمۃ محتملۃ للطھر والحیض (ابن العربی) اسی لئے یہاں بھی اہلِ شرح و تفسیر کے دو گروہ ہوئے ہیں۔ ایک جماعت نے معنی طہر یا پاکی قرار دیئے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے یہی معنی مروی ہیں، اور امام شافعیؒ اسی طرف گئے ہیں۔ قالت عائشۃ الاقراء الاطھار (جصاص) والمراد بالقرء عند الشافعی الانتقال من الطھر الی الحیض (روح) لیکن دوسری طرف حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو موسیٰؓ جیسے تیرہ صحابیوں کا قول یہ نقل ہوا ہے کہ یہاں قرء، حیض یا ناپاکی کے معنی میں ہے (جصاص) اور یہی قول امام ثوری، امام اوزاعی، امام ابو حنیفہ اور تمام فقہائے حنفیہ کا ہے۔ قال اصحابنا جمیعًا الاقراء الحیض وھو قول الثوری والاوزاعی والحسن بن صالح (جصاص) اور ائمۂ لغت و لسان سے بھی سند اس معنی کی زیادہ مل رہی ہے۔ یقال اقرءت المرأۃ اذا حاضت ذکرہ الاصمعی والکسائی والفراء (جصاص) قرأت المرأۃ رأت الدم واقرأت صارت ذات قرء (راغب) والقرء فی الحقیقۃ اسم للدخول فی الحیض عن طھر (راغب) ثلاثۃ قروء ای ثلاثۃ احیاض وقول من الطھر و فی الحیض۔ اور فقہائے حنفیہ نے حدیثِ نبوی سے قرء کے اس مفہوم کی شہادت

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٤﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي

بڑا سننے والا، بڑا جاننے والا ہے ۔ اللہ تمہاری قسموں میں سے لایعنی قسم پر مواخذہ نہ کرے گا

أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ

البتہ تم سے اُس (قسم) پر مواخذہ کرے گا جس پر تمہارے دلوں نے قصد کیا ہے

وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٢٥﴾ لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن

اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے، بڑا بُردبار ہے ۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے (ہمبستری کرنے کی) قسم

نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ۖ فَإِن فَاءُوا

کھا بیٹھے ہیں، اُن کے لئے مہلت چار ماہ تک ہے ۔ پھر اگر یہ لوگ رجوع

فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَإِنْ عَزَمُوا

کر لیں تو اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے ۔ اور اگر طلاق (ہی) کا پختہ ارادہ

الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٧﴾ وَالْمُطَلَّقَاتُ

کر لیں تو بیشک اللہ بڑا سننے والا، بڑا جاننے والا ہے ۔ اور طلاقیں دی ہوئی عورتیں اپنے کو

يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ

تین میعادوں تک روکے رہیں ۔ اور ان کے لئے یہ

لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ

جائز نہیں کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو پیدا کر رکھا ہے اُسے وہ چھپائے رکھیں

إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ

اگر وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں ۔ اور ان کے شوہر ان کے واپس لے لینے کے

١

اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا ؕ

اس (مدت) میں زیادہ حقدار ہیں۸۴۶ بشرطیکہ اصلاح حال کا قصد رکھتے ہوں ۸۴۷

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ

اور عورتوں کا (بھی) حق ہے جیسا کہ عورتوں پر حق ہے۸۴۸ موافق دستور (شرعی) کے۸۴۹ اور مردوں کو

عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾ اَلطَّلَاقُ

ان کے اوپر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۸۵۰، اور اللہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے۸۵۱ طلاق تو دو ہی

۲۸ ع ۱۲

مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

بار کی ہے۸۵۲ اس کے بعد (یا تو) رکھ لینا ہے قاعدے کے مطابق یا پھر خوش عنوانی کے ساتھ چھوڑ

وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا

دینا ہے۸۵۳ اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو مال تم انہیں دے چکے ہو اُس میں سے کچھ واپس لو۸۵۴

اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ

ہاں بجز اس صورت کے کہ جب اندیشہ ہو کہ اللہ کے ضابطوں کو دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے۸۵۵ سو اگر تم کو یہ اندیشہ ہو

اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا

کہ تم اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکو گے۸۵۶ تو دونوں پر اس (مال) کے باب میں کوئی گناہ نہ ہوگا،

افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ

جو عورت معاوضہ میں دیدے۸۵۷ یہ سب اللہ کے ضابطے ہیں سو ان سے باہر نہ نکلنا،

وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

اور جو کوئی اللہ کے ضابطوں سے باہر نکل جائیگا، سو ایسے ہی لوگ تو (اپنے حق میں) ظلم کرنے والے ہیں۸۵۸

منزل ١

بہم پہنچائی ہے۔ (ملاحظہ ہو جصاص، جلد اول ص ۳۴۳)۔ بہر حال حنفیہ کے ہاں کا متفقہ مسئلہ یہی ہے کہ عورت اپنے تین ایام ماہواری کے آنے تک اپنے کو عدت میں سمجھے، اور اس مدت میں نکاح ثانی اپنے لئے جائز نہ سمجھے ۸۴۴ اس لئے کہ چھپانے کی یہ کوشش زمانہ عدت کے شمار و حساب میں خلل انداز ہوگی، اور اس طرح شریعت نے جو مصلحتیں اس کے اندر رکھی ہیں وہ ضائع ہو کر رہیں گی۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ میں مَا کا لفظ عام ہے۔ رحم کے اندر جو چیز بھی ہو، جاندار بچہ ہو، یا ایام ماہواری کا خون ہو، دونوں پر شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ حمل قائم ہو چکا ہو خواہ ایام ماہواری کا دور چل رہا ہو، کوئی بھی صورت حال ہو اُسے چھپانا نہ چاہیئے ۸۴۵ دُنیا کے ہر علم و فن کا یہی حال ہے کہ وہ جس درجہ مکمل و منظم ہوگا، اُسی قدر اس کا ہر جزو دوسرے اجزاء سے مربوط و مرتبط ہوگا۔ شریعت اسلامی جملہ دینی علوم و فنون سے منظم تر ہے۔ اس لئے قدرۃً اس کے کسی معمولی جزئیہ کی طرف سے بھی بے التفاتی، دوسرے اجزاء احیات پر لازمی طور پر مؤثر ہوگی۔ آیت کا یہ جزو بڑھا کر گویا یہ تاکید و تصریح کر دی ہے کہ جس کسی کو اللہ کی ہمہ گیر حکومت اور آخرت کی بازپرس کا پورا عقیدہ ہے اس کی یہ شان نہیں کہ ایک جزئیہ کی بھی خلاف ورزی کی دانستہ جسارت کرے ۸۴۶ اور یہ واپسی بلا تجدید نکاح ہو جائے گی۔ فِیْ ذٰلِكَ ۔ یعنی تین مہینے کی میعاد و مدت کے اندر۔ اے فی ذلک التربص (مدارک) اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ ۔ اس کا اشارہ یہی نکلتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اُسے پختہ نہ ہونے دے، اور میاں بیوی از سرِ نو آباد ہو جائیں۔ طلاق کو شریعت الٰہی نے صرف ضرورت کے موقع پر بطور علاج اور آخری تدبیر کے جائز رکھا ہے، خواہ مخواہ اس کی ترغیب نہیں دی ہے، اور نہ بلا ضرورت اسے پسند فرمایا ہے؛ اور حدیث نبوی میں جو اسے ابغض المباحات سے تعبیر فرمایا ہے، یعنی اللہ کی قانوناً جائز ٹھہرائی ہوئی چیزوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسند، وہ اسی حقیقت کی ترجمانی ہے۔ تین مہینے کی مدت غور و فکر کے لئے اور ناگواری و بیزاری کے ہنگامی جذبات کے سرد پڑجانے کے لئے، بہت ہوتی ہے۔ اس اثناء میں اگر شوہر بیوی کو واپس لینا چاہے، تو طلاق کو قول یا عمل سے منسوخ کر سکتا ہے، اور اسی کو اصطلاح میں رجعت کہتے ہیں ۸۴۷ اس رجوع و رجعت سے۔ نیت کر فسخ طلاق سے مزید اذیت رسانی مقصود ہو۔ اگرچہ رجعت کا نفاذ قانونی و ظاہری ہر صورت ہو جائیگا، قانونی احکام اور اخلاقی ہدایات دو الگ الگ چیزیں ہیں، قانونِ ظاہری کا نفاذ اسی دنیا تک ہے۔ مومن کو اپنا معاملہ حق تعالیٰ سے درست رکھنا چاہیئے، کہ اجر و ترقی درجات کا مدار اسی پر ہے۔ اسی لئے قانونی احکام کے بیچ بیچ تصحیح نیت و اخلاص کی تاکید برابر آتی جاتی ہے۔ ۸۴۸ یہ قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اتنا بڑا مضمون اتنے مختصر سے فقرہ میں آگیا۔ اردو میں یہ مضمون یوں ادا ہوگا۔ جس طرح مردوں کا حق عورتوں پر ہے، اُسی طرح عورتوں کا حق بھی مردوں پر ہے۔ گویا دنیا کو یہ بتایا ہے کہ یہ سمجھو کہ بس مردوں کے حقوق عورتوں پر اور شوہروں ہی کے حقوق بیویوں پر ہوتے ہیں، نہیں، بلکہ اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق مردوں پر اور بیویوں کے حقوق بھی شوہروں کے ذمہ عائد ہوتے ہیں۔ حقوقِ نسواں کا یہ نام عرب کے ایک اُمی کی زبان پر اُس وقت لایا جا رہا ہے، جب کہ دُنیا کی دُنیا اس تخیل سے ناواقف تھی اور یہودیت و نصرانیت کی مذہبی دنیا میں تو عورت گویا ہر بُرائی کا سرچشمہ تھی، اور ذلت و حقارت کا ایک مرقع۔ یہود کی معتبر و مستند جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ہے۔ "معصیتِ اوّل چونکہ بیوی ہی کی تحریک پر سرزد ہوئی تھی، اس لئے اس کو شوہر کا محکوم کر کے رکھا گیا، اور شوہر اس کا حاکم ہے۔ شوہر اس کا مالک و آقا ہے اور وہ اس کی مملوکہ ہے۔" (جلد ۵ ص ۵۰۰) اور مسیحی دنیا سے متعلق، مسٹر لیکی Lecky فرنگی مسیحی اپنی تاریخ اخلاق یورپ History of European Morals میں لکھتے ہیں "عقیدہ یہ تھا کہ عورت جہنم کا دروازہ ہے اور تمام آفاتِ بشری کا باعث ہے۔ اُسے اپنے کو ذلیل سمجھتے رہنے کے لئے یہی وجہ کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔" (جلد ۲ ص ۳۵۷) یہ حال وقت کے اونچے اونچے مذہبوں کا تھا، شرک و جاہلیت کے پست مذہبوں کا ذکر ہی بے کار ہے۔ اور خود ملک عرب کا یہ حال تھا کہ عورتیں گویا انسان نہیں، جانور یا جائداد ہیں، کہ شوہر کے بعد بیویاں بھی ترکہ میں سوتیلے بیٹوں کی ملک و تصرف میں آنے لگی تھیں۔ مِثْلُ الَّذِیْ ۔ یہ مثلیت و مماثلت کس لحاظ سے ہے؟ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے نہیں، بلکہ نفس وجوب کے لحاظ سے ہے۔ والمراد بالمماثلۃ الواجب فی کونہ حسنۃ لا فی جنس الفعل (کشاف) اے فی الوجوب واستحقاق المطالبۃ علیہا (بیضاوی) یعنی شوہر کہیں اس بھول میں نہ پڑ جائیں کہ اُن کے صرف حقوق ہی حقوق ہیں اور فرائض کچھ نہیں۔ فرائض ان پر بھی اسی طرح عائد ہوتے ہیں جس طرح ان کی بیویوں پر۔ اسی طرح بیویاں بھی کہیں اس افراط "روشن خیالی" میں نہ مبتلا ہو جائیں کہ خدمت کرنا ہمارا کام نہیں، یہ کام سب مردوں کا ہے، ہمارا کام خدمت لینا ہے ۸۴۹ لیکن حقوق باہمی کا آخر معیار کیا ہے؟ آیت کا یہ ٹکڑا اسی سوال کا جواب ہے۔ یعنی ان حقوق کے جزئیات و تفصیلات کو شریعت ہی کے اصول و کلیات کے ماتحت ہونا چاہیئے، یا پھر عقل سلیم کے ماتحت۔ اے بالوجہ الذی لا ینکر فی الشرع وعادات الناس (مدارک) یہ نہیں کہ محض ہوائے نفس سے یا جاہلی مزعومات کے ماتحت کوئی دستور گڑھ لیا جائے، اور ان کا نام "ضابطہ حقوقِ نسواں" رکھ دیا جائے! ۸۵۰ تہذیب جاہلی ہر زمانہ میں عجیب عجیب بے اصل اور تمام تر غلط دعوے کرتی رہتی ہے، اور بعد کو ان دعووں کی عملی تردید بھی ہوتی رہتی ہے۔ تہذیب جدید کے انہی بے بنیاد مفروضوں میں سے ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ مرد و عورت ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے ہم درجہ ہیں۔ محض دعویٰ کتنی ہی کثرت سے دُہرایا جائے، دعویٰ ہی رہے گا، دلیل نہ بن جائے گا۔ قرآن ابھی ابھی جاہلیت ہی کے ایک مفروضہ کی تردید میں کہہ چکا ہے کہ عورت بے حق نہیں ہے، وہ بھی مردوں کی طرح اپنے حقوق رکھتی ہے۔ اب وہ جاہلیت کے دوسرے دعویٰ کی تردید میں بے دھڑک اعلان کرتا ہے کہ دونوں صنفوں میں مساواتِ مطلق و مساواتِ کامل نہیں، بلکہ مرد کو عورت پر ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔ دَرَجَةٌ ۔ قرآنی لفظ درجۃ خوب خیال میں رہے۔ مرد عورت کے مالک نہیں، عورت اس کی کنیز یا باندی نہیں، بلحاظ حقوق دونوں ایک سطح پر ہیں، پھر بھی مرد کو عورت پر ایک گونہ فضیلت و ترجیح حاصل ہے۔ معناہ فضیلۃ فی الحق (معالم) اے زیادۃ فی الحق (کشاف)۔ جدید علوم و طبیات کے ماہرین جنہوں نے مرد و زن کی جسمانی ساخت و ترکیب، دماغی و ذہنی قویٰ اور طبعی خصوصیات کے مطالعہ و تحقیق میں عمریں بسر کر دی ہیں، ان کی بڑی جماعت آخر اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متمم و تکمیل ہیں، تاہم، بلحاظ قوت و بلحاظ عقل مرد ہی کو فضیلت حاصل ہے۔ اور عورت جن ملکوں میں مردوں کے برابر ثابت بھی ہوئی ہے وہاں اپنی نسائیت کا خون کر کے ۸۵۱ معاشرتِ انسانی اور معاملات باہمی کے بہت سے صیغوں کے اہم مسائل اس آیت میں آگئے۔ اس لئے حق تھا کہ آیت کا خاتمہ ان ہی صفات باری کے اثبات پر کیا جائے۔ عَزِیْزٌ ۔ وہ بڑی قوت والا ہے۔ ہر مانع پر غالب۔ جو احکام وہ چاہے دے سکتا ہے۔ حَكِیْمٌ ۔ لیکن ساتھ ہی وہ بڑا حکمت والا بھی تو ہے، اس لئے وہ وہی احکام دیتا ہے جو بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کے جامع ہوتے ہیں۔ بندوں بیچاروں کی نظریں وہاں تک پہنچ کہاں سکتی ہیں ۸۵۲ جب تک کہ واپسی کی گنجائش باقی ہے، طلاق سے یہاں مراد طلاق رجعی ہے۔ دو بار تک الفاظ طلاق ادا کرنے پر رجوع کر لینے کی گنجائش باقی رہتی ہے ۸۵۳ یعنی دو ماہ کے بعد تیسرے مہینہ، تیسری پاکی کے زمانہ میں یا زبان سے الفاظ طلاق ادا کرے، یا خاموش رہے، دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اب بغیر کسی دوسرے شوہر سے نکاح کئے، اور طلاق پائے، اس پہلے شوہر سے نکاح درست نہ رہے گا۔ تو ایک صورت تو یہ ہوئی کہ اب پختہ ارادہ کر کے اس طلاق کو مکمل اور قطعی کر دیا جائے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ آخری گنجائش سے فائدہ اٹھا کر طلاق واپس لے لی جائے، اور تعلق زناشوئی ازسرِ نو قائم ہو جائے۔ فَاِمْسَاكٌ ۔ یعنی اس کچی طلاق بائی ہوئی بیوی کو رجعت کر کے پھر اپنے پاس رکھ لینا ہے۔ بِمَعْرُوْفٍ ۔ یعنی قواعد شرعی کے مطابق۔ تفصیلی احکام طلاق کتب فقہ میں ملیں گے۔ بِاِحْسَانٍ ۔ یعنی طلاق سے مقصود رفع نزاع ہو، ناخوشگوار صورت حال کا خاتمہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ عورت کی دل شکنی، تحقیر و تذلیل مقصود ہو۔ قرآن مومن کے خاندان کی، اس کے گھر بار کی کتنی عزت و حرمت ملحوظ رکھتا ہے، اس کی بے حرمتی کسی حال میں اُسے گوارا نہیں۔ آج مسلمان کو خود اپنی اور اپنے خاندان کی عزت و حرمت کا اتنا خیال بھی ہوتا جتنا اُن کے خدا کو ہے، تو آج خانگی فضیحتوں کا کوئی وجود بھی کہیں باقی نہ رہتا ۸۵۴ طلاق کے وقت، اکثر انسان جب غصہ میں آکر طلاق دیتا ہے تو یہی گزرتا ہے کہ اب تک جو کچھ

بیوی کو دیا ہے۔ اس سے چھین لیتا ہے۔ عرب جاہلیت میں یہ دستور اور زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ یہاں اسی ظالمانہ دستور کی ممانعت ہے۔ اور بتایا ہے کہ مہر وغیرہ جو کچھ انہیں پہلے دے چکے ہو اب اس کے چھیننے اور واپس لینے کا کوئی محل نہیں۔ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْئًا۔ عام مفسرین اور فقہاء نے اس سے مراد مہر کی رقم رکھی ہے۔ لیکن فقیہ ابن العربی مالکی نے اسے ہر اُس مال تک وسعت دی ہے جو شوہر بیوی کو دے چکا ہو۔ قال قوم یعنی من الصداق وعندی انہ کل شئ اعطاھا۔ حسنِ معاشرت، حسنِ معیشت، حسنِ سلوک کی تاکید ہر صورت میں ہے۔ بیویوں کو رکھو تو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ، رخصت کرو تو بھی ہنسی خوشی خوش عنوانی کے ساتھ ۸۵۵ ادائے حقوقِ زوجیت کے باب میں۔ یَخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا۔ وہ دونوں یعنی میاں بیوی ۸۵۶ یعنی حقوقِ زوجیت ادا اگر اب بھی ادا نہ ہو سکیں اور موافقت کی کوئی صورت ہی نظر نہ آئے۔ حُدُوْدَ اللّٰهِ یعنی معاشرتِ زوجی کے فرائض۔ قال طاؤس فیما افترض علی کل واحد منھما فی العشرۃ والصحبۃ (جصاص) ۸۵۷ یعنی بیوی اگر قیدِ نکاح سے خلاصی پانے اور شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لئے اپنے مہر یا اس کے کچھ حصے سے دستبردار ہو جانا چاہے۔ تو یہی ایک جائز صورت علیحدگی کی ہے۔ اور اس مال کو قبول کر لینا شوہر کے لئے درست ہوگا۔ طلاق کی اس خاص صورت کا نام جس میں طلاق کی خواستگار عورت ہو، اصطلاحِ شریعت میں خلع ہے اور احکامِ خلع کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی۔ مفسر تھانوی کی بیان القرآن میں بھی کلام مبسوط ملے گا۔ خلع کے جائز صورتِ طلاق ہونے اور اس کے طلاقِ بائن کے درجہ پر رکھنے پر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابیوں اور حسنؒ اور ابی سلمہ اور قاضی شریحؒ اور ابراہیمؒ اور شعبیؒ اور مکحولؒ جیسے تابعین تک کا اتفاق جصاص نے نقل کیا ہے، اور اس کو فقہاء کا متفقہ قول بھی قرار دیا ہے۔ وھو قول فقھاء الامصار لا اختلاف بینھم۔ فقہاء کے ہاں ایک بحث یہ بھی چلی ہے کہ خلع آیا صرف اسی اندیشہ کے وقت جائز ہے، جس کا آیت میں ذکر ہے، یا یوں بھی عام طور پر؟ جمہور فقہاء اور مجتہدین اسی طرف گئے ہیں کہ خلع ہر صورت میں اور ہر حال میں جائز ہے۔ الجمھور المجتھدین فقالوا الخلع جائز فی حالۃ الخوف وفی غیر حالۃ الخوف (کبیر) البتہ فقیہ زہری، نخعی اور داؤد ظاہری کا مذہب یہ نقل ہوا ہے کہ خلع کی اجازت صرف اندیشہ اور غضب کی حالت میں ہے۔ وقال الزھری والنخعی وداؤد لا یباح الخلع الا عند الغضب والخوف (کبیر) ۸۵۸ یہ تاکید ہے اس امر کی کہ احکامِ شرعی میں کسی خفیف جزئیہ کو بھی ناقابلِ التفات نہ سمجھا جائے۔ اور شریعت جیسے بے انتہا منظم فن میں ہونا بھی یہی چاہیے تھا ——— مشین جتنی نازک اور اعلیٰ صناعی کا نمونہ ہوگی، اُسی قدر اُس کا ایک ایک ننھا پُرزہ بھی اپنی جگہ پر بے بدل ہوگا ۸۵۹ یعنی اُن پہلی دونوں طلاقوں کے بعد رجعت نہ کرے، اور طلاق پر قائم ہی رہے، تو اب تیسری بار یا پہلی طلاق سے تین مہینے گزر جانے کے بعد اب طلاقِ قطعی طور پر نافذ ہو جائے گی۔ تین مہینے کی مدت غور و فکر کے لئے اور سبھی مصالحت و مفاہمت کے لئے بہت کافی ہوتی ہے ۸۶۰ اور وہ شوہر اُس سے ہمبستری بھی کرے، دُوسرے شوہر سے نکاح پہلے شوہر سے طلاقِ قطعی پانے کے تین مہینے بعد یعنی ایام عدت گزر جانے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ تَنْكِحَ۔ نکاح یہاں اپنے اصطلاحی شرعی معنی میں، یعنی عقدِ نکاح کے مرادف نہیں، بلکہ اپنے اصلی اور لغوی معنی میں، یعنی ہمبستری کے مرادف ہے۔ محض عقد کا مفہوم تو خود لفظ زَوْجًا سے نکل آتا ہے۔ تنکح سے مقصود ہم بستری کو ظاہر کرنا تھا۔ العقد فھم من ... بجاز الجماع من تنکح (روح) یحتمل ان تقیید النکاح بالاصابۃ (بیضاوی) اور امام ابن جریر اس سوال کے جواب میں کہ ہمبستری کا ذکر صراحت کے ساتھ قرآن میں موجود نہیں تو آخر یہ دلالت کہاں سے پیدا کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ معنی کی یہ دلالت ساری اُمت کے اجماع نے پیدا کی ہے۔ الدلالۃ علی ذلک اجماع الامۃ جمیعًا علی ان ذلک معناہ اور امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ قول مختار یہی ہے کہ ہم بستری کی شرط حدیث سے نہیں، قرآن ہی سے ثابت ہے۔ واختلف العلماء فی ان شرط الوطی بالسنۃ او بالکتاب قال ابو مسلم الاصفہانی الامران معلومان بالکتاب وھذا ھو المختار (کبیر) اور آگے اسے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ نکاح کا لفظ جب مطلق صورت میں ہے جب تو مراد عقدِ زوجیت سے ہوگی، لیکن جب اضافت زوجۃ وامراتہ کے ساتھ ہوگی، تو ہمبستری ہی ہوگی۔ اور آخر نتیجہ یہ نکالا ہے کہ قولہ تنکح یدل علی الوطی وقولہ زوجًا یدل علی العقد (کبیر) بہرحال جمہور فقہاء و ائمہ مجتہدین کا مذہب یہی ہے کہ مطلقہ کے ساتھ پہلے شوہر کا نکاح جب ہی درست ہے جب دُوسرا شوہر اُس کے ساتھ ہمبستری کر کے اُسے طلاق دیدے، اور اس طلاق پر بھی تین ماہ کی مدت گزر لے۔ مذھب جمھور المجتھدین ان المطلقۃ بالثلاث لا تحل لذلک الزوج الا بخمس شرائط تعتد منہ وتعقد للثانی ویطوءھا ثم یطلقھا ثم تعتد منہ (کبیر) اختلاف صرف دو تابعین سے منقول ہے۔ ان کے خیال میں مجرد عقدِ ثانی بھی، بغیر ہمبستری کے، طلاق کے بعد شوہرِ اوّل سے یا کسی اور سے عقد کے لئے کافی ہے۔ قال سعید بن جبیر وسعید بن المسیب تحل بمجرد العقد (کبیر) لیکن مذہب جمہور ہی نہایت قوی اور شریعتِ اسلامی کے عین مزاج کے مطابق ہے۔ شریعت نے طلاق کو پسند یقینًا نہیں کیا ہے۔ اس کے نفاذ میں طرح طرح کی قیدیں لگا دی ہیں۔ ترغیب یہی ہے کہ خُوب سوچ سمجھ کر ہی طلاق دی جائے۔ لیکن ان سب مرحلوں کو گزر جانے کے بعد جب طلاق نافذ ہی ہو جائے، تو پھر اب رعایت کا کوئی موقع نہیں، شوہر کو اب دوبارہ آسانی سے وہ بیوی واپس نہیں مل سکتی۔ اب اُسے ذرا خُونِ جگر کھا لینا پڑے گا، جب وہ حاصل ہو سکتی ہے ——— سزائے زنا میں بھی یہی اصل کارفرما ہے۔ ثبوتِ زنا نہایت ہی قوی بلکہ قطعی ہونا چاہیئے۔ ذرا سے بھی شبہ کا فائدہ ملزم ہی کو ملے گا، لیکن جب یہ سب مرحلے طے ہو چکیں تو پھر اب نفاذِ سزا میں کسی رعایت کی گنجائش نہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ

پھر اگر کوئی اپنی عورت کو طلاق دے ہی دے ۸۵۹ تو وہ عورت اُس کیلئے اُس کے بعد جائز نہ رہے گی یہاں تک کہ

زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ

وہ کسی اور شوہر سے نکاح کر لے ۸۶۰ پھر اگر وہ (بھی) اسے طلاق دیدے ۸۶۱ تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ

اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ

پھر مل جائیں ۸۶۲ بشرطیکہ دونوں گمان غالب رکھتے ہوں کہ اللہ کے ضابطوں کو قائم رکھیں گے ۸۶۳

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۲۳۰ وَ

اور یہ بھی اللہ کے ضابطے ہیں۔ انہیں (اللہ) کھول کر ان لوگوں کیلئے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں ۸۶۴ اور

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ

جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو ۸۶۵ اور وہ اپنی مدت گزرنے پر پہنچ جائیں ۸۶۶ تو (اب) یا تو انہیں

بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ

عزت کے ساتھ روک کے رکھو اور یا عزت کے ساتھ رہائی دیدو ۸۶۷ اور اُن کو تکلیف پہنچانے

ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ

کی غرض سے نہ روکے رہو ۸۶۸ اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ اپنی ہی جان پر

نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّ اذْكُرُوْا

ظلم کرے گا ۸۶۹ اور اللہ کے احکام کو ہنسی (کھیل) نہ سمجھو ۸۷۰ اور اللہ کی نعمتیں

نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ

اپنے اوپر یاد کرو ۸۷۱ اور (اس) کتاب و حکمت کو بھی جو اُس نے

منزل

مِنْۢ بَعْدُ۔ یعنی طلاقِ ثالث کے بعد۔ ای التطلیقۃ الثالثۃ (مدارک) اس شرط کے ساتھ نئے شوہر کا کسی مطلقہ کے ساتھ نکاح کرنا کہ بعد صحبت طلاق دے دی جائے گی، تاکہ وہ اپنے شوہرِ اوّل کے لئے جائز ہو جائے حلالہ کہلاتا ہے۔ حدیث میں لعنت بھی وہ دوسرا شوہر جو نکاح جیسے اہم، سنجیدہ اور مقدس معاہدہ کو پہلے شوہر کی خاطر ایک کھیل اور تفریح کی چیز بنائے دیتا ہے، اور محلل لہٗ یعنی وہ پہلا شوہر جس کی خاطر معاہدۂ نکاح کی اہمیت، سنجیدگی و تقدیس خاک میں ملائی جا رہی ہے۔ ان دونوں پر لعنت آئی ہے۔ اور اکثر فقہاء کے ہاں یہ نکاح، نکاحِ فاسد کے حکم میں آتا ہے۔ حنفیہ کے ہاں ایسا نکاح منعقد ہو جائے گا۔ یعنی اس کا نفاذ قانونی ہو جائے گا۔ اگرچہ اس سے گناہ عائد ہوگا ۸۶۱ اور اس دوسری طلاق پر بھی تین مہینے کی مدت گزر جائے ۸۶۲ اور بدستور سابق دوبارہ نکاح کر لے۔ مطلقہ اپنے شوہر کے لئے ہمیشہ کو حرام اب بھی نہیں ہو جاتی۔ ان درمیانی مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی اس کا نکاح اپنے شوہرِ اوّل سے ممکن ہے۔ ہر ہر فریقِ معاملہ کے حقوق کی پوری رعایت کا جو حکیمانہ اہتمام و التزام شریعتِ اسلامی کے سارے اجزاء میں ہے، اس کا ایک اعلیٰ نمونہ یہ طلاق کے جزئیات احکام ہیں۔ انسانی ذہن اور بشری دماغ اپنی ساری کوششیں کر تھکے، اتنے دقائق کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا ۸۶۳ اور آئندہ خواہ مخواہ کی رنجشیں پیدا کر کے تلافِ حقوق میں مبتلا ہوں گے۔ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔ حدود اللہ کی اقامت اس سیاق میں یہی ہے کہ حسنِ معاشرت کی رعایت رکھی جائے۔ ای یتعاشرا بالمعروف (ابن کثیر) ای یکون بینھما الصلاح وحسن الصحبۃ (معالم) اِنْ ظَنَّآ۔ یعنی اگر امید و ارادہ بھی رکھتے ہوں۔ باقی یقین کے ساتھ مستقبل کا حال کون جان سکتا ہے۔ ای رجوا لان احدًا لا یعلم ما ھو کائن الا اللّٰہ عزّوجل (معالم) ای متی حصل ھذا الظن حصل لھما العزم علی اقامۃ حدود اللّٰہ حسنت ھذہ المراجعۃ (کبیر) ای ان کان فی ظنھما انھما یقیمان حقوق الزوجیۃ (مدارک) ومن فسر الظن ھھنا بالعلم فقد وھم من طریق اللفظ (کشاف) ۸۶۴ اہلِ فہم و دانش کے لئے۔ اُن لوگوں کے لئے جو احکام و اوامرِ الٰہی کا علم رکھتے ہیں۔ یعنی یعلمون ما امرھم اللّٰہ تعالٰی بہ (معالم) یرید من لہ عقل وعلم (کبیر) ای یفھمون ما تبین لھم (مدارک)۔ حُدُوْدَ اللّٰهِ۔ یعنی اللہ کے احکام و قوانین۔ ای احکامہ وشرائعہ (ابن کثیر) ۸۶۵ یعنی وہی ایک بار یا دو بار دی ہوئی طلاقِ رجعی، جو ابھی قطعی نہیں ہوئی ہے اور جس سے ابھی رجوع کر لینے کی گنجائش ہے ۸۶۶ لیکن وہ مدت ابھی پوری گزر چکی نہ ہو۔ یعنی زمانۂ عدت اب ختم ہونے ہی پر ہو، لیکن پُوری طرح ختم ہو چکا نہ ہو، ورنہ بالکل ختم ہو جانے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اب کوئی گنجائش ہی رجعت کی نہیں باقی رہی۔ بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ۔ المراد مقاربۃ البلوغ والاشراف علیہ لا حقیقۃ (جصاص) المراد مقاربۃ دون انقضائہ ونظائرہ کثیرۃ فی القرآن واللغۃ (جصاص) معناہ قارب البلوغ (ابن العربی) اَجَلَهُنَّ۔ اجل کا اطلاق ساری مدت پر بھی ہوتا ہے اور آخر مدت پر بھی۔ والاجل یقع علی المدۃ کلھا وعلی آخرھا وکذالک الغایۃ

والزمنی (کشاف) وبعد فی البلوغ ایضاً فیقال بلغ البلد اذا شارفه ودان اه (کشاف) جعل لفظ بلغ بمعنی قارب کہ یقال اذ بلغت مکۃ فاغتسل (ابن العربی) ۸۶۷ یعنی جب وہ اپنی مدت عدت ختم
ہونے پر آئے، تو شوہر کو اب دو اختیار ہیں۔ یا یہ کہ اپنی اس تمام مطلقہ بیوی کو پھر شرافت و عزت کے ساتھ اپنی زوجیت میں واپس لے لے، اور یا پھر اسے شرافت و عزت کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت کر دے۔ اور مستقل علیحدگی اختیار کرلے
غرض دونوں صورتوں میں سے جو بھی اختیار کی جائے، تمام تر شریعت و اخلاق کے قانون و آداب کے موافق ہو ۸۶۸ گویا عورت کی حق تلفی کی گنجائش، کسی صورت اور کسی حال میں بھی نہیں ——
زوجیت میں واپسی خانہ آبادی کے لئے ہونا چاہیے نہ کہ خانہ بربادی کے لئے ۸۶۹ (اور اپنی زیادتیوں کی سزا دنیا یا آخرت میں بھگتے گا) بیویوں کے حقوق ادا کرنے والے، حقوق زوجیت میں برابر اور شدید کوتاہیاں
کرتے رہنے والے یہ خیال کرتے رہیں کہ ایسوں کے حق میں کیسی کیسی وعیدیں وارد ہو رہی ہیں ۸۷۰ (کہ جس پر جی چاہا عمل کیا، اور جسے چاہا یوں ہی چھوڑ دیا) شریعت اسلامی میں حیات اجتماعی و معاشرتی کا سنگ بنیاد خاندان
اور خاندانی زندگی ہے، اور خاندان کا کلیدی نقطہ میاں بیوی کے صحیح تعلقات ہیں۔ اس لئے ایک معنی میں یوں کہنا چاہیے کہ سارے نظام معاشرت کی بنیاد یہی حقوق زناشوئی کی ادائی ہے۔ اور جس طرح بعض بظاہر معمولی

الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا
تم پر اتاری ہے کہ اس سے وہ تمہیں نصیحت کرتا رہتا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانے
ع ۲۹ ۱۳ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ
رہو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور جب تم طلاق دے چکو اپنی عورتوں کو
فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ
اور پھر وہ اپنی مدت کو پہنچ چکیں تو تم انہیں اس سے مت روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے
اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ
نکاح کرلیں، جب کہ وہ آپس میں سب شرافت کے ساتھ راضی ہوں اس (مضمون)
يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
سے نصیحت کی جاتی ہے تم میں سے اس شخص کو جو اللہ اور روز آخرت پر
الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ
ایمان رکھتا ہے یہی تمہارے حق میں پاکیزہ تر اور صاف تر ہے اور اللہ جانتا ہے اور
اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ
تم نہیں جانتے ہو اور مائیں اپنے بچوں کو
اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ
دودھ پلائیں پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو
الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
رضاعت کی تکمیل کرنا چاہے اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا

بے احتیاطیاں بڑی بڑی سخت بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں، بعض جزئی احکام شریعت سے بے پروائی بڑے بڑے سخت فتنوں کا دروازہ کھول دیتی ہے —— ان دقائق کو سنبھالے رہنا شریعت ہی جیسے حکیمانہ نظام کا کام ہے۔ ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ احکام محض ہزل نہیں، پوری سنجیدگی سے ہر حال میں نافذ ہو جائیں گے۔ یہ نہیں کہ پہلے تو زبان سے صاف الفاظ میں طلاق دے دی، اور پھر بعد کو یہ کہہ کر ٹال دینا چاہا کہ یہ تو ہنسی میں کہا تھا۔ بعض تابعین اسی طرف گئے ہیں ۸۷۱ (اور ان ہی نعمتوں میں سے آئین معاشرت کی یہ مکمل مفصل جامع تعلیم بھی ہے) ۸۷۲ يَعِظُكُمْ بِهٖ۔ اس سے، یعنی اس کے ذریعہ وہ تمہیں نصیحت کرتا رہتا ہے۔ بہ میں ضمیر ما انزل کی طرف ہے ۸۷۳ (اور چھوٹے بڑے ہر حکم کی مصلحتوں سے بھی وہی خبردار ہے) وَاتَّقُوْا، وَاعْلَمُوْا تقوائے الٰہی و علم الٰہی کی کاملیت کا استحضار یہی دو تو بنیادیں ہیں ہر عمل صالح اور صالحانہ زندگی کی ۸۷۴ (اور مدت پوری کرکے دوسرے نکاح کی آرزومند ہوں) اِذَا طَلَّقْتُمُ۔ یہاں یہ خطاب صرف شوہروں سے نہیں، عام امت سے ہے۔ خطاب للاولیاء وللازواج ولسائر الناس والعموم یقتضی ذالک (جصاص) بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ یہاں ختم مدت کا قرب مراد نہیں، جیسا کہ آیت ماقبل میں تھا۔ بلکہ عین ختم مراد ہے۔ المراد حقیقۃ البلوغ بانقضاء العدۃ (جصاص) البلوغ ههنا حقیقۃ لا مجاز فیها (ابن العربی) ۸۷۵ (جیسا کہ عرب میں بہت سے مرتبہ برادرانہ اولیا، و اقربا، کی طرف سے روکنے کا رواج تھا) ۸۷۶ اَزْوَاجَهُنَّ یعنی ان کے تجویز کئے ہوئے شوہر عام اس سے کہ وہ نئے ہوں یا وہی پرانے ہوں جو ایک بار انہیں چھوڑ چکے ہیں۔ ای الذین یرغبن فیهم ویصلحون لهن (مدارک) يَنْكِحْنَ۔ اس لفظ سے معلوم ہوا کہ عورتیں خود بھی اپنا نکاح کر سکتی ہیں۔ اور یہیں سے حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ نکاح بغیر ولی کے بھی جائز ہے۔ قد دلت هذه الآية من وجوه علی جواز النکاح اذا عقدت علی نفسها بغیر ولی ولا اذن ولیها احدها اضافۃ العقد الیها من غیر شرط اذن الولی (جصاص) تَرَاضَوْا۔ حنفیہ نے اس لفظ سے استنباط کیا ہے کہ ایجاب و قبول رکن نکاح ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی بجائے زوجین کے ان کے ولی یا وکیل کر دیں۔ بِالْمَعْرُوْفِ یہ قید ان احکام میں ہر جگہ لگی ہوئی ہے، اور کس کثرت سے اس کا اعادہ ہو چکا ہے مقصد یہ ہے کہ کوئی ادنیٰ سی ادنیٰ بات بھی دین و اخلاق کے قانون کے خلاف نہ ہونے پائے ۸۷۷ ان تعلیمات و ہدایات کی پوری قدر ان ہی کو ہوگی جو مومن کامل ہیں ۸۷۸ ان تمام حکمتوں اور حقیقی مصلحتوں کا علم بس میں، ہمہ داں، خدائے تعالیٰ کو ہو سکتا ہے، یا علم کے ناقص، عقل کے ناقص گندے بندوں کو؟ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ۔ یعنی مفید، حکیمانہ، قابل عمل، آسان احکام، ذاتی و ملی ہر اعتبار سے۔ شخصی سیرتوں اور اجتماعی مصلحتوں دونوں کے معیار سے۔ دوسرے مذہبوں کے برعکس اسلام جس نظام کو لے کر آیا ہے وہ محض مجہول راہبوں، جوگیوں، فلسفیوں کے لئے نہیں، صرف نفس کشی و ریاضت کرنے والوں کے لئے نہیں۔ اس مادی دنیا کے بھی معاشرتی، اجتماعی فوائد کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کے قانون پر عمل کیا جائے۔ ذٰلِكُمْ۔ ای الاتعاظ به والعمل بمقتضاه (روح) ۸۷۹ رضاعت اصل حق ماں کا ہے، اور ماں سے بہتر کوئی مرضعہ ہو نہیں سکتی۔ پرانے طبیبوں اور نئے ڈاکٹروں اور ڈاکٹرنیوں سب کو اس پر اتفاق کرنا پڑا ہے۔ یحمل الام احق برضاع الولد هذه المدۃ (جصاص) اَلْوَالِدٰتُ۔ خواہ ان ماؤں کا نکاح باقی ہو یا طلاق ہو چکی ہو۔ اَوْلَادَهُنَّ۔ اس قید نے یہ صاف کر دیا کہ مراد مائیں ہی ہیں، نانیاں دادیاں مراد نہیں۔ رضاعت کاملہ کے لئے دو برس کی مدت پر بھی طبیبوں کا اتفاق رائے موجود ہے ۸۸۰ یعنی جو پورے نصاب کی تکمیل نہ کرنا چاہے اس کے لئے کم مدت کی بھی اجازت ہے۔

۸۸۱ مرضعہ کی تنخواہ اور کھانے کپڑے کی ذمہ داری بہرحال باپ کے سر ہے۔ اور مرضعہ عام حالات میں ماؤں ہی کو ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ مائیں ہنوز قید نکاح میں ہوں یا قید عدت میں۔ بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی عرف شریفانہ کے موافق، جو کسی قاعدہ شرعی کے خلاف نہ ہو۔ اے بما یحسن فی الدین والمروءۃ (مدارک) اے بما لا یکون مستنکرا شرعا او مروءۃ (روح) فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کھلانے پہنانے میں مرد کی وجہی حالت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اے رخشت سے کام لینا چاہیئے، نہ اسراف کی حاجت۔ یدل علی ان الواجب من النفقۃ والکسوۃ ھو علی قدر حال الرجل فی اعسارہ ویسارہ (جصاص) ۸۸۲ اور اس کے قوائے ترکیبی کے مناسب حال، چنانچہ یہاں بھی رضاعت کا حکم ماؤں کو، کہ یہ چیز عورت ہی کے فرائض میں داخل ہے۔ اور مرضعہ کو کھلانے پہنانے کی ذمہ داری رکھی گئی ہے باپ کے سر کہ کمانا اور خرچ کرنا مرد ہی کی زندگی سے مناسبت رکھتا ہے۔ جزئیات کے درمیان درمیان کلیے لے آنا انشاء قرآنی کے خصوصیات میں سے ہے ۸۸۳ آیت میں تنبیہ ہے باپ اور ماں دونوں کو، باپ کو تو یہ کہ وہ لڑکے کی ماں پر

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا

موافق دستور کے (۸۸۱) کسی شخص کو حکم نہیں دیا جاتا بجز اس کی برداشت کے بقدر (۸۸۲) نہ کسی

تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَ

ماں کو تکلیف پہنچائی جائے اُس کے بچے کے باعث اور نہ کسی باپ ہی کو تکلیف پہنچائی جائے اُس کے

عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ

بچے کے باعث (۸۸۳) اور اسی طرح (کا انتظام) وارث کے ذمہ بھی ہے (۸۸۴) پھر اگر دونوں اپنی باہمی

تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَاِنْ

رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑا دینا چاہیں (۸۸۵) تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر

اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ

تم لوگ اپنے بچوں کو کسی اور انّا کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ

عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاتَّقُوا

نہیں جب کہ تم (ان کے) حوالے کر دو جو کچھ انہیں دینا ہے موافق دستور کے (۸۸۶) اور اللہ

اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ وَ

سے ڈرتے رہو (۸۸۷) اور جانے رہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کا خوب دیکھنے والا ہے (۸۸۸) اور

الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ

تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں، وہ بیویاں اپنے آپ

بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ

کو چار مہینہ اور دس دن تک روکے رکھیں (۸۸۹) پھر جب وہ اپنی مدت

خواہ مخواہ سختی روا نہ رکھے اور ماں کو یہ کہ وہ لڑکے کے باپ سے خواہ مخواہ سخت مالی مطالبے نہ کرے ۸۸۴ (جب باپ زندہ نہ ہو) اَلْوَارِثِ۔ وارث سے فقہی اصطلاح میں ذی قرابت ارحم مراد ہے جو بچہ کا شرعی وارث ہے۔ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ یعنی جس طرح باپ پر بچہ کی ماں کا حفظ حقوق واجب ہے اسی طرح باپ کے بعد اپنے قریب ترین عزیزوں پر بھی واجب ہے۔ علیہ مثل ما علی والد الطفل من الانفاق علی والدۃ الطفل والقیام بحقوقھا وعدم الاضرار بھا (ابن کثیر) وبہ قول الجمہور وقد استقصی ذلک ابن جریر فی تفسیرہ (ابن کثیر) باپ کے ہوتے ہوئے بچہ کی پرورش کا خرچ صرف باپ کے ذمہ ہے۔ اور جب باپ مر جائے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بچہ مال کا مالک ہے تب تو اسی مال میں اس کا خرچ ہوگا۔ اور اگر مال کا مالک نہیں تو اس کے مالدار عزیزوں میں جو اس کے محرم ہیں یعنی اس بچہ سے ان کا رشتہ ایسا ہے کہ دونوں میں سے ایک کو مرد اور ایک کو عورت فرض کریں تو باہم نکاح درست نہ ہو، اور محرم ہونے کے علاوہ شرعاً اس کے مستحق میراث بھی ہیں۔ پس ایسے محرم وارث رشتہ داروں کے ذمہ اس کا خرچ واجب ہوگا اور ان رشتہ داروں میں ماں بھی داخل ہے۔ مثلاً ایک ایسے بچہ کی ایک ماں ہے، ایک دادا ہے تو اس کے خرچ کا ایک ثلث ماں کے ذمہ ہے اور دو ثلث دادا کے ذمہ۔ کیونکہ دونوں محرم بھی ہیں اور بچہ کی میراث بھی اسی نسبت سے پا سکتے ہیں (تھانویؒ)۔ شیر خوار کے مصارف جو دوسروں پر واجب کئے گئے ہیں اس کی علت یہی ہے کہ بچہ بذات خود اپنی پرورش کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اسی اشتراک علت سے فقہاء حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ محتاج عورتوں، اپاہج مردوں اور نابالغوں کے مصارف ان کے اقارب کے ذمہ ہیں۔ اور یہی مسلک حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ وقد استدل بذلک من ذھب من الحنفیۃ والحنبلیۃ الی وجوب نفقۃ الاقارب بعضھم علی بعض وھو مروی عن عمر بن الخطاب وجمہور السلف (ابن کثیر) ۸۸۵ (تکمیل رضاعت سے قبل یعنی دو برس کی مدت کے اندر ہی) تَرَاضٍ۔ تَشَاوُرٍ۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ماں کو بہ جذبہ شفقت اور حق پرورش زیادہ ہوتا ہے، اس لئے اس قسم کے امور کو محض باپ کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ ماں کی رائے اور رضامندی کی بھی شرط لگا دی گئی۔ حضرت تھانویؒ نے کہا کہ باہمی مشورہ کی ضرورت یہ ہے کہ خود بچہ کی مصلحت پر نظر کر لیں ۸۸۶ مقصد یہ ہے کہ بعض دفعہ ماں سے چھڑا کر کسی اور سے رضاعت کرانے کی ضرورت یا مصلحت بھی پیش آ جاتی ہے، چنانچہ جب ایسی صورت پیش آ جائے تو کسی انّا سے رضاعت کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ بالکل جائز ہے بشرطیکہ اجرت حسب قرارداد ادا کر دی جائے۔ بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی حسب معاہدہ و قرارداد۔ بالمعروف کا نحوی تعلق سلّمتم سے بھی ہو سکتا ہے اور اٰتیتم سے بھی ۸۸۷ (سارے احکام و اوامر کے باب میں) چنانچہ یہاں بھی یہ ہے کہ اجرت نہ دو گے تو گنہگار ہو گے ـــــ معاملات چھوٹے ہوں یا بڑے، قرآن مجید نے سارے دائرہ زندگی میں قدم قدم پر تقوائے الٰہی کو شمع راہ رکھا ہے ۸۸۸ انسان کو بدمعاملگی، بددیانتی پر لانے والی چیز صرف یہی بھول، غفلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا، اس کی ہمہ بینی، ہمہ خبری کا استحضار اگر ہر وقت رہے تو کوئی لغزش ہونے ہی نہ پائے۔ قرآن مجید بار بار اسی جذبہ کو بیدار کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی خانگی زندگی کی کسی منزل میں بھی اس طرف سے غافل نہ ہونے پائے ۸۸۹ (نکاح اور قریبی مقدمات نکاح سے) دنیا کے عمرانی اور معاشرتی مسائل میں طلاق کے بعد بیوہ کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ بیوہ کے ساتھ دنیا کے کسی دوسرے مذہب نے کوئی خاص اعتبار برتا ہی نہیں ہے۔ بلکہ بعض مذہبوں نے تو ستی وغیرہ کو جائز کر کے بیوہ کو زندہ ہی جلا دیا ہے۔ اسلام نے بیوہ کو زندہ رہنے، پوری طرح زندہ رہنے کا، سہاگنوں ہی کی طرح زندہ رہنے کا حق عطا کیا ہے۔ اور یہ باب بھی، جہاں تک دنیوی برکتوں کا تعلق ہے، اسلام کا ایک روشن ترین باب ہے۔ يَتَرَبَّصْنَ۔ انتظار کی اس مدت کا اصطلاحی نام عدت ہے۔ طلاق کی عدت پورے تین ماہ کی تھی۔ بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن یا کل ۱۳۰ دن تجویز ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں بیوہ کے لئے بناؤ سنگار سب ناجائز ہے۔ بیوہ اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت تا وضع حمل ہے۔

۸۹۰ یعنی مدتِ عدت پوری ختم ہو جائے۔ ۸۹۱ یعنی جب مدت ختم ہو گئی، تو اب نکاح کی تجویز وغیرہ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ فلا جناح علیکم فی ما فعلن ۔ خطاب علم بجائے اہلِ امت کو
یعنی تم پر ایسی بات کے جائز رکھنے میں کوئی گناہ یا حرج نہیں۔ ایھا الائمۃ الحکام (جصاص)، ھذا خطاب للاولیاء (ابن العربی)، قیل الخطاب لجمیع المسلمین (روح) اس
طرزِ خطاب سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ کوئی شخص اگر خلافِ شرع کام کرے تو دوسروں پر واجب ہوتا ہے کہ بشرطِ قدرت و بقدرِ قدرت اس کو روکیں، ورنہ یہ بھی گناہگار ہوں گے۔

اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ
تک پہنچ جائیں ۸۹۱ تو تم پر اس باب میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے بارے

اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۲۳۴
میں کچھ کارروائی کریں شرافت کے ساتھ ۸۹۲ اور جو تم کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے ۸۹۳

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ
اور تم پر کوئی گناہ اس میں نہیں کہ تم ان (زیرِ عدت) عورتوں کے پیغامِ نکاح کے باب میں

النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ
کوئی بات اشارۃً کہو یا (یہ ارادہ) اپنے دلوں ہی میں پوشیدہ رکھو ۸۹۴ اللہ کو تو علم ہے کہ تم ان عورتوں

سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ
کا ذکر مذکور کرو گے ۸۹۵ البتہ ان سے کوئی وعدہ خفیہ (ابھی) نہ کرو ۸۹۶ مگر ہاں کوئی بات

اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ
عزت و حرمت کے موافق (اچھا ہو تو) کہہ دو ۸۹۷ اور عقدِ نکاح کا عزم اس وقت تک کرو جب تک

النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
کہ میعاد مقرر اپنے ختم کو نہ پہنچ جائے ۸۹۸ اور جانے رہو کہ جو کچھ

اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا
تمہارے دلوں میں ہے، اللہ اسے جانتا ہے ۸۹۹ سو اس سے ڈرتے رہو اور جانے رہو

اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۲۳۵ ۧ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
ع ۳۰ / ۱۴
کہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا بردبار ہے ۹۰۰ تم پر کوئی گناہ نہیں

فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ ۔ یعنی نکاح اور متعلقاتِ نکاح کی تجویزیں بھی جو شرعاً جائز ہوں۔ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ جو بھی کارروائی ہو قانونِ شریعت و آئینِ اخلاق کے باہر نہ ہو ۸۹۲ چنانچہ کوئی بات خلافِ شریعت اگر خود کرو گے یا اسے ہونے دو گے تو اس کے ذمہ دار قرار پاؤ گے۔ ۸۹۳ مشرک قوموں نے اپنے خداؤں سے علمِ کامل اور باخبری کی نفی کی ہے۔ قرآن مجید نے ان صفات کے اثبات میں ایک پہلو ردِّ شرک کا بھی رکھا ہے۔ ۸۹۴ دورانِ عدت میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کوئی مرد کسی بیوہ سے نکاح کا ارادہ اپنے دل ہی میں قائم کرے، اور زبان پر نہ لائے، یا اگر لائے بھی تو محض اشارۃً و کنایۃً۔ صراحت کے ساتھ البتہ اجازت اس زمانہ میں نہیں ۸۹۵ سو محض تذکرہ کی حد تک کا کوئی مضائقہ نہیں، یہ عین فطرتِ بشری ہے کہ جو عورت دل میں بس جاتی ہے، مرد ادھر ادھر گھوم گھما کر اس کا ذکر ضرور لاتا ہے، اور اس کا تذکرہ چھیڑنے کو بہانے ڈھونڈا کرتا ہے۔ آیت کا یہ ٹکڑا یعنی اسی فطرتِ بشری کا ترجمان ہے ۸۹۶ دورانِ عدت میں عورت سے وعدہ نکاح کر لینا، علانیہ نہ سہی، بطورِ راز کے بھی جائز نہیں۔ اور یہ ٹکڑا اسی حکم کی تاکید کے لئے ہے۔ سِرًّا ۔ سر کے عام معنی چوری راز کے ہیں، ظاہر ہیں۔ جمہور مفسرین نے وہی قبول کئے ہیں۔ لیکن ایک مجازی معنی خود نکاح کے بھی ہیں اور ابن سیدہ لغوی، فراء نحوی وغیرہ نے یہاں اس سے کنایہ نکاح ہی کا سمجھا ہے۔ وکنی عن النکاح بالسر (راغب) ومن المجاز السر للنکاح وقال ابن السیدہ وھو کنایۃ عنہ (تاج) وھو ان یصف احد ھو نفسہ للمرأۃ فی عدتھا فی النکاح وبہ فسر الفراء (تاج) اس صورت میں آیت کا ترجمہ ہوگا "البتہ ان سے وعدہ نکاح نہ کرو" ۸۹۶ اور وہ عزت و حرمت کے ساتھ بات کرنا یہی ہے کہ جو کچھ بھی کہنا ہو اشارۃً و کنایۃً ہی کہا جائے نہ کہ صراحۃً ۸۹۷ یعنی ختم عدت سے قبل عزمِ نکاح کر لینا بھی درست نہیں۔ عزم سے مراد قصدِ مصمم و قطعی ہے۔
۸۹۸ سو جو امور ناجائز ہیں ان کے ارتکاب کا عزم بھی اس کے علم میں رہتا ہے ۸۹۹ غَفُوْرٌ ۔ چنانچہ توبہ کے بعد نافرمانوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ حَلِيْمٌ ۔ چنانچہ بہت دفعہ نافرمانوں کو فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ مہلت دے دیتا ہے۔

۹۰۰ یعنی کوئی باز پرس نہیں مہر کے باب میں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں شوہر کے ذمہ مہر واجب بھی نہیں۔ لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ۔ یہاں مس سے مراد ہمبستری کی دونوں قسمیں ہیں، حقیقی اور واقعی، اور حکمی و فقہی (یعنی خلوت صحیحہ) طلاق ہمبستری کے قبل بھی بالکل جائز ہے، بغیر کسی مہر کی ذمہ داری کے۔ نکاح بلا تعیین مہر بھی صحیح رہتا ہے۔ طلاق کے وقت اس واجب مبہم کا ادا شوہر کی حسب استطاعت کیا جائے گا۔ ۹۰۱ مَتِّعُوْهُنَّ کا لفظ قرآن میں عام ہے اور مذاق بشری کی ہمہ گیری اس عموم کو چاہتی بھی ہے۔ لے عملکوهن ما یمتعن به وذلك الشیٔ یسمی متعة (روح) متعة الطلاق اعلاها الخادم ودون ذلك الورق ودون ذلك الكسوة (روح۔ عن ابن عباس) ادنی ما یکون من المتعة ثلاثون درهمًا (روح۔ عن ابن عمر) البتہ فقہا نے یہاں عموماً تین کپڑوں کا جوڑا مراد لے لیا ہے۔ لیکن خود یہ جوڑا بھی یقیناً حسب رواج ملک و قوم۔ ہوگا۔ ۹۰۲ اور خوش معاملہ تو سارے مسلمانوں کو ہونا چاہیے، اس لئے مراد ہیں سارے مسلمان۔ لفظ محسنین لا کر ان کے اس وصف کو نمایاں کر دیا ہے۔

إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوْا

کہ تم ان بیویوں کو جنہیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ اُن کے لئے مہر مقرر کیا

لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ

طلاق دے دو ۹۰۰ وسعت والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق ہے اور تنگی والے

وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى

کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق ۹۰۱ (یہ) خرچ شرافت کے موافق ہو (اور یہ) واجب ہے

الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ

خوش معاملہ لوگوں پر ۹۰۲ اور اگر تم نے انہیں طلاق دے دی ہے قبل اس کے کہ انہیں

تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ

ہاتھ لگایا ہو، لیکن ان کے لئے کچھ مہر مقرر کر چکے ہو تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے

مَا فَرَضْتُمْ إِلَّآ أَنْ يَّعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ

اس کا آدھا واجب ہے بجز اس صورت کے کہ یا تو وہ عورتیں خود معاف کر دیں۔ یا وہ (اپنا

عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوْٓا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا

حق) معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے ۹۰۳ اور اگر تم (اپنا حق) معاف کر دو تو یہ بہت ہی قرین تقویٰ ہے ۹۰۴

تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

اور آپس میں لطف و احسان نظر انداز نہ کرو ۹۰۵ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ یقیناً اس کا خوب دیکھنے والا ہے ۹۰۶

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ

(سب ہی) نمازوں کی پابندی رکھو۔ اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی ۹۰۷ اور اللہ کے سامنے عاجزی سے (کھڑے رہا کرو)

والاجمال انما علی وجه التأکید (جصاص) اے علی المسلمین (مدارک) ۹۰۳ طلاق کی ایک صورت وہ تھی جو ابھی اوپر بیان ہو چکی، یعنی نہ مہر طے ہوا تھا اور نہ ابھی خلوت ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی۔ دوسری صورت اب بیان ہو رہی ہے کہ مہر تعیین ہو چکا تھا، لیکن خلوت نہیں ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی۔ عام قاعدہ ایسے موقع کے لئے یہ ہے کہ مہر مقرر کا نصف شوہر کے ذمہ واجب الادا ہو گا۔ لیکن دو صورتیں اس حکم عام سے مستثنیٰ کی ہیں۔ ایک یہ کہ بیوی اپنے حق سے تمام تر دستبردار ہو جائے اور نصف مہر بھی نہ لے، اور دوسری صورت یہ کہ شوہر اپنے حق سے دستبردار ہو جائے، یعنی جو نصف مہر اُسے رکھ لینے کا اختیار تھا اُسے بھی روک نہ رکھے اور بجائے نصف کے پورا مہر ادا کر دے۔ یَعْفُوْنَ۔ عورت اپنا حق معاف کر دے، اور اس کا حق ہے وہی مہر معین کا نصف۔ گویا عورت مہر تمام تر چھوڑ دے۔ نِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ۔ تعداد مہر اگر معین تھی جب تو اس کا نصف ظاہر ہے۔ اگر تعداد معین نہ تھی تو فیصلہ مہر مثل پر ہو گا (یعنی خاندانی مہر) الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ یعنی جو نکاح کی گرہ کے توڑنے اور جوڑے رکھنے کا اختیار رکھتا ہو مراد شوہر ہے۔ یہ الفاظ اس پر ناطق ہیں کہ معاہدۂ نکاح میں شریک غالب کی حیثیت شوہر ہی رکھتا ہے ۹۰۴ قانون اور ضابطہ ابھی بیان ہو چکا ہے کہ شوہر طلاق کی اس صورت میں نصف مہر روک سکتا ہے۔ اب مسائل اخلاق کے افضل و اعلیٰ مقام کی طرف رہنمائی کر دی گئی کہ حق وصول کرنے سے کہیں بہتر و برتر اس حق کا معاف کر دینا ہے۔ جائز و برتر، مباح و افضل، قانون و اخلاق کا یہ مسلسل امتزاج قرآن کے معنوی اعجاز میں سے ہے ۹۰۵ چنانچہ طلاق کے موقع پر بھی، جو تعلقات کی بقا کا نہیں، اس کے اختتام و انقطاع کے اعلان کا نام ہے، باہمی حسن سلوک، مروت، رعایت سے نہ چوکو۔ آیت سے صاف اشارہ ادھر نکل رہا ہے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آجانے سے صحبت قدیم و محبت سابق کے حقوق زائل نہیں ہو جاتے۔ بلکہ حالت طیش و ناگواری میں بھی لحاظ تقویٰ اور حسن اخلاق اور عفو و احسان کا برابر رکھنا چاہیے۔ وَلَا تَنْسَوُا۔ نسیان یہاں بھول کے معنی میں نہیں، کہ وہ تو غیر اختیاری ہے، بلکہ ترک کرنے اور نظر انداز کرنے کے معنی میں ہے۔ قال ابو محمد والنسیان ههنا الترك (ابن قتیبہ) ۹۰۶ سو اس کے ہاں تمہاری کوئی سعی نیکی بھی، کسی درجہ اور کسی موقع کی ہو، رائیگاں نہ جائے گی ۹۰۷ اوپر سے ذکر برابر بیویوں کے حقوق و مطالبات کا چلا آ رہا تھا اور آگے پھر یہی ذکر چلے گا۔ درمیان میں احکام نماز سے متعلق آ گئے، یہیں سے اس حقیقت پر ایک بار اور روشنی پڑ رہی ہے کہ اسلام میں معاشرت و معاملت، قانون و اخلاق کے مسائل، عبادات سے الگ نہیں۔ اور نظام شریعت میں خالق کے حقوق اور مخلوق کے حقوق دوش بدوش چل رہے ہیں۔ حافظوا على الصلوات۔ محققین نے محافظت صلوٰۃ کے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ ادنیٰ یہ کہ نماز وقت پر پڑھی جائے اور فرائض و واجبات ترک نہ کئے جائیں۔ اوسط یہ کہ جسم ہر طرح طہارت ظاہری سے آراستہ ہو، طبیعت اکل حلال کی خوگر ہو، دل میں خشوع و خضوع ہو، سنن و مستحبات کی پوری رعایت رہے۔ اعلیٰ یہ کہ نماز گویا حق تعالیٰ کے مواجہہ میں ہو رہی ہے۔ اس قدر حضور قلب و استغراق رہے۔ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔ اس درمیانی نماز سے کیا مراد ہے؟ اکثر ائمہ تفاسیر نے نماز عصر مراد لی ہے اور یہی معنی ابن جریر میں حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو ہریرہؓ صحابیوں اور قتادہ و ضحاک تابعین اور امام ابو حنیفہؒ و امام نخعیؒ سے مروی ہوئے ہیں۔ لیکن ابن جریر ہی میں دوسرے معنی، نماز ظہر اور نماز مغرب اور نماز فجر کے بھی اسی پایہ کے حضرات سے منقول ہیں۔ بعض نے لفظی پہلو پر زور دے کر یہ تفسیر کی ہے کہ ہر نماز چونکہ اپنی جگہ پر عبادات و حسنات کا درجۂ متوسط ہے، اور پھر ہر نماز کے ادھر ادھر کچھ نمازیں بھی ہوتی ہیں، نماز وسطیٰ کا اطلاق ہر نماز پر ہو سکتا ہے، اور اس سے کسی خاص وقت کی نماز مقصود نہیں۔

۹۰۸ (حالتِ نماز میں) قٰنِتِيْنَ - لفظ قنوت بہت جامع ہے اور حاوی ہے ذکر اور دعا اور خشوع و خضوع پر - قال ابو محمد والرازی اصل ھذا الحرف الا الطاعۃ لان جمیع
ھذہ الخصال من الصلوٰۃ والقیام فیھا والدعاء وغیر ذلک یکون عنھا (ابن تیمیہ) ۹۰۹ (جس طرح بھی بن پڑے اور جس حد تک حالات اجازت دیں) فَاِنْ خِفْتُمْ -
یعنی اگر عام قاعدہ کے مطابق نماز باجماعت میں کسی دشمن کی طرف سے خوف ہو - اسلام کی یہ روزانہ پنج وقتہ پریڈ یا دربارِ الٰہی میں حاضری اس درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ بالکل معاف عین حالتِ جنگ میں
بھی نہیں ہوتی - محافظتِ صلوٰۃ کا حکم ہر حال قطعی اور دائمی ہے - ترکِ نماز کی اجازت اس خطرہ کے حال میں بھی نہیں - البتہ رعایت ماحول کی پوری گنجائش دوسرے موقعوں کی طرح اس محل میں بھی رکھ دی گئی ہے -
نمازِ خوف کی تفصیلات کتب فقہ میں ملیں گی ۹۱۰ یعنی اب نماز عام قاعدوں کے موافق و بالتحت ادا کرو - فَاِذَآ اَمِنْتُمْ - یعنی جب دشمن کی طرف سے اندیشہ اور خطرہ باقی نہ رہے ۹۱۱ یہ وصیت

قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ
کھڑے رہا کرو ۹۰۸ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو تو تم پیدل ہی پڑھ لیا کرو یا سواری پر ۹۰۹ پھر جب

اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا
تم امن میں آجاؤ تو اللہ کو یاد کیا کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے جس کو تم جانتے

تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
(بھی) نہ تھے ۹۱۰ اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ

اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ
جائیں (اُن پر لازم ہے) اپنی بیویوں کے حق میں نفع اٹھانے کی وصیت (کر جانے) کی کہ وہ ایک

غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ
سال تک (گھر سے) نکالی نہ جائیں ۹۱۱ لیکن اگر (خود) نکل جائیں تو کوئی گناہ تم پر نہیں اس

مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ
باب میں جسے وہ بیویاں اپنے باب میں شرافت کے ساتھ کریں ۹۱۲ اور اللہ بڑا زبردست

حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا
ہے بڑا حکمت والا ہے۔ اور طلاقنوں کے حق میں بھی نفع پہنچانا دستور کے موافق مقرر ہے ۹۱۴ واجب

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ
پرہیزگاروں پر واجب ہے ۹۱۵ اللہ اسی طرح تمہارے لئے کھول کر اپنے احکام بیان کرتا ہے

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا
شاید کہ تم سمجھو ۹۱۶ کیا تجھے خبر نہیں ۹۱۷ ان لوگوں کی کہ جو اپنے گھروں سے

ع ۳۱ / ۷ / ۱۵

کا حکم اُس وقت تھا جب میراث کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے - جب میراث کے مستقل احکام نازل ہو گئے اور شوہر کے ترکہ میں ایک مستقل حصہ بیوہ کا بھی مقرر ہو گیا، تو ظاہر ہے کہ اب حکمِ وصیت پر عمل کا کوئی محل باقی نہ رہا ——— اسی کو مفسرین اپنی اصطلاح میں نسخ سے تعبیر کرتے ہیں - اُس وقت یعنی احکامِ میراث کے نزول سے قبل شریعت نے بیوہ عورتوں کے لئے حسبِ ذیل حالتیں رکھی تھیں :- (۱) وہ اگر شوہر ہی کے گھر رہنا چاہیں تو ایک سال تک انہیں کوئی بے دخل نہیں کر سکے گا (۲) انہیں کھانا کپڑا بھی اس مدت تک شوہر ہی کے ترکہ سے ملتا رہے گا (۳) وہ خود ہی اگر اپنی کسی مصلحت سے اس گھر میں رہنا نہ چاہیں، تو بعد ختم عدت ان کے لئے یہ بالکل جائز تھا، اور دوسرے حقوق کی طرح اس حق سے بھی دستبرداری کا انہیں حق حاصل تھا - مَتَاعًا - یہ نفع اُٹھانا، کھانے، کپڑے اور سکونتِ مکان کے متعلق ہو گا - المتاع عام شامل للانفاق والاسکان جمیعًا (روح) بیوہ غریب ظہورِ اسلام کے وقت یوں بھی ہر مذہب میں کس مپرسی میں پڑی ہوئی تھی - اور عرب جاہلیت میں تو کوئی اس کی بات پوچھنے کا بھی روادار نہ تھا - اسلام ہی نے آکر دنیا کی تاریخ میں پہلی بار بیوہ کی عزت اور اس کے حقوق کی نصرت کی ——— مشرکانہ مذہبوں میں تو بیوگی اور نحوست مترادف تھیں، اور بیوہ کو گھر بھر کی تحقیر و طعن کا ہدف بننا پڑتا تھا ۹۱۲ مثلاً یہی نکاح یا نکاح کی بات چیت - مِنْ مَّعْرُوْفٍ کی قید نے اسے واضح کر دیا کہ وہ کارروائی نہ کسی ضابطۂ شریعت کے خلاف ہوگی - مثلاً قانونِ عدت کی خلاف ورزی اور نہ کسی آئینِ اخلاق کے منافی ۹۱۳ عَزِيْزٌ - یاد دلا دیا کہ وہ بڑا قوت والا ہے، سو ایسے کے حکم کی خلاف ورزی کیسی بڑی سخت نادانی ہے - حَكِيْمٌ - یاد دلا دیا کہ اس کے احکام سارے کے سارے، قریب و بعید، جلی و خفی، مصالحِ بشری کے جامع ہوتے ہیں ۹۱۴ (کسی نہ کسی درجہ میں) مطلب یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق دی جائے، یہ نہ ہو کہ اسے ننگا بھوکا کر کے بھوکا پیاسا، اسی وقت گھر سے نکال دیا جائے بلکہ ایک مدت تک اس کی آسایش کا خیال اور اس کی ضرورتوں کی کفالت شوہر کے ذمہ ہے - فقہاء نے حدیث و سنت کی روشنی میں ایک سا ہی کی مدت مقرر کی ہے کہ اتنی مدت تک کھانے پہننے اور رہنے سہنے کا انتظام شوہر پر واجب ہے مطلقہ پر تینوں طلاقیں اگر ابھی نہیں پڑی ہیں، جب تو یہ حکم متفق علیہ ہے، اور اگر پڑ چکی ہیں تو حنفیہ کے ہاں جب بھی یہی حکم ہے ۹۱۵ عَلَى الْمُتَّقِيْنَ - یعنی مسلمانوں پر، کہ اس درجہ میں پرہیزگار ہر مسلمان ہوتا ہے - اے متقی الشرک (بحر) علی کل من کان متقیاً عن الکفر (کبیر) بمعنی المومنین المتقین الشرک (معالم) ۹۱۶ (اور ان پر عمل کرو) مفسر تھانویؒ نے یہاں یہ خوب لکھا ہے کہ ان احکام طلاق وغیرہ میں اتقوا اللہ اور حدود اللہ اور سمیع علیم اور عزیز حکیم اور بصیر اور خبیر اور ھم الظلمون اور فقد ظلم نفسہ وغیرہ کا اس کثرت سے آنا جو سب مخالفت پر وعیدیں ہیں، اس امر پر دلیل قطعی ہیں، کہ یہ سب احکام شریعت میں مقصود اور واجب ہیں، محض مشورہ کے طور پر نہیں ہیں کہ ان میں ترمیم و تبدیل کا ہمیں حق و اختیار حاصل ہے ۹۱۷ (اے مخاطب) اَلَمْ تَرَ - عربی میں یہ طرزِ خطاب ایسے موقع پر آتا ہے جب مخاطب کو کسی مہم اور معروف واقعہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے - رؤیت سے ہمیشہ چشمِ بصارت سے دیکھنا مراد نہیں ہوتا بلکہ وہم و تخیل اور غور و فکر اور عقل کی راہ سے بھی مطالعہ و مشاہدہ مراد ہوتا ہے - اور جب اس فعل کا صلہ الٰی کے ساتھ آتا ہے، تو کوئی مقصود کوئی نتیجہ نکالنا یا عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے - واذا عدی رأیت بالی اقتضی معنی النظر المؤدی الی الاعتبار (راغب)

۹۱۸ مین موقع جہاد پر) حَذَرَ الْمَوْتِ۔ یہ تصریح ہے اس کی کہ اتنی بڑی تعداد میں اپنے گھروں سے باہر نکل جانا محض اتفاقی نہ تھا، موت کے خوف سے تھا۔ ذکر کسی قدیم قوم کا ہے، اور اشارہ کسی ایسے واقعہ کی جانب ہے، جو مخاطبین اول، اہل عرب کے لئے معروف و متعارف تھا۔ مفسرین نے مختلف قوموں اور مقاموں کے نام لئے ہیں۔ ممکن ہے ان ہی میں سے کوئی صحیح ہو، ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کوئی قوم و مقام ہو۔ پوری تحقیق انشاء اللہ مستقبل میں قرآنیات کا کوئی ستم کرکے رہے گا۔ کچھ کام آخر آئندہ کے مفسرین و محققین کے لئے بھی تو اٹھا رہے۔ قرآن کی مخاطب جس طرح ہجرت کی دوسری صدی اور تیرھویں صدی کی دنیا رہی ہے، اسی طرح ہجرت کی پندرھویں اور بیسویں صدی کی دنیا بھی تو رہے گی۔ کچھ فرض ہے کہ جتنی تحقیقات بھی ہونا ہیں سب چودھویں صدی ہی میں ختم ہوجائے، اور آیندہ صرف انہی کو دہرا دینا اور نقل کر دینا رہ جائے! عہد عتیق کی کتاب حزقی ایل (۳۷: ۱-۱۰) میں ایک روایت بہ صورت کشف درج یا اس سے ملتی جلتی ہے۔ بہرحال قرآن کا جو اصل مقصد موعظہ و تذکیر ہے، وہ قوم و مقام کے ابہام و عدم تعیین کے باوجود بھی حاصل ہے ۹۱۹ (وباء یا کسی اور طریق سے، چنانچہ وہ سب مرگئے) یعنی وطن سے نکل کھڑے ہوئے جان بچانے کو اور حکم جہاد کی تعمیل سے جی چراتے ہوئے۔ لیکن یہ تدبیر کچھ بھی کام نہ آئی، اور الٹے موت کا شکار ہو کر رہے۔ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا۔ مقصود مجموعہ سے قول کا نقل کرنا نہیں۔ مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کرلیا، تو کوئی امر اس میں مانع نہ ہوسکا، اور عمل بن کر رہا۔ عربی میں یہ اسلوب بیان عام ہے۔ المراد انه تعالیٰ متی اراد ذلك وقع من غیر منع وتاخیر ومثل هذا عرف مشهور فی اللغة (کبیر) ۹۲۰ (اور انہیں مشاہدہ کرادیا کہ موت و زندگی کا سررشتہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ عقل و تدبیر انسانی کے ہاتھ میں نہیں، اور اس لئے جہاد یا دوسرے احکام شریعت کی تعمیل سے جی چرانا انتہائی سخافت و نادانی ہے) بعض مفسرین نے یہاں طاعون سے فرار کی بحث چھیڑ دی ہے اور فرمان نبوی نقل کیا ہے کہ جس سرزمین پر طاعون ہو وہاں سے بھاگو نہیں، اور جہاں ہو وہاں جاؤ نہیں۔ اس پر ایک عقلی اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طاعون زدہ مقام میں داخل ہونا اور طاعون زدہ مقام سے نہ بھاگنا، یہ دونوں عملاً متضاد ہدایتیں ہوگئیں۔ اگر طاعون بچنے کی چیز ہے، تو وہاں سے ہٹنے کا بھی حکم ملنا چاہیے۔ اور اگر بچنے کی چیز نہیں، تو اس شہر میں پہنچ جانے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیے! اصل یہ ہے کہ وبا زدہ مقام سے بھاگنے اور ہٹنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک کو اجازت ملی، تو بس سب ہی بھاگنا شروع کریں گے، اور شہر خالی ہوجائے گا۔ اس بے تحاشا بھگدڑ Panic سے آبادی کو جن مالی، معاشی، تمدنی، اخلاقی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا وہ بالکل ظاہر ہیں، اور یہ کثرت تجربہ و مشاہدہ میں بھی آچکے ہیں۔ پھر ایک طرف یہ عادت اگر جبنت، ثبات قلب، شجاعت اور باہمی ہمدردی کے منافی ہے، تو دوسری طرف اسباب ظاہری پر ضرورت سے زیادہ تکیہ اعتقاد کی دلیل اور توکل و اعتماد علی اللہ کے منافی، اور ایک مذہبی قوم کے بالکل غیر شایاں ہے۔ لیکن جہاں وبا ہے اور موت کا بازار ادھر گرم ہے، وہاں بے دھڑک داخل ہو جانا اور احتیاط نہ برتنا، ایک طرف سلسلۂ اسباب ظاہری کو بالکل نظر انداز کر دینا ہے، اور دوسری طرف انسان میں جو دیدہ خوف و اندیشہ طبعی کا رکھ دیا ہے، اس کے مقتضا کو پامال کرنا ہے۔ ان متضاد پہلوؤں کے درمیان اعتدال اور سلامتی کی راہ ڈھونڈ نکالنا اسلام ہی جیسے حکیمانہ مذہب کا کام تھا۔ اس نے عقلی اور طبعی تمام پہلوؤں کی رعایت رکھ کر یہ معتدل اور عادلانہ حکم دیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں نہ خواہ مخواہ جاؤ، نہ خواہ مخواہ وہاں سے نکل بھاگو ۹۲۱ (کہ انہی کے فائدے والے احکام انہیں دیتا رہتا ہے) ۹۲۲ (بلکہ الٹے ان احکام کی مخالفت میں لگے رہتے ہیں) حکم قتال معاً آگے آتا ہے۔ اس کے قبل ایسی حکایت بیان کرنا جس سے قلوب میں بے خوفی اور اللہ پر اعتماد پیدا ہو، عین تقاضائے حکمت ہے ۹۲۳ (اے امت اسلامیہ!) حکم کی مخاطب امت بہ حیثیت جماعت ہے، افراد امت نہیں۔ کہ فرداً فرداً ہر شخص جب جی چاہے، تلوار اٹھا کر چلانا شروع کر دے۔ اس تمہیدی حکایت کے بعد کہ موت و زیست سب کا آخری سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے، اب حکم ملتا ہے کہ اسی کے حکم سے اسی کے دین و آئین کی خدمت و نصرت کے لئے جہاد و قتال میں مشغول ہو جاؤ ۹۲۴ سَمِیْعٌ۔ وہ خوب سن رہا ہے، جہاد کرنے والوں اور نہ کرنے والوں دونوں کی باتوں کو۔ عَلِیْمٌ۔ وہ خوب جانتا ہے جہاد کرنے والوں اور نہ کرنے والوں دونوں کی نیتوں کو ۹۲۵ یعنی اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ خرچ کرے۔ جہاد و قتال کا حکم ابھی ملا ہے۔ قدرۃً سامان جنگ کے لئے امت اسلامیہ کو بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوگی، اس لئے پہلے ہی نمبر پر امت کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ قَرْضًا حَسَنًا۔ اصطلاح قرآنی میں اس لفظ سے مراد ہر وہ رقم ہے جو دین کی کسی مد میں خرچ ہوسکے۔ یہاں مراد مصارف جہاد ہیں۔ اس کی چندہ کو قرض اور پھر قرض حسنہ سے تعبیر کرنا عین محاورۂ عرب کے مطابق ہے کہ اہل عرب ہر اچھے معاوضہ والے عمل کو اچھے قرض اور ہر برے معاوضہ والے عمل کو برے قرض سے تعبیر کرتے تھے۔ والعرب تقول لکل من فعل الیه خیراً قد احسنت قرضی وقد اقرضتنی قرضاً حسناً (ابن جریر) قال الزجاج القرض هو کل ما یفعل لیجازی علیه تقول العرب لك هندی قرض حسن (بیضاوی) عرب ایک مشہور تجارت پیشہ قوم تھے۔ قرض، بیع و شراء وغیرہ کے الفاظ اگر ان کی زبان کے جزو بن گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایک بد دین، اردو خواں جاہل، قرآن مجید میں قرض کا لفظ دیکھ اور اسے اردو کے قرضہ پر قیاس کر، تمسخر کی راہ سے بولا کہ خدا بھی محتاج ہوگیا ہے، جو اسے بندوں سے ادھار مانگنے کی ضرورت پڑ رہی! —— جہل مرکب بھی انسان کے لئے کیسی سخت لعنت ہے! مرحوم امد حسرت فہم درست

مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ

نکل گئے تھے موت سے بچنے کے لئے، اور وہ ہزاروں ہی تھے ۹۱۸ تو اللہ نے

لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ

ان سے کہا کہ مر جاؤ ۹۱۹ پھر اس نے انہیں جلا دیا ۹۲۰ بیشک اللہ انسانوں پر بڑا فضل

عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۲۴۳ وَ

کرنے والا ہے ۹۲۱ لیکن اکثر انسان شکر نہیں ادا کرتے ۹۲۲

قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۴

اور اللہ کی راہ میں قتال کرو ۹۲۳ اور جانے رہو کہ اللہ بڑا سننے والا ہے، خوب جاننے والا ہے ۹۲۴

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ

کون ایسا ہے جو اللہ کو اچھا قرض قرض دے ۹۲۵ پھر اللہ اسے بڑھا کر

لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ

اس کے لئے کئی گنا کر دے ۹۲۶ اور اللہ ہی تنگی بھی کرتا ہے اور فراخی بھی کرتا ہے ۹۲۷ اور تم سب

تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ

اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۹۲۸ کیا تجھے خبر نہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی

مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا

ایک جماعت کی ۹۲۹ جب کہ ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا ۹۳۰ کہ ہمارے لئے ایک امیر

مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ

مقرر کر دیجئے کہ ہم خدا کی راہ میں قتال کریں ۹۳۱ (نبی نے) کہا کہیں ایسا تو نہیں، کہ

وقف لازم

منزل ۱

۹۲۶ (یعنی اصل استحقاق سے کہیں بڑھا چڑھا کر) یُضٰعِفَهٗ۔ اس کو، یعنی اس کے اجر و ثواب کو ۹۲۷ (سو اس کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرنے سے کیوں رکو، کیوں گھبراؤ) صاف بتلا دیا کہ معاشیات کے سارے قوانین اللہ ہی کی مٹھی میں ہیں۔ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے یہ سمجھ کر مفلس ہوجاؤ گے ۹۲۸ (اور وہی دین کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو جزا دے گا اور نہ خرچ کرنے والوں کو سزا) ۹۲۹ الملا۔ پر ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۹۱۔ الملا۔ ملاء مطلق جماعت نہیں، اہل حل و عقد یا اہل الرائے کی جماعت ہے۔ الملا جماعة یجتمعون علی رأی (راغب) الملأ من القوم وجوههم واشرافهم (روح) توریت میں اس موقع پر "اسرائیلی بزرگ" ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى۔ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوئی تین صدی بعد، اور حضرت داؤد سے کچھ ہی قبل کے زمانہ کا ہے۔ سنہ مسیحی کے آغاز میں ابھی کوئی ہزار گیارہ سو سال کی مدت باقی تھی ۹۳۰ مراد حضرت شموئیل ہیں (۱۱۰۰ ق م ۔ تا ۱۰۶۰ ق م) ملک شام قدیم میں ایک کوہستانی علاقہ افرائیم کے نام سے تھا۔ اس کے شہر رامہ میں آپ رہتے تھے ۹۳۱ (اور اس امیر کی ماتحتی میں ہم سب منظم ہو کر دشمنوں سے جنگ کریں) اسرائیلی اس وقت خاص طور پر دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے، اور لڑائی میں ان سے مغلوب و عاجز آچکے تھے۔ توریت میں اس کی بھی تصریح ہے کہ حضرت شموئیل نبی اس وقت بوڑھے ہوچکے تھے۔ اور آپ کے صاحبزادوں میں امارت و سرداری کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ مَلِكًا۔ عربی میں مَلِك کا لفظ بہت وسیع ہے، ہر صاحب قوت و اقتدار جو اپنے احکام و قوانین نافذ کر سکے مَلِك ہے۔ الملك هو المتصرف بالامر والنهی فی الجمهور (راغب) اور یہاں مَلِك سے مراد امیر جیش یا سالار لشکر لی گئی ہے، اور یہی سیاق کے مطابق ہے۔ یبین لنا ملك الجیش (ابن عباس) لے انهض لنا من تصدر عنه تدبیر الحرب وننتهی الی امره (بحر) ای اقم لنا امیراً (روح) طلبوا من نبیهم نحو ما كان یفعل رسول الله صلعم من التامیر علی الجیوش (کشاف) اردو میں رئیس و امیر کے الفاظ، اور سرحدی قبیلوں میں خان کا لفظ مَلِك کے مرادف ہے۔ توریت میں اس موقع پر "بادشاہ" کا لفظ آیا ہے، اور اسرائیلی تخیل میں بادشاہ کے لئے فوج کی سرداری لازمی تھی، اور ہر سردار اعلیٰ کو بادشاہ کہتے بھی تھے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔ "بادشاہ کا پہلا فرض یہ تھا کہ فوج کی امارت اور سپہ سالاری کرے" (جلد ۷، صفحہ ۵۰۱) اور یہ تصریح بھی ہے کہ "فلسطین میں تقریباً ہر سردار بادشاہ ہی کہلاتا تھا" (جلد ۷، صفحہ ۵۰۰) توریت میں اسی موقع کا بیان ان الفاظ میں ہے۔ "تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے، اور اسے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا، اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر، جو ہم پر حکومت کیا کرے، جیسا کہ سب قوموں میں ہے" (۱۔ سموئیل ۸: ۴ و ۵) "ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو تاکہ ہم بھی اور سب گروہوں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے، اور ہمارے لئے لڑائی کرے" (۱۔ سموئیل ۸: ۱۹ و ۲۰)۔

اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا

اگر تم پر قتال فرض کردیا جائے تو تم قتال نہ کرو؟ ۹۳۳ وہ بولے بھلا ہمارے

لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا

لئے کونسا ایسا سبب ہوسکتا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں نہ لڑیں۔ درآنحالیکہ ہم نکالے جاچکے ہیں

مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ

اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے ۹۳۴ لیکن جب اُن پر قتال فرض کردیا گیا تو وہ (سب)

تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾

پھر گئے بجز اُن میں ایک قلیل تعداد کے ۹۳۵ اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے ۹۳۶

وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ

اور اُن لوگوں سے ان کے نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو امیر مقرر کردیا

مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ

ہے ۹۳۷ وہ بولے اُسے ہمارے اوپر کیسے امیری حاصل ہوسکتی ہے، درآنحالیکہ ہم اس سے

بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ

بڑھ کر امیری کے مستحق ہیں اور اسے مال میں بھی تو وسعت نہیں دی گئی ہے ۹۳۸ (نبی نے) کہا

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ

کہ اسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں انتخاب کرلیا ہے ۹۳۹ اور اسے علم و جسم دونوں میں کشادگی

وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

زیادہ دی ہے ۹۴۰ اور اللہ اپنا ملک جسے چاہتا ہے دیتا ہے ۹۴۱ اور اللہ بڑا وسعت والا ہے

۹۳۲ یہ سب حضرت شموئیل نے کچھ تو اپنی فراست ایمانی سے فرمایا، اور کچھ اپنی قوم کی افتادِ طبیعت کے تجربوں کی بنا پر۔ عسیتم الا تقاتلوا کے معنی ہی کہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم نہ لڑوگے۔ یعنی اتوقع جبنکم عن القتال کما هل عسیتم میں هل تاکید کلام کے لئے ہے۔ اراد بالاستفہام التقریر والتثبیت ان المتوقع کائن (کشاف) ۹۳۳ وہ لوگ بولے، کہ واہ بھلا یہ بھی کہیں ممکن ہے۔ حکم شرعی سے قطع نظر ہم لوگ انتہائی مظلوم اور ستائے ہوئے بھی تو ہیں۔ اس دور میں فلسطینیوں کی جو شدید اور بے پناہ یورش اسرائیلیوں پر جاری تھی اور اسرائیلیوں کا ملک جس بے اندازہ حد تک ان کے ہاتھوں تاراج ہو رہا تھا اس کی تفصیلات قدیم اسرائیلی مؤرخ جوزیفس کے صفحات اور یہود کی دوسری تاریخوں میں ملتی ہیں۔ توریت بھی ان معرکہ آرائیوں کے ذکر سے بالکل خالی نہیں، ایک جگہ ہے۔ "اور جب وہ باہم مقابل ہوئے تو اسرائیل نے فلسطیوں سے شکست پائی۔ اور انہوں نے اُن کے لشکر میں سے قریب چار ہزار آدمی کے مارے" (۱۔ سموئیل۔ ۴:۲) اور دوسری جگہ ہے۔ "سو فلسطی لڑے، اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی، اور ہر ایک اپنے اپنے خیمہ کو بھاگا، اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی کہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے مارے پڑے، اور خدا کا صندوق لوٹا گیا" (۱۔ سموئیل۔ ۴:۱۰) ۹۳۴ آخر ان کے نبی کا کہا ان کے آگے آیا۔ اور بنی اسرائیل اتنے دعووں کے باوجود پست ہمتی اور بزدلی کا شکار ہو کر رہے۔ جوزیفس کی مشہور تاریخ آثارِ یہود میں ہے۔ "ان پر دہشت طاری ہوگئی۔ یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے، بعض نے زیر زمین غاروں میں پناہ لی، اور بہت سے لوگ تو اپنا ملک چھوڑ کر دریائے یردن کے پار جا کر گئے" (باب ۶۔ فصل ۷۔ فقرہ ۱) ۹۳۵ (اور اُن کی سزا بھی پوری طرح تیار) الظّٰلِمِیْنَ سے یہاں مراد اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، یعنی اللہ کے نافرمان بندے۔ هم الذین ظلموا انفسهم عن القتال وترك الجهاد (روح) ۹۳۶ طالوت بن قیس تاریخ میں قوم اسرائیل کے پہلے بادشاہ تسلیم کئے گئے ہیں۔ زمانہ حکومت ۱۰۳۰ ق۔م تا ۱۰۱۰ ق۔م۔ یہ وہی ہیں جن کا ذکر توریت میں ساؤل Saul کے نام سے آیا ہے۔ توریت میں ان کی نصب حکومت کا ذکر حسب دستور طوالت کے ساتھ موجود ہے۔ "اور خداوند نے ساؤل کے آنے سے ایک دن پیشتر سموئیل کے کان میں کہہ دیا تھا کہ کل اسی وقت میں ایک شخص کو بنیمین کی سرزمین سے تجھ پاس بھیجوں گا۔ سو تو اس پر تیل ملیو کہ وہ میری قوم اسرائیل کا حاکم ہو تاکہ میرے لوگوں کو فلسطیوں کے ہاتھ سے چھڑائے... سو جب سموئیل ساؤل سے دوچار ہوا تو خداوند نے کہا کہ دیکھ یہی شخص ہے جس کی بابت میں نے تجھے کہا تھا یہی میرے لوگوں پر ریاست کرے گا" (۱ سموئیل ۹: ۱۵۔ ۱۶) مَلِكًا یہاں ترکیب میں حال واقع ہوا ہے ۹۳۷ حضرت سموئیل نبی کا کہنا بالکل ٹھیک نکلا۔ اسرائیلی کہاں تو امیر کے تقرر کا خود ہی تقاضا کر رہے تھے، اور کہاں اب جو اس کا خدائی تقرر ہوگیا، تو لگے کٹ حجتی بھی کرنے اور کہنے کہ ایسے شخص کا انتخاب ہو کیونکر سکتا ہے۔ فلما بعث لهم ملكا انكروا ذلك وعجبوا (ابن جریر) واستبعد واجدًا ان یكون هو ملكا علیهم (کبیر) انّٰى بمعنی این کا بھی مرادف ہوسکتا ہے اور کیف کا بھی۔ حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی کمال تعجب۔ مقصود نبی کی تکذیب نہیں، صرف اس کے قول پر کمال حیرت ہے۔ کیف ومن این، وهو انكار لتملكه علیهم واستبعاد له (کشاف) الاستفهام حقیقی او للتعجب لا لتكذیب نبیهم (روح) ایک خاص قبیلہ کی طرف سے اعتراض و انکار کا ذکر توریت میں بھی ہے۔ "بنی بعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا۔ اور اس کی تحقیر کی۔ اور اس کے لئے نذرانے نہ لائے" (۱ سموئیل۔ ۱۰: ۲۷) بنی اسرائیل حضرت یعقوب کی بارہ اولادوں کی نسل میں نسلی بنا پر ۱۲ فرقوں یا قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹا قبیلہ بنی یامین کا تھا، اور توریت میں تصریح ہے کہ طالوت اسی قبیلہ سے تھے (۱ سموئیل۔ ۹: ۲۱) تو ایک وجہ تو ان کے حقیر سمجھے جانے کی یہی ہوئی۔ نسل و خاندان کی اہمیت جب جائز حدود سے بڑھ جاتی ہے، تو ہندوؤں کی طرح ذات پات کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اسرائیلیوں کا بھی اب یہ عقیدہ ہوگیا تھا کہ نبوت حق مخصوص ہے قبیلہ بنی لاوی کا، اور حکومت حق مخصوص ہے قبیلہ بنی یہودا کا۔ وكان فی بنی اسرائیل سبطان سبط نبوة وسبط مملكة ولم یكن طالوت من سبط النبوة ولا من سبط المملكة (ابن جریر) جیسے آج عام ہندوؤں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص جو نہ برہمن ہو نہ چھتری، وہ اعلیٰ حاکم و سردار کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا اعتراض اسرائیلیوں کا یہ تھا کہ یہ مالی اعتبار سے بھی تو منصب امارت کے لائق نہیں ——— جیسے ہندو کسی سے متعلق یہ اعتراض کریں کہ برہمن اور چھتری نہ سہی، یہ شخص ویش (مہاجن یا ساہوکار) کے درجہ کا بھی تو نہیں! ۹۳۸ (اور اللہ کا انتخاب ظاہر ہے کہ ہر طرح پُر حکمت و پُر مصلحت ہی ہوگا) حضرت شموئیل نبی نے پہلا اور اصلی جواب تو یہی دیا کہ یہ انتخاب انسانی نہیں خدائی ہے۔ اور اس لئے ہر طرح ہی مناسب و پُر مصالح ہے، ویسا کہ تمہارا تو ذہن بھی ان باریک مصلحتوں تک نہیں پہنچ سکتا ع ہر چہ گیرد علتی علت شود توریت میں اس مقام پر ہے۔ "اور سموئیل نے جماعت کو کہا کہ تم اُسے دیکھتے ہو کہ جسے خداوند نے چُن لیا کہ اس کی مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں" (۱ سموئیل۔ ۱۰: ۲۴) ۹۳۹ یہ شموئیل نبی کا دوسرا اور "عقلی" جواب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنے معیار سے بھی دیکھ لو۔ تمہارے معیار سے سردار فوج میں بھی دو ہی چیزیں ہونی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اسے سپہ داری و ملک گیری کے فنون سے واقفیت ہونا چاہئے۔ سو وہ طالوت کو حاصل ہے۔ اور دوسرے خود اس کی جسمی قوت و توانائی، سو اس میں بھی وہ ممتاز ہے۔ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ علم سے مراد یہاں وہی علوم و فنون ہیں جن کا تعلق ملک گیری و ملک داری سے ہے۔ ای علم الحروب (ابن عباس) لیتمكن به من حرفة الامور السیاسیة (روح) كان اعلم بنی اسرائیل بالحروب والدیانات فی وقته (مدارک) وَالْجِسْمِ۔ بسطة فی الجسم سے مراد ہوگی طولِ قد و قامت اور وجاہت ظاہری میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ ای الطول والقوة (ابن عباس) اطول من كل انسان براسه ومنكبیه (مدارک) توریت کی دی ہوئی تفصیلات سے اُن کے حلیہ کا نقشہ ذہن میں خود کھینچ لیجئے۔ "بہت خوب جوان تھا۔ اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے خوبصورت کوئی شخص نہ تھا۔ یہ ساری قوم میں کاندھے سے لیکر اوپر تک ہر ایک سے اونچا تھا" (۱ سموئیل۔ ۹: ۲) "اور وہ جب کہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شانوں سے لے کر اوپر تک سب لوگوں سے زیادہ لمبا تھا" (۱ سموئیل۔ ۱۰: ۲۳) یہ درازِ قامتی، اسرائیلیوں کے ہاں کوئی معمولی صفت نہیں، بڑی اہم اور ضروری صفت سرداری کے لئے تھی۔ توریت کے بعد اُن کے ہاں کا مقدس ترین نوشتہ تالمود ہے۔ اس کی تصریح ملاحظہ ہو۔ "خداوند تبارک وتعالیٰ اپنی سکینت کا نزول صرف اُس شخص پر کرتا ہے جو دانشمند ہو، مضبوط ہو، متمول ہو اور دراز قامت ہو" (Everyman's Talmud ص ۱۲۳) قرآن مجید کی اس بلاغت کے قربان جائیے، کہ اُس نے نام ہی ایسا رکھا جس سے بلند قامتی کی جانب پورا اشارہ ہو جائے۔ چنانچہ اہل تحقیق کا ایک گروہ اس جانب گیا ہے کہ طالوت در اصل طولوت تھا، اور طول سے مشتق۔ كان طالوت اسمه بالعبرانیة ساؤل فسمی طالوت لطوله (معالم) وقیل انه عربی من الطول واصله الطولوت (روح) ۹۴۰ (کہ وہی مالک و مختار ہے، اور اُس کی ہر عطا اقتضاء حکمت کے موافق ہی ہوتی ہے) مُلْكَهٗ۔ مُلک کی نسبت اپنی جانب کر کے اللہ نے بتا دیا کہ حقیقت میں ہی ایک ملک سارے ملکوں کا ہے

۹۴۱ وَاسِعٌ ۔ وہ بڑی ہی وسعت والا ہے، جس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ وہی ہر پست کو بلند، اور ہر ادنیٰ کو سرفراز کر سکتا ہے۔ واسع کی تفسیر واسع الفضل والرزق والرحمۃ سے بھی آئی ہے اور موسع سے بھی اور ذو سعۃ سے بھی (کبیر) عَلِیْمٌ ۔ اس کا علم محیط و کامل ہے۔ وہی خوب جانتا ہے کہ کس میں ملک گیری و ملک داری کی صلاحیت موجود ہے ۹۴۲ (یا دوسری تعریف جو تمہارے اطمینان کا کام دے سکے) کچھ عجب نہیں جو بنی اسرائیل نے اپنی قدیم اعجوبہ پرستی کی بنا پر طالوت کے لئے کسی غیبی نشان کا مطالبہ اپنے پیمبر سے کیا ہو، اور وہ اس کے جواب میں بامداد الٰہی یہ فرما رہے ہوں ۹۴۳ (درآنحالیکہ تم مدت دراز سے اپنی اس متاع عزیز سے محروم ہو) یَاْتِیَكُمُ یعنی از خود بغیر تمہاری کسی خاص جد و جہد کے آجائے گا۔ التَّابُوْتُ ۔ اس خاص صندوق کا اصطلاحی نام تابوت سکینہ ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی و قومی ورثہ تھا۔ اس کے اندر اصل نسخہ توریت مع تبرکات انبیاء محفوظ تھا۔ اسرائیلی اس کو انتہائی برکت و تقدیس کی چیز سمجھتے تھے، اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے۔ سفر و حضر جنگ و امن ہر حال میں اسے بڑی حفاظت سے اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علماء یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش حسب ذیل تھی:۔ طول ۲½ فٹ عرض ۱½ فٹ بلندی ۱½ فٹ۔ بنی اسرائیل اپنی ساری خوش بختی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے۔ مدت ہوئی فلسطینی اسے ان سے چھین لے گئے تھے۔ اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست و بدطالعی سمجھ، اس کی واپسی کے لئے نہایت درجہ بیتاب و مضطرب تھے طالوت کے وقت میں یہ تابوت واپس آجانے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں حضرت سلیمانؑ (متوفی ۹۳۳ ق م) تک رہا۔ اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسی میں اسے رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن ہے۔ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی توریت کا نسخہ شفا۔ ۹۴۴ یعنی ان دونوں حضرات اور ان کی مقدس اولاد کے آثار و تبرکات۔

بعض اہل طریق نے کہا ہے کہ اولیاء اللہ کے احترام کا جو طریقہ چلا آرہا ہے، اس کی اصل اور سند اسی تعظیم تابوت سے مل جاتی ہے ۹۴۵ تاریخ کا بیان ہے کہ فلسطینی اس تابوت سکینہ کو چھینے کو تو چھین لائے، لیکن جس تاریخ سے اسے لیکر آئے ایک دن بھی چین نہ اٹھانے پائے۔ ابھی وبا کا زور ہے ابھی کوئی اور مصیبت۔ آخر عاجز آکر یہ طے کیا کہ (نعوذ باللہ) اس نحوست کی پوٹ کو کہیں اور پھینکوا دیا جائے۔ ایک بیل گاڑی پر اسے لادا، گاڑی کو بغیر کسی گاڑیبان کے یوں ہی ہانک دیا۔ بیل سیدھے علاقہ بنی اسرائیل کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور گاڑی صوبہ یہودا کے شہر بیت شمس میں آکر ٹھہر گئی۔ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ تکوینی تصرفات جتنے بھی ہوتے رہتے ہیں سب فرشتوں ہی کے ذریعہ سے انجام پاتے رہتے ہیں چنانچہ بیلوں کا رخ خاص اسرائیلی علاقہ کی جانب کر دینا بھی فرشتوں ہی کا کام تھا۔ اور یہی غیبی نشان تھا طالوت کی تائید میں۔ بائبل میں تابوت سکینہ کی بازیابی عہد طالوت سے بہت پیشتر درج ہوگئی ہے۔ قرآن مجید نے یہاں یہ تصریح کر کے، حسب معمول، بائبل کے بیان کی تصحیح کر دی ——— مسیحیوں اور ان کے حلیفوں کی یہ کوشش جس قدر مضحکہ خیز ہے اسی قدر عبرت انگیز بھی کہ بجائے اس کے کہ قرآن جیسی محکم، محفوظ، مستند دستاویز کو بائبل پر پیش کریں، اور اس کی روشنی میں بائبل کے بیانات کو جانچیں پرکھیں، الٹے بائبل جیسی مشتبہ، غیر محفوظ، بے سند تحریر کی روشنی میں قرآن مجید کے بیانات کو جانچنا، پرکھنا چاہتے ہیں! ——— گویا آفتاب کی روشنی میں لالٹین کو دیکھنے کی بجائے لالٹین سے آفتاب کو دیکھنے کی کوشش! ۹۴۶ (تصرف غیبی کا) فِیْ ذٰلِكَ ای فی رجوع التابوت الیکم (مدارک) ای فی اتیان التابوت (بحر) لَكُمْ ۔ تمہارے لئے، یعنی تمہارے اطمینان کے لئے ۹۴۷ (اپنی فوج والوں سے) فَصَلَ یعنی دشمن کے مقابلہ میں بڑھے ۹۴۸ (صبر و ثبات، ضبط اور ڈسپلن میں) نَهَرٍ ۔ دریا سے یہاں مراد دریائے یردن Jorden ہے۔ یہ دریا بڑا نہیں، براہ راست لمبائی کل ۶۵ میل کی ہے۔ البتہ اس کے خم و پیچ ملا کر کوئی ۲۰۰ میل کی ہے۔ علاقہ فلسطین میں اہم ترین دریا یہی ہے، اور گویا ملک کی قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ یردن کے اس پار اور اس پار علاقوں کی تقسیم خود توریت میں درج ہے۔ (یوشع ۔ ۱:۱۳ و ۱۵) اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی جانب ہے۔ اور بحر جلیل اور بحر طبریہ ہوتا ہوا بحر مردہ Dead Sea میں جا گرتا ہے۔ اس کا پانی شروع میں تو صاف شفاف، شیریں ہے، لیکن آگے چل کر گندلا، بدبودار اور مضر ہو جاتا ہے ۹۴۹ یعنی میرے ہمراہیوں، رفیقوں میں سے نہیں ہے۔ یہ معنی نہیں کہ وہ سرے سے ایمان ہی سے خارج ہوگیا۔ لے من اشیاعی (روح) لیس من اتباعی و اشیاعی (مدارک) لم یخرجهم بذالك عن الایمان (بحر) شَرِبَ مِنْهُ ۔ یعنی جی بھر کر اس میں سے پانی پی لے گا۔ موسم گرمی کا تھا، اور طالوت کے سپاہیوں کو پیاس قدرۃً زور کی لگی ہوئی تھی ۹۵۰ معلوم ہوا کہ اصل حکم وہی پہلا تھا کہ کوئی راستہ میں یہ پانی زبان ہی پر نہ رکھے، اور یہ دوسرا حکم بطور رخصت و اجازت تھا کہ خیر ایک آدھ چلو سے منہ تر کر لینے میں مضائقہ نہیں۔ مَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ ۔ لے من لم یذقہ (روح) ھی لم یذق منه من طعم الشیٔ (مدارک) اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ ۔ معناہ الرخصة فی اغتراف الغرفة بالید دون الکرع (مدارک) ۹۵۱ ان کی تعداد حسب روایت توریت ... تھی) "تب ساؤل نے ان لوگوں کو جو اسکے پاس حاضر تھے گنا۔ اور وہ مرد چھ سو کے قریب تھے" (۱۔ سموئیل ۱۳:۱۵) شَرِبُوْا مِنْهُ ۔ یعنی خوب سیر ہو کر پیا جس کے بعد چلنا، خصوصاً فوجی مارچ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

عَلِیْمٌ ﴿٢٤٧﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ
بڑا علم والا ہے ۹۴۱ اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ اس کی امارت کا نشان یہ ہے ۹۴۲ کہ تمہارے پاس
التَّابُوْتُ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ
وہ صندوق (از خود) آجائیگا جس میں (سامان) تسکین تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے ۹۴۳ اور کچھ بچی ہوئی
اٰلُ مُوْسٰی وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
چیزیں بھی جنہیں آل موسیٰ اور آل ہارون چھوڑ گئے ہیں ۹۴۴ اس (صندوق) کو فرشتے لے آئیں گے ۹۴۵ بیشک
لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿٢٤٨﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ
اس واقعہ میں تمہارے لئے ایک نشان ہے ۹۴۶ اگر تم ایمان والے ہو۔ پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر
بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ
بڑھے ۹۴۷ تو بولے ۹۴۸ کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعہ سے لینا چاہتا ہے ۹۴۹ سو جو کوئی اس میں سے پانی
مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْٓ
پی لے گا وہ میرا نہیں ہے ۹۵۰ اور جو کوئی اسے نہ چکھے سو وہی میرا ہے،
اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِیَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا
مگر ہاں جو کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (اس کا مضائقہ نہیں) ۹۵۱ لیکن ان (سب) نے اس سے پی
قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ
لیا بجز ان میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے ۹۵۲ پھر جب طالوت اور مومنین بھی ان کے ساتھ اس (دریا) سے اتر گئے
قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ
تو وہ لوگ بولنے لگے کہ آج تو ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی طاقت نہیں ۹۵۳ اور وہ لوگ

ع ٣٢/ ١٦

۹۵۲ (بہ نظرِ احوالِ ظاہر) یہ گفتگوئیں آپس میں ہونے لگی۔ دشمن کی کثرتِ تعداد اور اس کی عظمت و سامان پر نظر کرکے اس کی ہیبت دل میں بیٹھ جانا اور اپنی طرف سے مایوس ہوجانا ایک امرِ طبعی تھا۔ اچھے اچھے اہلِ ایمان کی بھی ہمت ایسے موقع پر طبعی طور پر چھوٹ جاتی ہے۔ جوزیفس اسرائیلی کی تاریخ آثارِ یہود میں ہے:۔ "طالوت اور اس کے لشکری یہ سامان دیکھ کر سہم اُٹھے" (باب ۶-۹ ،۱) خود توریت کی روایت ہے:۔ "جس وقت ساؤل اور سارے اسرائیل نے اس فلسطی کی باتیں سُنیں تو اُن کی دلاوری نکل گئی اور وہ نپٹ ڈر گئے" (۱۔سموئیل ۱۷: ۱۱) جَالُوْتَ۔ فلسطینیوں کے لشکر کا مشہور سردار بڑے تن و توش کا پہلوان تھا۔ گویا انسان کیوں تھا، دیوزاد تھا۔ توریت میں اُس کی جسامت قد و قامت، اُس کی شہ زوری، اُس کے اسلحہ اور اُس کی مبارزت کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا قد، اف کا تھا، بجز چہرہ کے، سر سے پیر تک آہن پوش رہتا تھا، اور اُس کی سپر کا وزن کوئی تین من کا تھا! ۹۵۳ (آخرت میں) لشکرِ طالوت میں مومن تو سب ہی تھے، بہتوں پر لشکرِ جالوت کی ہیبت طبعی طور پر طاری ہوگئی۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا ایمان خدا اور آخرت پر بالکل پختہ و غیر متزلزل رہا۔ اُس وقت بھی ان کے ذہن میں یہ عقیدہ مستحضر تھا اور وہ ہنگامی طور پر بھی مرعوب و دہشت زدہ نہ ہوئے۔ بلکہ بڑے استقلال کے ساتھ بولے۔ يَظُنُّوْنَ۔ ظن یہاں گمان کے معنی میں نہیں، علم و یقین کے معنی میں ہے۔ اے یعلمون ویستیقنون (ابن عباسؓ) اے یوقنون بالشهادة (مدارک) يحتمل ان يكون الظن بمعنى الايقان اے یوقنون بالبعث والرجوع الى الله قاله السدى (بحر) ۹۵۴ (اس لئے دشمن کی کثرتِ تعداد سے خوف ہی کیا) ان مومنین راسخین نے اس وقت بھی کہا کہ اصل شے تو ایمان کی مضبوطی ہے۔ ایمان سے لبریز اقلیت بارہا اکثریت پر غالب آچکی ہے۔ باذن اللہ میں اذن، مشیتِ تکوینی کے معنی میں نہیں۔ حکم و توفیقِ الٰہی کے معنی میں ہے۔ اے بحکمه وتيسيره (روح) باذن اللہ کی قید نے اسے بھی واضح کردیا کہ اہم ترین شے ذاتی ہمت و شجاعت نہیں، یہی تائیدِ غیبی ہوتی ہے۔ ۹۵۵ (اسلئے اہم و مقدم شے صبر و ثبات اور اعتماد علی اللہ ہے) مع سے اللہ کی معیت جسمانی مراد نہیں، اس کی معیتِ نصرت و امداد کے ساتھ مراد ہے۔ المراد منه المعية بالنصر والاحسان (روح) اے بالنصر (مدارک) المراد به معية نصره وتوفيقه (ابو سعود)

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

جنہیں یقین تھا کہ اللہ کے رُوبرو پیش ہوں گے ۹۵۳ بولے کہ بارہا! چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٢٤٩﴾

پر اللہ کے حکم سے غالب آگئی ہیں ۹۵۴ اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۹۵۵

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا

اور جب وہ جالوت اور اُس کی فوجوں کے مقابل آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار ہمارے اوپر

صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾

صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں غالب کر کافر لوگوں پر ۹۵۶

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ

پھر انہوں نے ان کو اللہ کے حکم سے شکست دیدی ۹۵۷ اور داؤد نے جالوت کو قتل کردیا ۹۵۸ اور اللہ

اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ

نے داؤد کو بادشاہت اور دانائی عطا کی، اور جو کچھ چاہا انہیں سکھایا ۹۵۹ اور اگر اللہ بعض

اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ

لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو (ہرطرف) زمین پر فساد برپا ہوجاتا ۹۶۰

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٥١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ

لیکن اللہ تو جہان والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے ۹۶۱ یہ اللہ کی آیتیں

اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٥٢﴾

ہیں، ہم انہیں آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک ۹۶۲ اور آپ یقیناً مرسلین میں سے ہیں ۹۶۳

۹۵۶ ان دونوں آیتوں میں اللہ کے لشکر کے سپاہیوں کو آدابِ جنگ کی تعلیم ہے، کہ بہ خلاف عام فوجی سپاہیوں کے ان کا تکیہ قوت و شوکت پر نہیں، بلکہ نصرتِ الٰہی پر ہوتا ہے۔ قرآن اور توریت موجودہ کے بیانوں کا مقابلہ کرلیا جائے۔ توریت میں نفسِ جنگ کے خشک و خارجی واقعات کی تفصیل قرآن سے کہیں زائد ہے۔ لیکن وہ بس اسی پر قانع ہے۔ گویا کوئی کتاب تذکرہ و تاریخ کی ہے۔ قرآن مجید اس کے برخلاف ہر موقع پر تعلیم اصولِ دین اور اخلاقِ عالیہ کی دیتا جاتا ہے۔ اور یہی اس نے یہاں بھی کیا۔ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا یعنی ہمیں ثباتِ قلب کی توفیق دے۔ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا۔ یعنی ہمیں ثباتِ قدم نصیب کر۔ فَانْصُرْنَا۔ ثباتِ قلب و ثباتِ جسم کے بعد کافروں پر غلبہ تو قدرتی نتیجہ کے طور پر شاید حاصل ہو ہی جاتا لیکن مومنین عارفین کی نظر اپنے سارے انتظامات اور ساری سعی سے کہیں بڑھ کر تائیدِ الٰہی پر رہتی ہے۔ اس لئے صراحت کے ساتھ فتح و غلبہ کی دعا بھی ان کی زبان سے نقل کی گئی ۹۵۷ فَهَزَمُوْهُمْ۔ انہوں نے انہیں یعنی طالوت کے لشکر نے جالوت والوں کو شکست دیدی۔ اذن۔ یہاں بھی حکم و توفیق کے معنی میں ہے۔ توریت میں فلسطینیوں کی اس شکستِ فاش کی منظر کشی یوں کی گئی ہے:۔ "اور فلسطیوں نے جو دیکھا کہ اُن کا پہلوان مارا پڑا تو وہ بھاگ نکلے، اور اسرائیل اور یہوداہ کے لوگ اُٹھے اور للکارے، اور فلسطیوں کو وادی تک اور عقران کے پھاٹک کی راہ تک رگیدا" (۱۔سموئیل ۱۷: ۵۲) ۹۵۸ دَاوٗدُ۔ داؤد بن یسی بن عوبید (۱۰۲۲ تا ۹۶۳ ق م) ایک پیغمبر برحق ہوئے ہیں۔ قرآن مجید میں آپ کا ذکر ۱۶ مقاموں پر آیا ہے۔ طالوت کی فوج میں محض ایک نوجوان سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے۔ اس وقت تک نہ نبوت سے سرفراز ہوئے تھے، نہ ملک و سلطنت سے۔ توریت میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ درج ہے:۔ "اور ایسا ہوا کہ جب فلسطی اُٹھا اور آگے بڑھ کر داؤد کے مقابلہ کے لئے نزدیک ہوا تو داؤد نے پھرتی کی۔ اور صفوں کی طرف داؤد سے مقابلہ کرنے دوڑا۔ اور داؤد نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ اور اُس میں سے ایک پتھر لیا اور فلاخن میں دھر کے فلسطی کے ماتھے پر ایسا مارا کہ وہ پتھر اُس کے ماتھے میں غرق ہوگیا۔ اور وہ زمین پر منہ کے بل گر پڑا۔ سو داؤد ایک فلاخن اور ایک پتھر سے اس فلسطی پر غالب ہوا۔ اور اُس فلسطی کو مارا اور قتل کیا" (۱۔سموئیل ۱۷: ۴۸-۵۰) ۹۵۹ (یہ سب کچھ اس واقعہ کے بعد ہوا) اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ۔ یہ بادشاہی خدائی عطیہ تھی، پہلے تو اسی کو قرآن نے صاف کیا۔ یہ فرماں روائی قومِ اسرائیل کو عطا ہوئی۔ حضرت داؤدؑ نسلِ اسرائیلی کے دوسرے بادشاہ ہیں۔ تاجدارِ اوّل طالوت تھے۔ آپ اُنہی کے داماد تھے۔ طالوت جب مع اپنے بڑے فرزند کے میدانِ جنگ میں کام آگئے تو قبیلہ یہودا نے آپ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اور دو سال کی کشمکش کے بعد باقی قبیلوں نے بھی آپ ہی پر اتفاق کرلیا۔ سات سال تک آپ نے اپنا پایہ تخت حبرون (یعنی الخلیل) کو رکھا۔ اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے نکال کر اُسے دارالسلطنت بنایا۔ آپ نے اپنے گرد و پیش کے حکمرانوں کو مسخر و مغلوب کیا۔ اور اپنے حدودِ سلطنت کو خوب وسیع کیا۔ آپ کا عہدِ حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحاتِ ملکی اور حسنِ انتظام دونوں کے لئے یادگار ہے۔ الحكمة۔ حکمت سے یہاں مراد نبوت ہے۔ جو حکمت کا بلند ترین مقام ہے۔ حکمت کے عام معنی تمیز و دانائی بھی مُراد ہو سکتے ہیں۔ قيل الحكمة العلم والعمل بها وفسرها بعضهم بالنبوة (بحر) اے النبوة (بیضاوی) الحكمة به وضع الامور مواضعها على الصواب والصلاح وكمال هذا المعنى يحصل بالنبوة فلا يبعد ان يكون المراد هنا النبوة (کبیر) عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ۔ علومِ انبیاء کا احاطہ کون کرسکتا ہے! مِمَّا يَشَآءُ کے عموم میں وہ تمام علوم، فنون و صنائع آگئے جو حضرت داؤدؑ کو سکھا دیئے گئے تھے۔ مِمَّا میں مِن تبعیضیہ نہیں ابتدائیہ ہے ۹۶۰ (غلبہ بدی و بدکاری سے) بَعْضَهُمْ۔ یعنی مفسدوں، نافرمانوں، قانون شکنوں، باغیوں کو۔ بِبَعْضٍ یعنی دوسرے بندوں کو مشیتِ تکوینی کا آلۂ کار بناکر۔ یہاں یہ عام قانون بتا دیا کہ دنیا میں حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوا کرتے ہیں یہ یوں ہی بلا ضرورت و مصلحت "گردشِ گردوں" سے نہیں ہوجایا کرتے، بلکہ ہمیشہ با مقصد و پُرحکمت ہی ہوا کرتے ہیں اور ان سے ظلم و عصیان و طغیان کی اصلاح مدنظر ہوتی ہے۔ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس عالمِ اسباب میں مشیتِ تکوینی جو کام بھی لیتی ہے بندوں ہی کے واسطہ اور ذریعہ سے لیتی ہے ۹۶۱ (اس لئے وہ اپنے فضل و کرم سے روئے زمین پر اس فسادِ عظیم کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا اور بدکاروں اور نافرمانوں کے غلبہ و تسلط کو دوسروں کے ذریعہ سے ہٹاتا اور مٹاتا رہتا ہے) غرض یہ کہ ہر ایسے انقلابِ حکومت کے عقب میں رحمتِ الٰہی ہی کام کرتی رہتی ہے ۹۶۲ بالحق یعنی بالکل بے کم و کاست، اپنی اصلی حالت میں، اور غرضِ صحیح کے ساتھ۔ باليقين الذى لا يشك فيه اهل الكتب (مدارک) بالوجه المطابق الذى لا يشك فيه اهل الكتاب وارباب التواريخ (بیضاوی) اے ملتبسه باليقين الذى لا يرتاب فيه احد من اهل الكتاب وارباب التواريخ (ابو سعود) گویا یہاں یہ ظاہر کردیا کہ صحیح و مستند بیان صرف قرآن ہی کا ہے۔ دوسری الہامی کتابوں اور مذہبی نوشتوں کی طرح اس کے قصے غلط سلط اور مسخ شدہ ہوکر نہیں رہ گئے ہیں۔ اور اس کی ایک مثال خود یہی قصہ طالوت ہے۔ بائبل والوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ۹۶۳ (بس آپ اپنے پیغمبر برحق ہونے میں اصلاً شک نہ کیجئے، ان حقائق کا نزول پیغمبروں ہی پر ہوتا ہے) مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ لفظ مرسلین کی معنویت قابلِ غور ہے۔ انبیاء کی حیثیت اسلام میں تمام تر قاصدوں، سفیروں، بھیجے ہوؤں کی ہے۔ اور جو مرسل (بھیجا ہوا) ہوتا ہے، ظاہر ہے، کسی کی طرف سے، کسی کے پاس ہی بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ یہ مرسلین یا پیامبر، خالق کی طرف سے مخلوق کے پاس ایلچی بن کر آتے ہیں۔ ان کی عظمت و بزرگی جو کچھ بھی ہے، اُن کے اسی منصب متعارف و پیامبری سے وابستہ ہے۔ یہ خود نہ اوتار بھجتے ہیں نہ دیوتا، نہ خدائی کے مظہر، نہ ان میں خدائی حلول کئے ہوتی ہے۔ معبودیت یا نیم معبودیت کی صلاحیت یہ ذرا سی بھی نہیں رکھتے۔ اللہ اکبر! شرک بلکہ شائبۂ شرک سے بھی بچنے کا قرآن مجید کو کس درجہ اہتمام ہے۔ اور الفاظ تک کے انتخاب میں وہ اس کا کیسا لحاظ رکھ لیتا ہے۔

ضمیمہ پارہ ۲

متعلق آیت ۱۸۳ حاشیہ ۶۵۱

(۱)

کھانا انسان کی زندگی قائم رکھنے کے لئے ہے، یا انسان کی زندگی اس لئے ہے، کہ اُسے کھانے پینے کی لذتوں میں بسر کیا جائے؟ موجودہ مادی دنیا نے شق دوم کو اختیار کیا ہے، اور اس کا عمل بھی اسی پر ہے۔ مذہب نے شق اوّل کو اختیار کیا ہے، اور اپنے پیروؤں کو اس پر عمل کی ہدایت کی ہے۔

اسلام دینِ فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس میں کوئی شے فطرتِ انسان و فطرتِ کائنات کے مخالف ہو نہیں سکتی۔ وہ ایک طرف اپنے پیروؤں کو جائز لذتوں سے لُطف اُٹھانے کی بار بار دعوت دیتا ہے اور دُوسری طرف قدم قدم پر لاتُسْرِفُوا! دائرۂ اعتدال سے قدم باہر نہ رکھو کی بھی تاکید کرتا جاتا ہے۔ لذتوں پر جُھک پڑنے کا نام فسق ہے، اور لذتوں سے بالکل کنارہ کش ہو جانے کو رہبانیت کہتے ہیں۔ اسلام نے جو شاہراہِ ہدایت دنیا کے سامنے پیش کی ہے، وہ فسق و رہبانیت، دونوں سے بیچ کران کی درمیانی راہ ہے۔

خواص جب گمراہ ہوتے ہیں، تو رہبانیت کے ڈھرے پر پڑجاتے ہیں۔ عوام کی گمراہی کا نام فسق ہے نفسِ انسانی میں لذتوں پر جُھک پڑنے کا قدرتی میلان موجود ہے۔ انسان اکثر انھی لذتوں پر گرتا ہے اور ایسا گرتا ہے کہ انسانیت سے گزر کر بہیمیت کے غار تک پہنچ جاتا ہے۔ رُوح کو چاہیئے کہ روز بروز لطافت کی جانب ترقی کرتی جائے، تاکہ جب جسم سے جُدا ہو جانے کا وقت آئے تو اپنے مرکزِ اصلی کی جانب پرواز کر کے جوار سرتاپا نور و لطافت ہے، وصل و وصال کا وہ انتہائی لُطف و سرور حاصل کرے جس کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنت ہے لیکن انسان جب فسق میں مبتلا ہو جاتا ہے یعنی اُن مادی لذتوں میں پڑجاتا ہے، جو اس کی رُوحانی صحت کے حق میں مضر ہیں، تو رفتہ رفتہ اسکی رُوح کثافت اور گندگی میں آلودہ رہنے لگتی ہے، یہاں تک کہ جسم سے جُدا ہونے کے بعد اُس میں اپنے مرکزِ اصلی کی جانب پرواز کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور مجبوراً اُسے تنزّل کر کے مادہ کی کثافتوں اور آلائشوں کے مرکز سے آمیز ہونا پڑتا ہے، جو اس سو کوئی بھی طبعی و خلقی مناسبت نہیں رکھتے، اس لئے اسے انتہائی اذیت و تکلیف کا سامنا ہوتا ہے اور اس کو مذہب کی اصطلاح میں دوزخ کہتے ہیں۔

اسلام خلق اللہ کو راحت و سرُور کی انتہائی منزل تک پہنچانے کا بہترین راہبر ہے۔ اس نے چُن چُن کر اپنے نظام و آئین میں وہی باتیں رکھی ہیں، جو رُوح کی فطری صلاحیت کو بڑھائیں، اور گندگی و کثافت میں آلودہ ہونے سے اُسے محفوظ رکھیں۔ ان سب تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر کا نام روزہ ہے۔ محض بھُوکا اور پیاسا رہنا یا خواہ مخواہ کسی کو اپنے تئیں گرسنگی و تشنگی کی تکلیف میں مبتلا کرنا، ہرگز روزہ کا مُدعا نہیں۔ روزہ کی غرض و غایت صرف یہ ہے کہ انسان کچھ دیر کے لئے تمام اہم لذاتِ مادی کی طرف سے بے توجہ ہو کر رُوح کو اپنی صفائی و پاکیزگی کی جانب متوجہ ہونے کا موقع دے۔ قرآن پاک میں روزہ کی غایت دو لفظوں میں فرمادی ہے۔ لعلکم تتقون (تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ) 'تقویٰ' کے معنی 'بچنے' کے ہیں۔ بچنا کس شے سے ہے؟ ہر اُس شے سے جو رُوح کی پرواز و ترقی میں حائل ہوتی ہے۔ ہر اُس شے سے جو رُوح کے جوہرِ لطیف کے حق میں زہر کا اثر رکھتی ہے۔ ہر اُس شے سے جو رُوح کو کثافتوں اور آلائشوں کی دلدل میں پھنسائے رکھتی ہے۔ قرآنی بلاغت کا یہ معجزہ ہے کہ اس سارے مفہوم کو ایک لفظ 'تتقون' کے ذریعہ سے ادا کر دیا۔

نماز اور روزہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے دو جُداگانہ چیزیں نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کے ایجابی و سلبی، مثبت و منفی، دو پہلو ہیں۔ نماز کی حیثیت فاعلی ہے، یعنی دربارِ خداوندی میں حاضری دو، اپنی رُوح جزئی کا براہ راست تعلق رُوح کُلی سے پیدا کرو۔ روزہ کی حیثیت انفعالی ہے، یعنی ان چیزوں سے بچو جو اس راہ میں حائل ہوتی ہیں، جو رُوح کو اس رفتارِ ترقی کے ناقابل بناتی ہیں۔ طبیب حاذق علاج بھی کرتا ہے، اور پرہیز بھی بتاتا ہے۔ شفا اُسی وقت ممکن ہے جب مریض دونوں ہدایتوں پر عمل کرے۔ نماز بمنزلہ دوا ہے، اور روزہ بمنزلہ پرہیز۔ دوا اور پرہیز دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر ظاہر ہے۔

یہیں سے ہے، کہ دُنیا کے کامل ترین انسان کو نماز کے بعد جو عبادت سب سے زیادہ محبُوب تھی وہ روزہ تھا۔ رسُولِ خُدا صلعم اس کثرت سے روزہ رکھا کرتے تھے کہ اہلِ خاندان اور صحابہؓ بعض اوقات دنگ رہ جاتے۔ وجہ کھلی ہوئی ہے۔ اعلیٰ ترین رُوح کو رُوحانی پاکیزگی و صفائی کے نمونے بھی بہترین اور کامل ترین دکھانے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا جس جس نے عمل کیا وہ اپنی مراد کو پہنچ کر رہا۔

کھانے پینے میں زیادتی کرنا، عورت سے میل ملاپ پر حریص ہونا، جھوٹ بولنا، سخت کلامی کرنا، کسی کا دل دُکھانا، کسی کے پیچھے اس کا بُرائی سے ذکر کرنا، مال و دولت کی ہوس کرنا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو رُوح کی لطافت کو صدمہ پہنچاتی ہیں، اس کی بالیدگی کو روک دیتی ہیں، اس میں تازگی کی بجائے پژمُردگی پیدا کرتی ہیں۔ اور جسم و مادہ کی کثافتوں کو بڑھاتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی تمام چیزوں سے بچنے اور پرہیز کرنے کا نام روزہ ہے۔ اور روزہ دار کے لئے یہ سب اُمُور ممنوع ہیں۔

انسان، اگر اپنی عمر کا بیشتر حصہ ان پابندیوں کے ساتھ گزار سکے تو اس کے مرتبہ کا کیا پوچھنا، لیکن کم از کم سال کا بارہواں حصہ تو اس طرح گزارنا اپنے لئے لازمی سمجھے۔ اور اگر بہت سے بندے مل کر ایک خاص زمانہ اس کے لئے مقرر رلیں جس میں وہ سب شریک ہوں تو شرکت و اجتماع کی بنا پر نفسِ روزہ کی برکتیں بدرجہا بڑھ سکتی ہیں۔ مگر سب کا اپنے ارادہ سے ایک خاص زمانہ مقرر کرنا ممکن نہیں کسی کو کبھی سہولت ہوگی کسی کو کبھی۔ اس لئے خود شریعت نے راحت و سرورِ ابدی کی منزل کے بہترین، ہموار ترین و محفوظ ترین راستہ کا نام شریعت ہے، ایک خاص مہینہ کا تعین کر دیا، جسے رمضان سے موسوم کرتے ہیں۔

خدائے اسلام جس طرح ہمارے رکوع و سجود، ہماری تکبیر و تسبیح سے بے نیاز ہے، اسی طرح اُسے ہمارے بھُوکے اور پیاسے رہنے، ہمارے روزہ و تراویح ہماری سحری و افطار کی بھی کوئی حاجت نہیں۔ یہ تمام اُمور صرف ہمارے نفع و فائدہ کے لئے ہیں۔ ہماری طبیعتیں اور سرشتیں چونکہ شیطانی اثرات سے مسخ ہو چکی ہیں۔ اس لئے آج بہتوں کو روزہ کی پابندی ایک بار معلوم ہوتی ہے لیکن کل جب حجابات دُور ہو جائیں گے، جب آنکھیں کھل جائیں گی، اس وقت اندازہ ہو سکے گا کہ رُوح میں اعلیٰ صلاحیتیں پیدا کرنے کے لئے اور ابدی سرور و دائمی راحت حاصل کرنے کے لئے روزہ کتنا سہل، آسان، مفید و مؤثر نسخہ تھا۔ کاش ہمارے سب بھائیوں کی آنکھیں آج ہی کھل جائیں۔

(منقول از "سچ" لکھنؤ ہفتہ وار، مورخہ ۳- اپریل ۱۹۲۵ء - ایڈیٹر عبد الماجد)

(۲)

بہار کا موسم آتے ہی چمن دہر میں رُوح پرور ہوائیں چلنے لگتی ہیں، خشک درخت سبز ہو جاتے ہیں، پھُول کھِلنے لگتے ہیں جسم انسانی کی رگوں میں تازہ خون کی گردش ہونے لگتی ہے، سوئی ہوئی امنگیں جاگ اُٹھتی ہیں، اور جستی و توانائی کا دَور دورہ شروع ہو جاتا ہے جسم و مادہ کی کائنات میں آفتاب کا ایک پُورا دورہ گزر جانے کے بعد یہ موسم آتا ہے۔ اور طبیبوں کا بیان ہے کہ جسم سے مادۂ فاسد کے دفع کرنے اور مسہل لینے کا یہ بہترین زمانہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح رُوح و جان کی کائنات میں بھی چاند کا ایک پُورا دورہ گزر جانے کے بعد موسم بہار آتا ہے ماہتاب کو عشق کے سودا زدوں سے مناسبت ہے۔ ظاہر ہے، ماہتاب جب اپنے سالانہ سفر کا چکر ختم کرتا ہے، تو عشق و محبت کی اقلیم میں پھر شوریدگی و جنون کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، اور سال کے گیارہ مہینے کے اندر غیریت کی جو کدورتیں جم جاتی ہیں، طبیعت ان کے دفع کرنے کے لئے بیقرار ہو جاتی ہے، اسی لئے رحمتِ کاملہ و محبوبیت مطلقہ نے اپنے وفا شعاروں، اپنے پرستوں کے لئے ایک خاص مہینہ، ماسوا سے بے تعلق و بے نیاز رہنے کا مقرر کر دیا۔ جس کو اصطلاح میں ماہِ رمضان سے موسوم کرتے ہیں۔ یآایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام اے حسنِ ازل سے پیمانِ وفا باندھنے والو۔ اے اپنے محبُوب کی یکتائی کا کلمہ پڑھنے والو، اگر اپنے دعوی میں سچے ہو، آؤ، اپنے طریقِ عشق و آئینِ اُلفت میں، ایک مہینہ تک ماسوا پر نظر کرنا تک ناجائز سمجھو، اور اپنی تمام نفسانی لذتوں کو اس بڑی اور حقیقی لذت کے تصور پر قربان کرتے رہو، کہ یہی نفسانی لذتیں، اس شاہدِ حقیقی کے وصال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔

یہ شرط محض تمہارے ساتھ مخصوص نہیں، اکیلے تم ہی اس آزمائش میں نہیں ڈالے گئے ہو، بلکہ تمہارے اگلوں میں سے جس جس گروہ نے ہم سے پیمانِ وفا باندھا، جس جس جماعت نے راہِ اُلفت میں قدم رکھنے کا دعوی کیا، اُن سب کو اپنے دعوے کا کچھ ایسا ہی ثبوت پیش کرنا پڑا ہے، ان سب کو کچھ ایسی ہی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، ہر اساں نہ ہو، بہتوں کی آزمائش اسی طرح ہو چکی ہے۔ کما کتب علی الذین من قبلکم۔ اور اس حکم سے غرض تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں

ل "صوم" کے معنی ہیں، باز رہنے اور رُکنے کے، خواہ کھانے سے ہو یا کلام کرنے سے، یا کسی اور چیز سے جس پر نفس حریص ہو یا جو طبیعت کو مرغوب ہو۔ الصوم فی الاصل الامساک عن الفعل مطعماً کان او کلاماً او مشیاً (راغب۔ الصوم) الصوم فی اللغۃ الامساک عما تنزع الیہ النفس (بیضاوی) لما سک عن طعام او کلام او نحوھما (جستانی)

تمہاری جان کو ہلکان کرنا نہیں، بلکہ مقصود صرف تمہاری ہی فلاح و بہبود ہے۔ تمہارے ہی کمالات کی نشو و نما، اور تمہاری ہی ترقی ہے۔ تم ہی میں ضبطِ نفس پیدا کرنا ہے۔ تم ہی کو خواہشاتِ نفسانی پر حاکم بننے کی تعلیم دینا ہے تمہاری پاکیزگی کی چھپی ہوئی قوت کو ابھارنا، اور تمہیں حیوانیت کے غار سے نکال کے ملکوتیت کے آسمان پر پہنچانا ہے۔ تمہاری بُوالہوسی جو تمہاری خودداری پر غالب آجاتی ہے، اسی کو توڑنا منظور ہے۔ تمہاری ہی راہِ عروج میں ہر طرح کی سہولت پیدا کرنی مدِّ نظر ہے، اور تمہارے ہی چھپے ہوئے اندرونی دشمنوں یعنی بدی کی طاقتوں کو ہلاک و نابود کرنا مقصود ہے۔ لعلکم تتقون - اور پھر یہ آزمائش بھی دائمی نہیں، تمہاری ساری عمر کے لئے نہیں کسی بڑی طویل مدت کے لئے نہیں بلکہ صرف گنتی کے چند روز یعنی گیارہ مہینہ کے بعد، رمضان کا ایک مہینہ [۲] ایامًا معدودات

پھر ان عاشقین صادقین اور مومنین مخلصین میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو باوجود اپنے صدق و خلوص کے، اپنی جسمانی کمزوری یا پردیس میں ہونے کی بنا پر آسانی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل نہ کر سکیں گے، ان کے لئے یہ آزمائش زیادہ سخت ہوگی۔ ایسے معذوروں کے لئے اس کی اجازت ہے کہ انہیں جب اطمینان و فراغت نصیب ہو، تو اس ماہِ مبارک کے چھوٹے ہوئے روزوں کو پورا کرلیں "تبکیل بہار" اگر اپنے جذبۂ دل میں صادق ہے تو اس کے لئے سال کا ہر موسم موسمِ گل کا حکم رکھتا ہے۔ فمن کان منکم مریضًا او علی سفر فعدة من ایام اخر۔ بعض بیچارے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو بسبب اپنی جسمانی کمزوری یا کسی اور مجبوری کے، ماہِ مبارک کے بعد بھی، روزہ رکھنے میں سخت مشقت محسوس کرتے ہیں [۳] ایسوں کے لئے یہ رعایت ہے کہ وہ اپنی معذوری کے کفارہ کے طور پر کسی صاحبِ احتیاج کو پوری طرح کھانا کھلادیا کریں۔ وعلی الذین یطیقونہ فدیة طعام مسکین اس رخصت و اجازت کے باوجود بھی اگر کوئی شخص محنت و مشقت گوارا کرکے اس بڑی نیکی یعنی روزہ کو اختیار کرتا ہے، یا ایک مسکین سے زائد کو کھلاتا پلاتا ہے، تو اس کے مرتبہ کا کیا پوچھنا۔ ایسی نیکی جو فرض نہ رہی ہو، اگر اختیار کی جائے تو اس کے افضل و برتر ہونے میں کیا شبہ۔ فمن تطوع خیرًا فهو خیر لہ۔ یہ ایک عام اصول بتایا گیا۔ باقی اگر روزہ کی حقیقت پر نظر ہوجائے، روزہ سے جو باطنی ترقیاں مقصود ہیں، اگر ان کا علم ہوجائے تو کون ایسا ہے جو روزہ کی جانب بشوق و رغبت نہ دوڑے۔

یہ ماہِ مبارک صرف اسی لحاظ سے مبارک نہیں، کہ اس میں انسان صبر و ضبط کی خدائی طاقتوں سے نوازا جاتا ہے، بلکہ اس خیر و برکت والے مہینہ کا سب سے بڑا شرف یہ ہے، کہ اسی ماہ میں اوّل اوّل، دنیا کے لئے بہترین، کامل ترین، و جامع ترین ہدایت نامہ اُتارا گیا۔ اسی چاند میں انسانیت کے ظلمت کدہ کو نورانیت کے بدرِ کامل سے پُرانوار بنایا گیا، اور اسی بابرکت موسم میں انسان کے کان میں پہلی بار نغمۂ ازل کی سُریلی آواز، بیہوشوں کو بیدار اور ہوشیاروں کو مست کرنے والی پکار پہنچی، جس سے بڑھ کر کوئی دولت جس سے اونچی کوئی نعمت، جس سے برتر کوئی رحمت، عالمِ تصور میں بھی موجود نہیں۔ شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن هدًی للناس وبینٰت من الهدٰی والفرقان [۴] قیس عامری کے پاس اگر لیلیٰ کا کوئی مکتوب یا پیام آجاتا، تو کس طرح وہ اپنی جان نثار کرنے کو تیار ہوجاتا، اور اس مبارک گھڑی کو کس قدر عزیز رکھتا! حُسنِ ازل کے شیدائی بھی، نامۂ یار کے ورود کے زمانہ کو کیونکر بھول سکتے ہیں۔ جب جب یہ زمانہ آئے گا، اس کی یاد میں بیتاب ہوجائیں گے، اور اس پاک گھڑی کی پاک سالگرہ منانے میں اپنی بھوک پیاس تک کو بھول جائیں گے۔ فمن شهد منکم الشهر فلیصمه۔

موسمِ بہار کی فرحتیں، طراوتیں اور نشاط انگیزیاں، بڑے سے بڑے افسردہ دلوں تک میں اُمنگ پیدا ہی کردیتی ہیں اور گل و گلزار کی سیر سے کوئی محروم رہنا نہیں چاہتا۔ ماہِ مبارک کی برکتوں، فضیلتوں اور نعمتوں کا ذکر سُن کر بڑے سے بڑے بدہمت اور افسردہ دل کی رگوں میں جوش پیدا ہوجانا، اور بڑے سے بڑے فرزانہ و دُور اندیش میں شورش و شوریدگی کا اُبھر آنا قدرتی ہے۔ حالانکہ یہ آزمائش صرف ان کے لئے ہے جو اس کی جسمانی قوت بھی رکھتے ہیں معذوروں پر خواہ مخواہ بار و مشقت ڈالنا ہرگز مقصود نہیں۔ اُن کے جذبۂ شوق کو تسکین دینے کے لئے ایک بار پھر اس ارشاد کی ضرورت ہوئی کہ معذوروں کو ان دنوں کی گنتی بعد میں پوری کرلینی چاہئے، کہ مقصد آسانی دینا ہے، نہ کہ تنگی۔ اللہ کی بڑائی کرنے، اور اس کا شکر ادا کرنے کا مقصد بعد کو بھی گنتی کے دن پورے کرلینے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ومن کان مریضًا او علی سفر فعدة من ایام اخر۔ یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدة ولتکبروا الله علی ما هدٰکم ولعلکم تشکرون۔

یہ پُربہار موسم جب کسی کے شوق و ارمان میں گزرے گا، یہ متبرک گھڑیاں جب کسی کی یاد میں بسر ہوں گی، یہ مبارک دن جب کسی کے اشتیاق میں بغیر بھوک پیاس کے صرف ہوں گے، یہ برکت والی راتیں جب کسی کے انتظار میں آنکھوں ہی میں کٹیں گی، تو ناممکن ہے کہ روح میں لطافت، قلب میں صفائی، اور نفس میں پاکیزگی پیدا نہ ہوجائے۔ حیوانیت دُور ہوگی، ملکوتیت نزدیک آئے گی اور انسان خود اپنی ایک جدید زندگی محسوس کرے گا، ایسی حالت میں بالکل قدرتی ہے، کہ سوزِ دل اور تیز ہوجائے، قرب و وصل کی تڑپ اور بڑھ جائے، تزکیہ و مجاہدہ کے اثر سے زنگ دُور ہوکر کسی کا عکس قبول کرنے کے لئے آئینۂ قلب بے قرار و مضطر ہونے لگے۔ ٹھیک یہی گھڑی، ذوقِ طلب اور ذوقِ عطا، سوال اور اجابت، دعا اور مقبولیت، حاجتمندی اور کریمی، گدائی اور شاہی، بندگی و بندہ پروری کے درمیان ناز و نیاز کی ہوتی ہے، اس لئے قدرۃً اس منزل پر پہنچتے ہی، محملِ غیب سے یہ صدائے بشارت کان میں آنے لگتی ہے، کہ لے ہمارے پیام پہنچانے والے، ہمارے شیدائی، ہمارے پرستار، ہمارے بندے، اگر تم سے ہمارا پتہ پوچھیں، تو ان کو بتادو کہ ہم اُن سے کچھ دُور نہیں ہم تو ان سے بہت ہی قریب ہیں، ہمیں دل کی تڑپ کے ساتھ پکاریں تو سہی، ہم فوراً ان کی پکار کو سنیں گے۔ وہ صرف ہم سے اپنی لَو لگائے رہیں، اور ہم پر بھروسہ رکھیں، اس سے وہ سیدھی راہ پاکر، اور منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہیں گے۔ واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلهم یرشدون۔

(منقول از سچ (لکھنؤ) ہفتہ وار۔ ۱۳ اپریل ۱۹۲۶ء ایڈیٹر عبدالماجد)

(۳)

دو شخص ہیں۔ ایک وہ جو اپنی خواہشاتِ نفسانی کا غلام ہے، دُوسرا وہ جو اُن پر حاکم و آقا ہے۔ ایک وہ جو اپنی ہر ہوائے نفس سے مغلوب ہوجاتا ہے، دُوسرا وہ جو اُسے اپنے قابو و اختیار میں رکھتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو اپنی بھوک، اپنی پیاس، اپنی نیند، اپنی حرص، اپنے غصہ کسی شے پر قابو نہیں رکھتا، دُوسرا وہ جو ان میں سے ہر شے کے ضبط پر قدرت رکھتا ہے۔ آپ ایسے دو شخصوں میں سے کس کو ترجیح دیں گے؟ آپ خود ان دونوں میں سے کیا بننا پسند کریں گے؟ آپ کے نزدیک نفس کی غلامی بہتر ہے؟ یا اس پر حکمرانی؟ اگر آخر الذکر بہتر و پسندیدہ ہے، تو پھر یہ کیا ہے کہ ماہِ رمضان کی پیشوائی کو آپ ذوق و شوق، مسرت و خندہ جبینی کے ساتھ نہیں بڑھتے؟

حضرت نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ دائم الصوم تھے۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی عمر کے سالہا روزہ رکھ کر گزارے، حضرت جنید بغدادیؒ کا مقولہ مشہور ہے کہ مجھے جو کچھ ملا، سب بھوک اور گرسنگی ہی کی طفیل میں ملا۔ حضرت مولانائے رومؒ کا عمل خود انہی کی اس تعلیم پر تھا، کہ منزلِ حق کی جتنی راہیں کھلتی ہیں، سب بھوک اور پیاس سے۔ ہر سلسلے کے جتنے مقدس بزرگ اور مستند صُوفی گزرے ہیں، سب کا عمل یہی رہا ہے اور تعلیم بھی یہی مگر پھر یہ کیوں ہے، کہ آپ باوجود ان حضرات سے اعتقاد ظاہر کرنے، اور باوجود ان کے ماننے کے، اس باب میں ان کی تعلیم سے اس قدر بے پروا، اور ان کے عمل سے اس قدر بے نیاز ہیں؟

نماز میں جس طرح عبدیت کی تکمیل ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح روزہ دار کو اخلاقِ الٰہی کے ساتھ کس درجہ مناسبت و مشابہت پیدا ہوجاتی ہے۔ بھوک اور پیاس سے بے نیازی، صبر و ضبط، قوت و اختیار، حلم و تحمل، عفو و درگزر، یہ سب شانیں بندہ کی ہیں یا مولیٰ کی؟ عبد کی یا معبود کی؟ خاک کے پتلے کی یا آسمان کے فرمانروا کی؟ پھر یہ کیونکر ہے، کہ جو شے کچھ ہی دیر کے لئے سہی آپ میں اس کیفیت سے مناسبت پیدا کر رہی ہو، جو شے ذرہ میں آفتاب کا پرتو ڈال رہی ہو، جو شے آئینہ میں جلا پیدا کرکے اُسے نورانیت کاملہ کا عکس قبول کرنے کے قابل بنا رہی ہو، آپ اُس نعمتِ عظمیٰ کی جانب لپکنے میں تامل کر رہے ہیں؟

حدیثِ قدسی کے الفاظ یاد کیجئے، الصوم لی وانا اجزی بہ "روزہ میرے لئے ہے اور اس کا اجر خود میں ہوں" حوریں نہیں، جنت کے قصر و محل نہیں، کوئی اور ایسی نعمت نہیں، جسے ہماری عقل سمجھ سکے بلکہ میں خود اس کا اجر ہوں" یہ کون، کس سے کہہ رہا ہے؟ آفتاب ذرہ سے نہیں، مخدوم خادم سے نہیں، شاہ گدا سے نہیں، بلکہ خالق مخلوق سے، معبود عبد سے، خدا بندہ سے! کیا زمینوں اور آسمانوں کی ساری نعمتیں، ساری برکتیں، ساری بادشاہتیں مل کر بھی اس ایک اجر کے سامنے پیش کی جاسکتی ہیں؟ کیسی دردناک نادانی ہوگی، کہ اتنے ارزاں سودے کو بھی اپنی غفلت و بے پروائی کے نذر کردیا جائے!

(منقول از سچ (لکھنؤ) ہفتہ وار۔ ۲۶ مارچ ۱۹۲۶ء ایڈیٹر عبدالماجد)

۲؎ واولیٰ ذالک بالصواب عندی قول من قال عنی الله جل ثناءہ بقولہ ایامًا معدودات، ایام شهر رمضان (ابن جریر) والمراد بها رمضان (بیضاوی) المراد بهذہ الایام المعدودات شهر رمضان (ابو مسلم)

۳؎ عن عبد الله قال یقول وعلی الذین یطیقونہ ای یتجشمونہ (ابن کثیر) وقرأ ابن عباسؓ یطوقونہ بمعنی الطاقة والقلادة ای یکلفونہ او یتکلفونہ علی جهد منہ وعسر وهم الشیوخ والعجائز (زمخشری) یصومونہ جهدهم وطاقتهم ومبلغ وسعهم (زمخشری) وهو الرخصة لمن یتعبہ الصوم ویجهدہ وهم الشیوخ والعجائز فی الافطار والفدیة (بیضاوی) من صام بالکلفة والمشقة فعلیہ فدیة طعام مسکین (اگزروتی)

۴؎ ای ابتدی فیہ انزالہ (بیضاوی) ابتدی فیہ انزالہ (زمخشری) ابتدی فیہ انزالہ (روح المعانی) یکون ابتداء نزول القرآن علی محمد صلعم فی شهر رمضان وهو قول ابن اسحاق وابی سلیمان الدمشقی (خازن) اولت الآیة بان المراد انہ ابتدی فیہ انزالہ هذا قول محمد بن اسحاق (نیشاپوری)

(۴)

کھانا کھانے میں آپ کو لطف کس وقت آتا ہے؟ اُس وقت جب کہ بھوک کھُل کر لگی ہو یعنی کچھ دیر پیشتر سے کھانا نہ کھایا ہو۔ پانی سے گلاس میں مزہ کس وقت ملتا ہے؟ اُس وقت جب کہ پیاس لگی ہوئی ہو اور پانی پینے کی طلب بے قرار کر رہی ہو۔ نیند سکھ سے کس وقت آتی ہے؟ اُس وقت جبکہ کچھ گھنٹے قبل سے آپ برابر جاگ رہے ہوں۔ ان ساری مثالوں میں آپ کو روزمرہ، ہر وقت اور ہر جگہ تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ مادی لذتوں سے بھی پوری طرح لطف اٹھانے کے لئے کسی قدر ضبط، صبر و احتیاط لازمی ہے۔ یہی آپ کا مشاہدہ ہے، یہی آپ کا تجربہ ہے، اور اسی پر آپ کا عمل ہے۔ یہ آپ کبھی نہیں کرتے، کہ مسلسل چوبیسوں گھنٹے منہ میں نوالے چباتے رہیں، یہ کوئی بھی نہیں کرتا کہ ہر منٹ لگاتار پانی کے گھونٹ اُتارتا رہے۔ یہ کسی کو بھی نہیں دیکھا، کہ دن اور رات، صبح اور شام، ہر وقت برابر پڑا سوتا ہی رہے۔

«روشن خیالی» جب ایک قدم آگے بڑھاتی ہے، تو تعطیل اور چھٹی کو بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو بنا دیتی ہے۔ اسکولوں کے کمرے، کالجوں کے ہال، عدالت عالیہ کے ایوان، ہفتوں سے بند چلے آ رہے ہیں، اس لئے کہ موسمِ گرما کی تعطیل کلاں، کا زمانہ ہے! کچہریاں اور دفتر بند ہیں، اس لئے کہ آج بڑا دن ہے۔ ڈاک خانہ اور تار گھر، بینک اور خزانے بند ہیں، اس لئے کہ آج اتوار ہے! یہ سب اس لئے ہے کہ دماغ کو آرام ملتا ہے، اور تازہ دم ہونے کے بعد کام بہتر طور پر انجام پاتا ہے۔ آپ اپنے اس نظام اور اس انتظام پر شرماتے نہیں، فخر کرتے ہیں۔ اور آپ کی عقلیت و روشن خیالی کا یہ ایک مسئلہ ہے، کہ کام میں زیادہ مستعدی اور بہتر کارگزاری Efficiency کے لئے جسم اور اعضائے جسم کو آرام دیتے رہنا لازمی ہے، ایسا نہیں کہتے کہ اس سے کام میں خواہ مخواہ ہرج اور نقصان ہوتا ہے۔

لیکن جب مذہب آپ سے کہتا ہے، کہ سال کے ایک خاص زمانہ میں چند گھنٹوں کے ایک محدود وقت کے لئے معدہ کو آرام دیتے رہو، بھوک اور پیاس کو ضبط کرتے رہو تو معاً آپ کی عقلیت و روشن خیالی بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ آپ اپنے روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ، نظریات و عملیات، سب کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، رمضان کی آمد کو اپنے لئے ایک قہر و مصیبت سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اگر زبان سے نہیں تو کم از کم دل میں تو یہ ضرور کہنے لگ جاتے ہیں کہ روزہ کی یہ قیدیں کیسی سخت ہیں۔ اور آپ کے کمزور قویٰ ہرگز اتنی بڑی محنت کو نہیں برداشت کر سکتے! بیشک اگر آپ ہزاروں روپیہ کمانے اور اُڑانے والے بیرسٹر ہیں، اگر آپ اپنی سرکار ابد قرار کے بنائے ہوئے جج یا کلکٹر ہیں، اگر آپ صوبہ یا ملک کی کونسل کے ممبر ہیں، اگر آپ لاٹ صاحب اور بڑے لاٹ صاحب کی پارٹیوں میں شریک ہونے والوں میں ہیں، اگر آپ کے پاس سواری کے لئے موٹریں، اور رہنے کے لئے اونچی اونچی کوٹھیاں موجود ہیں، تو آپ کی محرومی اور حرماں نصیبی نے، اجرِ روحانی و راحتِ سرمدی کی طرح، روزمرہ کی مادی لذتوں اور جسمانی فائدوں کا بھی دروازہ آپ پر بند کر رکھا ہے، اور آپ کی اس بےمائیگی پر حق و بشر، حور و ملک جتنا بھی ترس کھائیں کم ہے لیکن اگر آپ اپنی خوش بختی سے کوئی غریب کاشتکار ہیں، کوئی مفلس مزدور ہیں، کوئی کم حیثیت خدمتگار ہیں، بھاری بھاری بوجھ کی گٹھریاں اور گٹھے اپنے سر پر لادنے والے ہیں، دھوپ میں چل چل کر اور کھٹن کھٹن کر کام کرنے والے ہیں، تو انشاء اللہ آج آپ اپنے خالق و مالک کے حکم کی تعمیل میں رمضان مبارک کے بارانِ رحمت سے سیراب ہو رہے ہونگے، یقین کیجئے کہ آج آپکے مرتبہ پر زمین پر بسنے والے نہیں، آسمان پر اُڑنے والے، فضائے قدس میں سانس لینے والے، حریم عرش کے پایہ تھامنے والے رشک کر رہے ہیں! ممکن ہے کہ آج یہ شاعری معلوم ہو رہی ہو لیکن کل انشاء اللہ حقیقت ہو کر رہے گی، اور ان بے خبروں کو بھی خبردار کر کے رہے گی جو آج روزہ داری کے طبی فوائد اور مادی لذتوں سے بھی محرومی میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

(منقول از سچ لکھنؤ، ہفتہ وار۔ ۲۔ مارچ ۱۹۲۶ء ایڈیٹر عبدالماجد)

(۵)

نیند پورے سکھ کے ساتھ کس کو آتی ہے؟ اُس کاہل کو جو رات دن بستر پر پڑا رہتا ہے یا اُس محنتی کو جو دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد تھک کر اپنے دماغ و جسم کو چند گھنٹوں کے لئے آرام دینے کو لیٹتا ہے؟ کھانے میں اصلی مزہ کس کو ملتا ہے؟ اُس امیر کو جو سارے دن اپنے ذائقہ کی خاطر داریوں میں لگا رہتا ہے، اور طرح طرح کی بدپرہیزیاں کرتا رہتا ہے یا اُس غریب کو جو محنت و مشقت کے بعد دن میں ایک یا دو بار سادہ اور معمولی کھانا کھاتا ہے؟ سو کر اُٹھنے کے بعد فرحت اور چالاکی کس کو حاصل ہوتی ہے؟ اُس کو جو ساری رات پریشان اور ہولناک خواب دیکھتا رہتا ہے یا وہ جو شروع سے آخر تک میٹھی نیند لیتا رہتا ہے؟ پس اگر کسی کو نیند پورے سکھ کے ساتھ نہیں آتی، کھانے میں پورا مزہ نہیں ملتا، یا سو کر اُٹھنے کے بعد طبیعت سے کسل پوری طرح دُور نہیں ہوتا، تو اُس کی ذمہ داری اور تنہا ذمہ داری، اسی کی بے احتیاطیوں، بدپرہیزیوں، اور بے اعتدالیوں پر آتی ہے۔

روزہ جسم و رُوح دونوں کے ایک خاص ضبط و انضباط، تزکیہ و تنقیہ، پرہیز و احتیاط کا نام ہے، اس کے تمام ہونے پر انتہائی لُطف و راحت، لذت و فرحت محسوس ہونی چاہیے۔ اگر آپ اس میں کمی محسوس کرتے ہیں تو یقیناً یہ آپ ہی کا قصور ہے اور یہ لازمی ہے کہ روزہ کی کچھ شرطیں آپ توڑ چکے ہیں، اور اس کے جو آداب نگاہ رکھنے کے تھے وہ آپ نے نہیں رکھے۔ جسم و دماغ کو اگر آپ دن بھر صحیح طور پر کام میں لگائے ہوئے ہیں، تو شب کو نیند کی حالت میں بھی سکھ ملے گا اور نیند پوری کرنے کے بعد بھی فرحت حاصل ہوگی، ٹھیک اسی طرح اگر جسم و رُوح کو آپ ٹھیک طور پر دن بھر مشغول رکھے ہوئے ہیں، اگر آپ وہی کرتے رہے ہیں جو ایک روزہ دار کو کرنا چاہئے تو آپ کا دن اور آپ کی رات، آپ کی صبح اور آپ کی دوپہر، آپ کا سہ پہر اور آپ کی شام، غرض آپ کے وقت کی ہر گھڑی آپ کے دل کی کلی کو کھلی رکھے گی۔ افسردگی اور اداسی آپکے لئے بے مفہوم ہوگی اور سرور و نشاط کی ہوائیں آپکی روح کو تروتازہ رکھیںگی۔ روزہ کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے پیدا کرنے والے، آپ کے سامانِ زندگی کے مہیا کرنے والے اور آپ کی موت و زندگی بیماری و تندرستی ہر چیز پر قدرت رکھنے والے کے سامنے عہد کرتے ہیں کہ سارے دن آپ اپنے تئیں اپنی آنکھ اور کان، اپنے منہ اور زبان، اپنے دل اور اپنے دماغ، اپنے ہاتھ اور پیر، اپنے جسم اور جان، غرض اپنے سارے وجود کو ہر ٹیڑھی راہ سے روکے رہیں گے، ہر کجی اور کج رَوی سے باز رکھیں گے اور صرف اسی کے لئے وقف رکھیںگے جو اس کا اصل کام، اس کی سیدھی راہ، اُس کا فطری حق اور اُس کی سچی غایت ہے؛ زبان اگر کھلے گی تو صرف کلمۂ حق پر، کان اگر سنیں گے تو صرف سچی آواز، آنکھ اگر دیکھے گی تو صرف امرِ حق کو، دل اگر سوچے گا تو صرف سچائیوں کو، ہاتھ اور پیر اگر حرکت کریں گے تو صرف سچائی کی راہ میں۔ مادی زندگی کے سب سے بڑے اور طاقتور مظہر سورج کے ڈوب جانے پر جب آپ اُس ذات کے شکر کے ساتھ جس نے آپ کو یہ توفیق دی اپنا جائزہ لیں اور اپنی اس بندگی کی ہر شرط کو پوری طرح ادا کیا ہوا پائیں تو —— دنیا کے کس لفظ اور کس عبارت میں اس کیفیت کو ادا کرنے کی قدرت ہے! رضائے الٰہی آپ میں اور آپ رضائے الٰہی میں جذب ہوگئے! راحت و لذت، لطف و مسرت، سرور و نشاط، شادی و انبساط یہ سارے الفاظ اس بڑی فرحت (افطار) کی کیفیت کو ادا کرنے کے لئے ناکافی ہیں جو اُس سب سے بڑی فرحت (دیدارِ الٰہی) کا پیش خیمہ ہے جس سے موسیٰ کلیم اللہ جیسے برگزیدہ پیمبر باوجود شوق و تمنا، اس دنیا میں محروم رہے!

(سچ لکھنؤ۔ ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء)

ضمیمہ

روزہ

(متعلق حاشیہ ۱۳۳ سورۃ البقرۃ)

آپ کو معلوم ہے کہ اطبائے یونانی کتنے متعدد امراض میں فاقہ کو مفید بتاتے ہیں؟ آپ کو خبر ہے کہ ڈاکٹروں کے اصول سے اب فاقہ کتنے امراض کا علاج ثابت ہو چکا ہے؟ آپ واقف ہیں کہ ہر طریقۂ علاج کے ماہرین فن نے کتنی شدید اور مہلک بیماریوں کا علاج اپنے تجربہ میں فاقہ ہی کو پایا ہے؟ خود آپ کا ذاتی تجربہ کیا ہے؟ آپ کو جب کبھی بیماری میں طبیب یا ڈاکٹر فاقہ کا مشورہ دیتے ہیں تو آپ کیسی خاموشی کے ساتھ بے چون و چرا اور بغیر بحث و مناظرہ اُس کے حکم کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں اور اُس کی ہدایتوں کے مطابق کھانے اور پینے کی لذتوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں! لیکن جب اس سے کم تکلیف اور اس سے ہزاروں گنی زیادہ راحتوں اور نعمتوں کے وعدہ کے ساتھ اس قسم کی احتیاط خورد و نوش کا حکم آپ کو سب سے بڑے حکیم کے مطب سے ملتا ہے، تو یہ کیا ہے کہ آپ اس خوش دلی کے ساتھ اُس کی تعمیل پر آمادہ نہیں ہو جاتے بلکہ طرح طرح کی تاویلوں سے جن سے اکثر خود آپ کا دل بھی مطمئن نہیں ہوتا اُسے ٹال جانا چاہتے ہیں!

آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے فضل سے روزہ دار ہیں اور ماہ رمضان کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں لیکن پھر یہ کیا ہے کہ آپ کی اندرونی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ غصہ اب بھی آپ کو برابر آتا رہتا ہے بلکہ شاید کچھ اور بڑھ ہی گیا ہے۔ دوسروں کے عیب چینی میں اب بھی آپ کو ویسا ہی مزہ آرہا ہے، نفسانی خواہشوں اور لڑنے جھگڑنے کے منصوبوں میں اب بھی کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی۔ دن میں بے شبہ آپ کھاتے پیتے نہیں ہیں لیکن وقت کا بڑا حصہ بجائے عبادتوں کے سونے اور بیکاری میں گزارتے ہیں، یا پھر سحری، طعام شب اور افطار پارٹیوں کے اہتمام و انتظام میں! وہ وہ لذیذ اور ثقیل غذائیں جن سے آپ کا ذائقہ سال میں گیارہ مہینے بالکل نامانوس رہتا ہے، آپ صرف اسی ماہ صبر و تقویٰ کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں، اور وقت اور روپے کا اچھا خاصا حصہ اسی ماہ مبارک کی دعوتوں اور ضیافتوں میں صرف فرماتے رہتے ہیں۔ کیا اسی روزہ داری پر آپ خوش ہیں؟ کیا اسی کا نام آپکے خیال میں ماہ مبارک کا احترام ہے؟

ایک شخص قند اور دودھ کا نفیس شربت تیار کرتا ہے مگر اس میں کچھ مکھیاں بھی پیس کر ملا دیتا ہے، آپ ایسے شخص کی صحت دماغی کی بابت کیا رائے قائم کریں گے؟ ایک شخص لذیذ سے لذیذ اور بہتر سے بہتر کھانا خوان میں لگا کر لاتا ہے لیکن اُس میں ایک جزو غلاظت کا بھی ملا دیتا ہے، آپ اس بدنصیب کی عقل و فہم پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟ یقین فرمائیے کہ اس سے کہیں زائد موجب تاسف و مستحق ماتم اُس بےعقل و بدنصیب کی حالت ہے جو روزہ رکھ کر بھی غصہ کر کے، عیب چینی میں مصروف رہ کر، نفسانی خواہشوں کے منصوبوں میں مبتلا رہ کے روزہ کی نعمتوں اور راحتوں، لذتوں اور فرحتوں کو اپنے ہاتھوں غارت کرتا رہتا ہے! اور جو حرماں نصیب سرے سے روزہ ہی کو ترک کئے ہوئے ہیں، اُن بیچاروں کو تو بس اللہ ہی سیدھی سمجھ اور نیک ہدایت کی توفیق نصیب کرے!

(سچ لکھنؤ ۱۲ مارچ ۱۹۲۶ء)

٩٦٤ (مراتب قرب و منزلت میں) فضل کے لغوی معنی بزرگی کے ہیں یعنی ایسی صفت جس سے انسان دنیا میں مدح و ثنا کا مستحق ہو اور آخرت میں اجر سے سرفراز۔ فضلنا میں ضمیر متکلم کا لحاظ رہے۔ تفضیل یا باہمی افضلیت و افضلیت جو کچھ ہے محض عند اللہ ہے۔ خالق کے ہاں درجات و مراتب قرب کے لحاظ سے ہے خلق کے لئے بحیثیت مطاع سب یکساں ہیں۔ عام خلقت کے لئے رسول سب برابر ہیں۔ اطاعت و تعظیم سب کی یکساں واجب ہے۔ اور اسی معنی میں قرآن مجید کی دوسری آیت اسی سورت کے آخر میں اسی پارہ میں آرہی ہے۔ لانفرق بین احد من رسلہ۔ لیس مقام التفضیل الیکم انما ھو الی اللہ عزوجل و علیکم الانقیاد والتسلیم لہ والایمان بہ (ابن کثیر) تِلْكَ الرُّسُلُ - مراد وہی مرسلین ہیں جن کا ذکر ابھی ابھی آچکا ہے۔ الرسل کے اعراب رفعی کی بنا پر ترکیب کلام یوں سمجھی گئی ہے۔ تلک الجماعۃ الرسل (کبیر) اہل لطائف نے آیت سے یہ نکالا ہے کہ انبیاء کے نائبین یعنی اولیاء کاملین کے بھی فرق مدارج کے باب میں عوام کو بحث و گفتگو جائز نہیں، ان کا تقابل و تفاضل عوام کے منصب سے باہر ہے۔ ہاں بجائے خود ان کے مقامات و احوال، و اشغال و افعال ذکر کرنے کا مضائقہ نہیں جیسا کہ یہاں بھی آگے ہو رہا ہے۔ ٩٦٥ (براہ راست اور بلا توسط ملائکہ) جیسا کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے ساتھ ہوا۔ ورنہ ایک معنی میں تو جس نبی پر بھی وحی آتی، اللہ کا مکالمہ اس سے ہو ہی گیا۔ اتفقوا علی ان موسیٰ علیہ السلام مراد بقولہ تعالیٰ (کبیر) و ھو موسیٰ علیہ السلام (مدارک) ٩٦٦ (بہت زیادہ) اشارہ ہے جامع کمالات و خاتم نبوت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ المراد ببعضھم ھنا النبی صلعم (روح) و ھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم و ھو قول مجاہد (بحر) والظاھر انہ اراد محمدا صلعم (کشاف) زمخشری نے یہاں یہ نکتۂ ادب و بلاغت خوب لکھا ہے کہ جہاں شناخت و تعیین میں کوئی دقت ہی نہ ہو وہاں کنایہ و ابہام صراحت و تفصیل سے بڑھ کر بلیغ و مؤثر ہوتا ہے۔ ٩٦٧ کہ وہ بھی انہی پیغمبران برحق میں سے تھے۔ ابن مریم یعنی مریم نامی ایک خاتون کے فرزند نہ کہ خدا زادہ یا ابن اللہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام با این شرف و سروری بہرحال ایک انسانی شکل و صورت اور بشری گوشت و پوست رکھنے والی عورت ہی کی اولاد تھے نہ خدا تھے نہ خدا زادے۔ الوہیت کا کوئی سا بھی جزو ان میں نہ تھا انہیں خدا کا بیٹا ٹھہرا لینا نری جہالت تھی۔ اور اس کی وضاحت کے لئے ضرورت تھی انہیں صراحت کے ساتھ ابن مریم کہنے کی کہ محض اس نشان دہی اور پتہ ہی سے نصرانیت پر ضرب لگ جائے۔ ورنہ نام تو اور بھی پیمبروں کے لئے گئے ہیں کہیں ابن فلاں کرکے تعارف نہیں کرایا گیا ہے! نہ ابن داؤد نہ ابن ابراہیم۔ نہ ابن اسحٰق نہ ابن یعقوب نہ ابن زکریا نہ ابن عمران۔ اس طرح کا تعارف صرف ابن مریم ہی کے لئے مخصوص ہے کہ انہیں کے لئے ابن اللّٰھیت کی تردید کی ضرورت تھی۔ ٩٦٨ (ان کی حقانیت اور پیمبری کے) یہاں یہ فرمایا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام رسول برحق اور مؤید من اللہ تھے۔ نہ کہ نعوذ باللہ کوئی مفتری یا کذاب جس طرح نصاریٰ نے غلو و افراط سے کام لے کر آپ کو حد عبدیت و عبودیت میں سے باہر نکال رکھا تھا۔ اسی طرح یہود نے تفریط و عناد کو کام میں لا کر آپ کو سرے سے ایک بازیگر اور شعبدہ باز قرار دے لیا تھا۔ قرآن مجید ابھی ابھی نصرانی شرک کی تردید کر چکا ہے اب یہودی دجل کی تردید کر رہا ہے۔ الْبَيِّنٰتِ - بینات کے تحت میں وہ تمام کھلی ہوئی چیزیں شامل ہیں جنہیں دیکھ کر ہر عقل سلیم والا منصف مزاج نبوت عیسوی کا قائل ہو جائے۔ کلھا یدل علی نبوتہ (روح) ٩٦٩ کہ وہ قدم قدم پر دشمنوں سے ان کی حفاظت کرتے رہتے تھے۔ رُوحِ الْقُدُسِ - قرآن مجید اور اسلام کی اصطلاح میں اس سے مراد فرشتۂ اعظم حضرت جبریلؑ ہیں۔ نصرانی تثلیث کے اقنوم ثانی سے یہاں کوئی واسطہ نہیں۔ جبریلؑ ملکوتی مخلوق ہیں اور بہت مقرب لیکن بہرحال مخلوق ہی ہیں۔ الوہیت کا کوئی شائبہ بھی اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اَيَّدْنٰهُ - ان کی تائید ہم نے کی جو ہر طرح قادر مطلق ہیں۔ یہ تائید خود بخود نہیں ہوگئی۔ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ عیسیٰ مسیح با این کمالات و فضائل بہرحال انسان ہی تھے اور وہ انسانوں کی طرح دفع ضرر اور حصول نفع دونوں کے محتاج۔ قدرت کاملہ نے ان کی محافظت و تقویت و رفاقت کے لئے ایک دوسری مخلوق لطیف و غیر مرئی جنس کی مقرر کر دی۔ ٩٧٠ الْبَيِّنٰتِ پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے۔ بینات کا مفہوم بہت وسیع و جامع ہے عقلی و حسی دونوں قسم کے روشن شواہد یعنی ایک طرف دلائل و براہین اور دوسری طرف خوارق و معجزات سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے ٩٦٤

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ

ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے ٩٦٥ ان میں سے بعض کے درجے اس نے بلند کئے ہیں ٩٦٦

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ

اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم ٩٦٧ کو شواہد عطا کئے ٩٦٨ اور ہم نے ان کی تائید

بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ

روح القدس کے ذریعہ سے کی ٩٦٩ اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو ان کے بعد کے لوگ آپس

مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

میں خونریزی نہ کرتے بعد اس کے کہ ان کے پاس شواہد آچکے تھے ٩٧٠

وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ

لیکن (لوگ) آپس میں جھگڑے ٩٧١ کوئی تو ان میں سے ایمان لے آیا اور کوئی ان میں سے

مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ

کفر ہی کرتا رہا ٩٧٢ اور اگر اللہ کی مشیت ہی ہوتی تو وہ آپس میں خونریزی نہ کرتے ٩٧٣

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو ارادہ کر لیتا ہے ٩٧٤ اے ایمان والو جو

اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ

کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو ٩٧٥ قبل اس کے کہ وہ

٣٣ ع ٥ ١

لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ - یعنی اگر مصالح تکوینی کے اقتضاء سے مشیت الٰہی کا اقتضاء یہی ہوتا۔ مِنْۢ بَعْدِهِمْ غیر پیمبروں کی طرف یعنی ان پیمبروں کے ظہور کے بعد مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ - یہ باہم خونریزی کرنے والے کون لوگ تھے؟ یقیناً پیمبروں کے منکرین اور انکار کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ ظاہری اور صوری تو اقرار ہو اور حقیقی و معنوی انکار ہی ہو جیسے یہود و نصاریٰ اہل کتاب کا ظاہر میں اقرار اور معنوی انکار۔ دوسرے یہ کہ انکار صورۃً و معنیً دونوں طرح پر ہو، جیسے مشرکین کا انکار توحید و رسالت میں۔ ٩٧١ گویا بینات کا تقاضائے طبعی تو یہی تھا کہ ایمان سب کے سب لے آتے لیکن ایک گروہ نے کج روی اور کج رائی سے کام لیا، اور یہ لوگ منکر ہی رہے۔ یہاں اس حقیقت کا بیان ہے کہ چونکہ مشیت الٰہی سب کو اضطراراً ایک ہی دین پر جمع کرنے کی نہ ہوئی۔ اور حکمت کاملہ نے اس عالم کو عالم ابتلاء ہی رکھنا چاہا۔ اس لئے خلقت کا باہم مختلف ہونا بھی ناگزیر رہا۔ ٩٧٢ (تو جب یہ اختلاف دینی شروع سے اور انبیاء سابقین کے وقت سے چلا آرہا ہے تو آپ ایسے پیمبر اپنے زمانہ کے کافروں پر بہت زیادہ رنج و غم نہ کریں۔ اور اپنے کو اس فکر و مشقت میں نہ ڈالیں کہ سب کے سب ایمان لے ہی آئیں) مِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ - سو جو لوگ ایمان لے آئے وہ تو نجات پا گئے۔ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ - جو لوگ کفر پر قائم رہے وہ سزائے ابدی کے مستحق قرار پائے۔ من اٰمن اور من کفر دونوں کے صیغوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ایمان اور کفر بندہ کی اپنی اختیاری چیزیں ہیں، خالق کی طرف سے جبر کسی صورت میں نہیں۔ ٩٧٣ یعنی اگر سب کی خلقت ہی یکساں رکھ دی گئی ہوتی، اور کفر و گمراہی کی آزادی ہی سلب کر لی گئی ہوتی جب البتہ نہ اختلاف ہوتا اور نہ نوبت قتل و قتال کی پہنچتی ٩٧٤ اَللّٰهَ يَفْعَلُ - اللہ وہی کرتا ہے بمقتضائے قدرت کاملہ مَا يُرِيْدُ - جو کچھ وہ چاہتا ہے بمقتضائے حکمت بالغہ۔ یعنی نہ اس کی قدرت و قوت فاعلہ پر کوئی قیدیں اور حد بندیاں عائد ہیں اور نہ اس کی تجویزوں، ارادوں میں کسی غلطی یا سہو و خطا کا امکان ہے۔ ارسطو جیسے مشہور فلسفی نے خدا کی قدرت و قوت کو محدود مانا ہے۔ اور سہو و خطا کا امکان تو مشرکوں نے اپنے خداؤں میں کثرت سے تسلیم کیا ہے۔ آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ چھوٹی بڑی اچھی بری کوئی سی شے بھی ہو بہرحال مشیت الٰہی سے باہر نہیں۔ وفی الاٰیۃ دلیل علی ان الحوادث تابعۃ لمشیۃ اللہ تعالیٰ خیرا کانت او شرا ایمانا او کفرا (روح) ٩٧٥ (اللہ کی راہ میں مصارف خیر میں) رَزَقْنٰكُمْ - ضمیر متکلم لا کر اور رزق کو اپنی جانب منسوب کرکے صاف بتا دیا کہ مال و دولت جو کچھ بھی بندوں کے پاس ہے خود بخود نہیں خدا ہی کا بخشا ہوا عطیہ ہے اسی کی دین ہے اور اسی کو حق حاصل ہے کہ جن کاموں میں چاہے ان کے صرف کرنے کا حکم دے دے۔

يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ
دن آجائے ٩٧٦ جس میں نہ تجارت کام آئے گی اور نہ دوستی اور نہ سفارش
وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٥٤﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا
اور کافر ہی تو ظالم ہیں ٩٧٧ اللہ (وہ ہے کہ) کوئی معبود اس کے سوا
هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا
نہیں ٩٧٨ وہ زندہ ہے سب کا سنبھالنے والا ہے ٩٧٩ اُسے نہ اونگھ آسکتی ہے نہ نیند ٩٨٠
نَوْمٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَن
اُسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ٩٨١ کون ایسا ہے
ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا
جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے ٩٨٢ وہ جانتا ہے جو کچھ
بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ
مخلوقات کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اس سب کو ٩٨٣ اور وہ اس کے معلومات میں سے کسی چیز
مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ
کو بھی گھیر نہیں سکتے ٩٨٤ سوا اس کے کہ جتنا وہ خود چاہے ٩٨٥ اس کی کرسی نے سما رکھا ہے ٩٨٦ آسمانوں اور
وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ
زمین کو اور اس پر ان کی نگرانی ذرا بھی گراں نہیں ٩٨٧ اور وہ عالیشان ہے
الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ
عظیم الشان ہے ٩٨٨ دین میں کوئی زبردستی نہیں ٩٨٩ ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف

منزل ١

٩٧٦ یعنی روز قیامت۔ مطلب یہ ہے کہ مصارفِ خیر میں صرف کرنے اور نیکیاں جمع کرنے کا موقع جو کچھ ہے اسی دنیا میں ہے۔ وقت کی قدر کرو، فرصتِ عمر کو غنیمت سمجھو۔ ٩٧٧ (اپنے حق میں) ظلم کے اصل معنی وضع الشئ فی غیر محلہ (کسی شے کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنے) کے ہیں۔ اشیاء اس کے قانون کو نہ ماننے سے بڑھ کر کون سا ظلم انسان کا اپنے حق میں ہوگا۔ ذنبیہ۔ جاہلی اور نیم جاہلی قوموں کی گمراہیاں ایک سے بڑھ کر ایک عجیب رہی ہیں۔ مشرک قومیں تو سرے سے روزِ جزا ہی کی قائل نہیں۔ اہلِ کتاب نے اس کے وقوع کو مانا، تو اس میں بھی یہ قیمیں لگا دیں کہ وہاں بھی دنیا کی طرح لین دین ہو سکے گا۔ کوئی کسی سے نیکیاں خرید لے گا۔ کوئی کسی کے ہاتھ اپنی بدیاں فروخت کر دیگا وقس علیٰ ھٰذا۔ قرآن نے اس ساری لغو خیال کا خاتمہ کر دیا۔ وَلَا خُلَّةٌ۔ خلۃ گہری جگری دوستی کو کہتے ہیں۔ مقصود ایسی دوستی کے نافع ہونے کا ابطال ہے جو ایمان کے بغیر کام دے سکے اور کفر کے مجرم کو نجات دلا سکے۔ اہلِ کتاب نے سمجھ رکھا تھا کہ یہاں کے نسبی رشتہ داریوں اور ذاتی خانگی دوستیوں سے وہاں کام چل جائیگا۔ جب گہری اور دلی دوستی کے نافع ہونے کی نفی ہوگئی۔ تو محض زبانی رسمی ظاہری تعلق کا لاحاصل ہونا تو اور زیادہ ظاہر ہے۔ وَلَا شَفَاعَةٌ۔ پہلی دو گمراہیوں کا بھی تعلق مسیحیوں سے تھا اور یہ تیسری گمراہی تو مسیحیت کے خصوصیات میں سے ہے۔ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ ابن اللہ کی حیثیت شافع مطلق کی ہے۔ انسان کے قالب میں انہوں نے اسی لئے تو جنم لیا تھا کہ اپنی جان کا فدیہ سب گنہگاروں کی طرف سے دے کر اور سب کی طرف سے صلیب پر اپنے خون کا چڑھاوا چڑھا کر قیامت میں شافع مطلق کی حیثیت سے ظاہر و نمودار ہوں اور ان کی شفاعت سب کے حق میں نجات کا حکم قطعی رکھے گی۔ ہمارے ہاں کے عام واعظوں اور نعت گو شاعروں نے شفاعتِ مصطفوی پر حد سے زیادہ زور دینا شروع کیا ہے یہ صاف مسیحیت کے تاثر کا نتیجہ ہے۔ الْكَافِرُونَ۔ یہاں وہی کافر مراد ہیں جو اسی قسم کے عقائد کفریہ میں مبتلا ہیں۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ آیت سے بخل کی مذمت نکلتی ہے جو لوگ ضروری مصارفِ خیر میں خرچ نہیں کرتے وہ اپنے کو اہلِ کفر اور اہلِ جہنم کے حکم میں لا رہے ہیں۔ ٩٧٨ (نہ بڑا نہ چھوٹا، نہ اصلی نہ ظلی، نہ خدا نہ خدا زادہ) خدا کے نفسِ وجود کے قائل تو جاہلی مذاہب بھی ہوئے ہیں، البتہ وہ اس معبودِ اعظم (ہندوؤں کی اصطلاح میں ایشور) کے علاوہ تحتانی معبودوں اور دیوتاؤں کے بھی قائل رہے ہیں۔ تعلیمِ اسلام یہی کی ہے کہ اس ایک خدا کے سوا کسی اور خدا کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ یہ نہیں کہ وہ تو معبودِ اعظم ہے باقی چھوٹے چھوٹے معبود اور بھی موجود ہیں۔ عیسائی بھی چونکہ شرک میں مبتلا ہو چکے تھے اس لئے ان کے مقابلہ میں بھی توحیدِ کامل کے اثبات اور پھر غیر اللہ کی اُلوہیت کی نفی کی اس قدر ضرورت تھی۔ یہ آیت آیۃ الکرسی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی برکتوں اور فضیلتوں سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو۔ احادیث میں اس کے فضائل بکثرت وارد ہوئے ہیں۔ اس کی معنویت اور جامعیت سے بھی اتنی نمایاں اور اس درجہ کی۔ اپنے تو خیر اپنے ہی ہیں، بیگانے جیسے سیل مترجم قرآن مجید اور میور اور روڈویل جیسے معاندین نے بھی بے ساختہ اس کی داد دی ہے۔ ٩٧٩ اَلْحَیُّ۔ وہ مستقلاً زندہ ہے وہ ازلی اور ابدی ہے صفتِ حیات اس کی جزو ذات ہے۔ موت یا عدمِ حیات اس پر نہ پہلے کبھی طاری ہوئی اور نہ آئندہ کبھی طاری ہو سکتی ہے۔ تو کیا کوئی قوم ایسی بھی ہوئی ہے جس نے اپنے معبود کی اس کھلی ہوئی اور موٹی صفت میں بھی شبہ کیا ہو ——— ایک نہیں متعدد قوموں نے شک و اشتباہ کیا معنی انکار تک اس صفت کا کیا ہے! بحرِ رُوم کے ساحل پر متعدد قومیں اس عقیدہ کی گزری ہیں کہ ہر سال فلاں تاریخ پر ان کا خدا وفات پا جاتا ہے۔ اور دوسرے دن از سرِ نو وجود میں آجاتا ہے! چنانچہ ہر سال اس تاریخ کو خدا یا بعل کا پتلا بنا کر جلایا جاتا تھا اور دوسری صبح اس کے جنم کی خوشی میں رنگ رلیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ ہندوؤں کے ہاں اوتاروں کا مرنا اور پھر جنم لینا اسی عقیدہ کی مثالیں ہیں ——— اور خود مسیحیوں کا عقیدہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ خدا پہلے تو انسانی شکل اختیار کر کے دُنیا میں آتا ہے، اور پھر صلیب پر جا کر موت قبول کر لیتا ہے! مسلمان کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے شروع ہی سے ایک ازلی ابدی باقی و غیر فانی خدا کے عقیدہ سے چونکہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ بڑے ہو کر انکے خیال ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ خدا کبھی اور کسی حال میں کسی معنی میں اور کسی لحاظ سے حادث و فنا پذیر بھی ہو سکتا ہے، لیکن آخر آج بھی کروڑوں کی تعداد میں پڑھے لکھے لوگ خدا کی اسی فنا پذیری کو تسلیم کر رہے ہیں یا نہیں؟ اَلْقَیُّوْمُ۔ مسیحیوں نے جس طرح حضرت حق کی صفتِ حیات کے باب میں سخت ٹھوکر کھائی ہے اسی طرح صفتِ قیومیت سے متعلق بھی عجیب گمراہی میں پڑ گئے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جس طرح بیٹا بغیر باپ کی شرکت و آمیزش کے خدا نہیں اسی طرح باپ پر بھی بغیر بیٹے کو شریک کئے خدا کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ گویا جس طرح نعوذ باللہ مسیح ابن اللہ خدا کے محتاج ہیں اسی طرح خدا بھی اپنی خدائی کے اثبات کے لئے مسیح کا محتاج ہے ——— صفتِ قیومیت کا اثبات کر کے قرآن نے اسی مسیحی عقیدہ پر ضرب لگائی ہے۔ قیوم وہ ہے جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہے بلکہ دوسروں کے بھی قیام کا سبب و باعث ہے اور سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے سب محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔ القیوم القائم الحافظ لکل شئ والمعطی لہ مابہ قوامہ (راغب) ہو القائم بنفسہ مطلقاً لا بغیرہ وھو مع ذلک یقوم بہ کل موجود حتی لا یتصور وجود شئ ولا دوام وجودہ الا بہ (تاج) ائمہ تفسیر نے بھی اسی معنی میں لیا ہے۔ القیم لغیرہ فجمیع الموجودات مفتقرۃ الیہ وھو غنی عنہا ولا قوام لہا بدون امرہ (ابن کثیر) ٩٨٠ (جیسا کہ مشرک قوموں نے سمجھ لیا ہے) جاہلی مذہبوں کے دیوتا بیندے جھوم بھی جاتے ہیں اور سونے بھی لگتے ہیں اور اسی غفلت کی حالت میں ان سے طرح طرح کی فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں۔ مسیحیوں اور یہود کا بھی عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب چھ روز میں آسمانوں اور زمین کو بنا ڈالا تو ساتویں دن اسے ستانے اور آرام لینے کی ضرورت پڑ گئی۔ اسلام کا خدا دائم بیدار، ہمہ خبردار، غفلت سستی اور تھکن سب سے ماورا ر خدا ہے۔ ٩٨١ لَهٗ کو مقدم کر دینے سے معنی میں زور اور تاکید آگئی اور مفہوم حصر کا پیدا ہو گیا یعنی ساری کائنات کی ملکیت اور مالکیت صرف اسی کی ہے۔ کوئی اس صفت میں اس کا شریک نہیں۔ اور اس کی ملک سے مخلوق کا کوئی گوشہ کوئی شعبہ خارج نہیں۔ مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو کائنات کا مالک مانا بھی ہو تو اندھے لولے لنگڑے ناقص قسم کا۔ اسلام نے آکر اس پر زور دیا کہ صحیح رشتہ و تعلق خالق کا مخلوق کے ساتھ ملکیت کاملہ ہی کا ہے۔ لہ میں ل متعلق طور پر ملک کے معنی میں ہے۔ واللام للملک (بحر نہر) ٩٨٢ مَنْ ذَا الَّذِیْ کون ایسا ہے؟ استفہام انکاری ہے، یعنی کوئی ایسا نہیں۔ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ۔ شفاعت پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا۔ مسیح کی شفاعتِ کبریٰ مسیحیوں کا ایک عقیدۂ خصوصی ہے۔ مسیح کے لئے ان کے ہاں بالاستقلال شفاعت ہی ثابت نہیں، بلکہ تخلیقِ کائنات بھی خدا نے (نعوذ باللہ) اپنے اسی فرزند کے واسطہ سے کیا ہے۔ قرآن مجید مسیحیوں سے مخاطب کے وقت اُن کے مخصوص مرکزی عقائد کفارہ و شفاعت وغیرہ پر برابر ضرب لگاتا جاتا ہے۔ بِاِذْنِهٖ۔ یہ تصریح بھی بہت ضروری تھی۔ مسیحیوں نے جہاں نجات کا دارومدار شفاعت پر رکھا ہے وہاں کے برعکس بعض مشرک قوموں نے

مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ

کھل چکی ہے ۹۸۰ تو جو کوئی طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ

اُس نے ایک بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا ۹۸۱ جس کے لئے کوئی شکستگی

لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ

نہیں ۹۸۲ اور اللہ سننے والا بڑا جاننے والا ہے ۹۸۳ اللہ اُن لوگوں کا ساتھی ہے جو ایمان

اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ

لائے ۹۸۴ اور انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال کر لاتا ہے ۹۸۵ اور جن لوگوں نے

كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ

کفر اختیار کیا اُن کے ساتھی شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی

النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

طرف لے جاتے ہیں ۹۸۶ یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں اس میں ہمیشہ

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ

پڑے رہیں گے ۹۸۷ کیا تو نے اُس شخص کے حال پر نظر نہیں کی ۹۸۸ جس نے ابراہیم

فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ

سے اُن کے رب کے بارے میں مباحثہ کیا تھا، اس سبب سے کہ اللہ نے اُسے بادشاہت دے رکھی تھی جب

رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۗ

ابراہیم نے اس سے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو وہ بولا کہ زندگی اور موت تو

وقف لازم ۲ ع ۳۴

منزل

خدا کو قانونِ مکافات (ہندی میں کرم) کے ضابطوں سے ایسا جکڑا ہوا سمجھ لیا ہے کہ اس کے لیے معافی کی اور اسکے ہاں شفاعت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ اسلام نے تو شطوِ اعتدال کی شاہراہ اختیار کرکے بتایا کہ نجات کا مدار ہر گز کسی کی شفاعت پر نہیں، البتہ خدا نے اس کی گنجائش رکھی ہے اور اپنی اجازت کے بعد مقبول بندوں کو دوسروں کی شفاعت کا (جو درحقیقت دعا ہی کی ایک صورت ہے) موقع دیگا اور اُن کی دُعائیں قبول کرے گا۔ اور مقبولین کے سب سے بڑے رئیس و سردار ہمارے رسول کریم صلعم ہیں۔ ۹۸۳ یعنی حاضر و غائب محسوس و معقول مدرک و غیر مدرک سب کا علم اُسے پورا پورا حاصل ہے۔ ما کان قبلھم و ما کان بعدھم (کشاف) تمام یہاں آگے اور پیچھے صرف دو ہی سمتوں کا لیا گیا ہے لیکن مُراد جمیع جہات ہیں اور یہ کنایہ عربی زبان میں عام ہے۔ ھذا کنایۃ عن احاطۃ علمہ تعالٰی بسائر المخلوقات من جمیع الجہات۔ ایدیھم اور خلفھم میں ضمیر جمع غائب یا تو من ذا کے مدلول کی جانب ہے جس میں انبیا و ملائکہ سب آگئے اور یا فی السمٰوٰت والارض کی جانب ہے اور ضمیر مذکر اس لئے کہ مُراد زمین و آسمان کے اہلِ عقل سے ہے۔ ھو الضمیر لما فی السمٰوٰت والارض لان فیھم العقلاء او لما دل علیہ من ذا من الملائکۃ والانبیاء (کشاف) صفاتِ باری میں حیات کا، قیومیت کا، مالکیت کا اثبات اوپر ہو چکا ہے۔ اب یہاں اس حقیقت کا ہو رہا ہے کہ حق تعالٰی کی صفتِ علم بھی کامل ہے۔ سعی و سفارش کا ایک موقع دُنیا میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جس حاکم یا مالک کے سامنے مقدمہ در پیش ہو اس کا علم محیط و کامل نہیں اسلئے ضرورت ہے کہ خارجی ذرائع سے اسکے معلومات میں اضافہ کیا جائے اور اسکے علم کو کامل کر دیا جائے۔ یہاں یہ بتلا کر کہ اللہ کا علم خود ہر خفی و جلی پر حاوی ہے۔ گویا یہ بتا دیا کہ اس کے علم پر کسی کے اضافہ کرنے اس کے آگے کسی کی خوبیاں جتلانے اُسے کسی نامعلوم شے پر آگاہ کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اور اس طرح مسیحی عقیدۂ شفاعت پر ایک اور ضرب لگی —

۹۸۴ کون نہیں گھیر سکتے؟ وہی مخلوقات جن میں پیمبر و فرشتہ سب شامل ہیں۔ من علمہٖ میں علم سے مراد معلوماتِ الٰہی سے ہے۔ ای من معلوماتہ (کشاف) العلم ھنا المعلوم (بحر) بڑے سے بڑے صاحبِ علم و معرفت بھی بس میں یہ نہیں کہ معلوماتِ الٰہی میں سے کسی ایک ہی چیز کی کُنہ و حقیقت سے پوری طرح واقف ہو جائے۔ محدود و لامحدود کے علم کا مقابلہ ہی کیا۔

۹۸۵ (اپنی حکمت و مصلحت کے موافق) یہاں اسی حقیقت کا بیان ہے کہ بندہ بڑے سے بڑا بھی عالم و عارف ہو، بہرحال اس کا علم محدود ہوتا ہے اور عین مشیتِ الٰہی کے ماتحت و مطابق۔

۹۸۶ (وہ خود بڑی سے بڑی چیز میں کیسے سما سکتا ہے) اس کی کرسیِ علم و قدرت تو خود سارے کائنات پر محیط ہے اس کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے تو آسمان پر، عرش پر، کسی وسیع سے وسیع چیز کے بھی اندر کیسے سما سکتا ہے؟ وہ سب کو گھیرے ہوئے ہے، اُسے کون گھیر سکتا ہے۔ اس صفت کے اثبات سے اُن مشرکوں کے بھی عقیدہ کی تردید ہو گئی جو خدائے تعالٰی کے مجسم ہونے اور کسی مکان میں اس کے محدود و مقید ہونے کے قائل ہیں۔ کرسی سے مُراد علمِ الٰہی لی گئی ہے۔ ابن عباسؓ صحابی سے یہی معنی منقول ہیں اور متعدد اہلِ تفسیر نے اس کی پیروی کی ہے۔ کرسیہ ای علمہ (ابن جریر عن ابن عباس) قیل مجاز عن العلم (روح) الکرسی ھو العلم (کبیر) ای علمہ ومنہ الکراسۃ لتضمنھا العلم (مدارک) ای وسع علمہ وسمی العلم کرسیا تسمیۃ بمکان الذی ھو کرسی العالم (کشاف) کرسی کے عام متعارف معنی وہی ہیں جو اُردو ہی میں چلے ہوئے ہیں لیکن حق تعالٰی کے سلسلہ میں کہیں وہ معنی تھوڑے ہی مُراد ہو سکتے ہیں۔ کیا نعوذ باللہ اللہ تعالٰی بھی کوئی جسم رکھتا ہے جو وہ اس عام معنی میں کرسی نشین ہوگا۔ ولا کرسی فی الحقیقۃ ولا قاعد (بیضاوی) کرسی کے اصل معنی علم ہی کے ہیں اور کراسۃ جو علمی صحیفوں کے لئے آتا ہے وہ اسی اصل کر ماخوذ ہے اور اہلِ لغت نے کرسی کے جہاں ایک معنی سریر کے دیئے ہیں، وہاں دوسرے معنی علم کے کئے ہیں۔ الکرسی السریر والعلم (قاموس) اصل الکرسی العلم ومنہ قیل للصحیفۃ یکون فیھا علم مکتوب کراسۃ (ابن جریر) کرسی کے دوسرے معنی قدرت و حکومت کے بھی ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی بہتیرے اہلِ لغت و اہلِ تفسیر اسی طرف گئے ہیں۔ الکرسی المقدرۃ (قاموس) وقیل کرسیہ ملکہ (راغب) المراد من الکرسی السلطان والقدرۃ والملک (کبیر) قیل کرسیہ ملکہ وسلطانہ والعرب تسمی الملک القدیم کرسیا (معالم) قال قوم کرسیہ قدرتہ التی یمسک بھا السمٰوٰت والارض (کشاف) ای وسع ملکہ تسمیۃ بمکانہ الذی ھو کرسی الملک (کشاف) غرض یہ کہ اس کی کرسی علم ہو یا کرسی حکومت وہ جمیع کائنات کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بڑی چھوٹی لطیف کثیف، جلی خفی، ہر چیز اس پر عیاں و روشن ہے۔ ۹۸۷ (کہ اس سے تھک کر اسے کسی شریک یا مددگار کی ضرورت پڑے) مشرک قوموں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اتنے وسیع اور لق و دق سلسلۂ موجودات کی نگرانی تنہا خدا کہاں تک کر سکتا ہے۔ اس لئے نعوذ باللہ وہ کبھی غافل بھی ہو جاتا ہے اور یہ کاروبار سنبھالنے کے لئے اُسے ضرورت شریکوں اور مددگاروں کی بھی پڑ گئی ہے۔ خود یہود اور مسیحیوں کا عقیدہ خدا کے ستانے اور آرام لینے کے باب میں بھی اسی تخییل کی طرف مشیر ہے۔ حفظھما میں تثنیہ کے صیغہ سے مُراد ہے ایک طرف سلسلۂ سمٰوٰت اور دوسری طرف زمین اور اسی لئے قرآن مجید نے ہر ایسے موقع پر صیغہ بجائے جمع کے تثنیہ کا استعمال کیا ہے۔ ۹۸۸ یعنی ایک طرف ہر نقص سے دور اور ہر عیب سے بالاتر۔ دوسری طرف تمام صفاتِ کمال کا جامع۔ علی اور عظیم دو دو صفتوں کا الا معنی سوخالی اور بے کار نہیں۔ علو کا حاصل ہے تمام صفاتِ نقص کی نفی، سارے عوارضِ حدوث سے برتری۔ العلی المتعالی عن الاشباہ والانداد والامثال والاضداد وعن امارات النقص ودلالات الحدث (روح) العلی الرفیع فوق خلقہ المتعالی عن الاشباہ والانداد (بحر) اور عظمت کا حاصل ہے تمام صفاتِ کمال کا اثبات اور ایسی ذات کا ایجاب جس کے مرتبہ کی انتہا ہو اور جس کی دریافت ہو سکے۔ ای ذو العظمۃ وکل شیء بالاضافۃ الیہ حقیر (روح) العظیم الذی لا منتہی لعظمتہ ولا یتصور کنہ ذاتہ (روح) العظیم ذو العظمۃ الذی کل شیء دونہ فلا شیء اعظم منہ (بحر) گویا ان دو صفات کے اندر عظمت و کمال کے سلبی و ایجابی پہلو سارے کے سارے آگئے۔ اور ہر قسم ضلالت کی تردید ہو گئی جو شرک فی الصفات سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ۹۸۹ دین کا تعلق اصلاً عقیدۂ قلب سے ہے اور قلب پر جبر و اکراہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اسی لئے گویا یہاں اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ایمان کا تعلق اپنے ارادہ و اختیار سے ہے جبر و اضطرار پر نہیں۔ ای لم یجر اللہ امر الایمان علی الاجبار والقسر ولکن علی التمکین والاختیار (کشاف) ولولا ذلک لما حصل الابتلاء ولبطل الامتحان والی ذلک ذھب القفال (روح) قال ابو مسلم والقفال معناہ انہ ما بنی تعالٰی امر الایمان علی الاجبار والقسر وانما بناہ علی التمکن والاختیار (بحر) جبریہ کو کم فہموں نے اسلام میں جبر کی اصل سمجھا ہے حالانکہ اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ جزیہ کی مشروعیت عین اس کے برعکس خود اس کی دلیل ہے کہ مقصود محض قانونِ اسلام و حکومتِ اسلام کو غالب رکھنا ہے نہ کہ فرد فرد اور ہر کافر کو بجبر مسلم بنانا۔ مفسر تھانویؒ نے کہا ہے کہ اکراہ کی نفی سے مقصود اکراہ فی نفسہٖ کی نفی ہے۔ اسلئے کہ اگر مرتد پر یا کافر حربی پر بوجہ خفائے دین کے اکراہ کیا جائے جیسا شریعت میں حکم ہے تو نفی اکراہ فی نفسہٖ کے معارض نہیں اور یہ اکراہ بھی صورت دین پر ہوگا۔ نہ کہ حقیقتِ دین پر کیونکہ قلب پر اطلاع کا کوئی یقینی طریق نہیں اور اس نفی اکراہ سے نہی عن الاکراہ بھی لازم آگئی۔ اسلئے بعض نے نہی کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے یعنی دین میں اکراہ مت کرو۔ ای ھو من

ووضوح الدلائل والحجج بحیث لا یکون فیه اکراہ بل یجب الدخول فیه بانشراح صدر واختیار (ر) الدین ۔ دین سے مراد مطلق دین نہیں۔ دین اسلام ہے۔ والدین ھنا ملۃ الاسلام واعتقادہ (بحر) ۹۹۰ اور دلائل و شواہد نے
دونوں کے درمیان علانیہ امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ الرُّشْدُ یعنی راہِ اسلام۔ الغَیّ یعنی طریقِ کفر۔ یعنی اب تو کفر و اسلام کے درمیان بہت کھلے ہوئے فرق و امتیازات پیدا ہو چکے ہیں۔ اب کسی پر خفا والتباس کی کوئی وجہ نہیں ۔
۹۹۱ یعنی جس نے دینِ اسلام قبول کر لیا اور جو باطل کی پیروی سے باز آ گیا اُسے دنیا و آخرت میں ایک بڑا زبردست سہارا ہاتھ آ گیا۔ الطَّاغُوْتُ ۔ طاغوت ۔ کا صحیح ترجمہ مشکل ہی ہے۔ اردو میں اس کے لئے قریب ترین لفظ شیطان کا
ہو سکتا ہے۔ اپنے عام و وسیع معنی میں عربی میں اس کا اطلاق ہر معبودِ باطل اور ہر سرکش پر ہوتا ہے۔ قال ابو اسحٰق کل معبود من دون اللہ جبتٌ وطاغوتٌ (لسان) الطاغوت عبارۃ عن کل متعدٍ وکل معبود من دون اللہ (راغب)
مالک بن انس اور بعض اور اہلِ تفسیر بھی اسی عموم کی طرف گئے ہیں۔ قال مالک ابن انس کل ما عبد من دون اللہ تعالیٰ (مدارک) مروی عن مجاھد والاولیٰ کل ما طغیٰ کبیرا ما عبد من دون اللہ تعالیٰ قالہ الطبری (بحر) ۹۹۲ (نہ دنیا میں
نہ آخرت میں) بندہ کا فاطرِ کائنات سے صحیح و فکری تعلق ہی کا نام دینِ اسلام ہے۔ یہ وہ زبردست سہارا ہے جس کے ہاتھ لگ جانے کے بعد زندگی کا ہر مرحلہ آسان ہو جاتا ہے اور ہر عقدہ کا حل مل جاتا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر آخرت کی
بھی منزلیں آسان ہو رہتی ہیں۔ اس ایک سہارے کے سوا باقی سہارے سہارے ناقص، کمزور اور بودے ہیں۔ بعض محققین صوفیہ نے کہا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ نسبت مع اللہ ہے۔ وہ حاصل ہو جانے کے بعد منقطع نہیں ہوتی۔ ۹۹۳ سَمِیْعٌ
سننے والا الفاظ کا اور اقوال کا۔ عَلِیْمٌ جاننے والا احوال کا اور اعمال کا۔ یعنی اللہ کو ظاہر و
باطن، کلی و جزئی ہر قسم کا علم و اطلاع ہے ۔۔۔۔ اللہ کی باخبری اور ہمہ علمی مسلمانوں کو ایک معمولی
اور موٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جاہلی قوموں میں ایک دو نہیں کثرت سے ایسی ہیں جو حق تعالیٰ کی
صفتِ علم میں بھی شبہ کر چکی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض جاہلی فلاسفہ یہ بھی کہہ گزرے ہیں کہ خدا کو علم صرف
کلیات کا ہے جزئیات کا نہیں ہوتا۔ کلامِ مجید کی اس قسم کی آیتوں کی پوری قدر جبھی ہوتی ہے،
جب دنیا کی جاہلی قوموں کے عقائدِ باطلہ پر نظر ہو ۔۔۔۔ ! ۹۹۴ وَلِیُّ ۔ ولی کا ترجمہ بھی کسی
ایک لفظ سے مشکل ہی ہے۔ رفیق، دوست، پشت پناہ، سرپرست سب کے مفہوم اس میں شامل ہیں
اور اہلِ تفسیر سے یہ سب معنی منقول ہیں۔ محبّھم ومتولی امورھم (بیضاوی) نصیرھم وظھیرھم
یتولاھم بعونہ (ابن جریر) الولی المتکفل بالمصالح (کبیر) معینھم ومحبھم او متولی امورھم (مدارک)
اہلِ ایمان کے بگڑے کام بنانے والا۔ آڑے وقت ان کے کام آنے والا اللہ ہی ہے نہ کہ ابن اللہ یا
کوئی دیوی دیوتا ۔۔۔۔ نفی نہ مسیحیوں اور مشرکوں کا یہاں بھی کیا گیا۔ بعض صوفیہ نے
آیت سے ولایتِ عامہ کے اثبات پر استدلال کیا ہے۔ ۹۹۵ (اور یہی مومنین کے حق میں سب سے
بڑی اور کار آمد نصرت و پشت پناہی ہے) الظُّلُمٰتِ سے مراد کفر، انواعِ کفر اور متعلقات و
ملحقاتِ کفر ہیں۔ مثلاً شک و ارتیاب، شہوتِ ممنوع میں غلو وغیرہا۔ النُّوْرِ سے مراد ایمان و انوارِ
ایمان ہیں۔ عقلِ سلیم و ذوق شوق وغیرہا۔ کفر و ظلمات کی قسمیں بے شمار ہیں اس لئے ظلمات کو
صیغۂ جمع میں لائے۔ انواعِ کفر و اسبابِ کفر بہت زائد ہیں۔ دو نقطوں کے درمیان منحنی یا ٹیڑھے خط
بے شمار ہو سکتے ہیں۔ سیدھا خط ایک ہی ہو سکتا ہے۔ راہِ راست ایک ہی ہے اس لئے النور
قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی آیا ہے صیغۂ واحد ہی میں آیا ہے۔ ۹۹۶ (ترغیب، تحریص و تخویف
کے ہر ممکن حربے سے کام لے کر) طَاغُوْتُ پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے اس کا اطلاق واحد جمع دونوں
پر ہوتا ہے۔ یہاں معنی میں جمع ہی مراد ہے۔ اور جب فضا ہی ساری کی ساری ظلماتی ہو تو ظاہر ہے
کہ شیطنت اور بدی کے محرکات کتنے بڑھ جاتے اور ایمان و تقویٰ کے محرکات کتنے گھٹ جاتے ہیں۔
شیطان بدی کے چہرہ پر طرح طرح کے خوشنما نقاب ڈال، اس کے نام طرح طرح کے خوبصورت رکھ
اُسے سامنے لانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جو اہلِ ایمان اہلِ تقویٰ ہیں وہی نکو بن کر رہ جاتے ہیں۔ اکبر
الٰہ آبادی ؎ مغوی کو بھی بدنہ کہئے ترغیب ہے یہ کس نے نہیں کہوں کہ دل کی تخریب ہے یہ
شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن اک شور مچا خلافِ تہذیب ہے یہ
۹۹۷ (کہ انہوں نے اپنی قوتِ فیصلہ سے کام نہ لیکر راہِ کفر و ضلالت اختیار کی) ۹۹۸ (اے مخاطب)
اَلَمْ تَرَ اِلَی ۔ عربی ادب میں یہ اسلوبِ بیان حیرت و استعجاب کے موقع کیلئے ہے اور وہ بھی پہلوئے ذم لئے ہوئے
جب کبھی کسی کے کسی حیرت انگیز نقص یا عیب کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے تو اسے شروع اس طریق

قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ
ابراہیم نے کہا اچھا اللہ تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو (ذرا) اسے
الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ
مغرب سے نکال دکھا ۹۹۹ اس پر وہ جو کافر تھا دنگ
الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۲۵۸
رہ گیا ۱۰۰۰ اور اللہ ظالم لوگوں کو راہِ ہدایت نہیں دکھاتا ۱۰۰۱
اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی
یا (پھر) اس شخص کے حال پر نظر کی ۱۰۰۲ جو ایک بستی کو گزر رہا تھا اس حال میں کہ وہ (بستی) اپنی چھتوں کے
عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ
بل گری ہوئی تھی ۱۰۰۳ وہ کہنے لگا اللہ اس (آبادی) کو اس کے مرے پیچھے کیوں کر جلا
مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ
اٹھائے گا ۱۰۰۴ سو اللہ نے اس شخص کو سو سال تک مُردہ رکھا، پھر اسے جلا اٹھایا ۱۰۰۵ (پھر) پوچھا
كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ
تو کتنی مدت اس حالت میں پڑا رہا، اس نے کہا میں (اس حالت میں) کوئی دن بھر یا اس کا کچھ حصہ رہا ہوں
بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ
نہیں بلکہ تو سو سال (کی مدت) تک رہا۔ اپنے کھانے اور پینے کی طرف تو دیکھ (کہ اب تک) وہ
لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً
سڑا گلا نہیں ہے ۱۰۰۶ اور اپنے گدھے کو دیکھ ۱۰۰۷ اور یہ سب اس لئے کہ ہم تجھے ایک نشان

پر کرتے ہیں جیسے اردو میں "کہئے کہ تم نے فلاں کی حرکت دیکھی ہے؟" وکذلک تفعل العرب اذا ارادت التعجب من رجل فی بعض ما انکرت من فعلہ قالوا ما تری الی ھذا (ابن جریر) ھی کلمۃ یوقف بھا المخاطب علی تعجب
ھنا ولفظھا لفظ الاستفہام (کبیر) ۹۹۹ (منکر و مخالف کی حیثیت سے) یہ بحث و مناظرہ کرنے والا کون تھا؟ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوئی معاصر بادشاہ تھا۔ یہ تصریحات تو قرآن مجید بلکہ اس آیت کے اندر موجود ہیں۔ مفسرین نے اس
موقع پر نمرود کا نام لیا ہے اور چونکہ اس خاص قصہ کا ذکر اہلِ کتاب کی کتابوں میں موجود نہیں اس لئے وہ اس روایت ہی کے ماننے میں تأمل کر رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید تو ریت کی اس طرح کی خدا جانے کتنی فروگزاشتوں کی تصحیح کر گیا ہے۔ اتنا تو بہرحال
تاریخ توریت اور روایاتِ یہود میں تسلیم ہے کہ نمرود نامی بادشاہ کا وجود تھا۔ بادشاہ بہت بڑا تھا اور ساتھ ہی سخت ظالم اور مشرک اور آزر اس کا وزیر تھا۔ توریت میں ہے:۔ "اور کوش سے نمرود پیدا ہوا وہ زمین پر جبار ہونے لگا۔ خداوند کے سامنے وہ
صیاد و جبار تھا۔ اسی واسطے مثل ہوئی کہ خداوند کے سامنے نمرود سا صیاد و جبار (پیدائش ۱۰: ۸، ۹) اور کوش سے نمرود پیدا ہوا وہ زمین پر جبار ہونے لگا (۱۔ تواریخ ۱: ۱۰) اور حسبِ روایاتِ یہود یہ نمرود اپنے قبیلہ والوں کی مختصر فوج سے کل یافث کو
شکست دینے کے بعد زمین کا بادشاہ ہو گیا۔ اور آزر کو اس نے اپنا وزیر بنایا۔ اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرود خدا سے بیگانہ ہو گیا۔ اور بہت سخت قسم کا مشرک بن گیا۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۹ ص) بابل و کلدانیہ ہی کی تاریخ میں
ایک اور بادشاہ کا نام آتا ہے جو بابل کا سب سے پہلا انسانی خدا تھا۔ بعض مورخین نے اسے نمرود کا مرادف قرار دیا ہے (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۲ ص) انیسویں صدی عیسوی کے ثلثِ آخر میں فرنگی مادیت و عقل پرستی اور اس کی
تقلید میں ہندوستانی "روشن خیالی" اور "نیچریت" کا شدید تقاضا یہ تھا کہ ان قصوں ہی کو سرے سے انکار کر دیا جائے لیکن جوں جوں خود فرنگی مورخین کے قدم آگے بڑھتے گئے یہ تشکیک و بے اعتقادی بھی ضعیف ہوتی چلی گئی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے
سب سے آخری یعنی چودھویں ایڈیشن میں اعتراف ہے کہ نصف صدی پیشتر ان قصوں کو جیسا بے اصل و نامعتبر سمجھ لیا گیا تھا وہ خیال اب مزید تحقیق سے قائم نہیں رہا۔ یہاں تک کہ نمرود کے ساتھ مناظرۂ ابراہیمی کا قصہ بھی (جلد ۱۲ ص) ۔ رَبِّیَ میں ضمیر
ابراہیم کی طرف ہے لیکن بعض نے الذی حاجہ کی جانب بھی جائز رکھی ہے۔ اور اس صورت میں ترجمہ ہوگا اپنے رب کے باب میں۔ والضمیر یحتمل ان یعود الی ابراھیم ویحتمل ان یرجع الی الطاغی (البحر المحیط) بہرحال قابلِ لحاظ نقطہ یہاں رب پر
گفتگو رب کے بارہ میں تھی۔ اللہ کے بارہ میں نہ تھی مسئلہ ربوبیت میں تھی بابِ الوہیت میں نہ تھی ۱۰۰۰ یعنی اُسے وسعتِ سلطنت ہی نے استنادِ لیرا سرکش اور برخود غلط بنا رکھا تھا۔ روایاتِ یہود میں یہاں تک تصریح ملتی ہے کہ دعویٰ

تعظیم بلکہ پرستش خدا ہی کی طرح کرتا تھا اور اپنے لئے اُس نے ایک عرشِ الٰہی تیار کرایا تھا جس پر اجلاس کیا کرتا تھا (ملاحظہ ہو گینزبرگ Ginzbug کی حکایاتِ یہود Legends of the Jews. جلد اول صفحہ ۱۷۸) آن
اٰتٰہُ اللّٰہُ میں ان سببیہ ہے لِاَن کے معنی میں اے اطغیٰ ایتاء الملك وحمله علی المحاجة (مدارک) کلدانیوں کا ملکی اور قومی مذہب خوب خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں اصلاً شمس پرستی تھا یعنی سورج دیوتا کی پوجا اور یہی سب
دیوتاؤں کے سردار تھے۔ نمرود کلدانی فرعون مصری کی طرح اپنے کو اسی خدائے اعظم کا مظہر یا بروز یا اوتار سمجھتا تھا۔ اور اہلِ توحید کو اپنے ملک کا غدار و باغی اور اپنے مذہب کا دشمن اور منکر قرار دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ اہلِ توحید کے خدائے واحد سے بھی جلنے
لگا تھا جوزیفس یہود کا مورخِ قدیم اپنی تاریخ آثارِ یہود میں لکھتا ہے۔ "وہ لوگوں کی خوشحالی کو خدا کی جانب نسبت دینے سے روکنے لگا۔ گویا کہ وہ خود قادر علی الاطلاق ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اب کی خدا نے طوفانِ نوحؑ کی طرح دنیا کو ڈبویا تو
میں اُس سے انتقام لوں گا" (کتاب اول۔ ۴:۲) **۱۰۰۱** (آپ کے اس سوال کے جواب میں کہ وہ کونسا خدا ہے جس کے تم پرستار ہو؟) نمرود تو مدعی اپنے خدا ہونے اور مظہرِ خدا ہونے کا تھا۔ اُس نے داعیٔ توحید کو چیلنج دے کر
پوچھا کہ وہ کونسا خدا ہے جس کی تم دعوت دے رہے ہو؟ ذرا میں تو اس کے اوصاف سنوں۔ مشرک افراد آج بھی بڑی حیرت اور بڑے اچنبھے کے ساتھ پوچھا کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں دیوتا اور فلاں فلاں دیویوں کے علاوہ اور ان سے
ماورا، آخر خدا ہے کونسا؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اسکے افعال وصفات کیا ہیں؟ **۱۰۰۲** یعنی حیات وموت کی ساری قوتیں اسی کے ہاتھوں میں ہیں۔ وہی سارے نظامِ ربوبیت کا سرچشمہ ہے۔ کائناتِ حیاتی کی بقا وفنا کے سارے قانون
اور ضابطے آخر میں اسی پر جا کر ٹھیرتے ہیں کسی بندہ میں یہ طاقت نہیں کہ اس نظامِ حیاتی وانفنائی کو بدل دے یا اس میں کوئی ادنیٰ تصرف بھی کر دکھائے۔ فقہاء مفسرین نے کہا ہے کہ آیت سے مداہنت کا ابطال ہو رہا ہے۔ محققین صوفیہ نے محاجۂ
ابراہیمی سے یہ استنباط کیا ہے کہ ضرورتِ دین کے وقت بحث ومناظرہ ہرگز تجرید وتفرید کے منافی نہیں خصوصاً کامل کیلئے۔ اور علم کلام کا سنتِ انبیاء میں سے ہونا تو بیان سے بالکل ظاہر ہو رہا ہے۔ وھذہ الاٰیة تدل علی صحة المحاجة فی
الدین واستعمال حجج العقول والاستدلال بدلائل اللّٰہ تعالیٰ علی توحیدہ وصفاتہ الحسنیٰ (جصاص) اور ایک محقق نے یہ نکتہ بھی خوب نکالا ہے کہ حضرات انبیاء توحیدِ باری میں صرف افعالِ حق سے استدلال کرتے تھے اور ایسی صفات
کو پیش نہ کرتے جن سے مذہبِ تشبیہ وتجسیم کیلئے گنجائش نکل سکے۔ تدل علی انه تعالیٰ لا یشبه شیئا ولا طریق معرفته الاّ نصب من الدلائل علی توحیدہ لان انبیاء علیھم السلام انما حاجّوا الکفار بمثل ذلك ولو نصفوا اللّٰہ تعالیٰ
بصفة توجب التشبیه ولما وصفوہ بافعاله واستدلوا بھا علیه (جصاص) **۱۰۰۳** نمرود نے موت وحیات کے اسبابِ بعیدہ خفی کو چھوڑا اور صرف اسبابِ ظاہری وسطحی کو سامنے رکھ کر جواب دیا کہ سامانِ معیشت تو سب میرے ہاتھوں میں ہے
میں جسے چاہوں روزی دوں اور جسے چاہوں بھوکوں مار ڈالوں یا کسی اور طریقہ سے اس کی زندگی ختم کر دوں۔ **۱۰۰۴** (اگر تو اپنے دعوائے قدرت وتصرف میں کچھ بھی سچائی رکھتا ہے) نمرود اوتار تھا سورج دیوتا کا۔ اور سورج ہی کلدانیوں کے عقیدہ
میں معبودِ اعظم تھا۔ اسی کی مثال کو اور زیادہ قریب الفہم بنانے کیلئے موحدِ اعظم نے اس کو پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم سورج کے قادر ومتصرف ہونے کے قائل ہو تو زیادہ نہیں یہی کر دکھاؤ کہ سورج اپنے ارادہ سے عام سنتِ الٰہی کے خلاف ذرا اپنا رُخ ہی بدل دے
دوسروں پر قدرت رکھنا الگ رہا۔ خود اپنے ہی پر ذرا اپنا ارادہ صرف کر دکھائے۔ اور ارادہ بھی اتنا ہلکا کہ صرف رُخ بدل دینے کا۔ کسی خدا کی بےبسی کا منظر اس سے بڑھ کر اور کیا پیش ہو سکتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے استدلال وہی قائم رکھا۔ صرف مخاطب کی
سطحی ذہنیت کا لحاظ کر کے اس کی مثال دوسری پیش کر دی اور فرمایا کہ اچھا کائناتِ حیاتی نہ سہی، کائناتِ طبعی ہی کے خدائی نظام میں ایک ادنیٰ تصرف کر کے دکھا دو۔ نمرود سورج دیوتا کا اوتار تھا، اور سورج کے خدائے اعظم ہونے کا قائل۔ اس کے
عقیدہ کے ابطال وتردید میں سورج ہی کو مثال میں پیش کرنا اس پر بہترین گرفت تھی۔ **۱۰۰۴** یعنی عاجز ولاجواب ہو گیا۔ اس کا جواب کسی مشرک وآفتاب پرست کے پاس ہو کیا سکتا تھا؟ نہ اس وقت کسی سے بن پڑا نہ آج کسی سے بن
پڑنا ممکن ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ جس ہستی کے متعلق صاحبِ ارادۂ عظیم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ تجربہ ومشاہدہ سے ارادۂ خفیف سے بھی معریٰ ثابت ہو رہا ہے۔ **۱۰۰۵** عاجز ولاجواب ہو جانے کے باوجود وہ ایمان نہ لایا۔ اور
ایمان لاتا ہی کیسے؟ جو لوگ غفلت اور عناد سے کجروی اختیار کئے رہتے ہیں انہیں ہدایت کبھی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ الظّٰلمین۔ وہی لوگ ہیں جو خلوص ذہن کے ساتھ حق وحقیقت پر غور ہی نہیں کرتے اور اپنی ضد ونفسانیت پر قائم
رہتے ہیں۔ آیت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ ایمان مستقیم اور فہمِ سلیم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ **۱۰۰۶** (اے مخاطب) آیت کا عطف معنوی ہے آیتِ سابق پر۔ اور تقدیرِ کلام اکثر نحویین کے نزدیک یہ ہے۔ اَرَاَیْتَ کَالَّذِیْ حَاجَّ اَوْ ھَل رَاَیْتَ
اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ. وھو قول الکسائی والفراء وابی علی الفارسی واکثر النحویین (کبیر) اور دوسری ترکیب یہ بھی بیان کی گئی ہے۔ اور اَرَأیت مثل الذی مرّ الخ زمخشری بیضاوی وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ **۱۰۰۷** یعنی
اس کی عمارتیں بالکل منہدم ومسمار ہو چکی تھیں۔ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا۔ عربی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ بستی بالکل تباہ وبرباد ہو چکی تھی چھتیں گریں پھر چھتوں کے اوپر دیواریں۔ بان سقط السقف اولاً ثم تھدمت
الجدران علیه (روح) یہ کون صاحب تھے اور کس تباہ شدہ بستی سے ان کا گزر ہوا تھا! اَلَّذِیْ مَرَّ۔ مفسرین نے زیادہ تر مراد حضرت عزیرؑ نبی سے لی ہے سلسلۂ اسرائیل کے ایک مشہور پیمبر گزرے ہیں۔ ان کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح تھا۔
۴۵۰ ق م میں ڈیڑھ ہزار یہود کو ان کی قید اور جلاوطنی سے چھڑا کر فلسطین لائے۔ بائبل میں ان کا نام عزرا کاتب یعنی کاتبِ توریت کی حیثیت سے آتا ہے۔ ایک صحیفہ بھی ان کے نام کی طرف منسوب ہے۔ قتادہ۔ سدی وغیرہ تابعین اسی طرف گئے ہیں
بلکہ یہی قول حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ صحابہ سے بھی مروی ہوا ہے۔ ذکر انه عزیر (ابن جریر عن قتادہ) ھو عزیر (ابن جریر عن السدی) المار ھو عزیر کما اخرجه الحاکم عن علی واسحٰق بن بشر عن ابن عباسؓ وعبداللّٰہ بن سلامؓ
الیه ذھب قتادة وعکرمة والربیع والضحاك والسدی (خلق کثیر) (روح) دوسرا قول حضرت یرمیاہ نبی سے متعلق نقل ہوا ہے۔ یہ بھی اسرائیلی سلسلہ کے پیمبر ہوئے ہیں۔ یہ ساتویں صدی قبل مسیح میں تھے۔ اور تاریخ یہود میں آتا ہے کہ انہیں نبوت ۶۲۶
ق م میں ملی تھی۔ تاریخی اعتبار سے امکان ان کے لئے بھی ہے۔ گو ذرا ضعیف۔ حضرت باقرؒ اور وہب سے روایت انہی کے متعلق ہے۔ قیل ھو ارمیا بن خلقیا وھو المروی عن ابی جعفر والیه ذھب وھب (روح)
بائبل میں اس سے ملتا جلتا ہوا ایک قصہ حضرت حزقیل نبی سے متعلق درج ہے۔ جو یرمیاہ نبی کے ہمعصر اور چھٹی صدی قبل مسیح میں تھے لیکن بائبل میں یہ قصہ بصورتِ واقعہ نہیں، بلکہ کشف یا رؤیا کے طور پر ہے (حزقیل۔ باب ۳۷)
قَرْیَةٍ۔ یہ بستی کونسی تھی، نام مختلف شہروں کے لئے گئے ہیں لیکن اکثریت یروشلم یا بیت المقدس کی طرف گئی ہے۔ یہ شہر بخت نصر تاجدارِ بابل کے ہاتھوں ۵۸۶ ق م میں پوری طرح تاخت وتاراج ہو چکا تھا۔ بظاہر یہ واقعہ اسی شہر کے
متعلق اس کی تباہی کے بعد قریب ہی کے زمانہ کا ہے۔ القریة بیت المقدس قاله وھب وقتادة والضحاك وعکرمة والربیع (کبیر) **۱۰۰۸** (قیامت کے دن) ھٰذِہٖ۔ اشارہ مُردہ شہر کے مُردہ باشندوں کی جانب ہے۔ اہلِ بصیرت کے لئے
ہر حسرتناک منظر ایک درسِ عبرت ومعرفت ہوتا ہے۔ عجب کیا جو خدا کے نبی کا ذہن اپنے پیشِ نظر منظرسے کائنات کے ہولناک ترین منظر کی طرف منتقل ہوا ہو، اور اس سے انہوں نے ایک اور سبقِ معرفت کا حاصل کرنا چاہا ہو۔ المشار الیه
اما نفس القریة بدون تقدیر او تقدیر مضاف ای اصحاب ھٰذہ القریة (روح) ای اھل ھٰذہ (مدارک) اَنّٰی یہاں کیف کے مرادف اور کس طرح یا کس کیفیت کے ساتھ کے معنی میں ہے۔ اعتراف العجز عن معرفة طریقة الاحیاء واستعظام لقدرة المحیی
ای علی ای حال یحیی (روح) آخرت میں حشرِ احیاء پر یقین نبی کیا معنی ہر مومن کو ہوتا ہے۔ سوال سے نبی کا مطلب تو یہی نہیں ہو سکتا کہ اس کے نفسِ وقوع میں شبہہ ظاہر کیا جائے۔ وہ صرف اس کی نوعیت جاننے اور کیفیت سمجھنے کے آرزومند
تھے۔ **۱۰۰۹** (بطور خرقِ عادت) معجزات یا خوارق پر کوئی عقلی اعتراض اگر کسی ملحد کی طرف سے ہو تو خیر اس کیلئے تو کچھ گنجائش بھی ہے لیکن خدا کے ماننے والے کی طرف سے یہ عقلی اعتراض یا اس کے امکان میں گفتگو بالکل بےمعنی ہے جب
معجزہ کا فاعل خدا تعالیٰ ہے تو وہ تو ادنیٰ مطلق جس طرح اپنی عادت یا معمولِ عام کے اجراء وابقاء پر قادر ہے ٹھیک اسی طرح اور ہمیشہ اسی درجہ میں اس کے ترک وخرق پر بھی! اسکے نزدیک تو یہ اور وہ ایسا اور ویسا یہ دونوں بالکل یکساں ومساوی ہیں
بلکہ اس ہستیٔ مطلق کے لئے یہ عادت، خلافِ عادت کے معنی ہی کیا؟ یہ موافقِ عادت وخارقِ عادت کی اصطلاحیں تو محض بندوں کے علم کے لحاظ سے ہیں۔ یہ تو ہم نے جس چیز کا بار بار اور متواتر مشاہدہ کیا اُسے عادتِ الٰہی میں داخل کر دیا۔ اور جس چیز کو
ایسا نہ پایا اُسے خلافِ عادت اور خارقِ عادت سے تعبیر کرنے لگے! لفظ "معجزہ" تو خود ہمارے جہل کا پردہ پوش ہے۔ حق تعالیٰ کے لئے کونسی تعبیر معجزہ ہو سکتی ہے؟ غرض کوئی مذہبی شخص کسی بڑے سے بڑے معجزہ کے نفسِ امکان میں تو زبان کھول
ہی نہیں سکتا، گفتگو جو کچھ بھی چلیگی رویت وروایت معتبر کے لحاظ سے چلیگی۔ اور بحث ظاہر ہے کہ تمامتر نقلی اور تاریخی ہوگی نہ کہ عقلی۔ وقوعِ معجزہ کے راوی اگر معتبر اور شاہد عینی ہیں تو وہ خارقِ عادت بھی ہمارے لئے ایسا ہی قابلِ یقین ہوگا جیسا کہ روزمرہ کے
عام واقعات ہوتے ہیں اور پھر جس معجزہ کے راوی خود حق تعالیٰ یا نبی معصوم ہوں اس کے باب میں تو ظاہر اور بالکل ظاہر ہے کہ آگے کوئی گفتگو چل ہی نہیں سکتی۔ کس وقت کس خارقِ عادت کے ظہور کی کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں، یہ حال بجز
حکیمِ مطلق کے اور کون جان سکتا ہے؟ **۱۰۱۰** یہ جواب اس بندہ نے اپنے علم وشعور اور اپنے احساس واندازہ کے مطابق دیا۔ اور بشری اندازہ وتخمین کی یہ غلطی ذرا بھی حیرت انگیز نہیں۔ جب دماغ ودل شعور واندازہ کی مشینوں کی حرکت ہی سرے سے
باطل ہو گئی تھی۔ تو کوئی بشر اندازہ کر ہی کیونکر سکتا تھا اور یوں بھی گھنٹوں اور دنوں بلکہ مہینوں اور برسوں کی مدت کو خواب اور بیہوشی کی حالت میں ہم روزمرہ گھنٹوں اور منٹوں کے اندر سمٹے اور سمائے ہوئے آخر دیکھتے ہی ہیں۔ **۱۰۱۱** (اتنی مدت کے باوجود) بعض
مفسرین نے اس جواب سے جوازِ اجتہاد پر استشہاد کیا ہے۔ فیه دلیل جواز الاجتھاد (مدارک) اور نظیر ہو اصل کہ اللّٰہ تعالیٰ جس چیز کو جتنی مدت تک بھی چاہے محفوظ وسالم رکھ سکتا ہے۔ بشری عقل وفہم مادی مثالوں اور نظیروں کی ہمیشہ حریص رہی ہے اور آج کی "روشن خیال"
اور تجربی سائنس کے سارے مطالبات کا لب لباب صرف یہی نظیر کی فراہمی ہے۔ **۱۰۱۲** (جس کی ہڈیاں اس وقت تک باقی تھیں اور گوشت پوست سب خاک میں مل چکا تھا) جانوروں کے ڈھانچے مدتوں تک باقی رہتے ہیں بعض بعض ڈھانچے سیکڑوں ہزاروں سال کے
سالم ومحفوظ برآمد ہوئے ہیں۔ حمار۔ گدھے سے ہندوستان میں تو نہیں لیکن عرب، شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں سواری کا کام گھوڑے ہی کی طرح لیا جاتا تھا۔ اور اب بھی لیا جاتا ہے۔ توریت اور انجیل دونوں میں گدھے کا ذکر سواری کے جانور کی حیثیت سے بکثرت آیا ہے اور حضرت
موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ دونوں کا اسی پر سوار ہونا بیان ہوا ہے۔ **۱۰۱۳** (اپنی قدرت کاملہ کا، اور یک نظیر وقوعِ بعث کی) **۱۰۱۴** یعنی اپنے مُردہ صد سالہ گدھے کے ڈھانچے کو بچشمِ خود دیکھے کہ ہم اس کا جوڑ جوڑ بٹھاتے ہیں اور پھر اس پر نو رُوح پھونک کر زندہ کر اٹھاتے
ہیں۔ **۱۰۱۵** یعنی ان پیمبر پر جب یہ ساری کیفیتیں تجربۃً اور مشاہدۃً گزر لیں تو وہ ترو تازہ جوشِ ایمانی کے ساتھ بے اختیار پکار اٹھے کہ بیشک یہ پروردگار ہر چیز پر قادر ہے اور اب میرا ایمان واعتقاد سوگنا اور بڑھ گیا۔ اَعْلَمُ۔ علم سے یہاں مراد
علمِ مشاہدہ ورویت ہے۔ ورنہ علم بالدلیل تو پہلے ہی سے حاصل تھا۔ تاویله انی قد علمت مشاھدة مما کنت اعلمه قبل ذالك الاستدلال (کبیر) **۱۰۱۶** (زندہ کرے) کیف یعنی کس خاص کیفیت کے ساتھ کس معین طریقہ پر فی ای حال یحیی

۱۰۱۶ (قیامت کے دن) كَيْفَ یعنی کس خاص کیفیت کے ساتھ کس متعین طریقہ پر فی ای حال (ا علی ای حال (ابو سعود) یہ وقوع تو اُسے پوری طرح مُسلّم ہے اور سوال اس کی صرف کیفیت کے بارہ میں کر رہا ہے۔ الاستفہام بکیف انما هو سوال عن حال شی متقرر الوجود عند السائل والمسئول فان الاستفہام ههنا عن هيئة الاحياء المتقرر عند السائل (قرطبی) محققین نے کہا ہے کہ سوال کے الفاظ سے خود یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ سائل کو کوئی شبہ احیاء موتیٰ کے نفس وقوع میں نہیں۔ صوفیہ اہل لطائف نے اس قصہ ابراہیمی سے ذیل کے نکات پیدا کئے ہیں:۔ ۱۔ اللہ تعالیٰ سے کشفِ مقامات کا سوال موجب قبول ہے۔ ۲۔ مقبولین کو جو مشاہدات ہوتے ہیں ان سے مراتب عرفان و کمالات ایقان میں ترقی ہوتی ہے۔ ۳۔ اور پھر اس سے ان کے تقرب و اعزاز حضور میں اضافہ ہوتا ہے۔ ۱۰۱۷ سوال سے مقصود یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کامل کا اقرار خود ان کی زبان سے کہا لیا جائے۔ اور دنیا کو تعلیم بھی مل جائے کہ ایسے سوالات ہمیشہ بے اعتقادی یا فقدانِ ایمان ہی سے نہیں پیدا ہوتے۔ ۱۰۱۸ حضرت ابراہیمؑ عرض کرتے ہیں کہ ایمان کے درجہ تک تو یقین اب بھی حاصل ہے۔ ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مشاہدہ کے بعد اطمینان اور زیادہ حاصل ہو جائے۔ اس مرتبہ کو اصطلاح میں عین الیقین کہتے ہیں۔ ورنہ یقین مرتبہ تصدیق تک تو جسے اصطلاح میں علم الیقین کہتے ہیں ہر مومن کو حاصل ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ جیسے مومن اعظم کو کیوں نہ حاصل ہوتا۔ مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ایمان ہی بڑھتے بڑھتے اطمینان تک پہنچ جاتا ہے اور محققین کہتے ہیں کہ یہ ترقی کبھی مشاہدہ و معائنہ سے ہوتی ہے اور کبھی محض وجدان سے۔ اطمینان مقابل ہے سکون کے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ عدم سکون کی کیفیت ایمان و عرفان کے منافی نہیں اور طمانیت کا جو درجہ ولایت و صدیقیت کے مناسب ہے وہ حضرت ابراہیمؑ کو اب بھی حاصل تھا اور آپ کو طلب اُس طمانیت کی تھی جو درجہ نبوت کے مناسب مقام ہو۔ ۱۰۱۹ ان پرندوں کے نام بھی تفسیروں میں نقل ہوئے ہیں لیکن اول تو سند کچھ قوی نہیں اور پھر یہ تعیین ہی سرے سے بے ضرورت ہے۔ البتہ اہل لطائف واشارات نے ان چار پرندوں سے نکتے خوب پیدا کئے ہیں، چنانچہ بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ ان سے اشارہ انسان کے اُن چار قویٰ کی جانب ہے جو مشاہدۂ حق اور حیاتِ حقیقی سے مانع ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ چار قوتیں یہ متعین کی ہیں:۔ (۱) خود بینی و خود ستائی۔ (حُبِّ جاہ) (۲) افراطِ شہوتِ جنسی۔ (۳) حرص و طمع (حُبِّ مال) (۴) طولِ امل یا محبتِ دُنیا۔ ۱۰۲۰ (ان کو ذبح کر کے اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد) فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ۔ یعنی ان پرندوں کو پال کر اور اپنے پاس رکھ کر انہیں اپنے سے خوب مانوس کر لیجئے کہ پھر شناخت میں دقت نہ ہو۔ صُرْهُنَّ کا مصدر صور ہے یعنی میل کے ہیں۔ اسی لئے صرهن کی تفسیر عموماً املهن اور وجهن سے کی گئی ہے۔ ای اضممهن اليك ووجههن نحوك (ابن جریر) فاملهن واضممهن اليك (کشاف) اور بعض نحویوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اجزاء آیت میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی اليك کا تعلق صرهن سے نہیں فخذ اربعة من الطير سے ہے۔ اور اليك صلہ فعل خذ کا ہے۔ کان فی الکلام تقدیم و تاخیر و یکون معناه فخذ اربعة من الطير اليك فصرهن فیکون اليك من صلة خذ (ابن جریر) فصرهن کے آگے اتنی عبارت محذوف مانی گئی ہے کہ اپنے سے ہلا چکنے کے بعد ان پرندوں کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑے پہاڑوں پر رکھ دیجئے۔ قرآن مجید کے اسلوبِ بلاغت میں اس قسم کے محذوفات و مقدرات کی مثالیں نایاب نہیں۔ اسی سورۂ بقرہ کے شروع کے رکوعوں میں ہے فقلنا اضرب بعصاك الحجر (ہم نے حکم دیا کہ اپنا عصا چٹان پر مارو) اور اس کے مابعد آتا ہے۔ فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا (پس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے) یہاں سب نے اتنا کلام محذوف مانا ہے کہ موسیٰؑ نے حکم کی تعمیل کی اور عصا کی ضرب چٹان پر لگائی ایسے محذوفات و مقدرات کی نظیریں تو اپنے شاعروں کے کلام میں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ پھر خدا کا کلام تو ظاہر ہے کہ ہر شاعر کے کلام سے فصیح تر و بلیغ تر ہے۔ بعض اہل لغت و تفسیر ادھر گئے ہیں کہ فعل صار یصور اور صار یصیر کے معنی ہی قطع کرنے کے ہیں۔ اس لئے کسی حذف و تقدیر کے ماننے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ آیت کے معنی ہی براہِ راست یہی ہیں۔ صار الشئ یصوره صورا قطعه و فصله صورة صورة (تاج) قیل قطعهن صورة صورة (راغب) قال ابو عبيدة معناه قطعهن والصور القطع (معالم) علامہ ابن جریر نے جو تفسیر کے ساتھ لغت کے بھی امام ہیں بسط و تفصیل کے ساتھ گفتگو اس پر کیا ہے کہ صار یصور اور صار یصیر دونوں کے معنی لغت عرب میں قطع کے مشہور و معروف ہیں۔ اور آخر میں لکھتے ہیں:۔ ففی ذالك اوضح الدليل على جهل من زعم ان قول القائل صار یصور وصار یصیر غير معروف فی كلام العرب بمعنى قطع بہر حال حذف مانا جائے تو اور نہ مانا جائے تو، دونوں صورتوں میں اتنے پر بجز ایک ابو مسلم اصفہانی کے سب کا اتفاق ہے کہ مُراد یہاں ذبح کر کے پارہ پارہ کرنے ہی سے ہے۔ اجمع اهل التفسير على ان المراد بالآية قطعهن (کبیر) كل المفسرين الذين كانوا قبل ابی مسلم اجمعوا على انه حصل ذبح تلك الطيور وتقطيع اجزائها فيكون انكار ذالك انكارا للاجماع (کبیر) فان كان بمعنى التقطيع فلا حذف او بمعنى الامالة فالحذف او قطعهن اجزاء (نہر) واجمع اهل التفسير على ان ابراهيم قطع اجزاءها (بحر) ابن عباسؓ صحابی اور حسن بصری سعید بن جبیر وغیرہ بکثرت تابعین سب اسی طرف گئے ہیں۔ معناه قطعهن وهو قول ابن عباس وسعيد بن جبير ومجاهد (کبیر) قاله ابن عباس ومجاهد والضحاك وابن اسحاق (بحر) قال ابن عباس وعكرمة وسعيد بن جبير وابو مالك وابو الاسود الدؤلي ووهب بن منبه والحسن والسدي وغيرهم (ابن کثیر) اور ابو مسلم کا یہ قول آج چودھویں صدی ہجری میں بعض طحیتوں کی زبان سے پھر چکا یا گیا ہے اسکی بابت صاحب روح المعانی کہتے ہیں۔ لا يخفى ان هذا اخلاف اجماع المسلمين وضرب من الهذيان لا يركن اليه ارباب الدين۔ صُرْهُنَّ۔ کی دوسری قرأت متواترہ صِرهن (بکسر صاد) کی ہے اور اس قرأت پر تو کھلے ہوئے معنی قطع و تشقیق ہی کے ہوتے ہیں۔ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ یعنی جو پہاڑیاں آپ کے آس پاس ہیں اُن پر یہ مراد نہیں کہ رُوئے زمین پر جتنی بھی پہاڑیاں ہوں سب کو تلاش کر کے سب پر رکھئے۔ المعنى على كل جبل من الجبال التى بحضرتك (کشاف) العموم فی كل جبل مخصص بوصف محذوف ای يليك او بحضرتك قاله مجاهد (بحر) مِّنْهُنَّ جُزْءًا یعنی ان کے ملے جلے ہوئے گوشت کا ایک ایک حصہ۔ جُزْءً کے اصل معنی عربی میں ٹکڑے کے ہیں جس کا فارسی مرادف پارہ ہے۔ الجزء النصيب والقطعة من الشئ (تاج) جزء الشئ ما يتقوم به جملته كاجزاء السفينة واجزاء البيت (راغب) جزء بالفتح پارہ پارہ کردن (صراح) وهن اجزاءٌ متفرقات (ابن جریر) ای ربعًا من كل طائر (ابن قتیبہ) بلکہ امام ابن جریر جن کی نگاہ لغوی اور ادبی نکتوں پر خوب رہتی ہے انہوں نے تو یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ جزء اور سهم کے استعمال میں بھی فرق ہے کہ سہم کا اطلاق مُسلّم حصہ پر ہوتا ہے اور جزء کا لفظ عام ہے۔ الجزء من كل شئ هو البعض منه كان معناه جميعه على حصة او غير منقسم فهو بذالك من معناه مخالف ففی السهم لان السهم من الشئ هو البعض المنقسوم عليه جميعه على حصة۔ اور ایسا ہی دوسروں نے بھی کہا ہے وظاهر ثم اجعل على كل جبل منهن جزءً بدل على ان تلك الطيور جعلت جزءً جزءً (بحر) ای قطعة وبعضا (رح) منهن سے پہلے تو مراد چاروں پرندوں کا مجموعہ لینا اور پھر جزءً سے مراد اس مجموعہ کا ایک ایک جزء یا ایک ایک مُسلّم پرندہ لینا خواہ مخواہ کا تکلف اور ایک

لِلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

لوگوں کیلئے بنا ئیں ۱۰۱۴ اور ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم انہیں کس طرح ترتیب دیتے ہیں اور پھر

نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ

ان پر گوشت چڑھاتے ہیں ۱۰۱۵ پھر جب اُن پر یہ سب ارد وشن ہو گیا تو اُس نے کہا میں یقین رکھتا ہوں کہ

عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ

بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۰۱۶ اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب ابراہیمؑ نے عرض کی

كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ

کہ اے میرے پروردگار مجھ کو دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائیگا ۱۰۱۷ ارشاد ہوا کیا آپ کو یقین نہیں ۱۰۱۸ عرض کی

لٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ

ضرور ہے لیکن (یہ درخواست) اس لئے ہے کہ قلب کو (اور) اطمینان ہو جائے، ارشاد ہوا کہ اچھا چار پرندے

فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ

لیجئے ۱۰۱۹ پھر انہیں اپنے سے ہلا لیجئے پھر ان میں کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ

جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ

دیجئے ۱۰۲۰ پھر ان کو اپنی طرف بلائیے (تو) وہ دوڑتے ہوئے آپکے پاس چلے آئینگے ۱۰۲۱ اور یقین رکھئے

عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ

کہ اللہ زبردست ہے، بڑا حکمت والا ہے ۱۰۲۲ جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں، ان کے

سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ

مال کی مثال ایسی ہے ۱۰۲۳ جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اُس سے سات بالیاں اُگیں ہر ہر

ع ۲۵ ۳

غلط فہم کا لغوی اجتہاد ہے جو صحابیوں اور تابعین کے بعد سے لے کر اس وقت تک جتنے بھی اہلِ تفسیر عربی کا ذوقِ سلیم رکھنے والے ہوئے ہیں سب نے مراد ہر پرند کے ٹکڑے ٹکڑے سے لی ہے۔ جزءًا من اجزائہ وجعل علی کل جبل منھن جزءًا (ابن کثیر) جزئھن وفرق اجزائھن علی الجبال (کشاف) ف ۱۰۲۱ (صحیح و سالم اس طرح کہ زندہ ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متفرق و منتشر اجزاء آپس میں مل ملا کر ٹھیک ہو جائیں گے) اُدْعُهُنَّ - یعنی آواز دے کر انہیں اپنی طرف پکاریئے۔ ف ۱۰۲۲ عَزِيْزٌ - یعنی ایسا زبردست جو ہر شے پر یکساں قادر ہے - محال و ممکن، اشد و سہل کی تفریقیں اور تقسیمیں تو انسان کی قائم کی ہوئی ہیں - قادرِ مطلق کے ہاں کسی چیز کے اشد یا محال ہونے کے کوئی معنی ہی سرے سے نہیں۔ حَكِيْمٌ - یعنی باوجود عمومِ قدرت و اختیارِ مطلق کے وہ کرتا صرف وہی ہے جو عین اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایسے عزیز و حکیم کے لئے احیاءِ موتیٰ میں دشواری ہی کیا ہے۔ جب بھی وہ اپنی حکمت کے لحاظ سے مناسب سمجھے گا حشر برپا کر دے گا۔ ف ۱۰۲۳ (اللہ کی نظر میں اور اپنی برکت و افزائشِ اجر کے لحاظ سے) فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ - یعنی احکامِ شریعت کے مطابق نیک کاموں میں۔ اَمْوَالَهُمْ - اور فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ دونوں عام ہیں - تمام مصارفِ خیر ان میں آجاتے ہیں۔ ف ۱۰۲۴ (تو جس طرح غلہ کے ایک دانہ سے سات سو دانے پیدا ہو گئے - اسی طرح اللہ کارِ خیر میں صرف کرنے والوں

كُلِّ سُنۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ

بالی کے اندر سو دانے ہوں اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ

اللہ بڑا وسعت والا ہے۔ بڑا علم والا ہے جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے

سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ

ہیں اور جو کچھ خرچ کر چکے ہیں اس کے عقب میں احسان و اذیت سے کام نہیں لیتے

لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

ان کیلئے اس کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف واقع ہوگا اور

يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ

نہ وہ غمگین ہوں گے مناسب بات اور درگزر ایسی خیرات سے بہتر ہے جس کے

يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

عقب میں اذیت ہو اللہ بڑا غنی ہے، بڑا بردبار ہے اے ایمان والو اپنے

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ

صدقوں کو احسان (رکھ کر) اور اذیت (پہنچا کر) باطل نہ کر دو جس طرح وہ شخص جو اپنا

مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ

مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھانے کو، اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا سو اس کی مثال

كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ

تو ایسی ہے کہ جیسے ایک چکنا پتھر ہے جس پر کچھ مٹی ہے پھر اس پر زور کی بارش ہو سو وہ اس کو

کو ان کے حسنِ عمل کا اجر سات سو گنا دیتا ہے) ایک عام فہم مادی مثال دے کر یہ سمجھا دیا گیا کہ تکثیرِ اجر پر اتنی حیرت کیوں کی جائے ایسی مثالیں تو مادیات میں روزمرہ مل جاتی ہیں - تجارتی اور کاروباری تلمیحیں تو قرآن مجید میں بکثرت ملتی ہیں - زرعی اور کاشتکارانہ تلمیحیں بھی مفقود نہیں ف ۱۰۲۵ یعنی اس کے اجر میں جس حد تک بھی چاہے اور بہ قدر اس کے اخلاص و شفقت کے۔ یہ جو نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی کھیتی سے لطیف تشبیہ دی گئی ہے - اس سے اہلِ لطائف نے دو نکتے اور پیدا کئے ہیں :- ۱- ایک یہ کہ اپنے مصارفِ خیر کی حفاظت و نگہداشت بھی اہلِ زراعت ہی کی طرح کرتے رہنا چاہیئے - ریا، نمائش، عجب، تکبر، ایذا اور احسان رکھنے سے انہیں برباد نہ کر دینا چاہیئے۔ ۲- جس طرح تخم ریزی، آبپاشی وغیرہ کے اختلاف سے پیداوار، محنت اور قیمت اور نفع میں مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح اجر گو مقدار میں برابر ہو، تاہم حسنِ قبول و قربِ رضا وغیرہ کی کیفیات میں نیت و اخلاص کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہے گی۔ ف ۱۰۲۶ وَاسِعٌ - اس کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں اس لئے مشرک قومیں یہ نہ سمجھیں کہ عطا و بخشش سے اس کے خزانہ میں کوئی کمی آسکتی ہے۔ عَلِيْمٌ - اس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ نہیں چھپ سکتا۔ اس لئے مشرک قومیں یہ نہ سمجھیں کہ کوئی بھی مخلص و مستحق نظرانداز ہونے پائے گا۔ ف ۱۰۲۷ یعنی جس کے ساتھ کچھ سلوک کیا ہے اس پر نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ اسے اپنے برتاؤ سے تکلیف پہنچاتے ہیں - حقارت سے پیش آنا بھی تکلیف دہ برتاؤ میں داخل ہے۔ کسی کی کچھ خدمت اپنے سے بن پڑ جائے یہ تو خود اپنے لئے باعثِ اجر و موجبِ سعادت ہے نہ یہ کہ الٹا اس پر فخر کیا جائے۔ اور جس کے ساتھ سلوک کیا گیا ہے اسے کسی درجہ میں بھی ذلیل ٹھیرایا جائے۔ ف ۱۰۲۸ (قیامت کے دن) اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ - یعنی ان لوگوں کو پورا پورا اجر ملے گا ان کے درجۂ اخلاص کے تناسب سے۔ ف ۱۰۲۹ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ - یعنی معذرت کی نرم بات کہہ دینا۔ مَغْفِرَةٌ یعنی سائل یا حاجت مند کی بات کو اس وقت ٹال جانا جب وہ سختی یا بدتہذیبی سے پیش آنے لگے۔ آیت میں صاف یہ تعلیم ہے کہ صدقہ یا خیرات مقصود بالذات نہیں، مقصود اصلاحِ قلب ہے اور اس کے بعد دینے والا لینے والے پر کوئی احسان نہیں رکھتا - بلکہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہے بلکہ الٹا لینے والے کا شکرگزار ہوتا ہے کہ اس نے قبول کر کے اس کو ایک بار سے ہلکا کر دیا۔ اَذًى - کا لفظ عام ہے - ہر قسم کے آزار کو شامل - زبان سے یا عمل سے احسان جتانا بھی اس میں آگیا۔ خَيْرٌ - ناداری کے وقت نرمی سے جواب دے دینا - اور سائل کی سختی کو پی جانا موجبِ قرب و اجر ہیں اس لئے انہیں خیر سے تعبیر فرمایا۔ ف ۱۰۳۰ غَنِيٌّ - وہ تمہارا مال تمہارے ہی فائدہ کے لئے خرچ کراتا ہے اور جو کوئی کچھ خرچ کرتا ہے وہ اپنے ہی دائمی نفع کے لئے کرتا ہے کوئی مشرک یا مشرک صفت احمق یہ نہ سمجھ لے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ دیا جاتا ہے وہ خود خدا کو دیا جاتا ہے اور خدا اپنے رزق کا محتاج ہے۔ حَلِيْمٌ - اسلئے مجرموں اور نافرمانوں کو جو سزا فی الفور نہیں دیتا، سائل کی بدتہذیبی یا غنی کی بدمعاملگی سب کو ایک مدت تک معاف کرتا رہتا ہے۔ ف ۱۰۳۱ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ - یعنی ان ممنوع طریقوں سے اضافۂ اجر و ازدیادِ ثواب کو مٹا نہ دو۔ فقہاء نے یہیں سے لکھا ہے کہ جس طرح صدقہ کا ابطال یہاں حرام و ممنوع قرار دیا گیا ہے اسی طرح کوئی سا بھی نیک عمل ہو اسے باطل کرنا حرام و ممنوع ہے، چنانچہ نفل نماز کی نیت باندھ کر اسے توڑ ڈالنے کی حرمت و ممانعت اسی قاعدہ کے ماتحت ہے۔ ف ۱۰۳۲ (اور یہ شخص صدقہ کے نفس اجر و ثواب ہی کو ضائع کر کے رہتا ہے) دو صورتیں الگ الگ بیان ہوئی ہیں - دونوں کا فرق ملحوظ رہے۔ پہلی صورت میں خطاب اہلِ ایمان سے ہے۔ نفس صدقہ تو ان لوگوں کا قبول ہو جائے گا لیکن احسان جتانے یا اذیت پہنچانے سے ترقیِ درجات و اضافۂ اجر سب سلب ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں ذکر اہلِ کفر کا ہے۔ یہ جب خدا اور آخرت پر ایمان ہی سے محروم ہیں تو ان کے صدقہ و خیرات سے بظاہر جو کچھ بھی مقصود ہو سب کا حاصل دنیا ہی ہوگا۔ ایسوں کو اجر کس چیز کا؟ رضائے الٰہی کی طلب تو کسی درجہ میں بھی ان کے عمل کا جزء نہیں۔ رِئَآءَ النَّاسِ - انجیل میں بھی اس سے ملتی جلتی ہدایت موجود ہے (متی ۶: ۲) محققین نے لکھا ہے کہ ریا کی مذمت میں یہ آیت نص صریح ہے۔ ف ۱۰۳۳ (اور وہ ویسا ہی کورا رہ جائے جیسا پہلے تھا) تشبیہ کا ماحصل یہ ہے کہ کافر اسی طرح اپنے کو قیامت کے دن ہر خیر و خیرات کے اجر سے محروم پائے گا۔ اس کا انفاقِ مال حقیقۃً کسی صدقہ و خیرات کے حکم میں آتا ہی نہیں۔ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ - تشبیہ محرومیِ اجر کے لحاظ سے دی گئی ہے۔ ف ۱۰۳۴ ذکر انہی لوگوں کا ہے جو نعمتِ ایمان سے محروم ہیں۔ مِمَّا كَسَبُوْا - یعنی جسے وہ اپنے خیال و پندار میں اپنی کمائی سمجھ رہے ہیں۔ ورنہ بندہ کی کمائی تو حقیقۃً وہی ہے جس پر عملِ صالح کا اطلاق ہو سکے اور عملِ صالح کی پہلی اور بنیادی شرط ایمان ہے۔

۱۰۳۵ (قیامت کے دن ثواب کے گھر یعنی جنت کا) یعنی ایسی ہو سکتے ہیں کہ جو کفر اختیار کئے ہوئے ہیں اور اپنی قوتِ فیصلہ سے صحیح کام نہیں لے رہے ہیں انہیں زبردستی راہِ ہدایت دکھا دینے کا قانونِ الٰہی ہی نہیں۔ ۱۰۳۶ (جیسا کہ مومن مخلص کا شیوہ ہوتا ہے) تَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ ۔ اتنے ٹکڑے میں نفسیاتِ بشری کی ایک گہری حقیقت بیان ہوئی۔ معصیت کی طرح ہر طاعت کا بھی خاصہ ہے کہ وہ متجانس اعمال کو کھینچتی ہے۔ چنانچہ ہر عمل صالح کے بعد نفس میں دوسرے اعمالِ صالح کے لئے آمادگی و پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ نفسِ بشری کا خاصہ ہے کہ عمل کے تکرار و عادت کے بعد اس عمل سے متعلق ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے مزاحمت کی قوت مغلوب و ضعیف ہوتی جاتی ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں دلیل ہے کہ عمل صالح سے جس طرح حصولِ اجر مقصود ہوتا ہے اسی طرح اصلاحِ نفس بھی مقصود ہوتی ہے۔ یعنی تو ظاہر ہی ہیں کہ وہ خرچ اس لئے کرتے ہیں کہ کمالِ ایمان اور ثابت قدمی اور اطمینان حاصل ہو۔ ایک دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ان کے دل اللہ کے کرم اور ثواب پر مطمئن ہیں، وہ صَرفِ مال کو نہ نقصان سمجھتے ہیں نہ باعثِ گرانی۔ ۱۰۳۷ (کہ ہوا کی لطافت و زمین کی صلاحیت اور بارش کی کثرت مل ملا کر قوتِ بار آوری کو خوب بڑھا دیں گی) بِرَبْوَةٍ ۔ ٹیکرے کی ہوا قدرۃً لطیف و بار آور ہوتی ہے۔ ۱۰۳۸ تمثیل کی زبان میں بیان اس حقیقت کا ہو رہا ہے کہ اخلاص اگر درجۂ اعلیٰ میں نہ ہو جب بھی محض ایمان، اور عدمِ موانع (یعنی احسان نہ رکھنا اور ایذا نہ پہنچانا) بجائے خود صدقات و خیرات کو مقبول بنا دینے کے لئے کافی ہیں ۱۰۳۹ (اور اسی لئے ہر ایک کے درجۂ اخلاص کا بھی خوب جاننے والا ہے) خطاب یہاں عام نسلِ انسانی سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کافر، مومن، مخلص، غیر مخلص سب کے حرکاتِ عمل اور سب کے درجۂ اخلاص و عدمِ اخلاص سے خوب واقف ہے۔ ۱۰۴۰ (لاؤ اپنے انجام کو سوچ کر اس کے مطابق عمل کرتے رہو) مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ ۔ تصریح کے ساتھ نام انہی میووں کا لیا گیا جو اہلِ عرب کے لئے خاص اہمیت اور خصوصی معنویت رکھتے تھے۔ ملاحظہ ہوں حواشی تفسیر انگریزی۔ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۔ یہ ریہ ظاہر کرنے کو ہے کہ وہ باغ خوب سرسبز و شاداب بھی تھا۔ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۔ یہ مالکِ باغ کی مرفہ الحالی اور شانِ غنا ظاہر کرنے کو ہے۔ أَصَابَهُ الْكِبَرُ ۔ یعنی وہ مالکِ باغ اب محنت و مشقت کے قابل نہ رہے۔ تمثیل کے پیرایہ میں بیان اس کا ہے کہ قیامت کا دن آ جائے اور اس شخص کی عمل سے معذوری اس پر عیاں ہو جائے۔ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ ۔ یعنی اولاد بھی اس قابل نہ ہو کہ تحصیلِ معاش میں اس کے کچھ کام آ سکے، گویا اس کی معذوری ہر طرح روشن و آشکارا ہو جائے۔ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ ۔ کہ وہی باغ وجہ معاش تھا۔ تمثیل کے پیرایہ میں بیان اس کا ہے کہ اس شخص کا بھروسہ ظاہری طاعات و اعمالِ صالحہ پر تھا۔ فَاحْتَرَقَتْ ۔ یعنی اس شخص کی ساری امیدیں غارت ہو کر رہ جائیں۔ تمثیل کی زبان میں مراد یہ ہے کہ ایک شخص اپنے خیال میں نیک کام کر رہا ہے اور اپنے نزدیک ساری توقعات اس سے لگائے بیٹھا ہے مگر عین احتیاج کے وقت یعنی قیامت کے دن اسے نظر آئے کہ وہ عمل تو شرائطِ قبول و مقبولیت ملحوظ نہ رکھنے کے باعث خود ہی نابود ہو چکا ہے۔ اس لئے اجر و ثواب کیسا اب تو حرمانِ محض اس کے نصیب میں آیا۔ الْآيَاتِ ۔ یہاں مثالوں اور نظیروں کے معنی میں ہے۔ لَعَلَّكُمْ ۔ یعنی تمہارے نفع کے لئے۔ تمہیں سمجھانے کو۔ ذرا صورتِ حال کی حسرتناکی کا تصور کیجئے۔ ایک شخص کی عمر بھر کی کمائی ایک باغ ہے، سرسبز و شاداب، خوب پھلا پھولا ہوا، ہر طرح کے میووں، پھلوں سے لدا ہوا باغ کا مالک بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اور اب کسی نئی محنت کے قابل نہیں، بچے موجود ہیں مگر کمزور، کمسن، جو بجائے اس کے کہ کسبِ معیشت میں باپ کا ہاتھ بٹائیں، اُلٹے اس کے لئے بار ثابت ہو رہے ہیں۔ عین اُس وقت شدید ترین حاجت مندی کے وقت یک بیک معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں آگ لگی اور سب کچھ جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ باغ کے مالک کے غم و حسرت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ اس سے کہیں بڑھ کر ہزار گنا اور لاکھ گنا بڑھ کر حالت اس بدنصیب انسان کی ہوگی جس کی آنکھیں زندگی بھر غفلت سے بند رہیں اور پل بار وقت کھلیں گی جب عمل کی مہلت بالکل ختم ہو چکے گی۔ اور اب وہ دیکھے گا کہ کوئی چیز بھی اس کے دفترِ عمل میں ایسی نہیں جو اس کے کام آ سکے۔ کچھ ٹھکانا، کوئی اندازہ اس کی حسرت و حرمان نصیبی کا ہو سکتا ہے؟

صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ
بالکل صاف کر دے ۱۰۳۴ (ایسے لوگ) کچھ بھی نہ حاصل کر سکیں گے اپنی کمائی سے ۱۰۳۵ اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٢٦٤﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ
کافر لوگوں کو راہِ ہدایت نہ دکھائے گا ۱۰۳۶ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال رضائے الٰہی

أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ
کی طلب میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور اپنے نفس میں پختگی پیدا کرنے کی غرض

أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ
سے ۱۰۳۶ ایک باغ کی طرح ہے جو کسی ٹیکرے پر ہو اور اس پر زور کا مینہ پڑا ہو پھر وہ

أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ
دوگنے پھل لایا ہو ۱۰۳۷ اور اگر زور کا مینہ نہ بھی پڑے تو ہلکی پھوار ہی کافی ہے ۱۰۳۸

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾ أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن
اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو خوب دیکھنے والا ہے ۱۰۳۹ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے

تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِن
کہ اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو جس کے نیچے نہریں بہ رہی

تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ
رہی ہوں (اور اس کے لئے اس باغ میں (اور بھی) ہر قسم کے میوے ہوں اور اس کا

الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ
بڑھاپا آ چکا ہو اور اس کے عیال کمزور ہوں، اس (باغ) پر ایک بگولا آئے کہ اس میں

۱۰۴۱ (اللہ کی راہ میں، نیک کاموں میں) مَا كَسَبْتُمْ جو کچھ تم نے کمایا ہے جائز پاک طریقے سے۔ طیبات کا اطلاق صرف پاک ہی کمائی پر ہو سکتا ہے۔ فقہاء نے بہ قاعدہ اشارۃ النص مَا كَسَبْتُمْ ہی سے نکالا ہے کہ زکوٰۃ اُس مال میں ہے جو اپنا کمایا ہوا ہو، اور جو اضطراراً حاصل ہو جائے، اس میں زکوٰۃ نہیں ۱۰۴۲ یعنی نباتات، معدنیات وغیرہ۔ لَكُمْ یعنی تمہارے کام کے لئے مِّنَ الْأَرْضِ۔ اس کے تحت میں زراعت، باغبانی، کانکنی وغیرہ کی ساری شاخیں آگئیں جس طرح مَا كَسَبْتُمْ کے تحت میں تجارت اور کاروبار کے اقسام آگئے تھے۔ فقہاء نے مِّنَ الْأَرْضِ سے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ زکوٰۃ زمینی پیداوار (زراعت، معدنیات وغیرہ) پر واجب ہوئی، برخلاف موتی، مونگے وغیرہ کے کہ وہ زمین سے نہیں سمندر سے نکلتے ہیں ۱۰۴۳ مطلب یہ ہوا کہ ایسی ناکارہ، ناقص، ردی چیزیں کہ اگر خود تمہیں ملنے لگیں تو تمہیں لینا گوارا نہ ہو، بجز اس صورت کے کہ تم ارادۃً ان کی طرف سے چشم پوشی کر لو۔ تو اللہ کی راہ میں تو ایسی چیزوں کے صرف کرنے کا تو تمہیں خیال بھی نہ کرنا چاہئے۔ الْخَبِيثَ ردی، ناکارہ چیز۔ تُنفِقُونَ مراد وہی اللہ کی راہ میں نیک کام میں خرچ کرنا ہے۔ تَنَّسْتُمْ بِآخِذِيهِ یعنی جب وہ تمہیں قیمتاً یا ہدیۃً مل رہی ہو ۱۰۴۴ غَنِيٌّ وہ تمہارے صدقات کا محتاج نہیں۔ جو چیز تمہارے معیار سے بھی ناکارہ ہو۔ اُس کی نذر اس کے دربار میں پیش کرنا چاہو اُس کے ہاں اجر میں کوئی بخل نہیں۔ اُس سے معاملہ کرنیوالا کبھی نادم و خاسر نہیں ہو سکتا۔ حَمِيدٌ وہ خود ہر طرح ستودہ صفات و جامع کمالات ہے۔ تمہاری داد و دہش سے اس کی محمودیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ خود تمہارے لئے شرم کی بات ہے کہ ناقص اور ناکارہ چیزوں کی نذر ایسے جامع کمالات کے حضور میں! ضمناً یہ پہلو بھی آگیا کہ جب وہ ستودہ صفات ہے تو اُس کے ہاں مقبولیت بھی انہی بندوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو خود بھی کوئی مناسبت اس کی صفاتِ حسنہ سے رکھتے ہوں۔ مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو نذر اور چڑھاوے کا محتاج مانا ہے۔ صفت غَنِيٌّ نے اس عقیدہ کی تردید ہو گئی اور دیوتاؤں میں کسی نہ کسی حیثیت سے نقص تو سب ہی مشرک قوموں کے ہاں مسلّم ہے صفت حَمِيدٌ نے ان خرافات کی بھی تردید کر دی۔

نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ

آگ ہو تو وہ (باغ) جل جائے، اللہ اسی طرح تمہارے لئے کھول کر نشانیاں بیان کرتا ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا

تاکہ تم فکر سے کام لو ۱۰۴۰ اے ایمان والو، جو تم نے کمایا ہے اس

ع ٣٦ ٤

مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ

میں سے عمدہ چیزیں خرچ کرو ۱۰۴۱ اور اس میں سے (بھی) جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے

الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَ

نکال دی ہے ۱۰۴۲ اور خراب چیز کا قصد بھی نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو گے حالانکہ تم خود

لَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا

بھی اسکے لینے والے نہیں ہو بجز اس صورت کے کہ چشم پوشی ہی کر جاؤ ۱۰۴۳ اور جانے رہو

أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ

کہ اللہ بے نیاز ہے، ستودہ صفات ہے ۱۰۴۴ شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے اور

يَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ ۖ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ

حکم دیتا ہے تمہیں بخل کا ۱۰۴۵ اور اللہ تم سے اپنی طرف سے مغفرت کا اور فضل کا وعدہ کرتا ہے ۱۰۴۶

وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن

اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے ۱۰۴۷ وہ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت

يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا

عطا ہو گئی اُسے یقیناً خیر کثیر عطا ہو گئی ۱۰۴۸ اور نصیحت تو بس صاحبانِ فہم

۱۰۴۵ (کہ راہِ خدا میں خرچ کر ڈالو گے تو خود مفلس رہ جاؤ گے) روزمرہ کا تجربہ ہے کہ جو چیز نیکی اور بھلائی کے کاموں میں صرف کرنے سے روکتی ہو وہ یہی خیال ہوتا ہے کہ سب کچھ خرچ کر ڈالنے کے بعد پھر اپنی ضرورتوں کے لئے کیا رہ جائے گا؟ قرآن مجید نے الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ کے بلیغ الفاظ سے یہ تعلیم دے دی کہ یہ خیال تمامتر ایک وسوسۂ شیطانی ہے۔ اور یُوں اس خیال کے باطل ہونے کا بہترین پیرایہ اختیار کر لیا الْفَحْشَاءِ عربی میں فحش و فحشاء کا اطلاق ہر شدید برائی ہر بُری صفت پر ہوتا ہے۔ هو كل ما يشتد قبحه من الذنوب والمعاصي (تاج) وقيل كل خصلة قبيحة فهي فاحشة من الاقوال والافعال (تاج) لیکن بخل پر فاحش کا اطلاق علی الخصوص ہوتا ہے۔ الفاحش البخيل (تاج) ومع قيل الفاحش هو البخيل جدًا (تاج) والعرب تسمي البخيل فاحشًا والبخل فحشًا وفحشاء (جصاص) اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہاں الْفَحْشَاءِ سے مراد ادائے زکوٰۃ و صدقات میں بخل ہے قال المفسرون انه يأمركم ان لا تتصدقوا (تاج) قيل الفحشاء ههنا البخل في اداء الزكوٰة۔ (تاج) يعني بأعظم القبح في البخل (راغب) يغريكم على البخل ومنع الصدقات وكذٰلك المراد بها في هذا الموضع البخل (جصاص) ۱۰۴۶ (خوش دلی کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر) مَّغْفِرَةً وَفَضْلًا وعدہ مغفرت کا تعلق آخرت سے ہے اور وعدہ فضل کا دنیا سے۔ ماحصل یہ ہے کہ خدائی احکام پر خدائی قانون کے مطابق چلوگے تو دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و بہبود یقینی ہے۔ شیطانی راہ بربادی و ہلاکت کی ہے۔ اور خدائی راہ فلاح و صلاح کی ۱۰۴۷ وَاسِعٌ ایسے وسعت والے کے ہاں انعام و اکرام کی کیا کمی۔ عَلِيمٌ ایسے علم کامل والے پر نیتوں کا حال رتی رتی روشن ہے۔ اس لئے ثمرہ بھی نیتوں کے مطابق ہی ملے گا ۱۰۴۸ (جس کے مقابل دنیا کی کوئی اور نعمت نہیں۔ الْحِكْمَةَ حکمت کی تشریحیں بہت سی کی گئی ہیں۔ لیکن بہترین اور جامع ترین تشریح یہ ہے کہ وہ امورِ دین میں فہم صحیح کا نام ہے۔ اور اس فہم صحیح میں کل سے بیزاری اور مصارف میں توازن بھی شامل ہے۔ مَن يَشَاءُ۔ یہ حکمت کی تقسیم و عطا مشیت تکوینی کے ماتحت و مطابق ہوتی رہتی ہے۔ مَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ یہ حکمت و دانائی ہرگز نہیں کہ جو کچھ بھی کمایا جائے سب بس اپنے نفس کی لذتوں اور خواہشوں پر اڑا دیا جائے۔ عین دانائی اور حکمت یہ ہے کہ اس آج سے کل کا ذخیرہ جمع کیا جائے۔ آج تخم ریزی ایسی کی جائے کہ کل پھل ہی پھل ہاتھ لگیں اور ایمان و طاعت کا ایسا بیمہ کرا دیا جائے جو آیندہ کی دائمی اور غیر منقطع زندگی میں برابر کام آتا رہے۔ خَيْرًا كَثِيرًا نکرہ اظہار عظمت کے لئے ہے یعنی بہت ہی بڑی نعمت ۱۰۴۹ أُولُو الْأَلْبَابِ یعنی عقل سلیم سے کام لینے والے۔ نصیحت سے مُراد راہِ حق پر چلنے کی اور رہنمایانِ دین کی اطاعت کی نصیحت ہے۔ اہل لطائف نے کہا ہے کہ آیت میں شیطانی وسوسہ کا علاج علم (حکمت) کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے۔ جس طرح اس سے قبل تثبيتًا من انفسهم میں عمل سے بتایا جا چکا ہے۔

۱۰۵۰ (دیوم جزا میں) وَمَآ اَنْفَقْتُمْ جو کچھ خرچ کرتے ہو۔ اچھے بُرے کسی مصرف میں۔ مِنْ نَّذْرٍ۔ نذر وہ چیز ہے جسے عوامی اُردو میں مَنّت ماننا کہتے ہیں۔ فقہ میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ کسی مُراد کے پُورے ہونے پر اپنے اُوپر کوئی ایسی چیز لازم کر لینا ہے جو واجب نہ تھی۔ النذر عقد، ترتب علیٰ شیء، والتزامه علیٰ وجه مخصوص (روح) النذر ما یلتزمه الانسان بایجابه علیٰ نفسه (کبیر) یہ نذر عبادت بدنی کی صُورت میں بھی ہو سکتی ہے مثلاً نماز یا روزہ اور عبادت مالی کی صُورت میں بھی۔ یَعْلَمُهٗ۔ یعنی اس کا علم رکھتا ہے کہ وہ کس نیت سے اور کس کی راہ میں مانی گئی ہے اور اس علم کامل کے مطابق جزا و سزا بھی ہوگی۔ کنایة عن مجازاته سبحانه علیه (روح) لیجازیکم علیه (بیضاوی) لِلظّٰلِمِیْنَ یعنی قانونِ الٰہی توڑنے والوں کا، اپنے حق میں ناانصافی کرنے والوں کا۔ ۱۰۵۱ نیکی کی طرح صدقات و خیرات کے بھی مخفی ادا کرنے کی حقیقت تو ظاہر رہی ہے، لیکن زندگی میں ایسے مواقع بھی برابر پیش آتے رہتے ہیں جہاں نیکی کا اعلان و اظہار بھی ضروری ہو جاتا ہے ایک شخص ہے کہ بھوک پیاس سے نڈھال یا بیماری میں مبتلا سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے ہم قریب سے گزر رہے ہیں اور بالکل ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اسے کھلا کر یا دوا دے کر کسنا چاہیئے کہ از سرِ نو زندہ اُٹھا کھڑا کریں لیکن اس اندیشے سے کہ کہیں ہماری اس خدمت کا شمار ریاء و نمائش میں نہ ہو جائے اس کے پاس سے کتراتے اور خاموش گزرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تقویٰ نہیں عین معصیت اور انتہائی وہم پرستی ہوئی۔ یہاں ضرورت فی الفور مدد رسانی کی تھی خواہ اس کے لئے اعلان بہ بانگ دہل ہی کرنا پڑے۔ نہ یہ کہ شبۂ ریاء و شائبۂ نمائش سے بچنے کے لئے تلاش پہلے گوشۂ تنہائی کی شروع ہو جائے۔ جن مذہبی طبقوں نے نیکی کے اہتمام پا خفاء میں تاکید حد سے زیادہ کی ہے اور خدمتِ خلق کو مخفی رکھنے کے ساتھ محدود و مقید کر دیا ہے، ان کی تعلیم یقیناً ناقص، ناتمام، یکطرفہ ہے اور انہوں نے زندگی میں شب و روز اس قسم کے پیش آنیوالے بکثرت واقعات کو نظر انداز ہی کر دیا ہے۔ مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عمل خیر کے اعلان و اخفاء میں اختیار ہو اور ساتھ ہی افضلیت اخفاء کی ہے، جب اعلان میں کوئی خاص مصلحت نہ ہو۔ اِنْ تُبْدُوْا ... وَاِنْ تُخْفُوْهَا یعنی حسبِ ضرورت و مصلحت دین اعلان و اخفاء جو بھی مناسب ہو۔ وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ یعنی فقیروں کے حوالے کرو اہتمامِ اخفاء کے ساتھ۔ هُوَ۔ یعنی وہی اہتمامِ اخفاء ۱۰۵۲ (ان نیکیوں کی برکت سے) قرآن مجید نے ازالۂ سیئات کی جہاں اور صورتیں رکھی ہیں وہاں ایک صُورت یہ بھی ہے کہ نیکیاں بدیوں کا کفارہ ہوتی رہتی ہیں اور حسنات سیئات کو محو کرتی رہتی ہیں۔ یہ چیز محض عقیدہ کی نہیں مشاہدہ و تجربہ کی بھی ہے کہ خلق کی نظر سے چھپا کر طاعت اور نیکیوں کی عادت اگر ڈال لی جائے تو ایک عرصہ کی مشق کے بعد نفس کی اصلاح خود بخود ایک بڑی حد تک ہو جاتی ہے اور جو کچھ خرابیاں پھر بھی باقی رہ جائیں ان سے درگزر کے لئے خدائے رحمٰن و رحیم کا لطف و کرم کافی ہے جو خوبیوں کو خرابیوں کا اور بھلائیوں کو برائیوں کا عوض بناتا رہتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مسیحیوں کے اس بُنیادی عقیدہ کو ایک بار پھر یاد کر لیا جائے کہ گنہگاروں کی نجات اور گناہوں کے دُھلنے کی کوئی صُورت بجز اس کے نہیں کہ "خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا" انسان کے قالب میں دُنیا میں آئے اور اپنی جان کو صلیب پہ دے کر سب کی طرف سے کفارہ ادا کرے ۱۰۵۳ (اور اس لئے وہ تمہیں اعمال و احوال کے مطابق دے گا) گناہوں سے باز رکھنے میں خدائے علیم و خبیر کے علم کل و نظر محیط کا استحضار اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور اس لئے قرآن مجید نے اسے ہر ایسے موقع پر بار بار دُہرایا ہے ۱۰۵۴ (اے پیغمبر!) هُدٰىهُمْ اُن کی یعنی کافروں کی ۱۰۵۵ (اپنی مشیت تکوینی کے ماتحت و مطابق) رسُول کا کام صرف تبلیغ ہے، یعنی ہدایت کا پیام دنیا تک پہنچا دینا، باقی کس کو قبولِ حق کی توفیق ہوتی ہے اور کس کو نہیں۔ اس کا تعلق تمام تر مشیتِ الٰہی سے ہے۔ شانِ نزول کی روایتوں میں آتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ بعض دفعہ کسی کافر مشرک صاحبِ حاجت کو خیرات دینے سے اس مصلحت سے رُک جاتے تھے کہ شاید یہ احتیاج ہی کی بنا پر اسلام قبول کر لیں۔ آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ اتنے بعید اہتمام کی ضرورت نہیں محض تبلیغ کافی ہے۔ فقہاء اُمّت نے کہا ہے کہ کافر کو خیرات دینا بالکل جائز ہے بشرطیکہ وہ حربی نہ ہو۔ المراد اباحة الصدقة علیهم وان لم یکونوا علیٰ دین الاسلام وقد روی ذٰلک عن جماعة من السلف (جصاص) حدیث میں جو آیا ہے کہ تیرا کھانا خاص متقی کھایا کریں۔ مُراد اُس سے طعام دعوت ہے اور آیت میں طعام حاجت۔ پس تعارض کا شبہ نہ کیا جائے (تھانویؒ) کافر حربی کو صدقہ وغیرہ جائز نہیں (تھانویؒ) کافر ذمی یعنی غیر حربی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں (تھانویؒ) اور دُوسرے صدقات واجب و نفل سب جائز ہیں (تھانویؒ) آیت میں ذکر زکوٰۃ کا نہیں عام صدقات کا ہے۔ مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ کسی کے زیادہ درپے نہ ہو اور تدبیر میں بھی بہت زیادہ انہماک نہ رکھے، کفار کو صدقہ نہ دینا تدبیر ہی کی ایک قسم تھی ۱۰۵۶ یعنی اپنے ہی اجر اُخروی کے لئے نہ کہ کسی اور کے لئے۔ فهو لانفسکم لا ینتفع به غیرکم (کشاف) مَا تُنْفِقُوْا یعنی اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہو

اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ

ہی قبول کرتے ہیں ۱۰۵۰ اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو یا جو نذر

مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

مانتے ہو یقیناً اللہ سب کچھ جانتا ہے اور ناانصافوں کا حامی کوئی بھی نہ ہوگا ۱۰۵۱

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا ھِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا

اگر تم صدقات کو ظاہر کر دو جب بھی اچھی بات ہے اور اگر انہیں چھپاؤ اور فقیروں کو

الْفُقَرَآءَ فَھُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

دو جب تو یہ تمہارے حق میں اور بہتر ہے ۱۰۵۲ اور اللہ تم سے تمہارے کچھ گناہ بھی دُور کر دے گا ۱۰۵۳ اور

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ ھُدٰىھُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۱۰۵۴ اُن کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ۱۰۵۵ بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ

ہدایت دیتا ہے ۱۰۵۶ اور تم جو کچھ بھی مال میں سے خرچ کرتے ہو سو اپنے لئے کرتے ہو ۱۰۵۷

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ

اور تم اللہ ہی کی رضا جوئی کے لئے خرچ کرتے ہو ۱۰۵۸ اور تم مال میں سے جو کچھ بھی

خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَاۗءِ

خرچ کرتے ہو سب (تم کو) پورا پورا لوٹا دیا جائیگا اور تم پر ذرا بھی زیادتی نہ کی جائیگی ۱۰۵۹ (اصل)

الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا

حق ان حاجتمندوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں ۱۰۶۰ ملک میں کہیں چل پھر نہیں

منزل ۱

مِنْ خَیْرٍ یعنی اپنے مال میں سے۔ خیر یہاں مال کے مرادف ہے۔ اے من مال (معالم) من مال (کشاف) خیر۔ اصلاً شر کے مقابل ہو اور اس کے مفہوم میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کو انسان اچھا سمجھتا ہے مثلاً عقل و اخلاق پر منفعت شے وغیرہ الخیر ما یرغب فیه الکل کالعقل مثلا والعدل والفضل والشیء النافع اور قرآن مجید میں مال کے لئے خیر کا لفظ متعدد مقامات پر مال کے حسن استعمال کے سلسلہ میں آیا ہے۔ مثلاً ان ترک خیرا۔ وانه لحب الخیر لشدید۔ ما انفقتم من خیر فللوالدین وغیرہا ۱۰۵۷ (سو یہ مقصد ہر حاجتمند کی حاجت برآری سے پورا ہو جاتا ہے، خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں) کان النبی صلعم لا یتصدق علی المشرکین فنزلت وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله فتصدق علیهم (ابن جریر) مطلب یہ ہوا کہ مقصود جب اپنے لئے نفع اُخروی یا حصُولِ اجر ہے تو وہ تو ہر حاجتمند کی امداد سے ہو سکتا ہے صدقہ کو مسلمانوں ہی پر محدود رکھنے کی قیدیں لگائی جائے۔ وَجْهِ اللّٰهِ کے عام طور پر معنی ذاتِ الٰہی کے کئے گئے ہیں۔ وربما عبر عن الذات بالوجه (راغب) لیکن دوسرے معنی رضاءِ الٰہی کے بھی ہو سکتے ہیں اور بعض محققین اس طرف بھی گئے ہیں۔ عبر بالوجه عن الرضا کما قال ابتغاء مرضات الله وذٰلک عادة العرب (بحر) محض للہ کے مقابلہ میں ابتغاء وجه الله کہنے میں ایک تو زور زیادہ پیدا ہو گیا۔ دوسرے یہ معنی بھی پیدا ہو گئے کہ کسی درجہ کی شرکت مقصود و مطلوب نہیں صرف اللہ ہی کی رضا مقصود ہے۔ گویا یہ ترکیب، تاکید اور حصر دونوں کی جامع ہے۔ ای ما تنفقون بسبب من الاسباب الا لهٰذا السبب (روح) ای ثوابه لا غیرہ من اغراض الدنیا (جلالین) آیت میں رد ہے ان جاہل صوفیہ کا جو ثواب اور اجر کے مقصد کو اخلاص کے منافی سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید نے تو بار بار صراحۃً نہیں صراحۃً ترغیب دی ہے اجر و ثواب کے تلاش کرنے کی ۱۰۵۸ (کہ اجر میں کچھ کسر رہ جائے اور ثواب کا کوئی حصہ کاٹ لیا جائے) مِنْ خَیْرٍ خیر کے مرادف مال ہونے پر حاشیہ ابھی اُوپر گزر چکا۔ یُوَفَّ اِلَیْکُمْ سب تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا۔ یعنی سارا اجر و ثواب آخرت میں ۱۰۵۹ یعنی صدقات کے اصل مستحق تو وہ حاجتمند ہیں جن کا ذکر اب آ رہا ہے۔ مبتدا بیان

محذوف ہے۔ اصل ترکیب یوں ہے۔ ھذہ الصدقات للفقراء (مدارک) اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ یعنی دین ہی کے کسی کام میں گھر گئے ہیں اور اب آزادی سے کسب معاش نہیں کرسکتے۔ ۱۰۵۹ مُراد وہاں مجاہدین ہیں ھم الذین احصرھم الجھاد فمنعھم من التعفف (مدارک) اِحۡصَارُ۔ میں بڑی گنجائش ہے یہ گھر جانا خواہ وقت کے لحاظ سے ہو یا جسم کے لحاظ سے سب اس کے تحت میں آجاتا ہے۔ علی ہٰذا فی سبیل اللہ میں بھی بڑی وسعت ہے دین کا کوئی سا کام، کوئی سی ضرورت ہو سب اس میں شامل ہوسکتی ہیں۔ گو اصل مراد جہاد ہے۔ مفسر تھانویؒ نے کہا ہے کہ آیت کے مصداق ہمارے ملک میں سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دین میں مشغول ہیں کہ علم دین میں جس مشغولی و انہماک کی ضرورت ہے اس کے ساتھ اگر فکر معاش کی مصروفیت کو جمع کرلیا جائے تو علم دین کی خدمت ناتمام رہ جائے گی ۱۰۶۰ (آزادی سے طلب معاش کے لئے) یعنی اُن کا وقت خدمت دین میں ایسا گھرا رہتا ہے کہ کسب معاش کے لئے انہیں مہلت نہیں ملتی ۱۰۶۱ یعنی اُن کی غیرت وخودداری گوارا نہیں کرتی کہ وہ لوگوں سے سوال کریں۔ ناواقفوں کو اس سے گمان یہ گزرتا ہے کہ یہ لوگ خوشحال ہیں، محتاج و مستحق امداد نہیں۔ (زندگی) اغنیاء۔ غنی اسے کہتے ہیں جو حاجت اصلی سے مال کے زائد رکھنے کو کہتے ہیں۔ الغنی ھو ما یفضل عن مقدار الحاجۃ (جصاص) مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ سالکین کو کوئی ایسی خاص وضع نہ بنانا چاہیے جس سے عام اہل دُنیا سے اُن کا امتیاز ظاہر ہوتا ہو ۱۰۶۲ (کہ یہ محتاج و مستحق امداد ہیں۔ اے مخاطب!) یعنی یہ لوگ زبان سے کچھ بھی نہ کہیں لیکن اُن کی طرز وہیئت خود سے دیکھنے کے بعد خود ان کے فقر و فاقہ کی غمازی کرے گی۔ بعض فقہاء نے یہیں سے قرائن سے استنباط نتائج کا جواز نکالا ہے ۱۰۶۳

فِی الۡاَرۡضِ ۫ یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ

سکتے ۱۰۶۰ ناواقف انہیں غنی خیال کرتا ہے اُن کی احتیاط سوال کے باعث ۱۰۶۱

تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ وَ مَا

تو انہیں ان کے بشرہ ہی سے پہچان لیگا، وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے ۱۰۶۲ اور تم

تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِیۡنَ

مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ اس کا خوب جاننے والا ہے ۱۰۶۳ جو لوگ اپنا

یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً

مال رات اور دن (اور) پوشیدہ اور آشکارا خرچ کرتے رہتے ہیں سو

رکوع ۳۷ / ۵

فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ

ان لوگوں کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس اجر ہے نہ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور

لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا

نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۰۶۵ جو لوگ سُود کھاتے رہتے ہیں ۱۰۶۶ وہ لوگ نہ

یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ

کھڑے ہوسکیں گے سوا اس کے کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے جنون سے خبطی

مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ

بنا دیا ہو ۱۰۶۷ یہ سزا اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں ۱۰۶۸ کہ بیع بھی تو سُود ہی کی طرح

الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ

ہے ۱۰۶۹ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سُود کو حرام کیا ہے ۱۰۷۰ پھر جس کسی کو نصیحت

منزل ۱

(شدت احتیاج کے باوجود) اور یہ دلیل ہے ان کے کمال غیرت کی۔ اِلۡحَافًا اوپر مِنَ التَّعَفُّفِ کے ضمن میں ابھی آچکا ہے کہ یہ غیور وخوددار لوگ سرے سے سوال ہی نہیں کرتے اور اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ لوگ لگ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس میں اشارہ ہے کہ الحاف (لگ لپٹ کر مانگنے کی عادت) بُری عادت ہے۔ بعض محققین نے معنی مطلقاً عدم سوال کے کئے ہیں۔ والمعنی انھم لا یسئلون اصلا وھو المروی عن ابن عباس والیہ ذھب الفراء والزجاج وآکثر ارباب المعانی (روح) ۱۰۶۴ (تمہارے اخلاص کا، اور اسی نسبت سے اجر بھی دے گا) وَمَا تُنۡفِقُوۡا۔ یعنی ایسے لوگوں پر خرچ کرتے ہو ۱۰۶۵ (قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس پہنچ کر) بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ۔ یعنی جس وقت اور جس گھڑی بھی ضرورت و مصلحت ہو۔ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یعنی پوشیدہ تو حسب عادت اور علانیہ حسب ضرورت ومصلحت۔ اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ۔ یعنی اللہ کی راہ اور خدمت دین میں۔ انفاق کی ترغیب جہاں جہاں بھی ہے۔ مطلق انفاق کی نہیں بلکہ مُراد وہی انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدمت دین میں خرچ ہے ۱۰۶۶ (اُسے جائز قرار دے کر) یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا سے مُراد اُردو محاورہ میں سُود لینا ہے۔ عربی اور فارسی محاورہ میں سُود کھانا آتا ہے۔ اور اُردو میں بھی سُود کھانا نامانوس نہیں۔ الرِّبٰوا ربٰو کے لغوی معنی ہر زیادتی اور اضافہ کے ہیں۔ خصوصاً سرمایہ میں اضافہ کے۔ رَبَا ای زاد وعلا (راغب) الربا الزیادۃ فی راس المال (راغب) اصطلاح شریعت میں ربٰو کہتے ہیں اصل قرض پر زیادتی کو یا بلا معاوضہ مال، مال پر زیادتی کو۔ خواہ یہ بڑی ہو یا چھوٹی۔ خُصّ فی الشرع بالزیادۃ علی وجہ دون وجہ (راغب) ھو فضل مال خال عن العوض فی معاوضۃ مال بمال (مدارک) اہل عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لئے استعمال کرتے تھے جو قرضخواہ اپنے قرض دار سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا تھا۔ اُردو میں اسی کا ترجمہ سُود ہے اور سُود کا مفہوم ہر شخص سمجھتا ہے ۱۰۶۷ اصل منظر تو قیامت کے دن کا ہے کہ آخرت میں اپنی قبروں سے اُٹھنے پر یہ سُودخوار سیدھے کھڑے تک نہ ہوسکیں گے کھڑے ہوں گے بھی تو متوالوں، خبطیوں، دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے لڑکھڑاتے ہوئے۔ لیکن اس کا ایک ہلکا سا رنگ اسی دنیا ہی میں نظر آجاتا ہے۔ مہاجن، ساہوکار جو روپیہ کے پیچھے دیوانہ باؤلا رہتا ہے۔ واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جن یا بھوت چمٹ گیا ہے اور اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہر تے جاگتے اس پر سُود یا بیاج ہی سوار رہتا ہے۔ اور جس کی حرص وطمع کی پیاس دنیا میں اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ لازم ہے کہ اُس کا حشر بھی اسی مخبوط، جنون زدہ حالت کے ساتھ ہو۔ اہل کشف اور محققین کا بیان ہے کہ حشر میں انسان اُسی صورت کے ساتھ اُٹھے گا، جس قسم کی سیرت اور خصلتیں دنیا میں اس پر غالب رہی ہوں گی۔ قال العارف الرومی ؎

سیرتے کو بر نہادت غالب است ۔۔۔ ہم بر آں تصویر حشرت واجب است

مِنَ الۡمَسِّ۔ مس اور مس شیطانی سے مُراد عربی محاورہ میں جنون ہوتی ہے۔ کنی بالمس عن الجنون (راغب) المس الجنون (کشاف) ان الفاظ کے آجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید خود ہی اس عقیدہ کی تعلیم دے رہا ہے کہ جنون مس شیطانی ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ قرآن بعض اوقات ایسے موقع پر صرف مخاطبین کے معتقدات کو دُہرا دیتا ہے۔ اور چونکہ اہل عرب کا عقیدہ یہی تھا اس لئے ہوسکتا ہے کہ قرآن اُنہی کی فہم کی مناسبت اور مذاق کی رعایت سے یہ فقرے آیا ہو۔ قیل اضیف الی الشیطان علی زعمات العرب ان الشیطان یخبط الانسان فیصرعہ فورد علی ما کانوا یعتقدون (بحر) الناس یضیفون الصرع الی الشیطان والی الجن فخوطبوا علی ما تعارفوہ من ھذا ومن عادۃ الناس انھم اذا ارادوا تقبیح شیء ان یضیفوہ الی الشیطان (کبیر) ۱۰۶۸ (حکم حرمت ربٰو کے جواب میں بطور استدلال کے) مُراد سُودخوار لوگ اور جواز سُود کے قائلوں کی جماعت ہے۔ یہ عہد جاہلیت کے "روشن خیال" تھے ۱۰۶۹ (حصول نفع واضافہ دولت کے لحاظ سے) آج کل کے "روشن خیالوں" کی طرح اُس عہد کے سفیہوں کا بھی کہنا یہ تھا کہ مالی نفع آخر تجارت میں بھی تو ہوتا ہے، پھر جب تجارت حرام نہیں تو سُود کیوں حرام ہو؟ ان نافہموں نے اسے بالکل نظر انداز کردیا تھا کہ دونوں کی ایک سطح نہ اخلاقی حیثیت سے ہے نہ معاشی حیثیت سے۔ سُود کی تو ایک متعین رقم بے کھٹکے ہر حال میں مہاجن کو ملتی رہتی ہے برخلاف اس کے تجارت میں نفع ونقصان دونوں کے احتمالات ہر وقت لگے رہتے ہیں اور تاجر کو نقصان سے بچنے کے لئے وقت، محنت، ذہانت سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر تجارتی معاملت تو ہر وقت ختم ہوجاتی ہے برخلاف اس کے مدت اور مہلت کے ساتھ ساتھ سُودخوار کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات قرضدار کی نوبت بالکل تباہ حالی اور بربادی کو پہنچ جاتی ہے۔ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں حرمت سُود کے جو عقلی دلائل لکھے ہیں وہ طرز ادا وتعبیر کی تھوڑی سی تبدیلیوں کے بعد آج بھی پوری طرح پڑھنے کے قابل ہیں۔ امام رازیؒ نے نمبر اول پر یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ سُود کی رقم آخر کس چیز کا معاوضہ ہوتی ہے؟ بجز مفت خوری کی بدترین شکل کے اور یہ ہے کیا؟ ۱۰۷۰ (اور معلوم ہے کہ اللہ وہ ہے جو شرائع واحکام کا مالک ہے اور حکیم بھی ہے اور حاکم بھی) جب حکیم مطلق نے ایک معاملت کو جائز اور دوسری کو حرام ٹھہرا دیا ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ جائز کے اندر بیشمار منافع ومصالح اور حرام کے اندر بے شمار مفاسد ونقصانات ہیں اور بالفرض کسی کی سمجھ میں یہ مصالح ومفاسد نہ بھی آئیں۔ جب بھی حاکم مطلق کا حکم واجب العمل تو ہر حال ہے۔ اسلام کے جو احسانات ساری دُنیا پر اور بہت روشن نمایاں

حیثیت سے بیان میں سے ایک حرمتِ سُود بھی ہے۔ اس کے مفاسد روشن سب پر ہو چکے تھے۔ اس سے عاجز سب ہی آ چکے تھے لیکن قطعی اور کلّی صورت میں حرام اسے دنیا کے ضابطوں و دستوروں میں صرف اسلام ہی نے قرار دیا۔ سُود خوار کے دل میں شقاوت و سنگدلی اور حرص مال اور بلا مشقت مال ہاتھ آ جانے سے نفس میں دناءت اور زر پرستی اور ساہوکاروں کا بخل اور باہمی حسد و رقابت اور قرضدار بیچارہ کی بے حرمتی و تذلیل یہ واقعات و مشاہدات کہنا چاہیے کہ روزِ پا افتادہ تھے۔ لیکن اس کی قطعی بندش کا خیال کسی انسانی دماغ کو نہ آیا۔ اصلاح حال کی جو کوششیں زیادہ سے زیادہ ہوئیں وہ بس شرح سُود کی تحدید تک رہیں۔ یونان میں سولن، انگلستان میں بیکن اور یورپ میں آبائے کلیسا کے جوش اصلاح و افادہ خلق کی کائنات کل اسی قدر ہے۔ یہ فخر قیامت تک کے لیے عرب کے اُمّی کے ساتھ مخصوص ہو گیا کہ اس انسانیت کُش رسم کی حرمت کی منادی اس کی زبان سے کرائی گئی اور حرم الربٰوا کا زلزلہ افگن نعرہ اس کے دہن سے بلند کرایا گیا۔ ١٠٧١ (اور وہ اس کھائے ہوئے نوالے کے اُگلنے پر مجبور نہیں) مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ یعنی یہی حرمتِ سُود کا حکم۔ فَانْتَهٰى۔ یعنی وہ باز آگیا سُود لینے اور اسے جائز ٹھہرانے سے۔ فَلَهٗ مَا سَلَفَ۔ یعنی حکم حرمت سے قبل جو کچھ لے چکا، سو لے چکا۔ توبہ کے بعد اس کے لئے گنجائش ہے کہ اُس مال کو اپنے پاس رہنے دے۔ پچھلی رقموں

جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ

اس کے پروردگار کی طرف سے پہنچ گئی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا وہ اس کا ہو چکا ١٠٧١

وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ رہا ١٠٧٢ اور جو کوئی پھر عود کرے تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں ١٠٧٣

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي

اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے ١٠٧٤ اللہ سُود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو

الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾ اِنَّ

بڑھاتا ہے ١٠٧٥ اور اللہ کسی کفر کرنے والے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا ١٠٧٦ بیشک

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور نماز کی پابندی کی اور

اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

زکوٰۃ دی اُن کے لئے ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ اُن پر کوئی خوف

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ

ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ١٠٧٧ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ

وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾

سُود کا بقایا ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو ١٠٧٨

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ

لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کے لئے اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے ١٠٧٩

کی واپسی پر شریعتِ اسلام کسی کو مجبور نہیں کرتی ١٠٧٢ (جو دلوں کے اسرار و خفایا کا عالم ہے) مقصود یہ ہے کہ یہاں بیان بندوں کے سامنے معاملے صرف ظاہری اور قانونی پہلوؤں کا ہو رہا ہے۔ باقی قلب کے تقویٰ و طہارت اور نفس کی اصلاح کا معاملہ اللہ پر چھوڑنا چاہیے۔ اَمْرُهٗۤ۔ میں ضمیر باز رہنے والے (من انتہٰی) کی طرف ہے۔ الظاهر ان الضمير في امره عائد الى المنتهى (بحر) ١٠٧٣ یعنی جو کوئی اس تبلیغ کے بعد بھی عقیدہ جواز سُود پر قائم رہے، یا سودی معاملت کرتا رہے۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ۔ یہ سزا ہے سُودی معاملت کرنے والوں کی۔ معاملت سُود گناہ کبیرہ ہے اور کبیرہ کی سزا جہنم ہے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ یہ سزا ہے جوازِ سُود کے قائلوں کی۔ جوازِ سود کا عقیدہ کفر ہے اور کفر کی سزا خلودِ جہنم ہے۔ معتزلہ نے آیت کے اتنے جزء سے مومن اہل معاصی کی عدم مغفرت پر استدلال کرنا چاہا ہے۔ لیکن تفسیر کا جو پہلو یہاں اختیار کیا گیا اس پر شبہہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ امام رازیؒ نے بھی تفسیر کبیر میں اس مقام پر خوب تقریر کی ہے۔ ١٠٧٤ آخرت میں تو اس وعدہ و وعید دونوں کا مشاہدہ پوری طرح ہو کر رہے ہی گا کہ سُود میں برکت و خیریت برائے نام بھی نظر نہ آئے گی۔ اور صدقات کا اجر بے حساب ملے گا۔ لیکن دُنیا میں بھی اس کا ظہور کسی نہ کسی حد تک ہوتا ہی رہتا ہے۔ سُود خوار قوموں کا انجام بارہا آپس کی خونریزی اور تباہی و بربادی ہی پر ہوا ہے اور افراد میں بھی مشاہدہ ہے کہ سُود خواری کی عادت بنیوں، مہاجنوں کے دل میں روپیہ کو تو نفسِ محبوب بنا دیتی ہے۔ تجربہ ہوتا ہے کہ سُود خوار زر و دولت سے دنیوی لطف بھی نہیں اٹھا پاتا۔ اس کے مقابل صدقہ کی برکتیں، باہمی غمخواری و ہمدردی، ایک دوسرے کی شارکت و معاونت قوم اور افراد دونوں میں مشاہدہ کی چیزیں ہیں۔ بینکوں کے آئے دن ٹوٹنے، مہاجنوں اور بنیوں کے دیوالہ نکلتے رہنے اور پھر اس سے ہزاروں گھروں کی تباہی و بربادی کس نے نہیں دیکھی ہے؟ معاشرہ کی اس ابتری کا راز بھی سُودی کاروبار کی ترویج ہے ١٠٧٥ اس کے اندر دونوں قسم کے نافرمان آ گئے۔ وہ جو سُود کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور وہ جو اپنے عمل کے ساتھ ساتھ، حرمتِ سُود کے عقیدہ کے بھی منکر ہیں۔ كَفَّارٍ۔ کافر کا صیغہ مبالغہ ہے۔ ناشکرے اور کفرانِ نعمت کرنے والے کے مفہوم میں کفور کا مرادف اور اس سے بلیغ تر۔ یہاں مُراد وہی لوگ ہیں جو جوازِ سُود کے قائل ہیں۔ ای عظيم الكفر باستحلال الربٰوا (مدارک) مصرّ على تحليل المحرمات (بیضاوی) الكفور المبالغ فى كفران النعمة والكفار ابلغ من الكفور (راغب) اَثِيْمٍ بڑے گنہگار۔ یعنی سُود خواری جیسی شدید معصیت میں مُبتلا۔ متماد فى الاثم باكله (مدارک) منهمك فى ارتكابه (بیضاوی) كَفَّارٍ کے لفظی معنی بڑے ناشکرے کے ہیں۔ جس شخص پر اللہ اپنا اتنا فضل کرے کہ اُسے اس کی اپنی ضروریات سے زیادہ مال دے اور وہ اس مال کو بندوں کی آزار رسانی پر صرف کرے تو اس سے بڑھ کر سوءِ استعمال کی مثال اللہ کے فضل کی اور کیا ہوگی اور ایسے بدبخت سے بڑھ کر ناشکرا اور کون قرار پائے گا؟ ١٠٧٦ (قیامت میں) خیر آخرت میں تو ایسے نیک کردار، متقی، خاشع، خادمِ خلق انسانوں کی خوش انجامی تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن دنیا میں بھی جو سکونِ قلب یکسوئی، طمانیتِ خاطر اور قناعت کی مسرتیں ایسے لوگوں کو حاصل رہتی ہیں اُن کا اندازہ وہ بدنصیب کر ہی نہیں سکتا۔ جو چوبیس گھنٹہ آنہ، پائی کی میزان لگاتا رہتا ہے جو مخلوق کی ایذا رسانی کا خوگر ہو کر پیسہ پیسہ گنتا رہتا ہے اور جس پر ہر گھڑی بہی کھاتہ سنبھالے رہنے کا بھوت سوار رہتا ہے ١٠٧٧ (کہ ایمان کا مقتضٰی سارے ہی احکام قرآن پر عمل کرنا ہے) محققین نے اس ٹکڑے سے یہ استدلال کیا ہے کہ شریعت کے کسی ایک جزء سے بھی انکار کرنا ساری شریعت سے انکار کرنا ہے۔ فيه دليل على ان من كفر بشريعة واحدة من شرائع الاسلام كان كافرًا كما لو كفر بجميع شرائعه (کبیر) اتَّقُوا اللّٰهَ۔ خوفِ خدا ہی اصل ہے تمام نیکیوں کی اور اجتنابِ معاصی کی۔ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ۔ یعنی حرمتِ سُود کے نزولِ حکم سے قبل جو رقم سود کی تم ٹھہرا چکے ہو اس کا وصول کرنا اب جائز نہیں اُسے چھوڑ دو۔

۱۰۷۸ یعنی تم پر باغیوں اور مرتدوں کی طرح جہاد کیا جائے گا۔ کما یحارب الفئۃ الباغیۃ (کبیر) کحرب المرتد وکحرب البغاۃ (مع) اعلام بانھم ان لم یفعلوا ما
اُمروا بہ فھم محاربون للہ ورسولہ (جصاص) اتنی شدید تہدید قرآن مجید میں کسی دوسری معصیت کے لئے نہیں آئی ہے۔ العظمۃ للہ۔ حرمتِ سُود کا کس درجہ اہتمام ہے
اور اس باب میں کس درجہ شدید احکام ہیں۔ کچھ حد ہے اس ڈھٹائی اور جسارت کی کہ اپنے کو مسلمان کہلا کر رسالہ "جوازِ سُود" پر شائع کئے جائیں اور اپنی تحریر وتقریر سے لوگوں کو سُودی کاروبار کی
ترغیب دلائی جائے۔ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی رسُولؐ سے یہ جو قول منقول ہے کہ سُود کو بھی چھوڑ دو اور اس کے مشابہ چیزوں کو بھی۔ وہ اسی قرآنی تہدید کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب جسمانی بیماریوں
کا یہ حال ہے کہ کسی مرض کو طبیب اگر سخت مرض سے مشابہ پاتا ہے تو احتیاطاً علاج اُس سخت تر مرض کا شروع کر دیتا ہے تو جو مسلمان تقویٰ کا ادنیٰ درجہ بھی رکھتے ہیں، اُن پر بھی یہی لازم ہے کہ نہ صرف
کھلے ہوئے سُود سے بچیں بلکہ ایسی مالی وکاروباری صورتوں سے بھی احتیاطاً بچتے رہیں جن کا سُودی ہونا مشتبہ ہے۔ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا۔ یعنی اگر اس حکم حرمتِ سُود پر عمل نہ کرو گے ۱۰۷۹ یعنی حکومت

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ
اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہارے اصل اموال تمہارے ہی ہیں ۱۰۸۰ نہ تم کسی پر ظلم کرو گے
وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ
نہ تم پر کسی کا ظلم ہو گا ۱۰۸۱ اور اگر تنگدست ہے تو اس کیلئے آسودہ حالی تک مہلت
اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
ہے ۱۰۸۲ اور اگر معاف کر دو تو تمہارے حق میں اور بہتر ہے اگر تم علم
تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ
رکھتے ہو ۱۰۸۳ اور اُس دن سے ڈرتے رہو جس میں تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۱۰۸۴
ع ۳۸ ۸ ۶ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾
پھر ہر شخص کو اس کا معاوضہ پورا پورا ملے گا، اور ان پر ظلم (ذرا بھی) نہ ہو گا ۱۰۸۵
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى
اے ایمان والو جب اُدھار کا معاملہ کسی مدتِ معین تک کرنے
اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ
لگو تو اس کو لکھ لیا کرو ۱۰۸۶ اور لازم ہے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا
بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ
ٹھیک ٹھیک لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اس کو سکھا دیا
اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
ہے ۱۰۸۷ پس چاہیئے کہ وہ لکھ دے اور چاہیئے کہ وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ حق واجب ہے ۱۰۸۸

اسلامی تمہارا اصل سرمایہ تمہیں واپس دلا دے گی۔ اگر توبہ نہ کرو گے تو راس المال بھی بحقِ حکومتِ اسلام ضبط ہو جائے گا۔ اِنْ تُبْتُمْ یعنی اگر سُود خواری کی معصیت سے توبہ کر لو گے ۱۰۸۰ لَا تَظْلِمُوْنَ ظالم بننے کی صورت تو یہ ہے کہ کوئی رقم قرض دی اور وصول کرتے وقت اصل سے زائد وصول کر لی۔ بطلب الزیادۃ علی راس المال (کبیر) لَا تُظْلَمُوْنَ۔ مظلوم بننے کی صورت یہ ہے کہ جتنی رقم قرض دی تھی اب ادا کرنا اس سے زائد کا پڑ رہا ہے۔ ای بنقصان راس المال (کبیر) ۱۰۸۱ یعنی مدیون یا قرضدار اگر وقت پر تنگدست ہے تو اُسے اسی وقت تک کے لئے مہلت دیدی جائے جب تک وہ ادا کرنے کے قابل ہو جائے ۱۰۸۲ (کہ اس احسان وحسن سلوک پر کتنا اجرِ عظیم موعود ہے) اَنْ تَصَدَّقُوْا۔ یعنی نادار مدیون کو اپنا مطالبہ بالکل معاف ہی کر دو۔ عقائدِ اسلامی کی طرح قوانین اسلامی کی بھی پوری قدر اس وقت ہوتی ہے جب اُن کے مقابلہ میں اپنے کو مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے والی قوموں کے قوانین رکھے جائیں۔ خود اس قرضہ کے معاملہ میں دوسری قوموں کے قانون قرض داروں کے حق میں سرتاسر ظالمانہ ہیں۔ رومی قانون (مرعوب) Roman Law میں مدیون کو قتل تک کیا جا سکتا تھا اور رومی تاریخ میں دائنوں کی ظلم وزیادتی سے بارہا نوبت شدید بلووں تک آ گئی ہے۔ ایک اور نکتہ۔ اسلامی نظامِ معاشیات کی بنیاد مادیات سے کہیں بڑھ کر انسانیت وروحانیت وتقویٰ الٰہی پر رکھی ہے۔ اور یہ خصوصیت اُسے دنیا کے قدیم وجدید سارے معاشی نظاموں سے ممتاز کئے ہوئے ہے ۱۰۸۳ (اپنے اپنے اعمال کی پیشی کے لئے) خطاب یہاں اہلِ ایمان سے ہے ۱۰۸۴ (کہ کسی کا نیک عمل بلا معاوضہ رہ جائے یا کسی کے نامۂ عمل میں کوئی بدی خواہ مخواہ لکھ دی جائے) تُوَفّٰی مَا كَسَبَتْ۔ یعنی اعمال کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا ۱۰۸۵ (اور اس صاف صاف لکھا پڑھی کو نہ دلیل بے اعتمادی کی سمجھو اور نہ اس میں شرماؤ) دَیْن۔ دین کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ عربی میں یہ (عین) کے مقابلہ میں ہے اور اس کا اطلاق ہر اس معاملت پر ہوتا ہے جس کے معاوضہ کا ایک جزو فی الفور نہ ہو۔ ھو عبارۃ عن کل معاملۃ کان احد العوضین فیھا نقدًا والآخر فی ذمۃ النسیئۃ کان العین عند العرب ما کان حاضرًا والدین ما کان غائبًا (ابن عربی) تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ۔ دَین یا اُدھار معاملت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ چیز ابھی خریدی اور قیمت کے لئے طے پا گیا کہ اتنی مدت کے بعد دیں گے۔ دوسری یہ کہ قیمت اُسی وقت دے دیں اور چیز کے لئے یہ طے پا گیا کہ اتنی مدت کے بعد لیں گے۔ شرعاً دونوں صورتیں جائز ہیں۔ تفصیلات فقہی کتابوں میں ملیں گی۔ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔ فقہاء مفسرین نے اس سے یہ اشارہ سمجھا ہے کہ قرضہ کے معاملات میں مدت بالکل صاف اور متعین ہونا چاہیئے۔ گول اور مجمل نہ رہے۔ "جاڑوں کے زمانہ میں" "برسات کے موسم میں" "ربیع کی فصل میں" ان مبہم مدتوں کی بجائے تعیین وصراحت ہونا چاہیئے کہ فلاں سنہ کے فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ۔ فقیہ ابن عربی مالکی نے ایک اس آیت کے ذیل میں ۵۲ مسئلے لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ آیت مسائلِ بیع میں اہم ترین آیت ہے۔ ھی اصل فی مسائل البیوع وکثیر من الفروع عامی صوفیہ اور جاہل مشائخ نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ معاملت ومعاشرت کی اصلاح ودرستی، سلوک وطریقت کے منافی ہے وہ غور کریں کہ قرآن کو اس باب میں کتنا اہتمام بلکہ جزئیات تک کا انضباط مدِ نظر ہے ۱۰۸۶ باہمی لین دین اور قانونی معاملات کے سلسلہ میں ادنیٰ ادنیٰ جزئیات تک کے لئے شریعت کا یہ اہتمام اللہ اللہ عالمگیر ہدایت ورہنمائی کا حق اگر کسی کتاب کو پہنچتا ہے تو بیشک وہ یہی کتاب ہو سکتی ہے۔ کہاں ایک طرف یہ مکمل نظامِ زندگی اور مفصل ضابطۂ حیات اور کہاں اس کے مقابلہ میں انجیل جس کے صفحات قانون ومعاملت کی چھوٹی چھوٹی ہدایات تک سے خالی ہیں۔ بِالْعَدْلِ۔ یعنی کسی فریق سے متاثر ہوئے کسی کی رو رعایت کئے ہوئے بغیر لکھے۔ فقہاء نے یہاں سے یہ بھی نکالا ہے کہ کاتب کو متدین اور شرائطِ تحریر کا عالم ہونا چاہیئے اور فریقین پر لازم ہے کہ ایسے ہی کاتب کی تلاش کریں۔ فیہ دلیل ان یکون الکاتب فقیھا عالمًا بالشروط وھو المتدین اینس بتخییر الکاتب (مدارک) كَاتِبٌ۔ فقہاء نے کہا ہے کہ کاتب کو اپنی محنت کی اُجرت لینا جائز ہے۔

۱۰۸۷ دستاویز کا ماحصل کسی حق کا اپنی طرف اقرار کرنا ہے۔ یہ قدرۃً اُسی کو کرنا چاہیئے جس کے ذمہ کوئی حق واجب الادا ہو۔ وَلْيُمْلِلِ۔ یعنی دستاویز کو لکھانا ۱۰۸۸ یعنی جو حق جس طرح اور جتنا اُس پر واجب ہے اُس میں سے کاتب دستاویز کو بتلائے اور لکھاتے وقت کچھ بھی کتر بیونت نہ کرے۔ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ۔ خوفِ خُدا تو مسلمان کے لئے جزو زندگی اور اس کی زندگی بھر رہنا چاہیئے۔ دستاویز لکھاتے وقت اس کی تاکید یاد دہانی کی حکمتیں اور مصلحتیں بالکل واضح ہیں ۱۰۸۹ اور یہ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ دستاویز لکھانے والا وہی ہونا چاہیئے۔ سَفِيْهًا۔ یہ مراد نہیں کہ پاگل ہو بلکہ صرف ضعیف العقل مراد ہے۔ ضعیف الرای ناقص العقل من البالغین (کبیر) ضَعِيْفًا۔ یہاں ایک جامع لفظ ہے۔ نابالغ اور پیر فرتوت سب اس کے اندر آجاتے ہیں۔ الصغیر والمجنون والشیخ الخرف وھم الذین فقدوا العقل بالکلیۃ (کبیر) ۱۰۹۰ (کسی اور عذر یا مانع سے) مثلاً یہ کہ گونگا ہو، یا پردیسی ہو، ملک کی زبان سے ناواقف ۱۰۹۱ (ایسی ہر صورت میں اس کی طرف سے ٹھیک ٹھیک) وَلِيُّهٗ سے مراد ولی شرعی ہے یا وکیل یا مختار۔ (یا پردیسی کے لئے ترجمان تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی صورت جب ایسی پیش آجائے کہ صاحبِ معاملہ کا اقرار اور بیان معتبر نہ رہ جائے تو اعتبار اُس کے کارکن کے بیان و اقرار کا کیا جائے ۱۰۹۲ (جو عاقل ہوں، بالغ ہوں، آزاد ہوں، دیندار ہوں) ای من رجال المومنین والحریۃ والبلوغ مشروط مع الاسلام (مدارک) مِنْ رِّجَالِكُمْ کی قید نے صاف بتا دیا کہ گواہوں کو مسلمان ہونا چاہیئے۔ یہودی قانون میں بھی گواہ کا اسرائیلی ہونا ضروری ہے۔ کافروں کی گواہی کافروں کے معاملات میں مقبول ہو سکتی ہے۔ وشہادۃ الکفار بعضھم علی بعض مقبولۃ عندنا (مدارک) وَاسْتَشْهِدُوْا گواہوں کی یہ گواہی تحریر دستاویز کے علاوہ ہونا چاہیئے۔ فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ اصل مدار ثبوت اُنہی گواہوں کی گواہی ہو گی ۱۰۹۳ (یعنی جو تمہارے نزدیک ثقہ و قابلِ اعتبار ہوں) فان لم یکونا رجلین۔ یعنی دو مرد گواہی کے لئے میسر نہ آئیں۔ رَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ یہودی قانون میں گواہی صرف مردوں کی معتبر ہے اور عورت کی شہادت سرے سے قابلِ تسلیم نہیں۔ اسلام نے اسے یہ حق دیا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے علم کامل اور تحقیق مطلق کی بنا پر عورت کی گواہی کا مرتبہ مرد کے مقابلہ پر نصف مانا ہے۔ ممن ترضون۔ دیانت ضمیر،

وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ
اور چاہیئے کہ وہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرتا رہے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے ۱۰۸۸ پھر اگر وہ
كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا
جس کے ذمہ حق واجب ہے عقل کا کوتاہ ہو یا یہ کہ کمزور ہو ۱۰۹۰ اور اس
يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ
قابل نہ ہو کہ وہ خود لکھوا سکے ۱۰۹۰ تو لازم ہے کہ اس کا کارکن ٹھیک ٹھیک لکھوا دے ۱۰۹۱
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ
اور اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ کر لیا کرو ۱۰۹۲ پھر اگر دونوں مرد نہ
يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ
ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ان گواہوں میں سے
مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ
جنہیں تم پسند کرتے ہو ۱۰۹۳ تاکہ ان دو عورتوں میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے اگر کوئی
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا
ایک ان دو میں سے بھول جائے ۱۰۹۴ اور گواہ جب بلائے جائیں تو انکار
دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ
نہ کریں ۱۰۹۵ اور اس معاملت کو خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی اس کی میعاد
كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ
تک لکھنے سے اُکتا نہ جاؤ یہ کتابت اللہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قرینِ عدل ہے

منزل ۱

سیرت، کردار کا ایک خاص معیار اسلام نے زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ اور معاشرت کے بعید سے بعید گوشہ میں بھی قائم رکھا ہے۔ چنانچہ یہاں یہ قید لا کر صاف بتا دیا کہ شہادت بھی ایک خاص اعزاز و منصب ہے ہر کس و ناکس اس کا اہل نہیں۔ اس کے اہل وہی ہیں جن کی سیرت و کردار پر اسلامی معاشرہ کو اطمینان ہو اور جن کی دیانت کم از کم عام طور پر مشتبہ نہ ہو۔ ۱۰۹۴ (اور اس طرح شہادت مکمل ہو جائے) اَنْ تَضِلَّ۔ بھول جائے شہادت کے کسی حصّہ کو۔ واقعہ کے کسی جزء کو۔ رہا یہ امر کہ عورت کی شہادت مرد کے مقابلہ میں ضعیف کیوں مانی گئی ہے۔ اور نسیان کا احتمال مرد کی شہادت میں کیوں نہیں رکھا گیا؟ تو یہ سوالات ذہن و اخلاق کی دنیا میں بالکل ایسے ہی ہیں، جیسے جسم و مادیات کی دُنیا میں دریافت یہ کیا جائے کہ حمل و رضاعت کا تعلق صرف عورت ہی سے کیوں رکھا گیا اور مرد کو باوجود اس کے قوت و جسامت کے اس بار کے برداشت کے کیوں ناقابل سمجھ لیا گیا؟ یہ فاطر کائنات ظاہر ہے کہ جسمیات و مادیات کے ایک ایک دانہ سے واقف ہے۔ اُس کے پیشِ نظر ذہنیات و اخلاقیات کی بھی باریک سی باریک حقیقتیں ہیں۔ مغرب کے ماہر نسائیات ہیولاک ایلز Hoolock Ellis نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ عورت کے لئے دھوکا اور فریب بہ منزلہ امر طبعی کے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی)

۱۰۹۵ (کہ اس میں امانت ہے معاملاتِ اُمّت کی اور خدمت ہے دین کی) وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ الخ یعنی گواہ بننے اور گواہی دینے سے انکار نہ کریں ۱۰۹۶ (یعنی وہی کتابت
معاملۂ دَین سے متعلق) عِنْدَ اللّٰہِ۔ یعنی اللہ کے قانون وضابطہ میں۔ ای فی حکمہ سبحانہ (مدارک) لَا تَسْئَمُوْٓا۔ بار بار لکھنے لکھانے سے نفس میں ایک قسم کی کاہلی پیدا
ہو جانا تقریباً طبعی ہے۔ تَكْتُبُوْهُ۔ میں ضمیر اسی معاملۂ دَین سے متعلق ہے۔ نادانوں نے آج کل شور بپا کر رکھا ہے کہ اب زمانہ اس کا نہیں کہ مذہب خصوصاً اسلام کو عقائد ہی
سے پرکھا جائے اب تو دیکھنا یہ ہے کہ اس دنیا کے لئے سب سے زیادہ عملی مذہب کون ہے؟ روزانہ مسائل زندگی کے حل کرنے میں کون مذہب سب سے زیادہ زور دے رہا ہے؟ یہ معیار
بجائے خود کس حد تک صحیح ہے؟ یہ تو ایک الگ سوال ہے۔ لیکن بہرحال جو لوگ اسی معیار کو مانے ہوئے ہیں کم از کم وہ تو خلوئے ذہن کے ساتھ غور کریں کہ ساری شریعتوں میں اسلام سے

وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ

اور شہادت کو درست تر رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار اس کی کہ تم شبہ میں نہ پڑو ۱۰۹۶

تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ فَلَیْسَ

بجز اسکے کہ کوئی سودا دست بدست ہو جسے تم باہم لیتے ہی رہتے ہو سو تم پر

عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا

اس میں کوئی الزام نہیں کہ تم اسے نہ لکھو ۱۰۹۷ اور جب خرید و فروخت کرتے ہو تب بھی

تَبَایَعْتُمْ ۪ وَ لَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِیْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ

گواہ کر لیا کرو ۱۰۹۸ اور کسی کاتب اور گواہ کو نقصان نہ دیا جائے ۱۰۹۹ اور اگر (ایسا)

تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ یُعَلِّمُكُمُ

کروگے تو یہ تمہارے حق میں ایک گناہ (شمار) ہوگا ۱۱۰۰ اور اللہ سے ڈرتے رہو ۱۱۰۱، اور اللہ تمہیں

اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۲۸۲ وَ اِنْ

سکھاتا ہے ۱۱۰۲ اور اللہ ہر چیز کا بڑا جاننے والا ہے ۱۱۰۳ اور اگر تم

كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ

سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ پاؤ ۱۱۰۴ سو رہن رکھنے کی چیزیں ہی جو قبضہ میں دیدی جائیں ۱۱۰۵

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی

اور تم میں سے کوئی کسی دوسرے پر اعتبار رکھتا ہے ۱۱۰۶ تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے اُسے چاہیے کہ

اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكْتُمُوا

دوسرے کی امانت کا حق ادا کردے اور چاہیے کہ اللہ (یعنی) اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے ۱۱۰۷، اور

بڑھ کر کس شریعت نے روزانہ زندگی کے چھوٹے
بڑے تمام مسائل کے حل کرنے کا اہتمام رکھا ہے!
۱۰۹۷ یہ اس لئے کہ دست گرداں معاملتیں کثرت
سے برابر واقع ہوتی رہتی ہیں اور عموماً مقداریں
بھی ان کی خفیف ہوتی ہیں اور عموماً ان میں احتمال
نزاع واختلاف کا بھی کم ہی ہوتا ہے۔ فقہاء نے
لکھا ہے کہ ایسے موقعوں پر کتابت دستاویز کے التزام
سے بڑا حرج لازم آتا تھا اس لئے شریعت نے التزام
کو یہاں سے اٹھا دیا۔ لیکن اگر کوئی معاملت ایسی
ہو کہ شکل کے اعتبار سے ہو تو دست بدست لیکن
مالیت بڑی ہو یا آئندہ اختلاف ونزاع کے احتمالات
موجود ہوں۔ یا اور کسی اعتبار سے حالات وہاں
وہ نہ ہوں جو عموماً تجارتِ حاضرہ یا معاملۂ دست گرداں
میں ہوا کرتے ہیں تو ایسے موقع پر ترکِ کتابت کی علت
مفقود ہوگی اور اہتمام کتابت مطلوب ہوگا ۱۰۹۸
یعنی ایسے موقع پر گواہی کرا لینا بہتر ہوگی وَاَشْهِدُوْٓا۔
صیغۂ امر یہاں وجوب کے لئے نہیں، صرف استحسان کے
لئے ہے۔ والامر للندب (مدارک) والاوامر
التی فی ھذہ الآیۃ للاستحباب عند
اکثر الائمۃ (بیضاوی) ۱۰۹۹ یعنی فریق اپنی
مصلحت کی خاطر کاتب یا گواہ کو زحمت میں نہ ڈالے
ادھر کاتب اور گواہوں کو حکم مل چکا ہو کہ کتابت
اور گواہی سے پہلو تہی نہ کریں اب فریقین کو حکم مل رہا
ہے کہ وہ بھی کاتب اور گواہوں کی مصلحت وآسائش
کا خیال رکھیں۔ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ۔ کاتب کو
نقصان پہنچانا مثلاً یہ کہ اسے بلا اجرت کتابت پر مجبور
کیا جائے۔ وَلَا شَهِيْدٌ۔ گواہ کو تکلیف میں
ڈالنا۔ مثلاً یہ کہ باوجود احتیاج اسے آمد ورفت کا
خرچ بھی نہ دیا جائے ۱۱۰۰ (کہ جس کام سے منع کیا گیا وہی کر رہے ہو) وَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ کی تصریح کر کے حکم کی اہمیت کو کس درجہ بڑھا دیا ہے ۱۱۰۱ (چھوٹے بڑے سارے معاملات اور
کارروائیوں میں) سبحان اللہ تقویٰ الٰہی کی تاکید کن کن موقعوں پر کیا ہے ۱۱۰۲ (تمام تر حکمت کی باتیں) بعض اہل علم نے "يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ" کو فقرۂ سابق "وَاتَّقُوا اللّٰهَ"
سے بالکل مربوط پاکر استنباط یہ کیا ہے کہ علم حقیقی عین نتیجہ ہوتا ہے تقویٰ الٰہی کا۔ تقویٰ اختیار کرو اور ازخود علم الٰہی مرحمت ہونے لگے گا ۱۱۰۳ چنانچہ اپنے اس علم کے مطابق معاملت بھی مطیع
وعاصی سے کرے گا ۱۱۰۴ (کتابت دستاویز کے لئے، درآنحالیکہ معاملۂ رہن کی ضرورت آپڑے) رہن کے سلسلہ میں سفر کا ذکر شاید اس لئے کر دیا گیا ہو کہ سفر کی حالت میں ضرورت
رہن کے پیش آجانے کا احتمال زیادہ ہے ۱۱۰۵ (صاحب حق کے۔ مدیون کی طرف سے) رِهٰنٌ ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ یہی ہوتی ہیں۔ فقہاء نے تصریح کر دی ہے
کہ رہن بالقبضہ تو صرف قرض دینے والے کے اطمینان کے لئے ہے۔ اسے یہ حق نہیں کہ وہ شے مرہون سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے ۱۱۰۶ (اور اس لئے رہن کی ضرورت نہیں سمجھتا) ۱۱۰۷
معاملات کے سلسلہ میں یہ تقویٰ الٰہی کی تاکید ایک بار پھر ملاحظ ہو۔ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ یعنی مدیون۔ فَلْيُؤَدِّ ادا کرے پورا پورا۔

۱۱۰۸ (اور اصل شی قلب ہی کی گنہگاری ہے) اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔ سب سے بڑا گناہ تو قلب ہی کا گناہ ہے۔ چنانچہ کفر جو سارے کبائر سے بڑھ کر کبیرہ ہے۔ قلب ہی کا گناہ ہے اس لئے اس اسلوب بیان نے خود یہ ظاہر کر دیا کہ کتمان شہادت شدید ترین گناہ ہے۔ لان افعال القلوب اعظم من افعال سائر الجوارح الاترى ان اصل الحسنات والسیئات الایمان والکفر وھما من افعال القلوب واذا جعل کتمان الشھادۃ من اٰثام القلوب فقد شھد لہ بانہ من معاظم الذنوب (مدارک) وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔ اور گواہی کو مت چھپاؤ۔ ادائے شہادت کے وقت۔ یہ ادائے شہادت کا حکم عام ہے تمام معاملات قانونی کے لئے۔ مثلاً نکاح، مہر، وصیت وغیرہ۔ صرف معاملات رہن کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اور شہادت چھپانے کی ساری صورتیں اس ممانعت کے اندر آ جاتی ہیں۔ مثلاً ادائے شہادت سے گریز کرنا یا شہادت میں واقعات صحیح نہ بیان کرنا۔ وقس علی ہذا۔ وَمَنْ يَكْتُمْهَا۔ اور یہ کتمان خواہ جزئی ہو یا کلی۔ ادائے شہادت چونکہ واجب ہے۔ فقہاء نے اس پر اجرت لینا ناجائز قرار دیا ہے البتہ آمد و رفت اور خوراک پر جو کچھ صرف ہو اس کا بقدر واقعی وصول کرنا جائز ہے۔ ۱۱۰۹ (اور اپنے اسی علم کامل کے مطابق جزا و سزا دے گا) بِمَا تَعْمَلُونَ۔ مثلاً ایک عمل اخفاء شہادت کا ہے جو معصیت ہے۔ اور دوسرا عمل ادائے شہادت کا ہے۔ جو طاعت ہے۔

الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ

گواہی کو مت چھپاؤ اور جو کوئی اسے چھپائے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا ۱۱۰۸ اور تم جو کچھ

بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي ع ۳۹

بھی کرتے ہو اللہ اس کا بڑا جاننے والا ہے ۱۱۰۹ اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ

الْأَرْضِ ۗ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ

زمین میں ہے ۱۱۱۰ اور جو کچھ تمہارے نفسوں کے اندر ہے اگر تم اس کو ظاہر کر دو ۱۱۱۱ یا اسے

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ

چھپائے رکھو بہرحال اللہ اس کا حساب تم سے لیگا ۱۱۱۲ پھر جسے چاہے گا بخش دیگا اور جسے چاہے گا

مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٨٤﴾ آمَنَ

عذاب دیگا ۱۱۱۳ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۱۱۱۴ پیغمبر ایمان لائے

الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ

اس پر جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے ۱۱۱۵ اور مومنین (بھی) یہ

كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ

سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ۱۱۱۶ ہم اس کے

بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ ۚ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ

پیغمبروں میں باہم کوئی فرق بھی نہیں کرتے ۱۱۱۷ اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی ۱۱۱۸

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ

ہم تیری مغفرت (طلب کرتے ہیں) اے ہمارے پروردگار ۱۱۱۹ اور تیری ہی طرف واپسی ہے ۱۱۲۰ اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا

۱۱۱۰ (اور کسی دیوی، دیوتا، بروز، مظہر، اوتار کی شرکت اس میں نہیں) قرآن مجید کی طویل ترین سورہ کا آخری رکوع شروع ہو رہا ہے یہاں پر عقیدۂ توحید کامل کا اعادہ و اثبات ہے۔ سورہ کا آغاز اصول دین سے متعلق جامع تعلیم سے ہوا تھا۔ سورہ کا خاتمہ بھی اسی طرح جامعیت و مانعیت کے ساتھ بنیادی عقائد پر ہو رہا ہے۔ ۱۱۱۱ (زبان سے یا عمل سے) مَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ جو کچھ دلوں کے اندر ہے۔ افعال ارادی و اختیاری میں سے مثلاً کوئی عقیدۂ فاسد یا عزم معصیت، اس میں وسوسہ اور گزرنے والے خیالات داخل نہیں کہ وہ حدود مؤاخذہ سے خارج ہیں۔ ولا تدخل الوساوس وحدیث النفس فیما یخفیہ الانسان لان ذلک مما لیس فی وسعہ ولکن ما اعتقدہ وعزم علیہ (مدارک) ۱۱۱۲ (مثل تمام معاصی کے) ۱۱۱۳ مغفرت ہوگی تو قانون رحمت عامہ کے مطابق اور عذاب ہوگا تو قانون حکمت کاملہ کے ماتحت ۱۱۱۴ اللہ فاعل بالارادہ ہے، مختار کل ہے اور اس سے منزہ ہے کہ عفو و مغفرت کے لئے ضرورت بطور فدیہ یا کفارہ کے کسی "خدائے مصلوب" کی ہو۔ آیت میں اشارۃً رد آ گیا عقیدۂ نصاریٰ کا اور متعدد مشرک قوموں کے عقائد کا۔ خدا بس اپنے ہی ارادہ یا مشیت کے علاوہ کسی اور قانون کا پابند نہیں جیسا کہ ہندی مشرک قوموں نے عقیدۂ کرم سے خیال کر رکھا ہے ۱۱۱۵ (یعنی قرآن پر) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ۔ اپنی رسالت یعنی پیام حق کی حقانیت کاملہ پر ایمان لانے والے سب سے پہلے خود پیمبر ہوتے ہیں۔ ایمان ایمان تو سب برابر ہے۔ لیکن باعتبار ظرف و بلحاظ کیفیت پیمبر کے ایمان عام اور عام افراد امت کے ایمان کے درمیان آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ ہر ایک کے ایمان کا مرتبہ بھی اس کی حیثیت اور مرتبہ کے متناسب ہوتا ہے ۱۱۱۶ اس جامع آیت کے اندر تمام لوازم ایمان بیان ہو گئے ہیں۔ اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس کی ذات اور صفت دونوں کی تصدیق کی جائے۔ حسب تصریحات قرآنی و تعلیمات نبوی یہ تردید ہو گئی دہریت، لاادریت، ارتیاب وغیرہ کی۔ خدائے واحد کی جزم کے ساتھ تصدیق کرنا لازمی ہے۔ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ۔ فرشتہ کی تعریف اوپر گزر چکی ہے کہ وہ ایک نوری مخلوق ہے جس سے صدور معصیت کا امکان نہیں۔ کثرت سے مشرک قوموں کو ٹھوکر اسی عقیدہ میں لگی ہے۔ فرشتوں کو بجائے تمامتر خدا کی کارندہ ہونے کے ان کی عظمت سے متاثر ہو کر انہیں کائنات کے مختلف شعبوں میں مستقلاً متصرف سمجھنے لگے۔ اور انہیں دیوی دیوتا کہہ کر پکارنے لگے مثلاً فلاں آگ کا دیوتا ہے فلاں ہوا کی دیوی ہے فلاں بارش کا دیوتا ہے۔ وقس علی ہذا۔ قرآن مجید نے جو فرشتوں کے عقیدہ پر بار بار زور دیا ہے اس کا مقصد شرک کی اس خاص قسم یعنی دیوتا پرستی کا استیصال ہے۔ فرشتے گو نوری ہوتے ہیں معصوم ہوتے ہیں لیکن بہرحال خالق کائنات کے سامنے انسان ہی کی طرح ایک عاجز و بےبس مخلوق ہوتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ ان کی ذات یا صفات کو مدغم کر دینا انتہائی حماقت ہے۔ وَكُتُبِهٖ۔ آسمانی نوشتوں اور ہدایت ناموں کے باب میں بھی بڑی افراط و تفریط ہوتی آئی ہے۔ کسی کسی قوم نے تو ان کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ خدا ہے لیکن کوئی ہدایت نامہ نہیں بھیجتا۔ اور بہت سی قوموں نے انہیں ذہن انسانی کی پیداوار قرار دیا جنہیں چند بڑے اور ہدایت یاب انسانوں نے مل کر لکھ لیا۔ وَرُسُلِهٖ۔ رسالت کا عقیدہ بھی مشرک قوموں نے بالکل مسخ کر دیا تھا۔ دنیا رسولوں کو بھول چکی تھی اور قائل اس کی رہ گئی تھی کہ جس کے ذریعہ سے ہدایت اور پھر نجات ہوتی ہے، وہ یا تو خدا کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے یا خود خدا کسی انسانی یا حیوانی قالب میں۔ قرآن مجید نے آ کر بتایا کہ یہ انسان اور بندے ہی ہوتے ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہتی ہے۔ سلسلۂ وحی کو ماننا بھی گویا "اوتار" کے عقیدہ پر ضرب لگانا ہے ۱۱۱۷ (کہ بعض کے قائل ہوں اور بعض کے منکر۔ بلکہ سب کو برحق سمجھتے ہیں اور سب کے مسلک ہدایت پر اللہ کی طرف سے ہونے کا یقین رکھتے ہیں) یہ مقولہ مومنین کا ہے۔ ای یقولون لانفرق (بیضاوی، مدارک) یہود کی طرح نہیں کہ بجز اپنی نسل یعنی اسرائیلی انبیاء کے اور کسی کو نہ مانیں اور ان میں سے بھی جس کا جی چاہے انکار کر دیں۔ یہاں تک کہ سلسلۂ اسرائیل کے خاتم (حضرت مسیحؑ) سے تو وہ عداوت رکھیں کہ اپنے خیال میں ان کی جان ہی لے ڈالیں۔ اور نہ نصرانیوں کی طرح کہ ایک اسرائیلی نبی کے ماننے میں تو وہ غلو کریں کہ پیمبری سے اٹھا کر الوہیت کے مرتبہ پر پہنچا دیں اور اسمٰعیلی شاخ سے پیمبری پانے والے سے عداوت ہی ٹھان لیں۔ انگریز ناول میں ایک مشہور مؤرخ گبن ہوا ہے۔ قرآن مجید اس کے نزدیک کلام الٰہی نہیں، کلام محمدؐ ہی ہے۔ بایں ہمہ اس آیت کی وسعت پر حیران ہو کر کہتا ہے:۔ محمدؐ کی وسیع المشربی نے اپنے پیش رووں کے لئے بھی وہی درجہ رکھا جو خود اپنے لئے اور ہبوط آدمؑ سے لیکر نزول قرآن تک سلسلۂ وحی کو قائم رکھا۔ (تاریخ زوال روم ۱۱۱۸ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا یعنی ہم نے اللہ کے پیام کو۔ اَطَعْنَا اطاعت کی ہم نے اللہ کے پیام کی۔ لَا نُفَرِّقُ۔ بعض اہل طریق نے اسی پر قیاس کر کے کہا ہے کہ اولیا و کاملین میں بھی یہ تفریق نہ کرنا چاہیئے کہ کسی سے اعتقاد رکھے اور کسی سے انکار کرے۔ (تھانوی، جلد ۵ ص) ۱۱۱۹ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا۔ یعنی وہ مغفرت جو تو ہی عطا کرے گا۔ اس میں رد آ گیا انصاریٰ اور دوسری قوموں کا۔ جو مغفرت کو عطیۂ الٰہی نہیں، بلکہ "ابن اللہ" یا کسی اور کی عنایت کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔

۱۲۰ لَا یُکَلِّفُ ۔ اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا احکام شرعیہ میں بجز ۔ الخ ۔ احکام شرعی کی قید لگا دینے سے امور تکوینی خارج ہو گئے ۔ ذمہ دار بنادینے سے مراد ہے اُن اعمال سے متعلق سوال و بازپرس ہونا ۔ اِلَّا وُسْعَهَا ۔
یعنی اس کے اختیار کے اندر ہوں ۔ گو بعض کسی قدر مشکل ہوں ۔ اس قید کے لگادینے سے وسوسہ اور خیالات غیر اختیاری سب حدِّ محاسبہ سے نکل گئے ۔ الوسع من القدرۃ ما یفضل عن قدر المکلف (رغب) قال لا یکلف
اللہ نفسا الا وسعہا تنبیہا انہ یکلف عبدہ ما ینوء بہ قدرتہ (راغب) الا طاقتہا وقدرتہا لان التکلیف لا یرد بفعل لا یقدر علیہ المکلف (مالک) الا ما تسعہ قدرتہا فضلا ورحمۃ (بیضاوی)
صوفیہ محققین نے اس آیت سے ایک سبق تو یہ لیا ہے کہ مجاہدہ میں طالب کی حالت کی رعایت رکھنا ضروری ہے ۔ اور دوسرا نتیجہ یہ نکالا ہے کہ تجلیات کا ورود و نزول بھی طالب کی طاقت و استعداد کے متناسب ہی ہوتا ہے ۔
اور اگر ان میں کبھی کمی ہو تو طالب کو تنگدل نہ ہونا چاہیئے ۔ ۱۲۱ یعنی اُس نیک عمل پر ثواب و جزا جو بندہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرے ۔ اور اس بدعمل پر عذاب و سزا جو بندہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرے ۔ یہ رد ہے
ہندی و بدھ مت کے عقیدۂ "کرم" کا یعنی انسان جو بھی کرے گا وہ لازمی نتیجہ ہو گا پچھلے جنم میں اس کے افعال و اعمال کا ۔ گویا اس قالب میں انسان اپنے ارادہ و اختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتا یہ جبریت کی انتہائی شکل ہے ۔ اور تناسخ اور عقیدۂ جبریت لازم و ملزوم ہیں ۔

نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا
مگر اس کی بساط کے مطابق ۱۲۰ اسے ملے گا وہی جو کچھ اُس نے کمایا اور اُسی پر پڑے گا
اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ
وہی جو کچھ اُس نے کمایا ۱۲۱ اے ہمارے پروردگار ہم پر گرفت نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں ۱۲۲
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى
اے ہمارے پروردگار ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا تُو نے ڈالا تھا اُن لوگوں پر جو
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ
ہم سے پیشتر تھے ۱۲۳ اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ نہ اُٹھوا جس کی برداشت
لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ
ہم سے نہ ہو ۱۲۴ اور ہم سے درگزر کر اور ہم کو بخشش دے ۱۲۵ اور ہم پر رحم کر تو ہی ہمارا
مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۞
کارساز ہے ۱۲۶ سو ہم کو غالب کر کافر لوگوں پر ۱۲۷

ع ۴۰ / ۸

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَا اٰيَةٍ وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا
مدنی ۲۰ رکوع ۲۰۰ آیتیں ۳۵۴۲ الفاظ ۱۵۳۳۱ حروف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ نہایت مہربان بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ نَزَّلَ
الف ۔ لام ۔ میم ۲ اللہ وہ ہے کہ کوئی خدا نہیں بجز اس کے ۳ زندہ (خدا) ہے ۴ سب کا سنبھالنے والا (خدا) ہے ۵

قرآن مجید نے اس فاسد عقیدہ پر ضرب لگائی اور بتایا کہ نیکی اور بدی کی راہیں تو انسان کے اپنے اختیار کی چیزیں ہیں ۔ اور
یہیں سے نصاریٰ کے عقیدۂ کفارہ کا بھی رد نکل آیا جس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو اب عمل صالح کی
ضرورت ہی نہیں ۔ ابن اللہ سب کی طرف سے بھینٹ چڑھ گئے ہیں اور سب کی نجات کا
سامان اُن کی مصلوبیت سے ہو گیا ہے ! ۱۲۲ یہ مومنین کو جامع و کامل دعا کی تعلیم ہو رہی ہے ۔
اِنْ نَّسِيْنَآ ۔ یعنی باوجود یاد رکھنے کی کوشش کے بھول جائیں ۔ اَخْطَاْنَا ۔ یعنی
باوجود عزم و اہتمام کے بھی چوک جائیں ۔ ۱۲۳ (اور جیسی جیسی آزمائشوں سے انہیں دوچار
ہونا پڑا ، وہ ہم پر نہ ڈال) عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۔ یعنی بعض سابق اُمتوں پر ۔ انجیل میں
پطرس حواری مسیح کا قول غیر اسرائیلی مسیحیوں کے باب میں نقل ہوا ہے کہ اب تم ان کی گردن پر ایسا
جوا رکھ کر جس کو نہ ہمارے باپ دادا اٹھا سکتے تھے نہ ہم ۔ خدا کو کیوں آزماتے ہو ؟ (اعمال ۱۵ : ۱۰)
گویا اسرائیلی شریعت ان کے حق میں ایسا سخت جوا تھا جو اٹھائے اُٹھ نہ سکتا تھا ۔ اِصْرًا
سے مراد ہے سخت حکم جو حدِّ بشری سے خارج تو نہ ہو لیکن اس کی تعمیل میں مشقت و کلفت زیادہ
پڑے ۔ استعیر للتکلیف الشاق (کشاف) والمراد بہ التکالیف الشاقۃ (روح)
قرآن مجید نے ضمناً اس مبالغۂ بیان کی بھی اصلاح کر دی اور یہ اشارہ کر دیا کہ گو وہ احکام سخت
ضرور تھے لیکن نہ ایسے کہ ان پر ناقابلِ برداشت ہونے کا اطلاق ہو سکے ۔ ۱۲۴ (نہ حوادث
تکوینی میں نہ احکام شرعی میں اور حق پرستی کو ہمارے لئے آسان کر دے) دعا کا یہ جزو کمال
عبدیت کا مظہر ہے ۔ شانِ رحمت کا اقتضاء تو خود ہی یہ ہے کہ ایسا بار ہم پر نہ ڈالا جائے گا لیکن
عقلاً اس کا امکان تو بہرحال تھا اور ہے ——— مالکِ کامل کو مملوک پر اور
خالق کو عبد پر اختیار و تصرف تو ہر وقت ، ہر طرح کا حاصل ہے ۔ ۱۲۵ (بلا کسی رکاوٹ
کے ۔ بغیر ادنیٰ شائبۂ سزا کے) عَنَّا ۔ ہم سے یعنی ہماری بھول چوک سے ۔ ۱۲۶ (ہر
عالم میں) وَارْحَمْنَا ۔ یعنی ہم پر رحمت کامل ہو دنیا اور آخرت دونوں میں ۔ ۱۲۷ (کہ یہ
دشمن ہیں تیرے دین اور تیرے آئین کے) فَانْصُرْنَا عَلَى ۔ نصر کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ
آتا ہے تو معنی غلبہ کے ہو جاتے ہیں ۔ اور غلبہ سے مراد دونوں میں بہ لحاظ دلائل و علوم
غلبۂ علمی و معنوی اور بہ لحاظ فتوحات جہاد ، غلبۂ مادی و ملکی ۔ ای فی محاربتنا معہم وفی مناظرتنا
بالحجۃ معہم وفی اعلاء دولۃ الاسلام علی دولتہم (کبیر)
سورۂ آلِ عمران ۔ ۱ عرب کا نقشہ سامنے ہو تو جنوب میں جو علاقہ یمن کے نام سے موسوم
ملے گا اس میں ایک مقام نجران کا ہے ۔ عہدِ نبوت میں یہاں مسیحیوں کی آبادی تھی ۔ سنہ ہجری میں
ان کے ۱۴ ۔ اکابر وفد کی صورت میں رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ آنحضورؐ نے دورانِ
گفتگو میں ان کے عقائدِ تثلیث و ابنیت کی لغویت ان پر پوری طرح واضح کر دی ۔ سورہ میں اشارے

جا بجا اس طرف ہیں ۔ سورۂ بقرہ میں خطاب جس طرح خاص طور پر یہود کی جانب تھا کہا جا سکتا ہے کہ اسی طرح اس سورۃ میں مسیحیوں کی جانب ہے ۔ بقرہ ہی کی طرح آلِ عمران کے فضائل بھی احادیث میں بکثرت وارد ہوئے
ہیں ۔ ۲ یہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں ۔ ان پر حاشیہ سورۂ بقرہ کے آغاز میں گزر چکا ۔ عجب نہیں جو یہ حروف مخفف ہوں فقرہ انا اللہ اعلم کے ۔ ۳ (نہ بحیثیت اقوم کے نہ کسی اور حیثیت سے) یعنی اُس خدائے واحد کا
شریک کوئی نہ ذات میں ہے نہ صفات میں نہ افعال میں ۔ دنیا میں بکثرت ایسے مشرک مذہبوں کا وجود رہ چکا ہے اور اب بھی ہے جو کہتے ہیں کہ خدائے اعظم تو بیشک ایک ہی ہے لیکن اس کے ماتحت شعبہ وار چھوٹے چھوٹے خدا دیوتا اور دیویاں
تو بہت سی ہیں ۔ قرآن مجید ان سب کی تردید کرکے کہتا ہے کہ نفسِ وجود ہی کسی دوسرے خدا کا نہیں ، نہ چھوٹے کا نہ بڑے کا ، الوہیت و ربوبیت تمامتر ایک ہی ذات میں ہے ۔ آیت علاوہ ان جاہلی مذاہب کے خاص طور پر مسیحی عقائد کے بھی رد
میں ہے ۔ ۴ اَلْحَيُّ ۔ وہ وہ خدا ہے جو ہمیشہ زندہ ہی ہے ۔ زندہ ہی رہا ہے اور زندہ ہی رہے گا ۔ موت کا اس کے لئے کوئی امکان ہی نہیں نہ صلیب کے اُوپر نہ کسی اور طرح پر ۔ اس کی حیات جس طرح آج قائم ہے ہمیشہ سے قائم ہے ۔ یہ نہیں
کہ اسے بار بار قالب بدلتے رہنے کی ضرورت پیش آئے کبھی وہ انسان بن جائے اور کبھی نعوذ باللہ حیوان ۔ وہ زندہ معاذ اللہ اس طرح کا نہیں کہ بہرحال اس پر موت طاری ہو گئے اور پھر وہ حیاتِ تازہ حاصل کرتا ہے ۔ الحی کے لفظ نے
اُس کی صفتِ حیات کا اثبات کرکے ان سارے خرافات کی تردید کر دی ۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ ۹۲۹ پارہ ہذا) اَلْقَيُّوْمُ ۵ وہ بذاتِ خود قائم ہے اور ساری مخلوقات اس کے وجود سے قائم ہے ۔ یہ نہیں کہ وہ خود بھی کسی معنی میں کسی دوسرے کا محتاج ہو
جیسا کہ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ :- "جس طرح بیٹا بغیر باپ کے تنہا خدا نہیں اسی طرح باپ بغیر بیٹے کے تنہا خدا نہیں ۔" (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۲ صفحہ ۴۵۸) گویا نعوذ باللہ ابن اللہ اور اللہ دونوں اپنی خدائی میں ایک
دوسرے کے محتاج ہیں ۔ صفت قیومیت کا اثبات کرکے قرآن مجید نے فرزندیٔ خدا کے عقیدہ کی جڑ ہی کاٹ دی ۔ بہت سے جاہلی مذہب ایسے بھی ہیں جو ایک طرف خدا کو خدا بھی مانتے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے بھی قائل
ہیں کہ وہ پیدا کسی اور سے ہے ۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ ۹۲۹ پارہ ہذا)

عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

اُس نے یہ کتاب آپ پر نازل کی ہے حق کے ساتھ ۵ اُن کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے آچکی ہیں ۶

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى

اور اُس نے اُتارا تھا توریت اور انجیل کو ۷ (اس سے) پیشتر لوگوں کی ہدایت کے

لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

واسطے ۸ اور اُس نے فرقان کو اُتارا ۸ بیشک جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں سے

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو

کفر کیا اُن کے لئے عذاب سخت ہے ۹ اور اللہ بڑا زبردست ہے بڑا بدلہ

انْتِقَامٍ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ

لینے والا ہے ۱۰ بیشک اللہ ایسا ہے کہ اس سے کوئی چیز چھپی نہیں رہتی نہ زمین میں

وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝ ھُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي

اور نہ آسمان میں ۱۱ وہ وہی (خدا) ہے جو تمہاری صورت رحموں کے اندر بناتا

الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ہے جس طرح وہ چاہتا ہے ۱۲ کوئی خدا نہیں بجز اسکے ۱۳ وہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے ۱۴

ھُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ

وہ وہی (خدا) ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے اس میں محکم آیتیں ہیں اور

مُّحْكَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا

وہی کتاب کا اصل مدار ہیں ۱۵ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں ۱۶ سو وہ

منزل

۵ اَنْزَلَ، نَزَّلَ سے مبالغہ ہے۔ تنزیل کا مصدر تنزیل ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید کیلئے بکثرت آیا ہے۔ بخلاف اَنْزَلَ (مصدر انزال) کے جو عموماً دوسری کتب آسمانی کے لئے آیا ہے۔ تَنْزِیْل میں تدریج اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر نازل ہونے کا تخیل تو موجود ہی ہے۔ القرآن نزل نجوماً شیئاً بعد شیئ والتنزیل مرۃ بعد مرۃ (قرطبی) لیکن عجب نہیں کہ اس کے مفہوم میں قرآن کا لفظ بلفظ، حرف بحرف نازل ہونا بھی شامل ہو۔ اور کچھ عجب نہیں جو اس کی سند آگے چل کر کسی محقق کو عربی لغت و زبان ہی سے ہاتھ آجائے۔ بِالْحَقِّ حق کے تحت میں حکمت بھی داخل ہے اور راستی بھی اور قوتِ دلائل بھی اور یہ لفظ ہزل کے مقابل بھی ہے۔ انہ قول فصل ولیس بالھزل (کبیر) نزل بالحق لا بالمعانی الفاسدۃ المتناقضۃ (کبیر) بالصدق وقیل بالحجۃ الغالبۃ (قرطبی)

۶ (کتب آسمانی میں سے) مُصَدِّقًا۔ قرآن نے بار بار صراحت کردی ہے کہ اس کا تعلق کتب قدیم سے تصدیق کا ہے۔ قرآن اجمالاً ان کے مضامین کی تصدیق و توثیق بھی کرتا ہے۔ یہیں سے اُن دشمنانِ دین کی نادانی بھی ظاہر ہوئی جاتی ہے جو کسی قرآنی بیان کے مثل کوئی مضمون توریت و انجیل وغیرہ کا اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا انہوں نے کوئی خاص انکشاف کیا ہے۔ اور (نعوذ باللہ) گویا قرآن کی بڑی چوری پکڑی ہے۔ ۷ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ توریت اور انجیل قرآن مجید کی اصطلاح میں دو مستقل آسمانی کتابوں کے نام ہیں۔ اور قرآن تصدیق انہی کی کرتا ہے۔ موجودہ بول چال میں توریت نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا جن میں سے ہر صحیفہ کسی نہ کسی نبی کی جانب منسوب ہے لیکن ان میں سے کسی ایک صحیفہ کی بھی تنزیل لفظی کا دعوٰی کسی یہودی کو نہیں۔ اسی طرح انجیل نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا جن میں حضرت مسیح سے متعلق مختلف گمنام اور بے نشان لوگوں کی جمع کی ہوئی حکایتیں، روایتیں اور ملفوظات ہیں، لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی مسیحیوں کے عقیدہ میں آسمانی نہیں۔ بلکہ مسیحی صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ مجموعہ حواریوں کے دور میں بلا ارادہ اور بلا توقع تیار ہوگیا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۳ صفحہ ۵۱۳ طبع چہاردہم) خوب سمجھ لیا جائے کہ ایسے بے سند "مقدس نوشتوں" کی تصدیق و توثیق کی ذمہ داری قرآن ہرگز نہیں لیتا اور موجودہ بائبل یعنی عہد عتیق و عہد جدید کا کوئی جزو بھی قرآن مجید کے ماننے والوں کی حجت نہیں۔ مِنْ قَبْلُ۔ یعنی قرآن سے قبل عہد موسوی اور عہد عیسوی میں اُن کی اُمتوں کے لئے۔ ۸ الفرقان فرقان اور فرق اصلاً ہم معنی ہیں بجز اس کے کہ فرق کے معنی تو محض اور مطلق امتیاز کے ہیں خواہ وہ کسی کے درمیان ہو۔ اور فرقان مخصوص اُس امتیاز کو کہتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان ہو۔ الفرقان ابلغ من الفرق لانہ یستعمل فی الفرق بین الحق والباطل (راغب) بعض کے نزدیک یہ اسم جنس ہے کل کتب آسمانی کے لئے۔ جنس الکتب السماویۃ (کشاف) ایک قول ہے کہ اس سے مراد معجزات و دلائل نبوت ہیں جو ہر پیمبر کو عطا ہوتے رہتے ہیں۔ والمختار عندی ان المراد من ھذا الفرقان المعجزات التی قرنہا اللہ تعالٰی بانزال ھذہ الکتب (کبیر) لیکن محققین کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ ھو القرآن انزل علی محمد وفرق بہ بین الحق والباطل (ابن جریر عن قتادۃ) المراد ھو القرآن (کبیر) ای القرآن (قرطبی) الفرقان ھھنا القرآن (ابن کثیر عن قتادۃ والربیع) ۹ (آخرت میں تو یقیناً اور دُنیا میں بھی احتمالاً) كَفَرُوْا۔ یعنی باوجود اس کے کہ اُن پر تبلیغ دین پوری طرح ہوچکی تھی، وہ کفر اختیار کئے رہے۔ اٰيٰتِ اللّٰهِ۔ سے مراد آیات قرآنی بھی ہوسکتی ہیں۔ اور نشانیاں بھی یعنی توحید کے دلائل و شواہد۔ ۱۰ خوب خیال رہے کہ سورہ کا اصل موضوع مسیحیت کی تردید ہے عموماً ایسی ہی صفات کا اثبات کیا گیا ہے جن سے مسیحیت ہی کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرب لگے۔ عَزِيْزٌ ہر سزا پر قادر ہے اور معاذ اللہ ہر حال میں سب سے بالادست و قوی تر ہے۔ وہ (معاذ اللہ) مسیحیوں کا خدا نہیں کہ انسانی قالب اختیار کرکے طرح طرح کی کمزوریوں اور بیچارگیوں کا شکار بن جائے اور دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوکر سُولی پر موت تک پاجائے۔ اس کی صفت عزیزیت اس تخیل ہی سے اِبا کرتی ہے۔ ذُوانْتِقَامٍ۔ وہ رحمٰن و رحیم و رؤف ہونے کے ساتھ عادل بھی ہے اور صفت معدلت کا اظہار مجرموں اور سرکشوں کے مقابلہ میں سزا و انتقام ہی سے ہوسکتا ہے۔ اسے سزا دینے میں ہرگز کوئی عار نہیں تاکہ اس عار سے بچنے کے لئے اُسے مصلوبیت اور کفارہ کے پیچ در پیچ راستے اختیار کرنے پڑیں۔ جن مذہبوں نے اپنے خدا کو صرف رحیم ہی رحیم مانا ہے ان کا خدا کامل نہیں ناقص ہے۔ ۱۱ جاہلی مذہبوں کے حکماء تک آخر جاہلی تھے! یونان کے نامی گرامی عقلاء و حکماء تک یہ کہہ گئے اور سکھلا گئے کہ علم باری صرف کلیات تک محدود رہتا ہے جزئیات کو محیط نہیں ہوتا۔ اور مسیحیوں نے خیر نبوت کی برکت سے کھلم کھلا اس عقیدہ کو تو نہ مانا، تاہم مرعوب اس حکیمانہ تعلیم سے اچھے خاصے ہے۔ قرآن مجید نے انکار کردیا کہ علم باری کا کمال نہیں، عین نقص ہوا علم باری ہر حیثیت سے کامل ہو اور چھوٹی بڑی ہر چیز پر حاوی۔ الْاَرْضِ وَالسَّمَاۗءِ۔ آسمان اور زمین کے نام اس سلسلہ میں اسلئے لے دیئے گئے کہ علم انسانی کی وسعتِ گرفت انہی حدود کے اندر محدود ہے۔ ضمناً خطاب مسیحیوں سے بھی ہے کہ تم جو مسیح کو خدا مانتے ہو تو بتاؤ ان کا علم کامل کہاں سے تھا اور خدا نے بندہ کی شکل اختیار کرکے کیسے اتنا بڑا نقص اپنے اندر گوارا کرلیا؟ ۱۲ (خواہ بغیر باپ کے بنائے خواہ باپ کی وساطت سے) قادر وہ ہر طرح اور ہر صورت پر ہے۔ باپ محض واسطۂ تخلیق ہوتا ہے اور خالق جس واسطہ کو جب چاہے ہٹادے۔ يُصَوِّرُكُمْ۔ میں خطاب عام ہے۔ سارے انسان مخاطب ہیں۔ فِي الْاَرْحَامِ۔ یعنی ماؤں کے رحم میں۔ اور حضرت مسیح کی صورت بھی رحم مادری میں بنی تھی۔ اُوپر ذکر اللہ کے علم کامل کا آچکا ہے۔ اب اشارہ اس کی قدرت کی طرف ہو رہا ہے کہ جس طرح اس کا علم کامل محیط کل و غیر محدود ہے اسی طرح اس کی قدرتِ تخلیق بھی غیر محدود و نامتناہی ہے۔ انسان کا اس کی حد بندی کی کوشش کرنا خود انسان کا جہل ہے۔ ۱۳ (ذات کے لحاظ سے و صفات کے) پھر یاد دلادیا کہ کون اس کے معاملاتِ تخلیق میں دخل دے سکتا ہے یا مشورہ کا حق رکھتا ہے وہ ذاتِ پاک ہر اعتبار سے یکتا، بے مثل اور بے مثال ہے۔ ۱۴ العزیز۔ عزیز پر حاشیہ ابھی گزر چکا۔ خدائے تعالٰی تخلیق کی ہر صورت پر یکساں قادر ہے۔ الْحَكِيْمُ۔ اسکی صفت حکمت کا اثبات ہے یعنی جو صورت جہاں قرین حکمت و مصلحت ہوتی ہے وہ وہی اختیار کرتا ہے۔ ۱۵ (اور وہی بطور معیار کے بن کر ان پر باقی کلام کو پیش کرنا چاہیئے) مُحْكَمٰتٌ۔ محکم قرآن مجید کی وہ واضح و صریح آیتیں ہیں جن کی دلالتیں متعین ہیں اور ان کے معانی میں کوئی خفاء و اشتباہ نہیں۔ المحکم ما لا یعرض فیہ شبھۃ من حیث اللفظ ولا من حیث المعنی (راغب) واضحۃ المعنی ظاھرۃ الدلالۃ محکمۃ العبارۃ محفوظۃ من الاحتمال والاشتباہ (روح) المحکمات فی آی القرآن ما عرف تاویلہ وفھم معناہ وتفسیرہ (قرطبی عن جابر بن عبداللہ والشعبی وسفیان الثوری) قال النحاس احسن ما قیل فی المحکمات ان المحکمات ما کان قائماً بنفسہ لا یحتاج ان یرجع فیہ الی غیرہ (قرطبی) فالمراد بہ اللفظ الذی لا اشتراک فیہ ولا یحتمل عند سامعہ الا معنی واحداً (جصاص) اُمُّ ہر شے کی اصل کو کہتے ہیں۔ یقال لکل ما کان اصلاً لوجود شیئ او تربیتہ او اصلاحہ او مبدئہ اُمٌّ (راغب) ای اصلہ والعمدۃ فیہ یرد الیہا غیرھا (روح) یہاں اس حقیقت کو بیان کردیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں بالکل واضح و صاف ہیں جن سے ایک ہی معنی نکلتے ہیں۔ وہی اصل مدار و معیار ہیں۔ دُوسری آیتوں کو جن کے کئی کئی معنی ہوسکتے ہیں۔ اُنہی پر پھر پیش کرنا چاہئے۔ فبین اللہ تعالٰی ان القرآن تشتمل علی محکم وعلی متشابہ والتمسک بالمتشابہات غیر جائز (کبیر)

والام هى التى منها ابتداءه واليها مرجعه فسماها اُمّاً فاقتضى ذلك بناء المتشابه عليها وردّه اليها (جصاص) **۱۶** مُتَشٰبِہٌ ایسے کلام کو کہتے ہیں جو دوسرے کلام سے ایسا ملتا جلتا ہو کہ باہم تفریق و تمیز مشکل ہو اور اس کی تعبیر و تفسیر میں مختلف پہلو نکلتے ہوں۔ ما اشکل تفسیرہ لمشابھتہ بغیرہ اما من حیث اللفظ او من حیث المعنی (راغب) واما المتشابہ فھو ان یکون احد الشیئین مشابھا للاٰخر بحیث یعجز الذھن عن التمییز (کبیر) انما المتشابہ فی ھذہ الاٰیۃ من باب الاحتمال والاشتباہ وقیل ان المتشابہ ما یحتمل وجوھا (قرطبی) المتشابھات لھن تصریف وتحریف وتاویل ابتلی اللہ فیھن العباد (قرطبی عن محمد بن اسحٰق) **۱۷** (اور محکمات سے قطع نظر کر لیتے ہیں)

اَلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ۔ کھلا ہوا اور براہِ راست اشارہ ہے مسیحیوں کی جانب جنہوں نے اپنے پیمبروں کی صاف و واضح و صریح ہدایاتِ توحید کو پس پشت ڈال کر ان کی بعض تشبیہات کو توڑ مروڑ کر اصل قرار دے لیا تھا لیکن الفاظ عام و وسیع ہیں۔ ہر کج رائے و کج رو، ہر زندیق و صاحبِ بدعت اس کے تحت میں آجاتا ہے۔ ھذہ الاٰیۃ تعم کل طائفۃ من کافر وزندیق وجاھل وصاحب بدعۃ وان کانت الاشارۃ بھا فی ذالک الوقت الی نصاریٰ نجران (قرطبی) ھم اھل البدع (مدارک) محققین نے اہلِ اسرار کے باب میں تصریح کر دی ہے کہ ان سے اگر ایسا کلام منقول ہو جو اپنی ظاہری صورت میں شریعت کے مطابق نہ ہو، تو سلامتی اس میں ہے کہ نہ اس کلام کے ظاہر کو قبول کیا جائے اور نہ اُن اشخاص ہی سے انکار کر دیا جائے۔ **۱۸** (تاکہ عقائد و احکام کے باب میں اس کلام سے اپنی گمراہیوں کی سند حاصل کریں) جن کے دلوں میں حق طلبی، حق جوئی و تلاش صداقت نہیں ہوتی وہ اس ادھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں کہ دین میں کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کریں اور بجائے اس کے کہ خود دین کی راہ پر چلیں، دین کو اپنی راہ پر چلانا چاہتے ہیں اور یہ لوگ نصوصِ کلامِ الٰہی کو توڑنے مروڑنے میں کوئی باک نہیں رکھتے، جیسا کہ آجکل بھی ہر فرقۂ باطل کی تاویلات میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ الفتنۃ ھٖ الکفر والضلال فی ھذا الموضع (جصاص)

اِبْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ۔ اس غلط تعبیری میں بھی یہ لوگ مخلص نہیں، مقصود ہی ان کا عوام مسلمین کو شورش میں ڈالنا اور وحدتِ دین میں رخنہ پیدا کرنا ہے۔ طلبًا للتشکیک فی القراٰن واضلال العوام کما فعلتہ الزنادقۃ والقرامطۃ (قرطبی) وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ۔ یعنی تاکہ اس کے غلط سلط معنی اپنی مرضی کے موافق تراش لیں۔ تاویل یہاں تحریف کے مُرادف ہے۔ ای تحریفہ علی ما یریدون (ابن کثیر) الاضافۃ فی تاویلہ للعھد ای بتاویل مخصوص وھو ما لم یوافق المحکم بل ما کان موافقا للمتشابہ (روح) والمراد منہ انھم یطلبون التاویل الذی لیس فی کتاب اللہ علیہ دلیل ولا بیان (کبیر) ای التاویل الذی یشتھونہ (مدارک) **۱۹** (اور وہی جس کو جتنا چاہے بتلا دے۔ چاہے نصوصِ قرآنی ہی سے اشارۃً یا دلالۃً یا اقتضاءً۔ چاہے اقوالِ رسولؐ سے صراحۃً) **۲۰** پس سارے کا سارا حق ہے۔ اور متشابہات کے معنی جو کچھ بھی ہوں بہرحال حق ہیں) الراسخون فی العلم یعنی علم دین میں پختہ اور صاحبانِ عقلِ سلیم۔ اکثر محققین کا مذہب یہ ہے کہ وقف تام وما یعلم تاویلہ الا اللہ پر ہے اور الراسخون فی العلم سے دُوسرا جملہ شروع ہوتا ہے جس کی خبر یقولون ہے قرطبی نے صحابہ و تابعین میں حضرت عائشہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عروۃ بن زبیرؓ، ابی بن کعبؓ اور عمرؒ بن عبدالعزیز کا اور ائمہ لغت و نحو میں کسائی اور اخفش اور فرآء اور ابو عبید کا مذہب یہی بتلایا ہے اور حنفیہ بھی عموماً اسی کے قائل ہوئے ہیں۔ وھو الذی ذھب الیہ الحنفیۃ (روح) والوقف عند الجمھور علی قولہ الا اللہ (مدارک) بلکہ اکثر صحابہ و تابعین اور محققین اہلِ سنت کا یہی مذہب ہوا ہے ھو مذھب الاکثرین من اصحاب رسول اللہ والتابعین واتباعھم خصوصًا اھل السنۃ وھو اصح الروایات عن ابن عباس (روح) رسوخ کے معنی مضبوط ہو جانے اور جم جانے کے ہیں۔ الرسوخ الثبوت فی الشیء وکل ثابت راسخ (قرطبی) تو اَلرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ وہ ہوئے جن کے دلوں میں دین کے حقائق ثبت ہو چکے ہیں۔ کل من عند ربنا خواہ اس کے بعض حصوں کے معنی بالکل ظاہر و واضح ہوں اور خواہ اس کے بعض حصوں کے مفہوم میں خفا و اشتباہ ہو تقدیر کلام یوں ہے۔ کلہ من عند ربنا اور کلہ میں ضمیر کتاب اللہ کی طرف ہے۔ **۲۱** (جو دین کے باب میں عقل و فہم سے کام لیا کرتے ہیں) بیان فہم سلیم رکھنے والوں کی عام ہے کہ ان لوگوں نے جب قرآن کے مجموعہ و کل کو کلامِ الٰہی مان لیا، تو اب اس کے کسی حصے سے متعلق بھی بے اعتقادی اور ریب دل میں نہیں لاتے۔ **۲۲** یعنی ہم کو اس صراطِ مستقیم پر قائم رکھ اور ہمارا حال کہیں یہود و نصاریٰ کا سا نہ ہو جائے، جو کتاب و نبوت کے بعد بھی گمراہ ہو گئے۔ یہ ساری دعا الراسخون فی العلم کی زبان سے

اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ
لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے (اسی حصہ کے) پیچھے ہو لیتے ہیں
مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ
جو متشابہ ہے شورش کی تلاش میں اور اس کے (غلط) مطلب کی تلاش میں حالانکہ کوئی
تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ
اس کا (صحیح) مطلب نہیں جانتا بجز اللہ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان
اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا
لے آئے (وہ) سب ہی ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول
الْاَلْبَابِ ۝ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا
کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کر بعد اس کے کہ تو ہمیں سیدھی راہ دکھا چکا
وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝
اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا کر بیشک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے
رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
اے ہمارے پروردگار بیشک تو (تمام) لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اس دن جس کے وقوع میں (ذرا) شک نہیں بیشک
لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ
اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں جاتا۔ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا۔ ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے
اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔـا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝
مقابلہ میں ان کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور یہی لوگ آگ کے ایندھن ہو گئے

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وقف لازم وقف منزل

ع ۱ / ۹

منزل

ہے۔ یعنی علم دین میں پختہ کاروں کی زبان سے۔ یہ لوگ اپنے رسوخ فی العلم اور پختہ کاری پر نازاں نہیں ہوتے بلکہ اس نعمت کے زوال سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔ مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً۔ انہیں خود اپنے کسی عمل پر ناز یا دعویٰ نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہتے کہ ہمیں ہمارے حسنِ عمل کے انعام میں راہِ راست پر قائم رکھ بلکہ کہتے ہیں کہ محض اپنے فضل و کرم لطف و عنایت سے راہِ ہدایت پر مستقیم رکھ۔ ای من عندک ومن قبلک تفضلًا لا عن سبب منا ولا عمل (قرطبی) گویا اس میں ادبِ دعا کی تعلیم بھی آگئی۔ رَحْمَةً کا صیغۂ نکرہ اس کی عظمت اور بڑائی کے لئے ہے۔ وتنوینہ للتفخیم (روح) **۲۳** (تو ایسے کے لئے اس درخواست کا قبول کر لینا مشکل کیا ہے) مفسر قرطبی نے کہا ہے کہ جاہل صوفیہ اور باطنیہ زنادقہ نے اس آیت سے یہ من گھڑت مسئلہ نکالا ہے کہ علم وہی ہے جو اللہ کی طرف سے محض وہبی ہو کسبی نہ ہو اور علم کتابی حجاب کے حکم میں ہے۔ **۲۴** (اس لئے قیامت کا آنا برحق اور بندوں کو اس کی یاد اور اس کا اہتمام ضروری) مومنین کاملین کی یہ دعائیں خوفِ آخرت سے ہوتی ہیں کسی مادی دنیوی غرض سے نہیں۔ جَامِعُ النَّاسِ یعنی لوگوں کی موت کے بعد اٹھانے والا اور اکٹھا کرنے والا۔ ای باعثھم ومحییھم بعد تفرقھم (قرطبی) **۲۵** (جیسا کہ بعض جاہل قوموں اور فرقوں نے گمان کر رکھا ہے) جاہلی قوموں کے عجیب عجیب معتقدات میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ خدا کے لئے جائز ہے کہ وعدہ کر کے بھول جائے یا وعدہ کا ایفاء اُسے خلافِ مصلحت نظر آئے اور اس لئے اُسے وہ ٹال جائے۔ اور افسوس ہے کہ بعض مسلمان کہلانے والے فرقوں نے ان خرافات میں ان کی تقلید شروع کر دی ہے۔ خلفِ وعید کا مسئلہ جو اہلِ سنت کے ہاں ہے وہ اس سے بالکل الگ ہے اور اس سے حق تعالیٰ کی شان میں کوئی منقصت نہیں نکلتی بلکہ عظمت و مکرمت کچھ اور بڑھ ہی جاتی ہے۔ **۲۶** اَلنَّارِ۔ یعنی آتشِ جہنم۔ جہنم کے عذاب آتشیں پر توریت و انجیل کے حوالے پارۂ اول میں گزر چکے۔ آیۂ کریمہ فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ کے تحت میں۔ مِنَ اللّٰهِ۔ یعنی عذابِ الٰہی کو دفع کرینگے۔ ای من عذاب اللہ (قرطبی) لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ۔ جاہلی قوموں کا ایک عقیدہ یہ بھی رہا ہے کہ اولاد اگر مرے ہوئے ماں باپ کی طرف سے دان پُن کر دے تو والدین کی نجات ہو جائے گی خواہ وہ ایمان سے محروم ہی دنیا سے اٹھے ہوں۔

۲۷ (مجرموں اور باغیوں کو) ذُو انْتِقَامٍ پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے۔ اُسے بھی ملاحظہ فرما لیا جائے۔ اللہ کوئی بے بس اور مجبور عاجز تو ہے نہیں کہ بندوں کو ہر طرح کے ظلم و عدوان کا مرتکب دیکھے اور پھر دم نہ مارے۔ وہ جب سزا دینے ہی پر آجاتا ہے تو سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ کوئی گرفت اس کی گرفت سے شدید تر و الیم تر نہیں۔ كَدَأْبِ ۔ دأب کے معنی حالت یا معاملہ کے ہیں۔ الدأب العادة والشأن (قرطبی) یہ تشبیہ بے سود ہونے میں ہے۔ گویا تاریخ سے استشہاد ہے کہ جس طرح ماضی میں فرعونیوں کے کام ان کا مال اولاد کچھ نہ آسکا اور عذاب الٰہی سے انہیں کوئی چیز نہ بچا سکی، اسی طرح ان کافروں کے حق میں بھی یہ سارے مادّی سہارے بالکل عبث و لاحاصل ثابت ہوں گے۔ اٰلِ فِرْعَوْنَ فرعون اور فرعونیوں پر مفصل حاشیے پارۂ اوّل میں گزر چکے۔ فرعونیوں کی ہلاکت کے ذکر میں ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ ان کی ہلاکت مسیحیوں کو مسلّم تھی اور سورہ کا روئے سخن خاص طور پر مسیحیوں ہی کی جانب ہے۔ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ یعنی وہ نافرمان قومیں جو عہدِ موسوی سے بھی قدیم تر ہوئی ہیں۔ اٰيٰتِنَا ۔ یہ نشانیاں خواہ آسمانی صحیفوں اور نوشتوں کی صورت میں ہوں یا معجزات و خوارق نبوت ہوں یا دلائل توحید ہوں۔ یحتمل ان یرید الآیات المتلوة ویحتمل ان یرید الآیات المنصوبة للدلالة علی الوحدانیة (قرطبی) اما المتلوة فی کتاب اللہ تعالیٰ او العلامات الدالة علی توحید اللہ تعالیٰ وصدق انبیآئه (ابن) فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۔ اور انہیں ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں مع ان کی ساری عظمت و شوکت کے نیست و نابود کر دیا۔ خطاب دین حق سے بغض و عناد رکھنے والوں سے رسول کے واسطے سے ہے۔ ۲۸ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ کا تعلق تو ظاہر ہے کہ آخرت ہی سے ہے۔ سوال آیت کے وعید اوّل ستغلبون سے متعلق ہے کہ دشمنانِ دین کی اس مغلوبیت و مقہوریت کا تحقق کہاں ہوگا؟ آخرت میں تو خیر ہو ہی گا لیکن آیا اس کے قبل اہل حق کے ہاتھوں اس دنیا میں بھی؟ اہل تفسیر نے بالاتفاق اس کا جواب اثبات میں دیا ہے اور تصریح کی ہے کہ اس کا وقوع عنقریب اس دنیا میں ہوگا۔ چنانچہ ہوا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ باقی یہ کہ اس سے کافروں کا کون سا گروہ متعین طور پر مراد ہے، بعض نے پیشگوئی کا مصداق بدر میں حکومتِ مکہ کی ہزیمت کو ٹھہرایا ہے۔ المراد مشرکی مکة (معالم عن مقاتل) قل لمشرکی مکة ستغلبون یعنی یوم بدر (بیضاوی) قیل نزلت فی قریش قبل بدر بسنتین (کبیر) لیکن اکثر نے مدینہ میں یہود کے پر قوت جتھوں اور جرگوں کی شکست و پامالی مراد لی ہے۔ یعنی الیہود ای [illegible] (قرطبی عن ابن عباس) فالمراد من الموصول الیہود (روح) سَتُغْلَبُوْنَ میں س قربِ وقوع کے لیے ہے یعنی اس دنیا میں اس کا مشاہدہ ہو کر رہے گا۔ والسین لقرب الوقوع ای تغلبون عن قریب واُرید منه فی الدنیا (روح) لیکن بہتر یہ ہوگا کہ لفظ کے اطلاق کو عام رکھا جائے اور یہود و مشرکین جو بھی رسول اللہ صلعم کے بعد میں مسلمانوں کے ہاتھ خوار و مغلوب ہوئے، سب کو آیت کا مصداق یکساں ٹھہرایا جائے۔ والظاهر ان الذین کفروا ایم الفریقین المشرکین والیهود وکل قد غلب بالسیف والجزیة والذلة و ظهور الدلائل والحجج (بحر) بہرحال قرآنی پیشگوئی کا اعجازی رنگ ہر صورت میں عیاں ہے۔ نزول آیت کے وقت مسلمانوں کی بے بسی بے سرو سامانی و زبوں حالی دیکھ کر کوئی بھی انسانی دماغ یہ پیشگوئی نہیں کر سکتا تھا کہ حکومتِ مکہ یا دولتِ یہود کسی سے بھی یہ ایسی زبردست ٹکر لے سکتے ہیں۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا

جیسا کہ معاملہ فرعون والوں کے ساتھ ہوا اور ان سے قبل والوں کے ساتھ انہوں نے ہماری

بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ

نشانیوں کو جھٹلایا سو اللہ نے ان کی گرفت کی ان کے گناہوں کے باعث اور اللہ بڑا سخت سزا

الْعِقَابِ ۝۱۱ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ

دینے والا ہے ۲۷ آپ ان کفر والوں سے کہہ دیجیے کہ تم عنقریب مغلوب کیے جاؤ گے ۲۸ اور جہنم کی طرف

اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۲ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ

اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے ۲۹ بیشک تمہارے لیے ایک نشانی ان دو گروہوں

فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى

میں ہے جو باہم مقابل ہوئے ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا

كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ

کافر تھا یہ اپنے کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے ان (یعنی مسلمانوں) کو کئی گنا ۳۰ اور اللہ اپنی

بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۤءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳

نصرت سے جس کی چاہتا ہے مدد کر دیتا ہے ۳۱ بیشک اس واقعہ میں اہل بصیرت کیلئے بڑا سبق ہے ۳۲

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ

لوگوں کے لیے خوشنما کر دی گئی ہے مرغوبات کی محبت (خواہ) عورتوں سے ہو یا بیٹوں سے

وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ

یا ڈھیر لگے ہوئے سونے اور چاندی سے

۲۹ (میدان بدر میں سنہ ۲ ہجری میں) اٰيَةٌ ۔ نشان اللہ کی قدرت و کارسازی اور رسول اللہ صلعم کی صداقت کا۔ فِيْ فِئَتَيْنِ یعنی دو گروہوں کے واقعہ میں، ایک گروہ مومنین بے سرو سامان، دوسرا گروہ مشرکین با سرو سامان کا۔ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ یہ گروہ مومنین کا تھا، تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر۔ تعداد میں کل ۳۱۳ تھے اور وہ بھی بغیر سامان حرب کے۔ اونٹ اتنے کم کہ چار چار پیادوں کے حصہ میں ایک ایک پڑتا تھا۔ گھوڑے لشکر بھر میں کل دو۔ آہنی زرہیں اتنے آدمیوں میں کل سات۔ وَّاُخْرٰى كَافِرَةٌ ۔ یہ لشکر حکومت مکہ کا تھا۔ تعداد میں مسلمانوں سے سہ چند تھا، یعنی ۹۵۰ افراد پر مشتمل۔ قریش کے بہترین سرداروں کے زیر قیادت اور ہر ضروری سامان سے آراستہ۔ شتر سوار اُن میں ۔۔ تھے اور سب سوار زرہ پوش ۔۔ تھے۔ ۳۰ لیکن کثرت تعداد پھر بھی کچھ کام نہ آئی اور آخرکار ذلّت شکست لشکر مکہ ہی کو نصیب ہوئی۔ يَرَوْنَهُمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۔ یعنی محض وہم و خیال نہ تھا بلکہ واقعہ مشاہدہ کر رہے تھے۔ رؤیہ آیت میں رویت چشم کیلئے ہے۔ قال ابو علی الرؤیة فی الآیة رؤیة عین ولذلك تعدت الی مفعول واحد (قرطبی) یعنی رؤیة ظاهرة مکشوفة (کشاف) يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ ۔ کون کس کو کتنا دیکھ رہے تھے؟ سوال کے جواب یا ضمیروں کی تعیین میں اہل تفسیر کے درمیان شدید اختلاف ہے، اور بالکل بلادلیل قول کسی کا بھی نہیں ہے۔ اسلم و احوط قول مفسر تھانوی کا نظر آتا ہے جنہوں نے یرونهم میں فاعل اور مفعول دونوں کی ضمیریں کافروں کی طرف پھیری ہیں، اور مثلیهم میں هم سے مراد مومنین سے لی ہے۔ مِثْلَيْهِمْ سے مراد دو چند بھی لی گئی ہو اور سہ چند بھی اور مطلق کثرت تعداد بھی بغیر کسی عدد خاص کے تعیین کے۔ نحو الفراء ان معنی یرونهم مثلیهم ثلاثة امثالهم ... المراد بالمثلین مطلق الکثرة لا خصوص المثلین (جمل) ۳۱ (چنانچہ اس موقع پر اس کی مشیت نصرت مومنین سے متعلق ہوگئی اور کافروں کے کام مادّی تیاریاں آسکیں نہ کثرت تعداد) مَنْ يَّشَاۤءُ ۔ اس کی تائید اس عالم ابتلاء میں مصالح تکوینی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ ۳۲ (یعنی یہ درس ہدایت کا ان لوگوں کیلئے ہے جو بصیرت سے کام ہی لیتے رہتے ہیں۔ لَعِبْرَةً ۔ تنوین عظمت کے لیے ہے یعنی ہدایت و بصیرت کا بہت بڑا سبق۔ التنوین للتعظیم ای عبرة عظیمة کائنة (روح)

۳۳ اور انہی کی محبت کثر افراد میں حدود جائز سے تجاوز کر کے معصیت کا سبب بن جاتی ہے۔ حُبُّ الشَّهَوٰتِ - شهوات یہاں مشتهیات کے معنی میں ہے یعنی مرغوب و دلپسند چیزیں۔ وقد یسمی المشتھی شھوة (راغب) جعل الاعیان التی ذکرھا شھوات مبالغة کونھا مشتھاة (کشاف) مِنَ النِّسَآءِ الخ ان مرغوبات کے نام صرف مثال اور نمونہ کے طور پر لے دیے گئے ہیں۔ ان میں حصر مُراد نہیں۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ۔ یہ صراحت ہے اس باب میں کہ انسان کی نظر میں ان چیزوں کی رغبت و کشش بطور امر طبعی کے ہے۔ اور بذاتِ خود معصیت نہیں۔ انسان ان کے شوق کے ازالہ کا مکلف نہیں صرف انہیں عقلِ سلیم و احکامِ شریعت کے ماتحت کر کے رکھنا چاہیے۔ ۳۴ (سو اس حقیقت کو سمجھ کر ان کی محبت جائز حدود کے اندر محدود رکھنی چاہیے) مَتَاعُ کہتے ہی اس چیز کو ہیں جس سے کسی حیثیت سے کچھ مدت کے لئے نفع حاصل کیا جائے۔ کل ماینتفع بہ علی وجہٍ ما فھو متاع (راغب) والمتاع انتفاع ممتد الوقت (راغب) مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مقصود یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی ساری چیزیں بہت زیادہ دل لگانے کے قابل نہیں۔ البتہ دنیوی زندگی برتنے میں مفید و معین یقیناً ہیں۔ سو ان کی قدر اسی حد تک کرنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ یہ مقاصدِ حیات بن جائیں۔ دُنیا خود ہی فانی ہے اور اُس کے یہ سارے ساز و سامان بھی فانی۔ والمعنی تحقیر امر الدنیا والاشارة الی فنائھا وفناء مایستمتع بہ فیھا (بحر)

وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذٰلِكَ
یا نشان پڑے ہوئے گھوڑوں سے یا مویشیوں سے یا زراعت سے ۳۳ یہ سب (دنیوی)
مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾
زندگی کے سامان ہیں ۳۴ اور حُسنِ انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے ۳۵
قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا
آپ کہئے کہ کیا میں تمہیں ایسی چیز کی خبر دوں جو ان (چیزوں) سے کہیں بہتر ہے ۳۶ جو لوگ ڈرتے
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
رہتے ہیں ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس باغ ہیں کہ ان کے نیچے نہریں پڑی بہہ رہی ہیں ان میں
فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ
وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ۳۷ اور صاف ستھری کی ہوئی بیویاں ہونگی ۳۸ اور اللہ کی خوشنودی ہوگی ۳۹ اور اللہ
بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا
اپنے بندوں کا خوب دیکھنے والا ہے ۴۰ (یہ وہ لوگ ہیں) جو کہتے رہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم یقیناً ایمان
فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَ
لے آئے سو معاف کر گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے ۴۱ (یہ) صبر کرنے والے
الصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ
ہیں اور راستباز ہیں اور فروتنی کرنے والے ہیں اور خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی رات میں گناہ کی
بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
بخشش چاہنے والے ہیں ۴۲ اللہ کی گواہی ہے کہ کوئی معبود نہیں ہے بجز اس کے اور فرشتوں

۳۵ (سو دائمی اور غیر فانی راحت کے لئے فکر و اہتمام صرف اللہ کی رضا کا رکھنا چاہیے اس کے آگے دنیا کی آنی و فانی بڑی سے بڑی لذت بھی بے بساط ہی ہے) ومعنی الاٰیة تقلیل الدنیا وتحقیرھا والترغیب فی حسن المرجع الی اللہ فی الاٰخرة (قرطبی) ۳۶ (کیا بہ لحاظ کیفیت کیا بلحاظ کمیت اور کیا بہ لحاظ قیام و دوام) خطاب عام انسانوں سے ہے۔ رسول علیہ السلام کے واسطہ سے ہے۔ ذٰلِكُمْ - یعنی یہ چیزیں جو سرتاسر بے ثبات و بے حقیقت ہیں۔ ۳۷ الذین اتقوا یعنی جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں۔ خوفِ خدا پر رحمتِ الٰہی کے مرتب و متوجہ ہونے کا ذکر قرآن مجید ہی میں نہیں اگلے صحیفوں میں بھی بار بار آیا ہے۔ چنانچہ توریت کے حوالہ پارۂ اوّل کے حواشی میں گزر چکے۔ مسیحیوں کے مقدس نوشتے بھی خوف و خشیت کے ذکر سے خالی نہیں۔ "اور اس کا رحم اُن پر جو اس سے ڈرتے ہیں پُشت در پُشت رہتا ہے (لوقا ۱: ۵۰) "اور آؤ اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی آلودگی سے پاک کر دیں اور خدا کے خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں"۔ (۲-کرنتھیوں ۷: ۱) "وہ وقت آپہنچا ہے کہ بڑے بڑے نبیوں اور مقدسوں اور اُن چھوٹے بڑوں کو جو تیرے نام سے ڈرتے ہیں، اجر دیا جائے۔"

۳۸ (اُن کے لئے جنت میں) مُطَهَّرَةٌ - پاک صاف کی ہوئی ہر جسمانی آلودگی و نجاست سے۔ قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ اہلِ جنت کے لئے راحت و لذت کا سامان ہر قسم کا ہوگا مادی لُطف کا بھی، ذہنی لطف کا بھی، رُوحانی لُطف کا بھی، پھر اگر انہیں وہاں بیویاں بھی عنایت ہوں، ہر طرح پاک صاف اور لُطفِ ازدواجی بھی پوری طرح اٹھانے کا موقع ملے تو اس میں "روشن خیالی" کے شرمانے کی کونسی بات ہے؟ ۳۹ (جو حاصل اور عطر ہے ساری نعمتوں و لذتوں، راحتوں کا) رِضْوَانٌ - کی تنوین اظہارِ عظمت کے لئے ہے) ای رضا عظیم علی مایشعر بہ التنوین (روح) ۴۰ (اور ان کے احوال، اقوال، اعمال کے ایک ایک جزئیہ سے پوری طرح خبردار ہے) پس اس کا احتمال ہی نہیں کہ کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی حساب یا صدورِ جزا سے رہ جائے۔ ۴۱ یہ کہنے والے کون ہیں؟ وہی ہو سکتے ہیں جن کا ذکر الذین اتقوا کے ماتحت چل رہا ہے۔ یہ اپنے اعمال و احوال پر نازاں ہونا الگ رہا اُلٹے فرطِ خشیت و ہیبت سے اپنی مغفرت و حُسنِ خاتمہ کے لئے مناجات کرتے رہتے ہیں۔ اٰمَنَّا - یعنی ہم اللہ اور اس کے رسُول اور اس کی شریعت پر ایمان لے آئے۔ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا - ایمان پر معاً طلبِ مغفرت کو مرتب کرتے ہیں نکتہ یہ ہے کہ مغفرت میں اصل حائل عدمِ ایمان ہی تو ہوتا ہے۔ جب یہ مانع رفع ہو گیا تو اب کیا ہے۔ اب ہماری باقی خطاؤں، لغزشوں کو تو معاف کر ہی دیجیے۔ ایمان بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی انتہائی اہمیت اس آیت سے ظاہر ہو رہی ہے۔ امام المفسرین امام رازیؒ نے اس مقام پر بہت خوب تقریر کی ہے۔ ذٰلك یدل علی انھم توسلوا بمجرد الایمان الی طلب المغفرة واللہ تعالیٰ حکی ذٰلك عنھم فی معرض المدح لھم والثناء علیھم فدل ھذا علی ان العبد بمجرد الایمان یستوجب الرحمة والمغفرة من اللہ تعالیٰ (کبیر) اور انہی کی پیروی صاحبِ بحر و صاحبِ روح نے بھی کی ہے۔ ۴۲ بِالْاَسْحَارِ - سحر نام اس وقت کا ہے جب رات کی تاریکی صبح کی روشنی سے مل رہی ہو۔ السحر والسحرة اختلاط ظلام اٰخر اللیل بضیاء النھار وجعل اسماً لذٰلك الوقت (راغب) آخرِ شب کی خصوصیت اس لئے ہے کہ وہ وقت خاص طور پر دلجمعی اور روحانی قویٰ کی بیداری و بالیدگی کا ہوتا ہے اور نفس پر اس وقت کا اشاق بھی زاید ہوتا ہے۔ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ - یعنی صبر کرنے والے اور راستی برتنے والے اپنے سارے معاملات میں۔ اَلْقٰنِتِيْنَ - یعنی فروتنی کرنے والے اللہ کے حضور میں۔ اَلْمُنْفِقِيْنَ یعنی خرچ کرنے والے اللہ کی راہ میں۔ عارفوں نے کہا ہے کہ یہ تمام صفات اولیاء اللہ کے ہوتے ہیں۔

وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ

اور اہل علم کی (بھی گواہی یہی ہے)[۴۳] اور وہ عدل سے انتظام رکھنے والا[۴۴] ہے کوئی معبود نہیں بجز اس

الْحَكِيْمُ ؕ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَ مَا اخْتَلَفَ

زبردست حکمت والے کے[۴۵] یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے[۴۶] اور جو اختلاف کیا

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ

اس میں اہل کتاب نے سو وہ آپس کی ضد سے کیا بعد اس کے کہ انہیں صحیح علم

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ

پہنچ چکا تھا[۴۷] اور جو اللہ کی آیتوں سے انکار کرے گا سو اللہ یقیناً جلد حساب

الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ

لینے والا ہے[۴۸] پھر اگر یہ لوگ آپ سے حجت کئے جائیں[۴۹] تو خیر آپ کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رخ اللہ کی طرف

مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ

کر چکا اور جو میرے پیرو ہیں وہ بھی[۵۰] اور آپ اہل کتاب سے اور امیوں سے دریافت کیجئے کہ تم

ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا

اسلام لاتے ہو[۵۱] سو اگر وہ اسلام لے آئے تو بس راہ ہدایت پر آ گئے[۵۲] اور اگر وہ روگردان رہے

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

تو آپ کے ذمہ تو صرف تبلیغ ہی ہے[۵۳] اور اللہ اپنے بندوں کا خوب دیکھنے بھالنے والا ہے[۵۴] بیشک جو لوگ

يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ

اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر ڈالتے

النصف

ع ۲
۱۰

۴۲ (اسلئے شرک ہر درجہ اور نوعیت کا باطل ہے) شَهِدَ اللّٰهُ ۔ اللہ کی یہ گواہی کتب آسمانی سے بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ اور صحیفۂ کائنات سے بھی۔ ومن وحدانیۃ بنصب الدلائل الدالۃ علیھا وانزال الآیات الناطقۃ بھا۔ (بیضاوی) کتب الٰہی کی شہادت دلیل نقلی کا حکم رکھتی ہے اور مصنوعاتِ فطرت کی دلالت دلیل عقلی کا۔ اَلْمَلٰٓئِكَةُ ۔ یہ وہی مخلوق ہے جسے کہ مشرک قومیں دیوتا کا لقب دے کر شریک خدائی سمجھ رہی ہیں۔ اُولُوا الْعِلْمِ ۔ "علم" سے مراد علم حقائق ہے نہ کہ علوم دنیوی۔ محققین نے آیت سے علماء کا خاص شرف و فضل نکالا ہے۔ فی ھذہ الآیۃ دلیل علی فضل العلم وشرف العلماء فانہ لو کان احد اشرف من العلماء لقرنھم اللّٰہ باسمہ واسم ملٰئکتہ کما قرن اسم العلماء (قرطبی) ۴۳ (ساری کائنات کا) قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۔ عدل سے مراد ہے کہ ہر شے اپنے محل مناسب میں ہو بعض جاہل قوموں نے خدا کا وجود تو تسلیم کیا ہے لیکن وجود معطل یا ایسی صفات سے موصوف ہے جو کمالاتِ الٰہیہ کے منافی ہیں۔ اسلام کا خدا، خدائے معطل نہیں، منتظم ہے، کارساز ہے، ہر ایک کا اور ہر کام بنانے والا ہے۔ ۴۵ اَلْعَزِيْزُ ۔ وہ جس کی قوت سب پر غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں۔ اَلْحَكِيْمُ ۔ وہ جس کی حکمت سب سے بڑھی ہوئی ہے دونوں صفات کے اثبات سے مقصود یہ ہے کہ اُسے نہ قوت کے لحاظ سے اور نہ علم و حکمت سے کسی شریک کی ضرورت ہے۔ ۴۶ (نہ کہ مطلقاً ہر وہ چیز جسے دین کے نام سے موسوم کر دیا جائے) یہ رد ہے بادشاہ اکبر اور دوسرے بددینوں کے اس عقیدہ کا، کہ ہر دین دینِ حق ہے؛ اور ہر مسلک خدا ہی کی راہ ہے۔ اور دَیر و حرم، کفر و ایمان میں فرق محض لفظی و اصطلاحی ہے۔ خطِ مستقیم حقیقت یہ ہے کہ دو نقطوں کے درمیان صرف ایک ہی ممکن ہے باقی سب خطوط منحنی و کج ہو گئے، راہِ مستقیم خدا اور بندے کے درمیان صرف ایک ہی ہے۔ اور اسلام ہے جو انبیا سوا دیانِ حق کا دین ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ الدِّيْنَ یعنی دینِ مقبول الدین اور الاسلام دونوں کا معرفہ ہونا حصر کے معنی دے رہا ہے یعنی دین مقبول صرف یہی ہے۔ وتعریف الجزئین للحصر ای لا دین مرضی عند اللّٰہ تعالیٰ سوی الاسلام (روح) ۴۷ (نہ کہ کسی اجتہادِ فکری اور اختلاف فہم کی بنا پر) یہاں پھر ایک بار اسے کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اہل کتاب کا راہِ حق سے انحراف کسی خطاء اجتہادی کی بنا پر نہیں، نفسانیت و ہواپرستی کی بنا پر ہے۔ یہود پہلے سے یہی کہتے چلے آ رہے تھے کہ راہِ حق ہماری راہ ہے۔ اس لئے کہ فلاں فلاں بزرگ ہمارے مورث ہوتے ہیں۔ اور سرورِ کائنات کے زمانہ میں بھی اُن کا کہنا یہ تھا کہ نبوت تو اسرائیلیوں کا حق رہی ہے۔ یہ نعمت ایک اسمٰعیلی کے حصہ میں کیونکر جا سکتی ہے؟ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۔ یعنی نفسانفسی اور ضدم ضدی آپس میں بھی اور دینِ حق سے بھی۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ یعنی ان پر دینِ حق کی تبلیغ پوری طرح ہو چکی اور دینِ برحق کی حقانیت و صداقت کے دلائل واضح انہیں پہنچ چکے۔ ۴۸ (اور حساب کا جو انجام منکرین و معاندین کے حق میں ہونے والا ہے، بالکل ظاہر ہے) ۴۹ (خوامخواہ ازراہِ عناد اور پوری تبلیغ کے بعد بھی) اشارہ اہل کتاب کی جانب عموماً ہوا اور نصرانیوں کی جانب خصوصاً۔ حَآجُّوْكَ ۔ ای جادلوک بالاقاویل المزورۃ والمغالطات (قرطبی) ۵۰ (اب تم مانو یا نہ مانو۔ تمہیں اختیار ہے) اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ ۔ پورا رُخ اللہ کی جانب کر لینا مرادف ہے اسلام کے یعنی میں اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر چکا۔ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ میں ہو سکتا ہے کہ وعطف کا نہ ہو، بلکہ مع کا مرادف ہو۔ (ویجوز ان یکون الواو بمعنی مع (کشاف) اہل طریق نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جب وضوحِ حق کی پوری کوشش ہو لے اور مخاطب پھر بھی قبول نہ کرے تو اب بحث و مباحثہ قیل و قال ترک کر دینا چاہیے۔ ۵۱ ءَاَسْلَمْتُمْ کے ایک صاف اور صریح معنی تو وہی ہیں جو متن ترجمہ میں درج ہو چکے ہیں لیکن بعض اہل علم نے صیغۂ امر میں معنی "اسلام لاؤ" کے بھی لئے ہیں۔ اور نحویین نے کہا ہے کہ الف استفہام کبھی امر کے بھی معنی دیتا ہے۔ بلکہ امر کے معنی میں زور اور زیادہ پیدا کر دیتا ہے۔ المقصود منہ الامر (کبیر) قال النحویون انما جاء الامر فی صورۃ الاستفہام (کبیر) استفہام کی صورت میں بھی استفسار محض مراد نہیں بلکہ مقصود تہدید ہے جیسے اُردو محاورہ میں بھی تہدید کے موقع پر کہتے ہیں "کیوں جی۔ سنتے ہو کہ نہیں"۔ قال الزجاج ء اسلمتم تھدید وھذا احسن لان المعنی ء اسلمتم ام لا (قرطبی) وَ الْاُمِّيّٖنَ ۔ مطلقاً اَن پڑھ یا کتب سماوی سے لاعلم و نابلد، مراد ہر صورت مشرکین مکہ ہیں۔ الامی ھو الذی لا یکتب ولا یقرء من کتاب (راغب) ای الذین لا کتاب لھم (ابن جریر) الذین لا کتاب لھم وھم مشرکوا العرب (قرطبی) ۵۲ (اور اب ان کی نجات و مغفرت میں بھی شبہ نہ رہا) جاہلیت کے نظریۂ حیات (Ideology.) میں اصلاح و تبدیلی ہی کا نام اسلام ہے پس جس نے بھی اسلام کے نظریۂ حیات کو قبول کر لیا وہ کسی بھی نسل، قوم، رنگ، وطن کا ہو بہرحال اب اس کا تعلق کائنات و خالقِ کائنات کے ساتھ صحیح نوعیت کا قائم ہو گیا۔ ۵۳ (آپ پر نتائج کی ذمہ داری ذرا بھی نہیں) رسول اللہ صلعم کو تسکین دی گئی ہے کہ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو آپ ملول و فکرمند نہ ہوں۔ آپ کا کام تو صرف تبلیغ ہے۔ ۵۴ (وہ خود ہی سب کے اعمال و احوال دیکھ کر مناسب جزا و سزا دے گا)

۵۵ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ۔ کسی کتاب الٰہی سے یا اس کے کسی جزو سے انکار یہ سب کفر بآیات اللہ کی صورتیں ہیں۔ بِغَیْرِ حَقٍّ۔ یعنی خود قاتلوں کے بھی آئین، قانون و ضابطے کے خلاف ورنہ قتل انبیاء فی الحقیقت اور عند اللہ تو ہمیشہ ہی ناحق رہیگا۔ یہود کے قتل انبیاء اور قتل ناحق پر حاشیہ پارۂ اول رکوع ۷ میں گزر چکا۔ ۵۶ (آخرت میں) یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ۔ یعنی لوگوں کو اخلاق و معاملات میں عدل کی ہدایتیں کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ مراد انبیاء، اور ان کے نائبین ہیں۔ یَقْتُلُوْنَ۔ یہ سب اشارے یہود کی حق دشمنی سے متعلق اور ان کی تاریخ کی جانب ہیں۔ عہد عتیق کے متعدد صحیفوں میں یہود کی حق بیزاری کی تصریح موجود ہے۔ مثلاً "وہ اس کا کینہ رکھتے ہیں جو دروازہ پر سرزنش کرتا ہے اور وہ اُس سے نفرت رکھتے ہیں جو حق بات کہتا ہے۔" (عموس۔ ۵ : ۱۰) عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ ایسے مجرموں اور خطاکاروں پر دنیوی لعنت حضرت داؤد نبی کی کتاب میں مفصل موجود ہے:۔ "وہ جلد ہی گھاس کے مانند کاٹ ڈالے جائیں گے اور ہرے سبزے کی طرح مرجھا جائیں گے اور شریر نہ ہوگا تو غور کرکے اس کا مکان ڈھونڈے گا اور وہ نہ ہوگا۔ اُن کی تلوار اُنہی کے دلوں میں پیٹھے گی۔ انکی کمانیں ٹوٹ جائیں گی۔" الخ (زبور ۳۷ : ۱۰۔ ۳۰) آیت سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ سابق اُمتوں میں امر بالمعروف واجب تھا اور یہ فرض انبیاء اور ان کے نائبین انجام دیتے تھے۔ و دلت ھٰذہ الاٰیۃ علی ان الامر بالمعروف و النھی عن المنکر کان واجبا فی الامم المتقدمۃ و ھو فائدۃ النبوۃ (قرطبی) ۵۷ (سزا کے وقت کہ انہیں عذاب سے چھڑا لے۔ یا اس میں کچھ تخفیف ہی کرا دے) ۵۸ حق و داعیانِ حق سے یہ مسلسل انحراف و اعراض تاریخ بنی اسرائیل کا کوئی نیا انوکھا واقعہ نہیں۔ ان کے مقدس نوشتے اور صحیفے ان شکایات سے بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً:۔ "تم کا ہے کو مجھ سے حجت کروگے۔ تم سب مجھ سے پھر گئے ہو" (یرمیاہ ۔ ۲ : ۲۹۔ ۲۸ نیز ہوسیع ۱۰ : ۱) مفصل حاشیے پارۂ اول رکوع ۶، ۷ کے ذیل میں گزر چکے۔ اَلَمْ تَرَ۔ خطاب یہاں رسول اللہ صلعم سے ہے۔ مِّنَ الْکِتٰبِ۔ ذکر وہی یہود کا چل رہا ہے۔ الکتاب یہاں بطور اسم جنس استعمال ہوا ہے یعنی کتاب الٰہی اپنے عمومی و کلی مفہوم میں۔ اور اسی کا ایک جزء توریت ہے۔ کِتٰبِ اللّٰہِ۔ اسی عمومی و کلی کتاب کا دوسرا جزء قرآن ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ یعنی مذہبی اختلافات کے باب میں فیصلہ کرے۔ ۵۹ ذٰلِکَ یعنی یہ سرکشی اور عُدوان کی عادت اس سبب سے قائم ہے کہ یہ لوگ اپنے مشرک ہونے ہی کے گویا قائل نہیں۔ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ۔ یعنی وہ ۴۰ روز کی مُدّت جو بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی میں بسر کی تھی۔ آیت کا یہ جزء پارۂ اول میں بھی یہود کی زبان سے نقل ہو چکا ہے اور وہیں اس پر مفصل حاشیہ بھی گزر چکا ہے۔ ۶۰ (جیسا ان کو اپنی نجات کا یقین کئے ہوئے بیٹھے ہیں) مَا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ۔ عقاید کے باب میں کوئی بات بے دلیل عقلی یا نقلی کے اپنی طرف سے گڑھ لینا افتراء علی اللہ کی ایک صورت ہے۔ اور یہود کے پیشواؤں اور سرداروں نے اس طرح قسم قسم کے عقائد کا ایک طومار گڑھ رکھا تھا۔ اور انہی میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہود پر آتش دوزخ (بجز برائے نام صورت کے) حرام ہے۔ اُن کے لئے اُن کے بزرگوں کی نسبت و شفاعت کافی ہے۔ اور ان کی نجات و مغفرت بلا ایمان و عمل خود بخود ہو جائیگی۔ ۶۱ (ان بدبختوں اور شامت زدوں کا) یَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ۔ یعنی قیامت کے دن۔ اس طرز تسمیہ سے مقصود قیامت کا محض ذکر ہی کر دینا نہیں۔ بلکہ اس کے وقوع کی قطعیت کو ذہن میں تازہ کر دینا ہے۔ فَکَیْفَ۔ اس طرز استفہام سے مقصود عذاب کی ہولناکی کا اظہار ہے۔ استعظام و تہویل وھو مما استندہ الیہ (ع) لِیَوْمٍ۔ میں لِ فی کے معنی میں ہے۔ واللام فی قولہ لیوم بمعنی فی قالہ الکسائی (قرطبی)

حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ

ہیں ۵۵ اور ان لوگوں کو جو عدل کا حکم دیتے ہیں انہیں قتل کر ڈالتے

النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

ہیں بس آپ انہیں عذاب دردناک کی خوشخبری سنا دیجئے ۵۶ یہی وہ لوگ ہیں جن کے

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ

اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مددگار نہ

نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ

ہوگا ۵۷ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب الٰہی سے حصہ دیا گیا

الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

تھا انہیں کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر ان

يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

میں سے ایک فریق بے رخی کرتا ہوا منہ پھیر لیتا ہے ۵۸ یہ اس سبب سے کہ یہ لوگ

قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ

کہتے ہیں کہ ہم کو آگ چھوئے گی بھی نہیں بجز (چند) گنے ہوئے دنوں کے ۵۹ اور جو کچھ یہ

فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ

تراشتے رہتے ہیں اس نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے ۶۰ سو اس روز جس میں ذرا شک نہیں جب

لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

ہم انہیں اکٹھا کرلیں گے تو کیا حال ہوگا ۶۱ اور ہر شخص کو جو کچھ اس نے کیا ہے پورا پورا بدلا دیا جائیگا

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۞٢٥ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي

اور ان پر (ذرا) ظلم نہ کیا جائے گا ٦٢ آپ کہئے اے سارے ملکوں کے مالک تو جسے چاہے

الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ

حکومت دیدے اور تو جس سے چاہے حکومت چھین لے ٦٣ تو جسے چاہے عزت

مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ

دے ٦٤ اور تو جسے چاہے ذلت دے ٦٥ تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے بیشک

عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞٢٦ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ

تو ہر چیز پر قادر ہے ٦٦ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور

تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ

رات میں دن کو داخل کرتا ہے اور تو بے جان سے جاندار کو نکالتا ہے اور تو

تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ

جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا

حِسَابٍ ۞٢٧ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ

ہے ٦٧ مومنوں کو نہ چاہیے کہ مومنوں کے ہوتے ہوئے کافروں کو

مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ

(اپنا) دوست بنائیں ٦٨ اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے ہاں

مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ

کسی شمار میں نہیں ٦٩ مگر ہاں ایسی صورت میں کہ تم ان سے کچھ اندیشہ

٦٢ (کسی کو سزا بلا جرم یا زائد از جرم مل جائے یا کسی کی کوئی نیکی بغیر اجر کے چھوٹ جائے) مَا كَسَبَتْ۔ جو کچھ اُس نے حاصل کیا ہے خواہ وہ حسنات ہوں یا سیئات۔ ٦٣ (رسول کے واسطہ سے) طریق دعا کی تعلیم اُمت کو دی جارہی ہے۔ مٰلِكَ الْمُلْكِ۔ مُلک سے مُراد سارا جہان ہے۔ مالک کا لفظ دعا کے شروع ہی میں لاکر یاد دلادیا کہ مالکانہ تصرف کا حق واختیار اسی کو حاصل ہے جس سے دعا کی جارہی ہے۔ تُؤْتِي وَتَنْزِعُ۔ حکومت کی نعمت دینا یا اس نعمت کو واپس لے لینا۔ تمامتر احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہے اور نفس بادشاہت یا حکومت میں تقدس یا الوہیت ذرا سی بھی نہیں۔ اس میں رَد آگیا اس کثرت سے پھیلے ہوئے جاہلی عقیدہ کا، کہ بادشاہی خود ایک درجہ الوہیت یا نیم الوہیت کا ہے اور کسی کا بادشاہ ہوجانا گویا خدا کے اوتار کے رتبہ پر پہنچ جانا ہے۔ مصر میں فرعونوں کی پرستش ہوتی رہی۔ ہندوستان میں چندر بنسی اور سورج بنسی راجہ مہاراجہ خدائی اوتار سمجھے گئے۔ جاپان میں میکاڈو آج تک مظہر خدا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سب اسی عقیدۂ شاہ پرستی کے مظاہر ہیں۔ اسلام نے آکر بتایا کہ بادشاہی بھی ساری دوسری نعمتوں کی طرح ایک خدائی تصرف ہے اور بادشاہ بھی بندگی، بےبسی، بیچارگی میں بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے سارے دوسرے بندے۔ حقیقت ہمیشہ سے اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس وقت اس کا نظارہ پوری قوت وشدت کے ساتھ سولینی (آمر اٹلی)، وہٹلر (آمر جرمنی) کے انجام سے کرادیا گیا ہے۔ ٦٤ (اپنی حکمت کاملہ کے مطابق) اس مَنْ تَشَآءُ (جسے تو چاہے) کی وسعتِ اطلاق میں قومیں بھی آگئیں اور فرد بھی۔ اور عزت کا سب سے بڑا ممکن مرتبہ یاد کرلیا جائے کہ نبوت ہے۔ اس طرح گویا اہل کتاب کو یاد دلادیا کہ جس قوم کے جس فرد کو وہ چاہے مرتبۂ نبوت سے سرفراز کردے۔ اس پر حسد بالکل بے معنی ہے۔ ٦٥ (اس کے پاداش عمل میں) مَنْ تَشَآءُ کا عموم اطلاق یہاں بھی فرد وقوم دونوں پر حاوی ہے کوئی فرد تو مرتبۂ نبوت سے معزول ہوا نہیں ہے۔ البتہ یہ نعمت قوموں سے سلب ہوسکتی ہے چنانچہ قوم اسرائیل صدیوں تک اس نعمت سے سرفراز رہنے کے بعد معزول کی گئی۔ اور یہ نعمت اپنی انتہائی اور آخری شکل میں عرب قوم کے ایک ممتاز فرد کے حصہ میں آئی۔ ٦٦ (تو اہل کتاب اس پر حیرت کیوں کر رہے ہیں کہ نعمتِ نبوت سے عرب قوم کے ایک فرد کو سرفراز کیا جارہا ہے) اَلْخَيْرُ۔ یعنی بھلائی ہر قسم کی اور ہر مرتبہ، درجہ کی۔ کائنات میں وجود ایجابی صرف خیر کا ہے اس لئے ذکر اسی کا کیا گیا اس کے مقابل کی چیز یعنی شر محض ایک سلبی حقیقت کا نام ہے۔ یہاں جو بجائے بیدك الخیر والشر کے صرف بیدك الخیر کا ارشاد واقع ہے اس سے عارفین صوفیہ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جس چیز میں بندہ کے ارادہ واختیار کو دخل نہ ہو وہ محض خیر ہی ہے۔ اسے ناگوار نہ جانے اور اسے اپنے حق میں عذاب ومصیبت نہ سمجھے۔ ٦٧ (غرض یہ کہ تقلبات وتصرفات کائنات کا ہر ہر جزیہ تیری ہی مشیت وقدرت کے تابع ومحکوم ہے) تُوْلِجُ الَّيْلَ۔ تُوْلِجُ النَّهَارَ۔ یہ سارے تصرفات وتقلبات بغیر کسی کی شرکت واعانت کے محض ارادۂ الٰہی سے مدام ہوتے رہتے ہیں۔ جاہلی قوموں نے لیل (رات) اور نہار (دن) دونوں کو دیوی دیوتاؤں کی حیثیت دے رکھی ہے۔ آیت میں ضمناً ان خرافات کا بھی رد آگیا۔ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ۔ اس کی ایک نمایاں مثال پرند کو انڈے سے نکالنا ہے۔ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ۔ اس کی ایک نمایاں مثال پرندے سے انڈے کی پیدائش ہے۔ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ سو ایسا قادر مطلق اگر ضعیفوں، عاجزوں کو بڑی بڑی سلطنتوں کا بھی مالک بنادے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اور یہ تقسیم رزق، عطائے دولت وغیرہ تکوینی انعامات کے سلسلہ میں۔ مَنْ تَشَآءُ کی قید جو ہر جگہ لگی ہوئی ہے۔ اس سے محققین نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ دولت وحکومت، امارت وغیرہ کی تقسیم محض مشیتِ تکوینی کے مصالح کائناتی کے اعتبار سے ہوتی رہتی ہے۔ اسے قرب الٰہی، اخلاقی افضلیت وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ٦٨ (کیا ظاہر میں اور کیا باطن میں) جسے دوستی کا علاقہ کہتے ہیں وہ ایک کیفیتِ قلب اور پھر عملی برتاؤ کا نام ہے۔ مسلمانوں کو، کافروں، منکروں، اللہ کے باغیوں کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے کی قطعی ممانعت ہے اور عقلاً بھی یہ اپنی خودداری اور قومی تشخص کے بالکل منافی ہے۔ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یعنی نہ مومنین کو چھوڑ کر اور نہ مومنین کے شمول میں۔ ای من غیر المومنین (کبیر) ای متجاوزین المومنین الی الکافرین استقلالاً او اشتراکاً (روح) بعض اہل حق نے یہیں سے تمسک کرکے اپنے مُریدوں، معتقدوں، شاگردوں کو منکروں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کردیا ہے۔ ٦٩ یعنی دشمنانِ خدا کے ساتھ دوستی رکھنے والے کی دوستی اللہ کے ساتھ کسی درجہ میں بھی معتبر ومقبول نہیں۔ لیس من اللہ فی شیء۔ من اللہ سے مراد من دین اللہ یا من ولایۃ اللہ بھی گئی ہے۔ ای من ولایتہ فی شیء (بیضاوی) ای لیس من دین اللہ فی شیء (معالم)

۵۷۰ (یعنی رفع ضرر کے لئے بقدر ضرورت ظاہری تعلقات دوستانہ کی اجازت ہے) کافروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تین ہی ممکن صورتیں ہیں:۔ (۱) موالات یا دوستی۔ (۲) مدارات یا ظاہری خوش خلقی وخاطرداری۔ (۳) مواسات۔ یا احسان ونفع رسانی۔ اپنے علماء شریعت کی تحقیق ہے کہ شق اوّل یعنی موالات یا حقیقی دوستی تو کسی حال میں جائز نہیں۔ شق سوم بھی زیادہ دشوار نہیں۔ مواسات اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے۔ غیر اہل حرب کے ساتھ جائز رہی شق دوم، سو وہ تفصیل طلب ہے۔ مدارات تین حالتوں میں درست ہے۔ ۱۔ ایک اپنے رفع ضرر کے لئے۔ ۲۔ دوسرے خود اس کافر کی مصلحت دینی ہو۔ یعنی توقع ہدایت کے موقع پر۔ تیسرے اکرام ضیف کے طور پر یعنی کافر جب مہمان ہو اس وقت کے لئے۔ بس ان تینوں صورتوں کے سوا اپنے نفع یا حصول مال وجاہ کے لئے مدارات درست نہیں بلکہ جب اس سے ضرر دین کا اندیشہ ہو تو یہ اختلاط بدرجۂ اَولیٰ حرام ہوگا۔ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۔ یہ لحاظ رہے کہ آیت میں ذکر اندیشہ کا ہے محض توہم یا احتمال بعید اس کے لئے کافی نہیں اور ضرر بھی جس کا اندیشہ کیا جائے معتدبہ ہونا چاہئے۔ التقية لا تحل الا مع خوف القتل او القطع او الايذاء العظيم (قرطبی) يعني ان تخافوا تلف النفس او بعض الاعضاء وهٰذا هو ظاهر ما يقتضيه اللفظ وعليه الجمهور (جصاص) آیت میں ایک طرف رد ہے۔ فرقۂ شیعہ کا جس نے تقیہ کے حدود بہت وسیع کر کے اسے اپنے مذہب کا ایک جزء بنالیا ہے۔ اور دوسری طرف فرقۂ خوارج کا جس نے جوازِ تقیہ سے سرے سے انکار کر دیا ہے۔ عدل واعتدال کا مسلک افراط وتفریط دونوں سے یکساں بچ کر اہل سنّت کا ہے۔ صاحب رُوح المعانی نے اس ذیل میں ماشاء اللہ بہت خوب لکھا ہے۔ ۵۷۱ (حقیقۃً صاحبِ اقتدار وقابلِ عظمت صرف وہی ہے) نَفْسَهٗ ۔ مراد یہ سمجھی گئی ہے کہ اللہ اپنے عذاب سے تم کو ڈراتا ہے۔ المعنى يحذركم الله عقابه (قرطبی) ۵۷۲ (سو اس کے احکام کی ظاہری، باطنی ہر مخالفت سے باز رہو) خطاب عامۃ الناس سے رسول اللہ صلعم کے واسطہ سے ہے۔ ۵۷۳ یعنی اس کا علم ہر طرح کامل، جزئیات وکلیات سب پر حاوی، حاضر وغائب سب پر شامل ہے۔ اس میں رد آگیا یونان اور دوسری قوموں کے ان جاہل فلسفیوں کا جنہوں نے خدا کی صفت علم کو ناقص ومحدود مانا ہے۔ ۵۷۴ اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ کی تصریح صرف محاورۂ زبان کے مطابق ہے۔ مُراد صفت علم کی کاملیت وجامعیت کا اظہار ہے۔ ۵۷۵ (اور جب علم کے ساتھ اُس کی قدرت بھی کامل ہے تو وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کی سزا سے ڈرا جائے) مشرک قوموں کو اصلی ٹھوکر صفت علم کے ساتھ صفت قدرت میں بھی لگی ہے۔ اسی لئے بار بار زور انہی صفات پر دیا گیا ہے۔ ۵۷۶ (جزاءِ اعمال کے لئے) یَوْمَ یعنی قیامت کے دن۔ مُّحْضَرًا ۔ اپنے مواجہہ میں اور اللہ کے حضور میں۔ لديها مشاهدًا (رح) مَا عَمِلَتْ ۔ یعنی اس عمل کو نامۂ اعمال میں لکھا ہوا۔ یا اُن اعمال کی جزاء کو۔ في الصحف (رح) وقيل تجد جزاء اعمالها محضرًا (رح) تقديره يوم تجد كل نفس جزاء ما عملت محضرًا (قرطبی) صحائف اعمالها او جزاء اعمالها (بیضاوی) بعض صُوفیۂ عارفین نے یہ معنی کئے ہیں کہ انسان بعینہٖ اُس عمل کو کرتے ہوئے اپنے کو پائے گا۔ قيل ظاهرًا في صورته (رح) حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ اُردو کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ہی حکیم وعارف بھی تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو ہر وقت ہم بولا کرتے ہیں کہ "وقت چلا گیا" وقت جاتا کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ہاں چلا جاتا ہے اور وہیں جمع رہتا ہے۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ اسی وقت کو واپسی کا حکم دیں گے۔ بس جب تک وقت واپس آئے گا تو جو کچھ بھی وقت کے اندر ہوتا رہا ہے اُس سب کو لئے ہوئے آئے گا۔ اس کے کائنات میں جو کچھ ہوتا رہا ہے۔ سب اس روز بجنسہٖ دوبارہ واقع ہو کر رہے گا۔ ۵۷۷ (کہ اعمال بد یا ان کی جزاء کا معاینہ نہ کرنا پڑتا) یہ حسرت ان کے دلوں میں پیدا ہوگی جن کے پاس اعمال خیر وشر کا مجموعہ ہوگا۔ تو جس بدنصیب کے پاس شر ہی شر ہوگا اُس کی حسرت نصیبی کا کیا پوچھنا! بَیْنَهَا میں ضمیر نفس کی طرف اور بینہ میں یوم کی طرف ہے۔ ۵۷۸ (کہ قابل عظمت وصاحب اقتدار ذات صرف اسی کی ہے) نَفْسَهٗ سے مراد عقاب نفسہ سمجھی گئی ہے۔ ۵۷۹ (چنانچہ یہ بار بار کی تنبیہ وتہدید بھی اسی شفقت ورافت ہی کا نتیجہ ہے کہ کاش بندے اب بھی سنبھلیں اور راہِ ہلاکت پر چلنے سے باز رہیں)

تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (٢٨)

(ضرر کا) رکھتے ہو ۵۷۰ اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے ۵۷۱ اور اللہ ہی کی طرف آنا ہے ۵۷۲

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ

آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے تم اسے خواہ پوشیدہ رکھو یا ظاہر کرو اللہ اس کو

اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ

جانتا ہے ۵۷۳ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اُس (سب) کو جانتا ہے ۵۷۴

وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٢٩) يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ

اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۵۷۵ جس روز ہر شخص اپنے ہر نیک

نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ڔ وَمَا عَمِلَتْ

عمل کو سامنے لایا ہوا پائے گا ۵۷۶ اور (اسی طرح) ہر بُرے

مِنْ سُوْۗءٍ ڔ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا

کام کو بھی (اس روز) تمنا کرے گا کہ کاش اس شخص اور اُس دن کے درمیان مسافت بعید

بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ

ہوتی ۵۷۷ اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے ۵۷۸ اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا

بِالْعِبَادِ (٣٠) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ

شفقت کرنے والا ہے ۵۷۹ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو ۵۸۰ تو میری پیروی کرو ۵۸۱

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٣١)

اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا ۵۸۲ اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ۵۸۳

معانقة ٣

ع ١٠ / ١١

منزل

۵۸۰ (جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے۔ اور اپنے اسی زعم کی بنا پر جو توقع رکھتے ہو کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا) خطاب رسولؐ کے واسطہ سے عامۃ الناس سے ہے۔ تُحِبُّوْنَ ۔ محبت کے جو معنی عربی میں ہیں اس میں ارادہ کا شمول ضروری ہے۔ قال ابن عرفة المحبة عند العرب ارادة الشيء على قصد له (قرطبی) ۵۸۱ (کہ میں جامع کمالات انسانی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میری زندگی ساری کائنات انسانی کے لئے ہر شعبہ میں معیار ونمونہ کا کام دے گی) محبت الٰہی کے دعوی کی جانچ کے لئے کیا اچھا معیار بتا دیا گیا یعنی اتباع رسولؐ۔ جو جتنا زیادہ متبع رسولؐ ہوگا اسی قدر اس کی محبت الٰہی مسلّم ومعتبر ہوگی۔ اسی معیار پر آج بڑے بڑے مدعیان مشیخت ومدعیان محبت الٰہی کے دعووں کو جانچئے تو جھوٹوں کی قلعی کھل کر رہے۔ ۵۸۲ (کہ اس کے آگے اور کوئی درجہ کمال نہیں) یہ طریقہ جو پچھلوں کو بتایا گیا یہی آواز اگلوں کے کان میں ڈال دی گئی ہے۔ حضرت مسیحؑ کے جو الفاظ اناجیل مروجہ میں نقل ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں۔ "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے" (یوحنا ۱۴: ۱۵، ۱۶) یہ مددگار کا لفظ اردو انجیلوں کے متن میں ہے۔ حاشیہ پر وکیل اور شفیع دونوں لفظ درج ہیں گویا اصل یونانی لفظ کے یہ سب معنی ہو سکتے ہیں۔ انگریزی انجیل میں لفظ "کفارہ" Comforter آیا ہے جس کے معنی تسلی دہندہ کے ہیں۔ تو گویا مفہوم اس لفظ کا یہ ہوا۔ بہرحال وہ سب کا مددگار اور وکیل اور شافع اور تسلی دہندہ، اس پیشگوئی کرنے والے مسیحؑ کے پانچ صدی بعد آیا۔ اور ایک ابدی اور غیر منسوخ شریعت لے کر ابد تک ساتھ رہنے ہی کے لئے آیا۔ اور اسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے خاتم النبیین کہلایا۔ پر صلیب کے پرستاروں اور مسیحؑ کی عبادت کرنے والوں نے اُسے برابر جھٹلایا۔ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ اللہ کی محبت بندہ کے ساتھ یہی ہے کہ اُسے مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ محبة الله للعباد انعامه عليه بالغفران (قرطبی) ۵۸۳ غَفُوْرٌ اس کی شان غفر کا تقاضا ہے کہ تمہارے معاصی وذنوب کی مغفرت کر دے گا۔ رَّحِيْمٌ ۔ سو اس کی شان رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۔ وہ تمہاری تقصیروں کو نظرانداز کر دے گا اور تمہارے مراتب قرب میں ذرا کمی نہیں آنے دے گا۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو[۵۸۴] اس پر بھی اگر وہ روگرداں رہیں تو اللہ کافروں

يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ

سے (ذرا) محبت نہیں رکھتا[۵۸۵] بیشک اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندان

اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً

ابراہیمؑ اور خاندان عمران کو سارے دنیا جہان پر برگزیدہ کیا ہے[۵۸۶] ایک دوسرے

بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ

کی اولاد ہیں اور اللہ (خوب) سننے والا ہے (خوب) جاننے والا ہے[۵۸۷] (اور وہ وقت یاد کرو)

امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ

جب عمران کی بیوی نے عرض کیا[۵۸۸] کہ اے میرے پروردگار میں نے تیرے لئے نذر مانی ہے اس (بچہ) کی جو

مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾

میرے پیٹ میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائیگا[۵۸۹] سو تو (اسے) مجھ سے قبول کر[۵۹۰] تو خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۗ وَاللّٰهُ

پھر جب اس نے (مریمؑ کو) جنا تو بولی کہ اے میرے پروردگار میں نے تو لڑکی جنی ہے[۵۹۱] اور اللہ تو خوب

اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ

جانتا تھا کہ اس نے کیا جنا ہے اور لڑکا (اس) لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا تھا[۵۹۲] اور میں نے اس

سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ

لڑکی کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو

منزل

۵۸۴ خطاب عامۃ الناس سے پیغمبر کے واسطہ سے ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ ۔ اللہ کی اطاعت اصالۃً اور بہ طور مقصود کے ہے۔ وَالرَّسُوْلَ ۔ رسول کی اطاعت تبعاً و نیابۃً ہے بطور آلہ و واسطہ کے یعنی اس حیثیت سے کہ پیغمبر اللہ ہی کا پیغام لے کر آتا ہے۔ **۵۸۵** (اور یہ لوگ کافر ہی تو ہیں جو اطاعت رسول سے منہ موڑے ہوئے ہیں خواہ محبت الٰہی کے جیسے ہی دعوے انکی زبانوں پر ہوں) فَاِنْ تَوَلَّوْا ۔ یعنی ایسے صاف وصریح حکم کے ماننے سے انکار کریں۔ **۵۸۶** (چنانچہ وہ خود اور ان کے گھرانے والے توحید کے علمبردار رہے ہیں) اِصْطَفٰی ۔ یہ برگزیدگی توحید کے علمبرداری کی حیثیت سے رہی ہو۔ اٰدَمَ ۔ حاشیہ پارہ ۱ رکوع ۴ کے ذیل میں گزر چکے۔ نُوْحًا ۔ حضرت نوحؑ بن لامخ بن متوشلح عراق میں ایک نہایت قدیم پیغمبر گزرے ہیں حسب روایت توریت حضرت آدمؑ سے دسویں پشت میں تھے عمر ۹۵۰ سال پائی۔ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ ۔ آل ابراہیمؑ کے تحت میں اسمٰعیلؑ اور خاندان اسمٰعیلؑ بھی آگئے۔ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ دونوں پر حاشیہ پارہ ۱ رکوع ۱۵ میں گزر چکا ہے۔ اٰلَ عِمْرٰنَ ۔ عمران کے نام کی تاریخی شخصیتیں دو گزری ہیں۔ ۱۔ ایک حضرت موسیٰؑ کے والد عمران بن یصہر۔ ۲۔ دوسرے انکے کئی صدی بعد حضرت مریمؑ کے والد ماجد اور حضرت مسیحؑ کے جد مادری عمران بن ماتان یہاں مراد دونوں ہو سکتے ہیں لیکن بلحاظ سیاق ترجیح عمران ثانی کو ہے حسن اور وہبؒ تابعین سے یہی قول منقول ہے۔ والمراد بعمران هٰذا هو والد مريم بنت عمران (ابن کثیر) والمراد بآل عمران عيسٰى عليه السلام وامه مريم بنت عمران قاله الحسن ووهب (روح) فقد اختلفوا فيه فمنهم من قال المراد عمران والد موسٰى وهارون ومنهم من قال بل المراد عمران بن ماتان (کبیر)

۵۸۷ سَمِیْعٌ ۔ سننے والا تمام زبان سے نکلے ہوئے الفاظ و کلمات کا۔ عَلِیْمٌ ۔ جاننے والا تمام دل کے اندر کے جذبات و خیالات کا۔ ذُرِّیَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۔ نوحؑ اولاد میں حضرت آدمؑ کے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ ان دونوں کی اولاد میں۔ اور حضرت عمران ان تینوں کی اولاد میں۔

۵۸۸ یہ اِمْرَاَتُ عِمْرٰنَ ۔ حضرت مریمؑ کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی جدۂ مادری تھیں۔ مسیحی نوشتوں میں ان کا نام حَنَّہ (Haunnae.) آیا ہے۔ ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ شام وغیرہ میں کلیسا، کلیسائے حَنَّہ کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی قبر دمشق میں ہے۔ ودیر حنة بالشام معروف وثمه دير اٰخر يعرف بدير حنه (بحر) وقبر حنة جدة عيسٰى بظاهر دمشق (بحر) **۵۸۹** (ہر قسم کے دنیوی کاروبار سے اور تیری ہی خدمت و عبادت کے لئے وقف رہے گا) حضرت مریمؑ کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ نے جو نذر نیاز مانی تھی۔ اس کی بابت بہت سی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں درج تھیں لیکن بزرگان کلیسا نے جب کاٹ چھانٹ کر کے مستند اناجیل اربعہ مرتب کرنا شروع کیں تو ان مضامین اور بیانات کو ان سے خارج کر دیا۔ اور اس کی شہادت آج ان ہی کے اکابر دے رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ کیتھولک ڈکشنری ص۔۔ نیز ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل جلد ۲ ص۔۔ نَذَرْتُ ۔ سادہ اردو میں "میں نے منت مانی ہے"۔ لَكَ میں لام تعلیل ہے یعنی مخصوص تیری خدمت و عبادت کے لئے۔ ای لعبادتك (قرطبی) لخدمة بيتك (روح) مُحَرَّرًا ۔ ای حقیقاً خالصاً لله تعالٰى خادماً للكنيسة حبيساً عليها (قرطبی) ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کی خدمت اور مجاوری کے لئے اولاد کو نذر کر دینے کا دستور یہود کے ہاں جاری تھا۔ **۵۹۰** سَمِیْعٌ ۔ سننے والا میری دعاؤں کا۔ عَلِیْمٌ ۔ جاننے والا میرے اخلاص کا۔ **۵۹۱** (اور لڑکی کس طرح تیرے معبد میں مجاور بن سکے گی؟) حضرت مریمؑ کی والدہ ماجدہ بہ صد حسرت و یاس بارگاہِ الٰہی میں مناجات کر رہی تھیں کہ تمنا تو لڑکے کی اسلئے تھی کہ اُسے ہیکل کی نذر کر دیا جاتا۔ وہ وہیں کی جاروب کشی اور مجاوری میں عمر بسر کرتا۔ اولاد تو ہوئی مگر لڑکی نکلی۔ لڑکی سے کیسے یہ نذر پوری ہو سکتی ہے؟ اسرائیلی قانون میں لڑکی سے اس خدمت کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ **۵۹۲** یہ پورا فقرہ والدۂ مریمؑ کی تقریر کا حصہ نہیں۔ بطور ایک مستقل جملہ معترضہ کے براہ راست ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس لڑکی کی عظمت و منزلت سے تو خدائے تعالیٰ ہی خوب واقف تھا۔ ماں غریب کیا سمجھ سکتی تھی۔ قال مكى هو اعلام من الله تعالٰى لنا على طريق التثبيت (قرطبی) اَلذَّکَرُ ۔ یعنی جو لڑکا والدۂ مریمؑ کے حسب خواہش ہوتا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۔ یعنی اس مولود سے جو جو عظمتیں وابستہ تھیں ان کی خبر ماں غریب کو کیا ہو سکتی تھی۔ ان سے تو بس اللہ ہی خوب واقف تھا۔ ای الله اعلم بالشئ الذى وضعته وما علق به من عظائم الامور ودقائق الاسرار وواضح الاٰيات وهى غافلة عن ذٰلك كله (روح)

۹۳ والدۂ مریم کی توحید پرستی مناجات کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ وذریتها۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ والدۂ مریم اللہ سے امید لگائے ہوئے تھیں کہ لڑکی کا سلسلۂ نسل چلیگا ۹۴ یعنی والدۂ مریم کی نذر کو اس لڑکی کی شکل میں بھی اللہ نے قبول کرلیا۔ تاریخ خدمتِ ہیکل میں ایک نئی بات تھی۔ یہودی نوشتوں کے بموجب حضرت مریم تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے قبول کرلی گئی تھیں اور معبد کے چھوٹے بڑے سب خادم اس کمسن بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو ہیسٹنگز Hastings کی ڈکشنری آف دی بائبل، جلد ۳ صفحہ ۲۸۶۔ نیز بج (Budge) کی حکایاتِ خاتون مریم Legends of Lady Mary ۹۵ یہ اچھا نشوونما ممکن ہے کہ قوائے جسمانی کے اعتبار سے ہوا ور ممکن ہے کہ قوائے روحانی واخلاقی کے اعتبار سے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں حیثیتوں سے ہو۔ یعنی سوّی خلقها من غیر زیادة ولا نقصان (قرطبی) ای ربّاها الرب تربیة حسنة فی عبادة وطاعة لربها قاله ابن عباس (روح) مجاز عن تربیتها بما یصلحها فی جمیع احوالها (بیضاوی) عبارة عن حسن النشأة والجودة فی خلق وخلق فانشأها علی الطاعة والعبادة (بحر) عجیب تماشہ ہے کہ حضرت مریم کے شرف وعظمت کی یہ ساری تفصیلات انجیل میں نہیں، قرآن مجید ہی میں مل رہی ہیں۔ انجیل اس قسم کے جزئیات سے بالکل خاموش ہے۔ ۹۶ زکریا اللہ کے پیغمبر تھے۔ مسیحی صحیفے ان کے تذکرہ سے گویا بیگانہ ہیں، چار مقدس ومستند انجیلوں میں سے صرف ایک جگہ ان کا ذکر انجیل لوقا میں آتا ہے۔ وہ بھی پیغمبر کی حیثیت سے نہیں صرف ایک بزرگ و راستباز کاہن کی حیثیت سے۔ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریا نام ایک کاہن تھا (لوقا ۱:۵) یہ حضرت زکریا

الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ

شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں ۹۳ پھر اس کے پروردگار نے اس کو بوجہِ احسن قبول کرلیا

وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا

اور اس کو اچھا نشوونما دیا ۹۵ اور اس کا سرپرست زکریا کو بنا دیا ۹۶ جب کبھی

دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ

زکریا ان کے پاس حجرہ میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز (کھانے پینے) کی پاتے ۹۷

قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ

(ایک بار) بولے کہ مریم یہ کہاں سے تجھے مل جاتی ہیں ۹۸ وہ بولیں یہ اللہ کی طرف سے آجاتی

اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾

ہیں ۹۹ بیشک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے ۱۰۰

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ

(بس) وہیں زکریا اپنے پروردگار سے دعا کرنے لگے ۱۰۱ عرض کی کہ اے میرے پروردگار مجھے اپنے

مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿٣٨﴾

پاس سے کوئی پاکیزہ اولاد عطا کر ۱۰۲ بیشک تو دعا کا بڑا سننے والا ہے ۱۰۳

فَنَادَتْهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَھُوَ قَاۗىِٕمٌ يُّصَلِّيْ فِي

پس انہیں فرشتوں نے آواز دی اس حال میں کہ وہ حجرہ میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ

الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ

رہے تھے کہ اللہ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے ۱۰۴ جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے

رشتہ میں حضرت مریم کے خالو تھے یعنی آپ کی خالہ کے شوہر۔ حضرت مریم کے والد ماجد جناب عمران کی وفات آپ کے بچپن ہی میں ہوگئی تھی اور ان کی وفات کے بعد ہیکل کے خادموں (یا یہود کی اصطلاح میں کاہنوں) کی سرداری حضرت زکریا کے حصہ میں آئی تھی۔ آپ ایک تو مریم کے عزیز قریب اور پھر خود ہیکل کے سردار۔ حضرت مریم کی تربیت کا واسطہ وذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو بنایا۔ کفّلها۔ کے لفظ میں اشارہ اس طرف بھی ہوگیا کہ یہ سب خدائی انتظامات تھے۔ زکریا کی حیثیت محض واسطہ یا ذریعہ کی تھی ۹۷ المحراب۔ محراب حجرہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی سب سے الگ تھلگ ہوکر بیٹھے۔ محراب مسجد کو بھی محراب اسی لئے کہتے ہیں کہ اس در میں امام نماز سب سے الگ اور تنہا کھڑا ہوتا ہے۔ المحراب الغرفة (قاموس) قال الازهری وسمی المحراب محرابا لانفراده الامام فیه وبعده من الناس (لسان) كلّما۔ ہیکل کے خادموں کے رہنے اور عبادت کرنے کے لئے ہیکل کے ادھر ادھر زاویے، حجرے یا خلوت خانے بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک حجرہ حضرت مریم کا تھا۔ حضرت زکریا ایک تو یوں بھی سردار خدام تھے۔ اور اس حیثیت سے ہر خادم وخادمہ کی نگرانی رکھنا آپ کے فرائض میں داخل تھا اور پھر حضرت مریم کے تو آپ بزرگ سرپرست بھی تھے ان کے حجرہ میں تو قدرۃً آپ کی آمد ورفت رہا کرتی۔ قرآن حکیم کے ایک ذرا سے لفظ كلّما نے اس سارے مفہوم یعنی حضرت زکریا کی کثرت آمد ورفت اور غیر متوقع وجود رزق سب کی طرف اشارہ کردیا۔ وكلّما تقتضی التكرار فیدل علی كثرة تعهده وتفقده لاحوالها ودلت الاٰية علی وجود الرزق عندها كل وقت يدخل عليها (بحر) رزقًا کھانے پینے کا سامان۔ مثلاً تروتازہ میوے۔ بعض "جدت پسندوں" نے یہاں رزق کے معنی فیض اور علم وحکمت کے لئے ہیں۔ لیکن محققین نے کہا ہے کہ یہ تفسیر کے حدود کو تجاوز کرجانا ہے۔ ابعد من فسّر الرزق هنا بانه "فیض" (بحر) هذا شبيه بتفسير الباطنية (بحر) رزقًا کی تنوین تعظیم وتفخیم کے لئے ہے یعنی وہ رزق کوئی ندرت کا پہلو رکھتا تھا۔ التنكير فی قوله رزقا يدل علی تعظيم حال ذلك الرزق كانه قيل رزقًا ای رزق غریب عجیب (کبیر) مریم اپنی ساری عظمت وجلالت کے باوجود بہرحال پیمبر نہ تھیں اسی بنا پر محققین اہل سنت نے آیت کو اثبات کراماتِ اولیاء کے باب میں نص قرار دیا ہے۔ اور علما فرق شیعہ بھی اس باب میں ان سے متحد ہیں۔ اختلاف صرف معتزلہ کو ہے۔ واستدل بالاٰية علی جواز الكرامة للاولياء لان مريم لا نبوة لها وهذا هو الذی ذهب اليه اهل السنة والشيعة وقالت فی ذلك المعتزلة (روح) وهو دليل جواز الكرامة للاولياء (بیضاوی) احتج اصحابنا علی صحة القول بكرامة الاولياء بهذه الاٰية (کبیر) ۹۸ یعنی لاتا تو میں ہی لاتا۔ میرے سوا اور کون اس سامان کا پہنچانے والا ہوسکتا ہے؟ سوال اظہارِ حیرت کے لئے ہے۔ استغرب زكريا وجود الرزق عندها وهو لم يكن اتی به فسأل علی سبيل التعجب من وصول الرزق اليها (بحر) ۹۹ (براہِ راست اور بلا کسی واسطہ ظاہری کے) اہل اللہ کے ساتھ اس قسم کے خوارق کا ظہور کوئی انوکھی بات نہیں ہوتے ہی رہتے ہیں اور بالغرض اس مومنہ قانتہ کو یہ سامان کسی ظاہری واسطے سے بھی پہنچ رہے ہوں، جب بھی اس کی نظر تو اس واسطہ پر نہیں براہِ راست اللہ تعالیٰ پر تھی ۱۰۰ (خواہ واسطوں سے ہو۔ خواہ بلاواسطہ اور بلا استحقاق) اللہ اپنی مشیت تکوینی کے ہر جزئیہ میں جس طرح آزاد ہے اسی طرح تقسیم رزق کے باب میں ہے۔ اس میں رد آگیا ان مشرک قوموں کا جنہوں نے خوشحالی اور بدحالی کو پہلے جنم کے اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے ۱۰۱ (قدرتِ الٰہی کے تازہ مشاہدہ سے متاثر ہوکر) هُنَا کا دوسرا ترجمہ (ادھر) کے علاوہ (وہاں) بھی ہوسکتا ہو، ہنا ظرف کے لئے ہو اور اس میں ظرف مکان وظرف زمان دونوں شامل ہیں یعنی اسی جگہ بھی اور اسی وقت بھی۔ اسم يشار به للمكان القريب وقد يشار به للزمان اتساعًا (جمل) گو اصلی مفہوم ظرف مکان ہی کا ہے۔ يستعمل للزمان والمكان واصله للمكان (قرطبی) ای فی ذلك المكان او فی ذلك الوقت فقد يستعار هنا وثم وحيث للزمان (کشاف) هنا ظرف مكان ويجوز ان يراد بها الزمان مجازًا (روح) هُنَالِكَ دَعَا۔ آیت سے استدلال مکانِ مبارک میں دعا کی مقبولیت پر کیا گیا ہے۔ علی ہذا وقتِ مبارک میں بھی دعا کی مقبولیت پر حضرت زکریا کو جب یہ مشاہدہ ہوگیا کہ یہ مقام خرقِ عادت کے صدور کا ہے تو آپ بھی وہیں دعا کرنے لگے۔ فی قوله هنالك دعا دلالة علی ان يتوخی العبد بدعائه الامكنة المباركة والازمنة المشرفة (بحر) ۱۰۲ (جو میرے سلسلۂ روحانی کو آگے چلا سکے) هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ۔ مجھے بھی اپنی عنایت سے اسی طرح دے جیسے کہ والدۂ مریم کو مریم عنایت ہوچکی ہیں۔ حضرت زکریا کا سن زیادہ ہوچکا تھا اور بیوی صاحبہ بھی عقیم سمجھ لی گئی تھیں۔ ایک خارقِ عادت کو دیکھ کر آپ کا ذہن معاً اسی طرف زور شور کے ساتھ منتقل ہوا کہ جو خدا اس پر قادر ہے کہ بلا اسباب ظاہری یہاں یہ تروتازہ میوے پہنچائے، وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ اس سن میں مجھے نعمتِ اولاد سے سرفراز کردے۔ مِنْ لَّدُنْكَ۔ یہ خبر صاف ظاہر کر رہی ہے کہ دعا کرنے والے کی نظر اس عالم اسباب میں بھی اسباب سے کہیں زیادہ مسبب الاسباب پر ہے۔ ذُرِّيَّةً۔ اولاد کی خواہش ایک امر طبعی ہے اور زہد کیا معنی کمال زہد کے بھی منافی نہیں۔ قرآن مجید نے بار بار پیغمبروں کی زبان سے اس قسم کی دعائیں نقل کرکے بتا دیا کہ وہ مذاہب حقیقت سے کتنی دور ہیں جنہوں نے بیوی بچوں کو مطلق صورت میں جنجال قرار دیا ہے۔ ہماری شریعتِ حقہ میں اولاد کی خواہش تو سنتِ انبیاء وصدیقین بتائی گئی ہے اور صحیح بخاری میں تو مستقل عنوانات طلب ولد

کے فضائل میں ہیں:- دلت ھذہ الآیۃ علی طلب الولد وھی سنۃ المرسلین والصدیقین (قرطبی) وقد ترجم البخاری علی ھذا باب طلب الولد والاخبار فی ھذا المعنی کثیرۃ تحث علی طلب الولد وتندب الیہ (قرطبی)
ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً۔ طیبہ کے لحاظ نے اسے صاف کر دیا کہ اہل اللہ کی نظر آخرت پر بہر حال رہتی ہے اولاد کی خواہش میں بھی مطلق کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن حضرت زکریا محض اولاد ہی نہیں چاہتے، اولاد صالح چاہتے ہیں جو ان کے بعد ان کے مشن تبلیغ توحید کو جاری رکھے۔ اللہ والوں کی نگاہ میں اخلاقی و روحانی فضائل بہر صورت مقدم رہتے ہیں۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ایسے امور کے لئے دعا کرنا جو اسباب قریبہ سے ہٹ کر ہوں، آداب دعا کے منافی نہیں۔ ۱۰۳ (اور بڑا قبول کرنے والا ہے) حق تعالیٰ کی اس صفت پر بار بار زور دینا مادی اور نیچری عقیدہ کے لوگوں کے رد میں ہے جو واقعات کو تمامتر اسباب ظاہری ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اور ارادہ حق تعالیٰ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رکھتے۔ انجیل میں ہے کہ زکریا نام ایک کاہن تھا۔ اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا۔ اور ان کے اولاد بھی نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔" (لوقا۔ ۱: ۵۔ ۷) ۱۰۴ (دعا کا قبول ہو گئی۔ اور آپ کو حالت نماز ہی میں فرزند کی بشارت مل گئی۔ اَلْمَلٰٓئِکَۃُ۔ صیغہ جمع ہے لیکن لازمی نہیں کہ آواز دینے والے کئی ہوں۔ صیغہ جمع اسم جنس کا بھی کام دیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ آواز دینے والا ایک ہی فرشتہ ہو۔ وجائز فی العربیۃ ان یخبر عن لفظ الجمع (قرطبی) قال الزجاج ای اتاہ النداء من ھذا الجنس الذین ھم الملٰئکۃ (بحر) ذالک جائز فی کلام العرب بان تخبر عن الواحد بمذھب الجمع (ابن جریر) یَحْیٰی۔ عہد جدید کے صحیفوں میں ان کا نام یوحنا آتا ہے۔ انجیل میں اس موقع پر آتا ہے:- "فرشتہ نے اس سے کہا۔ اے زکریا خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سنی گئی اور تیری بیوی الیشبع تیرے لئے بیٹا جنے گی تو اس کا نام یوحنا رکھنا اور تجھے خوشی وخرمی ہوگی" (لوقا۔ ۱: ۱۳) حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی اور آپ سے سن میں حسب روایت انجیل صرف چھ مہینہ بڑے تھے۔ سنہ ۳۰ء میں والئ شام ہیرود کے حکم سے شہید ہوئے۔ ۱۰۵ کَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ۔ جس طرح روح القدس لقب حضرت جبرئیل کا ہے، کلمۃ اللہ لقب حضرت مسیح کا ہے۔ یعنی عیسیٰ فی قول اکثر المفسرین (قرطبی) وھو اختیار الجمھور (کبیر) قالہ ابن عباس ومجاھد والحسن وقتادۃ والسدی وغیرھم (بحر) مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ آپ کی اصل حیثیت مسیح کے پیش رو اور نقیب ہی کی تھی۔ بعض نے کلمۃ اللہ سے مراد کتاب اللہ بھی لی ہے۔ قال ابو عبیدۃ معنی بکلمۃ من اللہ بکتاب من اللہ (قرطبی) سَیِّدًا۔ یعنی دین کے باب میں مقتدا، پیشوا۔ مسیحی تو خیر آپ کے تقدس کے قائل ہی ہیں یہود جو آپ کے منکر اور آپ کے سخت دشمن ہیں وہ بھی آپ کی مرجعیت و مقبولیت سے انکار نہیں کرتے۔ حَصُوْرًا۔ یعنی لذات و شہوات پر اسے قابو حاصل ہوگا۔ اور وہ نہایت درجہ محتاط، متقی ہوگا۔ انجیل میں آپ کے زہد و تقشف کا ذکر تصریح کے ساتھ ہے مثلاً:- "وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پئے گا۔ اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائیگا" (لوقا۔ ۱: ۱۵) "اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا اور وہ انبیاء کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راستبازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لئے ایک مستعد قوم تیار کرے" (لوقا۔ ۱: ۱۶، ۱۷) "اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے کے دن تک جنگلوں میں رہا" (لوقا۔ ۱: ۸۰) نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ حضرت یحییٰ کی نبوت کا اثبات یہود کے مقابلہ میں ہے جو نعوذ باللہ آپ کو ایک بنا ہوا انسان سمجھتے تھے اور آپ کی صالحیت کا اثبات یہود کے مقابلہ میں تو مسلّم ہے لیکن خود مسیحیوں کے مقابلہ میں بھی ہے جن کے نزدیک عصمت و تقویٰ لازم نبوت نہیں۔ ۱۰۶ انجیل میں اس موقع پر ہے۔ "زکریا نے فرشتہ سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بھی عمر رسیدہ ہے" (لوقا۔ ۱: ۱۸) "ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے" (لوقا۔ ۱: ۷) اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ۔ یعنی اس بشارت کے تحقق کی متعین صورت آخر کیا ہوگی؟ آیا میری جوانی عود کر آئے گی یا اور کوئی خاص انقلاب ہوگا؟ وعدۂ الٰہی سے بے اعتباری کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ حضرت تو محض متعین صورت جاننا چاہتے ہیں لیکن بالفرض عدم اطمینان بھی مراد لی جائے، جب بھی خلاف اسباب عادیہ کسی شے کے غیر وقوع پر حیرت بالکل طبعی ہے اور پیغمبر بھی امور طبعی میں بالکل بشر ہی تھے۔ ۱۰۷ (کہ اس حقیقت کا مراقبہ ہر استبعاد کے رفع کر دینے کے لئے کافی ہے) کَذٰلِکَ۔ یعنی عود شباب وغیرہ کچھ نہ ہوگا۔ بس اسی موجودہ حالت کے ساتھ ولادت فرزند ہوگی۔ ۱۰۸ (جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ گھر میں حمل ہے اور زمانۂ ولادت قریب ہے اور میں ادائے شکر کا سامان کر سکوں) اٰیَۃً۔ ہر ایسی چیز ہے جس سے قدرت الٰہی، نصرت غیبی خاص طور پر ظاہر ہو رہا ہو۔ ایسی چیز کو قدرۃ معمول عام سے کسی قدر ہٹا ہونا چاہئے اور اس واقعہ میں اعجازی رنگ ضرور ہونا چاہئے۔ ۱۰۹ (اور تسبیح و عبادت الٰہی اس حال میں بھی جاری رہے گی) اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ۔ انجیل کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی معصیت حضرت زکریا سے سرزد ہو گئی تھی۔ اور اس کی سزا میں ان کی قوت گویائی چند روز کے لئے سلب کر لی گئی تھی۔ "اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا۔ اسلئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انہوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رویا دیکھی ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا۔ اور وہ گونگا ہی رہا" (لوقا۔ ۱: ۲۰، ۲۲) قرآن مجید جو تمام قدیم صحیفوں پر مہیمن یا نگران و نگہبان ہے اور ان کی تمام غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا جاتا ہے، یہاں بھی اس نے حسب معمول اپنا فرض ادا کیا اور حضرت زکریا سے یہ بہتان رفع کر کے صحیح صورت حال یہ بیان کیا کہ ایک علامت غیبی و اعجازی کی تو انہوں نے خود درخواست کی تھی اور ان کی اس درخواست پر یہ علامت غیبی عطا ہوئی تھی کہ آپ تسبیح و ذکر الٰہی تو اپنی جگہ پر بدستور کرتے رہیں گے۔ البتہ لوگوں سے بات چیت کی قوت آپ کو تین دن کے لئے حاصل نہ رہے گی۔ تکلم الناس میں الناس ہی قابل غور کی جان ہے۔ انما خص تکلیم الناس لیعلمہ انہ یحبس لسانہ عن القدرۃ علی تکلیمھم خاصۃ مع ابقاء قدرتہ علی التکلم بذکر اللہ (مدارک) ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ۔ تین دن اور تین راتیں۔ دن کہنے سے رات اس میں تبعاً شامل ہو گئی ہے۔ سکوت طویل خصوصاً صوم سکوت کی حالت میں قدیم مذاہب و ادیان میں جزو عبادت رہ چکا ہے۔ رَمْزًا۔ رمز میں سر کے اشارے بھی آگئے اور ہاتھوں کے بھی۔ انجیل میں ہے:- "اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا" (لوقا۔ ۱: ۲۲) فقہاء مفسرین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ اشارہ بھی کلام کا قائم مقام ہے۔ فی ھذہ الآیۃ دلیل علی ان الاشارۃ تنزل منزلۃ الکلام وذالک موجود فی کثیر من السنۃ (قرطبی) ۱۱۰ (دل و زبان سے) وَاذْکُرْ وَسَبِّحْ۔ یعنی ذکر الٰہی و تسبیح کا شغل دل میں بھی جاری رکھو اور زبان سے بھی۔ یہ نہ ہوگا کہ آپ کی زبان بطور مرض یا عذاب الٰہی کے مطلقاً بند ہو جائے اور آپ بالکل گونگے ہو جائیں جیسا کہ انجیل میں درج ہے بلکہ ذکر و تسبیح میں آپ برابر لگے رہیں گے۔ البتہ لوگوں سے گفتگو پر قادر نہ رہیں گے اور یہی اس امر کی علامت ہوگی کہ حمل قرار پا گیا اور ظہور یحییٰ کا زمانہ قریب آگیا۔ عَشِیّ۔ زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک کا سارا وقت اس میں آگیا۔ العشی من حین ان تزول الشمس الی ان تغیب (کشاف) اِبْکَار۔ طلوع فجر سے دن چڑھے تک کا وقت اس میں شامل ہے۔ الابکار من طلوع الفجر الی وقت الضحٰی (کشاف) محاورہ میں مراد صبح و شام کے اوقات کی تعیین و تخصیص ہی نہیں بلکہ دوام بھی ہو سکتی ہے۔

مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ
ہوں گے اور مقتدا ہوں گے اور بڑے ضبط نفس کرنے والے ہوں گے اور نبی ہوں گے صالحین میں سے۱۰۶ (زکریا) بولے
رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَ
اے میرے پروردگار میرے بیٹا کس طرح ہوگا درآنحالیکہ مجھے بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری
امْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ
بیوی بانجھ ہیں۱۰۷ ارشاد ہوا اسی طرح اللہ کر دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے۱۰۸ (زکریا) بولے
رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ
اے میرے پروردگار میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دیجئے۱۰۹ ارشاد ہوا کہ تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے بات نہ کر سکیگا
اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ
تین دن تک بجز اشاروں کے۱۱۰ اور اپنے پروردگار کو کثرت سے یاد کرتے رہو اور تسبیح کرتے رہو دن ڈھلے بھی
وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ ع ۱۲ / ۴
اور صبح بھی۱۱۱ اور (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم بیشک اللہ نے
اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾
آپ کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک کر دیا ہے اور آپ کو دنیا جہان کی بیبیوں کے مقابلہ میں برگزیدہ کر لیا ہے
يٰمَرْيَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
اے مریم اپنے پروردگار کی اطاعت کرتی رہ اور سجدہ کرتی رہ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہ
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ
یہ واقعات غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم آپ کے اوپر ان کی وحی کر رہے ہیں اور آپ تو ان لوگوں کے

(بعض خصوصیات کے لحاظ سے) اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ ۔ یہ قول خواہ بطور الہام ہو جس کا تعلق محض قلب و باطن سے ہے خواہ بطور ندا ہو جس کا تعلق سماعت اور ظاہر سے ہے ملٰئکۃ کے صیغہ جمع سے یہ لازم نہیں آتا کہ کہنے والے کئی کئی فرشتے ہوں۔ ملٰئکۃ سے مراد جنس ملائکہ بھی ہو سکتی ہے۔ محققین نے کہا ہے کہ ملائکہ کا غیر انبیاء کے ساتھ ہمکلام ہونا ثابت ہے البتہ ملائکہ کے لائے ہوئے پیام تبلیغ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اصۡطَفٰىكِ ۔ اس اصطفاء کا تعلق مریم علیہا السلام کے بچپن سے ہے یعنی اللہ نے تو شروع ہی سے آپ کو بزرگی دے رکھی ہے، آپ کی والدہ کی دعاؤں کو سن کر آپ کو خلعتِ وجود بخشا گیا۔ پھر ہیکل کی خدمت کا کام لڑکوں اور مردوں کے لئے مخصوص تھا۔ آپ کو لڑکی ہونے کے باوجود اس کا موقع عنایت کیا گیا۔ پھر آپ کو آپکے حجرہ میں غذائیں جس اعجازی رنگ میں پہنچائی گئیں اس نے زکریا نبی تک کو متحیر کر دیا۔ یہ سب شواہد آپ کی برگزیدگی ہی کے تو ہیں۔ طَهَّرَكِ یعنی آپ کو گناہوں کی آلائش سے پاک صاف کر دیا۔ آپ کو اخلاقی پاکیزگی کا ایک نمونہ بنا دیا۔ یعنی طہرہ دینلہ من الریب والادناس التی فی ادیان نساء بنی دم (ابن جریر) ای نزهك عن الاخلاق الذميمة والطباع الردية (ر) روی عن الحسن و ابن جبير انہ طهرہ بالایمان عن الكفر و بالطاعة عن المعصية (ر) طهرك من الافعال الذميمة والعادات القبيحة (کبیر) عن مجاهد عما يعو النساء فی خلق وخلق و دین (بحر) عن مجاهد من الريب والشكوك (بحر) یہ خصوصیت کے ساتھ یہود کے رد میں ہے جو اپنی خباثت سے طرح طرح کے گندے الزامات حضرت مریمؑ پر لگائے ہوئے تھے اور آج تک لگاتے چلے آرہے ہیں۔ ۱۱۲ اِصۡطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ ۔ پہلے اصطفاء کا تعلق مریمؑ کے بچپن سے ہے یعنی

لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ اَيُّهُمۡ يَكۡفُلُ

پاس تھے نہیں، اس وقت جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی سرپرستی

مَرۡيَمَ ۖ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ ۝۴۴

کرے اور نہ آپ ان کے پاس اس وقت تھے جب وہ باہم اختلاف کر رہے تھے ۱۱۶

اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ

(وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! اللہ آپ کو خوشخبری دے رہا ہے اپنی طرف کے

مِّنۡهُ ۖ اسۡمُهُ الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ وَجِيۡهًا

ایک کلمہ کی ان کا نام (و لقب) مسیح عیسیٰ ابن مریمؑ ہوگا ۱۱۹ دنیا و آخرت

فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ۝۴۵ وَيُكَلِّمُ

(دونوں) میں معزز اور مقربوں میں سے ۱۲۰ اور وہ لوگوں

النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝۴۶

سے گفتگو کریں گے، گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوں گے ۱۲۱

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ

وہ بولیں اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا درآنحالیکہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں

بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى

لگایا ہے ۱۲۲ ارشاد ہوا ایسے ہی اللہ پیدا کر دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے ۱۲۳ جب وہ کسی بات کو

اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝۴۷ وَيُعَلِّمُهُ

پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتی ہے ۱۲۴ اور (اللہ) اسے

پیدائش ہی ایسی ہوئی اس اصطفاء کا تعلق ان کے بلوغ کے بعد سے ہے۔ یہ دوسری برگزیدگی خاص خاص حیثیات سے تھی مثلاً اس صفت میں کہ مرد کے توسط کے بغیر محض مس ملکی سے انہیں ماں بنا دیا گیا انجیل میں بھی فضیلتِ مریمؑ کا ذکر ہے لیکن قرآن مجید سے کہیں ہلکے لفظوں میں۔ ”اس کنواری کا نام مریمؑ تھا اور فرشتہ نے اس کے پاس اندر آکر کہا سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے خداوند تیرے ساتھ ہے“ (لوقا ۱: ۲۷، ۲۸) ۱۱۳ آیت ماقبل اگر یہود کے رد میں تھی جنہوں نے مریمؑ کی ذات کو اتہامات کا مرکز بنا رکھا تھا تو یہ آیت یہود و نصاریٰ دونوں کے رد میں ہے۔ یہود کو تو یہ بتایا گیا کہ آپ بڑی عبادت گزار و طاعت شعار خاتون تھیں اور نصرانیوں کو یہ جتلایا گیا کہ مریمؑ نہ (نعوذ باللہ) خدا کی ماں تھیں اور نہ کسی قسم کی دیوی کہ ان کی پرستش کی جائے یا انہیں کسی درجہ میں بھی شریک عبادت کیا جائے بلکہ ان کی ساری بزرگی و برگزیدگی تو بس یہی تھی کہ وہ اپنے مالک و مولیٰ کی مخلص پرستار، فرمانبردار اور نہایت درجہ عبادت گزار و طاعت شعار تھیں۔ ۱۱۴ (اے پیغمبرؐ) یعنی یہ واقعات وہ ہیں جو آپ سے کئی سو سال قبل ایک دوسرے ملک میں پیش آئے تھے اور اب دنیا سے ان کی صحیح تاریخ تک مٹ چکی ہے اور ان کے علم واقعی کا کوئی ذریعہ بھی اب بجز وحی الٰہی کے باقی نہیں۔ آپ کو بالکل ٹھیک ٹھیک وحی کے ذریعہ سے القاء کئے جا رہے ہیں اور یہ بجائے خود ایک دلیل آپ کی صداقت کی ہے۔ ۱۱۵ (شام کے دریائے یردن میں تفاؤل کے لئے)۔ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ ۔ اس فعل کے فاعل کون تھے؟ یروشلم کے ہیکل مقدس کے خدام اور کاہن (بہ اصطلاح یہود) اَقۡلَامَهُمۡ ہیکل سلیمانی کی خدمت و نگہداشت کے لئے خادموں کی ایک بڑی جماعت رہا کرتی تھی جیسے کہ بڑی مسجدوں کی خدمت کے لئے جاروب کشوں، فراشوں، دربانوں، مؤذنوں وغیرہ کا پورا عملہ رہتا ہے۔ حضرت مریمؑ کے والد حضرت عمران اپنے زمانہ میں ان خادمانِ حرم کے سردار تھے۔ ان کی وفات پر سوال یہ پیدا ہوا کہ اب مریمؑ کا سرپرست کون ہو۔ رشتہ ان خادموں میں سب سے قریب حضرت زکریاؑ کا تھا کہ آپ مریمؑ کے خالو تھے۔ طے یہ پایا کہ سوال کا حل فال کے ذریعہ سے کیا جائے۔ فال اشارۂ غیبی کی قائم مقام تھی۔ فال کا طریقہ یہ رائج تھا کہ وہ قلم جو توریت لکھنے کے ہوتے تھے اور پر توریت شریف ہی کے کچھ کلمات لکھ کر انہیں دریائے یردن میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اور قلم عموماً دریا ہی کے رخ بہنے لگتے لیکن بعض قلم مخالف رخ کو بہتے اور یہی مخالف بہاؤ کامیابی کی علامت سمجھی جاتی جیت ایسے ہی قلم کے مالک کی سمجھی جاتی۔ گویا غیب سے ڈگری اس کے حق میں ہو گئی۔ یہی صورت یہاں ہوئی اور قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام نکلا۔ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ ۔ خطاب رسول اللہ صلعم سے ہے۔ یعنی جب یہ مریمؑ کی کفالت و سرپرستی کا قضیہ طے ہو رہا تھا تو آپ خود تو وہاں موجود نہ تھے اور نہ کوئی معتبر چشم دید شہادت ہی آپ تک پہنچی، پھر جو آپ اتنی صحیح اور سچی خبریں اپنی زبان سے ادا کر رہے ہیں، ان کا ذریعہ بجز وحی الٰہی کے اور ہو کیا سکتا ہے؟ ۱۱۶ الۡمَلٰٓئِكَةُ ۔ کے صیغہ جمع پر حاشیے دو بار ابھی اوپر گزر چکے۔ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ ۔ کلمة اللہ پر حاشیہ ابھی چند آیتیں قبل گزر چکا ہے۔ بشارت یہاں مریمؑ کو بیٹے کی مل رہی ہے۔ وہ بیٹا جسے بن باپ کے ہونے کی بنا پر کلمة اللہ کہا گیا ہے۔ حضرت مریمؑ اس وقت تک یہودی رسم و رواج کے لحاظ سے ناکتخدا اور کنواری تھیں البتہ آپ کی منگنی آپ ہی کے کفو و قبیلہ آل داؤد کے ایک نوجوان یوسف نامی سے ہو چکی تھی جن کے ہاں کاروبار چوب سازی کا ہوتا تھا۔ انجیل کا بیان ہے:۔ ”جبریل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی۔ اور اس کنواری کا نام مریمؑ تھا۔“ (لوقا ۱: ۲۶، ۲۷) ”یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریمؑ کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔“ (متی ۱: ۱۸) رسم منگنی کی جو حیثیت یہود کے ہاں تھی اس کے لحاظ سے ہمیں اپنی اصطلاح و زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ آپؑ کا عقد ہو گیا تھا۔ مگر رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ گویا خلوت کی اجازت ابھی عرفاً نہیں ہوئی تھی۔ اِسۡمُهُ ۔ اسم کی وسعت مفہوم و جامعیت پر حاشیہ پارہ اول میں عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کے تحت میں گزر چکا ہے۔ اسم شئی کے تعارف کے لئے ہوتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے تعارف کے لئے یہ پوری عبارت ضروری تھی۔ المسیح عیسیٰ بن مریمؑ۔ الۡمَسِيۡحُ ۔ لفظ مسیح کے اشتقاق میں اختلاف ہے لیکن خواہ یہ لفظ عربی الاصل ہو خواہ عبرانی کے کسی لفظ کا معرب۔ بہرصورت اپنے معنی کے لحاظ سے ”مبارک“ کا مرادف ہے۔ عِيۡسٰى ۔ انجیل کے تلفظ اور املا میں ”یسوع“۔ ۱۱۷ (اللہ تعالیٰ کی) ابۡنُ مَرۡيَمَ ۔ یہودیت اور مسیحیت دونوں کے رد ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ابن مریم کہہ کر قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کر دی کہ عیسیٰ علیہ السلام خود تو بشر تھے ہی سفر زندگی کسی دیوی دیوتا کسی مافوق البشر کے نہ تھے محض عورت ذات کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ وَجِيۡهًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۔ یہ یہود کے رد میں ہے کہ تم جس کے حق میں ہر قسم کی توہین و افترا روا رکھتے ہو وہ صاحب عزت و اکرام ہیں۔ یہود کی قدیم کتابوں میں کوئی دقیقہ حضرت مسیحؑ کی توہین و تحقیر کا اٹھا نہیں رہا ہے۔ یہ قرآن ہی کی برکت و اعجاز ہے کہ اس کے نزول کے بعد سے رفتہ رفتہ اب خود یہود کے لہجہ کی تلخی نرمی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ اور تالمود کے الزامات دہراتے ہوئے یہود کو شرم آنے لگی ہے۔ آخرت کے اعزاز کا مشاہدہ تو خیر جب ہوگا ہوگا۔ دنیا کا اعزاز اس سے ظاہر ہے کہ روئے زمین کے ۶۰-۷۰ کروڑ مسلمان آج انہیں اللہ کا پیغمبر برحق مان رہے ہیں۔ ان کا نام بغیر علیہ السلام کے نہیں لیتے اور کروڑوں کی تعداد میں عیسائی ہیں جو انہیں انسان کے مرتبہ سے بھی بلندتر سمجھ رہے ہیں یہ عقیدہ گو احمقانہ ہے لیکن بہرحال آپ کی تعظیم و احترام ہی سے ناشی ہے۔ مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ۔ قرآن مجید کا یہ کمال اعجاز ہے کہ ایک ایک لفظ سے پورا پورا مضمون ادا ہو جاتا ہے۔ یہاں اس لفظ سے ایک طرف تو آپ کا اصل مقام بتا دیا یعنی تقرب الٰہی

دوسری طرف یہودیت کے رد میں آپ کی شہادت دے دی۔ تیسری طرف من المقربین کی ترکیب نے یہ ظاہر کردیا کہ اس مقبولیت میں وہ منفرد نہیں، دوسرے بندے بھی ان کے ساتھ شریک ہیں اور مسیح اپنی عظمت و اجلال بہرحال عبدیت سے مافوق کوئی مرتبہ نہیں رکھتے۔ ۱۱۸ (نہ کہ معاذ اللہ ساحر یا شعبدہ باز یا بداخلاق جیسا کہ یہود نے افترا کر رکھا ہے) لیکن با ایں عظمت و اجلال بہرحال دوسرے ہی بندگان صالح کی طرح ہوں گے۔ من الصّٰلحین۔ ذکر ان میں مافوق کچھ اور جیسا کہ مسیحیو نے اپنے دل سے ٹھہرا لیا ہے۔ يُكَلِّمُ النَّاسَ۔ اس سے اشارہ نکلتا ہے آپکے جوش تبلیغ کی جانب۔ لوگوں سے آپ کی گفتگو قصہ کہانی کی نہیں یقیناً توحید و تصحیح عقائد ہی پر ہوگی۔ انجیلوں سے بھی جتنی شہادتیں ملتی ہیں سب سے تائید آپ کے جوش تبلیغ ہی کی ہوتی ہے۔ فِی الْمَهْدِ۔ یعنی بالکل بچپن سے۔ یا اس سن سے جو گہوارہ میں لیٹے رہنے کا ہوتا ہے۔ ای طفلًا (کشاف) حال کونہ طفلًا (بیضاوی) اتنی کم سنی سے گفتگو پر یہ قدرت اعجازی رنگ میں تھی۔ انجیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بارہ سال کے سن میں تبلیغ کرنے لگے تھے۔ اور اچھے اچھے دانا آپ کی گفتگو سن کر دنگ رہ جاتے تھے (لوقا۔ ۲: ۴۲-۴۷) كَهْلًا۔ سے مراد پختہ عمر سے ہے یعنی بچپن اور بڑھاپے کا درمیانی زمانہ اس کا اطلاق ۳۰ سے اوپر ۵۰ سال کے سن تک ہوتا ہے۔ الكهل بين حال الغلومة وحال الشيخوخة (قرطبی) الكهل ما بين الشاب والشيخ (راغب) حضرت مسیح کے بچپن اور پھر پختہ عمری کے ذکر سے اشارہ اس طرف بھی ہوگیا کہ ہر انسان کی طرح آپ کا نشو و نما بھی تدریجاً ہوتا رہا۔ اور یہ نشو و نما خود ایک مستقل دلیل رد الوہیت پر ہے۔ ۱۱۹ (بطریق مواصلت) حسب بیان انجیل حضرت مریم کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی اور رخصتی کے قبل نامزد شوہر سے خلوت یہودی قانون میں بالکل ممنوع تھی۔ قَالَتْ رَبِّ۔ انجیل میں اس مقام پر ہے کہ "مریم نے فرشتہ سے کہا" (لوقا ۱: ۳۴) قرآن مجید نے اپنے حسب دستور اس موقع پر بھی انجیل کے بیان کی تصحیح کرکے یہ بتادیا کہ مریم کی مخاطبت اب فرشتہ سے نہیں براہ راست حق تعالیٰ سے تھی اور

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿٤٨﴾ وَرَسُوْلًا

کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھا دے گا ۱۲۳ اور وہ پیمبر ہوگا

اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ

بنی اسرائیل کے لئے ۱۲۳ (اور کہے گا) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے

رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ

نشانی لیکر آیا ہوں، میں تمہارے لئے مٹی سے پرندوں کی مانند صورت بنا دیتا ہوں پھر

الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

اس میں دم کردیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى

میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور مبروص کو اچھا کردیتا ہوں اور (میں) اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کردیتا

بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ

ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ جمع کرتے ہو وہ تمہیں

فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

بتلا دیتا ہوں بیشک ان (سارے واقعات) میں تمہارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٤٩﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ

رکھتے ہو ۱۲۵ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی توریت

التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ

کی اور (اس لئے آیا ہوں) کہ تم پر جو کچھ حرام کردیا گیا تھا اس میں سے کچھ تم پر حلال کردوں

ہر صاحب نظر پر واضح ہے کہ اس سے مریم کا مرتبہ معرفت و ایمان کتنا بڑھ جاتا ہے۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ۔ فرشتہ کی زبان سے وہ پوری تقریر سن کر اب حضرت مریم اپنے مالک و مولیٰ سے یہ عرض کر رہی تھیں آپ کا یہ سوال ظاہر ہے کہ حیرت اور واقعہ کی غرابت کی بنا پر تھا نہ کہ شک و انکار کی بنا پر۔ فرشتہ یا فرشتوں کے دوبدو ہوجانے اور ان کی گفتگو سن لینے کے بعد انکار کا تو اب کوئی محل رہا ہی نہیں تھا۔ استبعاد البتہ باقی تھا جو عین لازمۂ بشریت تھا۔ انجیل نے اس موقع پر جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

"فرشتہ نے اس کے پاس اندر آکر کہا۔ سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے۔ خداوند تیرے ساتھ ہے۔ وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی۔ اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا کلام ہے۔ فرشتہ نے اس سے کہا اے مریم خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے۔ اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی۔ اس کا نام یسوع ہوگا وہ بزرگ ہوگا ...... مریم نے فرشتہ سے کہا۔ یہ کیونکر ہوگا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی اور فرشتہ نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی" (لوقا۔ ۱: ۲۸-۳۵)

۱۲۰ رفع استبعاد کے لئے حضرت مریم کو یہاں یاد دلایا جارہا ہے کہ نظر مسبب الاسباب پر رکھنی چاہیئے کہ وہی فاعل حقیقی ہے نہ کہ اسباب طبعی و ظاہری پر کہ ان کی حیثیت محض واسطہ اور ذریعہ کی ہے۔ كَذٰلِكِ۔ یعنی مس بشر کے بغیر ہی۔ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ۔ ابھی چند ہی آیتیں قبل ذکر زکریا علیہ السلام اور بڑھاپے میں ان کی اولاد کا آچکا ہے۔ وہاں اس موقع کے لئے جو آیت تھی اس کے الفاظ تھے كَذٰلِكَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ۔ وہاں یفعل اور یہاں یخلق کا استعمال محض اتفاقی نہیں۔ مفسر محقق ابو حیان غرناطی نے خوب لکھا ہے کہ وہاں تو ولادت عام سنت الٰہی کے مطابق یعنی مرد و زن کے اتصال سے تھی اگرچہ وہ مرد و زن سن سے اتر چکے تھے وہاں قدرت الٰہی کے اظہار کے لئے یفعل بالکل کافی تھا۔ برخلاف اس کے یہاں عام و جاری سنت الٰہی سے ہٹ کر بغیر مرد و زن کے اتصال کے صرف عورت ہی سے ولادت کا تحقق کرانا ہے۔ اس لئے یہاں لفظ بھی یخلق لایا گیا جو حق تعالیٰ کی صفت ایجاد و اختراع پر دلالت کر رہا ہے۔ هناك يفعل لانه ممكن اذ هو من ذكر وانثى مسنين وهنا يخلق لانه لم يعهد مولود من غير ذكر فجاء بلفظ يخلق الدال على الاختراع الصرف من غير مادة ذكر (بحر) من حيث ان امر زكريا داخل في الامكان العادي الذي يتعارف وان قل وفي قصة مريم يخلق لانه لا يتعارف مثلا وهو وجود ولد من غير والد فيه ايجاد واختراع من غير سبب عادي فلذلك جاء بلفظ يخلق الدال على هذا المعنى (بحر)

۱۲۱ (اور وہ ہوجاتا ہے خواہ اسباب کے واسطہ سے ہو یا بلا کسی سبب ظاہری کے) اس قسم کی آیتیں برابر ان فلسفیوں اور باطل مذہبوں کی رد میں ہیں جو حادث پر قیاس کرکے قدیم کو بھی سلسلۂ اسباب کا پابند سمجھتے ہیں۔ لَهٗ۔ تاولو نے ایک سوال یہ پیدا کیا ہے کہ کوئی شے جب ابھی سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو حق تعالیٰ کا خطاب اس سے ہوتا کس طرح ہے؟ کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی میں تو موجود ہی ہے یعنی اس کو حکم ہوتا ہے کہ خارج میں بھی موجود ہوجا۔ يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ۔ قول کن سے مراد اس دو حرفی لفظ کا تلفظ نہیں کہ یہ حروف تو خود ہی حادث ہیں۔ مراد اللہ تعالیٰ کا قول اس کیفیت کے ساتھ ہے جو اس کے شان کمال کے لائق ہے۔ اور جس طرح اس کی تمام صفات کی تفصیلات فہم بشری کی گرفت سے باہر ہیں اس کے قول کی بھی کیفیت تفصیل سے نہیں سمجھی جاسکتی۔ مراد صرف یہ کہ ارادۂ الٰہی اور اس کی تعمیل کے درمیان کوئی شے حائل یا حاجب نہیں۔

۱۲۲ يُعَلِّمُهُ میں ضمیر مفعول ظاہر ہے کہ ولد مریم یعنی حضرت عیسیٰ کی جانب ہے۔ حضرت کا جو مقام عظمت ان الفاظ سے بیان کرنا مقصود ہے وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خود مریم کی بھی تشفی خاطر کا کتنا سامان ضمناً ہوا جارہا ہے۔ ارشاد گویا یہ ہورہا ہے کہ تم غم نہ کرو اور پریشان نہ ہو۔ بے شوہر ہی اولاد کی بنا پر خلق تمہیں جتنا بدنام اور مطعون کرے گی، اس کی تلافی کے لئے اولاد بھی تمہیں کس پایہ کی مرحمت کی جارہی ہے۔ الْكِتٰبَ۔ یعنی کتب سماوی۔ لفظ کتاب بطور اسم جنس استعمال ہوا ہے۔ ذهب كثيرون الى ان ال فيه للجنس والمراد جنس الكتب الالٰهية (روح) الْحِكْمَةَ۔ حکمت سے مراد یا تو جمیع امور دین ہیں اور اس سے ضمناً اس پر بھی روشنی پڑجاتی ہے کہ پیمبر دینی تعلیم اپنی کتاب یا صحیفہ کے علاوہ بھی لے کر آتے ہیں۔ اور یا تہذیب اخلاق جميع ما علمه من امور الدين (روح) المراد بالحكمة تعليم العلوم و تهذيب الاخلاق (کبیر)

۱۲۳ رَسُوْلًا۔ آپ کا مرتبہ پیمبری کا ہوگا۔ نہ آپ معاذ اللہ ساحر و شعبدہ باز ہوں گے جیسا کہ بدتمیز یہود نے آپ کو سمجھا۔ اور نہ (نعوذ باللہ) آپ خود خدا یا فرزند خدا ہوں گے۔ جیسا کہ نصرانیوں نے اپنی بیہودگی سے فرض کرلیا۔ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ یہ بالکل صریح ہے اس باب میں کہ آپ کی دعوت بنی اسرائیل تک محدود تھی اور دوسرے بنی اسرائیلی پیمبروں کی طرح آپ بھی صرف قومی نبی تھے۔ انجیل تک میں یہ تصریح۔ اتنی تحریفوں کے بعد بھی باقی رہ گئی ہے:- "ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔" (متی ۱۰: ۵-۶) "اس نے جواب میں کہا کہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (متی ۱۵: ۲۴) تقریباً دو ہزار سال کی کلیسا کی ساری ملمع سازیوں کے بعد بھی آج بھی خود مسیحی فاضلوں کو اقرار ہے کہ تبلیغ نصرانیت کی یہ عالمگیری ایجاد بندہ ہے ورنہ خود حضرت مسیح کے ہاں اس تعلیم کا پتہ نہیں۔ "مسیح نے اسرائیل کے باہر اپنے مرید تلاش نہیں کئے" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۵ طبع چہارم) اور مسیح تو مسیح حواریوں تک کو بھی یہ خیال نہ تھا۔ "اولین شاگردوں کو تعلیم مسیح کی عالمگیری کا احساس نہ ہوا" (ایضاً ص ۶۳۲)

۱۲۴ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ۔ آیة کے لغوی معنی نشان کے ہیں۔ یہاں معجزہ کے مفہوم میں آیا ہے۔ معجزہ ایسے واقعہ کے ظہور کا نام ہے جو عام و متعارف سلسلۂ اسباب سے الگ ہو پیمبر کے ذریعہ سے ایسے غیر عادی واقعہ کا وقوع اس امر کی دلیل ہوتا تھا کہ نصرت حق و تائید الٰہی پیمبر کے ساتھ ہے۔ معجزہ کا فاعل کائنات کے بڑے چھوٹے معمولی

وَجِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴿٥٠﴾

اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشانی لیکر آیا ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ‌ؕ هٰذَا صِرَاطٌ

بیشک اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے سو اُسی کی عبادت کرو یہی میری

مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿٥١﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيۡسٰى مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ

راہ ہے سیدھی پھر جب عیسیٰ نے اُن کی طرف سے انکار ہی پایا تو

قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ‌ ؕ قَالَ الۡحَـوَارِيُّوۡنَ

بولے میرا کون مددگار ہوگا اللہ کے لئے حواری بولے ہم ہیں

نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ‌ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشۡهَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿٥٢﴾

اللہ کے مددگار ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہیے گا کہ ہم فرمانبردار ہیں

رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ وَاتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے اُس پر جو کچھ تو نے نازل کیا ہے اور ہم نے پیروی (اختیار) کی رسول کی سو ہم کو

الشّٰهِدِيۡنَ ﴿٥٣﴾ وَمَكَرُوۡا وَمَكَرَ اللّٰهُ‌ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ ﴿٥٤﴾

بھی گواہوں کے ساتھ لکھ لے اور انہوں نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ بہترین خفیہ تدبیر والا ہے

ع ٥ / ١٤ / ١٣

اِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسٰۤى اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ

(وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ میں تم کو موت دینے والا ہوں اور تم کو اپنی طرف (ابھی)

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَجَاعِلُ الَّذِيۡنَ

اٹھا لینے والا ہوں اور ان لوگوں سے تجھ کو پاک کر دینے والا ہوں جو کافر ہیں اور جو تمہارے

غیر معمولی ہر واقعہ کی طرح صرف اللہ تعالیٰ ہوتا ہے پیمبر محض واسطہ یا ذریعہ ہوتا ہو۔ جو لوگ ایک قادرِ مطلق کے وجود کے قائل ہیں ان کیلئے کسی بڑے سے بڑے معجزہ کا نفسی امکان تو قابلِ انکار بلکہ قابلِ اشتباہ بھی ہو ہی نہیں سکتا۔ طبعی، غیر طبعی، عادی، غیر عادی، متعارف و مجہول ہی وغیرہ اسباب کی تفریق تو بشری تجربات کے لحاظ سے ہو۔ قادرِ مطلق کے لئے سب بالکل یکساں ہیں۔ اب رہا کسی متعین معجزہ کا ثبوت تو اس کا تعلق منطق سے نہیں تاریخ سے، عقل سے نہیں نقل سے درایت سے نہیں روایت سے ہے۔ ظن وتخمین کا یہاں دخل نہیں۔ اب گفتگو صرف سندِ متصل اور شہادتِ معتبر کی رُو سے ہوگی۔ معجزاتِ مسیح کا ذکر انجیلوں میں بکثرت آیا ہے۔ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ۔ یہ اضافہ اس حقیقت کی تاکید اور اس پر زور دینے کے لئے ہے کہ معجزہ کا ظہور حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ ذکر پیمبر کے اختیار و قدرت سے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے مقصود پیمبر ہی کی تائید و نصرت ہوتی ہے ۱۲۵ یعنی اگر تم خبثِ باطن اور ضد وعناد کو چھوڑ کر ایمان کے طالب اور یقین و اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اَخۡلُقُ۔ فعل خلق کا انتساب جب خالق کی جانب ہوتا ہے تو اس سے مُراد نیست سے ہست کرنا، عدم سے وجود میں لانا ہوتا ہے۔ اور جب انسان کی جانب ہوتا ہے تو اس سے مُراد ہوتا ہے اندازہ کرنا، ایک خاص انداز سے بنانا اور صُورت پیدا کرنا اور یہاں یہی معنی مُراد ہیں۔ خلقه تقديره ولم يرد انه يحدث معدوما (تاج) الخلق اصله التقدير المستقيم (راغب) الذى يكون بالاستحالة فقد جعله الله تعالى بغيره فى بعض الاحوال والخلق لا يستعمل فى كافة الناس الا على وجهين احدهما فى معنى التقدير (راغب) اى أقدر وأصور (كبير) والمراد بالخلق التصوير والابراز على مقدار معين (روح) لَكُمۡ۔ یعنی تم میں یقین پیدا کرنے کے لئے۔ اى لاجل تحصيل ايمانكم ودفع تكذيبكم اياى (روح) واللام فى لكم معناه التعليل (بحر) عوام ہمیشہ بجائے دلائل و عقلیات کے معجزہ و خارقِ عادت ہی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور یہود تو اپنی ہجو پسندی میں خصوصیت کے ساتھ بڑھے ہوئے تھے۔ مِّنَ الطِّيۡنِ۔ اس فقرہ نے اور زیادہ کھول کر اس حقیقت کو حضرت کی زبان سے ادا کر دیا ہے کہ میں عدمِ محض سے وجود میں ہرگز نہیں لاتا صرف مادہ میں ایک خاص ترکیب و ترتیب کے ساتھ تصرف کر دیتا ہوں۔ تقييد بانه لا يوجد من العدم الصرف بل ذكر المادة التى يشكل منها صورة الطير (بحر) كَهَيۡـــَٔةِ الطَّيۡرِ یعنی پرندوں کی شکل کے کھلونے مٹی سے بناتا ہوں۔ طَيۡر یہاں بطور اسم جنس کے ہے۔ فَاَنۡفُخُ فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًا یعنی میری نفخ دم سے اُن میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ سچ مچ کے پرندے بن کر اُڑنے لگتے ہیں۔ چاروں انجیلیں جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کے نزدیک مستند ہیں ان میں اس معجزہ کا ذکر نہیں لیکن جو انجیل کلیسائے قبط (مصر) Coptic Church کی مستند الیہ ہے، اُس میں یہ صاف مذکور ہے جیسا کہ ڈاکٹر بج Budge نے اپنی کتاب Legends of our Lady Mary کے مقدمہ صفحہ ۲۹ میں نقل کیا ہے کہ:۔ "وہ پرندوں کی شکل کے جانور بنا دیتے تھے جو اُڑ سکتے تھے"۔ بِاِذۡنِ اللّٰهِ۔ یعنی یہ جو کچھ بھی میں کر دکھاتا ہوں، اسے کہیں میری قوت و قدرت کا نتیجہ نہ سمجھ لینا یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے سب محض مشیتِ خداوندی و قدرتِ الٰہی کا ثمرہ ہے۔ الۡاَكۡمَهَ۔ اندھوں کو بغیر اپریشن کے بینا کر دینا یُوں بھی آسان نہیں چہ جائیکہ مادرزاد اندھوں کو، اور اکمہ ایسے ہی کو کہتے ہیں۔ اس معجزہ مسیح کا ذکر انجیلوں میں متعدد مقامات پر ہے مثلاً انجیل متی ۹: ۲۷، ۳۰ میں اور انجیل مرقس ۸: ۲۲-۲۵ میں لیکن سب سے زیادہ تفصیل انجیل یوحنا ۹: ۱-۷ میں ہے اور اس میں تصریح اندھے کے مادرزاد یا پیدائشی ہونے کی ہے۔ الۡاَبۡرَصَ۔ کوڑھیوں کے اچھا کرنے کا ذکر انجیل میں دو جگہ ہے۔ ایک جگہ ایک کوڑھی کو شفا دینے کا اور دوسری جگہ دس کوڑھیوں کو "جب وہ اس پہاڑ سے اُترا تو بہت سی بھیڑ اُس کے پیچھے ہولی اور دیکھو ایک کوڑھی نے پاس آکر اُسے سجدہ کیا اور کہا۔ اے خداوند اگر تو چاہے تو مجھے پاک صاف کر سکتا ہے اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے چھُوا اور کہا میں چاہتا ہوں تو پاک صاف ہو جا۔ وہ فوراً کوڑھ سے پاک صاف ہو گیا" (متی ۸: ۱-۳) "اور ایسا ہوا کہ یروشلیم کو جاتے ہوئے وہ سامریہ اور گلیل کے بیچ سے ہو کر جا رہا تھا اور ایک گاؤں میں داخل ہوتے وقت دس کوڑھی اس کو ملے۔ اُنھوں نے دُور کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ اے یسوع، اے صاحب ہم پر رحم کر اُس نے انہیں دیکھ کر کہا جاؤ اپنے تئیں کاہنوں کو دکھاؤ اور ایسا ہوا کہ وہ جاتے جاتے پاک صاف ہو گئے" (لوقا ۱۷: ۱۱-۱۴) انجیل کے جدید ناقدوں نے طرح طرح پر جرح کر کے پچھلی صدی میں اناجیل اربعہ کا گوشہ گوشہ مجروح کر ڈالا ہے۔ لیکن اتنے جُزو پر یہ ناقدین بھی متفق ہیں کہ مسیح کے معجزاتِ شفا بخشی ثابت شدہ ہیں۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۵ ص ۶۲) نیز انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جو خاص انھی تنقیدات کیلئے ہے اس کا کالم ۲۴۳۵۔ اُحۡىِ الۡمَوۡتٰى۔ برنباحواری کی جو انجیل چلی آرہی ہے اس میں تو معجزہ احیاء اموات کی تصریح بھی موجود ہے (صفحہ ۳۳۳ انگریزی ایڈیشن) رہیں اور اور انجیلیں جو موجودہ مسیحیوں کو مسلّم اور اُن کے نزدیک مستند ہیں وہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں بلکہ ان میں متعدد مثالیں اس قسم کے معجزہ کی مذکور ہیں چنانچہ لوقا جو یونان میں طبیب کی حیثیت سے مشہور تھے اُن کی جانب منسوب انجیل میں یہ درج ہے:۔ "تھوڑے عرصہ کے بعد ایسا ہوا کہ وہ نائین نامی ایک شہر کو گیا اور اُس کے شاگرد اور بہت سے لوگ اس کے ہمراہ تھے جب وہ شہر کے پھاٹک کے نزدیک پہنچا تو دیکھو ایک مُردے کو باہر لئے جاتے تھے وہ اپنی ماں کا اکلوتا تھا اور وہ بیوہ تھی اور شہر کے بہتیرے لوگ اُس کے ساتھ تھے اُسے دیکھ کر خداوند کو ترس آیا اور اُس سے کہا رو نہیں۔ پھر اُس نے پاس آکر جنازے کو چھُوا اور اُٹھانے والے کھڑے ہوگئے اور اُس نے کہا اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اُٹھ وہ مُردہ اُٹھ بیٹھا اور بولنے لگا اور اس نے اُسے اُس کی ماں کو سونپ دیا اور سب پر دہشت چھاگئی" (لوقا ۷: ۱۱-۱۶) نیز ۸: ۴۲ انجیل متی (۹: ۱۸-۲۵) میں ایک تازہ میت (ایک سردار کی لڑکی) کے جلا اُٹھانے کا ذکر ہے۔ اور انجیل یوحنا (۱۱: ۱-۴۴) میں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک چار روز کے دفن شدہ مُردہ لعزر کے احیا کا۔ بِاِذۡنِ اللّٰهِ۔ مزید تاکید و تصریح کے لئے اس فقرہ کو مکرر لایا گیا ہو کہ کہیں ان اعجازی تصرفات کو میری جانب نہ منسوب کر دینا۔ جو کچھ بھی ہوا محض خدائے برحق کی قدرت و مشیت سے ہوا۔ صوفیۂ عارفین نے کہا ہے کہ بعض اہل حال سے جو ایسے اقوال منقول ہیں جن میں وہ اپنی جانب ایسے افعال کو منسوب کر گئے ہیں جو حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں تو بشرطِ صحتِ نقل وہ دعویٰ غلبۂ حال پر محمول ہوں گے لیکن ان میں جو اہلِ ادب ہیں وہ ہر ایسے موقع پر حضرت مسیحؑ ہی کی طرح باذن اللہ یا اس کے مرادف کسی فقرہ کی قید لگا دیتے ہیں۔ اُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ یہ بات آیت نے مثال اور نمونہ کے طور پر فرمائی یعنی تمہاری مخفی چیزوں پر بھی اللہ مجھے مطلع کر دیتا ہے۔ اٰيَةً۔ یعنی نشان میرے پیمبر اور مؤید من اللہ ہونے کا۔ حضرت مسیح کے ہاتھ سے خوارق کا بکثرت صادر ہونا تاریخ کا ایک مسلّم واقعہ ہے خواہ ان کی توجیہ منکرین کچھ بھی کرتے رہے ہوں۔ یہودنے انھی خوارق کو دیکھ کر آپ کو ساحر و شعبدہ باز کہنا شروع کر دیا چنانچہ جوزیفس (المتوفی سنہ ۹۵ء) نے اپنی تاریخ آثارِ یہود میں آپ کا ذکر اس حیثیت سے کیا ہے اور جیوش انسائیکلوپیڈیا میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے:۔ "یسوع نے بحیثیت معلمِ دین یا قانون ساز کے نہیں بلکہ بحیثیت شعبدہ باز کے اپنی زندگی میں شہرت و ناموری گلیل کے سادہ مزاج باشندوں میں حاصل کی" (جلد ۷ صفحہ ۱۷۰) ۱۳۶ (یہ ارشادِ خداوندی) مُصَدِّقًا۔۔۔ التَّوۡرٰىةِ۔ کوئی نیا نبی پُرانے نبی کی تردید و تغلیط کے لئے نہیں آتا۔ (اس قسم کی تحقیقات صرف حکمار و فلاسفہ کو مبارک رہے) بلکہ ہر جدید پیامبر پیامِ قدیم کی تجدید و تکمیل ہی کے لئے آتا ہے۔ حضرت مسیحؑ بھی یہاں یہود سے یہی کہہ رہے ہیں کہ میں شریعتِ موسوی کے مٹانے کے لئے نہیں اُن کی تجدید و تصدیق کے لئے آیا ہوں۔ اس قسم کی تصریحات مروجہ انجیل میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پُورا کرنے آیا ہوں" (متی ۵: ۱۷) "آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطہ کے مٹ جانے سے آسان ہے" (لوقا ۱۶: ۱۷) (انجیلی بیان

میں شریعت سے مراد شریعت موسوی ہی ہو سکتی ہے) وَلِاُحِلَّ لَکُمْ یعنی شریعت موسوی میں جو چیزیں تم پر حرام تھیں۔ قانونی جزئیات اور بعض فروع میں ترمیم و تسہیل، عمومی تصدیق و تائید کے ذرا بھی منافی نہیں۔ اَحَلَّ لَکُمْ مسیحی تعلیم نے قدیم موسوی شریعت میں جو بعض سہولتیں اور آسانیاں پیدا کر دی تھیں ان کا ذکر انجیل مرقومہ میں بھی موجود ہے۔ مثلاً:- "اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو، سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام دوں گا۔ میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی کیونکہ میرا جوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا" (متی ۱۱-۲۸ تا ۳۰) یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ تمہارے حبروں اور ربیوں نے اپنی طرف سے جو احکام توریت میں غلط کر دیئے ہیں میں اس سارے بوجھ کو تم سے دور کرنے آیا ہوں ف۱۲۷ (اپنی نبوت و رسالت کا) اٰیَۃٍ نشان کا لفظ دلائل معجزات سب پر حاوی ہے۔ اور لفظ کے مفرد ہونے سے یہ خیال نہ ہو کہ معنی بھی صیغۂ واحد میں ہے اور کوئی ایک مخصوص نشان مراد ہے۔ اٰیۃ بطور اسم جنس کے ہے اور مراد اس سے سارے ثبوت اور شواہد حضرتؑ کی صداقت کے ہیں۔ انما وحد وھی اٰیات لانھا جنس واحد فی الدلالۃ علی رسالتہ (قرطبی)۔ خطاب بنی اسرائیل کو ہے ف۱۲۸ (بہ حیثیت رسولِ خدا ہونے کے) فَاتَّقُوا اللّٰہَ یعنی اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول کی تکذیب کی جرأت نہ کرو ف۱۲۹ (جس کی تعلیم ابتداء سے لیکر آخر تک سارے ہی پیمبر دیتے آئے ہیں)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم اسی عبدیت اور اسی توحید کی تھی۔ ظالموں نے اسے مسخ کر کے تثلیث بنا دیا۔ جو شرک ہی کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے۔ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ اس میں اشارہ اسی طرف ہے کہ اللہ کے مخلوق، مربوب اور عبد ہونے کے اعتبار سے پیمبر اور امتی سب یکساں ہیں۔ فَاعْبُدُوْہُ یعنی صرف اسی کی پرستش کرو، بغیر کسی کی شرکت و آمیزش کے۔ آج جو انجیلیں دنیا کے پردہ پر موجود ہیں ان میں سے ایک انجیل برنابا بھی ہے اس کے انگریزی، عربی، اردو ترجمے موجود ہیں اور

تلک الرسل ٣ — ۱۳٦ — اٰل عمرٰن ٣

اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ
پیرو ہیں انہیں قیامت تک ان لوگوں پر غالب رکھنے والا ہوں جو منکر ہیں ف۱۳۰ تم سب کی

إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ
واپسی میری طرف ہوگی سو میں تمہارے درمیان اس باب میں فیصلہ کروں گا جس میں تم (باہم)

تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا
اختلاف کرتے رہتے تھے ف۱۳۱ سو جن لوگوں نے کفر (اختیار) کیا انہیں دنیا اور

شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن
آخرت میں سخت سزا دوں گا اور ان کا کوئی مددگار

نَّاصِرِينَ ﴿٥٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
نہ ہوگا ف۱۳۲ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کئے سو اللہ

فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٥٧﴾
انہیں ان کے پورے پورے صلے دے گا اور اللہ ناانصافوں کو دوست نہیں رکھتا ف۱۳۳

ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ﴿٥٨﴾
یہ جسے ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں، نشانیوں میں سے ہے اور پرحکمت مضمون میں سے ف۱۳۴

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن
بیشک عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک مثل آدم کے حال کے ہے، اللہ نے ان کو مٹی سے

تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ
بنایا پھر ان سے کہا وجود میں آجاؤ چنانچہ وہ وجود میں آگئے ف۱۳۵ یہ امرِ حق تیرے رب کی طرف سے ہے

منزل ۱

وہ حضرت برنابا نامی حضرتؑ کے ایک حواری کی جانب منسوب ہے۔ اس میں ظہورِ اسلام کی خبریں اور حضرت ختم رسلؐ کی بابت پیشگوئیاں ایسے صاف و صریح لفظوں میں موجود ہیں کہ مسیحیوں کو مفر اسی میں نظر آیا کہ اسے جعلی کہہ کر الگ کر دیں۔ خیر وہ تو ہر سچے سفیرِ الٰہی کے کلام کی طرح توحید کی تعلیم و تاکید سے لبریز ہی ہے لیکن دوسری انجیلیں بھی جو خود کلیسا کے نزدیک مستند ہیں وہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ مثلاً:- یسوع نے اس سے کہا۔ اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴-۱۰) تثلیث کا شرک جن ظالموں کی بھی ایجاد ہو بہرحال حضرت مسیح کا دامن اقدس اس آلودگی سے بالکل پاک اور منزہ ہے ف۱۳۰ (اپنی ہر سعی اور تبلیغ کے باوجود) اَحَسَّ یعنی پا لیا، محسوس کیا حواس ظاہری سے۔ معناہ علم و وجد قالہ الزجاج و قال ابو عبیدہ معنی احس عرف (قرطبی) لا یقال ذلک الا فی ما کان من جھۃ الحاسۃ (راغب)، تحقق ما ید رکہ بالحواس (بیضاوی) مِنْھُمْ یعنی اپنے مخاطبین کی طرف سے جو بنی اسرائیل یا یہود تھے۔ ای من بنی اسرائیل (قرطبی) اَلْکُفْرَ یعنی انکار نبوتِ عیسوی سے اور انکار بھی ظلم و تعدی کے ساتھ۔ یہ انکار و طغیان علانیہ و برملا تھا۔ کوئی دقیق و مخفی شے نہ تھی جو مستنبط کی جاتی بلکہ حواس ظاہری ہی سے محسوس ہونے والی کھلی ہوئی چیز تھی اور یہی نکتہ ہو کہ یہاں فعل احس استعمال کیا گیا جس کے معنی بالکل ظاہر ظہور پانے کے ہیں۔ فتنبیہ انہ قد ظہر منھم الکفر ظہورًا بان للحس فضلا عن الفہم (راغب) ف۱۳۱ آپؑ نے اپنی قوم کو نصرتِ دین کے لئے جو پکارا اس سے محققین نے یہ استنباط کیا ہے کہ اہل دین سے دین کے بارہ میں مدد طلب کرنا توکل کے ذرا بھی منافی نہیں۔ ان سے یہ مدد طلب کرنا اسی حیثیت سے ہوتا ہے یہ نصرتِ الٰہی کے مظاہر ہوتے ہیں۔ اِلَی اللّٰہِ یعنی اللہ کی راہ میں۔ اللہ کے دین کے لئے۔ قال الحسن المعنی من انصاری فی السبیل الی اللہ (قرطبی)، قال ابو علی الفارسی معنی الی اللہ للہ (بحر)، الی ھھنا بمعنی مع او فی او اللام (بیضاوی) اَلْحَوَارِیُّوْنَ حواری کے لفظی معنی کپڑا دھو کر اسے صاف اور اجلا کر دینے والے ہیں کے۔ حورت الشیء بیضتہ ودورتہ (راغب) واصل الحور فی اللغۃ البیاض وحورت الثیاب بیضتھا (قرطبی)۔ حضرت مسیح کے ابتدائی مرید چونکہ عموماً دریا کے کنارے کام کرنے والے ماہی گیر تھے اس لئے آپؑ کے بعد کے بھی رفیقوں، شاگردوں کا یہی لقب پڑ گیا۔ مجازی معنی مخلص مددگار کے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضرت زبیرؓ کے لئے یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ الحواری ایضا الناصر (قرطبی)؛ وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل نبی حواری وحواری الزبیر (راغب)؛ حواری الرجل صفوتہ وخالصتہ (کشاف)۔ بہرحال وجہ تسمیہ جو کچھ بھی ہو مسیح کے صحابیوں کے لئے لقب یہی چلا ہوا تھا۔ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ حضرت عیسیٰؑ نے تو اپنے مددگار طلب کئے تھے من انصاری کو خدا کے کام کے لئے۔ حواری جواب میں اپنے کو خدا کے مددگار انصار اللہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ نحن انصارک الی اللہ محققین نے اس سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ معاملہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنا ف۱۳۲ مُسْلِمُوْنَ مسلم ہی کا لفظی ترجمہ فرمان بردار ہے۔ مسلم کا اطلاق ہر نبی کے پیرو پر ہوتا ہے کہ حقیقۃً ہر نبی کی دعوت اللہ کی فرمان برداری ہی کی ہوتی ہے۔ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ حواریوں کا سارا زور ایمان باللہ پر ہے۔ "ابن اللہ" کے تو تخیل سے بھی وہ بیچارہ آشنا نہ تھے ف۱۳۳ مسیح کے صحابی ابھی مسیح سے گفتگو کر رہے تھے وفعۃً براہ راست حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے۔ قرآن مجید اکثر ایسے موقعوں پر یہی کرتا ہے کہ بندوں کے خطاب کا رخ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پھیر دیتا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا۔ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ حضرت مسیح کے معاصر مسیحی آپؑ کو رسول ہی تسلیم کرتے تھے۔ "ابن اللہ" "اقنوم" وغیرہ کے خرافات اس وقت تک نہ ایجاد ہوئے تھے نہ ہو سکتے تھے۔ الشّٰھِدِیْنَ گواہ تیری توحید کے اور تیرے پیمبروں کی پیمبری کے ف۱۳۴ مَکَرُوْا کا اسم فاعل یہود ہیں۔ یہود کے اکابر اور سرداروں نے مخالفت و ایذاء کے بہت سے درجے طے کرنے کے بعد بالآخر طے کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کو ختم ہی کر دینا چاہیئے چنانچہ پہلے اپنی مذہبی عدالت میں الحاد کا الزام لگا آپؑ کو واجب القتل قرار دیا۔ پھر رومی حاکموں کی ملکی عدالت میں لا کر ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ حضرت عیسیٰؑ اور آپ کے مخالفین کا یہ معرکہ ملک شام کے صوبہ فلسطین میں پیش آیا تھا۔ شام اس وقت رومی سلطنت کا ایک جز تھا۔ اور یہاں کے یہودی باشندوں کو اپنے معاملات میں نیم آزادی اور نیم خود مختاری حاصل تھی جیسے انگریزی حکومت کے ماتحت والیانِ ریاست کو حاصل رہتی ہے۔ شہنشاہ روم کی طرف سے ایک نائب السلطنت (وائسرائے) شام کا تھا۔ اور اس کے ماتحت ایک والی یا امیر فلسطین کا تھا۔ رومیوں کا مذہب شرک و بت پرستی کا تھا۔ یہود کو اتنا اختیار حاصل تھا کہ اپنے لوگوں کے مقدمات اپنی مذہبی عدالتوں میں لائیں لیکن سزاؤں کے نفاذ کیلئے انہیں پھر انہی مجرموں کو ملکی عدالتوں کے سامنے لانا پڑتا تھا۔ جرم الحاد میں فتویٰ قتل خود یہود کی مذہبی عدالت دے سکتی تھی لیکن واقعۃً سزائے موت کا نفاذ صرف رومی ملکی عدالت کے قبضہ میں تھا۔ اور سزائے موت رومی حکومت میں سولی کی شکل میں دی جاتی تھی۔ یہود کی اسی گہری اسکیم کی جانب اشارہ قرآن مجید کے لفظ مکروا میں ہے۔ وَمَکَرَ اللّٰہُ یعنی اللہ نے مخالفین و معاندین کی ساری تدبیریں، ساری سازشیں الٹ دیں اور حضرت مسیح کو سولی کی موت سے بچا لیا۔ عربی زبان میں ایک قاعدہ مشاکلت کا ہے۔ یعنی کسی فعل کی سزا یا جواب کو بھی بجنسہ اسی فعل کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے اور اس طرز ادا میں مطلق کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً کسی نے زید پر حملہ کیا، اور زید نے اس کا جواب دیا۔ تو عربی کا محاورہ میں یوں کہیں گے کہ اس نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اس پر حملہ کیا حالانکہ زید کا "حملہ" مطلق نہ ہوگا۔ بلکہ صرف سزائے حملہ ہوگی یا زیادہ سے زیادہ جوابی حملہ" یا کوئی مجھے ٹھگ لے اور میں اس سے انتقام لوں تو عربی میں پیرایہ ادا یہ ہوگا کہ اس نے مجھے ٹھگا۔ اور میں نے بھی اسے ٹھگ لیا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ میری طرف سے ٹھگنے کی سزا ہی ملے گی۔ اس اصل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں سے کہ "(۱) مکروا ومکر اللہ انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ

سو کہیں تو شبہ کرنے والوں میں نہ ہو جانا ۱۳۲ پھر جو کوئی آپ سے اس باب میں حجت کرے بعد اس کے کہ

مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ

آپکے پاس علم (یقینی) پہنچ چکا ہے ۱۳۳ تو آپ کہہ دیجیے کہ اچھا آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بھی بلائیں اور تمہارے

وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ

بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو بھی اور تمہارے تئیں بھی پھر ہم

فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ

خشوع سے دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں ۱۳۴ بے شک یہی ہے

الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ

سچا واقعہ کوئی معبود نہیں ہے بجز اللہ کے اور بیشک اللہ

لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

ہی زبردست ہے حکمت والا ہے ۱۳۵ سو اگر یہ (اب بھی) سرتابی رکھیں تو بیشک اللہ

عَلِيْمٌ ۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا

خوب جاننے والا ہے مفسدوں کا ۱۳۶ آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسے قول کی طرف

اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ

آجاؤ جو ہم میں تم میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے کسی کی عبادت

وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا

نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں ۱۳۷ اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے علاوہ

ع ۶ ۱۴

منزل

مکر کیا۔ (۲) یَمْکُرُوْنَ بِکَیْدٍ وَنَکِیْدُ اِنَّهُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّ اَکِیْدُ کَیْدًا وہ کید سے کام لیتے ہیں اور میں بھی "کید" سے کام لیتا ہوں۔ (۳) جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا "برائی" کی سزا ویسی ہی ایک "برائی" ہے۔ (۴) قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو محض ہنسی کرتے ہیں، اللہ ان سے ہنسی کرتا ہے۔ (۵) فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ جو تم پر زیادتی کرتا ہے، تم اس پر زیادتی کرو۔ جو اشکال محض ترجمہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے وہ از خود حل ہو جاتا ہے۔ ان تمام مثالوں میں جوابی اور سزائی "مکر" نہ مکر ہے، نہ "کید" کید ہے۔ نہ "سیئۃ" سیئۃ ہے، نہ استہزاء، استہزاء، نہ زیادتی زیادتی ہے۔ بلکہ ہر موقع پر مراد صرف سزائے مکر، سزائے کید، سزائے سیئۃ، سزائے استہزاء اور سزائے اعتداء ہے۔ تو اس جوابی و تعزیری مکر اللہ پر کوئی سوال ہی نہیں عائد ہوتا۔ لیکن اس کے علاوہ عربی میں مکر میں کوئی ذم کا پہلو لازمی طور پر ہے بھی نہیں۔ مکر محمود بھی ہو سکتا ہے اور مکر مذموم بھی۔ اصل معنی صرف خفیہ تدبیر، گہری تدبیر یا انگریزی میں Plan کے ہیں۔ المکر الخدیعة والاحتیال وقال اللیث احتیال فی خفیة (تاج) وفی البصائر المکر ضربان محمود وهو ما یتحری به امر جمیل ومذموم وهو ما یتحری به فعل ذمیم (تاج) المکر صرف الغیر عما یقصده بحیلة وذلك ضربان مکر محمود ومذموم (راغب) پس جس کسی ہندی نے اردو کے مکر و فریب پر قیاس کر کے مکر اللہ پر حرف گیری کی ہے، اس نے خود اپنی جہالت کا پردہ فاش کیا ہے۔ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ اور اللہ کی تدبیریں سب سے اونچی اور سب پر غالب آنے والی ہیں اس کا مقابلہ جس طرح کوئی جسمانی قوت اور مادی زور سے نہیں کر سکتا اسی طرح کسی کی عقل، تدبیر اس کے سامنے پیش نہیں پا سکتی۔ چنانچہ یہاں بھی اُس کی حکمت و تدبیر کارگر رہی۔ حضرت عیسیٰؑ زندہ و سلامت رہے۔ اور صلیب دیتے وقت یہود عوام نے تو ہجوم و ازدحام کے گڑبڑ اور وقت کی تنگی سے اور سُولی گھر کے رومی سپاہیوں نے شناخت نہ ہونے کی بنا پر یوں کہا کہ حضرتؑ ہی کے قوم کے کسی ہم شکل، ہم عمر، ہم وضع کو سُولی پر چڑھا دیا۔ کلیسا کا آج عام عقیدہ حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہونے، صلیب پر وفات پانے اور پھر تیسرے دن جی اٹھنے کا ہے لیکن مسیحیوں کے بعض قدیم فرقے Basiledious باسلیدیہ وغیرہ) ٹھیک اسی اسلامی عقیدہ کے مُوید ہیں

۱۳۵ (حضرت عیسیٰؑ سے ان کی گرفتاری کے موقع پر) واقعات و حالات کی رفتار سے حضرت عیسیٰؑ کو اپنا انجام یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہود انھیں گرفتار کئے اور ان پر مقدمہ چلائے بغیر نہ رہیں گے۔ اور پھر رُومیوں کی ملکی عدالت میں لے جا کر انھیں سزائے موت دلوائیں گے۔ یہ ارشاد الٰہی حضرتؑ سے ان کی تسکین کے لئے اسی موقع گرفتاری پر ہوتا ہے ۱۳۶ (تمہارے وقت معہود پر) سو تم ان ظالموں کے مکر و عداوت سے گھبراؤ نہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ای مستوفی اجلك ومعناه انی عاصمك من ان یقتلك الکفار ومؤخرك الی اجل کتبته لك (کشاف) ممیتك حتف انفك لا قتلا بایدیهم (مدارك) ومؤخرك الی اجلك المسمی عاصما ایاك من قتلهم (بیضاوی) انی متمم عمرك فحینئذ اتوفاك فلا اترکهم حتی یقتلوك بل انا رافعك الی سمآئی ومقربك بملائکتی واصونك عن ان یتمکنوا من قتلك وهذا تاویل حسن (کبیر) تَوَفِّی کے معنی میں پورا پورا دینے کا مفہوم شامل ہے۔ اس لئے اشارۃً گویا یہ بھی ارشاد ہو گیا کہ تمہیں طول حیات پورا پورا ملے گا ۱۳۷ (اس درمیان میں) یعنی تمہاری وفات تو اپنے وقت مقرر پر جب ہو گی ہو گی۔ تمہارے دشمن تمہاری ہلاکت کے کسی منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ سردست اس کا انتظام یوں کیا جا رہا ہے کہ تمہیں ان کے درمیان سے اٹھا لیا جائے گا۔ اِلَیَّ یعنی آسمان کی طرف۔ ملاء اعلیٰ کی جانب۔ امام رازیؒ نے کہا ہے کہ قرآن میں یہ محاورہ عام ہے۔ جہاں تعظیم و تفخیم مقصود ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی جانب منسوب کر دیتا ہے۔ مثلاً ہجرت ابراہیمیؑ کی عظمت کا اظہار مقصود تھا تو پیرایہ بیان یہ رکھا گیا۔ انی ذاهب الی ربی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ ہجرت ابراہیمیؑ عراق سے شام کی طرف ہوئی تھی۔ ای الی سمآئی ومقر ملائکتی (کشاف) ای محل کرامتی ومقر ملائکتی (بیضاوی) ای سمآئی ومقر ملائکتی (مدارك) یہ تو ذکر تھا۔ حضرت مسیحؑ کے رفع جسمانی کی صراحت تو قرآن مجید میں موجود تھی۔ لیکن قریب بہ صراحت ہونے کے تو یہ عقیدہ قرآن مجید کی اسی آیت میں موجود ہے اور احادیث نے تو اسے اور صاف اور مؤکد کر دیا ہے۔ واولی هذه الاقوال بالصحة عندنا قول من قال معنی ذلك انی قابضك من الارض ورافعك الی لتواتر الاخبار عن رسول الله صلی الله علیه وسلم (ابن جریر) ممیتك فی وقتك بعد النزول من السمآء ورافعك الآن (مدارك) ابن جریرؒ کی عبارت میں لتواتر الاخبار عن رسول الله کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں اور اسی عقیدہ پر محققین اُمت کا اجماع ہو چکا ہے۔ حضرت مسیحؑ کی جب پیدائش عام انسانی قاعدہ توالد و تناسل سے الگ یعنی بغیر باپ کے توسط کے محض نفخہ جبریل سے ہو گئی تو اس میں استبعاد کیا ہے۔ بلکہ یہ تو اور قرین قیاس ہے کہ آپ کا انجام بھی معمول عام سے ہٹ کر ہوا۔ اور عجب کیا جو منشاء الٰہی نے آپکے جسم میں لطافت بھی شروع سے ایسے رکھ دی ہو جو آپ کے صعود آسمانی میں معین ہو سکے۔ اور یہ دلیل تو بالکل بودی ہے کہ آپ کے رفع آسمانی سے آپ کی افضلیت دوسرے انبیا، خصوصاً سید الانبیا پر لازم آجاتی ہے۔ آخر خدا معلوم کتنے فرشتے دن رات زمین سے آسمان پر جاتے ہی رہتے ہیں تو کیا اس بنا پر وہ سب سید الانبیاء سے افضل ہو گئے! ایک یورپین فاضل De Benson ڈی بنسن نے پچھلی صدی عیسوی میں ایک مختصر لیکن فاضلانہ کتاب اسلام یا حقیقی مسیحیت Islam or True Christianity کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے صفحہ ۱۳۲ کے حاشیہ میں اس نے قدیم مسیحی فرقوں میں سے متعدد کے نام لے لے کر لکھا ہے کہ فلاں فلاں فرقہ کا عقیدہ مسیحؑ کے رفع جسمانی کا تھا۔ نہ کہ وفات مسیحؑ کا جس پر اب عیسائی صدیوں سے جمے چلے آتے ہیں۔ اسی طرح سیل Sale نے بھی اپنے انگریزی ترجمہ کے حاشیہ میں بھی اس عقیدہ کے مسیحی فرقوں کے نام گنائے ہیں۔ حیرت ہے کہ اپنے کو مسلمان کہلانے والے ہی ایک جدید فرقہ نے وفات مسیحؑ کا عقیدہ مسیحیوں سے لیا ہے اور اسے اپنی خوش فہمی سے کمال روشن خیالی سمجھ رہا ہے ۱۳۸ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا لفظاً تو عموم ہے لیکن سیاق سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہی لوگ مراد ہیں جو حضرتؑ کی نبوت و صداقت کے منکر تھے یعنی یہود۔ المراد من الموصول الیهود (روح) من الذین کفروا یعنی ان لوگوں کی صحبتوں سے ان کی افترا پردازیوں سے۔ ممّا قالوه فیك وفی امّك (بحر) مطلب یہ ہے کہ یہود کے سارے مکائد کمل کر رہ جائیں گے اور انھوں نے جیسے جیسے گندہ الزامات تراشے ہیں سب کی قلعی اُتر کر رہے گی۔

۱۳۹ (تمہاری نبوت و صداقت کے) اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہاں بھی کھلی ہوئی مراد وہی ہیں جیسا کہ اوپر کے حاشیہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وهم الیهود (کبیر) اَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ یعنی جو عیسیٰؑ کی رسالت و نبوت کے قائل ہیں مراد مسلمان اور سچے عیسائی ہیں۔ وقیل اراد به النصاری (معالم) قال قتادة والربیع والشعبی ومقاتل والکلبی هم اهل الاسلام (معالم) واما بعد الاسلام فهم المسلمون واما النصاری فهم ان اظهروا من انفسهم موافقته فهم یخالفونه اشد المخالفة من حیث ان صریح العقل یشهد انه علیه السلام ما کان یرضی بشئ مما یقوله هؤلاء الجهال (کبیر) فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ یہ مسلمانوں اور سچے عیسائیوں کا غلبہ یہود و معاندین مسیحؑ پر قیامت تک کس معنی میں اور کس حیثیت سے رہے گا۔ قوت دلائل کے لحاظ سے اور معنوی حیثیت سے تو بالکل ظاہر ہے لیکن اگر مادی، حربی، ملکی و سیاسی حیثیتیں مراد ہوں، تو بھی اس وقت تک جو کیفیت یہود کی دنیا کے ہر حصہ میں ہے انہیں اس پیشگوئی کا مصداق بنانے کے لئے بالکل کافی ہے بہرحال مراد دونوں شقیں ہو سکتی ہیں۔ ای ظاهرین قاهرین بالعزة والمنعة والحجة (معالم) المراد من هذه الفوقیة فوقیة الحجة والدلیل (کبیر) ای بالقهر والسلطان والاستعلاء (بحر) یعلونهم بالحجة وفی اکثر الاحوال بها وبالسیف (مدارك) صاحب کبیر و صاحب معالم دونوں کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کا ہے دونوں نے آیت کے تحت میں لکھا ہے کہ یہود کو دیکھو ہر جگہ ذلیل، خوار اور حکومت سے محروم ہیں، بخلاف اس کے عیسائی بڑی بڑی حکومتوں کے مالک ہیں ۱۴۰ (اور وہ فیصلہ عملی شکل میں اور انقطاعی طور پر ہوگا، ورنہ جہاں تک حجت اور دلیل کا تعلق ہے وہ فیصلہ تو اس وقت

بھی ہو چکا ہے) مِنۡ جُمۡلَۃٍ خطاب یہاں مومن و کافر، مسلمان و یہود و نصاریٰ سب سے ہے۔ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ لفظ عام ہیں۔ لیکن سیاق میں جس اختلافی و نزاعی امر کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و رسالت ہے۔ ۱۴۱ ؎ فِی
الدُّنۡیَا دنیوی سزا کا حال تاریخ یہود کے صفحات سے پوچھ دیکھئے۔ کون سی تباہیاں ہیں جو اس دو ہزار سال کی مدت میں بیچاروں پر نہیں آچکی ہیں۔ اور آج دولت و ثروت کے باوجود بھی کیسی نکبت سوار ہے۔ بلکہ جیسا کہ جیوش انسائیکلو
پیڈیا کے حوالہ سے پارۂ اول کے ایک حاشیہ میں گزر چکا ہے، یہ قومی ثروت و تمول کا خیال بھی ایک افسانہ ہی ہے ورنہ حقیقۃً قوم پر بجائے دولت کے افلاس مسلط ہے) جرمنی۔ اٹلی۔ ہنگری، رومانیا وغیرہ سے جس بیدردی کے ساتھ نکالے
گئے وہ داستانِ خونیں تو ابھی بالکل تازہ ہے۔ وَالۡاٰخِرَۃِ۔ رہی آخرت تو سزا کا پورا پورا ظہور تو وہیں ہوگا۔ ۱۴۲ ؎ الظّٰلِمِیۡنَ ظلم کی حقیقت افراط و تفریط ہے۔ یہاں ظالموں سے مراد یہود کا ہونا تو ظاہر ہی ہے، جو حضرت عیسیٰؑ
کی نبوت و صداقت بلکہ شرافتِ نسب تک کے منکر تھے لیکن دوسری طرف اس کے تحت میں مسیحی بھی آئے جاتے ہیں۔ جو حضرت کو عبد کے بجائے معبود اور رسول کے بجائے مظہر یا اوتار قرار دے رہے ہیں۔ اور اس طرح حضرتؑ کے
باب میں دونوں ہی ظالم ہیں، یعنی مقامِ عدل و اعتدال سے ہٹے ہوئے۔ ۱۴۳ ؎ (اے ہمارے پیغمبر!) ذٰلِکَ یعنی صحیح تذکرہ مسیح، اشارہ بعید اظہار شرف و تکریم کے لئے ہے۔ اشارۃ الی ما تقدم من نبأ عیسیٰ وذکریا
وغیرہما (کبیر) والاتیان بما یدل علی البعد للاشارۃ الی عظم شان المشار الیہ وبعد منزلتہ فی الشرف (روح) مِنَ الۡاٰیٰتِ۔ یعنی آپ کی صداقت و نبوت کی نشانیوں میں سے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے حالات و واقعات
جن پر یہود اور نصرانیوں دونوں کی تاریخوں نے غلو و افتراء کے گہرے پردے ڈال رکھے ہیں، یہ جو آپ قرآن کے ذریعہ سے بالکل صحیح و معتبر طور پر سنا رہے ہیں یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ آپ مؤید من اللہ ہیں اور آپ وحی کہہ رہے ہیں جو عالم غیب
والشہادۃ آپ سے کہلا رہا ہے۔ الذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ اشارہ اس طرف ہے کہ آپ کی رسالت پر دلیل ہونے سے
قطع نظر یہ مضامین بجائے خود بھی پرحکمت و پرمعرفت ہیں۔ ۱۴۴ ؎ (اسی طرح عیسیٰؑ ابن مریم بشر محض اور
حادث و مخلوق ہیں انہیں قدیم اور غیر مخلوق کس طرح مان رہے ہو) مَثَلَ۔ یہ تمثیل کس لحاظ سے تھی؟
بشر محض ہونے اور بغیر باپ کے پیدا ہونے میں تھی۔ اٰدَمَ۔ جو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے
تھے اور پھر بھی بشر محض تھے۔ لَہٗ۔ ضمیر حضرت آدمؑ کے خاکی پتلے کی طرف ہے۔ یہ جواب ہے اس شبہ
مسیحی شبہ کا کہ جب مسیحؑ کی پیدائش ساری دنیا کے عام ضابطہ کے خلاف بغیر باپ کے توسط کے ہوئی، تو انہیں
بجائے فوق البشر کے محض بشر کیسے تسلیم کیا جائے؟ جواب یہ ہے کہ آدم کو بشر تو تم خود ہی تسلیم کرتے ہو درآنحالیکہ ان کی
پیدائش تو عجیب تر طور پر ہوئی یعنی وہاں ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کا بھی توسط نہ تھا مخلوق ہونے اور حادث
ہونے کا دارومدار کسی خاص و متعین طرزِ ظہور و وجود پر نہیں مطلق حدوث پر ہے اور وہ آفرینش عیسیٰؑ میں پوری طرح
موجود تھا۔ مسیحیوں میں ایک قدیم فرقہ ایرین Arians ہوا ہے۔ اس کا بانی Arius چوتھی صدی عیسوی
کے شروع میں اسکندریہ کا لاٹ پادری تھا۔ اس کی تعلیم یہی تھی کہ مسیحؑ قدیم و غیر مخلوق نہیں، مخلوق و حادث تھے
(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ صفحہ ۵۰۰ طبع چہار دہم) اس سے بھی قبل انطیوخ کے بطریق پال موسطوی (مشہور
و معروف پولوس طرسوسی سے اسے غلط نہ سمجھئے) کی تعلیم تیسری صدی عیسوی میں بھی یہی تھی کہ عیسیٰ مسیحؑ کی پیدائش
ایک دوشیزہ ہی کے بطن سے ہوئی تھی بواسطہ روح القدس اس لئے وہ بشر محض تھے۔ روح القدس کے توسط
نے انہیں خود ہی مقدس بنا دیا تھا۔ اور اس لئے وہ مسیح تھے لیکن شریک الوہیت بہرحال نہ تھے (ایضاً۔ جلد ۱۸
صفحہ ۲۹۵ نیز انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۱ صفحہ ۷۸۵) مسیحیوں کے صاحب فہم طبقہ میں برابر اس
طرح کی تحریکیں صحیح عقیدہ کی اٹھتی رہی ہیں لیکن کلیسا کے عام جمود و تعصب نے کبھی ان اصلاحی تحریکوں کو
عام نہ ہونے دیا۔ ۱۴۵ ؎ (اس حقیقت کے باب میں اے مخاطب!) قرآن مجید میں خطاب کہیں براہ راست
رسول اللہ صلعم سے ہے اور کہیں عام مخاطب افراد امت ہیں اور ضمیر واحد حاضر دونوں کے لئے یکساں مشترک
ہے دونوں کا فرق و امتیاز مفسر کے ذوق پر منحصر ہے۔ ان سطروں میں زیادہ سے زیادہ اتباع مفسر تھانویؒ کے ذوق
کا کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب رسول اللہ صلعم سے ہے۔ اور مراد آپ کی امت ہے اس لئے کہ خود
آپ سے تو اس کا امکان ہی نہ تھا۔ الخطاب للنبی صلعم والمراد امتہ (قرطبی) اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ
یہ حقائق پروردگار عالم کی طرف سے بیان ہو رہے ہیں اس لئے شک و شبہ کی گنجائش سے بالاتر ہیں۔ ۱۴۶ ؎
(اے پیغمبر!) فِیۡہِ یعنی ربوبیت و الوہیت مسیحؑ کے باب میں۔ سورہ کے شروع میں جو حاشیہ ہیں انہیں
ایک بار پھر نظر میں لے آیا جائے۔ سورہ کا اصلی موضوع مسیحیت اور عقیدۂ الوہیت مسیحؑ کا رد ہے۔ گفتگو نجران کے
مسیحی وفد سے چل رہی ہے۔ فَمَنۡ حَآجَّکَ یعنی ان مسیحیوں میں سے اب بھی کوئی آپ سے اپنی کج بحثی
جاری رکھے۔ الۡعِلۡمِ۔ اور علم بھی کیسا؟ ظنی و تخمینی نہیں۔ حتمی۔ قطعی یقینی۔ ۱۴۷ ؎ بطور اتمام حجت
کے اب جبکہ زبانی افہام و تفہیم اور دلائل کے سارے مرتبے طے ہو چکے اور مسیحی اپنی بات کی پچ پر اڑے ہوئے
ہیں) ۱۴۸ ؎ اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں مباہلہ ہے۔ مباہلہ میں ہر فریق اپنے کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اور تضرع و الحاح کے بعد اسی کے فیصلہ کا منتظر رہتا ہے۔ نَدۡعُ۔ ضمیر متکلم سے مراد ہر دو فریق اور ان کے افراد ہیں۔ اَبۡنَآءَ محض
صلبی بیٹے مراد نہیں نواسے، داماد وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ نِسَآءَ۔ بیویاں اور بیٹیاں دونوں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ صفحہ حاشیہ میں بیان ہو چکا ہے کہ ۹ ہجری میں مسیحیان نجران کے ۱۴ اکابر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر
ہوئے تھے گفتگو الوہیت مسیحؑ کے مسئلہ پر رہی۔ اسلامی عقیدہ بالکل صاف اور واضح تھا۔ مسیحی اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخرکار آپ نے وہی کیا جو ایک سچا اور مخلص دیندار ایسے موقع پر کرتا۔ آپ نے فرمان خداوندی کے ماتحت مسیحیوں کو مباہلہ
کی دعوت دیدی کہ زبانی گفتگو تو بہت ہو چکی اب آؤ ہم تم اپنے خاص اقربا کو لیکر اپنے پروردگار ہی سے بہ تضرع و الحاح عرض کریں کہ جو فریق ناحق پر ہو اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو۔ آپ نے یہ فرمایا اور اپنی اولاد یعنی سیدہ فاطمہؓ، سیدنا علیؓ، سیدنا
حضرت حسنؓ اور سیدنا حضرت حسینؓ کو ہمراہ لیکر آپ تشریف لے آئے لیکن تاریخ کے راوی کا بیان ہے کہ مسیحیوں کی ہمت عین وقت پر جواب دے گئی اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ جزیہ دے کر اور ذمی رعایا بن کر اسلام کی حکومت میں رہنا گوارا کر لیا جائے
سر ولیم میور مسلمان نہیں انیسویں صدی کے مسیحی تھے اور محض مسیحی ہی نہیں مشنری بھی۔ ان کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ "سارے واقعہ میں محمدؐ کے ایمان کی پختگی بالکل نمایاں ہے نیز ان کے اس عقیدہ کی شہادت کہ ان کا تعلق عالم غیب سے جڑا ہوا ہے اور
اس لئے حق تمام تر انہی کے ساتھ ہے۔ درآنحالیکہ ان کے خیال میں مسیحیوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے اور کچھ نہ تھا" (میور کی لائف آف محمدؐ صفحہ ۳۶۰) ۱۴۹ ؎ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ۔ یعنی یہ سارا سلسلہ واقعات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحؑ
اور مادر مسیحؑ دونوں بشر محض تھے۔ ای المذکور فی شان عیسیٰ علیہ السلام قالہ ابن عباس (روح) ای ما قص من نبأ عیسیٰ و مریم (بیضاوی) تکرار و اعادہ تاکید کے لئے ہے۔ الضمیر للفصل والتاکید (روح) مَا مِنۡ اِلٰهٍ
اِلَّا اللّٰهُ کوئی بھی شریک الوہیت نہیں۔ نہ بلحاظ ذات اور نہ بلحاظ صفات اور اقنوم وغیرہ کے قصے سب خرافات ہیں۔ مِنۡ زائدہ تاکید کلام کے لئے ہے۔ من زائدۃ للتوکید (قرطبی) فی افادۃ معنی الاستغراق الۡعَزِیۡزُ ہر
ارادہ پر غالب۔ قادر مطلق۔ یہ صفت بجز باری تعالیٰ کے مسیحؑ وغیرہ کس میں ہے؟ الۡحَکِیۡمُ حکیم مطلق علیم مطلق اس صفت کا تحقق بجز باری تعالیٰ کے مسیحؑ وغیرہ کس میں ہوتا ہے؟ ۱۵۰ ؎ یعنی ان لوگوں کا جو دین و اعتقاد میں فساد برپا کرتے
رہتے ہیں۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا یعنی ان توضیحات کے بعد بھی اپنی سرتابی جاری رکھیں۔ عَلِیۡمٌۢ علم کامل رکھنے والا اور اسی علم کامل کے مطابق جزا و سزا دینے والا۔ ۱۵۱ ؎ (نہ فرزند کہہ کر، نہ اقنوم ٹھہرا کر، نہ مظہر یا اوتار بنا کر، نہ اور کسی حیثیت سے)
لَا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کئی صدی بعد کی چیز ہے۔ قرآن کے معاصر جو مسیحی تھے وہ کیتھولک فرقہ یا کلیسائے رومی کے متبع تھے۔ اور اس فرقہ میں مسیح پرستی اور روح القدس پرستی تو خیر تھی اس کے علاوہ بھی خدا معلوم کتنی اور پرستیاں موجود

اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا
پروردگار نہ ٹھہرائے ۱۵۱ پھر یہ گروہ روگردانی کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم تو
مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَمَاۤ
فرمانبردار ہیں ۱۵۲ اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو جو ۱۵۳ درآنحالیکہ
اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَالۡاِنۡجِیۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۵﴾
توریت و انجیل تو ان کے بعد ہی اتری ہیں تو تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے ۱۵۴
هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِیۡمَا لَكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ
ہاں تم لوگ وہی تو ہو جو اس امر میں جھگڑ چکے ہو جس کا تمہیں کچھ تو علم تھا سو (اب) ایسی
تُحَآجُّوۡنَ فِیۡمَا لَیۡسَ لَكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ
بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں اللہ جانتا ہے اور تم
لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبۡرٰهِیۡمُ یَهُوۡدِیًّا وَّلَا نَصۡرَانِیًّا
نہیں جانتے ۱۵۵ ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ راہ راست
وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِیۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۶۷﴾
والے مسلم تھے اور مشرکوں میں سے بھی نہ تھے ۱۵۶
اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا
بیشک ابراہیمؑ سے سب سے قریب لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی تھی اور یہ
النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۸﴾
نبی ہیں اور وہ لوگ ہیں جو ان پر ایمان لائے اور اللہ ایمان لانے والوں کا حامی ہے ۱۵۷

منزل ۱

خیں۔ صنم پرستی، پاپا پرستی، ولی پرستی، شجر پرستی وغیرہا۔ آیت کا یہ ٹکڑا شرک کی جلی، خفی، ساری صورتوں کی تردید کر رہا ہے۔ قُلْ۔ خطاب رسول اللہ صلعم کو ہے۔ اَهْلَ الْكِتٰبِ۔ تشریح سورۂ بقرہ کے حاشیہ میں ہو چکی ہے۔ مراد یہود ونصاری دونوں ہو سکتے ہیں۔ یہاں اصلاً اشارہ نصرانیوں ہی کی جانب ہے۔ بَيْنَنَا۔ اس صیغۂ جمع متکلم سے مراد مسلمان ہیں۔ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ یعنی وہ اصل جو ہم کو تم کو دونوں کو مسلّم ہے جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیمبران برحق ہمیشہ دیتے آئے ہیں۔ اور یہودیت ونصرانیت دونوں دینوں کی بنیاد ہی اسی اصل پر ہے۔ توریت تو سرتا سر تاکید توحید و ممانعت شرک سے لبریز ہی ہے۔ انجیل تک میں بھی تعلیم موجود ہے۔ "تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴: ۱۰) انجیل میں یہ کہیں بھی نہیں ہے کہ پرستش صرف خدا کی کرو اور بعض پرستشوں میں خدا کے ساتھ فرزند خدا اور روح القدس کو بھی شامل کر لیا کرو۔ ۱۵۲ (کہ عملاً اسے مرتبۂ خدائی پر رکھ دے) اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ مخلوق پرستی اور مخلوق کی الوہیت کی تردید تو ادھر ہو چکی۔ اب تردید مخلوق کی ربوبیت کی ہو رہی ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو مطاع مطلق مان لینا اس کو رب قرار دے لینا ہے۔ دُوْنِ یہاں غیر یا علاوہ کے معنی میں ہے۔ دون هنا بمعنى غير (قرطبی) پاپا کی عصمت کیتھولک مسیحیوں کا اور پادریوں کے اجماع یعنی کلیسا Church کی عصمت کل مسیحیوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔ "ایک محسوس کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے۔ اس لئے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہی نہیں" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۶ صفحہ ۹۴۰) قرآن مجید نے انسان کی ان ساری خود ساختہ عصمتوں پر ضرب لگا دی۔ یہیں سے ان گمراہ فرقوں کی بھی تردید نکل آئی جو اپنے ان اماموں کے مجرد قول کو بلا دلیل شرعی واجب القبول ٹھیراتے ہیں۔ هذا يدل على بطلان القول بالاستحسان المجرد الذى لا يستند الى دليل شرعى وفيه ردٌّ على الروافض الذين يقولون يجب قبول قول الامام دون ابانة مستند شرعى وانه يحل ما حرمه

اللّٰه من غير ان يبين مستندًا من الشريعة (قرطبی) اى لا نطيع احبارنا فى ما احدثوا من التحريم والتحليل (مدارک) انزلوهم منزلة ربهم فى قبول التحريم والتحليل (بحر) کسی کو رب قرار دینے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اس لفظ کا بھی اطلاق اس پر کیا جائے بلکہ اس کے اندر اگر صرف صفاتِ ربوبیت مان لئے گئے تو عملاً وہ رب ٹھیر ہی گیا۔ وان لم يطلقوا عليه لفظ الرب الا انهم اثبتوا فى عقبه معنى الربوبية (کبیر) بَعْضُنَا بَعْضًا۔ مفسر ابن حیان نے اس سے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ الوہیت وربوبیت کی تردید تو بس اس فقرہ ہی سے ہو گئی۔ جب ایک دوسرے میں تثلیث اور رشتہ ہم نسبی قائم ہو گیا تو سب بندے ہونے کی حیثیت سے برابر ہو گئے۔ الوہیت وربوبیت اب باقی ہی کہاں رہ گئی۔ وفى قوله بعضنا بعضا اشارة لطيفة وهى ان البعضية تنافى الالهية اذهى تماثل فى البشرية (بحر) ۱۵۳ (اے مسلمانو! یعنی اگر اب بھی قبول حق سے روگردانی کرتے رہیں اور اپنے اس گڑھے اور ٹھیرائے ہوئے شرک سے باز نہ آئیں) ۱۵۴ (اور ہر حال ہر صورت وہی توحید خالص کے علمبردار ومبلغ ہیں) مُسْلِمُوْنَ لفظی معنی فرماں بردار کے ہیں اور یہی اصطلاحی نام بھی اس امت کا پڑ گیا۔ اِشْهَدُوْا کیا اللہ کی شان ہو کہ یہود ونصاری آج بھی مسلمانوں کی توحید خالص کی شہادت دے رہے ہیں۔ ۱۵۵ (اور انہیں خواہ مخواہ یہودی یا نصرانی ٹھیرا رہے ہو) خطاب یہود ونصاری دونوں سے ہے۔ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ۔ یعنی ابراہیم کے دین ومذہب کے بارہ میں۔ لِمَ۔ مخفف ہے لِمَا کا۔ خبر کے التباس سے بچانے اور محض استفہام کا مفہوم رکھنے کے لئے آخر سے الف گرا دیا گیا۔ الاصل لما فحذفت الالف فرقا بين الاستفهام والخبر (قرطبی) ۱۵۶ یعنی جن کتابوں پر تم اپنی نام نہاد یہودیت اور نصرانیت کی بنیاد قرار دیتے ہو وہ تو خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد کی چیزیں ہیں۔ تو کیسی بے عقلی کی باتیں کرتے ہو کہ انہیں مذہب ان کے سر چپکا دینا چاہتے ہو۔ ۱۵۷ یعنی اسی دین ابراہیمی سے متعلق۔ مراد یہ ہے کہ جب تم توریت وانجیل ہی کے مسائل میں بھٹکے اور اب بھٹکے، حالانکہ وہاں کچھ تو واقفیت اور علم تمہیں حاصل تھا تو اب دین ابراہیمی کے بارہ میں کیوں کٹ حجتی پر تلے ہو جس کے بارہ میں تو کوئی شائبۂ علم بھی تمہیں حاصل نہیں۔ هٰٓاَنْتُمْ۔ میں ھا کا اشارہ مخاطبین کی تحقیر وتنقیص کے لئے ہے۔ والاشارة للتحقير والتنقيص (روح) ۱۵۸ (بلکہ شرک سے سخت بیزار تھے اور دنیا شرک میں توحید کے پہلے علمبردار) حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔ حنیف اردو میں "سیدھے سادے مسلم" يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا۔ جس یہودیت اور جس نصرانیت کی نفی ہو رہی ہے وہ مروجہ اور گھڑی ہوئی یہودیت اور نصرانیت تھی۔ ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے جو دین حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا تھا، وہی حضرت ابراہیم کا بھی تھا۔ حضرت کی توحید پرستی یہود ونصاری دونوں کو مسلّم تھی۔ حضرت کے دین توحید پر حاشیے پارۂ اول کے رکوع آخر میں گزر چکے۔ فقیہ مفسر جصاص نے لکھا ہے کہ ان آیتوں سے دین حق کی حمایت میں دلائل قائم کرنے اور اہل باطل کے جواب دینے کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ وفى هذه الآيات دليل على وجوب المحاجة فى الدين و اقامة الحجة على المبطلين (جصاص) ۱۵۹ (دنیا اور آخرت دونوں میں) اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا
اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو تو یہی پسند ہے کہ تمہیں گمراہ کر کے رہے حالانکہ وہ
يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝٦٩ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ
بجز اپنے اور کسی کو بھی گمراہ نہیں کرتے اور (اس کی بھی) خبر نہیں رکھتے ۱۶۰ اے اہل کتاب تم اللہ کی
لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝٧٠ يٰٓاَهْلَ
آیتوں سے کیوں انکار کئے جاتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو ۱۶۱ اے اہل
الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ
کتاب تم حق کی تلبیس باطل کے ساتھ کئے جاتے اور حق کو چھپا جاتے ہو
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٧١ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
حالانکہ تم جانتے بوجھتے ہو ۱۶۲ اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے ۱۶۳ کہ ایمان
اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ
لانے والوں پر جو نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور دن کے
وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝٧٢ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا
آخر میں اس سے انکار کر بیٹھو، عجب کیا کہ وہ بھی پھر جائیں ۱۶۴ اور دل میں بجز اس کے کہ
لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ
جو تمہارے دین کا پیرو ہو اور کسی پر ایمان نہ لاؤ۔ آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے ۱۶۵
يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ
اور یہ سب اس غصہ میں کر رہے ہو کہ کسی اور کو وہ چیز مل گئی جو تمہیں ملی تھی یا وہ لوگ تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں

ع ۸ / ۱۵

منزل ۱

ابراہیم سے قریب بہ لحاظ دین وعقائد۔ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے زمانہ میں آپ کی پیروی کی تھی۔ وَهٰذَا النَّبِيُّ۔ اور یہ نبی جو گویا انہی کا پیام لیکر آئے ہیں۔ اور انہی کی نیابت اس زمانہ میں کر رہے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی مسلمان۔ فرنگی مؤرخین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم اسرائیلی مذہب کا جانشین اب اگر کوئی ہے تو وہ مسیحیت نہیں جس کے اندر یونان اور روم کے جاہلی مشرکانہ عقائد جمع ہو گئے ہیں بلکہ اسلام ہے۔ ملاحظہ ہو "مؤرخین کی تاریخ عالم" Historians History of the World ۱۶۰ روایتوں میں آتا ہے کہ یہود کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے اور انہیں باطل کی قوت پر اتنا غرہ تھا کہ خود اسلام قبول کرنا الگ رہا مسلمانوں کو بھی ان کے عقائد سے برگشتہ کر دینے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ آج بھی کتنے مسیحیوں کے دل میں یہ تمنا جیتی جاگتی موجود ہے کہ مسلمان مسیحیت قبول کریں یا نہ کریں بہر حال اپنے اسلامی عقائد سے تو ڈگمگا ہی جائیں۔ طَآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ خاص اشارہ یہود کی جانب ہے۔ يُضِلُّوْنَكُمْ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ یعنی حقیقۃً وہ مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں تو کامیاب ہوتے نہیں۔ خود اپنے ہی نامۂ اعمال کو اور زیادہ سیاہ کرتے رہتے ہیں۔ مَا يَشْعُرُوْنَ۔ یعنی ایسے بے عقل، نافہم ہیں کہ حقیقت حال کا مطلق شعور نہیں رکھتے۔ ۱۶۱ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ یعنی اللہ کی ان آیتوں سے جو خود تمہاری کتابوں کے اندر موجود ہیں اور جن میں نبوت محمدی کی پوری پوری علامتیں اور بشارتیں درج ہیں۔ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۔ یعنی یہ انکار کچھ ناواقفیت اور لاعلمی کی بنا پر نہیں ہو رہا بلکہ ان آیتوں میں تحریف کر رہے ہو، لفظی بھی اور معنوی بھی۔ ۱۶۲ یہاں یہود پر تین الزامات متعین طور پر لگائے گئے ہیں۔ ۱۔ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ اپنی کتابوں کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ حق بالکل باطل کے تحت میں دب کر رہ جاتا ہے۔ باطل حق کو ڈھانپ لیتا ہے اور تاویل بڑھ کر صریح تحریف بن جاتی ہے۔ فسر اللبس بالخلط والتغطية (بحر) ۲۔ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ۔ حق کو سرے سے چھپا ڈالتے ہو اور جہاں جہاں بشارتیں ظہور اسلام کی صاف موجود ہیں وہاں عبارتیں کچھ کی کچھ کر دیتے ہو۔ ۳۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ یہ سب کچھ اپنے قصد وارادہ سے کر رہے ہو۔ محض اتفاقی طور پر نہیں ہو رہا ہے۔ تحریفات اہل کتاب پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں۔ ۱۶۳ (آپس میں) قال بعضهم لبعض (قرطبی) فى ما بينهم (مدارک) یہ اشارہ ہے یہود خیبر وعرینہ کی جانب۔ كان احبار قرى عربية اثنى عشر حبرا فقالوا لبعضهم ادخلوا فى دين محمد اول النهار فاذا كان آخر النهار فاكفروا (ابن جریر) ۱۶۴ (اس چال وتدبیر سے) اٰمِنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ یہاں ایمان اظہار ایمان کے معنی میں ہے یعنی صبح ایمان ظاہر کرو۔ اى اظهروا الايمان (کشاف) ادخلوا فى دين محمد باللسان دون الاعتقاد (معالم عن الحسن وقتادة) والمراد اظهروا الايمان لا یمکن ان یراد به التصديق (بحر) وجه النهار يعنى اوله (قرطبی) اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یعنی جو ان مومنین کے خیال میں ان پر نازل ہوا ہے۔ اى على زعمهم (بحر) لَعَلَّهُمْ ضمیر ان لوگوں کی جانب ہے جو واقعۃً مسلمان تھے

مدینہ مضافات مدینہ کے یہود مکہ چالیں مسلمانوں کے خلاف عجیب عجیب رہتی تھیں ایک بار آپس میں صلاح و مشورہ کے بعد یہ سوچا کہ ہم میں بعض صبح کے وقت صرف وقتی اسلام کا اقرار کر لیا کریں اور بعد چند گھنٹوں کے بعد اس اقرار سے رجوع کر لیا کریں اور کہہ دیا کریں کہ غور و فکر اور مطالعہ توریت کے بعد اس نئے دین کی تصدیق نہ ہوئی اس لئے ہم اس سے نکل آئے ہیں۔ اہل عرب پر ہمارے علم و اخلاق دونوں کی دھاک تو بیٹھی ہی ہوئی ہے لوگ کہیں گے آخر کوئی خرابی تو اس نئے دین میں ہے جو ایسے ایسے لوگ اس سے باہر نکل گئے اور عجب نہیں کہ اس تدبیر سے کچھ پرانے مسلمان بھی اکھڑ جائیں۔ تاریخ یہود میں منافقت کی یہی ایک مثال نہیں خود ان کی کتابوں میں یہ واقعہ بصراحت درج ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں جب اسپین میں اسلامی حکومت تھی تو حکومت کے مظالم فرضی یا واقعی کی بنا پر بہت سے یہود نے اپنے ربیوں کی اجازت اور فتویٰ کے مطابق اپنے قبول اسلام کا اظہار شروع کر دیا تھا اور آخر تک دل میں سب کے سب منکر ہی تھے (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد اول ص ۴۲۲ و ص ۴۲۳) اور آج یہ جو بڑے بڑے فرنگی محققین یہود و مسیحی مستشرقین نے فرنگی زبانوں میں سیرۃ نبوی لکھنے کا طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے علم و تحقیق، وسعت مشرب و بے تعصبی کی دھاک بٹھا کر تمہید بڑے زور کی اٹھاتے ہیں اور معلوم یہی ہونے لگتا ہے کہ پیمبر عرب اور مصلح عالم کی نعت اور منقبت عظم اور تمثیل موسیٰ کی منقبت میں دریا کے دریا بہا دیں گے لیکن آگے چل کر یہ تیجہ نکالتے ہیں کہ نعوذ باللہ انہیں کچھ خلل دماغ سا تھا۔ یا یہود ونصاریٰ کی کتابوں کے مضامین کہیں سے سن سنا کر چرا لیتے تھے وقس علی ہذا۔ تو یہ بھی ٹھیک اسی قدیم یہودیانہ دجل و تلبیس کا ایک جدید فرنگی نمونہ بھی ہے۔ ۱۶۵ یعنی حقیقۃً اور دل سے تصدیق تو بس اپنے ہی والوں کی کیا کرو۔ وہی یہود کا قول چل رہا ہے۔ ۱۶۶ (جواب اسلام کے نام سے ظاہر ہوتی ہے اور جس کی صداقت پر دلائل عقلی و نقلی قائم ہیں نہ کہ تمہارے محدثات و مخترعات) قُلْ۔ میں خطاب پیمبر علیہ السلام سے ہے۔ اور یہ فقرہ کلام یہود کے جواب میں ہے۔ ۱۶۷ (اور اسی ڈرسے چھپے جا رہے ہو) مِثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ یعنی دولت نبوت۔ خطاب قوم یہود سے ہے۔ یعنی تمہیں اصل خلش تو بس اس کی ہے کہ انبیاء تو ہمیشہ ہماری نسل و قوم سے پیدا ہوتے رہے ہیں اب ایک عرب اور اسمٰعیلی کو یہ دولت کیسے مل جا رہی ہے۔ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ یعنی قیامت کے دن مسلمان یہود پر یہ کہہ کر غلبہ نہ حاصل کر لیں کہ ان لوگوں نے بھی تو دنیا میں ہماری تصدیق کی تھی۔ مفسر واحدی نے کہا ہے کہ یہ آیت تفسیر کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے (روح) ۱۶۸ (اپنی حکمت مطلقہ اور مصلحت کاملہ کے مطابق) قُلْ۔ میں خطاب پیمبر علیہ السلام سے ہے۔ وَاسِعٌ اس کے کارخانہ فضل و عطا میں کمی نہیں پھر یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ فلاں نسل یا قوم ہمیشہ محروم ہی رہے گی۔ عَلِيْمٌ وہ اپنے علم کامل کے مطابق جس کی جیسی استعداد دیکھتا ہے اسے وہ نعمت عطا کر دیتا ہے۔ ۱۶۹ (بخل اور کمی کا اس کے ہاں گزر کہاں) مَنْ يَّشَآءُ۔ وہ جسے چاہتا ہے حسب مصلحت تکوینی۔ ۱۷۰ (با احتیاط و دیانت تام یعنی یہود سب کے سب یکساں نہیں بعض ان میں ایسے ایسے امین و متدین بھی ہیں یہی لوگ آگے چل کر مسلمان ہو گئے۔ ۱۷۱ یہود کے حب زر کی یہ کتنی صحیح تصویر ہے۔ دِيْنَارٍ Denarius رومی حکومت کا ایک طلائی سکہ۔ عرب میں بھی مستعمل تھا۔ آج بھی یورپ کے مختلف حصوں میں چل رہا ہے۔ اردو میں اس کا مفہوم اشرفی سے ادا ہو سکتا ہے۔ مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا۔ یعنی وہ ادائے امانت میں برابر حیلہ و حوالہ کرتا رہے گا اور اس سے تقاضا برابر جاری رکھنا پڑے گا۔ اراد بالقیام ادامة المطالبة لا عين القيام (قرطبی) ۱۷۲ (کہ ایسا کوئی مسئلہ ہرگز شریعت اسرائیلی و موسوی میں موجود نہیں) الْاُمِّيّٖنَ یعنی اُمّ القریٰ مکہ کے باشندے۔ یہود نسلی فخر و عصبیت اور قومی غرور سے بھرے ہوئے یہود اہل مکہ کو اپنے سے بہت فروتر رکھتے تھے۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ یہود غیر یہود یا Gentiles کے ساتھ کاروباری تعلق کے سلسلہ میں بد معاملگی کے لئے برابر بدنام رہے ہیں۔ قومی مفاخرت اور نسلی نخوت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے۔ گوروں کا برتاؤ کالوں کے ساتھ آج دنیا کے ہر علاقہ میں کیا ہے! سَبِيْلٌ۔ سبیل کے معنی یہاں حجۃ کے ہیں۔ اور یہ معنی قرآن اور کلام عرب میں عام ہیں۔ السبيل الحجة وقوله فاولئك ما عليهم من سبيل من هذا المعنى وهو كثير في القراٰن و كلام العرب (بحر) يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔ یہ جھوٹے ہیں اپنے اس دعویٰ اور اس انوکھے اصول مذہب و اخلاق میں۔ اس تفصیل نے یہود کے جرم کی شناعت کہیں زیادہ بڑھا دی۔ وہ صرف فسق عمل ہی میں مبتلا نہ تھے بلکہ ایک بے اصل عقیدہ بھی گڑھ لیا تھا۔ اور اعمال سے کہیں گزر کر عقائد کی خرابی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ۱۷۳ (اور یہی خوف خدا اور تقویٰ ہی ساری خوش معاملگی کی بنیاد ہے) بَلٰى یعنی ذمہ داری کیوں نہ ہوتی۔ ہے اور ضرور ہے۔ بِعَهْدِهٖ۔ عہد خالق کیساتھ ہو یا مخلوق کے اس کی پابندی بہرحال لازمی ہے۔ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت سے وفائے عہد کی بڑی تعظیم نکل رہی ہے۔ اس لئے کہ تمام طاعات کا خلاصہ صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک احکام الٰہی کی تعظیم۔ دوسری خلق اللہ پر شفقت اور وفائے عہد ان دونوں قسموں کی طاعتوں کا مجموعہ ہے (کبیر) ۱۷۴ یعنی کسی دنیوی طمع میں آ کر ان پابندیوں کو توڑ رہے ہیں۔ ثَمَنًا قَلِيْلًا دنیوی معاوضہ ہمیشہ اخروی اجر کے مقابلہ میں قلیل ہی ہو گا۔ یہ مراد نہیں کہ اگر زیادہ معاوضہ مل رہا ہو تو بددیانتی اور عہد شکنی جائز ہو جائے گی۔ مفہوم صرف اس قدر ہے کہ اپنے معاہدوں کی پابندی نہ کرنا اور بد معاملگی کر بیٹھنا کسی حال میں جائز نہیں۔ عَهْدِ اللّٰهِ یعنی وہ عہد متابعت جو اللہ سے کر چکے ہیں۔ اَيْمَانِهِمْ۔ یعنی جو قسمیں آپس میں معاملات سے متعلق کھاتے رہتے ہیں۔ فقہاء مفسرین نے آیت کے تحت میں لکھا ہے کہ کوئی شخص جو جانتا ہو کہ وہ اصل میں برسر حق نہیں وہ محض اپنے کو حق پر قرار نہیں دے سکتا کہ عدالت ظاہر سے فیصلہ اسکے موافق ہو گیا ہو۔ ودلت هذه الاٰية والاحاديث ان حكم الحاكم لا يحل المال في الباطن بقضاء الظاهر اذا علم المحكوم له بطلانه (قرطبی)

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
غالب جاؤ گے ۱۶۸ آپ کہہ دیجئے کہ فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عطا کرتا ہے ۱۶۹ اور اللہ بڑا وسعت
عَلِيْمٌ (٧٣) يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
والا ہے بڑا علم والا ہے ۱۶۹ وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے، اور اللہ بڑے ہی فضل
الْعَظِيْمِ (٧٤) وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ
والا ہے ۱۷۰ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک ڈھیر (مال کا) امانت رکھ
يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ
دے تو وہ (بھی) تجھے ادا کر دے ۱۷۱ اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک دینار امانت رکھ
اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ
دے تو وہ تجھے اس کو واپس نہ کرے بجز اس صورت کے کہ تو اس کے سر پر کھڑا رہے ۱۷۲ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ
عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
جاہلوں (اَن پڑھ) امیوں کے باب میں کوئی ذمہ داری ہی نہیں اور یہ لوگ اللہ کے اوپر جھوٹ گڑھ رہے ہیں
وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (٧٥) بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ
درآنحالیکہ خوب جان رہے ہیں ۱۷۳ کیوں نہیں جو شخص بھی اپنے عہد کو پورا کرے اور اللہ سے ڈرے تو بیشک
يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (٧٦) اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ
اللہ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۱۷۴ بیشک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو
وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
قلیل قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ۱۷۵ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لئے کوئی حصہ آخرت میں نہیں

منزل ١

۱۷۵ (اس کفر و فسق کے پاداش میں) لَا خَلَاقَ - یعنی بھلائی کا کوئی حصہ نہیں - ای لاخیر (بحاری) لَا یُکَلِّمُھُمْ - یعنی بطریق لطف ان سے خطاب نہ کرے گا بجز خطاب
برائے عتاب و مواخذہ ہو۔ اس کی نفی مُراد نہیں۔ لَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ - یعنی نگاہ مہر و التفات سے ان کی طرف نظر نہ کرے گا - نگاہ قہر کی نفی مقصود نہیں۔ لَا یُزَکِّیْھِمْ - یعنی گناہوں
کی گندگی سے پاک صاف نہ کرے گا۔ اَلِیْمٌ - درد پہنچانے والے یا مؤلم کے معنی میں ہے - ای مولم موجع من الالم وھو فی موضع مُفعل (بحاری) ۱۷۶ اپنے
صحائف آسمانی پڑھتے وقت) یَلْوٗنَ - یعنی اُلٹتے پھیرتے ہیں۔ یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَھُمْ اس کے اندر تحریف لفظی و معنوی کی ساری صورتیں آگئیں - لی لسان سے عربی محاورہ میں مُراد
ہی ہوتی ہے جھوٹ، تلبیس، تحریف - لوی لسانہ بکذا کنایۃ عن الکذب وتخرص الحدیث (راغب) اور یہاں تحریف بالقصد مُراد ہے۔ والمعنی یحرفون

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ

اور اللہ قیامت کے دن نہ اُن سے بات کرے گا نہ اُن کی طرف دیکھے گا نہ انہیں پاک کرے گا

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۷ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ

اور اُن کے لئے تو دردناک عذاب ہے ۱۷۶ اور انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی زبانوں کو کتاب میں

بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَ

پیچ کرتے ہیں ۱۷۷ تاکہ تم اس (جزء) کو بھی کتاب ہی میں سے سمجھو درآنحالیکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے

يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ

اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے درآنحالیکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۸ مَا كَانَ

اور یہ اللہ پر جھوٹ گڑھتے ہیں درآنحالیکہ (خوب) جانتے ہوتے ہیں ۱۷۸ کسی بشر سے

لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ

یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے

لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا

یہ کہنے لگے کہ تم میرے بندے بن جاؤ علاوہ اللہ کے ۱۷۹ بلکہ (وہ تو یہی کہے گا) کہ اللہ

رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ

والے بن جاؤ ۱۸۰ (یہ) اس لئے (اور بھی) کہ تم پڑھاتے ہو کتاب (آسمانی) کو اور خود بھی (اسے)

تَدْرُسُوْنَ ۝۷۹ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ

پڑھتے ہو ۱۸۱ اور نہ وہ تمہیں اس کا حکم دے گا کہ تم فرشتوں

الکلم ویعدلون بہ عن القصد (قرطبی)
۱۷۷ یعنی اُن کی یہ تحریفیں دانستہ ہوتی ہیں
لِتَحْسَبُوْہُ میں ضمیر مخاطب سے مُراد سامعین ہیں
اور ضمیر غائب سے مُراد کتاب کا اختراعی حصہ۔ و
ھو المحرف (کبیر) یَقُوْلُوْنَ - ضرور نہیں کہ
ان کا یہ کہنا لفظاً و صراحۃً ہو - اگر اجمالاً و دلالۃً ہو
جب بھی کافی ہے۔ وَمَا ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ
فقیہ جلیل ابوبکر رازیؒ نے اس کے تحت میں لکھا
ہے کہ آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ معاصی کی نسبت
اللہ تعالیٰ یا اس کے فعل کی جانب دینا درست
نہیں - فیھا دلالۃ علی ان المعاصی لیست
من عند اللہ ولا من فعلہ (جصاص) لیکن
مفسر و محدث ابوحیان غرناطی کی تنقید اس پر
یہ ہے کہ یہ مذہب تو معتزلہ کا ہے اور ابوبکر رازی
کا میلان خود اسی مذہب کی جانب تھا - ھذا
مذھب المعتزلۃ وکان الرازی یحتج الی
مذھبھم (بحر) صاحب کبیر اور صاحب روح المعانی
دونوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ
عربی دانوں کے پڑھنے کے قابل ہے۔ ۱۷۸
(جیسا کہ مسیحیوں نے دعوت و پیام مسیح کا خلاصہ
گڑھ رکھا ہے) درمیان میں مناسبت مقام کو
رد یہود آگیا تھا - اب یہاں سے رد نصاریٰ پھر
شروع ہوتا ہے۔ مَا کَانَ لِبَشَرٍ ......
وَالنُّبُوَّۃَ - چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام سے بھی یہ نہیں
ہو سکتا جنہیں یہ ساری نعمتیں ملی تھیں جن کے
نفس ایسے طاہر و مطہر ہوں، اُن سے ایسے دعویٰ
کا صدور ممکن ہی کیونکر ہے۔ اَلْحُکْمَ حکم سے
مُراد علم و فہم ہے یا فہم احکام شریعت - الحکم العلم

والفھم وقیل ایضاً الاحکام (قرطبی) قیل بمعنی الحکمۃ والظاھر ان الحکم ھنا القضاء (بحر) اَلْکِتٰبَ. کتاب یہاں جنس کتاب کے معنی میں ہے - الکتاب ھنا اسم جنس (بحر)
۱۷۹ (جیسا کہ فی الواقع مسیح کی دعوت رہی ہے) رَبّٰنِیّٖنَ - ربانی وہ ہے جو رب کی جانب منسوب ہو - ربّی کا مُرادف ہے - ان کا اضافہ زور اور تاکید کے لئے ہے یعنی
بڑا اللہ والا - بڑا با خدا - معنی الربانی العالم بدین الرب الذی یعمل بعلمہ (قرطبی) قال محمد بن الحنفیۃ یوم مات ابن عباسؓ الیوم مات ربانی ھذہ الامۃ (قرطبی)
ھو شدید التمسک بدین اللہ وطاعتہ (مدارک) ۱۸۰ یعنی اس لئے تو تمہیں اور زیادہ ایسے لغو و مشرکانہ عقائد سے بچنا چاہیے - ای بسبب کونکم معلمین الکتاب وبسبب
کونکم دارسین لہ (بیضاوی) امام رازیؒ نے یہاں یہ نکتہ خوب پیدا کیا ہے کہ علم و تعلیم و دراست کا اقتضاء ہی یہ ہے کہ انسان باخدا بن جائے - پس اگر ان مشغلوں سے یہ مقصود ہی نہیں رکھتا
تو وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے - اور ایسے ہی علم اور قلب سے حدیث نبوی میں پناہ مانگی گئی ہے۔ نعوذ باللہ من علم لا ینفع وقلب لا یخشع (کبیر) خطاب نصاریٰ سے ہے یعنی تمہارے پاس
تعلیم و تعلم کے لئے کتاب آسمانی موجود اور پھر تم ایسے جہل و ضلالات میں گرفتار۔

۱۸۱ وَلَا یَاْمُرَکُمْ میں لا معنی نفی کی تاکید مزید کے لئے ہے۔ لا مزید ۃ لتاکید معنی النفی (مدارک) مسیحیوں کی تثلیث تو ایک معلوم و معروف حقیقت ہے۔ لیکن بکثرت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ملائکہ پرستی بھی ان کے ہاں زوروں پر رہ چکی ہے اور صدیوں تک یہ تعلیم ان کے ہاں جاری رہی ہے کہ "خدا نے انسانوں اور آسمان کے نیچے ساری چیزوں کے انتظامات تمامتر فرشتوں پر چھوڑ رکھے ہیں" (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ص ۵۸۸) نیز یہ کہ "خدا کائنات کی صرف کلی ربوبیت کرتا ہے باقی جزئیات سب ملائکہ کے حوالے ہیں" (ایضاً) مسیحیت کی تاریخ ملائکہ کی باضابطہ عبادت و پرستش سے بھی ناآشنا نہیں۔ ان کی مورتیاں تک ان کے ہاں پوجی گئی ہیں۔ ہمارے قدیم مفسرین بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔ ھذا موجود فی النصاری یعظمون الملائکۃ والانبیاء حتی یجعلوھم لھم اربابا (قرطبی) ۱۸۲ (اور توحید خالص کا اقرار کر چکے ہو) اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ اس سے ظاہر ہے

وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۸۰ ع ۱۶

اور پیغمبروں کو پروردگار قرار دو ۱۸۱ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دیگا بعد اس کے کہ تم اسلام لا چکے ہو ۱۸۲

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ

(اور وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب و حکمت (کی قسم)

حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ

سے دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول اس (چیز) کی تصدیق کرنے والا آئے جو تمہارے پاس ہے

لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ

تو تم ضرور اس رسول پر ایمان لانا اور ضرور اس کی نصرت کرنا ۱۸۳ پھر فرمایا تم اقرار کرتے ہو اور

عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا

اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے ہم اقرار کرتے ہیں فرمایا تو گواہ رہنا اور میں (بھی)

مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۸۱ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ

تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں ۱۸۴ پھر جو کوئی اس کے بعد بھی روگردانی کرے گا

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۸۲ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ

سو یہی لوگ تو نافرمان ہیں ۱۸۵ سو کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ (کسی اور دین کو)

وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ

تلاش کر رہے ہیں؟ درانحالیکہ اس کے فرمانبردار ہیں جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں (خواہ وہ فرمانبردار)

كَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ۸۳ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ

ہوں اختیار سے یا بے اختیاری سے اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ۱۸۶ آپ کہہ دیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر

منزل

کہ انبیاء پرستی و ملائکہ پرستی صاف کفر کے حکم میں داخل ہے۔ آیت سے سبق اُن مسلمانوں کو بھی لینا چاہیئے جو اپنے شیوخ و اکابر کی خواہ وہ زندہ ہوں یا گزر چکے ہوں، تعظیم و عقیدت میں غلو کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ جملہ کا سوالیہ انداز اظہار حیرت و انکار کے لئے ہے۔ جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟ علی طریق الانکار والتعجب (قرطبی) ۱۸۳ (یہ ایمان دل و جان سے ہو اور نصرت دست و زبان سے) اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ یعنی ارواح انبیاء سے عہد لیا۔ عالم ارواح میں اس ناسوتی دنیا کے وجود سے قبل۔ یہاں یہ واضح رہے کہ جو احکام انبیاء کو ملے، ان میں ان کی اُمتیں بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں۔ مِنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ۔ کتاب سے مراد کتاب آسمانی ہونا ظاہر ہے۔ حکمۃ سے مراد معرفت الٰہی بھی ہو سکتی ہے اور نبوت بھی۔ مُصَدِّقٌ۔ تصدیق ہونے سے بھی بڑھ کر یہ حالت ہے کہ وہ بعد کا آنے والا رسول خود ان پچھلی تعلیمات و ہدایات کا مصداق بھی ہو۔ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ۔ عارفین صوفیہ نے کہا ہے کہ شیوخ پر لازم ہے کہ ان کا جو معاصر علم و عمل میں اُن سے فوق ہو بلکہ ان کا مساوی ہو اس سے دعا کرانے میں عار نہ کریں۔ رَسُوْلٌ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ ایک فرد معین کی جانب کر رہا ہے۔ اور یہ اسلوب قرآن میں عام ہے۔ الرسول ھنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی قول علی و ابن عباس واللفظ وان کان نکرۃ فالاشارۃ الی معین (قرطبی) ۱۸۴ اِصْرِیْ۔ اصر کے لفظی معنی بوجھ کے ہیں۔ مراد عہد ہی سے ہے۔ انبیاء کی زبان سے اقرار یوں بھی اقرار صالح اور حلف مؤکد کے برابر ہیں۔ اللہ کی اس گواہی نے مؤکد کو مؤکد تر کر دیا۔ الاصر فی اللغۃ الثقل فسمی العھد اصرا لانہ منع وتشدید (قرطبی) ۱۸۵ فَمَنْ تَوَلّٰى۔ یعنی مومنوں میں جو کوئی اس عہد سے اعراض کریگا۔ خود انبیاء معصومین سے تو اس کا احتمال ہی نہیں، اسلئے لامحالہ افراد اُمت مراد ہونگے۔ ھذا الحکم بالنسبۃ الی اتباعھم (بحر) ۱۸۶ (قیامت کے دن) سو ڈرتے رہنا اُس ہستی سے چاہیئے جو آج بھی اس قدر با اختیار ہے اور کل بھی سابقہ اسی سے پڑے گا۔ اور اسی کی عبادت میں لگے رہنا چاہیئے۔ یَبْغُوْنَ۔ یہ باطل کے تلاش کرنے والے عام اہل باطل ہیں۔ دِیْنِ اللّٰهِ۔ یہاں صراحت کے ساتھ اسلام کے لئے دین اللہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یہاں مراد ہے انقیاد تکوینی۔ یعنی اس کی مشیت سے باہر کوئی بھی نہیں جا سکتا۔ طَوْعًا یعنی اپنے ارادہ و اختیار سے۔ كَرْهًا یہ اشارہ غیر ذوی العقول حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ کی طرف ہے۔

عَلَيْنَا وَمَآ أُنْزِلَ عَلٰٓى إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ

جو ہمارے اوپر اتارا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور

وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى

یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ پر اتارا گیا ہے اور اس پر جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور (دوسرے)

وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ

نبیوں کو دیا گیا اُن کے پروردگار کی طرف سے ۱۸۷ ہم ان میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے ۱۸۸ اور

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُونَ ۝۸۴ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ

ہم تو اسی اللہ کے فرمانبردار ہیں ۱۸۹ اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش

دِينًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ

کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں

الْخٰسِرِينَ ۝۸۵ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ

سے ہوگا ۱۹۰ اللہ کیسے ایسے لوگوں کو ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد

إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوٓا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ

کفر اختیار کر لیا اور بعد اس کے کہ شہادت دے چکے تھے کہ رسول برحق ہیں اور بعد اس کے کہ ان کے

الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۝۸۶

پاس کھلی ہوئی نشانیاں آچکی تھیں اور اللہ (ایسے) ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۱۹۱

أُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ

ایسوں کی سزا یہ ہے کہ اُن پر اللہ کی اور

منزل ۱

۱۸۷ یہاں یہ حقیقت ایک بار پھر دہرا دی گئی ہے کہ اسلام کوئی نیا نو پید اور انوکھا دین نہیں، وہی پُرانا دینِ توحید ہے۔ سارے انبیاء و مرسلین اسی کی تبلیغ کرتے چلے آئے ہیں۔ اور مسلمان کا ایمان سارے پیغمبروں پر یکساں ہوتا ہے۔ قُلْ یعنی اے پیغمبر آپ اپنی اُمّت کی طرف سے کہہ دیجیے۔ اُنْزِلَ عَلَيْنَا یعنی قرآن مجید نزولِ قرآن کا انتساب جس طرح عموماً پیغمبر کی طرف کیا گیا ہے، اسی طرح کبھی کبھی پیغمبر کی اُمّت کی جانب بھی کر دیا گیا ہے۔ اور فعل انزال کا صلہ قرآن مجید میں حرفِ علیٰ اور الیٰ دونوں کے ساتھ آیا ہے۔ الْاَسْبَاطِ یعنی اولادِ یعقوب میں سے جو جو پیغمبر ہوئے ہیں۔ اس لفظ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا۔ ان سب انبیاء کے اسمائے گرامی پر بھی حاشیے گزر چکے۔ ۱۸۸ (ان کی صداقت کے لحاظ سے، کہ بعض کو ماننا اور بعض کو جھٹلانا، جیسا کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ مغضوب اور معتوب اُمّتوں کا شیوہ ہے) ۱۸۹ مُسْلِمُوْنَ ایک طرف اُمّتِ محمدیؐ کا اصطلاحی نام بھی ہے۔ اور دوسری طرف اس کے لفظی معنی فرمانبردار کے ہیں۔ ۱۹۰ اَلْاِسْلَامُ سے یہاں کھلی ہوئی مراد اصطلاحی دینِ اسلام ہے۔ ورنہ لفظی معنی کے لحاظ سے تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ مسلم ہے۔ اعلم ان ظاهر هذه الاٰية يدل على ان الايمان هو الاسلام (کبیر) اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وغیرہ متعدد آیتوں میں یہ مضمون صاف صاف بیان ہو چکا ہے کہ سچا اور مقبول دین صرف یہی دین ہے جس کی کتاب قرآن ہے۔ اور جس کے لانے والے اور سکھانے والے محمد رسول اللہ صلعم ہیں۔ اس ایک دین کے علاوہ اور جتنے بھی دین و مذہب چلے ہوئے ہیں سب کی مثال کھوٹے اور جعلی سکّوں کی سی ہے کہ چلنے کو چلتے وہ بھی ہیں۔ لیکن جب چل نہ سکے تو ان کا سکّہ ہونا نہ ہونا برابر۔ یہ آیت اس حقیقت کو اور زیادہ مؤکّد و آشکار کر رہی ہے۔ دوسرے ادیان و مذاہب کو بھی اس دینِ حق کی طرح سچا سمجھنا، ہر دین و مذہب کو نجات کے لئے کافی سمجھنا، سب مذہبوں کو ملا جُلا کر ان کا ایک ملغوبہ تیار کرنا، یا یہ کہنا کہ دیر و حرم، کعبہ و کلیسا سب یکساں ہیں، ضلالت و بے دینی کی انتہائی شکلیں ہیں۔ اکبر، دارا شکوہ، وغیرہ ان ناکام کوششوں کیلئے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں۔ اور بڑے قلق کا مقام ہے کہ ہمارے زمانہ میں بھی بعض اہلِ قلم ایسی ہی نامراد کوششیں کر چکے ہیں۔ ۱۹۱ اَلْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ یعنی ایسے بے انصافوں کو جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں۔ اتنے دلیر ہیں۔ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ یعنی دینِ حق سے مُرتد ہو گئے۔ اَلْبَيِّنٰتُ کھلی ہوئی نشانیاں، رسولِ اسلام اور دینِ اسلام کی صداقت کی۔ دلائل، معجزات، سب ان بیّنات کے تحت میں داخل ہیں۔

الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ

فرشتوں کی اور انسانوں کی سب کی لعنت ہوتی ہے ۱۹۲ وہ اس میں ہمیشہ ہمیش پڑے رہنے والے ہیں

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾

نہ اُن پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ۱۹۳

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟

البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں اور (اپنے کو) درست کرلیں سو

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

بے شک اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحم والا ہے ۱۹۴ بیشک جن لوگوں نے بعد اپنے ایمان

بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ

لانے کے کفر اختیار کیا پھر کفر میں بڑھتے رہے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ

تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

کی جائے گی ۱۹۵ یہی لوگ تو گمراہ ہیں ۱۹۶ بیشک جن لوگوں نے

كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ

کفر اختیار کیا اور وہ مرگئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے سو ان میں سے کسی سے ہرگز قبول

مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ

کیا جائیگا زمین بھر (بھی) سونا اگرچہ وہ اسے معاوضہ میں دینا چاہے ۱۹۷ یہی وہ لوگ

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع ۹ ۱۱ ۱۷

ہیں جن کے لئے عذاب دردناک ہے اور جن کے کوئی بھی مددگار نہ ہوں گے

منزل ۱

۱۹۲ لعنۃ۔ رحمت الٰہی سے محرومی و مہجوری پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔ ۱۹۳ (جہنم میں پڑنے سے قبل) لا یخفف عنھم العذاب جہنم میں پڑنے کے بعد بھی کوئی تخفیف عذاب میں نہ ہوگی۔ فیھا یعنی اس حالت ملعونیت و مغضوبیت میں۔ ای خالدین فی اللعنۃ (کبیر) دوسرے معنی جہنم میں پڑے رہنے کے بھی مروی ہیں۔ قال ابن عباس ای فی جھنم (کبیر) ۱۹۴ تابوا یعنی صدق و اخلاص کے ساتھ توبہ کرلیں۔ غفور سو اپنی اس صفت غفر کے تقاضے سے ان کی پچھلی خطاؤں کو بخش دے گا۔ رحیم سو اپنی صفت رحیمیت کے تقاضے سے ان پر مزید فضل کرے گا۔ ۱۹۵ (دوسرے معاصی و سیئات کی) یعنی بڑے تو رہیں کفر و ارتداد میں اور چاہیں کہ انہیں ان کے دوسرے اعمال حسنہ کا صلہ مل جائے۔ سو بغیر ایمان و اعتقاد صحیح کے ان اعمال پر سرے سے حسنہ "و" صالحہ کا اطلاق ہی نہ ہو سکے گا جو ان پر اجر و صلہ کی توقع رکھی جائے ۱۹۶ یعنی گمراہ کامل۔ انتہا درجہ کے گمراہ۔ ورنہ گمراہ تو سب ہی کافر ہوتے ہیں۔ ھذا محمول علی انھم ھم الضالون علی سبیل الکمال (کبیر) ۱۹۷ (قیامت کے دن) یعنی بالفرض قیامت کے دن کافر مال کا مالک ہو اور اس کے دے ڈالنے پر بھی قادر ہو۔ ذھبا۔ ذھب سے سونے کی مخصوص و متعین دھات ہی مراد نہیں۔ بلکہ مراد کسی عزیز سے عزیز اور زیادہ سے زیادہ قیمتی شے کے فدیہ سے ہے۔ الذھب کنایۃ عن اعز الاشیاء (کبیر) دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی شخص آج چاہے کہ حالت کفر میں قائم رہ کر روئے زمین کے برابر روپیہ کار خیر میں خرچ کرے اور اس کے معاوضہ میں قیامت میں نجات حاصل کرے تو ایسا ہرگز نہیں ہونے کا۔ ای من مات علی الکفر فلن یقبل منہ خیر ابدا ولو کان قد ملأ الارض ذھبا فیما یراہ قربۃ (ابن کثیر)

۱۹۸ (اے مسلمانو!) الْبِرَّ۔ مطلق نیکی کو کہتے ہیں یہاں مراد کمال خیر ہے۔ اور نیکی کا درجۂ اعلیٰ یا یہ کہا جائے کہ حقیقت خیر ابواب خیر کی جامعیت ہی مراد لی گئی ہے۔ البر الاحسان وکمال الخیر (روح) ای لن تبلغوا حقیقۃ البر (مدارک) قال ابو منصور البر خیر الدنیا و الاٰخرۃ (کبیر) تُنْفِقُوْا۔ یعنی اللہ اور اس کے دین کی راہ میں نہ خرچ کروگے۔ انفاق یہاں بہت وسیع معنی میں ہے اس میں خیر اور نیکی کے تمام ابواب آگئے۔ قیل ھی سبل الخیر کلھا وھی الصحیح لعموم الاٰیۃ (ابن عربی) قال الزجاج کل ما تقرب بہ الی اللہ من عمل خیر (کبیر) قال الزجاج قال بعضھم کل ما تقرب بہ الی اللہ عزّ وجل من عمل خیر فھو انفاق (کبیر) مِمَّا تُحِبُّوْنَ محبوب چیز کے ماتحت ہر وہ چیز آجاتی ہے جسے انسان عزیز رکھتا ہے، مال، دولت، عزت، حکومت، قوت، وقت وغیرہ تنہا مال و دولت ہی مقصود نہیں بعض اوقات جاہ کی قربانی مال کی قربانی کہیں زیادہ سخت و دشوار ہوتی ہے۔ ای من المال او ما یعمہ وغیرہ کبذل الجاہ فی معاونۃ الناس و البدن فی طاعۃ اللہ و ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فی سبیلہ (بیضاوی) مِمَّا

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ۬

جب تک اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کروگے کامل نیکی کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکوگے ۱۹۸

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝۹۲

اور جو کچھ بھی کسی چیز سے خرچ کرتے رہتے ہو اللہ اُس سے خوب واقف ہے ۱۹۹

النصف

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا

ہر کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا بجز اس کے کہ

حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ

جو خود اسرائیل نے اپنے اُوپر حرام کرلیا تھا قبل اس کے کہ

تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ

توریت اُترے ۲۰۰ تو آپ کہئے کہ توریت لاؤ اور اسے پڑھو

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۹۳ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ

اگر تم سچے ہو ۲۰۱ سو جو شخص اللہ پر

وقف جبرئیل علیہ السلام

الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹۴

اس کے بعد جھوٹ گڑھ لے تو بس ایسے ہی لوگ ظالم ہیں ۲۰۲

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ بات فرمادی ہے سو تم سیدھی راہ والے ابراہیم کے دین کی پیروی کرو،

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۹۵ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ

اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے ۲۰۳ سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع

میں مِنْ تبعیض کے لئے ہے۔ من فی مما تحبون للتبعیض (کبیر) ۱۹۹ (اور وہ جزا بھی اسی کے مطابق دے گا) مطلب یہ ہے کہ نیک کام کے لئے جو کچھ بھی لگاؤگے اس کا اجر تو بہرحال ملے گا۔ باقی خیر کامل کا جو درجۂ اعلیٰ ہے وہ تو اسی وقت حاصل ہوگا جب تم حق میں اپنے محبوبات و مرغوبات کی قربانی پیش کرو۔ والحاصل انہ لا وصول الی المطلوب الا باخراج المحبوب (مدارک) مِنْ شَیْءٍ۔ یعنی عام اس سے کہ وہ محبوب ہو یا نہ ہو۔ مِنْ یہاں تبیین کے لئے ہے۔ من للتبیین ای من ای شیء کان (مدارک) ای من ای شیء محبوب او غیرہ ومن لبیان ما (بیضاوی) ۲۰۰ (اپنے اس دعوی میں کہ فلاں فلاں غذائیں تو ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے حرام چلی آتی ہیں) یہود کو تو روز ایک نیا فتنہ مسلمانوں کے خلاف اٹھانا تھا۔ آپ پر ایک الزام یہ ہوگیا، فلاں فلاں غذائیں تم جائز سمجھتے ہو اور اپنے کو دین ابراہیم کا متبع بھی کہے جاتے ہو، حالانکہ یہ چیزیں تو ابراہیم کے وقت سے حرام ہیں۔ كُلُّ الطَّعَامِ یعنی وہ غذائیں جن کے باب میں یہود سے بحث و گفتگو ہوئی ہے، ساری دنیا کے کھانے مراد نہیں۔ ای مطعومات التی فیھا النزاع (مدارک) حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ۔ اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام ہے آپ نے بعض طبی ضرورتوں سے بعض جائز غذائیں بالکل ترک کردی تھیں، روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کو مرض عرق النساء کی شکایت تھی، تو آپ نے اونٹ کے دودھ اور گوشت سے پرہیز شروع کردیا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس طبی پرہیز کا حرمت شرعی سے کوئی تعلق نہیں۔ قیل فعل ذٰلک للتداوی باشارۃ الاطباء (بیضاوی) قیل اشارت علیہ الاطباء باجتنابہ ففعل ذٰلک باذن من اللہ فھو کتحریم اللہ ابتداءً (کشاف) بعض جاہل صوفیہ کا یہ سمجھنا کہ ترک حیوانات یا بعض دوسری غذاؤں کے ترک کو قرب الٰہی میں کوئی دخل ہے تمام تر نادانی ہے۔ عاملوں کی مشقیں اور ریاضتیں بالکل دوسری چیز ہیں ورنہ جو غذائیں انسان کی روحانی ترقی میں مانع ہیں وہ خود ہی حرام کردی گئی ہیں۔ کسی غذا کے حلال ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اس راہ میں مانع نہیں۔ وفی ھذہ الاٰیۃ دلالۃ علی بطلان قول الممتنعین من اکل اللحوم و الاطعمۃ اللذیذۃ تزھدًا لان اللہ تعالیٰ قد نفی عن تحریمھا (جصاص) قُلْ (یعنی ان یہود سے کہئے جو معترض ہورہے ہیں) فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ۔ توریت میں تو آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے:۔ "وہ سب جیتے چلتے جانور تمہارے کھانے کے لئے ہیں میں نے ان سب کو نباتات کی مانند تمہیں دیا ہے" (پیدائش ۹: ۳) ۲۰۱ (اپنے حق میں) یعنی واضح اور صریح شہادتوں کے بعد بھی اپنے جھوٹ پر قائم رہیں اور یہ کہے جائیں کہ فلاں فلاں چیزیں خدا کی طرف سے حرام کی ہوئی ہیں۔ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ۔ یعنی اس واضح شہادت کے بعد۔ ای من بعد ما لزمتھم الحجۃ (بیضاوی) بعد ظھور الحجۃ (جلالین) ۲۰۲ یعنی قرآن نے امر حق واضح کردیا۔ اور تم نے جو جھوٹ اپنے ہی اکابر اور اپنے مقدس نوشتوں کی بابت گڑھ رکھے تھے، ان کی قلعی کھول دی ۲۰۳ اِبْرٰهِیْمَ۔ ملۃ ابراھیم۔ حنیف، سب پر حاشیے پارۂ اول کے ختم کے قریب سورۂ بقرہ کے رکوع ۱۵ و ۱۶ میں گزر چکے۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ یعنی اُنھی ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جنہیں تم بھی اپنا مقتدیٰ و پیشوا مانتے ہو۔

لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ۹۶

کیا گیا ۲۰۴ وہ وہ ہے جو مکہ میں ہے ۲۰۵ جسکی برکت دیا گیا اور سارے جہان کیلئے راہنما ہے ۲۰۶

فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ

اس میں کھلے ہوئے نشان ہیں (ان میں سے) ایک مقام ابراہیم ہے ۲۰۶ اور جو کوئی اس میں داخل ہو

كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ

جاتا ہے وہ امن سے ہو جاتا ہے ۲۰۷ اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کیلئے اس مکان کا یعنی (ان) اس شخص کے

اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ

ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو ۲۰۸ اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہان

غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۹۷ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ

سے بے نیاز ہے ۲۰۹ آپ کہئے کہ اے اہل کتاب تم کیوں

تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۹۸

اللہ کی نشانیوں سے کفر کر رہے ہو درانحالیکہ اللہ تمہارے کرتوں کا گواہ ہے ۲۱۰

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ

آپ کہئے کہ اے اہل کتاب جو ایمان لا چکا اسے تم کیوں اللہ کی راہ سے ہٹا رہے

اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ

ہو اس (راہ) میں کجی نکال نکال کر درانحالیکہ تم (خود) گواہ ہو

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۹۹ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا

اور اللہ تمہارے کرتوں سے بے خبر نہیں ۲۱۱ اے ایمان والو

۲۰۴ (دنیا میں بطور عبادت گاہ کے) مراد خانہ کعبہ ہے جس کی اولین تعمیر حضرت آدمؑ نے کی تھی اور اس کے منہدم ہو جانے کے بعد از سر نو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے۔ وُضِعَ لِلنَّاسِ یعنی لوگوں کی طاعت و عبادت کے لئے بنا۔ ای وضعه الله موضعًا للطاعات والخیرات والعبادات (کبیر) ای لعموم الناس لعباداتهم ونسکهم یطوفون به ویصلون به ویعتکفون عنده (ابن کثیر) وضع للناس یعبد الله فیه (معالم) اَوَّلَ بَیْتٍ۔ حدیث نبوی اور اقوال تابعین سب میں اس اولیت اور اقدمیت کی تشریح ملتی ہے۔ ثبت فی صحیح مسلم عن ابی ذر قال سالت رسول الله صلی الله علیه وسلم عن اول مسجد وضع فی الارض قال المسجد الحرام (قرطبی) قال مجاهد خلق الله موضع هذا البیت قبل ان یخلق شیئا من الارض بالفی سنة (قرطبی) ۲۰۵ (بطور قبلہ کے) کعبہ کو سب سے پہلا معبد بتا کر یہود کو بھی جتلا دیا گیا کہ کعبہ تو بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔ بَكَّةَ۔ مکہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ عربی میں ایک قاعدہ ہے جس سے حرف م اور حرف ب میں اکثر تبادلہ ہو جاتا ہے مثلاً لازم اور لازب میں یا راتم اور راتب میں یا نمیط اور نبیط میں۔ اسی قاعدہ کا عمل یہاں بھی ہوا۔ هی علم للبلد الحرام ومکة وبکة لغتان فیه (کشاف) بکة لغة فی مکة عند الاکثرین (روح) قال مجاهد بکة هی مکة (قرطبی) من اسماء مکة علی المشهور (ابن کثیر) ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ نام ہے کل شہر کا اور بکہ کا اطلاق ہے مسجد حرام اور مطاف پر۔ بکة هو موضع المسجد (ابن عباس) بکة موضع البیت و مکة ما سوی ذلك (ابن جریر عن ابی مالک) بکة موضع البیت ومکة سائر البلد عن مالك بن انس (قرطبی) قال ابو مالك وابو صالح وابراهیم النخعی وعطیة العوفی ومقاتل بن حیان بکة موضع البیت ما سوی ذلك مکة (ابن کثیر) بائبل میں بھی ایک جگہ ذکر وادی مکہ کا تحریفات کے باوجود رہ گیا ہے "وہ بکا کی وادی میں گزرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے" (زبور۔ ۸۴ : ۶) بائبل کے قدیم مترجمین نے اپنی تحریف کی عادت مستمرہ کے مطابق ترجموں میں اسے بجائے علم کے اسم نکرہ قرار دے کر اس کا ترجمہ رونے کی وادی کر ڈالا صدیوں کے بعد اب غلطی کا احساس ہوا اور اب جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اقرار ہے کہ یہ ایک مخصوص بے آب وادی کا نام ہے (جلد ۲ صفحہ ۴۱۵) الثذان کو اتنا سمجھنے کی توفیق اور دیدے کہ یہی "بے آب وادی" مکہ معظمہ ہے۔ مُبٰرَكًا۔ یہ وہ مقام ہے جس میں مادی اور روحانی دنیوی اور دینی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ لَلَّذِیْ میں لام تاکید کا ہے۔ واللام توکید (قرطبی) مکہ کی قدامت پر بادل ناخواستہ مسیحی مورخین کو بھی اب شہادت دینی پڑی (ملاحظہ ہو حواشی تفسیر انگریزی) ۲۰۶ تقدیر کلام یوں ہے۔ منها مَقَامُ اِبْرٰهِیْمَ والتقدیر منها مقام ابراهیم قال الاخفش (قرطبی) فِیْهِ یعنی اسی اول بیت میں اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ کھلے ہوئے توحید الٰہی کے شعائر یا حج کے شعائر۔ والمراد بالاٰیات شعائر الحج (کبیر) مَقَامُ اِبْرٰهِیْمَ پر حاشیہ پارۂ اول کے آخر یعنی سورۂ بقرہ کے رکوع ۱۶ میں گزر چکا۔ بَیْت سے یہاں مراد خانہ کعبہ نہیں بلکہ سارا حرم شریف ہے۔ مقام ابراهیم کے نام سے جو پتھر رکھا ہوا ہے وہ خانہ کعبہ کے اندر نہیں باہر ہی ہے۔ المراد بالبیت هنا الحرم کله لان هذه الاٰیات موجودة فی الحرم ومقام ابراهیم لیس فی البیت انما هو خارج البیت (جصاص) ۲۰۷ (شریعت الٰہی کی نظر میں) اٰمِنًا پر حاشیہ پارۂ اول کے آخر یعنی سورۂ بقرہ کے رکوع ۱۶ میں گزر چکا۔ ۲۰۸ (بہ لحاظ زاد سفر و امن راہ وغیرہ) اِسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا۔ استطاعت سبیل سے مراد وہاں تک پہنچ جانے کے ذرائع و اسباب ہیں۔ استطاعة السبیل الیه هی امکان الوصول الیه (جصاص) استطاعة السبیل الی الشیء عبارة عن امکان الوصول الیه (کبیر) حِجُّ الْبَیْتِ۔ حج و فرضیت حج پر حواشی پارۂ دوم کے وسط میں گزر چکے۔ عَلَى النَّاسِ میں عَلٰی شدت تاکید کے لئے ہے۔ هی من اوکد الفاظ الوجوب عند العرب فاذا قال العربی لفلان علی کذا فقد وکده واوجبه (قرطبی) ۲۰۹ (سو وہ سیاہ بخت اپنا نقصان آپ کریگا۔ اللہ تعالیٰ کو کیا نقصان پہنچا سکے گا) اللہ تعالیٰ کی صفت غنا کا اثبات ان مشرک قوموں کے رد میں ہے۔ جن کے دیوی دیوتاؤں کا وجود ان کے پجاریوں ہی کے دم سے قائم ہے۔ اور وہ دیوتا اپنے کھانے پینے تک کیلئے اپنے پجاریوں کے محتاج رہتے ہیں ۲۱۰ (اور اس حاضر و ناظر۔ ہمہ بین۔ ہمہ دان حاکم کے آگے کوئی حیلہ۔ بہانہ نہ چل سکے گا) اَهْلَ الْكِتٰبِ سے اشارہ خاص طور پر یہود کی جانب ہے جو مسلمانوں کو طرح طرح پر بہکاتے رہتے تھے۔ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ۔ اٰیات اللہ سے مراد خاص طور پر نبوت محمدی کے شواہد و دلائل ہیں۔ اور کفر سے مراد نبوت محمدی سے انکار ہے۔ المراد من اٰیات الله الاٰیات اللتی نصبها الله تعالٰی علی نبوة محمد علیه الصلوة والسلام والمراد بکفرهم بها کفرهم بدلالتها علی نبوة محمد علیه الصلوة والسلام (کبیر) مشرکوں کو بار بار جتلانے اور یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ اللہ صرف موجود ہی نہیں بلکہ ذرہ ذرہ سے باخبر بھی ہے۔ مشرکوں کے دیوتاؤں کی طرح بے خبر۔ ناقص العلم اور گم سم نہیں ۲۱۱ (سو اس کی گرفت اور عذاب سے اپنے کو باہر نہ سمجھو) تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ یہود خود تو اسلام

اِنۡ تُطِيۡعُوۡا فَرِيۡقًا مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ

اگر تم اُن لوگوں میں سے کسی گروہ کا کہا مان لوگے جنہیں کتاب دی جا چکی ہے تو وہ

يَرُدُّوۡكُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ وَ

تمہارے ایمان لانے کے پیچھے تمہیں کافر بنا چھوڑیں گے ۲۱۲ اور تم کس طرح کفر کر سکتے ہو درآنحالیکہ

اَنۡتُمۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ ؕ وَمَنۡ

تمہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اسکے رسول موجود ہیں ۲۱۳؟ اور جو کوئی

يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۰۱﴾

اللہ کو مضبوط پکڑتا ہے وہ ضرور سیدھی راہ کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے ۲۱۴

ع ۱۰

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جو اس کے ڈرنے کا حق ہے ۲۱۵ اور جان نہ دینا بجز

وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا

اس حال کے کہ تم مسلم ہو ۲۱۶ اور اللہ کی رسّی سب مل کر مضبوط تھامے رہو

وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۖ وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ

اور باہم نااتفاقی نہ کرو ۲۱۸ اور اللہ کا یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ جب تم باہم دشمن

اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ

تھے تو اُس نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی ۲۱۹ سو تم اُس کے انعام سے (آپس میں)

اِخۡوَانًا ۚ وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ

بھائی بھائی بن گئے، اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اُس نے تمہیں

سے سُنتے تھے۔ اب ان کی عداوتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ طرح طرح کے مکروفن سے دُوسروں کو بھی دینِ حق سے ہٹانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا۔ یہُود مسلمانوں کے آپس میں طرح طرح کی فتنہ انگیزی اور مفسدہ پردازی کرتے رہتے تھے کہ اگر اور کچھ نہیں بن پڑتا تو یہی ہو کہ یہ آپس میں مرکٹ کے تباہ ہو جائیں، چنانچہ ایک مرتبہ ایک مجمع میں جہاں مدینہ کے دو نامی مشہور اور جنگجو قبیلوں اوس اور خزرج کے مسلمان جمع تھے ایک یہُودی شماس بن قیس نے اُن کی عہدِ جاہلیت کی مشہور لڑائی جنگ بعاث کے پُرجوش جنگنامہ کے اشعار پڑھوا دیئے۔ دلوں میں گزشتہ عداوتوں کی یاد تازہ ہو گئی اور فریقین قدرۃً بھڑک اُٹھے اور عین موقع پر اگر رسول اللہ صلعم خود تشریف نہ لے آتے تو خانہ جنگی شروع ہی ہو چکی ہوتی۔ تَبۡغُوۡنَهَا میں ضمیر مؤنث غائب سبیل کی طرف ہے۔ الهاء فی تبغونها عائدة الی السبیل (کبیر) وَاَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ۔ یعنی تمہارا ضمیر خود گواہی دے رہا ہے کہ اسلام دینِ حق ہے ۲۱۲ (عقیدۃً نہیں عملاً سہی، تو یہ عملی ارتداد بھی کیا کم ہے) اِنۡ تُطِيۡعُوۡا۔ یعنی اگر اپنے عقائد و اعمال میں ان لوگوں سے متاثر ہونے لگو گے۔ فَرِيۡقًا مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ۔ یہ نام کے تو اہلِ کتاب ہیں لیکن تلے ہُوئے ہیں عداوتِ اسلام پر ۲۱۳ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے دینِ حق سے ارتداد کی گنجائش ہی کب ہے جبکہ تم میں قرآن اور سُنّتِ رسولؐ موجود و محفوظ ہے؟ ذالک لان تلاوة أيات الله عليهم حالا بعد حال مع كون الرسول فيهم الذى يزيل كل شبهة ويقرر كل حجة كالمانع من وقوعهم فى الكفر (کبیر) كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ۔ میں کفر سے مُراد اعمالِ کفر کی طرف بازگشت ہے اور کیف اظہارِ تعجب کے لئے ہے، قاله تعالى على جهة التعجب (قرطبی) قيل المراد بكفرهم فعلهم افعال الكفرة (روح) اٰيٰتُ اللّٰهِ۔ یعنی قرآن کی آیتیں اور قرآن درمیان موجود و محفوظ ہے۔ وَفِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ۔ یعنی سردست تو وہ بنفسِ نفیس تشریف فرما ہیں ہر شبہ مٹا سکتے اور راہ بتا سکتے ہیں باقی ان کے بعد ان کے سُنن و آثار بھی کام دیں گے۔ قيل الخطاب لجميع الامة لان اثاره وسننه فيهم وان لم يشاهدوه (بحر) ۲۱۴ یہ صراطِ مستقیم یا سیدھی راہ دُنیا میں فلاحِ کامل کی ہے اور آخرت میں جنّت کی۔ فَقَدۡ هُدِىَ۔ یعنی اللہ سے تمسک کرتے ہی یہ راہِ راست ضرور ہی مرتب ہو کر رہے گی۔ ۲۱۵ (ہماری طاقت اور استطاعت کے لحاظ سے) ورنہ حق تعالیٰ سے اُس کے مرتبہ کے لائق خشیت بھلا کون بشر اختیار کر سکتا ہے۔ والمعنى حق تقته ما استطعتم (قرطبی) ۲۱۶ یعنی جیو تو قانونِ تقویٰ الٰہی کے ماتحت اور مرو تو قانونِ اسلام کے مطیع۔ زندگی اور موت دونوں کی منزلیں مسلمان کو اللہ کے تابع فرمان ہو کر ہی گزرنا ہے ۲۱۷ اس تعلیم کے ایک عملی پہلو کا اعتراف ایک غیر مسلم کی زبان سے:۔ "اسلام نے اُن قبیلوں کو متحد کر دیا جو اس وقت تک برابر ایک دُوسرے سے مصروفِ پیکار رہتے تھے" (آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام ص۲) حَبۡلِ اللّٰهِ محاورۂ عربی میں حبل سے مُراد عہد بھی ہوتا ہے اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے۔ يستعار الحبل للعهد (روح) واستعير للوصل ولكل ما يتوصل به الى شىء (راغب) یہاں مُراد شریعتِ اسلامی یا قرآن ہے۔ متعدد قول نقل ہُوئے ہیں اور وہ سب متقارب ہیں۔ قال ابن مسعود حبل الله القرآن و رواه علیؓ و ابو سعيد الخدرى عن النبى صلعم وعن مجاهد و قتادة مثل ذالك (قرطبی) العهد او القرآن او الدين او الطاعة او اخلاص التوبة او الجماعة او اخلاص التوحيد او الاسلام اقوال السلف يقرب بعضها من بعض (بحر) جَمِيۡعًا یعنی اُمّت مجموعاً بھی اور افراداً اُمّت بھی ۲۱۸ (اور سب کو رشتۂ اسلام میں متحد و منسلک کر دیا) نِعۡمَتَ اللّٰهِ۔ اس انعام کے تحت میں علاوہ فلاحِ اُخروی کے اتحادِ قومی کی فلاحِ دُنیوی بھی شامل ہے۔ اتحادِ اُمّت بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً۔ ظہورِ اسلام سے قبل یعنی زمانۂ جاہلیت کا۔ عرب قبائل کی باہمی دُشمنی اور جنگجوئی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ بات بات میں چھڑ جاتی تھی جو لڑائیاں تاریخی روایات میں محفوظ رہ گئی ہیں اُن کی تعداد ۱۷۰۰ ہوتی ہے۔

مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ

اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام کھول کر سناتا رہتا ہے تاکہ تم

تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ

راہ یاب رہو اور ضرور ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہے جو نیکی کی طرف بلایا کرے

وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ

اور بھلائی کا حکم دیا کرے اور بدی سے روکا کرے اور

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا

پورے کامیاب یہی تو ہیں ۲۲۰ اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے

وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ

بعد اس کے کہ انہیں شواہد پہنچ چکے تھے باہم تفرق کرلی اور مختلف ہو گئے ۲۲۱ عذاب عظیم

لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ

انھی کو تو ہوتا ہے اس روز (جس روز) بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض

وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۚ اَكَفَرْتُمْ

چہرے سیاہ ہوں گے، پھر جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اُن سے کہا جائے گا کہ کیا تم ہی کافر

بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝

ہو گئے تھے اپنے ایمان کے بعد ۲۲۲ سو عذاب چکھو اپنے کفر کی پاداش میں

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ

اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے ۲۲۳

۲۱۹ (دینِ اسلام اور شریعتِ اسلامی رحمت کرکے) دُنیا میں یُوں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دینا اسلام کا معجزہ ہی تھا۔ اس کا اعتراف آج فرنگی محققین بھی کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ جس طرح عرب قبل اسلام کی عداوت ضرب المثل تک پہنچی ہوئی تھی اسی طرح بعد اسلام عرب کی آپس کی محبت، یگانگت، اخلاص بھی بے نظیر رہا۔ جہاں مکی مکی کا اور مدنی مدنی کا دشمن تھا۔ وہاں اسلام نے مکے کے مہاجرین اور مدینہ کے انصار کو ایسا شیر وشکر کرا دیا کہ دونوں واقعی آپس میں بھائی بھائی معلوم ہونے لگے برٹانیکا اور گبن دونوں کے صفحات میں اس کا اعتراف موجود ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ۔ ذکر زمانہ قبل اسلام کا ہے کہ اس وقت عقائد و اعمالِ مشرکانہ کی بنا پر اہلِ عرب دوزخ کے کنارہ تک پہنچ ہی چکے تھے ۲۲۰ کسی درجہ میں اور ایک چھوٹے پیمانہ پر تو یہ فرض ہر فردِ اُمت کا ہے۔ لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ایک مستقل جماعت خاص اسی کام کے لئے ہو۔ اس کا کام ہی یہی ہو کہ خلق کو دعوتِ خیر دے۔ معروف (بھلے کاموں) کی طرف بلائے منکر (بُرے کاموں) سے روکے۔ اُمَّةٌ۔ یہ بھی کمالِ رحمت و لطفِ شرعی کی انتہائی رعایت ہے کہ ساری اُمت کے بجائے اس فریضہ پر ایک مخصوص جماعت ہی کو مامور کیا گیا، ورنہ اس فریضہ کی ادائی کے لئے جن اوصاف اور شرائط کی ضرورت ہے کیا عجب کہ بہتوں کو وہ سخت دشوار معلوم ہوتے ۲۲۱ (توحید، رسالت، وحی، جزا و سزا وغیرہ اُصُولی و بُنیادی عقائد کے باب میں) كَالَّذِيْنَ مراد سابق اہلِ کتاب، یہود و نصاریٰ ہیں۔ یعنی الیھود والنصاریٰ فی قول جمھور المفسرین (قرطبی) تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا۔ یعنی از راہِ نفسانیت و شرارت وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کر دیا اور اپنے الگ الگ مذہب گڑھ لئے۔ مسائلِ جزئیاتِ احکام میں اختلاف جو اخلاصِ نیت کے ساتھ اجتہاد کی بنا پر ہو، وہ اسلام میں ہرگز ممنوع نہیں، بلکہ وہ تو اُمت کے حق میں عین رحمت ہے، اختلافِ مذاق و طبیعت کی بنا پر کسی کو کسی مسلک میں آسانی معلوم ہوتی ہے اور کسی کو کسی میں۔ الْبَيِّنٰتُ اس کے تحت میں احکام، دلائل، معجزات سب آ گئے ۲۲۲ یہ خطاب اہلِ دوزخ سے تو بہر حال ہوگا، گفتگو اس میں ہوتی ہے کہ ان سب سے ہوگا یا اُن کے صرف بعض گروہوں سے؟ ایک قول یہ ہے کہ خطاب منافقین سے ہوگا اور ایمان سے یہاں مُراد اظہارِ ایمان ہے۔ ھم المنافقون (ابن جریر۔ عن الحسن) ایک قول ہے کہ مخاطب اہلِ کتاب ہیں اور حجت ان پر قائم کی جائے گی کہ تمہاری کتابوں میں نبی آخر الزمان کا ذکر پُوری طرح موجود اور پھر تم مُکر گئے۔ المراد اھل الکتٰب (کبیر عن عکرمہ والاصم والزجاج) بعض اہلِ نظر نے ترجیح اسی قول کو دی ہے۔ والظاھر من السیاق والسباق ان ھؤلاء اھل الکتاب (روح)، ابن جریر نے بعض تابعین سے استناد کرکے یہ شق اختیار کی ہے کہ خطاب سارے کافروں کے لئے عام ہے اور جس ایمان کا یہاں ذکر ہے وہ اظہارِ ایمان عالمِ ارواح میں عہدِ الست کے وقت کا ہے۔ ھو الایمان الذی کان قبل الاختلاف فی زمان آدم (ابن جریر۔ عن اُبی بن کعب)، عنی بذلک جمیع اھل الکتاب (ابن جریر) تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ۔ یومِ حشر تو کشفِ حقائق کا وقت ہوگا، ضرور ہے کہ اہلِ حق کے چہرے اس دن انوارِ حق سے چمکتے جگمگاتے نظر آئیں۔ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ۔ کشفِ حقائق کے وقت یہ بالکل قدرتی ہے کہ اندر کی سیاہیاں اور باطن کی کدورتیں نکل نکل کر اہلِ باطل کے چہروں پر چھا جائیں۔ عربی محاورہ میں ابیضاضِ وجہ اور اسودادِ وجہ سے مُراد محض مسرت، غم بھی ہو سکتی ہے ۲۲۳ اور اسی محلِ رضا و محلِ رحمت کا نام جنت ہے۔ جنت کی ایک ایک نعمت کو قرآن مجید نے محلِ ترغیب میں ذکر کیا ہے۔ وہ رضائے الٰہی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ جیسا کہ جاہل صوفیہ اور گستاخ شاعروں کے کلام سے مترشح ہوتا ہے۔

۲۲۴ واس لئے اس کے فیصلے ہمیشہ عادلانہ و حکیمانہ ہوتے ہیں) اسلام کا خدا تمام تر رحیم ہے۔ عادل ہے۔ شفیق ہے۔ مشرک قوموں کے دیوی دیوتاؤں کی طرح ظالم و خونخوار نہیں ہے۔
قرآن مجید کو بار بار خداوند تعالیٰ کی تنزیہ کا اثبات ان صفات ذمیمہ سے کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اور تو اور توریت تک کے خدا میں صفات قہری کہیں زیادہ زور و قوت کے ساتھ جلوہ گر نظر
آرہے ہیں۔ بالحق۔ یعنی بالکل صحیح۔ جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ای بالصدق (قرطبی) ۲۲۵ (اور کوئی دیوی دیوتا اس مرجعیت امور میں اس کا شریک و سہیم ہے نہ آسمان
و زمین کے کسی جزء کی ملک و تصرف میں) جاہلی قوموں کی ان گمراہیوں کا ذکر پچھلے حاشیوں میں بار بار آچکا ہے۔ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ میں تاکید اس امر کی ہے کہ آخری فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا
ناطق ہوگا، کسی کو بھی اس میں دخل دینے کی مجال نہیں ۲۲۶ یعنی تم تو اس لئے بنائے گئے ہو کہ لوگ تمہارے نقش قدم پر چلیں۔ تم ساری دنیا کے لئے ایک نمونہ بنا کر بھیجے گئے ہو۔ خطاب اُمّتِ
محمدی اور ملّتِ اسلامی سے ہے۔ کُنْتُمْ۔ کان یہاں یا تو زائد ہے یا تامہ استعمال ہوا ہے اور اگر ناقصہ ہے جب بھی مراد دوام نسبت ہے۔ قیل ھو کان التامة المعنی

هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ۝١٠٧ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ
اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم انہیں تم کو ٹھیک ٹھیک
بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِينَ ۝١٠٨ وَلِلّٰهِ مَا
پڑھ کر سناتے ہیں اور اللہ مخلوقات پر ظلم نہیں چاہتا ۲۲۴ اور اللہ ہی کی
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُورُ ۝١٠٩
ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہی کی طرف (سارے) امور لوٹائے جائینگے ۲۲۵
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُونَ
تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے ۲۲۶ تم بھلائی کا حکم دیتے
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۗ
ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو ۲۲۷
وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ مِنْهُمُ
اور اہل کتاب بھی اگر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں کہیں بہتر ہوتا ۲۲۸ ان میں سے
الْمُؤْمِنُونَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ۝١١٠ لَنْ يَّضُرُّوكُمْ
کچھ تو ایمان والے ہیں مگر اکثر ان میں سے نافرمان ہیں ۲۲۹ وہ تم کو بجز خفیف اذیت کے
اِلَّآ اَذًى ۗ وَاِنْ يُّقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا
ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے ۲۳۰ اور اگر وہ تم سے مقابلہ کریں گے تو تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے پھر
يُنْصَرُونَ ۝١١١ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا اِلَّا بِحَبْلٍ
ان کی مدد بھی نہ کی جائیگی ۲۳۱ ان پر بس دی گئی ہے ذلت خواہ کہیں بھی وہ پائے جائیں ہوا اس کے کہ اللہ کی طرف

ع ۱۱
۲

منزل

خلقتم ووجدتم خیر امۃ وقیل کان زائدۃ المعنی انتم خیر امۃ (قرطبی) لا یراد ھھنا الدلالۃ علی معنی الزائد وانقطاع النسبۃ بل المراد دوام النسبۃ (بحر) ۲۲۷ (پورا پورا جیسا کہ حق ہے ایمان باللہ کا) آیت کے اس جزء میں اُمّتِ اسلامی کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی زندگی کے کامل و مکمل ہونے کا پُرا فوٹو آگیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تم اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس کرو۔ تم توحید کے امانت دار ہو، زمین پر اللہ کے نائب و خلیفہ ہو۔ بطور اس کی پولیس کے ہو الٰہی قانون کے نفاذ و تحفظ کے لئے۔ دنیا کے نظامِ عدل کو برقرار رکھنے کیلئے بھیجے گئے ہو۔ تمہاری زندگی کا مشن ہی یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کو چلاؤ، نظامِ حق کے ایک ایک کل پُرزہ کو درست رکھو، نظامِ باطل کا زور چلنے ہی نہ دو۔ ظلم ہوتا اگر اس ذمہ دار فعال (اگزیکٹو) جماعت کو جدال و قتال کی آزادی نہ ملتی! بلا اجازت جہاد، بلا اجازت اجراء حدود و تعزیرات اس قوم پر ذمہ داریاں ڈال دینے کے معنی یہ ہوتے کہ ہاتھ پیر باندھ کر حکم دریا میں پیرنے کا دیا جا رہا ہے۔ کیا تماشہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں ستی کی رسم کو جرم قرار دیدیں تو وہ ملک کے محسن۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادیوں کے دستور کو روک دیں تو ان کا شکریہ واجب۔ لیکن اللہ کے سپاہی اور مالک الملک کے پیارے اگر حق حاصل کرنا چاہیں کہ قانونِ الٰہی سے بغاوت کرنے والوں اور امن عالم کو غارت کر کے رکھ دینے والوں کی دار و گیر کریں تو "روشن خیالی" کے حسین تخیل پر شکن آجائے اور "تہذیب" کا پروپیگنڈسٹ اسے رواداری کے خلاف قرار دینے لگے۔ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ منکر کے تحت میں آج کے شراب خانہ اور تھیٹر، سینما اور کنسرٹ ہال، ناچ گھر اور میوزک کالج، اسکول آف آرٹ اور تصویر خانے سب آجاتے ہیں۔ آیت سے ظاہر ہے کہ اس اُمّت کی خیریت و
افضلیت اسی وقت تک ہے جب تک وہ ان صفات کی حامل ہے۔ یعنی ایمان باللہ میں مضبوط ہے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (ایجابی و سلبی دونوں قسم کی اخلاقی خوبیوں) پر قائم ہو ۲۲۸
(حالاً بھی اور مآلاً بھی۔ فی الفور بھی اور بہ لحاظ انجام کار بھی) یہ ایمان لے آتا تو ان اہل کتاب کا فرض ہی تھا اور عملی مثال مسلمانوں کی دیکھ بھی رہے تھے ۲۲۹ فاسق یہاں کافر کے معنی میں ہے۔
یعنی حد عبودیت سے باہر نکل جانے والے۔ کامل فی فسقہ متمرد فی کفرہ (بحر) عبرعن الکفر بالفسق (روح) ای الکافرون (معالم) الضلالۃ الکفر الفسق العصیان (ابن کثیر)
مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ۔ اس گروہ میں عبداللہ بن سلام یہودی کی طرح دوسرے اہل کتاب بھی داخل ہیں جو رسول اللہ صلعم کے زمانہ ہی میں ایمان لے آئے تھے ۲۳۰ اشارہ ہے یہود کی طرف۔
جن کا خاص مدینہ اور حوالی مدینہ میں بڑا زور و غلبہ تھا۔ آپ نے وقوع سے بہت قبل پیشگوئی کر دی کہ یہود اپنے بڑے بڑے مضبوط قلعوں کے باوجود، بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہونے کے باوجود مسلمان
کو ہرگز کوئی قابل ذکر نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اذًى ضرر کے مقابلہ میں بہت ہلکی اور چھوٹی چیز ہے۔ ای ضررا یسیرا کطعن وتھدید (بیضاوی) الاذی بمعنی الضرر الیسیر (روح)
۲۳۱ یعنی اگر وہ اتنی ہمت کر ہی جائیں کہ تم سے مقابلہ و مقاتلہ کو آئیں تو ہرگز غلبہ نہ پا سکیں گے بلکہ اُلٹی شکست کھا کر بھاگیں گے۔ یہ ایک پیشگوئی نہیں۔ مجموعہ ہے کئی پیشگوئیوں کا۔ اور سب کی
سب ظاہری قرائن و قیاسات کے خلاف پوری طرح پیشگوئیاں صحیح نکلیں۔ بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع، یہود خیبر سب کے باب میں اس جزم کے ساتھ بجز خدائے علیم و خبیر کے اور کون جرأت بھی ایسی
پیشگوئیوں کی کر سکتا تھا ۲۳۲ ایک اور پیشگوئی۔ وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ خود مظفر و منصور ہونا الگ رہا، عرب کے جن مشرک قبیلوں کی حمایت کا غرہ ان یہود کو ہے، ان میں سے کوئی
ان کی مدد کو بھی تو نہ آئے گا اور نہ مدینہ کے منافقین ہی ان کے کام آسکیں گے۔

۲۳۲ بنی اسرائیل کی مغضوبیت اور پستی و ذلت پر حاشیہ پارۂ اول رکوع ۷ کے ذیل میں مفصل گزر چکے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ: یعنی ان کی جانوں، ان کے اموال، ان کی عزتوں سب کی بے وقعتی اور ناقدری خلق اللہ کے دل میں پیدا ہوگئی ہے۔ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا۔ ابھی وہ بھی چار سال اُدھر یہود کی جو گت جرمنی میں، ہنگری میں، اٹلی میں زیکوسلاویکا میں اور دُوسرے ملکوں میں باوجود ان کی اس خوش حالی و امارت کے بن چکی ہے وہ آیت کی بہترین تفسیر ہے۔ حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ سے ان کی ایسی آبادی مراد ہو سکتی ہے جسے خود شریعت الٰہی نے قتل، ہلاکت اور تعزیری، انتقامی کارروائیوں سے مستثنیٰ رکھا ہے مثلاً ان کے بچے، ان کی عورتیں، ان کے گوشہ نشین زاہد، درویش وغیرہ۔ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ سے مراد ان کی وہ جماعتیں ہو سکتی ہیں جو معاہدوں کے ذریعہ سے امن حاصل کر لیتی ہیں۔ حبل کے معنی پہلے ہی بیان ہو چکے ہیں، مراد عہد و ذمہ سے ہے۔ الحبل العهد والذمة والامان (لسان)، وحبل میں و عطف کے لئے نہیں بلکہ او کے معنی میں ہے۔

مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ

کوئی عہد ہو یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے

اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا

ہیں ۲۳۳ اور ان پر پستی لپس دی گئی یہ (سب) اس سبب سے ہوا کہ وہ

يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ

اللہ کی آیتوں کے منکر ہو جاتے تھے اور نبیوں کو بلا وجہ قتل کر ڈالتے تھے۔ یہ (سب)

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ

اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حدود سے نکل جاتے تھے ۲۳۴ سب یکساں نہیں (ہی)

مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ

اہل کتاب میں ایک جماعت قائم ہے، یہ لوگ اللہ کی آیتوں کو اوقات شب میں

اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿١١٣﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں ۲۳۵ یہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

رکھتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے

عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ

روکتے ہیں اور اچھی باتوں کی طرف دوڑتے ہیں یہی لوگ نیکو کاروں میں سے

الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٤﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ

ہیں ۲۳۶ اور جو بھی نیک کام یہ کریں گے، اس سے ہرگز محروم نہ کئے جائیں گے،

منزل

۲۳۳ یعنی عہد و عبدیت و طاعت سے۔ یہود کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کی داستان سے عہد عتیق، عہد جدید اور خود یہود کی لکھی ہوئی تاریخیں سب بھری پڑی ہیں۔ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ دونوں موقعوں پر فعل کے ساتھ کانوا لانے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کوئی استثنائی یا اتفاقی واقعہ ان کی زندگی میں نہ تھا، بلکہ کفر و عدوان ان کی قومی خصلت بن گئے تھے، انکی سرشت کے جز بن گئے تھے۔ وہ ان چیزوں کے عادی بن گئے تھے۔ عَصَوْا۔ نافرمانی ان لوگوں نے اپنے رسولوں ہی کی نہیں کی بلکہ آخر میں خاتم رسل کی بھی کی بِغَيْرِ حَقٍّ یعنی انبیاء کو خود اپنے معیار عدل و قانون کے بھی خلاف ہی قتل کرتے تھے مسکنت، قتل انبیاء، کفر بآیات اللہ وغیرہ پر مفصل حاشیہ پارۂ اول رکوع ۷ کے ذیل میں گزر چکے ۲۳۵ (اپنی حق ناشناسی اور اسلام سے متعلق اپنے طرز عمل کے لحاظ سے) لیس اھل الکتاب مستوین (بحر) والضمیر لاھل الکتاب (بیضاوی) اُوپر جو کچھ ذکر ہوا۔ اہل کتاب کی یہ اکثریت کا تھا، باقی ان میں سے بعض حق شناس، انصاف دوست بھی تھے اور وہ بالآخر مشرف بہ اسلام ہو کر رہے۔ ۲۳۶ یعنی نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ والمراد ھم یصلون (روح) یصلون بین العشاء والزجاج (قرطبی) نماز شب کے فضائل آیت سے ظاہر ہیں۔ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ۔ یہ وہ جماعت تھی جو دین حق پر قائم و ثابت رہی۔ ای المستقیمة العادلة (بیضاوی) انها ثابتة علی التمسك بالدين الحق ملازمة له (کبیر)

اٰيٰتِ اللّٰهِ یعنی قرآن کی آیات۔ والمراد يقرءون القرآن (روح) مفسرین نے یہاں عبد اللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید، اسد بن عبید وغیرہم کے نام درج کئے ہیں جو یہود سے ایمان لائے تھے ۲۳۷ قرآن مجید جنہیں صالح قرار دیتا ہے۔ ان کے اوصاف و خصوصیات یہاں کس جامعیت و ایجاز کے ساتھ ارشاد کر دیئے گئے ہیں۔ پہلی بات یہ بتائی گروہ ایمان میں کامل ہوں گے، جو کچھ بھی خرچ کریں گے، مقصد صحیح کے ساتھ اور راہ حق میں کریں گے، دُوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ وہ لوگ نہ صرف خود ہی ایجابی و سلبی ہر حیثیت سے اخلاق اور پاکیزہ کرداری کے پتلے ہوں گے بلکہ دُوسروں کو بھی اسی راہ پر لائیں گے اور لگائیں گے اور نیکیوں کی طرف دلی شوق و رغبت کے ساتھ بڑھیں گے۔ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ یعنی نیکیوں کی طرف بے دلی اور بدشوقی کے ساتھ گویا ہار اور تھک کر نہیں، بلکہ بڑے شوق و اشتیاق، چاؤ اور رغبت کے ساتھ لپکیں گے۔ المسارعة فی الخير ناشئة عن فرط الرغبة (بحر) مِنَ الصّٰلِحِيْنَ کے معنی مع الصالحین کے بھی کئے گئے ہیں (قرطبی)

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے ۲۳۸ بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ

ہرگز ان کے ذرا بھی کام اللہ کے مقابلہ میں نہ اُن کے مال آئیں گے نہ اُن کی اولاد

اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

یہی لوگ دوزخ والے ہیں اس میں (ہمیشہ) پڑے

خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ

رہیں گے ۲۴۰ یہ جو کچھ اس دنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں

الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے ایک ہوا ہے جس میں سخت سردی ہے (اور) وہ ایسے لوگوں

اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ

کی کھیتی کو لگ جائے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے پھر وہ (ہوا) اس (کھیتی) کو برباد کر دے تو

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا

اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اے ایمان والو اپنے سوا کسی کو ہمراز دوست

بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا

نہ بناؤ ۲۴۱ وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے اور تمہارے دکھ پہنچنے

عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ښ وَمَا

کی آرزو رکھتے ہیں، بغض تو اُن کے مونہوں سے ظاہر ہو پڑتا ہے اور جو کچھ

۲۳۸ (اور چونکہ یہ پرہیزگار ہیں، اس لئے انہیں بھی خوب جانتا ہے)۔ یہ خیال نہ گزرے کہ کوئی متقی اللہ تعالیٰ کے علم میں آجانے سے رہ جائے گا۔ غیر قوموں کے عقائد کی تردید کے لئے اس جزء کا اضافہ ضروری تھا۔ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ۔ یعنی کہیں نہ سمجھ لینا کہ جب ماضی خراب رہ چکا ہے تو اب نجات و مغفرت کی امید ہی کیا اور اب ایمان و حسن عمل سے حاصل کیا؟ غیر مذہب والوں نے ایسے ہی عقائد گڑھ رکھے تھے۔ اس لئے تنبیہ ضروری تھی۔ يُّكْفَرُوْهُ میں ضمیر عمل خیر کے اجر و ثواب کی جانب ہے۔ ای لن تجحدوا ثوابه (قرطبی) ای لن تمنعوا ثوابه وجزاءه (کبیر)

۲۳۹ اُولٰٓئِكَ سے مراد ایمان سے محروم کفار ہیں۔ اور چونکہ اس لفظ سے حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، اہل سنت نے اس آیت سے معتزلہ کے خلاف استدلال کرکے کہا کہ خلود نار کی سزا صرف کافروں کے لئے ہے، گنہگار مومنین کے لئے نہیں۔ ولما افادت هذه الكلمة معنى الحصر ثبت ان الخلود فی النار لیس الا للكافر (کبیر) لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ۔ یعنی یہ نہ ہوگا کہ مال کو بطور کفارہ یا توبہ پیش کرکے نجات حاصل کرلی جائے۔ یہود کے جو غلط سلط عقیدے اس باب میں ہو چکے تھے، ان کا ذکر پارۂ اول کے حاشیوں میں آچکا ہے۔ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ۔ ہندوؤں اور جینیوں میں یہ گمراہی خاص طور پر بڑھی ہوئی ہے۔ اولاد نرینہ کی اہمیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ لڑکا ہی مرے ہوئے باپ کو پانی دے دے کر عذاب سے چھڑا لیتا ہے۔ منوجی کا یہ قول کتابوں میں نظر سے گزرا ہے کہ بیٹے کو سنسکرت میں "پُتر" کہتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ باپ کو "پت" (دوزخ) سے چھڑا لاتا ہے۔

۲۴۰ آسان اور عام فہم مثال میں اُن لوگوں کے مال کے ضائع جانے کو بیان کیا ہے جو ایمان سے محرومی کی حالت میں اس دنیا کے حصول کے لئے، ریا و ناموری کے لئے اپنی دولت خرچ کرتے رہتے ہیں۔ كَمَثَلِ۔ مثال ضائع جانے اور عبث ہونے میں ہے۔ صِرٌّ۔ سخت ٹھنڈی چیز کو کہتے ہیں جیسے پالا یا برف۔ قال ابن عباس الصر البرد الشدید (قرطبی) قال اکثر المفسرین واهل اللغة الصر البرد الشدید۔ قال ابن زید (کبیر) ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔ اپنے ہاتھوں اپنی جان پر ظلم کیا یعنی کفر اور بے دینی کرکے۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ۔ اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا کہ ان کے صرف مال کو خواہ مخواہ لاحاصل اور ضائع کردیا۔ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔ وہ خود ہی تو اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں کہ مال کو بے محل اور خلاف قانون الٰہی خرچ کر رہے ہیں۔

۲۴۱ (ایسا کہ اس سے اپنے ذاتی اور ملی راز کہہ ڈالو) مِّنْ دُوْنِكُمْ۔ یعنی بجز اپنی ملت والوں کے۔ بِطَانَةً۔ کہتے ہیں ہمراز دوست کو۔ ای مختصا بکم یستبطن امورکم (راغب) بطانة الرجل خاصته الذین یستنبطون امرہ (...) قانون اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت کسی مسلم کو یا اسلامی اسٹیٹ کی رعایا کو نہیں کہ اس سے فرد اور ملت دونوں کو ضرر کے اندیشہ اور خطرے کھلے ہوئے ہیں، اور اس صریح، معقول، مناسب اور ضروری انتظام کا نام بعض عقل کے دشمنوں نے "تنگ نظری" رکھا ہے ـــــ سبحان اللہ! امراض وبائی میں پرہیز و احتیاط کا نام تو فخر کے ساتھ "اصول حفظان صحت" رکھا جائے، اور جو انتظام کفر و طغیان یعنی دنیا و آخرت دونوں کی بربادی سے بچنے کے لئے کیا جائے اس کا نام "تنگ نظری" پڑ جائے! عقل دشمنی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ فقہاء مدینہ بلکہ فقہاء حجاز نے عموماً آیت سے استنباط کیا ہے کہ دشمن کی شہادت دشمن کے حق میں معتبر نہیں، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے مذہب میں جائز ہے۔ وفی هذه الآیة دلیل علی ان شهادة العدو علی عدوه لا تجوز وبذلك قال اهل المدینة والحجاز وروی عن ابی حنیفة جواز ذلك (قرطبی) افسوس ہے کہ مسلمانوں نے آیت کے حکم پر عمل میں سستی اور مداہنت شروع ہی سے برتنی شروع کردی اور ابھی رسول اللہ صلعم کے زمانہ کو چند صدیاں بھی نہیں ہونے پائی تھیں کہ سلطنت کے کاروبار میں کھلم کھلا مسیحیوں، مجوسیوں وغیرہ کو شریک کیا جانے لگا، امام قرطبی کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے حسرت، قلق اور درد کے لہجہ میں لکھتے ہیں۔ وقد انقلبت الاحوال فی هذه الازمان باتخاذ اهل الکتاب کتبة وامناء وتسودوا بذلك عند الجهلة الاغبیاء من الولاة والامراء۔ یہ حال جب اس زمانہ کا تھا تو آج چودھویں صدی ہجری میں جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کافروں کا غلبہ اور تسلط مسلمانوں پر نمایاں ہے صورت حال پر اظہار خیال کن لفظوں میں کیا جائے! فقہاء مفسرین نے آیت کے ذیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ کافروں سے تشبہ تک جب جائز نہیں تو ان کے ساتھ مصاحبت تو بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہوگی۔ لاخلاف بین علماء ان المراد به النهی عن مصاحبة الکفار من اهل الکتاب حتی نهی عن التشبه بهم (ابن عربی)

تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ ۖ إِنْ

اُن کے دل چھپائے ہوئے ہیں وہ اور بھی بڑھ کر ہے ۲۴۲ ہم تو تمہارے لئے نشانیاں کھول کر ظاہر کر چکے

كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١١٨﴾ هَا أَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ

ہیں ۲۴۳ اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو۔ تم تو ایسے ہو کہ اُن سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے ذرا محبت

وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا

نہیں رکھتے اور تم کتاب (آسمانی) پر ایک کل پر ایمان رکھتے ہو ۲۴۴ اور وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم

وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ

ایمان لے آئے اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر شدتِ غیظ سے انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں ۲۴۵ آپ

قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ

کہہ دیجئے کہ تم غیظ میں مر رہو۔ بیشک اللہ دلوں کی باتوں کو خوب جانتا

الصُّدُورِ ﴿١١٩﴾ إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ

ہے ۲۴۶ اگر تمہیں کوئی بھی حالت پیش آجاتی ہے تو یہ ان لوگوں کو دکھ پہنچاتی ہے اور اگر تم پر

تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا

کوئی بُری حالت آپڑتی ہے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں ۲۴۷ اور اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کئے رہو تو

لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ

تم کو ان کی چالیں ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی ۲۴۸، بیشک اللہ ان کے اعمال پر (پورا) احاطہ

مُحِيطٌ ﴿١٢٠﴾ وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ ع ۱۲ ۴

رکھتا ہے، اور (وہ وقت) یاد کیجئے جب آپ صبح کو اپنے گھر والوں (کے پاس) سے نکلے

۲۴۲ یعنی ان کی مخفی عداوت کا درجہ تو اس سے بھی کہیں بڑھا ہوا ہے۔ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ فقرہ کافرانہ ذہنیت کا پورا ترجمان ہے۔ اس کے اندر گہری تعلیم کی بات کی آگئی کہ کوئی غیر مسلم کسی حال میں مسلموں کا حقیقی دوست اور ہوا خواہ ہو نہیں سکتا۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ شدتِ عداوت میں غیر اختیاری طور پر زبان سے بھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ اشارہ زیادہ تر یہود مدینہ کی جانب ہے۔ یہ لوگ اب اپنا بغض اسلام مسلمانوں سے چھپا بھی نہیں رکھ سکتے تھے اور بے اختیار ان کی زبانوں سے ظاہر ہو ہی جاتا تھا۔ ۲۴۳ آیت کے معنی دو طرح پر کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کافروں کے بغض و عداوت کے آثار و علامات تم پر روشن ہو گئے ہیں، جن سے تم انہیں فوراً پہچان سکتے ہو۔ نعمۃ من اللہ تعالیٰ ان اظہر هذه الاسرار للمومنین من ...... علیهم اکبر دوسرے معنی یہ کہ تمہارے لئے اُن سے ترک موالات کی آیتیں کھول کر بیان کی جا چکی ہیں۔ ای اظهرنا لکم الآیات الدالة علی النهی عن موالاة اعداء الله تعالی ورسوله (او) الدالة علی موالاة المومنین ومعاداة الکافرین (بیضاوی) ۲۴۴ یعنی ساری کتب الٰہی پر۔ الکتٰب بطور اسم جنس استعمال ہوا ہے۔ والکتاب اسم جنس قاله ابن عباس (قرطبی) بجنس الکتاب کله (بیضاوی) تُحِبُّونَهُمْ یہ مسلمانوں کی سادہ دلی اور نیک طبعی کا ذکر ہے۔ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ یہ محبت تو تم سے کیا رکھتے، اُلٹے عداوت رکھتے ہیں، اور تمہاری کتاب الٰہی کے منکر ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ تم تو اُن کی کتابوں تک پر ایمان رکھتے ہو، اور وہ پھر بھی تم سے کسی درجہ میں بھی علاقۂ محبت نہیں رکھتے۔ ۲۴۵ عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ۔ غصہ سے انگلیاں کاٹ کاٹ کھانا عربی محاورہ میں کنایہ شدید جھنجھلاہٹ سے ہے۔ جیسے اُردو محاورہ میں اپنی بوٹیاں نوچنا، "بوٹیاں چبانا" "دانت پیسنا" وغیرہ۔ ذکر منافقین مدینہ کا ہے یعنی المنافقین (قرطبی) ۲۴۶ (چنانچہ اس نے تمہارے دلوں کے اندر کے کینہ اور عداوت کو کھول کر بیان کر دیا ہے) مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ یعنی شدت ناکامی و نامرادی ہی میں مر رہو، اس لئے کہ جو تمہاری تمنا ہے یعنی اسلام کی مغلوبیت و ہزیمت وہ پوری ہونے کی نہیں۔ ۲۴۷ منافقوں کی خباثت نفس اور کینہ پروری کا بیان ہے کہ مسلمانوں کی تکلیف سے خوش ہوتے ہیں اور اُن کی خوشی اور خوشحالی سے رنجیدہ۔ حَسَنَةٌ جیسے مسلمانوں کی اندرونی تنظیم یا کافروں پر اُن کی فتح و غلبہ۔ سَيِّئَةٌ مثلاً کوئی ہنگامی شکست۔ ۲۴۸ (اللہ اُن کی سزا پر ہر طرح قادر ہے) وَإِنْ تَصْبِرُوا۔ منافقین کے کید و مکر اور شدید مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج سے محفوظ رہنے کا کتنا آسان اور سہل الحصول نسخہ یہاں مسلمانوں کو بتا دیا گیا ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو، اپنی اصلاح میں لگے رہو۔ استقامت علی الحق کا دامن ہاتھ سے نہ دو۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا۔ صبر و تقویٰ، ان دو مختصر سے عنوانات کے اندر ساری تنظیمی جدوجہد و مشغولیت کس ایجاز و جامعیت کے ساتھ آگئی۔ آیت میں اس کی تعلیم بھی آگئی کہ دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے بہترین حربہ صبر و تقویٰ کا ہے۔ فهذا تعلیم من الله وارشاد الی ان یستعان علی کید العدو بالصبر والتقوی (مدارک)

۲۴۹ (دامنِ جبلِ اُحد کی طرف) اب ذکر جنگِ اُحد کا شروع ہو رہا ہے۔ اُحد مدینہ منورہ سے شمال کی جانب ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی ہے۔ بدر میں شکست کھائے ہوئے مشرکین مکہ جوشِ انتقام سے دیوانہ ہو رہے تھے۔ ہجرت کا تیسرا سال قریب ختم کے تھا، اور واقعۂ بدر پر ایک سال گزر چکا تھا، کہ مکہ والوں کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اب کی تیاریاں بڑے انتظام و اہتمام کے ساتھ اور بہت بڑے پیمانہ پر ہوئی تھیں۔ قریش کی جمعیت ۳ ہزار کی تھی، ان میں ۷۰۰ جوان زرہ پوش تھے، ۲۰۰ سوار اور باقی شتر سوار تھے، قوم اور قبیلہ کے بڑے بڑے سردار سب ساتھ ہوئے، بڑی بات یہ کہ عورتیں بھی شریکِ جنگ ہوئیں۔ ہاتھوں میں باجے لئے ہوئے پُرجوش نظمیں پڑھتی جاتی تھیں اور مقتولینِ بدر کے انتقام پر اپنے عزیزوں، قریبوں کو خوب اُبھارتی جاتی تھیں۔ —— جنگ میں عورتوں کی شرکت آج بیسویں صدی کی "جدت" نہیں۔ جاہلی مشرک قوموں کا پرانا شعار ہے۔ اسلامی فوج اس کے مقابلہ میں کل ایک ہزار تھی اور سامان کی کیفیت یہ تھی کہ علاوہ رسول اللہ صلعم کی سواری مبارک کے فوج بھر میں صرف ایک گھوڑا اور تھا۔ اس سے بڑھ کر ستم یہ ہوا کہ صبح سویرے عین اس وقت جب غنیم سامنے نظر آیا اور مسلمان اپنے مقدس امیر الجیش کے ساتھ نماز ہی میں مشغول تھے، عبداللہ بن اُبی مدینہ کا پرانا اور ذی اثر لیڈر یہ عذر کر کے کہ جب ہماری رائے نہیں سنی جاتی اور شہر کے اندر ہی محصور ہو کر نہیں لڑا جاتا تو ہم بیکار اپنی جانیں دوسروں کے کہنے پر کیوں دے دیں اپنے ۳۰۰ ساتھیوں کو لے کر شہر کو واپس چلا گیا۔ لشکرِ اسلام کی کل جمعیت ۷۰۰ کی رہ گئی۔ ان میں بھی زرہ پوش کل ۱۰۰۔ مقابل فوج تعداد میں چوگنی سے زائد۔ اور ساز و سامان کے لحاظ سے بھی کہیں زیادہ آراستہ! وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ میں من عند کے معنی میں ہے اور آنحضرت اس وقت حضرت عائشہؓ کے حجرہ سے برآمد ہوئے تھے۔ كان الخروج من حجرة عائشة (روح) اي خرجت بالصباح من منزلك من عند عائشة (قرطبی) مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ۔ ترتیب صفوف اور مورچوں کی مناسب موضعیت کی اہمیت جس طرح سکندر و دارا کے زمانہ میں تھی، جدید فنِ حرب میں بھی بالکل مسلّم۔ اور ملٹری سائنس کی کتابوں میں "پوزیشن" Position کی اہمیت کی تشریح میں صفحہ کے صفحہ وقف رہتے ہیں، اُمّت کا رہبرِ کامل، مقدس نبی ہونے کے علاوہ سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت سے بھی بے نظیر تھا۔ Tom Andre نامی بیسویں صدی کا ایک مسیحی مؤرخِ عرب ہے، وہ اپنی سوانح محمدؐ میں آپ کے اس کمال خصوصی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے "برخلاف اپنے مخالفین کے جو محض ہمت و شجاعت ہی رکھتے تھے۔ . . . محمدؐ نے کہنا چاہیے کہ فنِ حرب کی بھی نئی راہ نکالی۔ مکہ والوں کی بے دھڑک اور اندھا دھند حملوں کے مقابلہ میں محمدؐ نے خوب دور اندیشی اور سخت قسم کے نظم و انضباط سے کام لیا۔" (ص ۲۰۳) (ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی) مولانا شبلی مرحوم نے الفاظ کے ذریعہ سے گویا پورا معرکۂ اُحد کا کھینچ دیا ہے۔ "آنحضرت صلعم نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی، مُصعب بن عُمیرؓ کو علم عنایت کیا، زبیرؓ بن عوام رسالہ کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اس حصۂ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے، پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں اس لیے پچاس تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا۔ اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے، تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں، عبداللہ بن جبیرؓ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے، قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے انہوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی، میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا، جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیر اندازوں کے دستے الگ تھے، جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، اور ۲۰۰ گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں (سیرۃ النبی جلد ا صفحہ ۲۰۳ طبع اول) ۲۵۰ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ سمع و علم کی صفات کو یاد دلا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس وقت مخالفین و موافقین جو کچھ اپنی اپنی جگہ پر کہہ سن رہے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں آ چکا، اور اس موقع پر مخالفین و موافقین دونوں کو ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس میں سے کوئی شئی اس سے مخفی نہ رہی۔ ۲۵۱ (اور جنگ سے الگ ہو بیٹھیں۔ لیکن اس ارادہ پر عمل نہیں کرنے پائیں) هَمَّتْ۔ هَمٌّ کے معنی عربی میں پختہ قصد و عزم کے بھی ہیں اور محض خفیف سے خیال اور شائبۂ قصد کے بھی، یہاں مراد یہی آخری معنی ہیں الهم قد يراد به العزم وقد يراد به الفكر وقد يراد به حديث النفس (کبیر) والظاهر ان هذا الهم لم يكن عن عزم بل كان مجرد حديث نفس ووسوسة (روح) طَآئِفَتٰنِ ان دو جماعتوں سے مراد قبیلہ اوس کے بنی حارثہ اور قبیلہ خزرج کے بنی سلمہ ہیں۔ الطائفتان بنو سلمة من الخزرج وبنو حارثة من الاوس (ابن ہشام) ان دونوں دستوں نے عبداللہ بن اُبی کی مثال دیکھ آن کی آن کمزوری اور بزدلی محسوس کی لیکن اللہ کے فضل نے دستگیری کی، اور وسوسہ کو وسوسہ کے درجہ سے آگے بڑھنے نہ دیا۔ اور یہ خیال بھی جو انہیں پیدا ہوا، اپنی قلتِ تعداد، قلتِ سامان، غرض ضعفِ مادّی کی بنا پر پیدا ہوا نہ کہ ضعفِ ایمان سے۔ انما كان ذلك منهما عن ضعف او وهن اصابهما من غير شك في دينهما (ابن ہشام) انیسویں صدی عیسوی کا انگریز ناسور تھا سمتھ ابتدائی غزوات اسلام سے متعلق جو عموماً تاریخی استناد رکھتے ہیں کہتا ہے کہ بظاہرے اخلاص و ایثار و شجاعت کے لحاظ سے ہومر کے افسانوں سے بڑھے ہوئے ہیں (محمد اینڈ محمڈنزم صفحہ ۲۰۰) ۲۵۲ (چنانچہ اس موقع پر بھی اس نے دستگیری کی اور اپنا فضل قائم رکھا) آیت ان دونوں کمزوریوں پر اظہارِ عتاب کے لئے نہیں، اظہارِ عنایت خاص والتفات کے لئے ہے۔" حافظهما و ولاهما عن ذلك (ابن عباسؓ) ۲۵۳ (اور چاہیے کہ آئندہ یاس و بدہمتی کے جذبات کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دیں) توکّل طریقت کے اعلیٰ مقامات میں سے ہے اور محققین صوفیہ نے اس کی حقیقت پر مفصّل بحثیں کی ہیں۔ ۲۵۴ (یعنی تقویٰ کی عادت تمہیں شکر گزار بنا دے گی) بَدْرٍ۔ مدینہ کے جنوب و مغرب میں کوئی ۲۰ میل کے فاصلہ پر ایک پڑاؤ اور منڈی کا نام ہے۔ اس وقت اسے اہمیت اس لئے حاصل تھی کہ یہاں پانی کی افراط تھی اور یہ عرب میں ایک بڑی چیز تھی۔ توحید اور شرک کے درمیان یہیں سب سے پہلا قابلِ ذکر تصادم بروز جمعہ ۱۷ رمضان سنہ ۲ ہجری (۱۱ مارچ سنہ ۶۲۴ء) کو پیش آیا تھا۔ اس غزوہ نے گویا اسلام کی اور اس طرح بالواسطہ ساری دنیا کی تاریخ کا رُخ ہی پلٹ دیا تھا، فرنگی مؤرخین بھی اس کی اہمیت کے پورے طرح قائل ہیں۔ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے:۔ "فتوحاتِ اسلامی کے سلسلہ میں جنگِ بدر انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔" (جلد ۸ صفحہ ۱۲۲) اور امریکی پروفیسر ہٹی Hitti کی "ہسٹری آف دی عربس" میں ہے:۔ "یہ اسلام کی سب سے پہلی فتحِ مُبین تھی" (صفحہ ۱۱۷) وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ یعنی تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر۔ مسلمان تعداد میں کل ۳۱۳ تھے، اس "فوج" کے ہمراہ گھوڑے صرف دو تھے اور اونٹ ۷۰ کی تعداد میں، یعنی ہر لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔ اي بقلة العدد والسلاح (جلالین) معناها قليلون (قرطبی) في حالة قلة وذلة (بحر) يعني ما كانوا عليه من الضعف وقلة السلاح والمال والمركوب (بحر) وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ یعنی جیسا کہ ابھی واقعۂ بدر کی مثال میں تم نے دیکھ لیا۔ تم نے اپنی طرف سے تقویٰ کا حق ادا کر دیا، تو ادھر سے فضلِ باری اور نصرتِ الٰہی نے بھی کیسی دستگیری کی۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ۔ خطاب مؤمنین سے ہے، انہیں مستقبل میں ثابت قدم رکھنے کے لئے ماضی قریب سے نظیر لائی جا رہی ہے، کہ دیکھو ابھی پچھلے ہی سال تم نے

الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۱۲۱
مسلمانوں کو قتال کیلئے مناسب مقامات پر جماتے ہوئے ۲۴۹ اور اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا جاننے والا ۲۵۰
اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ
جب تم سے دو جماعتیں اس کا خیال کر بیٹھی تھیں کہ ہمت ہار دیں ۲۵۱ درآنحالیکہ اللہ دونوں کا مددگار تھا
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۱۲۲ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ
اور مسلمانوں کو تو اللہ ہی پر اعتماد رکھنا چاہیے ۲۵۲ اور یقیناً اللہ نے تمہاری نصرت کی
اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
بدر میں حالانکہ تم پست تھے، تو اللہ سے ڈرتے رہو، عجب کیا کہ شکر گزار بن
تَشْكُرُوْنَ ۱۲۳ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ
جاؤ ۲۵۴ (وہ وقت یاد کیجئے) جب آپ مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں
اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں سے
مُنْزَلِيْنَ ۱۲۴ ۭ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ
کرے ۲۵۵ کیوں نہیں، بشرطیکہ تم نے صبر و تقویٰ قائم رکھا ۲۵۶ اور اگر وہ تم پر فوراً
فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ
آ پڑیں گے ۲۵۷ تو تمہارا پروردگار تمہاری مدد پانچ ہزار نشان کئے ہوئے فرشتوں سے
الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۱۲۵ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى
کرے گا ۲۵۸ اور یہ تو اللہ نے اس لئے کیا کہ تم خوش ہو جاؤ

کس قدر نازک موقع پر اعتماد علی اللہ سے کام لیا تو فضلِ الٰہی نے تمہیں کیسے حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب کر دکھایا۔ ۲۵۵ (جو آسمان سے خاص اسی غرض کے لئے اتارے گئے ہوں) اِذْ تَقُوْلُ میں ذکر اس وقت کا ہے جب میدانِ بدر میں یہ خبر اڑ گئی تھی کہ غنیم کو زبردست کمک پہنچ گئی ہے، اور آپ مومنین کو تسلی دے رہے تھے۔ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ تمہارے لئے کافی نہیں، یعنی کیا تمہاری تسکین و تسلی کے لئے یہ کافی نہیں۔ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ امدادِ غیبی کے موقع پر صفتِ ربوبیت کا اظہار اور وہ بھی مخاطبین کی طرف اضافت کے ساتھ بہترین پیرایۂ بلاغت و اسلوب بیان ہے، آج کے ماہرینِ فنِ حرب پر بھی خوب روشن ہے کہ سپاہ کی ہمت قائم رکھنا، ان کے Morale کا درست رکھنا جنگ میں کامیابی کا کتنا بڑا اور اہم عنصر ہے! ۲۵۶ (میدانِ جنگ میں اور اطاعتِ رسولؐ سے منہ نہ موڑو گے) غور کر کے دیکھ لیا جائے، سارا زور صبر و ثبات اور اطاعتِ رسول پر ہے۔ جنگِ اُحد سے قبل آنحضرتؐ نے سپہ سالارِ اعظم نے جو خطبہ اپنی سپاہ کے سامنے دیا تھا، اور جو حدیث کی کتابوں میں منقول چلا آتا ہے، اس میں یہ مضمون خصوصیت کے ساتھ ہے کہ۔ "اگر ثابت قدم رہو گے تو اللہ تمہی کو مظفر و منصور کرے گا۔ اپنے پروردگار پر اعتماد رکھو، ثابت قدم رہو، اور فتح تمہی کو نصیب ہوگی"۔ ۲۵۷ (اور اچانک حملہ کی حالت میں امدادِ "بشری" عادۃً ممتنع ہوتی ہے) يَاْتُوْكُمْ کے فاعل وہی مخالفین و معاندین ہیں۔ ای المشرکون (روح) مِّنْ فَوْرِهِمْ۔ لفظة الفور تدل على السرعة والعجلة (بحر) استعير للسرعة (بیضاوی) ۲۵۸ مُسَوِّمِيْنَ یعنی کسی امتیازی علامت کے ساتھ ممتاز۔ ای مُعَلَّمِيْنَ بعلامات (قرطبی) رہا یہ امر کہ واقعۃً نزولِ ملائکہ ہوا

لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ
اور تمہیں اس سے دلجمعی حاصل ہو جائے، ورنہ نصرت تو بس زبردست اور
عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ
حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے ۲۶۰ (اور یہ نصرت اس غرض سے تھی) تاکہ کفر کرنے والوں
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ
میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا انہیں خوار کر دے کہ وہ ناکام ہو کر واپس جائیں ۲۶۱ آپ کو
لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ
اس امر میں کوئی دخل نہیں، (اللہ) خواہ ان کی توبہ قبول کرے، خواہ انہیں عذاب دے
فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
اس لئے کہ وہ ظالم ہیں ۲۶۲ اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ
الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
زمین میں ہے، وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا
اور اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحمت والا ہے ع ۱۳ اے ایمان والو سود کئی کئی حصہ
الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح
تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾
پا جاؤ ۲۶۳ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۲۶۴

اور انہوں نے کافروں سے قتال کیا تو قرآن اس باب میں خاموش ہے، اور روایتوں میں قول دونوں قسم کے ملتے ہیں۔ "لم تتعرض الاٰية الكريمة لنزول الملٰئكة ولا لقتالهم المشركين وقتلهم بل هو امر مسكوت عنه في الاٰية (بحر) قال ابن عباس ومجاهد لم تقاتل الملائكة الا يوم بدر وقال بعضهم انما كانت الفائدة في كثرة الملائكة انهم كانوا يدعون ويسبحون ويكثرون الذين يقاتلون يومئذ فعلى هذا لم تقاتل الملائكة يوم بدر وانما حضروا للدعاء بالتثبيت والاول اكثر (قرطبی) لا دليل فيها على وقوع قتالهم ولا على عدمه لاحتمالها الامرين على ما قال بعض (روح) عامر شعبی کی روایت ہے کہ مسلمانوں کو خبر پہنچی تھی کہ مشرکین کی مدد کے لئے کرز بن جابر محاربی آرہا ہے، اس ڈر کو مسلمانوں کے دل سے دور کرنے اور انہیں ڈھارس بندھانے کے لئے ان سے کہا گیا کہ تمہاری کمک پر بھی تو فرشتوں کے جھنڈ موجود ہیں، لیکن اُدھر نہ کرز مع اپنی جماعت کے آیا اور نہ اِدھر فرشتوں کو قتال کی ضرورت پڑی۔ فبلغت الكرز الهزيمة فرجع ولم يمدهم والخمسة (ابن جریر) فبلغ كرزا واصحابه الهزيمة فلم يمدهم ولم تنزل الخمسة (ابن جریر) ۲۵۹ (کہ فرشتوں، یا اور کسی مخلوق کی طرف سے) یہ گویا صاف طور پر بتا دیا کہ حقیقۃً متصرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے، فرشتے ہوں یا کوئی اور، کسی کا بھی ذریعۂ امداد ہونا سبب ظاہری کے درجہ سے زیادہ نہیں، ملائکہ پرستی، دیوتا پرستی کی جڑ یہیں سے کٹ جاتی ہے۔ ضمناً اس جانب بھی اشارہ ہو گیا کہ اسلام کی کامیابی اور فتح مندی حقیقۃً تمام تر تائیدِ غیبی کا نتیجہ ہے۔ وَمَا جَعَلَهُ میں ضمیر اسی وعدۂ امداد ملائکہ کی جانب ہے۔ الهاء للوعد والامداد (قرطبی) ای الامداد (روح) اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ۔ یعنی یہ تو فتح و نصرت کا صرف مقدمہ تھا۔ وَمَا النَّصْرُ سے مراد نصرتِ حقیقی و واقعی ہے۔ الْعَزِيْزِ۔ اس پر قادر کہ جب اور جیسے بلا اسبابِ ظاہر بلکہ خلافِ اسبابِ ظاہر فتح دلا دے اور کامیاب کرا دے۔ الْحَكِيْمِ۔ عام فطرتِ بشری کی رعایت سے اسبابِ ظاہری کا جمع کر دینے والا۔ ۲۶۰ ذکر ابھی غزوۂ بدر کا چل رہا ہے۔ اور اشارات و تلمیحات اسی کی جانب ہیں۔ لِيَقْطَعَ طَرَفًا۔ قطع یہاں ہلاک کرنے کے معنی میں ہے۔ اور ل کا تعلق نصرکم (آیت ماقبل) سے ہے۔ ونظم الاٰية ولقد نصركم الله ببدر ليقطع (قرطبی) ای ليهلك جماعة (راغب) ليهلك طائفة منهم (کشاف) لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی کافروں کو تمہارے ہاتھوں تباہ و ہلاک کرا دے جیسا کہ جنگِ بدر کے موقع پر ہوا، کہ قریش کے لیڈروں میں سے ستر کی تعداد میں اس روز قتل ہوئے اور اسی قدر قیدی بھی۔ يَكْبِتَهُمْ یعنی دنیا کی نظروں میں ذلیل و رسوا۔ ۲۶۱ (اور اس لئے فوری عذاب کے مستحق) روایتوں میں آتا ہے کہ آپؐ نے چند شدید اور موذی قسم کے کافروں کے حق میں بددعا کی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ یعنی انہیں قبولِ اسلام کی توفیق دیدے۔ اتنے ہی ٹکڑے سے ظاہر ہو گیا تھا کہ مکہ کے کافروں میں سے کچھ ضرور ایمان لے آئیں گے، چنانچہ لے آئے۔ يُعَذِّبَهُمْ یعنی اسی دنیا میں عذاب دیدے۔ ۲۶۲ (سو معاملۂ مغفرت و رحمت کرنے کے لئے اسے کسی خاص سبب کی ضرورت ہی نہیں) يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ اور یہ مغفرت اس کے عام قانونِ رحمت کے مطابق ہوگی۔ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ۔ اور یہ عذاب اس کے خاص قانونِ حکمت کے ماتحت ہوگا۔ اللہ کی ملکیتِ آسمان و زمین پر حاشیے سورۂ بقر میں گزر چکے۔ ۲۶۳ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ تقویٰ اور فلاح میں یہ لزوم بتا کر گویا اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ فلاح و کامیابی یا دنیا میں عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا راز، احکامِ تقویٰ پر عمل کرنے میں ہے۔ لَعَلَّكُمْ۔ لَعَلَّ کے لفظی معنی "عجب نہیں" کے ہیں۔ لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ لَعَلَّ جب وعدۂ الٰہی کے بیان میں آتا ہے تو اس کے مفہوم میں بجائے شک و تردد کے یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ترجمہ "تاکہ" سے صحیح ہوتا ہے۔ قال اهل المفسرين لعل وعسى من الله للتحقيق (مدارک) لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا۔ یعنی سودی کاروبار لین دین کو بالکل حرام سمجھو، حرمتِ سود پر حاشیے پارۂ سوم میں ختم سورۂ بقرہ کے قریب گزر چکے۔ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۔ سود کم بخت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ جو مفلس ہیں وہ مفلس تر اور جو امیر ہیں وہ امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔ آیت میں سود کے اسی دو گنے چوگنے ہو جانے والے وصف کی طرف اشارہ ہے، یہ مراد نہیں کہ سود مرکب نہ لو اور سود مفرد لے سکتے ہو۔ متکلمین نے کہا ہے کہ آیت سے فرقۂ مرجئہ کا رد نکل رہا ہے، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ ایمان کے بعد کوئی معصیت کفر نہیں، اور نہ مومن کے لئے کسی حال میں دوزخ کا عذاب ہے۔ فيه رد على المرجئة في قولهم لا يضر مع الايمان ذنب ولا يعذب بالنار اصلاً (مدارک) ۲۶۴ یعنی وہ جہنم کی آگ اصلاً ہے کافروں ہی کیلئے، کہیں تم کافروں کے سے اعمال کر کر کے اپنے کو ان کی لپیٹ میں نہ لے آنا۔ اکثر ائمۂ تفسیر اس طرف گئے ہیں کہ یہ وعید ان لوگوں کیلئے ہے، جو سود خواری کو عقیدۃً حلال سمجھتے تھے اور اس لئے حدودِ کفر میں داخل تھے۔ قال كثير من المفسرين هذا الوعيد لمن استحل الربوا ومن استحل الربوا فانه يكفر (قرطبی) وقال ابن عباس هذا تهديد للمومنين لئلا يستحلوا الربوا (بحر) وقال الزجاج والمعنى اتقوا ان تحلوا ما حرم الله فتكفروا (بحر) امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ یہ قرآن مجید کی بہت ہی زیادہ ڈرانے والی آیت ہے، کہ اس میں دوزخ سے جو حقیقۃً کفر کی سزا ہے، ان لوگوں کو بھی ڈرایا گیا ہے جو اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے نہیں بچتے۔ كان ابو حنيفة يقول هي اخوف اية في القران حيث اوعد الله المؤمنين بالنار المعدة للكافرين ان لم يتقوه في اجتناب محارمه (مدارک)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۲۶۶

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا

اور مغفرت کی طرف جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، دوڑو اور جنت کی طرف (دوڑو) جس کا

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ

عرض سارے آسمان اور زمین ہیں ۲۶۷ اور جو پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی ہے ۲۶۸ یہ وہ لوگ ہیں جو

يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ

فراغت اور تنگی (دونوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کے ضبط کرنے والے ہیں اور

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۲۶۹

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ

اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی بیجا حرکت کر بیٹھتے یا اپنے ہی حق میں کوئی ظلم کر ڈالتے ہیں تو

ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ

اللہ کو یاد کر لیتے ہیں اور اپنے گناہوں سے معافی طلب کرنے لگتے ہیں ۲۷۰

الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ

اور یہ (لوگ) اپنے کئے ہوئے پر اصرار نہیں کرتے، درآنحالیکہ وہ

يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ

جانتے ہوں ۲۷۱ ایسے لوگوں کی جزا اُن کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے

منزل

۲۶۵ (دنیا اور آخرت، دونوں میں) لَعَلَّكُمْ پر حاشیہ ابھی اُوپر گزر چکا ہے۔ وَاَطِيْعُوا۔ یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت خوش دلی کے ساتھ کرو۔ ۲۶۶ (اپنے اعمال کے ذریعہ سے) اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ ہر مومن کا منتہائے عمل اور منزلِ مقصود یہی مغفرتِ پروردگار ہونا چاہیئے۔ ۲۶۷ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام محض ایک سلبی حقیقت کا نام نہیں، محض گناہوں سے بچنا کافی نہیں، بلکہ مسلمانوں کو حکم اس کا بھی ملا ہے کہ اسلام کے ایجابی پہلو کا بھی پُورا حق ادا کریں، نیکیوں کی جانب لپکیں اور اس طرح جنّت کو حاصل کر کے رہیں جو رضاء الٰہی کا محل اور ظہورِ رحمت کا مل کا مقام ہے۔ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ یعنی وہ بے انتہا وسیع ہے، اس میں سب کی گنجائش ہے۔ وہاں چپقلش اور عدمِ گنجائش کا احتمال ہی نہیں۔ جنّت کی بجنسہٖ پیمائش بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ صرف اس کی بے انتہا وسعت اور گنجائش کا اظہار مقصود ہے۔ عربی محاورہ میں انتہاء وسعت کے اظہار کا یہی پیرایۂ ادا ہے۔ كناية عن غاية السعة بما هو في تصور السامعين (روح) المقصود في وصف سعة الجنة و ذلك لانه لاشيء يعلم عندنا اعرض منهما (كبير) قال القفال ليس المراد ههنا ما هو خلاف الطول بل هو عبارة عن السعة (كبير) ۲۶۸ آرنلڈ وغیرہ فرنگی فاضلوں نے کہا ہے کہ عرب جیسی تندخو، جنگجو، جدل پیشہ قوم کے سامنے حلم و ضبط، صلح و آشتی کے ایسے معیار پیش کرنا، اور پھر اس تعلیم کو کامیاب بنانا بجائے خود ایک اعجاز ہے۔ يُنْفِقُوْنَ۔ یعنی راہِ حق میں، دین کی خدمات میں خرچ کرتے رہتے ہیں، مطلق خرچ کرتے رہنا، چاہے کیسے ہی بیہودہ مقاصد کے لئے ہو، ظاہر ہے کہ شریعت میں ہرگز پسندیدہ نہیں۔ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ یعنی ہر حال اور ہر صورت میں دین اور اُمّت کی مالی ضرورتوں سے متعلق خرچ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ خوش حال ہوئے تو مسرفانہ عیش پرستیوں میں پڑ کر نیک کاموں سے ہاتھ ہی روک لیا یا تنگدست ہوئے تو ناشکری میں آ کر اپنی بساط بھر بھی خرچ کرنے سے رک گئے۔ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ۔ کظم کہتے ہیں غصہ کے ضبط کر جانے کو، تو یہ لوگ وہ ہوئے جو غصہ سے مغلوب نہیں ہو جاتے، بلکہ اس سے مقابلہ کر کے اُسے زیر کر لیتے ہیں، اور اپنے اُوپر قابو رکھتے ہیں، بعض اہلِ تحقیق نے یہ خوب لکھا ہے کہ یہاں فاقد من الغيظ ارشاد نہیں ہوا ہے یعنی مدح اس کی نہیں آئی ہے کہ غصہ سرے سے آتا ہی نہ ہو، بلکہ اس کی آئی ہے کہ اسے قابو میں رکھا جائے اور عقل جذبات کے اُوپر حاکم رہے۔ غصہ پیدا ہوتا ہے حرارتِ طبعی یا حمیت سے، اسے سرے سے فنا کر دینا ہرگز اسلام کو مقصود نہیں، مقصود اسے صرف حدود کے اندر رکھنا ہے، غصہ مطلق صورت میں ہرگز ممنوع نہیں، نہ شرعاً معصیت نہ عقلاً مُضر۔ بلکہ اگر حدود کے اندر رہے اور محلِ مناسب پر پیدا ہو تو عیب نہیں ہُنر ہے۔ غصہ کے ضبط کر جانے کی فضیلتیں حدیثِ نبوی میں بکثرت وارد ہوئی ہیں۔ مثال کے لئے صرف ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ من كظم غضبا وهو يقدر على انفاذه ملأ الله قلبه امنا و ايمانا (قدرتِ نفاذ کے باوجود جو شخص اپنے غصہ کو روک لیجائے اللہ اس کا قلب امن و ایمان سے لبریز کر دے گا۔ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ۔ یعنی لوگوں کے قصوروں، اور خطاؤں کو معاف بھی کر دیتے ہیں، یہی نہیں کہ باوجود قدرت و استطاعت خطاوار سے انتقام نہیں لیتے، بلکہ اسے معاف بھی کر دیتے ہیں، یہ درجہ کاظمين الغيظ سے بلندتر ہے، وہ اگر محض ایک سلبی کیفیت تھی، تو یہ ایک ایجابی مرتبہ ہے۔ الْمُحْسِنِيْنَ۔ محسنین کا درجہ کاظمین و عافین دونوں سے بلندتر ہے۔ یعنی عفو سے بھی آگے بڑھ کر یہ اور حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں، اخلاقی تعلیم کے موقع پر قرآن نے اکثر تدریج کو پیش نظر رکھا ہے، اور اس کی بہترین مثال یہ آیت ہے۔ تینوں مقامات فضیلت کے ہیں لیکن یہ تیسرا مقام فاضل ترین ہے۔ محدث بیہقی نے سیدنا حضرت علیؓ بن حسینؓ سے متعلق روایت نقل کی ہے کہ آپ کو ایک جاریہ وضو کرا رہی تھی کہ لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپ پر گرا۔ غصہ آنا امرِ طبعی تھا۔ جاریہ نے فوراً الفاظِ قرآنی الكاظمين الغيظ اپنی زبان سے ادا کئے۔ آپ کا غصہ دُور ہو گیا، پھر جاریہ نے العافين عن الناس پڑھا، آپ نے فرمایا "میں نے معاف کر دیا" اب جاریہ کی زبان پر والله يحب المحسنين آیا، آپ نے فرمایا "جا میں نے تجھے آزاد کر دیا" (روح)۔ رسولِ اسلام کی زندگی تو خیر من وعن، قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی ہی۔ رسولؐ سے متعلق قرب و قرابت رکھنے والے بھی کس درجہ نفوسِ قدسیہ کے مالک بن چکے تھے۔ ۲۶۹ (قاعدۂ شرعی کے مطابق) فَعَلُوْا فَاحِشَةً۔ فاحشہ کا اطلاق ہر گناہ کے لئے عام ہے، یہاں مراد وہ بُرائی ہے جو کسی دُوسرے کے ساتھ کی جائے یعنی کسی حقِ عبد کی ادائی میں کوتاہی ہو جائے۔ الفاحشة مطلق على كل معصية (قرطبي) اصل الفحش مجاوزة الحد في السوء (روح) الفاحشة الذنب الذي فيه ..... (بحر) اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یعنی حقوق اللہ کا اتلاف اگر ان سے ہو جائے۔ ولعل الفاحشة ما يتعدى وظلم النفس ما ليس كذلك (بيضاوي) ظلم النفس ما بين العبد وبين ربه (بحر) ذَكَرُوا اللّٰهَ کا اشارہ اس طرف ہے کہ نافرمانیاں ان سے پُورے قصد و تعمد کے بعد خباثتِ نفس کی بنا پر سرزد نہیں ہوا کرتیں، بلکہ احکامِ الٰہی کا ذہول اُن کے ذہن سے وقتی طور پر ہو جاتا ہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گاہ گاہ لغزشوں کا صادر ہو جانا قرب و تعلق مع اللہ کے منافی نہیں۔ اصل اور مقدم شے ہر غلطی اور کوتاہی کی تلافی اور تدارک کی فکر اور اس کی مناسب تدبیر ہے۔ فَاسْتَغْفَرُوْا۔ استغفار صحیح و معتبر وہی ہے جو محض زبان سے نہیں دل کی حسرت و ندامت کے ساتھ اور اس عزم کے ساتھ ہو کہ اب وہ گناہ دوبارہ نہیں ہونے پائیگا ورنہ اگر ہاتھ میں تسبیح چل رہی ہے اور دل بدستور گناہوں سے لذّت لے رہا ہے تو اکابر نے کہا ہے کہ یہ استغفار خود قابلِ استغفار ہے اور عجب نہیں کہ ایسے استغفار کا شمار استہزاء میں ہو جائے۔ الاستغفار المطلوب هو الذي يحل عقد الاصرار ويثبت معناه في الجنان لا التلفظ باللسان (قرطبي) روى عن الحسن البصري انه قال استغفارنا يحتاج الى استغفار (قرطبي) هذا يقوله في زمانه فكيف في زماننا هذا الذي يرى فيه الانسان مكبا على الظلم حريصا عليه لا يقلع والسبحة في يده زاعما انه يستغفر الله من ذنبه ..... واستخفاف (قرطبي) ۲۷۰ (یعنی اپنی کسی غلطی پر جان بوجھ کر برگزجمے نہیں رہتے) وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یہ تنبیہ ہے اس پر کہ گناہوں کی معافی صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، کسی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کے ہاتھ میں نہیں اور اس میں خصوصیت کے ساتھ رد ہے اس مسیحی عقیدہ کا کہ گناہوں کی معافی مسیح بلکہ ان کے نائبوں کے اختیار میں ہے۔ ملاحظہ ہو انجیل:۔ "جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے، میں تمہیں بھیجتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر ان پر پھونکا اور اُن سے کہا کہ روح القدس لو، جن کے گناہ تم بخشو، اُنکے بخشے گئے ہیں اور جن کے گناہ تم قائم رکھو، اُنکے قائم رکھے گئے ہیں۔" (یوحنا۔ ۲۰: ۲۱-۲۳) يَعْلَمُوْنَ۔ اى يعلمون قبح فعلهم (روح) والمراد لهم بصر واعالمين (روح)

۲۷۱ اُولٰٓئِكَ کا اشارہ صاف اُنھی لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر ابھی آچکا ہے۔ غلطیاں، خطائیں، لغزشیں بھی ان سے صادر ہوتی رہتی ہیں، اور ساتھ ہی وہ اُن کی تلافی اور تدارک بھی کرتے رہتے ہیں۔ اُنھی کے لئے یہ جنت کی نعمتیں بیان ہو رہی ہیں۔ عٰمِلِيْنَ۔ لفظی معنی عمل کرنے والے کے ہیں۔ محاورۂ قرآنی میں اس سے مراد عمل صالح کرنے والے ہیں۔ **۲۷۲** سُنَنٌ یعنی مختلف طور طریقہ اور ان طور طریقوں پر عمل کرنے والے، مختلف مسلکوں اور مشربوں کے لوگ، مشرک و کافر بھی، یہود و مومن بھی۔ قال الزجاج والمعنی اهل سنن فحذف المضاف (قرطبی) ساری گزشتہ اُمتوں اور قوموں کی طرف جامع اشارہ ان الفاظ میں آگیا۔ اور سنة

وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

اور (بہشت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں پڑی بہ رہی ہونگی ان میں وہ ہمیشہ (ہمیش) رہیں گے،

وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۱۳۶ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور کام کرنے والوں کیلئے کیسا اچھا معاوضہ ہے یقیناً تم سے قبل (مختلف) طریقے گزر چکے ہیں،

سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ

سو تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا

عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۱۳۷ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى

کیا انجام ہوا ہے یہ ایک اعلان ہے (سارے) لوگوں کیلئے اور ڈرنے

وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۱۳۸ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا

والوں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے اور نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو تم

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۱۳۹ اِنْ

ہی غالب رہوگے اگر تم مومن رہے اگر تمہیں

يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَ

کوئی زخم پہنچ جائے تو ان لوگوں کو بھی تو ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ

ہم ان ایام کی الٹ پھیر تو لوگوں کے درمیان کرتے ہی رہتے ہیں تاکہ اللہ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا

ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ کو شہید بنانا تھا اور اللہ

منزل ۱

کے معنی خود امة کے بھی کئے گئے ہیں، اس لئے سنن۔ امم کا مرادف ہوگا۔ السنة الامة والسنن الامم (قرطبی) وقال المفضل ان المراد بها الامم وقد جاءت السنة بمعنی الامة فی کلام العرب (روح) سِيْرُوْا۔ فَانْظُرُوْا۔ دونوں صیغہ امر کے ہیں۔ لیکن مقصود سیاحت نہیں بلکہ سرکش جاہلی قوموں سے عبرت حاصل کرنا ہے۔ خواہ جس ذریعہ سے بھی حاصل ہو۔ سیاحت سے، تاریخ سے، وقس علی ہذا۔ لیس المراد الامر بذلك لاعالة بل المقصود تعرف احوالهم فان حصلت هذه المعرفة بغير السير فی الارض كان المقصود حاصلا (کبیر) تاریخ اثریات وغیرہ کا مطالعہ اگر صحیح نقطۂ نظر اور ایمان و معرفت کے پہلو سے کیا جائے تو یہ بجائے خود ایک جہاد ہے۔ الْمُكَذِّبِيْنَ۔ یعنی دین حق کی جھٹلانے والی قوموں اور اُمتوں کا۔ **۲۷۳** مطلب یہ ہوا کہ قرآن اعلان نامہ تو ہے ساری دُنیا کے لئے لیکن اس سے نفع وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے دلوں میں خوف خدا موجود ہوگا۔ هٰذَا۔ اشارہ قرآن مجید کی جانب ہے۔ یعنی القرآن عن الحسن وغیرہ (قرطبی) قال الحسن وقتادة وابن جریج والربیع الاشارة الی القرآن (بحر) ای هذا القرآن (معالم) بعض نے وہ امر و نہی، وعدہ و وعید مُراد لئے ہیں، جو اُوپر گزر چکے ہیں۔ یعنی يقول هذا ما تقدم من امره ونهيه ووعده ووعيده (کبیر) الاشارة الی ما لخص من امر الكفار والمتقين والتائبين (مع) ای القرآن او ما تقدم من الكتب (مدارک) **۲۷۴** (اے ایمان والو) اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ وعدہ غلبہ کے لئے شرط ایمان پر ثبات کی لگی ہوئی ہے۔ یہ خوب خیال رہے۔ الْاَعْلَوْنَ۔ یہ علو و غلبہ کا وعدہ ہر قسم کے علو و غلبہ کو حاوی ہے۔ خواہ وہ مادی ہو یا روحانی، گو بیان پر نظر کرکے غلبۂ مادی ہی اغلب ہے۔ یعنی الغالبين على الاعداء (قرطبی) **۲۷۵** (تو تمہاری کسی افتاد سے ان مخالفوں کو کیا تسلی ہوسکتی ہے۔ انہیں تو ایسی ہی افتاد پیش آچکی ہے) اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ۔ اشارہ ہے ہونے والی جنگ اُحد کی طرف۔ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ۔ اشارہ ہے جنگ بدر کی طرف، اس میں قریش کو سخت ہزیمت اُٹھانا پڑی تھی۔ **۲۷۶** (مصالح تکوینی کے اعتبار سے) سو بجز و فتح و شکست کو حق و باطل کا معیار نہ سمجھا جائے۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ یعنی فتح و ظفر کا زمانہ والمراد بالايام اوقات الظفر والغلبة (کشاف)

۲۷۷ (سو ظالموں کے بر سرِ حق ہونے کا تو گمان بھی نہ کیا جائے، خواہ کو بعض مصلحتوں کی بنا پر انہیں عارضی اور ہنگامی کامیابیاں کیسی ہی حاصل ہو جائیں) وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا۔ یعنی مومنین کا ایمان
عالمِ آشکار ہو جائے ان کے اعمال ایثار اور جانبازی کی بنا پر۔ وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ۔ شہادتِ راہِ حق، معلوم ہے کہ شریعتِ اسلامی میں روحانی ترقی کی معراج اور قربِ الٰہی کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔
۲۷۸ (انہیں اسی عارضی کامیابی پر اور زیادہ مغرور کر کے) ذکر اسی غزوۂ اُحد کا چل رہا ہے، ایک فرنگی مؤرخ نے حال میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ گو قریش اُحد میں فتحمند ہوئے لیکن
یہی عارضی فتحمندی ان کے مستقل زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا۔ اہلِ ایمان کو ابتلا جب بھی پیش آتا ہے تو دفعِ سیئات کیلئے ہوتا ہے اور یا رفعِ درجات کیلئے
۲۷۹ (ان کے اعمال کے ذریعہ سے) اللہ تعالیٰ کے علمِ سرمدی میں جو کچھ بھی ہے، اشخاص کا استحقاق تو جنت میں کسی درجہ کے لئے بھی اس مادّی دنیا میں اعمال کے بعد ہی ثابت ہو سکتا ہے۔ اَمْ
یہاں بَلْ کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اسی لئے ترجمہ میں مفہوم "شاید" سے ادا کیا گیا ہے۔ ام بمعنی بل (قرطبی) ام ای بل (جلالین) اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ یعنی جنت میں امتیازِ خاص کے ساتھ پہنچ
جاؤگے۔ خطاب یہاں صحابۂ کرامؓ سے ہے۔ صحابۂ کرامؓ حصولِ جنت ہی کے مشتاق نہ تھے بلکہ اس کے اعلیٰ درجوں اور مرتبوں کا بھی حوصلہ اور ظرف رکھتے تھے اور ان مدارج کے لئے جہاد کی کڑی

يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا
ظالموں کو دوست نہیں رکھتا ۲۷۷ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو میل کچیل سے صاف کر دے
وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِينَ ﴿١٤١﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا
اور کافروں کو مٹا دے ۲۷۸ شاید تم اس گمان میں ہو کہ جنت میں جا داخل ہو گے
الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جٰهَدُوا مِنْكُمْ وَ
حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور
يَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ
(صبر کرنے والوں کو جانا ۲۷۹ اور تم تو موت کی تمنا کر رہے تھے
مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ
قبل اس کے کہ اس کے سامنے آؤ سو اس کو تو اب تم نے کھلی آنکھوں سے
تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ ع
دیکھ لیا ۲۸۰ اور محمدؐ تو بس ایک رسول ہی ہیں ۲۸۱ ان کے قبل اور بھی رسول گزر
قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى
چکے ہیں ۲۸۲ سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں
اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ
واپس چلے جاؤ گے ۲۸۳ اور جو کوئی بھی اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے گا وہ اللہ کا کچھ بھی
اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِينَ ﴿١٤٤﴾ وَمَا كَانَ
نقصان نہ کر سکے گا، اور اللہ عنقریب شکرگزاروں کو بدلہ دے گا ۲۸۴ اور ممکن نہیں،

کڑی منزلوں سے گزرنا ناگزیر تھا۔ ۲۸۰ (پھر اب اس سے خوف و ہراس کیوں ہے؟) خطاب صحابہؓ کی ایک جماعت سے ہے۔ الخطاب للمومنين وظاهره العموم والمراد الخصوص (بحر) خوطب به الذين لم يشهدوا بدرًا (مدارک) الخطاب للذين لم يشهدوا بدرًا وتمنوا ان يشهدوا مع رسول الله صلعم (بیضاوی) معرکۂ بدر میں مسلمانوں کی غیر متوقع بلکہ خلافِ توقع کامیابی سُن کر بعض اشخاص کو خیال پیدا ہوا کہ افسوس ہے ہم اس موقع پر حاضر نہ تھے۔ اب کاش کوئی معرکہ پھر اس قسم کا پیش آئے تو ہم بھی اپنی جانوں کی بازیاں لگا لگا کر شہدا بدر کا سا مرتبہ حاصل کریں۔ یہاں انہی کو جواب دیا جا رہا ہے کہ پہلے تو یہ ہمت تھی۔ سو اب یہ پست ہمتی کا اظہار کیوں ہو رہا ہے! وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ۔ وَ یہاں حتّیٰ کے معنی میں بھی لیا گیا ہے یعنی جب تک ان کا صبر ثابت ہو جائے۔ الواو هنا بمعنى حتى قاله الزجاج (قرطبی) ای حتى يعلم صبرهم (قرطبی) مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ (یعنی اس معرکۂ اُحد کے وقوع سے قبل) تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ۔ موت سے مراد سببِ موت۔ ذریعۂ موت یعنی جہاد و قتال ہے یا خود موتِ شہادت۔ الموت ای سبب الموت (معالم) ای الحروب فانها من اسباب الموت او الموت بالشهادة (بیضاوی) رَاَيْتُمُوْهُ ضمیر موت یا سببِ موت کی جانب ہے۔ يعنى الموت (ابن کثیر) يعنى اسباب الموت (معالم)
۲۸۱ (اور اس لئے فنا پذیر بھی ہیں۔ کوئی خدا یا جزءِ خدا یا مظہرِ خدا تو ہیں نہیں جو قانونِ حیات و ممات سے بالاتر ہوں) مُحَمَّدٌ۔ اسمِ مبارک قرآن میں پہلی بار آیا ہے۔ لفظی معنی ہیں وہ شخص جس کی مدح بہت یا بار بار کی جائے یا جو صفاتِ حسنہ کا مجموعہ ہو۔ يقال فلان محمد اذا كثرت خصاله المحمودة (راغب) اسمِ علَم ہے ہمارے رسولؐ اور دنیا کے آخری نبی کا۔ حضورؐ کی بعثت سے قبل اس نام کا رواج بہت کم تھا۔ علامہ ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی المتوفی ۲۴۵ھ نے کل سات آدمی اس نام کے گنائے ہیں (کتاب المحبر صفحہ ۱۳۰) اور ان میں سے ایک محمد بن سفیان بن مجاشع کی بابت تو یہ کہا ہے کہ اُن کے والد نے ایک

شامی راہب سے یہی سُن کر کہ آیندہ پیمبر کا نام محمدؐ ہوگا اپنے لڑکے کا یہی نام رکھ دیا۔ کان سفیان اتی الشام فنزل علی راهب فاعجبته فصاحته وعقله فسأل الراهب عن نسبه فانتسب له الی مضر فقال له اما انه يبعث فی العرب نبی يقال له محمد فسمی سفيان ابنه محمدًا تاج العروس اور لسان العرب میں بھی یہی سات نام نقل ہوئے ہیں۔ لیکن یہ نام عام طور سے عرب میں شائع نہ تھا۔ اور تصریحات اس قسم کی ملتی ہیں کہ لم يكن شائعًا بين العرب هذا الاسم اور تاج میں بھی اسی سے ملتا جلتا قول موجود ہے۔ راقم آثم کے ایک قدیم اور جواں مرگ دوست مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم کا ایک مستقل مقالہ اسمِ پاک محمدؐ پر ہے۔ ان کی یادگار کے طور پر اور اُن کی روح کو ثواب پہنچانے کی خاطر اس مقالہ کا بیشتر حصہ سورۃ کے آخر میں بطورِ ضمیمہ کے شامل کیا جاتا ہے۔ ۲۸۲ (اور ان سب نے اپنے اپنے وقت پر دنیا کو خیرباد کہا، سو یہ بھی اپنے وقتِ موعود پر وفات پائیں گے اور اس میں نہ کوئی بات حیرت کی ہوگی اور نہ کوئی پہلو آپ کی اہانت کا نکلے گا) رسولؐ کا مرتبہ خوب سمجھ لیا جائے۔ رسولؐ محض عبد ہوتے ہیں صاحبِ وحی۔ عقیدۂ حلول، مظہریت، ابنیت وغیرہ پر ضرب لگانے کے لئے مرتبۂ رسالت اور رسولیت کی بار بار تصریح ضروری تھی۔ حضورؐ کی وفات کا حادثہ اس قدر سخت تھا کہ حضرت فاروقؓ بھی جیسے باوقار و عالی ظرف صبر و ضبط کھو بیٹھے اور بے اختیار ہو گئے، عین اُس وقت ایک اُن سے بھی برتر شخصیت ابوبکر صدیقؓ اسی آیت کی برمحل تلاوت کر کے اُن کے اور سب کے جذبات کو قابو میں لے آئے تھے۔ ۲۸۳ (کفر اور بے دینی کی طرف) مطلب سوال کا یہ ہے کہ جب دین کی حقیقت تمہاری نظر میں ثابت ہو چکی، تو اب قاصد یا پیغامبر کی زیست یا وفات کا اس حقیقت و صداقت پر کیا اثر! غزوۂ اُحد میں جب حضور صلعم کو زخم پہنچا اور کسی شیطان نے یہ افواہ اُڑا دی کہ آپؐ دنیا سے رخصت ہو گئے تو بعض صحابہ نے اس انتہائی صدمہ انگیز خبر سے بددل اور شکستہ خاطر ہو کر میدانِ جنگ چھوڑنا شروع کر دیا تھا اور منافقین کی وقتی طور پر بن آئی تھی۔ انہوں نے برابر طعنہ کرنا اور ارتداد کی ترغیب دینی شروع کر دی تھی۔ آیت میں ان سب پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ مَاتَ۔ اشارہ طبعی اسباب سے آنے والی موت کی طرف ہے۔ اَوْ قُتِلَ اشارہ معرکۂ جنگ وغیرہ میں شہادت کی طرف ہے۔ اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ۔ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ۔ محاورہ میں کنایہ ہے

ارتداد سے۔ جنگ سے فرار بھی مراد ہو سکتی ہے۔ جاء من الانقداد والانهزام (مدارک) ۲۸۴ (بلکہ اس کا وبال خود اپنے ہی سر لائے گا) جاہلی مذہبوں میں دیوتاؤں اور پجاریوں کے درمیان ایک طرح کی مساوات ہمیشہ رہی ہے یعنی معبود بھی اپنی پرستش وعدم پرستش سے برابر متاثر ہوتے رہے ہیں۔ قرآن نے بار بار اسی جاہلی ذہنیت پر ضرب لگائی ہے ۲۸۵ شاکرین۔ یہ شکر یہ (کافر) کے مقابلہ میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ عنقریب جزائے خیر ان لوگوں کو ملے گی جو اللہ کی اصلی اور بڑی نعمت دینِ حق کا شکریہ اس کے قبول واختیار کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ الشاکرین علی نعمۃ الاسلام بالثبات علیہ (بیضاوی) ۲۸۶ (اور اس میعادِ مقرر کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں پھر آخر شرکتِ جنگ میں اتنا جی چرانے سے کیا حاصل) موت جب بھی آئے گی حکمِ خدا ہی سے آئے گی اس کے بدون نہیں آسکتی۔ اور پھر جب آئے گی وقت موعود میں آئے گی اس کے قبل نہیں آسکتی۔ خواہ خطرات کیسے ہی شدید ہوں ان حقائق کا اگر استحضار رہے تو موت کا طبعی خوف بھی حدِ اعتدال پر قائم رہے۔ ۲۸۷ (جنہوں نے نعمتِ الٰہی کا شکریوں ادا کیا اور جنگ میں شریک ہوئے اور جہاد سے جی نہیں چرایا) پہلی آیت میں شاکرین سے وہ لوگ مراد تھے جنہوں نے دینِ حق کو قبول کیا اور اعمالِ نیک پر قائم رہے۔ یہاں شاکرین سے وہ لوگ مراد ہیں جو ان اعمال میں آخرت کی نیت کئے ہوئے جہاد میں شریک ہوئے۔ الذین شکروا نعمۃ اللہ فلم یشغلھم شیٔ عن الجھاد (بیضاوی) وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا۔ دنیا کا نفع چاہنا مطلق صورت میں ممنوع نہیں ہے۔ یہاں مراد اس نفع سے ہے جو خالص دنیا ہی کے لئے ہو۔ اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ ہی نہ ہو، ثواب الدنیا سے مراد ہے کہ مقصود یہی دنیا ہو اور فی الدنیا حسنۃ سے مراد ہے کہ بھلائی حاصل ہو اور اس کا محلِ حصول یہ دنیا ہی ہو۔ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نُؤْتِهٖ مِنْهَا۔ یعنی اگر ہماری مشیت ہوئی تو اس کی یہ آرزو پوری کر دینگے اور آخرت سے محروم کر کے اُسے یہیں نقد کا نقد معاوضہ دے دیں گے۔ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا۔ یہ ثوابِ آخرت جو ہے اللہ کی طرف وعدہ اور ذمہ ہے، اس نوتہ منہا اور قبل کے نوتہ منہا کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ۲۸۸ (راہِ حق میں جہاد فی سبیل اللہ میں) یہ بتلایا ہے کہ جہاد کی سُنت انبیاءِ قدیم کے وقت سے چلی آتی ہے اور اس راہ کے رہروؤں کو برابر ان منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ رِبِّيُّوْنَ۔ ربّی

لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ

کسی کے لئے کہ وہ ایک میعادِ مقرر پر حکمِ خدا کے بغیر مرجائے ۲۸۶ اور

مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ

جو کوئی دنیا کا فائدہ چاہتا ہے ہم اس کو دنیا کا حصہ دے دیتے ہیں اور جو کوئی آخرت کا نفع

الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ

چاہتا ہے تو اسے اس آخرت کا حصہ دے دیں گے اور عنقریب ہم شکر گزاروں کو بدلہ دے دیں گے ۲۸۷ اور کتنے ہی

مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ

نبی ہو چکے ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لڑے ہیں ۲۸۸ سو جو کچھ انہیں

اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ

اللہ کی راہ میں پیش آیا اُس سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری اور نہ وہ دبے

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ

اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۲۸۹ اور ان کا کہنا تو بس اتنا ہی تھا کہ وہ کہتے رہے

اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا

کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور ہمارے باب میں ہماری زیادتی کو بخش دے

وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور ہم کو کافروں پر غالب کر ۲۹۰

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ

سو اللہ نے انہیں دنیا کا بھی عوض دیا اور آخرت کا بھی

ربانی کے مرادف ہے اور اور معنی بھی کئے گئے ہیں۔ ای ربانیون (کشاف) اخرج سعید بن منصور عن الحسن انھم العلماء الفقھاء واخرجہ ابن جریر عن ابن عباس ایضاً فھو منسوب الی الرب (روح) كَاَيِّنْ۔ کم کے مرادف ہے یعنی بہت سے کتنے ہی۔ کاین بمعنی کم (قرطبی) صارت بمعنی کم (بیضاوی) ۲۸۹ (اور دنیا اور آخرت میں اُس کا درجہ اور مرتبہ بڑھاتا رہتا ہے) مَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی طرح طرح کی مصیبتیں اور پریشانیاں۔ وَمَا ضَعُفُوْا۔ یعنی ہر اس رُوحشت کو اپنے اوپر غالب ہونے دیا۔ وَمَا اسْتَكَانُوْا یعنی کفر و اہلِ کفر کے سامنے ساز و سامان و شان و شوکت سے ذرا مرعوب نہ ہوئے۔ وهن۔ ضعف۔ استکانۃ تین متقارب المعنی الفاظ کے درمیان فرق امام رازیؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ وھن تو کہتے ہیں قلب کی کمزوری یا بدہمتی کو، اور ضعف مطلق ہے، اس کا تعلق جسمانی قوت و مادی قدرت سے زیادہ ہے اور استکانۃ اظہارِ عجز کو کہتے ہیں۔ ۲۹۰ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ۔ اس سے اشارہ ہوگیا کہ ان لوگوں کے عمل میں تو لغزش کیا ہوتی، زبان تک بھی ان کی کلماتِ تحمید و تمجید اور اعترافِ عجز و قصور کے لئے وقف رہی ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا۔ ذنوب سے یہاں مراد صغائر سے لی گئی ہے اور اسراف سے کبائر مراد ہیں۔ ذنوبنا یعنی الصغائر واسرافنا یعنی الکبائر (قرطبی) ابن فورک نے کہا ہے کہ اس سے قدریہ کا رد بھی نکل رہا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ افعالِ عبد کا خالق نہیں ہے (بحر)

۲۹۱ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب بنایا اور آخرت میں نکوکاری کی بشارت اللہ کی محبوبیت کی صورت میں دی —— دنیا اور آخرت کے سارے انعامات سے بڑھ چڑھ کر۔ ثَوَابَ الدُّنْيَا یعنی فتح و ظفر۔ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۔ یعنی جنت اور وہاں کی نعمتیں۔ ۲۹۲ سو کافروں کی ہم خیالی، ہم مذاقی سے بچو۔ يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ یعنی تمہیں الٹے پاؤں ارتداد اور بے دینی کی طرف دھکیل لے جائیں گے۔ ۲۹۳ (سو اس کے ہوتے ہوئے تم نصرت و اعانت کے لئے مخلوق پر کیوں نظر رکھتے ہو؟) اَللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۔ اللہ تمہارا دوست و محافظ ہے۔ سو وہی تمہیں بچائے گا۔ ۲۹۴ (یعنی ان کے لئے جو خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہتے ہیں) مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا یعنی شرک کی تائید میں نہ کوئی عقلی ہی دلیل موجود ہے اور نہ نقلی۔ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ۔ دشمنانِ دین کے دلوں میں القاء رعب یا ہیبتِ حق کے معجزانہ ظہور کی ایک یادگار مثال تاریخ کے صفحات میں یوں محفوظ ہے کہ معرکۂ اُحد میں جب آخری فتح بظاہر مشرکین مکہ کو ہو گئی تو اب قدرتی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ وہ لوگ وہیں سے شہر مدینہ پر چڑھ دوڑتے۔ فاصلہ اب رہ ہی کتنا گیا تھا —— لیکن اس کی ہمت انہیں کسی طرح نہ پڑی اور الٹے انہیں واپس ہی جاتے بنی۔ اور تعاقب اس کے برعکس خود "شکست خوردہ" مسلمانوں نے اپنے بے مثل و بے مثال سالارِ لشکر کے ماتحت مدینہ سے آٹھ میل دور حمراء الاسد تک کیا، یہاں تین دن تک ان کا کیمپ رہا اور لگے ہاتھوں غنیم کا ایک آدمی بھی گرفتار کرتے لائے۔ قال ابن اسحاق فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی انتھی الی حمراء الاسد وھی من المدینة علی ثمانیة امیال فاقام بھا الاثنین والثلاثاء والاربعاء (ابن ہشام) اور یہ اہم جنگی کارروائی اس خدائی سپہدارِ اعظم نے کی ہی اس غرض سے کہ مشرکین مکہ پر پورا رعب پڑ جائے اور ان کا یہ وہم و گمان مٹ کر رہے کہ مسلمانوں نے ہار مان لی ہے۔ وانما خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ترھیبا للعدو ولیبلغھم انہ خرج فی طلبھم لیظنوا بہ قوة وان الذین اصابھم لم یوھنھم عن عدوھم (ابن ہشام) بِمَآ اَشْرَكُوْا میں ب تعلیل کے لئے ہے۔ یعنی یہ رعب ان کے شرک کی بنا پر ڈالا گیا۔ ای کان سبب القاء الرعب فی قلوبھم اشراکھم (قرطبی) الباء للسبب ای بسبب اشراکھم باللہ (روح، بحر) ۲۹۵ (غزوۂ اُحد کے اندر) پوری آیت میں بیان غزوۂ اُحد کے مختلف پہلوؤں کا ہے۔ یہاں ذکر اس وقت کا ہے جب تک مسلمان ابتداءِ معرکہ میں اطاعتِ احکامِ رسول پر قائم تھے۔ تَحُسُّوْنَهُمْ سے اشارہ دشمنانِ دین مشرکین مکہ ہیں۔ حس کے معنی قتل کے ہیں۔ عُبّر بہ عن القتل (راغب) ای تقتلونھم قتلا ذریعا (کشاف) قال ابو عبیدة الحس الاستئصال بالقتل (قرطبی) بِاِذْنِهٖ میں اذن سے مراد اللہ کا حکم تکوینی ہے۔ ای بعلمہ او بقضاءہ وامرہ (قرطبی) ای بتیسیرہ وتوفیقہ (روح) ای بارادتہ (جلالین)

ع ۱۵

اَلْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
عمدہ عوض اور اللہ نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے ۲۹۱ اے ایمان والو

اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى
اگر تم ان لوگوں کا کہا مانو گے جو کافر ہیں تو وہ تمہیں پچھلے پیروں واپس

اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ
کر دیں گے اور تم گھاٹے میں آ کر رہ جاؤ گے ۲۹۲ البتہ تمہارا دوست اللہ ہے

وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ
اور وہ بہترین مددگار ہے ۲۹۳ ہم ابھی کافروں کے دلوں میں

الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ
رعب ڈال دیں گے اس لئے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ایسی چیز کو ٹھہرایا

يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ
جس کے لئے کوئی دلیل اللہ نے انہیں اتاری اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ کیسی بری جگہ

مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ
ظالموں کے لئے ہے ۲۹۴ اور یقیناً تم سے اللہ نے سچ کر دکھایا اپنا وعدہ (نصرت)

اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ
جب کہ تم انہیں اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے ۲۹۵ یہاں تک کہ جب تم (خود ہی) کمزور پڑ گئے

تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ
اور باہم جھگڑنے لگے حکم (رسول) کے باب میں اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں دکھا دیا تھا

۲۹۶ یعنی اپنی فتح اور غنیم کی شکست جس کا مشاہدہ تم برأی العین کر رہے تھے۔ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلْتُمْ۔ یعنی فتح و فیروزمندی کی کیفیت اس وقت تک قائم رہی، جب تک تم اپنی استقامت میں کمزور نہ پڑ گئے۔ اس وقت تم اپنی رائے میں مذبذب ہو گئے اور تیراندازوں کے دستہ نے خودرائی سے کام لے کر اطاعتِ رسول کی پروا نہ رکھی۔ معرکۂ اُحد میں جنگ شروع ہونے سے قبل مسلمانوں کے مقدس اور نہایت درجہ بالغ نظر سالارِ لشکر نے امکاناتِ نقشۂ جنگ کا بالکل صحیح اندازہ کر کے ایک گھاٹی میں ایک بلند ٹیکری پر ۵۰ چیدہ و ماہر تیراندازوں کا ایک دستہ متعین کر دیا تھا اور احکام دے دیئے تھے کہ اس مورچہ سے کسی حال میں نہ ہلنا یہاں تک کہ اگر ہم شکست کھا جائیں، جب بھی ہماری مدد کو نہ آنا۔ بلکہ اپنے عقب کا خیال رکھنا۔ جنگ شروع ہوئی اور مسلمانوں نے پورے جوشِ شجاعت کے ساتھ یلغار کی۔ مشرکین کا لشکر باایں فراوانی اور باایں سروسامانی زبردست ٹکر کی تاب نہ لا سکا اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمان اور آگے بڑھے اور بدر کا جوش و خروش تازہ ہو گیا۔ لیکن اب کی افراطِ جوش میں توازن قائم نہ رہا۔ ان کا خط ٹوٹ گیا اور صفوف میں ترتیب باقی نہ رہی اور ایک جماعت نے مزید پیش قدمی کر کے غنیم کے خیمے ڈیرے لوٹنے شروع کر دیئے۔ اُدھر ٹیکری والے تیرانداز دستہ نے جو یہ دیکھا کہ دشمن میدان چھوڑ رہا ہے اور مالِ غنیمت لٹنا شروع ہو گیا ہے، تو یہ سوچا کہ اب یہاں مورچہ پر جمے رہنے کے کیا معنی، حکم جس وقت تک کے قیام کے لئے تھا، اس کی تعمیل ہو چکی۔ چنانچہ اس خیال کے ماتحت ۵۰ میں سے ۴۰ تیرانداز سپاہی اپنی پوزیشن چھوڑ نیچے میدان میں دوسروں کے ساتھ غنیمت کی تاخت میں شریک ہو گئے۔ خالد بن ولید جو بعد کو ایمان لائے اور سیف اللہ کہلا کر مسلمانوں کے مشہور جنرل ہوئے، اس وقت تک مشرکین کے رسالہ کے سردار تھے۔ اُن کی دوربین نگاہ موقع کے گھات ہی میں تھی، اپنے سواروں کے ساتھ کاواکاٹ اسی درہ کی طرف سے دھاوا بول دیا، گنتی کے دس سپاہی کتنی دیر ٹھہر سکتے تھے، جنگ کا پانسہ آناً فاناً پلٹ گیا، اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر چھن گئی، قرآن اپنے معجزانہ رنگ میں اس سارے پس منظر پر تبصرہ کر رہا ہے۔ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ۔ یعنی اپنے قائدِ اعظم کے حکم کے باب میں بحث کرنے لگے کہ آیا اب بھی وہ حکم قائم اور واجب الاتباع ہے۔ ۵۰ میں سے ۴۰ نادک افگن سپاہی لوٹ پر ٹوٹ پڑے تھے اور باقی ۱۰ امیرِ لشکر کے حکم پر آخر تک قائم رہے۔ وَعَصَیْتُمْ۔ یعنی اپنے سالارِ لشکر اور رسولِ برحق کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ یہ حالت ایک استثنائی تھی اور اس لئے اس پر گرفت بھی اتنی سخت ہوئی ورنہ اسلامی فوجیں عام طور پر تو نظم و ضبط، اطاعت و امتثال (ڈسپلن) کی تصویر ہوتی تھیں۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی)

مَا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ

جو کچھ کہ تم چاہتے تھے ۲۹۷ بعض تم میں وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے ۲۹۸ اور بعض تم میں

یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ وَ

ایسے تھے جو آخرت چاہتے تھے ۲۹۹ پھر اللہ نے تم کو ان میں سے ہٹا لیا تاکہ تمہاری (پوری)

لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ

آزمائش کر لے ۳۰۰ اور اللہ نے یقیناً تم سے درگزر کی ۳۰۱ اور اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا فضل والا ہے

تُصْعِدُوْنَ وَ لَا تَلْوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ

(وہ وقت یاد کرو) جب تم چڑھے چلے جا رہے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تم کو پکار رہے تھے

فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى

تمہارے پیچھے کی جانب سے ۳۰۲ سو اللہ نے تمہیں غم دیا غم کے پاداش میں ۳۰۳ تاکہ تم رنجیدہ نہ ہوا کرو اس

مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس مصیبت سے جو تم پر پڑے، اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا یَّغْشٰى

پھر اس نے اس غم کے بعد تمہارے اوپر راحت نازل کی (یعنی) غنودگی کہ اس کا تم میں سے

طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ

ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ بھی کہ اسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی، یہ

یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ ؕ یَقُوْلُوْنَ

اللہ کے بارے میں خلافِ حقیقت خیالات، جاہلیت کے خیالات قائم کر رہے تھے، یہ کہہ رہے تھے

۲۹۷ (اور اسی لئے غنیمت کی لوٹ میں پڑ گئے) اشارہ اُنھی ۴۰ جلدباز تیراندازوں کی طرف ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ لوٹ بھی یعنی دو تفرع و شمنانِ دین کی شکست ہی پر تھی، اس لئے ایسی دنیا طلبی بھی تمام تر مذموم نہیں۔ یہاں بُرا اسے اسلئے ٹھہرایا گیا کہ اس میں مخالفت تھی حکمِ رسولؐ کی، گو وہ بھی اعتباراً ہی تھی۔ ۲۹۸ یہ وہ دس تیرانداز تھے جو نقشِ نبویؐ کے تمام تر متبع ہو کر آخر تک اپنی جگہ پر قائم رہے۔ ۲۹۹ (ایک عارضی و ہنگامی شکست کے ذریعہ سے) یہ ثبوت ہے صحابۂ نبویؐ پر کمالِ رحمت کا، یہ عارضی شکست بھی غضبِ الٰہی یا عذاب کی کوئی فرد نہ تھی بلکہ اس سے بھی مقصود صحابہ کی قوتِ ایمانی کا مزید امتحان ہی تھا۔ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ یعنی جب تم میں عدمِ ثبات و تزلزل پایا تو اللہ نے اپنی وہ آسمانی امداد و نصرت روک لی۔ ۳۰۰ (اسلئے اب مؤاخذۂ آخرت کا کھٹکا نہیں) کیا ٹھکانا ہے مومنین پر بالعموم اور صحابۂ رسولؐ پر بالخصوص شفقت کا کن کن عنوانات سے تسلی دی جا رہی ہے۔ ۳۰۱ (کہ ادھر آؤ۔ میں ادھر ہوں) یہ بیان ہو رہا ہے مسلمان سپاہ کی بھگدڑ اور شدتِ بدحواسی کا۔ اور واقعی بات ہے کہ جب فوج میں بھگدڑ پڑتی ہے تو ایسی ہی بےحواسی پھیل جاتی ہے، نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے، کوئی کسی کی نہیں سُنتا، ہر ایک کو اپنی ہی جان بچانے کی فکر پڑ جاتی ہے۔ اِذْ تُصْعِدُوْنَ یعنی جب بھاگے ہوئے چڑھے جا رہے تھے۔ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ۔ رسولِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام علاوہ اپنے دوسرے کمالات و فضائل کے ہمت و شجاعت میں بھی فرد اور بےعدیل تھے۔ ۳۰۲ یعنی اس رنج کے عوض میں جو تمہاری ذات سے رسول اللہ صلعم کو اٹھانا پڑا تھا تمہیں بھی ایک رنج دیدیا گیا۔ ای اثابکم غما بسبب غم اذقتموہ رسول اللہ صلعم بعصیانکم (بیضاوی) (روح)
۳۰۳ (اور اسی باخبری کے مطابق جزا و سزا بھی دے گا) لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا الخ یہ اشارہ ہے ان حکمتوں اور مصلحتوں کی جانب جو اس واقعۂ شکست میں پوشیدہ تھیں۔ لِکَیْ۔ یعنی تاکہ آئندہ کے لئے اس واقعہ سے سبق لو اور ہمت و استقلال کو کام میں لاؤ۔

٣٠٤ مسلمان تھکے ماندے تو تھے ہی، دوپہر کے وقت ان پر نیند کا غلبہ ہوا اس سے تازہ دم ہو گئے۔ تھکی ہوئی فوج کو نیند جیسی نعمت کے میسر آجانے کی قدر کوئی اہل فوج ہی کے دل سے پوچھے۔ ٣٠٥ (اور مسلمانوں سے حجت اور تکرار کر رہے تھے کہ تم سے جو وعدۂ فتح و نصرت تھا، وہ کیا ہوا؟) مُراد منافقین ہیں ــــ مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے ہوئے تھے، اس لئے خطاب بھی اُن سے اکثر مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہی ہے۔ یعنی المنافقین (قرطبی) ھم المنافقون (بیضاوی) اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ یعنی اس قسم کا سوچ بچار کہ دیکھیے یہاں سے بچ کر بھی جانا ہوگا، اپنی جان کی فکر بجائے خود کوئی بُری چیز نہیں۔ یہاں مُراد یہ ہے کہ اُن منافقین کو اپنی ہی پڑی تھی۔ نہ دین کی کوئی فکر تھی نہ رسُولؐ کا کوئی خیال تھا۔ ما همهم الا انفسهم وخلاصها لا همّ الدين ولا همّ رسول الله (مدارک) يَظُنُّوْنَ غَيْرَ الْحَقِّ۔ اللہ سے متعلق ان کی بدگمانیاں خلاف واقعیت وحقیقت تھیں انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مومنین کو نصرتِ حق و تائید غیبی نصیب نہ ہوگی۔ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ۔ اس سے بھی بڑھ کر ان کے خیالات اس حد تک پہنچ گئے تھے جو مشرک اور جاہلی ہی قوموں کے ہوتے ہیں ان کے نزدیک یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ کسی سے وعدۂ تائید و نصرت کرے اور پھر اسے پُورا نہ کرے۔ ایسے عقائد مشرک قوموں میں عام تھے۔ اَلْجَاهِلِيَّةِ۔ جاھلیة محاورۂ قرآنی میں اسلام سے قبل کا دورِ شرک ہے، یہ جاہلیت توحید کے منافی ہے۔ ظن الجاھلیة کی ترکیب یوں بھی گئی ہے۔ کظن اهل الجاھلیة۔

هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ

کہ ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے؟ آپ کہہ دیجیے کہ اختیار تو سارا اللہ کا

لِلّٰهِ ؕ یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ ؕ یَقُوْلُوْنَ

ہے۔ یہ لوگ دلوں میں ایسی بات چھپائے ہوئے ہیں جو آپ پر ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں کہ

لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ

کچھ بھی ہمارا اختیار چلتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ آپ کہہ دیجیے کہ

كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ

اگر تم گھروں میں ہوتے (جب بھی) وہ لوگ تو جن کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا، اپنی قتل گاہوں

اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ

کی طرف نکل ہی پڑتے اور (یہ سب اس لئے ہوا) کہ اللہ تمہارے باطن کی آزمائش کرے، اور

لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١٥٤﴾

تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے صاف کر دے اور اللہ باطن کی باتوں کو خوب جانتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا

یقیناً تم میں سے جو لوگ اس دن پھر گئے تھے جس دن کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئی تھیں

اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ

تو یہ تو بس اس سبب سے ہوا کہ شیطان نے انہیں ان کے بعض کرتوتوں کے سبب لغزش دے دی تھی

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿١٥٥﴾ ع

اور بیشک اللہ انہیں معاف کر چکا ہے یقیناً اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا حلم والا ہے۔

٣٠٦ ورنہ ہم تو شروع ہی سے اس جنگ سے منع کر رہے تھے، کسی نے ہماری نہ سُنی، ہماری سن لی گئی ہوتی تو آج یہ مصیبت ہی کیوں پیش آتی) یہ منافقین اپنی خفت و ندامت مٹانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ ٣٠٧ (اور قضاءِ الٰہی ہر انسانی تدبیر پر غالب وحاکم ہے) خطاب پیمبرؐ سے ہے کہ آپؐ یہاں منافقین سے کہہ دیجیے۔ ٣٠٨ یعنی اپنا کفر و نفاق۔ اس کو رسُولؐ اور مومنین سے مخفی رکھنے کا ہی تو خاص اہتمام تھا۔ ٣٠٩ یعنی اگر ہمارے مشورہ پر عمل ہوتا تو نہ لڑائی ہی کی نوبت آتی اور نہ اس شکست اور اتنے مقتولین کی۔ ٣١٠ مطلب یہ ہوا کہ احکام تکوینی تقدیری سے باہر رہنا کسی کے لئے کسی صورت میں ممکن نہیں؛ کوئی نہ کوئی ظاہری سبب بھی مقتل تک ان کے کھینچ آنے کا ضرور نکل آتا۔ ٣١١ (شیطانی اور نفسانی میل کچیل سے) وَلِیُمَحِّصَ تمحیص کے معنی ہیں آمیزشوں سے کدورتوں سے پاک کرنا۔ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ۔ یعنی تمہارے اخلاص کی آزمائش ہو جائے۔ ٣١٢ (میدانِ اُحد میں) اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا۔ مُراد وہی صحابی ہیں جن سے اُحد کے موقع پر کمزوری کا اظہار ہوا تھا۔ اُنہی کی تسکین و تسلی کے لئے نیز آئندہ کی تنبیہ وہدایت کی غرض سے یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ ٣١٣ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ آگیا کہ ہر پچھلا گناہ سبب بن جاتا ہے مزید وجدید معصیت کا۔ یہاں مُراد ہے حُبِّ حیات اور مالِ غنیمت کی ہوس۔ وقال بعض العلماء حبهم الغنيمة والحرص على الحياة (بحر) معنى السببية انجرارها اليه لان الذنب يجر الذنب كما ان الطاعة تجر الطاعة (روح) اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ اس میں اس ادب کی تعلیم آگئی کہ گناہ جو بھی سرزد ہو جائے اس کی نسبت حق تعالیٰ کی جانب نہیں بلکہ شیطان کی جانب دینا چاہیے۔ قال الكعبی الآية تدل على ان المعاصی لا تنتسب الى الله فانه تعالى نسبها فى هذه الآية الى الشيطان (کبیر) فالاضافة الى الشيطان لطف وتقريب والتعليل بكسبهم تخويف وتاديب (مدارک) خود کلام مجید میں بھی دوسری آیتیں اس قسم کی ہیں مثلاً حضرت موسیٰؑ کی زبان سے هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ یا حضرت یوسفؑ کی زبان سے مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ یا خادمِ موسیٰؑ کی زبان سے وَمَاۤ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ۔

۳۱۴ (ان کے توبہ واستغفار کی بنا پر) یہی مضمون تین آیت قبل بھی بیان ہو چکا ہے ولقد عفا عنکم۔ تکرار سے ان صحابیوں کی مزید تسلی واطمینان مقصود ہے جو لوگ ان صحابیوں کو اس واقعۂ اُحد کی بنا پر مورد طعن سمجھ رہے ہیں وہ صاف آیاتِ قرآنی کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ۳۱۵ یہاں دو صفاتِ باری کا اثبات کیا ہے۔ غَفُوْرٌ۔ ایک صفتِ غفر کا، اس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ حَلِیْمٌ۔ دوسرے صفتِ حلم کا، اس کا ظہور اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے، کہ فوراً مواخذہ نہیں کرتا بلکہ توبہ واستغفار کا موقع برابر دیتا رہتا ہے۔ ۳۱۶ (لیکن زبان پر دعویٰ اسلام وایمان کا رکھتے ہیں) مُراد منافقین ہیں۔ یعنی المنافقین (بیضاوی) هؤلاء المنافقون اصحاب عبد الله بن اُبیّ (ابن جریر عن السدی) لاتکونوا کالذین کفروا۔ ہدایت مومنین کو ہو رہی ہے کہ تم اپنی گفتگو میں منافقین کے مثل نہ ہو جاؤ ان کی سی باتیں نہ کرنے لگو۔ اس قسم کی باتیں صرف ان ایمان سے محروموں کے شایان ہے۔ نہی تعالی المومنین ان یکونوا مثلهم فی هذه المقالة الفاسدة (بحر) امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ یہاں منافقین پر الذین کفروا کا اطلاق ہوا ہے، حالانکہ منافقین کو زبانی دعویٰ اسلام کا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ مجرد دعوائے اسلام ایمان کیلئے کافی نہیں جب تک کہ تصدیقِ قلب بھی شامل نہ ہو۔ فالأية تدل على ان الايمان ليس عبارة من الاقرار باللسان كما تقول الكرامية (کبیر) ۳۱۷ (اور کسی جہاد یا اسلامی سفر پر روانہ نہ ہوتے تو مزے سے زندگی بسر کرتے رہتے اور کسی خطرہ میں نہ پڑتے) لِاِخْوَانِهِمْ میں ل تبلیغ کا نہیں، اس لئے اس کے معنی "سے" کے نہیں بلکہ تعلیل یا سببیت کا ہے، اس کے معنی "کی بابت" یا "کے باب میں" کے ہوں گے۔ ای لاجل اخوانهم (کشاف) واللام لام السبب ای لاجل اخوانهم وليست لام التبليغ (بحر) اخوانهم۔ اخوان سے مُراد نسبی بھائی یعنی مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں اور اعتقادی بھائی یعنی دوسرے منافقین بھی، ترجیح نسبی بھائیوں یا مسلمانوں کو ہے۔ مسلمانوں کی موت یا شہادت کی خبر جب منافقین سُن پاتے تو اسی طرح کے فقرے کہتے۔ ومعنى الاخوة اتفاق الجنس او النسب (کشاف) اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ یعنی کسی اسلامی، دینی مقصد سے سفر کو جاتے اور وہیں وفات پا جاتے۔ اَوْ كَانُوْا غُزًّى یعنی جہاد پر جاتے اور اسی میں شہید ہو جاتے۔ اِذَا۔ اگرچہ عموماً مستقبل کے لئے ہے لیکن اذ اور اذا دونوں کا ایک دوسرے کے بجائے لانا بھی درست ہے۔ قال قطرب كلمة اذ واذا يجوز اقامة كل واحدة منهما مقام الاخرى واقول هذا الذى قاله قطرب كلام حسن (کبیر) ۳۱۸ یعنی ایسے خیالات دماغ میں موج زن ہونا اور ان کا زبان پر لانا یہ خود ایک وبال ان کی منافقت اور نورِ ایمان سے محرومی کا ہے، دل میں وہ ایقان تو ہوتا ہی نہیں جو تسکین پیدا کرتا ہے، اس لئے ہر امر تکوینی تقدیری سے اُن کے دلوں میں حسرت اور کڑھن کا اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ ای یجعل ظنهم انهم لو لم يخرجوا ما قتلوا حسرة (قرطبی) ۳۱۹ موت وزندگی دونوں تمامتر اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اس مسبب الاسباب علت حقیقی کو چھوڑ کر نظر ظاہری اور فوری اسباب پر جانا اور سفر یا جہاد کو موت یا قتل کی علتِ تامہ قرار دینا کیسی شدید جہالت و سفاہت ہے۔ امریکہ میں اس وقت سوشیالوجی (عمرانیات) کا ایک ماہر فاضل ڈینی سن Denison اپنی کتاب Emotion a basis of Civilisation میں ایک جگہ لکھتا ہے۔ "مسلمانوں کو اس عقیدۂ تقدیر یا ہر امر تکوینی کو خدا کے تفویض کر دینے کی عادت نے نیز عقیدۂ شہادت نے (کہ شہید سیدھا جنت میں داخل ہو جاتے ہیں، جہاں اسے ۷۲ حوریں ملتی ہیں، اور کھانے کیلئے سونے کے ظروف) مسلمانوں میں معرکۂ جنگ کے اندر بڑی ہی قوت اور استقامت پیدا کر دی تھی" (صفحہ ۳۰۶) امریکی فاضل کا ایمان نہ عقیدۂ تقدیر پر ہے نہ عقیدۂ شہادت پر، اس پر بھی وہ ان عقیدوں کی نافعیت اور ان کی حیثیتِ افادی کی داد دینے پر اپنے کو بے اختیار پا رہا ہے۔ ۳۲۰ (سو اگر کہیں خدانخواستہ تم نے منافقین کے طرزِ خیال وگفتگو کی تقلید کی تو بھی سب اس خدائے دانا وبصیر وہمہ بین وہمہ دان کے علم میں آ کر رہے گا) ۳۲۱ (حفظ و نگرانی میں سے) مطلب یہ ہے کہ موت تو اپنے وقت موعود ہی پر آئے گی جہاد یا سفر فی سبیل اللہ سے خواہ مخواہ تو آ نہ جائے گی البتہ اگر اس حالت میں وقت ہی پورا ہو گیا تو اجر اور ابدی زندگی کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ ۳۲۲ (سو مومن کیلئے تو کوئی خوف ودہراس کی بات ہی نہیں) مُتُّمْ یعنی طبعی موت سے اپنے وطن میں وفات پا گئے۔ اَوْ قُتِلْتُمْ۔ یعنی چاہے وہ موت طبعی ہی ہو لیکن مشغولی اُس وقت اللہ کے کام میں ہو۔ قُتِلْتُمْ۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں مارے گئے۔ ۳۲۳ لَهُمْ یعنی ان لوگوں کے ساتھ نرم رہے جو جنگ اُحد میں آپؐ کی نافرمانی کر کے مسلمانوں کی شکست وتفضیح کا سبب بنے تھے، نافرمان سپاہیوں کے ساتھ عین معرکۂ جنگ میں خود رائی سے کام لینے والے سپاہیوں کے ساتھ شفقت وملاطفت کا معاملہ قائم رکھنا دُنیا کی جنگی تاریخ میں شاید اپنی نظیر آپ ہی ہو۔ بِمَا میں مَا زائدہ تاکید کے لئے ہے۔ ترجمہ میں اسی لئے "ہی" لایا گیا ہے۔ وما مزيدة للتاكيد والتنبيه (بیضاوی) وما مزيدة للتاكيد وعليه اجلة المفسرين وبه المأثور عن قتادة (روح) صلة فيه معنى التاكيد (قرطبی) والدلالة على ان لينه لهم ما كان الا برحمة من الله (کشاف)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
اے ایمان والو اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو حقیقۃً کفر اختیار کئے ہوئے ہیں ۳۱۶
وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ
اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جب کہ وہ لوگ زمین پر سفر کرتے ہیں یا کہیں
كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ
غزوہ کرنے جاتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے ۳۱۷
لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ
(یہ بات اسلئے ان کی زبان پر آئی ہے) تاکہ اللہ اسے ان کے دلوں میں سبب حسرت بنا دے ۳۱۸ اور اللہ ہی
وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝١٥٦ وَلَئِنْ
جلاتا اور مارتا ہے ۳۱۹ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے ۳۲۰ اور اگر تم
قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ
اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی مغفرت و رحمت
وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝١٥٧ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ
اس سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر رہے ہیں ۳۲۱ اور تم لوگ خواہ مر جاؤ یا مارے جاؤ،
لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝١٥٨ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ
ضرور اللہ ہی کے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے ۳۲۲ پھر یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ آپ ان کے
لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا
ساتھ نرم رہے ۳۲۳ اور اگر آپ تُند خو، سخت طبع ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر

۳۲۴ حضور انورؐ کے علم و تحمل، نرمی و خوش خوئی، شفقت و ملاطفت کے واقعات سے تو حدیث اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ کوئی کہاں تک گنائے! در حقیقت تو خاص طور پر یاد رکھنے کے
قابل ہے کہ اپنی ذات کے لئے آپؐ نے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ غیروں (اور غیر بھی کیسے، بعض معاند تک) کے دو ایک قول سننے کے قابل ہیں۔ لین پول نے کہا ہے،۔ "ظلم محمدؐ کی سرشت ہی میں
نہ تھا" اور باسورتھ اسمتھ کا بیان ہے،۔ "انہوں نے عمر بھر کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا ...... کوئی مصافحہ کرتا تو نہ وہ اپنا ہاتھ الگ کرنے میں سبقت کرتے نہ از خود اس سے الگ ہوتے گفتگو بہت
نرم و شیریں کرتے" ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے،۔ "پیمبر کا میلان طبع ہمیشہ نرمی ہی کی جانب رہتا" مفصل حوالوں کیلئے ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ لیکن نرمی و ملاطفت کے
بھی شریعت میں حدود مقرر ہیں۔ جہاں دین کی توہین ہو رہی ہو یا احکام دین کے اجرا کی ضرورت ہو وہاں سختی اور سزا لازمی ہو جاتی ہے۔ اللین والرفق انما یجوز اذا لم یفض الی اہمال حق من
حقوق اللہ فاما اذا ادی الی ذالک لم یجز (کبیر) ۳۲۵ (حسب دستور سابق) گویا اسلام کے نظام شوریٰ جمہوری میں حکم یہ ہے کہ ایسے مجرموں کو بھی مسائل ملی میں رائے زنی سے

مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ
ہو گئے ہوتے ۳۲۴ سو آپ ان سے درگزر کیجئے اور ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى
ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہیے ۳۲۵ لیکن جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ

اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝١٥٩ إِنْ يَنْصُرْكُمُ
رکھیے ۳۲۶ بیشک اللہ ان سے محبت رکھتا ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں ۳۲۷ اگر اللہ تمہارا ساتھ دے

اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي
تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا ۳۲۸ اور اگر وہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون ایسا ہے جو اسکے

يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝١٦٠
بعد تمہارا ساتھ دے ۳۲۹ اور ایمان والوں کو تو چاہیے کہ صرف اللہ پر بھروسہ رکھیں۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا
اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے ۳۳۰ اور جو کوئی خیانت کریگا وہ قیامت کے

غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ
دن اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو حاضر کریگا ۳۳۱ پھر ہر شخص کو اسکے کیے ہوئے کا پورا عوض ملیگا

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝١٦١ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ
اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا ۳۳۲ کیا جو شخص رضائے الٰہی کا تابع ہے ۳۳۳ وہ بھلا

كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ
اس جیسا ہو جائے گا جو غضب الٰہی کا مستحق ہے ۳۳۴ اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے

محروم نہ کیا جائے اور ان سے ووٹ کا حق سلب نہ کیا جائے ــــــ
کیا حد ہے اس رحمت کی آج دنیا کی بڑی بڑی آزاد جمہوریتیں بھی
اس کی مثال پیش کر سکیں گی؟ فَاعْفُ عَنْهُمْ یعنی جہاں تک آپؐ
کے حقوق کے اتلاف کا تعلق ہے، آپؐ معاف کر دیجئے۔ چنانچہ آپؐ
نے اس حکم کی تعمیل میں ان خطا کاروں کو زبانی تہدید بھی نہ فرمائی۔
لم یعنفہم الرسول صلعم بالتغلیظ والتشدید وانما خاطبہم بالکلام
اللین (کبیر) وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ یعنی جہاں تک حقوق اللہ کے اتلاف
کا تعلق ہے، آپؐ ان کے لئے دعائے مغفرت کر دیجئے۔ امام رازیؒ
نے یہاں یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ جہاد میں بھاگنے سے بڑھ کر گناہ کبیرہ اور
کیا ہوگا لیکن قرآن مجید نے ان اصحاب نبیؐ کے عفو و مغفرت کی بار بار
تصریح کر کے یہ صاف کر دیا کہ ان حضرات کے کبائر بھی معاف ہو گئے
تھے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ مشورہ کی بڑی فضیلتیں حدیث میں
آئی ہیں اور ظاہر ہے کہ مشورہ کا حکم جب رسول صاحب وحی کو مل
رہا ہے تو دوسروں کے لئے اس کی احتیاج کتنی زائد ہے گی۔ فقہاء
و مفسرین نے اس آیت سے اجتہاد اور قیاس شرعی کے جواز کی دلیل
پکڑی ہے۔ فیہ دلالۃ جواز الاجتہاد وبیان ان القیاس حجۃ (مدارک)
۳۲۶ یعنی جب کسی امر میں مشورہ ہو چکے تو بس اب تذبذب و تامل
کو دخل نہ دیجئے اور بلا تکلف و توقف اللہ کے بھروسہ پر عمل اسی پختہ
عزم پر کرنے لگیے ــــــ شخصیت و اجتماعیت، فردیت و شوریت
کا کیسا حکیمانہ امتزاج ہے۔ اس میں اشارہ اس طرف بھی ہو گیا
کہ اعتماد کی چیز اللہ کی ذات ہے۔ نہ کہ انسانی مشورے۔ قال قتادۃ
امر اللہ نبیہ علیہ السلام اذا عزم علی شئ ان یمضی ویتوکل علی
اللہ لا علی مشاورتہم (قرطبی) والمقصود ان لا یکون للعبد اعتماد
علی شئ الا علی اللہ فی جمیع الامور (کبیر) ۳۲۷ اسی تعلیم کا نتیجہ
ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی، نظام شرعی سے اس قدر بُعد کے بعد
بھی مسلمانوں کو صبر و قناعت کی دولت لازوال حاصل ہے اور خودکشی
کے فیشن سے دنیائے اسلام ناواقف ہے۔ ۳۲۸ (جیسا کہ معرکۂ
بدر میں تم نے دیکھ لیا اور وہ ثمرہ طاعت کا تھا) المقصود من الآیۃ
الترغیب فی الطاعۃ والتحذیر عن المعصیۃ (کبیر) ۳۲۹ (جیسا کہ معرکۂ احد میں تمہیں تجربہ ہو گیا اور وہ ثمرہ خود رائی کا تھا)
مِنْ بَعْدِهِ یعنی اس کی ترک نصرت کے بعد۔ ای من بعد خذلانہ (کشاف)
آیت سے یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ ایمان ثمرہ ہوتا ہے اعانت الٰہی کا اور کفر خذلان الٰہی کا۔ احتج الاصحاب بہذہ الآیۃ علی ان الایمان لا یحصل الا باعانۃ اللہ والکفر لا یحصل الا بخذلانہ (کبیر) ۳۳۰
یعنی یہ شان نبوت کے بالکل منافی ہے۔ المراد ان النبوۃ والخیانۃ لا یجتمعان (کبیر) والمعنی انہ لا یمکن ذالک منہ لان الغلول معصیۃ والنبی صلعم معصوم وہذا النفی اشارۃ الی انہ لا ینبغی ان
یتوہم فیہ ذالک (بحر) آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جنگ بدر کے بعد جب مال غنیمت تقسیم ہو رہا تھا تو ایک سرخ رنگ کا جبہ ذخیرہ سے غائب معلوم ہوا۔ اس پر کوئی بول اٹھا کہ رسولؐ نے لے لیا ہوگا۔ یہ قول اب
اگر کسی منافق کا تھا تو اس بدبخت نے کھلا ہوا حملہ رسول اللہؐ کی دیانت پر کر دیا اور اگر کسی نو مسلم کی زبان سے نکلا تھا تو وہ یقیناً اس غلط فہمی میں تھا کہ رسولؐ کو بغیر اطلاع بھی تصرف کا حق حاصل ہے
آیت ہر دو صورت کی تردید کر رہی ہے۔ اور ایسے عمل کو خیانت سے تعبیر کر رہی ہے۔ مشرک عرب تو سرے سے جانتے ہی نہ تھے کہ مرتبۂ نبوت کس منصب عظیم کا نام ہے اور پیمبرانہ اخلاق کے معنی کیا ہیں
یہود و نصاریٰ البتہ پیمبروں کے نام اور کارناموں سے آشنا تھے لیکن ان ظالموں نے بھی رفتہ رفتہ مرتبۂ نبوت کی اخلاقی عظمت کو بالکل ہی بھلا دیا تھا اور نبی کو کاہن کی قسم کا محض ایک پیشین گوئی کرنے والا
انسان سمجھ رکھا تھا۔ آیت سب غلط خیالیوں کی اصلاح کر رہی ہے۔ ۳۳۱ اتنی بڑی رسوائی اور فضیحت کو پیمبرانہ تقدس سے کوئی دور کا بھی واسطہ ہو سکتا ہے! فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ
غلول یا خیانت معصیت کبیرہ ہے۔ قال العلماء الغلول کبیرۃ من الکبائر (قرطبی) وقد عظم النبی صلعم امر الغلول حتی اجراہ مجری الکبائر (جصاص) اور یہ بھی کہا ہے کہ حکام کا ہدیہ قبول کرنا بھی اسی
حکم میں داخل ہے۔ ومن الغلول ہدایا العمال وحکمہ فی الفضیحۃ فی الآخرۃ حکم الغال (قرطبی) ۳۳۲ پیمبروں کا اعزاز و اکرام قطعی ہے۔ تو کسی نبی کی جانب خیانت جیسے ذلیل جرم کی نسبت کی
ہی کیونکر جا سکتی ہے؟ ۳۳۳ (جیسا کہ ہر نبی لازمی طور پر ہوتا ہے)

۳۳۴ (جیسے خائن یا اور کوئی مجرم) ۳۳۵ (اور اپنے اسی علم کامل کے مطابق جزاء و سزا دینے والا) ھُمْ یعنی یہ سب لوگ رضا حق پر چلنے والے ہیں اور راہ حق کی مخالفت کرنے والے ہیں۔ ھُمْ دَرَجٰتٌ۔ یہ مختلف طبقہ اللہ کے ہاں محبوبیت اور مبغوضیت کے لحاظ سے ہوں گے۔ تقدیر کلام یوں ہے ھم ذو درجٰت یا لھم درجٰت۔ معنی ھم درجٰت۔ ای ذو درجٰت او لھم درجٰت (قرطبی) والتقدیر الکلام لھم درجٰت عند اللہ (کبیر) عِنْدَ اللّٰہِ سے مراد ہے اللہ کی عدالت میں۔ ای فی حکم اللہ وعلمہ (کبیر) ۳۳۶ اللہ کی بہترین نعمت ہونے کے لحاظ سے بعثت رسولؐ کا احسان ہے تو سارے عالم پر، مسلمانوں کی تخصیص ذکر کی وجہ ظاہر ہے کہ بعثت سے فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ تھے۔ مِنْ اَنْفُسِھِمْ یعنی انہی کی جنس میں سے، اس میں مومنین کے لئے بڑی بشارت ہے کہ پیمبر بھی بس تمہارے ہی جیسے ایک بشر ہیں۔ اراد بہ المومنین کلھم ومعنی من انفسھم انہ واحد منھم وبشر مثلھم (قرطبی) رسولؐ کی تلاوت آیات، تزکیۂ تقویٰ، تعلیم کتاب و حکمت پر حاشیہ پارۂ اول کی آیت کے ذیل میں گزر چکے۔ ۳۳۷ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ قرآنی دستور العمل اور محمدی نمونۂ عمل سے قبل دنیا پر عقائد، معاملات، عبادات، اخلاق ہر اعتبار سے اندھیرا ہی چھایا ہوا تھا اور انسانی آبادی صحیح معنی میں فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ کی تصویر تھی۔ اِنْ۔ یہاں اِنَّ کا مخفف ہے اور تاکید کے معنی دے رہا ہے۔ ان ھی المخففۃ من الثقیلۃ (کشاف) ۳۳۸ (اس کے قبل بدر میں) اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ یعنی اُحد میں جب تمہیں شکست ہوئی اور تمہارے ستر آدمی شہید ہوئے۔ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْھَا یعنی بدر میں جب مشرکین کے ستر آدمی قتل ہوئے تھے اور ستر گرفتار۔

وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۶۲﴾ ھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰہِ ؕ

اور وہ بری جگہ ہے یہ لوگ اللہ کے نزدیک مختلف طبقوں میں ہوں گے

وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ

اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے ۳۳۶ حقیقت میں اللہ نے (بڑا) احسان

عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ

مسلمانوں پر کیا جب کہ انہی میں سے ایک پیغمبر ان میں

اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ

بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک صاف کرتا ہے

وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۚ وَاِنْ کَانُوْا

اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۳۳۷ اور بیشک یہ لوگ

مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْکُمْ

کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے ۳۳۸ اور جب تمہیں ایسی مار

مُّصِیْبَۃٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْھَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰی ھٰذَا ؕ

اٹھانی پڑی جس کی دوگنی تم (فریق مقابل پر) ڈال چکے تھے ۳۳۹ تو تم کہنے لگے یہ کدھر سے ہوئی

قُلْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ

آپ کہہ دیجیے کہ وہ تمہاری ہی طرف سے ہوئی ۳۴۰ بیشک اللہ ہر چیز پر

شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ اَصَابَکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ

قادر ہے ۳۴۱ اور جو مصیبت تم پر اس روز پڑی جب کہ دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے

النصف

اَوَ۔ میں وَ عطف کا ہے اور اَ تقریع و استفہام کا۔ الھمزۃ للتقریع والتقریر والواو عاطفۃ (بیضاوی) الالف للاستفھام والواو للعطف (قرطبی) ۳۳۹ یعنی تمہارے اپنے ہاتھوں ہوئی۔ ہمارا وعدۂ فتح و نصرت تمہاری طاعت و اطاعت کے ساتھ مشروط تھا۔ جب تم نے اس کا لحاظ نہ رکھا تو اب وعدہ کہاں باقی رہا۔ اَنّٰی ھٰذَا حیرت طبعی میں مسلمان بار بار استعجاب سے کہتے تھے کہ ہم صاحب ایمان بندے، اللہ کی راہ میں لڑنے والے ہم میں نبی موجود اور مقابل مشرکین اور پھر بھی شکست ہم ہی کو۔ ۳۴۰ فتح دینے پر بھی قادر اور فتح سے محروم کر دینے پر بھی قادر۔

فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ
سو وہ اللہ کی مشیت سے ہوئی ۳۴۱ تاکہ اللہ مومنین کو جان لے اور اُن لوگوں کو بھی جان لے
نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ
جنہوں نے منافقت اختیار کی ۳۴۲ اور اُن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا دفعیہ
اللّٰهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ
میں جاؤ ۳۴۳ تو وہ بولے کہ اگر کوئی (ڈھنگ کی) جنگ دیکھتے تو ضرور تمہارے پیچھے ہو لیتے ۳۴۴
هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ
یہ لوگ اس روز ایمان سے زیادہ کفر کے نزدیک ہو گئے ۳۴۵
يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ
یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ۳۴۶ اور جو کچھ
أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ
یہ چھپائے ہوئے ہیں اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ یہ لوگ در آنحالیکہ (خود) بیٹھے رہے، اپنے
وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ
بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کہا مانتے ۳۴۷ تو نہ مارے جاتے، آپ کہہ دیجیے کہ ذرا اچھا تو اگر تم
أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٦٨﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ
سچے ہو تو اپنے کو موت سے بچا لینا ۳۴۸ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے
قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾
گئے ہیں انہیں ہرگز مردہ مت خیال کرو، بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں رزق پاتے رہتے ہیں ۳۴۹

۳۴۱ (اور اللہ کی ہر مشیت اللہ ہی جانتا ہے کتنی حکمتوں اور مصلحتوں کی سرمایہ دار ہوتی ہے) بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ اذن یہاں مشیت کے معنیٰ میں ہے۔ ای بقضاءہ و قدرہ (قرطبی) المراد من الاذن قضاءہ ﷻ بذٰلک (کبیر عن ابن عباس)۔ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ۔ یعنی معرکۂ اُحد میں کہ ایک لشکر ابوسفیان کی کمان میں اور مدینہ کی فوج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں۔ المراد یوم احد (کبیر) ۳۴۲ یعنی علانیہ اس کا امتحان ہو جائے کہ مومن کون کون ہے اور منافق کون کون۔ ۳۴۳ یہ منافقین سے کہا گیا تھا۔ لھم میں ھُم کی ضمیر اُنہی کی طرف ہے۔ ای للمنافقین (مدارک) اَوِادْفَعُوْا۔ یعنی اگر لڑتے نہیں ہو تو کم از کم اپنی شمولیت ہی سے مسلمانوں کی تعداد کافروں کی نظر میں بڑھائے رہو۔ ای کثّروا سواد المسلمین (ابن کثیر عن ابن عباس) قال السدی وابن جریج وغیرهما كثّروا سوادنا وان لم تقاتلوا معنا (قرطبی) یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب منافقین کا تین سو کا گروہ آغازِ جنگ میں مسلمانوں سے کٹ کر مدینہ کو واپس آ رہا تھا۔ ۳۴۴ (لیکن یہ تو جنگ نہیں صریح خودکشی ہے) ولا یقال لمثله قتال هو القاء بالانفس الی التهلكة (کشاف) منافقین کا کہنا یہ تھا کہ دشمن اوّل تو تعداد میں تم سے چوگنا پھر ساز و سامان میں کہیں زائد ایسی حالت میں شہر سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کرنا سارے اصولِ جنگ کے خلاف، صریح دیوانگی ہے۔ ۳۴۵ (یعنی ایمان ظاہری و لفظی سے بھی بہت دُور ہو گئے اور حقیقی ایمان تو خیر کبھی تھا ہی نہیں) اور کفر سے قریب تر علانیہ بھی ہو گئے۔ یَوْمَئِذٍ۔ یعنی جس روز ایسی باتیں زبان سے نکالیں۔ ۳۴۶ (چنانچہ ان کا یہ عذر بھی مخلصانہ نہیں) اصل نیت ان منافقین کی کسی حال میں بھی مسلمانوں کی اعانت کی نہ تھی۔ اور کیوں ہونے لگی تھی جبکہ سرے سے ایمان ہی دلوں میں نہ تھا۔ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ۔ بافواههم کا اضافہ زور اور تاکید کے لئے ہے جیسے اُردو محاورہ میں کہتے ہیں "یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یا۔ اپنے کانوں یہ سُنا ہے۔ والتقييد بالافواه للتاكيد (مدارک) ۳۴۷ (اور ہماری ہی طرح جنگ سے علیحدہ رہے) لِاِخْوَانِهِمْ۔ اخوان سے مُراد اخوان دینی و اعتقادی نہیں۔ بلکہ اخوان نسبی و وطنی ہیں۔ ذکر منافقین کی زبان سے مسلمان شہداء کا ہو رہا ہے۔ فی النسب لا فی الدین هم شهداء أحد (معالم) وهم اخوة نسب ومجاورة لا اخوة الدين (قرطبی) ل۔ واسطہ کا ہے۔ معناه لاجل اخوانهم (قرطبی) اخوان اور ل دونوں پر حاشیہ اُوپر قریب ہی گزر چکا ہے۔ ۳۴۸ یعنی اگر تمہارا نظریہ یہ ہے کہ موت معرکۂ جنگ ہی میں جانے سے ہوتی ہے تو تم تو ہر حال جنگ سے احتراز کئے ہوئے ہو، دیکھنا ہے کہ موت سے کب تک بچے رہتے ہو۔ ۳۴۹ (عالمِ برزخ میں ایک حیاتِ مخصوص کے ساتھ) وَلَا تَحْسَبَنَّ ...... اَمْوَاتًا۔ شہداء کی موت عام انسانوں کی موت کی طرح نہیں ہوتی بلکہ انہیں برزخ میں ایک مخصوص قسم کی زندگی حاصل رہتی ہے۔ اَحْيَاءٌ ...... يُرْزَقُوْنَ۔ یہ حیات اور یہ رزق سب اسی عالم برزخ کے متناسب ہوتے ہیں۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ اپنے پروردگار کے مقرب بھی ہوتے ہیں۔ عند هنا تقتضي غاية القرب (قرطبی) بمعنی القرب والشرف (روح) پارہ دوم، آیت رکوع ۳ کے حاشیے بھی ملاحظہ کر لئے جائیں۔

فَرِحِينَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُونَ
ان نعمتوں سے مسرور ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں اور جو لوگ ان کے بعد والوں
بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ
سے ابھی ان سے نہیں جا ملے ہیں ۳۵۰ ان کی بھی اس حالت سے خوش ہیں کہ ان پر نہ کچھ خوف
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ
ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ لوگ خوش ہو رہے ہیں اللہ کے انعام
مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ
اور فضل پر اور اس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر
الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ
ضائع نہیں کرتا ۳۵۱ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے کہنے کو مان لیا ۳۵۲
مِن بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِينَ اَحْسَنُوا
بعد اس کے کہ انہیں زخم لگ چکا تھا ۳۵۳ اُن میں سے جو نیک اور
مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِينَ قَالَ لَهُمُ
متقی ہیں ان کے لئے اجرِ عظیم ہے ۳۵۴ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان سے کہنے
النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ
والوں نے کہا ۳۵۵ کہ لوگوں نے تمہارے خلاف بڑا سامان اکٹھا کیا ہے ۳۵۶ ان سے ڈرو لیکن اس نے
اِيمَانًا ۖ وَّقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿۱۷۳﴾
ان کا جوش ایمان اور بڑھا دیا اور یہ لوگ بول اٹھے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے ۳۵۷

وقف لازم
ع ۱۷/۸
مع

۳۵۰ (مگر آخر کار شہید ہو کر ان سے جا ملنے والے ہیں) مِن فَضْلِهٖ۔ اس فضل خداوندی کے اندر ہر قسم کی نعمتیں اور سرافرازیاں آگئیں۔ ۳۵۱ اس حقیقت کا تو انہیں عینی مشاہدہ ہو رہا ہے۔ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ نعمت یہ کہ اجر انہیں پورا پورا مل کر رہے۔ ای ثوابا لاعمالھم (بیضاوی) فَضْلٍ۔ فضل یہ کہ انعام و اکرام استحقاق سے کہیں بڑھ کر ملا۔ ای زیادۃ علیہ (بیضاوی) ۳۵۲ (اور رسول کی اطاعت میں خوش دلی کے ساتھ جنگ کے لئے نکل پڑے) اِسْتَجَابُوا۔ یہاں اجابوا کے معنی میں ہے اور حروف س و ت اس پر زائد ہیں۔ بمعنی اجابوا والسین والتاء ذائدتان (قرطبی) استجاب بمعنی اجاب (کبیر) ۳۵۳ (جنگ احد میں، اور وہ زخم ابھی تازہ ہی تھا) معرکۂ احد میں لشکرِ اسلام کو جو صدمہ پہنچا تھا، اس نے اہلِ مکہ کی ہمتیں بڑھا دی تھیں۔ سال ہی بھر بعد ایک بار پھر ابو سفیان قرشی اُموی کی قیادت میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ (ابو جہل، ابو لہب، عتبہ وغیرہ کے قتل و ہلاکت کے بعد اب قوم قریش کی سرداری کی باگ ابو سفیان ہی کے ہاتھ میں تھی) دو ہزار پیادہ فوج، مع پچاس سواروں کی جمعیت کے۔ لیکن دو ہی ایک روز بعد خود ان لوگوں پر کچھ ایسی ہیبت سوار ہوئی کہ اُلٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ آیات قرآنی میں اشارہ انہی واقعات کی جانب ہے۔ ۳۵۴ (اور نیک اور متقی تو یہ سب ہی ہیں) مِنْهُمْ۔ مِن جس طرح تبعیض کے لئے آتا ہے، یعنی کل میں سے کسی جزو کے بتانے کو، اسی طرح تبیین یعنی توضیح کے لئے بھی آتا ہے۔ چنانچہ یہاں اسی معنی میں ہے اور احسنوا اور اتقوا کے لانے سے مقصود اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ الذین استجابوا کی ممدوحیت کی علت یہی دو اوصاف احسان و تقویٰ ہیں۔ ومن للبیان والمقصود من ذکر الوصفین المدح والتعلیل لا التقیید لان المستجیبین کلھم محسنون متقون (بیضاوی) قد احسنوا کلھم واتقوا لا بعضھم (مدارک) ۳۵۵ (اور یہ ابو سفیان کے سکھائے پڑھائے ہوئے اس کی طرف سے پروپیگنڈا کرنے والے تھے) تاریخ میں اس پروپیگنڈسٹ جماعت کے لیڈر کا نام نعیم آتا ہے۔ یہ شخص قبیلہ ثقیف کا تھا۔ ۳۵۶ (اور تم کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہو) اِنَّ النَّاسَ۔ یہاں ناس سے مُراد قوم قریش ہے۔ اس روایت کی نشر و اشاعت سے مقصود مسلمانوں کے دلوں میں قریش کا رعب بٹھانا اور ان کی طرف سے دہشت پیدا کرنی تھی۔ "حربِ اعصاب" War of nerves جس طرح آج حربِ اسلحہ کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور اس کا ایک اہم جزو ہے، زمانۂ قدیم میں بھی ہوتی رہتی تھی اور ابو سفیان اپنے وقت اور اپنی قوم میں اس فن کا ماہر تھا، اس نے اپنے آدمی چھوڑ رکھے تھے کہ مسلمانوں سے مل مل کر انہیں قریش کی عسکری قوت اور حربی عظمت سے ایسا مرعوب کر دیں کہ ان کی ہمت پست پڑ جائے اور مقابلہ کا حوصلہ ہی باقی نہ رہے۔ ۳۵۷ (ہماری حمایت، حفاظت، سب کے لئے) یعنی اس خبر کی اشاعت اور پروپیگنڈا نے بجائے ان میں پست ہمتی پیدا کرنے کے مسلمانوں میں جوش ایمانی اور تیز کر دیا اور وہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی پوری قوت کے ساتھ بول اُٹھے کہ غنیم جو چاہے کرے ہمارا کارساز تو اللہ ہے اور وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ زادھم قول الناس ایمانا (قرطبی)

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ

سو یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ واپس آئے کہ انہیں کوئی ناگواری ذرا ۳۵۸ نہ

سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ

پیش آئی اور یہ لوگ رضاء الٰہی کے تابع رہے ۳۵۹ اور اللہ بڑا فضل والا

عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا

ہے ۳۶۰ یہ تو شیطان ہی ہے جو تمہیں اپنے دوستوں کے ذریعہ سے ڈراتا ہے ۳۶۱ سو تم

تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَ لَا يَحْزُنْكَ

اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھی سے ڈرو اگر ایمان والے ہو ۳۶۲ اور آپکے لئے یہ لوگ

الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ

جو جلدی سے کفر میں جا پڑتے ہیں باعثِ غم نہ بنیں ۳۶۳ یقیناً یہ لوگ اللہ کو ذرا سا بھی نقصان

شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ

نہیں پہنچا سکتے ۳۶۴ اللہ کی یہی مشیت ہے کہ اُن کے لئے آخرت میں ذرا بھی حصہ نہ رکھے ۳۶۵

وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ

اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے یقیناً جن لوگوں نے ایمان کے عوض کفر کو

بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

خرید لیا ہے وہ اللہ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۳۶۶ اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے،

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ

اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں یہ نہ خیال کریں کہ ہم جو انہیں مہلت دے رہے ہیں ۳۶۷ یہ ان کے حق میں

منزل

۳۵۸ (اور یہی رضاء الٰہی سرچشمہ ہے دُنیوی اور اُخروی ہر قسم کے نفع و راحت کا) فَانْقَلَبُوْا۔ یعنی مقام بدر تک جا کر مسلمان واپس آئے۔ اہل سِیَر و تاریخ کی زبان میں یہ واقعہ غزوۂ بدر صغریٰ کے نام سے موسوم ہے اور اس کا زمانہ شعبان سنہ ۴ ہجری کا ہے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے۔ "آپ نے ابوسفیان کے چیلنج کے جواب میں بدر کا قصد فرمایا چنانچہ وہاں پہنچ گئے اور یہاں آپ نے ابوسفیان کا انتظار آٹھ دن تک کیا اور ابوسفیان بھی مکہ والوں کو لیکر روانہ ہوا مگر نواحی ظہران میں پہنچا تو اس کی رائے مکہ واپس چلے آنے کی ہوئی اور اس نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے سفر کے لئے تو ایسا موسم مناسب ہے جس میں تم اپنے جانوروں کو چرا بھی سکو اور دُودھ بھی خوب پی سکو اور یہ موسم تو خشکی کا ہے سو میں تو واپس چلا تم بھی واپس چلے چلو چنانچہ وہ لوگ واپس ہو گئے۔" بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ یعنی نعمت مقبولیت اور ترقی ایمان کے ساتھ۔ فَضْلٍ۔ یعنی دُنیوی نفع کے ساتھ بھی۔ مال کی نکاسی خوب ہوئی۔ ۳۵۹ چنانچہ یہاں اس کا فضل مسلمانوں پر ان صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ۱۔ ان کے درجۂ ایمان میں ترقی ہوئی۔ ۲۔ انہیں سرکر جہاد میں نکلنے کی توفیق ہوئی۔ ۳۔ وہ ہر قوتِ دشمن کی شوکت و صولت سے ذرا مرعوب نہ ہوئے۔ مقابلہ کی ہمت قائم رکھی۔ ۴۔ مالی و تجارتی دنیوی نفع حاصل ہوئے۔ ۵۔ اجرِ عظیم کی بشارت ملی۔ ۳۶۰ شیطان کہیں اپنی اصلی صورت میں سامنے آکر حملہ نہیں کرتا جب وار کرتا ہے کسی نہ کسی انسانی شکل و قالب میں آکر اور یہی اولیاء الشیطٰن کہلاتے ہیں۔ یہاں اس جماعت کا لیڈر نعیم ثقفی تھا۔ اولیاءہ ای باولیاءہ (قرطبی) ۳۶۱ (کہ اللہ کے خوف کو مخلوق کے خوف پر غالب رکھنا لازمۂ ایمان ہے) لَا تَخَافُوْهُمْ۔ هُمْ سے مراد ہیں شیطان کے دوست یا اللہ کے دشمن۔ ۳۶۲ یعنی ان لوگوں کے لئے آپ فکر و غم میں نہ پڑیں الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مراد منافقین ہیں۔ اِدھر مسلمانوں کو خفیف سی بھی شکست ہوئی اور اُدھر یہ کھلم کھلا کفر میں جا پڑے۔ اور کافروں کے علانیہ بھی شریک ہونے لگے۔ نزلت فی المنافقین (کبیر)

۳۶۳ یعنی اللہ کے دین کو ذرا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ آیت سے مقصود پیغمبر کو تسکین دینا ہے کہ آپ کو بڑی فکر اس کی ہے کہ منافقین کی چالوں سے کہیں اشاعتِ اسلام نہ رک جائے۔ سو اطمینان رکھیے ان کی چالیں ذرا بھی کامیاب نہ ہوں گی۔ ۳۶۴ (ان کے کفر اختیاری کی پاداش میں) اراد ته ان لا یکون لهم ثواب فی الاٰخرة لا تکون بدون ارادة کفرهم و معاصیهم (مدارک) ۳۶۵ (بلکہ الٹے خود ہی ہر طرح کے خسارہ میں رہیں گے) الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ۔ اس میں اسلام کے دُشمن خفیہ و علانیہ ہر قسم کے آگئے۔ ۳۶۶ (اور فوراً انہیں عذاب کی گرفت میں نہیں لے رہے ہیں)

٣٦٧ (عمر و مہلت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ) یعنی ہمارے قانونِ تکوینی کا اقتضا یہی ہے کہ جب گرفت فوری نہیں ہوتی تو غفلت و جسارت اور بڑھتی جاتی ہے۔ ٣٦٨ (طرح طرح کے امتحانوں سے اور آزمائشوں کے ذریعہ سے) خطاب عام نوعِ انسانی سے ہے۔ علیٰ ما انتم ایہا الناس (جلالین) لِیَذَرَ میں ل تاکیدِ نفی کے لئے ہے۔ واللام لتاکید النفی (مدارک) مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ (یعنی مومنین و منافقین کی ملی جلی ہوئی قوم) علیٰ ما انتم علیہ من اختلاط المؤمن بالمنافق (قرطبی)، من اختلاط المؤمن المخلص والمنافقین (مدارک) الخطاب لا تباعکم مختلطین لا یعرف مخلصکم من منافقکم (بیضاوی) الخبیث اور الطیب سے ظاہر مُراد منافقین اور مومنین ہیں۔ ٣٦٩ (مثلاً یہی کہ وہ بتلادے کہ فلاں فلاں شخص منافق ہیں اور فلاں فلاں مومن) یہ منافقین کے جواب میں ارشاد ہوا ہے جو مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ اچھا بڑے سچے بنتے ہو تو یہی بتادو کہ منافق کون کون سے ہیں۔ لِيُطْلِعَكُمْ میں خطاب عامِ انسانی سے ہے یا صرف مسلمانوں سے۔ الغیب سے تکوینی حقیقتیں مُراد ہو سکتی ہیں جو اس سے پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ ٣٧٠ (بعض امورِ غیب کی اطلاع کے لئے) مَنْ يَّشَآءُ۔ یعنی جسے وہ چاہتا ہے اپنی مصلحت و حکمتِ تکوینی کے ماتحت۔ متکلمین نے کہا ہے کہ آیت نص ہے عقیدۂ باطنیہ کے مقابلہ میں جو علمِ غیب کا اثبات علاوہ رسُول کے اپنے امام کے لئے بھی کرتے ہیں الآیۃ حجۃ علی الباطنیۃ فانھم یدعون ذلک العلم لامامھم (مدارک)

لِاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ

بہتر ہے، ہم تو انہیں بس اس لئے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ جُرم میں اور بڑھ جائیں ٣٦٧ اور ان

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ١٧٨ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ

کے لئے رسوا کن عذاب ہے جس حال پر تم ہو اللہ اس پر ایمان والوں کو چھوڑے

عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ

رکھنے کا نہیں جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کرلے ٣٦٨

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

اور نہ اللہ تمہیں غیب پر مطلع کرنے والا ہے ٣٦٩ البتہ اللہ جس کو

يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ

چاہتا ہے اپنے رسولوں میں سے انتخاب کرلیتا ہے ٣٧٠ تم اللہ اور اسکے رسولوں پر ایمان

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ١٧٩ وَلَا

لاؤ ٣٧١ اور اگر تم ایمان لے آئے اور تم نے تقوی اختیار کرلیا تو تمہارے لئے اجرِ عظیم ہے، اور جو لوگ

يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ

کہ اس مال میں بخل کرتے رہتے ہیں ٣٧٢ جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے

فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ

رکھا ہے، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں کچھ اچھا ہے، نہیں، بلکہ ان کے

مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ

حق میں (بہت) بُرا ہے یقیناً انہیں قیامت کے دن طوق پہنایا جائیگا اس مال کا جس میں انہوں نے بخل کیا

منزل ١

٣٧١ رُسُلِهٖ صیغۂ جمع میں۔ رسولہٖ صیغۂ واحد میں۔ مقصود تو اب صرف نبوتِ محمدیؐ پر ایمان لانے کی ترغیب دینا ہے لیکن اس ضمنی موقع پر بھی حکم تمام انبیاء پر ایمان لانے کا مل رہا ہے۔ کس قدر اہتمام قرآن کو وحدتِ پیام اور سلسلۂ وحی کی اہمیت و عظمت کا ہے۔ ٣٧٢ (صرفِ واجب کے موقع پر) البخل فی اللغۃ ان یمنع الانسان الحق الواجب علیہ (قرطبی) نزلت فی مانعی الزکوٰۃ المفروضۃ قالہ ابن مسعود وابوھریرۃ وابن عباس والشعبی ومجاھد (بحر)

وَ الْاَرْضِ ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿١٨٠﴾ ۧ لَقَدْ

اور اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا، اور اللہ جو تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے ٣٧٦ بیشک

سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ

اللہ نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ اللہ مفلس ہے اور

وَّ نَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ

ہم مالدار ہیں ٣٧٧ ہم ضرور ان کے کہے ہوئے کو لکھ کر رہیں گے ٣٧٨ اور ان کے

الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ

ناحق قتل انبیاء کو بھی ٣٧٩ اور ہم کہیں گے کہ اب ٣٨٠ آگ کے عذاب کا مزا

الْحَرِيْقِ ﴿١٨١﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ

چکھو یہ ان (حرکتوں) کی وجہ سے ہے جو تم آگے بھیج چکے ہو اور اس لئے کہ اللہ

لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿١٨٢﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ

بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ٣٨١ (یہ وہ لوگ ہیں) جو کہتے ہیں ٣٨٢ کہ خدا نے ہمیں

عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا

حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے مواجہ میں ایسی

بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ

نیاز نہ پیش کرے جسے آگ کھا جائے ٣٨٣ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پیشتر یقیناً تمہارے پاس رسول

قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ

دلائل کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ بھی آچکے جسے تم کہہ رہے ہو تو تم نے انہیں کیوں قتل کر ڈالا

ع ۱۸ / ۹ — وقف لازم

٣٧٣ (یعنی یہی شیوۂ بخل) ھو ای البخل (مدارک) ٣٧٤ (اور یہ طوق سانپ کی شکل میں ہوں گے ان کی گردنوں میں لپٹے ہوئے) حشر میں جب مجردات اور معانی مادی جسم اور شکلیں اختیار کرلیں گے۔ بخل اور منع زکوٰۃ حدیث میں آیا ہے کہ سانپ بن کر مجرموں کی گردن میں لپٹے گا۔ قال رسول اللہ صلعم ما من احد لا یؤدی زکوٰۃ مالہ الا مثل لہ شجاع اقرع یطوقہ (ابن جریر عن ابن مسعود) سَيُطَوَّقُوْنَ میں س تاکید کے لئے ہے۔ السین مزیدۃ للتاکید (روح) ٣٧٥ (اور وہی آج بھی سب کا مالک حقیقی ہے) سو یہ لوگ بخل درحقیقت اپنے مال میں نہیں بلکہ اُس کے مال میں کر رہے ہیں جو اور بھی قبیح ہے۔ ولیس ھذا بمیراث فی الحقیقۃ لان الوارث فی الحقیقۃ ھو الذی یورث شیئا لم یکن ملکہ قبل واللہ سبحانہ تعالیٰ مالک السمٰوٰت والارض وما بینہما (قرطبی) والمقصود من الآیۃ انہ یبطل ملک جمیع المالکین الا ملک اللہ سبحانہ وتعالیٰ (کبیر) ٣٧٦ (اس لئے اخلاص کا اہتمام قدم قدم پر رکھنا لازمی ہے) ٣٧٧ یہ کہنے والے یہود تھے اور ان کا یہ قول بطور مضحکہ وتمسخر کے تھا۔ یہود کا ایک قبیلہ بنی قینقاع کے نام سے نواح مدینہ میں آباد تھا یہ زرگروں اور مہاجنوں ساہو کاروں کا گروہ تھا۔ انہی نے آیۂ کریمہ من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً سن کر بطور تعریض وتضحیک اس قسم کی بڑ گوئی شروع کردی تھی۔ یہود کی بدتمیزیوں اور گستاخانہ طنز وتمسخر کو کوئی آج سمجھنا چاہے تو آریہ سماجیوں کا مناظرانہ لٹریچر اٹھا کر پڑھ لے! ٣٧٨ یعنی فرشتوں کے ہاتھ سے ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں لکھا کر رہیں گے اور ایسی گستاخانہ پھبتیوں کو ہرگز نظرانداز نہ ہونے دیں گے۔ سَنَكْتُبُ۔ س یہاں بھی تاکید کے لئے ہے۔ السین للتاکید ای لن یفوتنا ابداً تدوینہ (روح) ٣٧٩ جو اس درجہ شقی القلب ہوں کہ اپنے پیغمبروں تک کو ہلاک کر ڈالیں ان سے ایسے گستاخی کے کلمہ بعید ہی کیا ہیں؟ قتل انبیاء اور ناحق قتل انبیاء پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکے۔ رکوع ۷۔ فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ جو یہود قتل انبیاء سے راضی ومطمئن رہے وہ بھی گویا عملاً قتل میں شریک اور قتل کے ذمہ دار ہوئے ہیں۔ اور پھر یہ حقیقت کُلّی درج کی ہے کہ رضا بالمعصیت بھی معصیت ہے۔ ھذہ مسألۃ عظیمۃ حیث یکون الرضا بالمعصیۃ معصیۃ (قرطبی) ٣٨٠ (قیامت کے دن) ٣٨١ یعنی اس کی صفت عدل کا اقتضا ہو گا کہ ایسے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے، نہ کہ اس میں ذرا بھی شائبۂ ظلم ہو۔ مشرک قوموں نے اپنے دیوی دیوتاؤں کو ظالم، جابر سب ہی کچھ مانا ہے۔ یہاں ان عقائد کی بھی پوری تردید ہوگئی۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ۔ حشر میں عذاب تو صرف متشکل ہو کر سامنے آجائے گا ورنہ ہو گا تو حقیقۃً ان مجرموں کی دنیوی کرتوتوں ہی کا ثمرہ۔ ٣٨٢ (اور تمامتر جھوٹ کہتے ہیں) ٣٨٣ یعنی مدعی نبوت کے لئے یہ دکھانا ضروری ہے کہ جو قربانی مذبح میں پیش کی جائے اسے آگ آسمان سے آکر جلا جائے۔ سوختنی قربانی کا ذکر توریت میں کثرت سے آیا ہے۔ عَهِدَ اِلَيْنَا۔ یعنی ہم نے نسل اسرائیل کو حکم دیا تھا۔

۳۸۴ یعنی اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ مرتبۂ نبوت اور اس خاص معجزہ کا ظہور لازم ملزوم ہیں تو آخر تمہاری قوم کے جن انبیاء نے یہ معجزہ دکھایا تم خود اُن کے منکر کیوں رہے؟ جَآءَكُمْ رُسُلٌ یعنی خاص تمہاری ہی نسل و قوم کے پیمبر جو تمہارے پاس آچکے ہیں۔ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ۔ توریت میں اس قسم کے متعدد واقعات مندرج ہیں مثلاً "ایلیا نبی نزدیک آیا اور بولا کہ اے خداوند ابراہام اور اسحاق اور اسرائیل کے خدا آج کے دن معلوم ہوجائے کہ تو اسرائیل کا خدا ہے اور مَیں تیرا بندہ ہوں اور میں نے یہ سب کچھ تیرے کہے سے کیا ہے۔ ...... تب خداوند کی طرف سے آگ نازل ہوئی اور اس نے اس سوختنی قربانی اور لکڑیوں اور پتھروں اور پانی کو جلایا" (۱۔ سلاطین۔ ۱۸: ۳۶، ۳۸) "اور جب سلیمان دعا مانگ چکا آسمان سے آگ اتری اور سوختنی قربانی اور ذبیحوں کو کھاگئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھرگیا" (۲۔ تواریخ ۷: ۱) ۳۸۵ (اس لئے آپ کچھ غم نہ کریں، کہ یہ معاملہ تو سارے انبیاء و مرسلین کے ساتھ ہوتا آیا ہے) بِالْبَیِّنٰتِ۔ بینٰت دلائل عقلی اور معجزات سب کا جامع ہے۔ ای الحجج والمعجزات (کبیر) ای الحجج والبراھین القاطعۃ (ابن کثیر) اَلزُّبُرُ۔ زبور کی جمع ہے، مراد وہ مختصر رسالے ہوتے ہیں،

إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَإِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ

اگر تم سچے ہو ۳۸۴ سو اگر یہ آپ کی تکذیب کر رہے ہیں تو

رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ

آپ سے پیشتر بھی پیمبروں کی تکذیب ہوچکی ہے جو شواہد اور فرشتوں اور روشن کتاب کے ساتھ

الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ

آئے تھے ۳۸۵ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے ۳۸۶ اور تم کو تمہاری پوری مزدوری

أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۖ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ

تو بس قیامت ہی کے دن ملے گی ۳۸۷ تو جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا

وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ

اور جنت میں داخل کیا گیا سو وہی کامیاب ہوا اور دنیا کی زندگی تو کچھ بھی نہیں

إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ أَمْوٰلِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ

بجز ایک دھوکے کے سودے کے ۳۸۸ یقیناً تم اپنے مال اور جان سے آزمائے جاؤگے ۳۸۹

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور یقیناً تم بہت سی دلآزاری کی باتیں اُن سے بھی سنوگے جنہیں تم سے پہلے کتاب مل چکی

وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْٓا أَذًى كَثِيْرًا ۗ وَإِنْ تَصْبِرُوْا

ہے اور اُن سے بھی جو مشرک ہیں ۳۹۰ اور اگر تم صبر کرو اور

وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَإِذْ أَخَذَ

تقویٰ اختیار کرو تو یہ تاکیدی احکام میں سے ہے ۳۹۱ اور (وہ وقت قابل ذکر ہے)

جن میں صرف اخلاقی موعظہ ہوتے ہیں۔ اس کی بہترین مثالیں اناجیل اربعہ ہیں۔ قیل الزبر المواعظ و الزواجر (بیضاوی) اَلْكِتٰبِ۔ اصطلاح قرآنی میں اس سے مراد ایسی کتاب ہوتی ہے، جس میں احکام و شرائع سب ہوں۔ اور پوری طور پر ہادی ہو۔ والکتاب فی عرف القراٰن مایتضمن الشرائع والاحکام (بیضاوی) ۳۸۶ (خواہ وہ کوئی اور کیسا ہی ہو) گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ موت ایک طبعی تمہ و تکملہ ہے حیات کا، اسے نکوکاری اور بدکاری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ انسان کے لئے بطور سزا کے مقرر ہوئی ہے۔ اس میں مسیحیوں اور یہود دونوں کا رد آگیا جن کے عقیدہ میں موت نام ہے گناہ کی سزا یا نتیجہ کا۔ انجیل کے صحیفوں میں ہے:۔ "جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب موت آئی اور موت سب آدمیوں میں پھیل گئی" (رومیوں ۵: ۱۲) "گناہ کی مزدوری موت ہے" (رومیوں ۶: ۲۳) "خواہش حاملہ ہوکر گناہ کو جنتی ہے اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے" (یعقوب ۱: ۱۵) یہود کا عقیدہ کہ موت نتیجہ ہوتی ہے شخصی گناہ کا، ان کی معتبر و مستند جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۴۸۳ میں درج ہے۔ ۳۸۷ (سو اگر آج کوئی شخص یہاں قانون مکافات کی گرفت سے بچ بھی گیا تو اس کی یہ محفوظیت عارضی ہے کہ یہ دنیوی زندگی سلسلۂ حیات کا ایک بہت ہی ناقص و ناتمام حصہ ہے) خطاب یہاں عام نوع انسانی سے ہے۔ اُجُوْرَ۔ اجر کا لفظ اپنے وسیع معنی میں جزاء کی طرح عذاب و ثواب دونوں کے لئے عام ہے۔ فاجر المومن ثواب واجر الکافر عذاب (قرطبی) تعطون جزاء اعمالکم خیرا کان او شرا تاما وافیا (بیضاوی) ۳۸۸ (اور یہاں کے سارے عیش تمامتر عارضی، فانی اور بے ثبات ہیں) ایک اس عقیدہ کا استحضار رہے تو ہر انسان کس قدر فرشتہ خصلت بن جائے۔ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ۔ بچا خواہ شروع ہی سے ہو، خواہ کچھ سزا بھگتنے کے بعد۔ ۳۸۹ (اے مسلمانو!) یعنی نقصان مال اور نقصان جان دونوں طرح تمہاری آزمائش ہوگی۔ وَاَنْفُسِكُمْ۔ اس سے رد نکل آیا ان فلاسفہ و متکلمین کا جنہوں نے مادیین کی طرح نفس کو صرف جسم مادی کے مرادف قرار دیا ہے۔ وھذہ الاٰیۃ دلیل علی ان النفس ھی الجسم المعاین وان ما فیہ المعنی الباطل کما قال بعض اھل الکلام و الفلاسفۃ (مدارک) ۳۹۰ (سو صبر و ثبات، تحمل و استقامت کی عادت برابر قائم رکھنا چاہیے) اَذًى كَثِيْرًا۔ میں دین کی تحقیر، پیمبر کی توہین وغیرہ سب چیزیں آگئیں۔ قرآن مجید کی پیش گوئی آج تک کیسی صحیح چلی آتی ہے۔ یہود کی، مسیحیوں کی، ہندوؤں کی زبانوں سے اپنے پیمبر، اپنے دین اور اپنی کتاب کے بارہ میں کیا کچھ سُننا نہیں پڑچکا ہے! ۳۹۱ (اور اس لئے ہر طرح واجب العمل) ای من معزومات الامور التی یعزم علیھا (جلالین) ای الامور التی ینبغی ان یعزمھا (روح) ایں از کارہائے مقصود است (ولی اللہ دہلوی) ذٰلِكَ۔ یعنی یہی صبر و تقویٰ یعنی الصبر والتقوٰی (بیضاوی)

۳۹۲ (چنانچہ اس حکم کی شہادت کسی درجہ میں تو موجودہ محرف توریت اور انجیل بھی دے رہی ہے۔ "تم اس کلام میں جو میں تمہیں فرماتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو" (استثنا ۴: ۲) "تو یہ باتیں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو سکھلا" (استثنا ۴: ۹) "اس نے...... بنی اسرائیل میں ایک شریعت بنا رکھی جس کی بابت اس نے ہمارے باپ دادوں کو حکم کیا کہ وہ اسے اپنی اولاد کو سکھلادیں تاکہ آنے والی پشت، وہ فرزند جو پیدا ہوں، سیکھیں اور وہ اٹھ کے اپنی اولاد کو سکھلادیں" (زبور ۷۸: ۵۔۶) "جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اُجالے میں کہو اور جو کچھ تم کانوں کان سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو" (متی ۱۰: ۲۷) لَتُبَيِّنُنَّهٗ۔ تبیین کے معنی خوب کھول کر بیان کرنے کے ہیں۔ ہ کی ضمیر کتاب کی طرف ہے۔ یعنی جو کتاب تمہیں ملے، اس کو اور اس کے مضامین کو خوب پھیلاؤ۔ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ یعنی اس کے کسی حصہ، کسی مضمون کو کسی غرض سے بھی نہ چھپاؤ۔ ۳۹۳ یعنی احکامِ الٰہی کو سستے داموں بیچ کر دنیا خرید کی۔ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ہمیشہ کم قیمت ہی رہے گی۔ یہ مراد نہیں کہ ان نافرمانوں نے تحریف کا معاوضہ ہلکا لیا انہیں اس سے زیادہ لینا تھا۔ نَبَذُوْهُ ضمیر اسی عہد کی طرف ہے۔ ای المیثاق (بیضاوی) ۳۹۴ خاص طور پر مراد ہیں علماء یہود اور منافقین یہود۔ عُنِيَ بذٰلك قومٌ من اهل النفاق (ابن جریر) عُنِيَ بذٰلك قومٌ من احبار الیهود (ابن جریر) بِمَآ اَتَوْا مثلاً ان کا یہی کارنامہ کہ حق کا اخفاء اور اپنی بدکرداریوں کا کتمان کرتے رہے۔ مَا لَمْ يَفْعَلُوْا۔ مثلاً یہی کہ دینِ حق کی نشرواشاعت نہ کی۔ ۳۹۵ (آخرت میں) بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ۔ اس عذاب سے مراد اسی دنیا میں سزائیں ہیں۔ چنانچہ یہود چند ہی سال کے اندر قتل ہوئے، گرفتار ہوئے، جلاوطن ہوئے، اور منافقین یہود ذلیل و رسوا ہوئے۔ ۳۹۶ (چنانچہ مجرموں کی دنیوی و اُخروی سزاؤں پر بھی) اللہ کی ملکیتِ تامہ اور قدرتِ کاملہ کا استحضار رہے تو شاید ایک بھی معصیت نہ سرزد ہو۔

اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ

جب اللہ نے اہلِ کتاب سے عہد لیا تھا کہ کتاب کو پوری طرح ظاہر کر دینا،

لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ

(عام) لوگوں پر اور اسے چھپانا مت ۳۹۲ سو انہوں نے اس (عہد) کو اپنے پس پشت پھینک

وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝١٨٧

دیا اور اس کو ایک حقیر قیمت کے عوض میں بیچ ڈالا ۳۹۳ سو کیسی بری چیز ہے جسے وہ خرید رہے ہیں،

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ

جو لوگ ۳۹۴ اپنے کرتوتوں پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام نہیں کئے ہیں،

اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ

ان پر بھی ان کی مدح کی جائے سو ایسے لوگوں کے لئے ہرگز نہ خیال کرو

مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١٨٨ وَلِلّٰهِ مُلْكُ

کہ وہ عذاب سے حفاظت میں رہیں گے ان کے لئے دردناک عذاب ہے ۳۹۵ اللہ ہی کے لئے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝١٨٩

آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۹۶

ع ١٩ ١٠

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ادل بدل

وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝١٩٠ الَّذِيْنَ

میں اہلِ عقل کے لئے (بڑی) نشانیاں ہیں ۳۹۷ یہ ایسے ہیں کہ جو

۳۹۷ (اللہ کی توحید اور فردیت کی، اس کی حکمت وصنعت کی اور اس کی قدرت وحاکمیت کی) نظامِ فلکی اور اس کی تفصیلات، چاند، سورج، ستاروں کی تعداد، انکے درمیانی فاصلے، ان کے باہمی تعلقات وتاثرات، ان کی گردشوں کی پیمائش، گرہن کے اسباب واوقات، اُن کے طلوع وغروب، نور وحرارت وغیرہ کے قاعدہ ضابطہ، اس قسم کی تفصیلات سے علم ہیئت کی کتابوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں ——— رہی زمین تو ہیئتِ ارض، مساحتِ ارض، طبقاتِ ارض، معدنیاتِ ارض، کششِ ارض، ہواؤں اور موسموں کے تغیرات وغیرہ کے لئے تو کوئی ایک پورا فن بھی کافی نہ ہوا بلکہ جغرافیہ، جغرافیہ طبعی، جیالوجی، فزالوجی، میٹرولوجی، آرکیالوجی خدا جانے کتنے فنون پر فنون نکلتے چلے آرہے ہیں اور حکمت باری اور صنعت باری کے انداز اور تخمینے ختم ہونے کے قریب بھی نہیں آرہے ہیں! آیت میں ضمناً اُن مشرک قوموں کا بھی رد آگیا جنھوں نے آسمان یا زمین یا رات دن کو دیوی دیوتا سمجھا ہے، معبودیت کی صلاحیت ان میں سے کسی میں بھی نہیں، یہ سب کے سب مملوک ومسخر ہیں ایک صانعِ اعظم کے۔ ۳۹۸ یعنی یادِ الٰہی خواہ دل سے ہو یا زبان سے، یہ ہر حال اور ہر ہیئت کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ المراد منہ کون الانسان دائم الذکر فان الاحوال لیست الا ھذہ الثلاثۃ (کبیر) قال سائر المفسرین اراد بہ المداومۃ علی الذکر فی عموم الاحوال (معالم) عَلٰی جُنُوْبِهِمْ سے مُراد ہے لیٹے ہوئے۔ ای مضطجعین (قرطبی) ۳۹۹ کائناتِ طبعی کے ان عظیم الشان موجودات کے قوانینِ طبعی اور قواعدِ تکوینی سے صانعِ اعظم وخالق عالم کی قدرت، حکمت، صنعت پر استدلال کرتے رہنا عبادت ہی نہیں ایک اعلیٰ واشرف عبادت ہے۔ ھو افضل العبادات کما قال علیہ الصلوٰۃ لاعبادۃ کالتفکر لانہ المخصوص بالقلب والمقصود من الخلق (بیضاوی) دلت الآیۃ علی ان اعلیٰ مراتب الصدیقین التفکر فی دلائل الذات والصفات (کبیر) کاش آج ہماری قوم کے ماہرین فن ہیئت، فلکیات، ریاضیات وغیرہ علوم طبعی پر دینی وایمانی نقطۂ نظر سے قلم اٹھاتے! ۴۰۰ یعنی بلا غایت وبے مقصد نہیں پیدا کیا ہے، بڑے بڑے مصالح ومقاصد اس کے اندر رکھے ہیں۔ اس میں رد آگیا علاوہ مادئین ودہریین کے جو کائنات کو محض بخت واتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اُن مذاہبِ باطلہ کا بھی جن کے نزدیک یہ نظامِ کائنات محض کسی دیوتا کا کھیل تماشا یا ایک طرح کا طلسم وشعبدہ ہے۔ ۴۰۱ (ہر فعل عبث اور لاحاصل سے) تنزیھاً عن الوصف بخلق الباطل (مدارک)

یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ

اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر (برابر) یاد کرتے رہتے ہیں ۳۹۸ اور

وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں ۳۹۹، اے ہمارے پروردگار

مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ

تو نے یہ سب لاینعنی نہیں پیدا کیا ہے ۴۰۰ تو پاک ہے ۴۰۱ سو محفوظ رکھ ہم کو دوزخ کے

النَّارِ ۱۹۱ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ

عذاب سے ۴۰۲ اے ہمارے پروردگار تو نے جسے دوزخ میں داخل کر دیا اسے واقعی رسوا ہی

اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۱۹۲ رَبَّنَاۤ

کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ۴۰۳ اے ہمارے پروردگار

اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا

ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی پکار کرتے ہوئے کہ اپنے پروردگار پر

بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ

ایمان لے آؤ، سو ہم ایمان لے آئے ۴۰۴ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم سے

عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۱۹۳ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا

ہماری خطاؤں کو زائل کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ موت دے ۴۰۵ اے ہمارے پروردگار ہمیں عطا کر

مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ

وہ چیز جس کا تو نے ہم سے اپنے پیمبروں کی معرفت وعدہ کر رکھا ہے اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کرنا ۴۰۶

۴۰۲ (اور وہ اس طرح کہ ہمیں راہِ ہدایت پر چلائے اور راہِ ضلالت کے سایہ سے بھی بچائے) ۴۰۳ (کہ انہیں میرے عذاب سے کچھ بھی بچا سکے) اَلظّٰلِمِیْنَ۔ ظالم سے یہاں کھلی ہوئی مراد کافر سے ہے۔ ای الکفار (قرطبی) والمراد الکفار (مدارک) القرآن دل علی ان الظالم الاعلان ھو الکافر (کبیر) مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ مراد وہ لوگ ہیں جو کفر وشرک میں مرے اور عذاب ابدی کے لئے دوزخ میں جھونکے جائینگے، وہ گنہگار مسلمان مراد نہیں ہیں جو گناہوں سے پاک صاف ہونے کیلئے عارضی ووقتی طور پر دوزخ میں بھیجے جائینگے۔ قال سعید بن المسیب الآیۃ خاصۃ فی قوم لایخرجون من النار (قرطبی) حکماء وعلماء اسلام کے گروہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ عذابِ روحانی عذابِ جسمانی سے بھی بڑھ کر زبردست وشدید ہوگا اس لئے کہ قرآن خزی (رسوائی) کا ذکر عذابِ دوزخ کے بعد کرتا ہے (کبیر) ۴۰۴ (اس داعیِ حق کی ہدایات کے مطابق) ایمان شریعت میں وہی معتبر ومستند ہے جو پیمبر کی ہدایات کے مطابق ہو، نہ کہ اپنے ظن وتخمین کے ماتحت۔ امام ماتریدی نے یہیں سے یہ نکالا ہے کہ اپنے ایمان کو انشاء اللہ کے، اتہ مقید ومشروط کرنا درست نہیں۔ قال الشیخ ابو منصور رحمہ فیہ دلیل بطلان الاستثناء فی الایمان (مدارک) مُنَادِیًا پکارنے والے سے مُراد رسول اللہ صلعم ہیں۔ یُنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ۔ یہ ضرور نہیں کہ پیمبر کی دعوت براہ راست ہی پہنچتی ہو، کسی واسطہ سے بھی پہنچے، بہرحال پیمبر ہی کی دعوت ہوگی۔ لِلْاِیْمَانِ میں ل الی کے معنی میں ہے۔ اللام بمعنی الی ای الی الایمان (قرطبی) ۴۰۵ (اور آخرت میں ان کی رفاقت نصیب کر) مخصوصین بصحبتھم معدودین فی زمرتھم (بیضاوی) ذُنُوْبَنَا۔ ذنوب سے مراد بڑے گناہ ہیں۔ ای کبائرنا (بیضاوی) سَیِّاٰتِنَا۔ سیأت سے مراد چھوٹے گناہ ہیں۔ ای صغائرنا (بیضاوی) ۴۰۶ یعنی ابتدا ہی سے ہم پر فضل وکرم رکھ۔ جہنم وغیرہ کے جو شدید ترین عذاب ہیں، وہ تو خیر الگ رہے، باقی میدانِ حشر میں پبلک رسوائی، عام تفضیح، یہ کچھ کم ہو، ذرا اس پر خیال تو کیا جائے۔ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا یعنی اجر موعود، جنت موعود۔ عَلٰی رُسُلِكَ۔ اللہ کے وعدے معتبر تمام تر وہی ہیں جو پیمبروں کی وساطت سے ہوں، نہ تصدیق صرف انہی پر لگی ہو، کہ اپنی عقل وذہانت سے فرض کر لئے ہوئے وعدوں پر۔ رَبَّنَا اس سلسلہ دعا میں بار بار اس لفظ کی تکرار، اللہ کی صفتِ ربوبیت کو بار بار مخاطب کرنا، اور گویا اسے اس کی صفت کا واسطہ دینا دلیل ہے دعا کرنے والے کی خشیت اور الحاح اور تضرع کی۔

۴۰۷ (اس لئے تیرے وعدہ پر تو قطعاً بھروسہ ہے لیکن اس کا اطمینان تو نہیں کہ ان وعدوں کا تحقق ہمارے حق میں ہو۔ ہم ہی ان وعدوں کے مصداق ٹھہریں) ۴۰۸ (اور انہیں اپنے فضل و کرم کی جنت میں داخل کر دیا) اِسْتَجَابَ۔ یہاں بھی اجاب کے معنی میں ہے۔ اِسْتَجَابَ بمعنی اَجَابَہٗ (قرطبی) ۴۰۹ (اور تم دونوں الگ الگ قسم کی مخلوق نہیں ایک ہی نوع کی دو شاخیں ہو) اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عربی زبان کا ایک مخصوص اسلوب بیان و طرز انشاء ہوتا ہے، اوپر سے برابر صیغۂ غائب چلا آرہا ہے۔ اب دفعۃً اس آیت کے اندر صیغۂ متکلم آگیا، عربی ادب و انشاء میں یہ فوری انتقال صیغہ داخل عیب نہیں، داخل ہنر ہے اور اپنے موقع و محل پر ایک خاص صفت، یہاں صیغۂ متکلم خاص طور پر دلالت کر رہا ہے تخصیص و شفقت پر۔ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ جاہلی مذہبوں میں یہاں تک کہ مسیحیت میں بھی عورت ہونا بجائے خود ایک جرم و نقص تھا، عورت غریب محض اسلئے کہ عورت

إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝١٩٤ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ

بیشک تو تو وعدہ خلافی نہیں کرتا ۴۰۷ سو ان کی دُعا کو ان کے پروردگار نے

رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن

قبول کر لیا ۴۰۸ اسلئے کہ میں تم میں کسی عمل کرنے والے کے (عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا) خواہ وہ مرد ہو

ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ

یا عورت عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا تم آپس میں ایک دوسرے کے جز ہو ۴۰۹ تو جن

هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي

لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے شہروں سے نکالے گئے اور (اور بھی) تکلیفیں انہیں میری

سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ

راہ میں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے، ان کی خطائیں ضرور ان سے معاف کر دی جائیں گی ۴۱۰

وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ

اور میں ضرور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی،

ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝١٩٥

(یہ) اللہ کے پاس سے ثواب ملے گا اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے ۴۱۱

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝١٩٦ مَتَاعٌ

(یہ) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا کہیں تجھے دھوکے میں نہ ڈال دے ۴۱۲ (یہ) چند روزہ

قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝١٩٧

بہار ہے ۴۱۳ پھر تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیسی بری آرامگاہ ہے

تھی بہت سے درجات سے، بہت سے قُربوں کی محروم تھی اس گمراہی کو مٹانے کے لئے صراحت کے ساتھ یہ بیان کرنے کی ضرورت تھی کہ جنس مذکر و مؤنث سے عمل و اجرِ عمل پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا، عمل عمل کے لحاظ سے ہر عامل یکساں ہے۔ نماز اِس کی بھی قبول اُس کی بھی، روزہ اِس کا بھی مقبول اُس کا بھی، عصمت اِس کی بھی قابل غور اس کی بھی و قِس علیٰ ہذا۔ لَآ اُضِيْعُ لاکر یہ بھی بتا دیا کہ عمل پر ثمرات کا ترتب تمامتر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ یہ تصریح ہے اس کی کہ انسانیت دونوں جنسوں میں مشترک ہے اس لئے حکم بھی دونوں کا مشترک ہی رہے گا۔ لانهما من اصل واحد (بیضاوی) لاتفاوت فی الاجابة ولا فی الثواب بین الذکر والانثی (کبیر) بیّنت فیها شرکة النساء مع الرجال فی ما وعدالله عباده الصالحين (مدارک) ذرا اسے یاد کر لیا جائے کہ دونوں جنسوں کے درمیان اشتراک انسانیت کی یہ تعلیم بیسویں صدی عیسوی میں نہیں ساتویں صدی عیسوی کی ابتداء میں مل رہی ہے، جبکہ فرنگستان اور ہندوستان دونوں میں عورت ہونا خود ایک جرم تھا اور عورت کا وجود مرادف تھا گندگی اور ناپاکی کے۔ مِّن ذَكَرٍ میں مِنْ تاکید کے لئے ہے۔ دخلت من للتاکید (قرطبی) ۴۱۰ (اور یہ کفّارۂ سیّئات و الانعام علاوہ اس اجر کے ہوگا جو انہیں اپنے اعمال شاقہ اور حسنات پر ملے گا) اَلَّذِيْنَ هَاجَرُوا ...... وَقُتِلُوا۔ یہ ذکر ہو رہا ہے حضورؐ کے رفیقوں اور صحابیوں کی جان نثاریوں کا۔ اور بیان میں چند اعمال کا نام لیکر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بطور مثال و نمونہ کے یا فہرست حسنات کے مہمات عنوان کے طور پر بتایا کہ انہی پر سارے اعمال حسنہ کا قیاس کر لیا جائے ان سے حسنات کا حصر مقصود نہیں۔ لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ۔ اس تصریح سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حضرات باوجود ان مرتبوں کے، باوجود صحابی اور مہاجر اور مظلوم فی سبیل اللہ اور غازی اور شہید ہونے کے معصوم نہ ہوں گے، لغزش و خطا سے ماوراء نہ ہوں گے، صاحب سیّئات ہوں گے عام بشری لغزشوں کے یہ بھی مرتکب ہوں گے البتہ فضل خداوندی ان کے حسنات کو ان کے سیّئات پر کہیں غالب رکھے گا۔ آج جو ہر "شیخ" اور ہر "بزرگ" کو عملاً القدس مآب، معصوم اور بشریت سے ماوراء سمجھا جانے لگا ہے اس عقیدۂ فاسدہ کی تردید قرآن مجید قدم قدم پر کر رہا ہے۔ ۴۱۱ صیغۂ حصر کا وارد ہوا ہے یعنی یہ بہترین و برترین نعمت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں۔ ای یختص به ولا یقدر علیه غیره (مدارک) ۴۱۲ یعنی اے مخاطب اہل کفر کا حظوظ دنیوی سے بہرہ ور ہونا، مادی نعمتوں کا حصہ دار ہونا کہیں تجھے اس دھوکے میں نہ ڈال دے کہ ان کی حالت بھی قابل قدر و مستحق احترام ہے۔ یہ دھوکا بھی کتنا عام ہے اور آج دنیا کتنا زیادہ اس دھوکے میں پڑی ہوئی اور اس فریب پر مٹی ہوئی ہے۔ الخطاب لکل احد (مدارک) هذا الخطاب لکل من سمعه من المکلفین کانه قیل لا یغرنک ایها السامع (کبیر) ۴۱۳ (آخرت کی ابدی نعمتوں اور سرافرازیوں سے ان حظوظ دنیوی کو نسبت ہی کیا؟) حدیث نبویؐ میں آیا ہے کہ دُنیا کو آخرت کے مقابلہ میں کوئی سمجھنا چاہے تو موجیں مارتے ہوئے سمندر میں انگلی کا سرا ڈالے اور نکال لے پھر دیکھے کتنا پانی اس میں آیا ہے۔

۴۱۴ (ہر دنیوی لذت و نعمت سے، کیفیت میں، کمیت میں، غرض ہر اعتبار و ہر جہت سے) وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ۔ یعنی اُخروی نعمتوں کی قسموں میں سے۔ اِتَّقَوْا رَبَّهُمْ۔ اور اس تقویٰ الٰہی کی پہلی منزل قبول اسلام ہے۔ نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ اللہ نے اہل جنت کو اپنا "مہمان" ٹھہرا کر ان کا مرتبہ اعزاز و اکرام جس حد تک بڑھا دیا ہے الفاظ اس کے ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ النزل ما یھیأ للضیف (کبیر) ۴۱۵ یعنی کسی بھی مصلحت و منفعت کے خیال سے اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف، ترمیم، تضعیف، تلبیس گوارا نہیں کرتے۔ ثَمَنًا قَلِيْلًا پر حاشیہ اوپر گزر چکے، ہر دنیوی معاوضہ بڑا ہو یا چھوٹا حقیر ہی قیمت کا کہا جائے گا۔ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ۔ یعنی اللہ کی ذات و صفات پر ایمان پورے

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ
البتہ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں ان کے لئے باغ ہونگے، جن کے نیچے نہریں
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ
بہ رہی ہونگی، ان میں وہ ہمیشہ (ہمیش) رہیں گے (یہ تو) مہمانی (ہوگی) اللہ کی
عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۱۹۸
طرف سے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیکوں کے حق میں کہیں بہتر ہے ۴۱۴
وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ
اور اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ضرور ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تم پر
اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ
اتارا گیا ہے، اور جو کچھ ان پر اتارا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہیں،
لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ
اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے ۴۱۵ انہیں ان کا اجر ان کے
اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۱۹۹
پروردگار کے پاس ضرور ملے گا بیشک اللہ حساب بہت جلد لے لیتا ہے، ۴۱۶
يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ
اے ایمان والو (خود) صبر کرو، اور مقابلہ میں صبر کرتے رہو، اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو،
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۲۰۰ ع
اور اللہ سے ڈرتے رہو، عجب نہیں جو فلاح پا جاؤ ۴۱۷

الثلٰثة

ع ۲۰
۱۱

توحیدی رنگ میں ہے اس میں شرک کی آمیزش نہیں۔ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ۔ خطاب مومنین سے ہے، یعنی قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں۔ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ۔ یعنی اپنی اپنی آسمانی کتابوں توریت، انجیل وغیرہ پر ان کی اصلی، غیر محرف صورتوں میں ایمان رکھتے ہیں۔ یہ مدح جیسا کہ ظاہر ہے اُن اہل کتاب کی ہو رہی ہے جنہوں نے رسول اللہ کی تصدیق کی اور اسلام قبول کر لیا۔ ۴۱۶ (سو وہاں کسی کو انتظار کی بھی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی) حشر کے مجمع عظیم کو دنیوی مجموں کی بھیڑ بھاڑ اور دنیوی عدالتوں کی تعویق اور تاخیر پر ہرگز قیاس نہ کیا جائے۔ ۴۱۷ اِصْبِرُوْا۔ یعنی جو صعوبتیں راہ حق میں از خود پیش آئیں اُن پر صبر کئے جاؤ۔ ای علی مشاق الطاعات و ما یصیبکم من الشدائد (بیضاوی) ای الصبر بالطاعات وعن الشھوات (قرطبی) قال الحسن وقتادة وابن جریج والضحاک اصبروا علی طاعة الله (جصاص) صَابِرُوْا۔ یعنی جو مصیبتیں مخالفین و معاندین کے ہاتھوں پیش آئیں انہیں بھی برداشت کرو۔ ای غالبوا اعداء الله فی الصبر علی شدائد الحروب (بیضاوی) معناہ مصابرة الاعداء قاله زید بن اسلم (قرطبی) صابروا اعداء الله (جصاص) رَابِطُوْا۔ یعنی خارجی دشمنوں اور اپنے اندرونی دشمن (نفس) دونوں سے مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔ الترابط حمل النفس علی النیة الحسنة والجسم علی فعل الطاعة ومن اعظمه ارتباط الخیل فی سبیل الله وارتباط النفس علی الصلوٰة (ابن عربی) وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ صبر و مصابرہ و مرابطہ سب کا اصلی مصدر اور آخری ماخذ تقویٰ الٰہی ہے۔ آخر میں اس کی تاکید ہے اور اسی کا نتیجہ دنیا و عقبیٰ میں فلاح ہے۔ ولا بد للانسان فی کل فعل یفعله من داعیة و غرض وجب ان یکون للانسان فی هذه المجاهدة غرض و باعث و ذلك هو تقوى الله لنيل الفلاح والنجاح (کبیر)

ضمیمہ پ۴

اسمِ پاک محمدؐ

(بسلسلہ حاشیہ ۲۸۱ پ۴)

حضورؐ کا نام نامی آپ کے دادا "عبدالمطلب" نے رکھا تھا۔ عام طور پر اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ رجحانِ محمد عبدالمطلب نے آثار نیک دیکھ کر محمدؐ نام رکھا کہ مستقبل میں یہ مولود سعید آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم مجموعۂ محامد اور مرجعِ خلائق بنے۔ ارباب تصوف موشگافی کی انتہا کر دیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ یہ لفظ "محمدؐ" خدا کے نام "احد" سے مشتق ہے۔

اگرچہ عام طور پر نام کی صرف اس قدر ضرورت سمجھی جاتی ہے کہ چند چیزوں میں باہم امتیاز قائم رہے لیکن نام کی صحیح اور حقیقی غرض یہ نہیں۔ اسم کو اپنے مسمّیٰ کے صفات، خواص اور حالات کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ افراد کے نام رکھنے میں تو اس کا کم لحاظ کیا جاتا ہے۔ لیکن عموماً انواع و اجناس کے نام اسی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ مثلاً انسان، مُسلم، قوم شاذ و نادر طریقہ پر افراد و اشخاص کے ناموں میں بھی اس کا لحاظ کر لیا جاتا ہے جیسے "مسیح" اور "بدھ" یہ دونوں نام اپنے مسمّیٰ کے اوصاف اور خواص کو بتلاتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپؐ سے پہلے عرب میں کہیں اس نام کا پتہ نہیں چلتا۔ مؤرخین اکثر لکھتے ہیں۔ ولم یکن شائعاً بین العرب ھذا الاسم اس حالت کو تسلیم کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اتفاقی طور سے "نام مبارک" کا "عبدالمطلب" کے ذہن میں آنا منشاء خداوندی معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نام کا محل کامل دنیا کو اپنے وجودِ گرامی سے مشرف کر چکا تو پھر اسم بھی فطری طور سے نام رکھنے والے کے ذہن میں وارد ہوا۔

نام مبارک کا عام اور سادہ ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ "وہ ذات جس کی تعریف کی گئی" اس ترجمہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس جامعیتِ کبریٰ، برزخِ کامل اور مقصودِ آفرینش کے فضائل و کمالات کے سامنے ترجمہ ہیچ ہے خدا کے تمام نبی اس کے نزدیک موجبِ توصیف ہیں۔ دنیا کے تمام حکیم، فاتح عام انسانوں کی نظروں میں لائقِ مدح و ستائش ہیں اس لئے اس ترجمہ کی صحت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے تخصص کو اور زیادہ وسعت دیں۔ صاحب مفردات "محمد" کے معنی لکھتے ہیں الذی اجتمعت فیہ الخصال المحمودۃ یعنی مختصر لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمدؐ کے معنی مجموعہ خوبی کے ہیں ؎

اے کہ تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

کارسازِ قدرت کی وسعت لامحدود اس کے کرشمے ناقابلِ شمار اس کی خلقت کا دروازہ ہمیشہ کھلنے والا ہے۔ غور کرنے سے ہم اپنی عقل کے مطابق اس فیصلہ پر پہنچے ہیں کہ قدرت نے تخلیق انواع کے لئے ایک میعار مقرر کیا ہے۔ مخلوقات کی ہر نوع کا ایک درجہ کمال ہے۔ کہ جس کے آگے اس کا قدم نہیں بڑھتا "حیوانات" "نباتات" اور جمادات تک میں اس کے شواہد مل سکتے ہیں صورتیں ایک ہیں شکلیں متحد ہیں، اوصاف مختلف ہیں۔ لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے جسے جنس اعلیٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں، ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف جامعیت کے ساتھ جا کر ختم ہوتے ہیں ہم مقصودِ فطرت اور نقطۂ تخلیق کہہ سکتے ہیں۔ اس نقطۂ تخلیق کی اصطلاح کو پوری تشریح کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہیے یہ بات تھوڑے سے غور اور شعور سے بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے تفحص اور تفتیش کے بعد تمام انواع مخلوقات کے اوصاف کا ایک درجۂ اعلیٰ پاتے ہیں کہ جس کے آگے انسانی معلومات میں کوئی درجہ نہیں۔

دوسرے تمام انواع کی طرح اس مقصودِ فطرت کو انسانوں کی جماعت میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے دوسری مخلوقات اور انسانوں میں ایک عام اور بیّن فرق یہ ہے کہ وہاں نوع کے سیکڑوں افراد ہیں اور یہاں اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے ہر ہر فرد اپنے مقام پر نوع مستقل ہے۔ آفرینشِ انسان کی مجمل یا مفصل تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتلا سکتی ہے کہ آج بھی انسان کی شکل و شباہت اس کے اعضاء و جوارح اس کا ڈھانچہ جسمانی ساخت ٹھیک وہی ہے سب چیزیں وہی ہیں جو دنیا کے پہلے انسان کی تھیں۔ لیکن دماغی کیفیتوں کا حال اُن سے جداگانہ ہے۔ ان میں برابر ارتقاء و اختلاف جاری ہے۔ اب اگر انسان کی اس ارتقائے دماغی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل و مابعد ادوار، زمانوں کی تاریخ میں ارتقائے دماغی کی آخر ترین سرحد اگر کوئی معلوم ہو سکتی ہے تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نامدار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے لغات قاموس نے لفظ "محمد" کے ایک معنی "تمام الخلق" کے بھی بتلائے ہیں پس لفظ "محمدؐ" کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو یعنی قدرت کی جانب سے نوع انسان کو جس سرحد کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حق تخلیق مقرر تھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کر دیا گیا۔ علم و عمل، خَلق و خُلق، دماغ دیگر لفظوں ارتقائے ذہنی و ارتقائے عملی یہی دو چیزیں انسان کا خلاصہ اور اس کی کائنات تخلیق کا لب لباب ہیں اول ثانی کے لئے بنیاد ہے عمل علم پر، کیرکٹر دماغ پر، خُلق خَلق پر قائم ہے۔ یہ ایک عجیب نکتہ ہے جس کی تشریح کسی دوسرے مقام پر آئے گی کہ جتنی ہی کسی انسان کی حالت مکمل ہوگی اسی قدر اس کی خُلقی کیفیت راسخ و مستحکم ہوگی ایک کا کمال دوسرے کے کمال کی علامت اور ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کی نشانی ہے۔ تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ کیرکٹر اور اخلاق کی جملہ شاخوں کی پختگی اور تکمیل کا جو نمونہ آنحضرت صلعم کی ذات مبارک نے پیش کیا عالم انسانی اس کی نظیر سے عاجز ہے حتیٰ کہ خود دشمنوں کے اقرار سے اس کو مانا گیا۔ انک لعلیٰ خلق عظیم محاورات عرب سے حمد کے یہی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کام کو اپنی قدرت کے مطابق انجام دینا حماسیات میں نیزہ کے بھرپور پڑنے کے وقت حمدت بلائہ (میں نے وار پورا کیا) کا محاورہ بہت مشہور ہے۔ اس معنی کو سامنے رکھتے ہوئے اور اوپر کے مضمون کو پیش نظر رکھ کر بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی مخلوق کامل کے بھی ہیں۔

منجملہ دیگر کمالات نبوت و معجزات رسالت کے ایک معجزہ گرامی حضور اقدس کا اسم نامی بھی ہے۔ یہ زندۂ جاوید معجزہ بعثت کے وقت سے تا ہنوز اپنے فضائل کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ محمد الذی یحمد مرۃ بعد مرۃ جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے۔ زمانہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اور انسان اپنی سعی و کوشش کے مطابق جس درجہ ترقی کرتا جاتا ہے محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعۃً رسالتمآب روحی فداہ صلعم کے کمالات پر سے پردہ اٹھتا جاتا ہے۔ علماء و فضلاء یورپ کی کثرت تاریخ اسلام کے ماتحت اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جاتی ہے دنیا کی مختلف پریشانیوں اور بے قراریوں کو معدوم کرنے کی ضرورت جتنی ہی ان کے نزدیک بڑھتی جاتی ہے۔ بادل ناخواستہ انہیں اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور زبان اعتراف کھولنا پڑتا ہے کہ یہ شہنشاہ پیغمبر عرب کے قانون دنیا کی ضرورتوں کے کفیل اور ان کی زندگی عالم انسان کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اہل ایشیا کا رجحان طبعی جتنا روحانیت اور سادگی کی طرف بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ پیغمبر اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ دنیا کا صرف واحد معجزہ ہے کہ نام مبارک تیرہ سو برس پہلے سے اس آنے والی حالت کا پتہ دے رہا ہے مستقبل میں دنیا کی عمر جس قدر دراز ہوگی خواہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ترقی کرے جس کی بظاہر امید نہیں اور خواہ اپنے پچھلے سبق دہرائے۔ دونوں حالتوں میں اسے کمالات نبوت کے اعتراف سے چارہ نہ ہوگا اس حیثیت سے نام مبارک محمد صلعم کا ترجمہ سلسلۂ اوصاف و محامد ہوگا۔

جیسا اوپر کہا گیا ہے عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام زندگی کا آئینہ اور اس کے شمائل و جبلت کی تفصیل ہو۔ مگر نام نامی آقائے نامدار اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی مطابقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاص نام کے رکھنے کے متعلق ضرور عبدالمطلب کو ایک غیبی تحریک ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ آنحضرت صلعم کی زندگی کا خلاصہ دوست و دشمن کی یکساں تنقید حاضر و غائب کی رائے زنی کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ علم و عمل، ظاہر و باطن، خلق و خُلق ہر حیثیت سے حضورؐ کی زندگی قابل تعریف تھی اور اسی خلاصہ حیات کا ترجمہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

... اور اس سے بھی زیادہ عجیب امر یہ ہے کہ نام مبارک حضورؐ کے نہ صرف نبی بلکہ خاتم النبیین ہونے کی دلیل بھی ہے۔ کمال و کمالِ اخلاق بھی انبیاء علیہم السلام کی مخصوص اور ممتاز صفات میں سے ہیں۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کا کمال علمی و عملی کسی ایک خاص صفت میں مخصوص تھا لیکن حضورؐ کی جامعیت آپؐ کی سوانح و تعلیمات سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ لفظ "محمدؐ" کے معنی مجموعہ خوبی اور "مخلوق کامل" کے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس کے آگے کوئی نقطہ ہی نہیں ہے۔ اسی حالت پر کمال کلی کی انتہا اور معارف کا اختتام

ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کی حاجت نہ کسی نبی کا وجود ممکن ہے۔ مستشرقین یورپ میں سے جن لوگوں نے آنحضرت کی سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے وہ باوجود ہزار سعی تنقیص اعتراف کمال پر مجبور ہوئے ہیں۔ سر ولیم میور اور مارگولیتھ جیسے سخت لوگوں کو بھی کھلے اور چھپے لفظوں میں اس کا اقرار کرنا پڑا کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم انتہائی سچائی اور حقیقی صداقت پر مبنی نظر آتی ہے۔ عہد نبوت میں بھی اسی قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں کہ بعض سخت ترین منکر ایک توجہ نظر اقدس کی تاب نہ لا سکے۔ عبداللہ بن سلام جو نامور علماء یہود میں سے تھے وہ جس طرح اسلام لائے معلوم ہے۔ بعثت کے حالات سیرت طیبہ تعلیم و تلقین اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ مخالف سے مخالف اور سخت سے سخت حریف اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی خاصیت اور بے اختیارانہ کشش کو نام مبارک میں بیان کیا گیا لفظ "محمد" عربی زبان میں تحمید سے مشتق ہے جو باب تفعیل کا مصدر ہے اس باب کے معنی کے خواص میں سے ہے کہ کسی کام کا وجود میں آنا اس طور پر مانا جائے کہ گویا کسی مخفی یا ظاہر طاقت نے اس کو وجود میں آنے کے لئے مجبور کیا جیسے صرف (پھیر دیا)۔ یعنی کسی طاقت نے بے اختیار کر کے پھیر دیا اسی طرح "محمد" کے معنی ہیں وہ جس کی تعریف بے اختیار کی گئی ہو۔ اس معنی سے اسی قوت جاذبہ اور کشش اصلی کی طرف اشارہ ہے۔ عبداللہ بن سلام کے متعلق مروی ہے کہ وہ چہرہ مقدس کو دیکھتے ہی پکار اُٹھے ھذا لیس بوجہ کذاب یورپ میں بڑی ہوشیارانہ تدبیر سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدترین پیرایوں میں دکھلانے کی کوششیں کی گئی ہیں لیکن اب آج کل بعض جماعتوں اور خدا ترس بندوں کی طرف سے جو مساعی جمیلہ جاری ہیں انہوں نے تجربہ کرا دیا کہ جب کبھی اصل صورت ان کے سامنے پیش کی گئی ہے تو انہوں نے یہی کہا کہ یہی تو ہمارا کعبہ مقصود ہے۔

اس باب کی دوسری خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کام کے اس طور پر ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کا استقصار کئے ہوئے ہے کوئی جز اس سے چھوٹا ہوا نہیں استعمال میں آتا ہے قَتَّلَهٗ تَقْتِيلًا یعنی خوب خوب قتل کیا اس خاصیت کا لحاظ رکھتے ہوئے نام مبارک کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ "محمد" یعنی جس کا جز و جز قابل تعریف ہے "اصلاح نفس" "تدبیر منزل" اور تدبیر ملت کی وہ کونسی شاخ ہے جس کا عملی نمونہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ صلعم نے پیش نہیں کر دیا۔ انبیاء علیہم السلام کا تمام سلسلہ عالم میں ایک خاص ترتیب و نظام کے ساتھ آیا اور ہر ایک اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمال اخلاقی یا عرفانی یا انتظامی لایا یہ بابرکت سلسلہ جب اپنی حد و نہایت کو پہنچا تو ضرورت ہوئی کہ عالم انسان کے سامنے ایک ایسا نمونہ کامل پیش کیا جائے جو ان تمام صفات کا مجمع اور فضائل کا آئینہ ہو جس کی زندگی کو سامنے رکھنے سے موسویانہ ہستی، مسیحانہ اخلاق، ابراہیمی محبت بیک وقت نظر کے سامنے آ جائے۔ اور پھر ان تمام اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بالاتر ہو۔ وہ ہستی کامل جامع اور برزخ کامل ذات پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی لئے حضرت مسیح نے اپنی بشارت میں لفظ "احمد" فرمایا یعنی وہ آئے گا جو اپنے تمام پہلے آنے والوں کا سردار اور سب پر فائق ہو گا۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب نے اپنی کامل نشو و نما جب ہی پائی ہے جب وہ حضرت روحانیت کی آغوش سے نکل کر سلطنت اور حکومت کی گود میں چلے گئے ہیں۔ مسیحی مذہب کی ترقی رومی بادشاہوں کی رہین احسان ہے۔ بودھ نے بہت کچھ تبلیغ کی لیکن اس کا عالمگیر مذہب بھی اُسی وقت اپنی تکمیل کر سکا جب وہ اشوک خاندان کی سرپرستی میں آ گیا۔ لیکن اسلام اپنی تاریخ میں بالکل علیحدہ ہے وہ جن جن ملکوں میں گیا اور جن جماعتوں میں پھیلا اخلاق و روحانیت سے گیا غریب تو وہ اسلام میں روحانیت اور مذہب کے داخلہ کے بعد گئی ہے۔ افریقہ اور ہندوستان کی نظیریں اس بارہ میں بہت صاف ہیں۔ اس خاص نعمت تبلیغ کو بھی نام مبارک میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد للہ رب العالمین بظاہر اسباب ان مفاسد کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی لیکن فطرت کی تدبیریں اندر اندر جاری رہتی ہیں اور ایک وقت معین پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ فطرت کی رفتار ہوا کی طرح تیز اور سیلاب کی طرح نرم ہوتی ہے۔ خوش تدبیری اور حسن اسلوب کے موقع پر بھی حمد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے پس لفظ "محمد" کے ایک یہ بھی معنی قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ خوش تدبیری نے ترقی کی آپ کی تعلیم کا انتشار آپ کا لایا ہوا دین خدا کی خاص مرضی اور خاص تدبیر سے عالم میں پھیل گیا جس کی سرعت اور بغیر جد و جہد رفتار ترقی سے اس وقت بھی دنیا متحیر ہے۔

الغرض اسلام کی تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کا نام مبارک بھی اپنے معانی کے لحاظ سے مختلف خوبیوں کا مرقع بہترین فضائل کا خلاصہ ہے ایک طرف وہ اپنے مسمّٰی کے کام اور کام کے انجام کی پیشین گوئی ہے دوسری طرف اُس کے کاموں کی تاریخ اور اس کی تعلیم کا لب لباب ہے۔

پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے نبی کا ایسا پاک نام رکھا اور پاکیزہ ہے وہ نبی جسے اس کے معبود نے ایسی فضیلتوں سے آراستہ کیا۔

والحمد للہ رب العالمین

سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّسِتٌّ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعٌ وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

مدنی ۔ ۲۴ رکوع ۔ سورۂ نساء ۔ ۱۷۶ آیتیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ نہایت مہربان بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ

اے لوگو اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم (سب) کو ایک ہی

مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا

جان سے پیدا کیا ۴۱۸ اور اسی سے اُس کا جوڑا پیدا کیا ۴۱۹ اور ان دونوں سے

رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ

بکثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیے ۴۲۰ اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے ایک

بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ

دوسرے سے مانگتے ہو ۴۲۱ اور قرابتوں کے باب میں بھی (تقویٰ اختیار کرو) ۴۲۲ بیشک اللہ تمہارے اوپر

رَقِيْبًا ۝۱ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا

نگران ہے ۴۲۳ اور یتیموں کو ان کا مال پہنچا دو ۴۲۴ اور پاکیزہ کو گندی چیز سے

الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى

مت تبدیل کرو اور ان کا مال مت کھاؤ اپنے مال کے

اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲ وَاِنْ

ساتھ بیشک یہ بہت بڑا گناہ ہے ۴۲۵ اور اگر

۴۱۸ یعنی ابوالبشر حضرت آدمؑ سے۔ وحدت نوع انسانی کا یہ سبق اپنے عملی اور دُوررس نتائج کے لحاظ سے کتنا اہم ہے! آخری جدِّ اعلیٰ ہر گورے اور ہر کالے کے، ہر حبشی اور ہر مہذب کے، ہر ہندی اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے ایک ہی ہیں اولادِ آدم ہیں، یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورثِ اعلیٰ کوئی اور تھے اور فلاں نسل کے کوئی اور، اور نہ یہ کہ برہمن ذات والے برہما جی کے منہ سے پیدا ہوئے اور کھشتری نسل والے اُن کے سینہ سے اور ویش جاتی والے اُن کے پیٹ سے اور شودر ذات والے اُن کی ٹانگوں سے، اصلاً انسان انسان سب ایک ہیں۔ خَلَقَكُمْ۔ مسئلہ ارتقاء کسی حد تک کسی معنی میں صحیح ہے یا نہیں، قرآن مجید کو اس سے مطلق سروکار نہیں انسان بہرحال وبہرصورت خلق ضرور ہوا ہے۔ قرآن انسان کی مخلوقیت کو بار بار نمایاں کر رہا ہے۔ اور ہر اس نظریہ اور عقیدہ کی تردید کر رہا ہے جو انسان کی تخلیق کے منافی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ۔ خطاب ساری نوع انسانی سے ہے، خواہ کوئی کسی نسل بھی رنگ، کسی قوم، کسی جنس، کسی ملک کا ہو، ایمان اور ایک درجہ میں تقویٰ کے مکلف سب ہیں۔ اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ۔ پروردگار سے ڈرنا اُس کے احکام کی مخالفت سے ڈرنا ہے۔ لفظ ربّ میں خود یہ اشارہ موجود ہے کہ جن احکام کی مخالفت سے ڈرایا اور روکا جا رہا ہے، خود اُن کی غایت بھی ربوبیت اور پرورش ہے۔ ۴۱۹ یعنی حضرت حوّاؑ۔ تخلیقِ حوّا کی تفصیلی کیفیت سے قرآن مجید تو یکسر ساکت ہے، رہی حدیث سو اس کا بھی یہی حال ہے۔ جس مشہور حدیث کی رُو سے حضرت حوّا کا حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے اُس میں ذکر نہ حضرت آدمؑ کا ہے نہ حضرت حوّاؑ کا۔ بلکہ محض عورت کی پیدائش اور کج سرشتی کا بیان ہے۔ آثار میں جو روایت ملتی ہے وہ روایت توریت کی آواز بازگشت ہے اور توریت کا بیان حسب ذیل ہے:۔ "خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سوگیا اور اُس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا۔ اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس بھیجا" (پیدائش ۲: ۲۲ و ۲۳) مِنْهَا۔ ضمیر ھا عموماً نفس کی طرف پھیری گئی ہے۔ لیکن ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ منھا یہاں من جنسھا کے مرادف ہے۔ القول الثانی ما ھو اختیار ابی مسلم الاصفھانی ان المراد من قولہ وخلق منھا زوجھا ای من جنسھا (کبیر) اور یہی قول علاوہ ابومسلم کے ابن بحر سے بھی نقل ہوا ہے۔ وقیل ھو علی حذف مضاف التقدیر وخلق من جنسھا زوجھا قالہ ابن بحر وابو مسلم (بحر) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے محض بطور تشبیہ کے ارشاد فرمائی گئی ہو اور مقصود محض اس کے عدم ثبات کو ظاہر کرنا ہو جیسا کہ قرآن مجید ہی میں ہے کہ انسان کی پیدائش جلدبازی سے ہوئی ہے۔ یحتمل ان یکون ذالک علی جھۃ التمثیل لاضطراب اخلاقھن وکونھن لا یثبتن علی حالۃ واحدۃ کما جاء خلق الانسان من عجل (بحر) ویحتمل ان یکون المعنی من جنسھا لا من نفسھا حقیقۃ (نہر) اور اس معنی کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث میں ذکر جنس عورت کا ہے نہ کہ حوّا کا۔ ویؤید ھذا التاویل قولہ ان المرأۃ فانہ بالجنس ولم یقل ان حوّا (بحر) اور بعض شارحین حدیث بھی حدیث مذکور کی شرح میں اسی طرف گئے ہیں کہ یہ فطرت نسوانی کی کجی کی طرف صرف استعارہ ہے:۔ استعارۃ للمعوج ای خلقن خلقاً فیہ اعوجاج ذکرہ الکرمانی (بحوالہ مجمع بحار الانوار جلد ۲ ص ۲۹۳) وقد حمل العوج بعض العلماء علی المجاز والمعنی ان العوج ھو المیل عن الاعتدال وحب الشذوذ ھو شان المرأۃ (حاشیۂ تفسیر ابن کثیر۔ مطبوعہ مصر) بخاری کی ایک حدیث میں تو بالکل صاف ہے کہ عورت مثل پسلی کے ہے۔ عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلعم قال المرأۃ کالضلع ان اقمتھا کسرتھا (صحیح بخاری۔ کتاب النکاح حدیث ۸۱) اور یہی حدیث مسلم نے بھی (کتاب الرضاع میں) حضرت ابوہریرہؓ ہی کی سند سے نقل کی ہے۔ خود ضلع کے پسلی کا مفہوم تو ثانوی ہے، اصل معنی کجی وانحراف یا میل ہی کے ہیں۔ الضلع المیل (کتاب الفائق۔ زمخشری) الضلع الاعوجاج ای الزیغ حتی یمیل صاحبہ عن الاستواء والاعتدال (نہایۃ۔ ابن اثیر) ۴۲۰ دونوں جنسیں اسی ایک جوڑے یعنی حضرت آدمؑ وحضرت حوّاؑ سے دنیا میں چلی ہیں۔ كَثِيْرًا۔ آدمؑ کے وقت سے لیکر اب تک جو آبادی ہر ملک اور ہر زمانہ کی رہی ہے یا جو قیامت تک ہوگی اس کے مجموعہ پر بھی اگر کثیر کا اطلاق نہ ہو گا تو اور کس پر ہو گا۔ ۴۲۱ (اپنے حقوق اور مراعات) قال الزجاج تطلبون بہ حقوقکم (بحر) بہ یعنی اس کے نام کا واسطہ دلا دلا کر۔ آیت سے اللہ کے واسطہ سے مانگنے کا جواز نکل آیا۔ وفی الاٰیۃ دلالۃ علی جواز المسئلۃ باللہ تعالیٰ (جصاص) ۴۲۲ اَلْاَرْحَامَ کا عطف اللہ پر ہے۔ یہ ہے قرابت اور رشتہ داری کی اہمیت اسلام میں حقیقت میں اُمت کے نظام اجتماعی کا سنگ بنیاد شریعت نے قرابت رحم ہی کو قرار دیا ہے۔ وفی عطف الارحام علی اسم اللہ دلالۃ علی عظم ذنب قطع الرحم (بحر) وقد نبّہ سبحانہ تعالیٰ اذا قرن الارحام باسمہ الکریم علی ان صلتھا بمکان منہ (بیضاوی) فیہ تعظیم لحق الرحم وتاکید للنھی عن قطعھا (جصاص) رحم کا اطلاق وسیع ہے۔ جملہ اعزہ واقربا اس کے اندر آجاتے ہیں۔ الرحم اسم لکافۃ الاقارب من غیر فرق بین المحرم وغیرہ (قرطبی) من المجاز الرحم القرابۃ وبینھما رحم ای قرابۃ قریبۃ (تاج) اور اسی معنی میں یہ حدیث بھی آئی ہے:۔ الرحم معلقۃ بالعرش تقول اللھم صل من وصلنی واقطع من قطعنی (رحم عرش الٰہی سے معلق دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے رہے اللہ اسے جوڑے رکھے اور جو مجھے کاٹے اللہ اُسے کاٹے) فقہاء اس پر متفق ہیں کہ قرابت کا لحاظ واجب ہے اور اسے قطع کرنا جرم ہے۔ اتفقت الملۃ علی ان صلۃ الرحم واجبۃ وان قطیعتھا محرمۃ (قرطبی) ۴۲۳ (اور اس نگرانی میں انسان کے ذاتی، خانگی، اجتماعی سارے معاملات آگئے) اگر اس کا استحضار رہے تو آج خانگی زندگیاں کس قدر خوشگوار ہو جائیں! ۴۲۴ یتیم یعنی بن باپ کے بچوں اور بچیوں کا مسئلہ ہر قوم میں اہم ونازک رہا ہے۔ قرآن اب یہاں اسی باب میں ہدایتیں دے رہا ہے۔ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ۔ یعنی ان یتیموں کے بالغ ہونے پر ان کی جائداد، اُن کا سامان ان کے حوالہ کردو، اور اس کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ یتیم اپنی جائداد کا مطالبہ کرے بھی۔ وفیہ دلالۃ علی وجوب تسلیم اموال الیتامیٰ بعد البلوغ وایناس الرشد وان لم یطالبوا بادائھا (جصاص) خطاب یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے۔ یتیموں کے سپرد ان کی جائداد ان کے بالغ اور سمجھدار ہو جانے کے بعد ہی کرنا چاہئے اس کے قبل نہیں۔ ان الیتیم لا یجب اعطاءہ مالہ قبل البلوغ (جصاص) انما یجب الدفع الیتیم بعد البلوغ وایناس الرشد (جصاص) وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ۔ یعنی ایسا نہ ہونے پائے کہ ان نابالغ یتیموں کی اچھی چیز نکال کر اپنے مال میں ملالی اور اپنی طرف کی کوئی گھٹیا چیز ان کے حصہ میں شامل کردی۔ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ یعنی اپنے حصہ کے ساتھ یتیموں کے حصہ کو خلط ملط کر کے۔ ای لا تاکلوھا مضمومۃ الی اموالکم (بیضاوی) الی اموالکم ای مع اموالکم (بحر) اِنَّهٗ۔ ضمیر اسی دست درازی اور یتیموں کے مال میں گڑبڑ کرنے کی طرف ہے۔ ای الاکل (بحر) ڈاکٹر رابرٹ رابرٹسن مسلم نہیں، کافر ہیں اس پر بھی اس کے قائل ہیں کہ قرآن اور پیمبر نے یتیموں کے حقوق کے تحفظ کا بہترین انتظام کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیۂ تفسیر انگریزی۔

خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا

تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے باب میں انصاف نہ کر سکو گے ۴۲۵ تو جو عورتیں تمہیں پسند

طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ

ہوں ۴۲۶ اُن سے نکاح کر لو دو دو سے خواہ تین تین سے خواہ چار چار سے ۴۲۷ لیکن اگر

خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ

تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو ۴۲۸ یا جو کنیز تمہاری ملک

اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ﴿۳﴾ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ

میں ہو ۴۲۹ اس میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے ۴۳۰ اور تم بیویوں کو اُن کے مہر

صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ

خوش دلی سے دے دیا کرو ۴۳۱ لیکن اگر وہ خوشدلی سے تمہارے لئے اس میں کا کوئی جزو

نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا ﴿۴﴾ وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ

چھوڑ دیں تو تم اُسے مزہ دار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ ۴۳۲ اور کم عقلوں کو اپنا وہ مال نہ دے دو

اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ

جس کو اللہ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے اور اس مال میں سے انہیں کھلاتے

فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا

اور پہناتے رہو اور اُن سے بھلائی کی بات کہتے

مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾ وَ ابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا

رہو ۴۳۳ اور یتیموں کی جانچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ

منزل

۴۲۵ یعنی جو یتیم لڑکیاں تمہاری نگرانی و سرپرستی میں ہیں اُن کے حقوقِ مہر وغیرہ پوری طرح ادا نہ کر سکو گے۔ خطاب یتیم لڑکیوں کے سرپرستوں سے ہے۔ جاہلیت میں ایک دستور یہ تھا کہ یتیم لڑکیاں جو مردوں کی سرپرستی میں ہوتیں تو ان کے وہی سرپرست اکثر یہ دیکھ کر کہ کوئی اور ان کی طرف سے مہر وغیرہ کا مطالبہ کرنے والا اور ان کی حمایت پر کھڑا ہونے والا ہے نہیں ان کے حقوق مار لینے آسان ہیں، انہی کے ساتھ نکاح کر لیتے اُن کی جائدادیں اپنی طرف شامل کر لیتے یا اور طریقوں سے ان کے ادائے حقوق کی طرف سے بے التفاتی برتتے۔ ۴۲۶ (ان یتیم، صاحبِ جائداد، مگر بے حمایتی لڑکیوں کے علاوہ جو اپنی رضا و عدم رضا کھل کر آزادی کے ساتھ ظاہر بھی نہیں کر سکتیں) مَا طَابَ لَكُمْ۔ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ عقل کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کے پسند میں طبیعت کے مقتضی پر عمل کی بھی پوری اجازت شریعت میں موجود ہے۔ مِّنَ النِّسَآءِ۔ اُمروا ان ینکحوا سواھن من النسآء (جصاص) ای غیرھن (قرطبی) اس میں بالغ نابالغ سب آگئیں۔ والصغار والکبار (جصاص) ۴۲۷ یعنی تم پر نکاح کے باب میں کوئی تنگی نہیں۔ اپنی زیرِ نگرانی یتیم لڑکیوں کو زیرِ عقد لانے میں اتلافِ حقوق کا اندیشہ بھی ہو تو اس خیال کو جانے دو۔ باہر والی آزاد عورتوں میں سے انتخاب کر سکتے ہو۔ ایک ہی کا نہیں، ایک سے لیکر چار تک کی گنجائش ہے۔ وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ میں وعطف کا نہیں تخییر کا ہے اور اَوْ کے مرادف ہے۔ وقد تخرج الواو عن افادۃ مطلق الجمع وذلک علی اوجہٍ احدھا ان تکون بمعنی اَوْ (تاج)، والواو بمعنی او للتخییر (معالم) خود قرآن مجید میں وؔ کے اس معنی میں استعمال کی مثالیں متعدد ملتی ہیں مثلاً۔ ان تقوموا للہ مثنٰی وفرادٰی (سبا ع ۶) اُولِیْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (فاطر ع ۱) بعض اہلِ زیغ نے ۲ اور ۳ اور ۴ کے عدد کو جوڑ کر آیت سے استدلال ۹ بیویوں کے جواز کا کیا ہے۔ اور بعض ظالموں نے تو اس تعداد کو ۱۸ تک پہنچا دیا ہے۔ یہ سر تا سر جہل و زیغ ہے۔ جہل زبانِ عرب سے بھی اور جہل سُنّتِ رسولؐ سے بھی۔ وھذا کلہ جھل باللسان والسنۃ ومخالفۃ لاجماع الامۃ (قرطبی) اگر نو ہی کی تعداد منظور تھی تو صاف ہی کیوں نہ ارشاد ہو گیا، اس قدر گھوم پھیر کر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تعددِ ازدواج کی اجازت ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی مغرب زدہ مسلمان کو شرمانے اور اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ مرد کے قویٰ اور اس کی جسمانی ساخت و ترکیب ہی اس نوعیت کی ہے کہ بکثرت عورتوں میں ایک بیوی اس کی طبعی خواہش کی تشفی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ مرد و عورت کے اتحاد و تناسل کا جہاں تک تعلق ہے مرد کا عمل چند منٹ میں ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مرد پر جسمانی حیثیت سے کوئی ذمہ داری ہی نہیں، برخلاف اس کے عورت کے لئے اس ذو منٹی عمل کے نتائج کا سلسلہ دنوں اور ہفتوں نہیں حمل اور رضاعت کی مدت ملا کر ڈھائی ڈھائی سال تک پھیلا ہوا رہتا ہے۔ پھر حمل کے بغیر بھی ہر جوان تندرست عورت کے لئے ہر مہینہ ایک ایک ہفتہ کی معذوری ایک امرِ طبعی ہے۔ اور وہ قانونی نظام کامل نہیں ناقص ہے جو مرد کی طبعی ضرورتوں کی طرف سے آنکھ بند کر لے اور عورت کی طبعی معذوریوں کا لحاظ کر کے مرد کے لئے کوئی سہولت جائز نہ رکھے! پھر یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرینِ حیاتیات کی شہادتیں اس تجربہ و مشاہدہ کی تائید میں ہیں کہ طبعی ضرورت سے قطع نظر مرد کی شہوانی جبلّت تنوع پسند بھی ہے اس لئے جو شریعت اسکی اس جبلّت کی کوئی رعایت اپنے نظام میں نہیں رکھتی وہ اور کچھ بھی ہو، بہرحال خدائی اور مطابقِ فطرت نہیں کہی جا سکتی۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ جب سے ساتھ دیتی ہے، داعیانِ توحید نے اس دستور کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر عمل کر کے اسے اور زیادہ قوت پہنچا رہی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ۔ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ میں سے کسی کے ہاں بھی یک زوجی کی سند نہیں ملتی، بلکہ بعض کی حرم سرا تو کثرتِ تعداد کے لئے بھی مشہور ہے۔ ہندِ قدیم میں اکابر ہنود کی بابت بھی روایتیں وحدت کی نہیں، تعدد ہی کی ہیں اور یورپ و امریکہ میں آج رسمِ نکاح کو درمیان میں لائے بغیر جو اندھیر کھلے بندوں ہو رہا ہے اُس کی نقل و حکایت کی بھی تاب ان صفحات میں کہاں سے لائی جائے۔ اسلام نے ایک طرف تو یک زوجی کی قید اُڑا کر تعدد کو سندِ جواز دے دی اور دوسری طرف اس کی مناسب حد بندیاں بھی کئی کئی طرح کر دیں اور یہی اس کی حکمت کا کمال رہا۔ ۴۲۸ (کہ جب تعدد کی صورت ہی نہ ہو گی تو عدل کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا) اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ یعنی بیویوں کے درمیان عدل نہ کر سکو گے اور ان کے حقوقِ واجب ادا نہ کر پاؤ گے۔ عدل سے یہاں مُراد ادائے حقوقِ واجب میں عدل و مساوات ہے جو انسان کے قصد و اختیار کے اندر کی چیز ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی بیوی بغیر کھانے، کپڑے، مکان کے نہ رہے باقی جہاں تک محبتِ طبعی اور تعلقِ قلب کا سوال ہے اس میں مساوات قدرتِ بشری سے باہر ہے، اور اس باب میں شریعت نے کوئی گرفت نہیں رکھی ہے۔ اور اس عدلِ اختیاری میں بھی یہ لازم نہیں کہ ہر معاملہ مساواتِ عددی ہی کے ساتھ کیا جائے۔ ایک افریقی بیوی خوگر بالکل دوسری چیزوں کی ہو گی اور امریکی بیوی دوسری چیزوں کی۔ مسن اور ادھیڑ سن کی بیوی کی ضرورتیں، خواہشیں، دلچسپیاں سب ایک کم سن، نوجوان بیوی کی ضرورتوں، دلچسپیوں، خواہشوں سے مختلف ہوں گی، مقصود یہ نہیں کہ ساری بھینسیں ایک ہی لاٹھی سے ہانکی جانے لگیں، مقصود ہر ایک کو بقدرِ امکان اور بہ لحاظ اس کے ذوق و حالات کے راحت پہنچانا ہے۔ فقہانے عدل بین الازواج کو فرض قرار دیا ہے لیکن خود عدل کی تفسیر عدمِ ظلم سے کی ہے کہ کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے۔ وظاھر الآیۃ انہ فرض ان یعدل ای ان لایجور (دُرِّمختار) فَوَاحِدَةً۔ کوئی شوہر اگر ظلم و بے انصافی کے ساتھ دو یا زائد بیویاں رکھے تو اس پر ظلم و بے انصافی کا گناہ برابر ہو تا رہے گا لیکن یہ نہیں کہ دوسری بیوی یا بیویوں سے نکاح ہی منعقد نہ ہو۔ ظلم و جور قانونی انعقادِ نکاح کا مانع نہیں۔ ۴۲۹ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ۔ کے لفظی معنی ہیں "وہ جنکے مالک تمہارے داہنے ہاتھ ہیں" محاورہ میں اس سے مُراد شرعی مملوک، غلام اور کنیزیں ہوتے ہیں۔ جن کا اب مُدّتِ دراز سے ہندوستان بلکہ دنیا کے اکثر ملکوں میں کہیں وجود نہیں۔ اسیرانِ جنگ کا معاملہ ہمیشہ ایک اہم و دشوار معاملہ رہا ہے یعنی یہ کہ جو مرد اور عورتیں شکست خوردہ غنیم کے ہاں سے گرفتار ہو کر آئیں۔ اُن کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، انہیں کہاں اور کیسے رکھا جائے۔ کسی نے اس کا حل جبری مزدوری **Forced Labour** یا بیگار کو نکالا۔ کسی نے کچھ اور۔ ہماری شریعت نے حکم یہ دیا کہ بجائے اس کے کہ ایک بڑی آبادی کا بار حکومت **State** پر ڈالا جائے، اس تعداد کو افراد میں تقسیم کیا جائے اور ہر فرد اس نو وارد کو اپنے خاندان کا ایک جزو بنالے۔ اس سے کام ہر طرح کا یقیناً لے لیکن اس کے آرام کا بھی ہر طرح لحاظ رکھے۔ اور ان میں جو عورتیں ہوں ان سے ہمبستری کا حق بھی حاصل رہے۔ اس کا قیدی ہو کر آنا یہ خود اعلانِ نکاح کا قائم مقام ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید ایجاب و قبول اور شاہدین کی ضرورت نہیں اور یہ لوگ آسان شرائط پر اپنی آزادی ہر وقت خرید سکتے ہیں (شرائط کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی)، بلکہ ان کے آزاد کرنے کی فضیلتیں اور اس کے لئے طرح طرح کی ترغیبات خود قرآن مجید ہی میں درج ہیں اور

حدیث میں تو اور زیادہ ہے ـــــ حیرت ہے کہ ایسے صاف، سیدھے، شریفانہ، حکیمانہ قانون سے شرمانے اور اسے غیروں سے چھپانے کی ضرورت تجدّد زدہ مسلمان محسوس کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کا ذہن معًا انگریزی کے لفظ Slave اور ان سارے سختیوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو اس لفظ کے تخیل کے ساتھ وابستہ ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہاں تو غلاموں اور غلام زادوں نے بار ہا بادشاہتیں کی ہیں اور اُمرا تو ان میں کثرت سے ہوئے ہیں اور دینی حیثیت سے بڑے بڑے علماء، فقہاء و ائمۂ فن اُن میں تابعین ہی کے زمانہ سے پیدا ہونے لگے تھے۔ کنیز کے حقوق بیوی سے کمتر ہوتے ہیں، اس لئے ان کا ادا کرنا بھی قدرةً سہل تر ہے۔ ۴۳۰ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی کے ساتھ نباہ کرنا ہو گا تو ظلم اور زیادتی کے امکانات بھی بہت گھٹ جائیں گے۔ ذٰلِكَ۔ یعنی یہی ایک پر قناعت۔ اشارة الی اختیار الواحدة (مدارک) اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ عول کے معنی ایک طرف جھک جانے اور جَور کرنے کے ہیں، لا تعولوا کے معنی ہوئے کہ ظلم و زیادتی نہ کرو۔ العول هو ترك النصفة بأخذ الزيادة (راغب) من قولهم عال الميزان عولاً اذا مال وعال الحاكم فى حكمه اذا جار (کشاف) معناه لا تجوروا ولا تميلوا وهذا هو المختار عند اكثر المفسرين (کبیر) لا خلاف بين السلف وكل من روى عنه تفسير هذه الأية ان معناه ان لا تميلوا وان لا تجوروا (جصاص) ۴۳۱ صَدُقٰتِهِنَّ۔ صداق یا مہر شریعت اسلامی میں بیوی کی وہ قیمت نہیں جو شوہر اس کے اولیاء کو دے کر ان سے بیوی حاصل کرتا ہے۔ بلکہ مہر بطور ایک نذرانہ کے ہے جو شوہر بغرض اکرام و اعزاز براہ راست بیوی کو پیش کرنا اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے۔

ہمارے فقہاء نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا ہے۔ المهر واجب شرعًا ابانة لشرف المحل (ہدایہ) عورت کی شرمگاہ نکاح ہوجانے سے شوہر کی ملک نہیں ہوجاتی ملک عورت ہی کی رہتی ہے شوہر کے لئے صرف جائز ہوجاتی ہے۔ الزوج لا يملك بدله شيئًا لان البضع فى ملك المرأة بعد النكاح كهو قبله (جصاص) وانما الذى يستحقه الزوج منها بعقد النكاح هو الاستباحة لا الملك (جصاص) وَاٰتُوا النِّسَآءَ۔ یہ رقم مہر اپنی بیویوں کو دو نہ کہ ان کے اولیاء و والدین کو۔ مہر کی اہمیت اور ادائے مہر کی تاکید شریعت میں بالکل ظاہر ہے۔ گو افسوس ہے کہ اُمّت کا عمل اس کے برعکس ہے مہر کو محض ایک رسمی اور فرضی چیز سمجھ رکھا گیا ہے۔ ۴۳۲ یعنی اس اجازت کے بعد بے تکلف اسے اپنے کام میں لا سکتے ہو۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ۔ بیویوں کی طرف سے یہ ابراء بغیر کسی جبر اور دباؤ کے اور شوہر کے کسی مکر و فریب کے بغیر ہونا چاہیئے، مہر اگر کسی جبر یا مکر سے معاف کرا لیا گیا ہے تو قاضی و عدالت کے ہاں سے جو کچھ بھی فیصلہ ہو جائے عند اللہ معاف نہیں سمجھا جائیگا۔ عَنْ شَیْءٍ۔ چاہے وہ جزء چھوٹا ہو یا بڑا، یہاں تک کہ کُل کا کُل بھی۔ بیوی اگر شوہر سے مہر وصول کر کے پھر اسے واپس کر دے تو اسے ہبہ کہیں گے اور اگر لئے بغیر پہلے ہی معاف کر دے تو اس کا نام اصطلاح فقہ میں ابراء ہے اور شرعًا دونوں صورتیں بالکل درست ہیں۔ فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا۔ محاورۂ زبان میں مُراد اس کے لفظی معنی نہیں بلکہ مُراد یہ ہے کہ بیوی کی اجازت کے بعد اس مال کو بے تکلف اپنے تصرف و استعمال میں لا سکتے ہو۔ تصرفوا فيه تملّكًا (روح) لا اعتبار بلفظ الأكل فى ذلك وان المقصد فيه جواز استباحته بطيبة من نفسها (جصاص) ليس المقصود صورة الأكل وانما المراد به الاستباحة بأى طريق كان (قرطبی)

۴۳۳ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ۔ سیاق میں سفہاء سے مُراد وہ یتیم ہیں جو عمر کے اعتبار سے بالغ ہو چکے ہیں لیکن صرف مال کا سلیقہ و انتظام ان میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ اور وہ بے تکان اور بے تحاشا اسراف میں مشغول رہتے ہیں۔ المبذرين اموالهم الذين ينفقونها فى ما لا ينبغى ولا قدرة لهم على اصلاحها (مدارک) وصف اليتامى بانهم سفهاء باعتبار خفة احلامهم واضطراب آرائهم لما فيهم من الصغر وعدم التدرب (روح) ليس السفه فى هؤلاء صفة ذم ولا يفيد معنى العصيان لله تعالى وانما سموا سفهاء لخفة عقولهم ونقصان تمييزهم عن القيام بحفظ المال (جصاص) سفہ و سفاہت سے یہاں کسی معصیت یا جرمِ اخلاقی کی طرف اشارہ کرنا نہیں بلکہ محض ان لوگوں کی انتظامی نااہلیت کا اظہار مقصود ہے۔ اَمْوَالَكُمُ۔ مُراد اس مال سے ہے جو ملک یتیموں ہی کی ہے لیکن فی الحال سرپرستوں کی ولایت میں ہے۔ اى اموالهم التى فى ايديكم (جلالین) انما اضاف الاموال الى الاولياء لانها فى تصرفهم وتحت ولايتهم (بیضاوی) لَكُمْ قِيٰمًا۔ ضمیر مخاطب

بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا
عمر نکاح کو پہنچ جائیں ۴۳۴ تو اگر تم ان میں ہوشیاری دیکھ لو تو ان کے حوالہ
اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا
ان کا مال کر دو ۴۳۵ اور مال کو جلد جلد اسراف سے اور اس خیال سے کر یہ
اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَ
بڑے ہوجائیں گے ۴۳۶ مت کھا ڈالو، بلکہ جو شخص خوشحال ہو وہ تو اپنے کو بالکل روکے رکھے ۴۳۷
مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا
البتہ جو شخص نادار ہو وہ مناسب مقدار میں کھا سکتا ہے ۴۳۸ اور جب
دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ
اُن کے مال ان کے حوالہ کرنے لگو تو ان پر گواہ بھی کر لیا کرو،
وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
اور اللہ حساب لینے والا کافی ہے ۴۳۹ مردوں کے لئے بھی اس چیز میں حصّہ ہے جس کو
تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ
والدین اور نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے بھی اس چیز میں حصّہ
مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ
ہے جس کو والدین اور نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں اس متروکہ میں سے تھوڑا ہو
اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ
یا زیادہ (بہرحال) ایک حصّہ قطعی ہے ۴۴۰ اور جب تقسیم کے وقت

سے مُراد عالم انسانیت ہے یعنی مال جو انسان کے لئے مایۂ زندگی ہے، جس کے اوپر انسان کی حیاتِ مادّی و معاشرتی کا دارومدار ہے۔ وبه قوامًا لابدانكم ومعاشًا لاهلكم واولادكم (مدارک) المراد من القيام ما به القيام (روح) لَكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ مال اللہ کی بڑی نعمت ہے اور بڑی قدر کی چیز۔ ابھی اسے نافہم یتیموں کے ہاتھ میں نہ دے دو۔ کہ وہ اس کی قدر و مرتبہ سے ناواقف ہیں وہ ناقدری سے اسے اُڑا دیں گے۔ فقہاء نے آیت سے حفظِ مال و عدم تضیعِ مال کے وجوب پر بھی استدلال کیا ہے۔ وفيه الدلالة على النهى عن تضييع المال ووجوب حفظه وتدبيره والقيام به (جصاص) وَّارْزُقُوْهُمْ .... مَعْرُوْفًا۔ مطلب یہ ہوا کہ اسی جائداد سے یتیموں کی ضرورتیں پوری کرتے رہو۔ اُن کی راحت و آسائش کے سامان کرتے رہو اور بجائے اُن کے ہاتھ میں جائداد دیدینے کے اُن سے تسلی کی باتیں کرتے رہو کہ یہ ملک تمہاری ہی ہے تمہاری ہی بہی خواہی کا تقاضا ہے کہ اسے ابھی تمہارے ہاتھ میں نہ دیا جائے بلکہ انتظار کیا جائے کہ تم میں پوری طرح سمجھ آ جائے۔ ان کی یہ سفاہت ان کے نان و نفقہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اور یہیں سے فقہاء نے نالائق اولاد اور بیوی کے نان و نفقہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ فى ذلك دليل على وجوب نفقة الاولاد السفه والزوجات (جصاص) مَعْرُوْفًا۔ معروف کے اندر ہر وہ چیز داخل ہے جو عملًا خواہ علمًا عقل و شریعت کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ كل ما سكنت اليه النفس لحسنه عقلًا او شرعًا من قول او عمل فهو معروف (مدارک) اى كلامًا تطيب به نفوسهم (روح) ۴۳۴ یعنی سیانے اور بالغ ہو جائیں۔ یعنی القدرة على الوطیء (ابن عربی) حتى اذا بلغوا حد البلوغ (بیضاوی) اور بلوغ کی عمر حنفیہ کے ہاں لڑکے کیلئے ۱۸ سال کی اور لڑکی کے لئے ۱۷ سال کی رکھی گئی ہے۔ وشاع عن الامام الاعظم ان السن للغلام تمام ثمانى عشرة سنة والجارية تمام سبع عشرة سنة (روح) هكذا قاله ابن عباس وتابعه القتبى (روح) وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى۔ یعنی اُن کے بالغ ہونے سے پہلے ان کی جانچ انتظامی معاملات میں ہوشیاری اور تمیزداری کی کر لیا کرو۔ والاختبار فى بتبراء حاله فى المعرفة بالبيع والشرى وضبط اموره وحفظ ماله (جصاص) خطاب وہی یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے چل رہا ہے۔ ۴۳۵ (بغیر اُن کے عمر بلوغ کا انتظار کئے) من غير تأخير عن حد البلوغ (مدارک) فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا۔ یعنی بلوغ و آزمائش کے بعد اگر ان میں انتظام اور صرفِ مال کا سلیقہ پاؤ۔ یہاں دیکھنے کی چیز اُن کی صرف انتظامی صلاحیت ہو گی نہ کہ ان کی عبادت و تقویٰ۔ رُشْدًا۔ رشد یہاں سلیقہ مندی کا

اور انتظام کے مفہوم میں ہے۔ نہ کہ تقویٰ و ہدایت کے عام معنی میں۔ ای نوعا من الرشد وهو الرشد فی التصرف والتجارة (کشاف) وبین الرشد تبین اعنی الرشد المونس من الیتیم والرشد الذی اُوتی ابراهیم علیه السلام بون بعید (راغب) ای هدایة فی التصرفات وصلاحا فی المعاملات (مدارک) وتنکیر الرشد یفید ان المراد رشد مخصوص وهو الرشد فی التصرف والتجارة (مدارک) فاعتبار الدین فی دفع المال غیر واجب باتفاق الفقهاء لانه لو کان رجلا فاسقا ضابطا لاموره عالما بالتصرف فی وجوه التجارات لم یجز ان یمنع ماله لاجل فسقه (جصاص) ف٤٣٦ (اور اس وقت تو بہرحال اُن کے حوالہ کرنا ہی پڑے گا) ومایکبروا فیطالبوا باموالهم (جصاص) حدِ کبر میں داخل ہونے کے بعد جائداد بہرحال صحیح الحواس اصل مالک کو مل جائے گی خواہ رشد سے انتظامی صلاحیت حاصل ہوپائی ہو خواہ نہیں۔ سفہ و قلتِ عقل کے احکام الگ ہیں۔ فیها دلالة علی انه اذا صار فی حد الکبر استحق المال اذا کان عاقلا من غیر شرط ایناس الرشد (جصاص) اور حدِ کبر میں داخلی کی عمر امام ابوحنیفہؒ کے ہاں ۲۵ سال کی ہے کہ اس سن میں انسان دادا بن سکتا ہے۔ وجعل ابو حنیفة رح حد الکبر فی ذلك خمسا وعشرین سنة لان مثله یکون جدا ومحال ان یکون جدا ولا یکون فی حد الکبار (جصاص) بدارًا کے معنی جلدی کرنے کے ہیں۔ بدارًا ای مسارعة (راغب) بدارًا ای مبادرة (بخاری) ف٤٣٧ (جائدادِ یتیم میں تصرف سے) ومن کان غنیا۔ ذکر انھی اولیاء یتامٰی کا ہے۔ حکم ان کو مل رہا ہے کہ اگر وہ خوش حال ہیں تو

أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم
عزیز اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو انہیں بھی اس میں سے
مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾ وَلْيَخْشَ
(کچھ) دیدو اور اُن سے ہمدردی کی بات کہو ف٤٤١ اور ایسے لوگوں کو
الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا
ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے چھوٹے بچے چھوڑ جائیں تو ان کی
خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا
انہیں کیسی فکر رہے پس چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور بات پکی
سَدِيدًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ
کہیں ف٤٤٢ بیشک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں
ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَ
وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں ف٤٤٣ اور عنقریب وہ
ع ١٢ سَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ
دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے، اللہ تمہیں تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارہ میں حکم دیتا ہے ف٤٤٤
لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً
مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے ف٤٤٥ اور اگر دو سے زاید عورتیں (ہی)
فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ
ہوں ف٤٤٦ تو ان کے لئے دو تہائی (حصہ) اس (مال) کا ہے جو مورث چھوڑ گیا ہے ف٤٤٧ اور اگر

انہیں فیس، آنریریم وغیرہ کے نام سے کوئی رقم بھی یتیم کے مال میں سے نہ لینا چاہیے۔ بلکہ اسے محض حسبۃً للہ کرتے رہنا چاہیے۔ ف٤٣٨ یعنی بہ قدر اپنی ضرورت کے۔ ای بقدر الحاجة (ابن عربی) بقدر حاجته الضروریة (روح) یہ رقم، محققین حنفیہ نے صاف کر دیا ہے کہ بطور اُجرت کے نہ ہوگی کہ نگرانی تو ولی کے فرائض میں ہے اور معلوم ہے کہ ادائے فرائض پر اُجرت جائز نہیں۔ بلکہ یہ رقم تو الگ سے اللہ کی مقرر کی ہوئی ایک مد ہے۔ ان الرزق لیس باجرة لشیء وانما هو شیء جعله الله له (جصاص) فاخذ الاجرة للقاضی ولمن قام بشیء من امور الدین غیر جائز (جصاص) بالمعروف۔ یعنی یہ تدبیر کہ اس آمدنی سے خوب عیش کی زندگی بسر کرنے لگے۔ بلکہ صرف اتنا معاوضہ لے جتنا اس معاشرہ میں متعارف ہو۔ ف٤٣٩ یعنی یہ گواہوں کا حکم تو دنیوی ضابطہ کی تکمیل کے لئے دیا جا رہا ہے ورنہ حقیقۃً ہر خیانت اور ہر امانت کا علم تو اللہ کو ہے۔ فاذا دفعتم الیهم۔ یعنی جب بعد تحقق شرائط مذکور (بلوغ و قابلیتِ انتظام) یتیموں کے سپرد ان کی جائدادیں کرنے لگو۔ فاشهدوا علیهم۔ گواہ اس امر پر کہ یتیموں کا مال اُن کے سپرد کر دیا گیا۔ ف٤٤٠ یعنی یہ مورث کی رائے اور اختیار پر موقوف نہیں۔ حصوں کی ہر تقسیم اور ترکہ کا ہر استحقاق شریعتِ الٰہی کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔ یہ نہیں کہ جو روشن خیال جب جب چاہیں انھیں اور اس قانون میں قطع و برید کر کے رکھ دیں۔ للرجال نصیب ...... وللنساء نصیب۔ یعنی حقِ میراث مردوں عورتوں دونوں کو یکساں پہنچتا ہے۔ اس میں رد آگیا ان مذہبوں کا جنھوں نے عورت کو محض اس کے عورت ہونے کی بنا پر حقِ وراثت سے محروم رکھا ہے۔ ہندوؤں کی طرح جاہلیتِ عرب میں بھی عورتوں کا کوئی حصہ ہی نہ تھا۔ مما قل منه او کثر۔ منه میں ضمیر غائب ترکہ یا مال کی طرف ہے۔ والضمیر یعود الی ما ترك (مدارک) ف٤٤١ یعنی نرمی اور خوش اسلوبی سے معذرت کر دو۔ خشونت سے کام نہ لو۔ اذا حضر القسمة۔ یعنی جس وقت وارثوں کے درمیان تقسیم ترکہ ہو رہی ہو۔ ای قسمة الترکة (مدارک) اولوا القربٰی۔ ایسے عزیز مراد ہیں جن کا میراث میں کوئی حق نہیں۔ فی من لا یرث (مدارک) منه۔ ضمیر ترکہ کی طرف ہے۔ ای مما ترك الوالدان و الاقربون (مدارک) یہ تقسیم صرف بالغوں کے حصہ میں سے ہوگی۔ نابالغوں کے حصہ میں سے خیر و خیرات یا کسی کی مراعات جائز نہیں۔ فارزقوهم۔ اس میں بڑی بحث و گفتگو ہوئی ہے کہ یہ حاضر الوقت غیر وارثوں کو ترکہ میں سے دینے کا حکم وجوبی ہے یا محض استحبابی۔ تحقیق یہ ہے کہ یہ درجۂ استحباب کی چیز ہے۔ واجب نہیں ہے۔ اور اگر ابتدا میں واجب تھا بھی تو اب حکم وجوب منسوخ ہے۔ ابن عباسؓ صحابی، ابن جبیر تابعی، حسن بصری تابعی، اور محققین حنفیہ کا یہی مذہب ہے۔ قال ابن عباس رض وابن جبیر والحسن هو ندب (بحر)

...... هذا کله یوجب ان یکون اعطاء هؤلاء الحاضرین عند القسمة استحبابا لا ایجابا (جصاص) والصحیح ان هذا علی الندب (قرطبی) ف٤٤٢ (اور ان یتیموں کے حسبِ مصلحت) یعنی ان کی تعلیم، تادیب، تسلی، دلجوئی ہر پہلو کا لحاظ رہے۔ ذکروا بالنظر فی مصلحتهم (ابن عربی) القول السدید من الاوصیاء ان لا یؤذوا الیتامٰی ویکلموهم کما یکلمون اولادهم بالادب الحسن والترحیب (کشاف) مفسرین کا ایک گروہ اس طرف بھی گیا ہے کہ یہ خطاب اولیاء کو نہیں بلکہ قریب الموت شخص کے عزیزوں قریبوں کو ہے کہ وہ اسے سمجھائیں کہ اسے حق صرف ایک ثلث میں صدقہ کا ہے اور باقی مال مقررہ وارثوں کے لئے چھوڑ جائے۔ فلیتقوا الله۔ یعنی اللہ سے ڈرتے رہیں کہ کہیں خود ان کے چھوٹے یتیم بچوں کے ساتھ یہ معاملہ پیش آ کر رہے۔ ذریة ضعافا۔ ضعیف سے مراد بوڑھی نہیں، کمزور اور کم سن اولاد ہے۔ ای اولادا صغارا (معالم، جلالین) قولا سدیدا۔ یعنی سچی اور صحیح بات جس میں کوئی پہلو شر و فساد و اتلافِ حقوق کا نہ نکلتا ہو۔ هو العدل والحق الذی لا خلل فیه ولا فساد فی رجحان بوارث او حرمان لذی قرابة (جصاص) ف٤٤٣ خیانت، غصب، بددیانتی ہر صورت میں بُری ہیں، یتیموں کے مال میں ان کا وقوع قبیح تر ہے۔ یاکلون اموال الیتامٰی۔ یاکلون سے مراد یتیم کا مال کسی طریقہ سے بھی بے جا صرف میں لے آنا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ صرف کھانے ہی کے کام میں لائے۔ اردو محاورہ میں بھی روپیہ "کھا جانا" ایسے موقع پر بڑے وسیع معنی میں آتا ہے۔ خص الاکل بالذکر لانه اعظم ما یبتغی له الاموال (جصاص) انما ...... نارا۔ یعنی اس حرام خوری کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ف٤٤٤ ترکہ کی تقسیم اجتماعی و معاشرتی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کی عادلانہ تقسیم پر معاشرہ کی فلاح و بہبود کا بہت کچھ مدار ہے۔ اور وہ نام نہاد آسمانی کتابیں دنیا کے ہدایت نامہ کی حیثیت سے کامل نہیں ناقص ہیں۔ جو ایسے اہم مسئلہ کی تفصیلات سے خالی ہوں۔ یوصیکم الله۔ اب تصریح سے یاد دلا دیا کہ یہ احکام کسی بندہ کے تجویز کئے ہوئے نہیں، حکیم مطلق اور عالم الغیب حاکم برحق کے ارشاد کئے ہوئے ہیں۔ ف٤٤٥ یہ ایک عام اصل بیان کر دی کہ ہر لڑکے کو دوہرا اور ہر لڑکی کو اکہرا حصہ ملے گا۔ خواہ لڑکا اور لڑکی ایک ایک ہوں یا کئی۔ حظ الانثیین۔ دنیا کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی شریعتیں ایسی ہیں جن میں لڑکی کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں اور عرب جاہلیت میں بھی ترکہ کے حصہ دار صرف مرد (اور مردوں میں بھی بالغ اور قابلِ حرب مرد) تھے۔ ایسے قانون کا ظالمانہ اور خلافِ فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے لیکن اب اس کے ردِ عمل کے طور پر بعض حلقوں

جو یہ عدل الٰہی ہے کہ مرد و عورت کا حصہ مساوی ہونا چاہیئے یہ دوسری بے اعتدالی اور افراط کی جگہ تفریط ہے۔ عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضویاتی فرائض نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت نسل کے ساتھ ساتھ اس پر فکر معاش کی ذمہ داریاں بھی ڈال دی جائیں۔ قدرت نے اور اس لئے صحیح اور سچی شریعت نے اس کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے۔ گھر اور خاندان کا خرچ چلانا اس کے سر رکھا ہے۔ اس لئے یہ ظلم نہیں عین عدل ہے کہ ترکہ میں اسے حصہ بھی بڑا ملے۔ پھر ہر شادی شدہ عورت کو حصول میراث کے موقع پر دُہرے حصے حاصل رہتے ہیں۔ ایک ادھر میکہ میں باپ کے ترکہ میں سے حصہ، دوسرا اُدھر سسرال میں شوہر کے ترکہ میں سے حصہ۔ اس طرح صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی عورت گھاٹے میں نہیں رہتی۔ ۴۴۶ دیا صرف دو ہی اولاد میں) اِنْ كُنَّ نِسَآءً۔ یعنی اگر وارث صرف لڑکیاں ہی ہوں۔ فَوْقَ اثْنَتَيْنِ۔ فوق کے معنی یہاں لازمی طور پر "زائد" کے نہیں۔ یہ صلہ محاورۂ عرب میں اکثر زائد بھی آجاتا ہے اور خود قرآن مجید میں بھی اس کے زائد استعمال کی مثالیں موجود ہیں مثلاً فاضربوا فوق الاعناق ان ذکر فوق ھھنا صلة للکلام (جصاص) ۴۴۷ لڑکیاں اگر صرف

وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا

ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لئے نصف (حصہ) ہے ۴۴۸، اور مورث کے والدین یعنی ان دونوں میں ہر ایک

السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ

کے لئے اُس (مال) کا چھٹا حصہ ہے جو وہ چھوڑ گیا ہے ۴۴۹ بشرطیکہ مورث کے کوئی اولاد ہو ۴۵۰ اور اگر مورث

لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ

کے کوئی اولاد نہ ہو اور اسکے والدین ہی اسکے وارث ہوں تو اسکی ماں کا ایک تہائی ہے ۴۵۱، لیکن اگر مورث

لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ

کے بھائی بہن ہوں تو اسکی ماں کیلئے ایک چھٹا حصہ ہے ۴۵۲ وصیت ۴۵۳ نکالنے کے بعد کہ مورث اس کی

بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ

وصیت کر جائے یا ادائے قرض کے بعد ۴۵۴ تمہارے باپ ہوں کہ تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے ہو کہ ان میں سے

اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا

نفع پہنچانے میں تم سے قریب تر کون ہے ۴۵۵، یہ سب اللہ کی طرف سے مقرر ہے، بیشک اللہ ہی علم والا ہے،

حَكِيْمًا ⑪ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ

حکمت والا ہے ۴۵۶ اور تمہارے لئے اُس (مال) کا آدھا حصہ ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں بشرطیکہ ان کے

يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ

کوئی اولاد نہ ہو ۴۵۷ اور اگر ان کے اولاد ہو تو تمہارے لئے بیویوں کے

الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ

ترکہ کی چوتھائی ہے ۴۵۸ وصیت (نکالنے) کے بعد جس کی وہ وصیت کر جائیں

دو ہوں تو ان کا کل حصہ $\frac{2}{3}$ ہونا ظاہر ہے ہر ایک کو $\frac{1}{3}$ کے حساب سے۔ لیکن یہ شرح یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ تین کو $\frac{3}{3}$ یعنی کُل کا کُل نہیں مل جائے گا۔ بلکہ لڑکیاں جتنی بھی ہوں ان کا مجموعی حصہ ترکہ کا $\frac{2}{3}$ ہی رہے گا۔ باقی $\frac{1}{3}$ میں اور اعزہ خاص شریک ہوں گے تفصیل فرائض کی کتابوں میں ملیگی۔ ۴۴۸ (کل ترکہ کا)۔ اور بقیہ نصف حصہ میں دوسرے متعین اعزہ شریک ہوں گے۔ لیکن اگر وہ نہ موجود ہوئے تو پھر وہ نصف بھی اسی لڑکی کی طرف عود کر آئے گا۔ ۴۴۹ اور بقیہ $\frac{5}{6}$ اولاد اور دوسرے وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ ۴۵۰ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اور خواہ تعداد میں ایک ہو یا زائد۔ ۴۵۱ (اور بقیہ دو تہائی باپ کا) وَوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ۔ یعنی علاوہ اولاد کے بھائی بہن بھی نہ ہوں، صرف ماں باپ ہی وارث ہوں۔ ۴۵۲ (اور بقیہ $\frac{5}{6}$ حصہ باپ کا) باپ کے باعث بھائی بہنوں کو نہ ملے گا۔ اِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ۔ یہ بھائی بہن خواہ سگے ہوں یا سوتیلے۔ یہ وہ صورت ہے کہ میت کے اولاد کوئی نہیں۔ لیکن ماں باپ بھی ہیں اور بھائی بہن بھی۔ اخوۃ۔ کا لفظ یہاں بھائی بہن دونوں کے لئے ہے۔ صیغۂ مذکر قاعدہ زبان کے مطابق محض تغلیباً لایا گیا ہے۔ ۴۵۳ (اگر کچھ ہو) وارثوں کو حصہ اس وقت ہوگا جب پہلے مورث کا قرض ادا ہولے اور اگر وہ ایک ثلث جائداد سے متعلق کچھ وصیت کر گیا ہے تو اس وصیت کا اجرا ہولے۔ فقہاء نے یہاں دو قاعدے اور بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ قرض اور وصیت میں ادائے قرض مقدم ہے۔ گو قرآن مجید میں لفظ وصیت پہلے مذکور ہے۔ الدین مؤخر فی اللفظ وھو مبتدأ بہ فی المعنی علی الوصیة (جصاص) انما قدمنا الدین علی الوصیة لقولہ علیہ السلام الا ان الدین قبل الوصیة (مدارک) دوسرے یہ کہ ادائے قرض اور اجراء وصیت ان دونوں سے بھی پہلے مورث کی تجہیز و تکفین کیلئے خرچ نکالنا ضروری ہے۔ ۴۵۴ یعنی نفع دنیوی ہو یا اخروی تمہیں کون زیادہ پہنچا سکے گا! اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ۔ اٰبآؤکم کے تحت میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا، پردادا، اوپر کے سارے اصول آگئے۔ اسی طرح ابناءکم کے تحت میں نہ صرف صلبی بلکہ اولاد در اولاد نیچے کے سارے فروع آگئے۔ یہاں یہ جتا دیا ہے کہ ترکہ کی تقسیم مورث کی رائے و اجتہاد پر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ حکیم و خبیر حاکم مطلق نے خود ہی سب قاعدے ضابطے مقرر کر دیئے ہیں۔ آیت سے حسن معاملت کے ساتھ ساتھ حسن معاشرت کی بھی تعلیم نکل آئی۔ انسان کو چاہیے کہ شفقت و رحمت اور حسن سلوک اپنے سارے بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ رکھے۔ اُسے کیا خبر کہ کون اُس کے زیادہ کام آکر رہے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ۴۵۵ اور اللہ کے علم و حکمت سے بھلا کسی بندہ کی فہم و دانش کو کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟ آیت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ احکام میراث کے باب میں قرآن مجید کو کس درجہ تاکید اور اہتمام منظور ہے۔ شروع یوصیکم اللہ سے کیا، اور آیت کے خاتمہ پر پھر دُہری دُہری بلکہ تہری تہری تصریح و تاکید موجود ہے ــــ اور پھر آج لوگ بھی ٹھیک اس کے مقابل غفلت اور بے پروائی میں کس قدر پڑے ہوئے ہیں۔ كَانَ یہاں ماضی کے معنی میں نہیں، بلکہ دوام و استمرار کے اظہار کے لئے ہے فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ چند حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں میراث جاری نہ ہوگی مثلاً (۱) وارث مرتد ہو جائے (۲) وارث اپنے مورث کے قتل عمد کا مجرم ہو۔ (۳) وارث جا کر دار الحرب میں قیام اختیار کرلے۔ تفصیل ان موانع میراث کی، فقہ و فرائض کی کتابوں میں ملے گی۔ ۴۵۶ (تم سے نہ کسی اور شوہر سے) ظاہر ہے کہ اتنے جز میں خطاب شوہروں سے ہے۔ ۴۵۷ (اور بقیہ $\frac{1}{2}$ دوسرے وارثوں کا حصہ ہے) بیوی کے ترکہ میں $\frac{1}{2}$ حصہ شوہر کا ہر صورت میں ہے۔ خواہ بیوی کوئی اولاد چھوڑے یا نہ چھوڑے۔ اِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ۔ یہ اولاد خواہ تم سے ہو یا پہلے شوہر سے

ف٤٥٨ حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ میراث کی تقسیم ہر حال میں اجرائے وصیت اور ادائے قرض کے بعد ہی ہوگی اور ان دونوں میں بھی ادائے قرض مقدم ہے۔ ف٤٥٩ اور بیویاں اگر کئی ہوں تو شوہر کے ترکہ کی وہی چوتھائی سب میں برابر تقسیم ہو جائے گی۔ ف٤٦٠ (اور شوہر کے ترکہ کا بقیہ ¾ دوسرے وارثوں کی طرف جائے گا) بیویوں کو ¼ بہر صورت ملے گا خواہ اولاد ہو یا نہ ہو۔ اِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ۔ یہ اولاد خواہ انہی بیویوں سے ہو یا کسی اور عورت سے۔ ف٤٦١ (اور بقیہ ⅞ حصہ دوسرے وارثوں کی طرف جائے گا) فَهُمْ شُرَكَآءُ۔ یہ شرکت برابری کی رہے گی یعنی مذکر و مونث کا حصہ برابر کا رہے گا۔ كَلٰلَةً۔ اردو میں اس کے لئے کوئی ایک لفظ موجود نہیں۔ کلالہ عربی میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ باپ دادا میں سے کوئی موجود ہو اور نہ اولاد، اولاد در اولاد میں سے۔ ف٤٦٢ یعنی مورث کسی وارث کو نقصان نہ پہنچائے نہ عملاً نہ ارادۃً۔ عملاً کی مثال یہ کہ وصیت ⅓ سے زائد کی کر دی۔ ایسی وصیت قانونِ شریعت کے خلاف ہونے کی بنا پر ناقابلِ نفاذ ہوگی۔ ارادۃً یہ کہ وصیت رکھے تو ⅓ کے اندر ہی۔ لیکن نیت و مقصود یہ ہو کہ وارث کا حصہ کٹ جائے۔ ایسی وصیت کا نفاذ قانونی تو ہو جائے گا۔ لیکن وصیت کرنے والا عنداللہ گنہگار ٹھہرے گا۔ اسلام اپنے پیرووں سے قدم قدم پر عمل کے ساتھ ساتھ نیت کا بھی اخلاص و صداقت چاہتا ہے۔ ف٤٦٣ ختم کے قریب پھر یاد دلا دیا کہ یہ سارا قانونِ میراث شریعت کے ہر دوسرے حکم کی طرح حاکمِ مطلق اور حکیم برحق کا نازل کیا ہوا ہے۔ کسی انسانی عقل و دماغ کا سوچا ہوا کسی کونسل کمیٹی مجلس کا وضع کیا ہوا نہیں جو آج پاس ہو اور کل اس میں ترمیم ہو جائے۔ ف٤٦٤ چنانچہ علمِ کامل کی بنا پر وہ خوب واقف ہے کہ کون اس قانون پر عامل ہے اور کون اس سے منحرف۔ اور حلمِ کامل کے اقتضاء سے بہت دفعہ مجرموں کی گرفت وہ فوراً نہیں کرتا۔ ف٤٦٥ (جنہیں ہلکا سمجھنا خود اپنے کو خدائی عدالت میں مجرم بنانا ہے) تِلْكَ کا اشارہ اُن تمام احکام کی جانب ہے جو یتیموں اور وصیتوں اور ترکہ کے باب میں ابھی گزر چکے ہیں۔ اشارة الى الاحكام التى ذكرت فى باب اليتامى والوصايا والمواريث (مدارک)

أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن
یا ادائے قرض کے بعد ٤٥٨ اور ان (بیویوں) کے لئے تمہارے ترکہ کی چوتھائی ہے ٤٥٩ بشرطیکہ تمہارے کوئی

لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا
اولاد نہ ہو لیکن اگر تمہارے کچھ اولاد ہو تو ان (بیویوں) کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ

تَرَكْتُم ۚ مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَ
ملے گا ٤٦١ بعد وصیت (نکالنے) کے جس کی تم وصیت کر جاؤ یا ادائے قرض کے بعد۔ اور

إِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ
اگر کوئی مورث مرد ہو یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی

أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا
یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کیلئے ایک چھٹا حصہ ہے اور اگر یہ لوگ اس

أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِن بَعْدِ
سے زائد ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے بعد وصیت (نکالنے)

وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً
کے جس کی وصیت کر دی جائے یا ادائے قرض کے بعد بغیر کسی کے نقصان پہنچائے ٤٦٢ یہ حکم اللہ کی طرف

مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾ تِلْكَ حُدُودُ
سے ہے ٤٦٣ اور اللہ بڑا علم والا ہے۔ بڑا بردبار ہے ٤٦٤ یہ سب خداوندی ضابطے ہیں ٤٦٥

اللَّهِ ۚ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ
اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی (پوری) اطاعت کریگا اللہ اسے (بہشت کے) باغوں میں داخل

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ

کرے گا، جسکے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اور یہ

الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ

بڑی کامیابی ہے[٤٦٦] اور جو کوئی اللہ اور اسکے رسولؐ کی نافرمانی کریگا اور اس کے

یَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا ۪ وَ لَهٗ

ضابطوں کو حدود سے باہر نکل جائیگا اسے وہ دوزخ کی آگ میں داخل کریگا اس میں وہ ہمیشہ ہمیش،

ع ٢ ١٣ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۱۴﴾ وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ

برا ہے[٤٦٧] اور ذلت دینے والا عذاب ہوگا، اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں[٤٦٨]

نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ

ان پر چار (آدمی) اپنے میں سے گواہ کرلو سو اگر وہ

شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ

گواہی دیدیں تو ان (عورتوں) کو گھروں کے اندر بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کا

الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَ الَّذٰنِ

خاتمہ کردے[٤٦٩] یا اللہ ان کے لئے کوئی (اور) راہ نکال دے[٤٧٠] اور تم میں سے کوئی

یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا

دو جو وہ کام کریں انہیں اذیت پہنچاؤ[٤٧١] پھر اگر دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں[٤٧٢]

فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

تو ان سے تعرض نہ کرو[٤٧٣] بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ بڑا مہربان ہے[٤٧٤]

٤٦٦ اور یہ فوزِ عظیم جس اطاعت کامل پر مشروط ہے اس کے اندر اس قانونِ میراث کی پابندی بھی آگئی۔ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت سے مُراد اُس قانون کی پابندی ہے جو اللہ کا اُتارا ہوا اور رسولؐ کا لایا ہوا ہے۔ ٤٦٧ یہ عذاب دائمی بھی ہوگا اور مُعذّب کے حق میں ذلّت آفرین بھی۔ اس عذاب کے مورد کافر ہی ہوں گے۔ یَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ۔ یعنی حد سے اس قدر باہر نکل جائے، کہ ان احکام کے احکامِ الٰہی ہونے ہی سے انکار کردے۔ الکافر ھوالذی تعدّی الحدود کلھا (مدارک) ای یتعدحد ودہ استحلالا (مدارک عن الکلبی) وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ میں معصیت سے مُراد معصیتِ کفر و شرک ہے۔ فسر الضحاک ھذا المعصیۃ بالشرک وقال الکلبی ومن یعص اللہ یکفرہ (مدارک) ٤٦٨ یعنی زنا کے مرتکب ہوں۔ اَلْفَاحِشَةَ۔ فاحشہ قولی و فعلی ہر بڑی بُرائی کے لئے عام ہے۔ الفاحشۃ ما عظم قبحہ من الافعال والاقوال (راغب) الفعلۃ القبیحۃ (کبیر)

یہاں مُراد زنا ہے۔ کنایۃ عن الزنا (راغب) واجمعوا علی ان الفاحشۃ ھٰھنا الزنا (کبیر) استعملت کثیرًا فی الزنا لانہ من اقبح القبائح وھو المراد علی الصحیح (روح) نِسَآىٕكُمْ۔ نساء ہر عورت کے لئے عام ہے یہاں مُراد بیویاں ہیں۔ ٤٦٩ زنا کی ایک سزا ابتداءِ اسلام میں عمر قید یا دائم الحبس تھی۔ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ۔ اَرْبَعَةً۔ اول تو نصابِ شہادت اس معاملہ میں دوگنا ہے یعنی جہاں مسلمان مرد یا عورت کی عزت کا سوال ہے، گواہوں کی تعداد بجائے دو کے چار ہونا چاہیئے اور پھر یہ چاروں، (۱) مسلم ہوں غیر مسلم نہ ہوں (۲) آزاد ہوں، غلام نہ ہوں (۳) عاقل ہوں، فاتر العقل نہ ہوں (۴) بالغ ہوں، نابالغ نہ ہوں (۵) گواہی چشم دید دیں۔ سماعی یا قیاسی شہادت کا یہاں دخل نہیں۔ فَاَمْسِكُوْهُنَّ یہ قید حکام یا اہلِ حل و عقد کے حکم سے ہونا چاہیئے۔ ھٰذا الخطاب للحکام (معالم) فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ یعنی گھروں کے اندر انہیں قید یا نظر بند کردو۔ بعض ظالموں نے جو اس سے پردہ مُراد لیا ہے انہوں نے اپنی عقل و فہم پر ظلم کیا ہے۔ فاحبسوھن فی البیوت واجعلوھا سجنًا علیھن (بیضاوی) ٤٧٠ (اپنے رسولؐ پر وحی کے ذریعہ سے) فقرہ خود اس پر دلالت کر رہا ہے کہ گھروں کے اندر دائمی نظر بندی کی سزا عارضی تھی اور آئندہ کوئی دوسری سزا تجویز ہونے والی ہے چنانچہ کچھ روز بعد سورۃ النور میں قرآن ہی کے ذریعہ سے دوسری سزا تجویز ہوئی۔ یعنی زانی مرد اور زانی عورت دونوں کے لئے سَو سَو تازیانے۔ اور سنتِ رسولؐ نے اس کی مزید تشریح یہ کی کہ یہ سزا کنخدا کے لئے ہے اور بیاہے ہوؤں کے لئے جرم کی سزا سنگساری ہے۔ وھٰذا کلہ کان قبل نزول الحد و نسخت بالجلد والرجم والجلد فی القرآن والرجم فی السنۃ (معالم) ٤٧١ یعنی سزا اس جرم کے سارے مجرموں کے لئے ہے۔ بہت سی قومیں اپنے کو مہذب کہلانے والی آج بھی موجود ہیں جن کے ہاں حرام کاری (جب تک کہ جبر نہ ہو) سرے سے قابلِ تعزیر ہی نہیں۔ بہت سی قوموں میں حرام کاری صرف شادی کے بعد ہے۔ بن بیاہوں اور بن بیاہیوں کے لئے یہ کوئی جرم ہی نہیں۔ آیت ان سارے غلط و گمراہ کن نظریات کی تردید کر رہی ہے۔ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا۔ میں ھا کی ضمیر فاحشۃ کی طرف ہے یعنی کوئی بھی جوڑا جو حرام کا مرتکب ہو۔ اس عموم میں ہر طرح کے مرتکب آگئے، بیاہے اور کنوارے، مرد و عورت سب بجز فاتر العقلوں کے۔ فَاٰذُوْهُمَا۔ اجراء سزا کا یہ حکم حکام یا اہلِ حل و عقد کو ہے۔ الخطاب ھٰذا للحکام (روح) ٤٧٢ (اجرائے سزا کے بعد) جن جرائم کی حد شرعی مقرر ہے ان میں اجرائے حد سے قبل توبہ کافی نہیں۔ ٤٧٣ یعنی مجرم جب سزا بھی بھگت چکا اور اب تائب بھی ہے تو اب اس پر مزید طعن و ملامت وغیرہ جائز نہیں۔

۴۷۴ اسلام کا خدا محدود و مقید قسم کا خدا نہیں کہ مغفرتِ ذنوب پر قادر ہی نہیں بلکہ کائنات میں گویا مشین کی طرح ایک قانون مکافاتِ عمل کی حکومت ہے اور خدا (نعوذ باللہ) بیٹھا ہوا منہ دیکھ رہا ہے۔ یا اگر مغفرت پر قادر ہے بھی جب بھی کفارہ کا محتاج ہے۔ ہندومت، مسیحیت وغیرہ تمام باطل ادیان کی تردید آیت سے ہوگئی۔ ۴۷۵ جو طبائع غیر سلیم ہیں۔ اُن کے لئے ہر قسم کی بدعملی کی گنجائش آیت ماقبل سے نکل سکتی تھی اور وہ اپنے دل میں کہہ سکتے تھے کہ جب توبہ قبول ہو ہی جائے گی تو پھر اطمینان سے ہم ہر قسم کے فسق و فجور میں پڑے رہ سکتے ہیں۔ جب مرنے لگیں گے، توبہ کرلیں گے۔ اس خدشہ کے دُور کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ قبول توبہ کے قیود و شرائط کو صاف کر دیا جاتا۔ اَلسُّوْٓءَ لفظ جامع ہے گناہ کبیرہ اور صغیرہ دونوں کیلئے۔ ای المعصیۃ صغیرۃ او کبیرۃ (روح) اَلتَّوْبَۃُ توبہ کی حقیقت شریعت میں یہ ہے کہ ماضی پر ندامت ہو اور مستقبل کے لئے ترکِ معصیت کا عزم ہو اور یہاں توبہ سے مراد قبول توبہ ہے۔ التوبۃ عبارۃ عن الندم علی ما مضی والعزم علی الترک فی المستقبل (کبیر) ای ان قبولھا (مدارک) بِجَهَالَةٍ مراد یہ ہے کہ معصیت کے ارتکاب کے وقت اس کے نتائج کا ذہن سے ذہول ہوگیا ہو اور عقل شدتِ جذبات (یا ہوائے نفس) سے اندھی ہوگئی ہو۔ عَلَى اللّٰهِ اہلِ حق کا مذہب ہے کہ اللہ پر حقیقۃً واجب تو کوئی بھی چیز نہیں۔ یہاں مقصود صرف وعدہ کی تاکید ہے۔ ولیس المراد بہ الوجوب اذ لا یجب علی اللہ شیء۔ ولکنہ تاکید للوعد (مدارک) ۴۷۶ معصیت پر ندامت اور اس کے ترک کا عزم، عمل معصیت کے بعد جس قدر جلد بھی ہو سکے اس کا مطلوب ہونا ظاہر ہے۔ لیکن شریعت نے انتہائی شفقت سے کام لیکر اس قرب (من قریب) کی میعاد حضورِ موت سے قبل تک وسیع کر دی ہے۔ صحابیوں اور تابعین سے یہی مروی ہے۔ والقریب فی ما بینہ وبین ان ینظر الی ملک الموت (ابن جریر۔ عن ابن عباسؓ) کل شیء قبل الموت فھو قریب (ابن جریر۔ عن الضحاک) وھو ما قبل حضرۃ الموت (مدارک) دوسرے معنی یہ کئے گئے ہیں اور یہ معنی بھی لگتے ہوئے ہیں کہ قبل اس کے کہ برائی نفس پر چھا جائے۔ اور نیکیوں کو سوخت کر جائے۔ معناہ قبل ان یحیط السوء بحسناتہ فیحبطھا (معالم) مِنْ قَرِيبٍ میں من تبعیض کے لئے ہے۔ معناہ التبعیض ای یتوبون بعض زمان قریب (کشاف) ۴۷۷ یعنی وعدۂ مغفرت مرتب ایسے ہی لوگوں کی توبہ پر ہوتا ہے۔ ۴۷۸ سو وہ اپنی شانِ علم سے خوب جانتا ہے کہ کس کس نے دل سے توبہ کی ہے اور اپنی شانِ حکمت سے دل سے توبہ نہ کرنے والے کو بھی رُسوا نہیں کرتا، اور تائب مخلص ہو یا غیر مخلص، بہرصورت اس کے لئے مزید ملامت روا نہیں رکھتا۔ ۴۷۹ یعنی ایسے لوگوں سے قبول توبہ کا وعدہ نہیں۔ باقی اگر اور کسی کے ساتھ محض فضل و کرم ہی کا معاملہ کرنا چاہے تو اس کی راہ میں حائل کون ہو سکتا ہے۔ ۴۸۰ (اور عالم برزخ اس پر منکشف ہونے لگے) یعنی حالت نزع و سکرات شروع ہو جائے کہ اب عذاب و ملائکہ عذاب کے مشاہدہ کے بعد جو توبہ ہوگی وہ اضطراری ہوگی اور اس لئے کسی درجہ میں بھی مقبول نہیں۔ اَلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ معصیت کا صدور اگر ایک ہی آدھ بار ہو لیکن اس سے توبہ نہ کی جائے تو اس کا شمار بھی اصرار علی المعصیت میں ہوگا، اور یہ عمل گناہ متواتر کرتے رہنے کے حکم میں داخل ہوگا۔ سَيِّاٰتِ۔ یہ صیغہ جمع لانے سے یہ لازم نہیں کہ گناہوں کی مختلف قسمیں صادر ہوتی رہیں بلکہ ایک ہی معصیت کی عرصہ دراز تک تکرار اسے صیغہ جمع میں لانے کے لئے کافی ہے۔ جمعت باعتبار تکرر وقوعھا فی الزمان المدید (روح) ۴۸۱ کافر کے ایمان کا مرتے وقت نامقبول رہنا تو اوپر کے فقرہ میں شامل تھا مزید تصریح شاید تاکید اور مزید تقبیح کے لئے ہو۔ ۴۸۲ عرب جاہلیت میں میت کی جائداد کی طرح اس کی بیویاں بھی وارث کے قبضہ میں آجاتی تھیں اور یہی دستور یونانی تمدن اور رومی تمدن میں بھی رہ چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی) پھر مرد اگر چاہتا تو ان سے جبراً یا خود نکاح کرلیتا یا دوسروں کے نکاح میں دیدیتا۔ تَرِثُوا النِّسَآءَ یہیں بیویوں کے جسم کا مالک ہونا بھی آگیا اور ان کے مال جائداد کا بھی۔ عورتوں کے مال کے مالک ہو جانے کی تین صورتیں مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے کہ عرب میں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ عورت کا جو حق شرعی میراث میں نکل رہا ہو اسے خود لے لیا جائے اور اُسے نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو نکاح نہ کرنے دیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے اور اس کے مال پر قبضہ کرلیا جائے۔ تیسرے یہ کہ خاوند اپنی بیوی کو بلا وجہ مجبور کر دے کہ اسے کچھ مال دے جب یہ اسے چھوڑے۔ دنیا بد اخلاقی اور بدعملی کی کتنی مختلف صورتوں میں مبتلا تھی اور اسلام نے آکر کن کن چیزوں کی اصلاح کی ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے وہ تو بس انہی لوگوں کی ہے جو بُری حرکت

بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ

نادانی سے کر بیٹھتے ہیں، اور پھر قریب ہی (وقت میں) توبہ کرلیتے ہیں ایسے ہی لوگوں کی

يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا

توبہ اللہ قبول کرتا ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا

حَكِيْمًا ۱۷ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ

حکمت والا ہے اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو (برابر) گناہ کرتے

السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ

رہیں یہاں تک کہ موت ان میں سے کسی کے سامنے آکھڑی ہو

قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَ

(اور تب) وہ کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، اور نہ ان لوگوں (کی توبہ) جو اسی حال میں مر

هُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۱۸

ہیں کہ وہ کافر ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا

اے ایمان والو تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم عورتوں کے جبراً مالک

النِّسَاۗءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ

ہو جاؤ اور نہ انہیں اس غرض سے قید رکھو کہ تم نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے

۴۸۳ ؎ (گر جب البتہ عورتوں کو قید رکھنا یا اُن سے کچھ مال وصول کرنا جائز ہوگا) ایک دستورِ عرب جاہلیت میں یہ بھی تھا کہ مالدار بیوی کو وارث اس خیال سے کہیں نکاح نہ کرنے دیتے کہ یہ اپنا مال اپنے ساتھ لے جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ مجبور و محبوس بیوہ اس کے گھر میں اپنی جان دیدیتی۔ یا پھر اسے اپنا مال و متاع حوالہ کرکے اپنی جان چھڑاتی۔ "اس مضمون میں بھی تین صورتیں آگئیں۔ ایک یہ کہ میت کا وارث اس میت کی بیوی کو نکاح نہ کرنے دیتا تاکہ ہم کو یہ کچھ دے۔ دوسرے یہ کہ خاوند اس کو مجبور کرتا کہ مجھ کو کچھ دے تب چھوڑوں۔ تیسرے یہ کہ خاوند طلاق دینے کے بعد بھی اس سے کچھ لئے بغیر اس کو نکاح نہ کرنے دیتا" (تھانویؒ)۔ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ۔ یعنی جو چیزیں خود تم نے دی ہوں یا تمہارے قرابت والوں نے۔ فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ اس سے مُراد زنا کاری ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ وھو الزنا (ابن جریر عن السدی) ای الزنا (ابن الجریر عن الحسن) لیکن دوسرے معنی شوہر کی نافرمانی کے بھی ائمہ فن سے منقول ہیں۔ وھو النشوز (ابن جریر عن ابن عباسؓ) وھو النشوز (ابن جریر عن قتادۃ) محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ لفظ زنا کاری اور نافرمانی دونوں مفہوموں کا جامع ہے۔ کل فاحشۃ من بذاءۃ باللسان علی زوجھا واذی لہ و زنا بفرجھا (ابن جریر) خلاصہ یہ کہ سوء معاشرت کا سبب اُن بیویوں کا پیدا کردہ نہ ہو۔ ای الاان یکون سوء العشرۃ من جھتھن (کشاف)

۴۸۴ ؎ قرآن مجید کا یہ ایک عام اسلوب بیان ہے کہ جزئیاتِ احکام کے درمیان ایک کُلی مسئلہ بھی بیان کردیتا ہے اور کلیات کے ضمن میں جزئیات بھی لے آتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہے کہ جزئی احکام بیان کرتے کرتے اُس نے ایک اہم اصل بیان کردی عورتوں کے ساتھ معاشرت کی۔ یہ حسن معاشرت کا مرکزی، بنیادی، کلیدی حکم سہاگنوں، بیواؤں، طلاقنوں سب کے معاملہ میں واجب العمل ہے۔ اور یہ ہدایت اس مذہب کی ہے جو کتنے ہی کور چشم مسیحیوں، آریوں وغیرہ کے نزدیک عورت کے حق میں ظالمانہ ہے۔ ۴۸۵ ؎ (حال یا مستقبل میں) شکایت کرنے والے شوہروں کو اپنی تسکین و تسلی کے لئے اس مراقبہ سے بڑھ کر اور کون خیال ہوسکتا ہو۔ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ خیر کے اندر دنیوی و اخروی، عاجل و آجل ہر قسم کی فلاح اور بھلائی آگئی۔ محض خیر ہی نہیں خیر کثیر (بھلائیوں کا ایک ڈھیر۔ ایک انبار) کہ اس سے زیادہ تسکین دہ اور کون خیال ہوسکتا ہے؟ اِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ۔ یہاں وہ کراہت مراد ہے جو طبعی طور پر یا خواہ مخواہ ہو۔ نہ کہ کوئی ایسا قابل شکایت امر جس کے اندر عورت کا ارادی قصور شامل ہو۔ ۴۸۶ ؎ بلا اس کے کہ اس پہلی بیوی کا کوئی قصور ہو۔ یعنی محض اپنی رغبت و خواہش سے تم ایک بیوی چھوڑ کر دوسری کرنا چاہتے ہو۔ ۴۸۷ ؎ (اور اس طرح اقرار کئے ہوئے مال کو روک بھی مت رکھو) اِحْدٰىهُنَّ یعنی اس پہلی بیوی کو جسے اب چھوڑ رہے ہو۔ قِنْطَارًا۔ کے معنی مال کے انبار کے ہیں۔ القنطار المال العظیم (کبیر، کشاف) اس پر ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ حدیث میں تو مہر کی زیادتی کی ممانعت آئی ہے لیکن خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ نے ایک بار مسجد میں سرِ منبر گو پہلے مہر کی زیادتی سے روکا لیکن ایک ضعیفہ کے ٹوکنے پر اس کا جواز بھی تسلیم کرلیا اور خود اس آیت سے بھی ڈھیروں مال کا جواز ثابت ہو رہا ہے؟ سوال کا ایک مشہور جواب تو امام رازیؒ کے قلم و دماغ سے ہے یعنی آیت سے جواز کہاں ثابت ہوا؟ آیت نے تو محض ایک مفروض و مشروط حالت کا ذکر کیا ہے کہ اگر تم ڈھیروں مال دے چکے ہو جب بھی اس کی واپسی کا مطالبہ درست نہیں۔ اس سے اُس مفروضہ یا شرط کا صحیح ہونا تو لازم نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے بھی صاف، دلنشین اور بے تکلف جواب ہمارے زمانہ کے امام شریعت مفسر تھانویؒ کے قلم سے نکلا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "یہ جواز مفہوم من القرآن بمعنی صحت نفاذ ہے۔ اور حدیث میں جواز بمعنی اباحت مطلقہ و عدم کراہت کی نفی ہے۔ پس کچھ تعارض نہیں۔ اور حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ میں زیادہ مہر کے جواز کو مان لینا اس لئے تھا کہ سامعین اس کو حرام نہ سمجھنے لگیں پس اس سے کراہت کا عدم ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ پر کوئی اعتراض لازم آتا ہے۔" ۴۸۸ ؎ یعنی بلا وجہ واپس لوگے تو یا تو صریح ظلم کے مرتکب ہوگے اور یا پھر بات بنانے کیلئے عورت پر کوئی جھوٹا سنگین الزام۔ زنا کاری یا نافرمانی کا لگانا ہوگا۔ ۴۸۹ ؎ نکاح کے وقت کہ تم مہر ادا کروگے۔ مِيْثَاقًا غَلِيْظًا۔ یعنی عہد مستحکم۔ وصفہ بالغلظ لقوتہ وعظمہ (کشاف) عھدًا وثیقًا (مدارک) وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ۔ یعنی جب انہوں نے اپنا جسم تمتع و تلذذ کیلئے تمہارے سپرد کردیا تو اب مہر ان سے واپس لینا یا اسے انہیں ادا نہ کرنا بڑی بے حمیتی بلکہ کم ظرفی کی بات ہے۔ افضٰی افضاء لغۃً خلوت صحیح اور اصل عمل صحبت دونوں کو شامل ہے۔ حنفیہ نے مُراد خلوت صحیح لی ہے۔ افضٰی الی امراتہ ای خلا بھا (راغب) قال الکلبی الافضاء ان یکون معہا فی لحاف واحد جامعہا اولم یجامعہا وھذا القول اختیار الفراء و مذہب ابی حنیفۃ (کبیر) ذکر الفراء ان الافضاء ھو الخلوۃ وان لم یقع دخول و قول الفراء حجۃ فی ما یحکیہ من اللغۃ (جصاص) ای خلا بلا حائل (مدارک) حنفیہ کے ہاں مہر خلوت صحیح پر واجب ہوجاتا ہے۔ والاٰیۃ حجۃ لنا فی الخلوۃ الصحیحۃ وھا انہ کد المھر (مدارک) ۴۹۰ ؎ یعنی اس حکم کے نزول سے قبل جو ہوچکا۔ اب اس پر بازپرس نہیں۔ ای قبل نزول اٰیۃ التحریم فانہ معفو عنہ (کبیر) لَا تَنْكِحُوْا۔ میں نکاح اپنے لغوی معنی یعنی صحبت کرنے کے مفہوم میں لیا گیا ہے۔ فیہ تحریم وطی موطؤۃ الاب بنکاح او ملک یمین او بزنا کما ھو مذھبنا وعلیہ کثیر من المفسرین (مدارک) مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ عرب جاہلیت کے اس دستور کی طرف اشارہ ہے کہ سوتیلی ماؤں سے بھی نکاح کرلیا جاتا تھا۔ قال ابن عباسؓ وجمہور المفسرین کان اھل الجاھلیۃ یتزوجون بازواج اٰبائھم (کبیر) مَا نَكَحَ میں مَا مَنْ کے معنی میں ہے۔ ما بمعنی مَن (جلالین) اٰبَآؤُكُمْ اس کے ذیل میں وہ بیویاں بھی آگئیں جو دادا یا نانا کے نکاح میں رہ چکی تھیں۔

مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ

اُس کا کچھ حصہ وصول کرو بجز اس صورت کے کہ وہ صریح بدکرداری کی مرتکب ہوں ۴۸۳

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ

اور بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کیا کرو ۴۸۴ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو

فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا

عجب کیا کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی

كَثِيْرًا ۝ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ

رکھ دے ۴۸۵ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ (دوسری) بیوی بدلنا چاہو

زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا

اور تم اس بیوی کو (مال کا) انبار دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی

مِنْهُ شَيْـًٔـا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝

واپس مت لو ۴۸۷ کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کرکے اسے (واپس) لوگے ۴۸۸

وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى

اور تم کیسے اسے (واپس) لے سکتے ہو درآنحالیکہ ایک دوسرے سے خلوت کر چکے

بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ وَلَا

ہو اور وہ (بیویاں) تم سے ایک مضبوط اقرار لے چکی ہیں ۴۸۹ اور اُن

تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ

عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کرچکے ہیں، مگر ہاں جو کچھ ہوچکا (ہوچکا) ۴۹۰

۴۹۱ قرآن مجید نے تین لفظ استعمال کئے ہیں اور تینوں سے الگ الگ اشارے ہیں۔ فَاحِشَةً۔ یہ دستور بجائے خود اور عقلاً بھی بڑی بے حیائی کی چیز تھا۔ مَقْتًا۔ مذاقِ سلیم رکھنے والوں کے عرف میں بڑی گندی سی چیز تھا۔ مقت کہتے ہیں ایسی بُری چیز کو جسے دیکھ ہی کر طبیعت میں گھن پیدا ہو۔ المقت بغض شدید لمن تراہ تعاطی القبیح (راغب) خود اہلِ جاہلیت بھی اس نکاح کو بہت بُری نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا نام ہی نکاح المقت پڑ گیا تھا۔ سَآءَ سَبِیْلًا۔ یعنی اس کے نتائج بھی بڑے قبیح تھے۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ قبیح کے تین درجہ ہوتے ہیں۔ ایک قبح عقلی، دوسرے قبح شرعی، تیسرے قبح عرفی، فاحشۃ میں اشارہ اوّل کی جانب ہے، مقتا میں دوم کی جانب، ساء سبیلا میں سوم کی طرف۔ ۴۹۲ اس لئے جو غلطیاں نزولِ حکم سے قبل ہو چکیں، ان پر وہ گرفت نہیں کرتا۔ اور ان پر وہ خطِ عفو کھینچ دیتا ہے۔ قرآن مجید نے یہاں ایک مفصل فہرست دے کر بتا دیا کہ ان عورتوں سے مطلقاً یا فلاں فلاں صورتوں میں نکاح حرام ہے۔ اور یہ فہرست محرمات قرآن مجید کی کاملیت کے دلائل میں سے ایک قوی دلیل ہے۔ موجودہ انجیل اور خدا معلوم کتنی نام نہاد آسمانی کتابوں میں تعلیم کا یہ ورق سرے سے سادہ موجود ہے۔ اُمَّهٰتُكُمْ۔ تمہاری مائیں اور اسی طرح ماں کی مائیں، دادیاں، نانیاں وغیرہا۔ والجدۃ من قبل الام والاب ملحقۃ بھن (مدارک) بَنٰتُكُمْ تمہاری بیٹیاں اور اسی طرح بیٹیوں کی بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں وغیرہا۔ وبنات الابن وبنات البنت ملحقات بھن (مدارک) اَخَوٰتُكُمْ۔ اس میں حقیقی کے علاوہ سوتیلی بہنیں بھی آ گئیں۔ لاب وام او لاب او لام (مدارک) عَمّٰتُكُمْ۔ اس میں باپ کی اور باپ سے اوپر والوں کی بہنیں آ گئیں۔ من الاوجہ الثلاثۃ (مدارک) خٰلٰتُكُمْ اس میں ماں کی اور ماں سے اوپر والوں کی بہنیں آ گئیں۔ من الاوجہ الثلاثۃ (مدارک) بَنٰتُ الْاَخِ۔ یعنی سگی اور سوتیلی بھتیجیاں۔ کذلک (مدارک) بَنٰتُ الْاُخْتِ۔ یعنی سگی اور سوتیلی بھانجیاں۔ کذلک (مدارک) اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ۔ خیال کر کے دیکھا جائے کہ قرآن مجید دودھ پلائیوں کو ماں کے لقب سے یاد کر رہا ہے۔ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ۔ رضاعت کے اوقات گو مختلف ہوں، مگر دودھ ہو ایک ہی ماں کا۔ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ۔ اس میں بیوی کی نانیاں، پرنانیاں وغیرہ سبھی آ گئیں۔ ان کی حرمت محض عقد سے لازم آ جاتی ہے۔ وھن محرمات بمجرد العقد (کشاف) رَبَآئِبُكُمُ۔ اس میں بیوی کی بیٹیوں کے علاوہ نواسیاں وغیرہ بھی آ گئیں۔ فِیْ حُجُوْرِكُمْ۔ لفظی معنی ہیں کہ تمہاری گودوں میں ہوں، مُراد ہے تربیت و پرورش میں ہونا۔ یہ محض عام عادت و عرف کا بیان ہے کوئی قید یا شرط نہیں۔ ذکر الحجر علی غلبۃ الحال دون الشرط (مدارک) مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ

۳۶۴

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ
بیشک یہ بڑی بے حیائی اور نفرت کی بات تھی اور بہت بُرا طریقہ تھا۔ ۴۹۱ تمہارے اوپر

عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَ
حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور

خٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ
تمہاری خالائیں اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں

الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ
جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی

نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ
مائیں اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں رہتی ہیں اور جو تمہاری ان

الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا
بیویوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے لیکن اگر ابھی تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر

جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۡ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ
کوئی گناہ نہیں اور جو بیٹے تمہاری نسل سے ہوں اُن کی بیویاں اور یہ بھی

اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا
(حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو یکجا کرو مگر ہاں جو ہو چکا

قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾
(ہو چکا) بیشک اللہ بڑا بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے ۴۹۲

دَخَلْتُمْ بِهِنَّ یعنی ماں سے مجرد نکاح اس کی بیٹی کی حرمت کے لئے کافی نہیں، حرمت کیلئے ماں سے صحبت کا ہو چکنا ضروری ہے۔ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ اصلاً تو کنایہ صرف صحبت سے ہے۔ وھی کنایۃ عن الجماع (بیضاوی، کشاف) لیکن حنفیہ نے لمس شہوانی اور بوس وکنار کو بھی اسی حکم میں داخل کیا ہے اور امام مالکؒ و امام شافعیؒ اور بہت ائمۂ فقہ اس میں حنفیہ کے ہمراہ ہیں۔ واللمس ونحوہ یقوم مقام الدخول (مدارک) ھو التمتع من اللمس او القبل قال المالک وابو حنیفۃ (ابن العربی) واتفق اصحابنا والثوری ومالک والاوزاعی واللیث والشافعی ان اللمس بشھوۃ بمنزلۃ الجماع فی تحریم ام المرأۃ وبنتھا (جصاص) الجماع ھو الاصل ویحمل علیہ اللمس لانہ استمتاع مثلہ ویدخل تحت عمومہ (ابن العربی) حنفیہ و مالکیہ نے علاوہ لمس شہوانی کے شہوانی نظروں کو بھی سبب تحریم قرار دیا ہے۔ وقال اصحابنا جمیعاً اذا نظر الی فرجھا بشھوۃ کان ذلک بمنزلۃ اللمس فی ایجاب التحریم (جصاص) وقال مالک اذا نظر الی شعر جاریتہ تلذذا او صدرھا او ساقھا او شیء من محاسنھا تلذذا حرمت علیہ امھا وبنتھا (جصاص) واما النظر فانہ فی الدرجۃ الثالثۃ شبہۃ فی الزنا ذریعۃ الذریعۃ (ابن العربی) فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ یعنی ایسی غیر مدخول بہا بیوی کی بیٹی سے نکاح کر لینے میں۔ مِنْ اَصْلَابِكُمْ۔ یہ صلب یا نسل کی قید اس لئے لگا دی کہ متبنّیٰ یا محض منہ بولے بیٹوں کی بیویاں اس میں نہ شامل ہو جائیں جیسا کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا۔ من او ما تبنیتم (کشاف) اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ۔ بہنیں خواہ حقیقی ہوں یا رضاعی اُن کا نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

۴۹۳ (بطور کنیز شرعی کے) اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ یعنی ایسی بیاہی ہوئی عورتیں جو اب مسلمانوں کی قید میں جہاد کے بعد آگئی ہیں ان کی ازواج بن سکتی ہیں باوجود اس کے کہ ان کے شوہر زندہ اور دار الحرب میں موجود ہیں۔ اُن کا وہ نکاح کافرانہ اُن کے مسلمانوں کے ملکِ یمین میں جانے سے مانع نہیں ہو سکتا۔ ما ملکت ایمانکم پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے پ ۴، حاشیہ ۴۲۷ لفظی معنی ہیں "وہ جن کے مالک تمہارے دونوں ہاتھ ہو جائیں" مراد شرعی کنیزیں ہیں۔ اَلۡمُحۡصَنٰتُ۔ احصان کے معنی ہیں روک میں آجانا۔ قید میں آجانا۔ الاحصان ھو ان یحمی الشیء ویمنع منہ ابن قتیبہ الاحصان فی اللغۃ المنع (کبیر) محصنت کے معنی ہوئے قید میں آجانے والیاں۔ مراد شادی شدہ عورتیں ہیں۔ عقدِ نکاح کو قید سے تعبیر کرنے سے یہ اشارہ نکلا کہ ازدواج خود محافظِ عفت ہے۔ ای ھن النساء ذوات الازواج لان الازواج احصنوھن ومنعوھن (ابن جریر) قیل المحصنت المزوجات تصورا ان زوجھا ھو الذی احصنھا (راغب) والمراد بالاحصان ھنا العفۃ (روح) مطلب یہ ہوا کہ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے اب دوسرا نکاح حرام ہے۔ یہ تو عام قاعدہ ہوا۔ استثناء اس سے شرعی کنیزوں کا ہے جو کافر شوہروں کی زوجیت سے آئی ہیں۔ والمحصنت کا عطف نحوی اعتبار سے اُن محرمات پر ہے جو قبل میں مذکور ہو چکے۔ عطف علی المحرمات المذکورات قبل (قرطبی) ۴۹۴

وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ۚ

اور وہ عورتیں بھی (حرام کی گئی ہیں) جو قیدِ نکاح میں ہوں، بجز اُن کے جو تمہاری ملک میں آجائیں ۴۹۳

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ‌ۚ وَاُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰ لِكُمۡ اَنۡ

اللہ نے فرض کر دیا ہے (ان احکام کو) تم پر ۴۹۴ اور جو ان کے علاوہ ہیں وہ تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں ۴۹۵

تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ‌ؕ

یعنی تم انہیں اپنے مال کے ذریعہ سے تلاش کرو اس طور پر کہ قیدِ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ مستی نکالنے والے ۴۹۶

فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰ تُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ

پھر جس طریقہ سے تم نے اُن عورتوں سے لذت لی ہے، سو انہیں ان کے مقررشدہ مہر

فَرِيۡضَةً‌ ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا تَرٰضَيۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ

دے دو اور تم پر اس (مقدار) کے بارہ میں جس پر تم لوگ مہر کے مقرر ہو جانے کے بعد باہم رضامند

بَعۡدِ الۡفَرِيۡضَةِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۲۴﴾ وَ

ہو جاؤ ۴۹۶ بیشک اللہ بڑا جاننے والا ہے بڑا حکمت والا ہے ۴۹۷ اور

مَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ

تم میں سے جو کوئی مقدرت نہ رکھتا ہو ۴۹۸ کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح

الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ

کر سکے ۴۹۹ تو وہ تمہاری (آپس کی) مسلمان کنیزوں سے جو تمہاری ملک (شرعی) میں ہوں

الۡمُؤۡمِنٰتِ‌ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ‌ ؕ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ

(نکاح کرے) ۵۰۰ اور اللہ تمہارے ایمان (کی حالت) سے خوب واقف ہے ۵۰۱ تم (سب) آپس میں

نظامِ خانگی ہی کی درستی پر ساری ہیئتِ اجتماعی کی درستی کا انحصار ہے اور نظامِ خانگی کا ایک بڑا اہم جزئیہ ہے کہ عقدِ نکاح کس کس کے ساتھ جائز ہے اور کس کس کے ساتھ ناجائز۔ ضروری تھا کہ اس کے اصول قرآن مجید ہی میں محفوظ کر دیے جاتے۔ کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ۔ وہی تاکید و اظہار اہمیت کے لئے ہے۔ اُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰ لِكُمۡ۔ حدیث و سنت سے جن دوسری عورتوں سے حرمتِ نکاح ثابت ہے، مثلاً رضاعی بہنوں کے ساتھ پھوپھی کا بھتیجی کے ساتھ یا خالہ کا بھانجی کے ساتھ جمع کرنا۔ یہ سب کنایۃً قرآن مجید کی آیات بالا میں آگئیں۔ حدیث نے انہیں صرف کھول کر بیان کر دیا ہے۔ کتاب اللہ علیکم۔ تقدیرِ کلام یوں مانی گئی ہو۔ الزموا ما کتب اللہ علیکم (معالم) یا یوں کتب اللہ علیکم کتابًا (مدارک) ۴۹۵ یعنی مقصود فرد و جماعت دونوں کے نزدیک یہ ہو کہ زوجین نکاح کے ذریعہ سے پاک و منزہ، باعفت مستقل زندگی بسر کریں گے۔ اور نکاح کی شرطیں معلوم و معروف ہیں مثلاً کم سے کم دو گواہوں کی موجودگی میں میاں بیوی کی رضامندی کا اعلان، نکاح کا موقت نہ ہونا وغیرہ۔ المراد بالاحصان ھنا العفۃ وتحصین النفس عن الوقوع فی مالا یرضی اللہ تعالی (روح) معناہ متعففین عن الزنا (قرطبی) غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ۔ یعنی مقصود حیوانات کی طرح تمامتر ایک مادی شہوت یا جنسی تقاضہ کا پورا کرنا نہ ہو۔ بیوی کے ساتھ مستقل تاہل یعنی نباہ کرنے کا ارادہ اور اس کی وقعت و محبت کسی درجہ میں تو ہو۔ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ۔ مال سے مراد مہر ہے۔ یا ملکِ یمین کی قیمت۔ ان تبتغوا النساء باموالکم بالصرف فی مھورھن (بیضاوی) ای تنکحوا بصداق او تشتروا بثمن (معالم) یعنی المھور (مدارک) فقہاء نے یہیں سے استدلال کیا ہے کہ مہر نکاح کا لازمی جزء ہے گو تعداد مہر معین نہ ہو۔ وفیہ دلیل علی ان النکاح لا یکون الا بمھر وانہ یجب وان لم یسم (مدارک) مہر کی بار بار تاکید سے ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلامی کو عورتوں کے حقوق کا کس درجہ اہتمام مطلوب ہے۔ نفس خرچ نکاح و سفاح دونوں میں مشترک ہے۔ فرق یہ ہے کہ نکاح سے زندگی انسانوں کی طرح مقید و پابند ہو جاتی ہے اور سفاح میں انسان جانوروں کی طرح چھوٹا ہوا رہتا ہے۔ تَبۡتَغُوۡا۔ بغی کے معنی تلاش کرنے طلب کرنے کے ہیں اور حکم کے مخاطب مرد ہیں۔ گویا نکاح کی درخواست کرنا یا انگریزی محاورہ میں "پروپوز" کرنا مرد کا کام ہے۔ عورت کا کام صرف قبول کرنا منظوری دینا ہے۔ نر اور مادہ کے درمیان یہ فاعلیت و انفعالیت کا فرق زندگی کے ہر شعبہ پر محیط و حاوی ہو۔ ۴۹۶ یعنی مقدارِ مہر ایسی شے نہیں جو ایک مرتبہ بندھ جانے کے بعد کسی طرح قابلِ تبدیلی نہ ہو۔ میاں بیوی باہمی رضامندی سے اسے گھٹا سکتے ہیں، بڑھا سکتے ہیں یا بالکل معاف بھی کر سکتے ہیں۔ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ۔ یعنی بعد نکاح لطف اٹھایا ہے۔ الاستمتاع التلذذ۔ والاجور المھور (قرطبی) ۴۹۷ اللہ کا علم کامل ہے بندوں کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا۔ اور اسی علم کامل کے لحاظ سے اُس نے قانون اور ضابطے مقرر کئے ہیں۔

۴۹۸ یعنی ان آزاد شریف بیویوں کا مہر نفقہ وغیرہ پوری طرح ادا کرنے کے قابل نہ ہو۔ المحصنت سے یہاں مراد شریف آزاد بیویاں ہیں۔ ای الحرائر (معالم) یرید الحرائر و ذلک فرق معناہ العفائف وھو ضعیف (قرطبی) طول کے معنی وسعت و مقدرت کے ہیں۔ الطول السعۃ والغنی قالہ ابن عباس والمجاھد وسعید بن جبیر والسدی و ابن زید (قرطبی) ۴۹۹ اور کنیز کو بیوی بنا لینے میں عار محسوس نہ کرے۔ یہ مشورہ اس مصلحت سے دیا گیا ہو کہ باندی کا مہر نفقہ وغیرہ نسبۃً ہلکا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی کہ ان کے مالک انہیں غریب شوہروں کے نکاح میں دے دینے میں عار بھی محسوس نہ کریں گے۔ فَتَيٰتِكُمُ۔ فتاۃ کا لفظ جب باندیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس میں جوان عمر کی قید باقی نہیں، بوڑھی، جوان ہر سن و سال کی باندیاں فتیات ہی کہی جائیں گی۔ العجوز الحرۃ لا تسمی فتاۃ والامۃ شابۃ والعجوز کل واحدۃ منھما تسمی فتاۃ (جصاص) ای امائکم (راغب) ای المملوکات وھی جمع فتاۃ (قرطبی) فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ۔ حنفیہ کے یہاں کنیز کتابیہ سے بھی نکاح جائز ہے اور آیت میں مومنات کی قید محض استحبابی ہے۔ ونکاح الامۃ الکتابیۃ یجوز عندنا والتقیید فی النص للاستحباب (مدارک) ۵۰۰ اور ایمان ہی معیار و مدار فضیلت ہے۔ پھر کوئی آزاد کیوں بوقتِ ضرورت کسی باندی سے عقد کرنے میں عار محسوس کرے۔ فقہاء مفسرین نے آیت سے ظاہر ایمان کے قبول کرنے پر استدلال کیا ہے نیز اس پر کہ ایمان تصدیقِ قلب کا نام ہے نہ کہ اقرار زبانی کا۔ فیہ تنبیہ علی قبول ظاھر ایمانھن ودلیل علی ان الایمان ھو التصدیق دون عمل اللسان (مدارک) ۵۰۱ (مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی اور اولادِ آدم ہونے کے لحاظ سے بھی) انتم وارقائکم متناسبون نسبکم من ادم ودینکم الاسلام (بیضاوی) ای لا تستنکفوا من نکاح الاماء فکلکم بنو آدم (مدارک) عرب سوسائٹی میں باندیوں سے نکاح کرنا عار اور ذلت کی چیز تھی کہ ان سے جو اولاد ہو گی وہ کنیز زادی کہلائے گی۔ قرآن مجید نے اس عار کو مٹایا اور بتایا کہ بوقتِ ضرورت اس میں بلا تکلف نکاح کرنا چاہیے۔ ان العرب کانوا یفتخرون بالانساب فاعلم فی ذکر ھذا الکلمۃ ان اللہ لا ینظر ولا یلتفت الیہ (کبیر)

٥٠٢ مجرد نکاح سقوطِ ملک کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے مالک کی اجازت بہرحال ضروری ہے۔ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ۔ المراد به الموالی لانه لاخلاف انه لایجوز لها أن تتزوج بغیر اذن مولاها ولذلک لا اعتبار باذن غیر المولیٰ (جصاص) لیکن نفس نکاح میں رضامندی خود باندیوں کی معتبر ہوگی نہ کہ ان کے مالکوں کی۔ وهو حجة لنا فی ان لهن ان یباشرن العقد بانفسهن لانه اعتبر اذن الموالی لا عقدهم (مدارک) ٥٠٣ (اور اُن کے کنیز ہونے کی بنا پر اداءِ مہر کو غیر اہم و غیر ضروری نہ سمجھو) فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ چونکہ مالک اپنی باندیوں کی ہر کمائی کے مالک ہوتے تھے اس لئے باندیوں کا مہر بھی اُن کے مالکوں ہی کو دیا جائے گا، اور تقدیر کلام یوں ہوگی۔ واتوا موالیهن اجورهن۔ فکان اداؤها الیهن اداءٌ الی الموالی لانهن وما فی ایدیهن مال الموالی (مدارک) ٥٠٤ یعنی یہ اداءِ مہر بمعاوضۂ نکاح ہو بطور اجرتِ زنا نہ ہو۔ آزاد شریف بیویوں کے مقابلہ میں باہر نکلنے والیوں کے بدچلنی کے امکانات یوں بھی زائد ہوتے ہیں چہ جائیکہ باندیاں جو عرفاً حقیر و غیر معزز ہی سمجھی جاتی ہیں، اس لئے اُن کے ذیل میں ان قیدوں کا ذکر صراحت کے ساتھ ضروری ہوا۔ مُسٰفِحٰتٍ سے مُراد ہیں کھلی ہوئی اور عام کسبیاں، اور متخذات اخدان سے مُراد ہیں وہ جن کا کوئی ایک آدھ متعین آشنا ہوتا تھا۔ دنیائے حسن میں بیسواؤں کی دو قسمیں تقریباً ہر جگہ قائم رہی ہیں۔ ایک کھلی ہوئی کسبیاں، دوسرے چُھپی ہوئی خانگیاں۔ جاہلیت عرب کے تمدن میں بھی یہی تفریق قائم تھی۔ قال اکثر المفسرین المسافحة هی التی تؤاجر نفسها مع ای رجل اراد ها والمتخذة الخدن هی التی تتخذ خدناً معیناً وکان اهل الجاهلیة یفصلون بین القسمین وما کانوا یحکمون علی ذات الخدن بکونها زانیة (کبیر) ٥٠٥ (جیسکہ قبل نکاح بھی تھا) باندیاں خواہ نکاحی ہوں یا کنواری اُن کی سزائے زنا ہر حال میں آزاد شریف بے نکاحی عورتوں کی سزا کی نصف ہے۔ باندیاں جس طرح اکثر حقوق میں بیویوں کا نصف مرتبہ رکھتی ہیں، اسی طرح اس جُرم کی سزا بھی اُن کے لئے نصف ہی رکھی گئی ہے۔ شاید اس لئے کہ جُرم کی ترغیبات بھی ان کے لئے زائد ہیں اور موانع کمتر ہیں۔ بِفَاحِشَةٍ۔ جُرم بے حیائی یہاں زناکاری کے معنی میں ہے۔ وهی الزنا (ابن جریر) مِنَ الۡعَذَابِ۔ سزا سے مُراد حد شرعی ہے۔ ای من الحد (مدارک) عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ۔ محصنات سے یہاں مُراد بیاہی ہوئی نہیں بلکہ بن بیاہی شریف خواتین ہیں۔ احصان کے تحقق کے لئے اس کا محض حُرّہ (آزاد) ہونا ہی کافی ہے۔ یعنی البکرة الحرة سماها وان لم تتزوج لان الاحصان یکون لها اذا کانت حرة ولا یکون بالامة احصان (ابن قتیبہ) المحصنات هنا الحرائر اللاتی لم یتزوجن (مدارک) ای الابکار الحرائر (قرطبی) ای ما علی الحرائر الابکار (معالم) ایک آیت اُوپر ان ینکح المحصنات المومنات کے ذیل میں بھی محصنات مطلق شریف عورتوں کے معنی میں آچکا ہے۔

بَعۡضٍ ۚ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ
ایک ہو ٥٠٢ سو ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لیا کرو ٥٠٣ اور اُن کے مہر انہیں دے دیا کرو
بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ
مقرر کے موافق ٥٠٤ اس طرح کہ وہ قیدِ نکاح میں لائی جائیں نہ کہ مستی نکالنے والیاں ہوں اور نہ چوری چھپے
اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ
آشنائی کرنے والیاں ٥٠٥ پھر جب وہ کنیزیں قیدِ نکاح میں آجائیں اور پھر اگر وہ کوئی بے حیائی کا ارتکاب
نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ
کریں تو ان کیلئے اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لئے ہے ٥٠٦ یہ اسی کے لئے
لِمَنۡ خَشِىَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ ؕ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّـكُمۡ ؕ
ہے جو تم میں سے بدکاری کا اندیشہ رکھتا ہو ٥٠٧ اور اگر تم ضبط سے کام لو تو تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے ٥٠٨
وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۵﴾ يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَـكُمۡ وَ
اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے اور بڑا مہربان ہے ٥٠٩ اللہ کو منظور ہے کہ تم سے (احکام) کھول کر بیان کر دے اور
يَهۡدِيَكُمۡ سُنَنَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَيَتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ ؕ
تم کو تم سے قبل والوں کے حالات بتلا دے اور تم پر توجہ فرمائے ٥١٠
وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ
اور اللہ بڑا علم والا ہے اور بڑا حکمت والا ہے ٥١١ اور اللہ کو منظور ہے کہ تمہارے حال پر توجہ فرمائے ٥١٢
وَيُرِيۡدُ الَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الشَّهَوٰتِ اَنۡ تَمِيۡلُوۡا مَيۡلًا عَظِيۡمًا ﴿۲۷﴾
اور جو لوگ خواہشوں کے بندے ہیں ٥١٣ انہیں یہ منظور ہے کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ ٥١٤

ع ۳ / ۱

منزل ۱

٥٠٦ یعنی باندی کی زناکاری کی سزا پچاس دُرّے ہے، شریف کنواری عورت کی سزائے زناکاری سو دُرّے ہے۔ فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة اس کے نصف پچاس ہی دُرّے ہوتے ہیں۔ شریف نکاحی عورت کے لئے سزائے زنا سنگ زنی ہے اور اس کی تنصیف ممکن نہیں اور مملوک پر سرے سے رجم ہی نہیں۔ اس کی سزا ہر صورت وہی پچاس دُرّے ہے۔ نصف ما علی المحصنت یدل علی انه الجلد لا الرجم لان الرجم لا یتنصف (مدارک) غلاموں کی حرامکاری کی سزا قرآن مجید میں مذکور نہیں۔ فقہاء نے اسی آیت سے استنباط کر کے ان کی سزا بھی یہی پچاس دُرّے رکھی ہے۔ فرقۂ خوارج سزائے رجم کا بالکل منکر ہے اور اس کا مستدل یہی آیت ہے۔ (کبیر) ٥٠٧ (خواہ اس لئے کہ طبعی تقاضا مجبور کر رہا ہو خواہ اس لئے کہ شریف بیوی میسر نہ آرہی ہو) ذٰلِكَ یعنی باندی سے نکاح۔ یعنی نکاح الامة عند عدم الطول (معالم) ای نکاح الاماء (مدارک) الۡعَنَتَ۔ عنت کے لفظی معنی ضرر و زیان کے ہیں۔ اصل العنت الضرر والفساد (ابن قتیبہ) یہاں مُراد زنا میں پڑ جانا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کون ضرر مسلمان کے لئے ہو سکتا ہے۔ ای الزلة والفجور منكم ابن عباس العنت الزنا (ابن جریر عن ابن عباس) ای الاثم التی تؤدی الیه غلبة الشهوة (مدارک) دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ شدید ضبط جس سے انسان جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے مثلاً اختناق الرحم کی شکایت ہو جائے یا مردوں کو ورم پُشت وغیرہ کی۔ امام رازیؒ جو خود بھی اپنے زمانہ کے نامور طبیب تھے اس قول کو یوں نقل کرتے ہیں:۔ والثانی ان الشبق الشدید والغلمة العظیمة قد تؤدی بالانسان الی الامراض الشدیدة اما فی حق النساء فقد تؤدی الی اختناق الرحم واما فی حق الرجال فقد تؤدی الی اوجاع الورکین والظهر (کبیر) ٥٠٨ یعنی اگر خواہشِ نفس کا اتنا غلبہ نہیں ہے جس سے حرامکاری میں پڑ جانے کا قوی اندیشہ ہو رہا ہو تو پھر کنیزوں سے نکاح کرنے سے یہی بہتر ہے کہ خود خواہشِ نفس پر قابو حاصل کر لیا جائے۔ ای الصبر عن نکاح الاماء خیر لکم (ابن جریر) ظاهرة الاخبار عن صبر خاص وهو عن نکاح الاماء قاله ابن عباس ومجاهد وابن جبیر والسدی (بحر) ٥٠٩ چنانچہ اس کی صفتِ رحیمی اسی سے ظاہر ہے کہ ایسے نکاحوں کی حُرمت کا حکم نہیں رہا اور شانِ غفوریت یہ ہے کہ کنیزوں سے بلا ضرورتِ شدید بھی نکاح کر لینا گو باعثِ تنزیہی کے باوجود نجات کی راہ میں حائل کسی طرح نہیں۔ ٥١٠ (رحمت و مغفرت کے ساتھ) لِيُبَيِّنَ لَـكُمۡ۔ چنانچہ وہ آیات احکام و مسائل تمہاری ہی مصلحت و نفع کے لئے نازل کرتا ہے۔ يَهۡدِيَكُمۡ سُنَنَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ۔ چنانچہ وہ آیات قصص و حکایات تمہاری ہی مصلحت و نفع کے لئے نازل کرتا ہے ٥١١ چنانچہ بندوں کی کوئی سی بھی ضرورت و مصلحت اس کے علم کامل سے باہر نہیں۔ اور اپنی حکمتِ کاملہ سے اُس نے احکام ایسے رکھے ہیں جو ہر مصلحت کی پوری پوری رعایت کرنے والے ہیں۔ ٥١٢ (شفقت و رحمت کے ساتھ اُنہی احکام و تعلیمات کے ذریعہ سے) ٥١٣ (اور ہوائے نفس ہی کو اپنا دین و ایمان بنائے ہوئے ہیں) یہ کون لوگ ہیں؟ الفاظ کا مصداق کفار کا ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ باقی فسق پیشہ افراد بھی مُراد ہو سکتے ہیں، صحابہ و تابعین سے اس کے معنی اہل کتاب کے بھی مروی ہوئے ہیں، یہود کے بھی اور زانیوں کے بھی وقس علی ہذا۔ قیل المجوس (کبیر) قیل المجوس وقیل الیهود (بیضاوی) قال بعضهم هو الزناة وقال آخرون هم الیهود والنصاری (ابن جریر) هم الزناة او الیهود والنصاری او الیهود خاصة او المجوس (بحر) قولِ فیصل یہ ہے کہ الفاظ ان سارے معانی کے محتمل ہیں۔ اس لئے کہ جو شخص بھی نافرمانی پر دلیر ہے وہی اپنی خواہشِ نفس کا بندہ ہے۔ کان داخلاً فی الذین یتبعون الشهوات الیهود والنصاری والزناة وکل متبع باطلاً لان کل متبع ما نهاه الله عنه متبع شهوة نفسه (ابن جریر) الفجرة (المدارک) ای متبعوا کل شهوة قاله ابن زید رجحه الطبری وظاهره العموم (بحر)

٥١٤ اور راہِ راست سے ہٹ کر اُنہی جیسے ہو جاؤ۔ مَیۡلًا عَظِیۡمًا ۔ اس سے بڑھ کر کجی اور کیا ہوگی کہ انسان یا تو حرام کو حرام سمجھنے ہی سے انکار کرے اور یا بے باکانہ ارتکابِ جرم کرتا ہے۔
٥١٥ (کمزور جسم کے لحاظ سے بھی اور کمزور ارادہ کے لحاظ سے بھی) اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ ۔ چنانچہ شریعت کے سارے احکام میں انسان کی سہولتوں کا لحاظ رکھ لیا گیا ہے۔ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا
چنانچہ جتنے بھی احکام شرعی ہیں سب انسان کے ضعفِ جسمانی و ضعفِ ارادی ہی کی رعایت سے ہیں۔ ٥١٦ بِالۡبَاطِلِ یعنی غیر مشروع طریقوں پر۔ خیانت اور بددیانتی کی تمام صورتوں کی
بندش اس ایک حکم کے اندر آگئی۔ کاش اسلام کے ایک اسی قانون پر عمل ہو اور آج دنیا کی کایا پلٹ ہو جائے۔ ٥١٧ مطلب یہ ہوا کہ ایک دوسرے کے مال میں تصرف کی اجازت کسی باطل
طریقہ (سود، قمار، وغیرہ) سے تو سرے سے ہی نہیں۔ صرف جائز طریقوں کے اندر ایک دوسرے کی رضامندی سے تصرف کر سکتے ہو۔ مثلاً سرمایہ مشترک سے تجارت، کہ یہ تو عین باعثِ برکت ہے۔

يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ
اللہ کو منظور ہے کہ تمہارے ساتھ تخفیف برتے اور انسان تو کمزور پیدا ہی کیا گیا
ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ
ہے ٥١٥ اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر
بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ ۚ
نہ کھاؤ ٥١٦ ہاں البتہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو ٥١٧
وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾ وَمَنْ
اور (نیز) اپنی جانوں کو قتل مت کرو ٥١٨ بیشک اللہ تمہارے حق میں بڑا مہربان ہے ٥١٩ اور جو کوئی
يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَ
ایسا کرے گا سرکشی اور ظلم کی راہ سے تو ہم عنقریب اس کو آگ میں ڈالیں گے اور
كَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا
یہ اللہ کے لئے آسان ہے ٥٢٠ اگر تم اُن بڑے کاموں سے جو تمہیں منع کئے گئے
تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ
ہیں بچتے رہے تو ہم تم سے تمہاری چھوٹی برائیاں دُور کر دیں گے ٥٢١ اور تمہیں ایک معزز مقام پر
مُدْخَلًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ
داخل کر دیں گے ٥٢٢ اور تم ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو
بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا
دوسرے پر بڑائی دی ہے ٥٢٣ مردوں کے لئے اُن کے اعمال کا

٥١٨ اَنۡفُسَکُمۡ کے معنی عموماً اخوانکم یا من جنسکم کئے گئے ہیں۔ اور مُراد یہ لی گئی ہے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ اتفقوا علی ان ھذا النھی عن ان یقتل بعضھم بعضاً اکبیر (قتل بعضکم بعضاً (ابن جریر عن عطاء) ای اھل ملتکم (ابن جریر عن السدی) یعنی اخوانکم (معالم۔ عن الحسن) من کان من جنسکم من المومنین (مدارک) دُوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ خودکشی نہ کرو اور یہ معنی بھی منقول ہیں۔ ولا یقتل الرجل نفسہ (مدارک) بعض مذہبوں میں خودکشی خود ایک عبادت رکھی گئی ہو۔ مثلاً جاپانیوں میں یا بعض قدیم ہندی مذہبوں میں۔ بالبخع کما تفعلہ جھلۃ الھند (بیضاوی) ٥١٩ (چنانچہ یہ سارے احکام بھی اسی شفقت و رحمت کا نتیجہ ہیں) ٥٢٠ یہ وعید اُن لوگوں کے لئے ہے جو احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی اتفاقی طور پر یا بطورِ خطائے اختیاری کے نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ کرتے رہتے ہیں۔ ذٰلِکَ ۔ ای ما نھی عنہ (جلالین) یعنی ما سبق ذکرہ من المحرمات (معالم) عُدۡوَانًا یعنی حدودِ شرعی سے تجاوز کرتے ہوئے یا دوسروں پر ظلم کرتے ہوئے۔ قیل اراد بالعدوان التعدی علی الغیر (بیضاوی) العدوان تجاوز الحد (قرطبی) ظُلۡمًا یعنی اپنی جان پر ظلم کرتے ہوئے قیل اراد بالظلم ظلم النفس (بیضاوی) وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا ۔ اللہ کی قوت کو دیوتا پرست مشرک کہیں انسانوں یا دیوتاؤں کے محدود قوتوں پر قیاس نہ کریں۔ ٥٢١ (از قسم تمہیں عذاب سے بھی بچا لیں گے) یہ نوید الٰہی ہے جس کی تکرار قرآن مجید میں کئی بار آئی ہے۔ اور ایک جگہ اسے بالکل کلی اور عمومی صورت میں یُوں بیان کیا گیا ہے۔ ان الحسنات یذھبن السیاٰت ۔ اس قسم کی آیتوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ بڑے بڑے اولیاء و اتقیاء میں بھی معصوم کوئی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی کثرتِ طاعات پر نظرِ رحمت کر کے ان کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر کر دیتا ہے اور انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبوں سے سرفراز کرتا رہتا ہے۔ عصمتِ انبیاء کا مسئلہ ایک دوسرے قانون سے ثابت ہے۔ کَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ ۔ یعنی بڑے بڑے گناہ لیکن خود کبیرہ کا اطلاق کس عمل پر ہوتا ہے۔ اس کے متعدد جوابات

دیئے گئے ہیں۔ سفیان ثوری تابعی کا قول یہ نقل ہوا ہے کہ کبیرہ بندوں کے اتلافِ حقوق کا نام ہے اور صغیرہ صرف اللہ کے اتلافِ حقوق کا۔ قال سفیان الثوری الکبائر ما کان فی المظالم بینک و بین عباد اللہ تعالیٰ والصغائر ما کان بینک و بین اللہ تعالیٰ (معالم) اس ہیچمدان کے خیال میں کبیرہ وہ عمل ہے جس کی ممانعت صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آچکی ہو۔ اور اس کا معصیت ہونا کسی دقیق استنباط یا دلالتِ خفی کا محتاج نہ ہو۔ یا کم از کم یہ کہ حدیث صحیح میں اس کی ممانعت صراحت اور تاکید کے ساتھ آچکی ہو۔ ممتاز صحابیوں کے نزدیک کچھ ایسا ہی پایا جاتا ہے۔ قال علی بن ابی طالب ھی کل ذنب ختمہ اللہ بنار او غضب او لعنۃ او عذاب (معالم) اور یہی ابن جریر نے عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے۔ سَیِّاٰتِکُمۡ ۔ سیات سے مراد چھوٹی برائیاں یا گناہ صغیرہ ہیں۔ ای صغائرکم (بیضاوی) مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ کبیرہ پر عتاب کے ساتھ ساتھ فضل کا احتمال اور صغیرہ پر عفو کے ساتھ ساتھ عتاب کا احتمال خاص اہلِ سنت کا مذہب ہے۔ بخلاف معتزلہ کے جن کے نزدیک صغائر واجب المغفرۃ ہیں اور کبائر غیر مغفور ہیں۔ (مدارک) ٥٢٢ یعنی جنت میں۔ پہلا وعدہ عذاب سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ اب بشارت دخولِ جنت کی مل رہی ہے۔
٥٢٣ (طبعی و وہبی طور پر بلادخل کسی عمل و کسب کے مثلاً مردوں کو جو فضیلت عورتوں پر حاصل ہے) کوئی دولتمند ہے، کوئی حسین و جمیل ہے، کوئی خوش آواز ہے، کسی کے قوائے جسمانی بہت مضبوط ہیں۔ اس قسم کے وہبی و طبعی فضائل کو قربِ حق میں مطلق دخل نہیں۔ آیت میں تعلیم ہے کہ ان کی بنا پر ایک دوسرے پر رشک کرنا، ایک دوسرے کی جگہ پر ہونے کی حسرت و تمنا کرنا درست نہیں۔ قربِ حق میں دخل صرف عمل و اکتساب کو ہے۔ شانِ نزول کی روایتوں میں آیا ہے کہ کچھ عورتوں نے اپنے احساسِ کمتری کی بنا پر مردوں پر رشک کا اظہار کیا تھا۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور بتایا گیا کہ نجات و مغفرت اور قربِ حق کا مدار تو اپنے اعمالِ ارادی و اختیاری پر ہے۔ اور اس لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل یکساں ہے۔ عورتوں کیلئے بھی قانونِ حسنِ عمل وہی ہے جو مردوں کے لئے ہے اور اس لئے انہیں مردوں پر رشک کا کوئی محل نہیں۔ یہ فرق تو محض تکوینی مصلحتوں سے رکھ دیئے گئے ہیں۔ لان ذلک التفضیل قسمۃ من اللہ تعالیٰ صادرۃ عن حکمۃ وتدبیر وعلم باحوال العباد (مدارک)

۵۲۴ (یہ نہ ہوگا کہ مرد کا اجر اس کے مرد ہونے کی بنا پر کچھ بڑھ جائے اور عورت کا اجر اس کے عورت ہونے کی بنا پر کچھ گھٹ جائے)۔ مرد بہ حیثیت مرد ہرگز اللہ کے ہاں مقرب تر اور نجات کا مستحق تر نہیں۔ اور عورت اپنی جنس کی بنا پر ہرگز کسی اجر و قرب سے محروم نہ رہیگی۔ جیسا کہ بعض دوسرے مذہبوں نے قرار دے رکھا ہے۔ اس میں عورت کے لئے تعلیم ہے کہ وہ اپنا احساسِ کمتری دور کرے اور سمجھ لے کہ ایک مکلف مخلوق کی حیثیت سے وہ اور مرد دونوں بالکل ایک سطح پر ہیں اور حصولِ نجات و قربِ حق میں وہ مرد سے ذرا بھی فروتر نہیں۔ ہندوؤں نے اپنی منوسمرتی کے اوراق میں اور کیتھولک کلیسا نے صدیوں تک اپنی کونسلوں میں جو فیصلے عورت کی پستی اور پست فطرتی کے کئے ہیں۔ آیت ان سب کی تردید کر رہی ہے۔ مِّمَّا اكْتَسَبُوا۔ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔ اکتساب سے مراد دونوں جگہ اعمالِ خیر کا کسب ہے۔ ۵۲۵ (توفیقِ اعمال میں) رشک و تمنا والی اور دعاؤں سے طلب کرنے والی اصل چیز وہبی اور طبعی نعمتیں نہیں بلکہ توفیقِ حسنِ عمل ہے۔ ۵۲۶ (چنانچہ اپنے اس علم کامل کے مطابق اس نے ہر مخلوق کو صلاحیت و استعداد بخشی اور وہی ہر ایک کے فردِ عمل پر پوری طرح مطلع بھی ہے) ۵۲۷ (قانونِ میراث کے ذریعہ) وارثوں کی تفصیل اسی سورۃ میں چند رکوع قبل گزر چکی۔ تقسیمِ ترکہ کی کچھ عارضی صورتیں آغازِ اسلام ہی میں بتادی گئی تھیں وہ مکمل قانونِ میراث کے نازل ہونے کے بعد اب قدرۃً منسوخ ہو گئیں۔ لِكُلٍّ میں مضاف الیہ محذوف ہے۔ تقدیرِ کلام یوں ہے لکل احد۔ ۵۲۸ یعنی کل ترکہ کا ⅙ حصہ۔ الَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ۔ اصطلاح میں یہ لوگ مولی الموالاۃ کہلاتے ہیں۔ عرب قدیم میں دستور تھا کہ دو شخص باہم قول و قرار کرکے ایک دوسرے کے اس طرح دوست و مددگار ہو جاتے اگر

اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَاسْأَلُوا
حصہ (ثابت) ہے۔ اور عورتوں کے لئے اُن کے اعمال کا حصہ (ثابت) ہے ۵۲۵ اور اللہ سے
اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٣٢﴾
اُس کے فضل کی طلب کرو ۵۲۵ بیشک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے ۵۲۶
وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ
اور جو مال والدین اور قرابت دار چھوڑ جائیں اس کے لئے ہم نے وارث ٹھیرا دیئے ہیں ۵۲۷
وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ
اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں انہیں ان کا حصہ دے دو ۵۲۸
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٣٣﴾ الرِّجَالُ
بیشک اللہ ہر چیز پر مطلع ہے مرد عورتوں کے
قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ
سردھرے ہیں ۵۲۹ اس لئے کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر
عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصَّالِحَاتُ
بڑائی دی ہے ۵۳۰ اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے ۵۳۱ سو نیک بیویاں
قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ ۚ وَاللَّاتِي
اطاعت کرنے والی اور پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں ۵۳۲ اور جو عورتیں
تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ
ایسی ہوں کہ تم اُن کی سرکشی کا علم رکھتے ہو ۵۳۳ تو انہیں نصیحت کرو ۵۳۴ اور انہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو ۵۳۵

۵/۸ ع ۲

ایک پر دیت لازم آئے تو دوسرا اسے ادا کرے اور ایک کی وفات پر دوسرا اسکی میراث پائے۔ اسی عہد کو عقدِ موالاۃ کہتے۔ شریعت نے شروع شروع اس دستور کو تھوڑی سی ترمیم کے بعد قائم رکھا اور انصار و مہاجرین میں مواخات قائم کرکے باہم میراث جاری کرادی۔ پھر اس عہد والے کا حصہ ⅙ متعین کیا۔ پھر جب سورت احزاب کی یہ آیت نازل ہوئی واولوا الارحام بعضهم اولی ببعض تو سب وارثوں کے حصے متعین ہو گئے اور اب اس کے لئے گنجائش نہ رہی۔ ۵۲۹ ابھی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ روحانیات کی دنیا میں یعنی قربِ حق اور حسنِ عمل کے لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل مساوی ہے۔ نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج اور ساری عبادتیں جس طرح اور جس پیمانہ پر مرد کی قبول ہو سکتی ہیں وہی ساری راہیں عورت کیلئے بھی کھلی ہوئی ہیں۔ اب یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ مرد و زن کی یہ مساوات دنیوی معاملات میں اور انتظامی حیثیت سے قائم نہیں۔ باپ اور بیٹے دونوں حیثیت عبد بالکل ایک ہیں۔ عنداللہ اعمال کی مقبولیت کے معیار سے دونوں بالکل مساوی ہیں لیکن دنیا میں شریعت ہی کا حکم ہے کہ باپ افسر ہو کر رہے اور بیٹا ماتحت ہو کر۔ باپ حکم دے اور بیٹا حکم مانے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر غلبہ و تفوق حاصل ہے۔ الزوجان مشترکان فی الحقوق وللرجال علیهن درجة بفضل القوامية (ابن العربی) قَوَّامُونَ قوام کے معنی ہیں کسی شے کے محافظ، منتظم، مدبر کے اور یہاں مراد یہ ہے کہ مرد عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے، ان پر احکام نافذ کرنے والے ہیں۔ قوام اور قیم ہم معنی ہیں۔ قوام فصیح تر ہے۔ قام الرجل المرأة ای قام متکفلا بامرها فهو قوام وقد یجیئ القیام بمعنی المحافظة والاصلاح (تاج) الرجال متکفلون بامور النساء (لسان) صار واقواما علیهن نافذ الامر علیهن (ابن جریر) فکانه تعالیٰ جعله امیرا علیها ونافذ الحکم فی حقها (کبیر) قیامهم علیهن بالتادیب والتدبیر والحفظ والصیانة (جصاص) القوام والقیم بمعنی واحد والقوام ابلغ وهو القائم بالمصالح والتدبیر والتادیب (معالم) بائبل نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اس کا اندازہ ذیل کی عبارتوں سے ہوگا:۔ "خداوند خدا نے ..... عورت سے کہا اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا۔ اور وہ تجھ پر حکومت کریگا" (پیدائش ۳: ۱۶) "اے بیویو اپنے شوہروں کی ایسے تابع رہو جیسے خداوند کی۔ کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے جیسے کہ مسیح کلیسا کا سر اور وہ خود بدن کا بچانے والا ہے۔ لیکن جیسے کلیسا مسیح کے تابع ہے ایسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے شوہروں کے تابع ہوں" (افسیوں ۵: ۲۲-۲۴) قرآن حق کا کلام ہے اور ہمیشہ حق ہی کہتا ہے اور کلیسا کی کونسلوں اور منوسمرتی کی طرح عورت کی تحقیر و تذلیل کا ہرگز قائل نہیں لیکن ساتھ ہی اسے جاہلیتِ قدیم و جاہلیتِ جدید کی زن پرستی سے بھی ہمدردی نہیں۔ وہ عورت کو ٹھیک وہی مرتبہ و مقام دیتا ہے جو نظامِ کائنات میں فاطرِ کائنات نے اسے دے رکھا ہے۔ حیثیت ایک عبد اور مکلف مخلوق کے وہ مرد کے مساوی و ہم رتبہ ہے۔ لیکن دنیا کے انتظامی معاملات میں مرد کے ماتحت اور تابع ہے۔ ۵۳۰ (طبعی اور تکوینی طور پر) مرد کی یہ افضلیت اس کے قوائے جسمانی کی مضبوطی اور دل و دماغ کی برتری دونوں سے عیاں ہے۔ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ۔ یعنی صنفِ ذکور کو صنفِ اناث پر۔ بعضهم وهو الرجال علی بعض وهو النساء (کشاف) بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ میں ب سببیہ ہے اور اس کا تعلق قوامون سے ہے۔ الباء للسببية وهی متعلق بقوامون ای قوامون علیهن بسبب تفضیل الله تعالیٰ ایاهم علیهن (روح) ۵۳۱ (خواہ وہ مہر میں اور نفقہ میں) مطلب یہ ہوا کہ مرد کی افضلیت عورت پر دہری حیثیت رکھتی ہے۔ ایک تو طبعی یعنی جسمانی و دماغی قویٰ میں خلقی برتری۔ دوسری قانونی یا معاشری کہ عورت خرچ میں مرد کے دست نگر رہتی ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ قرآنی نظام کی رو سے کمانا یا کسبِ معاش کرنا اور بیوی کے خرچ کا بار اٹھانا مردوں کے ذمہ ہے۔ دلت علی وجوب نفقتها علیه (جصاص) ۵۳۲ نیک بیویوں کی۔ مومنات صالحات کی علامت یہ ارشاد ہو رہی ہے کہ وہ شوہر کی غیبت میں اس کے عزت و ناموس اور اس کے مال و جائداد کی نگہداشت کرنے والیاں ہوتی ہیں۔ فرنگیت مآب اسکولوں اور کالجوں کی پڑھی ہوئی لڑکیاں غور کریں کہ انہیں اس قرآنی معیار سے کیا مناسبت ہے۔ فَالصَّالِحَاتُ میں ف نتیجہ کا ہے یعنی اوپر کے مقدمات سے ایک کھلا ہوا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ بِمَا میں ب سببیہ ہے یعنی ان کا ایسا کرنا توفیقِ الٰہی ہی کے سبب سے ہوتا ہے۔ والباء سببية ای بسبب حفظ الله لهن اجل ای بتوفیقه لهن (روح) ۵۳۳ ذکرِ مہذب، شریف، شائستہ بیویوں کا ابھی اوپر ہو چکا ہے۔ اب اس کے مقابل ناشائستہ اور رذیل فطرت کی بیویوں کے باب میں کچھ احکام بیان ہو رہے ہیں۔ وہ نظامِ قانون کامل نہیں ناقص ہے جو ذکر صرف اچھوں کے انعام و اکرام کا کرتا ہے اور بدوں کا تذکرہ ہی چھوڑ جاتا ہے۔ نُشُوزَهُنَّ۔ عورت کے نشوز کے اصل معنی یہ ہیں کہ شوہر کی نافرمانی پر کمربستہ ہو جائے۔ نشزت المرأة بزوجها ای استعصت علی زوجها وارتفعت علیه وابغضته وخرجت عن طاعته (تاج) نشوز المرأة بغضها لزوجها ورفع نفسها عن طاعته (راغب) واصل النشوز الترفع علی الزوج بمخالفته (جصاص) ائمہ تفسیر نے اس معنی کی توثیق کی ہے۔ یعنی استعلائهن علی ازواجهن وارتفاعهن عن فرشهم بالمعصية منهن والخلاف علیهم فی ما لزمهن طاعتهم فیه بغضا منهن واعراضا عنهم (ابن جریر عن محمد بن کعب) گویا یہ مسرتِ ازدواجی زندگی کے بجائے تصادم و بغاوت شروع ہو جائے۔ تَخَافُونَ۔ خوف یہاں علم کے معنی میں ہے یعنی جب ان کی بغاوت و نافرمانی تجربہ میں آجائے۔ یہ نہیں کہ محض بدگمانیاں یا دور کے احتمالات کو اس کے لئے کافی سمجھ لیا جائے۔ تخافون ای تعلمون (ابن عباس)

والخوف ههنا قيل معناه اليقين وذهب في ذلك الى ان الاوامر التي بعد ذلك انما يوجبها وقوع النشوز لا توقعه (بحر) حمل الخوف على العلم (سالم) فارسی مترجمین قرآن نے بھی یہاں خوف کا ترجمہ علم یا دانستن سے کیا ہے
آں عورتاں کہ معلوم کنید سرکشی ایشاں (ولی اللہ دہلویؒ) آں زنانے کہ بیابید نافرمانی ایشاں را (سعدیؒ) ۵۳۴ اب سرکش و نافرمان بیویوں کا علاج بیان ہو رہا ہے۔ پہلی منزل یہ ہے کہ انہیں نرمی و آشتی سے سمجھایا جائے۔ اگر عورت شریف طینت
ہے تو یہ کافی ہو جائے گا۔ اسی میں شوہر کو بھی تعلیم ہے کہ فوراً غصہ میں آکر کوئی سخت کارروائی نہ کر بیٹھو۔ ۵۳۵ یعنی ان سے تعلقات ہمبستری منقطع کر لو اور ان کے پاس لیٹنا چھوڑ دو۔ یہ سزا کی دوسری منزل ہے۔ جب
زبانی گفتگو و فہمائش سے اصلاح حال نہ ہو اور نافرمانی و سرکشی بدستور قائم ہے۔ جب پہلا عملی قدم یہ اٹھاؤ لیکن تحقیق و تجربہ کے بعد۔ اس کے قبل محض ظن و بدگمانی کی بنا پر نہیں۔ ان تحققتم وعلمتم النشوز (جمل) فقہاء نے
تصریح کر دی ہے کہ محض بدگمانی پر دوسری اور تیسری سزاؤں کا قدم اٹھانا جائز نہ ہوگا۔ فالحاصل ان کلا من الھجر والضرب مقید بعلم النشوز ولا یجوز بمجرد الظن (جمل) وَاهْجُرُوْهُنَّ۔ ھجر کے دوسرے معنی ترک
کلام کے بھی کئے گئے ہیں یعنی ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دو۔ قال ابن عباس وعکرمة والضحاك والسدی ھجر الکلام (جصاص) ای لا یکلمھا وان وطئھا قاله عکرمة وابو الضحیٰ (ابن العربی) ۵۳۶ (ہلکے پھلکے) ضربا
غیر مبرح ولا شائن (ابن عباس) قال الحسن ضربا غیر مبرح وغیر مؤثر (جصاص) یہ تیسرا علاج اس وقت کے لئے ہے جب دوسرا علاج بھی ناکام ثابت ہو لے۔ والامور الثلاثة مرتبة ینبغی ان یتدرج فیھا (بیضاوی)

وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ
اور انہیں مارو ۵۳۶ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف بہانے نہ ڈھونڈو ۵۳۷
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿٣٤﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا
بیشک اللہ بڑا رفعت والا ہے بڑا عظمت والا ہے ۵۳۸ اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو ۵۳۹
فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ
تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کر دو ۵۴۰ اگر
يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دیگا ۵۴۱ بیشک اللہ بڑا علم رکھنے
عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿٣٥﴾ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ
والا ہے ہر طرح باخبر ہے ۵۴۲ اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرو ۵۴۳ اور
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ
حسن سلوک رکھو والدین کے ساتھ اور قرابت داروں کے ساتھ اور یتیموں اور
الْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَ
مسکینوں اور پاس والے پڑوسی اور دور والے پڑوسی اور
الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ
ہم مجلس اور راہگیر کے ساتھ اور جو تمہاری ملک میں ہے
اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿٣٦﴾
ان کے ساتھ ۵۴۴ قطعاً اللہ ایسوں کو دوست نہیں رکھتا جو خود بین ہیں فخار ہیں ۵۴۵

اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکی قسم کی ہو ایسی نہ ہو جس سے چوٹ زیادہ آجائے۔ یا جس سے رفیق زندگی کی توہین لازم آتی ہو۔ بلکہ مفسر صحابی ابن عباسؓ سے تو یہ منقول ہے کہ یہ مار مسواک جیسی ہلکی پھلکی چیز سے ہو۔ قال ابن عباس بالسواك ونحوه (بحر) قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے (لیکن بار بار اسے یاد کر لینے کی بھی ضرورت ہے) کسی ایک طبقہ کسی ایک قوم کسی ایک تمدن سے نہیں۔ اسکے مخاطب عرب و عجم، چینی اور حبش، انگریز اور ہندی، رومی اور جاپانی، اعلیٰ اور ادنیٰ، شریف و رذیل، عالم و عامی، فہیم اور کودن، چمار اور چوہڑے، نائی اور دھوبی، شہری اور دیہاتی، نیک بخت اور بد باطن، ہر طبقہ، ہر سطح، ہر ذہنیت کے لوگ پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک ہر زمانہ اور ہر دور والے ہیں اور اس کے احکام و مسائل میں لحاظ ہر انسانی ضرورت اور ہر بشری ماحول کا کر لیا گیا ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے معاشرے اور طبقے ایسے ہیں جہاں عورت کے لئے جسمانی سزائیں عام ہیں۔ علاج کی یہ صورت ظاہر ہے کہ انہی طبقوں کے لئے ہے۔ پھر اتنی اجازت بھی ضرورت پڑنے ہی پر ہے ورنہ سیاق عبارت نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے۔ وسوق الکلام للرفق فی اصلاحھن (جمل) فالتخفیف مراعی فی ھذا الباب علی ابلغ الوجوہ (کبیر) وقال الشافعی والضرب مباح وترکه افضل (کبیر) اور اہل تحقیق نے تصریح کر دی ہے کہ نرم تدبیر اگر کافی ہو جائے تو سخت تر صورت ہرگز جائز نہیں۔ مھما حصل الغرض بالطریق الاخف وجب الاکتفاء به ولم یجز الاقدام علی الطریق الاشد (کبیر) یورپ میں بیویوں کی مار پیٹ کا دستور جہاں جہاں ہے اس کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ قرآن مجید میں اس حکم کا ملنا قرآن مجید کے حق میں ذرا بھی مضر نہیں جیسا کہ بعض یورپ زدہ مسلمان سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ تو عین دلیل ہے اس کی کہ قرآن مجید کے احکام ہر طبقہ اور ہر مزاج اور ہر سطح انسانی کے لئے ہیں۔ ۵۳۷ (ان پر سختی اور زیادتی کرنے کے لئے) اوپر کی تدبیر تو محض ضرورت کیلئے ہے۔ بلا ضرورت اس کا استعمال بیوی کو ستانے اور تکلیف پہنچانے کیلئے ہرگز درست نہیں۔ ۵۳۸ (سو تم ایسی رفعت والے عظمت والے پروردگار کے حقوق میں کوتاہی سے کب ماورا ہو؟) شوہر اگر یہ مراقبہ کرتے رہیں تو بیویوں سے اپنے مطالبات میں یقیناً نرم پڑ جائیں اور ان کی طرف سے ادائے حقوق پر اتنا اصرار جاری نہ رکھیں۔ ۵۳۹ خطاب عام امت اسلامیہ کو ہے اور حکام اور اہل حل و عقد کو بدرجۂ اولیٰ۔ الخطاب کما قال ابن جبیر والضحاك وغیرھما للحکام (روح) وقال آخرون المراد کل واحد من صالحی الامة (کبیر) خطاب لجمیع المومنین (کبیر) بَيْنِهِمَا یعنی میاں بیوی کے درمیان۔ شِقَاقَ یعنی ایسی کشمکش جسے وہ باہم سلجھا سکیں۔ امت اور افراد امت کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ افراد کے باہمی اور خانگی مناقشوں سے معاشرۂ اسلامی کا دامن بالکل الگ اور بے تعلق نہیں کہ افراد ہی کی صالحیت پر امت کی صالحیت کا مدار ہے۔ آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ افراد کی خانگی نزاعوں کو امت اپنا ہی معاملہ سمجھے۔ اِنْ خِفْتُمْ۔ خوف یہاں بھی علم کے معنی میں ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۵۳۳ والمراد فان علمتم کما قال ابن عباس (روح) والخوف بمعنی الیقین وقیل ھو بمعنی الظن یعنی ان ظننتم شقاقا بینھما (معالم)

۵۴۰ (جو تصفیہ کی اہلیت رکھتے ہوں وہ جا کر تحقیق حال کریں) فَابْعَثُوْا۔ یعنی تصفیہ کی غرض سے ان دو حکموں کو ان میاں بیوی کے پاس بھیجو۔ میاں بیوی میں نزاع ہونے میں یہ ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ فوراً طلاق تم طلاق ہو جائے یا اور کسی ایسی ہی شدید کارروائی کی نوبت آجائے۔ بلکہ پہلے یہ کوششیں مصالحت و مفاہمت کی کر لی جائیں۔ رشتۂ ازدواج ایک اہم ترین رشتہ ہے اس پر بے پروائی سے ضرب نہیں لگائی جاسکتی۔ ۵۴۱ اِنْ يُّرِيْدَآ میں ضمیر تثنیہ دونوں حکموں کی جانب ہے اور بَيْنَهُمَا میں زوجین کی جانب۔ الضمیر الاول للحکمین والضمیر الثانی للزوجین (بیضاوی) والضمیر فی ان یریدا للحکمین وفی بینھما للزوجین (مدارک) ہوسکتا ہے کہ دونوں موقعوں پر ضمیر زوجین ہی کیلئے ہوں۔ وقیل کلاھما للزوجین (بیضاوی) او الضمیران للزوجین (مدارک) اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا۔ یعنی اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ نیت مصالحت و مفاہمت کی ہوگی تو اللہ تعالیٰ نیت میں برکت ضرور دیگا۔ اور قلب کی صفائی کی کوئی صورت نکال دیگا۔ فقہاء تھانویؒ نے لکھا ہے کہ فیصلہ کرنا واجب ہے اگر زوجین حکام سے رجوع کریں اور دوسروں کیلئے مستحب ہے اور مِنْ اَهْلِهٖ وَاَهْلِهَا کی قید بھی مستحب ہے۔ ۵۴۲ ہر انسانی ضرورت ہر بشری مصلحت پر اس کا علم محیط ہے۔ ۵۴۳ (ذات یا صفات میں) ۵۴۴ حسن سلوک کی تاکید والدین سے لے کر غلاموں اور باندیوں تک معاشرہ کے ہر طبقہ کے ساتھ اور پھر اس حکم کا عطف توحید الٰہی پر ـــــ دنیا کی کسی دوسری آسمانی کتاب میں اس منظم تعلیم کی نظیر ملیگی؟ اور اسی کے ساتھ محققین کی یہ تصریح کہ اہل حقوق گر کافر ہوں تب بھی ان کے ساتھ احسان کرے۔ البتہ مسلمان کا حق اسلام کی وجہ سے ان سے زائد ہوگا (تھانوی) وَالْجَارِ۔ حدیث میں آیا ہے جیسا کہ مفسرین نے محدث ابو نعیم اور محدث بزار کے حوالے لکھا ہے کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں (۱) ایک وہ جن پر تہرے حق ثابت ہیں۔ حق جوار، حق قرابت، حق اسلام۔ (۲) دوسرے وہ جن پر دوہرے حق ثابت ہیں۔ حق جوار و حق اسلام۔ (۳) تیسرے وہ جن پر ایک ہی حق ثابت ہے یعنی حق جوار اور وہ وہ پڑوسی ہے جو مشرک کتابی ہو۔ قرآن مجید کی یہ تصریح بھی یاد رہے کہ دونوں قسم کے پڑوسی حق رکھتے ہیں۔ قریب والے اور قرابت والے بھی اور دور والے اور اجنبیت والے بھی۔ مسلمان اگر آج ایک اسی تعلیم کو یاد رکھیں تو کتنی خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو جائے؟ بلکہ ایک تفسیر تو یہ بھی منقول ہے کہ جار ذی القربیٰ سے مراد مسلمان پڑوسی ہو اور جار الجنب سے یہودی و نصرانی۔ والجار ذی القربیٰ قال نوف الشامی ھو الجار المسلم والجار الجنب ھو الجار الیھودی والنصرانی فھی عندہ قرابة الاسلام واجنبیة الکفر (کبیر)

یحتمل ان یراد بالجار ذی القربیٰ من له مع الجوار قرب واتصال بنسب او دین و بالجار الجنب الذی لا قرابة له ولو مشرکاً (روح) وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ۔ اس
ہم مجلسی یا صحبت میں وقت کی کوئی قید نہیں۔ رفاقت و مصاحبت خواہ سالہا سال کی ہو خواہ چند منٹ کی بہرحال اپنا حق قائم کرجاتی ہے۔ اس کی تعریف کے ذیل میں ہم سبق، ہم مدرسہ، ہم سفر
، کھیل کود کے ساتھی، ریل اور جہاز کے ساتھی، شریکِ تجارت، شریکِ صنعت سب آجاتے ہیں۔ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ یہ ضرور نہیں کہ مسافر مہمان ہی بن کر آئے۔ خاطر تواضع بہ قدر وسعت
و حیثیت ہر آیندہ و روند کی ضروری ہے۔ ۵۴۵ اب یہاں سے اُن موانع کا بیان ہے جو ادائے حقوق کی راہ میں حائل ہوتے رہتے ہیں ان میں سے پہلی چیز خود بینی ہے اور دوسری چیز

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ
جو بخل کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں اللہ نے
مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا
اپنے فضل سے دے رکھا ہے اُسے چھپاتے ہیں ۵۴۶ اور ہم نے کافروں کے لئے ذلّت والا عذاب تیار
مُّهِيْنًا ۝۳۷ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ
کر رکھا ہے ۵۴۷ اور جو لوگ اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتے رہتے ہیں
وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ
اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روزِ آخرت پر (تو یہ سب کافروں ہی کے حکم میں
الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝۳۸ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ
داخل ہیں) ۵۴۸ اور جس کا مصاحب شیطان ہوا سو بُرا مصاحب ہوا ۵۴۹ اور انہیں کیا خرابی لاحق ہوجاتی
لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ
اگر یہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لے آتے اور جو کچھ اللہ نے انہیں دے رکھا ہے اس میں
اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝۳۹ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ
سے خرچ کرتے رہتے ۵۵۰ اور اللہ ان سے خوب واقف ہے بیشک اللہ ایک ذرّہ بھر ظلم نہیں
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ
کرے گا ۵۵۱ اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسے دوگنا کردیگا اور اپنے
مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۴۰ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ
پاس سے اجرِ عظیم دے گا ۵۵۲ سو اُس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمّت سے

نمائش و حبِّ جاہ۔ مُخْتَالًا وہ ہے جو اپنی بڑائی
کے خیال میں گرفتار رہتا ہے اور عزیزوں قریبوں،
پڑوسیوں کی طرف التفات کرنے میں کسرِ شان سمجھتا
ہے۔ فَخُوْرًا وہ ہے جو دوسروں پر اپنا فخر زبان
سے جتلاتا رہتا ہے۔ ۵۴۶ کہ ان تینوں قسم کے
لوگ اللہ کے ہاں ناپسندیدہ مخلوق میں داخل ہیں۔ ادائے حقوق میں خود بینی اور مختاری کے بعد تیسرا بڑا
مانع یہی بخل ہوتا ہے۔ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ
سے مُراد مال و دولت کا ہونا ظاہر ہے۔ دُوسرے
معنی علمِ دین کی دولت کے بھی کئے گئے ہیں اور
وعید میں وہ لوگ شامل سمجھے گئے ہیں جو مسائل
دین کے اظہار میں بخل کرتے رہتے ہیں۔ ۵۴۷ انسان
عموماً بخل اسی لئے کرتا ہے کہ مال بچا کر اس سے اپنے
جاہ میں اضافہ کرے۔ اس جاہ پرستی کی سزا قدرۃً
یہ ملے گی کہ عذاب سخت دردناک ہونے کے علاوہ
اسے خلق کی نظر میں ذلیل و رسوا کرنے والا بھی ہوگا۔
۵۴۸ رِئَاۗءَ النَّاسِ یعنی یہ لوگ اہلِ حقوق پر خرچ
نہیں کرتے بلکہ موقع نمود پر خرچ کرتے ہیں۔ جن
لوگوں کا ایمان خدا اور روزِ جزا پر نہیں ہوتا وہ جس موقع
پر اور جس مقصد سے بھی خرچ کریں گے بہرحال کوئی نہ
کوئی صورت رضاءِ خلق ہی کی ہوگی۔ حالانکہ اسلام
نے جان کی طرح گو اس سے کم درجہ میں، مال کی بھی خرچ
کی اجازت رضاءِ خالق ہی کے تحت دی ہے ۵۴۹
(جو ہمیشہ برائی ہی کی ترغیب دیتا رہے گا) مَنْ
يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا۔ جس کا مصاحب شیطان
ہوا۔ جیسا کہ ان سب لوگوں کا ہے۔ ۵۵۰ (دین
کی راہ میں اور اخلاص کے ساتھ) مَاذَا عَلَيْهِمْ۔
محاورۂ عربی میں ایسے موقع پر آتا ہے جیسے اُردو

میں کہتے ہیں، کیا غضب ہوجاتا، کون سی بڑی بات تھی! ۵۵۱ (قیامت کے دن) یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کی کوئی نیکی بلا اجر رہ جائے یا کوئی بدی کسی کے حساب میں خواہ مخواہ
لکھ لی جائے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ۔ اللہ جو خالقِ مطلق، حاکمِ مطلق، مالکِ مطلق ہے حقیقۃً ظلم کا اطلاق تو اس کے کسی فعل پر بھی کسی حال میں نہیں ہوسکتا۔ یہاں مُراد تو یہ ہے کہ وہ ظاہر
میں اور مجازی معنی میں بھی ظلم نہیں کرتا۔ آیت میں دو پہلو اور بھی ہیں۔ ایک تو مشرک قوموں نے اپنی دیوی دیوتاؤں کو ظالم، ستمگر، خونخوار مانا ہے (مثلاً کالی مائی) حق تعالیٰ کی تنزیہ اس
قسم کی صفات سے کلیۃً ہوگئی۔ دوسرے جن آیتوں میں حق تعالیٰ کی قوتِ مطلق اختیاراتِ کامل کا اثبات ہے، ان سے ممکن تھا کہ مسلمانوں کو بھی یہ خیال ہوجاتا کہ ہر طرح کا ظلم اس قادرِ مطلق کے لئے
روا ہے۔ اس کی تردید بھی آیت سے ہوگئی۔ ۵۵۲ (سو کیا ٹھکانا ہے ایسے پروردگار کی رحمت و کرم کا) مِنْ لَّدُنْهُ اپنے پاس سے یعنی زاید از استحقاق بلکہ بلا استحقاق۔ اسلام کا خدا نہ
کوئی خونخوار دیوتا ہے نہ ایسا معذور کہ کسی پر کرم کرنا چاہے بھی تو اپنی صفتِ عدل کو برقرار رکھنے کے لئے کسی اور پر ظلم اسے کرنا پڑے! ——— شرک اور مسیحی شرک دونوں کی تردید آیت سے
ہوگئی۔ ۵۵۳ (قیامت کے دن اس اُمّت سے متعلق اظہار دینے) یہ گواہ ہر اُمّت کے مقابل اُس اُمّت کے رسول ہونگے جو اس کی شہادت دیں گے کہ وہ احکام کی پوری پوری تبلیغ
کر آئے تھے۔

اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؁۴۱

ایک ایک گواہ حاضر کریں گے ؀۵۵۳ اور ان لوگوں پر آپ کو بطور گواہ پیش کریں گے، ؀۵۵۴

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ

جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور پیمبر کی نافرمانی کی ہے وہ اس روز

تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ؁۴۲

تمنا کریں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جائے، اور اللہ پر کوئی بات نہ چھپا سکیں گے ؀۵۵۵

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى

اے ایمان والو نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشہ میں ہو،

حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ

یہاں تک کہ جو کچھ (منہ سے) کہتے ہو اسے سمجھنے لگو ؀۵۵۶ اور نہ حالت جنابت میں ؀۵۵۷ جب تک کہ غسل

حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ

نہ کر لو ؀۵۵۸ بجز اس حال کے کہ تم مسافر ہو ؀۵۵۹ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو ؀۵۶۰ یا

جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ

تم میں سے کوئی استنجا سے آیا ہو ؀۵۶۱ یا تم نے اپنی بیویوں سے قربت کی ہو ؀۵۶۲ پھر تم کو

تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ

پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر

وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ؁۴۳ اَلَمْ تَرَ اِلَى

ہاتھ پھیر لیا کرو ؀۵۶۳ بیشک اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے بڑا بخشنے والا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ع ۹ ۴

؀۵۵۴ (اے پیغمبر!) هٰٓؤُلَآءِ (ان لوگوں) کا اشارہ کس جانب ہے؟ بہ ظاہر وہ لوگ مُراد معلوم ہوتے ہیں جو قرآن کے براہ راست یا بالواسطہ مخاطب تھے، اور جن سے رسول اللہ صلعم کا سابقہ تھا۔ ای علی امتک (ابن جریر) یعنی قومہ المخاطبین بالقرآن (کبیر) دوسری تفسیر یہ ہے کہ اشارہ ان گواہوں کی جانب ہے، یعنی ان گواہوں کے صدقِ بیان پر گواہ ہو کر۔ تشھد علی صدق هٰؤلاء الشھداء لعلمك بعقائدھم (بیضاوی) بہرصورت جب رسول اللہ صلعم اس آیت پر پہنچتے تھے تو اپنی ذمہ داری کے احساس اور فرطِ خشیت سے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آنسو چشمِ مبارک سے ظاہر ہو جاتے تھے۔ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتی علیھا فاضت عیناہ (ابن جریر)۔ جن بیدردوں نے قرآن کو کلام محمدی ٹھیرایا، وہ غور کریں، اپنے گھڑے ہوئے کلام سے بھی انسان کے آنسو جاری ہو سکتے ہیں؟ ؀۵۵۵ (بلکہ ہر چھپا ہوا راز اس روز ظاہر ہو کر رہیگا) یَوْمَئِذٍ۔ اس روز سے ظاہر ہے کہ روزِ حشر مُراد ہے۔ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ۔ تاکہ وہ پیوندِ زمین ہو کر حشر کی رسوائی اور عذاب سے محفوظ رہیں۔ ؀۵۵۶ یعنی نشہ اُتر جائے اور زبان قابو میں آجائے۔ آیت اُس وقت کی ہے جبکہ حُرمتِ شراب کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اوقاتِ نماز میں تو شراب پینے سے باز رہو۔ یہ مطلب نہیں کہ شراب تو اسی طرح پیتے چلے جاؤ اور نشہ کی حالت میں نماز چھوڑے رہو۔ ؀۵۵۷ یعنی حالتِ جنابت کے بعد غسل کرنا فرض ہے، بغیر اس کے نماز درست نہ ہوگی۔ مرد کو انزال ہو جانا۔ عورت کو حیض آجانا، مرد و عورت دونوں کا عمل مباشرت کرنا (خواہ انزال کے بغیر ہو) یہ سب حالتیں جنابت کی ہیں۔ اَلصَّلٰوةَ سے مُراد مواضع الصلٰوۃ بھی لی گئی ہے۔ یعنی مسجدیں۔ ای مواضع الصلٰوۃ وھی المساجد (مدارک) المراد مواضع الصلٰوۃ وھو قول الشافعی (قرطبی) ؀۵۵۸ یعنی بجز حالتِ سفر کے کہ جب پانی کا ملنا اور غسل کا انتظام ہونا دشوار ہو۔ ایسی حالت کا حکم ابھی آگے آتا ہے۔ ولا یحل لاحد ان یقرب الصلٰوۃ وھو جنب الا بعد الاغتسال الا المسافر فانہ یتیمم وھذا قول ابی حنیفۃ (قرطبی) جن فقہاء نے الصلٰوۃ سے مراد مواضع الصلٰوۃ لی ہے انہوں نے الا عابری سبیل سے جنبی کی ضرورت کے وقت مسجد سے گزرنے کا جواز نکالا ہے۔ فیجوز للجنب العبور فی المسجد عند الحاجۃ (مدارک) ھذا یقتضی جواز العبور للجنب فی المسجد لا الصلٰوۃ (قرطبی) ؀۵۵۹ (اور مرض اور سفر دونوں صورتوں میں پانی کا استعمال یا مُضر ہو، یا اس کا بہم پہنچانا دشوار ہو، یا غسل کا انتظام نہ ہو سکتا ہو) ؀۵۶۰ (اور اس لئے وضو باقی نہ رہا ہو) ؀۵۶۱ (اور اس لئے غسل فرض ہو گیا ہے) لٰمَسْتُمُ۔ لمس اور مس دونوں کے لفظی معنی چھونے کے ہیں۔ اس لئے بعض فقہاء نے یہاں بھی محض ملامست مراد لی ہے اور ملامستِ نساء کو موجباتِ وضو میں سے قرار دیا ہے لیکن لمس کے مجازی معنی ہمبستری کے ہیں۔ ویکنی بہ وبالملامسۃ عن الجماع (راغب) من المجاز اللمس والملامسۃ المجامعۃ (تاج) اور مس تو قرآن مجید میں بھی ہمبستری کے معنی میں آیا ہے۔ ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن اس لئے فقہاء حنفیہ نے یہاں لمس سے بھی ہمبستری ہی مراد لی ہے اور یہی مذہب قوی ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابیوں اور مجاہد و طاؤس، حسن بصری، سعید بن جبیر وغیرہم تابعین سے بھی یہی منقول ہے۔ ای جامعتم النسآء (ابن عباسؓ) قال قوم ھو المجامعۃ وھو قول ابن عباس والحسن والمجاھد وقتادۃ (معالم) روی عن علی وابی ابن کعب ومجاھد وطاؤس والحسن وعبید بن عمیر وسعید بن جبیر والشعبی وقتادۃ ومقاتل بن حیان نحو ذٰلك (ابن کثیر) وکنی بالملامسۃ من الجماع والی ذٰلك ذھب علی کرم اللہ تعالیٰ وجھہ وابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما والحسن (روح) ؀۵۶۲ یعنی ایسی مٹی ہو جو خود غیر طاہر یا گندی نہ ہو، دو دو بار ہاتھ مار کر پہلی بار پورے چہرہ اور دوسری بار ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیر لیا کرو۔ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً۔ یعنی کسی سبب سے بھی ہی۔ پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو۔ ماء کے صیغۂ نکرہ میں آنے سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ پانی کسی قسم کا بھی ہو، وضو کے لئے درست ہے۔ فھو عام فی کل ما کان من سماء او نھر او عین عذب او ملح (قرطبی) امام ابوحنیفہؒ نے اس میں اتنی وسعت یہ رکھی ہے کہ رنگ، مزہ یا بو بدلے ہوئے پانی تک کی اجازت دے دی ہے۔ واجاز ابوحنیفۃ الوضوء بالماء المتغیر (قرطبی) پانی کی معدومیت ایک تو حقیقی ہے وہ یہی کہ پانی موجود نہ ہو۔ دوسری حکمی یعنی موجود تو ہو لیکن اس کا استعمال مرض پیدا کرے یا مرض کو بڑھائے یا کسی اور وجہ سے اس کے استعمال سے معذوری ہو۔ فقہاء نے نام صرف چند چیزوں کے گنائے ہیں۔ فلم تقدروا علی استعمالہ لعدمہ او بُعدہ او فقد آلۃ الوصول الیہ او لمانع من حیۃ او سبع او عدو (مدارک) لو کان یجد الماء الا انہ مریض یخاف ان استعمل الماء اشتد مرضہ تیمم (ہدایہ) والمقاان یخاف فوات الرفیق او علی الرحل بسبب طلبہ لصوصا او سباعا او فوات الرفیق او عطشا علی نفسہ او علی غیرہ وکذا لو بطو بطیئ مخطۃ بدنہ فاذا کان احد ھٰذہ الاشیاء تیمم وصلی (قرطبی) صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ صعید لغت میں کہتے ہیں زمین کے بالائی رُخ کو، نہ کہ نفس مٹی کو۔ الصعید یقال لوجہ الارض (راغب) قال الزجاج لیس ھو التراب انما ھو وجہ الارض ترابا کان او غیرہ (تاج) والذی یعضد الاشتقاق وھو صریح اللغۃ انہ وجہ الارض علی ای وجہ کان من رمل او حجر او مدر او تراب (ابن العربی) اس لئے حنفیہ کے ہاں جنس ارض کی تمام چیزوں پر تیمم جائز ہے خواہ ان پر گرد پڑی ہو یا نہ پڑی ہو اور امام مالکؒ اور ثوریؒ وغیرہ دوسرے ائمۂ فقہ بھی اس باب میں حنفیہ کے ہم زبان ہیں۔ ویجوز التیمم عند ابی حنیفۃ ومحمد بکل ما کان من جنس الارض (ہدایہ) یتیمم بالمطھر من جنس الارض وان لم یکن علیہ نقع (در مختار) یتیمم بوجہ الارض کلہ ترابا کان او رملا او حجارۃ او معدنا او صبخۃ ھٰذا مذھب مالك وابی حنیفۃ والثوری والطبری (قرطبی) جنس ارض میں سے ہونے کی شناخت یہ ہے کہ وہ آگ میں نہ جل جائے نہ اس سے پگھل جائے چنانچہ گیرو، پتھر، سُرمہ، یاقوت۔ زبرجد وغیرہ پر اس قاعدہ کے موافق اور چونہ پر اس قاعدہ کے خلاف عمل جائز ہے۔ البتہ خاکستر (راکھ) پر جائز نہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک تیمم صرف مٹی ہی پر جائز ہے۔ ؀۵۶۳ (چنانچہ دشوار موقعوں کے لئے اُس نے کیسے آسان حکم دے رکھے ہیں)

۵۶۴ (اے مسلمانو!) یہود خود تو علم توریت کے باوجود کفر و ضلالت اختیار کئے ہوئے تھے ہی، مسلمانوں کو بھی اسلام سے برگشتہ کرنے کی جو طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ یہ اشارہ اسی طرف ہے۔ مِنَ الْكِتٰبِ۔ کتاب سے مراد جنس کتاب ہے یعنی توریت۔ اَلَمْ تَرَ۔ میں خطاب عام ہے ہر مخاطب کے لئے۔
۵۶۵ (اور اُس نے تم کو بھی خبردار کر دیا) ۵۶۶ اللہ کا حمایتی ہونا یہ ہے کہ وہ مومن بندوں کی مصلحتوں کی رعایت کرتا رہتا ہے اور اُس کا مددگار ہونا یہ ہے کہ وہ انہیں دشمنوں کی نقصان رسانی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ۵۶۷ (اور لفظی و معنوی ہر قسم کی تحریف کرتے رہتے ہیں) اَلْكَلِمَ۔ کلام سے مُراد کلام الٰہی یا توریت ہے۔ اَلَّذِيْنَ هَادُوْا۔ یہ وہ لوگ تھے جو نسلاً اسرائیلی نہیں، بلکہ عرب تھے لیکن یہود کی طویل صحبت سے متاثر ہو کر خود بھی یہود کے شعائر و عقائد اختیار کر کے رفتہ رفتہ ان میں جذب ہو چکے تھے۔ شرارت و خباثت میں یہ بھی نسلی یہود سے کچھ کم نہ تھے تفصیل پارۂ اول میں گزر چکی۔ نحویین کہتے ہیں کہ هادوا اور یحرفون کے درمیان مَن محذوف ہے۔ قال الفرا المحذوف مَن المعنی من الذین هادوا مَن یحرفون (قرطبی) ۵۶۸ (یعنی ان کے حق میں نافع بھی اور مطابق واقعہ بھی) عرب یہود کی مستمر شرارتوں اور خباثتوں میں سے یہ امر بھی تھا کہ رسُول اللہ صلعم کو مخاطب کرتے وقت ایسے الفاظ قصداً بولتے جن میں پہلوئے ذم بھی نکلتا رہتا اور تحقیر یا بددعا پیدا ہوتی رہتی۔ پارۂ اول میں بھی یہ ذکر پوری وضاحت سے آچکا ہے۔ یہود کی ان گستاخیوں کا دار و مدار چونکہ تلفظ اور الفاظ ہی کے سوء استعمال پر ہے اس لئے ترجمہ سے اصل مفہوم پوری طرح ظاہر ہی نہیں ہو سکتا۔ اصل عربی الفاظ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ سَمِعْنَا

اَلَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ
کہ جنہیں کتاب سے حصہ ملا تھا وہ گمراہی کو مول لے رہے ہیں

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۴۴ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ
اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ ۵۶۵ اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۴۵ مِنَ الَّذِيْنَ
اور اللہ کا حمایتی ہونا کافی ہے اور اللہ کا مددگار ہونا کافی ہے ۵۶۶ جو لوگ یہودی ہو گئے

هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا
ہیں ان میں سے ایسے بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقعوں سے پھیرتے رہتے ہیں ۵۶۷ اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا

وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا ۢ بِاَلْسِنَتِهِمْ
مگر ہم نے مانا نہیں اور (ہماری) سنو اور تمہیں سنوایا نہ جائے، اور "راعنا" میں زبانوں کو توڑ موڑ کر

وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا
دین میں طعنہ زنی کی راہ سے اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے قبول کیا،

وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ
اور (ہماری) سنو اور "انظرنا" تو ان کے حق میں کہیں بہتر اور درست تر ہوتا ۵۶۸ لیکن اللہ نے

لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۴۶
تو ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کی ہے ۵۶۹ سو وہ ایمان نہ لائیں گے مگر تھوڑے سے ۵۷۰

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا
اے وہ لوگو جنہیں کتاب مل چکی ہے اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے

وَعَصَيْنَا۔ ظاہری مطلب یہ تھا کہ ہم نے آپ کا ارشاد سُن لیا اور آپکے گمراہ کُن مخالف و معاند کا قول نہیں مانا لیکن اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہم نے تمہاری بات تو سُن لی لیکن اُسے قبول نہیں کیا۔ اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ۔ ظاہر مطلب یہ تھا کہ کوئی مخالف اور رنج دہ بات آپکے کان میں نہ جائے لیکن اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ تمہیں کوئی اچھی بات سنائی ہی نہ دے۔ رَاعِنَا۔ راعنا کا ظاہر مطلب یہ تھا کہ ہماری رعایت سے دوبارہ فرمایئے لیکن تلفظ میں "ع" کو ذرا کھینچ کر پڑھنے سے بالکل گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا تھا۔ لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ یعنی بظاہر لہجے سے تعظیم و توقیر نظر آتی تھی لیکن زبانیں تقیہ سے کام لیتی ہوتی تھیں اور دل کے بغض و عناد کو چھپائے ہوئے رہتی تھیں۔ طَعْنًا فِى الدِّيْنِ۔ اس تصریح نے بتا دیا کہ عرب یہود کی یہ ساری حرکتیں بے خیالی سے خالی نہ تھیں اور نہ تفریح طبع کے طور پر تھیں۔ بلکہ اللہ کے دین پر طعن کرنا، اسے مجروح کرنا مقصود بھی تھا۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ اسمع انظرنا۔ تعلیم ان الفاظ کی ہوئی کہ پہلوئے ذم سے خالی ہیں۔ ۵۶۹ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ۔ یعنی اللہ نے ان کے دلوں کو اپنی رحمت خاصہ سے دُور کر دیا۔ لعنت پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا۔ بِكُفْرِهِمْ۔ اس سے یہ صاف ہو گیا کہ رحمتِ خاصہ سے بھی یہ دُوری اور مہجوری خود بخود اور بلا سبب نہیں ہوئی بلکہ یہ انہی کے کرتوتوں کا ثمرہ ہے ۵۷۰ اور یہ تھوڑے سے وہی تھے جو آگے چل کر مسلمان ہو گئے باقی سب کا خاتمہ علم الٰہی کے مطابق کفر ہی پر ہوا

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا

تصدیق کرنے والی اس (کتاب) کی جو تمہارے پاس ہے ۵۷۱ قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں اور

فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ

چہروں کو ان کے پیچھے کی جانب الٹا دیں ۵۷۲ یا ہم ان پر اس طرح لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں

السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝۴۷ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ

پر لعنت کی تھی ۵۷۳ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے ۵۷۴ اللہ اس کو تو بیشک نہ بخشے گا کہ

اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ

اس کے ساتھ شرک کیا جائے ۵۷۵ لیکن اس کے علاوہ جس کسی کو بھی چاہے گا بخش دے گا اور جو کوئی (کسی کو)

يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝۴۸ اَلَمْ تَرَ اِلَى

اللہ کا شریک ٹھیراتا ہے اس نے یقیناً ایک بڑا گناہ سمیٹا ۵۷۶ کیا تو نے ان پر نظر نہیں کی

الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ

جو اپنے کو پاکیزہ ٹھیراتے ہیں ۵۷۷ حالانکہ اللہ جسے چاہے پاکیزہ ٹھیرائے ۵۷۸

وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۴۹ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي

اور ان پر دھاگا برابر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا ۵۷۹ دیکھ تو یہ لوگ اللہ پر کیسا جھوٹا طوفان

ع ۸/۴

اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰ اَلَمْ تَرَ اِلَى

باندھتے ہیں اور یہ کافی ہے جرم صریح کے لئے ۵۸۰ کیا تو نے ان لوگوں پر

الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ

نظر نہیں کی جنہیں کتاب سے بہرہ ور کیا گیا تھا ۵۸۱ اس پر بھی یہ بت اور شیطان کو

۵۷۰ اُوْتُوا الْكِتٰبَ میں کتاب سے مراد توریت ہے۔ بِمَا نَزَّلْنَا اس کتاب پر جسے ہم نے اب اپنے رسول پر نازل کیا ہے یعنی قرآن پر۔ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ یعنی قرآن تو اصل توریت کی تصدیق ہی کرنے والا ہے۔ اس کے محرف اجزا ظاہر ہے کہ اس عام تصدیق سے مستثنیٰ ہیں۔ **۵۷۲** (غرض اسی طرح کے کسی عذاب شدید و ہولناک میں مبتلا کردیں) نَطْمِسَ وُجُوْهًا۔ طمس وجہ سے مراد ہے چہرہ کے نقش و نگار اور آنکھ و ناک منہ وغیرہ اعضا کو مٹا دینا۔ فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَا۔ یعنی ان لوگوں کے چہروں کو گدیوں کی طرح صفاچٹ کردیں۔ ف ہمیشہ تعجب ہی کے لئے نہیں ہوتی کبھی تفصیل اجمال کے لئے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں اسی غرض سے ہے۔ اور یہ دوسرا فقرہ پہلے فقرہ کی تفصیل و توضیح کر رہا ہے۔ یہ سزاویں سب عذاب اُخروی کے ہیں لیکن وجوہ کے معنی مجازاً سرداروں اور رئیسوں کے بھی آئے ہیں۔ قیل عنی بالوجوہ الاعیان والرؤساء (راغب) یراد بالوجوہ رؤسہم ووجہاؤہم (کشاف) اس لئے فقرہ کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان کے سرداروں کو ذلیل و خوار کریں چنانچہ کشاف و کبیر وغیرہ میں یہ معنی بھی نقل ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس کے متصل فقرہ کے معنی یہ ہوں گے کہ "ہم ان کی وجاہت و اقبال کو سلب کرلیں اور ان پر ذلت و ادبار نازل کریں" چنانچہ کشاف، بیضاوی وغیرہ میں یہ قول بھی نقل ہوا ہے۔ مِنْ قَبْلِ کا صحیح مفہوم پیش نظر نہ رہنے سے ایک سوال یہ پیدا ہوگیا ہے کہ طمس و مسخ کی یہ سزا ملی ہی کب؟ ظاہر ہے کہ ان سزاؤں کا ظہور تو آخرت میں ہوگا اور من قبل ہمیشہ کسی واقعہ کے واقع ہوجانے ہی پر دلالت نہیں کرتا بلکہ صرف اس کے ہوسکنے پر بھی دلالت کرتا ہے اور محل تہدید میں آتا ہے تو اس معنی میں اس کا استعمال قرآن مجید میں کثرت سے ہوا ہے۔ حدیث نبوی میں ایک دعا آتی ہے۔ اللّٰهم ارزقني عينين هطالتين تسقيان القلب بذروف الدمع من خشيتك قبل ان تكون الدموع دمًا والاضراس جمرًا۔ قبل کے یہاں یہ کوئی معنی بھی نہیں سمجھتا کہ بعد کا واقعہ صرف مؤخر ہے اور واقع ہو کر رہے گا بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس کے وقوع سے اپنے کو بچایا جائے۔ اردو ہی کے محاورہ میں ہم برابر کہتے رہتے ہیں کہ قبل اس کے کہ دوزخ میں پڑو گناہوں سے توبہ کرلو۔ اس کا یہ مطلب کوئی بھی نہیں لیتا کہ دوزخ میں تو بہرحال پڑنا ہی صرف نا تا اس سے قبل توبہ کرلینا چاہیئے بلکہ صاف مطلب یہ ہے کہ دوزخ سے بچنے کے لئے گناہوں سے توبہ کرلو۔ اسی طرح آیت کا خلاصۂ مفہوم صرف اس قدر ہے کہ طمس و مسخ کی سزاؤں سے بچنے کے لئے قرآن و صاحب قرآن کی تصدیق کرلو۔ **۵۷۳** اصحٰب السبت پر حاشیہ پارۂ اوّل میں گزر چکا۔ **۵۷۴** (سو طمس، مسخ، لعنت جس چیز کا بھی حکم ہوگیا وہ بہرحال پورا ہو کر رہے گا) **۵۷۵** (سو مشرک عذاب دائمی میں مبتلا رہے گا) مشرک کی نجات کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اس نے جنت کی نعمتوں کے قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت ہی اپنے میں باقی نہ رکھی۔ **۵۷۶** (اور اس جرم عظیم کی بنا پر وہ قابل مغفرت نہ ہوگا) اِفْتَرٰٓى اِثْمًا۔ گناہ سمیٹنا کا محاورہ خاص اس مفہوم کے ادا کرنے کو ہے۔

مَا دُوْنَ ذٰلِكَ۔ یعنی اور جتنے بھی گناہ ہوسکتے ہیں، وہ بہرحال شرک سے کمتر ہی ہوں گے۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ۔ یعنی شرک تو آسمانی حکومت سے صریح بغاوت کے مرادف ہے بس اسے چھوڑ کر باقی ہر معصیت مغفرت کی گنجائش رکھتی ہے اور جس کسی کے حق میں مشیت الٰہی ہوگی اسے معافی مل جائے گی۔ خواہ اس نے توبہ نہ بھی کی ہو۔ وقد ابانت هذه الاٰية ان كل صاحب كبيرة ففي مشيئة الله ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه عليها ما لم تكن كبيرته شركًا بالله (ابن جریر) اي يغفره ادون الشرك وان كان كبيرة مع عدم التوبة (مدارک) آیت میں رد ہے خوارج وغیرہ ان گمراہ فرقوں کا جو سمجھتے ہیں کہ ہر گناہ شرک ہے اور ہر گناہ کی سزا عذاب ابدی ہے۔

لِمَنْ يَّشَاۗءُ۔ مشیت کا اطلاق بلا کسی قید و شرط کے ہے یہیں سے رد نکل آیا معتزلہ کا جو کہتے ہیں کہ مغفرت ان کی ہوگی جو توبہ کرلیں، ان کی جو توبہ نہ کریں گے۔ توبہ کے بعد تو ظاہر ہے کہ اہل کفر و شرک کی بھی مغفرت ہوجاتی ہے۔ تفسیر کبیر میں امام رازیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے تھے کہ جس طرح شرک کے ساتھ کوئی عمل نفع نہیں پہنچا سکتا ہے اسی طرح میرا خیال ہے کہ توحید کے ساتھ کوئی عمل ضرر نہیں کرتا۔ یہ قول حضرت عمرؓ کے سامنے دہرایا گیا تو آپ نے اس پر سکوت اختیار کیا۔ **۵۷۷** اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ۔ یعنی ایسے لوگوں کی حماقت بھی قابل دید ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔ یعنی اللہ نے توحید و تقویٰ کو جو معیار فضیلت و مقبولیت رکھ دیا ہے، اسے چھوڑ چھاڑ لوگوں نے نسل وغیرہ کے طرح طرح کے معیار شرف و بزرگی کے گڑھ لئے ہیں اور ان بنیادوں پر اپنے کو معظم و مقدس سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ تمامتر حماقت و ضلالت ہے۔ آیت کا اشارہ خاص یہود کی جانب ہے۔ اپنے کو نسل انبیا میں سے ہونے کی بنا پر مقدس سمجھے ہوئے تھے۔ باقی ہندوستان میں برہمن، چھتری وغیرہ اپنے کو محض مقدس خاندانوں سے انتساب کی بنا پر مقدس سمجھنے والے، اپنے چندر بنسی، سورج بنسی ہونے پر فخر و ناز کرنے والے یا جاپانیوں کی طرح اپنے کو دیوتاؤں کی نسل میں قرار دینے والے سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔ اور ہاں پھر کسی درجہ میں مسلمان پیرزادے، مخدوم زادے، سید زادے وغیرہا۔ **۵۷۸** یعنی معتبر تو پاکیزگی اسی کی ہے جسے اللہ پاکیزہ قرار دے اور اپنے زعم و پندار میں اپنے کو پاکیزہ ٹھیرا لینے سے کیا ہوتا ہے۔ **۵۷۹** یعنی جو سزا انہیں ملے گی، وہ ان کے جرم سے ذرہ بھر بھی زائد نہ ہوگی۔ ان کا جرم ہے ہی اسی سزا کا مستحق۔ فَتِيْلًا۔ فتیل کے لفظی معنی دھاگے کے ہیں۔ عربی محاورہ میں مراد حقیر سی حقیر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے ہوتی ہے۔ جیسے ایک دوسری جگہ ولا يظلمون نقيرًا۔ بھی آیا ہے۔ يرجع الى الكناية عن تحقير الشيء وتصغيره (قرطبی) اشارة الى اقل شيء (بحر) جیسے اردو میں ایسے موقع پر "ذرہ بھر" "رتی بھر" "بال برابر" استعمال ہوتے ہیں۔ **۵۸۰** (تو ایسے صریح جرم پر ایسی سزا کیا کچھ ظلم و زیادتی ہے؟) بِهٖ میں ضمیر افتراء یعنی افترا علی اللہ کی جانب ہے۔ والضمير في به عائد على الافتراء وهو الذي انكر عليهم (بحر) **۵۸۱** یعنی یہود۔ اور کتاب سے مراد کتاب الٰہی یا توریت ہے۔

وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ

مانے ہوئے ہیں ۵۸۲ اور کفر کرنے والوں کی بابت کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے

مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ

تو یہی لوگ زیادہ ہدایت یاب ہیں ۵۸۳ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی

اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ۝ أَمْ لَهُمْ

ہے ۵۸۴ اور جس پر اللہ لعنت کرے تو اُس کا کوئی مددگار ہرگز نہ پائے گا ۵۸۵ کیا انہیں بھی

نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ۝

کچھ اقتدار نصیب ہو جائے تو یہ تو لوگوں کو تل بھر بھی نہ دیں ۵۸۶

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن

کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اُن چیزوں کے باعث جو انہیں اللہ نے اپنے فضل سے

فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ

دے رکھی ہیں ۵۸۷ سو ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت دی ہے اور ہم نے

آتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ۝ فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم

انہیں بڑا اقتدار بھی دیا ہے ۵۸۸ اور ان میں سے کوئی کوئی تو اس پر ایمان لائے اور

مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ

کوئی کوئی اس سے رکے رہے اور دہکتا ہوا جہنم ہی کافی ہے ۵۸۹ بیشک جن لوگوں نے

كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ

ہماری نشانیوں کے ساتھ کفر کیا ہم انہیں عنقریب (دوزخ کی) آگ میں جھونکیں گے جب کبھی ان کی

۵۸۲ الجبت۔ جبت کا اطلاق تو اللہ کے سوا ہر معبود پر ہوتا ہے۔ یقال لکل ما عبد من دون اللہ جبت (راغب) لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا استعمال ساحروں اور کاہنوں کے لئے ہوتا ہے۔ سمی الساحر والکاھن جبتا (راغب) صحابہ اور تابعین دونوں سے یہ معنی منقول ہیں۔ قال عمرؓ الجبت السحر (ابن جریر) قال ابن عباس وابن جبیر وابو العالیۃ الجبت الساحر (قرطبی) یہود میں عملیات کا اور سحر، کہانت، نجوم، وغیرہ علوم سفلی کا ذوق ابتدا سے چلا آرہا ہے، جیسا کہ پارۂ اول میں آیۃ واتبعوا ما تتلوا الشیاطین کے تحت میں دکھایا جا چکا ہے۔ جبت کا لفظ لاکر عجب نہیں کہ اشارہ ان کی اسی قومی خصلت کی جانب کرنا مقصود ہو۔ الطَّاغُوتِ۔ طاغوت پر حاشیہ پارۂ سوم میں گزر چکا۔ طاغوت ہر وہ چیز ہے جو انسان میں طغیان و عدوان پیدا کردے۔ الطاغوت کل ما یطغی الانسان (قرطبی) عجب نہیں کہ یہ لفظ لاکر یہود کے رجحان مادیت اور ذوق مادہ پرستی کی طرف توجہ دلانا منظور ہو۔ ۵۸۳ روایتوں میں آتا ہے کہ سرداران یہود مکہ میں آئے تو قریش نے اُن سے پوچھا کہ ہمارا دین بہتر ہے یا پیروان محمدؐ کا۔ اور سوال میں اپنے دینی کارناموں، مثلاً خدمت حجاج، خدمت کعبہ کا ذکر بھی کر دیا۔ سرداران یہود بولے کہ ان کے دین سے تو تمہارا ہی دین بہتر ہے۔ اور اُن سے زیادہ ہدایت یاب تم ہی ہو۔ لِلَّذِينَ كَفَرُوا۔ الذین کفروا سے مراد قریش و مشرکین مکہ ہیں۔ ل کے معنی "بابت" یا "متعلق" کے ہیں۔ للذین ای فی حقہم (روح) واللام للتبلیغ (بحر) الَّذِينَ آمَنُوا۔ سے مراد مسلمان ہیں۔ ۵۸۴ خود دین توحید رکھ کر اور آئین انبیا سے آشنا ہو کر، دین توحید سے اتنی بیزاری اور ذات رسولؐ سے اتنا بغض کہ شرک اور مشرکین تک کو اُن سے بہتر بتا رہے ہیں۔ ملعونیت کا تحقق ان سے بڑھ کر اور کس پر ہوگا۔ ۵۸۵ (جو عذاب سے اُسے بچالے یا اس میں کچھ کمی بھی کرا دے) مشرک قوموں اور قبیلوں نے خدا کے ساتھ ساتھ اپنے اور بھی حمایتی گڑھ کر رکھے تھے۔ ۵۸۶ یعنی اپنی مقبولیت اور روحانی عظمت الگ رہی۔ یہود کو اگر دنیوی امارت و سیادت نصیب ہوتی تو یہ اتنے بخیل اور تنگدل ہیں کہ اس میں بھی کسی کو شریک نہ ہونے دیتے۔ بلکہ لوگوں کے حقوق تک نہ ادا کرتے۔ اور شاید اسی بخیلی، تنگدلی کی قومی جبلت کی بنا پر یہود دنیوی اقتدار سے بھی محروم کر دیے گئے ہیں۔ نَقِيرًا۔ نقیر کے لفظی معنی اُس گڑھے کے ہیں جو کھجور کی گٹھلی میں ہوتا ہے۔ عربی محاورہ میں مثل فتیل کے حقیر سی حقیر اور چھوٹی سی چھوٹی چیز اس سے مراد ہوتی ہے۔ جیسے اُردو میں رائی بھر، رتی بھر وغیرہ بولتے ہیں "تل برابر" ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ہے۔ لا یؤتون نقیرا ای بمنعون الحقیر ق (قرطبی) ۵۸۷ (مثلاً نعمت نبوت) النَّاسَ کے لفظی معنی تو "لوگوں" کے ہیں لیکن یہاں مراد عرب یا بنی اسمٰعیل یا خود رسولؐ اور مومنین ہیں۔ الناس ھنا العرب حسدتہا بنو اسرائیل (بحر عن قتادہ) حسدت الیہود قریشا لان النبوۃ فیھم (قرطبی عن الضحاک) المراد ھھنا الرسول ومن معہ من المومنین (کبیر) یہود کو اصلی خلش اسی کی تھی کہ انبیاء تو ہمیشہ اسرائیلیوں میں ہوئے ہیں، یہ ایک عرب کو کیسے نبوت مل گئی۔ آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ۔ مراد نبوت ہے۔ قتادہ وابن جریج تابعین سے یہی معنی مروی ہیں معنی الفضل فی ھذا الموضع النبوۃ التی فضل اللہ بھا محمدا وشرف بھا العرب (ابن جریر عن قتادہ وابن جریج) اولی التاویلین فی ذلک بالصواب قول قتادۃ وابن جریج الذی ذکرنا قبل (ابن جریر) ۵۸۸ آلَ إِبْرَاهِيمَ۔ اور نسل ابراہیمی کی دو شاخیں ہیں، بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل۔ یہاں یہود کو یاد دلایا گیا ہے کہ ہماری نعمتوں کے وعدے تو کل نسل ابراہیمؑ سے ہیں نہ کہ اس کی ایک ہی شاخ سے۔ پھر تم تنہا اپنے ہی کو ان نعمتوں کا حقدار کیسے سمجھنے لگے ہو۔ اور جب ایک اسمٰعیلی کو نعمتیں مل رہی ہیں تو تمہیں اس پر حسد یا حیرت کیوں ہے؟ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ دونوں روحانی نعمتیں ہیں۔ ان کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے اور مُلکاً عظیماً دنیوی نعمت ہے اس کا ذکر الگ کر کے کیا ہے۔ ۵۸۹ (سو دنیا میں سزا ملنا نہ ملنا چنداں قابل التفات نہیں) مَّنْ آمَنَ بِهِ۔ میں ضمیر کس طرف ہے؟ بعض نے مراد کتاب لی ہے بعض نے وہ سارا فقرہ جو آل ابراہیم سے متعلق گزرا ہے اور بعض نے ذات محمدیؐ کو۔ ماحصل تینوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔ من آمن بالکتاب (بحر) بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم او بما ذکر من حدیث آل ابراھیم (بیضاوی) یعنی بالنبی (صلعم) (قرطبی)

جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ

جلدیں پک جائیں گی ہم ان کی جلدوں کو بدل کر دوسری کر دیا کرینگے تاکہ وہ برابر عذاب چکھتے رہیں ۵۹۰

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے ۵۹۱ اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے

الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

نیک عمل بھی کئے انہیں ہم عنقریب باغوں میں داخل کرینگے جن کے نیچے نہریں پڑی بہ رہی ہوں گی

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ

ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے ، ان کے لئے ان باغوں میں صاف ستھری بیویاں

مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿٥٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ

ہوں گی اور ہم انہیں بڑے گنجان سایہ میں لا اتاریں گے ۵۹۲ اللہ تمہیں حکم دیتا

يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَھْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ

ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو ۵۹۳ اور جب لوگوں کے

بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا

درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو ۵۹۴ بیشک اللہ تم کو بہت ہی اچھی

يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿٥٨﴾ يٰٓاَيُّهَا

بات کی نصیحت کرتا ہے ۵۹۵ بیشک اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا دیکھنے والا ہے ۵۹۶ اے ایمان والو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے اہلِ اختیار کی

ع

۵۹۰ آیت کا مقصود اہلِ دوزخ کے دوامِ عذاب کا اعلان ہے۔ نضجت ۔ نضج کے لفظی معنی پک جانے کے ہیں۔ یہاں مراد جل چکنے سے ہے مقصود یہاں یہی ہے کہ عذاب منقطع نہ ہوگا۔ اور احساسِ عذاب ہمیشہ تازہ ہوتا رہے گا۔ ویمکن ان یقال ھذا استعارة عن الدوام وعدم الانقطاع (کبیر) المقصود بیان دوام العذاب وعدم انقطاعہ (کبیر) صاحب بحر نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے اگرچہ قبول نہیں کیا ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ یہ سمجھنا کہ کھال جب جل جائے گی تو اس میں مزید الم کا ادراک ہی کہاں باقی رہے گا نہیں بلکہ کھال کا احساس ہر دم تازہ ہوتا رہے گا اور جلد بے حس کبھی بھی نہ ہونے پائے گی ـــــــ آخرت میں خواص اشیاء کو دنیا کے خواص طبعی پر قیاس کرنا یوں بھی کمال بے دانشی ہے۔ ۵۹۱ چنانچہ صفتِ عزیز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نئے پرانے ہر قسم کے عذاب پر ہر وقت قادر ہے اور صفتِ حکیم کا تقاضا یہ ہے کہ عذاب ہو یا تجدیدِ عذاب۔ کوئی بھی شے حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی نہیں۔ ۵۹۲ یعنی انہیں عیش و راحت ہر طرح کی حاصل رہے گی۔ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۔ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکے ہیں۔ ۵۹۳ الْاَمٰنٰتِ ۔ امانات کے اندر جملہ حقوق آگئے جن کی ادائی واجب ہو، اور اَھْلِهَا سے وہ سب مراد ہیں جن کے متعلق وہ فرائض عائد ہوتے ہیں خطاب سارے مسلمانوں سے ہے انہیں حکم ہو رہا ہے کہ جس جس کے جو حقوق واجب ہیں، سب ادا کرتے رہو۔ اسی میں حقوق اللہ و حقوق العباد سب آگئے۔ ھو یعم جمیع الامانات الواجبة علی الانسان من حقوق اللہ علی عبادہ ومن حقوق العباد بعضھم علی بعض (ابن کثیر) حکمھا عام ولھذا قال ابن عباس ومحمد بن الحنفیة ھی للبر والفاجر ای ھی امر لکل احد (ابن کثیر) ھذہ الآیة من امھات الاحکام تضمنت جمیع الدین و الشرع (قرطبی) والاظھر فی الآیة انھا عامة فی جمیع الناس (قرطبی) ۵۹۴ (ان کے آپس کے حقوق کے باب میں) اب خطاب حکام اور اہلِ حل وعقد سے ہو رہا ہے۔ انھا نزلت فی الامراء یعنی الحکام بین الناس (ابن کثیر) ۵۹۵ کہ اسی طریق معدلت سے دنیا میں بھی انتظامات درست رہینگے اور آخرت میں بھی اجر اسی کا ہے۔ يَعِظُكُمْ بِهٖ سے اشارہ اسی طریق معدلت کی جانب ہے۔ ۵۹۶ چنانچہ وہ ادائے حقوق اور عدل گستری سب کے باب میں تمہارے لفظ و قول کو بھی سنتا رہتا ہے اور تمہاری نیتوں اور محرکاتِ عمل پر بھی نظر رکھتا ہے ۵۹۷ کہ ان کے احکام بھی احکامِ خدا و رسول پر مبنی اور انہی سے ماخوذ ہوں گے) اَطِيْعُوا اللّٰهَ ۔ مطاعِ اصلی اور حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۔ رسول مطاعِ مطلق اس اعتبار سے ہیں کہ اللہ کے احکام کے وہی پہنچانے والے اور وہی ان احکام کی شرح و تفصیل کرنے والے ہیں۔ اُولِي الْاَمْرِ ۔ اولوالامر کون ہیں؟ اس میں اچھی خاصی قیل وقال ہوئی ہے۔ علماء و فقہاءِ امت بھی مراد لئے گئے ہیں اور امراء و حکام بھی۔ اور بہتر یہ ہے کہ دونوں ہی مراد لئے جائیں کہ احکامِ شریعت کے نافذ کرنے والے یہ دونوں ہوتے ہیں۔ ای الولاة او العلماء (مدارک) روی عن جابر بن عبد اللہ وابن عباس روایة والحسن وعطاء ومجاھد انھم اولوا الفقہ والعلم وعن ابن عباس فی روایة وابی ھریرة انھم امراء السرایا ویجوز ان یکونوا جمیعا مرادین بالآیة لان الاسم یتناولھم جمیعہ (جصاص) اُولِي الْاَمْرِ ۔ خواہ وہ علماء و فقہاء ہوں یا امراء و حکام۔ بہرحال ان میں مستقل مطاع ہونے کی صلاحیت ذرا سی بھی نہیں، وہ مطاع صرف اسی حیثیت سے ہیں کہ احکامِ شریعت کے نافذ کرنے والے یا بعض جزئیات میں شرح کرنے والے ہیں۔ اس حد کے آگے ان کی کوئی اطاعت نہیں۔ مسئلہ: اس تصریح کے ہوتے ہوئے اس آیت سے جن صاحبوں نے کسی غیر اسلامی حکومت کی اطاعت پر استدلال کیا ہے، انہوں نے اپنی فہمِ سلیم پر بڑا ظلم کیا۔ اطاعت تو مسلم امیر کی بھی ہر صورت و حال میں جائز نہیں۔ چہ جائیکہ کسی غیر مسلم کی۔ وہ اگر جائز ہے بھی تو کم از کم اس آیت سے تو اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۵۹۸ (اور اس کی تحقیق مزید کرلیا کرو، کہ اولوالامر کا حکم احکام شریعت کے کہاں تک مطابق ہے) اِلَی اللّٰہِ۔ اللہ کے احکام کی طرف مراجعت کرنا تو ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے سے ہر وقت ممکن ہے لیکن اِلَی الرَّسُوْلِ کی تعمیل کی کوئی صورت رسول اللہ کی وفات کے بعد بجز اس کے ممکن نہیں کہ دفتر احادیث و سنن کی طرف رجوع کیا جائے ——— حدیث و سنت کی حجیت اس طرح فرقہ اہلِ قرآن کی سطحیت کے علی رغم خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اِنْ تَنَازَعْتُمْ۔ ضمیر جمع مخاطب سے مراد اولوالامر اور عام افراد امت

مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ
اطاعت کرو ۵۹۸ پھر اگر تم میں باہم اختلاف ہوجائے کسی چیز میں تو اس کو اللہ اور اسکے رسول
الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ
کی طرف لوٹا لیا کرو ۵۹۸ اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو ۵۹۹ یہی
ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۵۹ ۧ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ
بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی خوشتر ہے ۶۰۰ کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی
يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ
جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے اور آپ سے قبل
قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا
نازل ہوچکی ہے ۶۰۱ لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں ۶۰۲ حالانکہ انہیں حکم مل چکا
اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا
ہے کہ اسکے مقابلہ میں کفر اختیار کریں ۶۰۳ اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں بھٹکا کر بہت دُور دراز
بَعِيْدًا ۶۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ
لے جائے ۶۰۴ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی طرف آؤ جسے اللہ نے نازل کیا ہے اور
اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ
رسول کی طرف آؤ تو آپ دیکھیں گے کہ منافقین آپ کی طرف سے بڑی پہلوتہی
صُدُوْدًا ۶۱ ۚ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ
کرتے ہیں ۶۰۵ پھر کیسی گزرتی ہے جب اُن پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے اپنے ہی ہاتھوں ۶۰۶

ع ۹ / ۵

منزل

ہیں۔ اس تصریح نے یہ حقیقت اور کھول دی کہ حکام و علماء سے عوام کا اختلاف بالکل جائز ہے۔ آخری اپیل کتاب و سنت ہی کی عدالت میں ہونی چاہیے اور وہی ساری شریعت کا ماخذ ہے۔ یہیں سے اُس فرقہ کا بھی رد نکل آئے گا جو رسول معصوم کے علاوہ مستقل ائمہ معصوم کا بھی وجود تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ ہر امام وقت، اپنی ساری بزرگیوں کے باوجود بہرحال غیر معصوم ہے۔ ۵۹۹ (اور اس لئے شتر بے مہار نہیں ہو بلکہ اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس رکھتے ہو) ۶۰۰ یعنی دنیا میں بھی یہی ذریعہ امن و راحت ہے اور آخرت میں بھی وسیلہ نجات و سعادت۔ ذٰلِكَ۔ یعنی یہی طریق عمل جس کا ذکر ابھی ہوچکا ——— اصل اور غیر مشروط اطاعت اللہ کی۔ اللہ ہی کے نائب معصوم کی حیثیت سے اطاعت رسول کی۔ اور پھر ان دونوں کے واسطہ سے اور انہی کی موافقت و سازگاری کے ساتھ مشروط، اطاعت حکام و علمائے اسلام کی۔ ۶۰۱ مراد یہود اور منافقین ہیں۔ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ یعنی توریت۔ يَزْعُمُوْنَ زعم کے اصل معنی مطابق قول کے ہیں، خواہ وہ حق ہو یا باطل لیکن عموماً اس کا استعمال جھوٹ یا مشکوک بات کے لئے ہوتا ہے۔ الزعم القول الحق والباطل واکثر مایقال فیما یشك فیه ولا یتحقق (تاج) واذا شك فیه فلم یدر لعله کذب او باطل قیل یزعم فلان (لسان) محاورۂ قرآنی میں یہ ہمیشہ ذم ہی کا پہلو لئے ہوئے آیا ہے۔ جاء فی القرآن فی کل موضع ذم القائلون به (تاج) ۶۰۲ (بجائے اسکے کہ اُسے شریعت کی عدالت میں لائیں) طَاغُوْت پر حاشیہ ۔۔ میں گزر چکا ہے۔ یہاں مراد ہر غیر اللہ کی حکومت و اقتدار ہے۔
۶۰۳ یعنی اس کی حاکمیت کے تسلیم کرنے سے انکار کردیں۔ اور طاغوت کے اقتدار کے آگے گردن نہ جھکائیں۔ ۶۰۴ یعنی بنی آدم کے دشمن ازلی شیطان کی تو تمنا ہی یہ رہتی ہے کہ انہیں راہِ حق سے زیادہ سے زیادہ دُور کردے۔ ۶۰۵ منافقین یوں تو اسلام کے مدعی تھے لیکن جب کبھی کوئی مقدمہ معاملہ آپڑتا تو فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہونے سے بہت ہی گھبراتے کہ یہاں تو بہرحال بلا رو و رعایت دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہوکر رہیگا۔ اور کسی قسم کی سخن سازی و خیانت نہ چل سکے گی۔ تَعَالَوْا اِلَى الرَّسُوْلِ۔ رسول کی طرف آؤ، کہ آپ قانونِ شریعت کے موافق فیصلہ کردیں۔ ۶۰۶ مثلاً یہی کہ اُن کی خیانت یا منافقت کا راز کھل گیا۔ اور اس پر اُن کی دھر پکڑ شروع ہوگئی۔

اَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ جَآءُوۡكَ يَحۡلِفُوۡنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّاۤ

پھر آپکے پاس آتے ہیں اللہ کی قسم کھاتے ہوئے کہ ہمارا مقصود تو محض

اِحۡسَانًا وَّتَوۡفِيۡقًا ﴿٦٢﴾ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُ اللّٰهُ مَا

بھلائی اور مصالحت تھا ۶۰۷ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ اسے خوب

فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَعِظۡهُمۡ وَقُلۡ لَّهُمۡ

جانتا ہے، تو آپ ان سے چشم پوشی کر جایا کیجئے ۶۰۸ اور انہیں نصیحت کرتے رہیئے، اور انہیں ان کے

فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَوۡلًاۢ بَلِيۡغًا ﴿٦٣﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ

باب میں مؤثر بات کہتے رہیئے ۶۰۹ اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ اس غرض

اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ‌ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ

سے کہ اسکی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جائے، اور کاش کہ جس وقت یہ اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے تھے

جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ

آپکے پاس آجاتے پھر اللہ سے مغفرت چاہتے، اور رسول بھی اُن کے حق میں مغفرت چاہتے تو

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ

یقیناً اللہ کو توبہ قبول کرنیوالا اور مہربان پاتے ۶۱۱ سو آپکے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ

حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِىۡۤ

ہونگے ۶۱۲ جب تک یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہو آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ

اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ﴿٦٥﴾ وَ

آپ کردیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کرلیں ۶۱۳ اور

۶۰۷ یعنی جب اُن کی دورنگی کھل جاتی ہے اور بازپرس شروع ہوجاتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے لگتے ہیں کہ ہم بھی تو مومن ہیں۔ اور ہمیں رسولؐ کی حاکیت سے کچھ انکار تھوڑے ہی ہے۔ ہم تو محض نیک نیتی اور فریقین کی خیرخواہی کے خیال سے مقدمہ کو دوسری جگہ لے گئے تھے۔ آیتوں کی شان نزول میں آتا ہے کہ ایک یہودی اور ایک نام کے مسلمان یعنی منافق کے درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا ہوا۔ یہودی نے رسول اللہ صلعم کی دیانت پر اعتماد کرکے کہا کہ چلو وہیں تصفیہ کرائیں۔ منافق کا پہلو کمزور تھا، بولا نہیں بلکہ سردار یہود کعب بن اشرف کے پاس چلیں۔ بالآخر مقدمہ رسول اللہ صلعم ہی کی خدمت میں آیا اور یہاں سے فیصلہ یہودی کے موافق ہوا کہ وہی اس معاملہ میں حق پر تھا۔ منافق نے کہا کہ چلو اب عمرؓ کے پاس چلیں وہ غالباً اپنے دل میں یہ سمجھا کہ عمرؓ کی شدت و غلظت کافروں پر بہت بڑھی ہوئی ہے اور میں ظاہر میں تو بہرحال مسلمان ہوں۔ وہاں میری ہی چل جائے گی۔ آیات میں تلمیح اسی واقعہ کی جانب ہے۔ منافقین اپنا یہ عذر پیش کرتے تھے کہ ہم کسی اور کے پاس مقدمہ کچھ اس خیال سے تھوڑے ہی لے جاتے ہیں کہ فیصلہ کا حق رسولؐ کے سوا کسی اور کو حاصل ہے، بلکہ ہم تو اس لئے لے جاتے ہیں کہ وہاں حق و انصاف و قانون سے زیادہ فریقین کی مصالحت اور دلجوئی پر نظر رہیگی۔ ۶۰۸ (اور اُن کے کرتوتوں کو علم خداوندی اور مؤاخذہ خداوندی کے حوالہ رکھیئے، خود مؤاخذہ سردست نہ فرمایئے) مَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ۔ یعنی جو کچھ یہ اپنے دلوں میں کفر و نفاق کی قسم سے چھپائے ہوئے ہیں۔ ۶۰۹ یعنی خاص اُن کی اصلاح سے متعلق اُن پر کافی مضامین کی تبلیغ کرتے رہیئے کہ اُن پر حجت الٰہی قائم رہے۔ وَعِظۡهُمۡ۔ انہیں نصیحت کرتے رہیئے جیسا کہ منصب رسالت کا اقتضاء ہے۔ ۶۱۰ یہاں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ رسولؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اُس کو حاکم اعلیٰ اور مقتدا تسلیم کیا جائے اور امت اُسی کے لائے ہوئے قانون اور بتلائی ہوئی شریعت پر چلنا سیکھے۔ ورنہ محض زبانی رسول مان لینے سے تو کوئی حاصل ہی نہیں۔ مِنۡ رَّسُوۡلٍ میں مِنۡ زاید تاکید کی غرض سے ہے۔ من زائدۃ للتاکید (قرطبی) بِاِذۡنِ اللّٰهِ۔ اس قید نے واضح کردیا کہ مطاع حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسولؐ مطاع اُس کے نائب کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ۶۱۱ (اور ان کی توبہ قبول ہوگئی ہوتی) اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ۔ اپنی جان پر ظلم اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ رسولؐ زندہ سلامت اپنے درمیان موجود اور پھر ان کی عدالت سے اعراض۔ فَاسۡتَغۡفَرُوا (مغفرت چاہتے اپنے اس گناہ کی اور گناہ نفاق کی)۔ جَآءُوۡكَ۔ آپکے پاس ندامت کے ساتھ حاضر ہوتے۔ تقدیر کلام یہاں یوں سمجھی گئی ہے۔ لو جآءوك فآمنوا واستغفروا۔ استغفار کے لفظ میں خود ایمان کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس لئے آمنوا کی تصریح کی ضرورت نہ رہی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بغیر ایمان لائے محض حاضری ہرگز کافی نہ تھی۔ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ۔ رسولؐ کی خدمت میں ایمان کے ساتھ حاضری اور پھر اللہ سے طلب مغفرت، یہ دونوں چیزیں یقیناً آپکے قلب سے اثر ناسازی کو دور کردیتیں اور اس کے بجائے انشراح پیدا کردیتیں اور آپ ضرور اُن کے لئے مغفرت طلب کرنے لگتے۔ ایک نو پیدا باطل فرقہ کا آیت کے یہ معنی کرنا کہ کتاب اللہ بھی انہیں معانی دے دیتی "لغت اور قرآن دونوں کے ساتھ تمسخر ہے۔ ۶۱۲ عِنۡدَ اللّٰهِ یعنی اللہ کے ہاں اُن کا ایمان اُس وقت تک معتبر نہ سمجھا جائے گا۔ ان لوگوں سے مراد وہی منافقین اور اسلام کے ظاہری اور زبانی دعویدار ہیں۔ فَلَا وَرَبِّكَ میں لا زائد و تاکید قسم کے معنی میں ہے۔ مزیدۃ لتاکید معنی القسم (مدارک) ۶۱۳ آیت نے اسے صاف کردیا کہ رسولؐ کی عدالت میں مقدمہ محض لے آنا ہرگز ایمان کے لئے کافی نہیں عقلی اعتقادی حیثیت سے اطمینان بھی رسولؐ کے فیصلہ پر ہونا چاہیئے۔ ہاں اس کے بعد بھی کوئی طبعی تنگی باقی رہ جائے تو غیر اختیاری ہونے کی بناء پر معاف ہوگی حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ۔ آپ کی حیات مبارک میں تو آپ کا حکم بنانا ظاہر ہی تھا، بعد وفات آپ کی شریعت حکم بننے کے لئے کافی ہے۔ فقہاء نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ جو کوئی اللہ یا اُس کے رسولؐ کے کسی حکم میں شک و شبہ کرے یا ماننے سے انکار کرے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ وفی ھذہ الآیۃ دلالۃ علی ان من رد شیئا من اوامر اللہ تعالیٰ او اوامر رسول اللہ صلعم فھو خارج من الاسلام سواء ردہ من جھۃ الشك فیہ او من جھۃ ترك القبول والامتناع من التسلیم (جصاص)۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا

اگر ہم نے ان پر فرض کر دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو مار ڈالو یا یہ کہ اپنے وطن سے

مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ

نکل جاؤ تو اس کو ان میں سے نہ کرتے کوئی مگر بجز تھوڑے سے لوگوں کے ۶۱۴ اور اگر یہ (لوگ)

فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۙ ۶۶

وہ کر ڈالتے جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو انکے حق میں یہ بہتر بھی ہوتا اور انہیں ثابت قدم رکھنے والا بھی ۶۱۵

وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ ۶۷ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ

اور اس وقت ہم انہیں ضرور اپنے پاس سے اجرِ عظیم دیتے ۶۱۶ اور ہم انہیں سیدھی

صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۶۸ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ

شاہراہ دکھا دیتے ۶۱۷ اور جو کوئی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریگا تو ایسے لوگ بھی

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ

ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے اپنا خاص انعام کیا ہے یعنی پیمبر اولیاء اور

وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۶۹ ؕ

شہید اور صالحین اور یہ کیسے اچھے رفیق ہیں ۶۱۸

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۷۰ ع ۹ يٰٓاَيُّهَا

یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ ہی کا علم کافی ہے ۶۱۹ اے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ

ایمان والو اپنی احتیاط کرو پھر گروہ گروہ کوچ کرو

منزل ۱

۶۱۴ (اور وہی تھوڑے مومن کامل ہوتے) اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ ایک معنی میں تو دونوں حکم اب بھی موجود ہیں یعنی جہاد و قتال اور ترک وطن یا ہجرت اپنے اپنے موقع پر اور تحقق شرائط پر اب بھی واجب ہیں، یہاں مراد یہ ہے کہ اگر یہ احکام خود بھی مقصود بالذات ہوتے اور قتال و ہجرت ہر حال میں فرض ہوتے۔ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ. قليل منهم. یہ علیهم اور منهم میں ضمیر جمع غائب کس کی جانب ہے؟ جائز ہے کہ منافقین کی جانب ہو۔ والضمير قيل يعود على المنافقين (بحر) لیکن بہتر یہ ہے کہ مطلق انسانوں یا الناس کی جانب مانی جائے۔ لو كتب الله على الناس ما ذكر (بحر) يعنوا تعالى عن اكثر الناس (ابن کثیر) مَا فَعَلُوْهُ ضمیر حکم کی جانب ہے۔ والضمير للمكتوب ودل عليه كَتَبْنَا (بیضاوی) اِلَّا قَلِيْلٌ کی ایک قرأت بجائے رفع کے نصب کے ساتھ الا قليلاً بھی آئی ہے لیکن ائمہ نحو نے ترجیح اسی مشہور قرأت کو دی ہے۔ ۶۱۵ (ایمان کے معاملہ میں) یعنی اگر شک، تذبذب، تزلزل کی راہ چھوڑ کر اطاعتِ رسولؐ میں یکسوئی کے ساتھ لگ جائیں تو انہیں ایمان میں ثبات واستقلال اور اس کی برکتیں از خود نصیب ہونے لگیں۔ ذکر انہی منافقین اور کمزور ایمان والوں کا چل رہا ہے۔ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ۔ یعنی اللہ و رسولؐ کے احکام کی اطاعت اگر انہوں نے بہ دل و جان کرلی ہوتی۔ اى ما يؤمرون به من التبعة والانقلا (ابن عباس) من متابعة الرسول صلعم ومطاوعته طوعًا ورغبتًا (بیضاوی) لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ یعنی دنیوی و اُخروی انفرادی و اجتماعی ہر اعتبار سے ان کے فلاح کی صورت پیدا ہو جاتی۔ تَثْبِيْتًا۔ پہلے یہ بتایا کہ احکام دین پر اگر عمل کرتے تو چیز انہی کے کام آتی اور انہی کے حق میں بہتر ہوتی۔ اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ احکام پر عمل کرنے سے خود قوتِ ایمانی، ضعیف سے قوی اور قوی سے قوی تر ہو جاتی ہے۔ مرشد تھانوی رح نے فرمایا کہ تجربہ سے ثابت ہے کہ دین کا کام کرتے رہنے سے اعتقاد و یقین کی باطنی کیفیت کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ ۶۱۶ (آخرت میں) اِذًا یعنی اگر انہوں نے احکام خدا اور رسولؐ کا اتباع کیا ہوتا اور نتیجۃً انہیں خیر و صلاح بھی حاصل ہو چکتی اور دین میں ثبات واستقامت بھی نصیب ہو چکتی۔ اى لو اتبعوا (جلالین) ۶۱۷ (کہ بے روک ٹوک سیدھے رضار الٰہی کے مقام جنت میں داخل ہو جائیں) اور عجب نہیں کہ اسی کی برکت سے دنیا میں بھی سعی و عمل کی صراطِ مستقیم ان پر خوب روشن ہو کر رہے۔ ۶۱۸ دنیا کی مادی اور حسی نعمتیں چاہے جتنی بھی ہوں۔ انسان ان سے لطف و لذت لینے میں کچھ کمی ہی محسوس کرتا ہے۔ اگر ساتھ ہی یارانِ بزم اور شرکاء صحبت بھی اپنے ہم مذاق اور دلپسند نہ ہوں۔ یہاں بشارت اسی نعمت عظیم کی مل رہی ہے کہ اہل جنت کو مادی و روحانی ہر قسم کی نعمتوں کے علاوہ صحبت بھی پاکیزہ ترین، بہترین، انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے والوں کی نصیب ہوگی۔ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا میں ایک پہلو حیرت کا بھی ہے اور اسی لئے ترجمہ کیسے اچھے سے کیا گیا ہے۔ فيه معنى التعجب كانه قيل وما احسن اولٰئك رفيقًا (کشاف) وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ۔ اس اطاعت کا تعلق احکام اور واجبات ضروری سے ہے۔ ورنہ اگر فرائض و واجبات کے علاوہ مستحبات، نوافل، تطوعات کا بھی اسی قدر اہتمام ہو جائے تو پھر درجۂ ولایت خود ہی حاصل ہو جائیگا اور بطور انعام رفاقت اولیاء نصیب ہونے کے کوئی معنی نہ رہیں گے۔ اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ یعنی باوجود اپنے اعمال میں کمی اور کوتاہی رہ جانے کے اور باوجود بالذات ان کاملین سے مرتبہ میں فروتر ہونے کے انہیں ان کاملین کی جنت نصیب ہو جائیگی۔ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ یہ انعام کمال قرب و وصول کی صورت میں ہوگا۔ صِدِّيْقِيْنَ یعنی بات کے کھرے اور معاملہ کے سچے، ایسے کہ سچائی اور حق پسندی گویا ان کی فطرت میں رچ گئی اور ان کی طبیعت کا جزو بن گئی ہے۔ ایمان کے ہر جزو سے متعلق ان کی تصدیق کامل ہوتی ہے۔ ریب و شک کے حدود سے بالاتر۔ كل من صدق بكل الدين لا يتخالجه فيه شك فهو صديق (کبیر) المبالغ فى الصدق والتصديق (قرطبی) اردو میں انہی کو اولیاء کہتے ہیں۔ قرب حق میں ان کا نام انبیاء کے بعد ہی ہوتا ہے۔ افضل الخلق هم الانبياء عليهم السلام وبعدهم الصديقون (کبیر) شُهَدَآءِ۔ شہید وہ ہے جو دین کی محبت میں اپنی جان تک کے دریغ نہ کرے اور عمل سے ثابت کر دے کہ جس چیز پر وہ ایمان لایا تھا، وہ اسے اس قدر عزیز تھی کہ اس کی خاطر اس نے اپنی جان تک قربان کر دی۔ الصّٰلِحِيْنَ۔ صالحین وہ افراد امت کہلاتے ہیں جو پورے دیندار اور متبع شریعت ہوتے ہیں۔ ۶۱۹ اللہ کا علم حاوی و محیط ہے۔ ان کی نیتوں کو بھی، ان کے عمل کو بھی، ان کے مقتضائے عمل کو بھی۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ۔ یعنی تمام مومنین کو جو کاملین کی معیت و رفاقت نصیب ہوگی، محض فضل خداوندی کا ظہور ہوگا۔ ان کے اعمال کا ثمرہ نہ ہوگا۔

۶۲۰ؐ جیسا موقع اور جیسی مصلحت ہو قرآن مجید کی کثیر آیتوں کی طرح ان آیتوں کو بھی پوری طرح سمجھنے کیلئے ان کا پس منظر پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اُحُد میں ابھی حال ہی میں مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی تھی اور مشرکین کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں اس سے قدرۃً بڑھ گئی تھیں اور اکیلے قریش کچھ ہی نہیں گردو پیش کے دوسرے قبیلے بھی متحد ہو کر اسلام کے خلاف زبردست محاذ تیار کرچکے تھے مسلمانوں کو ہمت ثبات و استقامت کے جو سبق ہیں اس وقت دیئے جا رہے ہیں۔ خُذُوْا حِذْرَكُمْ۔ حذر کا مفہوم بہت وسیع و جامع ہے، ہر وہ چیز جو دشمن سے بچاؤ کے کام میں آتی ہے اس میں شامل ہے خواہ ہتھیار ہوں خواہ تدبیریں۔ قس علی ہذا گویا مطلب یہ ہوا کہ دشمن کے مقابلہ میں ہر طرح کیل کانٹے سے درست اور آمادہ رہو۔ حذركم اى ما فيه الحذر من السلاح وغيره (راغب) ما يحذر به كالحزم والسلاح (بیضاوی) خُذُوا حذركم اى استعدوا بأنواع ما يستعد به للقاء من تلقاه (رح) ۶۲۱ؐ (ایسی کہ جہاد میں شریک بھی نہیں ہوتا اور پیچھے رہ جاتا ہے) یہاں مُراد منافقین ہیں جو جہاد میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے۔ المبطئون منافقوهم تثاقلوا وتخلفوا عن الجهاد (بیضاوی) مِنْكُمْ۔ خطاب یہاں مومنین اور ظاہری مومنین (منافقین) کے مجموعہ سے ہے اور اس مضمون کی آیتوں میں قرآن مجید کا عام طریقِ خطاب یہی ہے۔ الخطاب لعسكر رسول الله صلعم المؤمنين منهم والمنافقين (بیضاوی) انما جمع بينهم فى الخطاب من جهة الجنس والنسب لا من جهة الايمان (قرطبی) ۶۲۲ؐ (نہیں تو میں بھی اسی مُصیبت کا شکار ہوتا) اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ۔ مُصیبت مثلاً جنگ میں شکست۔ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ۔ یہ وہ فخر و مسرت کے ساتھ کہتا ہے۔ ۶۲۳ؐ منافقین کی دو رنگی اور سیرتِ منافقانہ کو آشکار کیا ہے کہ مومنین کو جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو منافقین اپنی بے تعلقی اور علیحدگی پر جھٹ اپنی مسرت و فخر کا اعلان کرنے لگتے ہیں کہ خوب ہوا جو ہم شریک نہ تھے ورنہ ہم بھی اسی بلا میں پھنستے اور مسلمانوں کو جب فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے تو رشک کرنے لگتے ہیں کہ کاش مالِ غنیمت ہمارے حصّہ میں بھی آتا۔ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ مثلاً جنگ میں فتح و نصرت۔ کَاَنْ ..... مَوَدَّةٌ یعنی اس خود غرضی کے ساتھ کہتا ہے جیسے تم مسلمانوں کی خوشی سے اس منافق کو کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور اُسے تاسف و حسرت صرف اپنی ہی قوت و دولت پر ہے۔ یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ اُمتِ اسلامیہ کی خوشی سے خوش ہونا علاماتِ ایمان میں سے ہے۔ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔ منافق کی زبان سے اس کے معنی یہ ہونگے کہ میں بھی خوب دولت حاصل کرتا۔ مالِ غنیمت میں میرا بھی بڑا سا حصّہ ہوتا! ۶۲۴ؐ (اخلاص کامل اور اللہ کی رضاجوئی کی نیت سے) فَلْيُقَاتِلْ میں ف کے معنی ہیں کہ اگر واقعی اُسے فوزِ عظیم ہی منظور ہے۔ ۶۲۵ؐ یعنی کافروں سے قتال کرے جو دین کی صحیح تعلیم کو بھلائے ہوئے ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ يَشْرُوْنَ۔ شرا لغاتِ اضداد میں سے ہے یعنی اس کے معنی خریدنے کے بھی ہیں اور فروخت کرنے کے بھی۔ کچھ اس بنا پر اور کچھ آیت کی ترکیبِ الفاظ کی بنا پر آیت کے ایک بالکل دوسرے معنی بھی کئے جاسکتے ہیں اور کئے گئے ہیں یعنی "وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے عوض میں فروخت کرچکے ہیں"۔ اور اس صورت میں آیت کا تعلق تمامتر مومنین مخلصین سے ہوگا جو اپنی ہر دنیوی خوشحالی اور کامرانی کو رضاء الٰہی پر قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ائمہ تفسیر نے دونوں ہی پہلو اختیار کئے ہیں۔ وللمفسرين وجهان الاول ان يشرون معناه يبيعون والقول الثانى معنى قوله يشرون اى يشترون (کبیر) يشرون بمعنى يشترون ويبيعون (کشاف) نزلت فى المنافقين ومعنى يشرون يشترون وقيل نزلت فى المومنين المخلصين ومعنى يشرون يبيعون (معالم) ۶۲۶ؐ (آخرت میں) یہ آخرت کا اجرِ عظیم مجاہدین کے لئے غلبہ اور شکست (کہ اس کی انتہائی صورت کو فَيُقْتَلْ سے تعبیر کیا ہے) کہ ہر صورت میں موعود ہے۔ مفسر تھانوی نے لکھا ہے کہ فوزِ عظیم کو اجر سے تعبیر کرنا وعدہ کے تاکد اور ترتب کے تحقق کے لئے ہے۔ ۶۲۷ؐ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ اعلاء کلمۃ اللہ تو خود جہاد کا ایک مستقل محرک اور قوی داعی ہے۔ مَا لَكُمْ۔ استفہام سے مقصود ترغیب و تحریص ہے اور خطاب مومنین صادقین سے ہے۔ خطاب للمامورين بالقتال على طريقة الالتفات مبالغة فى التحريض والحث عليه وهو المقصود من الاستفهام (روح)

اِنْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ
یا اکٹھے ۶۲۰ اور یقیناً تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو دیر لگا دیتا ہے ۶۲۱ اور پھر تم پر
اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ
اگر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو کہتا ہے کہ بیشک مجھ پر اللہ نے بڑا فضل کیا کہ میں
اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ
ان لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہوا ۶۲۲ اور اگر تمہیں اللہ کا فضل پیش آتا ہے تو بول اٹھتا
اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ
ہے اس بے تعلقی کے ساتھ کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان کوئی رشتۂ محبت تھا ہی نہیں کہ کاش
كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ
میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا ۶۲۳ تو اگر یہ ہے تو اُسے چاہیئے کہ
سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ
اللہ کی راہ میں لڑے ۶۲۴ ان لوگوں سے جو دنیا کی زندگی خریدے ہوئے ہیں آخرت کے عوض ہیں ۶۲۵
وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ
اور جو کوئی اللہ کی راہ میں لڑتا ہے تو مارا جائے یا جیت جائے (بہر صورت)
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ
ہم اس کو عنقریب اجرِ عظیم دیں گے ۶۲۶ اور تمہیں کیا عذر ہے کہ تم جنگ نہیں
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ
کرتے ہو اللہ کی راہ میں ۶۲۷ اور ان لوگوں کے لئے جو کمزور ہیں مردوں میں سے

٦٢٨ یہ دُوسرا اہم جہاد کے لئے ارشاد ہُوا۔ کمزوروں کی دستگیری ونصرت اور مظلوموں کی اعانت اور انہیں ظالم کافروں کے پنجہ سے رہائی دلانا بجائے خود مقاصدِ جہاد میں سے ہے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ کا عطف لفظ اللہ پر ہے
یعنی فی سبیل اللہ والمستضعفین ۔ زجاج اور زہری سے یہی ترکیب منقول ہے۔ عطف علی اسم اللہ عزوجل ای وفی سبیل المستضعفین وھذا اختیار الزجاج وقالہ الزھری (قرطبی) ٦٢٩ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ۔ مراد مکہ کا
شہر اور مکہ کی حکومت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ القریۃ ھنا مکۃ باجماع من المتأولین (قرطبی) الظَّالِمِ اَھْلُھَا ۔ مکہ والے ظالم دُہرے معنی میں تھے۔ ایک تو مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھارہے تھے۔ دُوسری طرف شرک
کرکے خود اپنی جانوں پر بھی ظلم کررہے تھے۔ ووصف اھلھا بالظلم اما لاشراکھم واما کما حصل منھم من شدۃ الوطأۃ علی المؤمنین واذلالھم ایاھم لاجل انھم کانوا یؤذون المسلمین ویوصلون الیھم انواع المکارہ وظلمھم
بالشرک الذی ھو ظلم عظیم وبأذیۃ المؤمنین ومنعھم عن الھجرۃ (روح) ٦٣٠ آیت سے ظاہر ہورہا ہے کہ بچوں، عورتوں، مردوں کی ایک خاصی تعداد اسلام لاچکی ہے۔ مگر یہ لوگ سردارانِ قریش کے تشدد کے مقابلہ میں اپنے کو
بے بس پارہے ہیں۔ نہ دفعِ ظلم ہی پر قادر ہیں اور نہ ہجرت پر۔ یہاں مناجات اور فریاد انہی لوگوں کی زبان سے ادا ہورہی ہے۔ آیت سے یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ ظلم وشقاوت سے بچے، عورتیں، بوڑھے کوئی بھی محفوظ نہ تھے۔ مِنْ

وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ
اور عورتوں اور لڑکوں میں سے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے باہر
هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ
نکال جس کے باشندے سخت ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی قدرت سے
لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا ۝
کوئی دوست پیدا کردے، اور ہمارے لئے اپنی قدرت سے کوئی حمایتی کھڑا کردے
اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ
جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو
كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا
کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں سو تم لڑو
اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ
شیطان کے ساتھیوں سے اور شیطان کی چال تو پھر ہی
ضَعِیْفًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا
ہوتی ہے کیا تو نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو
اَیْدِیَكُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ
روکے رہو اور نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو پھر جب ان پر قتال فرض کردیا
الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْیَةِ اللّٰهِ
گیا تو اُن میں سے ایک گروہ انسانوں سے ایسا ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرتا رہتا ہے

ع

لَّدُنْکَ بلفظی معنی ہیں "اپنے پاس سے" اُردو محاورہ میں ایسے موقع پر "اپنی قدرت سے" آتا ہے یعنی
غیب سے اس کا سامان کردے۔ وَلِیًّا ۔ ایسا دوست وہمدرد جو اس مصیبت میں ہمارے ساتھ
ہے، ہم سے ہمدردی وغمخواری کرے۔ نَصِیْرًا ۔ ایسا حمایتی جو ان ظالموں سے ہمیں نجات
دلائے۔ ٦٣١ اور جیسا کہ خود حق تعالیٰ ہر قسم کی نفسانی آمیزش وآلایش سے منزہ وپاک ہے۔
اللہ والوں کا لشکر بھی کبھی عدوان وطغیان، ظلم وخیانت، مے نوشی وبدکاری کے آلاتِ حرب سے
مسلح ہوکر جنگ کرہی نہیں سکتا۔ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کی قید جو بار بار لگائی جارہی ہے۔ بے معنی نہیں
بہت ہی پُرمعنی ہے۔ درحقیقت یہ آیت سلسلۂ جہاد کی آیتوں میں سے ایک کلیدی آیت ہے
اس نے صاف صاف اسلامی جہاد کا فرق دنیا جہان کی تمام جنگوں اور جاہلی محاربات سے واضح کر
دیا۔ اس نے وضاحت کے ساتھ بتادیا کہ سچا مسلمان جب اپنے ابنائے جنس پر ہتھیار اٹھائیگا تو
توسیعِ ملک کے لئے نہیں، قومی تفوق کے لئے نہیں، تجارتی منڈیاں قائم کرنے کو نہیں، دوسرے کو نیچا
دکھانے کو نہیں، دوسرے پر اپنی برتری ثابت کرنے کو نہیں، رشک وہوس اور جاہ پرستی کے
جذبات سے متاثر ہوکر نہیں، بلکہ دنیا کے بلند ترین مقصد، انسانیت کے برترین نصب العین،
کلمۂ توحید کی برتری اور سربلندی کے لئے! —— رنگ اور نسل، مرزبوم اور قوم، وطن اور
قبیلہ کی عزت وحمیت پر کٹ مرنے والے، اسلامی نقطۂ نظر کی بلندی کو سمجھ بھی سکتے ہیں؟ اسلامی
جہاد جب تک اسلامی جہاد رہا، کیا وہاں بھی کسی لشکر کے لئے ہزاروں من اور سیکڑوں ٹن شراب
کی ضرورت پڑی؟ کیا اس لشکر میں بھی سوزاک اور آتشک کے سیکڑوں ہزاروں مریض سپاہیوں
اور افسروں کے لئے امراضِ خبیثہ کے مخصوص اسپتالوں کا انتظام کرنا پڑا؟ —— مسلمان
سپاہی کے سینہ میں تو یہ زندہ ایمان رہتا ہے کہ اسے ایک ایک اقدام کا حساب دینا ہے کبھی
ان کا قدم ان گندے راستوں پر پڑسکتا ہے؟ ٦٣٢ طاغوت کے لفظی معنی پر حاشیہ پ ٣
میں گزر چکا۔ یہاں اس لفظ کو لاکر طاغوتی، جاہلی، سپاہیوں کے تمرد، خدا فراموشی، نفس پرستی اور
تجاوز عن الحدود کے پہلو کو نمایاں کرنا ہے۔ طاغوت کا ترجمہ اگر اس موقع پر "نفس" سے کیا جائے
تو اردو میں شاید پورا مفہوم ظاہر ہوجائے۔ طاغوت اور نفس کی راہ میں آج بھی جو قومیں وطن
پرستی، قوم پروری، ملکی آزادی کے خوشنما لفظ اور لقب کے ساتھ جنگ کرتی رہتی ہیں، ان کی اخلاقی
حالت کا جائزہ لے لیا جائے۔ شقاوت وسنگدلی، فریب وخیانت، شراب خواری وحرامکاری جس
معیار سے چاہے جانچ لیا جائے جانوروں اور درندوں سے بھی کہیں بدتر حالت نکلے گی ——
یہ سب کرشمہ فی سبیل الطاغوت لڑنے کے ہیں، محاسبۂ آخرت سے بے نیاز ہوکر جنگ کرنے کے
ہیں۔ ٦٣٣ سو شیطانی اور طاغوتی قوتوں کو کبھی بھی مستقل اور پائیدار فتح حق کے مقابلہ میں نصیب
نہیں ہوسکتی۔ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ مسلمانوں کو لڑنے کا حکم ملا ہے مگر کس کے مقابلہ میں؟ شیطانیوں

اور طاغوتیوں کے مقابلہ میں۔ ان کے مقابلہ میں جو دنیا میں شر وفساد، فسق وشرک ہی کی حکومت پھیلانا چاہتے ہیں۔ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ۔ اس میں مسلمانوں کو ہمت دلائی ہے کہ شیطان کوئی ڈرنے اور سہمنے کی چیز نہیں
وہ تم پر حاکم وآمر نہیں۔ تم ذرا ہمت کرجاؤ تو وہ خود تم سے پناہ مانگتا ہوا بھاگے گا۔ اُس میں جان تو ہے ہی نہیں۔ حربی زندگی سے قطع نظر، اخلاق ومعاشرت، معاملات وعبادات کے میدان میں بھی شیطان سے مقابلہ کرلینا کچھ دشوار
نہیں۔ ضرورت صرف ہمت کی ہے۔ ٦٣٤ (کہ حالتِ امن میں اس قسم کی عبادات پر عمل کافی ہے) کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ۔ یعنی جوشِ انتقام اور قتال سے ابھی باز رہو۔ یہ ذکر کن لوگوں کا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے اس وقت کے
حالات پیشِ نظر رکھنے ضروری ہیں۔ مسلمانوں کو مکہ میں قریش کے مظالم سہتے سہتے ایک زمانہ ہوگیا تھا، اور قدرۃً انتقام کی خواہش اُن کے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی۔ یہ لوگ بھی آخر اسی خون اور اُسی گوشت و پوست کے تھے۔
اور جوش میں آکر بار بار جنگ کی اجازت طلب کرنے لگے تھے۔ ادھر وحی الٰہی ابھی برابر عفو وحلم، مسامحت ودرگزر کا سبق دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہجرت کا حکم آگیا۔ اور مسلمان مدینہ کی پُرامن فضا میں منتقل ہوگئے۔
١٣۔ ١٤ سال کی صحبتِ رسولؐ کی زبردست ٹریننگ کے بعد جب علمِ الٰہی میں مسلمانوں کے اخلاق فاضلہ پختہ ہوگئے۔ اور تحمل وبے نفسی ان کے کردار کے جزو بن گئے تو حکمِ جہاد وقتال نازل ہوا۔ لیکن ادھر مدینہ کی پُرامن فضا میں رہتے
سہتے مسلمانوں کے جذباتِ انتقام دھیمے پڑگئے تھے اور وہ جوش وولولۂ قتال باقی نہیں رہا تھا۔ اب طبعی اقتضاء سے میدانِ جنگ میں جانے سے حیلہ حوالہ ڈھونڈنے جانے لگے۔ یہاں ذکر اُنہی عافیت کوش مسلمانوں کا ہے۔

۶۳۵ اللہ کے عذاب کا خوف تو کھلا ہوا ہی ہو لیکن یہ خشیۃ بھی تو ساتھ ساتھ رہتا ہو کہ اللہ رحمٰن و رحیم ہے غفور ہے ارحم الراحمین ہے۔ عجب کیا جو تمام تر عفو و فضل ہی کا معاملہ فرمائے بخلاف اسکے دشمنوں سے بجز ایذا رسانی کے اور کسی برتاؤ کی توقع ہی نہ تھی۔ امام ماتریدی نے فرمایا کہ یہ خوف خوفِ طبعی تھا۔ اس لئے اس پر گناہ نہیں ہوا۔ قال الشیخ ابو منصور رحمہ اللہ ھذہ خشیۃ طبع لما انہ ذلک منھم کراھۃ لحکم اللہ فالمرء مجبول علی کراھتہ ما فیہ خوف ھلاک غالبًا (مدارک) فھی علی ما طبع علیہ البشر من المخافۃ لا علی المخالفۃ (قرطبی) قالوا خوفا وجبنا لا اعتقادا ثم تابوا (معالم) اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً۔ اَوْ یہاں بلکہ کے مفہوم میں ہے قیل بمعنی بل (بحر) ۶۳۶ (اور ہم دنیا میں کچھ دن اور اطمینان سے جی لیتے) قَالُوْا الخ مسلمانوں کی زبان سے یہ قول بطور تمنا کے تھا۔ بطور اعتراض نہ تھا۔ وقولھم محمول علی التمنی لتخفیف التکلیف لا علی وجہ الانکار اکبر لا علی وجہ الاعتراض علی حکمۃ تعالٰی۔ والانکار لایجابہ بل علی طریق تمنی التکلیف (ابو سعود) یہ قول اگر زبان سے تھا جب بھی چونکہ درجۂ تمنا میں تھا، اعتراض و انکار اس سے مقصود نہ تھا اس لئے قابلِ مواخذہ جب بھی نہ تھا لیکن خود لفظ قالوا سے یہ لازم نہیں آتا کہ زبان سے بھی ادا کیا گیا ہو۔ قول عربی میں جس طرح کلام لسانی کے لئے آتا ہے اسی طرح حدیثِ نفس کے لئے بھی یقال للمتصور فی النفس قبل الابراز باللفظ قول فیقال فی نفسی قول لم اظھرہ (راغب) اور علم الٰہی میں تو دونوں برابر ہیں۔ اور حدیثِ نفس یا وسوسہ کا معصیت نہ ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔

اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ

یا اس سے بھی بڑھ کر ڈرنا ۶۳۵ اور وہ لوگ بول اٹھے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کر دیا، کاش

لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ

تھوڑی مدت تو اور ہم کو جینے کی مہلت دیئے رہتا ۶۳۶ آپ کہہ دیجیے کہ دنیا کا سامان (بہت ہی) تھوڑا ہے

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۷۷

اور آخرت اس کے لئے کہیں بہتر ہے جو تقویٰ (اختیار) کرے ۶۳۷ اور تم پر دھاگے برابر بھی ظلم نہ کیا جائیگا ۶۳۸

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ

تم جہاں کہیں بھی ہو گے وہیں تمہاری موت آ لے گی خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں

بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ

ہو ۶۳۹ اور اگر انہیں کوئی سکھ پہنچ جاتا ہے تو کہتے ہیں یہ تو خدا کی طرف

مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ

سے ہے اور اگر انہیں کوئی دکھ پیش آ جاتا ہے تو کہتے ہیں یہ آپ کے

مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ

سبب ہوا ۶۴۰ کہہ دیجیے کہ ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے ہے سو ان لوگوں کو کیا

الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝۷۸ مَآ اَصَابَكَ مِنْ

ہوا ہے کہ گویا یہ بات ہی نہیں سمجھتے ۶۴۱ تجھے جو بھی سکھ پیش آتا ہے

حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ

وہ بس اللہ ہی کی طرف سے ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تیرے اپنے ہی سبب سے ہے ۶۴۲

ائمۂ تفسیر نے یہاں حدیثِ نفس مُراد لی ہے۔ یحتمل انھم ما تفوھوا بہ ولکن قالوہ فی انفسھم رضی اللہ تعالٰی عنھم (بیضاوی) بالسنتھم او بقلوبھم (روح) یجوز ان یکون اعتقدوہ وقالوا فی انفسھم رضی ذلک تعالٰی عنھم (بحر) قد یجوز ان یکون ھذا مما نطقت بہ السنتہ حالھم من غیر ان یتفوھوا بہ صریحا (ابو سعود) بہر صورت آیت اُن ظالم پادریوں کی پُرزور تردید کر رہی ہے جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ مسلمان تو غنیمت کی طمع میں جنگ کے لیے تُلے بیٹھے تھے، رسُول کو صرف اشارہ کی دیر تھی یا معاذ اللہ۔ یہاں اُلٹے اُن کو ترغیب دینے اور آمادہ کرنے کی ضرورت تھی۔ ۶۳۷ (اور ہر حکم الٰہی کو بخوشی بجا لائے) عدم فرضیت جہاد اور زیست مزید کی مُہلت کی تمنا، چونکہ حُبِّ دنیا اور مانی الدنیا سے پیدا ہوئی تھی، اس لئے نہایت حکیمانہ انداز میں اصل ضرب اسی پر لگائی گئی۔ اور ارشاد ہوا کہ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہوا ہے۔ جو کچھ ہے وہ بھی بالکل فانی و بے ثبات طلب و تمنا کے قابل شے تو آخرت ہے اور اُس کی لذتوں اور نعمتوں کے حصول کا ذریعہ تقویٰ اور احکام الٰہی کی تعمیل ہے۔ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ۔ سو ایسی حقیر اور بے ثبات چیز کی خاطر التوائے حکم جہاد کی تمنا خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى۔ اور اس تقویٰ ہی کی ایک فرد جہاد ہے۔ ۶۳۸ (سو یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاد کے اعلیٰ ثمرات سے محروم رہ جاؤ) فَتِيْلًا۔ نقیرًا۔ ہی کی طرح عربی میں جب بھی تحقیر و تصغیر کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ جیسے اُردو محاورہ میں رتی بھر، رائی برابر، ذرہ بھر وغیرہا۔ ۶۳۹ تو جب موت ایسی یقینی اور بے پناہ شے ہے تو آخرت میں جہاد کے اجر و مراتب بے حساب سے محروم اور خالی ہاتھ کیوں پہنچو؟) ۶۴۰ ذکر اب منافقین کا ہو رہا ہے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں کی بات بنی رہتی، یہ لوگ بھی برابر ان کے شریک رہتے اور کہتے کہ یہ تو عین فضلِ خداوندی ہے جس میں ہم تم سب یکساں شریک ہیں اور جب بات بگڑ جاتی تو جھٹ سارا الزام مسلمانوں اور اُن کے سردار اعظم پر رکھ دیتے کہ یہ جو کچھ پیش آیا، سب آپ ہی کی بے تدبیریوں کا نتیجہ ہے۔ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ۔ مثلاً جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور اس میں حصۂ رسدی ان کو بھی مل گیا۔ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ۔ مثلاً جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور اس کا خمیازہ بحصۂ رسدی انہیں بھی اُٹھانا پڑا۔ يَقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یعنی یہ کامیابی تو طبعی حالات کی بنا پر تکوینی اسباب سے حاصل ہو گئی۔ اس میں مسلمانوں یا اُن کے سردارِ اعظم کے کسی حُسنِ تدبیر کو کیا دخل۔ منافقین کا یہ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کہنا بھی بطور حمد نہ تھا۔ بلکہ بطور محاورۂ زبان تھا۔ جیسے اردو میں لوگ کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ تو تقدیری اُمور ہیں۔ ۶۴۱ یہ توجہ دلائی ہے منافقین کی حماقت شعاری اور بے غوری کی عادت پر۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یعنی دُکھ ہو یا سُکھ رنج ہو یا راحت سب کا مسبّب الاسباب حقیقی اللہ ہی ہے۔ سُکھ اور راحت اگر ہے تو یہ براہِ راست اس کے فضل و کرم کا ظہور ہے بلا توسطِ اعمال۔ اور دُکھ یا رنج اگر پیش آ رہا ہے تو یہ اس کے عدل کا ثمرہ ہے بتوسطِ اعمال۔ ۶۴۲ (اے انسان!) خطاب اب عام نوعِ انسانی سے ہے۔ یا انسان خطابًا عامًا (کشاف) الخطاب عام کانہ قیل ما اصابک یا انسان (بحر) والخطاب فیہ کما قال الجبائی وروی عن قتادۃ عام لکل من یقف علیہ لا للنبی صلعم (روح) فَمِنَ اللّٰهِ۔ یعنی اس کے فضل و کرم کا نتیجہ۔ مِنَ اللّٰهِ و مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یہ دو محاورہ الگ الگ ہیں۔ زبان و ادب کے ماہرین نے دونوں میں فرق یہ بتایا ہے کہ دوسرا محاورہ بُرے بھلے سارے افعالِ تکوینی کے لئے عام ہے بخلاف اس کے پہلے محاورہ کا استعمال صرف محلِ رضا پر ہوتا ہے۔ من عند اللہ اعم یقال فی ما کان برضاہ و بسخطہ ولا یقال ھو من اللہ الّا فی ما کان برضاہ و بامرہ (بحر) فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ یعنی اے بندہ تیری ہی بد اعمالی کے سبب سے اور باقتضائے عدلِ الٰہی۔ سَيِّئَةٍ۔ کا اطلاق اس سیاق میں صرف اس بُرائی پر ہوتا ہے جو واقعۃً بھی بُرائی ہو محض صورۃً ہی بُرائی نہ ہو۔ صالحین و ابرار کو جو حوادث و مصائب پیش آتے رہتے ہیں وہ صرف صورۃً ہی مصائب ہوتے ہیں۔ حقیقت میں اُن کی بلندیٔ مراتب کے لئے اور ذریعۂ رحمت ہوتے ہیں۔ اور اس لئے اُن کے حق میں بد اعمالی کا ثمرہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۶۴۳ اور اللہ کی یہ گواہی دنیا میں رسولؐ کے کمالات سے ظاہر ہورہی ہے معجزات وخوارق بھی انہی کمالات کا ایک جزو ہیں۔ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا۔ یہاں صاف للناس فرمایا ہے۔ للعرب نہیں فرمایا۔ خاتم النبیین کے پیام کی عالمگیری پر دوسری آیات کے علاوہ یہ آیت بھی ایک نص قاطع ہے۔ والناس عام عربھم وعجمھم (بحر) فیہ رد لمن زعم اختصاص رسالتہ علیہ السلام بالعرب فتعریف الناس للاستغراق (روح) تعریف الناس للاستغراق ای مرسلا لکل الناس لا لبعضھم (ابوسعود) ۶۴۴ اگر عام انسانوں کے پاس کوئی ذریعہ احکام الٰہی کی معرفت کا نہیں بجز واسطۂ رسول کے) آیت میں رد آگیا ان گمراہ فرقوں کا جو رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے مستلزم نہیں سمجھتے۔ آیت عصمت رسول کے مضمون کو بھی واضح طور پر بیان کررہی ہے کہ اگر رسول سے ذرا بھی خطاء

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۷۹

اور ہم نے آپ کو انسانوں کی طرف پیمبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے ۶۴۳

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اُس نے اللہ ہی کی اطاعت کی ۶۴۴ اور جو کوئی روگردانی کرے سو

اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝۸۰ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا

ہم نے آپ کو اُن پر نگران کر کے نہیں بھیجا ہے ۶۴۵ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ طاعت (قبول ہے) ۶۴۶ لیکن آپ

بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ

کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو اُن میں سے ایک جماعت شب کے وقت اس کے برخلاف مشورہ کرتی

تَقُوْلُ ۚ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ

ہے جو کچھ کہہ چکے تھے اور اللہ اُن کے رات والے مشوروں کو لکھتا جاتا ہے، تو آپ اُن کی طرف سے بے التفاتی

تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۸۱ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ

برتیے اور اللہ پر بھروسہ رکھیے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے ۶۴۷ کیا یہ لوگ قرآن میں غور

الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ

نہیں کرتے ؟ اگر یہ (کلام) اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس کے اندر بڑا

اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝۸۲ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ

اختلاف پاتے ۶۴۸ اور انہیں جب کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو یہ

اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ

اُسے پھیلا دیتے ہیں ۶۴۹ اور اگر یہ لوگ اسے رسولؐ کے یا اپنے میں سے صاحبانِ امر کے حوالہ کر دیتے ۶۵۰

منزل ۱

غلطی کا امکان ہوتا تو اُن کی اطاعت عین اطاعتِ الٰہی کیسے قرار پاسکتی۔ من اقوی الدلائل علی انہ معصوم فی جمیع الاوامر والنواھی وفی کل ما یبلغہ عن اللہ (کبیر) اور علاوہ حدیث نبوی کے جہاں یہ مضمون تصریحاً آیا ہے، فقہاء نے خود اس آیت سے بھی نکالا ہے کہ رسولؐ کی نافرمانی عین حق تعالٰی کی نافرمانی ہے۔ افاد بذٰلک ان معصیتہ معصیۃ اللہ (جصاص) ۶۴۵ (سو اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں اور نہ آپ اس لیے زیادہ فکر و غم میں پڑیئے۔ فَمَنْ تَوَلّٰى۔ یعنی جو آپ کا کہنا نہ سنے اور آپ کی طرف سے بے توجہی اختیار کرے۔ ۶۴۶ ذکر منافقین کا چل رہا ہے۔ یعنی المنافقین (ابن عباس) یہ زبان سے تو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں بھی عرض کرتے تھے کہ ان کے احکام آنکھوں پر، آپکے ارشادات کی تعمیل ہمیں قبول و منظور۔ طَاعَةٌ خبر ہے مبتدا محذوف ہے۔ و بہ امرنا وشاننا طاعۃ (کشاف) ۶۴۷ اس کی کارسازی یہ ہے کہ وہ دنیا میں آپ کو ان کے شر سے اور سازشوں سے محفوظ رکھے گا اور آخرت میں انہیں شدید سزائیں دیگا۔ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ۔ یعنی ان منافقوں کے سردار اور سرغنہ۔ بَيَّتَ۔ رات کی تاریکی اور پوشیدگی میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں منصوبے بنائے جاتے تھے۔ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ۔ یعنی خدائی ریکارڈ میں ان کی سازشیں اور منصوبے سب مندرج و محفوظ ہیں۔ وقت آنے پر یہ سارا دفتر کھلے گا۔ ۶۴۸ (جو بشری تالیف و تصنیف کا لازمہ ہے) اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ اس کے مفہوم میں بہت کچھ قیل و قال ہوئی ہے۔ کسی نے کہا کہ بیان میں تناقض مراد ہے۔ اور کسی نے لکھا کہ تحقیقات میں فرق مراتب اور کسی نے کہا کہ عبارت کی عدم یکسانی لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود اختلاف کثیر کا لفظ بڑا وسیع اور جامع ہے۔ معنوی اور ادبی ہر قسم کی بے آہنگی ہر طرح کا جھول جھال اس کے اندر داخل ہے۔ قرآن مجید نے اس آیت سے دنیا کے سامنے اپنی یکتائی کا ایک مستقل چیلنج پیش کردیا کہ ہر طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لو، ہر طرح جانچ پڑتال کرلو، مضامین کی پستی و بلندی، عبارت کی ناہمواری، کسی قسم کی کوئی کمی کوتاہی اس کے اندر نہ پاؤ گے۔ اور یہی دلیل ہے اس کی کہ یہ بشر اور مخلوق کا کلام نہیں۔ قرآن کے جملہ منکرین کے خلاف خواہ وہ کسی وجہ اور کسی پہلو سے ہوں، یہ قیامت تک کے لئے تحدی ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ قرآن میں تدبر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا لفظی و معنوی اعجاز بالکل واضح ہوجائیگا۔ اور اس وضوح سے آپ کی رسالت کی جانب سے شبہات کافور ہوجائیں گے لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ۔ جیسا کہ معاصر و متاخر منکرین کا خیال تھا اور جیسا کہ آج بھی بعض "روشن خیال" مرتدین کا خیال ہے۔ يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ سے حجت قیاس پر بھی دلیل نکل آئی۔ اور ان فرقوں کا بھی رد ہوگیا جو سمجھتے ہیں کہ تفسیر قرآن صرف رسولؐ اور امام معصوم کا حق ہے۔ ۶۴۹ (بغیر اس تحقیق کے کہ وہ خبر صحیح بھی ہے اور بغیر اس پر غور کیے کہ اگر صحیح ہے بھی تو اس کی فوری اشاعت کہاں تک مناسب و قرین مصلحت ہے) اشارہ منافقین اور کمزور ایمان والوں کی طرف ہے۔ نزل فی جماعۃ من المنافقین او ضعفۃ المسلمین (جلالین)۔ ہیئتِ اسلامی شروع ہی سے ایک حد تک منظم، بلکہ نیم عسکری جماعت تھی اور یہ امر ہر اجتماعی تنظیم کے منافی عموماً اور عسکری تنظیم کے منافی تو خصوصاً ہے کہ اُمت کے عوام اور عام افراد جس خبر کو جہاں اور جب سُن پائیں بلا اپنے سرداروں اور اہل حل وعقد کی طرف رجوع کئے بے تحقیق اُسے لے دوڑیں اور بے تحاشا اُسے پھیلانا شروع کردیں۔ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ۔ مثلاً کہیں باہر سے لشکرِ اسلام کی فتح و ظفر کی خبر آئی۔ اَلْخَوْفِ۔ مثلاً کہیں باہر سے مسلمانوں کی شکست و ہزیمت کی خبر آئی۔ ۶۵۰ (بجائے اس کے کہ خود اس خبر کی شہرت و اشاعت میں لگ گئے) اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ یعنی صاحبانِ فہم سلیم۔ یہاں مراد ہیں اکابر صحابہ، مثلاً حضرت ابوبکرؓ۔ ذوی العقل والثبت من المؤمنین یعنی ابابکر واصحابہ (ابن عباس) ذوی العلم والرائی منھم (کبیر) وھم اھل العلم والفقہ عن الحسن وقتادہ وغیرھما (قرطبی) یجوز ان یرید بہ الفریقین من اھل الفقہ والولاۃ لوقوع الاسم علیھم جمیعاً (جصاص)

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ

تو اُن میں سے جو لوگ استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں اسکی حقیقت بھی جان لیتے ۶۵۱ اور اگر تم پر اس کی رحمت

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

شامل نہ ہوتی تو تم (سب) بجز تھوڑے سے لوگوں کے شیطان کی پیروی کرنے لگ جاتے ۶۵۲

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ

تو آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجیے ۶۵۳ آپ پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی بجز اپنی ذات کے ۶۵۴ اور

الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ

اپنے مسلمانوں کو بھی آمادہ کرتے رہیے ۶۵۵ اور عجب نہیں کہ اللہ کافروں کا زور روک دے ۶۵۶

وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً

اور اللہ بڑا ہی زور والا ہے، بڑا ہی سزا دینے والا ہے ۶۵۷ جو کوئی اچھی سفارش کرے گا

حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً

اس کو اس میں سے حصہ ملے گا ۶۵۸ اور جو کوئی بُری سفارش لائے گا

سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

اُس پر اُس میں سے بار رہے گا ۶۵۹ اور اللہ ہر چیز پر طاقت رکھنے والا

مُّقِيْتًا ۝ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ

ہے ۶۶۰ اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طور پر سلام کرو یا اُسی کو

اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝ اَللّٰهُ

لوٹا دو ۶۶۱ بیشک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے ۶۶۲ اللہ وہ ہے

النصف

۶۵۱ یعنی اس خبر کی صحیح حیثیت متعین کر لیتے۔ اَلَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اس سے ایک بڑی اہم فقہی حقیقت روشنی میں آگئی معلوم ہُوا کہ استنباطِ مسائل و اجتہادِ احکام، بعد صحابہ کے ہر ایک کا کام نہ تھا۔ اس کے لئے ایک خاص فہم و سلیقہ اور مرتبۂ تحقیق کی ضرورت ہے۔ ہر فردِ اُمت اس سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔ مِنْهُمْ۔ آیت میں دو جگہ آیا ہے۔ دونوں جگہ اس سے مُراد مجموعۂ اُمت ہے اس میں حسبِ الظاہر منافقین بھی شامل تھے۔ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت سے چار اُمور ثابت ہوتے ہیں:۔ ۱۔ ایک یہ کہ نئے نئے مسائل جو پیش آئیں گے ان کی بابت احکام نص سے نہیں استنباط سے حاصل ہوں گے۔ ۲۔ دوسرے یہ کہ استنباط بھی ایک حجّت شرعی ہے۔ ۳۔ تیسرے یہ کہ احکام میں عامیوں پر اہلِ علم کی تقلید واجب ہے۔ ۴۔ چوتھے یہ کہ رسُول اللہ صلعم اس پر مأمور تھے کہ استنباطِ احکام کرتے رہیں۔ آیت سے عقیدۂ امامت کا بھی رد نکل رہا ہے۔ اگر کسی امام معصوم کا وجود اُمت میں ہوتا تو استنباطِ احکام کی ضرورت کیا تھی۔ امام خود ہی الہاماً ان احکام سے واقف ہوتا۔ هذه الاٰية تدل على بطلان قول القائلين بالامامة لانه لو كان كل شئ من احكام الدين نصوصًا عليه لعرفه الامام ولزال موقع الاستنباط (جصاص) ۶۵۲ (اے اُمتِ محمدیہ!) یعنی گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتے تو تم کو ان نعمتوں کی قدر خاص طور پر کرنی چاہیے کہ اُس نے تمہیں قرآن دیا، شریعت دی، صاحبِ شریعت رسُول دیا۔ اِلَّا قَلِيْلًا۔ اور یہ تھوڑے سے جو محفوظ رہ جاتے وہ بھی عقلِ سلیم کی بدولت رہتے کہ وہ خود بھی فضل و رحمتِ خاص ہی کی صورت ہے۔ ۶۵۳ (اے پیغمبر!) ادھر مضمون جہاد و قتال کا چل رہا تھا۔ درمیان میں دُوسرے مضمون ضمنی مضامینوں سے آگئے تھے، اب پھر اُس مستقل مضمون کی طرف رجوع ہے۔ ۶۵۴ (نہ کسی دوسرے کے عمل کی) مقصد یہ ہے کہ آپ خود جہاد پر آمادہ ہو جایئے خواہ کوئی دوسرا ساتھ دے یا نہ دے۔ آپ پر ذمہ داری کسی دُوسرے کے عمل کی نہیں۔ تاریخ کا بیان ہے کہ غزوۂ اُحد جب شوال میں پیش آچکا تو اس کے مابعد ذی قعدہ میں آپ مشرکین کے وعدہ کا خیال کر کے بدر کی طرف پھر چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ اُس وقت منافقین تو اپنی بے اعتقادی کے سبب نکل گئے۔ اور مؤمنین بھی ساتھ دینے میں بہت پس و پیش کرنے لگے۔ کچھ تو اس لئے کہ ابھی اُحد کے زخم بالکل تازہ تھے اور کچھ اس لئے بھی کہ افواہی خبروں پر یقین کر بیٹھے تھے۔ مسلمانوں کا سپہ سالارِ اعظم یہ رنگ دیکھ، بالکل تن تنہا چل کھڑے ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ کیا ٹھکانا تھا فرض شناسی اور نصرتِ الٰہی پر اعتماد کا۔ قلت و کثرت اور اکائی اور سیکڑوں کی عددی نامناسبت کا گویا خیال بھی سامنے نہیں رہا۔ ۶۵۵ (جہاد پر) یعنی درجۂ ترغیب میں تبلیغ آپؐ کے فرائضِ رسالت میں داخل ہے۔ حَرِّضِ۔ تحریض کے معنی ہیں کسی شے کی خوبیاں بکثرت بیان کر کر کے اُس کی جانب شوق و رغبت دلانا۔ گویا صحیح اور سچا پروپیگنڈہ کرنا۔ التحريض الحث على الشئ بكثرة التزيين وتسهيل الخطب فيه (راغب) آیت ان ظالم اور بیہودہ پادریوں کا پول کھول رہی ہے جنہوں نے یہ جھوٹ اُچھال رکھا ہے کہ (نعوذ باللہ) پیروانِ محمدؐ لوٹ مار کے شوق میں جہاد پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ کیا بار بار ترغیب دلانے اور آمادہ کرنے کی ضرورت حریصوں کو ہُوا کرتی ہے؟ ۶۵۶ (اور انہیں ان کی زور آوری کے باوجود مغلوب کر دے) قرآن مجید کی یہ پیش خبری مستقبل قریب و بعید دونوں میں پوری ہو کر رہی۔ مخالفین و معاندین میں سے قریش کا زور تو اُسی زمانہ میں ختم ہو کر رہا، رہیں دُور دراز کی پُرقوت پُرشوکت بادشاہتیں اور حکومتیں سو وہ مغلوب ہو گئیں۔ عَسٰى۔ اس پر پہلے ہی حاشیہ گزر چکے ہیں کہ اس کا استعمال جب اللہ تعالیٰ کے کسی قول میں ہوتا ہے تو اُس کے معنی محض اُمید یا توقع کے بجائے وعدہ اور یقین کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عسٰى من الله واجب (ابن عباس) الماء۔ والاطماع من الله عزّ وجل واجبٌ (قرطبی) ۶۵۷ اَشَدُّ بَاْسًا اس قوت و شدت کا ظہور اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا۔ اس صفت سزا دہی کا پورا ظہور آخرت میں ہوگا۔ ۶۵۸ یعنی جو کوئی عملِ خیر میں بطریقِ مشروع ساعی ہوگا، اُسے اس کا اجر مل کر رہیگا کہ وہ کسی درجہ میں سبب بنا عملِ خیر کا۔ ۶۵۹ (اس لئے کہ وہ سبب اور ذریعہ بنا معصیت کا) شَفَاعَةً سَيِّئَةً۔ اس کے تحت میں علاوہ عملِ بد کے وہ عملِ خیر بھی آجاتے ہیں جو غیر مشروع طریق پر کئے جائیں۔ ۶۶۰ تو ہر نیکی پر اجر اور ہر بدی پر عذاب کا ترتب اس کے لئے کچھ بھی دشوار نہیں۔ ۶۶۱ (اسلئے معاشرت کے ان جزئیات کو حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیا جائے) سلام کے جواب میں سلام تو بہر حال واجب ہے۔ اس کے بعد اختیار دے دیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جوابِ سلام، سلام سے بہتر ہو۔ دوسرے یہ کہ ایسا ہی ہو۔ بہترین قول بعض صحابہ اور تابعین کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کرنے والا اگر مسلمان ہے تو اس کا جواب زیادتی کے ساتھ دیا جائے اور اگر غیر مسلم ہے تو اس کے الفاظ دہرائے جائیں۔ ردوها بافضل منها اى الزيادة على اهل دينكم وملتكم اوردوها مثل ماسلموا عليكم على غير اهل دينكم (ابن عباس) اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ۔ یعنی جب تمہیں سلام کیا جائے طریق مشروع پر۔ سلام کے شرعی طریقوں کی تفصیل کتب فقہ میں ملے گی۔ تحيّة۔ حيّاك الله کے اصل معنی تو زندگی سے خبر دینے کے ہیں۔ پھر دعائے زندگی کے معنی ہو گئے۔ ذلك اخبار ثم يجعل دعاء (راغب) اہلِ عرب جب آپس میں ملتے تھے تو اس کلمۂ دعا کو استعمال کرتے تھے۔ اسلام نے اسے سلام کے معنی میں کر دیا۔ فلما جاء الاسلام ابدل ذلك بالسلام فجعلوا التحية اسما للاسلام (کبیر)

٦٦٢ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے چھوٹے بڑے سارے ہی ارشادات سے متعلق قلب میں یقین محکم اور اذعان کامل قائم رہنا چاہیے۔ اگر ریب و تذبذب ذرا بھی باقی رہ گیا تو عمل بلکہ عزم عمل میں بھی کوتاہی رہ جائے گی۔ اِلٰی۔ یہ کبھی فی کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں تو اسی معنی میں ہے۔ الی بمعنی فی اجل المراد لیجمعنکم فی الموت (کبیر) فِیْهِ میں ضمیر یوم کی طرف بھی ہوسکتی ہے اور جمع کی طرف بھی۔ فی الیوم او فی الجمع (بیضاوی) معنی بہرصورت یہ ہیں کہ کوئی شبہ اس بیان کی حقیقت اور اس خبر کی صداقت میں نہیں۔ لا شك فی حقیقة ما اقول لکم فی ذلك واخبرکم من خبری (ابن جریر) ٦٦٣ (اے مسلمانو کہ تم میں سے بعض ان کو اب بھی مومن کہے جارہے ہیں) یہ آیت کس گروہ منافقین کے باب میں ہے؟ روایتیں اس بارہ میں مختلف ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہ منافقین ہوں جو غزوۂ احد کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی سیادت میں جنگ سے قبل ہی واپس چلے آئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وہ گروہ ہو جس نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں، جو دارالحرب مکہ کو دارالہجرت مدینہ میں آئے اپنا اسلام ظاہر کیا۔ مال تجارت لے کہ گئے اور پھر واپس نہ آئے، مشرکوں میں مل جل کر رہیں۔ دارالحرب میں رہ پڑے اور سیاق قرآنی کی رو سے یہی قول سب سے زیادہ قوی ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ
کہ کوئی معبود نہیں بجز اس کے، وہ ضرور تم سب کو قیامت کے دن جمع کریگا، اس میں کوئی شبہ نہیں
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿٨٧﴾ فَمَا لَكُمْ فِي ع ١١ / ٨
اور کون اللہ سے بڑھ کر بات میں سچا ہے ٦٦٢ سو تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم منافقین
الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ
کے باب میں دو گروہ ہوگئے ہو ٦٦٣ درآنحالیکہ اللہ نے اُن کے کرتوتوں کے باعث انہیں الٹا پھیر دیا ٦٦٤
اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ
کیا تم چاہتے ہو کہ انہیں راہ دکھاؤ جنہیں اللہ نے گمراہ کر رکھا ہے، اور جسے اللہ ٦٦٥ گمراہ کردے اس کے
تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿٨٨﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ
لئے تو ہرگز راہ نہ پائے گا ٦٦٦ یہ لوگ تو دل سے چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جیسے یہ لوگ کفر کررہے ہیں
سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ
تاکہ تم سب برابر ہوجاؤ سو تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا جب تک اللہ کی راہ میں ہجرت
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ
نہ کریں ٦٦٧ اور اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں پکڑو اور جہاں کہیں انہیں پاؤ انہیں
وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٨٩﴾
قتل کرو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ ٦٦٨
اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَ
بجز ایسوں کے جو ان لوگوں سے جا ملتے ہیں جن کے اور تمہارے درمیان

بہرحال وہ کوئی سے بھی ہوں، تھے منافقین ہی، جو مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف شرکت جنگ سے جی چراتے تھے بلکہ ان کے خلاف طرح طرح کی سازشوں اور منصوبوں میں لگے رہتے تھے۔ جیسا کہ قبل والے رکوع میں ذکر آچکا ہے۔ بلکہ بعض تو دارالاسلام کا قیام جو اس وقت عین علامت اسلام تھی، ترک کرکے دارالحرب میں کافروں سے جا ملے تھے۔ ٦٦٤ (اُن کے علانیہ کفر کی جانب) کافر تو حقیقۃً وہ پہلے ہی سے تھے، اب اُن کی جسارتیں اتنی بڑھ گئیں کہ علانیہ دشمنان اسلام کے ساتھ ہوکر میدان میں مسلمانوں کے مقابل آگئے۔ بِمَا كَسَبُوْا۔ یہ اُن کا اکتسابی رد عمل تھا کہ باوجود قدرت انہوں نے دارالاسلام کو چھوڑ دیا تھا —— اس وقت جبکہ ترک اقرار اسلام کی طرح یہ بھی ایک علامت کفر کی تھی۔ من ارتدادهم ولحوقهم بالمشرکین (مدارک) ٦٦٥ یعنی جب انہوں نے گمراہی کا قصد کرلیا تو اللہ کا قانون تکوینی یہ ہے کہ ہر عزم فعل پر فعل پیدا کردیا جاتا ہے۔ اور اسی قاعدہ کے مطابق مشیت تکوینی نے انہیں گمراہی میں ڈال دیا تو اب انہیں نکال کون سکتا ہے؟ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ۔ اللہ کی طرف اس اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت منافقین کے کفر اختیاری کے نتیجہ کے طور پر ہے۔ اَتُرِيْدُوْنَ ...... اللّٰهُ۔ یعنی کیا تم اُن کے قلوب میں زبردستی ایمان ڈال سکو گے جو سرے سے ارادہ ہی ایمان کا نہیں کرتے۔ ٦٦٦ یعنی ان کے مومن ہونے کا کیا ذکر ہے۔ ان کے غلو کفر کا تو یہ حال ہے کہ اُلٹے وہ تمہی کو اپنے رنگ میں رنگ لینے اور اپنے میں جذب کرلینے کی دھن میں ہیں۔ ٦٦٧ (اور دارالحرب کو ترک کرکے دارالاسلام میں نہ آجائیں) اس وقت ہجرت بھی اسلام کے لئے اقرار شہادتین کی طرح لازمی تھی۔ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ۔ یعنی ان سے مسلمانوں کا سا برتاؤ مت رکھو کہ دوستی کے جواز کے لئے شرط ہے۔ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ قید بہت ضروری تھی۔ ورنہ یوں تجارت وغیرہ کی غرض سے تو کافر بھی دارالہجرت میں آسکتے تھے۔ دنیا کے قانون میں اسلام کا ثبوت انہی ظاہری چیزوں سے ملتا ہے۔ رہی تصدیق قلب، سو وہ صرف عند اللہ ہے۔ بندوں کے ذمہ اس کی تفتیش نہیں۔ ٦٦٨ یعنی کسی حال میں کوئی علاقہ اُن سے محبت کا نہ رکھو۔ نہ حالت امن میں دوستی کا نہ حالت خوف میں استعانت کا۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا۔ یعنی اگر یہ ہجرت اور اسلام سے روگردانی رکھیں اور بدستور دارالحرب میں کافر ہی بنے رہیں۔ عن الایمان والهجرة (ابن عباس) عن الایمان الظاهر بالهجرة (بیضاوی) وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ۔ اس لئے کہ یہ بھی مشرکین محاربین کے حکم میں داخل ہوگئے اور ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا جو مشرکین محاربین کے ساتھ ہوتا ہے۔ کما کان حکم سائر المشرکین (مدارک) ٦٦٩ (اور اُن کے بھی جا کر ہم عہد ہوجاتے ہیں تو گویا اس طرح تمہارے بھی حلیف ہوجاتے ہیں) حلیف کا حلیف بالواسطہ اپنا ہی حلیف ہوجاتا ہے۔ اور اس سے مصالحت و امن حاصل ہوجاتا ہے۔ ایسوں کے اخذ و قتل کا حکم نہیں۔ گویا بنائے حکم ان کا کفر نہیں بلکہ مادہ ضرر رسانی ہے۔

۶۷۰ یعنی نہ وہ اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑنا چاہتے ہیں بلکہ دونوں سے صلح و آشتی رکھنا چاہتے ہیں دوسرے لفظوں میں مسلمان ان کی طرف سے بھی امن میں ہیں۔ ان دونوں قسم کے منافقین کو حکم قتل و اسیری سے مستثنیٰ کر کے قرآن مجید نے یہ بالکل صاف کر دیا کہ اصل مقصد مسلمانوں کو اذیت و نقصان سے محفوظ رکھنا ہے۔ ۶۷۱ (لیکن اللہ نے ایسا نہیں ہونے دیا اور تمہیں کلفت و پریشانی سے بچا لیا) وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ۔ یعنی اگر مشیتِ تکوینی یہی ہوتی۔ ۶۷۲ یعنی ایسوں سے جنگ جائز نہیں۔ اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے نہ لڑیں اور ان کے ساتھ صلح و سازگاری سے رہنا چاہیں، اگرچہ وہ مسلمانوں کا بھی ساتھ کافروں کے مقابلہ میں نہ دیں، ان سے جنگ و قتال جائز نہیں۔ ۶۷۳ اور ان کا یہ چاہنا مکر و خداع کی راہ سے نہ اس سے کہ ان کا دل واقعی لڑائی سے بھر گیا اور وہ اخلاص کے ساتھ صلح و امن چاہتے ہیں۔ یہ وہ منافقین تھے جو اپنی عقیدۂ اسلامی کی طرح اس صلح جوئی اور مصالحت پسندی میں بھی منافقت برت رہے تھے۔ سَتَجِدُوْنَ۔ میں س زائد مستقبل کے معنی میں بھی لیا گیا ہے اور استمرار کے معنی میں بھی۔ قیل السین للاستمرار لا للاستقبال (جمل) ۶۷۴ (اور موقع پانے پر مسلمانوں سے لڑنے پر بلا تامل آمادہ ہو جاتے ہیں) اَلْفِتْنَةِ سے مراد کفر و شرک یا فساد عقائد بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن سیاق کھلا ہوا اشارہ قتالِ مسلمین کی جانب کر رہا ہے فساد عقائد میں تو وہ پہلے ہی سے مبتلا تھے۔ اب موقع پا جانے پر مسلمانوں پر بھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ای کلما دعاهم قومهم الی قتال المسلمین (کبیر) اُرْكِسُوْا فِيْهَا یعنی اس میں اندھا دھند اُلٹے منہ گر پڑتے ہیں۔ یہ ان کی شان کفر، بغض مسلمین کے اظہار کے لئے ہے۔ هٰذا استعارة لشدة اصرارهم علی الکفر وعداوة المسلمین (کبیر) گویا ان کے کفر اور بدنفسی اور عداوت مسلمین کا اب عملی ثبوت بھی مل جاتا ہے۔

بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ
عہد ہے ۶۶۹ یا تمہارے ہی پاس اس طرح آتے ہیں کہ ان کے سینے اس سے تنگ ہو

يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ
رہے ہیں کہ تم سے لڑیں یا اپنی ہی قوم سے لڑیں ۶۷۰ اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تمہارے اوپر مسلط

عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ
کر دیتا ۶۷۱ تو اگر وہ تمہیں چھوڑے رہیں اور تم سے قتال نہ کریں اور تمہارے ساتھ

وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ
صلحت روی رکھیں تو اللہ نے اُن کے خلاف تمہارے لئے کوئی راہ نہیں

سَبِيْلًا ۞ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ
رکھی ہے ۶۷۲ عنقریب کچھ لوگ اور بھی پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور

وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ
اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں ۶۷۳ انہیں جب کبھی فساد کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو اس میں

اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ
پلٹ پڑتے ہیں ۶۷۴ تو اگر یہ تمہیں چھوڑے نہ رہیں اور نہ تمہارے ساتھ سلامت روی

السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ
رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تم سے) روکیں تو تم بھی انہیں پکڑو اور

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ
انہیں قتل کرو جہاں کہیں بھی انہیں پاؤ یہی لوگ تو ہیں

۶۷۵ یعنی اُن کا حکم کھلے ہوئے محاربین کا ہے، اور اُن پر کھلی ہوئی گرفت، اُن کی بدعہدی اور عملی عداوتِ اسلام کی ہے۔ لظهور عداوتهم و وضوح كفرهم وخباثتهم (روح) لظهور عداوتهم وانكشاف حالهم في الكفر والغدر واضرارهم باهل الاسلام (بحر) سُلْطٰنًا یہ لفظ قرآن مجید میں جہاں آیا ہے گرفت اور دلیل ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔ قال عكرمة حيثما وقع السلطان في كتاب الله فالمراد به الحجة (بحر) ۶۷۶ (خواہ وہ غلطی قصد میں ہوئی ہو یا نفس عمل میں) شرک کفر وغیرہ اعتقادی معصیتوں سے قطع نظر عملی گناہوں میں انسان کے لئے اکبر الکبائر قتل مومن ہے۔ اتنے بڑے گناہ کی جسارت کسی مومن سے بہ ثبات ہوش و سلامتی عقل بہت مستبعد ہے۔ ہاں غلطی اور دھوکے ہی سے ہو جائے تو اور بات ہے۔ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا۔ جرم قتل کی فقہاء نے دو قسمیں کی ہیں ایک قتل عمد جس میں آلۂ قتل سے کام لیا گیا ہو، دوسرے قتل شبہ عمد جس میں کام آلۂ قتل سے نہ لیا گیا ہو۔ جو قتل کسی حجت شرعی کی بنا پر مثلاً قصاص میں کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر جرم قتل کا اطلاق ہی نہ ہوگا۔ اِلَّا خَطَـًٔا فقہاء نے قتل خطا کی دو بڑی قسمیں کی ہیں:- ایک یہ کہ غلطی قصد و ظن میں ہوئی مثلاً دور سے آدمی کو شکار کا جانور سمجھ لیا یا آدمی ہوتا تو سپاہی مگر مومن کے اوپر کافر حربی کا دھوکا ہوا۔ دوسرے یہ کہ غلطی نفس عمل میں ہوگئی۔ مثلاً نشانہ لگایا جانور کے مگر پڑ گیا آدمی کے اوپر۔

ع ۱۲ / ۹

جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ﴿٩١﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ

جن کے خلاف ہم نے تم کو صاف گرفت دے رکھی ہے ۶۷۵ اور کسی مومن کے شایان نہیں کہ وہ

اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا

کسی مومن کو قتل کرے بجز اس کے کہ غلطی سے ایسا ہو جائے ۶۷۶ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر ڈالے

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ

تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا اس پر واجب ہے اور خون بہا بھی جو اس کے عزیزوں کے حوالہ کیا جائیگا ۶۷۷

اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ

سوا اس کے کہ وہ لوگ (خود ہی) اسے معاف کر دیں ۶۷۸ تو اگر وہ ایسی قوم میں ہو جو تمہاری دشمن ہے درآنحالیکہ وہ بذات

مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۗ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ

خود مومن ہے تو ایک مسلم غلام کا آزاد کرنا واجب ہے ۶۷۹ اور اگر ایسی قوم سے ہو کہ

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَ

تمہارے اور اُن کے درمیان معاہدہ ہے ۶۸۰ تو خون بہا واجب ہے جو اس کے عزیزوں کے حوالہ کیا جائیگا اور

تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ

ایک مسلم غلام کا آزاد کرنا بھی ۶۸۱ پھر جس کو یہ نہ میسر ہو اس پر دو مہینے کے لگاتار روزے

مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٩٢﴾

رکھنا واجب ہے یہ توبہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے ۶۸۲

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا

اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ

۶۷۷ (جو مقتول کے شرعی وارثوں کے درمیان بہ قدر اُن کے حصۂ میراث کے تقسیم ہوگا) اگر کوئی وارث نہ ہو تو اُن کا قائم مقام بیت المال قرار پائیگا۔ دِيَةٌ اس پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے۔ دیت کی مقدار سنت سے سو اونٹ ثابت ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس پر قیاس کرکے ایک ہزار دینار شرعی یا دس ہزار درہم شرعی ٹھیرا دی ہے لیکن جس طرح عراق و مصر و شام کے حالات عرب سے مختلف تھے اسی طرح ہندوستان وغیرہ کے حالات خود ان ملکوں سے مختلف ہیں۔ اس لیے دیت کی مقدار کو ہر ملک کے عرف کے ماتحت قاضی کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے۔ مگر شرط یہ ہے کہ قاضی شرعی مقدار سے کم و بیش نہ کرے۔ البتہ مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے کہ خون بہا بالکل معاف کر دیں یا کم کر دیں۔ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔ اس کے تحت میں جس طرح غلام ہے، کنیز بھی شامل ہے۔ ۶۷۸ (خواہ کل، خواہ کوئی جز) اَنْ يَّصَّدَّقُوْا خون بہا کی معافی کو لفظ تصدق سے تعبیر کرنے میں خود اشارہ اس طرف ہو گیا کہ افضل یہی ہے۔ سمى العفو عنها صدقة حثا عليه وتنبيها على فضله (بیضاوی) ۶۷۹ (اور دیت اس موقع کے لئے نہیں) ظاہر ہے کہ مقتول جب کافروں کے درمیان رہتا تھا تو اس کی دیت بھی کافروں ہی کے ہاتھ میں جائے گی۔ اور کافر کے لئے مسلم کی میراث ممنوع ہے۔ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ یعنی مقتول تھا تو مومن، لیکن کسی سبب سے حربی کافروں کے درمیان رہ رہا تھا۔ عَدُوٌّ لفظاً واحد ہے لیکن معنیٰ یہاں جمع ہے، اعداء کے مُرادف۔ مومن اگر دار الحرب ہی میں رہ گیا اور ہجرت کرکے دار الاسلام میں نہ پہنچ سکا تو اُس کی جان تو بہرحال اس کے اسلام کی بنا پر محفوظ سمجھی جائیگی، اور اس کے لئے کفارہ دینا پڑے گا لیکن دیت کا تعلق اس کے ایمان سے نہیں بلکہ اس کے مقام سے ہے اور وہ دار الاسلام ہے نہیں اس لئے یہ واجب نہ آئے گی۔ سقطت الدية لوجهين احدهما ان اولياء القتيل كفار فلا يصح ان تدفع اليهم فيتقووا بها والثاني ان حرمة هذا الذي لم يهاجر قليلة (قرطبی) ۶۸۰ (صلح کا یا ذمہ کا) یہاں حکم اس صورت کا بیان ہو رہا ہے کہ مقتول گو غیر مسلم ہے لیکن ایسی قوم کا فرد ہے جو مسلمانوں سے معاہدۂ صلح و اتحاد کئے ہوئے یا فقہاء کی اصطلاح میں ذمی یا مستامن ہے۔ هم اهل الذمة من اهل الكتاب (کبیر عن ابن عباس) هم المعاهدون من الكفار (کبیر عن الحسن) هذا في الذمي والمعاهد يقتل خطأ فتجب الدية والكفارة قاله ابن عباس والشعبي والنخعي والشافعي واختاره الطبري (قرطبی) ۶۸۱ گویا کفارہ اور دیت کے لحاظ سے ذمی اور معاہد کافر بھی ایک مسلم کے برابر ہی حق رکھتا ہے۔ وان كان من قوم كفرة معاهدين او اهل الذمة فحكمه حكم المسلمين في وجوب الكفارة والدية (بیضاوی) ان كان المقتول ذميا فحكمه كحكم المسلم وفيه دليل على ان دية الذمي كدية المسلم (مدارک) فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ یعنی اس کافر کا بھی خون بہا اس کے کافر وارثوں کو دیا جائے گا۔ ۶۸۲ (بس ایسے علیم کل اور حکیم مطلق کے قانون کی کسی ترمیم، کسی تنسیخ کی گنجائش کسی بندہ کو نہیں) تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ لفظ توبہ بہت اہم اور بلیغ ہے، ندامت، شرمساری، اصلاح کے سارے پہلو اس کے اندر آ گئے۔ من الله یہاں اسی تاکید و تصریح ہے کہ کفارہ اور دیت کے یہ طریقے اللہ کی طرف سے مشروع ہیں، کسی بندہ کی طرف سے نہیں۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ۔ یعنی جس کو باندی یا غلام کی استطاعت ہی نہ ہو۔ اور یہ صورت اس وقت ہندوستان میں تمام تر عائد ہے جبکہ شرعی کنیز اور غلام کا وجود ہی نہیں۔ صِيَامُ شَهْرَيْنِ۔ تقدیر کلام یوں ہے۔ فعليه صيام شهرين (قرطبی) مُتَتَابِعَيْنِ۔ ان دو مہینوں میں اگر ایک دن کا بھی ناغہ بلا عذر شرعی ہو جائیگا تو پھر سے ان دو مہینوں کا شمار پورا کرنا ہوگا۔ حتى لو افطر يوما استأنف هذا قول الجمهور (قرطبی)

فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا

پڑا رہیگا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اُس پر لعنت کریگا اور اُس کے لئے عذاب عظیم تیار

عَظِيمًا ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ

رکھیگا ۶۸۳ اے ایمان والو! جب تم سفر کرو اللہ کی راہ میں تو خوب تحقیق

اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ

کرلیا کرو ۶۸۴ اور جو تمہیں سلام کرتا ہو ۶۸۵ اُسے یہ مت کہہ دیا کرو کہ

لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ

تو تو مسلمان ہی نہیں ۶۸۶ تم دنیوی زندگی کا سامان تلاش کرتے ہو تو اللہ کے پاس تو (بہت)

اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ ۚ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ

کثرت سے مال غنیمت ہے ۶۸۷ ایسے ہی تم بھی تو پہلے تھے ۶۸۸ پھر اللہ نے تم پر کرم کیا ۶۸۹

عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝

تو خوب تحقیق کرلیا کرو، بیشک تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خوب خبر رکھتا ہے ۶۹۰

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ اُولِي

مسلمانوں میں سے بلا عذر (گھر) بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال

الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ

اور اپنی جان سے جہاد کرنے والے برابر نہیں

اَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِينَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

ہو سکتے ۶۹۱ اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجہ میں

منزل ۱

۶۸۳ کسی اتنی سخت وعیدیں بجز کفر و شرک کے اور کسی جرم کی قرآن مجید میں وارد نہیں اور اسی لئے قتل مومن اشاعرہ و معتزلہ سب کے نزدیک بالاتفاق اکبر الکبائر ہے اور یہ ڈرنے اور لرز جانے کی چیز ہے۔ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا۔ قتل عمدی جو معروف اور برابر والی صورتیں ہیں وہ تو ہیں ہی لیکن عجب نہیں کہ اس وعید کے تحت میں قتل مسلم کی وہ ساری صورتیں بھی آجائیں جو کسی غیر شرعی قانون کے مطابق اور کسی کافرانہ آئین و نظام کے ماتحت کی جاتی ہیں مثلاً کسی کافر حکومت کی فوج یا پولیس میں داخل ہو کر اس حکومت کے باغی اور مجرم مسلمان پر گولی چلا دینا یا کسی غیر اسلامی عدالت کی کرسی پر مجسٹریٹ یا جج کی حیثیت سے بیٹھ کر کسی مسلمان کو سزائے موت کا حکم سنا دینا وقس علیٰ ہذا۔ مُتَعَمِّدًا۔ تعمد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مقتول کے ایمان ہی کی بنا پر اُسے قتل کیا جائے۔ یہ صورت تو صاف کفر کی ہے۔ دوسری یہ کہ قتل مسلم کو جائز سمجھ کر۔ یہ صورت بھی کفر ہی کی ہوئی۔ ای تعمد اقتله لایمانه وهو کفر او قتله مستحلا لقتله وهو کفر ایضا (مدارک) فَجَزَآؤُهٗ۔ آگے سزا ایسے قاتل کی مذکور ہو رہی ہے جو اس قتل کو جائز سمجھے یا بلاتوبہ مر جائے۔ والجمهور على انه مخصوص بمن لم يتب (بیضاوی) وهو عندنا مخصوص لما مستحل له (بیضاوی) پھر یہ بھی لحاظ رہے کہ نوعیت جرم کی شدت کے لحاظ سے اصل سزا یہی ہے جو یہاں مذکور ہوئی لیکن یہ لازمی نہیں کہ ہر مومن کو بھی انتہائی سزا مل کر رہے اور یہ تفسیر حدیث نبوی سے ماخوذ اور اس پر مبنی ہے۔ دنیوی قانون میں بھی جرائم کی ایک انتہائی سزا مقرر ہوتی ہے لیکن یہ حاکم کی رائے تمیزی پر ہوگا کہ اس حد کے اندر جتنی سزا مناسب سمجھے دے۔ معناه هي جزاؤه ان جازاه ولكنه ان شاء تجاوز عنه وان شاء غفر له بكرمه فانه يغفر لمن يشاء (معالم) قال عليه السلام هي جزاؤه ان جازاه (مدارک) جمہور اہل سنت کا مذہب ہے کہ قاتل اگر مسلم ہے تو اسکی توبہ بھی بالآخر قبول ہو جائیگی۔ اور خلود فی النار کی سزا صرف کافروں اور مشرکوں کے لئے رہ جائے گی۔ اس عقیدہ کے دلائل کتاب و سنت سے ماخوذ کلام و عقائد کی کتابوں میں اپنی جگہ پر مبسوط درج ملیں گے۔ ۶۸۴ (ہر امر کی اور خصوصاً قتل کے باب میں) یہ مسلمانوں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ جب تم وطن سے باہر سفر جہاد میں ہو تو بلا خوب چھان بین کئے محض شک و شبہ کی بنا پر قتل میں جلد بازی نہ کر دیا کرو۔ فَتَبَيَّنُوا خوب سوچ بچار لو۔ ایسا نہ ہو کہ کافر کے خیال میں کسی کلمہ گو کو قتل کر ڈالو۔ تحققوا حتى يتبين لكم المؤمن من الكافر (ابن عباس) المقصود من هذه الاية المبالغة في تحريم قتل المؤمنين (کبیر) یہ تحقیق و احتیاط، سفر و حضر ہر حال میں واجب ہے سفر جہاد کی قید آیت میں صرف اس لئے ہے کہ نزول آیت سے قبل ایسا واقعہ اتفاق سے سفر جہاد ہی میں پیش آیا تھا۔ والتبيين اى التثبت في القتل واجب حضرا وسفرا لاخلاف فيه وانما خص السفر بالذكر لان الحادثة التي فيها نزلت الاية وقعت في السفر (قرطبی) احادیث نبوی میں یہ مضامین بار بار آئے ہیں کہ ایک کلمہ گو کا قتل ہو جانا اللہ کے ہاں ہزار کافروں کے زندہ بچ جانے سے بلکہ ساری دنیا کے فنا ہو جانے سے شدید تر ہے۔ فلأن ايقاد الف كافر اهون عند الله من قتل امرئ مسلم (بیضاوی) وفي الحديث زوال الدنيا اهون على الله من قتل امرئ مسلم (کشاف) فِي سَبِيلِ اللّٰهِ یعنی راہ جہاد میں۔ فی غزوکم في الجهاد (ابن عباس) ۶۸۵ مسلمانوں کے طریقہ پر یا اور کسی ایسی ہی علامت سے اپنے اسلام کا اظہار کر رہا ہو) ۶۸۶ بلکہ محض جان بچانے کو اظہار اسلام کر رہا ہے) مقصد یہ ہے کہ قتل سے دستکشی اُس شخص کے مجرد اظہار اسلام سے واجب ہو جاتی ہے۔ اسکے باطن کی تفتیش ہرگز تمہارے ذمہ نہیں۔ فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ جان و مال کو محفوظ کر دینے والی شے کلمہ شہادت ہے، کافر غیر معاہد بھی اگر اسے پڑھ دیگا تو مسلم کیلئے اُس پر تلوار اٹھانا حرام ہو جائیگی) المسلم اذا لقي الكافر ولا عهد له جاز له قتله فان قال لا اله الا الله لم يجز قتله لانه قد اعتصم بعصام الاسلام المانع من دمه وماله واهله (قرطبی) آیت سے بعض فرقوں نے استدلال یہ کیا ہے کہ ایمان مجرد قول کا نام ہے لیکن اہل تحقیق کا قول ہے کہ ایمان فقط اقرار لسانی کا نام نہیں اور زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے بلکہ ایمان کی حقیقت میں تصدیق قلب بھی شامل ہو البتہ بندوں کے پاس علم کا کوئی ذریعہ بجز لفظ و قول کے نہیں۔ استدل بهذه الاية من قال ان الايمان هو القول وليس في ذلك ان الايمان هو الاقرار فقط الاترى ان المنافقين كانوا يقولون هذا القول وليسوا بمؤمنين خشية ان الايمان هو الاقرار وغيره وان حقيقته التصديق بالقلب ولكن ليس للعبد طريق اليه الا ما سمع منه فقط (قرطبی) ۶۸۷ یعنی اگر مال غنیمت کی طمع تمہیں ایک مدعی اسلام کے قتل میں جلد بازی و بے احتیاطی کی طرف لا رہی ہے تو یہ یاد رکھو کہ مال اور مال غنیمت کا سرچشمہ بھی تو اللہ ہی کی ذات ہے اور وہ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہیں اس کی بڑی سے بڑی مقدار قانون شریعت کے اتباع ہی سے دے بعنایت دے۔ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ عرض وہ چیز ہے جو بذات خود قائم نہ رہ سکے اور اسی لئے متکلمین نے جوہر کے مقابل کی اصطلاح رکھی ہے) العرض ما لا يكون له ثبات ومنه استعار المتكلمون العرض لما لاثبات له الا بالجوهر (راغب) یہاں عرض سے مراد مال ہے اور بجائے مال کے عرض اسی لئے لایا گیا ہے کہ اس سے مال کی بے ثباتی اور زود فنائی کی جانب بھی پورا اشارہ ہو جائے۔ سُمّيه تعالى بتسميته عرضا على كونه سريع الفناء قريب العرض المال سمى به لسرعة فنائه (مدارک) الانقضاء (کبیر) ۶۸۸ یہ تو مسلم صحابیوں اور دوسروں کو یاد دلایا ہے کہ آخر تمہارے اوپر بھی تو یہ دور گزر چکا ہے کہ تمہارے پاس تمہارے اسلام و ایمان کا ثبوت بجز تلفظ کلمہ اور زبانی دعوی کے اور تھا کیا؛ تمہارے اخلاص قلب اور تمہارے حسن اعمال کی شہادت تو بہت بعد کو پیش ہوئی۔ اول ما دخلتم في الاسلام سمعت من افواهكم كلمة الشهادة فحصنت دماءكم واموالكم من غير انتظار الاطلاع على مواطاة قلوبكم لالسنتكم (کشاف) ۶۸۹ (کہ تمہارے اس اعلان اسلام اور وعدے کو کافی سمجھ لیا گیا اور تمہارے ایمان کو معتبر قرار دینے کے لئے تفتیش باطن کا حکم نہیں ہوا) فعليكم بان تفعلوا بالداخلين في الاسلام كما فعل بكم وان تعتبروا ظاهر القول (کبیر) هذا هو الذي اختاره اكثر المفسرين (کبیر) دوسری صورت اللہ کے فضل و کرم کی یہ بھی قرار دی جا سکتی ہے کہ اُس نے تمہارے اس ابتدائی اسلام کو اب مشہور و معلوم کرا دیا اور تمہیں استقامت اور حسن عمل کی توفیق دی۔ الاشتهار بالايمان والاستقامة في الدين (بیضاوی) حيث نور نور الايمان في قلوبكم وايمانكم على العمل به والمحبة له (کبیر) بالاستقامة والاشتهار بالايمان (مدارک) ۶۹۰ (سو اگر تم نے کوئی بھی بے احتیاطی کی تو اس کے ساتھ تمہارا کون سا عذر چل سکے گا) فَتَبَيَّنُوا۔ تحقیق و احتیاط کیلئے تکرار دعوت یا اہتمام حکم کی غرض سے۔ اعادة الامر بالتبيين تدل على المبالغة في التاكيد من ذلك الفعل (کبیر) كرر الامر بالتبيين ليؤكد عليهم (مدارک) اعاد الامر بالتبيين للتاكيد (قرطبی) ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ آیا زندیق کی توبہ قبول ہوگی؟ فقہاء نے اس آیت کی رو سے جواب دیا ہے کہ قبول ہوگی۔ اختلفوا في ان توبة الزنديق هل تقبل ام لا والفقهاء قبلوها واحتجوا عليه بوجوه الاول هذه الاية (کبیر) امام ابو حنیفہ نے اس آیت سے استدلال کر کے فرمایا ہے کہ بچوں کا اسلام بھی قبول ہوگا اسلئے کہ آیت عام ہے بالغ اور نابالغ کی اس میں کوئی قید نہیں۔ قال ابو حنيفة ودلت هذه الاية على صحة اسلام الصبي لان قوله لا تقولوا لمن القى اليكم السلم لست مؤمنا عام في حق الصبي وفي حق البالغ (کبیر) بکر ساقین

خود بھی جو اپنے جان و مال کو مسلمانوں سے بچائے ہوئے تھے، وہ کلمۂ اسلام کے تلفظ ہی کی بنا پر تو تھا اور آخرایکہ عنداللہ ان کا کفر باطل ظاہر تھا۔ اور رسول اللہ پر بھی اکثر صورتوں میں روشن ہو گیا تھا۔ وقد کان المنافقون یعصمون دماءھم واموالھم باظہار ھذہ الکلمۃ مع علم اللہ تعالیٰ باعتقادھم الکفر وعلم النبی صلعم بنفاق کثیر منھم (جصاص) ٦٩١ (اللہ کے ہاں درجہ اور مرتبہ میں) اُولِی الضَّرَرِ کے لفظی معنی تو ہوتے۔ بے دکھ والے لیکن یہاں ضرر مرض سے کہیں زیادہ وسیع معنی میں ہے اور ہر قسم کے عذر و مانع کو شامل ہے اور اہلِ الضرر اہل العذر کے مرادف ہے۔ قال العلماء اہل الضرر ھم اھل الاعذار (قرطبی) الضرر النقصان سواء کان بالعمی والعرج اوالمرض اوکان بسبب عدم الاھبۃ (کبیر) اَلْقٰعِدُوْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ۔ کی تقدیر کلام یوں ہے۔ القاعدون الذین ھم غیر اولی الضرر (قرطبی) مطلب صاف ہے۔ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے والے اور بلاعذر گھر میں بیٹھ رہنے والے اللہ کے ہاں فضیلت و مقبولیت میں برابر نہیں ہو سکتے۔ یہیں سے یہ مطلب بھی صاف ہو گیا کہ جہاد فرض عین نہیں، فرض کفایہ ہے۔ اگر فرض عین ہوتا یعنی ہر ہر فرد پر فرض ہوتا تو ان بیٹھ رہنے والوں اور نہ شریک ہونے والوں پر یقیناً عتاب و وعید کے الفاظ وارد ہوتے رہتے۔ فیہ دلالۃ علی ان الجہاد لیس بفرض عین بل ھو فرض کفایۃ (ابن کثیر) قال الفقہاء فیہ دلیل علی ان فرض الجہاد علی الکفایۃ ولیس علی کل احد بعینہ (کبیر) وھذا دلیل علی ان فرض الجہاد علی الکفایۃ ولیس علی کل احد بعینہ (جصاص) فرقۂ شیعہ نے آیت سے استدلال یہ کیا ہے کہ حضرت علیؓ کی افضلیت حضرت ابوبکرؓ پر ظاہر ہو رہی ہے اسلئے کہ حضرت علیؓ نے جہاد و قتال حضرت ابوبکرؓ سے کہیں زیادہ کیا ہے اور اس کو آیت میں معیارِ فضیلت

عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ

فضیلت دے رکھی ہے اور بھلائی کا وعدہ تو اللہ نے سب (ہی) سے کر رکھا ہے ٦٩٢ اور

اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝٩٥ دَرَجٰتٍ

اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اجرِ عظیم کے لحاظ سے برتری دے رکھی ہے ٦٩٣ یعنی اللہ کی

مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٩٦ اِنَّ

طرف سے بہت درجے اور بخشش اور رحمت۔ اور اللہ ہے ہی بڑا بخشش والا، بڑا رحمت والا ٦٩٤ بیشک

الَّذِيْنَ تَوَفّٰىھُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ

ان لوگوں کی جان جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے (جب) فرشتے قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ تم کس

كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ

کام میں تھے ٦٩٥ وہ بولیں گے ہم اس ملک میں بے بس تھے ٦٩٦ فرشتے کہیں گے کہ اللہ کی

تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِيْھَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ

سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہی لوگ ہیں جن کا

مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝٩٧ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ

ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے ٦٩٧ بجز ان لوگوں کے جو

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً

مردوں اور عورتوں بچوں میں سے کمزور ہوں (کہ) نہ کوئی تدبیر ہی کر

وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝٩٨ فَاُولٰۗىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ

سکتے ہوں اور نہ کوئی راہ پاتے ہوں ٦٩٨ تو یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے گا

ع ۱۳ / ۱۵ / ۱۰

منزل

قرار دیا گیا ہے۔ استدلال باطل ہے۔ اگر مطلق قتلِ کفار ہی معیارِ فضیلت ہوتا تو بہ قول امام رازیؒ حضرت علیؓ خود رسول اللہ صلعم سے بھی افضل و اشرف ہوتے۔ حالانکہ اس کے قائل شیعہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ افضلیت کُلی کے اجزاء اور بھی متعدد ہیں مثلاً تبلیغِ دین میں مصروفیت، اقامت احکام و استحکام ملت میں مشغولیت وغیرہا۔ اور ان سارے امور میں حضرت صدیقؓ ٹھیک اپنے آقا و سردار کے نقش قدم پر چلنے والے تھے چنانچہ حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے جلیل القدر صحابی بڑی تعداد میں آپ ہی کی سعی و تبلیغ سے ایمان لائے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ کے مجاہدانہ جوہر مدینہ میں آکر چمکے جب اسلام کو یک گونہ غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ برخلاف اسکے ابوبکرؓ صدیق نے دین کی گرانبہا خدمتیں اُس وقت سے انجام دینا شروع کر دی تھیں جب ملت غایت ضعف و پستی میں تھی اور اُمت ہر طرف سے زغۂ اعداء میں محصور (کبیر) ٦٩٢ (مجاہدین کو انکے جہاد کی بنا پر۔ اور قاعدین سے انکے دوسرے اعمالِ حسنہ کی بنا پر) كُلًّا۔ یعنی مجاہدین اور قاعدین دونوں سے) ای کل فریق من القاعدین والمجاہدین (قرطبی) اَلْحُسْنٰى۔ یعنی جنت اور آخرت کی نعمتیں۔ المثوبۃ الحسنی وھی الجنۃ (بیضاوی) الجنۃ والجزاء الجزیل (ابن کثیر) الْمُجٰهِدِيْنَ وَالْقٰعِدِيْنَ۔ دونوں لفظوں میں جہاد اور قعود کے عموم مفہوم کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ بیان یقیناً میدانِ جہاد میں جانے والوں اور میدانِ جنگ سے رہ جانے والوں کا ہو لیکن لفظ جہاد کو قتال کے معنی میں مخصوص و محدود کر دینا صحیح نہیں بلکہ نصرتِ دین کی ہر سعی و فکر اسکے اندر آجاتی ہو (جسکی ایک فرد یقیناً قتال بھی ہے) علیٰ ہٰذا قعود یا خانہ نشینی کے تحت میں ہر امر شریعت میں سُستی آجاتی ہے۔ اور اسی کی ایک اہم فرد قتال سے جی چرانا بھی ہے گویا فضیلت دین کے ہر کام کرنے والے کو نہ کرنے والے پر حاصل ہو۔ اور اس سے یہ شبہ مٹ گیا کہ لشکرِ قتال کا ایک ایک سپاہی ہر غیر مقاتل سے افضل ہے خواہ وہ غیر مقاتل کسی پایہ و مرتبہ کا محدث مفسر فقیہ متکلم وصوفی وغیرہ خادمِ دین ہو۔ ٦٩٣ اہلِ لطائف نے یہاں یہ نکتہ لکھا ہے کہ المجاھدون باموالھم وانفسھم (جان و مال سے جہاد کرنے والوں) کا ذکر تو اوپر آچکا ہے۔ اب یہاں ذکر مطلق مجاہدین کا بغیر کسی قید کے ہے۔ اس سے مُراد وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی کا رُخ تمامتر غیر اللہ سے اللہ کی طرف پھیرلیں اور یہ مجاہدات صوفیہ کا اعلیٰ مقام ہے۔ وجب ان یکون المراد منہ من کان مجاھدا علی الاطلاق فی کل الامور وھو اشرف انواع المجاھدۃ وحاصل ھذا الجہاد صرف القلب من الالتفات الی غیر اللہ الی الاستغراق فی طاعۃ اللہ (کبیر) ٦٩٤ چنانچہ شانِ غفوریت کے تقاضہ سے وہ ان کا ہر عذر قبول کر لیگا اور شانِ رحیمیت کے تقاضہ سے انہیں اجر مزید عنایت کریگا۔ ٦٩٥ یعنی دارالکفر دارالحرب میں رہ کر دین کے کن کن کاموں میں لگے ہوئے تھے کہ ہجرت کو نہ نکلے؟ یہ تعریض ہے انکے ہجرت نہ کرنے پر اور دارالحرب میں رہنے پر قانع و راضی ہو جانے پر۔ التوبیخ بانھم لم یکونوا فی شیء من الدین حیث قدروا علی المہاجرۃ ولم یھاجروا (کبیر) یہ وہ لوگ تھے جو مکہ میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ اقرار اسلام کر چکے تھے لیکن جب ہجرت فرض ہوئی تو یہ مسلمانوں کے ساتھ نہ آئے مکہ ہی میں رہ گئے یہاں تک کہ پھر مشرکین کا ساتھ دینے لگے۔ المراد بالجماعۃ من اہل مکۃ کانوا قد اسلموا واظہروا للنبی صلعم الایمان بہ فلما ھاجر النبی صلعم اقاموا مع قومھم وفتن منھم جماعۃ فافتتنوا (قرطبی) نزلت فی اقوام من اہل مکۃ کانوا قد اسلموا وامنوا باللہ وبرسولہ وتخلفوا عن الھجرۃ مع رسول اللہ صلعم حین ھاجر وعرض بعضھم علی الفتنۃ فافتتن (ابن جریر) نزلت فی قوم من المنافقین کانوا یظہرون الایمان للمومنین خوفا اذا رجعوا الی قومھم اظہروا لھم الکفر ولا یھاجرون الی المدینۃ (جصاص) یہ عتاب خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہجرت اُس وقت فرض عین تھی۔ ھذا یدل علی فرض الھجرۃ فی ذلک الوقت (جصاص) فتح مکہ کے بعد ہجرت واجب نہ رہی۔ حدیث نبوی میں ارشاد ہوا ہے۔ لاھجرۃ بعد الفتح۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ہجرت کا وجوب اُس وقت اسلئے تھا کہ منکرین کی ایذا اور مزاحمت سے محفوظ رہ کر مسلمان حکومتِ الٰہی کے اندر رہیں اور قانونِ الٰہی کا نفاذ اپنے اوپر کر سکیں۔ جب لشکرِ اسلام کو کافی قوت حاصل ہو گئی اور منکرین کی مزاحمت کا زور ٹوٹ گیا تو ہجرت بھی واجب نہ رہی لیکن پھر کہیں اور جب کبھی وہی وجوہ ہجرت پائے جانے لگیں گے ہجرت واجب ہو جائیگی۔ اَلْمَلٰۗىِٕكَةُ۔ صیغہ جمع ہے مُراد ہیں ملک الموت اور انکے انصار۔ المراد ملک الموت واعوانہ (بحر) لیکن جمہور کا قول یہ ہے کہ تنہا ملک الموت مراد ہے اور صیغہ جمع انکے لئے انکی عظمت کے اظہار کیلئے لایا گیا ہے۔ الملٰئکۃ ھنا قیل ملک الموت ھو من باب اطلاق الجمع علی الواحد تفخیما لہ وتعظیما لشانہ ھذا قول الجمھور (بحر) اور واحد پر لفظِ جمع کا اطلاق محاورۂ عرب میں عام ہی ہے۔ والعرب قد تخاطب الواحد بلفظ الجمع (معالم) مفسر تھانویؒ نے فرمایا کہ اب تک ذکر جہاد کا تھا جس کا خلاصہ ہے شر کفار کا دفع عام۔ اب ذکر ہجرت کا شروع ہو رہا ہے جس کا ماحصل ہے شر کفار کا دفع خاص پہلا حکم اجتماعی تھا اور یہ دوسرا انفرادی ہے دونوں میں غرض مشترک اقامتِ دین ہے۔ ٦٩٦ یعنی ہم اپنے ملک میں محض مغلوب اور بے بس تھے احکامِ دین پر عمل کرنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ اسلئے ترکِ فرائض میں معذور رہے۔ ٦٩٧ فقہاء نے لکھا ہے کہ جب ایک ملک میں رہ کر فرائض دین پوری طرح نہ ادا ہو سکتے ہوں اور یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا ملک ہے جہاں فرائض دین ادا ہو سکتے ہیں تو پہلے سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔ والآیۃ تدل علی ان من لم یتمکن من اقامۃ دینہ فی بلدہ کما یجب وعلم انہ یتمکن من اقامتہ فی غیرہ حقت علیہ المہاجرۃ (مدارک) ھذا یدل علی الخروج من ارض الشرک الی ای ارض کانت من ارض الاسلام (جصاص) ٦٩٨ یعنی ایسے لوگ جو فی الواقع اپنے ضعف جسمانی کی بنا پر سفر ہجرت پر قادر ہوں۔

اور کسی دار الاسلام کا پتہ نشان انہیں مل رہا ہو۔ ای لا یجدون اسباب الھجرۃ ومبادیھا ولا یعرفون طریق للموضع المھاجر الیہ (مع) حِیْلَۃً عربی میں تدبیر کے لئے عام ہے۔ اردو کے 'حیلہ' کے مُرادف نہیں۔
۴۹۹ عفو کا تعلق ماضی سے ہے اور غفر کا مستقبل سے یعنی ان کی پچھلی کوتاہیوں کو معاف کر دینے والا ہے اور آئندہ ان کے حق میں مغفرت کرنے والا ہے۔ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ یعنی ان سے یہ فریضہ ہجرت سرے سے ساقط ہی کر دیا جائے۔ عَسَی اللّٰہُ۔ عَسٰی سے متعلق اوپر گزر چکا ہے کہ جب اس کے فعل کا تعلق اللہ سے ہوتا ہے تو مُراد محض توقع یا اُمید نہیں رہ جاتی ہے بلکہ تیقن پیدا ہو جاتا ہے۔ وعسٰی ان کان للاطماع فھو من اللّٰہ واجب (مدارک) مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ عدم ہجرت کا گناہ فی الاصل اس قدر سخت ہے کہ غفوراً لا کر ادھر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ باوجود عذر موجود ہونے اور اس لئے گناہ نہ ہونے کے مشابہ اس کے ہے کہ گناہ ہوا اگرچہ معاف بھی کر دیا گیا۔ ۵۰۰ اقامتِ دین اور اظہار کلمۂ حق کے لئے) یعنی کوئی ہجرت کر کے دیکھے تو۔ اللہ کی سرزمین تنگ نہیں۔ اس زمین پر اسے متعدد جگہیں مل جائیں گی جہاں وہ آزادی سے اپنے دین کا اظہار کر سکے گا بعض اہل لطائف نے کہا کہ مراغم اور سعۃ دو الگ الگ لفظ لانے میں اشارہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اظہار دین کی جگہیں مل جائینگی اور آخرت میں فراخ اور وسیع بہشتیں ملیں گی۔ ۵۰۱ (قبل اس کے کہ وہ اپنی منزل مقصود یا ہجرت گاہ تک پہنچ سکے۔ اور اسلئے گویا بظاہر ناکام ہے) فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ ہر ایسی مجبوری جو انسان کو عاجز و بے بس کر دے موت ہی کے حکم میں داخل ہے۔ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ یعنی ایسے مقام کی طرف چلے جہاں اللہ اور اس کے رسُول کے دین کا اظہار کر سکے۔ الی حیث امر اللّٰہ ورسولہ (مدارک) محققین نے لکھا ہے کہ ہر ایسا سفر جو رضاء الٰہی کے لئے ہو مثلاً سفر حج، یا طلب علم دین کے لئے سفر، اجر کے لحاظ سے سفر ہجرت کے حکم میں داخل ہے۔ قالوا کل ھجرۃ لطلب العلم او حج او جھاد او قرار الی بلد یزداد فیہ طاعۃ او قناعۃ او زھدا او ابتغاء رزق طیب فھی ھجرۃ الی اللّٰہ ورسولہ (مدارک) ۵۰۲ (تو اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ اس ناکامی پر بھی پورا وہی اجر دیدے جو کامیابی پر موعود تھا) ھذا یدل علی ان من خرج متوجھا لفعل شیء من القرب ان اللّٰہ یجازیہ بقدر نیتہ وسعیہ وان اقتطع دونہ (جصاص) ۵۰۳ یہ آخر کا فقرہ جیسا کہ شارع علیہ السلام کا عمل اس پر گواہ ہے اور سارے اہل علم بجز خوارج کے اس پر متفق ہیں، بطور شرط کے نہیں کہ صرف اسی حالت میں نماز قصر کی جائے بلکہ اس فقرہ میں نزول آیت کے وقت کی صرف حالت واقعی کا بیان ہے ورنہ قصر صلوٰۃ کا حکم ہر سفر کے لئے عام ہے۔ والخوف شرط جواز القصر عند الخوارج بظاھر النص وعند الجمھور لیس بشرط (مدارک) والذی علیہ الائمۃ ان القصر المشروع فی الامن ایضا وقد تظاھرت الاخبار علیٰ ذلک (روح) اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ۔ سفر شرعی کی مسافت تین منزل کی قرار پائی ہے اور منزل کا اندازہ فقہاء نے ۲۰ میل کا کیا ہے لیکن یہ سب اندازے اور تخمینے ہی ہیں۔ رسُول اللہ صلعم سے اس سے بہت کم فاصلہ پر بھی قصر نماز ثابت ہے۔ جمہور فقہاء کا قول ہے کہ سفر جس جائز غرض، مقصد سے بھی ہو، شرعی سفر کے حکم میں داخل ہے۔ الجمھور علی جواز القصر فی السفر المباح کالتجارۃ ونحوھا (قرطبی) لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ یعنی بادی النظر

عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ
اور اللہ تو ہے ہی بڑا معاف کرنے والا، بڑا بخشنے والا ۴۹۹ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں
سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَ
ہجرت کریگا وہ زمین پر جانے کی بہت جگہ اور گنجائش پائے گا ۵۰۰ اور
مَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ
جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسُول کی خاطر ہجرت کرتا ہوا نکلے اور اسے
يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ
پھر موت آ پکڑے ۵۰۱ تو اس کا اجر یقیناً اللہ کے ذمہ ثابت ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٠﴾ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ
بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان ۵۰۲ اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر اس باب میں کوئی
عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ڰ اِنْ خِفْتُمْ
مضائقہ نہیں کہ نماز میں کمی کر دیا کرو اگر تمہیں اندیشہ ہو
اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا
کہ کافر لوگ تمہیں ستائیں گے ۵۰۳ بیشک کافر تو تمہارے کھلے ہوئے دشمن
مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ
ہی ہیں اور جب آپ ان کے درمیان ہوں اور ان کے لئے نماز قائم کریں
فَلْتَقُمْ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ
تو چاہئے کہ ان میں کا ایک گروہ آپکے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لئے رہیں ۵۰۴

ع ۱۱

میں رکعات نماز میں کمی کر دینا ایک گناہ کی چیز معلوم ہوتی ہے اور وسوسہ تمہیں بھی گناہ کا ضرور ہو رہا ہے لیکن اطمینان رکھو کہ اس میں مضائقہ نہیں۔ اللہ کی طرف سے یہ جائز کیا جا رہا ہے۔ الصَّلٰوۃ۔ صلوٰۃ (نماز) سے مُراد صلوٰۃ مکتوبہ یا نماز فرض ہے۔ حنفیہ کے ہاں سفر میں نماز قصر مستحب ہی نہیں واجب ہے۔ قلنا القصر عزیمۃ غیر رخصۃ ولا یجوز الاکمال (مدارک) روی عن جماعۃ انہ فرض وھو قول عمر بن عبد العزیز والکوفیین والقاضی اسمٰعیل وحماد بن ابی سلیمان (قرطبی) اور یہ قصر چار رکعتوں والی تینوں نمازوں میں ہوتا ہے ظہر، عصر، عشاء میں فرض کی دو دو رکعتیں رہ جاتی ہیں مسائل قصر کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔ فِي الْاَرْضِ سے مُراد یہ نہیں کہ سفر صرف خشکی ہی میں ہو۔ ارض کا لفظ بر و بحر کے لئے عام و مشترک ہے اور مقصد یہ ہے کہ کوئی سا بھی سفر ہو۔ المراد من الارض ما یشمل البر والبحر والمقصود التعمیم ای اذا سافرتم فی ای مکان یسافر فیہ من بر وبحر (روح) ۵۰۴ یعنی حالت نماز میں بھی مسلح رہیں۔ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ۔ صیغہ واحد حاضر سے محض رسول اللہ ہی مُراد نہیں۔ آپ ہوں یا آپ کا کوئی قائم مقام۔ قال الائمۃ نواب عن رسول اللّٰہ صلعم فی کل عصر (مدارک) ھذہ الاٰیۃ خطاب للنبی صلعم وھو یتناول الامراء الی یوم القیٰمۃ ھذا قول کافۃ العلماء (قرطبی) فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ یعنی جب وقت نماز آ جائے پر آپ میدان جنگ میں امامت نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں اور اندیشہ ہو کہ دشمن موقع پا کر حملہ کر دیگا۔ فَلْتَقُمْ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ۔ یعنی ایسے موقع پر چاہئے کہ سپاہ کے دو گروہ ہو جائیں کچھ لوگ تو نماز شروع کر دیں اور کچھ لوگ نگہبانی کے لئے دشمن کے مقابل کھڑے ہو جائیں۔ یہ سب بیان صلوٰۃ الخوف کا ہو رہا ہے پوری تفصیلات کے لئے فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ
پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو اب چاہیے کہ وہ تم لوگوں کے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ
طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ
جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آجائیں اور وہ آپکے ساتھ نماز پڑھ لیں اور
وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ
یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار ساتھ لئے رہیں کافروں کی تو خواہش ہی ہے کہ تم
كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ
اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے ذرا غافل ہو جاؤ تو یہ لوگ تمہارے اوپر
فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ
یک بارگی ہی ٹوٹ پڑیں اور تمہارے لئے
عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم
اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش سے تکلیف ہو رہی ہو یا تم بیمار
مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ
ہو تو اپنے ہتھیار اتار رکھو اور اپنے بچاؤ کا سامان لئے رہو
إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٠٢﴾ فَإِذَا
بیشک اللہ نے کافروں کے لئے ایک رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے پھر جب تم
قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا
(اس) نماز کو ادا کر چکو تو اللہ کی یاد میں لگ جانا کھڑے اور بیٹھے

٥٠٥ فقہاء نے یہاں سے یہ استنباط کیا ہے کہ عین عبادت منصوص کی حالت میں بھی اسباب و انتظام پر نظر رکھنا اولیٰ ہے۔ فَإِذَا سَجَدُوا یعنی پہلا گروہ ایک رکعت تمام کرلے۔ فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ۔ یعنی پہلے گروہ والے تمہارے پاس سے ہٹ کر دشمن کے مقابلہ میں آجائیں۔ وَلْتَأْتِ ...... لَمْ يُصَلُّوا یعنی وہ لوگ جنھوں نے ابھی نماز شروع بھی نہیں کی ہے اور ابھی تک وہ دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے وہ اب پہلے گروہ کی جگہ پر آجائیں۔ فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ۔ یعنی نماز کی جو رکعت ابھی امام کے لئے باقی ہے، اُس میں آکر اُس کے شریک ہو جائیں۔ ٥٠٦ کیا ٹھکانا ہے ہماری شریعت کی پیدا کی ہوئی اس چستی مستعدی ہر چستی اور ہمہ وقتی بیداری کا، دشمن سامنے ہے، قتل و خون کا بازار گرم ہے۔ جان کا سودا ہو رہا ہے۔ عین اُس وقت نماز بھی ہوتے جائے اور ہتھیار بھی برابر ساتھ رہیں۔ سستی کاہلی، غفلت، آرام طلبی کہیں شریعتِ اسلامی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں؟ ٥٠٧ نماز خوف کی جو صورتیں یہاں ارشاد ہوئی ہیں، وہ سب اس وقت کے لئے ہیں جب سب سپاہی ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں اور حضور صلعم کی موجودگی میں سب کا آپ ہی کے پیچھے پڑھنے پر حریص ہونا بالکل قدرتی تھا لیکن جب امام ہی دو یا زائد ہوں تو پھر ان انتظامات کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ خوف کی بھی دو حالتیں ہیں اور دونوں کے حکم الگ الگ ہیں:- (١) ایک یہ کہ عین معرکۂ قتال گرم ہو اور جماعت کا اہتمام ہی سرے سے نہ بن پڑے۔ ایسی حالت میں نماز جماعت اُڑا دی جائے گی اور اس کا ذکر سورۂ بقرہ آیت ٢٣٩ میں موجود ہے۔ شدتِ خوف کی حالت میں نماز الگ الگ پڑھی جائے گی۔ سوار یا پیادہ ہر حال میں جائز ہے۔ رکوع و سجدہ کے لئے اشارہ کافی ہے۔ استقبال قبلہ ہی ضروری نہ رہے گا۔ (٢) دوسرے یہ کہ ہو تو میدانِ جنگ میں لیکن قتال ابھی شروع نہ ہوا ہو۔ اور نماز جماعت کا موقع ہو، جیسا کہ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ سے اشارہ ہو رہا ہے۔ اس آیت میں جن انتظامات کی ہدایت ہوئی ہے وہ اسی صورت حال سے متعلق ہے۔

۳۰۸ غرض ہر صورت حال کے مناسب (علی ای حال کنتم (قرطبی) علیٰ جُنُوۡبِکُمۡ کے لفظی معنی ہیں، اپنے پہلوؤں پر، یا اپنی کروٹوں پر، اردو محاورہ میں مراد لیٹنے سے ہے۔ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ۔ مطلب یہ ہوا کہ تخفیف نماز میں تو ہو گئی۔ باقی ذکر الٰہی میں کوئی تخفیف نہیں۔ اور اسی لئے ہو یہاں تک کہ عین قتال کے وقت بھی ذکر الٰہی دل سے تو جاری ہی رہ سکتا ہے محققین نے کہا ہے کہ احکام شریعت کا اتباع بجائے خود ذکر الٰہی ہے۔ فَاِذَا قَضَیۡتُمُ الصَّلٰوۃَ۔ الصلوٰۃ سے یہاں مراد وہی نماز خوف ہے جس کی ایک ہیئت مخصوص ہو عام نمازی ہیئت سے ہٹی ہوئی۔ اس نماز کے لئے لفظ قضیتم ارشاد فرمانا اس کی دلیل ہے کہ یہ بظاہر نامکمل، ناتمام نماز بھی عنداللہ ادا ہو جاتی ہے۔ ۳۰۹ (اصل قاعدہ کے مطابق اور پورے شرائط کے ساتھ) اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ۔ صلوٰۃ اصلی کے لئے یہاں لفظ اقامت استعمال کرنا اس کی دلیل ہے کہ اقامت صلوٰۃ سے مراد نماز کا اس کے جملہ شرائط ہی کے ساتھ ادا کرنا ہوتا ہے۔ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ یعنی سفر اور خوف کی حالتیں ختم ہو جائیں۔ ۳۱۰ یہاں نماز کی صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ علاوہ فرض ہونے (کتابًا) کے، پابندی وقت کے لحاظ سے فرض ہے۔ مَوۡقُوۡتًا۔ اس لئے سوا حالت معذوری کے، اُسے وقت سے ہٹا دینا جائز نہ ہوگا۔ موقوتًا ای محدود الاوقات لایجوز اخراجہا من اوقاتہا فی شیٔ من الاحوال (مدارک) مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ فرض ہونے کی وجہ سے اُس کا ادا کرنا ضرور ہے اور موقت ہونے کی وجہ سے وقت پر ہی ادا

وَّ عَلٰی جُنُوۡبِکُمۡ ۚ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ۚ

اور لیٹے ۳۰۸ اور پھر جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز کی اقامت کرو ۳۰۹

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾

بیشک نماز تو ایمان والوں پر پابندیٔ وقت کے ساتھ فرض ہے ۳۱۰

وَ لَا تَہِنُوۡا فِی ابۡتِغَآءِ الۡقَوۡمِ ؕ اِنۡ تَکُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ

اور مخالف قوم کے تعاقب میں ہمت نہ ہارو ۳۱۱ اگر تمہیں دکھ پہنچا تو وہ بھی تو

فَاِنَّہُمۡ یَاۡلَمُوۡنَ کَمَا تَاۡلَمُوۡنَ ۚ وَ تَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰہِ مَا

دکھ اٹھائے ہوئے ہیں، جیسے تم دکھ اٹھائے ہوئے ہو، اور تم اللہ سے وہ اُمید لگائے ہوئے

۱۵ ع ۱۲

لَا یَرۡجُوۡنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۰۴﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ

ہو جو وہ نہیں رکھتے ۳۱۲ اور اللہ تو ہے ہی بڑا علم والا، بڑا حکمت والا ۳۱۳ یقیناً ہم نے

اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىکَ

آپ پر کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ اس کے مطابق کریں جو اللہ نے

اللّٰہُ ؕ وَ لَا تَکُنۡ لِّلۡخَآئِنِیۡنَ خَصِیۡمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّ اسۡتَغۡفِرِ

آپ کو سمجھا دیا ہے ۳۱۴ اور ان خائنوں کے طرفدار نہ ہو جایئے ۳۱۵ اور آپ اس سے مغفرت

اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۰۶﴾ وَ لَا تُجَادِلۡ

چاہیے، بیشک اللہ بڑا ہی مغفرت والا ہے بڑا ہی رحیم ہے ۳۱۶ اور ان لوگوں کی طرف سے

عَنِ الَّذِیۡنَ یَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ

وکالت نہ کیجیے جو اپنے حق میں خیانت کرتے رہتے ہیں ۳۱۷ اللہ کسی ایسے شخص کو نہیں چاہتا

کرنا ضرور۔ اسلئے مخصوص حالات میں اس کی ہیئت کچھ کچھ تبدیل کردی گئی تھی۔ جب وہ عارض دور ہو گیا تو اس کی اصل ہیئت واجب الحفظ ہو گئی۔ ۳۱۱ (جب تعاقب کی ضرورت آپڑے) روایتوں میں آتا ہے کہ آیت غزوۂ حمراء الاسد کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی۔ اس کا ذکر غزوۂ اُحد کے سلسلہ میں سورۂ آل عمران رکوع ۱۸ میں آچکا ہے۔ آیت الذین استجابوا للہ والرسول کے ماتحت۔ ۳۱۲ یعنی اجر آخرت کی۔ جس کے مقابل کوئی چیز منکروں کے پاس نہیں۔ تو قوت قلب کے لحاظ سے تم ان سے کہیں بڑھے چڑھے ہو۔ دنیوی فتحمندیوں اور کامیابیوں کی پیش گوئیاں بھی اس کے تحت میں آسکتی ہیں۔ ۳۱۳ چنانچہ علیم کل ہونے کی بنا پر اس پر اعداء دین کا ضعف جسم ضعف قلب خوب روشن ہے اور حکیم مطلق ہونے کی بنا پر اس نے تمہاری قوت تحمل سے زیادہ تمہیں کوئی حکم نہیں دیا۔ ۳۱۴ (اسی قرآن کے ذریعہ سے) اَرٰىکَ یہاں بتا دیا، سمجھا دیا، سکھا دیا کے مفہوم میں ہے۔ بما اراک اللہ ای بما علمک (راغب) بما علمک اللہ فی القرآن (ابن قتیبہ) بِالۡحَقِّ۔ یعنی قانون عدل کے مطابق۔ آیت اس باب میں صریح ہے کہ فیصلہ جو کچھ بھی کئے جائیں قرآن ہی کے مطابق و ماتحت کئے جائیں نہ کہ اپنے ہوائے نفس کے موافق یا کسی انسانی دماغ کے گڑھے ہوئے آئین و دستور کے ماتحت آیت کا پس منظر یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنو اُبیرق کے ایک گھرانے میں تین بھائی بشیر، بشر اور مبشر مسلمان تھے اور ان کا ایک بھائی بُشیر منافق تھا۔ ایک مرتبہ چور حضرت رفاعہ بن زید انصاریؓ کے گھر میں نقب لگا کر ان کے ہتھیار اور میدے کی ایک بوری لے گئے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ بُشیر منافق اور اس کے بدمعاش ساتھیوں نے چوری کی ہے۔ حضرت رفاعہؓ نے اپنے برادرزادہ جناب قتادہ بن نعمان سے کہا کہ تم آستان نبوت میں جا کر واقعہ بیان کرو تو عجب نہیں کہ ہمارا مال مل جائے۔ انہوں نے جا کر سارا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کیا۔ جب بُشیر کے اقرباء نے سُنا کہ نبی علیہ السلام کے پاس استغاثہ ہوا تو وہ آکر کہنے لگے یا رسول اللہ! قتادہ بن نعمان اور ان کے چچا رفاعہ ہمارے آدمی پر جو مسلمان ہو چکا ہے ناحق چوری کی تہمت لگاتے ہیں۔ اس کے بعد قتادہ حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان سے فرمایا تم ایسے شخص پر بغیر کسی ثبوت کے چوری کی تہمت لگاتے ہو جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکا ہے؟ یہ سُن کر قتادہؓ کے دل میں آرزو ہوئی کہ کاش میں نے آپ سے چوری کی شکایت نہ کی ہوتی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ خالق کردگار نے اپنے رسولِ پاک پر یہ آیت نازل فرمائی (ترمذی ابواب تفسیر القرآن) ۳۱۵ خائنوں سے بنو اُبیرق مراد ہیں جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو بنو اُبیرق نے بُشیر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کر کے چوری کا مال برآمد کر لیا اور تمام اسلحہ نبی صلعم کے پاس بھجوا دیئے بُشیر نفاق کا لباس فریب اتار کر علانیہ مشرکوں سے جا ملا۔ (ترمذی) ۳۱۶ یہ استغفار کا حکم رسولؐ کو کس کیلئے مل رہا ہے؟ اپنے حق میں یا اُنکے حق میں۔ بظاہر یہ حکم استغفار ان لوگوں کے حق میں معلوم ہوتا ہے، جو برادری کے خیال سے اس مجرم منافق کے حق میں ساعی اور سفارشی تھے اور قرآن مجید میں اس اسلوب بیان کی مثالیں اور جگہوں پر بھی ملتی ہیں۔ مثلاً یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ یا وَ اِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ وغیرہا۔ چنانچہ اہل تفسیر کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔ قیل الخطاب للنبی صلعم والمراد بنو اُبیرق (قرطبی) والمعنی استغفر اللہ للمذنبین من امتک والمتخاصمین بالباطل (قرطبی) یحتمل ان یکون المراد واستغفروا اللہ لاولئک الذین یذبون عن طعمۃ ویریدون ان یظہروا براءتہ عن السرقۃ (کبیر) لیکن یہ معنی لئے جائیں کہ اے پیمبرؐ آپ اپنے حق میں مغفرت طلب کیجیے تو اس سے اشارہ آپکے صرف اس میلان طبع کی جانب ہے کہ آپ نے بنو اُبیرق کی شکایت پر حضرت قتادہ بن نعمانؓ سے اظہار ناراضی فرمایا۔ یہ میلان طبع ظاہر ہے کہ معصیت کبیرہ کیا معنی صغیرہ کا بھی درجہ نہیں رکھتا لیکن پیمبر تقویٰ اور طہارت قلب کے جس بلند ترین مقام پر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس قدر ارادہ اور میلان طبع بھی قابل استغفار قرار پایا۔ ۳۱۷ (یہ ہدایت آیندہ کے لئے ہے۔ جیسا کہ اکثر نے پیش کیا ہے) ۳۱۸ خوّان اور اثیم کے لانے سے یہ مقصود نہیں کہ جو کم درجہ کے خائن اور گنہگار ہیں وہ اللہ کی نظر میں غیر معیوب نہیں۔ بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ منافق کی برادری کے جن لوگوں نے اُسے مجرم جان کر بھی خواہ مخواہ حق پوشی اور باطل کوشی کی، وہ خائن اور گنہگار بڑے درجہ کے تھے الَّذِیۡنَ یَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ۔ خیانت کا ضرر و وبال بالآخر خود خائن ہی کو بھگتنا پڑتا ہے اس لئے خیانت کو خیانتِ نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جعلت خیانۃ الغیر خیانۃ لانفسہم لان وبالہا وضررہا عائد علیہم (روح)

۱۹ (اس کے احاطۂ علم سے کون سی کارروائی مخفی کی بھی باہر رہ سکتی ہے!) اس حقیقت کا استحضار ہر جرم، ہر معصیت سے باز رکھنے کو کافی ہے۔ یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ۔ یعنی خلق کے سامنے ذلت و رسوائی سے شرماتے ہیں۔ لَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰہِ۔ یعنی اللہ کے حضور میں بطور مجرم پیش ہونے سے نہیں شرماتے ہیں۔ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ ...... الْقَوْلِ۔ اشارہ ہے اس طرف کہ اس خاص معاملہ میں رات کو باہم سازو ارانہ مشورہ ہوا تھا کہ صبح کو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں گفتگو کس طریقہ پر کی جائے گی۔ وَھُوَ مَعَھُمْ۔ معتزلہ، قدریہ، جہمیہ، وغیرہ نے اس قسم کی آیتوں سے حق تعالیٰ کی معیت مکانی پر استدلال کیا ہے۔ قال الجھمیۃ والقدریۃ والمعتزلۃ ھو بکل مکان تمسکا بھذہ الاٰیۃ وما کان مثلھا (قرطبی) لیکن اہل سنت اسے شانِ تنزیہی کے منافی سمجھتے ہیں اور انہوں نے مراد صرف معیت علمی لی ہے۔ ای بالعلم والرؤیۃ والسمع ھذا قول اھل السنۃ (قرطبی) یرید بالعلم والقدرۃ والرؤیۃ (کبیر)

مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا

جو بڑا خائن اور گنہگار ہو، یہ لوگ آدمیوں سے شرماتے ہیں اور

يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى

اللہ سے نہیں شرماتے درآنحالیکہ وہ اُن کے ساتھ اُس وقت بھی رہتا ہے جب وہ

مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ

رات میں اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جو اُسے پسند نہیں، اور وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اُس کا احاطہ کئے ہوئے ہے

هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ

تم لوگوں نے دنیوی زندگی میں تو اُن کی طرف سے وکالت کر لی، لیکن قیامت کے دن اُن کی

اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

طرف سے اللہ کے سامنے کون وکالت کرے گا یا کون ان کا کام بنانے والا ہوگا

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ

اور جو کوئی بھی بُرائی کرے یا اپنی جان پر زیادتی کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے

يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا

تو وہ اللہ کو بڑا مغفرت والا بڑی رحمت والا پائے گا، اور جو کوئی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا

يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ

ارتکاب اپنی ہی جان کے خلاف کرتا ہے، اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے، اور جو کوئی

يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ

کسی قصور یا گناہ کا ارتکاب کرے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگائے تو درحقیقت اُس نے ایک

۲۰ اس حقیقت کبریٰ کو یاد دلایا ہے کہ اصل پیشی اور جوابدہی تو عدالت آخرت ہی کی ہے۔ یہاں کسی طرح اگر بات بنا بھی لی گئی تو کیا ہوتا ہے؟ مومن کے لئے اصل خوف کی چیز تو وہی آخرت کی عدالت ہے جہاں کسی قسم کی تلبیس کی گنجائش نہیں۔ هٰۤاَنْتُمْ۔ خطاب ہے مجرم کی برادری اور محلہ والوں کی طرف جنہوں نے سازش کر کے مجرم کی پشت پناہی کی تھی۔

۲۱ اُوپر کی وعیدی و انذاری آیتوں کے بعد گنہگاروں اور کمزور ایمان والوں کے لئے یہ کیسی حکیمانہ اور مناسب حال دلدہی ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا۔ متعدی بُرائی مراد ہے یعنی کسی دُوسرے کے ساتھ برائی کی جائے۔ مثلاً ظلم، دغا، سُود خواری، رشوت ستانی وغیرہا۔ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ۔ وہ برائی جو خود اپنے ہی حق میں کی جائے۔ مثلاً ترک نماز، شراب خواری وغیرہا۔ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ۔ یہ استغفار قواعد شرعی کے مطابق ہونا چاہیے۔ **۲۲** علیم کل ہونے کی حیثیت سے وہ سب کے چھوٹے بڑے گناہوں سے باخبر ہے۔ حکیم ہونے کے اعتبار سے وہ جزاو سزا اس کے مناسب حال ہی تجویز کرتا ہے۔ اِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ۔ یعنی گناہ کا ضرر و وبال خود اسی کو بھگتنا ہوگا۔ اسلئے توبہ و استغفار، تدارک، تلافی لازمی ہے۔

۵۲۳ (اور اپنے جرم کو کئی گنا بڑھادیا) توبہ نہ کرنا اپنی جگہ پر نادم ومنفعل نہ ہونا، تلافی وکفارہ اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہ کرنا یہ جرائم بجائے خود کیا کم ہیں۔ چہ جائیکہ اپنا گناہ اُلٹا کسی بے گناہ کے سر تھوپ دیا جائے۔ قرآنی اخلاقیات میں یہ جرم ضمیر واخلاق کی انتہائی پستی کا نمونہ ہے اور اس لئے لازمی طور پر اس پر گرفت بھی سخت رکھی گئی ہے۔ خَطِیْٓئَۃً۔ وہ چھوٹا گناہ ہے جس میں قصد وتعمد لازمی نہیں یا وہ گناہ ہے جو صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہو۔ الخطیئۃ قد تکون من قبل العمد وغیر العمد (ابن جریر) ای صغیرۃ او ما لا عمد فیہ من الذنوب (روح) ذنب بینہ وبین ربہ (مدارک) اِثْمًا۔ وہ بڑا گناہ ہے جس میں قصد وتعمد لازمی طور پر ہو۔ یا جو بندوں کا گناہ ہو۔ الاثم لا یکون الا من العمد (ابن جریر) او کبیرۃ او ما لا یکون من العمد (روح) ذنب فی مظالم العباد (مدارک) ۵۲۴ یعنی اپنی اس ناپاک کوشش میں کامیاب ہونا تو اُن کے لئے ممکن نہیں۔ البتہ اس سعی سے اپنے ہی کو مستحق عقوبت بنا رہے ہیں۔ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْكَ وَرَحْمَتُہٗ۔ اللہ کا فضل وکرم تو آپ پر عموماً اور ہر حال میں تھا لیکن اس خاص قضیہ میں خصوصیت کے ساتھ اس کا ظہور رہا۔ اَنْ یُّضِلُّوْكَ۔ یعنی آپ کو غلطی اور دھوکے میں مبتلا کرکے آپ سے غلط فیصلہ حاصل کرلیں۔ ان یضلوك عن الحکم (ابن کثیر) ای بان یضلوك عن القضاء بالحق (روح) ۵۲۵ (احکام دین وقضایا کے باب میں) یعنی شیطان اور اس کے چیلوں

ع ۱۶ / ۱۴

بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ
بڑا بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لے لیا ۵۲۳ اور اگر آپ پر اللہ کا فضل (خاص) اور رحمت
رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا
نہ ہوتی تو اُن میں سے ایک گروہ نے تو تہیہ ہی کرلیا تھا کہ آپ کو بھٹکا کر رہیں گے حالانکہ یہ بس
يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ
اپنے ہی آپ کو بھٹکا رہے ہیں اور آپ کو کسی چیز میں بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۵۲۵
وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ
اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور آپ کو وہ سکھا دیا ہے جو
تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ
آپ نہیں جانتے تھے ۵۲۶ اور آپ پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے ۵۲۷ سرگوشیاں بہت کی
فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ
ایسی ہیں جن میں کوئی بھلائی نہیں ہاں البتہ بھلائی یہ ہے کہ کوئی صدقہ کی ترغیب دے یا کسی
مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ
اور نیک کام کی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی ۵۲۸ اور جو کوئی
ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾
اللہ کی رضا حاصل کرنے کو ایسا کرے گا ۵۲۹ سو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم دیں گے
وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى
اور جو کوئی بعد اس کے کہ اس پر (راہ) ہدایت کھل چکی رسول کی مخالفت کرے گا

(منافقین) کو یہ قوت نہیں دی گئی ہے کہ وہ آپ کو دین کے کسی شعبہ میں کچھ بھی مغالطہ میں ڈال سکیں۔ ۵۲۶ یہ کتاب کا نزول، حکمت کا نزول، علوم خاصہ کی تعلیم یہ سب اسی فضل عظیم کے شواہد ہیں اور اللہ کا فضل جس پر عظیم ہو اس پر کس کا قابو چل سکتا ہے؟ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ اور اس کتاب ہی کے ذریعہ سے منافقین کی معاندانہ روش کا پردہ بھی چاک کیا گیا۔ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ یعنی جو علوم عالیہ آپ پر قبل نبوت ونزول قرآن منکشف نہ تھے۔ اب سب منکشف ہوگئے۔
۵۲۷ (اور ان اغراض کے لئے خفیہ گفتگو اور سرگوشی کی ضرورت پڑجائے تو اس میں البتہ کوئی حرج نہیں، بلکہ ایسے موقع پر خیر وبرکت ہوگی) نَجْوٰىهُمْ میں ضمیر ھم مطلق انسان کی جانب ہے۔ ای نجوی الناس جمیعا (ابن جریر) یعنی کلام الناس (ابن کثیر) المراد لا خیر فی ما تتناجی فیہ۔ ۵۲۹ (نہ کہ اپنے ذاتی دنیوی اغراض کے لئے) اخلاص نیت اور حصول رضاء الٰہی کی شرط ہر اہم موقع کے لئے یہاں بھی لگی ہوئی ہے۔

۴۲۹ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى | اسے صاف کر دیا کہ آیت میں بیان مُرتدوں کے خصائل رذیلہ کا ہو رہا ہے۔ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى یعنی ہم اُسے اسی طرف پر چھوڑے رکھتے ہیں اپنے قانونِ مشیتِ تکوینی کے مطابق۔ مقصود یہ ہے کہ جبر و اکراہ سے کسی کو راہِ حق کے قبول کرنے اور ماننے پر مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ وضوحِ حق کے بعد جو بدبخت اپنی کجروی پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ اسی پر اُسے قائم رہنے دیا جاتا ہے۔ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اس اتباع کا تعلق اُمورِ دین سے ہے۔ يَتَّبِعْ .... جَهَنَّمَ۔ آیت کے اس جزء سے فقہاء کو ایک بہت بڑی اصل ہاتھ آگئی ہے۔ اور اس کو انہوں نے اجماعِ اُمت کے حجتِ شرعی ہونے کا مبنیٰ قرار دیا ہے۔ اور تقریرِ استدلال یہ کہ طریقِ مومنین سے الگ ہونا جب حرام اور مستحقِ جہنم ٹھیرا تو لازمی ہوا کہ اس کا عکس یعنی اتباعِ طریقِ مومنین واجب ہو۔ اور اس کی مخالفت بھی کتاب و سنت کی مخالفت کے بعد ناجائز ٹھہرے اور یہاں قرآن مجید نے عدمِ اتباعِ طریقِ مومنین کو مخالفتِ رسول کے ساتھ جمع کر کے فرمایا ہے۔ ھو دلیل علی ان الاجماع حجة لا تجوز مخالفتھا کما لا تجوز مخالفة الکتاب والسنة لان اللہ تعالٰی جمع بین اتباع غیر سبیل المومنین و بین مشاقة الرسول فی الشرط وجعل جزاءہ الوعید الشدید فکان اتباعھم واجبا کموالاة الرسول (مدارک) وقرن اتباع غیر سبیل المومنین الی مباینة الرسول فی ما ذکر له من الوعید فدل علی صحة اجماع الامة لالحاقه الوعید بمن اتبع غیر سبیلھم (جصاص) وتقریر الاستدلال ان اتباع غیر سبیل المومنین حرام فوجب ان یکون اتباع سبیل المومنین واجبا (کبیر) وھو من احسن الاستنباطات واقواھا (ابن کثیر) **۴۳۰** (ایسا کہ اب حق کی طرف اُس کی مراجعت ممکن نہیں) اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ۔ شرک ضد ہے توحید کی۔ اور جس طرح توحید اصل اصول ہے تمام ممکن بھلائیوں اور نیکیوں کی، اسی طرح شرک اصل بنیاد ہے ساری خرابیوں اور برائیوں کی اس لئے اور کسی معصیت پر شرک کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ راہرو کا رُخ اگر منزلِ مقصود کی طرف ہو تو گرتا پڑتا، وقت ضائع کرتا کبھی نہ کبھی منزل تک پہنچ ہی جائیگا۔ لیکن اگر رُخ ہی غلط ہے تو ظاہر ہے کہ ہر قدم اُسے منزل سے دُور تر ہی کرتا رہیگا اور قیامت تک بھی اگر چلتا رہے تو منزل تک نہ پہنچ سکے گا۔ مشرک قبولِ رحمت کی ساری صلاحیتوں و استعدادوں ہی کو سوخت کر دیتا ہے اسلئے وہ آخرت کی کسی نعمت، کسی لذت، کسی راحت کے قابل ہی نہیں رہ جاتا۔ ملاحظہ ہوں اس سورت کی آیت ۴۸ کے حاشیہ ۱۵۵۔ آیت میں خوارج کے اس عقیدہ کا بھی رَدّ آگیا کہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔ فیه رد علی الخوارج حیث زعموا ان مرتکب الکبیرة کافر (قرطبی)

۴۳۱ مشرک قوموں کی دیو مالا (میتھالوجی) میں ہمیشہ دیویوں دیوتاؤں کی ایک بڑی اور اہم تعداد رہی ہے۔ ہندوؤں میں دُرگا دیوی، کالی مائی، لکشمی جی، سرسوتی دیوی کے نام ایک ایک کی زبان پر ہیں۔ عرب جاہلی میں یہ دیوی پرستی اور زیادہ زور کے ساتھ جاری تھی، چنانچہ قرآن مجید میں بھی جاہلی معبودوں کے سلسلہ میں صراحت جن ناموں کی آئی ہے وہ دیویوں ہی کے ہیں یعنی لات، منات اور عزّٰی۔ ملاحظہ حاشیہ تفسیر انگریزی۔ اِنٰثًا۔ لغت میں اس کے ایک معنٰی دیوی، کمزور، اور ضعیف العمل چیزوں کے بھی آتے ہیں۔ قیل لما یضعف عمله انثی (راغب) پھر چونکہ جمادات تمام تر انفعالیت کے مظہر ہوتے ہیں اور پتھر کے بُت یا مورتیاں انہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں جن میں نہ جان ہوتی ہے اور کوئی قوتِ فاعلی۔ اسلئے لغت نے لفظ اناث کا مجازی استعمال ان کے لئے بھی جائز رکھا ہے۔ لما کانت معبوداتھم من جملة الجمادات التی ھی منفعلة غیر فاعلة سماھا اللہ تعالٰی اناثا (راغب) من کل شیٔ اخسته (ابن جریر) چنانچہ اکابر تفسیر میں سے بھی بہت سے اسی طرف گئے ہیں۔ ای اصناما بلا روح (ابن عباس) میتا لا روح فیه (ابن جریر عن قتادة) **۴۳۲** یہ مشرکوں کی حماقت کو واضح کیا ہے کہ ان بُتوں اور دیویوں کو پکارنا عین شیطان کو پکارنا ہے۔ **۴۳۳** (اور لعنت کی باعث اُس کی یہی سرکشی اور بے حکمی ہوئی ہے) **۴۳۴** یہ بنی آدم کو وضاحت سے بتا دیا ہے کہ شیطان تو اُن کا بڑا دشمن اور بدخواہ ہے۔ لَاَتَّخِذَنَّ ...... نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۔ یعنی اپنی راہ پر لگا کر رہونگا۔ **۴۳۵** یعنی اُن کے عقائد اور بنیادی خیالات کو بھی ڈگمگا دونگا۔ اور انکے نفسانی جذبات اور خواہشات کو بھی اُبھار دونگا۔ گمراہیاں دو ہی طریقوں سے آسکتی ہیں اور انسان شیطانی اثر دو ہی شکلوں سے قبول کر سکتا ہے۔ ایک عقل و فکر کی راہ ہے۔ دوسرے جذبات و احساسات کا راستہ ہے۔ قرآن مجید کے دو جامع لفظوں نے ان سب کا احاطہ کر لیا۔ ضلال کے تحت میں ہر قسم کی عقلی، فکری، نظری گمراہیاں آگئیں اور تمنّی کے تحت میں معاصی و فواحش کی جانب میلان اور نظر سے ان کی مضرتوں کا غائب ہو جانا آگیا۔ **۴۳۶** (بتوں کے نام پر) عرب جاہلیت کے ایک خاص دستور کی طرف اشارہ ہے۔ کان کے پیچھے جو غدود ہوتے ہیں، وہ غدود بندروں کے کاٹ کاٹ کر انسان کے جسم میں ان کی تعلیم کی ہوا جو اس زمانہ میں چلنی شروع ہوئی ہے۔ اور عجب نہیں کہ کل بندروں سے گزر کر دوسرے جانوروں اور چوپایوں تک پہنچ جائے۔ ادھر اگر فاطرِ کائنات کے کلام میں اشارہ ہے تو کچھ عجب نہیں۔ **۴۳۷** تغییرِ خلق اللّٰہ کی دو بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک خلق تکوینی میں تغییر دوسرے خلق تشریعی میں تغییر۔ قدیم مفسرین نے تغییرِ خلق تکوینی کی مثال میں داڑھی منڈانے اور جسم گُدنے کو پیش کیا ہے۔ لیکن جاہلیت جدید کی ترقیوں نے ان سے کہیں بڑھ بڑھ کر مثالیں نہ صرف ایجاد کر لی ہیں بلکہ انہیں پھیلا کر فیشن میں داخل کر دیا ہے۔ مثلاً مردوں کا چہرہ کے بال بالکل صاف کر کے اور طرح طرح کی نزاکتیں اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک عورت بن جانا۔ عورتوں کا سر کے بال کٹا کر اور مردانہ وضع و لباس اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک مرد بن جانا۔ ایسے اپریشن کرانا جن سے جنس تبدیل ہو جائے یعنی عورت مرد بن جائے اور مرد عورت ہو جائے۔ وقس علی ھذا۔ خلقِ تشریعی میں تغییر کے معنٰی دین اور احکامِ دین تحریف کر دینا ہے۔ قیل معناه یغیرون حکمه (راغب) ابن جریر نے خلق اللّٰہ کے معنٰی دین اللّٰہ کے ابن عباسؓ صحابی اور مجاہد تابعی اور عکرمہ تابعی سے نقل کئے ہیں اور دوسروں نے بھی یہی معنٰی لئے ہیں۔ ای دینه بالکفر واحلال ما حرم وتحریم ما احل (جلالین) قال معناه ابن عباس وعن عکرمة وابو صالح وذالک کله تعذیب الحیوان وتحریم وتحلیل بالطغیان وقول بغیر حجة ولا برھان (قرطبی) یہ بھی کہا گیا ہے کہ آفتاب پرستی، آتش پرستی، شجر پرستی، حیوان پرستی وغیرہ سب اس تغییرِ خلق اللّٰہ کی صورتیں ہیں کہ مشرک ان سے وہ کام لے رہا ہے جس کے لئے ان کی خلقت ہوئی ہی نہ تھی۔ (قرطبی)

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ

اور مومنین کے راستہ کے علاوہ (کسی راستہ کی) پیروی کرے گا ہم اُسے کرنے دیں گے جو کچھ وہ کرتا ہے اور ہم

جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۱۱۵ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ

اسے جہنم میں جھونکیں گے ۴۲۹ اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے یقیناً اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے

يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ

ساتھ شرک کیا جائے اور اسکے سوا اور گناہوں کی بخشش دیگا جس کیلئے منظور ہوگا اور جو کوئی اللہ کے

يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۱۱۶ اِنْ يَّدْعُوْنَ

ساتھ شرک کرتا ہے وہ یقیناً بڑی دُور کی گمراہی میں پڑ گیا ۴۳۰ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں

مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۱۱۷

تو بس زنانی چیزوں کو ۴۳۱ اور یہ لوگ پکارتے بھی ہیں تو بس شیطان سرکش کو ۴۳۲ اس پر

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا

لعنت کی ہے اللہ نے ۴۳۳ اور وہ کہہ چکا ہے کہ میں تیرے بندوں میں اپنا مقرر حصہ لے کر

مَّفْرُوْضًا ۱۱۸ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ

رہوں گا ۴۳۴ اور میں انہیں گمراہ کر کے رہونگا اور ان میں ہوس پیدا کر کے رہونگا ۴۳۵ چنانچہ وہ

فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ

چوپایوں کے کانوں کو تراشیں گے ۴۳۶ اور انہیں حکم دونگا تو وہ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی

اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ

کریں گے ۴۳۷ اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنائے گا وہ یقیناً

ع ۱۷ ۳ ۱۴

وقف لازم

۵۳۸ شیطان کا دوست بنانا یہی ہے کہ احکام شریعت کو چھوڑ کر خود ساختہ طور طریقوں کو اختیار کیا جائے اور مخلوق کے چلائے ہوئے رسم و رواج کو دلیل راہ بنا لیا جائے۔
۵۳۹ چنانچہ ان وعدوں کی بے حقیقتی اکثر تو اسی دنیا میں روشن ہو کر رہتی ہے ورنہ موت کے وقت تو بہرصورت کھلتی ہی ہے۔ یَعِدُھُمْ شیطانی وعدے مثلاً یہ کہ حشر نشر، حساب کتاب کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے یہی مادّی دنیا ہے۔ عقل جزوی ہی سب سے بڑا معیار اور آخری معیار ہے۔ وحی الٰہی محض وہم ہے۔ مادّہ کی قوتیں اور قوانین ہی سب کچھ ہیں۔ اُن کے اوپر کوئی مشیّتِ اعلیٰ حاکم نہیں۔ وقس علی ہذا۔ یُمَنِّیھِمْ شیطانی جذبات مثلاً یہ کہ فحش کاری میں کوئی عیب و حرج نہیں۔ شراب صحت کے لئے ضروری ہے۔ قانون حجاب ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ ۵۴۰ دائمی راحت کی زندگی صرف قرآن اور شریعت کے اتباع سے ممکن ہے۔ ۵۴۱ اس برائی کے تناسب اور اس شخص کے تناسب حال۔ یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ مدارِ کار طاعت ہے محض آرزوئیں اور خوش خیالیاں اس میں محض ہیچ ہیں خواہ وہ کسی کی بھی ہوں۔ سُوْٓءًا کے معنی یہاں شرک کے بھی کئے گئے ہیں لیکن جمہور مفسرین نے اسے عام ہی رکھا ہے قال الجمھور لفظ الاٰیۃ عام و الکافر والمؤمن مجاز بعمله السوء (بحر) ۵۴۲ کہ اُن کی کوئی نیکی گھٹنے سے بچے، یا گھٹا دی جائے۔ وَھُوَ مُؤْمِنٌ۔ ایمان کی قید بہت ضروری ہے۔ ہر عمل کے واقعۃً صالح ہونے کیلئے لازم ہے کہ محرک عمل بھی صحیح ہو۔ ریا، نمائش یا وہم پرستی مقصود نہ ہو۔ اسی اخلاص نیت کا نام اصطلاح شریعت میں ایمان ہے۔ اور بغیر اخلاص نیت کے کوئی عمل مقبول نہیں اسکے بغیر عمل صالح صرف صورۃً ہی صالح ہوگا، حقیقت صالحیت سے خالی ـــــ یہیں سے اس بحث کا بھی خاتمہ ہوا جاتا ہے جو بعض سطحی دماغ والوں نے آج کل

خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝۱۱۹ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ
کھلے ہوئے نقصان میں رہے گا۔ ۵۳۸ (شیطان) اُن سے وعدے ہی کرتا اور ہوسیں ہی دلاتا رہتا ہے ۵۳۹

الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲۰ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ
اور شیطان ان سے وعدہ صرف فریب کی راہ کرتا ہے، یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ لوگ

عَنْهَا مَحِيْصًا ۝۱۲۱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
اس سے بچنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے، اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل نیک کئے ہم انہیں

سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
عنقریب بہشتوں کے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں پڑی بہ رہی ہوں گی اُن میں ہمیشہ ہمیش

فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ
کو رہیں گے اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون بات کا سچا

قِيْلًا ۝۱۲۲ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ
ہے ۵۴۰ بے شک نہ تمہاری تمناؤں پر ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر (بلکہ) جو کوئی بھی

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
برائی کرے گا اُسے اس کا بدلہ دیا جائیگا ۵۴۱ اور وہ اللہ کو چھوڑ کر اپنے لئے نہ کوئی دوست

وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝۱۲۳ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ
پائیگا نہ مددگار اور جو کوئی نیکیوں پر عمل کرے گا (خواہ) مرد ہو

ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ
یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہو تو ایسے (سب) لوگ جنت میں داخل ہوں گے ۵۴۲

پیدا کر رکھی ہے یعنی آیا کافروں کے اعمالِ صالحہ قبول ہونگے، جواب یہ ہے کہ بغیر اخلاص نیت یا ایمان کے کسی عمل پر عمل صالح کا اطلاق ہی درست نہیں، تو اس کے اجر کا کیا سوال ہے۔ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ کے بعد ھُوَ مُؤْمِنٌ کے اضافہ نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ ایمان اور عمل صالح دو الگ الگ چیزیں ہیں، باہم مرادف نہیں۔ فیہ اشارۃ الی ان الاعمال لیست من الایمان (مدارک)۔ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ اس میں تردید آگئی ان تمام جاہلی مذہبوں کی جو حسنِ عمل کے باوجود عورت کو محض اس کے عورت ہونے کی بنا پر ثمرۂ حسنِ عمل سے محروم ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ اسلام میں عورت کو اس کی جنس کی بنا پر ہرگز کسی اجر سے محروم نہیں کیا ہے۔ نَقِيْرًا پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے۔

۴۴۳ یعنی فرمانبرداری دل سے ہو، منافقانہ نہ ہو۔ موحد محسن بالقول والفعل (ابن عباسؓ) متابعاً للشریعۃ فھو ظاھرہٗ بالمتابعۃ وباطنہ بالاخلاص (ابن کثیر) اَسْلَمَ وَجْهَهٗ یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی، اعمال میں بھی۔ ای اخلص دینہ وعملہ للہ (ابن عباسؓ) ۴۴۴ ذکر اسی ملّتِ ابراہیمی کا دوسرا نام دینِ اسلام ہے۔ ۴۴۵ توریت میں بھی ابراہیم علیہ السلام کا لقب خدا کا دوست آگیا ہے:۔ "کیا تو ہمارا خدا نہیں جس نے اس سرزمین کے باشندوں کو اپنی گروہ اسرائیل کے آگے سے خارج کیا اور اسے اپنے دوست ابرہام کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دیا؟" (۲۔ تواریخ۔ ۲۰: ۷) "اے اسرائیل میرے بندے، اے یعقوب جسے میں نے پسند کیا، جو میرے دوست ابرہام کی نسل سے ہے" (یسعیاہ ۴۱: ۸) خَلِيْلًا۔ خلّہ کہتے ہیں محبت خالص کو اور خلیل دوست خالص کو۔ الخلۃ ھی المودۃ التی لیس فیھا خلل (بحر) محبۃ تامۃ لاخلل فیھا (مدارک) قال الزجاج الخلیل ھو المحب الذی لاخلل فی محبتہ (کبیر) سمی خلیلا لان اللہ احبّہ واصطفاہ (معالم) قال ثعلب انما سمی الخلیل خلیلا لان محبتہ تتخلل القلب فلا تدع فیہ خللا الاملأتہ (قرطبی) خلّتِ الٰہی سے مراد ہے تقرب ومقبولیت کا اعلیٰ مقام۔

وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿١٢٤﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ

اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا ۔ اور دین میں اس سے بہتر کون ہے جو اپنا رخ

اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ

اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو اور ابراہیمؑ راست رو کے مذہب

حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي

کی پیروی کرے اور اللہ نے تو ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنالیا اور اللہ ہی کی ملک ہے

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے

مُّحِيْطًا ﴿١٢٦﴾ وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاۗءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ

ہے لوگ آپ سے عورتوں کے باب میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے اللہ تمہیں ان

فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَي النِّسَاۗءِ

کے بارہ میں (خود ہی) فتویٰ دیتا ہے اور وہ (آیات بھی) جو تمہیں کتاب کے اندر ان یتیم عورتوں کے باب میں

الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ

پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جنہیں وہ نہیں دیتے ہو جو ان کے لئے مقرر ہو چکا ہے اور اس سے بیزار ہو کہ

تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ

ان سے نکاح کرو اور جو (آیات) کمزور بچوں کے (باب میں ہیں) اور (جو آیات اس باب میں ہیں) کہ

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ

یتیموں کے معاملات میں انصاف برتو اور تم جو کچھ بھی

ع ١٨ / ١٥

قرآن مجید نے ایک طرف تو ملّتِ ابراہیمی کی پیروی ضروری قرار دی اور دوسری طرف ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنایا۔ اس میں صاف اشارہ یہ نکل آیا کہ اسی ملّت کی پیروی سے آج بھی کوئی نہ کوئی درجہ خلّت کا حاصل ہوسکتا ہے۔ ۴۴۶ (اپنے علم وقدرت سے) لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ میں بیان کیا گیا اللہ کے کمالِ قدرت ووسعتِ سلطنت کا اور كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا میں بیان آگیا اس کے کمالِ علم کا۔ یعنی چھوٹی بڑی کوئی سی شے کائنات میں نہ اُس کی ملک وسلطنت سے باہر ہے اور نہ اسکے احاطۂ علم سے۔ مشرکین کو علی العموم انہی دو صفاتِ باری (صفتِ علم وصفتِ ملک وقدرت) میں ٹھوکر لگی ہے۔ اس لئے انہی صفات کا اثبات قرآن مجید بار بار کرتا ہے۔ ۴۴۷ یعنی انکے مہر، میراث وغیرہ کے باب میں، اُن کے حقوق وفرائض کے بارہ میں۔ ای یطلبون منک تبیین المشکل من الاحکام فی النساء ومعایجب لھن وعلیھن (روح) یہ سوال کرنے والے صحابی حضرات تھے۔ نزلت بسبب سوال قوم من الصحابۃ امر النساء واحکامھن فی المیراث وغیر ذلک (قرطبی) آیت کے مضمون کا ربط سورت کی ابتدائی آیتوں کے مضمون سے ہے۔ ھذہ الآیۃ مرجوع الی ما افتتحت بہ السورۃ من امر النساء (قرطبی) ۴۴۸ (جو پہلے مل چکا ہے) مثلاً یہ کہ عورتوں کو ترکہ سے محروم نہ رکھو۔ ایک بندھا ہوا حصہ انہیں دو جو یتیم عورتیں تمہاری پرورش میں ہیں اُن کا نکاح کہیں اچھی جگہ دیکھ کر کردو، اگر اپنے ہی سے کرتے ہو تو اُن کا مہر پورا ادا کرو۔ وقس علی ہذا۔ ۴۴۹ یعنی اُن کا مہر یا ترکہ میں اُن کا حصہ۔ وقس علی ہذا۔ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ۔ یعنی وہ آیتیں جو اس کے قبل نازل ہو چکی ہیں۔ اشارہ جاہلیت کے ظالمانہ دستوروں کی جانب ہے کہ مثلاً یتیم عورتوں کے ساتھ معاملہ یہ رکھتے ہو کہ اگر وہ صاحبِ مال اور صاحبِ جمال ہوئیں تو ان سے عقد تو کرلیتے ہو لیکن اُن کے جو حقوق مقرر ہیں، وہ انہیں ادا نہیں کرتے ہو۔ یتیموں کے حقوق اور عورتوں کے حقوق آج معمولی سی بات معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ تو آج ہے ظہورِ اسلام کے ساڑھے تیرہ سو سال بعد۔ باقی اگر ان احکام کی اہمیت کا پورا اندازہ کرنا ہے تو تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم کرلیا جائے کہ چھٹی صدی عیسوی میں عرب کی خصوصاً اور ہندوستان، ایران، چین، یورپ کل دنیا کی عموماً کیا حالت حقوقِ نسواں کے باب میں تھی۔ ۴۵۰ یعنی چونکہ وہ صاحبِ جمال نہیں، اسلئے اپنے عقد میں انہیں لینے سے گریز کررہے ہو، اور ساتھ ہی چونکہ صاحبِ مال ہیں۔ اسلئے دوسری جگہ بھی انہیں نکاح نہیں کرنے دیتے ہو کہ اس طرح مال اپنے ہاتھ سے چلا جائیگا۔ تَرْغَبُوْنَ کے ساتھ اس کا صلہ عن یہاں مذکور نہیں لیکن اکثر ائمۂ تفسیر نے مقدر مانا ہے اور اسی لئے تفسیر بیزاری سے کی ہے۔ اور خود عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی ترغبون عن نکاحھن (ابن عباسؓ) ای ترغبون عنھن (ابن جریر عن الحسن) ای وترغبون عن ان تنکحوھن ثم حذفت عن (قرطبی) وحدیث عائشۃ یقوی حذف عن (قرطبی) دوسری تفسیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مقدر بجائے عن کے فی یا الیٰ کو مانا جائے اور معنی یہ کئے جائیں کہ "تم رغبت تو اُن سے عقد کی رکھتے ہو اُن کے صاحبِ مال یا صاحبِ جمال ہونے کی بنا پر، لیکن اُن کے مہر پورے نہیں دینا چاہتے ہو"۔ اکابر کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے۔ قال سعید بن جبیر ومجاھد ویرغب فی نکاحھا اذا کانت کثیرۃ المال (قرطبی) کشاف نے فی اور عن دونوں کے احتمالات نقل کردیئے ہیں، اور کبیر میں ابوعبیدہ لغوی کا قول نقل ہوا ہے کہ معنی رغبت اور بیزاری دونوں کے نکلتے ہیں۔ قال ابوعبیدۃ ھذا یحتمل الرغبۃ والنفرۃ۔ لب لباب دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے یعنی عورتوں کے باب میں عدم ادائے حقوق۔ ۴۵۱ تقدیرِ کلام یوں ہے:۔ يُفْتِيْكُمْ فی یتامی النساء وفی المستضعفین وفی ان تقوموا (مدارک) یہاں یہ بتایا ہے کہ یہ ساری آیاتِ احکام جو پہلے گزر چکی ہیں، بدستور واجب العمل ہیں۔ ان احکام میں کوئی ترمیم یا تنسیخ نہیں ہوئی ہے۔ یتیموں کی حق رسی، یتیم لڑکوں کے ساتھ حُسنِ سلوک، عورتوں کی مردوں کے ساتھ من وجہ مساوات وغیرہ کے باب میں آیاتِ ذیل پہلے گزر چکی ہیں۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ الخ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى الخ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ الخ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا الخ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا۔

۵۵۲ (اور اسی علم کامل کے مطابق جزاء خیر بھی دیگا) وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ۔ اسی عمل خیر میں تیموں اور عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک و حُسنِ معاشرت بھی آگیا۔ ۵۵۳ (بشرطیکہ شرائطِ صلح اصلاً جائز ہوں حرام و ممنوع نہ ہوں) فقہا نے تصریح کردی ہے کہ صلح اگر کسی حرام شرط کے ساتھ مشروط ہوگی تو باطل ہوگی مثلاً شوہر نے صلح کی یہ شرط لگادی کہ وہ بیوی کے ساتھ اسکی بہن کو بھی زوجیت میں رکھے گا اور بیوی نے اسے منظور کرلیا، جب بھی چونکہ یہ ایک امر حرام ہے، اس لئے یہ مصالحت باطل رہیگی۔ صُلْحًا کی تنوین تنویع کے لئے ہے۔ یعنی ایک خاص قسم کی صلح۔ پوری صلح اگر طیب خاطر کے ساتھ ہوجائے تو پھر تو کسی شرط وغیرہ کا سوال ہی نہیں رہ جاتا۔ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا۔ مثلاً اس طور پر کہ بیوی اپنے شوہر کو رضامند رکھنے کیلئے اپنے حقوق میں سے کچھ چھوڑ دے۔ اپنا مہر معاف کردے، یا اس میں کمی کردے، اپنی باری کا دن دوسری بیوی کو دیدے، اپنے مصارف کا بار ہلکا کردے وقس علیٰ ہذا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بیوی کے حق شوہر پر دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک ثابت و مستقل مثلاً رقم مہر، دوسرے وہ جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں مثلاً نفقہ یا ہمبستری، صلح کے لئے عورت دستبرداری دونوں قسم کے حقوق سے کرسکتی ہے۔ البتہ یہ فرق ہوگا کہ قسم اوّل کے حقوق میں نقضِ صلح کا اختیار نہ رہیگا یعنی جو چھوڑ دیا بس وہ ساقط ہوگیا۔ اور الساقط لا یعود لیکن دوسرے قسم کے حقوق میں بیوی کو یہ اختیار باقی رہیگا کہ وہ جب چاہے، کسی چھوٹے ہوئے حق کا مطالبہ از سرِ نو کردے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ۔ بیوی کی طرف سے یہ دستبرداری بظاہر ایک صورت رشوت کی معلوم ہوتی ہے یہاں اس وہم کو دفع فرمایا ہے اور بتادیا ہے کہ نہیں اس میں کچھ مضائقہ نہیں، بالکل جائز و درست ہے۔ نُشُوْزًا۔ نشوز کے معنی پر حاشیہ اُوپر گزر چکا ہے۔ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ۔ بیوی کی طرف سے جو نشوز ہو اس کا علاج اُوپر بتایا جاچکا ہے۔ اب یہاں یہ بتلایا جارہا ہے کہ نشوز اگر شوہر کی طرف سے ہو تو وہ بھی لاعلاج نہیں۔ اس کی بھی تدبیریں ہیں۔ خَافَتْ۔ خوف یہاں توقع کے معنی میں ہے خافت یعنی توقعت (قرطبی) ۵۵۴ (ہر نزاع و افتراق سے، ہر فساد و عناد سے) من الفرقة او سوء العشرة او من الخصومة (بیضاوی) نزاع و افتراق یوں بھی عقل و شریعت کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ چہ جائیکہ خانگی زندگی میں اور میاں بیوی جیسے قریب ترین رشتوں کے درمیان!

۵۵۵ بیوی کے لئے ان الفاظ میں صاف ترغیب ہے کہ وہ اپنے کچھ حقوق چھوڑ ہی دے بلا سے تعلق زوجیت تو قائم ہے۔ تو شوہر جب دیکھیگا کہ اُس کے اپنے حقوق و حظوظ میں کچھ فرق نہیں آتا اور بیوی ہی اپنے بعض حقوق کا مطالبہ چھوڑے دے رہی ہے تو عجب نہیں کہ مصالحت پر جلد تر آمادہ ہوجائے۔ الشُّحَّ۔ شُح ایسے بخل کو کہتے ہیں جسکے ساتھ حرص ملی ہوئی ہو۔ الشح بخل مع حرص (راغب) مراد یہ ہے کہ خود غرضی اور نفس کی آرام طلبی سے کوئی بھی فریق خالی نہیں۔ یہ اپنی راحت ڈھونڈتا ہے، وہ اپنی۔ ای کل واحد منهما يطلب ما فيه راحته (مدارک) ۵۵۶ (اور اس کی طرف سے وعدہ ہر تقویٰ اور حُسنِ سلوک پر اجر کا ہے) اسمیں در پردہ شوہروں کو نصیحت ہے کہ نفاق و افتراق تو خیر بہت دُور کی چیز ہے انہیں تو تقویٰ اور حُسنِ سلوک کی روش پر قائم ہوکر بیویوں سے کسی حق کی دستبرداری کی بھی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا۔ ذکر یہاں شوہروں کے نشوز و اعراض کا چل رہا ہے اسلئے یہ خطاب بھی شوہروں سے ہے تُحْسِنُوْا۔ تو شوہر جب بیوی سے حُسنِ سلوک کا خوگر ہوجائیگا تو اس سے اس کی بھی توقع نہیں رکھیگا کہ وہ اپنے کسی حق سے دستبردار ہوجائے۔ وَتَتَّقُوْا۔ اور جب تقویٰ اختیار کریگا تو نشوز و اعراض خود ہی کافور ہوجائینگے۔ خوب خیال کرکے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں حُسنِ معاشرت زوجین کا ذکر آیا ہے میاں بیوی میں سے کسی کو اسکے حقوق پر توجہ دلائی ہے ایک جامع لفظ تقویٰ کا لایا گیا ہے اور اس خانگی حُسنِ معاشرت کو تقویٰ ہی کی ایک اہم فرد قرار دیا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ اس سے بہتر اور مؤثر تر تدبیر کوئی اور ہے ہی نہیں۔ ۵۵۷ (سو یہ عدل تمہارے اختیار سے باہر ہے اسلئے تم اس عدل کے مکلف بھی نہیں) اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ۔ برابری ہر چیز میں یہاں تک کہ رغبتِ قلب اور امور غیر اختیاری میں بھی۔ شروع سُورت میں جہاں چار تک کی تعدادِ ازدواج کی اجازت صراحت کے ساتھ مرحمت ہوئی تھی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ وہاں صرف یہی ارشاد ہُوا تھا کہ انکے درمیان عدل رکھنا اور اگر عدل نہ کرسکو تو ایک ہی پر قناعت رکھنا۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔ اُس موقع پر عدل سے مراد تھی عدل معاملات میں، عدل اُمور اختیاری میں، یعنی ہر بیوی کی ضروریات کا، مزاج و مذاق کا لحاظ رکھنا، برخلاف اسکے یہاں جس عدل کی نفی کی جارہی ہے اور ارشاد ہورہا ہے کہ ایسے عدل پر تم قادر ہی نہیں ہوسکتے چاہے لاکھ اس کی تمنا کرو۔ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ۔ اس عدل سے مُراد ہے مساوات اُمور غیر اختیاری میں، کیفیات قلب میں، مثلاً محبت و رغبت میں اور ایسی مساوات کامل تو والدین تک عادۃً اپنی ساری اولاد کے درمیان نہیں رہ سکتے ——— لفظ عدل دونوں جگہ مشترک ہے لیکن مفہوم الگ الگ ہے۔ اور اس اسلوبِ بیان کی مثالیں قرآن مجید میں کثرت سے ملتی ہیں۔ اخبر تعالیٰ بنفي الاستطاعة في العدل بين النسآء وذٰلك في ميل الطبع في المحبة والجماع والحظ في القلب (قرطبی) روی عن ابی عبیدة قال یعنی المودة و میل القلب وکذٰلک روی عن ابن عباس و قتادة (جصاص) پس بعض جدید مؤلفین نے اس آیت سے جو یہ نکالنا چاہا ہے کہ قرآن مجید نے عدل بین الازواج کو ناممکن بتایا ہے اور تعددِ ازدواج کی اجازت حرفِ عدل کے ساتھ دی ہے تو اس طرح اُس اجازت کو ایک بار دے کر پھر واپس لے لیا ہے تو ایسے لوگوں نے نادانستہ سہی لیکن بہرحال قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اور اس کی جانب بے تکلف اس عیب کو منسوب کردیا ہے کہ وہ جس چیز کو روکنا چاہتا ہے اُسے براہ راست منع نہیں کردیتا بلکہ اس کے لئے خواہ مخواہ ایک پُر پیچ راستہ اختیار کرتا ہے۔ ۵۵۸ (کہ مساواتِ کامل اور رغبتِ قلب کی بے اختیاری کو بہانہ کرکے بیوی کے ظاہری اور اپنے اختیار کے اندر والے حقوق بھی پامال کرنے لگو) قال مجاهد لا تتعمد والاساءة بل الزموا التسوية في القسم والنفقة لان هذا مما يستطاع (قرطبی) ۵۵۹ (کہ وہ بیچاری نہ تو عام شوہر والیوں کی طرح اپنے حقوق سے مستفید ہوتی ہے۔ اور نہ طلاق والیوں کی طرح اپنے کو آزاد و خود مختار پاتی ہے) فَتَذَرُوْهَا میں ضمیر مؤنث مظلوم بیوی کی جانب ہے۔ ای لا هی مطلقة ولا ذات زوج قال الحسن (قرطبی) التی لیست ذات بعل ولا مطلقة (بیضاوی) شریعت نے اس ادھر میں پڑی رہنے والی کی حالت کو بدترین قرار دیا ہے۔ شوہر کو چاہیے کہ اپنے امکان بھر پوری کوشش حُسنِ معاشرت کی اور تعلق زوجیت کے حق کی کرے لیکن جب دیکھے کہ کوئی صُورت اس میں کامیابی کی نہیں تو پھر صاف طور پر قاعدۂ شرعی کے مطابق طلاق دیدے۔ یہ ظالمانہ صورت بہرحال نہ اختیار کرے کہ عورت بظاہر سہاگن اور شوہر دار ہو، لیکن حقیقۃً اپنے کسی حق سے بھی متمتع نہیں ہورہی ہے۔ ۵۶۰ (سو اس کے ہاں ماضی کی اصلاح حال کی احتیاط اور مستقبل کے عزم احتیاط کے بعد تمامتر مغفرت و رحمت ہی ہے) اَنْ تُصْلِحُوْا۔ یعنی اپنی پچھلی بدعنوانیوں کی اصلاح حسبِ قاعدۂ شرعی کرلو۔ وَتَتَّقُوْا۔ اس تقویٰ کا تعلق حال و مستقبل سے ہے۔ ۵۶۱ (ایک کو دُوسرے سے) یعنی اگر صلح و موافقت کی ہر تدبیر ناکام ہے اور نوبت بالآخر علیحدگی ہی کی آجائے تو زیادتی (نشوز) اور بے اتفاقی (اعراض) کرنے والا فریق یہ نہ سمجھے کہ اب اللہ کسی کے کام کو کسی سے اٹکائے نہیں رکھتا۔ وہ بغیر کسی بندہ کی شرکت اور مدد کے ہر ایک کا کام چلادینے کے لئے کافی ہے۔

خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝۱۲۷ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ

نیکی کروگے سو اللہ اس کا خوب علم رکھتا ہے ۵۵۲ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف

مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ

زیادتی یا بے اتفاقی کا اندیشہ ہو تو اس میں اُن کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں

يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ

آپس میں ایک خاص طریق پر صلح کرلیں ۵۵۳ صلح بہرحال بہتر ہے ۵۵۴ اور طبیعتوں میں تو بخل

الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ

ہوتا ہی ہے ۵۵۵ اور اگر تم حُسنِ سلوک رکھو اور تقویٰ اختیار کئے رہو تو جو کچھ تم کرتے ہو

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۲۸ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا

اللہ بیشک اس کی پوری خبر رکھتا ہے ۵۵۶ اور تم سے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تم بیویوں کے درمیان

بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ

پُورا پُورا عدل کرو خواہ تم اسکی کیسی ہی خواہش رکھتے ہو ۵۵۷ تو تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھلک

فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ

جاؤ ۵۵۸ اور اسے ادھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو ۵۵۹ اور اگر تم (اپنی) اصلاح کرلو اور تقویٰ اختیار کرو تو

اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۲۹ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ

اللہ بیشک بڑا بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ۵۶۰ اور اگر دونوں جُدا ہی ہوجائیں تو

اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا

اللہ ہر ایک کو اپنے فضل کی وسعت سے بے نیاز کردیگا ۵۶۱ اور اللہ ہے ہی بڑا وسعت والا بڑا

۷۶۲ (اُسے ہر ایک کے لئے ایک مناسب سبیل نکال لینا کیا مشکل ہے) ۷۶۳ (سو اس مالک الملک اور ملک الملوک کی رضا جوئی کے بجائے کسی اور کی رضا طلبی کیسی شدید حماقت ہے وہ زمین و آسمان کے سارے خزائن کا مالک ہے۔ اُسے دوسروں کو غنی بنا دیتے کیا دیر لگ سکتی ہے۔ ۷۶۴ (کہ یہی خوفِ خدا اور تقویٰ الٰہی بنیادی ہی تمام احکام الٰہی کی تعمیل کی ہے اور اسے آسان اور خوشگوار بنادینے والی بھی) انسان کی ساری زندگی کا سنگِ بنیاد یہی تقویٰ ہے اور اسلئے یہ عین مقتضائے حکمت ہے کہ قرآن مجید اس کی تاکید سے لبریز ہے مسیحیوں کا دعویٰ ہے کہ انکے مذہب کی بنا خوفِ خدا پر نہیں، بلکہ محبتِ الٰہی پر ہے اور انکے پادری اسے بہت فخر سے پیش کرتے رہتے ہیں حالانکہ اُن کی انجیل ان تاکیدوں سے خالی نہیں مثلاً۔ " اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کرسکتا ہے" (متی ۱۰: ۲۸) اس سے ڈرو جس کو قتل کرنے کے بعد اختیار ہے کہ جہنم میں ڈالے۔ ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی سے ڈرو" (لوقا ۱۲: ۵) رہی توریت تو اس کے حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔ ۷۶۵ (سو ایسے کی ناشکری اور نافرمانی سے اُس کا کیا ضرر۔ ضرر تو خود تمہارا ہی ہے) اِنْ تَكْفُرُوْا احکام الٰہی کی مخالفت ہی کا نام ناشکری ہے۔ ۷۶۶ مشرک جاہلی قوموں کے دیوی دیوتا اپنی صفات میں ناقص اور اپنی ذات کے لحاظ سے محدود ہوتے ہیں، اُن کے پرستار اور پجاری جو منتروں سے جاپ کرتے رہتے ہیں۔ اس سے انکے نقائص کی تکمیل ہوتی رہتی ہے۔ اور وہ اپنی الوہیت و معبودیت کیلئے غذا حاصل کرتے رہتے ہیں——— قرآن مجید نے یہاں ان دو صفات کا ذکر کرکے ان خرافات کی تردید کردی۔ اللہ بذاتِ خود ہر طرح کامل و مکمل ہے کسی کی عبادت سے اس کی تکمیل کا خیال ہی مہمل ہے اور اس کی صفات سب عالی و ستودہ ہیں نقص کا گزر نہیں۔ ۷۶۷ اس کی کارسازی عالم کو ناکافی سمجھ کر کسی مخلوق کی طرف التفات کرنا اور اس سے کارسازی کی توقع رکھنا کیسی خرافت ہے) خلقت کائنات و تدبیر کائنات سب اُس کیلئے آسان ہیں۔ ۷۶۸ (اور جو کام اُسے لینے ہیں، وہ اسی نئی مخلوق سے لے) یہ بیان اُس کے

حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

حکمت والا ہے ۷۶۲ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کی ملک ہے ۷۶۳

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور ہم نے اُن لوگوں کو جنہیں تم سے قبل کتاب مل چکی ہے اور خود تمہیں بھی حکم

وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ

دیا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو ۷۶۴ اور اگر ناشکری کروگے تو (یاد رہے کہ) جو کچھ بھی آسمانوں

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کی ملک ہے ۷۶۵ اور اللہ بڑا بے نیاز ہے

غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

ستودہ صفات ہے ۷۶۶ اور جو کچھ بھی آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (سب)

الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا

اللہ ہی کی ملک ہے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے ۷۶۷ وہ اگر چاہے تو لے جائے تم (سب) کو اے

النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ

اور دوسروں کو لے آئے ۷۶۸ اور اللہ اس پر

قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ

قادر ہی ہے ۷۶۹ جو کوئی دنیا کا انعام چاہتا ہے تو اللہ کے پاس تو دنیا اور آخرت

ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

ع ۱۹ / ۸ / ۱۶

(دونوں) کا انعام موجود ہے ۷۷۰ اور اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا دیکھنے والا ہے ۷۷۱

کمال قدرت کا ہے۔ آخَرِیْنَ یعنی نوع انسان کے علاوہ کوئی اور ہی نئی مخلوق۔ ای خلقاً آخرین مکان الانس (بیضاوی) جوز الزمخشری وابن عطیۃ ومقلدوھما أن یکون المراد جنساً غیر جنس الناس (روح) ۷۶۹ (سو اس قدرت کے باوجود وہ اگر ایسا نہیں کرتا اور تمہارے بجائے کسی جدید مخلوق کو وجود میں نہیں لارہا ہے تو اس کا تمہارے ہی اوپر کمال احسان ہے کہ وہ کس طرح حصولِ اجر کا موقع دیے جارہا ہے) کَانَ لانے سے مفہوم ماضی مقصود نہیں۔ بلکہ صفت قدرت کی ازلیت اور غیر متناہیت کا اثبات مقصود ہے۔ القدرۃ صفۃ ازلیۃ لاتتناھی مقدوراتہ کمالا تتناھی معلوماتہ والماضی والمستقبل فی صفاتہ بمعنی واحد (قرطبی) صیغۂ ماضی لانے میں نکتہ یہ ہے کہ صفت کے قدیم ہونے کی طرف اشارہ ہوجائے۔ ذات وصفات کو کوئی حادث نہ سمجھ لے۔ انما خص الماضی بالذکر لئلا یتوھم انہ یحدث فی ذاتہ وصفاتہ (قرطبی) ۷۷۰ (سو اس لازوال انعام ولذت کو چھوڑ کر صرف عارضی اور فانی لذتوں پر قناعت کرلینا کس درجہ بے دانشی اور عاقبت نااندیشی ہے) ۷۷۱ سو وہ سب کی دعاؤں کو، التجاؤں کو خوب سنتا رہتا ہے۔ خواہ وہ معاوضۂ دنیوی کے باب میں ہوں یا اجرِ اُخروی سے متعلق اور سب کی نیتوں کے اخلاص وعدم اخلاص کو دیکھتا رہتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ

اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی

شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ

دینے والے رہو ٤٧٢ چاہے وہ تمہارے یا (تمہارے) والدین اور عزیزوں کے

وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى

خلاف ہی ہوتے ٤٧٣ وہ امیر ہو یا مفلس اللہ (بہرحال) دونوں سے زیادہ

بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا

حقدار ہے ٤٧٥ تو خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا ٤٧٦ کہ حق سے ہٹ جاؤ ٤٧٧ اور اگر تم کج کروگے

اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٣٥﴾

یا پہلو تہی کروگے تو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب خبردار ہے ٤٧٧

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ

اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول اور اس کتاب

الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ

پر ایمان لاؤ جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس (جنس) کتاب پر بھی

اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

جو وہ اس سے قبل نازل کرچکا ہے ٤٧٩ اور جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی

وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا

کتابوں اور اس کے پیمبروں اور قیامت کے دن سے کفر کرتا ہے وہ گمراہی میں بہت دور

٤٧٢ اپنے تمام معاملات میں، احکام کی تعمیل میں اور زندگی کے مختلف معاملات میں بار بار ترغیب راہِ حق و دیانت سے ہٹنے کی ہوتی رہتی ہے اور کہیں اپنے ذاتی نقصان کے خیال سے، کہیں بزرگوں، عزیزوں کی مروت اور لحاظ سے قدم کو بار بار لغزش ہونے لگتی ہے۔ یہاں تاکید ہے کہ ایسے تمام موقعوں پر حق و دیانت پر قائم رہو۔ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ اسکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ گواہی سے مقصود اللہ کی رضاجوئی ہے۔ ای تقیمون الشھادات لوجہ اللہ (بیضاوی) ای لا یراعی فی الشہادۃ الا جھۃ اللہ ... (بحر) لذات اللہ ولوجہہ ولمرضاتہ وثوابہ (قرطبی) اور دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "اللہ کے گواہ بن جاؤ" یعنی تمہاری شہادت شہادت الٰہی کے قائم مقام ہو جائے۔ فقہاء نے یہی معنی لے کر استنباط کیا ہے کہ جو امر گواہوں سے ثابت ہو جائے، وہی قطعی ہے۔ اور اس کی مخالفت جائز نہیں۔ چنانچہ قاضی اگر معتبر آدمیوں کی شہادت پر مدعی کو ڈگری دے دے اور مدعی علیہ خوب علم رکھتا ہو کہ حق مدعی کا نہیں اور فیصلہ غلط اور نامنصفانہ ہوا ہے، تاہم اگر وہ تعمیل نہ کریگا تو قاضی اسلام کی مخالفت اور گواہوں کی تکذیب کا مجرم ہوگا۔ ٤٧٣ یعنی مروت اور رعایت نہ خود اپنی کرو نہ اپنے کسی بزرگ کی، نہ کسی عزیز کی، بلکہ صرف اللہ کی اور حق و صداقت کی۔ قرآن مجید پر عامل مسلمان حلفیہ شہادت کا ذکر نہیں، بلا حلف بھی کبھی جھوٹی گواہی کا مرتکب ہو سکتا ہے؛ حکم عام ہے ہر قسم کی گواہی کے لئے۔ صرف مالی اور عدالتی معاملات کی حد تک محدود نہیں محققین کہتے ہیں کہ اسکے پورے مصداق تو حضرات محدثین ہوئے ہیں کہ انہوں نے روایات حدیث کے باب میں کسی کی ذرا رعایت نہ کی اسی لئے وہ اللہ کے گواہ بن گئے۔ اور انکی روایتوں پر دین کے ایک حصہ کا مدار ٹھیر گیا۔ ٤٧٤ یعنی جس کے خلاف اگر تمہاری سچی گواہی پڑ رہی ہے اور اس کی خاطر تم سچے اظہار سے بچنا چاہتے ہو اس پر جتنا حق تمہارا ہے، اس سے کہیں بڑھ کر حق اللہ کا ہے۔ جھوٹی گواہی کے محرک عموماً دو ہی ہوتے ہیں۔ فریق اگر امیر ہے تو اس کا دباؤ، لحاظ، مروت اور اگر غریب ہے تو اس کے ساتھ جذبۂ ہمدردی یہاں دونوں کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ دونو صورتوں میں، جتنا تمہارا تعلق اسکے ساتھ ہے۔ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اللہ کا تعلق اسکے ساتھ ہے۔ ٤٧٥ (ادائے شہادت میں) تاکید ہے کہ شہادت بالکل واقعہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ شاہد کے ذاتی رجحانات کا دخل بھی نہ آنے پائے۔ ٤٧٦ یعنی ذاتی رجحانات کو دخل دینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ قدم راہِ حق سے ادھر یا ادھر ہو جائے گا۔ اَنْ تَعْدِلُوْا۔ تقدیر کلام یوں ہے۔ ان لا تعدلوا (جلالین) ای مخافۃ ان تعدلوا (ابوسعود) ٤٧٧ ہر معصیت، ہر بد اخلاقی کی طرح ادائے شہادت کی بھی ہر بے عنوانی سے روکنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ بھی اللہ تعالیٰ کی ہمہ بینی، ہمہ دانی کا استحضار ہے، جتنا یہ عقیدہ قوی، زندہ اور تازہ ہوگا، اسی قدر سخت پہرہ انسان کے نفس پر قائم رہیگا۔ اِنْ تَلْوٗۤا یعنی شہادت دی تو جائے لیکن بد دیانتی، خیانت اور اینچ پینچ کے ساتھ۔ تُعْرِضُوْا۔ یعنی سرے سے شہادت ہی نہ دی جائے۔ ٤٧٨ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا۔ آیت میں خطاب اُن لوگوں سے ہے جو کلمۂ اسلام پڑھ کر اجمالاً تو ایمان لا چکے ہیں اور اسی لئے لقب مومنین سے مشرف ہیں اور انہی کو تاکید ہو رہی ہے کہ تفصیل کے ساتھ ایمانیات کے ایک ایک جزو پر اپنا عقیدہ مضبوط کریں۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ یعنی اللہ کی ذات و صفات پر اس کی اور توحید کے تقضمنات پر تفصیل ایمان لاؤ۔ وَرَسُوْلِهٖ۔ رسول پر ایمان لانے کے معنی ہیں کہ اس کی شریعت کے ہر ہر جزو کو بے چون و چرا مان لیا جائے۔ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ۔ مراد یہاں جنس کتاب ہے یعنی اُن کتابوں پر ایمان لایا جائے جو قرآن سے قبل نازل ہو چکی ہیں۔ المراد بہ جنس ما انزل علی الانبیاء قبلہ من الکتب (کشاف) نزلت فی جمیع المومنین والمعنی یاایہا الذین صدقوا اقیموا علی تصدیقکم واثبتوا علیہ (قرطبی) یاایہا الذین اٰمنوا بحسب الاستدلالات الجملیۃ اٰمنوا بحسب الدلائل التفصیلیۃ (کبیر) ٤٧٩ ان میں سے ہر ہر عقیدہ پر فرداً فرداً ایمان لانا ضروری ہے اور ان میں سے کسی ایک عقیدہ سے بھی انکار دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے کیلئے کافی ہے۔ وَ یہاں چاروں جگہ اَوْ کے معنی میں ہے۔ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ۔ اللہ کی ذات سے انکار کی طرح اُسکی صفات سے بھی انکار داخل کفر ہے۔ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ بجائے فرشتوں کے جاہلی قوموں کی طرح دیوتاؤں کو ماننا فرشتوں ہی سے کفر کی ایک شکل ہے۔ وَكُتُبِهٖ۔ جاہلی مشرک قومیں چونکہ عقیدۂ وحی سے محروم ہیں، اسلئے کتب آسمانی کی بھی قائل نہیں۔ وَرُسُلِهٖ بجائے پیمبروں کے اوتاروں یا خدا کے مظہروں کو ماننا رسولوں سے کفر کرنا ہے۔ ای من یکفر بشیء من ذلک (بیضاوی، بحر، مدارک) لان الکفر ببعضہ کفر بکلہ۔ (مدارک)

بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا
جا پڑا ہے ۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے

ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ
پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں ترقی کرتے گئے اللہ ہرگز نہ ان کی مغفرت

لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿١٣٧﴾ بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ
کرے گا اور نہ انہیں سیدھی راہ دکھائے گا ۔ آپ منافقین کو سنا دیجئے کہ

بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣٨﴾ الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ
ان کے لئے عذاب دردناک ہے ۔ (یعنی وہ لوگ) جو مومنوں کو چھوڑ کر

الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ أَيَبْتَغُونَ
کافروں کو دوست بنائے ہوئے ہیں کیا ان کے پاس

عِندَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ
عزت کی تلاش کر رہے ہو سو عزت تو ساری اللہ ہی کی ہے ۔ اور وہ

نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ
تمہارے اوپر یہ (فرمان) کتاب میں نازل ہی کر چکا ہے کہ جب تم اللہ کی نشانیوں کے ساتھ

اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ
کفر اور تمسخر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو

حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ
یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں ۔ کہ اس حالت میں یقیناً تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے

۵۸۰ (جنت وہدایت کی) ذکر ان لوگوں کا ہے جو اسلام پر قائم نہ رہے بلکہ مرتد ہو گئے ۔ اور دوبارہ ایمان لا کر پھر بھی ایمان پر قائم نہ رہے ۔ اور توبہ نہ کی ۔ بلکہ اسی حالت کفر وارتداد پر ختم ہو گئے ۔ بجز متعین طور پر کون گروہ مراد ہے ؟ ایک قول ہے کہ یہود مراد ہیں ۔ پہلے حضرت موسیٰ پر ایمان لائے ۔ پھر انہی کی زندگی میں گوسالہ پرستی کی اور کافر ہو گئے ۔ تائب ہوئے اور ان کی ذریت حضرت عیسیٰ سے انکار کر کے پھر کافر ہو گئی ۔ اور آخر میں رسول اللہ صلعم سے انکار کر کے اپنا کفر بڑھاتے ہی رہے ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مرتدین کا کوئی خاص گروہ مراد ہے ۔ جو مکرر مرتد ہوا اور آخر تک مرتد رہا ۔ تیسرا قول اور سب سے زیادہ لگتا ہوا ہے ، یہ ہے کہ مراد منافقین و متردّدین و مذبذبین ہیں اور مقصود ان کے تردد و تذبذب کا اظہار ہے ۔ نہ کہ ان کے ارتداد کا تعدد ۔ سیاق قرآنی بھی منافقین ہی کو چاہتا ہے ۔ کنا نحسبهم المنافقين ويدخل في ذلك من كان مثلهم (ابن جریر عن مجاہد) هؤلاء المنافقون (ابن جریر ۔ عن ابن زید) روی عن ابن عباس ان الاية في المترددين (بحر) ليس المراد بيان هذا العدد بل المراد ترددهم كما قال مذبذبين بين ذلك (كبير عن القفال) جعلها ابن عباس عامة لكل منافق في عهده صلى الله عليه وسلم في البر والبحر (بحر) لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ ۔ بظاہر نفی تاکید ہے ۔ حالانکہ واقعۃً تاکید نفی کے لئے ہے ۔ ان نفي التاكيد اذا ذكر على سبيل التهكم كان المراد منه المبالغة في تاكيد النفي (كبير) **۵۸۱** بَشِّرِ ۔ تبشیر کے معنی ہمیشہ خوشخبری ہی کے نہیں ہوتے ۔ لغت میں عام ہے ہر ایسی خبر کے لئے جس کا اثر چہرہ سے ظاہر ہونے لگے ۔ التبشير الاخبار بما يظهر اثره على البشرة (قرطبی) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بشارت یہاں طنز و زجر کے معنی میں ہو ۔ اور عرب ایسے موقع پر ایسا ہی استعمال کرتے ہیں ۔ قوله بشرهم تهكم بهم والعرب تقول تحيتك الضرب وعتابك السيف (کبیر) ذالک قول الشاعر تحية بينهم ضرب وجيع اردو میں تو طنز یہ موقع پر کہتے ہیں ۔ لو اب اپنا انعام لو ۔ اب تو مزہ پایا ۔ اب دیکھو اپنا تماشا ۔ **۵۸۲** یعنی اعزاز تو تمامتر اللہ کی ملک اور قبضہ میں ہے ۔ وہ جسے چاہے معزز بنا دے ۔ منکرین کے بڑے بڑے امراء و رؤسا تک حقیقی عزت سے خالی ہیں ۔ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ ۔ یعنی یہ منافقین اہل ایمان کے کو دلی عقائد تو کیا رکھتے ۔ ظاہری تعلقات بھی ان سے قائم نہ رکھ سکے ۔ اور بجائے اُن کے اُلٹے کافروں سے لگے لپٹے ہوئے ہیں ۔ فقہاء نے آیت سے نکالا ہے کہ منکروں اور کافروں سے بلاضرورت میل جول ۔ خلاملا ۔ ان کی وضع قطع بلاضرورت بنانا ، اُن کا فیشن اختیار کرنا ۔ اُن کے لباس ، تمدن و معاشرت کو فخر و عزت کی چیز سمجھنا یہ سب داخل نفاق ہے ۔ **۵۸۳** (نفس معصیت میں) یہ تثلیث اور یکسانی نفس معصیت میں ہو گی ۔ ورنہ منکرین کا استہزاء ظاہر ہے کہ کفر اعتقادی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کے جلسوں ، محفلوں میں مسلمانوں کی شرکت محض فسق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ اى في العذاذ اذا مكنتموهم ولم يرد به التمثيل من كل وجه فان خوض المنافقين فيه كفر ومكث هؤلاء معهم معصية (مدارک) اى في العصيان وان لم تبلغ معصيتهم منزلة الكفر (جصاص) فِي الْكِتَابِ ۔ حوالہ اسی کتاب قرآن کا ہے ۔ واذا رايت الذين يخوضون في اٰيٰتنا فاعرض عنهم حتى يخوضوا في حديث غيره (سورۂ انعام آیت ۶۸) یہ سورۂ نساء مدنی ہے اور سورۂ انعام اس سے بہت قبل کی ہے ۔ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۔ اللہ کی نشانیوں کا لفظ عام ہے ۔ قرآن مجید کی آیتیں بھی انہی میں شامل ہیں ۔ حکم کی تکرار یعنی ایک بار مکہ میں نزول اور دوبارہ مدینہ میں ۔ حکم کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے ۔ یکفر اور تمسخر کرنے والے تھے کون لوگ ؟ مکہ میں تو مشرکین تھے اور مدینہ میں یہود اور منافقین ۔ آیت کا حکم عام ہے ۔ بے دینی کا ہر مشغلہ ، کفر و انکار کا ہر مظاہرہ اس کے تحت میں آجاتا ہے ۔ مسیحی یا ہندوانہ تعلیمی ، تہذیبی ، معاشرتی و سیاسی ماحول کے جو گہرے اثرات طبعی طور پر مسلمانوں پر پڑ رہے ہیں ، وہ سب اس وعید کے ماتحت آجاتے ہیں ۔ اپنے شعائر و اصول دین پر مضحکہ سنتے رہنا خواہ وہ اسکولوں اور کالجوں میں ہو یا بازاروں اور میلوں میں یا تھیٹروں اور سینماؤں میں ، یوں بھی بہر صورت بڑی بے غیرتی کی بات ہے ۔ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ فاسقوں کی مجلس میں شرکت جس وقت وہ فسق میں مشغول ہوں جائز ہے مگر کراہت کے ساتھ ۔

إِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ

بیشک اللہ دوزخ میں منافقوں اور کافروں سب کو اکٹھا

جَمِيْعًا ﴿١٤٠﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ

کر کے رہیگا ٨٨٥ یہ وہ لوگ ہیں جو تمہارے لئے مصیبت کے منتظر رہتے ہیں تو اگر تمہیں اللہ کی جانب سے

مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا أَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَإِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ

فتح حاصل ہو گئی تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو حصہ مل گیا تو ان کی

نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ

سے کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہیں آنے لگے تھے اور ہم نے تمہیں مسلمانوں سے

الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلَنْ

بچا نہیں لیا ٨٨٦ تو اللہ ہی تم (سب) لوگوں کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کریگا ٨٨٧ اور

يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿١٤١﴾ إِنَّ

اللہ کافروں کا ہرگز مومنوں پر غلبہ نہ ہونے دے گا ٨٨٨ بیشک

الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا

منافقین تو اللہ سے چال چل رہے ہیں حالانکہ اللہ انہی کی چالوں کو ان پر الٹ رہا ہے ٨٨٩ اور یہ

إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا

لوگ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں (صرف) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٤٢﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ

اللہ کی یاد کچھ یوں ہی سی کرتے ہیں ٨٩٠ درمیان ہی میں معلق

ع ۱۷

٨٨٤ (کہ آخرت میں ایک کا چھپا ہوا اور ڈھکا ہوا کفر اور دوسرے کا کھلا ہوا کفر دونوں یکساں روشن وظاہر ہوں گے) اسی سے یہ تعلیم بھی نکلتی ہے کہ اصلی جوڑ اور ساتھ تو کافروں اور منافقوں کا ہے حقیقۃً مناسبت انہی دونوں کے درمیان باہم ہے۔ پاک وصالح انسانوں یعنی مسلمانوں کا ان لوگوں کے ساتھ مجلسی اختلاط ہی کیسا؟ جَامِعُ۔ یہاں مضارع بمعنی جمع کے معنی میں ہے۔ والاصل جامعٌ بالتنوین محذوف استخفافا فانه بمعنی یجمع (قرطبی) ٨٨٥ منافقین کی پوری ذہنیت آشکارا و بے نقاب کی جارہی ہے۔ ان لوگوں کا بھی عجب حال تھا۔ جب جنگ چھڑتی تو منافقین کا گروہ لشکر اسلامی کے ساتھ ساتھ ہوتا اگرچہ کافروں سے قتال بہت کم کرتا یا برائے نام ہی کرتا تو اگر مسلمانوں کو فتح ہو جاتی تو یہ مسلمانوں کے پاس آکر اپنی شرکت ومعیت و رفاقت کا حق جتلاتے اور مال غنیمت وغیرہ میں سے اپنا حصہ طلب کرتے لیکن اگر اس کے برعکس کبھی اتفاق سے کافروں ہی کے ہاتھ میدان رہتا تو یہ جھٹ ان کے پاس جاکر ان پر اپنا احسان رکھتے کہ دیکھو فلاں موقع پر لشکر اسلامی کا پلہ بھاری ہو رہا تھا۔ اور تم شکست کھانے ہی کو تھے کہ ہم آڑے آگئے۔ ہم نے اپنی کوشش وتدبیر سے تمہارا پلہ وزن دار کرلیا اور ہاری ہوئی لڑائی جتادی۔ تو اب ہمارا حصہ دلواؤ۔ حربی کافروں سے مسلمانوں کی مخبری کرنا، جاسوسی کرنا سب اسی کے تحت میں آجاتا ہے۔ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ۔ یعنی تمہارے لئے آفت ومصیبت کے انتظار میں رہتے ہیں۔ ای ینتظرون بکم یعنی الدوائر والشدة (ابن عباس) أَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ۔ معیت کا تعلق سفر جہاد سے ہے۔

أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ۔ یہاں صیغہ جمع متکلم میں منافقین اپنے کو مجموعۂ لشکر اسلام میں شامل کر رہے ہیں۔ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منافقین کو مال غنیمت میں حصہ نہیں ملتا تھا جبھی وہ اسے مانگتے اور اس کیلئے مطالبہ کرتے۔ والآية تدل على ان المنافقين كانوا لا يعطونهم الغنيمة ولهذا اطلبوها (قرطبی) فتح کے لفظ میں شان عظمت ہے، اسلئے مسلمانوں کی کامیابی کو اس سے تعبیر کیا گیا اور نصیب میں حقارت اور پستی ہے۔ اسلئے کافروں کی کامیابی کے لئے یہ لفظ دیا گیا۔ سمّی ظفر المسلمين فتحًا تعظيمًا لشأن المسلمين وسمّی ظفر الكافرين نصيبًا تخسيسًا لحظ الكافرين (کشاف) ٨٨٦ یعنی آج تو اظہار اسلام کر کے ہر قانون کی گرفت سے بچ جاتے ہیں اور مسلمانوں میں ملے جلے رہتے ہیں لیکن قیامت میں کیا کرینگے۔ وہاں تو ان کا کفر علانیہ ظاہر ہوگا اور مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر رہیں گے۔ ٨٨٧ (اپنے اُسی آخری اور اُخروی فیصلہ میں) آخرت دارالجزاء ہے۔ وہاں اس دارالعمل کی طرح کسی تکوینی امتحان، التباس واشتباہ کی گنجائش نہیں۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بہرحال وصورت الگ ہو کر رہیگا۔ ٨٨٨ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اسی دنیا میں کافروں کو مومنوں پر غالب نہ آنے دیگا۔ حجت عقلی وشرعی کے لحاظ سے۔ قال علی بمعنی یوم القیمة یوم الحکم وکذا قال ابن عباس ذالك يوم القيمة قال ابن عطية وبهذا قال جميع اهل التاويل (قرطبی) المراد بالسبيل الحجة (بیضاوی) ای حجة شرعية لا عقلية (بحر) ای حجة عقلية ولا شرعية يستظهرون بها الا ابطلت ودحضت (قرطبی) اس نفی غلبہ وولایت کفار کا تعلق اسی عالم تکوینی سے مان کر بعض فقہاء نے اس سے ذیل کے استنباطات کئے ہیں:۔

(١) کافر کی گواہی اگر مسلمان کے مقدمہ میں ہو تو قبول نہ کی جائے گی۔ (٢) کافر کی ولایت کسی مسلم نابالغ کے نکاح میں جائز نہ ہوگی۔ (٣) کافر کو کسی مسلمان کی وراثت نہ پہنچے گی۔ ٨٨٩ (ان کی چالوں کو ناکام دیکھ کر، ان کی چالوں کی سزا ان کو دے دے کر) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ۔ یعنی اپنے اسلام کا جھوٹا اقرار کر کے اللہ تک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اپنے حمق سے یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جس طرح دنیا میں ان کے ساتھ معاملہ ہو رہا ہے، اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا۔ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ خداع کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد مجازات خداع ہوتی ہے۔ الخداع من الله مجازاتهم على خداعهم اولياءه ورسله (قرطبی) سمی الجزاء عن العمل باسمه على مجاوزة الكلام (جصاص) ای مجازيهم بالعقاب على خداعهم (بیر) ای هو الذی يستدرجهم فی طغيانهم وضلالهم ويخذلهم عن الحق والوصول اليه فی الدنيا وكذلك يوم القيمة (ابن کثیر) ٨٩٠ یعنی یہ منافقین اول تو نماز پڑھتے ہی کہاں ہیں۔ جب مسلمانوں کے مجمع میں شرما شرمی پڑھنا ہی پڑی تو صرف ہیئت ظاہری کے لحاظ سے کچھ دیا ٹھک بیٹھک سی کرلی۔ قَامُوْا كُسَالٰى۔ عبادت میں نشاط، مستعدی اور چستی تو صرف ایمان و اعتقاد کی قوت سے پیدا ہوتی ہے، جب سرے سے یہی مفقود ہو تو ظاہر ہے کہ کاہلی اور بددلی کیسے نہ پیدا ہوتی۔ یہاں تو مقصود تمامتر ظاہرداری تھی، خلقت کی نظر میں اپنے کو مسلمان ظاہر کرنا۔ إِلَّا قَلِيْلًا۔ عارفین نے کہا ہے کہ یہ عمل قلیل ہی اگر اللہ کے لئے ہوتا تو اللہ اسے کثیر ہی قرار دیتا۔ قال الحسن لو كان ذالك القليل لله تعالىٰ لكان كثيرا (مدارک) انما سماه قليلا لانه لغير وجهه فهو قليل فی المعنى وان كثر الفعل منهم (جصاص) يُرَآءُوْنَ النَّاسَ محض لوگوں کے دکھاوے کو، تاکہ یہ بھی مسلمان ہی سمجھے جائیں اور ان کے ساتھ بھی مسلمانوں ہی کی سی مراعات ہوتی رہیں۔ ریاء کے معنی ہیں کسی اچھی چیز کو دکھاوے کے لئے اختیار کرنا نہ کہ حکم الٰہی کی تعمیل میں۔ الرياء اظهار الجميل ليراه الناس لا لاتباع امر الله (قرطبی) إِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ۔ جب نماز جیسے اہم ترین رکن اسلام کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو دوسری عبادتوں کے ساتھ جو معاملہ ہوگا، ظاہر ہی ہے۔ نماز کی تصریح خصوصیت کے ساتھ اسلئے کی گئی ہے کہ اعمال میں نماز ہی ایمان واسلام کا ظاہری معیار ہے۔ فقہاء نے کہا ہے کہ جس نماز ریائی کا یہاں ذکر ہے اور جو معصیت کے درجہ میں ہے اور جس نماز کا دہرانا لازم ہے وہ وہ ہے جو عقیدہ کے بغیر لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کیلئے پڑھی جائے کہ اس سے لوگ مسلمان سمجھنے لگیں۔ باقی جو نماز اس ارادہ سے پڑھی جائے کہ لوگ اسے دیکھ کر اسکے مومن اور مقبول الشهادة ہونے کی اور اسکے جواز امانت کی شہادتیں دیں تو ایسی نماز اس وعید کے تحت میں نہیں آتی۔ یعنی انهم يفعلونها ليراها الناس وهم يشهدون ولا يفعلوا فهذا هو الرياء والشرك فاما ان صلاها ليراها الناس يعني ويرونه فيها فيشهدون له بالايمان فليس ذالك الرياء المنهي عنه وكذالك لو اراد بها طلب المنزلة والظهور لقبول الشهادة وجواز الامانة لم يكن عليه حرج وانما الرياء والمعصية ان يظهرها صيد الدنيا وطريقا الى الاكل بها فهذه نية لا تجزى وعليه الاعادة (ابن عربی)

لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ

نہ پورے اِدھر ہی کے ہیں نہ پورے اُدھر ہی کے اور جسے اللہ گمراہ رکھے تو

فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝۱۴۳ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا

اُس کے لئے تو کوئی راہ نہ پائے گا ۷۹۱ اے ایمان والو، مومنوں کو چھوڑ کر

الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ

کافروں کو دوست مت بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ

اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۴۴ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ

اپنے اُوپر اللہ کی حجت صریح قائم کرلو ۷۹۲ یقیناً منافق دوزخ کے

فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝۱۴۵ لا

سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے اور تو ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا، ۷۹۳

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ

البتہ جو لوگ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں اور اللہ کا سہارا پکڑے رہیں اور اپنے

اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ

دین کو اللہ کے لئے خالص کرلیں تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے ۷۹۴ اور اللہ

يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۴۶ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ

مومنوں کو عنقریب اجرِ عظیم دے گا ۷۹۵ اللہ کو تمہارے عذاب سے کیا کرنا

بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝۱۴۷

ہے، اگر تم شکرگزاری کرو اور ایمان لے آؤ اللہ تو بڑا قدردان ہے بڑا علم والا ہے ۷۹۶

منزل ۱

۷۹۰ (ایمان اور ہدایت کی) مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ۔ یعنی کافروں اور مومنوں کے درمیان۔ لَآ اِلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ وَلَآ اِلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ یعنی ظاہر اور صورت کے اعتبار سے مومن اور معنی اور حقیقت کے لحاظ سے کافر۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ۔ اللہ کا یہ فعل اضلال اس کی سنت تکوینی کے مطابق ہے جس کے ماتحت وہ ہر عزم عمل پر عمل کا ترتب کر دیتا ہے۔ ۷۹۱ (اپنے مجرم اور مستحق سزا ہونے کی) اتنی صریح وعیدوں کے باوجود ہم لوگ جو بلا ضرورت ہر قسم کے غیر مسلموں، بے دینوں، بد دینوں سے دوستی اور صحبت کے تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں تو ہم لوگوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اللّٰھم احفظنا۔

لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ۔ کافروں کے تحت میں پوری طرح وہ چھپے ہوئے کافر بھی داخل ہیں جنہیں منافقین کہا گیا ہے۔ اقتضت الاٰیۃ النھی عن الاستنصار بالکفار والاستعانۃ بھم و الرکون الیھم والثقۃ بھم (جصاص) فقہاء حنفیہ نے ذمیوں کو وکیل مال بنانا اور اُن سے شرکت تجارت (مضاربت) میں بھی کراہت کی ہے۔ وقد کرہ اصحابنا توکیل الذمی فی الشراء والبیع ودفع المال الیہ مضاربۃ وھٰذہ الاٰیۃ دالۃ علٰی صحۃ ھٰذا القول (جصاص) ۷۹۲ (کہ انہیں بچا سکے یا اُن کی سزا کچھ ہلکی ہی کرا سکے) فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ۔ ہر منافق اصلاً کافر ہی ہوتا ہے۔ منافق کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے جرم کفر پر ایک مزید جرم مکر و فریب کا اضافہ کئے ہوئے ہے اس لئے اگر اُسے کھلے ہوئے کافر سے سخت تر سزا ملے تو یہ عین مقتضائے عقل ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا۔ سے فقہاء مفسرین نے محض گنہگاروں کی شفاعت پر استدلال کیا ہے۔ اور تقریر استدلال یہ ہے کہ یہ عدم نصرت کی تہدید چونکہ اہل نفاق کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ جو منافق نہ ہوں گے، اُن کی نصرت و شفاعت ہو سکے گی۔ واحتج اصحابنا بھٰذہ الاٰیۃ علٰی اثبات الشفاعۃ فی حق الفساق من اھل الصلوٰۃ (کبیر) ۷۹۳ (جنت اور درجات جنت میں) مومنین کے ساتھ ان نئے تائبین کا ذکر لانے سے مومنین ہی کی تکریم اور شرف مرتبت نکلتی ہے۔ اوقع اجر المؤمنین فی التشریف لانضمام المنافقین الیھم (کبیر) مع المومنین کے معنی من المومنین کے بھی کئے گئے ہیں۔ قال الفراء ای من المومنین (قرطبی) تَابُوْا۔ یعنی اپنے عقائد شرک و کفر سے توبہ کرلیں۔ اَصْلَحُوْا یعنی اپنے افعال و احوال کو شریعت کے مطابق و ماتحت کرلیں۔ وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ۔ اور اس اعتصام باللہ کے تحقق کے لئے کافروں کی رفاقت کا ترک لازمی ہے۔ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ۔ اللہ کے ساتھ اخلاص کی شرط منافقت کی جڑ کاٹ رہی ہے۔ فقہاء نے آیت کے اس جزء سے یہ نکالا ہے کہ اعمال تقرب و عبادت ہر قسم کے شائبۂ ریاء اور ہر قسم کے دنیوی معاوضہ و نفع سے خالی ہونا چاہیے۔ یدل علٰی ان کل ما کان من امر الدین علٰی منھاج الحق فسبیلہ ان یکون خالصًا للہ سالمًا من شوب الریاء وطلب عرض من الدنیا (جصاص) اور یہ بھی نکالا ہے کہ نماز اذان و حج وغیرہ اعمال عبادات پر معاوضہ قبول کرنا جائز نہیں۔ ھٰذا یدل علٰی امتناع جواز اخذ شیء من اعراض الدنیا علٰی ما سبیلہ ان لا یفعل الا علٰی وجہ القربۃ من نحو الصلوٰۃ والاذان والحج (جصاص) پوری آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ منافقین جو اس قدر وعیدوں کے مستحق ہیں، وہ بھی اللہ کی رحمت و مغفرت سے ہمیشہ کیلئے مایوس نہ ہو جائیں۔ توبہ اور اصلاح حال تو ان کی اپنی اختیاری چیز ہے۔ جب اور جس وقت چاہیں، سیدھی راہ اختیار کر کے مومنین کی معیت حاصل کر سکتے ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا گناہ بھی ایسا نہیں جو موروثی یا پیدائشی ہو یا اب ناقابل اصلاح و تلافی ہو۔ ۷۹۴ (اور جب یہ تائبین اور نومسلمین، مومنین کے ساتھ ہوئے تو ظاہر ہے کہ اجر عظیم ان کے حصہ میں بھی آکر رہیگا) اس میں سبق ہے اُن خاندانی اور پشتینی مسلمانوں کیلئے جو آج ہر کفر و فسق سے تائب نومسلم یا نو صالح کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ اسلامی اور ایمانی برادری میں نئے شامل ہونے والے بھائی ہیں جو اور زیادہ عزت و اکرام کے مستحق ہوتے ہیں۔ ۷۹۵ خطاب منافقوں سے ہے۔ انہیں بتایا ہے کہ تمہاری سزا دینے پر اللہ تعالیٰ کا کوئی کام تو معلق ہے نہیں۔ یہ تو محض تمہارا کفر اور کفران نعمت ہے جو تمہیں جنت کی نعمتوں سے استفادہ کے ناقابل بنائے ہوئے ہے۔ اگر اپنے ان عقائد کو چھوڑ دو تو رحمتِ حق تو خود بخود تمہیں آئے گی۔ اس میں تعلیم بھی آگئی کہ اسلام کا خدا مشرک اور جاہلی قوموں کے خونخوار و سفاک دیوی دیوتاؤں کی طرح نہیں جسے بندوں کے آزار دہی ہی میں لطف آرہا ہے۔ شَاكِرًا۔ یعنی خدمت اور عبودیت اور اخلاص کا قدر دان۔ عَلِيْمًا۔ یعنی ہر ایک کے درجۂ اخلاص سے واقف۔ آیت سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ مومن شاکر عذاب الٰہی سے بالکل دُور رہے گا۔ فقہاء مفسرین نے آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ صاحب کبیرہ پر عذاب نہیں ہے۔ قال اصحابنا دلت ھٰذہ الاٰیۃ علٰی انہ لا یعذب صاحب الکبیرۃ (کبیر)

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا
اللہ بُری بات کے ظاہر کرنے کو (کسی کے لئے بھی) پسند نہیں کرتا سوا
مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿١٤٨﴾ اِنْ تُبْدُوْا
مظلوم کے، اور اللہ تو ہے ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا اگر تم کسی بھلائی کو ظاہر
خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
کرو یا چھپاؤ یا کسی بُرائی سے درگزر کر جاؤ تو اللہ تو (ہر صورت) بڑا
كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿١٤٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ
معاف کرنے والا ہے بڑا قدرت والا ہے۔ بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے پیمبروں سے کفر کرتے ہیں اور
رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ
چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے پیمبروں کے درمیان فرق رکھیں اور یہ
وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ
کہتے ہیں کہ ہم کسی پر تو ایمان لائے ہیں اور کسی کے ہم منکر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ
اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿١٥٠﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ
ایک راہ درمیانی نکالیں تو یہی لوگ حقیقی کافر
حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿١٥١﴾ وَ الَّذِيْنَ
ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے ایک عذاب رسوا کرنے والا تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ
اللہ اور اس کے پیمبروں پر ایمان لائے، اور وہ لوگ اُن کے درمیان فرق بھی نہیں کرتے،

۴۹۶ یہ اخلاق کی اصطلاح میں غیبت و بدگوئی کو اور قانون کی زبان میں ہتک عزت کو بالکل ناجائز قرار دے دیا ہے۔ اور فرد و جماعت، شخص و ملت دونوں کے ہاتھ میں فلاح و اصلاح کی ایک بڑی اصل دے دی ہے۔ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ کے تحت میں پس پشت بھی کسی کے عیب کی تشہیر آگئی اور اس کے روبرو تلخ کلامی بھی۔ بلا ضرورت اور بلا مصلحت شرعی کسی کی بدگوئی کسی حال میں بھی جائز نہیں، نہ سامنے نہ پیچھے۔ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ مظلوم البتہ اپنے دل کا بخار ایک حد تک کر بھی نکال سکتا ہے، اور حاکم کے سامنے فریاد بھی لے جاسکتا ہے۔ انسان کے طبعی تقاضوں اور اضطراری یا نیم اضطراری ضرورتوں کا اس حد تک لحاظ بجز شریعت اسلامی کے اور کس نے کیا ہے؟ فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ جھوٹی بات کی شہرت مظلوم کو بھی جائز نہیں ——— یہیں مظلوموں کے ساتھ ساتھ ظالموں کے حق بھی اُسی سچی، فطری، الٰہی شریعت نے تسلیم کرلئے۔ سَمِيْعًا۔ اس میں ایک طرف تو ظالم کو تنبیہ ہے کہ مظلوم کہیں فریاد لے کر جائے نہ جائے، اللہ تو بہر صورت اس کی سُن ہی رہا ہے۔ اور دوسری طرف مظلوم کو بھی ترغیب دی ہے کہ خلق کے آگے خواہ مخواہ زیادہ رونا گانا نہ پھرے، یقین رکھے کہ اللہ تو سننے والا ہے ہی۔ عَلِيْمًا۔ یہ صفت لاکر بھی ظالم و مظلوم دونوں کو یاد دلادیا ہے کہ کوئی زبان سے نکالے یا نہ نکالے، اللہ پر تو ہر ظلم کی نوعیت و حقیقت عیاں ہی ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے انتقام کی اجازت نکل رہی ہے، جس کی ایک جزو شکایت بھی ہے۔ اور ضعفاء کی اس میں بڑی رعایت ہے کہ اس سے دل کا کینہ دُور ہوجاتا ہے۔ ۴۹۷ (جو بہر صورت افضل اور اولیٰ ہے) انسان اپنے نفس کو ٹٹولے تو نظر آئے گا کسی کے ساتھ حُسن سلوک کرنے یا اس پر مال خرچ کرنے سے کہیں زیادہ شاق نفس پر یہ گزرتا ہے کہ کوئی ہمیں دکھ پہنچائے اور ہم اُس سے درگزر کرجائیں، اور انتقام نہ لیں۔ اس لئے فعل خیر سے الگ اور ممتاز کرکے اس وصف چشم پوشی اور عدم انتقام کو بیان کیا ہے۔ فندب الی العفو و رغب فیه (قرطبی) ۴۹۸ اخلاقی حیثیت سے تین مرتبے الگ الگ ہیں۔ اور انہیں یہاں کیسی صحیح ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ انسان نے نیکی کی، ساتھ ہی وہ اس کا اظہار و اعلان بھی کردیتا ہے خلق سے داد لینے کی خواہش ایک حد تک طبعی ہے۔ ایک درجہ نیکی کا یہ بھی ہوا نیکی یہ بھی ہوئی مگر نکلی قسم کی بلندی کی سطح کی۔ اَوْ تُخْفُوْهُ۔ اونچا مرتبہ یہ ہے کہ نیکی کرے اور خلق سے داد و صلہ کی پرواہی نہ رکھے، بلکہ اُسے خلق کے علم میں آنے ہی نہ دے اور مقصود اس سے تمام تر رضاء الٰہی ہی رکھے۔ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو بُرائیاں پیش آئیں، اور وہ انہیں نظر انداز کرجائے اور بُرائی کرنے والے سے بدلہ نہ لیا جائے۔ یہ نفس کے لئے بہت ہی شاق ہے۔ اور اس کا مرتبہ سلوک و اخلاق کے منتہی ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ عَفُوًّا۔ اس صفت کو لاکر یہ یاد دلادیا کہ درگزر کی صفت تو صفات کمالیہ الٰہیہ میں سے ہے۔ کیا خوب ہو جو بندہ بھی اپنے کو اسی رنگ میں رنگ لے! قَدِيْرًا۔ یہ لفظ لاکر ادھر اشارہ کردیا کہ بندہ بیچارہ انتقام لے ہی کیا سکتا ہے۔ انتقام پر قدرت کاملہ تو اللہ ہی کو حاصل ہے، اور وہ اس کمال قدرت کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتا رہتا ہے ——— بندوں کو عفو و درگزر کی راہ پر لانے کا کتنا مؤثر و حکیمانہ طریقہ یہ ہے! امام رازیؒ جن کی نکتہ رسی قرآن فہمی میں قابل صد رشک ہے، یہاں پر خوب بات فرمائی ہے کہ آیت کے ان دو مختصر سے فقروں میں سارا خلاصۂ اخلاق و سلوک آگیا۔ فدخل فی هاتین الکلمتین جمیع انواع الخیر واعمال البر (کبیر) مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس طرح پہلی آیت میں ضعفاء کی رعایت تھی، یہ آیت اہل ہمت کے مناسب حال ہے۔ اس میں مصلحت عروج الی القرب ہے۔ ۴۹۹ یہ ارشاد کن لوگوں کی طرف ہے؟ اس باب میں بہت کچھ بحث ہوئی ہے۔ بہرحال اتنا تو صاف ہے کہ اصل ارشاد یہود کی جانب ہے جو انبیاء سابقین میں سے بہتوں کے تو قائل تھے لیکن اپنے ہی سلسلہ کے انبیاء میں سے حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ کے منکر تھے۔ اور پھر نبوت مصطفوی کے۔ لیکن قرآن کے الفاظ عام ہیں اور ان کے تحت میں نہ صرف مسیحی آجاتے ہیں، جو نبوت مصطفوی کے تو صاف منکر، اور رسالت مسیحؑ کے بھی منکر ہو کر الوہیت مسیح کے قائل ہوگئے ہیں۔ بلکہ آج کل کے بہت سے "آزاد خیال" اور "روشن خیال" بھی اسی ذیل میں آجاتے ہیں۔ یورپ میں ایک فرقہ ... (خدا پرستوں) کا کہلاتا ہے، اور ہندوستان میں برہمو سماج ہے۔ یہ لوگ توحید کے تو قائل ہیں لیکن عقیدۂ وحی و نبوت کے منکر ——— یہ سب مثالیں اسی ناقص اور غلط ذہنیت کی ہیں، جسے اسلام بڑھانا اور پیدا کرنا نہیں، بلکہ مٹانا اور فنا کرنا چاہتا ہے۔ ۵۰۰ جیسے دہلی کے ایک مغل بادشاہ اکبر نے کفر و اسلام کو ملا جلا کر ایک "دین الٰہی" ایجاد کیا تھا، اور پھر تین پشتوں کے بعد ایک اور شہزادہ دارا شکوہ نے بھی کچھ اسی قسم کی کوشش شروع کی تھی۔ اور بعض ملحد طبع آج بھی شرک و توحید، کفر و اسلام کو مخلوط و ممزوج کرکے طرح طرح کے خوشنما ناموں کے ساتھ ایک نئے دین کی ترکیب و اختراع کی فکر میں لگے رہتے ہیں ——— ان لوگوں کی نظر دین اسلامی کی وحدت، اور اس کے عقائد و ارکان کے اندرونی نظم و ارتباط پر سرے سے ہے ہی نہیں! ۵۰۱ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ایسے لوگوں کا مرتبہ کافروں سے تو بہرحال بہتر ہوگا۔ نہیں بلکہ یہ لوگ پکے کافر ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ جملہ کی ترکیب خود ہی زور پیدا کرنے کے لئے ہے۔ حَقًّا کا اضافہ تاکید مزید کے لئے ہے۔ ای هم الکاملون فی الکفر (کشاف) ای لاعبرة بایمانهم هذا (بیضاوی) وهو تاکید لمضمون الجملة الخبریة (بحر) اولٰئک هم الکافرون کفرا کاملا ثابتا حقا یقینا (کبیر) ۵۰۲ ایسے لوگوں کے خیالات و نظریات کی تہ میں اصلی روگ اپنی بڑائی کا ہوتا ہے شعوری یا لاشعوری طور پر، بہرحال یہ لوگ سمجھتے یہی ہیں کہ اُن کی عقل وحی الٰہی کے مقابلہ میں زیادہ وزن دار ہے۔ اور پیمبروں سے (نعوذ باللہ) جو کوتاہیاں رہ گئیں، اُن کی تلافی یہ اپنی عقل آرائیوں سے کردیں گے ——— اسی کبر و خود بینی کی سزا انہیں آخرت میں ملے گی کہ علاوہ جسمانی تعذیب کے یہ خلق کی نظر میں ذلیل و رسوا ہو کر بھی رہیں گے۔ ۵۰۳ یعنی یہ نہیں کرتے کہ کسی پیمبر کو مانیں، اور کسی کو نہ مانیں۔ قرآن مجید نے وحدت وحی پر بڑا زور دیا ہے، اور سارے انبیاء کو ایک مستقل نظام و سلسلہ کے اندر منسلک قرار دیا ہے۔

۸۰۴ سَوْفَ یہاں قربِ زمانی کے لئے نہیں جزم و تیقن کے لئے ہے۔ معناہ ان ایتاءھا کائن لا محالۃ وان تاخر زمانہ، فالغرض بہ توکید الوعد وتحقیقہ لا کونہ متاخرا (کبیر)
متکلمین نے آیت سے معتزلہ کا رد بھی نکالا ہے جو مرتکب گناہ کبیرہ کے دوام عذاب کے قائل ہیں، حالانکہ آیت میں صاف مضمون موجود ہے کہ ایمان محض پر بھی اجر ملے گا۔ والأیۃ تدل علی بطلان
قول المعتزلۃ فی تخلید المرتکب الکبیرۃ لانہ اخبر ان من امن باللہ ورسلہ ولم یفرق بین احد منھم یؤتیہ اجرہ ومرتکب الکبیرۃ فیمن من امن باللہ ورسلہ ولم یفرق بین احد فیدخل
تحت الوعد (مدارک)۔ تمسک اصحابنا بھذہ الأیۃ فی اثبات العفو وعدم الاحباط فقالوا ان تعالٰی وعد من امن باللہ ورسلہ بان یؤتیھم اجورھم والمفھوم یؤتیھم اجورھم علی ذالک الایمان (کبیر)

أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ
تو ایسے لوگوں کو اللہ ضرور اُن کا اجر دے گا، اور اللہ تو ہے ہی بڑا مغفرت والا
ع ۲۱
غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۱۵۲﴾ يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ
بڑا رحم والا ۔ آپ سے اہل کتاب فرمائش کرتے ہیں کہ آپ اُن کے اوپر
عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ
ایک نوشتہ آسمان سے اتروا دیں ۸۰۵ سو یہ تو موسٰیؑ سے اس سے بھی بڑی فرمائش
مِنْ ذَٰلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ
کر چکے ہیں ۸۰٦ (ان سے) یہ بولے تھے کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو، سو اُن کی (اسی زیادتی پر
الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ
انہیں کڑک بجلی نے آپکڑا پھر بعد اس کے کہ اُن کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آچکی تھیں انہوں
مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَٰلِكَ ۚ وَآتَيْنَا
نے گوسالہ کو (معبود) تجویز کر لیا۔ لیکن ہم نے اس سے (بھی) درگزر کیا اور ہم نے موسٰیؑ کو
مُوسَىٰ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ
ایک صریح اقتدار عطا کیا ۸۰۷ اور ہم نے اُن کے اوپر طور کو معلق کر دیا تھا
بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
ان سے قول و قرار کے لئے، اور ہم نے اُن سے کہا کہ دروازہ (شہر) میں داخل ہو عاجزی کے ساتھ
وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ
اور ہم نے اُن سے کہا کہ سبت کے بارہ میں زیادتی نہ کرنا، اور ہم نے ان سے

۸۰۵ یہ فرمائش کرنے والے یہود مدینہ تھے خصوصاً کعب بن اشرف اور اس کی پارٹی۔ ای کعب واصحابہ (معالم) یہود کہتے تھے کہ ہم ایسی وحی کے قائل نہیں جو فرشتہ کے ذریعہ سے قلبِ نبی پر نازل ہو۔ ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ ہمارے پیمبر موسٰیؑ پر لکھے لکھائے ہوئے احکام عشرہ نازل ہوئے تھے تو اگر اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہو تو اسی طرح کا کوئی لکھا لکھایا صحیفہ پیش کرو! قالت الیھود ان کنت صادقا فأتنا بکتاب من السماء جملۃ کما جاء موسٰی بالکتاب (بحر عن السدی) سأل الیھود رسول اللہ صلعم ان ینزل علیھم کتابا من السماء کما نزلت التوراۃ علی موسٰی مکتوبۃ (ابن کثیر عن محمد بن کعب القرظی) (معالم و قتادہ) فأتنا بکتاب من السماء جملۃ کما جاء به موسٰی (بالالواح) (کبیر) مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے اس شخص کی مذمت نکل رہی ہے جو برکات سماوی کو شیخ کے اختیار میں سمجھ کر اس سے افاضہ کی درخواست کر رہا ہے۔ ۸۰٦ سو ایسی قوم کی ایسی فرمائشیں کچھ انوکھی اور نادر نہیں (ضمناً جواب بھی نکل آیا کہ حضرت موسٰیؑ تو خود ہی ایسی چیز لائے تھے پھر اس پر ان ظالموں نے کب بس کیا؟ اُن سے تو یہ فرمائش کر دی کہ براہِ راست اللہ میاں کا دیدار ہی ہمیں کرا دیجئے۔ یہ سارے واقعات اس غرض کے لئے یاد دلا دیے گئے کہ ان لوگوں کی ساری قومی تاریخ ہی ضد و عناد سے بھری پڑی ہے۔ ایسی فرمائشوں سے اُن کا مقصود تحقیقِ حق نہیں بلکہ محض مجادلہ و مکابرہ ہے۔ ھذا یدل علی ان طلب ھؤلاء لنزول الکتب علیھم من السماء لیس لاجل الاسترشاد بل لمحض العناد (کبیر) ۸۰۷ چنانچہ وہ محض نبی و رسول ہی نہ تھے بلکہ اپنی قوم کے حاکم اعلٰی اور صاحب اقتدار لیڈر بھی تھے) أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً۔ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ۔ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ۔ ان سب واقعات پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔
محققین نے کہا ہے کہ آیت میں اُس شخص پر رد نکل رہا ہے، جو وقوعِ رؤیت کا اسی دنیوی زندگی میں قائل ہے۔ یدل علی الانکار علی من یعتقد وقوع الرؤیۃ فی النشأۃ الدنیویۃ (کذا)
بِظُلْمِهِمْ میں ب سببیہ ہے۔ بسبب ظلمھم (بیضاوی) ثُمَّ یہاں تاخر زمانی کے لئے نہیں استبعاد کے لئے ہے یعنی ایسی بیہودہ فرمائشیں ہی کیا کم تھیں کہ اس سے بڑھ کر حرکت یہ کہ گوسالہ پرستی کی شروع کر دی۔ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ۔ یعنی حضرت موسٰیؑ کے پیش کئے ہوئے دلائل و معجزات جاننے، سمجھنے اور دیکھنے کے بعد۔ شرک خصوصاً اپنی قبیح ترین صورت گوسالہ پرستی میں یوں بھی بُرا ہی تھا، فطرتِ سلیم خود اس سے اِبا کرتی ہے لیکن پیمبرِ برحق کے لائے ہوئے دلائلِ قوی اور شواہدِ بیّن کے بعد تو اس پستی میں گرنا بدبختی کی انتہا ہے۔ ۸۰۸ (ان احکام نیز دوسرے احکام کی تعمیل کے لئے) رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ۔ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا۔ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ۔ ان سب واقعات پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔
بِمِيثَاقِهِمْ میں ب اظہارِ غرض و غایت کیلئے ہے۔ ای بسبب میثاقھم لیقبلوہ (بیضاوی) والباء للسبب (کبیر) سُجَّدًا یہاں سجدۂ شرعی مُراد نہیں۔ بلکہ سجدہ اپنے لفظی معنی میں ہے یعنی تواضع کے ساتھ۔ ای متطامنین خاضعین۔ (مدارک)

مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَكُفۡرِهِمۡ

سخت قول و قرار لیا تھا ۔ سو ہم نے بسبب کچھ اُن کی عہد شکنی اور بسبب آیاتِ الٰہی سے

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ

اُن کے کفر کے اور بسبب اُن کے قتلِ ناحق انبیاء کے اور بسبب اُن کے اس قول کے کہ ہمارے

قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا

قلوب محفوظ ہیں، (ہم نے انہیں سزا میں مبتلا کیا) نہیں بلکہ (یہ ہے کہ) اللہ نے اُن پر مہر لگا دی،

يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفۡرِهِمۡ وَقَوۡلِهِمۡ عَلٰى

بسبب اُن کے کفر کے سو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت تھوڑا سا اور نیز بسبب اُن کے کفر کے اور بسبب اُن کے

مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا

مریم پر بہتانِ عظیم رکھنے کے اور بسبب اُن کے اس قول کے کہ ہم نے

الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ

عیسیٰ ابن مریم کو مار ڈالا، جو مسیح اور اللہ کے پیمبر تھے حالانکہ نہ وہ آپ کو مار ڈال سکے

وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ

اور نہ آپ کو سولی ہی پر چڑھا پائے بلکہ اُن پر شبہ ڈال دیا گیا اور یہ لوگ آپ کے بارہ

اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ

میں اختلاف کر رہے ہیں وہ آپ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، ان کے پاس

عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۙ ﴿۱۵۷﴾

کوئی علم (صحیح) تو ہے نہیں ہاں بس گمان کی پیروی ہے، اور یقینی بات ہے کہ انہوں نے آپ کو مار نہیں ڈالا

منزل

۸۰۹ یہود کے نقضِ میثاق اور کفر بآیاتِ الٰہی اور انبیاء کے قتلِ ناحق پر اور اُن کے قول قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ان سب پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ کی اصل تقدیر کلام یوں ہے۔ فبنقضهم میثاقهم لعنّاهم۔ التقدیر فبنقضهم میثاقهم لعنّاهم عن قتادة وغیرہ (قرطبی) عربی اسلوبِ بیان میں ایسے محذوفات عام ہیں، مخاطبین کے علم کی بنا پر محذوف کر دیئے جاتے ہیں۔ حذف هذا لعلم السامع (قرطبی) قال ابن عطیة وحذف جواب هذا الکلام بلیغ منوط علی ذهن السامع (بحر) بِمَا میں مَا زائدہ تاکیدِ کلام کے لئے ہے۔ ما زائدة مؤکدة (قرطبی) ۸۱۰ یہ ٹکڑا ابتداءً کبھی نہیں لگتی، جزاءً ہی لگتی ہے۔ اور یہاں تو اس کی تصریح ہی موجود ہے۔ بکفرهم ای جزاء لهم علی کفرهم (قرطبی) ۸۱۱ (اور وہ بہت تھوڑا سا ایمان نجات کے لئے کافی نہیں) یہ ایمانِ قلیل غیر نافع اسی لئے ہوگا کہ یہ کُل انبیاء پر ایمان پر شامل نہیں۔ ای الا ایمانا قلیلا ای ببعض الانبیاء وذلک غیر نافع لهم (قرطبی) وهو غیر مفید لان الکفر بالبعض کفر بالکل (روح) اہلِ کتاب کا "ایمان" بس ایسا ہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو ماننے کا اقرار کیا، اور عیسیٰ علیہ السلام سے انکار کرتے رہے، حضرت اسحٰقؑ کی تصدیق کی لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کی تکذیب یا مثلاً حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کو تو مان لیا لیکن خود خاتم النبیینؐ سے انکار کئے گئے۔ ایسی حالت میں لفظ ایمان پر ایمانِ شرعی کا اطلاق ہو ہی گا نہیں۔ ایمان اصطلاحِ شریعت میں تو وہ ہے جو سارے سلسلۂ نبوت پر ہو، ورنہ ایک نبی پر ایمان لا کر دوسرے انبیاء سے انکار کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ لانہ ایمان لغوی لا شرعی (تھانوی) فقد بیّنّا ان من یکفر برسول واحد فانه لا یمکنه الایمان باحد من الرسل البتة (کبیر) ۸۱۲ (کہ نعوذ باللہ وہ بدوضع تھیں) بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۔ یہود کی کتابوں میں ایسی ایسی گندہ روایتیں اس پاک سرشت خاتون کی بابت لکھی ہوئی ہیں کہ ان صفحات پر بغرض رد بھی نقل ہونے کے قابل نہیں۔ قرآن مجید نے اس سارے طومار خرافات کی طرف بکمال بلاغت بہتان اور بہتانِ عظیم لا کر اشارہ کر دیا۔ مَرْيَمَ پر حاشیے پ۳ میں گزر چکے۔ یہ عمران کی صاحبزادی اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ نکاح بہ روایاتِ تاریخی یوسف سے ہوا تھا۔ جو نجاری کا کارخانہ قائم کئے ہوئے تھے۔ دونوں بڑے عابد و خدا رسیدہ تھے۔ بِكُفْرِهِمْ ۔ ذکر یہود کی سزا کا چل رہا ہے کہ اُن پر جو یہ عذاب مسلط ہے فلاں فلاں اسباب سے ہے۔ یہاں کفر یہود سے مراد اُن کا کفر حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ہے۔ ای بعیسیٰ علیہ السلام (بیضاوی) ۸۱۳ یہ قول کس کا تھا؟ ظاہر ہے کہ یہود ہی کا تھا، جو اس پر خوش بھی ہو رہے تھے، اور اس کا دعویٰ بھی فخر کے ساتھ کر رہے تھے۔ الْمَسِيْحَ ۔ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۔ یہ دونوں الفاظ یہود کے نہیں، وہ انہی دونوں منصبوں یا مسیحیت اور رسالت ہی کے تو منکر تھے۔ قرآن حمید نے نفسِ واقعہ کے لحاظ سے ان کا صحیح منصب بیان کر دیا۔ قرآن مجید کا یہ اسلوبِ بیان عام ہے۔ هو اخبار من الله تعالیٰ بصفة عیسیٰ (بحر عن ابن عطیة) یجوز ان یضع الله الذکر الحسن مکان ذکرهم القبیح فی الحکایة عنهم (کبیر، کشاف) یحتمل ان یکون استئنافا من الله تعالیٰ بمدحه (بیضاوی) یحتمل ان الله وصفه بالرسول وان لم یقولوا ذلک (مدارک) اِنَّا قَتَلْنَا ۔ قتل کے اصل معنی روح کو جسم سے جُدا کر دینے کے ہیں، خواہ کسی طریقہ پر ہو۔ اسی کو اُردو محاورہ میں "ختم کر دینا" یا "کام تمام کر دینا" کہتے ہیں۔ اصل القتل ازالة الروح عن الجسد (راغب) قتل۔ ای اماته بضرب او حجر او سم او علة ... هو ازالة الروح عن الجسد کالموت (ابوالبقاء) اور امام قرطبی نے ایک دوسری آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ کے تحت میں لکھا ہے القتل هو کل فعل یفیت الروح وهو انواع من النحر والذبح والخنق والرضخ وشبهه ۔ یہاں اصطلاحِ فقہ کا قتل مراد نہیں جس کے معنی محض کسی دھاردار آلہ سے ہلاک کرنے کے ہوتے ہیں۔ تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کو سزائے موت اگرچہ رومی عدالت سے ملی۔ اور وہی ملکی عدالت نفاذِ سزا پر قادر تھی، لیکن آپ کو سزا دلوانے میں اور آپ کے لئے سزائے موت کا حکم سنوانے میں ہاتھ تمام تر یہود ہی کا کام کر رہا تھا۔ اسی لئے قرآن مجید نے بھی جو تاریخ کی دقیق حقیقتوں کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا، بالکل صحیح طور پر آپ کے قتل یا اقدامِ قتل کی ذمہ داری یہود ہی پر رکھی۔ انجیلیں اتنے جزو پر متفق المعنی (بلکہ ایک حد تک متفق اللفظ بھی) ہیں کہ رومی عدالت کا حاکم پیلاطیس آپ کو سزا دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس سے برابر بچ رہا تھا۔ یہ یہود ہی تھے جنہوں نے استغاثہ جھوٹا گڑھا، گواہیاں جھوٹی فراہم کیں اور بلوہ و فساد کی دھمکی دے دے کر اُسے حکم سنانے پر مجبور کر دیا۔ انجیل متی کا ایک مختصر سا بیان ملاحظہ ہو:۔ "...... جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا، بلکہ اُلٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے رُوبرو اپنے ہاتھ دھوئے، اور کہا میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں، تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو اُن کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے۔" (۲۷: ۲۴-۲۶) اسی کی تائید دوسری انجیلیں بھی کرتی ہیں، بلکہ لوقا میں تو اتنی تصریح اور زائد ہے کہ حاکم نے ملزم کو سزائے موت سے بچانے کی تین تین بار کوشش کی لیکن یہود نے ہر دفعہ اس کی بات کو رد کر دیا (۲۳: ۲۲) یہ بیانات تو مسیحیوں کے تھے۔ خود یہود کی لکھی ہوئی جو قدیم ترین حیاتِ مسیح دنیائے معلوم میں موجود ہے، اور جس کا ترجمہ انگریزی میں ... کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس میں اس واقعہ کو فخر کے ساتھ اپنی ہی جانب منسوب کیا ہے۔ (حاشیہ ...) انجیلوں میں جو پیشگوئیاں حضرت مسیحؑ کی زبان سے اپنے قتل ہونے کی بابت منقول ہیں، اُن میں بھی ساری ذمہ داری سرداران یہود ہی کے سر تھی ہے اور رومیوں یا حاکموں کا ذکر نہیں آتا۔ "اُس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں۔" (متی ۱۶: ۲۱) "پھر وہ انہیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابنِ آدم بہت دکھ اُٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اُسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے۔" (مرقس ۸: ۳۱) "ضرور ہے کہ ابنِ آدم بہت دکھ اُٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کریں۔ اور وہ قتل کیا جائے۔" (لوقا ۹: ۲۲) ۸۱۴ یعنی آپ کا کام تمام کر دینا تو الگ رہا یہود تو واقعۃً اتنا بھی نہ کر سکے کہ اُس زمانہ میں اس ملک میں جو طریقہ سزائے موت کا تھا اُسی تک پہنچ جاتے یعنی آپ کو سولی پر چڑھا تک نہ سکے۔ وَمَا صَلَبُوْهُ ۔ صلبوا کے اصل معنی محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کے ہیں چڑھا کر ختم کر دینے کے نہیں هو تعلیق الانسان للقتل (راغب) اُردو میں یہ مفہوم "سولی دینے" سے نہیں "سولی چڑھانے" ہی سے ادا ہوتا ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادرؒ اور علامہ تھانویؒ نے اپنے اپنے اُردو ترجموں میں بھی یہی مفہوم لیا ہے۔ ۸۱۵ یا یہود دھوکے میں ڈال دیئے گئے یا "حقیقت اُن پر مشتبہ ہو گئی"۔ یہ شبہ میں کون پڑ گئے یا حقیقت کن پر مشتبہ و ملتبس ہو گئی؟ ظاہر ہے کہ مراد وہی یہود یا اعدائے مسیح ہیں جن کا ذکر اُوپر سے چلا آ رہا ہے۔ کانه قیل وقع لهم التشبیه (مدارک) التبس علیهم الامر (بیضاوی) یا یوں کہا جائے کہ شُبِّهَ انہیں مقتول سے متعلق ہوا، اور وہ دھوکے میں اس کی شخصیت کے بارہ میں پڑ گئے۔ شبه لهم المقتول والمصلوب (جلالین) بہرحال اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہود کو دھوکا ہوا، اور وہ حضرت مسیحؑ کے دھوکے میں کسی اور کو سولی پر چڑھا گئے لیکن یہ شخص کون تھا، اور دھوکے کی صورت کیا ہوئی، اس کا تصریحی جواب نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی حدیثِ صحیح میں۔ اب سوا اس کے

چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ کے جزئیات کو ایک ایک کر کے لایا جائے، اُس وقت کے پس منظر کو سامنے لایا جائے۔ اور جو صورتِ واقعہ نسبۃً زیادہ قرینِ قیاس اور مطابق مقتضائے حال معلوم ہو، اُسی کو ترجیحی طور پر اختیار کیا جائے۔
پہلی بات اس سلسلہ میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یروشلم کے لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام، خواص بھی آپؑ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے۔ چنانچہ جب آپؑ کی گرفتاری کا وقت آیا، تو اس کے لئے یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک پورا گروہ اس ضرورت کیلئے کافی ثابت نہ ہوا، بلکہ آپؑ کی شناخت کے لئے آپؑ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق و غدار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے لیکن امام المفسرین امام رازیؒ اس راز سے بھی واقف ہیں۔ فرماتے ہیں۔ والناس ما کانوا یعرفون المسیح الا بالاسم بانہ کان قلیل المخالطۃ للناس (کبیر) متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے سپاہیوں کی شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لئے انہیں یہوداہ منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو "یسوع نے اُن سے پھر پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا میں تم سے کہہ تو چکا ہوں کہ میں ہی ہوں"۔ (۱۸:۳-۸) ‹‹ حضرت مسیحؑ کی تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ معاصر مخالفین و معاندین کی نظر میں تو آپؑ کی حیثیت صرف یسوع ناصری نامی ایک بدنام و غیر معروف مجرم کی تھی۔ وہ سامنے موجود تھا، اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا، حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں! دوسری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرتؑ کو، یا بالفاظ یہود یسوعؑ ناصری کو تبدیلِ ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں حضرتؑ کی اسی قدرت کو بطور معجزہ کے بیان کیا گیا ہے۔ "چھ دن کے بعد یسوعؑ نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا، اور انہیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا۔ اور اُن کے سامنے اُس کی صورت بدل گئی، اور اُس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا۔" (متی۔ ۱۷:۱،۲) "جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی، اور اس کی پوشاک سفید براق ہوگئی"۔ (لوقا ۹:۲۹) نیز مرقس ۹:۲۔ یہ معجزہ تھا یا نہ تھا، یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہرحال آپؑ کو نفس قدرت اس پر حاصل تھی۔ تیسرے اس تاریخی حقیقت کا تحفظ ذہن میں کر لیا جائے، کہ ملک (شام و فلسطین) کی آبادی اُس وقت اسرائیلیوں (یہود) کی تھی۔ اور اسی برادری کے ایک فرد آپؑ بھی تھے لیکن ملک پر حکومت رُومیوں کی تھی، اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی۔ اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے مختلف تھے، بلکہ صورت شکل، وضع و لباس، زبان و معاشرت وغیرہ میں بھی اُن سے ایسے ہی الگ تھے جیسے آج انگریز، ہندوستانیوں سے مختلف و ممتاز ہیں ۔۔۔۔۔۔ اور جس طرح آج ہندوستانیوں کو سب فوجی گورے یکساں اور گوروں کو سارے "کالے" ایک سے معلوم ہوتے ہیں، بدیسی رومی سپاہیوں اور فوجیوں کی نظر میں سب یہودی یہود، اور اسرائیلی اسرائیلی بھی ایک ہی تھے۔ چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ ملائیے کہ جس مقام پر رومی عدالت تھی، وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلہ پر تھا، اور سُولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف ٹی (T) کے مشابہ یا ریلوے سگنل سے ملتی جلتی ہوتی تھی، وہ سُولی گھر میں پوری گڑی ہوئی نہیں ہوتی تھی، صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑا ہوا رہتا تھا، باقی جو لکڑی اُس کے اوپر آڑی آڑی پڑتی تھی، اس کے لئے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سولی گھر تک لانی پڑتی تھی۔ یہاں تک جو کچھ عرض ہوا، اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے اُمور ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آئیے۔ (۱) حکم جب سنایا گیا ہے، جمعہ کا دن تھا۔ اور دن آخر ہو رہا تھا۔ اور یہود کو جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پا کر شاموں شام گھر واپس آجائیں۔ جمعہ کی شام ہی سے اُن کا یوم السبت شروع ہو جاتا تھا، اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی وغیرہ بھی ممنوع تھی۔ اور پھر یہود کا اہم تہوار، عید فسح ( ) ابھی شروع ہو رہی تھی۔ غرض یہود کو اس کی بہت ہی عجلت تھی کہ کسی طرح اُن کا یہ مجرم جلد سے جلد سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔ (۲)۔ لاغر و ناتوان مجرم (یعنی خود حضرت مسیحؑ) کے لئے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور شریر قسم کے یہود خود ہی قدم قدم پر انہیں چھیڑتے جاتے اور اُن کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے۔ اب اس ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھ کر فرمائیے کہ رُومی سپاہی، جو مجرم، بلکہ مجرموں کو (آپؑ کے ساتھ سُولی کیلئے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لئے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ معایا میں سے نہیں، بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے، ایسے موقع پر کیا کرتے؟ ۔۔۔۔۔۔ خود تو اپنے اوپر وہ سُولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے۔ انہوں نے وہی کیا جو اُن کی جگہ پر کوئی بھی اُن جیسا انسان کرتا۔ انہوں نے مجمع ہی میں سے کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا، اور صلیب کی لکڑی اُسی پر لاد دی! ۔۔۔۔۔۔ انگریز گارد ایسے موقع پر یعنی کسی ہندوستانی مجرم کو حراست میں لئے جاتا ہوتا تو کیا کرتا؟ یہی کرتا کہ بھیڑ میں کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا اور اس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس و قرینہ نہیں، انجیلوں میں اتنے جزو کی تصریح موجود ہے۔ "انہیں شمعون نام ایک کرینی آدمی ملا۔ اُسے بیگار میں پکڑا کہ اُس کی صلیب اُٹھائے"۔ (متی۔ ۲۷:۳۲) "اور شمعون نام ایک کرینی آدمی اسکندر اور روفس کا باپ دہات سے آتے ہوئے اُدھر سے گزرا۔ انہوں نے اُسے بیگار میں پکڑا کہ اُس کی صلیب اُٹھائے" (مرقس۔ ۱۵:۲۱) "اور جب اس کو لئے جاتے تھے، تو انہوں نے شمعون نام ایک کرینی کو جو دہات سے آ رہا تھا، پکڑ کے صلیب اُسی پر رکھ دی کہ یسوعؑ کے پیچھے پیچھے چلے" (لوقا ۲۳:۲۶) جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ و منظم مجمع نہیں، بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا) اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اُس سے تمسخر کرتا ہوا سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا، تو رُومی پولیس گارد جو ساتھ تھا، اب اُس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوعؑ ناصری کس کا نام ہے۔ وہ اپنے حسب دستور مجرم اُسی کو سمجھے جس کے اُوپر صلیب لدی ہوئی تھی ۔۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کے لئے سب یہودی اجنبی ہی تھے، اور اس لئے باہمدگر ہم شکل اور یکساں۔ انہیں ایک اسرائیلی (یسوعؑ ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ انہیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نہیں نظر آ سکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا، لیکن اِدھر مجمع کا شور و ہنگامہ اُدھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت، اور پھر سُولی پر لٹکا دینے کی جلدی، اسی افراتفری کے عالم میں اُسی شمعون کو پکڑ کر سُولی پر چڑھا دیا گیا۔ اور وہ چیختا چلاتا رہا۔ حضرت مسیحؑ قدرۃً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہو گئے۔ اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹاک ٹوئیے مارتے رہ گئے! وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ یہ عقیدہ تو ایجاد نہیں۔ خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سالِ وفات ۱۴۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا۔ اور کھلم کھلا کہتا کہ مصلوب حضرت مسیحؑ نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔ قرآن مجید

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾
بلکہ آپؑ کو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور اللہ بڑا قوت والا ہے، بڑا حکمت والا ہے
وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ
اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو آپؑ پر اپنے مرنے وقت ایمان نہ
مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾
لے آئے اور آپؑ قیامت کے دن اُن پر گواہ (کی حیثیت سے پیش) ہوں گے
فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ
سو یہود کی (ایسی ہی) زیادتیوں کے باعث ہم نے اُن پر بہت سی چیزیں جو اُن پر حلال تھیں
اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾
حرام کر دیں اور اس سبب سے بھی کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے
وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ
اور اس سبب سے بھی کہ وہ سود لیتے تھے حالانکہ انہیں اُس کی ممانعت کر دی گئی تھی اور اس سبب سے
النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ
بھی کہ وہ دوسروں کا مال ناحق کھا لیتے تھے اور اُن میں سے جو کافر ہیں اُن کیلئے ہم نے عذاب
عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ
دردناک تیار کر رکھا ہے البتہ اُن میں جو لوگ علم میں پختہ اور ایمان والے ہیں
وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ
کہ ایمان رکھتے ہیں اس (کتاب) پر جو آپؑ پر اُتری ہے اور اُس پر (بھی)

اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ لیکن پولس (متوفی ۶۸ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی، اُس کی تو بنیاد ہی عقیدۂ کفارہ پہ ہے یعنی اس عقیدہ پر کہ ابن اللہ نے یا خود خدا نے مجسم ہو کر، اور صلیب پر جانکنی
کی تکلیف اٹھا کر اور اپنی جان دے کر سب کی طرف سے مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کردیا۔ اس لئے یہ رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کو مانے اور فرض کئے ہوئے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ اس لئے لامحالہ اسی
پولسی اور کلیسائی مسیحیت نے کل قدیم صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو "بدعتی" اور "مبتدع" قرار دے کر کلیسا سے خارج کردیا۔ اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنانِ عیسیٰؑ یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے یعنی یہ کہ عیسیٰؑ صلیب پر وفات
پاگئے۔ گو ظاہر ہے کہ اس اشتراک عقیدہ میں نیتیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود وفات عیسیٰؑ کو موقع تحقیر و اہانت میں بیان کرتے ہیں، اور مسیحی بعینہ اسی واقعہ سے آپؑ کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں لیکن نفس عقیدہ بہرحال
دونوں میں مشترک ہے۔ اور بڑے تاسف اور قلق کا مقام ہے کہ آج بیسویں صدی عیسوی میں بعض "مسلمان" فرقے بھی اسی گمراہی کی طرف واپس جارہے ہیں۔ اور طرفہ یہ ہے کہ وفات مسیحؑ کے اس باطل اور خلاف تحقیق عقیدہ کو
"روشن خیالی" کا تمغہ اور تحقیق کا پروانہ سمجھ رہے ہیں! ۸۱۶ (آپس میں، کہ کوئی آپ کو مرتبۂ الوہیت پر پہنچائے دیتا ہے اور کوئی مرتبۂ عبدیت کاملہ سے بھی نیچے اتارے لاتا ہے) فِیْهِ میں ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے
ای فی شان عیسی علیه السلام (روح) ای فی عیسی (مدارک) ای فی عیسی (جلالین) الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ سے مراد یہود و نصاریٰ اور اُن کے مختلف فرقے ہیں۔ کہ کوئی آپ کو نعوذ باللہ شعبدہ باز قرار دے رہا ہے
اور کوئی نعوذ باللہ آپ کی خدائی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ المراد من الموصول ما یعم الیهود والنصاری جمیعًا (روح) قیل الضمیر عائد علی الیهود والنصاری (بحر) ۸۱۷ شک کی بہترین تفسیر مفسر تھانویؒ
نے کی ہے یعنی قول بلادلیل۔ یعنی نظریہ پر نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں اور کوئی بات بنائے نہیں بنتی۔ مسیحی مسیحیوں سے دست و گریباں ہیں اور یہود یہودیوں سے۔ اندر ہی اندر خدا معلوم کتنے فرقے ہوگئے ہیں۔
اور ایک دوسرے کو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ۸۱۸ (اور گمان یا اٹکل حقیقت رسی میں کہاں تک کافی ہوسکتی ہے!) مسیحیوں نے تو غضب ہی کر رکھا ہے، اپنے سارے مذہب یعنی الوہیت مسیحؑ، وفات
مسیحؑ، احیاء مسیحؑ کی بنیاد تمام تر ظن و وہم پر رکھی ہے۔ لَهُمْ میں ضمیر الذین اختلفوا کی طرف ہے یعنی وہ لوگ جو حضرت مسیحؑ کے باب میں جھگڑ رہے ہیں، یہود، نصاریٰ اور اُن کے اندرونی فرقے۔ مِنْ عِلْمٍ
علم سے مراد علم صحیح، علم ثابت بالدلائل ہے۔ اور مِن زائد ہے۔ من زائدة (قرطبی) چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ یہود اور مسیحی دونوں قوموں کی روایتوں اور مکاتیب کی بالکل صحیح تصویر قرآن مجید نے
ان مختصر و جامع الفاظ میں کھینچ دی ہے۔ لکن یتبعون فیه الظن الذی تخیلوه (جلالین) ظن یہاں مقابل علم کے ہے یعنی ایسا قول جو بالکل بلادلیل ہو اور جس کا مبنیٰ نہ کوئی نص ہو نہ اُس سے کوئی استنباط
___ یعنی کج فہموں نے آیتوں کے الفاظ سے نفی قیاس پر جو دلیل قائم کرنا چاہی ہے وہ بے اصل ہے۔ قیاس فقہی تو خود ایک دلیل شرعی ہے استنباط و استخراج کے مرادف۔ ۸۱۹ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا میں
یقینًا نفی قتل کی تاکید کے لئے ہے۔ کذلک ما قتلوه حقا (کشاف) ما قتلوه حقا فیصل یقینا تاکید القوله وما قتلوه (مدارک) ای حق انتفاء قتله حقا (مدارک) حال موکدة لنفی القتل (جلالین) عقیدۂ
وفات مسیحؑ یا قتل مسیحؑ چونکہ بہت بڑی غلط فہمی یا گمراہی کا باعث ہے اور دنیا کی دو بڑی قومیں یہود اور مسیحی اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اس لئے قرآن مجید کو اس کی تردید کی ضرورت بھی بہت وضاحت اور تاکید کے ساتھ پیش
آئی۔ ۸۲۰ اِلَیْهِ۔ اپنی طرف یا اپنے آسمان کی طرف۔ قرآن مجید میں اس طرح کے حذف مضاف کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اور جس طرح "اللہ نے اپنی طرف بلا لیا" سے مراد آخرت کی طرف بلا لینا سمجھی جاتی ہے
اُسی طرح عربی اور اردو دونوں محاورہ میں اللہ کی طرف اُٹھالینے سے مراد آسمان کی طرف اُٹھالینے سے ہے۔ یحتمل رفعه الی السماء (راغب) ای الی السماء واللہ تعالی متعال عن مکان (قرطبی) الی السماء (مدارک)
الی محله (بحر) رَفَعَهُ۔ رفع کے اصلی معنی رفع جسمانی یا رفع مادی ہی کے ہیں۔ الرفع یقال فی الاجسام الموضوعة اذا اعلیتها عن مقرها (راغب) مجازی معنی، یعنی رفع مراتب کے بھی جائز ہیں۔ ای رفعه
من حیث التشریف (راغب) لیکن حقیقت کو چھوڑ کر مجاز اختیار کرنے کی کوئی وجہ قوی موجود ہونی چاہیئے اور وہ یہاں موجود نہیں۔ بعض نادان اور نوخیز فرقوں کا یہ استدلال کہ چونکہ رفع کی نسبت اللہ تعالیٰ
کی جانب ہے، اس لئے رفع جسمانی تو مراد ہو ہی نہیں سکتا، اور اس لئے لامحالہ رفع مجازی یعنی قرب و منزلت ہی مراد ہوگی، قرآن فہمی سے بُعد پر مبنی ہے۔ آخر قرآن مجید ہی میں اس طرح کی آیات موجود ہیں یا نہیں:۔
وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ۔ یہاں مہاجرت الی اللہ سے کسی نے مہاجرت الی دارالاسلام یا مہاجرت الی المدینہ نہیں لی ہے؟ یا پھر قال ابراهیم انی ذاهب الی ربی۔ یہاں کون نہیں سمجھتا کہ ذہاب الی رب
سے مراد ذہاب الی الشام مُراد ہے؟ وقس علی هذا۔ امام رازیؒ نے خوب لکھا ہے کہ تعظیم و تشریف کے جس سیاق میں یہاں ذکر رفع الی اللہ کا ہے، وہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ یہ رفع کوئی امتیازی اور مخصوص چیز ہے، متقین و
صالحین کے عام دخول جنت اور وہاں کی لذات جسمانی وحسی سے الگ۔ رفعه الیه اعظم فی باب الثواب من الجنة ومن کل ما فیها من اللذات الجسمانیة (کبیر) رفع جسمانی کا عقیدہ لازمۂ ایمان اور شرط اسلام ہو یا نہ
ہو، بہرحال ظاہر قرآن سے قریب تر ضرور ہے۔ ۸۲۱ صفت عزیز لاکر یہ یاد دلایا کہ وہ اپنے نبی کو بچالینے پر بھی قادر، اسے اٹھا لینے پر بھی قادر، رفع جسمانی و رفع روحانی دونوں پر قادر۔ صفت حکیم لاکر ادھر اشارہ کردیا کہ اُس نے حضرت عیسیٰؑ اور
ان کے دشمنوں کے ساتھ جو معاملہ کیا وہی عین مقتضائے حکمت تھا۔ ۸۲۲ (جب عالم برزخ کا مشاہدہ شروع ہوجاتا ہے، اور اس لئے وہ ایمان نافع نہیں ہوتا) قبل موته میں ضمیر کتابی کی طرف ہے، اور مراد ہے موت کے
وقت۔ یؤمن بعیسی اذا عاین الملک ولکنه ایمان لا ینفعه لانه ایمان عند الیاس وحین التلبس بحالة الموت (قرطبی) لایموت یهودی حتی یؤمن بعیسی (ابن جریر عن ابن عباس) کل صاحب کتاب یؤمن بعیسی
قبل موته (ابن جریر عن مجاهد) هذا قول اکثر المفسرین واهل العلم (معالم) یعنی اذا عاین قبل ان تزهق روحه حین لا ینفعه ایمانه لانقطاع وقت التکلیف (کشاف) حیث یعاین ملئکة الموت فلا
ینفعه ایمانه (جلالین) قبل کا اطلاق عربی میں جس طرح تقدم منفصل پر ہوتا ہے، تقدم متصل پر بھی ہوتا ہے۔ یستعمل فی تقدم المتصل والمنفصل (راغب) اور یہاں تقدم منفصل ہی مراد ہے، یعنی مرتے وقت
بِهٖ میں ضمیر بالاتفاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے۔ لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ یعنی آپؑ کا جو صحیح مرتبہ عند اللہ ہے، اسے وہ جان کر، اور اس کا اعتراف و اقرار کرکے رہیں گے۔ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ لفظ عام ہے، لیکن محاورۂ قرآنی میں اکثر
اس سے مراد یہود ہی ہوتے ہیں۔ اور یہاں بھی عبارت کا سیاق و سباق انہی کی جانب مشیر ہے۔ ای من الیهود (بحر) لا یموت یهودی حتی یؤمن بعیسی (ابن جریر عن ابن عباس) ای الیهود خاصة کما اخرج
ابن جریر عن ابن عباس (روح) اور اگر وہی عام ہی معنی لئے جائیں اور یہود و نصاریٰ دونوں مراد سمجھے جائیں، جب بھی معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یعنی الیهود والنصاری کما ذهب الیه کثیر من المفسرین
(روح) مراد یہ ہوگی کہ مسیحیوں، یعنی مقام عیسیٰؑ میں افراط کرنے والوں اور یہود یعنی منصب عیسیٰؑ میں تفریط کرنے والوں، دونوں پر موت کے وقت صحیح مقام عیسیٰؑ کا انکشاف کردیا جائیگا۔ ۸۲۳ یعنی یہ بتلائینگے کہ فلاں فلاں
نے میری تصدیق کی تھی، اور فلاں فلاں نے تکذیب۔ یعنی شاهدا علیهم بتکذیب من کذبه منهم وتصدیق من صدقه منهم (ابن جریر) شَهِيْدًا کے معنی حکم لگانے والے کے بھی ہوتے ہیں۔ وقد
یعبر بالشهادة عن الحکم (راغب) ۸۲۴ جس طرح افراد کے نفس سرکش کی اصلاح کی ایک صورت یہ ہے کہ بعض مباحات سے بھی اُسے روک دیا جائے، اسی طرح جب قوم کا مزاج اعتدال سے منحرف ہوجاتا ہے تو
اس کے لئے بھی مناسب صورت یہی ہوتی ہے کہ جن جائز چیزوں کی وہ عادی تھی، اُن سے اسے محروم کردیا جائے۔ بِظُلْمٍ میں با سببیہ ہے۔ اس سے یہ صاف نکل آیا کہ اُمت اسرائیل پر بعد کو جو کچھ بھی سختیاں ہوئیں،
خود اُنہی کی زیادتیوں کی بدولت ہوئیں، بلاوجہ نہیں ہوئیں۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی کے سبب سالک سے واردات کا قبض اسی کے مشابہ ہے۔ ۸۲۵ یہود کی قومی فرد جرم کی یہ دوسری دفعہ ہے یعنی خود
اپنی جانوں پر تو وہ ظلم کر ہی رہے تھے، ان کی گمراہی متعدی بھی تھی۔ دوسروں کو بھی بھٹکا رہے تھے۔ کثیرًا۔ کثیر کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ وہ بہت لوگوں کو راہ حق سے روک دیتے تھے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ
اُن کی روک یا گمراہ کرنے کی خصلت بہت زائد تھی۔ تیسرے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ مدت طویل تک روک تھام کرتے رہے۔ غرض کثرت کا تعلق کمیت، کیفیت اور زمانہ تینوں سے ہوسکتا ہے۔ ای جمعًا عظیمًا من
الناس او صدا کثیرا وقدره بعضهم زمانا کثیرا (بحر) ۸۲۶ (ان کے پیمبروں کے ذریعہ سے انہی کی کتابوں میں) توریت میں ممانعت سود کے اس طرح کے احکام آج تک لکھے چلے آرہے
ہیں۔ "اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دیوے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر اور سود مت لے" (خروج ۲۲: ۲۵) "تو اس سے سود اور نفع مت لے۔ اپنے خدا سے
ڈر تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے۔ تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے، نہ اُسے نفع کے لئے کھانا کھلا" (احبار ۲۵: ۳۶-۳۷) یہ اور بات ہے کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ سود خور قوم یہی یہود ہو۔ اور ان کے
شائلاک دنیا کے ادبیات میں ضرب المثل بن گئے ہوں۔ ۸۲۷ یعنی انکی شریعت میں سود، رشوت، خیانت وغیرہ آمدنی کے جن ذریعوں کو حرام کردیا گیا تھا، اُنہی کو اختیار کر کے جن نعمتوں سے یہود محروم کردیئے گئے تھے وہ جتنی اور
جو کچھ بھی ہوں بہرحال ان سے محرومی کے اسباب یہاں کھول کر بیان کردیئے گئے ہیں:۔ (۱) ایک انکی ذاتی زبردستیاں، زیادتیاں، گنہگاریاں۔ (فبظلم من الذین هادوا) (۲) دوسرے انکی متعدی گمراہیاں (بصدهم عن
سبیل الله کثیرا)۔ (۳) تیسرے اُن کی سود خوری، وہ بھی ممانعت کے بعد (اخذهم الربوا وقد نهوا عنه) (۴) چوتھے ناجائز آمدنیوں سے ان کا تامل نہ کرنا (اکلهم اموال الناس بالباطل) ۸۲۸ (آخرت میں) اور دنیوی
سزاؤں میں خود نعمتوں سے محروم ہوجانا کیا کچھ کم ہے؟ آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سزائیں تو عمومی و اجتماعی رنگ میں ملتی ہیں، چنانچہ فلاں فلاں نعمتوں سے ساری قوم محروم کردی گئی لیکن آخرت میں

سزائیں تمامتر انفرادی و شخصی حیثیت سے ملتی ہیں۔ ہر ہر فرد اپنے اپنے اعمال کو بھگتے گا۔ جہنم کا عذاب الیم صرف انہی افراد کو ہوگا جو کافر ہونگے۔ ۸۲۹ (آخرت میں) آیت میں ایمان کے بھی اہم ترین اجزاء اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، آسمانی کتابوں پر ایمان آگئے۔ اور عبادات کے بھی اہم ترین عنوانات، یعنی اقامت صلوٰۃ و ادائے زکوٰۃ۔ اَلرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ۔ علم سے مراد علم دین ہے۔ اَلْمُؤْمِنُوْنَ یعنی جو ایمان لے آنے والے ہیں۔ سَنُؤْتِيْهِمْ ۔ س یہاں تیقن کے لئے ہے۔ والسین لتوکید الوعد (روح) ۸۳۰ یہ جتنے نام یہاں آئے ہیں

اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ

جو آپ سے قبل اتر چکی ہے اور نماز کے پابند اور زکوٰۃ کے ادا کرنے والے

الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ

ہیں اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں ایسوں کو ہم

سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۟۱۶۲ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ

اجرِ عظیم ضرور دیں گے یقیناً ہم نے آپ پر وحی بھیجی ہے جیسی کہ

ع ۲۲ / ۲

اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ

ہم نے نوحؑ اور اُن کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی بھیجی تھی اور ہم نے

اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ

ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور

الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ

اولادِ یعقوبؑ اور عیسٰیؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وحی بھیجی

سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۟۱۶۳ وَ رُسُلًا قَدْ

تھی اور ہم نے داؤدؑ کو ایک صحیفہ دیا تھا اور دوسرے پیمبروں پر کہ

قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ

اُن کا حال ہم پیشتر آپ سے بیان کر چکے ہیں (ہم نے وحی بھیجی تھی) اور ایسے پیمبروں پر (بھی) کہ

عَلَيْكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۟۱۶۴ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ

اُنکا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور اللہ نے موسٰیؑ سے خاص طور پر کلام فرمایا اور پیمبروں کو

ان سب پر حاشیے پہلے گزر چکے۔ خطاب کا رُخ زیادہ تر یہود ہی کی جانب ہے۔ انہی کو بتایا اور سمجھایا ہے کہ سلسلۂ وحی کو تو آخر تم مانتے ہو، اور حضرت نوحؑ اور اُن کے بعد کے انبیاء کی نبوت کو بھی تسلیم کرتے ہو، پھر ایک نئے نبی کی شناخت و معرفت میں تمہیں اتنی دشواری کیوں پیش آرہی ہے؟ حضرت ابراہیمؑ وغیرہ ایسے انبیاء کے ساتھ جن کی نبوت یہود کو مسلّم تھی، چند ایسے پیمبروں کے نام بھی لے دیئے گئے ہیں، جن کی نبوت کے یہود منکر (مثلاً حضرت عیسٰی علیہ السلام) یا تقریباً منکر تھے (مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام) ۸۳۱ زَبُوْرًا ۔ زبور یہاں لغوی معنی میں ہے اور لغوی معنی اس کے ہر لکھی ہوئی چیز کے ہیں۔ الزبر الکتابة، زبر الکتاب کتبه (لسان) اور الزبور کے بھی معنی لکھی ہوئی کتاب کے ہیں۔ الزبور الکتاب الزبور (لسان) الزبور الکتب المسطور (تاج) زبور کے نام سے اس وقت جو کتاب حضرت داؤدؑ کی جانب منسوب موجود ہے، وہ عہد عتیق کے مجموعۂ صحائف میں سے ایک صحیفہ ہے۔ اور اس مجموعہ کے نمبر ۱۹ پر ہے۔ اس میں احکام و مسائل شریعت درج نہیں، بلکہ صرف حمد مناجات، دعائیں وغیرہ ہیں۔ اور جا بجا آخری نبیؐ کی بابت پیشگوئیاں بھی، پیشگوئیوں کے ڈھکے ہوئے انداز میں موجود ہیں۔ ۸۳۲ (رکوع) پھر بعض پیمبر ایسے ہیں جن کا ذکر اس آیت کے نزول کے بعد قرآن مجید میں آگیا۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں سرے سے آیا ہی نہیں۔ والاکثرون غیر مذکورین علی سبیل التفصیل (کبیر) متکلمین نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ہر ہر نبی پر تفصیل کے ساتھ ایمان لانا ضروری نہیں البتہ سب نبیوں کی اجمالاً تصدیق ضروری ہے۔ والآیة تدل علی ان معرفة الرسل بأعیانهم لیست بشرط لصحة الایمان بل من شرطه ان یؤمن بهم جمیعاً اذ لو کان معرفة کل واحد منهم شرطاً لقص علینا کل ذلک (مدارک) مِنْ قَبْلُ یعنی اس آیت کے نزول سے پیشتر۔ ۸۳۳ تکلیماً فعل کے بعد اسی مصدر کو اور پھر تنوین کے ساتھ لانے کے معنی یہ ہیں کہ کلام کی کوئی بہت ہی مخصوص نوعیت مراد ہے۔ ورنہ کلام و مخاطبہ اپنے عام معنی میں تو ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہے ——— ایسا کلام جو ہمکلامی و مخاطبۂ انبیاء میں بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ عام عقول کیلئے تو ناقابل فہم ہی ہوگا۔ مصدر معناہ التاکید (قرطبی) هو الکلام الحقیقی الذی یکون به المتکلم متکلماً (قرطبی) والمعنی ان التکلیم بغیر واسطة منتهی مراتب الوحی واعلاها (روح) اشارة الی ان المصدر وتنوینه للتنویع لانه نوع عجیب لا یدرک کنهه (تھانوی)

۸۳۴ یعنی پیمبروں کے آجانے کے بعد اب کسی کو قیامت میں یہ عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہیں رہا، کہ ہماری عقل مسائل و حقائق کے سمجھنے سے قاصر رہی۔ متکلمین نے یہیں سے یہ اخذ کیا ہے کہ بندوں پر حجتِ الٰہی ارسالِ رُسل کے بعد ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ مجرد عقل کی بناپر۔ یدل علی ان قبل البعثة یکون للناس حجة فی ترك الطاعات والعبادات (کبیر) احتج اصحابنا بهذه الأیة علی وجوب معرفة الله تعالیٰ لا یثبت الا بالسمع (کبیر) فی هذا کله دلیل واضح انه لا یجب شئ من ناحیة العقل (قرطبی) فیه تنبیه علی ان بعثة الانبیاء الی الناس ضرورة بقصور الکل عن ادراك جزئیات المصالح والاکثر عن ادراك کلیاتها (بیضاوی) ۸۳۵ صفت عزیز لاکر یاد دلا دیا کہ وہ مالکِ حقیقی ہے، فاعلِ مختار، پیمبروں کے بھیجے ہوئے بغیر بھی ہر عذر کو قطع کرسکتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی تو ہے۔ اس صفت کو لاکر یہ بتا دیا کہ اس کی حکمتِ کاملہ مقتضی اس کی ہوئی کہ وہ ظاہری عذر بھی نہ باقی رہنے دے۔ ۸۳۶ لکنْ کلمۂ استدراک ہے اور استدراک قولِ ماسبق پر ہوتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اگر یہ لوگ خصوصاً یہود اب بھی اور اس کے باوجود بھی نبوتِ محمدی کو نہ مانیں تو ——— روایتوں میں آتا بھی ہے کہ یہود نے پچھلی آیات انا اوحینا الیك الخ کو سُن کر کہا تھا کہ ہم تو ان کی رسالت کی گواہی نہیں دیتے۔ مما قال انا اوحینا الیك قال القوم لا نشهد لك بذلك فنزل لکن الله یشهد (کبیر) فی الکلام حذف دل علیه الکلام کان الکفار قالوا ما نشهد لك یا محمد فی ما تقول فمن یشهد لك (قرطبی) ۸۳۷ اور اسی کمالِ علمی ہی نے تو قرآن کو معجزہ بنا دیا ہے) اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ یعنی اللہ کی شہادت اسی قرآن کے ذریعہ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ أَنزَلَهُۥ بِعِلْمِهِۦ۔ اس میں قرآن کے لئے صفتِ کمال کا اثبات ہے۔ والمراد من قوله وصف القرآن بغایة الحسن ونهایة الکمال (کبیر) معتزلہ نے جو صفاتِ باری سے انکار کیا ہے، اس کا رد بھی متکلمین اہلِ سنت نے یہیں سے نکالا ہے۔ فیه نفی قول المعتزلة فی انکار الصفات فانه اثبت لنفسه العلم (مدارک) دلت علی انه تعالیٰ عالم بعلم (قرطبی) ۸۳۸ یعنی حقیقت نفس الامر کے اعتبار سے اللہ کی شہادت ہر دوسری شہادت سے بے نیاز ہے۔ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ۔ اللہ کی گواہی تو قرآن کے ذریعہ سے ظاہر ہی ہے، لیکن فرشتوں کی گواہی سے کیا مراد ہے؟ عام مفسرین نے یہ پہلو اختیار کیا ہے کہ فرشتے جو ان منکرین سے کہیں افضل واشرف ہیں، جب وہ رسول کی صداقت پر گواہ ہیں، تو ان منکرین کی ہستی اور حقیقت کیا ہے۔ لیکن ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سارا تکوینی کاروبار فرشتوں ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے تو گویا کائنات کی فعلی شہادت جو درحقیقت فرشتوں ہی کی شہادت ہے، خود تمام تر رسولِ اسلام اور دینِ رسول کی تصدیق و تائید میں ہے۔ بِاللّٰهِ میں ب زاید ہے۔ والباء زائدة (قرطبی) ۸۳۹ اس ظلم سے مُراد دونوں قسم کے ظلم ہو سکتے ہیں، ایک ظلم تو خود اپنے نفس اور جان پر، کفر و انکار کرکے۔ دوسرا ظلم یہ ہے کہ دوسروں کو اسلام و ایمان کے راستہ سے ظلم یا مکر سے روکا جائے۔ ۸۴۰ یہ بیان ہو رہا ہے قانونِ مجازات اور مکافاتِ عمل کا۔ کفر اور ظلم کے نتیجے قدرۃً اسلام اور عدل کے نتیجوں سے بالکل مختلف نکلیں گے۔ ۸۴۱ اسلام کا خدا مشرک قوموں کے خداؤں کی طرح محدود اور ناقص قوتیں رکھنے والا خدا نہیں، جو اُسے اس سزا دہی کے لئے کسی خاص اہتمام یا تکلف کی ضرورت پڑے۔ وہ مطلق الاختیار ہے۔ فعال لما یرید ہے۔ جو کچھ چاہے بات کی بات میں کرسکتا ہے۔

وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ

(ہم نے بھیجا) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بناکر) تاکہ لوگوں کو پیمبروں کے (آنے کے) بعد اللہ

بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ١٦٥ لَّٰكِنِ

کے سامنے عذر نہ باقی رہ جائے ۸۳۴ اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست، بڑا حکمت ۸۳۵ والا لیکن ۸۳۶ (اس کے ساتھ)

اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُۥ بِعِلْمِهِۦ ۖ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ

اللہ گواہی دے رہا ہے اس (کتاب) کے ذریعہ سے جو اُس نے آپ پر نازل کی (اور) اسے اُس نے اپنے

يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ١٦٦ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

(کمالِ) علم سے نازل کیا ۸۳۷ اور فرشتے بھی گواہی دے رہے ہیں، اور اللہ کی گواہی کافی ہے ۸۳۸ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا

وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَٰلًۢا

اور اللہ کی راہ سے (دوسروں کو) روکا، وہ بڑی ہی دُور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں، یقیناً جن

بَعِيدًا ١٦٧ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ

لوگوں نے کفر کیا، اور ظلم کیا ۸۳۹ اللہ ایسا نہیں کہ انہیں بخش دے اور

لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ١٦٨ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ

نہ یہ ہے کہ انہیں کوئی راستہ دکھائے بجز راہ جہنم کے ۸۴۰

خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ١٦٩

اس میں وہ پڑے رہیں گے (ہمیشہ ہمیش کو) اور اللہ کے نزدیک یہ آسان ہے ۸۴۱

يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن

اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس (یہ) رسول تمہارے پروردگار کے پاس سے آئے ہیں، سچی بات

٨٤٢ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ۔ خطاب صرف اہلِ عرب یا اہلِ مکہ کو نہیں، سارے جہان کو ہے ۔ دعوتِ قرآنی کی عالمگیری کا ایک اور ثبوت ۔ ھذا خطاب للکل (مدارک) خطاب لجمیع المکلفین (بحر) ذکر خطابًا عامًا یعمھم وبعد غیرھم (کبیر) ٭ اَلْحَقِّ ۔ اس میں سچے دعوے اور سچے دلائل دونوں آگئے ۔ ٨٤٣ ایمان لانے اور زندگی کو شریعت کے مطابق ڈھالنے میں نفع تمام تر بندہ کا اپنا ہی ہے ۔ حق تعالیٰ کی کوئی غرض اس سے اٹکی ہوئی نہیں ہے، جیسا کہ مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کے بارہ میں تصور کر رکھا ہے ۔ فَاٰمِنُوْا ۔ میں ف سے اشارہ اس جانب ہے کہ صحیح دعوےٰ اور صحیح دلیل کا مقتضا ہی یہ ہے کہ ایمان لے آیا جائے ۔ ٨٤٤ سو اُس کا ضرر کسی طرح بھی نہیں، ضرر سر تا سر تمہارا ہی ہے) مشرکوں کو یہ حقیقت بار بار یاد دلانے کے قابل تھی ۔ وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو بھی اپنا ہی جیسا محتاج اور غرضمند تصور کرتے تھے ۔ ٨٤٥ صفت علیم لاکر یاد دلا دیا کہ ہر ایک کا کفر و ایمان اُس پر روشن ہے، اس کے حدودِ علم سے باہر کوئی چیز نہیں ۔ اور صفت حکیم لاکر یہ اشارہ کر دیا کہ وہ سزا بھی موقع مناسب ہی پر دیگا ۔ ٨٤٦ دین میں غلو کرنا یہ ہے کہ عقائد و مسائل میں اضافہ و افراط کو اپنی طرف سے دخل دیدیا جائے خواہ کسی نیت سے ہو ۔ الغلو فی الدین ھو مجاوزۃ حد الحق فیہ (جصاص) اَھْلَ الْکِتٰبِ سے یہاں مراد اہلِ انجیل یا نصاریٰ ہیں ۔ ای اھل

رَبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا

لے کر ٨٤٢ پس ایمان لاؤ یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا ٨٤٣ اور اگر تم کفر کرتے رہے ٨٤٤

فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

تو بیشک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ بڑا علم والا ہے

عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ

بڑا حکمت والا ہے ٨٤٥ اے اہلِ کتاب اپنے دین میں غلو نہ

دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا

کرو ٨٤٦ اور اللہ کے بارہ میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو ٨٤٧ مسیح

الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ

عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک پیغمبر ہی ہیں ٨٤٨ اور اس کا کلمہ ٨٤٩

اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ؗ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ

جسے اللہ نے پہنچا دیا تھا مریم تک ٨٥٠ اور ایک جان ہیں اسکی طرف سے ٨٥١ پس اللہ اور اسکے پیغمبروں پر

رُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ

ایمان لاؤ ٨٥٢ اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تین ہیں ٨٥٣ اس سے باز آجاؤ ٨٥٤ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے ۔

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ

اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے ٨٥٥ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کے بیٹا

وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَ

ہو ٨٥٦ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ٨٥٧ اور

وقف لازم

الانجیل من النصاریٰ (ابن جریر) والتقدیر یا اھل الکتٰب من النصاریٰ (کبیر) ینھی تعالیٰ اھل الکتٰب عن الغلو والاطراء وھذا کثیر فی النصاریٰ (ابن کثیر) نزلت فی النصاریٰ (معالم) یہود کے مطاعن کا ذکر کر کے اور ان کا جواب دے کر اب ذکر عیسائیوں کا شروع ہو رہا ہے، جو یہود کی تفریط کے مقابلہ پر افراط کی انتہا پر پہنچ گئے تھے ۔ اور عیسیٰ مسیح کو بجائے ایک صالح اور مقبول بندہ کے خدا یا خدا کا بیٹا ماننے لگے تھے ۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہود کا غلو احکام ظاہری میں متعلق تھا اور مسائل باطن کی طرف سے اعراض تھا اور مسیحیوں کا غلو مسائل باطن میں متعلق اور ظاہر کی طرف سے اعراض تھا ۔ طریق حق ظاہر و باطن کو جمع کرنا ہے ۔ ٨٤٧ یعنی الوہیت کے باب میں کوئی عقیدہ اپنی رائے سے گڑھ کر پیش کرو ۔ اور توحید میں کوئی شائبہ بھی شرک کا نہ آنے دو ۔ ٨٤٨ (نہ کہ خود معبود یا خدا یا مظہر خدا) اللہ کے بھیجے ہوؤں کو، اُس کے نائبوں اور رسولوں کو خود معبود سمجھ بیٹھنے کا مرض شرک قوموں میں عام رہا ہے ۔ مسیحیوں نے بھی مصری، یونانی، رومی مشرکوں اور مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیمبر برحق کو بھی مظہر خدا یا فرزند خدا کا درجہ دے دیا تھا ۔ یہ اُس کی تردید ہو رہی ہے ۔ ٨٤٩ یعنی اُن کی پیدائش اللہ کے ایک کلمہ ہی کا نتیجہ ہے ۔ ای صار بکلمۃ من اللہ مخلوقًا (ابن عباس) والمعنی انہ وجد بکلمۃ اللہ وامرہ من غیر واسطۃ ولا نطفۃ (کبیر) ای ھو مکون بکلمۃ کُن (قرطبی) کلمہ سے مراد یا تو کلمہ کُن ہے یا وہ کلمہ جو بواسطہ جبریل حضرت مریم پر القاء کیا گیا تھا ۔ ومعنی کونہ کلمۃ انہ حصل بکلمۃ کن من غیر والد معتادۃ والی ذالک ذھب حسن و قتادۃ (روح) ای قولہ کُن (معالم) لیست الکلمۃ صارت عیسیٰ ولکن بالکلمۃ صار عیسیٰ (ابن کثیر من شاذان بن یحیی) وتسمیۃ عیسیٰ بکلمۃ لکونہ موجدًا بکُن (روح) ٨٥٠ (بواسطہ فرشتہ جبریل کے) ای القاء الکلمۃ کان من اللہ ثم من جبرئیل (ابن العربی) ٨٥١ یعنی اللہ کے زندہ کئے ہوئے اور اللہ کی بنائی ہوئی روح ہیں، جو بلا اسباب مادی ظاہری مریم کے بطن میں مجسم ہوگئے ۔ ای تخلیقہ وتکوینہ (مدارک) ای بامرہ صار ولدًا بلا اب (ابن عباس) ای احیاء اللہ ایاہ بتکوینہ (ابن جریر) نسب الی انہ روح من اللہ لانہ بامرہ (ابن جریر) ای من خلقہ ومن عندہ (ابن کثیر) ای مخلوق من روح مخلوقۃ (ابن کثیر) رُوْحٌ مِّنْهُ ۔ روح کا انتساب اللہ کی جانب محض اُس کے شرف و عظمت کے لئے ہے ۔ جیسے بیت اللہ یا نعمت من اللہ میں نسبت تشریفی و تعظیمی ہوتی ہے ۔ والمراد من قولہ منہ التشریف والتفضیل کما یقال ھذہ نعمۃ من اللہ ۔ (کبیر) اُضیفت الرُّوح الی اللہ علی وجہ التشریف کما اُضیفت الناقۃ والبیت الی اللہ (ابن کثیر) ھو روح کسائر الارواح الا انہ تعالیٰ اضافہ الی نفسہ تشریفًا (معالم) اضافہ اللہ تعالیٰ الیہ تشریفًا لہ کما یقال بیت اللہ وسماء اللہ (جصاص) یہ مراد نہیں کہ صرف اُنھی میں اللہ کی رُوح تھی، کسی اور میں اللہ کی رُوح نہیں ہوتی ۔ اللہ کی رُوح تو ہر فرد بشر میں ہے ۔ ونفخت فیہ من روحی ۔ قرآن مجید میں موقع تخصیص و امتیاز پر کبھی کسی کو عبدہٗ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اور کبھی کسی کو عبدنا سے، حالانکہ ظاہر ہے کہ اللہ کے عبد سب ہی ہیں ۔ ٨٥٢ (ان ہی پیمبروں کی تعلیمات کے مطابق) فَاٰمِنُوْا کی ف میں اشارہ اس طرف ہے کہ ان صحیح حقائق کو سمجھ لینے کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد و خیالات کو چھوڑ کر ایمان اللہ اور اس کے رسولوں کی ہدایات پر لاؤ ۔ ٨٥٣ خواہ وہ تین اقنوم ہوں یا تین مستقل بالذات ہستیاں ۔ مسیحی تثلیث کا عقیدہ خود مسیحیوں کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :- " باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے ۔ جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے ۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق، اور روح قدس غیر مخلوق باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود، اور روح قدس غیر محدود ۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی اور روح قدس ازلی ۔ تاہم تین ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی ۔ اسی طرح تین غیر محدود نہیں ۔ اور نہ تین غیر مخلوق، بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود ۔ یونہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق، اور روح قدس قادر مطلق ۔ تو بھی تین قادر مطلق نہیں، بلکہ ایک قادر مطلق ہے ۔ ویسا باپ خدا، بیٹا خدا اور روح قدس خدا ۔ بس یہ بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا " ایک طرف یہ گورکھ دھندا، اور دوسری طرف اسلام کا صاف و سادہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ــــــ کوئی مناسبت بھی دونوں میں ہے ؟ ٨٥٤ ذکر یہ غالیانہ عقائد کفر بلکہ شرک تک پہنچا دینے والے ہیں ۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ آیت حلول و اتحاد کے بطلان صریح پر دال ہے جس کے قائل بعض جہلاء صوفیہ ہوئے ہیں ۔ ٨٥٥ واحد ہر اعتبار سے اور اپنے ہر معنی میں ۔ نہ وہ ایک تین میں تقسیم ہے، نہ وہ ایک اپنے کو تین شکلوں میں ظاہر کرنے والا ہے ۔ نہ تر یموَرتی کی کوئی قسم بھی صحیح ہے ۔ ٨٥٦ یہ ولدیت کا عقیدہ غلط ہی نہیں، بلکہ اصلاً مہمل اور تنزیہ الوہیت کے لئے باعث توہین، شانِ الوہیت کے بالکل منافی ہے ۔ ٨٥٧ خالق کا صحیح رشتہ مخلوق کے ساتھ صرف مالکیت کا ہے ۔ مالک و مملوک میں مُباینت لازمی ہے، برخلاف اس کے والد و مولود کے درمیان مجانست ـــ ہم جنسی و ہم قومی ـــ شرط ہے ۔ تو جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی بھی مخلوق اس کی اولاد ہو ہی نہیں سکتی ۔

۸۵۸ کیا اسے بندوں کی حاجت روائی اور اپنی کارسازی میں کسی کی اعانت کی محتاجی ہے، جو وہ کسی کو شریک کرے؟ ۸۵۹ (نہ عالم ناسوت میں، نہ برزخ میں، نہ آخرت میں) المسیح - الملٰئکۃ المقربون ایک طرف حضرت مسیح اور دوسری طرف ملائکہ مقربین یہی دونوں دنیا میں کثرت سے پوجے گئے ہیں۔ مشرکوں نے فرشتوں کو دیوی دیوتا نام دے کر شریکِ الوہیت ٹھہرایا، اور مسیحیوں نے مسیح کو خدائی کے مرتبہ پر پہنچایا، اسی لئے خصوصیت کے ساتھ تصریح سے ان دونوں کی نفی الوہیت کی گئی، اور بتایا گیا کہ اللہ کی عبدیت کوئی چیز توہین والی نہیں۔ مسیح اور ملائکہ مقربین تو اس پر فخر کرتے ہیں، نہ یہ کہ اس میں کسی قسم کا بھی عار محسوس کرتے ہیں۔

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ مراتب شرف میں عبدیت مرتبۂ اعلیٰ ہے۔ ۸۶۰ یہاں بیان اس عام قانون کا ہو رہا ہے کہ کوئی اللہ کی بندگی میں عار اور تکبر کر ہی کیونکر سکتا ہے، اللہ تو ایسا حاکم مطلق ہے کہ وقت موعود پر سب ہی کو اس کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔ ۸۶۱ (جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے) فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ یعنی جتنا اجر مقرر و موعود ہے وہ تو انہیں پورا ملے ہی گا۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یعنی جو لوگ عقیدۃً اور عمل دونوں کے اعتبار سے عبد بنے رہے ۸۶۲ خلاصہ یہ کہ نیک سے نیک بزرگ سے بزرگ، مقبول سے مقبول بندے بھی بہرحال بندے ہی ہوتے ہیں۔ غالی مریدوں، معتقدوں کا اپنے شیخ یا کسی پیر کو اس کی حدِ عبدیت سے باہر نکال دینا اپنے کو مستحق جہنم بنانا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا یعنی جنہوں نے عبد بننے سے عار رکھا۔ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔ ولی اور نصیر میں فرق یہ ہے کہ ولی ایجابی طور پر ایصال نفع پر قادر ہوتا ہے، اور نصیر سلبی طور پر دفع مضرت پر۔ وَلِيًّا ای قریبًا ینفعھم (ابن عباس) نصیرًا ای مانعًا یمنعھم من عذاب اللہ (ابن عباس) ۸۶۳

كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٧١﴾ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ
اللہ ہی کارساز ہونا کافی ہے ۸۵۸ مسیح ہرگز اس سے عار نہ کریں گے کہ
اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ
وہ اللہ کے بندہ ہیں اور نہ مقرب فرشتے بھی ۸۵۹
وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ
اور جو کوئی اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو
فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿١٧٢﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
اللہ ضرور اپنے پاس سب کو جمع کرے گا ۸۶۰ پھر جو لوگ ایمان لائے ہوں گے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ
اور انہوں نے نیک کام بھی کئے ہوں گے تو وہ ان کو ان کا پورا پورا اجر دیگا اور انہیں اپنے فضل
مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا
سے اور زاید دیگا ۸۶۱ اور جن لوگوں نے عار اور تکبر کیا ہوگا سو
فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ۬ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ
انہیں وہ دردناک عذاب دے گا اور وہ لوگ اپنے حق میں کسی غیر اللہ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٧٣﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ
کو نہ دوست پائیں گے نہ مددگار ۸۶۲ اے لوگو، تمہارے پاس
قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ
یقیناً ایک دلیل تمہارے پروردگار کے پاس سے آچکی ہے ۸۶۳ اور ہم تمہارے اوپر

ع ٢٣ / ٣

(کافی اور محکم) بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ اس برہان سے مراد رسول اللہ صلعم کی ذات اقدس ہے، جن کی سیرت پاک اور تعلیم کی جامعیت نے ہر مشکل کو آسان اور ہر تھپر کو پانی بنا دیا ہے۔ ای رسول من ربکم (ابن عباس) یعنی محمدًا صلعم عن الثوری (قرطبی) الجمہور علیٰ ان البرہان ھو محمد صلعم (بحر) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ۔ خطاب ساری نسل انسانی جملہ اہل مذاہب کو عام ہے۔ یایھا الناس من جمیع اصناف الملل (ابن جریر) یقول تعالیٰ مخاطبًا جمیع الناس (ابن کثیر) خطاب لکافۃ المکلفین (روح) . . . . .

نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا
ایک کھلا ہوا نور اتار چکے ۸۶۴ تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے، اور اُسے انہوں نے مضبوط پکڑا
بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ
انہیں وہ ضرور اپنی رحمت و فضل میں داخل کرے گا ۸۶۵ اور انہیں اپنے تک
اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ
سیدھی راہ دکھا دے گا ۸۶۶ لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ
فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ
تمہیں میراث کلالہ کے باب میں ۸۶۷ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو ۸۶۸ اور
اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ
اس کے ایک بہن ہو ۸۶۹ تو اُسے اُس ترکہ کا نصف ملے گا ۸۷۰ اور وہ مرد وارث ہوگا اس (بہن) کے
يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ
کل ترکہ کا اگر اس (بہن) کے اولاد نہ ہو ۸۷۱ اگر دو بہنیں ہوں تو ان دونوں کو ترکہ میں سے دو تہائی
مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ
ملے گا ۸۷۲ اور اگر (وارث) چند بھائی بہن مرد و عورت ہوں تو ۸۷۳ ایک مرد کو
مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ
دو عورتوں کے حصہ کے برابر ملیگا ۸۷۴ اللہ تمہارے لئے (یہ احکام) کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم گمراہی
۲۴ ع وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾
میں نہ پڑو ۸۷۵ اور اللہ ہر شے کا پورا علم رکھتا ہے ۸۷۶

۸۶۴ یعنی قرآن مجید جس کے اندر بڑے اور چھوٹے، انفرادی اور اجتماعی، سارے مسائل کا حل موجود ہے۔ ای کتابا مبینا (ابن عباس) النور المنزل ھو القرآن عن الحسن (قرطبی) وھو القرآن کما قالہ قتادۃ ومجاھد والسدی (روح)

۸۶۵ یعنی جنت میں داخل کرکے اور بھی نعمتوں سے سرفراز کرے گا۔ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ یعنی اللہ کی توحید اور نفی شرک پر ایمان لائے۔ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ ۔ یعنی اللہ کے دین کو مضبوط پکڑے رہے۔

۸۶۶ یعنی دنیا میں انہیں طریق رضا پر ثابت و قائم رکھا جائے گا۔ اور اطاعت کی برکت سے انہیں ثبات علی الطاعات کی توفیق ہوگی۔ ای یثبتھم علی طریق مستقیم فی الدنیا مقدم ومؤخر (ابن عباس) اسی سے تارکین ایمان و اعمال صالحہ کی حالت معلوم ہو گئی کہ ان کو یہ ثمرات نہ ملیں گے۔ (تھانوی)

۸۶۷ کلالہ وہ ہے جس کے نہ اولاد ہو۔ اور نہ والدین زندہ ہوں۔

۸۶۸ اور یہ بہن حقیقی یا عینی ہو، یا علاتی یعنی باپ کی طرف سے ہو۔ اخیافی یعنی صرف ماں کی طرف سے بہن کا حکم سورۃ کے شروع (آیت ۱۲) میں آچکا ہے۔

۸۶۹ اور بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہوا تو اسے ملے گا، ورنہ خود اسی بہن پر لوٹ آئے گا، چچا، چچا زاد بھائی وغیرہ عصبات میں داخل ہیں۔ ادائے قرض اجرائے وصیت پر سب جا مقدم ہے۔

۸۷۰ اور والدین بھی نہ ہوں،

۸۷۱ اور بقیہ ایک تہائی عصبہ کو ملیگا ورنہ بطور رد پھر انہی بہنوں کو مل جائیگا۔ بہنیں اگر دو سے زائد ہوں، تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔

۸۷۲ یعنی بھائی کو دہرا اور بہن کو اکہرا حصہ ملے گا۔ یہ بیان عام قاعدہ یا اصول کا ہے۔ باقی تفصیلات کہ عینی بھائی اور عینی بہن کا اثر علاتی بھائی بہنوں پر کیا پڑے گا، کتب فقہ و فرائض میں ملیں گی۔ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً یعنی ایسی میت کے بھائی بہن ہوں، جس پر اطلاق کلالہ کا ہو۔

۸۷۳ (اور معاشرت دنیوی اور جزائے آخرت دونوں میں نقصان سے محفوظ رہو)

۸۷۴ اپنی صفت علم لاکر یاد دلا دیا کہ ان احکام میں بندوں کی ساری رعایتیں اور مصلحتیں جمع کردی گئی ہیں۔